آیت اللہ العظمیٰ محمد حسین طباطبائی

ترجمہ

المیزان

فی

تفسیر القرآن

آیت اللہ حسن رضا غدیری

۳

تالیف:

علامہ السید محمد حسین الطباطبائیؒ

ترجمہ

المیزان

فی تفسیر القرآن

(علمی، فنی، فلسفی، ادبی، تاریخی اور حدیثی معارف سے مزین)

جلد ۳

ترجمہ

آیت اللہ حسن رضا غدیری

انٹرنیشنل سٹینڈرڈ بک نمبرنگ ایجنسی، حکومت پاکستان، اسلام آباد سے رجسٹرڈ

ISBN No.

978-969-8947-07-1

شناس نامۂ کتاب

نام کتاب .... المیزان فی تفسیر القرآن

جلد .... سوم

تالیف .... آیت اللہ علامہ محمد حسین طباطبائی طاب ثراہ

ترجمہ .... آیت اللہ حسن رضا غدیری مدظلہ العالی

اہتمام و ترتیب .... سید دولت علی زیدی

ناشر............................. الغدیر اکیڈمی، پاکستان

تدوین و تزئین....................... الحاج آغا محمد رضا غدیری

تاریخ اشاعت........................ مئی 2008ء

بار .... اوّل

پیشکش .... فاطمیہ ٹرسٹ، لندن

مطبع .... سپوتنک پرنٹرز

13-فین روڈ۔لاہور فون: 03004442227

ملنے کا پتہ ☆ الغدیر اکیڈمی، حسینیہ ہال، ہوپ روڈ، لوکو شیڈ، لاہور - 54900 (پاکستان)

فون 6840622 - 6811712 (+92-42)

☆ Hussaini Research Center

45-Peter Avenue, London, NW10 2DD U.K.

Tel: (+44) 208 621 4088

بسم اللہ الرحمن الرحیم

والباقیات الصالحات خیر عند ربک ثواباً و خیر عملاً

انسانی معاشرہ کی بقا ان افراد کے وجود سے وابستہ ہوتی ہے جن کا عقیدہ صحیح اور عمل نیک ہو، وہ دوسروں کو عزت و سعادت کی دولت ونعمت سے بہرہ مندی کی راہ دکھاتے ہی نہیں بلکہ اس پر لا کھڑا کرتے ہیں، ان کے اعمال کو قرآنی زبان میں باقیات صالحات سے موسوم کیا گیا ہے کیونکہ وہ صرف اسی زمانہ اور انہی کی ذات تک محدود نہیں ہوتے بلکہ ان کی اثر گزاری کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے اور دیگر افراد بشر کے لئے شمع راہ ہی نہیں متاع دوام بھی بن جاتے ہیں، انہی خوش قسمت اور بلند پایہ شخصیات میں ایک معتبر نام جناب مولانا سید نور شاہ کاظمی اعلی اللہ مقامہ کا ہے جنہوں نے علاقہ رتہ متہ میں علوم و معارف کو دوبالا کیا، موصوف ایک عالم باعمل، مقدس اور عابد وزاہد انسان تھے، انہوں نے اپنی پاکیزہ سیرت و کردار کے ذریعے دین اسلام و مذہب اہل بیت علیہم السلام کی جو عظیم خدمت کی وہ ان کے لئے توشۂ آخرت ہے، اس کا صحیح اجر تو خداوند عالم اور حضرات آئمہ معصومینؑ ہی دیں گے کیونکہ موصوف نے جو کچھ بھی انجام دیا وہ انہی کی رضا وخوشنودی کے حصول کی غرض سے کیا تھا لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح کی علمی وعملی تبلیغ کا اعزاز خداوند عالم کی طرف سے حاصلہ توفیق کے بغیر ممکن نہیں ہوتا کیونکہ وہ دلوں کے رازوں کو جانتا ہے اور ہر شخص کو اس کی مقصودہ غرض کے مطابق جزا دیتا ہے، خدا کا فضل و کرم اپنے نیک و صالح بندوں کے لئے مخصوص ہے وہ رحمٰن ہے یعنی اپنی تمام مخلوق پر عنایت کی بارش برساتا ہے، وہ رحیم ہے یعنی اپنے خاص مخلص اطاعت گزار بندوں کو اپنی رحمت سے نوازنے والا ہے، حقیقت یہ ہے کہ اگر دنیا میں خدا کے نیک و صالح بندے موجود نہ ہوں تو دنیا تباہ و برباد ہو جائے، مولانا سید نور شاہ کاظمی مرحوم نے اپنی نجی زندگی میں بھی سادگی، قناعت اور زاہدانہ روش کو اپنایا جس سے ان کی دینی پہچان کا تشخص قائم ہوا، موصوف کی انہیں انفرادی واجتماعی صفات کی قدردانی کے طور پر ان کی روح کو شاد کرنے کے لئے ان کے فرزند ارجمند حجۃ الاسلام مولانا سید کلب عباس کاظمی آف گاہی سیداں تحصیل وضلع راولپنڈی (حال مقیم لندن) نے جہاں دیگر عبادتی اعمال انجام دیئے وہاں کتاب حاضر تفسیر المیزان جلد ۳ کی اشاعت میں مکمل مالی تعاون کیا، ادارہ تمام قارئین کرام سے ملتمس ہے کہ مولانا سید کلب عباس کاظمی کے والدین اور دیگر بزرگانِ خاندان مرحومین و مرحومات کے ایصال ثواب کے لئے سورۂ مبارکہ فاتحہ وسورۂ اخلاص کی تلاوت کے ساتھ ساتھ ان کی بلندیٔ درجات کے لئے دعا کریں، خداوند عالم مولانا موصوف کی یہ دینی خدمت اور عبادتی عمل کو اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت عطا فرمائے اور ہم سب کو اپنی مقدس کتاب کے فہم المعانی اور اس کی ارفع واعلیٰ تعلیمات پر عمل کرنے کی توفیق دے۔

سید دولت علی زیدی

الغدیر اکیڈمی پاکستان

سورۂ آلِ عمران

۲۰۰ آیات پر مشتمل

یہ سورۂ مبارکہ مدینہ منورہ میں نازل ہوا

فہرست

موضوعی فہرست

جو موضوعات اس جلد میں عنوان قرار پائے وہ درج ذیل ہیں :

- خدا کی وحدانیت
- قرآن کی تنزیل
- حق اور اس کی حقیقت
- تورات اور انجیل
- عذاب وسزا
- بشری تخلیق اور اس کے مراحل
- تقدیر کی اصل واساس
- محکم ومتشابہ آیات
- تفسیر وتاویل
- ہدایت ورحمت
- قیامت کے دن کی حضوری
- محکمات اور ام الکتاب
- تاویل قرآن کا علم
- متشابہات کا راز
- ناسخ اور منسوخ
- قرآن اور معرفت الٰہی
- راسخون فی العلم
- وحی کی حقیقت
- ارشادات نبویؐ
- قرآن کی صفات وفضائل

- لیل ونہار
- حیات وموت
- رزق اوراس کا خدائی نظام
- تکوین وتشریع
- قرآنی معارف
- مومن اور کافر
- ادب القرآن
- منت ونذر کی حیثیت
- حضرت مریمؑ اوران کی عظمت
- حضرت عیسیٰؑ اوران کا اصل مقام
- حضرت زکریاؑ اورحضرت یحیٰؑ
- غیبی الہامات
- شیطانی خیالات
- رسول، نبی اورمحدث
- اطاعت خداوندی
- مسیح اورمسیحائی
- معجزات اوران کی مختلف صورتیں
- غیبی خبریں اوران کے موارد
- بندگیء پروردگار
- شرعی احکام
- گواہی کی دینی حیثیت
- دلیل وحجت کی قوت
- ایمان وکفر کے اخروی آثار
- اصطفاء اوراس کے مواردومصادیق
- آسمانی کتب

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حرف اول

قرآن کریم اپنی خدائی نسبت کی بنیاد پر عظمتوں، فضیلتوں، ہدایتوں اور علمی کمالات کا ایسا پاکیزہ مرقع ہے جس کی قصیدہ خوانی خود خداوند عالم نے کی اور اس مقدس مجموعہ علوم و معارف کو کائنات کے لئے ہادی ورہنما یا دوسرے لفظوں میں ''کتاب ہدایت'' کے نام سے موسوم کیا چنانچہ ارشاد ہوا: '' **ذلک الکتاب لا ریب فیه هدی للمتقین**'' ، (سورہ بقرہ آیت ۲) اس عظیم کتاب کی دیگر متعدد اہم خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ اسے قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے آئین زندگی بنایا گیا ہے، اسے سب سے آخری اور سب سے بڑے نبی حضرت محمدؐ پر نازل کیا گیا کہ جن کی نبوت ورسالت قیامت تک باقی رہے گی اور ان کے بعد کوئی نبی یا رسول نہ آیا اور نہ ہی آئے گا، اس کتاب کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالی نے لی اور اسے ''ذکر'' قرار دے کر تحریف کرنے والوں کے مذموم مقاصد سے محفوظ رکھا، یہی وجہ ہے کہ آج تک اس کی خدائی نسبت کو چیلنج کرنے کی کوئی کوشش کامیاب نہ ہوسکی اور بدخواہوں و بداندیشوں کو ہمیشہ منہ کی کھانی پڑی، قرآن مجید اپنی نسبتی آب وتاب کے ساتھ نسل انسانی کے لئے آج بھی اسی طرح مشعل ہدایت ہے جس طرح اپنے زمانہ نزول میں تھا اور قیامت تک اسی طرح رہے گا، صدیاں گزر جانے کے باوجود اس کی روحانی ومعنوی تازگی برقرار ہے اور گردش ایام اس کی علمی لطافت وعظمت کو کم نہ کرسکی بلکہ روز بروز اس کے ہادیانہ کردار کے آثار نمایاں تر ہوتے جارہے ہیں، ہر دور میں دانشوروں نے اپنی علمی کاوشوں میں اس سے اصولی استفادہ کیا اور ارباب تحقیق نے اس کے عظیم معارف کی بنیاد پر اپنے فکری سفر کے مراحل آسانی سے طے کئے اور اب تک یہ سلسلہ جاری ہے، اس حوالہ سے اس مقدس کتاب کی جامعیت مسلم الثبوت ہے کہ اس میں موضوع کی محدودیت کا کوئی تصور نہیں اور نہ ہی زمان ومکان کی قید وشرط ہے بلکہ یہ ہر زمانہ اور ہر مقام پر ہر موضوع کی بابت سرچشمہ ہدایت اور ہر فرد بشر کے لئے ضامن سعادت ہے۔ اس کے بلند پایہ معارف کی تفہیم وتفسیر کی بابت اہل فکرودانش نے ہر زمانہ میں اپنی علمی دولت صرف کی تاکہ اس کے خزانہ علم وحکمت سے جس قدر ممکن ہو استفادہ کیا جاسکے، چنانچہ ہر شخص نے اپنے ذوق ورجحان کے مطابق اپنی توانائیاں بروئے کار لائیں، کسی نے اس کی ادبی جہت کو مدنظر قرار دیا، کسی نے اس کے تاریخی

حوالوں کو بنیاد بنایا، کسی نے اس کی فقہی حیثیت کو ملحوظ رکھا، کسی نے علمی وفلسفی اصولوں کے تناظر میں اس سے مطلوبہ مقاصد کے حصول کی راہ اختیار کی، کسی نے اس کی اخلاقی تعلیمات کو محوریت ومرکزیت کے آئینہ میں دیکھا، کسی نے مخصوص اعتقادی زاویے پیش نگاہ رکھے، کسی نے سائنسی اصولوں میں اس کے اشاراتی بیانات کو سرچشمہ قرار دیا، کسی نے علوم طبیعی کے ارتقائی سفر میں اس کی ہدایات کو مشعل راہ بنایا، کسی نے اقتصادی اور کسی نے سیاسی پیشرفت میں مربوط امور کے نظم ونظام کی ترتیب و استحکام میں اس کے اصولی ارشادات کو اساس بنایا، خلاصہ یہ کہ سب نے اس کتاب الٰہی کے مخزن اسرار ورموز سے لعل وجواہر حاصل کیے لیکن ہر شخص کی فکری ترجیحات مختلف تھیں کہ جن کے نتیجہ میں کبھی تو تحقیق کی سمت درست اور کبھی نادرست رہی ،درست اس طرح کہ تفسیر کے خدائی اصولوں کو اپنایا گیا اور نادرست اس لئے کہ رائے وقیاس کو بنیاد بنایا گیا،تو جہاں تک تفسیر المیزان کا تعلق ہے تو اس میں کسی مخصوص فکری وابستگی سے بالاتر ہو کر ایک ایسا اصول اپنایا گیا جو خدا پسند وحق آشنا ہے اور وہ ہے تفسیر القرآن بالقرآن، اسی کو حضرت پیغمبر اسلام ؐ اور آئمہ اہل بیتؑ واکابر اصحاب وارباب فن نے معمول بنایا، اس اصول پر اس کتاب کے تفسیری عمل کی بنیاد قائم ہے۔ میری کوشش رہی ہے کہ تحریر کے تسلسل میں اردو دان حضرات کے لئے اس مقدس کتاب کی بیانی لطافت کو محفوظ رکھوں۔ میں اس میں کہاں کامیاب ہوا ہوں اس کا فیصلہ تو اہل علم قارئین ہی کریں گے مگر اپنی علمی کم مائگی کے صریح اعتراف کے ساتھ ہر طرح کے نقص وخامی پر بارگاہ رب العزت میں عفو اور اہل دانش سے ارشاد وتصحیح کا طلبگار رہوں، خداوند عالم میری اس عبادتی کاوش کو اپنے حضور شرف قبولیت عطا فرمائے اور مجھے اور تمام اہل دین کو اس مقدس گلستان علم ومعرفت سے گل چینی اور اس کتاب الٰہی کی اعلی وسعادت آفرین تعلیمات کی عملی پیروی کی توفیق سے نوازے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ اہل علم حضرات اور خطباء وارباب منبر کے اصرار وفرمائش پر ترجمہ کے ساتھ ساتھ روایات و احادیث کی اصل عبارتیں بھی شامل کی گئی ہیں تا کہ اس سے اظہار وبیان کے موارد میں استناد واستفادہ آسان ہو، اسی طرح حوالہ جات میں بھی یہی مقصد ملحوظ ہے۔

حسن رضا غدیری

لندن

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پیش گفتار

سورہء مبارکہ آل عمران کی آیت (۱) سے آیت (۱۲۰) کی تفسیر پر مشتمل کتاب المیزان کی تیسری جلد کی اشاعت کا مرحلہ پایہء تکمیل کو پہنچا، اس سلسلہ میں حسب سابق ہم نے اپنے مقدور بھر کوشش کی تا کہ کتاب کے اعلیٰ معیار کو برقرار رکھا جائے اور پہلی دو جلدوں کی طرح اس کی جاذبیت ملحوظ و محفوظ ہو۔ ہمیں خوشی ہے کہ اس مقصد میں ہم کامیاب ہوئے ہیں اور کاغذ و طباعت سمیت تمام اشاعتی امور عمدہ معیار کے حامل ہیں، اس حوالہ سے ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ اپنے نہایت محدود وسائل کے باوجود ہم جس طرح اس سلسلہ کو آگے بڑھا رہے ہیں اس میں تائید خداوندی ہی اصل و اساس اور ہمارا حقیقی سہارا ہے، کہ جس پر ہم جس قدر شکر بجالائیں کم ہے۔ ہمارا مقصد نہ تو تجارتی فوائد حاصل کرنا ہے اور نہ ہی نشریاتی اداروں کی فہرست میں شامل ہو کر کسی امتیازی مقام کو پانا ہے بلکہ صرف رضائے پروردگار کا حصول ہماری پہلی اور آخری ترجیح و مقصود و مطلوب ہے۔ تفسیر المیزان کے علاوہ اپنی دیگر مطبوعات میں بھی یہی مقصد ملحوظ ہے کہ جس قدر ممکن ہو دینی و علمی معارف و مطالب کو اہل ایمان و صاحبان ذوق تک پہنچائیں اور اس طرح روحانی افادہ و استفادہ کا مقدس ہدف حاصل کر سکیں، تفسیر المیزان کی اشاعت ہمارے لئے بہت بڑا اعزاز ہے اور ہم اس خداداد عزت پر فخر کرتے ہیں کیونکہ قرآن مجید ہماری سعادت کا ضامن آئین زندگی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسے قیامت تک آنے والی نسل انسانی کے لئے سرچشمہء ہدایت بنایا ہے کہ اس کی ہر آیت میں حق کی نشانی پائی جاتی ہے، جو شخص اس کے نور ہدایت سے مستفیض ہونے کی توفیق پالے وہ دنیا و آخرت دونوں جہانوں میں سر بلند ہوگا۔

الغدیر اکیڈمی پاکستان خالص دینی و تبلیغی اشاعتی ادارہ ہے اور ہم ہر طرح کی غیر دینی وابستگی سے بالاتر اپنے پاکیزہ روحانی اہداف کے حصول میں سرگرم عمل ہیں، ہماری پوری کوشش ہے کہ اپنی مطبوعات کو معنوی بنیاد پر مزین کر کے قائین کی

خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کریں لہٰذا ہم عبارتوں کی درست ترتیب اور آیات مبارکہ کی صحیح کتابت کو خاص طور پر اہمیت دیتے ہیں تاکہ ان کی درست تلاوت کرنے والوں کے ساتھ ہم بھی شریک عبادت ہونے کی عزت حاصل کرنے کے حقدار بنیں، لیکن اس کے باوجود ہم اپنی کوتاہ دامنیٔ فکر و علم کا اعتراف کرتے ہوئے ہمیشہ اپنے قابل احترام قارئین کرام سے درخواست اور امید کرتے ہیں کہ اگر کسی جگہ لفظی یا اعرابی غلطی نظر آئے تو ہمیں آگاہ فرمائیں گے تاکہ آئندہ اشاعت میں اس کی تصحیح ہو سکے۔

خداوند عالم کا احسان ہے کہ اس نے ہمیں اپنی مقدس کتاب کی خدمت کی توفیق اس کی تفسیر کو عام کرنے کی صورت میں عطا کی، تفسیر المیزان موجودہ دور کی سب سے بڑی علمی تفسیر ہے کہ جس میں آیات مبارکہ کی توضیح و تشریح اور ان کے معانی سے مربوط مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے اور موضوع سے مربوط بنیادی مباحث کو شامل کر کے تفسیری عمل کی جامع تصویر پیش کی گئی ہے جس سے آیات مبارکہ سے فہم المعنی کی بابت بیشتر مراحل کا طے کرنا آسان ہو جاتا ہے، اس حوالہ سے کتاب کی اہمیت کسی وضاحت کی محتاج نہیں رہی، قرآن فہمی کا ذوق رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب ایک عظیم روحانی سوغات ہے، نہایت دقیق اور عمیق مطالب و معانی پر مشتمل عربی عبارتوں کو نہایت آسان اور قابل فہم اردو الفاظ میں ڈھالنا عظیم کارنامہ ہے جس کے لئے آیت اللہ حسن رضا غدیری مدظلہ العالی شکریہ و داد تحسین اور مبارکباد کے مستحق ہیں کہ جنہوں نے اپنی دیگر علمی و تبلیغی مصروفیات کے باوجود اردو دان طبقہ پر احسان کیا اور قرآنی معارف کی تفہیم کا نہایت عمدہ و دلکش اسلوب و انداز اختیار کر کے تفسیری مطالب کو چار چاند لگا دیئے، خدا سے دعا ہے کہ موصوف اس مقدس عمل کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی توفیق حاصل کریں اور صحت و سلامتی کے ساتھ اپنی علمی کاوشوں و تحقیقی و تبلیغی سلسلوں کو جاری و ساری رکھیں۔ اور الغدیر اکیڈمی پاکستان کا خالص دینی اشاعتی سلسلہ ترقی و توسیع کے مراحل طے کرنے میں کامیاب ہو۔ آمین

سید دولت علی زیدی

انچارج الغدیر اکیڈمی پاکستان

آیات ۱ تا ۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

○ الٓمّٓ ۝۱

○ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۝۲

○ نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ
التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝۳

○ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ۛ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝۴

○ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاۗءِ ۝۵

○ هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاۗءُ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۶

ترجمہ

- " شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے کہ جو نہایت مہربان ......اور...... ہمیشہ رحم کرنے والا ہے " الٓمّٓ ﴿۱﴾
- " اللہ، کہ جس کے سوا کوئی ...... برحق ...... معبود نہیں وہ ہمیشہ زندہ ...... اور...... تا ابد پائندہ ہے " ﴿۲﴾
- " اس نے آپ پر حق کے ساتھ کتاب نازل کی جو کہ اپنی پیشرو کتب الٰہیہ کی تصدیق کرتی ہے، اور اس نے اس سے پہلے تورات و انجیل کو لوگوں کی ہدایت کے لئے نازل کیا اور اسی نے فرقان (حق و باطل کے درمیان تمیز دلانے والا...... قرآن......) نازل کیا " ﴿۳﴾
- " جو لوگ خدا کی آیتوں ...... واضح نشانیوں ...... کے منکر ہوئے ان کے لئے سخت عذاب مقرر ہے اور خدا طاقتور اور سخت بدلہ لینے والا ہے " ﴿۴﴾
- " حق یہ ہے کہ کوئی چیز خدا سے پوشیدہ نہیں نہ ہی زمین میں اور نہ آسمان میں ! " ﴿۵﴾
- " وہی ہے جو ماؤں کے رحموں میں اپنی مرضی کے مطابق تمہاری شکل و صورت بناتا ہے، اس کے سوا کوئی ...... برحق ...... معبود نہیں، وہ نہایت قدرتمند و دانا ہے " ﴿۶﴾

تفسیر و بیان

اس سورۂ مبارکہ کے نزول کا بنیادی مقصد اہل ایمان کو اس بات کی دعوت دینا ہے کہ دین کی بابت اتحاد و یکجہتی اختیار کریں اور دشمنانِ دین مثلاً یہود و نصاریٰ اور مشرکین کہ جو اپنی تمام تر توانائیاں اسلام کے روشن چراغ کو بجھا دینے کے لئے بروئے کار لا چکے ہیں ان کے مقابلہ میں استقامت و پائیداری اور صبر و شکیبائی کا مظاہرہ کریں۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورۂ مبارکہ یکجا نازل ہوا کیونکہ اس کی تمام آیات ..... جو کہ دوسو (۲۰۰) ہیں شروع سے آخر تک ایک ہی طرز و اسلوبِ سخن کی حامل اور ترتیب و ترکیب کے حوالہ سے ہمرنگ ہونے کے ساتھ ساتھ معنی و مقصود کے لحاظ سے باہم مربوط، متناسب و ہم آہنگ ہیں،

بنابرایں اس سورۂ مبارکہ کے زمانۂ نزول کی بابت یہ کہنا بجا ہوگا کہ یہ اس دور میں نازل ہوا جب حضرت پیغمبر اسلامؐ اپنے مقدس مشن کے ابتدائی مراحل میں تھے اور ابھی ان کی دعوت دین کے عمل کو استحکام حاصل نہیں ہوا تھا، کیونکہ ان آیات شریفہ میں جنگ احد کا تذکرہ، نجران کے نصاریٰ کے ساتھ مباہلہ کا ذکر، یہودیوں سے متعلق بعض امور کا بیان، اہلِ ایمان کو مشرکین کے مقابلہ میں قیام کرنے کی ترغیب اور باہمی ربط و یک جہتی، صبر و شکیبائی و ثابت قدم رہنے کی دعوت کے حوالہ سے اہم مطالب موجود و مذکور ہیں جس سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ یہ سورۂ مبارکہ اس دور میں نازل ہوا جب اہلِ اسلام دین حق کے دفاع میں اپنی تمام تر قوتوں و توانائیوں کو بروئے کار لا کر اپنی اجتماعی قوت مضبوط کرنے میں سرگرم عمل تھے اور یہ وہ دور تھا جب مسلمانوں کو ایک طرف سے یہود و نصاریٰ کے فتنوں و سازشوں کا سامنا تھا اور دوسری طرف مشرکین کے جنگی حملوں کا جواب دینا تھا لہٰذا وہ دشمنوں کی سازشوں کو ناکام بنانے کے لئے بھرپور طریقہ سے میدانِ عمل میں اتر چکے تھے تاکہ اہلِ اسلام غلط پروپیگنڈوں کی وجہ سے اعتقادی طور پر کمزوری کا شکار نہ ہونے پائیں اور ادھر مشرکین نے جنگ و قتال کی جو آگ بھڑکائی ہوئی تھی اس میں بھی مسلمان اپنی قوتِ ایمانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دشمنوں سے مقابلہ کر رہے تھے۔ گویا وہ دور مسلمانوں کے لئے ہر لحاظ سے بدامنی اور جنگ کا دور تھا کیونکہ اسلام کی روز افزوں پیشرفت اور دعوتِ حق کے پھیلنے کی وجہ سے یہودیوں، نصرانیوں اور مشرکینِ عرب نے دینِ الٰہی کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا تھا اور ان کے علاوہ روم، ایران اور

دیگر عجمی ممالک بھی اسلام دشمنی میں اپنی توانائیاں بروئے کار لانے میں مصروف تھے،

اس صورتِ حال کے پیش نظر خداوندِ عالم نے اس سورۂ مبارکہ میں اپنے مقدس دین کے بعض حقائق کو آشکار کرتے ہوئے اہل ایمان کو دین حق کی عظمت وصداقت سے روشناس کرایا تاکہ ان کے دل ایمان کی پاکیزگی سے آراستہ ہوں اور شبہات وشیطانی وسوسوں اور اہل کتاب کی ریشہ دوانیوں کی گندگی ان کے دلوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دور ہو جائے، اور اس کے ساتھ ساتھ انہیں اس امر سے آگاہ کرے کہ خدا عالمِ ہستی کے نظام کی تدبیر سے لحہ بھر غافل نہیں ہوا اور نہ ہی اپنی مخلوق کے مقابلہ میں عاجز وناتواں ہے اور اس نے اپنے دین ...... اسلام...... کو پسند کرنے اور اپنے کچھ بندوں کو اس مقدس آئین کی رہنمائی میں جو طریقہ اپنایا وہ عام رائج طرزِ عمل اور ہمیشہ سے جاری روش یعنی اصول علل واسباب کے سوا کچھ نہیں بنابرایں مؤمن وکافر دونوں اس طریقہ واصول پر چل رہے ہیں اور اپنی اپنی طاقت آزمائی میں مصروف ہیں، ایک دن کافر کا اور ایک دن مؤمن کا ہے، دنیا امتحان وآزمائش کا گھر ہے، آج عمل کا دن ہے اور کل جزا کا دن ہوگا...... ہر شخص اپنے کئے کا نتیجہ پائے گا۔

خدا کی وحدانیت کا واضح اعلان

○ " اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ "

(اللہ، نہیں ہے کوئی معبود سوائے اس کے، وہ زندہ، مضبوط مدبر ہے)

آیت الکرسی کی تفسیر میں اس جملہ " اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ " کی تشریح ذکر ہو چکی ہے، جو مطالب وہاں بیان ہوئے ان کا خلاصہ یہ ہے کہ کائنات کو وجود عطا کرنے اور تمام مخلوق کے امور کی احسن تدبیر کا کامل سلسلہ خداوندِ عالم کے دستِ قدرت سے قائم ہوا اور اسی سے وابستہ ہے بنابرایں موجوداتِ عالم کا وجودی سلسلہ ونظام ہر لحاظ سے خداوند عالم کا قائم کردہ ہے کوئی چیز اپنے وجود اور وجودی آثار میں ذاتی استقلال نہیں رکھتی یعنی ایسا نہیں کہ وہ خود بخود وجود میں آئی ہو اور نہ ہی یہ کہ صرف طبیعی اسباب کی اثر آفرینی سے اسے وجود حاصل ہوا ہو کیونکہ طبیعی اسباب خواہ جس قدر قوی ووسیع تاثیر کے حامل کیوں نہ ہوں لیکن وہ شعور سے محروم ہوتے ہیں جبکہ زندگی کا وجودی استقرار علم و قدرت سے وابستہ ہے اور جو چیز خود اس سے محروم ہو وہ کسی اور کو اس سے بہرہ مند کیونکر کر سکتی ہے تو ثابت ہوا کہ زندگی عطا کرنے والے سرچشمۂ وجود کے لئے علم و قدرت بنیادی شرط ہے لہٰذا یہ حقیقت تسلیم کرنی ہوگی کہ تمام موجودات اصل وجود، حیات اور تمام متعلقہ امور وآثار میں خداوندِ

عالم کے قائم کردہ نظامِ ایجاد سے وابستہ ہیں، اور علم الٰہی تمام موجودات پر حاوی ہے کوئی چیز اس سے پوشیدہ نہیں، اور قدرت خداوندی بھی تمام موجوداتِ عالمِ ہستی پر محیط و چھائی ہوئی ہے اس کی مشیت و اذن کے بغیر کچھ بھی وقوع پذیر نہیں ہوسکتا چنانچہ اسی مطلب کو آیت ۵ اور ۶ میں اس طرح ذکر فرمایا:

" اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ۝ هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ "

(خدا سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں نہ زمین میں اور نہ آسمان میں، وہی تمہاری ماؤں کے رحموں میں تمہاری شکل وصورت بناتا ہے جس طرح چاہتا ہے)

چونکہ اس سورہ کے آغاز میں یہ چھ آیات مبارکہ نہایت عمدہ ومنفرد اندازِ بیان کے ساتھ مقدمہ وتمہید کے طور پر ہیں اور سورۂ مبارکہ میں مذکور تمام مطالب کی تفصیلات کے اجمالی بیان پر مشتمل ہیں سورۂ مبارکہ کے نازل ہونے کی غرض و مقصد کو بیان کیا جاچکا ہے لہٰذا یہ آیت شریفہ " اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ " ایک ایسے کلی وجامع بیان کی طرح کلام کے آغاز وتمہید کی حیثیت رکھتی ہے جس سے سورۂ مبارکہ کی اصل غرض ومقصد کی تکمیل یقینی ہوتی ہے چنانچہ آخری دو آیتیں (اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ۝ هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝) مطلوبہ موضوعات کے بیان کے بعد ان کی بنیادی وجوہ اور سبب کی حیثیت رکھتی ہیں کہ جسے علمی زبان میں " تعلیل بعد البیان " کہا جاتا ہے لہٰذا درمیانی دو آیتیں (نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝) ہی مقدمۂ کلام وتمہیدی بیان کے تکمیلی حصہ کی حیثیت رکھتی ہیں، بنابرایں ان آیات کے معانی کی بازگشت درج ذیل مطالب کی طرف ہوگی:

۱۔ اہل ایمان کو یہ بات یاد رہنی چاہیے کہ وہ جس خدا پر ایمان لائے ہیں وہ الوہیت میں یکتا ہے،

۲۔ وہ (خدا) کائنات کو وجود عطا کرنے (تخلیق) اور اپنی مخلوق کے تمام امور کی تدبیر کا محور وسرچشمۂ فیض وبقا ہے۔ موجودات کی حیات کا سلسلہ ونظام اسی سے وابستہ ہے اور ان کی زندگی کی اصل واساس کا نگہبان ونگران ہے،

۳۔ خدا اپنے دائرہ فرمانروائی میں کسی سے مغلوب نہیں ہوتا،

۴۔ خدا کے اذن ومشیت کے بغیر کوئی چیز وجود میں نہیں آسکتی اور نہ ہی کسی فعل وعمل کے وقوع پذیر ہونے کے مراحل طے ہوسکتے ہیں......

جب اہلِ ایمان ان مطالب ...وحقائق......کو خاطر میں لائیں گے تو انہیں اس حقیقت سے آگاہی حاصل ہو

جائے گی کہ خدا ہی ہے جس نے اس (قرآن) کو نازل فرمایا ہے جو حق کی طرف ہدایت کرنے والی اور حق و باطل کے درمیان تمیز کرنے ..... کے اصول و معیاروں سے آگاہی دلانے ..... والی کتاب ہے، اور خدا نے اس میں انہی ضابطوں کو ملحوظ رکھا جن پر عالم الاسباب کا دارومدار ہے اور انہی اصولوں کو بنیادی حیثیت دی جو نظام الاختیار میں اساس العمل کے طور پر معین و مقرر ہیں یعنی خداوند عالم نے جن اصولوں کی بنیاد پر عالم الاسباب و نظام الاختیار قائم کیا انہی کو کائنات کے آئین حاکمیت و دستور فرماں روائی میں بھی معیار قرار دیا، بنابریں جو ایمان لایا وہ اپنا اجر و جزا پائے گا اور جس نے کفر اختیار کیا تو خدا اسے اس کے کیفر کردار تک پہنچائے گا کیونکہ خدا غلبہ و طاقت والا اور انتقام (سزا دینے کا حق و اختیار رکھنے) والا ہے، ایسا اس لئے ہے کہ وہی معبود ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں جو ان امور میں حکم فرمائی کر سکے، اور کافروں کا کوئی معاملہ خدا سے پوشیدہ نہیں اور نہ ہی ان کے اعمال اور کفر اختیار کرنا خدا کے ارادہ و مشیت کی حدود سے باہر ..... بے نیاز ..... ہے، ..... بلکہ اگر خدا چاہے تو ان کی فکری و عملی قوتوں کو بے اثر کر کے انہیں مجبور و بے بس کر دے لیکن خدا نے بندوں کے لئے جو نظام الاختیار مقرر کیا ہے اور عالم الاسباب قائم کیا ہے وہ انہیں اسی کے مطابق جزا و سزا دے گا کہ یہی اس کے عدل کا تقاضا و اصول ہے..... م،

قرآن کی برحق تنزیل

○ "نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ"

(اس نے آپ پر کتاب نازل کی حق کے ساتھ جو کہ اپنی پیشرو کتاموں کی تصدیق کرنے والی ہے)

"نَزَّلَ" باب تفعیل "**تنزیل**" سے فعل ماضی کا صیغہ ہے، بعض مقامات پر "اَنْزَلَ" باب افعال "اِنْزَال" سے ذکر ہوا ہے، دونوں کا معنی نازل کرنا ہے اور ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ "**تنزیل**" تدریجی نازل کرنے جبکہ "اَنْزَلَ" میں دفعتاً نازل کرنے کا معنی پایا جاتا ہے۔

یہاں ممکن ہے کہ "**تنزیل**" اور "اِنْزَال" کے مذکورہ بالا فرق کو نادرست قرار دیتے ہوئے درج ذیل آیات سے استدلال کیا جائے:

سورۂ فرقان، آیت ۳۲:

○ "لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً"

(کافروں نے کہا) اس پر قرآن ایک ہی مرتبہ نازل کیوں نہیں کیا جاتا.....

سورہ مائدہ، آیت ۱۱۲ :

○ " اَنْ یُّنَزِّلَ عَلَیْنَا مَآئِدَةً "

(عیسٰیؑ کے حواریوں نے کہا کہ آیا تیرا پروردگار یہ کرسکتا ہے کہ) ہمارے لئے مائدہ نازل کرے)۔۔۔

سورہ انعام، آیت ۳۷ :

○ " لَوْلَا نُزِّلَ عَلَیْهِ اٰیَةٌ "

(کافروں نے کہا) اس پر کوئی نشانی (معجزہ) نازل کیوں نہیں ہوتی)۔۔۔

سورہ انعام، آیت ۳۷ :

○ " قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ یُّنَزِّلَ اٰیَةً "

(ان سے کہہ دیں کہ خدا نشانی (معجزہ) نازل کرنے پر قادر ہے)۔۔۔

شاید ان آیات سے استدلال کرتے ہوئے کہا جائے کہ "تنزیل" میں غیر تدریجی معنی پایا جاتا ہے، اور اسی احتمال کے پیش نظر بعض مفسرین نے کہا ہے کہ بہتر ہے کہ "نَزَّلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ" کا معنی "انزلهٗ انزالاً بعد انزال" کیا جائے تا کہ تنزیل اور انزال کے درمیان فرق پائے جانے کے اعتراض کی گنجائش ہی باقی نہ رہے۔

لیکن اس احتمال یا اعتراض کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ تدریجی نزول سے مراد یہ نہیں کہ کسی مرکب چیز کے اجزاء میں ایک جزء کا دوسرے جزء سے غیر معمولی زمانی فاصلہ ہو بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ ہر مرکب چیز اپنے اجزاء کے ساتھ موجود ہو اور اس کے وجود کا لحاظ دو طرح سے ہوتا ہے:

ایک: اجزاء کے مجموعہ کی بنیاد پر، اور دوسرا: ہر جزء کے دوسرے جزء سے متصل ہونے کی بنیاد پر،

اجزاء کے مجموعہ کی بنیاد پر مرکب چیز کو جزء جزء کے حوالہ سے نہیں بلکہ من حیث المجموع دیکھا جاتا ہے اور وہ مجموعہ مرکب کی صورت میں ایک غیر منقسم شے کہلاتا ہے کہ جس کا وجود ایک اکائی ہو جاتا ہے، اس بناء پر اس کے لئے "نزول" و "انزال" کی تعبیر درست ہوتی ہے جیسا کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

سورہ رعد، آیت ۱۷ :

○ " اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً "

(اس نے آسمان سے پانی نازل کیا)۔۔۔

یہاں پانی نازل کرنے سے بارش برسانا مراد ہے۔

مرکب چیز کو اس کے جزء جزء کے حوالہ سے دیکھا جائے تو اس کا پے در پے ایک دوسرے سے متصل ہونا ملحوظ ہوتا

ہے خواہ اجزاء کے درمیان زمانی فاصلہ پایا جائے یا نہ پایا جائے، اسے تدریج کہا جاتا ہے اور اسے "تنزیل" سے تعبیر کیا جاتا ہے جیسا کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

سورہ شوریٰ، آیت ۲۸:

O " وَهُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ الْغَيْثَ"

(وہی ہے جو بارش برساتا (نازل کرتا) ہے)

اس بیان کے بعد واضح ہو جاتا ہے کہ جو آیات اعتراض کی دلیل کے طور پر پیش کی گئی ہیں ان سے مطلوبہ ہدف حاصل نہیں ہوتا یعنی "تنزیل" میں تدریجی نزول کے معنی پائے جانے کی نفی ثابت نہیں ہوتی بلکہ یہ بات اپنے مقام پر باقی رہتی ہے کہ "تنزیل" کے تمام صیغوں میں تدریجی نزول کا معنی پایا جاتا ہے لہٰذا " لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَاحِدَةً " کا معنی یہ ہوگا کہ کافروں نے کہا کہ: کیوں نہیں نازل کیا جاتا اس (محمدؐ) پر قرآن، ایک ہی دفعہ! یعنی قرآنی آیات کا نزول کسی زمانی فاصلہ کے بغیر ایک ہی متصل وقت میں کیوں ہے؟ جیسا کہ امر واقعہ ہے کہ قرآن مجید مختلف امور و واقعات کی بابت مختلف اوقات میں نازل ہوا۔

بہر حال اس جواب سے اعتراض کی دلیل کے طور پر پیش کی جانے والی دیگر آیات شریفہ کے معانی بھی واضح ہو جاتے ہیں اور اعتراض کی اصل و اساس ہی باقی نہیں رہتی۔

جہاں تک بعض مفسرین کی طرف سے پیش کی جانے والی مذکورہ رائے کا تعلق ہے کہ جس میں کہا گیا ہے کہ " نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ" کا معنی " انزلہ انزالاً بعد انزال" کیا جائے تو بہتر ہوگا، تو یہ بات استحسان اور ایک فرد کی من پسند رائے ہے جسے کسی لغت و زبان میں جائز و روا قرار نہیں دیا جاتا اور اس کے علاوہ اس رائے سے اصل اعتراض بھی ساقط نہیں ہوتا بلکہ مذکورہ آیات پر اٹھایا جانے والا اعتراض کما کان باقی رہتا ہے۔

"نزول" کی اصل حقیقت

خداوند عالم نے اپنے مقدس کلام (قرآن مجید) میں حضرت رسول اعظم محمد مصطفیٰؐ کو کتاب سے نوازنے کا ذکر فرماتے ہوئے اسے "تنزیل" اور "نزول" ... انزال ... سے تعبیر کیا ہے، ("تنزیل" نزول سے باب تفعیل اور "انزال" باب افعال ہے)۔ "نزول" کا لفظی معنی نیچے آنا، اترنا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ کسی بلند مقام یا مکان سے کوئی چیز اپنے مخصوص انداز میں نیچے والے مقام یا مکان میں اتر کر استقرار پائے (اپنی جگہ و ٹھکانہ بنالے) چونکہ خدائے

قدوس نے اپنی توصیف " علو " (بلندی) اور رفعت درجات سے کی ہے اور اپنی کتاب (قرآن) کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ اس کی طرف سے آئی ہے، چنانچہ ارشاد ہوا:

سورۂ شوریٰ، آیت ۵۱:

O " اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ "

(وہ بلند مقام والا، حکمت والا ہے)

اور ارشاد ہوا:

سورۂ بقرہ، آیت ۸۹:

O " وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ".

(اور ان کے پاس کتاب آئی اللہ کی طرف سے، جو تصدیق کرتی ہے اس چیز کی جو ان کے پاس ہے)......

لہٰذا وحی کے ذریعے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب مبارک پر کتاب (قرآن) کے قرار پانے کو "نزول" سے تعبیر کرنا صحیح و بجا ہے۔

" حق " سے کیا مراد ہے ؟

کسی یقینی ...... و نا قابل انکار و شک ...... امر کی خبر کو اصل حقیقت کے عین مطابق ہونے کی بناء پر " حق " کہتے ہیں، جیسا کہ " صدق " سے مراد وہ خبر ہے جو واقعہ کے عین مطابق ہو، بنابرایں " موجودات عالم " اور " حقیقی امور " کے لئے لفظ " حق " کا استعمال ان کے حق ...... وحقیقت ...... ہونے کی بناء پر ان کے بارے میں خبر ...... صحت ...... کے حوالہ سے ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے لئے لفظ " حق " استعمال کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے: " انهٔ حق " (وہ حق ہے) اسی طرح دیگر حقائق کے لئے کہا جاتا ہے: " انها حقة " (وہ حق ہیں) تو یہ تمام استعمالات ان کے حق و حقیقت ہونے سے خبر کی صحت کے حوالہ سے ہیں۔

بہرحال آیت مبارکہ " نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ " میں " حق " سے مراد وہ ثابت، یقینی، نا قابل انکار، مسلم الثبوت شے ہے جس میں نادرست و غلط ہونے اور ناحق و باطل ہونے کی ہرگز گنجائش نہیں پائی جاتی (الامر الثابت الذی لا یقبل البطلان) یعنی وہ مسلم الثبوت حقیقت کہ جو باطل و نادرستی کو اپنے نزدیک آنے ہی نہیں دیتی،

"بالحق" میں حرف ب مصاحبت (ساتھ ہونے) کے معنی میں ہے، اس بناء پر آیت مبارکہ کا معنی یہ ہوگا:

"نزل علیک الکتاب تنزیلاً یصاحب الحق ولایفارقہ" خدا نے آپ پر کتاب نازل کی، اس طرح سے کہ وہ حق کے ساتھ ہے اور اس سے جدا نہیں ہوگی، دراصل یہ ایک لطیف استعارہ ہے جسے کنایہ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، جس سے مراد اس امر کا بیان ہے کہ یہ قرآن چونکہ حق کے ساتھ ساتھ ہے اور اس کی مصاحبت میں ہے لہٰذا ہر لحاظ سے محفوظ و مامون ہے، اس پر باطل کا سایہ بھی نہیں پڑسکتا اور نہ ہی باطل اس سے آمیزش کی راہ پاسکتا ہے۔

یاد رہے کہ "بالحق" میں حرف ب کے بارے میں دیگر معانی بھی ذکر کئے گئے ہیں لیکن وہ مقرون بہ صحت نہیں۔

"مصدقاً" تصدیق (صدق سے باب تفعیل) سے اسم فاعل کا صیغہ ہے، اس (تصدیق) کا معنی کسی بات کے درست ہونے کا اقرار اور کسی خبر کے بمطابق واقعہ ہونے کا اعتراف کرنا ہے، چنانچہ کہا جاتا ہے: "صدقت مقالاً کذا" (میں نے فلاں بات کی تصدیق کی) یعنی اس کے سچا و درست ہونے کا اقرار کیا اور اس کی صداقت کا اعتراف کیا، "صدقت فلاناً" (میں نے فلاں شخص کی تصدیق کی) یعنی جس چیز کی وہ خبر دیتا ہے اس میں اس کے سچا ہونے کا اعتراف کیا۔

"مَابَيْنَ يَدَيْهِ" سے تورات اور انجیل مراد ہے چنانچہ سورۂ مائدہ میں ارشاد ہوا:

آیت ۴۴ : "اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ......"

(ہم نے تورات کو نازل کیا اس میں ہدایت اور نور ہے......)۔

آیت ۴۶ : "وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ......"

(اور ہم نے اسے (عیسیٰ کو) انجیل دی جس میں ہدایت اور نور ہے......)۔

آیت ۴۸ : "وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ......"

(اور ہم نے آپ پر کتاب نازل کی حق کے ساتھ جو اپنے سے پہلے کتابوں کی تصدیق کرتی ہے......)،

ان آیات مبارکہ کے مجموعی مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ یہود و نصاریٰ کے پاس جو تورات اور انجیل موجود ہے وہ خداوند عالم کی طرف سے نازل ہونے والے احکامات و تعلیمات پر مشتمل ہیں اور خدا نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ پر جن معارف کی وحی کی وہ ان دو کتابوں میں موجود ہیں اگرچہ ان دونوں میں تحریف اور بعض مطالب کو نکال دینے کا عمل بھی ہوا ہے کیونکہ حضرت رسول خدا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے عہد مبارک میں بھی یہی تورات اور چار انجیل یہود و نصاریٰ کے درمیان موجود تھیں اور قرآن مجید انہی کی تصدیق کرتا ہے، لیکن پورے طور پر نہیں بلکہ کچھ حصوں کی، کیونکہ قرآن مجید نے واضح الفاظ میں ان دونوں میں تحریف اور مطالب کے نکال دیئے جانے کا تذکرہ کیا ہے مثلاً سورۂ مائدہ میں ارشاد ہوا:

○ "وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ......" (آیت ۱۲)......

" فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَ جَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ " ....، (آیت ۱۳)

" وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ " ....، (آیت ۱۴) ....،

آیت ۱۲ میں بنی اسرائیل سے عہد و پیمان کا ذکر ہے، آیت ۱۳ میں ان کی طرف سے عہد شکنی اور اس کی سزا (خدا کی لعنت اور دلوں کی سختی) کے بعد ان کی طرف سے تحریف اور جس چیز کے یاد رکھنے کی تاکید کی گئی تھی اس کے بھلا دینے کا تذکرہ ہے، آیت ۱۴ میں نصاریٰ اور ان کی طرف سے تحریف کے عمل کا تذکرہ کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے پختہ عہد و پیمان کے بعد اس چیز کو بھلا دیا جس کے یاد رکھنے کی انہیں تاکید کی گئی تھی ۔ ان آیات شریفہ سے صاف طور پر اس امر سے آگاہی حاصل ہوتی ہے کہ ان دو کتابوں میں تحریف کی بناء پر قرآن مجید ان کی کامل تصدیق نہیں کرتا بلکہ جزوی تصدیق کرتا ہے (علمی زبان میں کامل تصدیق کے لئے " تصدیق بالجملہ " اور جزوی تصدیق کے لئے " تصدیق فی الجملہ " کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں)۔

تورات و انجیل کے نزول کا ذکر

○ " وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۙ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ "

(اور اس نے تورات و انجیل نازل کی اس سے پہلے، لوگوں کے لئے ہادی و رہنما بنا کر)

" تورات " عبرانی زبان کا لفظ ہے جس کا معنی " شریعت " ہے، اور " انجیل " یونانی یا بقولے اصل میں فارسی زبان کا لفظ ہے اس کا معنی بشارت (خوشخبری) ہے، ان دو کتابوں کے بارے میں تفصیلی بحث سورۂ مائدہ آیت ۴۴: (اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّ نُوْرٌ ......) میں ہوگی، انشاء اللہ تعالیٰ۔

قرآن مجید میں جہاں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کتاب کا تذکرہ ہوا ہے وہاں لفظ " انجیل " (مفرد کے صیغہ کے ساتھ) ہی استعمال کیا گیا ہے اور اسے " خداوند عالم کی طرف سے نازل ہونے والی کتاب " سے تعبیر کیا گیا ہے، جبکہ کئی انجیلیں موجود ہیں اور ان میں سے معروف چار انجیلیں تو نزول قرآن کے زمانہ اور اس سے پہلے موجود تھیں، ان چار انجیلوں کی تالیف و تدوین کی نسبت لوقا، مرقس، متی اور یوحنا کی طرف دی جاتی ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ لفظ " اناجیل " (صیغۂ

جمع) کی بجائے" انجیل "(صیغۂ مفرد) ذکر کرنے اور اسے خدا کی طرف سے نازل ہونے والی کتاب کہنے سے ثابت ہوتا ہے کہ کثرت کے ساتھ پائی جانے والی انجیلیں خدا کی طرف سے نازل نہیں ہوئیں بلکہ اس کی طرف سے صرف ایک انجیل نازل ہوئی ہے اور اس میں تحریف وحذف کے ذریعے ہر شخص نے اپنی من پسند ترتیب ومطالب سے اسے مدون کیا ہے لہٰذا ان میں سے ہر ایک کو حقیقی اور خدا کی طرف سے نازل کی جانے والی" انجیل " نہیں کہا جا سکتا۔

بہر حال اس آیۂ مبارکہ میں جو کہ اس سورہ کی ابتدائی آیات میں سے ہے تورات اور انجیل کے تذکرہ سے اس امر کا اشارہ ملتا ہے کہ اس سورۂ مبارکہ میں یہودیوں اور عیسائیوں کے بارے میں مطالب ذکر ہوں گے چنانچہ عنقریب ان کی سرگزشت اور حضرت عیسی علیہ السلام کی ولادت، نبوت اور آسمان پر اٹھائے جانے کا تذکرہ ہوگا۔

فرقان کا نزول

O " وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ "
(اور اس نے فرقان کو نازل کیا)

عربی زبان کی مشہور کتاب" صحاح اللغۃ " میں لفظ" فرقان " کا یہ معنی کیا گیا ہے :
"ما یفرق به بین الحق و الباطل" (جس چیز کے ذریعے حق اور باطل کے درمیان تمیز کی جائے یا جا سکے)،
البتہ اس لفظ کے مادۂ اشتقاق سے ثابت ہوتا ہے کہ دو چیزوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنے والی ہر شے کو فرقان کہا جاتا ہے خواہ وہ دو چیزیں حق اور باطل ہوں یا کچھ اور! جیسا کہ خداوندِ عالم نے ارشاد فرمایا:

سورہ ءانفال، آیت ۴۱ :

O " یَوْمَ الْفُرْقَانِ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ " ---،
(فرقان والے دن، اس دن جب دو گروہ آمنے سامنے ہوئے .....)
(اس دن سے مراد جنگ بدر کا دن ہے۔م)

اسی سورۂ انفال، آیت ۲۹ میں یوں ارشاد ہوا ہے :

O " یَجْعَلْ لَّکُمْ فُرْقَانًا "
(وہ قرار دیتا ہے تمہارے لئے فرقان)......،

یہاں فرقان سے مراد اہلِ ایمان کو تقویٰ کے نتیجہ میں حاصل ہونے والا نورِ بصیرت ہے......،

بہر حال" فرقان "سے یہاں" حق و باطل کے درمیان فرق پیدا کرنے والا" مراد ہے اور چونکہ جو" فرق " خداوندِ عالم کا پسندیدہ و مطلوب ہے اس کی بازگشت ہدایت کی طرف ہے اور وہ حق و باطل کے درمیان پایا جانے والا جامع و وسیع معنی کا حامل فرق ہے جس میں عقائد و معارف اور دنیاوی زندگی میں انسان کے اعمال کے حوالہ سے واجبات و محرمات اور ضروری و غیر ضروری افعال کی تمیز شامل ہے لہٰذا اس آیۂ مبارکہ میں لفظ" فرقان" کا اطلاق دین کے ان تمام اصول و فروع پر ہوگا جو خداوندِ عالم نے بذریعہ وحی اپنے انبیاء پر نازل فرمائے ہیں خواہ کتاب کی صورت میں یا کسی اور انداز میں! چنانچہ خداوند کا ارشادِ گرامی ہے:

سورہ انبیاء، آیت ۴۸:

○ " وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ "

(اور ہم نے موسیٰ اور ہارون کو فرقان دیا)......،

سورۂ بقرہ، آیت ۵۳:

○ " وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ"

(اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب اور فرقان دیا)...... م

سورۂ فرقان، آیت ۱:

○ " تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ۙ "

(برکت والا ہے وہ کہ جس نے اپنے بندے پر فرقان کو نازل کیا تاکہ وہ کائنات کے لئے نذیر (خدا کی معصیت کے انجام سے خبردار کرنے والا) ہو)

(آیت ۴۸ سورۂ انبیاء میں حضرت ہارونؑ کو فرقان عطا کئے جانے کا ذکر ہے جو کہ" کتاب " نہ تھی، اور سورۂ بقرہ آیت ۵۳ میں حضرت موسیٰؑ کو" کتاب "اور" فرقان " دونوں عطا کئے جانے کا تذکرہ ہوا ہے اور سوۂ فرقان آیت ۱ میں" فرقان " سے تمام اصول و فروع اور معارفِ دین مراد ہیں کہ جن کے ذریعے تبلیغ و انذار کا عمل انجام پاتا ہے لہٰذا معلوم ہوا کہ" فرقان " کا اطلاق انبیاء کرام پر وحی کے ذریعے نازل کئے جانے والے تمام امور پر درست ہے خواہ کتاب کی شکل میں ہو یا کسی دوسرے انداز میں ہو۔)

" فرقان" کے اسی جامع و وسیع معنیٰ کو خداوندِ عالم نے" میزان" سے تعبیر کیا ہے چنانچہ ارشاد ہوا:

○ " لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ "

......سورۂ حدید:۲۵......،

(اور ہم نے اپنے پیغمبروں کو واضح نشانیوں کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان کو نازل کیا تا کہ لوگ عدل وانصاف قائم کریں)،

یہ آیت درج ذیل آیہ مبارکہ کی ہم وزن وہم پلہ ہے: سورہ بقرہ، آیت ۲۱۳:

○ " كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ " ......

(تمام لوگ ایک ہی امت تھے، پھر خداوند عالم نے نبیوں کو خوشخبری دینے والے اور انذار کرنے والے بنا کر بھیجا اور ان کے ساتھ برحق کتاب نازل کی تا کہ وہ لوگوں کے درمیان پائے جانے والے اختلافات کا فیصلہ کرے)

اس آیت شریفہ میں " کتاب " کو برحق فیصل قرار دیا گیا ہے جبکہ سورۂ حدید آیت ۲۵ میں " میزان " کو اس عمل کا ذریعہ قرار دیا گیا تھا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس میں معنوی مطابقت وہم آہنگی پائی جاتی ہے اور " میزان " بھی "فرقان" کی طرح اس دین کا نام ہے جو لوگوں میں عدل پر مبنی فیصلہ کرے...... عدل وانصاف کے قیام کی راہ ہموار کرے اور عادلانہ معاشرہ کے قیام کو یقینی بنائے ...... اور اپنے عظیم معارف واحکام کے ذریعے نوع انسانی کو عادلانہ نظامِ زندگی فراہم کرے (واللہ اعلم)

بعض حضرات نے کہا ہے کہ " فرقان " سے مراد " قرآن " ہے،

بعض دانشوروں نے اسے "حق وباطل کے درمیان حدِ فاصل اور ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے والا، تمیز دینے والا" امر قرار دیا ہے

،بعض اہلِ دانش نے اس سے حضرت پیغمبر اسلامؐ کی طرف سے نصاریٰ کے ساتھ حضرت عیسیٰ بن مریمؑ کی بابت بحث میں پیش کی جانے والی ٹھوس دلیل مراد لیا ہے،

بعض حضرات نے اس سے " نصر" (نصرت ومدد) اور بعض نے "عقل" مراد لی ہے،

بہرحال ہم نے اس کی بابت حقیقت امر کی وضاحت کردی ہے......اس کی روشنی میں اس کے حقیقی معنی ومفہوم سے آگاہی حاصل کرنا ممکن ہے......،

آیات الٰہی کے منکرین کا انجام

○ " اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ لَھُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ ؕ وَاللّٰہُ عَزِیْزٌ ذُو انْتِقَامٍ "
(جن لوگوں نے اللہ کی آیتوں کا انکار کیا ان کے لئے سخت عذاب ہے اور اللہ غالب، سخت انتقام والا ہے)

" انتقام " کا معنی " غلطی و جرم کرنے والے کو ارتکاب جرم پر دی جانے والی سزا " کیا گیا ہے۔ بنابرایں اس سے عام طور پر مراد لیا جانے والا معنی " بدلہ " ہرگز مقصود نہیں کہ جو اپنی تشفی قلب کے لئے لیا جاتا ہے کیونکہ ہمارے درمیان انتقام کا معنی (بدلہ) دراصل غلطی کرنے والے کو اس تکلیف و نقصان پر سخت ترین سزا دے کر اپنے دل کو مطمئن کرنے سے عبارت ہے جو وہ کسی کو پہنچاتا ہے، یعنی جب کوئی شخص کسی کو زبانی یا عملی طور پر تکلیف یا نقصان پہنچائے تو متاثرہ شخص اس کی تلافی اس طرح کرتا ہے کہ اس سے بدلہ لیتے ہوئے اسے اس سے زیادہ تکلیف و نقصان یا سزا دے کر اپنے دل کو سکون پہنچاتا ہے۔ انتقام کا یہ معنی خداوندِ عالم کی بابت ہرگز درست نہیں کیونکہ اس کی ذات بندوں کی طرف سے پہنچنے والے نفع یا نقصان اور ان کے اعمال کے منفی اثرات سے متاثر ہونے سے پاک و بالاتر ہے، نہ تو اسے بندوں کے اعمال سے کوئی نفع حاصل ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی تکلیف و نقصان پہنچتا ہے لیکن اس نے بندوں سے وعدہ کیا ہے...... اور اسی کا وعدہ حق ہے...... کہ وہ اپنے بندوں کے درمیان بہت جلد حق کے ساتھ فیصلہ کرے گا، نیکی کی جزا اور برائی کی سزا دے گا، چنانچہ ارشاد ہوا:

سورۂ مومن، آیت: ۲۰

○ " وَاللّٰہُ یَقْضِیْ بِالْحَقِّ ؕ "
(اور اللہ حق کے ساتھ فیصلہ کرے گا)

سورۂ نجم، آیت: ۳۱

○ " لِیَجْزِیَ الَّذِیْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَ یَجْزِیَ الَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰی "
(تاکہ بدکاروں کو ان کے برے اعمال کی سزا دے اور نیک اعمال بجالانے والوں کو اچھی جزا عطا کرے)

ایسا کیوں نہ ہو جبکہ وہ عزیز و غالب علی الاطلاق ہے وہ گستاخ بندوں کی گرفت اور روک تھام پر قادر ہے، جیسا کہ کہا گیا ہے کہ لفظ " عزت " کا اصل معنی امتناع اور روک تھام کرنا اور روکنا ہے، " عزیز علی الاطلاق " سے مراد یہ ہے کہ وہ ہر لحاظ سے اور کسی محدودیت کے بغیر غلبہ و طاقت رکھتا ہے۔

بنابرایں آیۂ مبارکہ " اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ لَھُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ " کہ جس میں " عذاب " کو کسی

خاص وقت و حالت کے ساتھ مقید کر کے ذکر نہیں کیا گیا بلکہ آخرت یا قیامت کے دن جیسے الفاظ سے خالی صرف ''عذاب شدید'' کہا گیا ہے یعنی کافر جس طرح آخرت میں عذاب سے دوچار ہوں گے اسی طرح دنیا میں بھی خدا کا عذاب ان کو اپنی لپیٹ میں لے گا۔

بہر حال یہ مسئلہ ان قرآنی حقائق میں سے ایک ہے جسے آیاتِ قرآنیہ میں بحث کرنے والے مفسرین و مفکرین نے اہمیت کی نگاہ سے نہیں دیکھا اور اس کے معنی و مفہوم کی وسعت پر توجہ نہیں دی، شاید اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہ ہو کہ عام طور پر ہم ''عذاب'' سے وہی کچھ مراد لیتے ہیں جس میں جسمانی تکلیف یا مالی نقصان وغیرہ ہو، اسی بناء پر مال و دولت کا ضائع ہو جانا (مال کی کمی یا محرومی)، اپنوں اور عزیزوں کی موت، شدید جسمانی بیماریوں وغیرہ ہی کو عذاب سمجھتے ہیں جبکہ قرآنی تعلیمات میں ان تمام امور سے ماوراء امر کو عذاب سے تعبیر کیا گیا ہے،

''عذاب'' کا معنٰی، قرآنی نقطۂ نظر سے!

قرآن مجید خدا کی یاد سے خالی زندگی کو ''تنگی کی حامل'' قرار دیتا ہے خواہ وہ ہماری نظروں میں جس قدر وسعت کی حامل کیوں نہ ہو، چنانچہ ارشاد ہوا:

سورۂ طٰہٰ، آیت: ۱۲۴

○ ''وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْكًا''

(جو شخص میری یاد سے روگردانی کرے اس کی زندگی تنگ ہو گی)

اسی طرح اموال اور اولاد کو ''عذاب'' قرار دیتا ہے جبکہ ہم ان کو عظیم نعمت سمجھتے ہیں، چنانچہ ارشاد ہوا:

سورۂ توبہ، آیت: ۸۵

○ ''وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَاَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ اَنْ یُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِی الدُّنْیَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۸۵﴾''

(ان کے اموال اور اولاد سے آپ تعجب کا شکار نہ ہوں، خدا چاہتا ہے کہ انہیں انہی کی وجہ سے دنیا میں عذاب کرے اور کفر کی حالت ہی میں ان کی روحیں قبض کرے)

حقیقت امر...... جیسا کہ اسی سورۂ مبارکہ (بقرہ) کی آیت ۳۵ ''وَ قُلْنَا یٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ

اَلْجَنَّةَ......" کی تفسیر میں اجمالی طور پر بیان ہو چکا ہے..... یہ ہے کہ :

ا۔ ہر انسان کی خوشی، غم، فرح وسرور، حزن واندوہ، رغبت ودلچسپی، بے رغبتی وبے اعتنائی، رنج وعذاب میں مبتلا ہونا اور نعمتوں سے لطف اندوز ہونا، ان سب کا دارومدار اس کے اپنے فکری رجحان کے مطابق سعادت وشقاوت کے طے شدہ مخصوص معیاروں پر ہے،

۲۔ نعمت، عذاب اور ان سے قریب المعنی امور میں سے ہر ایک اپنی مخصوص نسبت کی بناء پر مستقل معنی رکھتا ہے یعنی جس چیز کی طرف اس کی نسبت ہوتی ہے اس کے حوالہ سے اس کا مخصوص معنی متعین ہو جاتا ہے، بنابرایں "روح" کی سعادت وشقاوت اسی سے مخصوص معنی رکھتی ہے اور "جسم" کی سعادت وشقاوت اس سے نسبت ومناسبت کے حوالہ سے مخصوص معانی کی حامل ہیں، اسی طرح "حیوان" کی سعادت وشقاوت اس سے انتساب کی بنیاد پر اور "انسان" کی سعادت وشقاوت اس سے نسبت کے حوالہ سے اپنے اپنے مخصوص معانی رکھتی ہیں۔

ان دونکات کے تناظر میں یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ جو انسان اپنے آپ کو اخلاق الٰہیہ سے آراستہ نہ کرے اور آداب خداوندی نہ اپنائے (اپنے آپ کو خدا سے وابستہ نہ کرے) وہ ہمیشہ مادی سعادت ہی کو حقیقی اور اصل سعادت سمجھتا ہے وہ روحانی سعادت کو ہرگز خاطر میں نہیں لاتا اور نہ ہی اسے اہمیت وتوجہ کی نظر سے دیکھتا ہے، طمع وحرص کے کیچڑ میں لت پت ہو کر مال، اولاد، جاہ وجلال اور اقتدار کے حصول میں اپنی تمام تر توانائیاں صرف کر دیتا ہے، بظاہر وہ انہی چیزوں کے حاصل کرنے کے درپے ہوتا ہے لیکن حقیقت میں اس کی توجہ اسی موہوم نعمت سے لطف اندوز وبہرہ ور ہونے پر مرکوز ہوتی ہے جو اس کی لوح خیال میں ثبت ہو کر اس کے ارادہ وچاہت کو مغلوب کر چکی ہوتی ہے۔ اور جب وہ اسی خیالی نعمت کو پالیتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ایک لذت ہزاروں غموں اور دکھوں کو اپنے ساتھ لئے ہوئے ہے (وہ جسے اپنے تئیں "نعمت" سمجھتا تھا اور اس سے لطف اندوز ہونے کے خواب دیکھتا تھا وہ اس کے لئے عذاب ہے) جب تک وہ "نعمت" اسے حاصل نہ تھی تو وہ اس کے حصول کو اپنی سب سے بڑی تمنا وآرزو قرار دیتا تھا اور جب اسے پالیتا ہے تو اس کے خوابوں کا شیش محل ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے اور وہ حاصل شدہ نعمت سے سوائے رنج وزحمت کے کچھ حاصل نہیں کرتا بلکہ محرومی ورسوائی کے سایے اس پر چھا جاتے ہیں اور وہ ان اسباب کے سامنے شرمندہ ہو جاتا ہے جن کے سہارے اس نے اپنی قوتیں وکاوشیں بروئے کار لائی تھیں (اسے ناامیدی ویاس کے سوا کچھ نہیں ملتا)، ایسا کیوں نہ ہو؟ کیونکہ وہ قلبی طور پر اس مرکز فیض سے وابستہ ہی نہ تھا جو سکون، اطمینان اور حقیقی راحت وآرام کا سرچشمہ ہے بلکہ وہ فناپذیر مادی لذتوں سے لطف اندوز ہونے کے دھوکہ میں آکر روحانی نعمتوں سے بہرہ ور ہونے سے محروم ہو گیا، وہ اپنی حاصلہ نعمت کے گھنے جنگل میں سرگرداں ہو گیا، اسے اپنا مطلوب نہ مل سکا اور وہ حسرت وغم کی وحشت ناک وادی میں گم ہو گیا، جو ملا وہ مطلوب نہ تھا اور جس سے محرومی ہوئی اس کی حسرت دل میں باقی

رہی، تو یہ ہے مادی لذتوں کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا کر موہوم وخیالی نعمتوں سے بہرہ مند ولطف اندوز ہونے کا نتیجہ، کہ اس نے اپنی پائی ہوئی نعمت سے سوائے رنج وغم کے کچھ نہ پایا اور کھوئی ہوئی نعمت پر حسرت وافسوس کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔

لیکن قرآن مجید، انسان کو دو چیزوں کا مجموعہ مرکب قرار دیتا ہے: ایک ہمیشہ باقی رہنے والے روح اور دوسرا بدلتا رہنے والا تغیر پذیر مادی بدن، انسان انہی دو وجودی عناصر کے ساتھ اپنے پروردگار کے پاس لوٹ جانے تک اسی حالت و صورت میں باقی رہتا ہے اور جب وہ خدا کی طرف لوٹ جاتا ہے تو اس کے تغیر وزوال پذیری کا دور ختم ہو جاتا ہے پھر وہ کامل "ہمیشگی" پالیتا ہے کہ جس میں کوئی تبدیلی نہ ہو گی، بنابراین جس چیز میں صرف روح کی سعادت پائی جاتی ہے جیسے علم ودانش وغیرہ تو وہ انسانی سعادت کا حصہ ہے، اسی طرح جو چیز جسم اور روح دونوں کی سعادت کا موجب ہو سکتی ہو مثلاً مال واولاد وغیرہ بشرطیکہ وہ ذکر الٰہی سے مانع نہ ہونے پائیں اور ہمیشہ کی پستی کا موجب نہ بنیں تو وہ بھی انسان کے لئے سعادت ہے۔ اور وہ کس قدر عمدہ سعادت ہے۔ اسی طرح جو چیز بدن کی تکلیف وسختی اور جسمانی محرومی کا سبب ہو جبکہ اس میں روح کی سعادت پائی جائے مثلاً خدا کی راہ میں مارا جانا اور خدا کی خوشنودی کے لئے مال خرچ کر دینا...... کہ جس سے مال میں بظاہر کمی آجاتی ہے...... تو یہ بھی انسان کی سعادت کا حصہ ہے کہ اس طرح کی کیفیت دراصل ایسے ہے جیسے دوا کی لحہ بھر تلخی کو سہہ کر طولانی مدت کی صحت وتندرستی کو یقینی بنایا جاتا ہے، یہ سب کچھ قرآنی نقطۂ نظر میں انسان کے لئے "سعادت" اور "نعمت" قرار دیا گیا ہے، اس کے علاوہ وہ چیز جس میں انسان کی جسمانی سعادت اور روح کی شقاوت ہو ہو...... حقیقت میں...... اس کے لئے شقاوت اور عذاب ہے اور قرآن صرف جسمانی سعادت کو نہایت معمولی وناچیز اور ناقابل توجہ شے قرار دیتا ہے، چنانچہ ارشاد حق تعالیٰ ہے:

سورۂ آل عمران، آیات: ۱۹۶، ۱۹۷

○ "لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ ﴿١٩٦﴾ مَتَاعٌ قَلِيلٌ ثُمَّ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿١٩٧﴾"

(کافروں کا شہر میں گھومنا پھرنا...... مادی زندگی سے لطف اندوز ہونا...... آپ کو غمگین نہ کرے کیونکہ یہ سب کچھ نہایت معمولی وناچیز متاع ہے پھر ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے)

اور جو چیز جسم اور روح دونوں کی شقاوت کا باعث ہے تو جس طرح قرآن اسے انسان کے لئے شقاوت وبدبختی (مضرت ونقصان) قرار دیتا ہے اسی طرح افراد بشر بھی اسے اپنے لئے شقاوت سمجھتے ہیں، لیکن دونوں کے معیاروں اور نقطۂ نظر میں فرق ہے، کیونکہ قرآن ہر اس چیز کو عذاب قرار دیتا ہے جس میں روح کی شقاوت پائی جائے جبکہ لوگ صرف جسم کی شقاوت کو عذاب سمجھتے ہیں، اس کی مثال سابقہ امتوں پر نازل ہونے والے گوناگوں عذاب سے واضح ہو جاتی ہے، ارشاد

خداوندی ہے:

سورۂ فجر، آیات: ۶ تا ۱۴:

○ "اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۝ الَّتِىْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِى الْبِلَادِ ۝ وَ ثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ۝ وَ فِرْعَوْنَ ذِى الْاَوْتَادِ ۝ الَّذِيْنَ طَغَوْا فِى الْبِلَادِ ۝ فَاَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ ۝ فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ۝ اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ۝"

(کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے رب نے قوم عاد کے ساتھ کیا سلوک کیا، ۝ شہر ارم کے ساتھ کہ عالیشان بلند ستونوں والا ہے؟ ۝ ایسی بلند عمارتیں شہر میں اس سے پہلے نہیں بنائی گئیں ۝ اور قوم ثمود کے ساتھ! کہ جو دروں میں بڑے بڑے پتھر کاٹتے تھے ۝ اور فرعون کے ساتھ! کہ جو نہایت طاقتور تھا ۝ انہوں نے شہر میں طغیان وسرکشی کا بازار گرم کر دیا ۝ اور ان میں سے کثرت کے ساتھ فساد پھیلایا ۝ چنانچہ تیرے پروردگار نے انہیں عذاب کا تازیانہ لگایا ۝ یقیناً تیرا رب کمین میں ہے ۝)

ذی شعور مخلوق کی سعادت وشقاوت، شعور وادراک سے وابستہ ہے یہی وجہ ہے کہ جو لذیذ چیز ہمیں حاصل ہو اگر ہم اس کی لذت محسوس نہ کریں تو اسے اپنے لئے لذت آمیز نہیں سمجھتے، اسی طرح اگر درد وغم انگیز شے کا ادراک نہ کریں تو اسے اپنے لئے شقاوت نہیں سمجھتے، اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ سعادت اور شقاوت کی بابت قرآنی معیار، مادی معیار و مسلک سے قطعی مختلف ہے، بنا برایں جو شخص مادی لذتوں میں غرق ہو اسے حقیقی سعادت وشقاوت کہ جن کے معیاروں کی پہچان قرآن نے کروائی ہے کے ادراک کے لئے قرآن ہی کے بتائے ہوئے راہ وروشِ زندگی کے فکری وعملی اصولوں کو اپنانا ہوگا اور قرآن نے اپنے شائستہ افراد کو ان اصولوں سے آگاہی دلاتے ہوئے واضح کیا ہے کہ: وہ اپنے دلوں کو غیر خدا سے ہرگز وابستہ نہ کریں، خداوند عالم ہی کو اپنا حقیقی اور ہر چیز کا مالک سمجھیں کہ اس کے سوا کوئی چیز استقلال نہیں رکھتی بلکہ ہر شے اسی سے رزقِ استقلال پاتی ہے، اور ہر چیز کو صرف اسی کے لئے چاہیں ... کسی چیز کو اس کی رضا وخوشنودی کے حصول کی غرض کے سوا اپنا مقصد ومقصود قرار نہ دیں بلکہ ہر چیز میں حقیقی مقصد خدا ہونا چاہیے، جو شخص تربیت کے اس قرآنی اصول کو اپنائے وہ دنیاوی زندگی میں اپنے لئے سعادت کے سوا کوئی چیز خاطر میں نہیں لاتا، اس کی سعادت دو طرح کی ہوتی ہے: (۱) روح اور جسم دونوں کی سعادت، (۲) صرف روح کی سعادت، اس کے علاوہ وہ کسی چیز کو اپنے لئے سعادت نہیں سمجھتا بلکہ ان دونوں قسموں کے علاوہ ہر چیز کو اپنے لئے عذاب وشقاوت سمجھتا ہے، لیکن جو شخص نفسانی خواہشوں کی زنجیروں میں جکڑا ہوا اور دنیا کی مادی لذتوں کا اسیر ہو چکا ہو وہ اگرچہ اپنے تئیں دنیاوی زینت کی ہر اس چیز کو اپنے لئے سعادت، خیر اور لذت سمجھتا ہے جو

اسے حاصل ہو جائے لیکن بہت جلد حقیقت کے چہرے پر پڑا ہوا مجازی پردہ اٹھ جائے گا اور وہ اپنی غلطی و غلط فہمی اور کجروی سے آگاہ ہو جائے گا اور جس چیز کو اپنے لئے سعادت گمان کرتا تھا وہی اس کے لئے شقاوت بن جائے گی، خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے:

سورۂ معارج، آیت ۴۲:

○ "فَذَرْهُمْ يَخُوضُوا وَيَلْعَبُوا حَتّٰى يُلٰقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي يُوعَدُونَ"

(انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو کہ وہ...... اپنے کفر و باطل کی تاریکی میں...... گرے پڑے رہیں اور لہو ولعب میں مصروف و سرگرم رہیں یہاں تک کہ وہ دن ان پر آ جائے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے)

سورۂ ق، آیت ۲۲:

○ "لَقَدْ كُنْتَ فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ ﴿۲۲﴾"

(اور تو اس امر سے غفلت میں تھا پھر ہم نے تیرے سامنے سے پردہ ہٹا دیا تو آج تیری نظر بہت تیز ہے)

سورۂ نجم، آیات ۲۹، ۳۰:

○ "فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿۲۹﴾ ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ"

(جو شخص ہمارے ذکر سے منہ موڑ لے اس سے رخ پھیر لو اور وہ دنیاوی زندگی کے سوا کچھ نہیں چاہتا، یہ ان کے علم کی آخری حد ہے)

تو اس طرح کے افراد خالص و سالم لطف ولذت سے بہرہ ور نہیں ہوتے بلکہ ان کی ہر خوشی غم والم سے بھری ہوئی ہوتی ہے اور دکھوں کو اپنے ساتھ لئے ہوتی ہے،

اس بیان سے واضح و ظاہر ہوتا ہے کہ جو فکر و ادراک خدا والوں اور خاصانِ قرآن کو حاصل ہوتا ہے وہ دوسروں کو حاصل فکر و ادراک سے قطعی مختلف ہے جبکہ وہ سب ایک ہی وجودی نوع یعنی انسان ہی سے تعلق رکھتے ہیں (سب کے سب انسان ہیں اور اس وجودی نوع کے حوالہ سے برابر ہیں) اور ان دونوں گروہوں (اہل خدا و خاصان قرآن اور خدا و قرآن سے دور افراد) کے درمیان متوسط درجات کے حامل اہل ایمان ہیں کہ جو خدا کی راہ پر ہونے کے باوجود خدائی تعلیم و تربیت کے کمالی درجہ پر فائز نہیں ہوئے۔

یہ ہے "عذاب" کا معنی و مفہوم اور اصل و اساس کا قرآنی نقطۂ نظر! اس کے باوجود کلامِ الٰہی میں جسم کی شقاوت (جسمانی تکلیف و اذیت) کو بھی "عذاب" سے تعبیر کیا گیا ہے البتہ اسے صرف جسم تک محدود قرار دیا گیا ہے وہ روح تک نہیں پہنچتا، چنانچہ سورۂ ص آیت ۴۱ میں حضرت ایوبؑ کا قول مذکور ہے:

O " اِذْ نَادٰی رَبَّهٗۤ اَنِّیۡ مَسَّنِیَ الشَّیۡطٰنُ بِنُصۡبٍ وَّ عَذَابٍ"

(جب اس نے اپنے پروردگار کو پکارا کہ خدایا! مجھے شیطان نے سخت تکلیف اور عذاب سے دوچار کر دیا ہے)

اسی طرح سورۂ اعراف، آیت ۱۴۱ میں خداوندِ عالم نے فرمایا:

O " وَ اِذۡ اَنۡجَیۡنٰکُمۡ مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ یَسُوۡمُوۡنَکُمۡ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ ۚ یُقَتِّلُوۡنَ اَبۡنَآءَکُمۡ وَ یَسۡتَحۡیُوۡنَ نِسَآءَکُمۡ ؕ وَ فِیۡ ذٰلِکُمۡ بَلَآءٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ عَظِیۡمٌ ۝"

(اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے تمہیں آل فرعون سے نجات دلائی، وہ تمہیں سخت و برے عذاب کا نشانہ بناتے تھے، تمہارے بیٹوں کو قتل کرتے تھے اور تمہاری بیٹیوں کو خدمت گزاری کے لئے زندہ رکھتے تھے، اور اس میں تمہارے لئے تمہارے پروردگار کی طرف سے بہت بڑی آزمائش تھی)

اس آیت میں خداوند عالم نے فرعونیوں کی طرف سے بنی اسرائیل پر ڈھائے جانے والے مظالم کو اپنی طرف سے ان کی آزمائش و امتحان قرار دیا اور ان (فرعونیوں) کے حوالہ سے اسے "عذاب" سے تعبیر کیا، یعنی اسے اپنی طرف سے عذاب قرار نہیں دیا بلکہ فرعونیوں کی طرف سے عذاب اور اپنی طرف سے اسے بنی اسرائیل کی آزمائش کا نام دیا ہے۔

خدا سے کچھ پوشیدہ نہیں

O " اِنَّ اللّٰهَ لَا یَخۡفٰی عَلَیۡهِ شَیۡءٌ فِی الۡاَرۡضِ وَ لَا فِی السَّمَآءِ ....."

(بیشک اللہ پر کوئی چیز جو زمین میں ہے مخفی نہیں اور نہ ہی جو آسمان میں ہے)

خداوندِ عالم نے آیات الٰہی کا انکار کرنے والوں کے عذاب کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے "ذُوانۡتِقَامٍ" (سخت گرفت والا) ہونے کو بیان فرمایا تاکہ ان پر عذاب کا سبب واضح ہو جائے، لیکن حقیقت الامر کی مزید و تکمیلی وضاحت کے لئے خداوند عالم نے اپنے بیان میں اضافہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ "زمین و آسمان میں کوئی چیز خدا سے پوشیدہ نہیں"، تاکہ کسی کے دل میں یہ خیال نہ آنے پائے کہ شاید کسی شخص کا کفر خدا سے پوشیدہ رہے اور خدا اس پر عذاب و انتقام کا اقدام نہ کرے، تو اس اضافہ سے خداوند عالم نے واضح کر دیا کہ وہ غلبہ و طاقت والا ہے کوئی چیز اس سے مخفی و پوشیدہ نہیں خواہ وہ زمین میں ہو کہ ظاہری حواس جس کا ادراک کر سکتے ہیں یا آسمان میں ہو کہ جو ظاہری حواس کی دسترس سے باہر ہے، سب کچھ خدا کے سامنے ہے، ذرہ بھر اس سے مخفی نہیں۔

عین ممکن ہے کہ "مما فی الارض" (جوکہ زمین میں ہے) سے ظاہری اعضاء و جوارح سے انجام دیئے جانے والے اعمال اور "مما فی السمآء" (جو کچھ آسمان میں ہے) سے دلوں میں چھپی ہوئی باتیں مراد ہوں جیسا کہ اس مطلب اور ممکنہ معنی کا ذکر ہم نے سورۂ بقرہ کی آیت ۲۸۴ کی تفسیر میں کیا ہے جس میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

○ " لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ۗ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ"

(جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین مں ہے سب خدا کا ہے (اس کی ملکیت ہے) اور اگر تم اپنے دلوں کی باتوں کو ظاہر کرو یا چھپاؤ خدا تم سے اس کا حساب لے گا ... تمہارا محاسبہ کرے گا ...)

رحموں میں تصویر کشی

○ " هُوَ الَّذِیْ یُصَوِّرُكُمْ فِی الْاَرْحَامِ كَیْفَ یَشَآءُ"

(وہ کہ جو رحموں میں جیسا چاہتا ہے تمہاری تصویریں بناتا ہے)

کسی چیز کو مخصوص شکل و صورت دینے کو "تصویر" کہتے ہیں، لفظ "صورت" میں سایہ دار جیسے مجسمہ وغیرہ اور غیر سایہ دار تمام اشیاء شامل ہیں،

"ارحام"، رحم کی جمع کا صیغہ ہے اس سے مراد بچہ دانی ہے (عورت کے جسم میں وہ مقام جہاں بچہ ٹھہرتا اور نشو و نما پاتا ہے)

یہ آیت مبارکہ، سابقہ دو آیتوں کی نسبت تکاملی بیان کی حیثیت رکھتی ہے اور جو مطالب ان آیتوں میں بیان کئے گئے ہیں ان سے بالاتر امور کا تذکرہ اس آیت مبارکہ میں ہوا ہے، سابقہ دو آیتوں میں مذکور مطالب کا خلاصہ یہ ہے:

"خداوند عالم ان لوگوں پر عذاب نازل کرتا ہے جو اس کی آیات کا انکار کرتے ہیں کیونکہ وہ غلبہ و طاقت والا، انتقام و سخت گرفت و سزا دینے والا اور مخفی و ظاہر سے آگاہی رکھنے والا ہے، کوئی اس پر غلبہ نہیں پا سکتا بلکہ وہی سب پر غالب ہے"،

اور زیر نظر آیت مبارکہ میں جن مطالب کا بیان مقصود ہے ان کا خلاصہ یہ ہے کہ:

بات اس سے بھی زیادہ بڑی ہے اور وہ یہ کہ: جو شخص خدا کی آیات کا انکار کرے اور اس کے حکم کی نافرمانی کرے

اسے اپنے بارے میں استقلال کا حامل ہونے کی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہی خدا سے بے نیاز، اپنی قدرتمندی کا گمان کر کے یہ سوچنا چاہیے کہ وہ امر الٰہی پر غلبہ پا سکتا ہے اور خداوندِ عالم کے قائم کردہ نہایت خوبصورت بنیادوں پر استوار نظامِ خلقت کو درہم برہم کر سکتا ہے کہ جس کے نتیجہ میں اس کا ارادہ خدا کے ارادہ پر چھا جائے گا، (ایسا ہرگز درست نہیں) بلکہ ہر حال میں اسے یہ باور رکھنا چاہیے کہ اس کا وجود اور وجودی قوتوں کے استعمال کی قوت و اختیار خدا کی عطا کردہ نعمتیں ہیں، کوئی چیز خدا کے اذن کے بغیر وجود میں نہیں آ سکتی اور اس نے نظامِ خلقت کو اس طرح ترتیب دیا ہے کہ اس میں انسان ہی کے اختیار کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اور اسی امتیازی صفت کے ساتھ وہ اپنی زندگی کی راہ روش کے اصولوں کا تعین کرتے ہوئے اپنے لئے ایمان و اطاعتِ الٰہی یا کفر و معصیت کا راستہ اختیار کرتا ہے، انسان کو اس طرح کی قوتِ اختیار عطا کرنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ اس کی آزمائش و امتحان کا سلسلہ درست بنیادوں پر قائم ہو تا کہ ہر شخص ایمان لانے اور کفر اختیار کرنے میں سے جس چیز کو پسند کرے اسے اپنا لے لیکن اسے معلوم ہونا چاہیے کہ ہر شخص کا ارادہ و مشیت خداوندِ عالم کہ جو پوری کائنات کا پروردگار ہے کے ارادہ و مشیت سے وابستگی کے بغیر کوئی وجودی حیثیت و اعتبار نہیں رکھتا، (**فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر، وما یشاؤون الا ان یشاء اللہ رب العالمین**)

بنا برایں ایمان و کفر سمیت عالمِ ہستی کی تمام موجودات کا تعلق تقدیر سے ہے، تقدیر سے مراد وہ نظم و نظام ہے جو خداوندِ عالم نے اشیاء و موجوداتِ عالم کے لئے اس طرح قائم کیا ہے کہ ہر چیز اس کی بناء پر آسانی کے ساتھ اپنے مقصدِ حیات کو پانے کے لئے اپنی وجودی توانائی کے مطابق راہ و روش و طرزِ عمل کا انتخاب کر سکے اور خداوندِ عالم نے اپنی قدرتِ کاملہ سے ہر چیز کو اس کی وجودی حیثیت کے مناسب و موزوں صورت عطا فرمائی ہے تا کہ اس کی وجودی توانائیاں نتیجہ خیز ثابت ہوں، تو خداوندِ عالم ہی ہر حال میں غالب اور اپنے ارادہ و مشیت میں قاہر و طاقتور اور اپنی مخلوق پر کامل اختیار رکھنے والا ہے، لیکن انسان اس زعمِ باطل کا شکار رہتا ہے کہ اسے اپنے ارادہ و مشیت میں کامل استقلال حاصل ہے اور اس کا ہر فعل و عمل صرف اس کے اپنے ارادہ و مشیت پر مبنی ہے لہٰذا وہ اپنے کامل استقلال کے ساتھ نظامِ ہستی کے اس جاری سلسلہ کا راستہ روک سکتا ہے جو خدا نے کائنات کے وجودی تسلسل کے لئے قائم کیا ہوا ہے اور اس طرح اسے تقدیرِ الٰہی پر سبقت حاصل ہو جائے گی، یہ اس کی غلط فہمی اور خام خیالی ہے کیونکہ اس کی وجودی قوتوں کے استعمال کے استقلالی اختیار کا تعلق بھی تقدیرِ خداوندی سے ہے کہ اگر خدا اسے اپنی وجودی قوتوں کے استعمال کا اختیار عطا نہ فرماتا تو اسے ہرگز ان سے استفادہ کرنے کی راہ نہ ملتی، یہی ہے آیۂ مبارکہ: "یُصَوِّرُکُمْ فِی الْاَرْحَامِ کَیْفَ یَشَآءُ" کا معنی و مراد، یعنی وہ تمہارے وجود کے اجزاء کو ابتداء ہی سے ایسے نظم و نظام کے ساتھ مرتب کرتا ہے جس کا سلسلہ مشیتِ الٰہی سے وابستہ و پیوستہ ہے لیکن وہ خدا کے حتمی فیصلہ پر مبنی نہیں بلکہ اس کے ن سے مربوط اور اس پر موقوف ہے۔

تقدیر کے حوالہ سے ایک اہم نکتہ

اس آیۂ مبارکہ میں ایک اہم نکتہ مورد توجہ ہے کہ اس میں "تقدیر" کے جس جاری سلسلہ کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ صرف انسان سے تعلق رکھتا ہے پورے عالم ہستی میں جاری سلسلۂ تقدیر سے نہیں، اس کی دو وجوہات ممکن ہے :

ایک یہ کہ یہاں کافروں سے انتقام کی بات ہو رہی ہے لہٰذا سلسلۂ کلام اس امر کا متقاضی ہے کہ انسان کی تقدیر کا ذکر کیا جائے تا کہ بحث و گفتگو میں ربط باقی رہے، اور الفاظ و معانی اور عبارت و مقصود کے درمیان مطابقت قائم رہے،

دوسری وجہ یہ کہ اس سورۂ مبارکہ کی ابتدائی آیات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں نصاریٰ کے عقیدہ کا تذکرہ ہوا ہے لہٰذا یہاں انسان کی تقدیر کا ذکر کر کے اسے سلسلۂ بحث سے مربوط کر دیا گیا تا کہ نتیجتاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں حقیقت الامر واضح ہو جائے اور ان کا "مخلوق" ہونا معلوم ہو جائے کیونکہ نصاریٰ بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ان کے رحم مادر میں نشو ونما پانے کے مراحل طے کرنے سے انکار نہیں کرتے اور نہ ہی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے وجودی تکوینی امور کو خود انجام دیا،

ایک علمی نکتہ

اس آیت مبارکہ میں ایک اور علمی نکتہ قابل توجہ ہے، اور وہ یہ کہ اس میں "نَزَّلَ عَلَيْكَ" کے بعد "يُصَوِّرُكُمْ" کہا گیا ہے، "نَزَّلَ عَلَيْكَ" میں "کَ" کا مخاطب حضرت پیغمبر اسلامؐ ہیں اور "يُصَوِّرُكُمْ" میں "کُمْ" کا مخاطب تمام افرادِ بشر ہیں، اسے علمی اصطلاح میں "تعميم بعد التخصيص" کہا جاتا ہے (خاص کے ذکر کے بعد عام کا ذکر کرنا)، یہاں ایسا کرنے میں دراصل اس امر کا بیان مقصود ہے کہ مؤمنین کا ایمان بھی کافروں کے کفر کی طرح تقدیر خداوندی کے دائرہ سے باہر نہیں، تا کہ مؤمنین اپنے بارے میں خدا کی خاص عنایت و رحمت کے استحقاق پر قلبی مسرت پائیں اور تقدیر کے حسنِ انتخاب پر خوش ہوں، اسی طرح کافروں کے بارے میں ان کے کفر کی وجہ سے خدائی انتقام کا نشانہ بننے کی خبر سن کر انہیں (مؤمنین کو) اطمینانِ خاطر حاصل ہو،

یکتا، غالب و دانا معبود

O "لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ"
(کوئی معبود نہیں سوائے اس کے، وہ غالب، حکیم و دانا ہے)

اس جملہ میں اس موضوع کی یاددہانی مقصود ہے جس کا ذکر اس سورۂ مبارکہ کی ابتدائی آیات کے آغاز میں ہوا ہے یعنی توحید، گویا یہاں تاکید کی غرض سے دلیل کا خلاصہ ذکر کر دیا گیا ہے تاکہ تمام امور کی بھرپور وضاحت ہو سکے اور اس حقیقت سے آگاہی دلائی جا سکے کہ یہ تمام امور یعنی لوگوں کی تخلیق کے بعد ان کی ہدایت و رہنمائی کا سلسلہ قائم کرنا، کتاب اور فرقان نازل کرنا اور کافروں کو کیفر کردار تک پہنچانے سے عالم ہستی کے جاری نظام کی مستحکم تدبیر کا اہتمام کرنا وغیرہ ایسے امور ہیں جو ایک ہی خدائے مدبر سے تعلق رکھتے ہیں اور چونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی برحق معبود نہیں لہٰذا ثابت ہوا کہ وہی ہے جو لوگوں کو پیدا کرنے کے بعد ان کی ہدایت کرتا ہے، وہی ہے جو کتاب و فرقان نازل کرتا ہے، وہی ہے جو اپنی آیات کا انکار کرنے والوں کو عذاب کرتا ہے اور یہ سب کچھ یعنی ہدایت، کتاب و فرقان کا نازل کرنا، انتقام و تقدیر کے امور اس کی حکمت و عزت کے عملی آثار ہیں۔

روایات پر ایک نظر

تاریخ کے اوراق سے!

تفسیر "مجمع البیان" میں کلبی، محمد بن اسحاق اور ربیع بن انس سے روایت کی گئی ہے کہ اس سورۂ مبارکہ (آل عمران) کی ابتدائی آیات سے تقریباً اسی آیات سے کچھ زیادہ تک نجران کے ۶۰ افراد پر مشتمل ایک وفد کے بارے میں نازل ہوئیں جو حضرت پیغمبر اسلامؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان میں ۱۴ افراد ان کے بزرگوں و سرداروں میں سے تھے کہ جن میں سے درج ذیل تین افراد وفد کی قیادت کر رہے تھے:

(۱) عاقب، کہ جو قوم کا سردار تھا اور سب ہی اس کی رائے کو بنیادی حیثیت دیتے تھے یہاں تک کہ کوئی فیصلہ اس کی مرضی کے بغیر نہیں ہوتا تھا۔ اس کا اصل نام "عبدالمسیح" تھا،

(۲) "ایہم"، ان کی بزرگ قومی شخصیت کہ جس نے تمام ضروریات سفر فراہم کیے،

(۳) "ابوحارثہ بن علقمہ"، جو ان کی مرکزی دینی شخصیت، بزرگ عالم، مذہبی رہنما اور مدارس علمیہ کے سب سے بزرگ استاد تھے اور اپنی قوم میں نہایت بلند مقام و مرتبت کے حامل تھے، عظیم استاد و معلم کے طور پر پہچانے جاتے تھے چنانچہ روم کے بادشاہوں نے ان کی عزت و تکریم کے طور پر انہیں دینی و مذہبی قائد و پیشوا تسلیم کیا اور ان کے دینی احکامات کو لازم الاتباع قرار دیا اور ان کی علمی و اجتہادی عظمت کی قدردانی کے طور پر ان کے لئے کئی گرجا گھر تعمیر کروائے،

یہ وفد مدینہ منورہ میں آیا اور مسجد نبویؐ میں حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا، اس وقت آنحضرتؐ نماز عصر پڑھ چکے تھے۔ وفد کے ارکان نے علماء کا مخصوص لباس (نہایت خوبصورت جبے اور قیمتی عبائیں) زیب تن کیا ہوا تھا انہیں دیکھ کر بعض صحابۂ کرام نے کہا کہ ہم نے اس سے پہلے اس قدر باوقار وفد نہ دیکھا تھا، وہ ابھی آئے ہی تھے کہ ان کی نماز کا وقت ہو گیا اور وہ کھڑے ہو گئے اور گھنٹیاں بجانے لگے اور انہوں نے مسجد نبویؐ میں اپنی نماز ادا کی،

صحابۂ کرام نے آنحضرتؐ کی خدمت میں عرض کی: یا رسول اللہ! یہ تو آپؐ کی مسجد میں ایسا کر رہے ہیں؟

آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا: انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو جو کچھ وہ کرنا چاہتے ہیں انہیں کرنے دو ...، چنانچہ ان لوگوں نے مشرق کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی، اس کے بعد ان کے سردار "ایہم" اور "عاقب" نے حضرت پیغمبر اسلامؐ سے گفتگو شروع کی، آنحضرتؐ نے ان دونوں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی،

ایہم اور عاقب نے کہا کہ ہم آپ سے پہلے اسلام لا چکے ہیں،

آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا، تم جھوٹ بولتے ہو، تم خدا کے دین کو تسلیم نہیں کرتے، تم کیونکر اسلام کے دعویدار ہو سکتے ہو جبکہ تم "خدا کے لئے بیٹا" مانتے ہو، صلیب کی پوجا کرتے ہو اور خنزیر کا گوشت کھاتے ہو،

انہوں نے کہا: اگر عیسیٰ خدا کا بیٹا نہیں تو ان کا باپ کون ہے؟

اس کے بعد وہ سب آنحضرتؐ سے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بحث و مناظرہ کرنے لگے،

حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ان سے فرمایا: کیا تمہارا یہ عقیدہ نہیں کہ اولاد باپ کے مشابہ ہوتی ہے؟

انہوں نے کہا: ہاں، بالکل ایسا ہی ہے۔

آنحضرتؐ نے فرمایا: کیا تم یہ عقیدہ نہیں رکھتے کہ ہمارا رب زندہ ہے اور کبھی نہ مرے گا اور یہ کہ عیسیٰ، فانی ہے اور اس پر موت آ سکتی ہے؟

انہوں نے کہا: بالکل ایسا ہی ہے۔

حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ارشاد فرمایا: کیا تمہارا عقیدہ یہ نہیں کہ ہمارا پروردگار ہر چیز پر حاوی اور تمام امور کا مالک ہے اور ہر شے کا محافظ اور اسے رزق دینے والا ہے؟

انہوں نے کہا: کیوں نہیں!

آنحضرتؐ نے فرمایا: آیا حضرت عیسیٰؑ ان تمام صفات کے حامل ہیں؟

انہوں نے کہا: نہیں

پیغمبر اسلامؐ نے ارشاد فرمایا: کیا تم یہ عقیدہ نہیں رکھتے کہ خداوند عالم ہر چیز کا علم رکھتا ہے اور آسمانوں اور زمین میں کوئی چیز اس سے مخفی و پوشیدہ نہیں؟

انہوں نے کہا: کیوں نہیں! یہی ہمارا عقیدہ ہے

آنحضرتؐ نے فرمایا: کیا حضرت عیسیٰؑ بھی اسی طرح پوری کائنات میں موجود ہر شے کا علم رکھتے ہیں اور کوئی شے ان سے پوشیدہ نہیں یا صرف اسی حد تک علم رکھتے ہیں جتنا خداوند عالم نے انہیں تعلیم دی؟

انہوں نے جواب دیا: نہیں، وہ پوری کائنات کا علم نہیں رکھتے۔

حضرت رسول خداؐ نے فرمایا: ہمارے پروردگار نے عیسیٰؑ کو خلق کیا اور ان کی والدہ گرامی قدر کے رحم مبارک میں اپنی مشیت کے مطابق ان کی صورتگری کی، ہمارا رب نہ کھاتا ہے اور نہ پیتا ہے اور نہ ہی اسے رفع حاجت کی ضرورت پیش آتی ہے،

انہوں نے کہا: آپ کی بات درست ہے،

آنحضرتؐ نے پوچھا: کیا تمہارا یہ عقیدہ نہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ اسی طرح ان کی حاملہ تھیں اور ان کو جنم دیا جس طرح ہر عورت بچے کی حاملہ اور اسے جنم دیتی ہے؟ اور ان کی والدہ نے انہیں اسی طرح دودھ پلایا جس طرح ہر ماں اپنے بچے کو دودھ پلاتی ہے اور دودھ پلائی کی مدت ختم ہونے کے بعد ہر بچے کی طرح حضرت عیسیٰؑ بھی کھانا کھاتے، پانی پیتے اور رفع حاجت کرتے تھے؟

انہوں نے جواب دیا: ہاں، بالکل درست ہے،

حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ارشاد فرمایا: جب یہ سب کچھ صحیح ہے تو پھر ان کے بارے میں تمہارے عقائد کی بنیاد کیا ہے؟......اور تم انہیں خدا کا بیٹا کیونکر مان سکتے ہو؟......

وہ لوگ آنحضرتؐ کے سامنے لاجواب ہو گئے اور خاموش رہے۔

اس وقت خداوند عالم نے ان کے بارے میں یہ یعنی سورۂ آل عمران کی ابتدائی آیات سے اسی (۸۰) سے زیادہ آیتیں نازل فرمائیں۔

(تفسیر مجمع البیان، جلد ا، صفحہ ۴۰۶)

مؤلفؒ: اسی مطلب کو جلال الدین سیوطی نے تفسیر "درمنثور" میں ابن اسحاق، ابن جریر، ابن منذر کے اسناد سے محمد بن جعفر بن زبیر کے حوالہ سے ذکر کیا ہے اور اسی مضمون کی ایک روایت ابن اسحاق کے اسناد سے محمد بن سہل بن ابی امامہ کے حوالہ سے ذکر کی ہے۔ (ملاحظہ ہو: تفسیر منثور، جلد ۲، صفحہ ۳)

بہرحال اصل واقعہ عنقریب ذکر کیا جائے گا، لیکن صحابۂ کرام کا یہ قول کہ سورۂ آل عمران کی ابتدائی آیات اسی واقعہ کی بابت نازل ہوئیں، ان کا اجتہادی نقطۂ نظر ہے، البتہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اس سوۂ مبارکہ میں جو سیاق الکلام اختیار کیا گیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا نزول ایک ہی بار ہوا ہے،

خوش بخت اور بد بخت

حضرت پیغمبر اسلامؐ سے مروی ہے آپؐ نے ارشاد فرمایا:

" الشقی شقی فی بطن امه و السعید سعید فی بطن امه"

شقی و بد بخت انسان، اپنی ماں کے شکم ہی میں شقی ہوتا ہے اور سعادتمند و خوش بخت آدمی، اپنی ماں کے شکم ہی میں سعادت و خوش بختی کا حامل ہوتا ہے (نہج الفصاحۃ، صفحہ ۳۷۵)

تخلیق کے مراحل

کافی میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے فرمایا:

" ان اللـه اذا اراد ان یخلق النطفة التی هی مما اخذ علیه المیثاق من صلب آدم او ما یبدو له فیـه و یـجـعلها فی الرحم حرک الرجل للجماع و اوحی الی الرحم ان افتحی بابک حتی یلج فیک خلقی و قضائی النافذ و قدری، و تفتح بابها، فتصل النطفة الی الرحم، فتردد فیه اربعین یوماً، ثم تصیر

علقة اربعين يوماً، ثم تصير مضغة اربعين يوماً، ثم تصير لحماً تجرى فيه عروق مشتبكة، ثم يبعث الله ملكين خلاقين يخلقان فى الارحام ما يشاء الله، يقتحمان فى بطن المرأة من فم المرأة، فيصلان الى الرحم و فيها الروح القديمة المنقولة فى اصلاب الرجال و ارحام النساء فينفخان فيها روح الحياة و البقاء و يشقان له السمع و البصر والجوارح و جميع ما فى البطن باذن الله تعالىٰ ثم يوحى الله الى الملكين : اكتبا عليه قضائى و قدرى و نافذ امرى و اشترطا لى البداء فيما تكتبان، فيقولان: يا رب ما نكتب؟ فيوحى الله عز و جل اليهما ان ارفعا رؤسكما الى راس امه، فيرفعان رؤسهما فاذا اللوح يقرع جبهة امه، فينظران فيه، فيجدان فى اللوح صورته و زينته و اجله و ميثاقه سعيداً او شقياً و جميعا شانه، فيملى احدهما على صاحبه فيكتبان جميع ما فى اللوح و يشترطان البداء فيما يكتبان، ثم يختمان الكتاب و يجعلانه بين عينيه، ثم يقيمانه قائماً فى بطن امه قال: فربما عتا فانقلب، ولا يكون ذلك الا فى كل عات او ماردٍ، و اذا بلغ اوان خروج الولد تاماً او غير تامٍ اوحى الله الى الرحم: ان افتحى بابك حتى يخرج خلقى الى ارضى و ينفذ فيه امرى فقد بلغ اوان خروجه، قال: فتفتح الرحم باب الولد فينقلب فتصير رجلاه فوق رأسه و رأسه فى اسفل البطن ليسهل الله على المرأة و على الولد الخروج، وبعث الله عزوجل اليه ملكاً يقال له زاجر، فيزجره زجرة فيفزع منها الولد فاذا احتبس زجره الملك زجرة اخرىٰ فيفزع منها، فيسقط الولد الى الارض باكياً فزعاً من الزجرة"

(جب خداوندعالم چاہتا ہے کہ اس نطفہ کوخلق کرے کہ جس سے صلب آدم میں میثاق لے لیا گیا یا جو کچھ روز ازل سے اس کے لئے مقرر کیا گیا ہے اسے ظہور بخشے اور نطفہ کو رحم میں قرار بخشے تو مرد کو مقاربت کی ترغیب دلاتا ہے اور عورت کے رحم کو حکم دیتا ہے کہ انعقاد نطفہ کے مراحل طے کرنے کے لئے آمادہ ہوتا کہ میرا فیصلہ نافذ العمل ہو اور تخلیق کی بابت میں نے جو کچھ طے کیا ہے اسے جامۂ عمل مل جائے، چنانچہ رحم اپنا منہ کھول دیتا ہے اور نطفہ آسانی سے رحم کے اندر چلا جاتا ہے اور چالیس دن تک اس میں گھومتا رہتا ہے یہاں تک کہ "علقہ" بن جاتا ہے، چالیس دنوں تک اسی حالت میں رہتا ہے اور پھر "مضغہ" بن جاتا ہے، چالیس روز تک "مضغہ" کی حالت میں رہتا ہے اور پھر گوشت بن جاتا ہے کہ جس میں رگوں کا ایک جال بنتا چلا جاتا ہے، اس کے بعد خداوندعالم تخلیق پر مامور دو فرشتوں کو بھیجتا ہے جو خداوندعالم کی مشیت کے مطابق، رحموں میں تخلیق کے امور انجام دیتے ہیں، وہ عورت کے منہ کے ذریعے اس کے شکم میں داخل ہوتے ہیں اور رحم تک پہنچ جاتے ہیں کہ جس میں وہ قدیم روح موجود ہوتی ہے جو مردوں کی پشتوں اور عورتوں کے رحموں سے منتقل ہو کر وہاں موجود ہوتی ہے، پھر وہ اس میں زندگی و بقا کی روح پھونکتے ہیں اور خدا کے حکم کے مطابق اس کے لئے کان، آنکھیں، اعضاء و جوارح اور بدن کی تمام چیزیں

بناتے ہیں، اس وقت خداوند عالم ان فرشتوں کو وحی کرتا ہے اور انہیں حکم دیتا ہے کہ اس بچے کی تقدیر کو جو میں نے معین کی ہے اسے لکھیں اور اس کے بارے میں میری قضاء وقدر اور ہر فیصلہ کو تحریر کریں اور اپنی تحریر میں میرے لئے بداء کا حق محفوظ کریں، وہ فرشتے خداوند عالم سے پوچھتے ہیں کہ پروردگارا ! ہم کیا لکھیں؟ تو خداوند عالم انہیں وحی فرماتا ہے اور انہیں حکم دیتا ہے کہ سر اٹھا کر اس کی ماں کے سر پر نگاہ کرو، وہ سر اٹھا کر دیکھتے ہیں کہ اس کی ماں کے سر پر ایک لوح...... تختی ...... لٹکی ہوئی ہے، اسے غور سے دیکھتے ہیں تو اس میں اس کی شکل وصورت، حسن وجمال، زیب وزینت، میثاق ...... وعدۂ فطرت......، اس کا خوش بخت یا بدبخت ہونا اور اس سے تعلق رکھنے والے تمام امور درج ہوتے ہیں، ان میں سے ایک اس لوح کو پڑھتا ہے اور دوسرا اسے لکھتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ لوح میں مذکور تمام امور کو لکھ لیتے ہیں اور اپنی تحریر میں بداء کے خدائی حق کی لزومی شرط بھی ذکر کرتے ہیں (کہ جس کی بناء پر خداوند عالم ان کے مقدر میں جو تبدیلی چاہے لاسکتا ہے)، پھر اسے تمام کر کے اس پر مہر لگا دیتے ہیں اور اسے بچے کی دو آنکھوں کے درمیان رکھ دیتے ہیں، اس کے بعد اسے ماں کے شکم میں کھڑا کر دیتے ہیں، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ لڑکھڑا کر منقلب ہو جاتا ہے البتہ یہ صورت جھگڑالو یا سرکش افراد میں پیدا ہوتی ہے، پھر جب بچے کی ولادت کا وقت قریب ہوتا ہے خواہ صحیح وکامل پیدا ہو یا ناقص الخلقت پیدا ہو، تو خداوند عالم رحم کو وحی کرتا ہے کہ اب اپنا منہ کھول دے گا کہ یہ میری مخلوق میری زمین پر آجائے اور اس کے بارے میں میرے تمام فیصلے پورے ہوں ...... اس کی تقدیر کو عملی جامہ مل سکے ......، کیونکہ اب وقت آپہنچا ہے کہ وہ شکم سے باہر آجائے، خدا کے حکم پر رحم اپنا منہ کھول دیتا ہے اور بچہ الٹا ہو کر اپنا سر نیچا اور پاؤں اوپر کر لیتا ہے اور اپنا سر ماں کے شکم کے نچلے حصے کی طرف کرتا ہے تاکہ خداوند عالم زچہ وبچہ دونوں کے لئے ولادت کا مرحلہ آسان کر دے، پھر خداوند عالم ایک فرشتہ بھیجتا ہے جس کا نام "زاجر" ہے، وہ بچہ کو جھنجھوڑتا ہے جس سے وہ فزع وبے چینی میں مبتلا ہو جاتا ہے، اگر اس کے باوجود وہ رکا رہے تو وہ فرشتہ دوبارہ اسے جھنجھوڑتا ہے تاکہ وہ فزع واضطراب کے ساتھ ماں کے شکم سے باہر آجائے، چنانچہ بچہ ماں کے شکم سے زمین پر گر پڑتا ہے اور اسی فزع واضطراب کے باعث گریہ کرنے لگتا ہے) (فروع کافی، جلد ۶، ص ۱۳)

روایت کی تشریح وتوضیح

امامؑ کے ارشاد گرامی: "جب خدا چاہتا ہے کہ نطفہ کو خلق کرے" سے مراد یہ ہے کہ جب خداوند عالم نطفہ کو مکمل اور کامل الخلقت بشر بنانا چاہتا ہے اور اس جملہ کے ساتھ آپؑ کا یہ ارشاد کہ "وہ نطفہ کہ جس سے آدم کی صلب میں عہد وپیمان

لے لیا تھا'' تو اس سے ایک اہم مطلب کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ جس کا تفصیلی بیان عنقریب آئے گا اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں آنے سے پہلے ایک عالم میں وجود رکھتا تھا اور وہاں جن حالات و کیفیات کا حامل تھا وہ اس دنیا میں بھی اس کے ساتھ پائی جاتی ہیں کہ اس عالم کو روایات و احادیث میں ''عالم ذر'' اور ''عالم میثاق'' سے تعبیر کیا گیا ہے، تو اس سے اس عالم میں جو عہد و پیمان لیا گیا ہے وہ اس دنیا میں عملی صورت میں آنا چاہیے اور اس کی تخلیق کے مراحل اسی عہد و پیمان کے عین مطابق طے ہونے چاہئیں اور ان میں ہرگز کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے، اسی کو ''حتمی فیصلہ'' اور ''القضاء المحتوم'' کہتے ہیں۔

اسی وجہ سے امام علیہ السلام نے ابتدائے کلام ہی میں ان افراد کہ جن سے عالم ذر میں میثاق لے لیا گیا اور ان افراد کہ جن کی تخلیق کے مراحل میں بداء حاصل ہوا، کے درمیان فرق کا اظہار کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''یا جو کچھ روز اول سے اس کے لئے مقرر کیا گیا''، اس جملہ سے مراد یہ ہے کہ اس کی تخلیق کے مراحل میں بداء حاصل ہوا اور اس سے میثاق نہیں لیا گیا لہٰذا وہ کامل الخلقت نہیں ہوتا بلکہ سقط ہو جاتا ہے بنابرایں پہلی قسم کے افراد کہ جن سے عہد و پیمان لے لیا گیا ان کی بابت بداء نہیں بلکہ وہ کامل الخلقت، دنیا میں آتے ہیں۔ لہٰذا امامؑ کے اس فرمان کہ ''نطفہ کو رحم میں قرار بخشے'' کی بازگشت پہلے جملہ ''جب چاہتا ہے کہ نطفہ کو خلق کرے'' کی طرف ہے۔

اور روایت کے یہ الفاظ کہ وہ دو فرشتے عورت کے منہ کے ذریعے اس کے پیٹ میں داخل ہوتے ہیں تو ممکن ہے یہ جملہ امام علیہ السلام کا نہ ہو بلکہ راوی کے الفاظ ہوں چنانچہ اس کی تائید عبارت میں لفظ عورت کے دوبار ذکر کئے جانے سے ہوتی ہے جبکہ ایک بار کہہ کر دوسری مرتبہ اس کی بجائے ضمیر ذکر کی جاتی تو جملہ زیادہ ادبی ہوتا (عبارت اس طرح ہے ''**یقتحمان فی بطن المراۃ من فم المراۃ**'' جبکہ دوسری مرتبہ المراۃ کی بجائے ضمیر ھا کہنا کافی تھا یعنی یوں کہا جا سکتا تھا ''**من فمھا**'' لیکن ضمیر کی بجائے اسم ظاہر ذکر کیا گیا جس سے یہ امکان دکھائی دیتا ہے کہ شاید یہ الفاظ امام کے نہ ہوں بلکہ راوی نے خود کہا ہو)۔ البتہ ظاہر الحال پر بناء رکھتے ہوئے اگر اسے امام علیہ السلام کا کلام قرار دیا جائے تو اس سے یہ ثابت ہوگا کہ فرشتوں کا عورت کے شکم میں داخل ہونا جسم کے جسم میں داخل ہونے کے باب سے نہیں کیونکہ شرمگاہ کے علاوہ رحم میں داخل ہونے کے لئے رگوں کے سوا کوئی اور راستہ ہی نہیں اور ان رگوں میں سے ایک وہ رگ ہے جو خون حیض کے رحم تک پہنچنے کا ذریعہ بنتی ہے تاہم رحم میں داخل ہونے کا یہ راستہ شرمگاہ سے رحم میں داخل ہونے سے زیادہ آسان نہیں۔ بنابرایں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ منہ کے ذریعے داخل ہونے میں وسعت و کشادگی کے علاوہ حکمت ملحوظ ہے جو کہ محتاج بیان نہیں۔

اور امام علیہ السلام کا یہ ارشاد گرامی کہ ''اس میں مردوں کی صلبوں اور عورتوں کے رحموں سے منتقل ہونے والی قدیم روح ہوتی ہے'' گویا اس نباتی روح کی طرف اشارہ ہے جو جسم کے تغذیاتی نظام اور نشو و نما کا سرچشمہ ہے۔

اور امام علیہ السلام کے ارشاد گرامی: ''**فینفخان فیھا روح الحیاۃ و البقاء**'' (پھر وہ اس میں زندگی اور بقاء کی

روح پھونکتے ہیں) میں بظاہر لفظ " **فیھا** " کی ضمیر "**ھا**" کی بازگشت "**الروح القدیمة**" کی طرف ہے، بنا برایں حیات وبقاء کی روح، نباتی روح میں پھونکی جاتی ہے، اور اگر بالفرض اس ضمیر کی بازگشت جملہ " **ثم تصیر مضغة** " میں مذکور لفظ " **مضغة** " کی طرف ہو تو عبارت کا معنی یہ ہوگا کہ زندگی وبقاء کی روح، نباتی روح کے ذریعے زندگی پانے والے مضغہ (لوتھڑا) میں پھونکی جاتی ہے، تو نتیجہ یہ ہوا کہ مضغہ ء نباتیہ میں حیات وبقاء کی روح پھونکی جاتی ہے۔

بہرحال امام علیہ السلام کے ارشاد گرامی سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ انسانی روح کا پھونکا جانا دراصل نباتی روح کے لئے ایک طرح کی ترقی وکمال پانے سے عبارت ہے کہ جس کا حصول اس کے قوت واستحکام سے بہرہ ور ہونے کی بنا پر ممکن ہوتا ہے (البتہ یہ بات، حرکت جوہریہ کے نظریہ پر مبنی ہے)۔

اس بیان سے روح قدیمہ کے، مردوں کے صلبوں اور عورتوں کے رحموں میں منتقل ہونے کا معنی بھی واضح ہو جاتا ہے اور یہ بات بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ روح ایک حوالہ سے بدن یعنی نطفہ کے ساتھ وجودی طور پر یکساں ہے البتہ اس ترتیب کے ساتھ کہ خون حیض تدریجی طور پر نطفہ کا جزء بنتا ہے اور پھر نطفہ اور ماں باپ دونوں کے جسموں کے درمیان وجودی طور پر ایک دوسرے سے یکسانیت پیدا ہو جاتی ہے اور پھر یہ سلسلہ جاری رہتا ہے، بنا برایں جو کچھ انسان کی زندگی میں پیش آتا ہے وہ کسی حد تک اس کے ماں باپ کے وجود میں متعین ہو چکا ہوتا ہے اور ان کی شخصیت کی صورت گری کے جلوے دکھائی دیتے ہیں گویا وہ ایک طرح سے اس کی کتاب زندگی کی فہرست ہے کہ جو اس کے والدین کی کتاب زندگی میں لکھی جا چکی ہے

مذکورہ بالا بیان سے امام علیہ السلام کے اس ارشاد گرامی کا معنی بھی روشن ہو جاتا ہے کہ " اللہ تعالیٰ فرشتوں کو وحی کرتا ہے کہ اپنے سروں کو اٹھاؤ اور اس کی ماں کے سر کی طرف دیکھو "۔ اس بیان میں امامؑ نے فرمایا کہ خدا فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ اس کی ماں کے سر کو دیکھو، یہاں ماں کے ساتھ باپ کا ذکر نہیں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ باپ سے تعلق رکھنے والے قضاء و قدر کے تمام مراحل انعقاد نطفہ کے بعد مکمل ہو جاتے ہیں اور پھر سلسلۂ تقدیر باپ سے منقطع ہو جاتا ہے اور صرف ماں تک محدود ہو جاتا ہے یعنی جو کچھ بچے کی بابت خدائی فیصلے ہوتے ہیں ان کا ربط صرف ماں سے برقرار رہتا ہے لہٰذا اب ماں ہی بچے کی تقدیر کی امانت دار ہوتی ہے اسی وجہ سے امامؑ نے ارشاد فرمایا کہ " جب وہ فرشتے اس کی ماں کے سر کی طرف نگاہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ایک تختی اس کی پیشانی پر آویزاں ہے "۔

یہاں پیشانی کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ وہ انسان کے حواس واحساسات اور اس کی شخصیت کی مظہر وآئینہ دار ہوتی ہے اور اسی پر انسان کی باطنی کیفیات جلوہ گر ہوتی ہیں، بہرحال فرشتے اس کی پیشانی پر نظر کرتے ہیں تو اس میں بچے کی شکل و صورت، حسن وجمال، مدت حیات، فطری میثاق کی بنیاد پر سعادت وشقاوت کا خاکہ وخدوخال اور اس سے تعلق رکھنے والے تمام امور اس میں لکھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ پھر ان میں سے ایک فرشتہ اسے پڑھتا ہے اور دوسرا اسے لکھتا چلا جاتا ہے

(بچے کی تقدیر اس کی پیشانی پر رقم ہو جاتی ہے) اس طرح ان فرشتوں کی حیثیت فاعل (انجام دینے والے) اور قابل (قبول کرنے والے) جیسی ہو جاتی ہے، وہ ماں کی پیشانی پر آویزاں لوح تقدیر میں مرقوم تمام امور کو بچے کی پیشانی پر لکھ دیتے ہیں۔

اور امامؑ کا یہ ارشاد گرامی کہ وہ فرشتے تقدیر کے ہر فیصلے کے ساتھ بداء کی شرط بھی لکھ دیتے ہیں (بداء سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ حق حاصل ہے کہ انسان کی مصلحت کے پیش نظر اس کی تقدیر کا رخ بدل دے اور اس میں اپنی مشیت کے مطابق فیصلہ کرے) تو اس کی وجہ یہ ہے کہ بچہ شکم مادر میں، مستقبل میں رونما ہونے والے واقعات کے تمام علل واسباب کا حامل نہیں ہوتا کیونکہ جسمانی قوتیں مستقبل میں پیش آنے والے حالات وواقعات اور انسانی زندگی سے تعلق رکھنے والے تمام امور کے وجود پذیر ہونے کا سرچشمہ ہوتی ہیں لیکن اس کے باوجود ان کو تمام امور کا واحد سرچشمہ ہونے کی حیثیت حاصل نہیں بلکہ ان کے علاوہ دیگر عوامل واسباب اور جسمانی قوتوں سے باہر کی دنیا کے امور بھی دخیل ہوتے ہیں اسی وجہ سے غیر یقینی و غیر حتمی امور ہمیشہ بداء کی زد میں رہتے ہیں اور ان کی بابت خداوند عالم اپنی مشیت اور انسان کی بہتری و بھلائی کے مطابق فیصلہ کرتا ہے، اسی کو بداء کہتے ہیں.....

اس مقام پر یہ امر قابل ذکر ہے کہ مذکورہ بالا روایت میں بچے کی ولادت کے تمام مراحل کے طے ہونے میں جن امور کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف دی گئی ہے یعنی مرد میں جنسی عمل کا میلان پیدا کرنا اور اس کی برانگیختگی، عورت کے رحم کو انعقاد نطفہ کی آمادگی کی وحی کرنا، خلق وعطائے وجود..... جسمانی صورت گری ..... کے امور انجام دینے والے دو فرشتوں کو بھیجنا اور ایک بیرونی حفاظت پر مامور فرشتہ بھیجنا وغیرہ تو اس سے ان امور کی اپنے طبیعی اسباب کی طرف نسبت کی نفی نہیں ہوتی کیونکہ یہ دو عوامل ایک دوسرے کے مدمقابل نہیں بلکہ ایک دوسرے سے مربوط و مرتبط تسلسلی رشتہ رکھتے ہیں کہ جسے علمی اصطلاح میں "طولی سلسلہ" کہا جاتا ہے جبکہ ایک دوسرے کے مدمقابل قرار پانے کو "عرضی سلسلہ" کہتے ہیں۔ بنابرایں ایسا نہیں کہ ان میں سے ایک، دوسرے کی نفی کرے، یا وہ ایک دوسرے سے اس قدر متصادم ہوں کہ دونوں ہی ختم ہو جائیں اور یا پھر نوبت یہاں تک پہنچ جائے کہ دونوں سببوں کے مجموعہ مرکب سے بچے کے تولد کی علت تامہ کو وجود ملے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے ہر سبب اپنی اپنی حیثیت میں "علت تامہ" ہے۔ نہ کوئی ایک، دوسرے کی نفی کرتا ہے اور نہ ان میں کسی حوالہ سے تصادم پیدا ہوتا ہے بلکہ ہر سبب اپنے طور پر اثر آفرینی کا مظاہرہ کرتا ہے.....،

مذکورہ بالا مطالب سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن ہستیوں کو لوگوں کی روحانی سعادت اور انہیں رضائے الٰہی کے حصول کی راہ دکھانے کی ذمہ داری سونپی..... یعنی انبیاء علیہم السلام..... تو چونکہ یہ کام نہایت روحانی اور باطنی پاکیزگی پر مبنی ہے لہٰذا خدائی نمائندوں کا فریضہ ہے کہ وہ لوگوں سے اس انداز میں گفتگو کریں کہ جس سے ان کو روحانیت کی راہ

مل جائے اور اپنے تمام بیانات میں لوگوں کو ان کے پروردگار کی یاد دلاتے رہیں، اور وہ اس طرح کہ انہیں باور کرائیں کہ فرشتوں کو عنایات خداوندی کی فیض رسانی میں وساطت کی ذمہ داری حاصل ہے اور نو پیدا امور کی عملی نسبت انہی کی طرف ہے، البتہ لوگوں کی سعادتمندی کو ملائکہ کی روحانی تائید و مدد سے نسبت ہے جبکہ ان کی شقاوت و بدبختی اپنی تمام تر مکروہ صورتوں کے ساتھ شیاطین کی وسوسہ انگیزی کا نتیجہ ہے لہٰذا شقاوت کی ہر صورت کو شیطانوں سے نسبت ہے، اس کے باوجود عالم ہستی کے ذرہ ذرہ کو اپنے وجودی تشخص کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے نسبت ہے اور وجود پذیر ہونے والا ہر امر اسی سے منسوب ہے البتہ اس معنی میں جو اس کی ذات اقدس کے شایان شان اور اس ایک مقام ربوبیت کو زیبا ہے۔

انبیاء کا یہ انداز اس لئے ضروری ہے تاکہ لوگوں کو ہدایت و گمراہی اور نفع و نقصان کی تمام صورتوں سے آگاہی حاصل ہو اور خلاصہ یہ کہ انہیں آخرت کی زندگی کے بارے میں تمام پہلوؤں کا علم ہو جائے اور وہ جان لیں کہ اس دنیاوی زندگی میں ہدایت کی راہ اختیار کرنا آخرت میں کس قدر مفید ہوگا اور گمراہی کا نتیجہ کس قدر سنگین و تباہ کن ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ان طبیعی اسباب کو ہرگز نظر انداز نہ کریں جو عالم ہستی میں کسی شے کے وجود پذیر ہونے کو یقینی بناتے ہیں بلکہ ان اسباب و علل اور وجودی عوامل کو عملی احترام دیں کیونکہ وہ حیات انسانی کے دو بنیادی ارکان میں سے ایک ہے اور وہ پختہ بنیاد ہے جس پر دنیاوی زندگی کے تمام امور قائم و استوار ہیں لہٰذا ضروری ہے کہ انسان ان سے پوری طرح باخبر ہو جس طرح اس پر یہ لازم ہے کہ روحانی و باطنی علل و اسباب سے آگاہی حاصل کرے تاکہ پوری طرح اپنے آپ کو پہچان لے اور پھر اپنے رب کو پہچان سکے۔ کیونکہ جو شخص اپنے آپ کو پہچان لے وہ یقیناً اپنے پروردگار کو پہچان لیتا ہے، گویا ذات رب العزت کی معرفت کا حصول اپنی ذات کی معرفت پر موقوف اور اس کے ذریعے ممکن ہوتا ہے۔

آیات ۷ تا ۹

○ هُوَ الَّذِيٓ اَنۡزَلَ عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ مِنۡهُ اٰيٰتٌ مُّحۡكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الۡكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِيۡنَ فِيۡ قُلُوۡبِهِمۡ زَيۡغٌ فَيَتَّبِعُوۡنَ مَا تَشَابَهَ مِنۡهُ ابۡتِغَآءَ الۡفِتۡنَةِ وَابۡتِغَآءَ تَاۡوِيۡلِهٖ ۚ وَمَا يَعۡلَمُ تَاۡوِيۡلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ؔ وَالرّٰسِخُوۡنَ فِي الۡعِلۡمِ يَقُوۡلُوۡنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ۝۷

○ رَبَّنَا لَا تُزِغۡ قُلُوۡبَنَا بَعۡدَ اِذۡ هَدَيۡتَنَا وَهَبۡ لَنَا مِنۡ لَّدُنۡكَ رَحۡمَةً ۚ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡوَهَّابُ ۝۸

○ رَبَّنَاۤ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوۡمٍ لَّا رَيۡبَ فِيۡهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخۡلِفُ الۡمِيۡعَادَ ۝۹

ترجمہ

"وہی ہے کہ جس نے آپ پر کتاب نازل کی کہ جس میں سے بعض محکم آیات ہیں جو کہ اصل کتاب ہیں اور دوسری متشابہ آیات ہیں، پس جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ اس کی متشابہ آیات ہی کی پیروی کرتے ہیں تا کہ فتنہ بپا کریں اور ان کی اپنی من پسند تاویلیں کریں جبکہ ان کے اصل معانی کو کوئی نہیں جانتا سوائے اللہ کے اور ان کے جو راسخون فی العلم ہیں کہ جو کہتے ہیں کہ ہم اس کتاب پر ایمان لائے ہیں یہ ساری کی ساری ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے اور عقل والوں کے علاوہ کوئی نصیحت نہیں پا سکتا"۔ (۷)

"اے ہمارے پروردگار! ہمیں ہدایت کی نعمت سے بہرہ ور کرنے کے بعد ہمارے دلوں میں کجی پیدا نہ ہونے دے اور ہمیں اپنی طرف سے رحمت عطا فرما کہ یقیناً تو ہی عطا کرنے والا ہے"۔ (۸)

"اے ہمارے پروردگار! یقیناً تو ہی لوگوں کو اس دن اکٹھا کرنے والا ہے کہ جس میں کوئی شک نہیں، یقیناً اللہ وعدہ خلافی نہیں کرتا"۔ (۹)

تفسیر و بیان

قرآن کا دفعتاً نزول

○ " هُوَ الَّذِيٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ "
(وہی ہے جس نے آپ پر کتاب نازل کی)

اس آیۂ مبارکہ میں خداوند عالم نے حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قرآن مجید نازل کرنے کو ''تنزیل'' کے بجائے ''انزال'' سے تعبیر فرمایا ہے (نزل) کے بجائے (انزل) کہا ... یاد رہے کہ انزال دفعتاً نیچے اتارنے کے معنیٰ میں جبکہ تنزیل تدریجی طور پر نیچے اتارنے کے لئے استعمال ہوتا ہے ... اس تعبیر کی وجہ یہ ہے کہ یہاں نازل ہونے والی پوری کتاب کی بعض صفات وخصوصیات کا ذکر مقصود ہے اور وہ یہ کہ یہ کتاب محکم اور متشابہ آیات پر مشتمل ہے اور متشابہ آیات کی بازگشت محکم آیات کی طرف ہوتی ہے اور ان (محکمات) کے ذریعے متشابہات کے معانی سمجھے جاتے ہیں، اس بناء پر نازل کی جانے والی کتاب کو ایک چیز (مجموعہ) تصور کیا گیا ہے اور اس کی آیات کے تعدد و کثرت کو ملحوظ قرار نہیں دیا گیا لہٰذا یہاں تنزیل کے بجائے انزال مناسب ہے۔

محکم و متشابہ آیات

○ " مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ "
(اس میں سے کچھ آیات محکم ہیں جو کہ اصل کتاب ہیں اور دیگر متشابہ ہیں)

''محکمات'' کا لفظی اشتقاق مادہ ''حکم'' سے ہے اور اس کا معنی کسی چیز کا اس حال و کیفیت میں ہونا ہے

کہ کوئی چیز اسے کلی یا جزئی طور پر خراب یا غیر مؤثر نہ کر سکے (اس کی عملداری میں مانع نہ ہو)۔ اردو زبان میں اس کا ترجمہ مضبوطی یا مضبوط ہونا ہے۔ اسی سے اِحکام (الف کے نیچے زیر کے ساتھ، باب افعال) اور تحکیم (باب تفعیل) بنایا جاتا ہے کہ جن کا معنی کس چیز کو محکم و مضبوط کرنا ہے، اور حکم بمعنی قضاوت و فیصلہ کرنا، حکمت بمعنی کامل معرفت و پختہ اور مفید علم و یقین اور حکمت (ح پر زبر کے ساتھ) بمعنی گھوڑے کو لگام لگانا، ان سب میں مضبوطی اور مخالف و دشمن کو اپنے قریب نہ آنے دینا کے معانی پائے جاتے ہیں اور بعض دانشوروں کا کہنا ہے کہ اس لفظ کے مادۂ اشتقاق میں دونوں معنی باہم پائے جاتے ہیں "المنع" (مخالف و دشمن سے اپنی حفاظت) اور "الاصلاح" (اصلاح و درستگی)، " المنع مع الاصلاح "،

یہاں آیات کے محکم کیے جانے سے مراد ان کا صریح و واضح قرار دیا جانا ہے یعنی ان میں آیات متشابہات کی طرح عدم وضوح نہیں پایا جاتا بلکہ پڑھنے والا فوراً ان کے معانی کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، (متشابہات کا معنی یہ نہیں کہ مہمل ہیں، اجمال اور اہمال میں بہت فرق ہے اور کلام الٰہی میں کوئی آیت ہرگز مہمل نہیں) اگر چہ خداوند عالم نے اپنی مقدس کتاب کے محکم ہونے کے بارے میں واضح طور پر ارشاد فرمایا ہے کہ اس کی آیات محکم ہیں، چنانچہ ارشاد ہوا:

سورہء ہود، آیت ا:

○ " كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ "

(کتاب (قرآن) کی تمام آیات کو محکم کیا گیا پھر ان کی تفصیل و وضاحت کی گئی، یہ سب کچھ دانا و آگاہ کی طرف سے ہے)

لیکن اس میں آیات کے محکم کیے جانے کے بعد مفصل کیے جانے کے بیان (احکمت ثم فصلت) سے ثابت ہوتا ہے کہ محکم کیا جانا نزول سے قبل کتاب کی ایک صفت کا بیان ہے اور وہ یہ کہ قرآن مجید نزول سے قبل ایک "اکائی" (غیر منقسم) تھا اور آیات کی کثرت و تعداد سے متصف نہیں تھا اور یہی، حصہ حصہ ہونے سے قبل اس کا متقن و محکم ہونا ہے۔ بنا بر ایں "محکم" ہونا دراصل پوری کتاب کی مجموعی صفت ہے جبکہ محکم و متقن ہونے کی جو صفت اس کی بعض آیات کے لئے ذکر کی گئی ہے وہ ان دوسری بعض آیات کے مقابلے میں ہے کہ جن میں یہ صفت نہیں پائی جاتی اور ان دونوں کی وجہ امتیاز بھی یہی ہے کہ جو آیات محکم و متقن ہیں ان کے معنی و مراد کی بابت کوئی ابہام و عدم وضوح نہیں پایا جاتا بلکہ وہ کسی طرح کے تشابہ کو اپنے قریب بھی نہیں آنے دیتیں۔

مذکورہ بالا مطالب کو باالفاظ دیگر یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ آیت مبارکہ "مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ

الْكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ" میں چونکہ قرآن مجید کی آیات کی دو قسموں یعنی محکم اور متشابہ میں تقسیم کا ذکر ہوا ہے لہٰذا اس سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ یہاں آیات کے محکم ہونے سے سورۂ ہود میں مذکور تمام قرآنی آیات کے مجموعی طور پر محکم ہونے والا معنی مراد نہیں کہ جس میں یوں ارشاد ہوا: "كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ....." کتاب (قرآن) کی آیات کو محکم کیا گیا ، اسی طرح سورۂ زمر کی آیت ۲۳ میں کتاب (قرآن) کے متشابہ ہونے کا جو معنی ملحوظ و مراد ہے وہ بھی "وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ" میں ملحوظ معنی سے مختلف ہے، سورۂ زمر میں یوں ارشاد ہوا: " كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ" (کتاب قرآن متشابہ اور دہرائی جانے والی ہے)۔ بنابراین زیرنظر آیت مبارکہ میں آیات کے محکم اور متشابہ ہونے کے جو معانی ملحوظ و مراد ہیں وہ سورۂ ہود اور سورۂ زمر میں مذکور محکم اور متشابہ ہونے کے معانی سے مختلف ہیں اور وہ اس طرح کہ ان دو سورتوں میں آیات کے محکم اور متشابہ ہونے کا تذکرہ تمام قرآنی آیات کے مجموعہ مرکب کے بارے میں جبکہ زیرنظر آیت مبارکہ میں بعض آیات کے محکم اور دوسری بعض کے متشابہ ہونے کا تقابلی تذکرہ ہوا ہے،

زیرنظر آیت مبارکہ میں ایات محکمات کو" اُمُّ الْكِتٰبِ " کی صفت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے: "مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ"، تو ضروری ہے کہ لفظ" ام " کی وضاحت کی جائے۔

لفظ" اُمٌّ " کا اصل معنی کسی چیز کی اصل و اساس اور بنیاد ہے، یعنی جس چیز کی طرف کسی کی بازگشت ہو اسے "اُمٌّ" کہتے ہیں، یہاں آیات محکمات کو "اُمُّ الْكِتٰبِ" (کتاب کی اصل بنیاد) سے موسوم و متصف کرنے سے اس حقیقت کا اظہار اور آیۂ مبارکہ (مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ) کا معنی یوں ہوگا کہ قرآن کی بعض آیات، متشابہات ہیں کہ جن کی بازگشت دوسری بعض آیات کی طرف ہوتی ہے جو کہ محکمات ہیں: (متشابہات کی بازگشت محکمات کی طرف!)، اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ "اُمُّ الْكِتٰبِ" میں "اُمٌّ "کی" الْكِتٰبِ" کی طرف اضافت،" ام الاطفال "(بچوں کی ماں) میں ملحوظ و مقصود، اضافت کی طرح نہیں کہ جسے" اضافت لامیہ "کہتے ہیں بلکہ حرف "من "(سے) کے معنی میں ہے جس طرح ہم کہتے ہیں:" **نساء القوم** "(قوم کی عورتیں)، " **قدماء الفقهاء** " (فقہاء میں سے قدیم)، اور اس طرح کے دیگر اضافتی جملوں کی طرح ہے کہ جن میں " سے" اور "میں سے" کا معنی پایا جاتا ہے۔

بنابراین کتاب..... قرآن.....ایسی آیات پر مشتمل ہے جو دوسری آیات کے لئے "ام" کی حیثیت رکھتی ہیں، یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ آیۂ مبارکہ میں لفظ" اُمٌّ "کو مفرد ذکر کیا گیا ہے جبکہ **"آیـات"** جو کہ جمع کا صیغہ ہے اس کی مناسبت سے " **امهات** "ہونا چاہیے تھا " **امهات الكتاب** " تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ" آیات محکمات" ایک دوسری سے مختلف نہیں بلکہ سب یکتا حقیقت کا حامل مجموعہ مرکب ہے لہٰذا جمع کے صیغہ "**امهات**" کی بجائے

"ام" کہا گیا۔

ایک لطیف نکتہ

یہاں ایک نہایت لطیف نکتہ قابل توجہ ہے اور وہ یہ کہ آیہ مبارکہ میں "مُّحْكَمٰتٌ" اور "مُتَشٰبِهٰتٌ" کا تقابلی تذکرہ ہوا ہے چنانچہ ارشاد ہوا: " مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ " تشابہ کا معنی چند مختلف اشیاء کا بعض اوصاف و کیفیات میں ایک دوسرے سے مطابقت و مماثلت کا حامل ہونا ہے،...... یعنی جب دو یا دو سے زیادہ چیزیں اپنے بعض اوصاف میں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہوں (مشابہت رکھتی ہوں) تو انہیں متشابہ اشیاء کہا جاتا ہے......، چنانچہ خداوند عالم نے پورے قرآن مجید کی توصیف اس صفت کے ساتھ کی ہے، ارشاد حق تعالیٰ ہے:

سورۂ زمر، آیت ۲۳:

○ " كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ ۖ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُودُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۚ"

(کتاب (قرآن) متشابہ و دہرائی گئی ہے...... اس کی قرأت و سماعت سے ان لوگوں پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے جو اپنے پروردگار ...کے کلام و مقام کی ہیبت ...... سے خوفزدہ رہتے ہیں)

اس سے لامحالہ یہ مراد ہوگا کہ کتاب خدا کی آیات، حسنِ ترتیب و ترکیب، کمالِ اسلوب و جمالِ بیان، اظہارِ حقائق و ذکرِ نصائح اور صریح و آشکار حق کی طرف ہدایت و رہنمائی کے حوالہ سے ہم رنگ ہیں چنانچہ آیہ مبارکہ میں مذکور قیود و صفاتی شرائط سے اس ہم رنگی کا ثبوت ملتا ہے، تو یہ تشابہ (ایک دوسرے سے مشابہت کا حامل ہونا) پوری کتاب کی جامع صفت ہے، اور زیرِ نظر آیہ مبارکہ میں جس تشابہ کا ذکر ہوا ہے یعنی کہا گیا ہے "وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ" (اور دیگر متشابہات ہیں) تو چونکہ ان آیات کو آیات محکمات سے تقابلی صورت میں ذکر کیا گیا ہے اور ان کی پیروی کو کج فکر و بیمار دل کی فتنہ انگیزی و غلط تاویل کی کوشش قرار دیا گیا ہے لہٰذا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس (تشابہ) کا معنی یہ ہے کہ ان کے سننے والے کو فوری طور پر ان کے معانی و مراد کا تعین نہیں ہوتا بلکہ وہ تردد کا شکار ہو جاتا ہے اور اس کے ذہن میں کبھی کوئی معنی اور کبھی کوئی معنی آتا ہے یہاں تک کہ وہ آیات محکمات کی طرف رجوع کرتا ہے اور ان کے ذریعے ان کے معانی سے آگاہی حاصل کر لیتا ہے اور پھر ان کا مقصود و مراد اس پر آشکار و واضح ہو جاتا ہے، اس طرح وہی آیاتِ متشابہات، آیات محکمات ہو جاتی ہیں یعنی آیاتِ محکمات کے ذریعے اور ان کی مدد سے وہ بھی محکمات قرار پاتی ہیں جبکہ آیات محکمات اپنی اصل حقیقت میں...... کسی دوسری آیت کی مدد و ذریعہ کے بغیر...... محکمات ہیں...... ان کے معانی سے آگاہی پانے والے کو کسی دوسری آیت کی طرف رجوع کرنے اور اس سے استفادہ کر کے ان کے معانی کے تعین کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ وہ خود اپنے معانی واضح کر دیتی ہیں، آیات متشابہات کے

آیات محکمات میں بدل جانے کی دو مثالیں ملاحظہ ہوں:

سورۂ طٰہٰ، آیت ۵:

O "اَلرَّحۡمٰنُ عَلَى الۡعَرۡشِ اسۡتَوٰى"

(خدا عرش پر قائم ہے)

اس آیت کے سننے والے کو عرش پر خدا کے قائم ہونے کا معنی واضح طور پر معلوم نہیں ہوسکتا لیکن جب وہ اس کی بابت سورۂ شوریٰ کی آیت ۱۱ کی طرف رجوع کرتا ہے کہ جس میں ارشادِ حق تعالیٰ ہے: "لَيۡسَ كَمِثۡلِهٖ شَىۡءٌ" (اس کی مانند کوئی چیز نہیں) تو اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ "قائم ہونے" سے اس پر کامل اختیار واقتدار اور کائنات پر مکمل کنٹرول مراد ہے اس پر جاگزین ہونا اور جسمانی طور پر مکین ہونا مراد نہیں کیونکہ کسی "جگہ" و "مکان" میں قرار پانا جسم رکھنے والی چیز کی صفت ہے جبکہ ایسا ہونا خداوندِ عالم کی ذات قدسیہ کے حوالہ سے ممکن ہی نہیں اور وہ جسم وجسمانیات اور جسمانی تقاضوں وضرورتوں سے مافوق و ماوراء ہے۔

سورۂ قیامت، آیات ۲۲۔۲۳:

O "وُجُوۡهٌ يَّوۡمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ﴿۲۲﴾ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿۲۳﴾"

(اس دن کچھ چہرے مسرور و شادمان ہوں گے، اپنے پروردگار کی طرف دیکھتے ہوں گے)

اس میں چہروں کے اپنے پروردگار کی طرف دیکھنے کا معنی غیر واضح ہے کیونکہ اس سے یہ بات ذہن میں پیدا ہوسکتی ہے کہ خدا بھی اجسام کی طرح رویت کے قابل ہے جبکہ یہ بات غلط و نادرست ہے لیکن جب اس کی بابت سورۂ انعام کی آیت ۱۰۳ کی طرف رجوع کریں تو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں "دیکھنے" سے حسی نظر (آنکھ) سے دیکھنا مراد نہیں،

یہی صورت حال ناسخ اور منسوخ آیات کی ہے کہ جب منسوخ ہونے والی آیت کو ناسخ آیت کے تناظر میں دیکھا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ منسوخ ہونے والی آیت زمانی طور پر محدود تھی اور اس میں مذکور حکم، ناسخ آیت میں مذکور حکم کے نازل ہونے تک تھا لہٰذا ناسخ آیت کے نزول کے بعد منسوخ آیت میں مذکور حکم خود بخود عملی طور پر بے اثر ہو گیا،

تو یہ ہے "محکم" اور "متشابہ" کے معانی کا خلاصہ کہ جسے زیر نظر آیۂ مبارکہ: "هُوَ الَّذِىۡۤ اَنۡزَلَ عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ مِنۡهُ اٰيٰتٌ مُّحۡكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الۡكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ" سے سمجھا جا سکتا ہے، یہ آیت یقینی طور پر "محکم" ہے خواہ اس کے علاوہ پورا قرآن ہی متشابہ تصور کیا جائے یعنی بفرضِ محال اگر یہ کہا جائے کہ پورے کا پورا قرآن آیات متشابہات پر مشتمل ہے لیکن اس آیت کے بارے میں قطعی طور پر کہنا پڑے گا کہ یہ "محکم" ہے اور اس کا محکم ہونا ہر طرح کے شک سے خالی ہے، اور اگر اس آیت کو بالفرض "متشابہ" تصور کریں تو تمام قرآنی آیات کو متشابہ قرار دینا پڑے گا اور پھر آیات

کی ''محکم'' و ''متشابہ'' دوحصوں میں وہ تقسیم درست نہ رہے گی جس کی واضح دلیل ان الفاظ میں پائی جاتی ہے: ''منہ آیات محکمات'' (قرآن کی کچھ آیات محکم ہیں) اور ''هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ'' کے الفاظ بے اثر و بے نتیجہ ہو جائیں گے اور سورۂ حم سجدہ کی آیت ۴ بے معنی اور حقیقت و صداقت کی حامل نہ ہوگی کہ جس میں ارشادِ حق تعالیٰ ہے: ''كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۙ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا''، (کتاب کہ اس کی آیات کو تفصیل کے ساتھ الگ الگ (واضح) کر دیا گیا ہے، عربی زبان کی فصاحت و بلاغت کا شاہکار قرآن علم رکھنے والوں کے لئے بشارت و خوشخبری دینے والا اور عذاب سے ڈرانے والا ہے)، اسی طرح وہ استدلال و حجت قائم کرنا بھی درست نہ رہے گا جو سورۂ نساء آیت ۸۲ میں مذکور ہے کہ جس میں ارشادِ حق تعالیٰ ہے: ''اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۭ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا'' (وہ قرآن میں غور و فکر اور تدبر کیوں نہیں کرتے اور اس بات کو کیوں نہیں سمجھتے کہ اگر وہ خدا کے علاوہ کسی کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے)، اس کے علاوہ دیگر وہ آیات کہ جن میں قرآن مجید کو ''نور'' (روشنی)، ''ھدیٰ'' (ہادی و رہنما) ''تبیان'' (صریح بیان)، ''بیان'' (واضح سخن)، ''مبین'' (نمایاں گفتار) اور ''ذکر'' (یاد دلانے والا) سے متصف کیا گیا ہے وہ سب بے معنی ہو جاتیں،

اس کے ساتھ ساتھ یہ بات نہایت واضح و روشن ہے کہ جو شخص اول سے آخر تک قرآنی آیاتِ مبارکہ کو بانظر غائر دیکھے وہ ہرگز اس حقیقت کے بارے میں کسی شک و شبہ کا شکار نہ ہوگا کہ ان میں سے کوئی ایک آیت بھی ایسی نہیں جس کے مندرجات اپنے معانی سے مطابقت نہ رکھتے ہوں اور ان کے مرادی حقائق غیر واضح و نا آشکار ہوں (مہمل یا مبہم ہوں) بلکہ تمام آیات اپنے مرادی حقائق کی منہ بولتی تصویریں ہیں خواہ وہ ایک ہی حقیقت کی حامل ہوں کہ جس کی بابت کسی نکتہ سنج و دانائے رموز سخن کو کوئی شک لاحق نہیں ہوتا یا متعدد معانی رکھتی ہوں کہ ان میں سے کسی کا تعین نہ ہو سکتا ہو بلکہ ہر معنی کے مراد ہونے کا شبہ پیدا ہوتا ہو، لیکن اس کے باوجود یہ بات یقینی ہوتی ہے کہ جو معنی مقصود ہے وہ انہی مترددہ معانی میں سے ایک ہے اس سے باہر نہیں ورنہ الفاظ کی اصل دلالت ہی مخدوش و باطل ہو جائے گی اور جو ایک معنی مقصود و مراد ہے وہ لامحالہ قرآن مجید کے ان مسلمہ اصولوں سے عدم مطابق و ناہم آہنگ اور بے ربط نہیں کہ جو وجود صانع و آفریدگار عالم اور اس کی توحید و یکتائی، بعثتِ انبیاءؑ، احکام و عملی دستوارت کی تدوین و تشریع، معاد اور روزِ قیامت اور مرنے کے بعد ایک دن خدا کی بارگاہ میں واپسی و حاضری وغیرہ سے عبارت ہیں، بلکہ وہ معنی انہی اصولوں سے کامل مطابقت رکھتا ہے اور وہ اصول بھی اس سے اسی طرح پیوستہ بنیادوں کی حیثیت رکھتے ہیں کہ جس طرح جڑ اور شاخ یا درخت و پھل کا رابطہ ہوتا ہے اور وہ (اصول) آیت کے متعدد احتمالی معانی و مدالیل میں سے مقصود و مراد معنی کا تعین کرتے ہیں، بنا بریں قرآنِ مجید......ایسی حقیقت واحدہ رکھتا ہے کہ اس...... کا بعض حصہ دوسرے حصہ کی وضاحت و تشریح کرتا ہے اور بعض حصہ اصل و بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے کہ جس کی طرف اس کے

دوسرے حصہ کی بازگشت اصل کی طرف ہوتی ہے یعنی کچھ حصہ اصل اور کچھ فرع ہے اور چونکہ فرع کی بازگشت اصل کی طرف ہوتی ہے لہٰذا بعض آیات دوسری بعض سے اصل وفرع کے رشتہ سے منسلک ہیں گویا ایک دوسرے سے وابستہ و پیوستہ ہیں ۔۔

پھر جب وہ آشنائے رموزِ سخن اس آیہ مبارکہ کی طرف متوجہ وملتفت ہوگا: "مِنۡهُ اٰيٰتٌ مُّحۡكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الۡكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ" تو اس حقیقت کی بابت ہر طرح کا شک وشبہ اس کے دل ودماغ سے دور ہوجائے گا کہ اس میں "محکمات" سے وہ آیات مراد ہیں جو قرآنی مسلمہ اصولوں پر مشتمل ہیں اور "متشابہات" سے وہ آیات مراد ہیں کہ جن کے معانی ان مسلمہ قرآنی اصولوں کے ذریعے متعین اور واضح ہوتے ہیں۔

ایک سوال اور اس کا جواب

اس مقام پر ممکن ہے آپ سوال کریں کہ یہ بات مسلم ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ فروع کی بازگشت، اصول کی طرف ہوتی ہے ہر فرع، اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے یہ سلسلہ ہر موضوع ومسئلہ میں پایا جاتا ہے خواہ وہ قرآنی معارف ہوں یا ان کے علاوہ دیگر علوم وامور ہوں، لیکن یہ بات، فروع کے "متشابہ" ہونے کا باعث نہیں بن سکتی اور "اصول" کی طرف بازگشت کی بناء پر ان کو "متشابہات" قرار نہیں دیا جاسکتا، تو یہاں ایسا کیوں ہے؟ یعنی قرآن مجید میں آیات کو دو حصوں میں تقسیم کر کے بعض کو متشابہ اور بعض کو محکم سے تعبیر کیا گیا اور محکم آیات کو اصول اور متشابہ آیات کو فروع قرار دیا گیا جیسا کہ صریح الفاظ سے ثابت ہے: "مِنۡهُ اٰيٰتٌ مُّحۡكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الۡكِتٰبِ"، "وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ"، تو اس کی وجہ کیا ہے؟

اس کا جواب ہم یہ دیتے ہیں کہ ایسا ہونے کی وجہ دو امور میں سے ایک ہے، اور وہ یوں کہ قرآنی معارف کی دو قسمیں ہیں:

(۱) کچھ معارف کا تعلق ماورائے طبیعت سے ہے کہ وہ حس اور مادہ کی دسترس ودائرہ سے خارج ہیں اور عام افراد کے اذہان کو ان کے معانی کے تعین میں غیر یقینی صورت حال کا سامنا ہوتا ہے اور وہ کسی معنی کا بآسانی تعین نہیں کر پاتے بلکہ وہ اس سلسلہ میں شک وتردد کا شکار رہتے ہیں کہ آیا ان سے حسی ومادی معانی مراد لئے جائیں یا غیر حسی وغیر مادی معانی؟ مثلاً:

سورۂ فجر، آیت ۱۴:

○ "اِنَّ رَبَّكَ لَبِالۡمِرۡصَادِ"

(یقیناً تیرا پروردگار گھات میں ہے)

سورۂ فجر، آیت ۲۲:

O "وَّجَآءَ رَبُّكَ"

(اور تیرا رب آیا)

تو ان الفاظ سے فوری طور پر وہی معانی ذہن میں آتے ہیں جو جسمانی اوصاف و خصوصیات اور حسی حقائق ہیں کیونکہ عام طور پر انسانی ذہن انہی سے مانوس اور انہی کی طرف متوجہ ہوتا ہے..... طبع وفکر بشری کو صرف مادی معانی سے انس ہے اور ہمیشہ انسانی ذہن انہی کی طرف متوجہ وملتفت ہوتا ہے..... لہٰذا جو شخص یہ الفاظ سنتا ہے اس کے ذہن میں "گھات میں ہونے" اور "آنے" کے وہی معانی آتے ہیں جو عام طور پر جسمانی حرکات ہیں یعنی جس طرح کوئی جاندار کسی جگہ آتا ہے یا کوئی کسی کی گھات میں ہوتا ہے خداوند عالم کا گھات میں ہونا اور آنا بھی اسی طرح سمجھا جاتا ہے لیکن جب ان کی بابت اصول و حقائق کی طرف رجوع کیا جاتا ہے کہ جن میں مادہ وجسم..... جسم وجسمانیات..... کی خداوند عالم سے نفی کی گئی ہے (یعنی وہ آیات کے جن میں خداوند عالم کو مادہ وجسم سے منزہ و پاک قرار دیا گیا ہے) تو غلط فہمی دور ہو جاتی ہے اور حسی و مادی معنی کا ابتدائی التفات دم توڑ دیتا ہے، یہ بات تمام غیر مادی اور غیر حسی معارف و موضوعات اور مباحث میں پائی جاتی ہے اور صرف قرآن مجید سے اختصاص نہیں رکھتی بلکہ تمام آسمانی کتب کہ جو بلند پایہ معارف وحقائق پر مشتمل ہیں اور تحریف سے پاک ہیں اور اسی طرح علم فلسفہ میں عنوان قرار پانے والے دینی والٰہی معارف و مباحث میں بھی یہ قاعدہ و ضابطۂ فہم المعانی موجود ہوتا ہے، اسی کی طرف قرآن مجید میں ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے:

سورۂ رعد، آیت ۱۷:

O " اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا "

(خدا نے آسمان سے پانی نازل کیا پھر اس سے ندیاں بہہ پڑیں اپنے اندازے کے ساتھ!)

سورۂ زخرف، آیت ۳، ۴:

O " اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۝ "

(یقیناً ہم ہی نے اسے قرآنِ عربی قرار دیا تاکہ تم اسے سمجھ سکو، حالانکہ وہ ام الکتاب میں ہمارے پاس عظمت و دانائی کے ساتھ محفوظ ہے)

(۲) کچھ معارف کا تعلق معاشرتی امور و مسائل اور فرعی احکام و دستورات سے ہے اور چونکہ اجتماعی و معاشرتی زندگی میں یکسانیت نہیں پائی جاتی بلکہ زمان و مکان کے تقاضوں کے مطابق اس میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں کہ جن کی وجہ سے احکام و دستورات میں بھی ناسخ و منسوخ کا سلسلہ جاری و قائم ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ملحوظ ہوتی ہے کہ قرآن مجید کا نزول تدریجی ہے بنابرایں احکام و دستورات پر مبنی آیات کے معانی کی بابت تشابہ پیدا ہو جاتا ہے اور کسی معنی کا تعین

آسان نہیں رہتا لیکن یہ تشابہ اور معنی کے تعین کی غیر یقینی کیفیت اس وقت دور ہو جاتی ہے جب ان کی تفسیر وتشریح کے لئے آیات محکمات کی طرف رجوع کیا جائے تو آیات محکمات، آیات متشابہات کی وضاحت کر دیتی ہیں جس کے نتیجہ میں کسی طرح کا تشابہ باقی نہیں رہتا بلکہ معنی مقصود معلوم ہو جاتا ہے، یہی حال ناسخ ومنسوخ کا ہے کہ منسوخ کو ناسخ کے تناظر میں دیکھنے سے اس کا معنی ء مراد ومقصود واضح ومعلوم ہو جاتا ہے لہٰذا فروع کی اصول کی طرف بازگشت اور متشابہات کی محکمات کی طرف بازگشت کے درمیان، ہم رنگی کا مسئلہ واضح ہو گیا اور یہ راز معلوم ہو گیا کہ قرآن مجید میں آیات کی دو قسموں میں تقسیم کا فلسفہ کیا ہے اور یہ کہ محکمات، کیونکر متشابہات کی تفسیر وتشریح کرتی ہیں؟ اور فروع کو متشابہات اور اصول کو محکمات سے تعبیر کرنے کی وجہ کیا ہے؟

فتنہ پرور لوگ

○ "فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَأْوِيْلِهٖ"

(تو جن گوں کے دلوں میں کجی ہے وہ اس میں سے متشابہات کی پیروی کرتے ہیں فتنہ پروری کی غرض سے اور اس کی تاویل کرنے کے لئے!)

"زیغ" کا معنی ہے کجی وٹیڑھا پن! اور اس کا لازمی اثر ونتیجہ دل کا اضطراب و پریشانی ہے کیونکہ آیہ مبارکہ میں قلبی اضطراب و پریشانی کا تقابل دل کے سکون واطمینان کے ساتھ مذکور ہے چنانچہ آیت کا ذیلی جملہ اس طرح ہے: "وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا" (اور جو راسخون فی العلم ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے ہیں، سب کچھ ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے)، اس جملہ میں قرآن مجید کی محکم اور متشابہ آیات کے حوالہ سے لوگوں کی قلبی کیفیات کا تذکرہ ہوا ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جن کے دلوں میں کجی ہے اور وہ قلبی اضطراب و پریشانی کا شکار ہوتے ہیں، وہ فتنہ پروری اور غلط تفسیر وتاویل کی غرض سے متشابہ آیات کی پیروی کرتے ہیں، اور ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو راسخ العلم ہیں اور دلوں میں سکون وقرار کی نعمت سے مالا مال ہیں وہ آیات محکمات پر عمل پیرا ہوتے ہیں اور متشابہات پر ایمان تو لاتے ہیں مگر ان کی پیروی نہیں کرتے اور وہ خداوند عالم سے دعا مانگتے ہیں کہ ہدایت کی نعمت سے بہرہ ور ہونے کے بعد ان کے دلوں کو کجی وٹیڑھے پن سے محفوظ رکھے،

اس بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ "متشابہات" کی پیروی کرنے سے مراد اعتقادی پیروی نہیں بلکہ عملی پیروی مقصود ہے یعنی وہ عملی طور پر متشابہات کا اتباع کرتے ہیں.... ، اور متشابہات کی عملی پیروی اسی صورت میں مذموم ہے جب ان کے فہم معانی میں محکمات کی طرف رجوع نہ کیا جائے بلکہ استقلالی طور پر انہی سے ظاہری تمسک اختیار کر کے معانی کا تعین کرتے ہوئے عملی اقدام کیا جائے کیونکہ اگر ان کی تفسیر وتشریح اور ان کے معانی کے تعین کے لئے محکمات کی طرف رجوع کر کے فہم المعنیٰ کا مرحلہ طے کیا جائے تو اس کے بعد ان کی پیروی کرنا متشابہات کی پیروی کرنا نہیں بلکہ محکمات کی پیروی کرنا کہلائے گا کہ جس میں مذمت کی کوئی راہ نہیں ہوتی بلکہ وہ قرین صحت عمل ہے۔

"ابۡتِغَآءَ الۡفِتۡنَةِ" (فتنہ پروری، فتنہ انگیزی، فتنہ پردازی) سے مراد لوگوں کو گمراہ کرنے کی خواہش .... و کوشش ہے کیونکہ "فتنہ" اور "اضلال" (گمراہ کرنا) دو قریب المعنیٰ الفاظ ہیں، گویا خداوند عالم فرماتا ہے کہ وہ لوگ آیات متشابہات کی پیروی کر کے عوام الناس کو آیات الٰہی کی بابت گمراہ کرنا چاہتے ہیں اور اس سے بڑی بات یہ کہ وہ اس ذریعے سے قرآن مجید کی تاویل اور حلال وحرام کے احکام پر مشتمل آیات کی من پسند تشریح وتفسیر کرنے کے درپے ہیں تاکہ اس طرح اپنے آپ کو دین کے پختہ اصولوں کی پیروی سے بے نیاز کر لیں اور بالآخر دین خدا کی اصل واساس ہی باقی نہ رہے،

"تاویل" (باب تفعیل) "اول" سے مشتق ہے جس کا معنیٰ رجوع وبازگشت ہے، لہٰذا "تاویل" کا معنیٰ "لوٹانا" ہوگا۔ اس بنا پر متشابہ کی تاویل سے مراد وہ مرجع.... رجوع وبازگشت کی وہ بنیاد .... ہے کہ جس کی طرف اسے لوٹایا جاتا ہے اور تاویل قرآن کا معنیٰ وہ ماخذ وسرچشمہ ہے جس سے قرآنی معارف اخذ ہوتے ہیں،

خداوند عالم نے اپنے مقدس کلام میں چند مقامات پر لفظ "تاویل" ذکر فرمایا ہے جن میں سے ایک یہ ہے:

سورۂ اعراف، آیات ۵۲، ۵۳:

O "وَلَقَدۡ جِئۡنٰهُمۡ بِكِتٰبٍ فَصَّلۡنٰهُ عَلٰی عِلۡمٍ هُدًی وَّرَحۡمَةً لِّقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ ۝ هَلۡ يَنۡظُرُوۡنَ اِلَّا تَاۡوِيۡلَهٗ ؕ يَوۡمَ يَاۡتِىۡ تَاۡوِيۡلُهٗ يَقُوۡلُ الَّذِيۡنَ نَسُوۡهُ مِنۡ قَبۡلُ قَدۡ جَآءَتۡ رُسُلُ رَبِّنَا بِالۡحَقِّ"

(ہم تو ان کے پاس ایسی کتاب لائے ہیں کہ جسے علم کی بناء پر کھول کھول کر بیان کر دیا گیا ہے جو کہ ہدایت ورحمت ہے ایمان والے لوگوں کے لئے O کیا وہ اب بھی اس کی تاویل کا انتظار کرتے ہیں؟ جس دن اس کی تاویل آئے گی تو جن لوگوں نے اسے اس سے پہلے بھلا دیا وہ یہ کہتے ہوئے دکھائی دیں گے کہ ہمارے رب کے پیغامبر حق ہی لائے تھے)

یعنی وہ یہ کہیں گے کہ پیغمبروں نے جو کچھ کہا وہ حق تھا اور انہوں نے خدا کے بارے میں جو کہا کہ وہ ان کا مولا وآقا ہے وہ درست بات تھی اور ہم خدا کے علاوہ جس کو پوجتے اور پکارتے تھے وہ باطل تھا، اور نبوت (خدا کی طرف سے انبیاءؑ کا بھیجا جانا) حق ہے، اور دین (جو نظام زندگی خداوند عالم نے ہمارے لئے مقرر کر کے انبیاءؑ کے ذریعے ہم تک پہنچایا ہے) وہ

حق تھا، اور یہ بات حق و درست تھی کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو قبروں سے اٹھائے گا، خلاصہ کلام یہ کہ قیامت کے دن ان تمام معارف کی حقیقت واضح و آشکار اور ظاہر ہو جائے گی جو انبیاء علیہم السلام نے پیش کئے اور جن کی بابت انہوں نے خبر دی۔

مذکورہ بالا مطالب کی روشنی میں بعض حضرات کا کہنا ہے کہ آیت میں تأویل سے مراد وہ حقیقت ہے جس کے بارے میں سچی خبر دی گئی جیسے وہ امور کہ جو قیامت کے دن مشہود ہوں گے یعنی کھل کر سامنے آئیں گے اور جیسا کہا گیا تھا اس کے عین مطابق ہوں گے کہ وہ انبیاء و پیغمبرانِ الٰہی اور کتب آسمانی کے بیانات و مندرجات کی صداقت کی منہ بولتی تصویریں ہوں گی۔

لیکن یہ قول درست نہیں کیونکہ اس بناء پر تأویل انہی آیات سے مختص ہو جائے گی کہ جن میں صفات خداوندی، بعض افعال اور قیامت کے دن رونما ہونے والے واقعات اور ظاہر ہونے والے امور سے مطابقت و عدم مطابقت سے کوئی ربط نہیں (کیونکہ مطابقت و عدم مطابقت اس چیز کے بارے میں متصور ہوتی ہے جس کے بارے میں خبر دی گئی ہو اور یہ "خبر" نہیں بلکہ "انشاء" کے باب سے ہیں کہ جس میں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا حکم ہوتا ہے) لہٰذا ان کی بابت تأویل بے معنی ہو جائے گی، کیونکہ ان کی تأویل ان سے باہر نہیں بلکہ خود ان کے ساتھ ساتھ ہوتی ہے، اسی طرح وہ آیات کہ جن میں اخلاقی دستورات مذکور ہیں اور ان کی بابت صریح عقلی تائید پائی جاتی ہے تو ان کی تأویل بھی خود ان کے ساتھ ہوتی ہے اور اسی طرح انبیاءؑ کی سرگزشت اور سابقہ امتوں کی داستانوں پر مشتمل آیات کی تأویل...... اس معنی کی بناء پر زمانہ ماضی میں وجود پذیر ہو چکی ہے لہٰذا قیامت کے دن ان کی تأویل کی بات بے معنی ہے، اس کے علاوہ یہ کہ ظاہراً آیہ میں تأویل کی اضافت پوری کتاب کی طرف ہے آیات میں سے خاص قسم کی طرف نہیں (هَلۡ يَنۡظُرُوۡنَ اِلَّا تَاۡوِيۡلَهٗ ؕ يَوۡمَ يَاۡتِىۡ تَاۡوِيۡلُهٗ......)، جبکہ تأویل کا جو معنی پیش کیا گیا ہے اس کی بناء پر اس کا تعلق صرف چند آیات سے ہوگا پوری کتاب سے نہ ہوگا۔

زیر نظر آیۂ مبارکہ کی مانند ایک آیت سورۂ یونس میں ہے جس میں اس طرح ارشاد حق تعالیٰ ہے:

O "وَمَا كَانَ هٰذَا الۡقُرۡاٰنُ اَنۡ يُّفۡتَرٰى...... اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰٮهُ...... بَلۡ كَذَّبُوۡا بِمَا لَمۡ يُحِيۡطُوۡا بِعِلۡمِهٖ وَلَمَّا يَاۡتِهِمۡ تَاۡوِيۡلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ فَانۡظُرۡ كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيۡنَO"، (آیت ۳۹)، (اور ایسا نہ تھا کہ اس قرآن کو غلط نسبت دی جائے ...... یا وہ کہتے ہیں کہ (پیغمبرؐ) نے خود اس کی جھوٹی نسبت دی ہے (اسے غلط طور پر خدا سے منسوب کیا ہے)...... بلکہ وہ اس چیز کی تکذیب کرتے ہیں جس سے آگاہی نہیں پا سکتے اور ابھی تک ان کے پاس اس کی تأویل آئی ہی نہیں اسی طرح ان سے پہلے لوگوں نے تکذیب کی، آپ دیکھیں کہ ظالموں کا انجام کیا ہوا۔)

چنانچہ آپ نے ملاحظہ کیا ہے کہ اس آیت میں تأویل کی اضافت پوری کتاب کی طرف دی گئی ہے (تأویلہٗ)،

بہرحال اسی معنی کی بناء پر بعض مفسرین نے کہا ہے کہ "تأویل" دراصل ایک نفس الامری حقیقت ہے کہ جس پر کلام کا دارومدار ہوتا ہے اور وہ کلام کی اصل بنیاد ہوتی ہے اور وہ ہر مورد وموضوع میں اپنا خاص ومخصوص معنی رکھتی ہے مثلاً کسی "خبر" میں اسی چیز سے عبارت ہوتی ہے جس کے بارے میں خبر دی گئی ہو (یعنی وہ حقیقت کہ جو خارجی وجود رکھتی ہے) خواہ وہ (خبر) اس چیز کے بارے میں ہو جو زمانہ ماضی میں واقع ہوئی تھی جیسے انبیاءؑ کی داستانیں اور گزشتہ اقوام کی سرگذشت، یا مستقبل میں ظہور پذیر وجلوہ گر ہوگی جیسے وہ آیات کہ جن میں صفات واسماء الٰہی اور اس کے وہ وعدے جو اس نے اپنی مخلوق سے کئے ہیں اور وہ سب کچھ جو قیامت کے دن رونما ہوگا، اور "انشاء" (اوامر ونواہی اور عملی دستورات وغیرہ) میں ان حکمتوں سے عبارت ہوتی ہے جن کی بناء پر احکام صادر ہوتے ہیں مثلاً آیاتِ احکام میں سے یہ آیت مبارکہ: "وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا" (سورۂ اسریٰ آیت ۳۵) ... اور جب تم ناپ تول کرو تو پیمانہ پورا کرو اور صحیح و درست ترازو کے ساتھ وزن کرو، یہی بہتر اور نہایت اچھا نتیجہ عمل ہے ... تو یہ وہ مصلحت و حکمت ہے جس پر انسانی معاشرہ کے امور کا بہتر طور پر انجام پانا ممکن ہے یعنی ناپ تول اور وزن میں عادلانہ وصحیح روش اپنانے اور ناپی تولی جانے والی چیزوں میں پورا پیمانہ اور وزن کا پورا ترازو برقرار رکھنا معاشرتی زندگی کو خوشگوار وخوشحالی کی راہ پر گامزن رکھ سکتا ہے، یہی وہ امر ہے جو احکامات کے صادر ہونے کا بنیادی سبب ہے۔

لیکن یہ قول اس بناء پر مخدوش ہے کہ:

(۱) ظاہرا لآیہ یہ ہے کہ تأویل ایک خارجی وجود رکھنے والی حقیقت ہے اور ایک حقیقی اثر ونتیجہ ہے جو کہ لوگوں کے عمل (یعنی ناپ تول کو پورا کرنا اور وزن کو درست برقرار کرنا) پر مترتب ہوتا ہے نہ کہ ایک تشریعی حقیقت، کہ جسے جملہ "وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ۭ ......" میں بیان کیا گیا ہے، بنابرایں تأویل ایک ایسی حقیقت ہے جو کسی دوسری حقیقت کا ملجأ وماویٰ ہے یعنی ایک اور حقیقت کی بازگشت اس کی طرف ہوتی ہے، لہٰذا آیات الکتاب (قرآنی آیات) کو تأویل کی حامل ہونے کی صفت سے متصف کرنا اس حوالہ سے کہ وہ "خبر" میں، خارجی اور وجود رکھنے والی حقیقتوں کی ترجمانی وعکاسی کرتی ہے اور "انشاء" میں، افعال یا خارجی وجود رکھنے والے امور کی نشاندہی کرتی ہیں، درحقیقت، اصل شے کی توصیف نہیں بلکہ اس سے تعلق رکھنے والی شے کی توصیف ہے، ...... یعنی اس طرح آیات الکتاب کی تاویل کا بیان نہ ہوگا بلکہ ان سے مربوط امور کی توصیف ہو جائے گی۔

(۲) تاویل ... کہ جس کا معنی بازگشت اور لوٹنا ہے اگرچہ اس سے مراد وہ حقیقت ہے جس کی طرف کوئی چیز لوٹتی ہے (کسی چیز کی بازگشت اس کی طرف ہوتی ہے) لیکن ہر لوٹنے اور بازگشت کو "تأویل" نہیں کہا جاتا بلکہ اس مقام پر خاص معنی کی حامل بازگشت مراد ہے کیونکہ ہر ملازم اپنے افسر اعلیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے مگر اس رجوع کو تأویل نہیں کیا جاتا،

ہر عدد کی بازگشت ''ایک'' کی طرف ہوتی ہے مگر اس بازگشت کو ''تاْویل'' سے موسوم نہیں کیا جاتا، بنابرایں ''تاْویل'' سے مراد لامحالہ رجوع اور بازگشت کے مطلق اور عام معنی کی بجائے خاص طرز کا رجوع ہوگا چنانچہ اس کی بابت قرآنی دلائل وشواہد بھی موجود ہیں ملاحظہ ہو:

سورۂ کہف، آیت ۷۸:

○ '' سَاُنَبِّئُكَ بِتَاْوِيْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا''

(میں عنقریب تجھے آگاہ کروں گا اس چیز کی تاْویل سے کہ جس پر تو صبر نہ کر سکا)

یہ آیت حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ کے واقعہ کے بارے میں ہے۔ اسی سلسلہ کی دوسری آیت یہ ہے:

سورۂ کہف، آیت ۸۲:

○ '' ذٰلِكَ تَاْوِيْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا''

(یہ ہے اس چیز کی تاْویل کہ جس پر تو صبر نہ کر سکا)

کیونکہ حضرت خضرؑ نے حضرت موسیٰؑ کو اپنے ان تین کاموں کے حقائق سے آگاہ کیا جو انہوں نے انجام دیئے اور حضرت موسیٰؑ نے ان کی ظاہر نگری کی بنیاد پر ان کو مورد سوال و اعتراض قرار دیا یعنی کشتی میں سوراخ کرنا، دیوار تعمیر کرنا اور بچے کو قتل کرنا، تو ان اعمال کے بارے میں حضرت موسیٰؑ نے ان پر اعتراض کیا اور ان سے مربوط حقائق کی طرف عدم التفات کی بناء پر حضرت خضرؑ پر سوالات کی بوچھاڑ کی، دراصل انہوں نے ان اعمال سے مربوطہ حقائق کے علاوہ دیگر معانی اپنی لوحِ ذہن میں ثبت کیے جن کے باعث اعتراض کی راہ نکلی اور انہوں نے صبر و تحمل سے کام نہ لیا بلکہ ان اعمال کی وضاحت طلب کرنے میں جلدی کی، قرآن مجید میں ان تین موارد کا تذکرہ اس طرح ہوا ہے:

(۱)...... سورۂ کہف، آیت ۷۱:

○ '' حَتّٰى اِذَا رَكِبَا فِى السَّفِيْنَةِ خَرَقَهَا''

(جب وہ دونوں کشتی میں سوار ہوئے تو اس نے اس میں سوراخ کر دیا)

(۲)...... سورۂ کہف، آیت ۷۴:

○ '' حَتّٰى اِذَا لَقِيَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ''

(جب وہ ایک نوجوان لڑکے سے ملے تو اس نے اسے قتل کر دیا)

(۳)...... سورۂ کہف، آیت ۷۷:

○ '' حَتّٰى اِذَآ اَتَيَآ اَهْلَ قَرْيَةِ اِسْتَطْعَمَآ اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ يُّضَيِّفُوْهُمَا فَوَجَدَا فِيْهَا جِدَارًا يُّرِيْدُ

اَنْ یَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ "

(جب وہ دونوں بستی والوں کے پاس آئے تو انہوں نے ان سے کھانا مانگا مگر ان لوگوں نے انہیں مہمانی دینے سے انکار کر دیا، پھر انہوں نے اس بستی میں ایک بوسیدہ دیوار دیکھی جو گرنے والی تھی تو اس نے اس کی مرمت کر دی)

حضرت خضرؑ کے ان اعمال پر حضرت موسی علیہ السلام نے اعتراض کرتے ہوئے اس طرح فرمایا:

سورۂ کہف، آیت ۷۱:

○ " اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا ۚ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا اِمْرًا"

(کیا تو نے اس میں اس لئے سوراخ کیا ہے تا کہ اس کے سواروں کو غرق کر دے، تو نے کیا عجیب کام انجام دیا ہے؟)

سورۂ کہف، آیت ۷۴:

○ " اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفْسٍ ۭ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نُّكْرًا"

(کیا تو نے ایک بیگناہ شخص کو کسی جرم کے بغیر قتل کر دیا، تو نے تو بہت برا کام کیا ہے؟)

سورۂ کہف، آیت ۷۷:

○ " لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا"

(اگر تو چاہتا تو اس کام کی اجرت لے لیتا)

گویا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان تین کاموں پر تعجب کرتے ہوئے ان کے مربوط حقائق سے آگاہ ہونے تک صبر کرنے کی بجائے فوراً ان پر اعتراض کر دیا اور ان اعمال کی ظاہری صورتوں اور عام جہتوں کو تصور میں لاتے ہوئے ان کی بابت زبانِ سوال کھول دی،

اور حضرت خضر علیہ السلام نے اپنے ان کاموں کی تاویل ان الفاظ میں حضرت موسیٰؑ کو بتائی:

سورۂ کہف، آیت ۸۲:

○ "وَاَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا ۝ وَاَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَآ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۝ فَاَرَدْنَآ اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّاَقْرَبَ رُحْمًا ۝ وَاَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَكَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا ۚ فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا ۤ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۚ"

(جہاں تک کشتی کا تعلق ہے تو وہ چند مسکینوں کی تھی کہ جو دریا میں کام کر رہے تھے تو میں نے چاہا کہ اسے عیب دار بنا دوں کیونکہ ایک بادشاہ ان لوگوں کی کمین میں تھا کہ جو ہر کشتی پر غاصبانہ قبضہ کر لیتا ہے...... تا کہ وہ اسے غصب نہ کرے...... اور جہاں تک اس بچے کا تعلق ہے تو اس کے والدین مؤمن تھے تو ہمیں یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ وہ انہیں سرکشی و کفر کی جانب کھینچ لے گا لہٰذا ہم نے چاہا کہ خداوند عالم انہیں اس کے بدلے میں اس سے پاکیزہ تر اور رحمدل و مہربان ترین ...... فرزند...... عطا فرمائے، اور وہ دیوار شہر کے دو یتیم بچوں کی ملکیت تھی اور اس کے نیچے ان کا خزینہ پوشیدہ تھا اور ان کا باپ نیک و صالح شخص تھا تو تیرے پروردگار نے چاہا کہ وہ دونوں جوان و بالغ ہو جائیں اور اپنے دفینہ کو نکال لیں، یہ تیرے پروردگار کی طرف سے رحمت و مہربانی کی بنیاد پر ہوا)

پھر حضرت خضرؑ نے حضرت موسیٰؑ کے تمام اعتراضات کے جواب میں یوں کہا: "وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ اَمْرِیْ" (سورۂ کہف، آیت ۸۲) کہ میں نے جو کچھ بھی انجام دیا وہ اپنے طور پر ...... اپنی مرضی سے...... نہیں کیا،

مذکورہ بالا آیات مبارکہ میں "تأویل" سے مراد...... جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا...... کسی چیز کا اپنی اصل صورت اور حقیقی عنوان (مقصد) کی طرف لوٹنا ہے جس طرح سے بچے کو مارنے کی بازگشت اس کی اصلاح و بہتر تربیت کے مقصد کی طرف ہوتی ہے اور فصد یعنی رگوں کو کھولنے اور خون نکالنے کی بازگشت علاج و معالجہ کی طرف ہوتی ہے، اور اس طرح نہیں کہ جیسے ہم کہتے ہیں کہ زید آ گیا تو ہمارے اس قول کی بازگشت اس کے ظاہر بہ ظاہر آ جانے کی طرف ہو...... کیونکہ اسے "خبر" کہا جاتا ہے تأویل نہیں کہا جا سکتا، تأویل کا تعلق پس منظر اور پس پردہ حقیقت و مقصد سے ہوتا ہے...... م،

تأویل کے اسی معنی سے قریب تر مثالیں حضرت یوسفؑ کے قصہ میں بھی ملتی ہیں، ملاحظہ ہو:

سورۂ یوسف، آیت ۴:

○ "اِذْ قَالَ یُوْسُفُ لِاَبِیْهِ یٰۤاَبَتِ اِنِّیْ رَاَیْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ رَاَیْتُهُمْ لِیْ سٰجِدِیْنَ"

(جب یوسفؑ نے اپنے والد سے کہا کہ بابا جان، میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے اور سورج و چاند مجھے سجدہ کر رہے ہیں)

سورۂ یوسف، آیت ۱۰۰:

○ "وَرَفَعَ اَبَوَیْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَقَالَ یٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاْوِیْلُ رُءْیَایَ مِنْ قَبْلُ ۫ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّیْ حَقًّا"

(اور اس نے اپنے والدین کو تخت پر بٹھایا اور جب سب اس کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے، اس وقت اس (یوسف)

نے کہا کہ اے بابا جان! یہ سب اس خواب کی تعبیر ہے جو میں نے دیکھا تھا، اسے میرے پروردگار نے سچ کر دیا ہے)

اگر چہ ان آیتوں میں حضرت یوسفؑ کے والدین اور ان کے بھائیوں کے سجدہ ریز ہونے کی بازگشت اس خواب کی طرف ہے جو حضرت یوسفؑ نے دیکھا تھا کہ جسے "تأویل" سے تعبیر کیا گیا ہے لیکن یہ بازگشت اس طرح سے ہے جیسے کسی مثال کی اس کے ممثل (جس کی مثال دی گئی یا جس کے لئے مثال دی گئی) کی طرف سے ہوتی ہے۔

قصہ یوسفؑ ہی میں ایک اور جگہ یوں ارشاد ہوا:

سورۂ یوسف، آیات ۴۳۔۴۸:

O "قَالَ الْمَلِكُ اِنِّیْٓ اَرٰی سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ یَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّ سَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّ اُخَرَ یٰبِسٰتٍ ؕ یٰٓاَیُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِیْ فِیْ رُءْیَایَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْیَا تَعْبُرُوْنَ ۝۴۳ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ ۚ وَ مَا نَحْنُ بِتَاْوِیْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِیْنَ ۝۴۴ وَ قَالَ الَّذِیْ نَجَا مِنْهُمَا وَ ادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِیْلِهٖ فَاَرْسِلُوْنِ ۝۴۵ یُوْسُفُ اَیُّهَا الصِّدِّیْقُ اَفْتِنَا فِیْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ یَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّ سَبْعِ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّ اُخَرَ یٰبِسٰتٍ ۙ لَّعَلِّیْٓ اَرْجِعُ اِلَی النَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَعْلَمُوْنَ ۝۴۶ قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِیْنَ دَاَبًا ۚ فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِیْ سُنْۢبُلِهٖٓ اِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ ۝۴۷ ثُمَّ یَاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ یَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ ۝۴۸"

(بادشاہ نے کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ سات موٹی تازی گائیں ہیں کہ جنہیں سات دبلی پتلی گائیں کھا رہی ہیں، اور سات سبز خوشے اور دوسرے سات خشک خوشے ہیں، اے اہل دربار! اگر تم خواب کی تعبیر بیان کر سکتے ہو تو میرے خواب کے بارے میں اظہار خیال کرو O انہوں نے کہا کہ یہ خواب پریشان ہے اور ہم اس طرح کے خوابوں کی تعبیر کا علم نہیں رکھتے O ان دو آدمیوں میں سے ایک کہ جسے قید سے رہائی مل چکی تھی اسے کافی دیر کے بعد یاد آیا تو وہ کہنے لگا کہ میں تمہیں اس کی تأویل بتاتا ہوں مجھے بھیج دو O (وہ قید خانہ میں حضرت یوسفؑ کے پاس آیا اور ان سے کہا) اے یوسف! اے سچے انسان! ہمیں اس خواب کے بارے میں بتاؤ کہ سات موٹی تازی گائیں ہیں کہ جنہیں سات کمزور و دبلی پتلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات سبز خوشے ہیں اور سات خشک خوشے ہیں، تاکہ میں لوگوں کے پاس لوٹ جاؤں اور وہ اس خواب کے بارے میں آگاہ ہو جائیں O اس (یوسف) نے کہا: (اس کی تعبیر یہ ہے) کہ تم سات سال تک مسلسل خوب کاشتکاری کرو گے اور جو کچھ تم فصل کاٹو گے اس میں سے تھوڑی مقدار کھا لو گے اور باقی خوشوں میں ذخیرہ کر لو گے O پھر اس کے بعد سات سال نہایت سخت (قحط و خشک) ہوں گے اور جو کچھ تم نے ان کے لئے ذخیرہ کیا ہوگا وہ کھا لیں گے سوائے تھوڑی سی مقدار کے کہ جسے تم بیج کے لئے بچا پاؤ گے)

اسی قصہ میں ایک اور مقام پر یوں ارشاد ہوا:

سورۂ یوسف، آیت ۳۶:

○ " وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيَانِ ؕ قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِيْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ؕ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ...... يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّآ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا"

(اور اس کے ساتھ قید خانہ میں دونو جوان داخل ہوئے ان میں سے ایک نے کہا میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں شراب بنانے کے لئے انگوروں کو نچوڑ رہا ہوں، دوسرے نے کہا میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں سر پر روٹیاں لاد کر جا رہا ہوں اور پرندے کھا رہے ہیں، ہمیں اس کی تأویل بتاؤ کیونکہ ہم آپ کو نیک لوگوں میں سے سمجھتے ہیں ... (یوسف نے کہا) اے میرے قیدی ساتھیو! تم میں سے ایک اپنے مالک کو شراب پلائے گا (دربار شاہی میں ساقی بنے گا) اور دوسرے کو تختہ دار پر لٹکایا جائے گا اور اس کے سر سے پرندے گوشت کھائیں گے، اور جس چیز کے بارے میں تم نے پوچھا ہے یہ اس کی بات حتمی فیصلہ ہے)

ایک اور مقام پر حضرت یوسفؑ کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد ہوا :

سورۂ یوسف، آیت ۶:

○ "وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ"

(اور وہ تجھے خوابوں کی تعبیر کی تعلیم دے)

اور اسی سورہ کی آیت ۲۱ اور آیت ۱۰۱ میں بالترتیب اس طرح ارشاد فرمایا: "وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ" (اور تو نے مجھے خوابوں کی تعبیر سکھائی ہے)

مذکورہ بالا تمام آیات مبارکہ میں لفظ "تأویل" انہی واقعات میں استعمال ہوا ہے جن کی بازگشت خوابوں کی تعبیر کی طرف ہوتی ہے، اور خواب دیکھنے والا جس چیز کو خواب میں دیکھتا ہے وہ انہی حوادث کی ایک مثالی صورت ہوتی ہے۔ بنابرایں خوابوں کی اصل واقعات سے وہی نسبت ہے جو معنی کی اس صورت سے ہے کہ جو اس صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے (جو نسبت معنی اور صورت کے درمیان پائی جاتی ہے وہی نسبت اصل واقعات اور خوابوں کے درمیان ہوتی ہے) یا یوں کہیے کہ اصل واقعات کا خوابوں سے وہی تعلق ہے جو کسی مثال اور اس حقیقت کے درمیان ہوتا ہے جس کی مثال دی گئی ہوتی ہے کہ وہ مثال اس حقیقت کی عکاسی کرتی ہے اور اسے تجسم دیتی ہے، جیسا کہ ان آیات مبارکہ میں مشاہدہ ہوتا ہے جو حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ کے واقعہ میں ہم نے پیش کی ہیں، اور آیہ مبارکہ "وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ ...... وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا"

(سورۂ اسراء، آیت ۳۵)......اور پیمانہ پورا کرو جب تولو......اور نہایت اچھی تأویل......بھی اسی بابت سے ہے۔

یہی حال قیامت کے حالات پر مشتمل آیاتِ مبارکہ میں غور وفکر کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ لفظ "تأویل" سے مراد مذکورہ بالا معنیٰ ہے، ملاحظہ ہو:

سورۂ یونس، آیت ۳۹:

○ "بَلۡ كَذَّبُوۡا بِمَا لَمۡ يُحِيۡطُوۡا بِعِلۡمِهٖ وَلَمَّا يَاۡتِهِمۡ تَاۡوِيۡلُهٗ"

(بلکہ انہوں نے اس چیز کی تکذیب کی جس سے وہ آگاہی حاصل نہ کر سکے اور ان کے پاس اس کی تأویل نہیں آئی)

سورۂ اعراف، آیت ۵۳:

○ "هَلۡ يَنۡظُرُوۡنَ اِلَّا تَاۡوِيۡلَهٗ ؕ يَوۡمَ يَاۡتِىۡ تَاۡوِيۡلُهٗ"

(کیا وہ صرف اس کی تاویل کا انتظار کر رہے ہیں، جس دن اس کی تأویل آجائے گی)

اس کی تائید سورۂ قٓ آیت ۲۲ سے ہوتی ہے جس میں ارشاد حق تعالیٰ ہے:

○ "لَقَدۡ كُنۡتَ فِىۡ غَفۡلَةٍ مِّنۡ هٰذَا فَكَشَفۡنَا عَنۡكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الۡيَوۡمَ حَدِيۡدٌ"

(تو اس امر کی بابت غفلت میں تھا پھر ہم نے تیری آنکھ سے پردہ ہٹادیا تو آج تیری نظر بہت تیز ہے)

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ قیامت کے دن کی جس صورتحال کی بابت انبیاءؑ اور کتب آسمانی نے خبر دی ہے وہ اس حسی مشاہدہ سے قطعی مختلف ہے جو اس دنیاوی زندگی میں ہمارا معمول ہے اور جس طرح قیامت کے دن کی اصل بر پائی اور اس میں حکمفرما نظام و احکام کی کیفیات ہماری دنیاوی زندگی کے معمولات اور روزمرہ کے مشاہدات میں پائی جانے والی کیفیات سے مختلف ہیں اسی طرح اس کی عملی صورتحال بھی ہمارے معمولات سے مختلف ہے۔ بہر حال اس سلسلہ میں مزید وضاحت بہت جلد پیش کی جائے گی، اس بناء پر قیامت کے دن کے حالات کی بابت کتب سماوی میں جو کچھ مذکور ہے اور جو مطالب انبیاء علیہم السلام نے اس سلسلہ میں بیان فرمائے ہیں ان کی بازگشت ان کے ظاہری مصادیق کی طرف اس طرح نہیں جیسے مستقبل کے حالات کے بارے میں دی جانے والی خبروں کی بازگشت مستقبل میں ان امور کے وقوع پذیر ہونے کی طرف ہوتی ہے، ان دونوں کی بازگشت کی کیفیات مختلف ہیں،

مذکورہ بالا مطالب سے درج ذیل تین امور واضح ہو گئے:

(۱) تأویل کی حامل آیت اس کی اصل تأویل کی طرف بازگشت اس طرح نہیں جیسے کسی متشابہ آیت کی محکم آیت کی طرف بازگشت ہوتی ہے۔

(۲) تأویل کا مسئلہ، صرف متشابہ آیات تک محدود نہیں اور نہ انہی آیات سے مختص ہے بلکہ اس کا تعلق تمام قرآنی آیات سے ہے اور ہر آیت تأویل کی حامل ہے لہٰذا متشابہ آیات کی طرح محکم آیات بھی تأویل کی حامل ہیں،

(۳) ''تأویل'' ان مفاہیم میں سے نہیں جن پر الفاظ دلالت کرتے ہیں بلکہ وہ ظاہری حقائق میں سے ایک ہے اور آیات کو تأویل کی صفت سے متصف کرنا اس سے تعلق رکھنے امر و واقعہ کے حوالہ سے ہے، اور جہاں تک اس لفظ (تأویل) کے استعمال سے ظاہری الفاظ کے مخالف معانی مراد لینے کا تعلق ہے تو یہ بات نزول قرآن کے زمانہ میں نہیں بلکہ اس کے بعد سامنے آئی ہے لہٰذا آیہ مبارکہ ''وَابْتِغَآءَ تَأْوِیْلِهٖ وَمَا یَعْلَمُ تَأْوِیْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ'' میں ''تأویل'' سے خلاف الظاہر معنی مراد لینا بلا دلیل ہے۔ اسی طرح تأویل کے جو معانی ذکر کئے جاتے ہیں ان میں سے اکثر کہ جن کی تفصیل عنقریب ذکر کی جائے گی ان کی صحت پر کوئی دلیل موجود نہیں۔

تأویل کا علم

○ ''وَمَا یَعْلَمُ تَأْوِیْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ''
(اور اس کی تأویل کوئی نہیں جانتا سوائے اللہ کے)

اس جملہ میں ''تَأْوِیْلَهٗ'' کی ضمیر (ہٗ) کی بازگشت بظاہر ''ما تشابہ'' کی طرف ہے کیونکہ عبارت میں وہی نزدیک ترین مرجع ..... کہ جس کی طرف ضمیر کو لوٹایا جا سکے ہے جیسا کہ جملہ ''وَابْتِغَآءَ تَأْوِیْلِهٖ'' میں بھی یہی صورت پائی جاتی ہے، البتہ آپ اس امر سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ ''تأویل'' کی آیات متشابہات کی طرف بازگشت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ انہی میں محدود ہے بلکہ جس طرح آیات متشابہات تأویل کی حامل ہیں اسی طرح آیات محکمات بھی تأویل رکھتی ہیں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ''تَأْوِیْلِهٖ'' میں ضمیر (ہ) کی بازگشت ''الْکِتٰبَ'' کی طرف ہو جیسا کہ جملہ ''مُتَشٰبِهٰتٌ مِنْهُ'' میں ضمیرہٗ (منہ) کی بازگشت اصل کتاب کی طرف ہے (اس بناء پر کتاب (قرآن) کی تمام آیات خواہ محکم ہوں یا متشابہ، تأویل کی حامل قرار پائیں گی۔

زیر نظر جملہ (وَمَا یَعْلَمُ تَأْوِیْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ) سے بظاہر یہ ثابت ہوتا ہے کہ تأویل کا علم صرف اور صرف خدا کے پاس ہے اس کے سوا کوئی تأویل کا علم نہیں رکھتا، اور جملہ ''وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ'' مستقل جملہ ہے کیونکہ ظاہر الکلام سے

معلوم ہوتا ہے کہ "وَالرّٰسِخُوْنَ" میں حرف واو سابقہ جملہ کی طرف عطف کے لئے نہیں بلکہ مستقل اور نئے جملہ کا اشارہ دیتی ہے، لہٰذا آیت کا معنی یہ نہ ہوگا کہ "اس کی تأویل کوئی نہیں جانتا سوائے خدا اور راسخون فی العلم کے، گویا یہ ابتدائے آیت کے جملہ "فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ" کے مقابل میں ان لوگوں کا تذکرہ کرتا ہے جو متشابہات کی پیروی نہیں کرتے، بنابرایں آیت کا معنی یہ ہوگا کہ کتاب سے استفادہ کرنے والوں کی دو قسمیں ہیں، کچھ لوگ وہ ہیں جن کے دلوں میں کجی و ٹیڑھا پن ہے اور وہ "مَا تَشَابَهَ" یعنی متشابہات کی پیروی کرتے ہیں اور کچھ لوگ وہ ہیں کہ جب کوئی متشابہ آیت ان کے سامنے آتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ "ہم اس پر ایمان لائے ہیں (قرآن پر ایمان لائے ہیں) سب کچھ ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے"۔ دراصل ان لوگوں کے اختلاف کی وجہ ان کے دلوں کی کیفیات اور حالات ہیں کہ پہلے گروہ کے لوگوں کے دلوں میں کجی جبکہ دوسرے گروہ کے افراد ایسے ہیں کہ علم ان کے دلوں میں گھر کر گیا ہے۔

اس کے علاوہ اگر "وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ" میں حرف واو عطف کے لئے ہو اور جملہ اس طرح ہو کہ کتاب کی تأویل کوئی نہیں جانتا سوائے خدا اور "رَاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ" کے، گویا دونوں اس امر میں شریک ہیں، تو اس صورت میں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ ان (رَاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ) میں سے ہیں اور ان میں سب سے افضل و برتر ہیں جبکہ یہ بات کیونکر قابل تصور ہے کہ قرآن مجید آنحضرتؐ کے قلب مبارک پر نازل ہو اور آپ کو معلوم نہ ہو کہ اس کی آیات سے کیا مراد لیا گیا ہے (یعنی یہ کس طرح ممکن ہے کہ آنحضرتؐ اپنے دل پر اترنے والی کتاب کی آیات متشابہات کے معانی سے ناآگاہ ہوں؟)، اس کے ساتھ ساتھ یہ امر کسی سے پوشیدہ نہیں کہ قرآنی بیانات کا اسلوب و ادب یہ ہے کہ جب امت اسلام یا ان لوگوں کا توصیفی تذکرہ کرے جن میں آنحضرت بھی شامل ہوں تو سب سے پہلے منفرد صورت میں آنحضرتؐ کا ذکر ہوتا ہے اور آپؐ کی عزت و عظمت کے عملی احترام کی بناء پر امتیازی طور پر آپؐ کا تذکرہ کیا جاتا ہے اور اس کے بعد دیگر تمام افراد کا ذکر ہوتا ہے، ملاحظہ ہو:

سورۂ بقرہ، آیت ۲۸۵:

○ "اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ"

(ایمان لایا پیغمبر اس چیز پر جو اس کی طرف اس کے رب کی طرف سے نازل کی گئی اور مومنین ...... ایمان لائے)

سورۂ توبہ، آیت ۲۶:

○ "ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِیْنَتَهٗ عَلٰی رَسُوْلِهٖ وَعَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ"

(پھر اس نے اپنی متاع سکون اپنے رسول پر اور مومنین پر نازل کی)

سورۂ توبہ، آیت ۸۸:

O "لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ"

(لیکن رسول اور وہ لوگ جو اس کے ساتھ ایمان لائے)

سورۂ آل عمران، آیت ۶۸:

O "وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا"

(اور یہ نبی اور وہ لوگ جو ایمان لائے)

سورۂ تحریم، آیت ۸:

O "لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ"

(اللہ رسوانہیں کرتا نبی کو اور ان لوگوں کو اس کے ساتھ ایمان لائے)

ان کے علاوہ دیگر متعدد آیات میں پہلے حضرت پیغمبر اسلام کا نام لیا گیا اور پھر امت واہل ایمان کا تذکرہ کیا گیا،

بنابریں اگر جملہ "وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ" سے "عالمون بالتأویل" (آیات کی تأویل کا علم رکھنے والے) مراد ہوتا..... کہ جن میں حضرت پیغمبر اسلامؐ یقینی طور پر شامل ہیں.....تو آیت مبارکہ اس طرح ہوتی: "وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ" (اور نہیں جانتا اس کی تأویل کو سوائے اللہ اور اس کے رسول اور راسخون فی العلم کے) البتہ اس مقام پر یہ بات ممکن ہے کہ آیت کے ابتدائی الفاظ سے استناد کرتے ہوئے یہ کہا جائے کہ جب آنحضرتؐ عالم بالکتاب تھے اور کتاب کے تمام معانی و مفاہیم اور حقائق واسرار سے واقف تھے تو" هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ" کے بعد دوبارہ آپؐ کا تذکرہ کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی ...اس لئے "وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ" کے بعد "ورسولهٗ" کہنے کی بجائے "وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ" کہا گیا ہے۔

نتیجۂ کلام یہ کہ ظاہراً آیہ سے ثابت ہوتا ہے کہ تأویل کا علم خداوند عالم سے مخصوص ومنحصر ہے اس کے علاوہ کوئی اس کا حامل نہیں، البتہ اس سے کسی استثنائی صورت کی نفی نہیں ہوتی یعنی یہ کہ خداوند عالم اپنے سوا ہر ایک سے علم بالتأویل کی نفی کرنے کے بعد آنحضرت کو استثناء کر کے علم بالتأویل کا حامل قرار دے جیسا کہ علم غیب کے خدا کے ساتھ مخصوص و منحصر ہونے کے بیان پر مشتمل آیات مبارکہ میں بعض رسولوں کے استثناء کا تذکرہ ہے مثلاً:

سورۂ جن، آیت ۲۷:

O "عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰي غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ۝ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ"

(غیب کا عالم ہے، وہ اپنا غیب کسی پر ظاہر نہیں کرتا سوائے اس رسول کے کہ جسے پسند کرے)

اور نہ ہی اس بات کی نفی ہوتی ہے کہ "رَاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ" ہی کو مستثنیٰ قرار دیا جائے کیونکہ زیر نظر آیہ مبارکہ کہ جس میں راسخون فی العلم کا توصیفی ذکر ہوا ہے اور ان کی بعض صفات بیان کی گئی ہیں (یعنی وہ جب کسی آیت متشابہ کو دیکھتے ہیں تو اس کی بابت سکوت اختیار کر لیتے ہیں اور کوئی منفی رائے قائم یا ظاہر نہیں کرتے اور وہ مریض دل لوگوں کی طرح نہیں بلکہ ایمان وتسلیم کی منزل پر فائز ہیں) اور وہ آیات کہ جن میں "رَاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ" کے تمام یا بعض افراد کو قرآنی حقائق اور طویل آیات کا عالم قرار دیا گیا ہے، ان کے درمیان کسی طرح کا مفہومی تصادم وتنافی نہیں پائی جاتی ...... یعنی وہ ایک دوسرے کی نفی نہیں کرتیں، اس موضوع کی بابت تفصیلی تذکرہ بہت جلد ہوگا۔

راسخون فی العلم کا قول

○ "وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ"

(اور جو لوگ رَاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ ہیں وہ کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے، سب کچھ ہمارے رب کی طرف سے ہے)

"رسوخ" کا معنی نہایت مضبوطی اور گڑ جانا ہے۔ (کہا جاتا ہے: "رسخ العلم فی القلب"، علم دل میں جاگزیں ہوگیا)

اس آیہ مبارکہ میں "رَاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ" کو "الَّذِيْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ" (وہ لوگ کہ جن کے دلوں میں کجی ہے) کے مقابل میں ذکر کیا گیا ہے اور پھر ان کی توصیف اس طرح کی گئی ہے کہ "وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے سب کچھ ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے" اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں ان کی مکمل پہچان کروائی گئی ہے کہ وہ خداوند عالم اور اس کی آیات کے بارے میں اس طرح علم وآگاہی رکھتے ہیں کہ اس سلسلہ میں انہیں کسی طرح کا شک وشبہ لاحق نہیں ہوتا، اور محکمات کے بارے میں جو علم انہیں حاصل ہے وہ پائیدار ومستحکم ہے کہ جس میں عدم استحکام وبے ثباتی اور تزلزل نہیں پایا جاتا، بلکہ وہ اس پر کامل ایمان رکھتے ہیں اور عملی طور پر اس کا اتباع کرتے ہیں اور جب ان کے سامنے کوئی متشابہ آیت آتی ہے تو اس کا متشابہ ہونا ان کے دلوں میں اضطراب وبے چینی پیدا نہیں کرتا کیونکہ وہ پختہ وپائیدار علم کے حامل ہیں اور آیات کا علم ان کے دلوں میں جاگزیں ہو چکا ہے بلکہ وہ اس پر ایمان لا چکے ہیں اور اعتقادی طور پر اس سے پختہ فکری وابستگی رکھتے ہیں البتہ اس کی

بابت عملی سکوت اختیار کرتے ہیں اور اس کے اتباع میں عملی اقدام سے رک جاتے ہیں۔

"رَاسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ" کے اس قول میں کہ "ہم اس پر ایمان لائے اور سب کچھ ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے" (اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا) ان کے راسخون فی العلم ہونے کی دلیل اور نتیجہ گفتار دونوں مذکور ہیں کیونکہ محکم اور متشابہ دونوں قسم کی آیات مبارکہ کا خدا کی طرف سے نازل ہونا اس بات کا متقاضی ہے کہ سب آیات پر ایمان لایا جائے ......خواہ وہ محکم ہوں یا متشابہ، البتہ اس فرق کے ساتھ کہ محکم آیات کے مطالب کا واضح و روشن ہونا ان پر عمل کرنے اور عملی پیروی کا موجب بنتا ہے جبکہ متشابہ آیات کے معانی و مطالب کا عدم وضوح کسی عملی اقدام کا باعث نہیں ہوتا لیکن عملی اقدام سے رک جانا ان کے انکار و رد کے طور پر نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ بھی خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہوتی ہیں البتہ ان پر عمل کرنے کا عدم جواز اس وجہ سے ہے کہ وہ اپنے متشابہ معانی کی بناء پر محکم آیات کے منافی دکھائی دیتی ہیں جبکہ اس کے برعکس محکم آیات کا واضح و روشن بیان ان کی عملی پیروی کو لازم قرار دیتا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ متشابہ آیات کے ان معانی پر عملی پیروی کی جائے جن میں محکمہ ایات کے معانی سے احتمالی مطابقت پائی جاتی ہو، یہ بات بعینہ متشابہ آیات کو محکم آیات کی طرف لوٹانے کی ایک صورت ہے۔ بنابرایں جملہ "كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا" دونوں اومر کی بابت بمنزلۂ دلیل کے ہے: (۱) تمام قرآن پر ایمان لانا اور محکم آیات پر عمل کرنا (۲) متشابہ آیات پر ایمان لانا اور عمل کے مرحلہ میں محکم آیات کی طرف رجوع کرنا...... یہ دونوں مطالب، جملہ "كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا" سے ثابت ہوتے ہیں۔

ایمان والوں سے خطاب

○ "يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا..."

(اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو......)

"تذکر" سے مراد کسی چیز کی دلیل سے آگاہی پانا ہے تاکہ اس کے ذریعے مربوطہ شے کا اثبات و استنتاج ہو سکے، چونکہ جملہ "كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا" ...... جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے...... رَاسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ کی طرف سے استدلال کے طور پر تھا اور اس شے سے آگاہی پانے کا قطعی اظہار تھا کہ جن کا ثبوت ان کے اعمال میں پایا جاتا تھا لہٰذا خداوند عالم نے اسے "تذکرہ" سے موسوم کیا اور اس پر ان کی مدح و تعریف کی،

"الباب" لُبّ (لام پر پیش اور ب پر شدہ کے ساتھ) کی جمع کا صیغہ ہے اور اس کا معنی خالص عقل ہے کہ جو وہم وغیرہ کی آمیزش سے پاک ہو، خداوند عالم نے اپنے مقدس کلام میں متعدد مقامات پر ان لوگوں کی عمدہ تعریف کی ہے جو خالص عقل رکھتے ہیں اور ان کی توصیف میں ارشاد فرمایا ہے کہ وہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کی طرف خالص توجہ و التفات رکھتے ہیں اور احسن القول یعنی اچھی وعمدہ بات کی پیروی اور اس پر عمل کرتے ہیں، پھر ان کے اوصاف ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ وہ ہمیشہ اپنے پروردگار کی یاد میں رہتے ہیں، اس کے بعد ان کے بارے میں فرمایا کہ وہ "تذکر" والے ہیں یعنی وہ حقائق و معارف کو دلیل و برہان کے ذریعے پاتے ہیں......دوسرے الفاظ میں یہ کہ وہ لوگ دلیل کے ذریعے حقائق تک رسائی حاصل کرتے ہیں.....اور وہ حکمت و دانائی اور معرفت کے حامل ہیں ان کی بابت ارشاد الٰہی ہوا:

سورۂ زمر، آیت ۱۸:

O "وَالَّذِينَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوتَ أَن يَعْبُدُوهَا وَأَنَابُوا إِلَى اللَّهِ لَهُمُ الْبُشْرَىٰ ۚ فَبَشِّرْ عِبَادِ ۝ الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ ۚ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَاهُمُ اللَّهُ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمْ أُولُو الْأَلْبَابِ ۝ "

(اور وہ کہ جنہوں نے طاغوت کی پرستش سے اجتناب و دوری اختیار کی اور اللہ کی طرف لوٹ آئے (صمیم قلب سے توبہ کی) ان کے لئے بشارت وخوشخبری ہے، پس ان بندوں کو خوشخبری دیجئے کہ جو ہر بات کو غور سے سنتے ہیں اور جو اچھی ہوتی ہے اس پر عمل کرتے اور اس کی پیروی کرتے ہیں کہ وہی ہیں کہ جنہیں خدا نے ہدایت کی اور وہی عقل والے ہیں)

اس آیت میں ان کی طرف سے طاغوت کی پرستش سے دوری اختیار کرنے، خدا کی طرف لوٹ آنے اور ہر بات کو غور سے سن کر اس میں سے اچھی بات کو اپنا لینے کا تذکرہ کر کے ان کی مدح کی گئی ہے کہ وہ خدا کی طرف سے نعمت ہدایت سے بہرہ مند اور عقل والے ہیں، ایک اور مقام پر یوں ارشاد ہوا:

سورۂ آل عمران، آیت ۱۹۱:

O "إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ۝ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ"

(بے شک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور گردش لیل ونہار میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں، وہ کہ جو اللہ کو یاد کرتے ہیں کھڑے ہوئے، بیٹھے ہوئے اور لیٹے ہوئے ہر حالت میں)

اس آیت میں ان کے دائمی ذکر اور ہر حال میں خدا کی یاد میں رہنے اور پھر خضوع و انکساری کا جو تذکرہ ہوا ہے دراصل اسی انابت یعنی خدا سے قلبی لو لگانے (اس کی طرف لوٹ آنے) سے عبارت ہے کہ جو ان کے آیات الٰہی کے تذکرہ اور حقائق و معارف تک رسائی کا موجب ہے، چنانچہ اس بات کا ارشارہ ایک مقام پر یوں ہوا:

سورۂ غافر، آیت ۱۳:

○ " وَمَا يَتَذَكَّرُ إِلَّا مَن يُنِيبُ "

اور کوئی شخص تذکر حاصل نہیں کرتا سوائے اس کے کہ جو انابت کا حامل ہو (خدا کی طرف لوٹ آئے اور صمیم قلب سے اس کی طرف رجوع کر لے)

اسی کے مانند یہ الفاظ دیگر مقامات پر بھی موجود ہیں مثلاً:

سورۂ بقرہ، آیت ۲۶۹، سورۂ آل عمران، آیت ۷

○ "وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُوا الْأَلْبَابِ"

(اور کوئی تذکر نہیں پاتا سوائے صاحبان عقل کے)

طلب ہدایت و رحمت

○ "رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْوَهَّابُ"

(اے ہمارے پروردگار! ہمارے دلوں کو ہدایت کرنے کے بعد ٹیڑھا نہ ہونے دے اور ہمیں اپنی طرف سے رحمت عطا فرما کہ بیشک تو ہی عطا کرنے والا ہے)

یہ دعا ان لوگوں کے رسوخ فی العلم (علم و آگاہی کی گہرائی اور کمال) کی واضح نشانی اور روشن علامت ہے کیونکہ ان حضرات نے جب اپنے پروردگار کے بلند و بالا مقام و رتبہ سے آگاہی و معرفت حاصل کر لی اور خدا کی ذات اقدس کا جمال اپنی چشم عقل سے دیکھ لیا تو انہیں اس امر پر یقین حاصل ہو گیا کہ ہر طرح کی مالکیت و اقتدار صرف اور صرف خدائے یکتا کو حاصل ہے اور یہ کہ وہ خود اپنے لئے کسی بھی چیز کے مالک نہیں ہیں، وہ اپنے اس ایمانی مقام و منزلت پر کسی طرح سے آنچ آنے کو گوارا نہیں کر سکتے لہٰذا اس امکان کو خاطر میں لا کر کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ علم کی اس بلندی پر فائز ہونے کے بعد ان کے دلوں میں کجی راہ پالے وہ خدا کی پناہ کے طلبگار رہتے ہیں اور اپنے پروردگار سے یہ التماس و التجا کرتے ہیں کہ ہدایت سے بہرہ مند ہونے کے بعد ان کے دلوں میں کجی نہ آنے پائے

اور خدا انہیں اپنی طرف سے خاص رحمت سے نوازے تاکہ ان کی حاصل شدہ نعمت کو بقا مل جائے اور ہدایت کی راہ پر چلنے اور قربِ خداوندی کی اعلیٰ ترین منزلوں کو طے کرنے میں ان کی مدد ہو۔

ایک سوال اور اس کا جواب

اس مقام پر ممکن ہے کہ کسی کے ذہن میں یہ سوال آئے کہ جب انہوں نے یہ دعا کر لی تھی کہ خدایا، ان کے دلوں کو کجی سے بچانا، تو اس کے بعد اس دعا کرنے کی کیا ضرورت تھی کہ انہیں رحمتِ خاص سے نوازے!

اس کا جواب یہ ہے کہ دلوں کا کجی سے محفوظ ہونا، ''رَاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ'' ہونے کی صفت پر باقی رہنے کا لازمی سبب نہیں ہے کیونکہ عین ممکن ہے کہ ان کے دلوں میں کوئی کجی پیدا نہ ہو جبکہ علم کی دولت سلب ہو جائے، جس کے نتیجہ میں ان کی قدر و منزلت اور ان کی حیثیت و شخصیت چکنا چور ہو جائے، یعنی وہ نہ تو علم کی بناء پر سعادت سے بہرہ مند ہوں اور نہ ہی دلوں کی کجی کی بناء پر شقاوت و بدبختی سے دوچار ہوں بلکہ جہالت و بیچارگی کا شکار ہو جائیں حالانکہ انہیں علم کی اشد ضرورت ہوتی ہے، اس کے باوجود ان کی ضرورت کا سفر جاری و ساری رہتا ہے بلکہ وہ جس راہ پر گامزن ہوتے ہیں اس میں انہیں گوناگوں رحمتیں درکار ہوتی ہیں، ایسی رحمتیں کہ جن کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں اور نہ ہی اس کے علاوہ کوئی شخص ان کو شمار کر سکتا ہے البتہ وہ خود اپنی اس ضرورت کا شعور و احساس رکھتے ہیں اور وہ یہ بات اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ ان کو ''راسخ فی العلم'' ہونے کی جو صفت حاصل ہے اس کی بقا کے اسباب خداوند عالم کے دستِ قدرت میں ہیں چنانچہ اس کا ثبوت ان کے بیان کے ذیلی جملہ میں موجود ہے جس میں انہوں نے بارگاہ احدیت میں عرض کیا: ''رَبَّنَآ اِنَّکَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ'' (اے ہمارے پروردگار، بے شک تو ہی لوگوں کو اس دن جمع کرنے والا ہے کہ جس میں کسی طرح کا شک نہیں)،

بنابرایں ان کا یہ دعا مانگنا کہ ''رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا'' (اے ہمارے رب! ہمیں ہدایت کرنے کے بعد تو ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ کر،) درحقیقت ان کی طرف سے اپنے آپ کو خدا کی پناہ میں دے کر اس بات کا طلب کرنا ہے کہ ان کے دلوں میں کجی نہ آنے پائے اور وہ راسخ فی العلم ہونے کے جس مقام پر فائز ہیں وہ ان کے ہاتھ سے نہ جائے، اور ان کا یہ دعا مانگنا کہ ''وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ'' (اور ہمیں اپنی طرف سے رحمت عطا فرما، کہ بے شک تو ہی عطا کرنے والا ہے)، ابرِ رحمت سے طلبِ باران کرنے کی ایک صورت ہے تاکہ اس کے ذریعے ان کے دلوں کی حیات کو دوام حاصل ہو جائے، اس جملہ (وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً) میں لفظ ''رحمۃ'' نکرہ کی صورت

میں ذکر کیا گیا ہے (یعنی الف ولام کے بغیر..... الرحمۃ کے بجائے...... "رحمۃ" کہا گیا ہے) اور اس کے سرچشمۂ فیض کا ذکر بھی اس کے ساتھ اس طرح کیا گیا ہے "مِنْ لَّدُنْكَ" (اپنی طرف سے) تو یہ ان کی طرف سے مطلوبہ رحمت کی کیفیت سے ناآگاہی کے اظہار کے ساتھ ساتھ اس بات کا بیان بھی ہے کہ وہ بخوبی جانتے ہیں کہ اگر ان کے پروردگار کی طرف سے خاص رحمت ان کے شامل حال نہ ہو اور اس رحمت کا سرچشمہ صرف اور صرف خدا کی ذات اقدس نہ ہو تو ان کی کسی ضرورت کی تکمیل نہ ہوگی اور نہ ہی ان کے کسی بھی مربوطہ امر کے پورا ہونے کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکے گا۔

بہرحال ان کا صرف اور صرف خدا کی پناہ طلب کرنا اور صرف اسی سے خاص رحمت کی استدعا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ہر چیز کی مالکیت کو خدا سے مخصوص و مختص سمجھتے ہیں اور اسے ہی ہر شے کا علی الاطلاق مالک مانتے ہیں اور اس حوالہ سے ظاہری اسباب کو درخور اعتناء قرار نہیں دیتے۔

قیامت کے دن کی حضوری

O "رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ"

(اے ہمارے پالنے والے یقیناً تو ہی لوگوں کو اس دن اکٹھا کرنے والا ہے جس میں کوئی شک نہیں، یقیناً اللہ وعدہ خلافی نہیں کرتا)

یہ جملہ "رَاسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ" کی طرف سے طلب رحمت کی وجہ کے بیان کے طور پر ہے کہ وہ خداوند عالم سے "وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً" (اور ہمیں اپنی طرف سے رحمت عطا فرما) کے الفاظ میں اس لئے رحمت کی استدعا کرتے ہیں کہ انہیں اس بات کا علم ہے کہ نظام خلقت و تبلیغ دین اور انسان کا اپنی وجودی توانائیوں کو بروئے کار لانا سب کچھ قیامت کے دن بارگاہِ خداوندی میں پیش ہونے کا پیش خیمہ ہے، وہ دن کہ جب، رحمت خداوندی کے علاوہ نہ تو کوئی چیز فائدہ مند و کافی ثابت ہو سکتی ہے اور نہ ہی اس کے بغیر کسی کی مدد ممکن ہوگی جیسا کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

سورۂ دخان، آیت ۴۲:

O "اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيْقَاتُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ يَوْمَ لَا يُغْنِيْ مَوْلًى عَنْ مَّوْلًى شَيْـًٔا وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝

اِلَّا مَنۡ رَّحِمَ اللّٰهُ"

(بے شک قیامت کا دن، جو کہ حق و باطل کے درمیان جدائی و فاصلہ (فیصلہ) کا دن ہے تمام لوگ اس دن جمع ہوں گے، اس دن کوئی دوست کسی دوست کے کام نہ آئے گا اور نہ ہی کسی کی مدد ہوگی سوائے ان لوگوں کے کہ رحمت خداوندی جن کے شامل حال ہو جائے)

اسی وجہ سے راسخون فی العلم نے رحمت خداوندی کی درخواست کی اور اس کی نوعیت و کیفیت کا تعین خدا کے سپرد کر دیا تا کہ وہ انہیں ایسی رحمت عطا فرمائے کہ جو ان کے لئے فائدہ بخش ہو اور ان کے مربوطہ امور میں کفایت کرے۔

اور "رَاسِخُوۡنَ فِي الۡعِلۡمِ" نے اپنی دعا میں اس دن کی توصیف ان لفظوں میں کی کہ وہ دن ایسا ہے کہ جس کی بابت کوئی شک نہیں پایا جاتا (لِيَوۡمٍ لَّا رَيۡبَ فِيۡهِ) تا کہ اپنی دعا و طلب کی بابت اپنے قلبی جذبات و تاکیدی رجحانات کو آشکار کر سکیں، اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے جملہ "اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخۡلِفُ الۡمِيۡعَادَ" کے ذریعے بھی اپنے احساسات اور روز قیامت کی توصیف کے مخصوص انداز کی بنیادی وجہ کو بیان کیا کیونکہ وہ حضرات، علم میں رسوخ کے حامل ہیں اور کسی چیز کی بابت علم و آگاہی کی گہرائیوں سے آشنا ہونا اور اس کی کامل تصدیق اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ اس کی نتیجہ بخش بنیادی علت وسبب کا علم حاصل نہ ہو اور ان کا قیامت کے دن کی بابت کسی طرح کے شک وشبہ کا شکار نہ ہونا اس بناء پر ہے کہ خداوند عالم نے اس کے وجود پذیر ہونے کا وعدہ کیا ہے......اور خدا اپنے وعدوں کی خلاف ورزی نہیں کرتا...... لہٰذا ان حضرات نے جب "لِيَوۡمٍ لَّا رَيۡبَ فِيۡهِ" کہا تو اس کے فوراً بعد یہ الفاظ ورد زبان کئے: "اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخۡلِفُ الۡمِيۡعَادَ" (بے شک خدا، اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا)، ...... ان کا اس طرح اظہار اور قیامت کے دن کی "لَا رَيۡبَ فِيۡهِ" سے توصیف کرنا خدا کے وعدۂ حق کی بناء پر ہے کیونکہ خدا نے اس دن کے بارے میں وعدہ کیا ہے اور وہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی ہرگز نہیں کرتا...... ، بعینہ یہ صورت و انداز ان کے پہلے دعائیہ جملے میں پایا جاتا ہے کہ جب انہوں نے کہا: "وَهَبۡ لَنَا مِنۡ لَّدُنۡكَ رَحۡمَةً" (اور ہمیں اپنی طرف سے رحمت عطا فرما) تو فوراً اس کے بعد اس طرح طلب رحمت کی وجہ بیان کی کہ "اِنَّكَ اَنۡتَ الۡوَهَّابُ" (یقیناً تو ہی عطا کرنے والا)، یعنی ان کے طلب رحمت کرنے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ خدا ہی عطا کرنے والا ہے۔

ایک نہایت لطیف ادبی نکتہ

یہاں ایک نہایت لطیف ادبی نکتہ ملحوظ ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے "اِنَّكَ" (بے شک تو) کے بعد "اَنۡتَ" (تو) کا

لفظ ذکر کیا ہے اور "اِنَّ" کی خبر "وَهَّابُ" پر الف ولام لگا کر "الْوَهَّابُ" اسے معرفہ بنا دیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے قول "مِنْ لَّدُنْكَ" (تو اپنی طرف سے) کا بنیادی سبب بیان کرنا چاہتے ہیں اور یہ کہنا چاہتے ہیں کہ رحمت کا عطا کرنا خدا ہی سے مخصوص ہے یعنی عطائے رحمت کی صفت اسی سے مختص ہے...... تیرے سوا کوئی بھی رحمت عطا نہیں کر سکتا......، اسی کی مانند ان کی دعا "رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا" میں بھی یہی انداز کہ انہوں نے دلوں کے ٹیڑھا ہونے سے بچنے کی دعا کے بعد یہ الفاظ کہے: "بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا" (اس کے بعد کہ تو نے ہماری ہدایت فرمائی ہے) گویا وہ کہنا چاہتے ہیں کہ تجھ سے دلوں کے ٹیڑھا نہ کئے جانے کی دعا اس بناء پر کر رہے ہیں کہ تو نے ہمیں ہدایت کی نعمت سے نوازا ہے، بنا برایں ان کی اس دعا کہ اے ہمارے رب! تو ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ کر، اس سبب سے ہے کہ خدا ہی نے ان کے دلوں کو ہدایت عطا کی ہے، لہٰذا انہوں نے کہا کہ تو نے ہی تو ہمیں ہدایت عطا فرمائی ہے!، اسی طرح جملہ "اٰمَنَّا بِهٖ" (ہم اس......قرآن...... پر ایمان لائے ہیں) کے بعد ان کا یہ الفاظ کہنا "كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا" (سب کچھ ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے) بھی قرآن پر ایمان لانے کی وجہ و بنیادی سبب کو بیان کرنے کے طور پر ہے،

بہرحال "رَاسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ" وہ افراد ہیں کہ جو اپنے پروردگار پر ایمان لائے اور اپنے ایمان پر ثابت قدم رہے تو خداوند عالم نے انہیں ہدایت کی نعمت سے نوازا اور ان کی عقلوں کو کمال بخشا، جس کے نتیجہ میں وہ جو کچھ کہتے ہیں وہ صرف علم کی بنا پر کہتے ہیں، علم کے بغیر کوئی بات نہیں کرتے اور نہ ہی کوئی کام بغیر علم کے کرتے ہیں، ان کا قول و فعل علم پر مبنی ہوتا ہے، اسی وجہ سے خداوند عالم نے انہیں "رَاسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ" سے موسوم کیا ہے اور انہیں "اُولُوا الْاَلْبَابِ" کی کنیت عطا فرمائی ہے۔

اگر آپ اس امر پر غور کریں کہ خداوند عالم نے کس طرح اولوا الالباب کی توصیف فرمائی ہے تو آپ کو بخوبی معلوم ہو جائے گا کہ جو صفات خداوند عالم نے ان کے بارے میں ان آیات مبارکہ میں ذکر کی ہیں وہ سب ان پر پوری طرح منطبق ہوتی ہیں اور وہی حضرات ہیں جن کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا:

سورۂ زمر، آیت ۱۷-۱۸:

○ "وَالَّذِيْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ يَّعْبُدُوْهَا وَاَنَابُوْٓا اِلَى اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰى ۚ فَبَشِّرْ عِبَادِ ﴿١٧﴾ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ۭ اُولٰۤىِٕكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰۤىِٕكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿١٨﴾"

(وہ طاغوت کی پرستش سے دوری اختیار کرتے ہیں اور اللہ کی طرف ہی کامل رجوع و توجہ کرتے ہیں، انہی کے لئے خوشخبری ہے۔ تو میرے ان بندوں کو بشارت دیجئے کہ جو ہر بات کو غور سے سنتے ہیں اور جو اچھی بات ہو اس پر عمل پیرا ہو جاتے ہیں وہی ہیں کہ اللہ نے جن کو ہدایت کی نعمت عطا کی اور وہی عقل والے ہیں) تو اس طرح خداوند عالم نے ان کی یہ صفات

بیان فرمائی ہیں: ایمان، اچھی بات کی پیروی کرنا، خدا کی طرف کامل توجہ و رجوع کرنا، خداوند عالم نے زیر بحث آیات مبارکہ میں یہی صفات "رَاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ" کے بارے میں بیان فرمائی ہیں۔

ایک ادبی سوال اور اس کا جواب

یہاں ایک ادبی سوال ممکن ہے اور وہ یہ کہ "رَاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ" نے اپنے بیانات میں پہلے جو انداز سخن اپنایا وہ مخاطب کا تھا مگر بعد والے جملہ میں غائب کے صیغہ کے ساتھ بات کی، اور وہ اس طرح کہ پہلے یہ الفاظ کہے: اے ہمارے پروردگار! تو ہی تمام لوگوں کو اس دن جمع کرنے والا ہے کہ جس میں کوئی شک نہیں پایا جاتا (رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ)، اس میں مخاطب قرار دے کے بات کی، اس کے بعد یوں کہا: یقیناً خدا اپنے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کرتا (اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ) اس میں مخاطب کی بجائے غائب کا صیغہ استعمال کیا، اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ وعدۂ آخرت، راسخین فی العلم کے لئے مخصوص نہیں بلکہ ان کے لئے اور دیگر تمام افراد بشر کے لئے عمومیت اور وسعت کا حامل ہے لہٰذا اس مقام پر یہی موزوں تھا کہ "رَبَّنَآ" کی بجائے لفظ "اللّٰہ" ذکر کریں کیونکہ الوہیت ہر شے پر حاوی، قائم، محیط اور وسعت رکھتی ہے...... اسے نہ تو زمانی، نہ مکانی اور نہ ہی افرادی محدودیت کا شکار کیا جا سکتا ہے بلکہ خداوند عالم کی خدائی کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ کائنات کی ہر چیز اس میں شامل ہے، کوئی چیز اس سے باہر نہیں، اس لئے اسے راسخون فی العلم یا کسی خاص طبقہ کے ساتھ مخصوص قرار نہیں دیا جا سکتا، اسی نکتہ کے پیش نظر راسخون فی العلم نے اپنی خاص دعائیں کرنے کے بعد قیامت کے دن کے تذکرہ کے ذیل میں "اے ہمارے رب" کے الفاظ کی بجائے "اللّٰہ" کا لفظ ذکر کیا تاکہ عقیدۂ الوہیت کی حقیقی اساس پر ایمان کا اظہار ہو سکے۔

محکم، متشابہ اور تأویل کی بابت تفصیلی بحث

محکم، متشابہ اور تأویل کی بابت جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے وہ کلام الٰہی میں غور و فکر کرنے کا نتیجہ اور آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی روایات سے حاصل ہونے والے مطالب کا خلاصہ ہے، اس سلسلہ میں "روایات پر ایک نظر" کے عنوان سے ذکر کیے

جانے والے مطالب میں عنقریب مزید تذکرہ ہوگا، لیکن اہل تفسیر حضرات اس بحث میں سخت اختلاف رائے رکھتے ہیں اور ان کی آراء کا اختلاف اس قدر وسیع و شدید ہوا کہ ان کے درمیان انحرافی نظریات پیدا ہو گئے اور وہ حقیقت الامر سے کوسوں دور ہو گئے، مفسرین کے درمیان پائے جانے والے اس اختلاف رائے کی چھان بین اور تحقیق عمیق کریں تو اس کا سلسلہ صدر اسلام کے ان مفسرین سے ملتا ہے جو صحابہ و تابعین میں سے تھے اور ان کے بیانات میں سے جو کچھ ہم تک پہنچا ہے وہ ہمارے مذکورہ مطالب سے کامل طور پر بجائے خود جزوی طور پر بھی بہت کم مطابقت رکھتا ہے، ان حضرات کے درمیان اس قدر شدید اختلاف آراء اور پھر انحرافی نظریات کے جنم لینے کا اصل سبب یہ ہے کہ محکم و متشابہ اور تأویل کے معنی کی بحث میں خلط ملط ہو گیا جس کے نتیجہ میں اصل مسئلہ کی صورتگری سمیت بحث کی کیفیت اور اس سے حاصل ہونے والے نتائج کی بابت غیر معمولی و عجیب اختلاف پیدا ہو گیا، بنابرایں ہم یہاں چند فصول کے ذیل میں اصل مسئلہ کی مربوطہ جہتوں اور موضوع کے متعلقہ پہلوؤں پر تفصیلی طور پر روشنی ڈالتے ہیں اور جہاں تک ممکن ہوا اس سلسلے میں سے ذکر کئے جانے والے اقوال و آراء اور دلائل کو ذکر کر کے اپنی تحقیقی رائے پیش کریں گے۔

ا۔ محکم اور متشابہ

"اِحکام" (الف کے نیچے زیر کے ساتھ، باب اِفعال)...... کہ جس سے صیغہ اسم مفعول "مُحکَم" (کاف پر زبر کے ساتھ) بنا ہے اور "تشابہ" (باب تفاعل)...... کہ جس سے اسم فاعل "متشابہ" ہے...... دونوں الفاظ کے لغوی معانی واضح و آشکار ہیں اور قرآن مجید میں ان کا استعمال یوں ہوا کہ خداوند عالم نے اسی کو (قرآن کو) ان دو سے متصف کیا ہے چنانچہ ارشاد حق تعالیٰ ہے:

سورۂ ہود، آیت ا:

O "كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ"

(کتاب، کہ جس کی آیات کو محکم کر دیا گیا ہے)

سورۂ زمر، آیت ۲۳:

O "كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ"

(کتاب، کہ جو متشابہ اور دہرائی جانے والی ہے)

ان آیتوں میں واضح طور پر پوری کتاب کو ان دو صفتوں سے متصف کیا گیا ہے تو اب دیکھنا یہ ہے کہ ان سے مراد کیا

ہے؟ اِحکام، سے مراد یہ ہے کہ اس کی آیات مخصوص ترتیب و بیان کی پختگی کی حامل ہیں اور "تشابہ" سے مراد یہ ہے کہ ادائے معنی و بیان مقصود میں پختگی و مضبوطی کے حوالہ سے ایک دوسرے سے مشابہت رکھتی ہے، البتہ جو اہم مطلب قابل توجہ ہے وہ یہ کہ مذکورہ بالا دو آیتوں میں "محکم" اور "متشابہ" ہونے کی نسبت پورے قرآن مجید کی طرف دی گئی ہے جبکہ یہاں زیر بحث آیہ مبارکہ میں خداوند عالم نے اس کی آیات کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے یوں ارشاد فرمایا ہے: "هُوَ الَّذِيٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ" (اللہ ہی ہے کہ جس نے آپ پر کتاب نازل کی ہے کہ جس کی بعض آیات محکم ہیں جو کہ اصل کتاب میں اور بعض متشابہ ہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس آیت میں "محکم" اور "متشابہ" کا جو معنی مراد ہے وہ مذکورہ دو آیتوں میں کہ جن میں پوری کتاب کو "محکم" و "متشابہ" کہا گیا ہے، سے مختلف ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ ان دونوں (محکم اور متشابہ) کے معانی پر بحث کی جائے اور آیات مبارکہ میں سے ان کے مصادیق کا تشخص و تعین کرتے ہوئے یہ دیکھا جائے کہ کونسی آیت محکم اور کونسی متشابہ ہے؟

"محکم" اور "متشابہ" کے معانی کی بابت دس سے زیادہ اقوال پائے جاتے ہیں، ذیل میں ان کا تفصیلی تذکرہ کرتے ہیں:

پہلا قول:

آیات محکمات سے مراد سورۂ انعام کی وہ چند آیات مبارکہ ہیں جن میں یوں ارشاد الٰہی ہوا:

○ "قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۚ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۵۱﴾ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِىَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۵۲﴾ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۵۳﴾"

(کہہ دیجئے کہ آؤ، میں تمہارے سامنے اس حکم کو پڑھوں جس میں تمہارے رب نے تم پر کوئی چیز حرام قرار دی ہے (شرک) اور وہ یہ ہے کہ تم اس کے ساتھ کسی کو شریک قرار نہ دو، ○ والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو، اپنی اولاد کو فقر کے خوف میں قتل نہ کرو، ہم تمہیں رزق دیتے ہیں اور انہیں بھی رزق دیتے ہیں، اور تم کسی برائی کے نزدیک نہ جاؤ خواہ وہ ظاہری ہو

یا باطنی، اورتم اس جان کو قتل نہ کرو کہ جسے خدا نے حرمت کا حامل قرار دیا ہے سوائے استحقاق کے، یہ وہ حکم ہے جس کی خدا نے تمہیں سخت تاکید کی ہے تا کہ تم قوتِ عقل سے کام لے سکو (اور اس حکم پر عمل کر سکو) O اور یتیم کے مال کے نزدیک نہ جانا مگر احسن طور سے، یہاں تک کہ وہ سوج بوجھ کی عمر تک پہنچ جائے، اور تم ناپ تول کو انصاف کے ساتھ پورا کرو، ہم کسی بندے کو اس کی طاقت سے زیادہ کوئی ذمہ داری نہیں سونپتے، اور تم جب کوئی بات کرو تو عدل کے ساتھ کرو خواہ کسی قرابتدار کے بارے میں کیوں نہ ہو، اور اللہ سے کئے ہوئے وعدہ کو پورا کرو، یہ وہ حکم ہے جس کی بابت خدا تمہیں تاکید کرتا ہے تا کہ تم اسے یاد رکھو (اور زندگی میں اسے عملی جامہ پہناؤ) O اور یہ ہی میرا سیدھا راستہ ہے تم اس پر گامزن ہو جاؤ (اس حکم کی پیروی کرو) اور دیگر راستوں کی پیروی نہ کرو ورنہ وہ تمہیں خدا کی راہ سے ہٹا دیں گے، یہی وہ حکم ہے جس کی وہ تمہیں تاکید کرتا ہے تا کہ متقی بن جاؤ'' O

اور آیات متشابہات سے مراد وہ آیات ہیں جن کی بابت یہودیوں کو شبہ لاحق ہوا اور وہ حروف مقطعہ ہیں جو چند سورتوں کے اوائل میں ذکر ہوئے ہیں مثلاً الٓمٓ، حٰمٓ، الٓر وغیرہ، یہودیوں نے جملوں کے حوالہ سے ان حروف کی تاویلیں کیں اور اس بناء پر امت مسلمہ کی زندگی کے دن گننا چاہے، مگر ان کے محاسبات درست ثابت نہ ہوئے اور وہ غلط اندازوں کے نتیجہ میں شبہ کا شکار ہو گئے۔

اس قول کی نسبت صحابہ کرام میں سے صرف ابن عباس کی طرف دی گئی ہے۔

جواب:

یہ ادعاء بلا دلیل ہے اور اگر اسے مقرون بہ صحت تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی محکم اور متشابہ کا انہی دونوں میں منحصر و محدود ہونا ثابت نہیں ہوتا اور اس کے علاوہ یہ کہ اس سے یہ بات لازم آئے گی کہ محکم اور متشابہ کے علاوہ تیسری قسم کو تسلیم کرنا پڑے گا جبکہ ظاہراً آیات سے کسی بھی تیسری قسم کے وجود کی نفی ہوتی ہے۔

البتہ حق بات یہ ہے کہ اس طرح کے قول کی نسبت جناب ابن عباس کی طرف درست نہیں اور ان کی علمی شخصیت کے منافی ہے، جو بات ان کی طرف سے منقول ہے وہ یہ کہ انہوں نے کہا ہے کہ یہ تین آیات، محکمات میں سے ہیں نہ یہ کہ صرف یہی تین محکمات ہیں چنانچہ اصل روایت یوں ہے کہ تفسیر ''در منثور'' میں مذکور ہے کہ سعید بن منصور، ابن ابی حاتم، حاکم (انہوں نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے) اور ابن مردویہ نے عبداللہ بن قیس سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا میں نے ابن عباس سے سنا ہے انہوں نے آیہ مبارکہ ''مِنۡهُ اٰيٰتٌ مُّحۡكَمٰتٌ'' کی تفسیر میں کہا کہ سورۂ انعام کی تین آیتیں کہ جن کی ابتداء ''قُلۡ تَعَالَوۡا'' کے الفاظ سے ہوتی ہے اور اس کے بعد والی دو آیتیں، محکمات میں سے ہیں۔

اس حدیث کی تائید و تصدیق جناب ابن عباس ہی سے مروی اس بیان سے ہوتی ہے جو اسی آیت مبارکہ

(مِنۡهُ اٰیٰتٌ مُّحۡکَمٰتٌ) کی تفسیر میں مذکور ہے کہ انہوں نے کہا: انہی آیات میں سے "قُلۡ تَعَالَوۡا......" سے "لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ" (سورۂ انعام) تک تین آیتیں، اور "وقضی ربک ان لا تعبدوا الا ایاہ......" سے "کان للاوابین غفورا" تک تین آیتیں (سورۂ اعراف) بھی ہیں۔

ان دو روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ جناب ابن عباس نے جن آیات کو ذکر کیا ہے وہ آیات محکمات ہیں چند مثالوں کے طور پر ہے نہ یہ کہ صرف یہی آیتیں محکمات سے ہیں اور ان کے علاوہ کوئی نہیں، یعنی ابن عباس کا بیان بطور مثال تھا نہ کہ محکمات کی تحدید کے طور پر!

دوسرا قول:

یہ پہلے قول کے برعکس ہے اور وہ یہ کہ جو حروف مقطعات سورتوں کی ابتداء میں ذکر ہوئے ہیں وہ آیات محکمات ہیں اور ان کے علاوہ دیگر تمام آیات متشابہات ہیں، اس قول کی نسبت ابی فاختہ کی طرف دی گئی ہے کہ انہوں نے "هُنَّ اُمُّ الۡکِتٰبِ" کی تفسیر میں کہا کہ "اُمُّ الۡکِتٰبِ" سے مراد سورتوں کے ابتدائی حروف ہیں کہ جن کے ذریعے قرآن ماخوذ ہے (جن کے ذریعے قرآن تک پہنچنے کی راہ نکلتی ہے) مثلاً سورۂ بقرہ، الٓمّٓ ۚ ذٰلِکَ الۡکِتٰبُ سے اور سورۂ آل عمران الٓمّٓ ۙ اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ سے استخراج ہوا ہے،

سعد بن جبیر سے منقول ہے کہ انہوں نے بھی "ام الکتاب" سے اسی طرح کا معنی مراد لیا ہے اور کہا ہے کہ یہی حروف مقطعات اصل کتاب ہے کیونکہ وہ سب کے سب پورے قرآن میں مرقوم ہیں،

مذکورہ بالا دونوں روایتوں سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ ابی فاختہ اور سعید بن جبیر کا حروف مقطعات کے بارے میں نظریہ یہ ہے کہ ان سے مراد الفاظ حروف ہیں اور وہ اس طرح کہ خداوند عالم نے جو کتاب تم پر نازل کی ہے وہ یہی حروف مقطعہ ہیں کہ جن سے کلمات اور جملے بنتے ہیں، (اس حوالہ سے یہی حروف اصل الکتاب ہے اور انہی سے آیات کی ترکیب ہوتی ہے)

جواب:

پہلی بات تو یہ ہے کہ حروف مقطعہ کے بارے میں جو کچھ ذکر کیا گیا ہے وہ دعویٰ بلا دلیل ہے اور اس کی صحت پر کوئی ثبوت موجود نہیں، اس کے ساتھ ساتھ یہ کہ یہ نظریہ، آیہ مبارکہ سے مطابقت ہی نہیں رکھتا کیونکہ اس سے یہ بات لازم آئے گی کہ ان حروف مقطعات کے علاوہ باقی پورا قرآن متشابہ ہو، حالانکہ اسی آیہ مبارکہ "مِنۡهُ اٰیٰتٌ مُّحۡکَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ

الْكِتٰبِ......" میں خداوند عالم نے متشابہات کی پیروی کرنے کی مذمت کی ہے وراسے دلوں کے ٹیڑھے پن سے تعبیر فرمایا ہے جبکہ اس کے ساتھ ساتھ اتباع القرآن کی مدح وستائش کرتے ہوئے اسے اوجب الواجبات (سب سے بڑا واجب العمل امر) قرار دیا ہے چنانچہ ارشاد ہوا:

سورۂ اعراف، آیت ۱۵۷:

○ "وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ"

(اور انہوں نے پیروی کی اس نور کی جو اس (رسول) کے ساتھ نازل کیا گیا ہے)

اس کے علاوہ دیگر آیات مبارکہ میں بھی اسی مطلب کو بیان کیا گیا ہے کہ قرآن کا اتباع کریں،......اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر حروف مقطعات ہی کو اصل الکتاب اور محکمات قرار دیا جائے تو باقی پورا قرآن متشابہات کا مصداق ہوگا کہ جس کی پیروی نہ کرنے کا حکم ہے، لہٰذا یہ قول درست نہیں......

تیسرا قول:

"متشابہ" آیت سے مراد وہی ہے جسے مجمل کہا جاتا ہے (یعنی جس کا معنی واضح نہ ہو) اور "محکم" سے مراد مبین ہے (جس کا معنی واضح وآشکار ہے)

جواب:

یہ قول صحیح نہیں کیونکہ آیت مبارکہ میں متشابہ اور محکم کی جو صفات وخصوصیات ذکر کی گئی ہیں وہ "مجمل" اور "مبین" پر منطبق نہیں ہوتیں۔

اس کی وضاحت یوں ہے کہ کسی لفظ کے مجمل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کیفیت میں ہو کہ اس کے معنی کے بعض پہلو دوسرے بعض پہلوؤں سے اس طرح مخلوط ہو جائیں کہ اس سے اصل مراد واضح نہ ہو سکے اور سننے والے یا اس کے مخاطب کو کلام کرنے والے کے حقیقی مقصد سے آگاہی حاصل نہ ہو سکے، اسی لئے اہلِ زبان حضرات کے ہاں تفہیم وتفہم کے اصول وآداب اس طرح قرار پائے ہیں کہ مجمل الفاظ کے استعمال سے اجتناب کیا جائے اور غیر واضح المعنی لفظوں کو کلام میں شامل نہ کیا جائے بلکہ اس طرح کے الفاظ کو بے معنی قرار دے دیا جائے اور اگر اس طرح کے الفاظ کلام میں آ جائیں تو ان کے ساتھ مبین الفاظ کی طرف رجوع کر کے ان کے معانی سے آگاہی حاصل کی جائے اور پھر اس کا اتباع کیا جائے، کیونکہ مجمل کے معنی کا تعین مبین کے ذریعے ہونے کے بعد مجمل بھی مبین کی طرح ہو جائے گا اس صورت میں اصل اتباع مجمل کا ہوا، بنابریں اگر محکم ومتشابہ کو بھی بعینہٖ مجمل ومبین کی طرح قرار دیں تو اس صورت میں اصل اتباع متشابہ کا ہوگا یعنی اس کے معنی کو

سمجھنے کے لئے محکم کی طرف رجوع کر کے اس کی پیروی کی جائے گی تو وہ محکم کی پیروی ہوگی بلکہ محکم کے ذریعے معنی کی آ گاہی حاصل ہونے کے بعد متشابہ کا اتباع ہوگا اور اس طرح کے اتباع کو طبع تکلم و مزاج تفاہم سے ہم رنگی حاصل نہ ہوگی اور اصول البیان میں اس طرح کے اتباع کو روا نہیں سمجھا جاتا لہٰذا کوئی اہل زبان خواہ وہ بیمار دل ہو یا راسخون فی العلم میں سے ہو اس طرح کے اتباع و استعمال کا اقدام نہیں کرتا کہ نتیجتاً متشابہ کا اتباع باعث مذمت اور زیغ القلب کا موجب نہ رہے گا...... جبکہ قرآن مجید میں متشابہ کے اتباع کو مورد مذمت قرار دیا گیا ہے اور اسے بیماریٔ دل کا سبب و موجب بتایا گیا ہے۔

چوتھا قول:

متشابہات سے مراد، وہ آیات ہیں جو منسوخ ہو چکی ہیں کہ جن پر ایمان لانا ضروری ہے مگر ان پر عمل نہیں کی جا سکتا اور محکمات سے مراد وہ آیات ہیں جو ناسخ کہلاتی ہیں کہ جن پر ایمان لانا اور عمل کرنا دونوں ضروری ہیں، اس قول کی نسبت ابن عباس، ابن مسعود اور چند صحابہ کی طرف دی گئی ہے، اسی وجہ سے ابن عباس اپنے آپ کو تأویل القرآن کا عالم سمجھتے تھے۔

جواب:

اگر بالفرض اس قول کو درست تسلیم کر لیا جائے تو اس سے یہ ثبوت ہرگز نہیں ملتا کہ آیات متشابہات صرف منسوخ شدہ آیات ہی ہیں کیونکہ خداوندِ عالم نے زیر نظر آیہ مبارکہ میں اتباع المتشابہ کو فتنہ پروری و تأویل جوئی قرار دیا ہے جو کہ کثیر غیر منسوخ آیات مثلاً صفات و افعالِ خدا کے بیان پر مشتمل آیات میں بھی موجود ہے کہ ان کا اتباع بھی فتنہ و تأویل پردازی قرار دیا جاتا ہے جبکہ وہ آیات منسوخ نہیں ہوئیں ، اس کے ساتھ ساتھ اگر اس قول کو درست قرار دیا جائے تو اس سے یہ بات لازم آئے گی کہ آیات کو محکم اور متشابہ کے علاوہ کوئی تیسرا عنوان بھی حاصل ہو جو کہ محکم و متشابہ کی درمیانی قسم قرار پائے ... حالانکہ قرآن مجید میں واضح طور پر ارشاد ہوا ہے کہ "مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ"

جہاں تک ابن عباس کے نظریہ کا تعلق ہے تو جو بات ان سے منسوب ہے اور محکم و متشابہ کی بابت ان کا نقطۂ نظر ذکر کیا گیا ہے وہ ناسخ و منسوخ سمیت زیادہ وسیع معنی کا حامل ہے اور انہوں نے ناسخ و منسوخ کا ذکر بطور مثال کیا ہے نہ یہ کہ ان کی مراد محکم و متشابہ کے مصادیق کا تعین تھا، چنانچہ ان کے حوالہ سے تفسیر "درمنثور" میں اس طرح مذکور ہے کہ ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم نے حضرت علیؑ کے حوالہ سے ابن عباس کا قول بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: محکمات سے مراد قرآن کی ناسخ آیات اور حلال و حرام و حدود و فرائض پر مشتمل آیات اور وہ سب آیات ہیں کہ جن پر ایمان لانا ضروری ہے، جبکہ متشابہات سے منسوخ شدہ آیات، مقدم و مؤخر، امثال و اقسام اور وہ آیات مراد ہیں جن پر ایمان لانا ضروری ہے مگر ان پر عمل نہیں کیا جا

سکتا (منسوخ شدہ)

پانچواں قول:

محکمات سے وہ آیات مراد ہیں کہ جن کے معانی ومطالب پر واضح وروشن عقلی دلائل موجود ہیں مثلاً وحدانیت، قدرت وحکمت خداوندی کی دلیلیں، اور متشابہات سے وہ آیات مراد ہیں کہ جن کے معانی ومفاہیم کا سمجھنا نہایت غور وفکر اور تدبر پر موقوف ہے۔

جواب:

اگر دلیل کے واضح وروشن ہونے یا نہایت غور وفکر اور تدبر کا محتاج ہونے سے مراد یہ ہے کہ آیت کی عبارت ایسی عقلی دلیل کی حامل ہے کہ جو بداہت کے قریب ہے یا خود بدیہی ہے اور یا یہ کہ اس طرح کی نہ ہو تو اس سے یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ احکام وفرائض وغیرہ پر مشتمل آیات متشابہات قرار پائیں کیونکہ ان کی کوئی واضح وروشن عقلی دلیل موجود نہیں بلکہ وہ اس طرح کی دلیلوں کی ناقد ہیں، تو اس صورت میں ان کا اتباع مذموم قرار پائے گا جبکہ حقیقت الامر یہ ہے کہ وہ واجب الاتباع ہیں، اور اگر دلیل کے واضح وروشن ہونے یا نہایت غور وفکر اور تدبر کا محتاج ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ کتاب ہی سے واضح دلیل کی حامل ہیں یا اس طرح کی دلیل کے نہ ہونے کی وجہ سے تفکر وتدبر کی محتاج ہیں تو اس حوالہ سے تمام آیات مبارکہ یکساں ہیں، اور ایسی کیوں نہ ہوں؟ آخر یہ کتاب ہی ایسی ہے کہ جس کی صفت متشابہ مثانی، نور اور مبین ہے کہ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ پورا قرآن محکم ہو اور کوئی آیت متشابہ نہ ہو جبکہ یہ بات واقع الامر اور نصِ قران؟ قرآنی تصریح...... کے بالکل برعکس ہے۔ کیونکہ تمام آیات، محکمات نہیں بلکہ متشابہات بھی ان میں موجود ہیں۔

چھٹا قول:

''محکم'' سے مراد وہ آیات ہیں جن کے معانی ومقاصد سے آگاہی کا حصول کسی روشن یا غیر روشن دلیل کے ذریعے ممکن ہو اور ''متشابہ'' سے وہ آیات مراد ہیں کہ جن کے مطالب سے آگاہی حاصل کرنا کسی بھی دلیل سے ممکن نہ ہو مثلاً قیامت کے دن کا تعین کہ وہ کب ہوگا، وغیرہ۔

جواب:

یہ قول اس لحاظ سے درست نہیں قرار پاتا کہ محکم اور متشابہ ہونا، دو ایسی صفتیں ہیں کہ جو قرآنی آیات سے ان کے قرآنی آیات ہونے کی حیثیت سے تعلق رکھتی ہیں یعنی اس بناء پر کہ وہ معارف الٰہیہ میں سے کسی مطلب پر دلالت کرتی ہیں

(ان سے معارف الٰہیہ کا ثبوت ملتا ہے)، اور قرآنی آیات میں سے کوئی آیت جس معنی ومقصود کو بیان کرتی ہے وہ ہرگز ایسا نہیں کہ لوگ اس کے سمجھنے سے کلی طور پر قاصر اور اس کے ادراک سے عاجز ہوں یعنی ایسا ممکن نہیں کہ آیت کے الفاظ ہی ایسے ہوں کہ جن کے معانی کا سمجھنا خود انہی لفظوں کے ذریعے یا کسی دوسری آیت سے مدد لے کر بھی ممکن نہ ہو، یہ کیونکر قابل تصور ہے کہ آیت کے الفاظ سے کسی معنی کا سمجھنا مراد ومقصود ہو جبکہ اس کے الفاظ سے وہ معنی سمجھ میں ہی نہ آسکیں؟ یہ بات خداوند دانا وقادر کی نسبت سے ناقابل فہم ہے کہ وہ آیات کے ذریعے کوئی بات لوگوں کو سمجھانا چاہے مگر الفاظ سے اس بات کا سمجھنا لوگوں کے بس میں نہ ہو اور اس کے سمجھنے کی کوئی راہ بھی نہ پائی جائے، جبکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کی توصیف میں فرمایا ہے کہ وہ سرچشمۂ ہدایت ہے، نور ہے، ہر بات کو واضح طور پر بیان کرنے والی ہے اور اس سے بالاتر یہ کہ اسے اس طرح نازل کیا گیا ہے کہ مؤمنین تو بجائے خود، کفار بھی اس کے معانی کو سمجھ سکتے ہیں چنانچہ ارشاد الٰہی ہوا:

سورۂ حم سجدہ آیت ۲۔۴

O "تَنْزِيلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿٢﴾ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿٣﴾ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۚ فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿٤﴾"

(رحمان ورحیم کی طرف سے نازل کی گئی ہے، ایسی کتاب ہے جس کی آیات الگ الگ کر کے اتاری گئی ہیں قرآن ہے جو عربی زبان میں ہے ان لوگوں کے لئے جو علم رکھتے ہیں، خوشخبری دینے والا اور عذاب الٰہی سے ڈرانے والا ہے، مگر لوگوں کی اکثریت نے اس سے روگردانی کی ہے اور وہ اسے سنتے ہی نہیں ہیں)

اسی طرح ارشاد حق تعالیٰ ہے:

سورۂ نسآء، آیت ۸۲:

O "اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۭ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ﴿٨٢﴾"

(آیا وہ قرآن میں غور وفکر اور تدبر نہیں کرتے، اگر وہ غیر خدا کی طرف سے نازل ہوا ہوتا تو وہ اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے)

بنابراین قرآن مجید کی جو آیت بھی کسی مطلب کو بیان کرتی ہے وہ عمومی طور پر قابل فہم ہے اور اس کا فہم وادراک اور اس کے مفہوم سے آگاہ ہونا ہرگز محال وناممکن نہیں، اور جہاں تک ان مطالب کا تعلق ہے کہ جن کا ادراک بشری قوت فکر کی دسترس سے باہر ہے مثلاً قیامت برپا ہونے کا وقت اور غیب کی خبریں وغیرہ تو ایسے مطالب قرآن میں کسی بھی آیت میں مذکور نہیں کہ جن کی بناء پر اسے آیۂ متشابہ قرار دیا جائے۔

اس کے علاوہ یہ قول اس حوالہ سے بھی نادرست قرار پاتا ہے کہ اس کے قائل نے "متشابہ" اور "تأویل" کے معانی

میں خلط ملط کر دیا ہے،......جبکہ ان دونوں میں فرق ہے...... چنانچہ اس حوالہ سے پہلے بھی مطالب ذکر کئے جا چکے ہیں۔

ساتواں قول:

آیاتِ محکمات سے مراد آیات الاحکام ہیں اور ان کے علاوہ دیگر آیات، متشابہات ہیں کہ جو ایک دوسری سے ہم رنگی و ہم آہنگی نہیں رکھتیں بلکہ ایک دوسری سے اجنبی ہیں، اس قول کی نسبت مجاہدؒ اور دیگر محدثین کی طرف دی گئی ہے۔

جواب:

اگر ایک دوسری سے عدم ہم رنگی و عدم ہم آہنگی سے مراد ہر وہ شے ہے کہ جو لفظ سے مرادی معنی کے تعین میں مدد دے یہاں تک کہ مخصص کے ذریعے تخصیص اور مقید کے ذریع تقیید جیسے موارد اور قرائن حالیہ و مقامیہ وغیرہ بھی اس میں شامل ہوں تو آیات الاحکام بھی دیگر آیات کی مانند، متشابہات میں قرار پائیں گی...... کیونکہ ان میں بھی عام و خاص اور مطلق و مقید پائی جاتی ہیں......، اور اگر اس سے مراد ان میں پائے جانے والے ابہام کا حوالہ ہو اور وہ یوں کہ ابہام اس کے مرادی معنی کے تعین میں رکاوٹ ثابت ہو اور احتمالات کی کثرت اس کے مدلول سے آگاہی کے حصول میں مانع ہو کہ جس کی وجہ سے نہ تو آیت اپنے مرادی معنی کا تعین کر سکے اور نہ ہی دیگر آیات کے ذریعے اس کے معنی کے تعین کا مسئلہ حل ہو سکے تو اس صورت میں نتیجہ یہ ہوگا کہ آیات الاحکام کے علاوہ دیگر تمام آیات، متشابہات قرار پائیں اور احکام کے سوا معارف القرآن میں سے کسی بھی چیز کا علم حاصل نہ ہو سکے کیونکہ مذکورہ بالا فرضیہ کی بناء پر آیات الاحکام کے علاوہ کوئی آیت محکمات میں سے نہیں کہ متشابہات میں اس کی طرف رجوع کیا جائے اور اس کے ذریعے متشابہات کے معانی کا تعین اور ان سے آگاہی حاصل ہو سکے،...... دونوں صورتوں میں اس قول کی عدم صحت کا ثبوت ملتا ہے اور یہ کہنا قطعی درست قرار نہیں پاتا کہ آیات الاحکام کے علاوہ دیگر تمام آیات، متشابہات ہیں کیونکہ اس سے معارف القرآن پر مشتمل آیات بے معنی و بے نتیجہ ہو جائیں گی۔

آٹھواں قول:

آیاتِ محکمات سے مراد وہ آیات ہیں جن کی تاویل صرف ایک صورت کی حامل ہو اور آیات متشابہات سے گوناگوں تاویلات یا تاویل کی متعدد صورتوں کی حامل آیات مراد ہیں،

اس قول کی نسبت امام شافعی کی طرف دی گئی ہے، گویا اس نقطۂ نظر سے مراد یہ ہے کہ ''محکم'' اس آیت کو کہتے ہیں جو صرف ایک معنی میں ظہور رکھتی ہو مثلاً نص (جو کہ اپنے معنی میں واضح و صریح ہو) اور اپنے معنی میں قوی ظہور کی حامل ہو جبکہ ''متشابہ'' اسے کہتے ہیں کہ نہ تو اپنے معنی و مراد پر نص قرار پائے اور نہ ہی اس میں قوی ظہور کی حامل ہو۔

جواب:

اس قول میں ''محکم'' اور ''متشابہ'' کی جگہ دیگر الفاظ تبدیل کئے گئے ہیں اس سے زیادہ کچھ نہیں اور وہ اس طرح کہ ''محکم'' کی جگہ یہ الفاظ ذکر کئے گئے: "مالیس لہٗ الا معنی واحد" (وہ کہ جس کا صرف ایک معنی ہو) اور ''متشابہ'' کی جگہ یہ الفاظ ذکر کئے گئے: "مایحتمل معانی کثیرة" (جو کثیر معانی رکھتا ہو)، اس کے علاوہ اس قول میں لفظ ''تأویل'' کا معنی ''تفسیر'' کیا گیا ہے اور یوں کہا گیا کہ ''محکم'' سے مراد وہ آیات ہیں کہ جن کی تأویل صرف ایک صورت کی حامل ہو (مالا یحتمل من التأویل الا وجھاً واحداً) اور ''متشابہ'' سے مراد وہ آیات ہیں جو متعدد تأویلات کی حامل ہوں (مایحتمل معانی کثیرة) جبکہ یہ درست نہیں اور تأویل و تفسیر میں بہت فرق ہے کیونکہ اگر دونوں کا معنی ایک ہوتا اور تأویل بعینہٖ تفسیر ہوتی تو تأویل کا علم خدا یا خدا اور راسخون فی العلم کے ساتھ مختص نہ ہوتا۔ اور اس کی بابت یہ الفاظ ذکر نہ کئے جاتے: "وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ" کہ اس کی تأویل سوائے خدا اور راسخون فی العلم کے، کوئی نہیں جانتا۔ ، حالانکہ قرآن کی بعض آیات دوسری بعض کی تفسیر کرتی ہیں (القرآن یفسر بعضهٗ بعضاً) اور اس حوالہ سے کہ قرآنی آیات کے معانی بذریعہ تفسیر واضح ہو جاتے ہیں تمام مومنین، کفار، راسخون فی العلم اور اہل الزیغ (وہ کہ جن کے دلوں میں ٹیڑھا پن پایا جاتا ہے) سب برابر ہیں اور وہ بعض آیات کو دیگر بعض کے ذریعے تفسیر کر کے آیات کے معانی کو سمجھ سکتے ہیں۔ ... جبکہ تأویل الآیات اس سے مختلف ہے۔

نواں قول:

''محکم'' سے مراد وہ آیات ہیں جن میں انبیاء الٰہیؑ اور ان کی امتوں کے حالات و واقعات واضح و تفصیلی طور پر بیان کئے گئے ہیں، اور ''متشابہ'' سے مراد وہ آیات ہیں کہ جن کے الفاظ میں یکسانیت نہیں پائی جاتی بلکہ انبیاءؑ اور ان کی امتوں کے واقعات متعدد سورتوں میں مکرر ذکر کئے گئے ہیں اور ہر سورت میں مختلف الفاظ استعمال ہوئے ہیں، اس بناء پر یہ بات تسلیم کرنی ہوگی کہ آیات کا ''محکم'' اور ''متشابہ'' دو قسموں میں تقسیم کیا جانا دراصل انہی قصص و واقعات کی بناء پر ہوا ہے۔

جواب:

محکم اور متشابہ کا انبیاءؑ اور ان کی امتوں کے حالات و واقعات کے ساتھ مختص قرار دینا بلا دلیل ہے اور اس کی بابت کوئی ٹھوس ثبوت نہیں پایا جاتا، اس کے علاوہ یہ بات قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید میں ''محکم'' اور ''متشابہ'' کی جو خصوصیات ذکر کی گئی ہیں ان کی رو سے ''محکم'' کی پیروی میں ہدایت اور ''متشابہ'' کی پیروی میں فتنہ پروری اور تأویل جوئی کا ہدف پایا جاتا

ہے، اور یہ بات انبیاءؑ اوران کی امتوں کے واقعات وحالات پر مشتمل آیات میں ہی نہیں بلکہ ان کے علاوہ دیگر آیات میں بھی پائی جاتی ہے اور صرف ان واقعات میں ہی نہیں پائی جاتی کہ جو متعدد آیات میں ذکر کئے گئے ہیں بلکہ اس واقعہ میں بھی پائی جاتی ہے جو صرف ایک بار ذکر ہوا ہے مثلاً زمین میں خلیفہ بنائے جانے کا واقعہ، بنابریں آیات کی ''محکم'' اور ''متشابہ'' میں تقسیم کو آیات القصص سے مختص قرار دینا درست نہیں۔

دسواں قول:

''متشابہ'' اس آیت کو کہتے ہیں جو وضاحت وبیان کی محتاج ہو۔ یعنی اس کا معنی مزید توضیحی بیان کے بغیر سمجھ میں نہ آسکے۔ اور ''محکم'' سے وہ آیت مراد ہے جس کے لئے کسی توضیحی بیان کی ضرورت نہ ہو، اس قول کی نسبت امام احمد بن حنبل کی طرف دی گئی ہے۔

جواب:

یہ قول اس لحاظ سے قرین صحت نہیں کہ تمام آیات الاحکام میں حضرت پیغمبر اسلامؐ کی طرف سے وضاحت و تشریح کی ضرورت ہوتی ہے خواہ وہ آیات محکمات ہی کیوں نہ ہوں، کوئی آیت ایسی نہیں جس کا معنی آنحضرتؐ کی طرف سے وضاحت کا محتاج نہ ہو، اس سلسلہ میں متعدد بار مطالب ذکر کئے جاچکے ہیں، یہ بات ان آیات میں بھی پائی جاتی ہے جو منسوخ ہوچکی ہیں جبکہ منسوخ شدہ آیات بھی آیات متشابہات میں شمار ہوتی ہیں جیسا کہ اس سلسلہ میں پہلے بیان ہوچکا ہے حالانکہ منسوخ شدہ آیات کی بابت کسی وضاحت اور توضیح وتشریح کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن چونکہ ان کا درجہ دیگر آیات الاحکام جیسا ہے لہٰذا ان میں بھی آیات الاحکام کے معانی کو سمجھنے کا اصول اور قاعدۂ کلیہ جاری ہوتا ہے۔

گیارہواں قول:

''محکم'' اس آیت کو کہتے ہیں جس پر ایمان لانا اور عمل کرنا دونوں واجب ہیں جبکہ ''متشابہ'' پر ایمان لانا واجب مگر اس پر عمل نہیں کیا جاسکتا، اس قول کی نسبت ابن تیمیہ کی طرف دی گئی ہے، ممکن ہے کہ اس کی مراد یہ ہو کہ جو آیات کسی حکم و فرمان پر مشتمل ہوں وہ محکمات ہیں اور جن آیات میں صرف واقعات ذکر کئے گئے ہیں وہ متشابہات کہلاتی ہیں، جیسا کہ بعض اہل علم حضرات نے بھی ابن تیمیہ کے قول سے مذکورہ بالا مطلب کا احتمال ذکر کیا ہے، ورنہ اس قول کو مستقل قول قرار دینے میں کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کیونکہ اس سے پہلے جو اقوال ذکر کئے گئے ہیں ان میں سے ہی بعض اس سے مطابقت رکھتے ہیں۔

جواب:

اس قول سے یہ بات لازم آتی ہے کہ آیات الاحکام کے علاوہ دیگر آیات بھی متشابہات ہوں کہ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ احکام کے علاوہ دیگر معارف الٰہیہ میں سے کسی چیز کا علم حاصل نہ ہوسکے کیونکہ دیگر معارف میں عمل کا پہلو نہیں پایا جاتا، اس کے علاوہ یہ کہ ان آیات میں کوئی آیت، محکم نہ ہوگی کہ جس کی طرف رجوع کر کے متشابہ آیت کا معنی معلوم کیا جاسکے، اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی لازم آئے گی کہ منسوخ شدہ آیات جو کہ سب کی سب انشاء اور حکم وفرمان پر مشتمل ہیں وہ ''محکمات'' قرار پائیں جبکہ حقیقت الامر یہ ہے کہ قطعی طور پر وہ آیات متشابہات ہیں۔

البتہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن تیمیہ کے اس قول سے کہ ''جس آیت پر ایمان لانا اور عمل کرنا ضروری ہو وہ ''محکم'' اور جس پر صرف ایمان لانا ضروری ہو وہ ''متشابہ'' ہے مراد وہ معنی ومفہوم ہے کہ جس کا ثبوت زیر بحث آیہ مبارکہ میں ملتا ہے چنانچہ ارشاد الٰہی ہوا: "فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَاتَشَابَهَ مِنْهُ"......"وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا"......، (وہ لوگ کہ جن کے دلوں میں کجی پائی جاتی ہے وہ ان آیات کی پیروی کرتے ہیں جو متشابہ ہیں) (اور جو لوگ راسخون فی العلم ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے ہیں سب کچھ ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے)، تاہم جو بات لائق توجہ ہے وہ یہ کہ اس قول میں کہا گیا ہے کہ ''محکمات'' وہ ہیں کہ جن پر ایمان لانا اور ان پر عمل کرنا ضروری ہے اور ''متشابہات'' وہ ہیں کہ جن پر صرف ایمان لانا ضروری ہے ان پر عمل نہیں کیا جاسکتا، تو اس حوالہ سے قرآن پر ایمان لانے والے ہر شخص کے لئے پہلے یہ بات ضروری ہوگی کہ ''محکمات'' اور ''متشابہات'' کی درست پہچان کرے اور یہ واضح ہو کہ کون سی آیات محکم اور کون سی متشابہ ہے تاکہ جو ''محکم'' ہو اس پر ایمان اور عمل کو یقینی بنائے اور جو متشابہ ہو اس پر صرف ایمان کے کافی ہونے کا یقین حاصل کرے، بنابرایں، ''محکم'' اور ''متشابہ'' سے ان کے مصادیق کی پہچان کی بناء پر آگاہی حاصل کرنا کافی نہیں ہوسکتا جو کہ ایک واضح مسئلہ ہے۔

بارھواں قول:

''متشابہات'' سے بالخصوص وہ آیات مراد ہیں جن میں صفات بیان کی گئی ہیں خواہ وہ صفات خداوند متعال کی ہوں جیسے ''علیم''، ''قدیر''، ''حکیم''، ''خبیر'' یا صفات انبیاء الٰہیؑ ہوں جیسا کہ خداوند عالم نے حضرت عیسیٰؑ بن مریمؑ کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے:

سورۂ نسآء، آیت ۱۷۱:

○ "وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ"

(اور وہ کلمہ تھا کہ جسے خدا نے مریم کو القاء کیا اور وہ اس کی طرف سے روح تھے)

یہ اور اس طرح کی دیگر آیات، اس قول کی نسبت بھی ابن تیمیہ کی طرف دی گئی ہے۔

جواب:

اگر بالفرض یہ بات تسلیم بھی کر لی جائے کہ صفات کے ذکر پر مشتمل آیات، متشابہات ہیں لیکن ان کے انہی آیات میں منحصر و محدود ہونے کی کوئی دلیل موجود نہیں، یعنی عین ممکن ہے کہ ان کے علاوہ دیگر آیات بھی متشابہات ہوں،

ابن تیمیہ کے بعض طولانی بیانات سے کہ جو اس کی طرف سے منقول ہیں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے ''محکم'' اور ''متشابہ'' سے ان کے لغوی معانی مراد لئے ہیں اور وہ یہ کہ ''محکم'' اسے کہتے ہیں جس کے الفاظ اس کے معانی پر ٹھوس دلالت کرتے ہوں اور ''متشابہ'' اسے کہتے ہیں کہ جس کے الفاظ سے متعدد معانی کا احتمال پایا جائے، اور وہ احتمالات ایک دوسرے سے مشابہت رکھتے ہوں، ابن تیمیہ کا کہنا ہے کہ محکم اور متشابہ کے مذکورہ دو معانی نسبت کی بناء پر ہیں اور وہ اس طرح کہ گاہے ایسا ہوتا ہے کہ ایک آیت بعض لوگوں کے لئے متشابہ ہوتی ہے اور وہ اس کی بابت گونا گوں احتمالات دیتے ہیں جیسا کہ عوام الناس اکثر اسی طرح کرتے ہیں لیکن وہی آیت دوسرے لوگوں کے لئے محکم ہوتی ہے مثلاً علماء جو کہ بحث و تحقیق کے مراحل طے کر کے اس کا معنی سمجھ لیتے ہیں، تو یہ صورتِ حال صفات کے ذکر پر مشتمل آیاتِ مبارکہ میں واضح طور پر پائی جاتی ہے کیونکہ عوام الناس کی اکثریت ان کے معانی و مراد کی بابت درست ادراک نہیں رکھتی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی قوتِ فکر و فہم، ماوراء حس کی بلندی کو چھو ہی نہیں سکتی لہٰذا وہ ان صفات کی بابت کہ خداوند عالم نے اپنے لئے جن کا اثبات کیا ہے مثلاً علم، قدرت، سمع (سننا)، بصر (دیکھنا)، رضا (خوش ہونا)، غضب (ناراض ہونا)، ید (ہاتھ)، عین (آنکھ) وغیرہ، ان کے وہی معانی سمجھتے ہیں جو ان کے ہاں متعارف ہیں یعنی مادی و جسمانی امور، یا ایسے غلط و ناحق معانی کرتے ہیں کہ جن کی وجہ سے فتنوں کا بازار گرم ہو جاتا ہے، بدعتیں جنم لیتی ہیں اور مذاہب و مسالک وجود میں آ جاتے ہیں، یہ ہے محکم اور متشابہ کے معانی کا اجمالی ذکر، اور وہ دونوں معانی نسبت کے حوالے سے ہیں اور ان دونوں کا علم ممکن الحصول ہے لیکن جس چیز کا ادراک اور علم و آ گاہی ناممکن ہے وہ متشابہات کی تأویل ہے یعنی آیات الصفات اور ان کی مانند دیگر آیات کے حقیقی معانی کا علم کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا...... ''تأویل المتشابہات'' سے ان کے حقیقی معانی کے علم و ادراک کے حصول کی کوشش مراد ہے...... یہ بات صحیح ہے کہ ہم آیۂ مبارکہ ''اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ'' (خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے) اور ''اِنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ'' (خدا ہر چیز کا علم رکھتا ہے (اور اس طرح کی دیگر آیات کریمہ سے قدرت کی حقیقت اور اسی طرح خدا کی دیگر صفات اور خاص و مخصوص افعال کی کیفیتوں کو ہرگز نہیں سمجھ سکتے اور یہی وہ ''تأویل المتشابہات'' ہے کہ جس کا علم خداوند عالم کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔

یہ ہے ابن تیمیہ کے طولانی بیان کا خلاصہ، ہم ان کے بیان کی بابت تفصیلی تذکرہ ''تأویل'' کی بحث میں کریں گے

جو کہ عنقریب ہو گی انشاء اللہ۔

تیرھواں قول:

''محکم'' سے مراد وہ آیت ہے کہ جس کے معنی کا ادراک، عقل کی دسترس میں ہو اور ''متشابہ'' اس کے برعکس ہے یعنی عقل اس کے معنی کو سمجھنے سے قاصر ہو۔

جواب:

یہ قول بلا دلیل ہے اور قرآنی آیات اگرچہ دو قسموں میں تقسیم ہوئی ہیں کہ ان میں سے ایک وہ قسم ہے کہ جس کا فہم المعنی عقل کی دسترس میں ہے اور دوسری وہ قسم ہے کہ جس کے فہم المعنی تک قوتِ عقل کی رسائی نہیں لیکن اس تقسیم سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ زیر بحث آیہ مبارکہ میں ''محکم'' اور ''متشابہ'' سے مراد بھی یہی ترتیب ہے کہ پہلی قسم کی آیات کو ''محکمات'' اور دوسری قسم کی آیات کو ''متشابہات'' قرار دیا جائے کیونکہ اس آیہ مبارکہ میں ''محکم'' اور ''متشابہ'' کی جو صفات و خصوصیات ذکر کی گئی ہیں وہ مذکورہ بالا قول سے صحیح مطابقت نہیں رکھتیں، اس کے علاوہ یہ کہ مذکورہ بالا قول آیات الاحکام کے تناظر میں بے اساس ہو جاتا ہے کیونکہ آیات الاحکام یقینی طور پر ''محکمات'' میں سے ہیں جبکہ عقل ان کے فہم المعنیٰ کی بابت قاصر ہے۔

چودھواں قول:

''محکم'' سے مراد وہ آیات ہیں جن کے ظواہر مقصود ہوں اور ''متشابہ'' سے مراد وہ آیات ہیں کہ جن کے ظواہر کے برعکس معانی مقصود ہوں۔..... ''محکم'' یعنی وہ کہ جس کا ظاہر مقصود ہو اور متشابہ وہ کہ جس کا خلاف الظاہر مقصود ہو ، یہ قول بعد میں آنے والے دانشوروں و محققین کے درمیان مشہور ہوا اور اسی نظریہ کی بناء پر انہوں نے ''تأویل'' کی اصطلاح کا یہ معنی کیا کہ اس سے کلام کا خلاف الظاہر معنی مراد ہے، گویا جس دانشور نے محکم اور متشابہ کے بارے میں یہ کہا کہ ''محکم'' اسے کہتے ہیں کہ جس کی تأویل، اس کی تنزیل ہی ہے اور ''متشابہ'' اسے کہتے ہیں کہ جس کا معنی تأویل کے بغیر سمجھ میں نہ آ سکے، یعنی جس آیت کا معنی اس کے ظاہری الفاظ ہی سے سمجھ میں آ جائے اسے محکم اور جس کا معنی تأویل کے بغیر سمجھ میں نہ آئے اسے متشابہ کہتے ہیں۔

جواب:

یہ قول صرف ایک طرح کی اصطلاح ہے اور آیہ مبارکہ میں ''محکم'' و ''متشابہ'' کی بابت جو اوصاف ذکر ہوئے

ہیں وہ اس پر منطبق نہیں ہوتے کیونکہ ''متشابہ'' کو اس لئے متشابہ کہا جاتا ہے کہ اس کا مرادی معنی و مدلول (وہ امر کہ جو اس کے الفاظ سے ثابت ہو) واضح نہیں ہوتا، اور ''تأویل'' سے مراد وہ معنی نہیں جو متشابہ سے مراد لیا گیا ہے کہ جس کی بناء پر اسے محکم سے جدا کر سکیں اور اس طرح کہیں کہ متشابہ وہ ہے کہ جس کی تأویل موجود ہو اور محکم وہ ہے کہ جس کی تأویل نہ ہو،..... جس کی تأویل کی ضرورت نہ ہو وہ محکم اور جس کی تأویل کی ضرورت ہو وہ متشابہ قرار پائے......، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ آیۂ مبارکہ میں ''تأویل'' سے وہ معنی مراد ہے جو تمام قرآنی آیات کی بابت پایا جاتا ہے خواہ وہ محکم ہوں یا متشابہ ہوں جیسا کہ اس سلسلہ میں پہلے بیان ہو چکا ہے، اس کے علاوہ یہ اہم بات قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید میں کوئی آیت ایسی نہیں کہ جس کا خلاف الظاہر مراد ہو اور جہاں تک ان آیات کا تعلق ہے کہ جن سے اس طرح کی بات کا احتمال پیدا ہوتا ہے تو دراصل وہاں ان کا خلاف الظاہر مقصود و مراد نہیں بلکہ ان سے ان معانی کو مراد لیا گیا ہے جو دیگر آیات محکمات کی مدد سے حاصل ہوتے ہیں کیونکہ ''القرآن یفسر بعضهٗ بعضاً'' ایک مسلمہ اصول ہے کہ قرآن کا بعض حصہ دوسرے بعض کی تفسیر کرتا ہے،... کسی آیت کا معنی دوسری آیت سے سمجھا جا سکتا ہے......، اور یہ ایک واضح امر ہے کہ کسی لفظ کا وہ معنی جو قرائن و شواہد..... خواہ وہ قرائن متصل ہوں یعنی اس لفظ کے ساتھ جڑے ہوئے ہوں یا منفصل ہوں یعنی اس سے الگ کسی جگہ مذکور ہوں کہ جن کے تناظر میں اس آیت کا معنی واضح ہو جائے کہ جس کے ظاہری الفاظ سے معنی نہ سمجھا جا سکتا ہو..... کے ذریعے معلوم ہو جائے اسے خلاف الظاہر قرار نہیں دیا جا سکتا بالخصوص اس کلام میں کہ جس کا متکلم صریح و واضح طور پر کہہ دے کہ اس کی روش و طرزِ تکلم ہی ایسا ہے کہ اس میں کلام کا بعض حصہ دوسرے بعض حصہ سے متصل ہوتا ہے اور اس کا بعض حصہ دوسرے بعض کا شاہد و گواہ ہوتا ہے بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ اس میں بظاہر دکھائی دیا جانے والا فرق و اختلاف اس میں اچھی طرح غور و فکر اور تدبر کرنے سے خود بخود دور ہو جاتا ہے یعنی اگر اس کا قاری اس کے معانی میں غور کرے تو اسے اس کے الفاظ سے جو فرق و اختلاف دکھائی دیتا ہو وہ دور ہو جائے گا جیسا کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

سورۂ نسآء، آیت ۸۲:

O ''اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا كَثِیْرًا ﴿۸۲﴾''

(وہ قرآن میں تدبر اور غور و فکر کیوں نہیں کرتے کہ اگر وہ خدا کے علاوہ کسی کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے)

پندرہواں قول:

یہ قول ''اصم'' کی طرف نسبت سے ذکر کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ ''محکم'' سے وہ آیت مراد ہے جس کی تأویل پر تمام

اہل علم حضرات کا اجماع اور اتفاق رائے ہو اور ''متشابہ'' سے وہ آیت مراد ہے جس کی تأویل میں اختلاف رائے پایا جائے، گویا اجماع سے مراد یہ ہے کہ اس کی بابت کوئی اختلاف رائے نہ پایا جاتا ہو بلکہ سب کی آراء متفق ہوں اور اختلاف سے مراد یہ ہے کہ اس کی بابت اختلاف رائے پایا جاتا ہو، پہلی قسم کو''محکم'' اور دوسری قسم کو''متشابہ'' کہتے ہیں۔

جواب:

یہ قول اس بناء پر قرین صحت نہیں کہ اس سے یہ بات لازم آتی ہے کہ پورا قرآن متشابہ ہو جو کہ قرآنی آیات کے محکم و متشابہ دو قسموں میں تقسیم ہونے سے مطابقت نہیں رکھتی، کیونکہ قرآن مجید میں کوئی آیت ایسی نہیں کہ جس میں کسی طرح سے کوئی اختلاف رائے نہ پایا جاتا ہو بلکہ یا تو اس کے الفاظ میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے اور یا اس کے معانی کی بابت مختلف آراء سامنے آتی ہیں، یا پھر یہ کہ وہ کسی معنی میں ظہور رکھتی ہے یا نہیں رکھتی، اسی طرح دیگر جہتوں اور پہلوؤں سے اہل علم حضرات اختلاف رائے کرتے ہیں، یہاں تک کہ بعض حضرات نے پورے قرآن مجید کے''متشابہ'' ہونے پر اس آیت سے استدلال پیش کیا ہے کہ جس میں اس طرح ارشادِ حق تعالیٰ ہے: ''کِتٰبًا مُّتَشَابِهًا''......سورۂ زمر، آیت ۲۳...(وہ کتاب ہے متشابہ)، لیکن وہ اس بات سے غفلت میں رہے کہ یہ آیت اس صورت میں ان کے استدلال کی صحت کو یقینی بنا سکتی ہے جب خود اسے''محکم'' قرار دیا جائے جبکہ یہ بات خود ان کے اپنے استدلال کے منافی ہے کہ جس میں وہ پورے قرآن کو''متشابہ'' مانتے اور ثابت کرنا چاہتے ہیں، ان کے علاوہ کچھ حضرات کا نظریہ یہ ہے کہ ظاہر القرآن حجت ہی نہیں ہے یعنی آیات قرآنیہ اپنے معانی میں ظہور ہی نہیں رکھتیں۔

سولہواں قول:

''متشابہات'' سے وہ آیات مراد ہیں کہ جن کی تفسیر اس وجہ سے مشکل ہو کہ وہ دیگر آیات سے مشابہت رکھتی ہیں خواہ ان کی تفسیر کا مشکل ہونا الفاظ کی بناء پر ہو یا معانی کی بناء پر ہو، اس قول کو مشہور ماہر لغت، راغب اصفہانی نے ذکر کیا ہے، انہوں نے اپنی کتاب مفردات میں لکھا ہے کہ''آیاتِ متشابہات'' سے مراد وہ آیات ہیں جن کی تفسیر دیگر آیات سے مشابہت و ہمرنگی کی وجہ سے مشکل ہو جائے خواہ الفاظ کے حوالہ سے ہو یا معانی کے حوالہ سے ہو، اسی وجہ سے فقہاء کا کہنا ہے کہ''متشابہ'' اس آیت کو کہتے ہیں کہ جس کا ظاہر اس کے مرادی معنی کو واضح نہ کرے، حقیقت یہ ہے کہ قرآنی آیات کی ایک دوسری سے وابستگی کی بناء پر تین قسمیں ہیں:

پہلی قسم: محکم علی الاطلاق، یعنی ہر لحاظ سے محکم، اور ہر طرح کی قید و شرط سے خالی۔

دوسری قسم: متشابہ علی الاطلاق، یعنی ہر لحاظ سے متشابہ۔

تیسری قسم: محکم من وجہ ومتشابہ من وجہ، یعنی ایک لحاظ سے محکم اور ایک لحاظ سے متشابہ۔

بنابراین ''متشابہ'' کو فی الجملہ تین قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(۱) صرف الفاظ کے حوالہ سے متشابہ

(۲) معانی کے حوالہ سے متشابہ

(۳) الفاظ ومعانی دونوں حوالوں سے متشابہ

اور پھر الفاظ کے حوالہ سے متشابہ کی دو قسمیں ہیں:

(۱) اس کے مفردات متشابہ ہیں یعنی اس کا متشابہ ہونا اس کے مفرد الفاظ کے متشابہ ہونے کی وجہ سے ہے اور وہ اس طرح کہ یا اس کے الفاظ غیر مانوس واجنبی ہیں مثلاً ''اب''، ''یزفون''، یا اس کے الفاظ متعدد معانی رکھتے ہیں مثلاً ''ید''، ''عین''..... ید بمعنی ہاتھ، قدرت، سمت وغیرہ، اور عین بمعنی آنکھ، چشمہ، پتھر وغیرہ)

(۲) اس کے جملے وکلامی ترکیبات، متشابہ ہیں۔

اس دوسری قسم کی تین قسمیں ہیں:

(۱) کلامی ترکیب کا متشابہ ہونا اس بناء پر ہے کہ کلام میں اختصار پایا جاتا ہے مثلاً:

سورۂ نسآء آیت ۳:

O '' وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ ''

(اگر تمہیں یہ اندیشہ لاحق ہو کہ تم یتیموں کے بارے میں عدل قائم نہ رکھ سکو گے تو پھر جو خواتین تمہیں پاکیزہ لگیں ان سے نکاح کرو)

(۲) کلام کا متشابہ ہونا اس میں پائے جانے والے اضافہ کی وجہ ہو کہ جس کے نتیجہ میں کلام میں وسعت وگستردگی پیدا ہو جائے مثلاً: ''لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ''..... سورۂ شوریٰ آیت ۱۱...... (اس جیسی کوئی چیز نہیں)، اگر یہ جملہ اس طرح ہوتا: ''**لیس مثلہ شیء**'' تو اس کا معنی سننے والے پر زیادہ واضح وروشن ہو جاتا،...... ایک حرف (کاف) کے اضافہ سے اس میں تشابہ پیدا ہو گیا۔

(۳) کلام کا متشابہ ہونا اس کی جملہ بندی کی وجہ سے ہو، مثلاً:

سورۂ کہف، آیت ۱:

O ''اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۜ قَيِّمًا''

(اس نے اپنے عبد پر کتاب نازل کی اور اس میں کوئی کجی قرار نہیں دی، مضبوط وپائیدار کتاب ہے)

جبکہ اصل میں یوں ہے: "اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِہِ الْکِتٰبَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّہٗ عِوَجًا" (اس نے اپنے بندے پر کتاب نازل کی جو کہ مضبوط و پائیدار ہے اور اس نے اسے کج قرار نہیں دیا)، اسی طرح ایک آیت مبارکہ میں یوں ارشاد ہوا:

سورۂ فتح، آیت ۲۵:

" وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَـُٔوْهُمْ فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۚ لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝"

(اور اگر مؤمن مرد اور مومنہ عورتیں ایسی نہ ہوتیں کہ جنہیں تم بے خبری میں پاؤں تلے روند دو گے کہ پھر لاشعوری طور پر ایک عار و عیب تم پر لگ جائے گا تو خدا تمہیں اس جنگ سے نہ روکتا ... ورنہ مقصد یہ ہے کہ خداوندِ عالم جسے چاہے اپنی رحمت میں داخل کر دے، اگر مومنین و کفار ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے تو ہم کافروں پر دردناک عذاب نازل کرتے)

ان دو آیتوں (کہف ۱، فتح ۲۵) میں جملہ بندی اس طرح ہوئی ہے کہ سامع کو فہم المعنی میں دشواری لاحق ہوتی ہے، اسی وجہ سے ان آیات کو متشابہ قرار دیا جاتا ہے۔

یہ تھیں وہ آیات کہ جن کا متشابہات ہونا ان کے الفاظ کی بناء پر ہے، اور معانی کے حوالہ سے وہ آیات، متشابہات ہیں جن میں خداوند عالم کی صفات و اوصاف اور قیامت کے دن کے اوصاف بیان ہوئے ہیں کیونکہ اس طرح کی صفات و اوصاف کا تصور ہمارے بس میں نہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم صرف انہی صورتوں کا ادراک کر سکتے ہیں جو ہماری قوتِ حس و احساس کی دسترس میں ہوں اور جو صورتیں ہماری قوتِ حس کی دسترس سے باہر ہوں وہ ہماری لوحِ فکر و ذہن پر ثبت ہی نہیں ہوتیں، یا کم از کم وہ ایسی صورتیں ہوں کہ جو ہماری قوت حس کے دائرے میں آ سکنے والی چیزوں میں سے ہوں ورنہ ان کا ادراک ناممکن ہوگا... جبکہ خداوندِ عالم کی صفات اور قیامت کے دن کی خصوصیات نہ تو ہماری قوتِ حس کی دسترس میں ہیں اور نہ ہی قوتِ حس کے دائرے میں آ سکنے والی چیزوں میں سے ہیں،

اور وہ آیات کہ جو الفاظ و معانی دونوں حوالوں سے متشابہ ہیں ان کی پانچ قسمیں ہیں:

(۱) کمیت و مقدار کے حوالہ سے! جیسا کہ عموم و خصوص کا واضح نہ ہونا، مثلاً آیۂ مبارکہ "فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ" توبہ آیت ۵ (مشرکوں کو قتل کر دو)، اس جملے میں قتل کرنے کا حکم مشرکین کی تعداد کے ذکر سے خالی ہے اور آیا ہر مشرک کو قتل کرنے کا حکم ہے یا مشرکین کے مخصوص گروہ کو، اس کے بیان سے بھی خالی ہے، اس وجہ سے یہ آیت، متشابہات میں سے ہے۔

(۲) کیفیت کے حوالہ سے! جیسا کہ وجوب و استحباب کا واضح نہ ہونا، یعنی جو حکم دیا گیا ہے وہ واجب العمل ہے

کہ جس کا ترک جائز نہیں یا مستحب ہے؟ اس کی بابت آیت سے کچھ ظاہر نہیں ہوتا مثلاً ارشاد ہوا: ''فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ'' (نسآء ۳)...... تم ان عورتوں سے نکاح کرو جو تمہارے لئے پاکیزہ ...... وپسندیدہ...... ہوں...... حکم کے واجب یا مستحب ہونے کے حوالہ سے یہ آیت متشابہات میں سے ہے،

(۳) وقت اور مدت کے حوالہ سے! جیسا کہ ناسخ ومنسوخ میں قابل تصور ہے، مثلاً: ''اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ'' سورۂ آل عمران ۱۰۲......، (اور تم تقوائے الٰہی اختیار کرو جیسا کہ اس کے تقویٰ کا حق ہے)، اس آیت میں یہ احتمال پایا جاتا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے اور یہ بھی احتمال موجود ہے کہ منسوخ نہ ہوئی ہو، گویا منسوخ ہونے اور منسوخ نہ ہونے کے حوالہ سے یہ آیت متشابہات میں قرار پاتی ہے۔ اس احتمال کی وجہ یہ ہے کہ اس میں تقویٰ اختیار کرنے کا حکم مطلق ہے جبکہ ایک اور مقام پر یوں ارشاد ہوا: ''فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ'' سورۂ تغابن آیت ۱۶......، (تم جس قدر طاقت رکھتے ہو تقوائے الٰہی اختیار کرو) گویا اس آیت میں ''مقدور بھر'' کے الفاظ سے یہ شبہ لاحق ہوتا ہے کہ شاید پہلی آیت میں جو عام اور مطلق حکم دیا گیا ہے اسے اس دوسری آیت کے ذریعے منسوخ کر دیا گیا ہو، اس حوالہ سے پہلی آیت کو متشابہات میں شمار کیا جاتا ہے۔

(۴) جگہ ومکان یا ان امور کے حوالہ سے کہ جن کی بابت آیت نازل ہوئی ہو مثلاً ''وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا'' (سورۂ بقرہ، آیت ۱۸۹)۔ نیکی یہ نہیں کہ تم گھروں میں ان کے پیچھے کی طرف سے آؤ......، اس آیت میں ''گھروں کے پیچھے'' کے الفاظ سے یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ اس سے مراد گھر کی کون سی جگہ ہے...... کیونکہ عین ممکن ہے کہ پچھلی دیوار مقصود ہو، یا چھت مقصود ہو یا دائیں بائیں کی دیواریں مقصود ہوں یا کوئی ایسی جگہ کہ عام طور پر اس سے گھر میں نہیں داخل ہوا جاتا، تو اس احتمالات کی بناء پر آیت کو متشابہات میں قرار دیا جاتا ہے......، اسی طرح ارشاد الٰہی ہے:

''اِنَّمَا النَّسِيْٓءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ'' (سورۂ توبہ، آیت ۳۷)...... ''نسي'' کفر میں اضافہ کا سبب بنتا ہے۔

اس آیت میں لفظ ''نسـي'' ذکر کیا گیا ہے تو جو شخص زمانہ جاہلیت کے عربوں کی عادات سے نا آگاہ ہو وہ اس آیت کی تفسیر آسانی سے نہیں کر سکتا۔ اس لفظ کا معنیٰ ''حرام کئے گئے مہینوں میں تقدم وتاخر کرنا'' کیا گیا ہے......،

(۵) ان شروط کی بناء پر کہ جو کسی عمل کی صحت و درستی اور عدم درستی میں دخیل ہوں! مثلاً نماز اور نکاح میں جو شروط ملحوظ و دخیل ہیں ان کے حوالہ سے مربوطہ آیات، متشابہات قرار پاتی ہیں۔

مذکورہ بالا مطالب سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مفسرین نے ''متشابہ'' کا جو معنیٰ ذکر کیا ہے وہ انہی اقسام میں سے کسی ایک پر منطبق ہوتا ہے، ان کے علاوہ نہیں ہے مثلاً جس نے کہا کہ ''متشابہ'' سے مراد حروف مقطعات (الٓمٓ، الٓرٰ، یٰسٓ، کٓھٰیٰعٓصٓ......) ہیں، وہ قتادہ کا قول کہ ''محکم'' سے مراد وہ آیت ہے جو ناسخ ہو اور متشابہ سے مراد وہ آیت ہے جو منسوخ ہو، اور

اصم کا قول کہ "محکم" وہ آیات ہیں جن کی تفسیر متفق علیہ ہو اور "متشابہ" سے مراد وہ آیات ہیں جن کی تفسیر کے بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہو، تو یہ سب اقوال و آراء مذکورہ پانچ قسموں سے باہر نہیں بلکہ انہی میں سے کسی ایک سے مطابقت رکھتی ہیں،

ان مطالب کے تناظر میں "متشابہ" کو تین قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(۱) وہ آیات کہ جن کی تأویل اور حقیقت الامر کا علم کسی انسان کے بس کا روگ نہیں مثلاً قیامت کا وقت، زمینی مخلوق کا باہر نکلنا اور اس کی کیفیت وغیرہ

(۲) وہ آیات کہ جن کے الفاظ کے معانی سے آگاہی کا حصول نوع انسانی کے لئے ممکن ہو مثلاً اجنبی و نامانوس الفاظ اور پیچیدہ احکام و دستورات وغیرہ

(۳) وہ آیات کہ جو پہلی دو قسموں کے مابین ہیں یعنی ان کے بارے میں یہ احتمال پایا جاتا ہے کہ ان کی تفسیر عام انسانوں کے لئے مقدور ہے اور یہ احتمال بھی ہے کہ صرف رَاسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ ان کی تأویل و حقیقت الامر سے آگاہی رکھتے ہوں اور عام افرادِ بشر کی ان تک رسائی نہیں، اس تیسری قسم کی مثال حضرت پیغمبر اسلامؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ جو آپؐ نے حضرت علیؑ کے بارے میں اس طرح دعا کی: "اللهم فقهه في الدين و علمه التأويل" (اے اللہ! اسے دین میں فقیہ بنا اور اسے تأویل سے آگاہ فرما)، اسی طرح کی دعا جناب عبداللہ بن عباس کے بارے میں بھی موجود ہے۔

یہ تھا مشہور لغت دان اور راغب اصفہانی کا بیان کہ جس میں انہوں نے "محکم" اور "متشابہ" کے معانی کو ذکر کیا ہے اور یہ "متشابہ" کے معنی کی بابت سابق الذکر اقوال کا جامع ترین بیان ہے،

لیکن راغب کے بیان پر دو حوالوں سے اعتراض ہوسکتا ہے:

(۱) انہوں نے "متشابہ" کے معنی کا دائرہ وسیع کر دیا ہے کہ جس میں الفاظ کا اجنبی و نامانوس ہونا، جملوں کی ترکیبات کا پیچیدہ و غیر واضح ہونا اور ان میں عموم و خصوص کی جہتوں کا پایا جانا بھی شامل ہے تو یہ بات ظاہر الآیہ سے مطابقت نہیں رکھتی کیونکہ آیت مبارکہ میں "محکمات" کو "متشابہات" کی تفسیر کرنے والی آیات کے طور پر ذکر کیا گیا ہے کہ جب "آیات متشابہات" میں سے کسی آیت کا معنی معلوم کرنا ہو تو "آیات محکمات" کی طرف رجوع کر کے ایسا کیا جاسکتا ہے جبکہ یہ بات واضح و معلوم ہے کہ الفاظ کا اجنبی و غیر مانوس ہونا اور ترکیبات کا پیچیدہ ہونا، آیات محکمات کے واضح الدلالۃ ہونے سے قطعی کوئی ربط نہیں رکھتا، اور نہ ہی ان کی طرف رجوع کر کے ان مسائل کو حل کیا جاسکتا ہے بلکہ ان مسائل کے حل کے لئے دیگر امور و اصول موجود ہیں کہ الفاظ و ترکیبات کی پیچیدگیوں کو دور کرنے میں ان کی طرف رجوع کیا جاتا ہے مثلاً لغت اور علم صرف و نحو وغیرہ، اس کے علاوہ و یہ کہ آیہ مبارکہ میں "متشابہات" کے بارے میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ان کی نشانی ہی یہ ہے کہ

ان کی پیروی صرف فتنہ انگیزی کی غرض سے کی جاتی ہے، جبکہ یہ بات واضح ہے کہ خاص کی طرف رجوع کئے بغیر عام کی پیروی کرنا، "مقید" کی طرف رجوع کئے بغیر "مطلق" کی پیروی کرنا اور علم لغت کی وضاحت کو درخور اعتناء قرار دیئے بغیر اجنبی وغیر مانوس الفاظ کے معانی کا تعین کرنا اہل زبان کے مروجہ طریقوں کے منافی ہے اور کوئی اہل زبان اس طرح کے کاموں کو درست قرار نہیں دیتا بلکہ اس طرح کے کاموں کو غلط قرار دے کر اس کے مرتکب کی سرزنش کی جاتی ہے لہٰذا وہ شخص فتنہ انگیزی کا ہدف ہرگز نہیں حاصل کر سکتا کیونکہ کوئی اہل زبان اس سلسلہ میں اس کا ہمدم ومددگار نہیں ہوتا۔

(۲) انہوں نے "متشابہ" کو تین قسموں میں تقسیم کر دیا ہے یعنی ایک وہ کہ جسے عوام الناس نہیں سمجھ سکتے، دوسری وہ کہ جسے کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا خواہ وہ عوام ہیں یا خواص، اور تیسری وہ کہ جس کا فہم المعنیٰ بعض کے لئے ممکن اور بعض کے لئے ناممکن ہے، اس تقسیم سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی رائے میں "تاویل" صرف "متشابہ" سے مخصوص ومختص ہے، جبکہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ یہ نظریہ صحیح نہیں۔

مذکورہ بالا تمام مطالب، "محکم" اور "متشابہ" کے معانی کی بابت مفسرین کرام واہل علم ودانش کے اقوال وآراء اور نظریات ہیں کہ جو انہوں نے آیات محکمات اور آیات متشابہات اور ان کے موارد کی تشخیص وتمیز کے حوالہ سے پیش کئے، قارئین کرام ان آراء واقوال کی کمزور جہتوں سے آگاہ ہو چکے ہیں اور اس امر سے بھی آگاہ ہو چکے ہیں کہ وہ آیۂ مبارکہ سے ظاہر وآشکار ہونے والے مطالب سے مطابقت نہیں رکھتے بلکہ ان میں سے کوئی قول بھی ایسا نہیں جسے آیۂ مبارکہ سے سمجھے جانے والے حقائق ومعارف سے ہم رنگ قرار دیا جائے کیونکہ آیۂ مبارکہ سے "متشابہ" کا یہ معنیٰ معلوم وظاہر ہوتا ہے کہ متشابہ اس آیت کو کہتے ہیں جو معنیٰ کے حوالہ سے واضح نہ ہو، نہ کہ الفاظ کے حوالہ سے، یعنی اس سے جو معانی سمجھے جاتے ہوں وہ یقینی نہ ہوں بلکہ ان کے متعلق دیگر احتمالات پائے جائیں کہ جن کی وجہ سے اصل مقصد آشکار نہ ہو سکے کیونکہ اگر الفاظ کے حوالہ سے فہم المعنیٰ میں دشواری پیدا ہوتی ہو تو اسے ان طریقوں سے استفادہ کرتے ہوئے حل کیا جا سکتا ہے جو اہل زبان حضرات کے ہاں رائج ہوں مثلاً جب کوئی لفظ "عام" یا "مطلق" ہو تو اس کا معنیٰ جاننے کے لئے "مخصص" اور "مقید" کی طرف رجوع کیا جاتا ہے جس کے نتیجہ میں مقصود معلوم ہو جاتا ہے، اسی طرح دیگر وہ اصول جو کسی کلام سے فہم المعنیٰ کی بابت وضع کئے گئے ہیں تو ان کی طرف رجوع کر کے الفاظ سے معانی کا ادراک ممکن ہو جاتا ہے، گویا آیت کا متشابہ ہونا اس کے معنیٰ کے حوالہ سے ہوتا ہے جو کہ کسی دوسری آیت جو کہ "محکم" ہو اور اس کے معنیٰ میں کوئی شک وشبہ نہ پایا جاتا ہو، سے ہم رنگ نہ ہو کہ جس کے ذریعے متشابہ کی وضاحت وتفسیر ممکن ہو سکے... کیونکہ آیات محکمات کو یہ رتبہ حاصل ہے کہ وہ آیات متشابہات کی تفسیر کرتی ہیں۔

اور یہ بات معلوم وآشکار ہے کہ کسی آیت کا معنیٰ، مذکورہ وصف کا اسی صورت میں حامل ہو سکتا ہے جب اس کا فہم و

ادراک عام افرادِ بشر کے لئے آسان اور وہ معنیٰ ہر فرد کی طبع فکر سے ہم رنگ ہو کہ جسے سادہ ترین افراد بھی اپنی لوح فکر وفہم میں ثبت کر سکتے ہیں یا اس کی تاٗویل اس طرح سے کی جائے کہ کمزور فہم وفکر اور ضعیف ادراک وتعقل کے حامل افراد کے اذہان میں سما سکے۔

اگر آپ ان بدعتوں اور غلط وفاسد نظریات ومذاہب اور مسالک کی تاریخ کا مطالعہ کریں کہ جو حضرت پیغمبر اسلامؐ کی رحلت کے بعد حق کے مضبوط راستہ سے انحراف کے نتیجہ میں مسلمان گروہوں میں رونما ہوئے، خواہ وہ اعتقادات ومعارف سے تعلق رکھتے ہوں یا احکام ودستورات سے مربوط ہوں آپ خود آگاہ ہو جائیں گے کہ ان کے اکثر موارد میں ''متشابہ'' کی پیروی اور آیات قرآنی کو مرضیٔ خداوندی کے برخلاف تاٗویل کرنا ہی بنیادی سبب بنا ہے، چنانچہ اس کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں کہ بعض گروہوں نے متشابہ آیات سے تمسک واستدلال کرتے ہوئے خداوند عالم کے جسم ہونے کا عقیدہ قائم کرلیا، بعض گروہ ''جبر'' کے قائل ہو گئے اور بعض ''تفویض'' کے معتقد ہوئے، بعض گروہوں نے انبیاء الٰہی کے ارتکاب معصیت کا عقیدہ رکھ کر انہیں غیر معصوم مان لیا، اور بعض گروہوں نے یہ عقیدہ قائم کرلیا کہ خداوند عالم چونکہ ہر حوالہ سے منزہ ہے لہٰذا اس میں کوئی ''صفت'' نہیں پائی جاتی گویا انہوں نے خداوند عالم کا منزہ ہونا، صفات کی نفی کر کے مانا اور بعض گروہوں نے کامل تشبیہ کا عقیدہ رکھتے ہوئے خدا کی صفات کو انسانی صفات کی مانند قرار دے کر ان کے زائد بر ذات ہونے کا عقیدہ قائم کرلیا، ان کے علاوہ دیگر متعدد گروہ وجود میں آئے کہ جنہوں نے بدعتی نظریات قائم کئے اور ان میں بنیادی وجہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ انہوں نے متشابہات کی پیروی کی اور محکمات کی طرف رجوع کئے بغیر ان کے معانی کا تعین کیا.... جس کے نتیجہ میں بھٹک گئے.... جبکہ متشابہات کے معانی کے تعین میں محکمات کی طرف رجوع کرنا ہی اصل واصول اور قاعدہ ودستور ہے، بعض گروہ ایسے بھی سامنے آئے جنہوں نے کہا کہ دینی احکامات ودستورات اس لئے صادر کئے گئے ہیں کہ ان کے ذریعے خدا تک پہنچنا ممکن ہو سکے، لہٰذا اگر ان سے زیادہ نزدیک راستہ مل جائے کہ جو خدا تک پہنچا دے تو اسے اختیار کرنا چاہیے کیونکہ مقصد ومقصود صرف اور صرف خدا تک پہنچنا اور حق تک رسائی ہے خواہ جس ذریعے سے کیوں نہ ہو اور جس راستہ پر چل کر ممکن ہو، بعض گروہوں نے کہا کہ واجبات وفرائض کا اصل مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ ان کے ذریعے ''کمال'' تک رسائی یقینی ہو لہٰذا جو شخص کمال کو پالے اور کامل ہو جائے تو اس کے بعد اس پر کوئی ذمہ داری اور فریضہ عائد کرنا بے معنی ہے، جبکہ حقیقت الامر یہ ہے اور تاریخ اس کی گواہی دیتی ہے کہ تمام احکام وفرائض اور دستورات واسلامی سیاست کے امور حضرت پیغمبر اسلامؐ کے عہد مبارک میں بھی اپنی اصل حیثیت کے ساتھ باقی تھے اور ان میں سے کوئی حکم وفریضہ ایسا نہ تھا جسے ختم کر دیا گیا ہو.... کسی مسلمان نے یہ نہیں کہ اب چونکہ ہم کمال تک پہنچ چکے ہیں لہٰذا اب ان احکامات کی ضرورت باقی نہیں رہی.... مگر آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد رفتہ رفتہ بلکہ روز بروز ان میں کمی لائی جاتی رہی اور ان کی اصل حیثیت ختم کرنے کی راہیں اختیار کی گئیں، یہ

سب کچھ ان حکومتوں وحکمرانوں نے کیا جو اپنے آپ کو اسلامی کہلاتے تھے اور اسلام کے نام پر قائم ہوئے تھے، ان نام نہاد و خودساختہ حکمرانوں نے جب بھی کسی حکم الٰہی یا فریضہ خداوندی کو ختم کرنا چاہا یا کسی قانون کی اصل حقیقت کو بے وقعت کیا تو یہی کہا کہ دین وقانون الٰہی صرف اس لئے بنا کہ اس کے ذریعے دنیا میں صلاح وبہتری پیدا ہو اور لوگوں کے امور زندگی اچھی طرح انجام پائیں اور جو قوانین وضوابط ہم نے مقرر و طے کئے ہیں وہ موجودہ زمانہ میں لوگوں کی بہتری کے لئے زیادہ مفید و مؤثر ہیں اور ان میں بنی نوع انسان کے لئے رفاہ وفلاح کی زیادہ ضمانت پائی جاتی ہے، بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ ان نام نہاد حکمرانوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ دینی دستورات کی غرض اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ ان پر عمل کر کے دنیاوی زندگی کو بہتر و آسودہ بنایا جائے اور عصر حاضر میں دینی سیاست ناقابل قبول ہو چکی ہے اور کوئی اسے درخور اعتناء قرار نہیں دیتا بلکہ موجودہ زمانہ جدید قوانین کا متقاضی ہے کہ جن کی تدوین عصری تقاضوں اور تمدن کے مطابق ہو اور ان کے نفاذ و اجراء کے ذریعے اپنی ضرورتوں کو پورا کیا جائے، ،اس سے بالاتر یہ کہا گیا کہ دینی اعمال انجام دینے کی اصل غرض یہ ہے کہ ان کے ذریعے دلوں کو پاک کیا جائے اور نیک و پاکیزہ فکر وارادہ کی راہ پائی جائے لہٰذا موجودہ زمانہ میں جبکہ معاشرتی تربیت کی بنیاد پر دلوں کو پاکیزگی اور فکر ونظر کی قوتوں کو خدمت خلق کی راہ مل چکی ہے تو اب ان کے پاک کرنے میں وضو، غسل اور نماز وروزہ وغیرہ کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

اگر آپ مذکورہ بالا اقوال وآراء پر ..... کہ جو اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کو شمار نہیں کیا جا سکتا اور ان جیسے دیگر اقوال پر اچھی طرح غور کریں اور اس آیہ مبارکہ پر تدبر کریں "فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَاتَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ....." تو آپ کو ہمارے بیان کردہ مطالب کی صحت کی بابت ہرگز کوئی شک وشبہ باقی نہ رہے گا اور آپ یقینی طور پر یہ فیصلہ کریں گے کہ یہ تمام فتنے اور مصائب ومشکلات کہ اسلام واہل اسلام جن سے دوچار ہیں ان کی اصل وجہ آیات متشابہات کی پیروی اور قرآن کی تأویل کرنے کے سوا کچھ نہیں، شاید اسی بناء پر ..... واللہ اعلم ..... قرآن مجید میں اس موضوع کی بابت نہایت شدت کے ساتھ مطالب ذکر کئے گئے ہیں اور سخت ترین لہجہ میں آیات متشابہات کی پیروی سے، فتنہ پردازی وتأویل جوئی سے، آیات الٰہی میں الحاد وغلط اندیشی اور ان کی بابت جہالت ولاعلمی کی بنیاد پر اظہار خیال کرنے اور شیطان کے نقش قدم پر چلنے سے منع کیا گیا ہے کیونکہ قرآنی روش ہی یہ ہے کہ انہی امور میں سخت انداز اختیار کیا جاتا ہے کہ جن کے سبب ارکان دین میں سے کسی رکن کا وجود خطرے میں پڑ جائے اور دین کی بنیاد متزلزل اور اس کی اساس منہدم ہو جائے جیسا کہ کفار سے دوستی کے بارے میں شدید اللحن بیانات صادر ہوئے، اور مودت فی القربیٰ کی بابت خاص انداز اختیار کر کے اس کی اہمیت سے آگاہی دلائی گئی کہ اس کے بغیر دین باقی نہ رہے گا، ازواج النبیؐ کو گھروں میں بیٹھے رہنے (وقرن فی بیوتکن) کا سخت حکم دیا گیا، سودی معاملات سے نہیں میں شدت اختیار کی گئی اور دین میں وحدت القول کی سخت تاکید

کی گئی اور اس طرح کے دیگر امور کو جن کی بابت قرآنی آیات میں تشدید و تاکید نظر آتی ہے۔
بہر حال دلوں کی کجی اور فتنہ جوئی کہ جن کی بنیادی وجہ دنیا پرستی، مادی لذتوں پر مرمٹنا اور نفسانی خواہشات کی پیروی ہے کا ازالہ و مقابلہ صرف اور صرف اس ذریعہ سے ممکن ہے کہ قیامت کے دن کی یاد تازہ رکھی جائے جیسا کہ خداوند عالم کا ارشاد گرامی ہے:

سورۂ ص، آیت ۲۶:

○ "وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ"

(نفسانی خواہشوں کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہیں خدا کی راہ سے گمراہ کر دیں گی، بیشک جو لوگ خدا کی راہ سے بھٹک جائیں ان کے لئے سخت عذاب مقرر ہے کیونکہ انہوں نے یوم حساب کو بھلا دیا)

یہی وجہ ہے کہ راسخون فی العلم حضرات قرآن مجید کی تاویل میں ہرگز ایسی روش اختیار نہیں کرتے جس میں ان کے پروردگار کی رضا نہ ہو یا ان کے رب کی رضا کے منافی ہو۔ اور وہ اپنے اظہارات کے ذیل میں یہ کہتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں: "رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ" ......اے ہمارے پروردگار! تو ہی لوگوں کو اس دن اکٹھا کرنے والا ہے کہ جس میں کوئی شک نہیں پایا جاتا، بے شک اللہ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔

۲۔ محکمات کو ام الکتاب قرار دینے سے کیا مراد ہے؟

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ آیات محکمات کا ام الکتاب ہونا اس بناء پر ہے کہ وہ اصل الکتاب ہیں اور انہی پر دین کے ان اصول و احکام کی بنیاد قائم و استوار ہے کہ جن پر ایمان لانا اور عمل کرنا لازم و ضروری ہے اور دین انہی دو اصولوں یعنی عقیدہ و عمل ہی کے مجموعہ کا نام ہے، اور جہاں تک آیات متشابہات کا تعلق ہے تو ان کے معانی و مراد کے غیر واضح و غیر یقینی ہونے کی وجہ سے ان پر عمل نہیں کیا جا سکتا بلکہ ان پر صرف ایمان لانا ضروری ہوتا ہے۔

اس تفسیری قول کے حوالہ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو اقوال پہلے ذکر کئے جا چکے ہیں ان میں غور و فکر کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تفسیری قول انہی اقوال میں سے بعض کا لازمی نتیجہ بنتا ہے اور وہ یوں کہ ان اقوال میں سے ایک قول یہ تھا کہ متشابہ کو اس لئے متشابہ کہا جاتا ہے کہ اس کی تاویل نہایت دشوار اور اس کا فہم المعنی بہت مشکل ہے، اور ایک قول یہ تھا کہ متشابہ کے معنی و

مراد سے آگاہی کا حصول اور اس کے الفاظ میں پائے جانے والے تشابہ کو کامل طور پر یا جزوی طور پر اس طرح دور کیا جا سکتا ہے کہ عقل ولغت یا اس عقلائی طریقہ وروش کی طرف رجوع کیا جائے کہ جس سے لفظی شبہات کو دور کرنے میں مدد ملتی ہے۔

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ محکمات کو اس لئے ام الکتاب کہا جاتا ہے کہ متشابہات کے فہم المعانی کے لئے ان کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اور ان کے ذریعے متشابہات کے معانی واضح ہوتے ہیں، البتہ اس قول میں محکمات کی طرف "رجوع کرنے" کی جو بات کی گئی ہے اس کی بابت مفسرین کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا ہے کہ اس سے مراد کیا ہے؟ بعض حضرات کے کلام سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ متشابہات پر صرف ایمان لایا جائے اور ان کے موارد و موضوعات میں عملی اقدام کے لئے محکمات کو بنیاد قرار دیا جائے جیسا کہ منسوخ شدہ آیات میں ہوتا ہے کہ ان پر ایمان لایا جاتا ہے اور ان کے موارد میں عملی اقدام کرنے کے لئے ان کی ناسخ آیات کو بنیاد قرار دیا جاتا ہے، لیکن یہ قول پہلے قول سے زیادہ مختلف نہیں۔

بعض حضرات نے اس کا معنی یہ کیا ہے کہ محکمات کو اس لئے ام الکتاب کہا گیا ہے کہ وہ متشابہات کے معانی کی وضاحت کرتی ہیں اور ان میں پائے جانے والے تشابہات اور لفظی غیر واضح صورتوں کو آشکار کرتی ہیں کہ پھر متشابہات کا تشابہ باقی نہیں رہتا۔

مذکورہ بالا تین اقوال میں سے تیسرا قول صحیح و درست ہے کیونکہ آیت مبارکہ میں "هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ" کے الفاظ ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان میں "اصل الکتاب" ہونے سے زیادہ عمیق معنی ومفہوم ملحوظ ہے ورنہ "اُمُّ الْكِتٰبِ" کی بجائے "اصولِ الکتاب" کہا جاتا، یہ بات مسلم ہے کہ لفظ "اُمٌّ" ...... کہ جس کا لفظی ترجمہ "ماں" ہے...... "رجوع" و بازگشت کی اس حقیقت اور لطیف مفہوم کا حامل ہے کہ جس میں نشوونما، اشتقاق اور تبعض کے معانی پائے جاتے ہیں (بچہ کی نشوونما کا مرکز "ماں" ہے، اشتقاق یعنی اس کے لباس وجود میں آنے کا سبب "ماں" ہے، تبعض یعنی بچہ، ماں کا جزء، حصہ و ٹکڑا ہوتا ہے) لہٰذا اس لفظ (ام الکتاب) سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ آیات متشابہات بھی اپنے مخصوص معانی پر دلالت کرتی ہیں البتہ ان کے معانی، آیات محکمات کی پیداوار ہیں اور ان کی فروع وشاخیں اور حصے و ٹکڑے ہیں اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ آیات محکمات، متشابہات کے معانی کو واضح و آشکار کرنے والی ہیں، یعنی ان کا وجودی رتبہ ہی یہ ہے کہ وہ متشابہات کی توضیح و تشریح کرنے والی ہیں۔

اس کے علاوہ یہ امر قابل توجہ ہے کہ متشابہات کو اس بناء پر متشابہات کہا جاتا ہے کہ ان کے مرادی معانی غیر واضح ہوتے ہیں اور یہ بات آشکار نہیں ہوتی کہ وہ کن معانی پر دلالت کرتی ہیں، انہیں تاویل کی حامل ہونے کی بناء پر متشابہات سے موسوم نہیں کیا جاتا کیونکہ یہ بات تو آیات محکمات میں بھی پائی جاتی ہے کہ وہ بھی تاویل کی حامل ہیں، اور اس حوالہ سے

دونوں میں اشتراک پایا جاتا ہے یعنی تاویل کا حامل ہونا دونوں میں قدر مشترک ہے اور ایسا نہیں کہ صرف متشابہات میں یہ بات پائی جاتی ہو، اور قرآن مجید کی آیات کے درمیان باہمی ربط کی بنیاد ہی یہ ہے کہ وہ ایک دوسری کی تفسیر کرتی ہیں لہٰذا متشابہات کی تفسیر کرنے والی آیتیں بھی یقینی طور پر موجود ہیں اور وہ "محکمات" ہی ہیں ان کے علاوہ دیگر آیات اس صفت کی حامل نہیں ہوسکتیں چنانچہ اس کی ایک مثال یہ ہے:

سورہء قیامت، آیت ۲۳:

○ " اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَةٌ "

(اس دن چہرے اپنے رب کی طرف دیکھتے ہوں گے)

یہ آیت متشابہ ہے کیونکہ اس میں اس امر کی وضاحت موجود نہیں کہ لوگوں کا خدا کو دیکھنا کیونکر ہوگا؟ لیکن جب اس آیت کو دیگر آیات کی طرف لوٹایا جائے تو اس کا معنٰی واضح ہو جائے گا مثلاً ان آیات کو مدنظر قرار دیا جائے:

سورہء شوریٰ، آیت ۱۱:

○ " لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ..... "

(اس جیسی کوئی چیز نہیں ......)

سورہء انعام، آیت ۱۰۳:

○ " لَا تُدْرِکُهُ الْاَبْصَارُ..... "

(آنکھیں اس کو درک نہیں کرسکتیں ....)

تو واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ خدا کو دیکھنے سے مراد کیا ہے، یعنی اس کا دیکھا جانا بصری و حسی رؤیت کے باب سے نہیں اور اسے مادی جسمانی آنکھیں ہرگز نہیں دیکھ سکتیں، کیونکہ خداوند عالم نے دیکھنے کی نسبت دل کی طرف بھی دی ہے چنانچہ ارشاد حق تعالیٰ ہے:

سورہء نجم، آیت ۱۸:

○ " وَمَا کَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی ⑪ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰی مَا یَرٰی ⑫ ...... لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّهِ الْکُبْرٰی "

(اور دل نے جھوٹ نہیں کہا اس شے کی بابت کہ جسے اس نے دیکھا، کیا تم اس چیز کے بارے میں شک کرتے ہو جو اس نے دیکھی...... اس نے اپنے رب کی بہت بڑی نشانیاں دیکھیں......)

اس میں دل کی مخصوص رؤیت کا واضح ثبوت ملتا ہے اور اس سے غور و فکر اور سوچ مراد لینا ہرگز درست نہیں کیونکہ فکر کا

تعلق کسی چیز کے وجود کی صحت کے اثبات وتصدیق اور اشیاء کی ذہنی ترکیبات سے ہے جبکہ رؤیت کا تعلق وجود کی حامل مفرد چیز سے ہوتا ہے، بنابراین دل کی رؤیت سے مراد خاص قلبی توجہ ہے کہ جو نہ تو حسی و مادی ہے اور نہ ہی عقل و ذہن تک محدود ہے۔۔۔ بلکہ قلبی التفات کی ایک خاص صورت ہے۔۔۔۔، یہ مثال بلکہ اصول تمام متشابہات میں حکمفرما ہے (اور اسی کے تناظر میں متشابہات کی محکمات کی طرف بازگشت کا مسئلہ واضح ہوجاتا ہے اور محکمات کا ام الکتاب ہونا بھی معلوم ہوجاتا ہے)۔

۳۔ تأویل کا معنیٰ کیا ہے؟

'' تأویل '' کے متعدد معانی ذکر کیے گئے ہیں:

۱۔ کچھ مفسرین نے اس کا معنیٰ '' تفسیر'' کیا ہے یعنی وہ معنیٰ کہ جس کا ارادہ متکلم نے کیا ہو، (کلام کے مرادی معنی کو تأویل کہتے ہیں)، اور چونکہ بعض آیات کا معنیٰ واضح و روشن ہے اور ان سے مقصود معنی ظاہر و آشکار ہے لہٰذا آیۂ مبارکہ ''وَابۡتِغَآءَ تَاۡوِيۡلِهٖ ۚ وَمَا يَعۡلَمُ تَاۡوِيۡلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ......''میں تأویل سے مراد، متشابہ آیات کا مرادی معنیٰ ہے بنابراین یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ آیات متشابہات کے مرادی معانی سوائے خداوند عالم، یا خدا اور راسخون فی العلم کے، کوئی شخص نہیں جانتا،

۲۔ کچھ مفسرین نے کہا ہے ''تأویل'' سے مراد وہ معنیٰ ہے جو ظاہر اللفظ سے مطابقت نہ رکھتا ہو (اس کے برعکس ومخالف ہو)، یہ قول اس قدر عام ہوا کہ لفظ ''تأویل'' اسی معنی میں حقیقت قرار پا گیا البتہ حقیقت ثانیہ! جبکہ لغت کے حوالہ سے اس کا معنی لوٹانا، رجوع کرنا یا لوٹایا گیا اور مرجع ۔۔۔ جس کی طرف رجوع و بازگشت ہوئی ہو ۔۔۔ ہے۔

بہرحال متاخرین ۔۔۔۔ علماء ومفسرین ۔۔۔ کے درمیان دوسرا معنیٰ ہی مشہور ہے جیسا کہ قدماء مفسرین کے درمیان پہلا معنیٰ مشہور تھا ۔۔ پہلا معنی سابقہ مفسرین نے اختیار کیا اور دوسرا معنیٰ بعد میں آنے والے اہل علم حضرات نے اختیار کیا۔۔۔۔، البتہ قدیم مفسرین حضرات میں سے بعض اس بات کے قائل ہوئے کہ تأویل کا علم خداوند عالم کے سوا کسی کو حاصل نہیں اور بعض حضرات نے کہا کہ راسخون فی العلم بھی اس کا علم رکھتے ہیں چنانچہ جناب عبداللہ ابن عباس کے بارے میں منقول ہے کہ وہ کہا کرتے تھے : " انا من الراسخين في العلم وانا اعلم تأويلهٗ "، (میں رَاسِخُوۡنَ فِی الۡعِلۡمِ میں سے ہوں اور میں قرآن کی تأویل کا علم رکھتا ہوں)

۳۔ کچھ حضرات نے یہ رائے پیش کی ہے کہ ''تأویل'' دراصل آیت کے معانی ہی میں سے ایک معنی ہے کہ جسے یا تو صرف خداوند عالم جانتا ہے اور یا خداوند عالم اور راسخون فی العلم جانتے ہیں ان کے سوا کوئی اس کا علم نہیں رکھتا وہ معنی ظاہر

اللفظ سے متصادم، مخالف و منافی نہیں یعنی ایسا نہیں کہ آیت کے ظاہری الفاظ سے مطابقت نہ رکھتا ہو۔

اس قول کی بناء پر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ متشابہ آیت کے متعدد معانی ہیں جو ایک دوسرے سے ملے جلے ہیں اور ان میں سے بعض معانی، ظاہر الالفاظ ہی سے سمجھے جا سکتے ہیں اور ہر شخص ان کا فہم وادراک رکھتا ہے اور بعض معانی ظاہر الالفاظ سے کوسوں دور ہیں کہ جن کا سمجھنا ہر شخص کے بس میں نہیں اور ان تک رسائی عام انسان کی قدرت فکری سے خارج ہے ان کا علم خداوند عالم یا خدا کے علاوہ راسخون فی العلم ہی رکھتے ہیں، اس مقام پر مفسرین کرام کے درمیان ان معانی کے ظاہر الالفاظ سے ربط کی کیفیت کے بارے میں اختلاف رائے پیدا ہو گیا کہ جو معانی عام انسان کی قوت فکری کی دسترس سے باہر ہیں اور خداوند عالم و راسخون فی العلم کے سوا کوئی بھی ان کا فہم وادراک نہیں رکھتا ان کا آیت کے ظاہری لفظوں یا الفاظ کے ظواہر سے ربط کیونکر ہے؟ کیونکہ یہ بات تو یقینی ہے کہ وہ تمام معانی الفاظ کے مرادی معانی ہونے کے حوالہ سے ایک ہی جہت میں واقع نہیں یعنی ایک ہی جہت میں ایک دوسرے کے مدمقابل قرار نہیں پا سکتے ورنہ ایک لفظ کا ایک سے زیادہ معنی میں استعمال کیا جانا لازم آئے گا جو کہ صحیح نہیں اور اس کی عدم صحت بلکہ عدم جواز اپنے مقام پر واضح ہو چکا ہے (یعنی ایسا ممکن نہیں کہ متکلم اپنے بیان میں ایک لفظ سے متعدد معانی مراد لے) بنابراین لامحالہ وہ معانی سلسلۂ طولیہ میں قرار پائیں گے یعنی یکے بعد دیگرے قابل تصور ہوں گے لہٰذا ان کی بابت یوں کہا گیا کہ وہ معانی، ظاہری معانی کے لوازم (ان سے جڑے ہوئے) ہیں اور ان کے لوازم اور جڑے ہوئے ہونے کی کیفیت یہ ہے کہ ہر لفظ ایک معنیٰ رکھتا ہے کہ جسے اس کا لازم المعنی کہا جاتا ہے اور پھر اس لازم المعنیٰ سے ایک اور معنیٰ جڑا ہوا ہوتا ہے کہ جسے اس کا لازم المعنی کہا جاتا ہے اور پھر اس لازم المعنی سے ایک اور معنی جڑا ہوا ہوتا ہے کہ جسے اس کا لازم المعنی کہتے ہیں جو کہ ''لازم لازم المعنیٰ'' کہلاتا ہے اور اسی طرح یہ سلسلہ آگے بڑھتا چلا جاتا ہے، (تو اس حوالہ سے جو معانی تأویل کہلاتے ہیں اور خدا اور راسخون فی العلم کے علاوہ کوئی ان کا علم نہیں رکھتا وہ دراصل ظاہری معانی کے لوازم یعنی ان سے وابستہ ہیں)۔ بعض حضرات نے اس کیفیت کے بارے میں اس طرح کہا ہے کہ ان معانی کا باہمی ربط اس طرح سے ہے جیسے باطن کا ظاہر سے ہوتا ہے کہ جب ظاہری الفاظ سے ان کے ظاہری معروف معانی کا ارادہ کیا جاتا ہے تو وہ جہاں ظاہری معانی کا ارادہ ہوتا ہے وہاں بعینہ باطنی معانی کا ارادہ بھی ہوتا ہے اس کی مثال یوں پیش کی جا سکتی ہے کہ جب آپ کسی سے کہیں کہ مجھے پانی پلاؤ، تو آپ بظاہر اس سے یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ آپ کو پانی پلائے جبکہ اس کے باطنی معانی یہ ہیں کہ گویا آپ نے اسے کہا ہے کہ:

(۱) وہ آپ کو پانی پلائے،

(۲) وہ آپ کو سیراب کرے،

(۳) آپ کے وجود کی ضرورت کو پورا کرے،

(۴) وہ آپ کو ایک وجودی کمال سے بہرہ ور کرے،

مگر آپ نے اپنے جملہ" مجھے پانی پلاؤ "میں بظاہر یہی بات طلب کی ہے کہ وہ آپ کو پانی لا کر دے جبکہ دیگر تین معانی باطنی طور پر آپ کا مطلوب ہے جو کہ لفظوں میں مذکور نہیں اور ایسا نہیں کہ الفاظ کو ان چار معنوں میں استعمال کیا گیا ہو اور چار چیزیں طلب کی گئی ہوں یا چار دستورات صادر کئے گئے ہوں بلکہ ایک ہی طلب درحقیقت چاروں معانی کی طلب کی حامل ہے اور وہ معانی ایک دوسرے کے باطن میں ایک دوسرے سے مرتبط ہیں اور" پانی پلانا" ان سب سے ربط و تعلق کا حامل اور ان پر متکی ہے،...... یہی صورت حال آیت متشابہ کی ہے کہ اس کے باطنی معانی اس کے ظاہری الفاظ ہی میں متکلم کی مراد ہیں اور ان سے کامل وابستگی رکھتے ہیں کہ جسے تأویل سے تعبیر کیا جاتا ہے.....،

(۴) تأویل کی بابت چوتھا قول یہ ہے کہ وہ الفاظ کے مرادی معانی کے باب سے نہیں بلکہ وہ اس حقیقت سے عبارت ہے جو کلام کی اصل و اساس ہے اور اس پر کلام قائم و استوار ہے لہٰذا اگر کلام انشائی ہو یعنی کسی حکم و فرمان (امر یا نہی) پر مشتمل ہو تو اس کی تأویل سے مراد وہ مصلحت و حکمت ہوگی کہ جس کی بناء پر وہ حکم و فرمان جاری کیا گیا اور اسے دستور و قانون کی شکل دی گئی، مثلاً آیت مبارکہ:" اقیموا الصلواۃ "(نماز پڑھو، نماز قائم کرو) میں اس مخصوص عمل کی انجام دہی کا جو فرمان جاری کیا گیا ہے اس کی اصل حقیقت (تأویل) نماز گزار کی وہ ظاہری نورانی حالت و کیفیت اور صورت ہے جو ظاہر بظاہر اس ایک وجود میں سمٹ کر اس کے باطن کا مظہر اور اس کی روحانی حیثیت کی عکاس کرتی ہے اور اسے برائی و منکرات سے روکتی ہے..... شاید اس وجہ سے لفظ" قائم کرنا" استعمال ہوا، واللہ العالم .....،

یہ ہے کلام کے انشائی یعنی حکم و فرمان پر مشتمل ہونے کی صورت میں تأویل کا معنی، اور اگر کلام خبری ہو یعنی اس میں کسی گذشتہ واقعہ کی خبر دی گئی ہو تو اس کی تأویل سے مراد وہی اصل واقعہ ہوگا جو گذشتہ دور میں رونما ہوا، اس کی مثال وہ آیات مبارکہ ہیں جن میں سابقہ انبیاء علیہم السلام اور پہلی قوموں کی سرگذشت بیان ہوئی ہے تو ان آیات کی تأویل سے مراد وہ اصل واقعات ہیں جو سابق زمانہ میں وجود پذیر و رونما ہوئے، اگر ان حالات و واقعات کہ جن کی خبر دی گئی ہو، کا تعلق زمانہ ماضی سے نہ ہو بلکہ ان کا تعلق زمانہ حال و مستقبل سے ہو تو اس کی دو قسمیں ہیں:

(۱) جن امور کی خبر دی گئی ہے وہ ظاہری حواس یا عقلی فہم و ادراک کی دسترس میں ہیں (انہیں ظاہری حواس یا عقل و فکر کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے) تو ان کی تأویل وہی امور ہیں جو ظاہر بہ ظاہر وجود میں آئے یا آئیں گے جیسا کہ ماضی میں رونما ہونے والے واقعات کی بابت ذکر کیا گیا ہے، مثلاً آیہء مبارکہ:" وَفِيكُمْ سَمّٰعُونَ لَهُمْ "(سورہء توبہ، آیت ۴۷) .....اور تم میں ان کے جاسوس موجود ہیں.....، اس آیت میں زمانہ حال میں پائے جانے والے امر کا ذکر ہوا ہے اور اس

کی تأویل وہاں موجود ان افراد سے عبارت ہے جو مؤمنین کے درمیان پائے جاتے ہیں جبکہ وہ ان کے دشمنوں کے لئے جاسوسی کا کام کرتے ہیں، یا آیۂ شریفہ : " غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۝ فِیْۤ اَدْنَی الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۝ فِیْ بِضْعِ سِنِيْنَ "(سورہ ءروم، آیات ۲، ۳، ۴) ......رومیوں نے شکست کھائی، قریب ترین علاقہ میں، اور وہ شکست کھانے کے بعد بہت جلد پھر غالب آجائیں گے، چند ہی سالوں میں!)

اس آیت میں مستقبل کی خبر دی گئی اور پیش گوئی کی گئی ہے، تو اس کی تأویل وہ اصل واقعات ہیں جو مستقبل میں رونما ہوں گے۔

(۲) جن امور کی خبر دی گئی ہے وہ ان غیبی امور میں سے ہیں جو آئندہ وجود پائیں گے کہ جو نہ تو ہمارے حواس کی دسترس میں ہیں اور نہ ہی ہماری عقلیں ان کی اصل وحقیقت کو سمجھ سکتی ہیں مثلاً وہ امور جن کا تعلق روز قیامت سے ہے یعنی اس کا دن اور وقت، مردوں کے زندہ ہوکر دوبارہ اٹھائے جانے کی کیفیت اور ان سب کا ایک جگہ اکٹھا ہونا، سوال و جواب اور حساب و کتاب اور اعمال ناموں کا سامنے آنا وغیرہ، اسی طرح وہ امور کہ جن کا تعلق کسی وقت و زمانہ سے نہیں اور نہ وہ زمانی و مکانی اشیاء و امور کی سنخ سے ہیں مثلاً صفات و افعال خداوندی کی حقیقت، تو ان کی تأویل بھی وہی حقائق ہیں، البتہ ان آیات میں کہ جو صفات و افعال خداوندی اور قیامت کے دن اور اس کے مربوطہ احوال جیسے امور کے ذکر پر مشتمل ہیں دیگر آیات متشابہات سے مختلف صورتحال پائی جاتی ہے اور ان کے درمیان بنیادی فرق یہ ہے کہ دیگر آیات میں جن امور کا تذکرہ ہوا ہے ان کی تأویل سے آگاہ ہونا ممکن ہے جبکہ غیبی امور اور صفات و افعال خداوندی و روز قیامت سے مربوط امور اس طرح نہیں اور ان سے آگاہ ہونا ممکن نہیں کیونکہ ان کا علم اور ان کی تأویل سے آگاہی صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے اس کے سوا کوئی ان کی حقیقی تأویل یا حقیقت التأویل سے آگاہ نہیں، البتہ " رَاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ " اسی حد تک اس سے آگاہ ہوسکتے ہیں جس حد تک خداوند عالم انہیں علم دے اور ان کی عقلی توانائی و توانمندی کے مطابق انہیں کچھ عطا کرے، لیکن ان امور کی اصل حقیقت جو کہ ان کی حقیقی تأویل ہے وہ بنیادی طور پر علم خداوندی ہی سے مختص ہے۔

یہ ہیں وہ چار اقوال و آراء جو تأویل کے معنی کی بابت ارباب فکر و نظر نے پیش اور ذکر کی ہیں، ان کے علاوہ بھی متعدد دیگر اقوال موجود ہیں جو ان اہل فن حضرات نے ذکر کئے ہیں جو کہ درحقیقت مذکورہ بالا اقوال میں سے پہلے قول ہی کی شاخیں ہیں اگرچہ ان کے قائل حضرات پہلے قول کو درست تسلیم کرنے سے وحشت زدہ ہیں، وہ اقوال سات ہیں اور ان کی تفصیل یوں ہے :

تفسیر وتاویل کی بابت سات اقوال

(۱) '' تفسیر'' اور'' تأویل '' میں یہ فرق ہے کہ تفسیر، تأویل سے زیادہ عمومیت رکھتی ہے..... اس کا دائرہ تأویل سے زیادہ وسیع ہے..... اور اسے الفاظ اور ان کے مفردات وحروف میں استعمال کیا جاتا ہے جبکہ ''تأویل'' کا زیادہ تر استعمال معانی اور جملوں میں ہوتا ہے، اس کے علاوہ لفظ'' تأویل '' عام طور پر آسمانی کتب کی بابت استعمال ہوتا ہے جبکہ لفظ'' تفسیر'' آسمانی کتب کے علاوہ دیگر کتب کی بابت بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

(۲) '' تفسیر'' کا معنی یہ ہے کہ لفظ سے اس کے اس معنی کو بیان کیا جائے کہ جس میں ایک ہی جہت کا احتمال پایا جاتا ہو جبکہ ''تأویل'' سے مراد لفظ کے چند احتمالی معانی میں سے کسی ایک معنی کو مشخص کرنا ہے کہ جو بذریعہ استنباط اور دلیل کی بنیاد پر ہوتا ہے۔

(۳) '' تفسیر'' سے مراد، لفظ سے اس کے قطعی ویقینی معنی کو بیان کرنا ہے جبکہ ''تأویل'' سے مراد، لفظ کے چند احتمالی معانی میں سے کسی ایک معنی کو ترجیح دینا ہے بشرطیکہ وہ معانی غیر قطعی وغیر یقینی ہوں، یہ قول دوسرے قول سے قریب تر ہے۔

(۴) '' تفسیر'' کا معنی، مرادی معانی کی دلیل کو بیان کرنا ہے جبکہ ''تأویل'' کا مطلب حقیقت المراد کو بیان کرنا ہے، چنانچہ اس کی مثال یوں ہے: خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: '' اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ''(سورۂ فجر، آیت ۱۴)..... تیرا رب، گھات میں ہے..... ،اس کی تفسیر یہ ہے کہ لفظ'' مرصاد'' بروزن مفعال (میم کے نیچے زیر کے ساتھ)'' رصد'' سے مشتق ہے جس کا معنی گھات میں ہونا اور نگرانی کرنا ہے، اور اس کی ''تأویل'' یہ ہے کہ آیت مبارکہ میں لوگوں کو خدائی احکام و دستورات کی بابت بے توجہی وغفلت برتنے سے دور رہنے کی تاکید کی ہے..... اور انہیں خبردار کیا ہے، کہ وہ تمہاری کمین اور گھات میں ہے لہٰذا اس کے فرامین کی بجا آوری میں کسی طرح سے سستی وکوتاہی سے کام نہ لیں..... ،

(۵) '' تفسیر'' سے مراد، لفظ کے ظاہری معنی کو بیان کرنا ہے جبکہ ''تأویل'' اس کے مشکل معنی کے بیان سے عبارت ہے۔

(۶) '' تفسیر'' کا تعلق روایت سے ہے یعنی روایت کے ذریعے آیت کا معنی سمجھا جائے جبکہ ''تأویل'' سے مراد یہ ہے کہ آیت کا معنی درایت اور غور وفکر کے ذریعے سمجھا جائے۔

(۷) '' تفسیر'' کا تعلق آیت کے معنی پر کان دھرنے اور اس پر عمل کرنے سے ہے جبکہ ''تأویل'' غور وفکر اور استنباط کے ذریعے آیت کے معنی کو سمجھنے سے زیادہ کسی چیز کا نام نہیں۔

مذکورہ بالا سات اقوال درحقیقت مقدم الذکر چار اقوال میں سے پہلے قول ہی کے شعبے اور اس کی شاخیں ہیں لہٰذا جو اشکال و اعتراض اس قول پر وارد ہوا تھا وہ بعینہٖ ان سب پر وارد ہوتا ہے، بہر حال نہ تو ان چار اقوال کو درخور اعتناء قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ ہی ان سے مربوطہ آراء و اقوال کو کسی اہمیت کی نظر سے دیکھا جا سکتا ہے کیونکہ :

(۱) اجمالی جواب :

قارئین کرام بخوبی آگاہ ہیں کہ آیت کی تأویل سے وہ مفہوم مراد نہیں جس پر آیت دلالت کرتی ہو کہ خواہ ظاہراً آیہ سے عدم مطابقت کا حامل ہو یا مطابقت کا حامل ہو، بلکہ ''تأویل'' دراصل عالم الخارج میں پائے جانے والے حقیقی امور میں سے ایک ہے لیکن اس سے یہ غلط فہمی پیدا نہ ہو کہ عالم الخارج میں وجود پذیر ہونے والا ہر امر اس کا مصداق بن سکتا ہے اور اسے ''تأویل'' سے موسوم کیا جا سکتا ہے، ہرگز ایسا نہیں بلکہ عالم الخارج میں پائے جانے والے اس خاص و مخصوص امر کو ''تأویل'' کا مصداق قرار دیا جا سکتا ہے کہ جو کلام سے اس طرح کی نسبت رکھتا ہو جو مثل کی مثال سے اور باطن کی ظاہر سے ہوتی ہے، (مِثل یعنی جس کی مثال دی گئی ہو اور مَثَل (م اور ث پر زبر کے ساتھ) سے مراد وہ چیز جو کسی شے کا مظہر ہو)۔

(۲) تفصیلی جواب :

پہلے قول پر ہی ایک بنیادی اعتراض وارد ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اس سے کم از کم یہ غلط نتیجہ ظاہر ہوگا کہ قرآن مجید کی بعض آیات ایسی ہیں کہ ان کی تأویل یعنی تفسیر اور الفاظ سے سمجھے جانے والے مرادی معانی عامتہ الناس کی قوت فہم و ادراک کی دسترس سے باہر ہوں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید میں اس طرح کی کوئی آیت یا آیات موجود نہیں کیونکہ قرآن ایسی عظیم کتاب ہے جس کا واضح لفظوں میں یہ اعلان ہے کہ اسے اس لئے نازل کیا گیا ہے کہ فہم و ادراک کی قوتیں اسے پاسکیں اور ہر شخص اس کے معانی و مراد سے آگاہی کی نعمت سے بہرہ ور ہو سکے، بنابرایں مذکورہ رائے کے قائل کے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار باقی نہیں رہ جاتا کہ وہ اس نظریہ کو اختیار کرلے کہ آیات متشابہات صرف اور صرف وہ حروف مقطعہ ہیں جو سورتوں کی ابتداء میں ذکر ہوئے ہیں کیونکہ ان کے معانی کا ادراک عام فہم نہیں اور عمومی قوت فہم کو ان تک دسترس حاصل نہیں، لیکن اس نظریہ کی صحت پر کوئی دلیل موجود نہیں اور صرف یہ بات کافی نہیں کہ دونوں لفظوں یعنی ''تأویل'' اور ''تفسیر'' میں چونکہ رجوع اور بازگشت کا معنی پایا جاتا ہے لہٰذا دونوں کی حقیقت ایک ہے اور ''تأویل'' ہی تفسیر ہے، ایسا ہرگز نہیں کیونکہ اس طرح ہر لفظ کے بارے میں کہا جانے لگے گا کہ جو کہ درست نہیں مثلاً لفظ ''ام'' جس کا ترجمہ ''ماں'' ہے اور وہ اپنی اولاد کی جائے رجوع ہوتی ہے یعنی اولاد کی بازگشت ماں کی طرف ہوتی ہے جبکہ اسے اولاد کی تأویل قرار نہیں دیا جا سکتا، اسی طرح ''رئیس'' وسردار اپنے مرؤس ورعیت کی جائے رجوع ہوتا ہے اور اس کی طرف ان کی بازگشت ہوتی ہے لیکن وہ ان کی ''تأویل'' نہیں کہلاتا، اس کے علاوہ یہ امر قابل توجہ ہے کہ آیۂ مبارکہ میں جملہ "ابتغاء الفتنة" آیا ہے یعنی وہ لوگ فتنہ پروری کے

لئے آیات متشابہات کی پیروی کرتے ہیں، تو اس میں آیات متشابہات کو فتنہ جوئی کے لئے استعمال کیا جانے والا ذریعہ قرار دیا گیا ہے جبکہ فتنہ جوئی کے لئے حروف مقطعہ کی بجائے دیگر آیات کی پیروی کو اختیار کیا گیا ہے اور کوئی ایسی مثال نہیں ملتی کہ کسی نے حروف مقطعہ کی پیروی کو ذریعہ فتنہ پروری قرار دیا ہو بلکہ عام مشاہدہ میں یہ بات آئی ہے کہ اسلام میں فتنہ پروری کا بازار گرم کرنے میں صفات خداوندی پر مشتمل آیات اور احکام کے علل و اسباب کی مہم جوئی کو ذریعہ قرار دیا گیا ہے...... جبکہ حقیقت الامر یہ ہے کہ صفات خداوندی پر مشتمل آیات کے معانی و مفاہیم کا ادراک اور احکام الٰہیہ کی علل و اسباب سے آگاہی کا مسئلہ آسان نہیں اور اسی وجہ سے ان آیات کو متشابہات سے موسوم کیا جاتا ہے کہ جن کا علم خداوند عالم کے علاوہ ان راسخون فی العلم کو ہے جو خدا کی طرف سے اس مقدس عطیہ سے بہرہ ور ہوئے ہوں، م...،

یہ تھا پہلا قول اور اس کا جواب!

جہاں تک دوسرے قول کا تعلق ہے تو اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ:

اس سے یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ قرآن مجید میں کچھ آیات ایسی موجود ہیں کہ جن سے ان کے ظاہری معانی کے برعکس معانی مراد لئے گئے ہیں کہ جن سے دین میں فتنہ پروری کی راہ ہموار ہوتی ہے، انہی کی وجہ سے آیات محکمات سے ٹکراؤ کی صورت پیدا ہوتی ہے، تو نتیجتاً قرآنی آیات کے درمیان اختلاف و ناہم آہنگی کا پایا جانا مسلم ہو جائے گا کہ جس کا دور کرنا صرف اسی صورت میں ممکن ہو گا کہ بعض آیات سے ان کے ظاہری معانی مراد نہ لئے جائیں اور ان کی بجائے ایسے معانی کا تصوراتی تعین کیا جائے جو عام فہم نہ ہوں اور عمومی قوت فہم و ادراک کی دسترس سے باہر ہوں، جبکہ یہ بات اس قرآنی حجت و استدلال اور مدلل اظہار و اعلان سے متصادم ہی نہیں بلکہ اس کو غلط و نادرست قرار دیئے جانے کی ایک صورت ہوگی کہ جس میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

سورہ نساء، آیت ۸۲:

O " اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا كَثِیْرًا "

(کیا وہ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے کہ اگر وہ اللہ کے علاوہ کسی اور شخص کی طرف سے ہوتا تو وہ لوگ اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے)

اس آیت میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ قرآن مجید میں کسی طرح کا کوئی اختلاف و دورنگی اور ناہم آہنگی نہیں پائی جاتی اور آیت کے الفاظ صراحت کے ساتھ اس حقیقت پر دلالت کرتے ہیں کہ قرآن مجید ہر طرح کے اختلاف سے مبرا ہے، اور اگر دو آدمیوں کے درمیان عدم اختلاف کا مسئلہ اس طرح حل کیا جائے کہ ان میں سے کسی ایک یا دونوں سے ان کے ظاہری معانی کے علاوہ معانی مراد لئے جائیں بلکہ وہ تاویلی معانی مراد لئے جائیں کہ جن کا علم خداوند عالم کے سوا کسی کو

حاصل نہیں تو اس صورت میں آیہ مبارکہ (سورہ ءنساء، ۸۲) میں ذکر کیے جانے والے استدلال وحجت کی کوئی حیثیت ہی باقی نہیں رہتی کیونکہ کسی بھی کلام میں خواہ وہ غیر خدا کا ہی کیوں نہ ہو اس طرح تأویلی معانی مراد لے کر اختلافی صورت کو ختم کرنا آسان وممکن امر ہے اور کسی کلام میں عدم اختلاف سے مراد ہرگز یہ نہیں لیا جاسکتا کہ جہاں کہیں اختلافی صورت نظر آئے وہاں کلام کو اس کے ظاہری معانی سے پھیر کر اس سے دیگر معانی مراد لئے جائیں تاکہ یہ نہ کہا جاسکے کہ اس میں اختلاف پایا جاتا ہے بلکہ تأویلی معانی مراد لے کر اختلاف کی نفی کر دی جائے، اس طرح کلام الٰہی کی عظمت متزلزل ہو جائے گی کیونکہ اس کا دعویٰ ہے کہ اس میں کوئی اختلاف و ناہم آہنگی نہیں پائی جاتی اور اگر عدم اختلاف کے حوالہ سے مذکورہ طریقہ اپنایا جائے تو اختلاف سے مبرا و منزہ ہونے کی جو صفت و خصوصیت کلامِ خدا میں پائی جاتی ہے وہ اس کا امتیازی حوالہ نہ رہے گا اور اس کے غیر بشر کا کلام ہونے کا ثبوت ہی باقی نہ رہے گا۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کا عدم اختلاف ہی اس کے غیر بشر کا کلام ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ہے بلکہ کہا جاسکے گا کہ جس طرح ہر کلام اور کلام کے الفاظ میں بظاہر دکھائی دینے والا اختلاف تأویلی معانی مراد لے کر دور کیا جاسکتا ہے اسی طرح قرآنی آیات میں بھی ممکن ہے کیونکہ جس کتاب وکلام کا مطالعہ کریں اس میں یہ صورت نظر آتی ہے یہاں تک کہ یقینی طور پر جھوٹ ولغو پر مشتمل کلام میں بھی یہ بات پائی جاتی ہے کہ تأویلی معانی لے کر اسے سچ وحق سے مطابقت کا حامل قرار دیا جاسکتا ہے اور اس کے ظاہری الفاظ سے مختلف معانی مراد لے کر اس کی اصل حقیقت و صورت پر پردہ ڈالا جاسکتا ہے، بنابرایں مذکورہ بالا طریقہ سے عدم اختلافات کا دعویٰ کرنا قرآنِ مجید کی امتیازی عظمت کو ثابت نہیں کرسکتا اور نہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ یہ کلام اپنی مجموعی صورت میں اس طرح ہے کہ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ اس اس ہستی کا کلام ہے جو زمانی ومکانی حالات وکیفیات سے مبرا، آراء ونظریات کے تناقض سے منزہ، سہو ونسیان وخطا سے پاک اور گردش لیل ونہار ورفتارِ زمانہ کے ساتھ ساتھ تدریجی طور پر روبہ کمال نہیں۔ جبکہ آیہ مبارکہ (سورہ ءنساء، ۸۲) اس حقیقت کے بیان اور اس استدلال پر مشتمل ہے کہ قرآن مجید بشر کا کلام نہیں کہ جس میں اختلاف پایا جاتا ہو...... بلکہ وہ اس ہستی کا کلام ہے جو کسی طرح کے تغیر وتبدل سے دوچار نہیں ہوتی، اس کی آراء میں دورنگی وتناقض نہیں پایا جاتا، اس پر سہو ونسیان وخطا کا غلبہ نہیں ہوتا اور اس کا کمال رفتارِ زمانہ کا مرہونِ منت نہیں۔ ، لہٰذا یہ آیت مبارکہ اپنے خاص اندازِ بیان ومخصوص طرز اظہار کی بناء پر صراحت کے ساتھ اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ قرآن مجید عام فہم معانی رکھتا ہے اور اس کے الفاظ سے مراد معانی کا ادراک عمومی قوتِ فہم سے خارج نہیں اور اس کے الفاظ ومعانی بحث وتحقیق اور غور وفکر وتدبر کے متقاضی ہیں، اس میں کوئی آیت ایسی نہیں پائی جاتی جس کے الفاظ سے ایسے معانی مراد لئے گئے ہوں جو عربی کلام کے ظواہر سے منافی ومتصادم ہوں یا ان میں معمہ سازی اور بیان کے پیچ وخم پائے جاتے ہوں۔

اب تیسرے قول کی بابت عرض ہے کہ اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ قرآنی

آیاتِ مبارکہ ایسے معانی پر مشتمل ہیں کہ جن میں سے بعض دوسرے بعض سے وابستہ اور وہ ایک دوسرے پر فوقانی وتحتانی درجات میں ہیں تو اس سے سوائے اس کے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ جو قوتِ تفکر وتدبر سے محروم ہو لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ تمام معانی...... بالخصوص وہ معانی کہ جو تحت اللفظی معانی سے جڑے ہوئے ہیں اور ان کے لوازم المعنی کہلاتے ہیں...... قرآنی الفاظ ہی کے معانی ہیں البتہ ان کے سمجھنے میں جو فرق واختلاف پایا جاتا ہے اس کی وجہ سمجھنے والے شخص اور سننے والے فرد کی قوتِ فکر وذکاوتِ ذہن یا ضعف وناتوانی فکر اور کندیٔ ذہن ہے کہ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمام لوگ ان تمام معانی کو پورے طور پر درک نہ کر سکیں، لہٰذا اس بات کا تعلق ''تأویل'' سے نہیں کہ جس کے بارے میں خداوندِ عالم کا ارشادِ گرامی ہے: ''وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللّٰهُ''، (اس کی تأویل خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا)، کیونکہ بلند پایہ معارف وحقائق اور گہرائی وگیرائی کے حامل مسائل کی بابت اذہان وافکار کا فرق افراد کے تقویٰ وپاکیزگیٔ نفس کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ تیزی وتندیٔ فکر ونظر اور سستی وکندیٔ فہم ودرک کا نتیجہ ہوتا ہے البتہ تقویٰ وپاکیزگیٔ نفس، پاکیزہ معارف وخدائی مقدس علوم وحقائق کے ادراک میں ملحوظ ومقصود اور مؤثر واقع ہونے والی اعلیٰ ترین صفات ہیں کہ خدائی پاکیزہ معارف یقیناً پاکیزہ ظرف چاہتے ہیں لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ تقویٰ وپاکیزگیٔ نفس ہی ان کے دراک کا کامل وواحد سبب ہے جیسا کہ آیت کے ظاہری الفاظ ہی سے واضح ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: '' وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللّٰهُ''...... اس کی تأویل سوائے خداوندِ عالم کے کوئی نہیں جانتا......،

اب رہا چوتھا قول، تو اس کی بابت یہ اعتراض سامنے آتا ہے کہ اگرچہ اس کی بعض شقیں درست ہیں لیکن دیگر بعض شقوں میں نادرستی پائی جاتی ہے، اور وہ یوں کہ اس میں یہ بات تو صحیح ہے کہ تأویل کا دائرہ، آیات متشابہات تک محدود نہیں بلکہ پورا قرآن تأویل کا حامل ہے اور یہ کہ تأویل سے مراد وہ معانی نہیں کہ جن پر الفاظ دلالت کرتے ہیں بلکہ وہ ان سے باہر اور عالم الخارج میں پائے جانے والے حقیقی امور ہیں کہ جن پر کلام کی بنیاد قائم واستوار ہے، لیکن اس قول کے قائل سے یہ غلطی سرزد ہوگئی کہ اس نے عالم الخارج میں وجود پانے والے ہر امر کو مضمونِ کلام سے مربوط قرار دے دیا ہے یہاں تک کہ ان روایات کو بھی تأویل کا مصداق مان لیا جن میں سابقہ زمانوں اور گذشتہ اقوام کی داستانیں مذکور ہیں اور پچھلے ادوار میں رونما ہونے والے واقعات کا تذکرہ ہے، اور اس نے اس سلسلہ میں بھی غلطی کا ارتکاب کیا کہ آیات متشابہات کو انہی آیات میں منحصر قرار دے دیا جن میں صفاتِ خداوندی اور روزِ قیامت کے حالات ذکر کئے گئے ہیں۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ: اس قول کی بناء پر لفظ ''تأویل'' کی بابت بحث ہوگی کہ آیت میں اس کا تعلق واشارہ کس طرف ہے، اگر یہ کہا جائے کہ جملہ ''وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ'' میں ضمیر (ہ) کی بازگشت پورے قرآن کی طرف ہے اور اس کا مرجع ''الکتاب'' ہے تو اس صورت میں جملہ ''وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللّٰهُ'' اس سے ہم آہنگ نہ رہے گا کیونکہ تأویل قرآن

کا کثیر حصہ ایسا ہے کہ جسے غیر خدا اور غیر راسخون فی العلم اور عوام الناس بلکہ دلوں کی کجی کی بیماری میں مبتلا افراد بھی سمجھ سکتے ہیں اور ان سے آگاہ ہو سکتے ہیں مثلاً داستانیں و واقعات، احکام و دستورات اور اخلاقی ارشادات پر مشتمل آیات، تو جو آیات رونما ہونے والے واقعات پر مشتمل ہیں ان میں مذکور باتوں کو سمجھنا تمام لوگوں کے دائرۂ فہم وادراک میں آتا ہے اور کوئی ان سے آگاہی حاصل کرنے سے محروم نہیں ہوتا، ...... نہ ہی ان سے عدم آگاہی کسی ٹھوس و مفید نتیجہ کا سبب بن سکتی ہے بلکہ اس کی کوئی وجہ بھی نہیں ہو سکتی ، اسی طرح اخلاقی حقائق اور خدائی احکام و دستورات مثلاً عبادات و معاملات اور دیگر شرعی فرامین سے حاصل ہونے والے فوائد بھی ایسے ہیں کہ ان کا ادراک تمام افرادِ بشر کر سکتے ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ لوگ اس سے محروم ہوں،

اور اگر یہ کہا جائے کہ آیت میں تأویل سے مراد فقط آیات متشابہات کی تأویل ہے تو اس صورت میں ان کی ''تأویل'' کے علم کا خداوندِ عالم کی ذات اقدس سے اختصاص وحصر درست پائے گا کہ جس کا ذکر اس جملہ میں ہوا ہے ''وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللهُ''، اور یہ بات ثابت ہوگی کہ خداوند عالم اور راسخون فی العلم کے علاوہ کسی کو ہرگز روا نہیں کہ آیات متشابہات کی تأویل ڈھونڈنے نکلے کیونکہ ان کے ایسا کرنے سے فتنہ کو ہوا ملے گی اور ضلالت وگمراہی پھیلے گی، لیکن اس قول سے ایک خرابی لازم آتی ہے اور وہ یہ کہ آیات متشابہات کو صرف انہیں آیات سے مختص و محدود قرار دینا کہ جو خداوندِ عالم کی صفات، اور روز قیامت کے حالات کے ذکر پر مشتمل ہیں بلا دلیل ہے کیونکہ جس طرح اس طرح کی آیات کی تأویل جوئی سے فتنہ وگمراہی کو ہوا ملتی ہے اسی طرح دیگر آیات متشابہات کی تأویل جوئی کا نتیجہ بھی یہی ہے مثلاً آیات احکام و آیات القصص وغیرہ، کہ ان میں سے متشابہات کی تأویل جوئی سے بھی فتنہ وگمراہی کے اسباب فراہم ہوتے ہیں، چونکہ آیات الاحکام ہی کے حوالہ سے اگر یہ کہا جائے (جیسا کہ کہا گیا ہے) کہ دین و شریعت اور احکام و دستورات الٰہی کا اصل مقصد انسانی معاشرہ کا احیاء ہے کہ جو اس کے امور میں اصلاحی عمل کے ذریعے اس طرح ممکن ہے کہ ان احکام کو معاشرہ پر منطبق کیا جائے اور معاشرتی حالات و امور سے ہمرنگ کیا جائے لہٰذا جب مقصد و مقصود ہی یہ ہے کہ معاشرہ میں بہتری برقرار ہو تو اگر ایسا ہو نا شرعی حکم کی عملداری و نفاذ کے بغیر ممکن ہو جائے یا ایسی صورت حال پیدا ہو جائے کہ شرعی حکم کی تطبیق میں معاشرہ کی بہتری نہ ہو تو ضروری ہوگا کہ شرعی حکم کے علاوہ دوسرے کسی حکم واصول کو اپنایا جائے اور دینی شرعی حکم کو چھوڑ دیا جائے، یہ بات اس طرح سے ہے جیسے کوئی شخص یوں کہے (جیسا کہ کہا بھی گیا ہے) کہ قرآن مجید میں انبیاء علیہم السلام کی جن کرامات کا تذکرہ ہوا وہ سب عام امور ہیں مگر انہیں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ عام و عادی امور نہیں بلکہ معجزات وغیرہ ہیں.... تا کہ عوام الناس کی توجہات ان کی طرف جذب کی جائیں اور ان کے دلوں کو ان کی طرف کھینچا جائے کہ وہ شیفتۂ قرآن ہوں اور عام و عادی امور کو خارق العادت اور مافوق الطبیعۃ سمجھیں، اس طرح کے اقوال نو ظہور اسلامی مذاہب میں کثرت سے پائے جاتے ہیں اور اسلام۔ کے نام پر وجود میں آنے والے مسالک نے اس طرح کے نظریات کو خوب ہوا دی

ہے جبکہ وہ سب کے سب قرآن کی تاؤیل کے نام پر فتنہ جوئی کی مذموم غرض کے حصول کے لئے ہیں اور اس میں کسی طرح کا کوئی شک وشبہ نہیں پایا جاتا کہ اس طرح کی باتیں کرنے والوں کا مقصد لوگوں میں فتنہ پردازی اور غلط عقائد کی ترویج کے سوا کچھ نہیں، بنابرایں آیات متشابہات کو آیات الصفات اور آیات القیامۃ تک محدود اور انہی سے مختص قرار دینا بلاوجہ ہے اور اسے قرین صحت قرار نہیں دیا جاسکتا۔

قارئین کرام! مذکورہ بالا مطالب سے آگاہی کے بعد آپ کو یہ بات معلوم ہوچکی ہوگی کہ ''تاؤیل'' کی بابت حق و بجا قول یہ ہے کہ وہ ایک واقعی حقیقت ہے کہ جس پر تمام قرآنی بیانات خواہ ان کا تعلق احکام سے ہو یا اخلاقیات سے اور موعظہ ونصیحت سے ہو، قائم واستوار ہیں اور وہ تمام آیات کی اصل واساس ہے، خواہ وہ آیات محکمات ہوں یا آیات متشابہات ہوں، ان سب میں ''تاؤیل'' کو بنیادی روح کی حیثیت حاصل ہے اور وہ ''مفاہیم'' کے باب سے بھی نہیں کہ جن پر الفاظ دلالت کرتے ہیں (یعنی ان امور میں سے نہیں جو الفاظ کے ذریعے ذہنوں تک پہنچتے ہیں) بلکہ وہ ان بلند پایہ حقیقی امور سے عبارت ہیں کہ لفظوں کو ان تک رسائی حاصل ہی نہیں، الفاظ اپنی تنگ دامنی کی وجہ سے ان کے پانے سے قاصر ہیں، جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ خداوند عالم نے ان حقیقتوں کو الفاظ کے قالب میں ڈھالا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ذہنوں کو ان سے قریب تر کرنے کا یہی طریقہ ہے، گویا خدا کا کلام اور آیات کے الفاظ ان مثالوں کی طرح ہیں جو مقاصد کی تفہیم کے لئے پیش کی جاتی ہیں اور ان کے ذریعے متکلم اپنے مطلوبہ معانی کو سننے والے کے ذہن سے قریب تر کرتا ہے تاکہ وہ اپنی قوت فہم سے ان کو سمجھ سکے ..... اور متکلم، اپنی بات سامع کو باآسانی سمجھا سکے ....، جیسا کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

سورۂ زخرف، آیت ۴:

○ " وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۝ "

(کتاب مبین کی قسم! ہم نے اسے عربی زبان کی عام پڑھی جانے والے کتاب بنایا ہے تاکہ تم سمجھ سکو، درحقیقت وہ ہمارے پاس ام الکتاب نہایت بلند مرتبہ وعظیم دانائی کی حامل ہے)

یہی بات قرآن مجید میں مختلف مقامات پر صراحت واشارہ دونوں صورتوں میں بیان کی گئی ہے۔

اس کے علاوہ آپ سابقہ بیانات سے آگاہ ہوچکے ہیں کہ قرآن مجید نے لفظ ''تاؤیل'' کو جہاں جہاں استعمال کیا ہے..... اور جیسا کہ شمار کیا گیا ہے وہ ۱۶ مقامات ہیں..... تو ہر جگہ اس کا یہی معنیٰ ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے۔

۴۔ کیا خدا کے علاوہ کوئی شخص تأویل قرآن کا علم رکھتا ہے؟

یہ مسئلہ بھی مفسرین کرام کے درمیان سخت اختلافی ہے اور اس کی بابت ان کی آراء بہت مختلف ہیں، اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ انہوں نے جملہ "وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا......" کی مختلف تفسیریں کیں اور ہر شخص نے اپنے ذوق علمی کے مطابق اس کا معنی پیش کیا اور اس سلسلہ میں کسی نتیجہ تک نہ پہنچے کہ آیا اس میں حروف "واؤ" عاطفہ ہے یا مستأنفہ؟ (اگر عاطفہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جس طرح خداوند عالم تأویل القرآن کا علم رکھتا ہے اس کے ساتھ ساتھ رَاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ بھی اس کا علم رکھتے ہیں یعنی جملہ "رَاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ" کا عطف "اللّٰہ" کی طرف ہے اور وہ بھی "یعلمہ" کا فاعل ہے۔ جیسا کہ عام جملوں میں کہا جاتا ہے کہ "یہ کام میں نے کیا ہے اور زید نے" تو اس میں ایک کام کے دو فاعل لفظ "اور" کے ذریعے ذکر کئے جاتے ہیں، اور اگر مستأنفہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حرف واو کے ذریعے نئے جملہ کا آغاز ہوا ہے اور اس کا پہلے جملہ سے لفظی تعلق نہیں، م) عاطفہ قرار دینے کی صورت میں معنی یوں ہوگا کہ متشابہات کی تأویل کا علم خدا اور راسخون فی العلم کو ہے، اس رائے وقول کو بعض قدماء مفسرین، شافعی مسلک سے تعلق رکھنے والے اہل علم وفن اور اکثر شیعہ مفسرین نے اختیار کیا ہے، اور وہ کہتے ہیں کہ حرف واو، عاطفہ ہے اور راسخون فی العلم متشابہات القرآن کا علم رکھتے ہیں،

دیگر متعدد قدماء اور اہل سنت میں سے حنفی مسلک کے پیروکار مفسرین نے کہا ہے کہ حرف واو، مستأنفہ ہے اور یہاں سے نیا جملہ شروع ہوتا ہے لہٰذا اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ کے علاوہ کوئی شخص تأویل کا علم نہیں رکھتا اور وہ صرف اور صرف علم الٰہی کا خاصہ ہے۔

دونوں آراء کے حامل مفسرین نے اپنے اپنے دعویٰ ونظریہ اور تفسیری مسلک کی صحت پر دلائل قائم کئے ہیں چنانچہ مقدم الذکر قول کو اختیار کرنے والوں نے کثیر استدلالی صورتیں ذکر کیں اور بعض روایات کو بھی اپنی صحت گفتار کی تائیدی دلیل قرار دیا، اسی طرح مؤخر الذکر مفسرین نے بھی کئی دیگر دلائل کے ساتھ ساتھ ان متعدد روایات کے بارے میں استدلال کیا جن میں یہ مطلب بیان کیا گیا ہے کہ متشابہات کی تأویل کا علم خداوند عالم کے ساتھ مختص ہے۔

دونوں مسالک کے پیروکار، مفسرین عرصہ دراز تک اپنے اپنے نظریات کی صحت اور دوسروں کو باطل قرار دینے میں مصروف رہے اور سالہا سال اس کام میں گزار دیئے۔

اس مقام پر جو اہم نکتہ قابل ذکر ہے وہ یہ کہ اس موضوع کی بابت علمی تحقیق کے مراحل طے کرنے والے اہل علم و دانش پر لازم ہے کہ وہ اس مطلب کی طرف توجہ رکھیں کہ یہ مسئلہ جب سے شروع ہوا اختلافی رہا اور اس کی بابت ارباب تحقیق

کی آراء ونظریات کے مختلف ہونے کے باوجود اس کی اصل حقیقت کے بارے میں غلط فہمی ہوئی اور مربوطہ مطالب خلط ملط ہو گئے، چنانچہ یہ بات ہی واضح نہ ہوئی کہ متشابہ کو محکم کی طرف پلٹانے سے کیا مراد ہے اور اس کے ساتھ ساتھ متشابہ اور محکم کے درمیان پائے جانے والے ربط وتعلق اور مسئلہ ءتاَ ویل کے درمیان خلط ملط پیدا ہوگئی، دوسرے لفظوں میں یہ کہ آیت مبارکہ میں ''تاَ ویل'' کے حوالہ سے آیات متشابہات سے مرادی معانی کے فہم وادراک کی صورت کیا ہے؟ اس سلسلہ میں ہمارے ادعاء کی صحت کا واضح ثبوت ہمارے عنوان کردہ موضوع کے الفاظ اور اس پر اختلافی آراء کے بیان وذکر کے ساتھ ساتھ فریقین کی طرف سے پیش کردہ دلائل کے تذکرہ ہی سے ملتا ہے۔ اسی بناء پر ہم نے فریقین کے دلائل کو ذکر کرنے سے اجتناب کیا کیونکہ جب ان کے درمیان پائے جانے والے علمی نزاع کی اصل بنیاد ہی ایسی ہے کہ اس میں مطالب خلط ملط ہو چکے ہیں اور غلط فہمی واشتباہ واقع ہوا ہے تو ان کی دلیلیں جو کہ اسی بنیاد کے گرد گھومتی ہیں ان کا تذکرہ اثبات ونفی دونوں صورتوں میں غیر مفید ہوگا۔ اس کے علاوہ فریقین نے جن روایات کے ذریعے استدلال کیا ہے وہ چونکہ ظاہر القرآن سے ناہم آہنگ ہیں لہٰذا ہمیں ان سے کوئی سروکار نہیں، کیونکہ ان روایات کی دو قسمیں ہیں:

(۱) وہ روایات کہ جو اثباتی حوالہ رکھتی ہیں یعنی ان میں اس بات کا ثبوت پایا جاتا ہے کہ ''رَاسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ'' تاَ ویل سے آگاہی رکھتے ہیں، ایسی روایات اس حوالہ سے قابل اعتناء نہیں کہ ان میں ''تاَ ویل'' کو متشابہ الفاظ کے مرادی معنی کے برابر معنی سے تعبیر کیا گیا ہے جبکہ قرآن مجید میں تاَ ویل کا یہ معنی کہیں بھی ملحوظ ومقصود نہیں، جیسا کہ اہل سنت کے اسناد وحوالوں سے یہ روایت ذکر کی گئی ہے کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ نے جناب ابن عباس کے لئے دعا کی اور یہ الفاظ استعمال فرمائے: ''اللهم فقهه في الدين و علمه التأويل'' اے اللہ! اسے دین میں فقہ وفہم عطا فرما اور اسے تاَ ویل کا علم عطا کر! (ملاحظہ ہو: صحیح بخاری جلد ۱ صفحہ ۴۸)، اور حضرت ابن عباس نے بھی اس طرح ادعاء واظہار فرمایا: ''انا من الراسخين في العلم وانا اعلم تأويلهٗ'' (میں راسخون فی العلم میں سے ہوں اور میں قرآن کی تاَ ویل جانتا ہوں)۔ ملاحظہ ہو: تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲ صفحہ ۷۔ اس کے علاوہ انہوں نے فرمایا: ''ان المحكمات هي الآيات الناسخة والمتشابهات هي المنسوخة'' کہ آیات محکمات سے مراد ناسخ آیات اور آیات متشابہات سے مراد منسوخ آیات ہیں، (ملاحظہ ہو: تفسیر ''درمنثور'' جلد صفحہ ۴)۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی رائے میں آیات محکمات کا معنی ہی دراصل آیات متشابہات کی تاَ ویل کہلاتا ہے، جبکہ اس سلسلہ میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ تاَ ویل کا یہ معنی، آیہ مبارکہ سے ثابت نہیں ہوتا اور قرآن مجید میں تاَ ویل کا یہ معنی مقصود نہیں۔

(۲) وہ روایات کہ جن میں نفی کا پہلو پایا جاتا ہے یعنی وہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ خداوند عالم کے علاوہ کوئی شخص متشابہات کی تاَ ویل کا علم نہیں رکھتا جیسا کہ حضرت ابن عباس سے روایت کی گئی ہے کہ وہ اس آیہ مبارکہ کی تلاوت اس

طرح کرتے تھے: "وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللّٰهُ وَالرّٰسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ اٰمَنَّا بِهٖ" (اوراس کی تاویل خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا اور راسخون فی العلم کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے ہیں)، ابی ابن کعب بھی اسی طرح پڑھتے تھے، اور حضرت ابن شعود کے بارے میں روایت کی گئی ہے کہ وہ اس طرح قرأت کرتے تھے: "وان تأويله الا عند الله وَالرّٰسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ اٰمَنَّا بِهٖ" (اوراس کی تاویل خدا کے علاوہ کسی کے پاس نہیں، اور راسخون فی العلم کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں)، لیکن ان دو روایات سے کوئی مطلب ثابت نہیں ہوتا کیونکہ: پہلی بات تو یہ ہے کہ ان قرأتوں کو دلیل قرار نہیں دیا جا سکتا اور دوسری بات یہ کہ ان سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ صرف یہ کہ آیت، راسخون فی العلم کا تاویل سے آگاہ ہونا ثابت نہیں کرتی، جبکہ آیت کا ان کے علم کو ثابت نہ کرنا اور ان کے عدم علم کی دلیل ہونا دو الگ الگ مسئلے ہیں اور مؤخر الذکر مفسرین کا دعویٰ یہ ہے کہ آیت مبارکہ ان کے عدم علم پر دلالت کرتی ہے، حالانکہ ایسا نہیں بلکہ ممکن ہے کہ کسی دوسری دلیل سے ان کے عدم علم کا ثبوت ملے۔

اسی کی مانند ایک روایت تفسیر درمنثور میں طبرانی کے حوالہ سے مذکور ہے کہ ابو مالک اشعری نے کہا کہ انہوں نے حضرت رسول خداؐ سے سنا ہے، آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا:

" انی لا اخاف علٰی امّتی الا ثلاث خصال : ان یکثرلهم المال فیتحا سدوا فیقتلوا، وان یفتح لهم الکتاب فیأ خذه المؤمن یبتغی تأویلهٗ وما یعلم تأویلهٗ الا اللّٰه والراسخون فی العلم یقولون اٰمنا بهٖ کل من عند ربنا وما یذکر الا اولوا الالباب، وان یکثر علمهم فیضیعوه ولا یبالون بهٖ "

مجھے اپنی امت سے صرف ان تین چیزوں کے بارے میں خوف لاحق ہے:

(۱) ان کا مال اور دولت زیادہ ہو جائے اور وہ اس کی بابت ایک دوسرے سے حسد کرنے لگیں اور ایک دوسرے کی جانوں کے دشمن بن جائیں۔

(۲) قرآن ان کے سامنے کھلے تو اس پر ایمان لانے والا ہی اس سے تاویل جوئی کرنے لگے، جبکہ اس کی تاویل کوئی نہیں جانتا سوائے اللہ اور راسخون فی العلم کے، کہ جو کہتے ہیں ہم قرآن پر ایمان لائے ہیں سب کچھ ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے اور صاحبان عقل کے سوا کوئی نصیحت نہیں پا سکتا" وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللّٰهُ وَالرّٰسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُوا الْأَلْبَابِ"

(۳) ان کا علم زیادہ ہو مگر وہ اس کو ضائع کر دیں اور اس کی پرواہ ہی نہ کریں۔

(ملاحظہ ہو: "درمنثور" جلد ۲ ص ۵)

اس حدیث سے اگر یہ بات ثابت بھی ہو جائے کہ خدا کے علاوہ کوئی تأویل القران کا علم نہیں رکھتا لیکن اس سے قرآن پر ایمان لانے والے ہر شخص کے علم کی نفی ہوتی ہے نہ کہ صرف راسخون فی العلم حضرات کے علم کی، لہٰذا یہ حدیث ان حضرات کا ہدف پورا نہیں کرسکتی جنہوں نے اس کے ذریعے استدلال کیا اور اسے اپنے دعویٰ کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے،

اسی طرح وہ روایات کہ جو آیات محکمات کی پیروی اور آیات متشابہات پر ایمان لانے کے واجب وضروری ہونے پر دلالت کرتی ہیں، تو ان سے بھی غیر خدا کے علم کی نفی کا ثبوت یقیناً نہیں ملتا۔

اسی کے مانند ایک روایت تفسیر الآلوسی میں ابن جریر کے حوالہ سے ابن عباس سے منقول ہے (یہ حدیث مرفوع ہے یعنی اس کے سلسلۂ سند میں آخری حوالہ مذکور نہیں) کہ انہوں نے کہا:

"انزل القرآن علیٰ اربعة احرف: حلال و حرام لا یعذر احد بجهالته، و تفسیر تفسره العلماء، و متشابه لا یعلمه الا الله، و من ادعیٰ علمهٗ سوی الله تعالیٰ فهو کاذب"

(تفسیر آلوسی، جلد ۳ صفحہ ۸۵)

قرآن مجید کو چار حروف پر مشتمل نازل کیا گیا ہے:

(۱) حلال (وہ آیات کہ جن میں حلال چیزوں کا ذکر ہے)

(۲) حرام (وہ آیات کہ جن میں حرام اشیاء وامور مذکور ہیں)

(۳) علوم ومعارف (وہ آیات کہ جن میں حقائق الامور وحقائق الاشیاء مذکور ہیں اور علماء ان کی تفسیر کرتے ہیں)

(۴) متشابہ کہ جس کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں اور جو شخص اس کا عالم ہونے کا دعویٰ کرے وہ جھوٹا ہے۔

یہ روایت جہاں مرفوع ہے (یعنی اس کے سلسلہ سند کی آخری کڑی مذکور نہیں) وہاں ان روایات سے تعارض و تصادم رکھتی ہے جن میں ابن عباس نے یہ بات ذکر کی کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ان کے لئے دعا کی اور ابن عباس نے خود عالم بالتأویل ہونے کا دعویٰ کیا، اس کے علاوہ یہ کہ اس میں ظاہر القرآن سے عدم مطابقت بلکہ مخالفت پائی جاتی ہے کیونکہ ظاہر القرآن سے ثابت ہوتا ہے کہ تأویل سے مراد وہ معنیٰ نہیں جو متشابہ کا ہے، چنانچہ اس سلسلہ میں آپ سابقہ مطالب سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ تأویل اور متشابہ دو مختلف معانی رکھتے ہیں۔

بہر حال اس مقام پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ غیر خدا کا عالم بالتأویل ہونا ممکن ہے البتہ زیر بحث آیہ مبارکہ اس پر دلالت نہیں کرتی کیونکہ اس سلسلہ میں جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اس آیت کے صدر و ذیل اور بعد والی آیات کے تناظر میں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس میں دو چیزیں بیان کی گئی ہیں، ایک یہ کہ آیات دو قسموں پر مشتمل ہیں، محکم اور متشابہ، اور دوسری یہ کہ ان کے فہم المعنی کی بابت لوگ دو طرح کے ہیں، ایک وہ کہ جن کے دلوں میں بیماری

وکجی ہے اور وہ متشابہات کی پیروی کرتے ہیں، دوسرے وہ لوگ کہ جو متشابہات کی پیروی نہیں کرتے بلکہ صرف ان پر ایمان لاتے ہیں اور محکمات کی پیروی کرتے ہیں، بنابرایں "رَاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ" کا تذکرہ ان کے قرآن فہمی کی بابت اختیار کئے جانے والے طرز عمل کے حوالہ سے ان کی مدح وستائش کے طور پر ہوا ہے جبکہ اس کے مقابل میں ان لوگوں کا تذکرہ ہے کہ جن کے دلوں میں کجی و بیماری ہے اور وہ فہم الآیات کی بابت جو طرزِ فکر اختیار کرتے ہیں وہ مذموم ہے، گویا راسخون فی العلم کی مدح اور بیمار دل افراد کی مذمت کے طور پر ان کا تذکرہ ہوا ہے، اس سے زیادہ کوئی بات زیر نظر آیہ مبارکہ سے نہ تو ثابت ہوتی ہے اور نہ ہی اس کا مقصد و مقصود ہے، اور کسی دلیل سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ راسخون فی العلم، تأویل الآیات کا علم ہونے میں خدا کے شریک ہیں سوائے ان مطالب کے کہ جو اس سلسلہ میں پہلے ذکر کئے جا چکے ہیں لیکن وہ ناتمام اور زیر نظر موضوع کے اثبات میں ناکافی و قاصر ہیں اور ان سے ہرگز یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ راسخون فی العلم بھی اللہ تعالیٰ کی طرح آیات کی تأویل کا علم رکھتے ہیں، لہٰذا آیہ شریفہ میں جملہ "وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ" صرف اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ خدا کے سوا کوئی شخص تأویل کا علم نہیں رکھتا، اس بات کو نہ تو "وَالرّٰسِخُوْنَ" کی واو کو عاطفہ قرار دینے اور نہ ہی استثناء کے حوالہ سے نقض کیا جا سکتا ہے، بلکہ اس آیت سے واضح طور پر اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ تأویل کا علم خدا کے ساتھ مختص ہے اس کے علاوہ کوئی اس کا حامل نہیں، البتہ اگر کسی دوسری مستقل دلیل سے یہ بات ثابت ہو جائے کہ غیر خدا، باذن خدا، تأویل کا عالم ہو سکتا ہے تو اس میں علم بالتأویل کے خدا کے ساتھ مختص ہونے کی نفی نہیں ہوتی جیسا کہ علم بالتأویل کی مانند علم بالغیب کا مسئلہ ہے کہ وہ خدا کے ساتھ مختص ہے اس کے علاوہ کوئی غیب کا عالم نہیں اور اس کے باوجود قرآنی آیات سے غیر اللہ کا باذنِ خدا، عالم الغیب ہونا ثابت ہوتا ہے، آیات مبارکہ ملاحظہ ہوں :

سورہ نمل، آیت ۶۵:

○ "قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ"

(کہہ دیجئے کہ آسمانوں اور زمین میں بسنے والا کوئی شخص غیب کا علم نہیں رکھتا سوائے کے اللہ کے۔)

سورہ یونس، آیت ۲۰:

○ "اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ"

(غیب صرف اللہ کے لئے ہے..... اس سے مختص ہے....)

سورہ انعام، آیت ۵۹:

○ "وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ"

(اور اس کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں کہ جن کا علم صرف خداوندِ عالم کو حاصل ہے اس کے علاوہ کوئی اس کا حامل

نہیں)

علمی اصطلاح میں اسے "حصر" کہا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ موضوع اور مورد کے درمیان اختصاصی تعلق ہے) اس کے باوجود علم غیب کی بابت خداوندِ عالم نے یوں ارشاد فرمایا:

سورہ جن، آیت ۲۷:

O "عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ﴿٢٦﴾ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ"

(خدا، عالم الغیب ہے، وہ اپنے غیب کا کسی کے سامنے اظہار نہیں کرتا سوائے اس رسول کے کہ جسے پسند کرے)

اس آیت میں خداوند عالم نے اپنے علاوہ بعض افراد کے لئے علم بہ غیب کا اثبات کیا ہے اور وہ افراد اس کے پسندیدہ رسول ہیں۔

بہر حال قرآن مجید میں علم غیب کی مانند بعض دیگر امور میں بھی اس طرح کی مثالیں موجود ہیں کہ وہ خدا کے ساتھ مخصوص ہونے کے باوجود خدا کی طرف سے اس کی برگزیدہ ہستیاں بھی ان کے حامل ہونے کا اعزاز رکھتی ہیں،

جہاں تک زیر نظر موضوع کی پہلی شق کا تعلق ہے یعنی یہ کہ قرآن مجید میں غیر خدا کے عالم تاویل ہونے کا ثبوت موجود ہے اور آیات مبارکہ اس پر دلالت کرتی ہیں کہ خداوند عالم کے علاوہ دیگر افراد بھی تاویل کا علم رکھتے ہیں، تو اس کی وضاحت یہ ہے کہ: جیسا کہ آپ آگاہ ہو چکے ہیں کہ تاویل سے مربوط آیات مبارکہ سے ثابت ہوتا ہے کہ تاویل، آیت کے ظاہری معانی سے باہر کی ایک حقیقت کا نام ہے کہ جسے آیت کے مدلول (وہ معنی کہ جس پر آیت دلالت کرتی ہے) سے وہی نسبت ہے جو ممثل کو مثال سے ہوتی ہے...... یا ترجمان کو اس حقیقت سے ہوتی ہے جس کا وہ ترجمان ہوتا ہے۔

بنابرایں وہ ممثل یا ترجمان اگرچہ آیت کا مدلول نہیں ہوتا یعنی آیت کے الفاظ اس کے وجود پر دلالت نہیں کرتے لیکن ایک خاص انداز میں اس کی ترجمانی کرتے ہیں اور وہ مخصوص کیفیت کے ساتھ الفاظ میں محفوظ ہوتا ہے، اس کی مثال عربوں کے ہاں استعمال کئے جانے والے اس جملہ سے دی جاسکتی ہے کہ جس میں وہ کہتے ہیں: "فِي الصَّيْفِ ضَيَّعْتِ اللَّبَنَ" (تونے گرمیوں میں دودھ ضائع کر دیا)، یہ ضرب المثل اس شخص کے لئے ہوتی ہے جو کسی کام کا ارادہ رکھتا ہو یا کسی مقصد تک پہنچنا چاہتا ہو مگر اس کے اسباب کو اس تک پہنچنے سے پہلے ہی کھو دے، اس مثال کے الفاظ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ کسی عورت نے گرمیوں کے موسم میں ایسا کام کیا جس سے دودھ ضائع ہو گیا، یہ مثال اگرچہ ہمارے زیر نظر موضوع سے مطابقت نہیں رکھتی لیکن اس سے مخاطب کے ذہن میں اس مثال کی مربوط و متعلقہ صورتیں مجسم ہو جاتی ہیں جس کے نتیجہ میں کلام کے ظاہری الفاظ کے ذریعے اس کے مقصود کے ادراک کی راہ ہموار ہو سکتی ہے، یہی صورتحال تاویل کی ہے کہ جو اصل حقیقت کسی حکم کی تشریع و قانونی حیثیت میں آنے کا موجب بنی یا معارف الٰہیہ میں سے کسی مطلب کے بیان کا سبب ہوئی یا قرآن مجید

میں مذکور کسی واقعہ و داستان کے وقوع پذیر ہونے کا باعث ہوئی، اگر چہ الفاظ اس پر دلالت نہیں کرتے مگر ان کا ان امور کی اصل حقیقت ہونا اور اس کا ان امور کے وجود میں آنے یا وقوع پذیر ہونے کا موجب وسبب ہونا ہی اس سلسلہ میں کافی ہے کہ ان امور میں ہر ایک کو اس کا ترجمان وعکاس قرار دیا جائے اور کہا جائے کہ فلاں چیز آیت کی تاویل ہے، اس کی مثال یوں ہے کہ کوئی شخص اپنے نوکر سے کہے کہ ''مجھے پانی پلاؤ'' تو اس کا یہ کہنا درحقیقت اس کی طبع انسانی کے تقاضائے کمال پر مبنی ہے کیونکہ عالم الخارج میں پائی جانے والی وہی حقیقت ہے کہ جو وجود ہستی کی حفاظت و بقا چاہتی ہے اور وہ یعنی حفظ و بقائے ہستی بدن میں پیدا ہونے والی کمی کو دور کرنے کی خواہاں ہوتی ہے اور وہ یعنی کمی کو دور کرنے کی خواہش ضروری غذا چاہتی ہے تا کہ سیر ہو سکے اور سیر ہونے کی طلب پانی مانگنے کی راہ پر لاتی ہے، تو یہ تمام مطالب ''مجھے پانی پلاؤ'' کے جملہ میں پوشیدہ ہیں لہٰذا ''اسقنی'' (مجھے پانی پلاؤ) کی تاویل وہی طبع انسانی کا اپنے وجود ہستی اور اس کی بقا کا تقاضائے کمال ہے۔ کہ جس کی تکمیل پانی پی کر سیراب ہونے کی صورت میں ممکن ہوتی ہے...... اور اگر یہ وجودی اور عالم الخارج میں پائی جانے والے حقیقت کسی دوسری حقیقت میں تبدیل ہو جائے (یعنی وجود ہستی کی بقا پانی کی بجائے کسی دوسری چیز کے ذریعے ممکن ہو) تو جملہ بھی بدل جائے گا اور ''پانی پلاؤ'' کی بجائے کسی دوسری شے کی طلب مثلاً کھانا لاؤ میں تبدیل ہو جائے گا۔ یہی حال ان افعال کا ہے جو معاشرہ میں پسندیدہ و ناپسندیدہ ہوتے ہیں کہ پسندیدہ امور کے کرنے اور ناپسندیدہ امور کے نہ کرنے کی طرف رغبت ہوتی ہے اور ہر معاشرہ دوسرے معاشروں سے مختلف اور گہرے فرق کے باوجود اپنے آداب زندگی و رسم و عادات کے مطابق پسندیدہ و ناپسندیدہ امور و اعمال کی تشخیص و تمیز کرتا ہے اور اس تشخیص کا اصل معیار ان کے ہاں اچھائی و برائی کے مروجہ اصولوں، گوناگوں زمانی و مکانی علل و اسباب اور عوامل کے ساتھ ساتھ بزرگان قوم و ملت کے ہاں رائج طریقوں اور ان کے اپنائے ہوئے سلیقوں اور علاقائی رسم و رواج اور بار بار کے عملی مشاہدات پر استوار ہوتا ہے اور یہی وہ امر ہے جو مختلف اجزاء سے ترکیب یافتہ حقیقت ہے جو کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا اصل سبب ہے کہ جسے اصل عمل نہیں قرار دیا جا سکتا بلکہ وہ اصل فعل یا ترک فعل سے مختلف ہوتا ہے لیکن فعل یا ترک فعل کے ذریعے اس کا سراغ ملتا ہے کیونکہ فعل یا ترک فعل کے ضمن میں اور ان کے حوالہ سے اس کا تحفظ ہوتا ہے اسی وجہ سے اسے تاویل سے موسوم کیا جاتا ہے، لہٰذا گوناگوں اجزاء سے مرکب اس حقیقت کا نام ''تاویل'' ہے کہ جس پر فعل یا ترک فعل کی اساس قائم ہوتی ہے، اس سے یہ نتیجہ ظاہر ہوتا ہے کہ معاشرتی رسوم و آداب کے مختلف ہو جانے سے فعل یا ترک فعل کی کیفیات میں بھی تبدیلی پیدا ہونا ناگزیر ہے، اور ہر وہ چیز خواہ اس کا تعلق احکام سے ہو یا کسی داستان و واقعہ سے ہو وہ تاویل کی تبدیلی کی وجہ سے تبدیل ہو جائے گی، اسی حوالہ سے آپ دیکھتے ہیں کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: '' فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ ۚ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ '' (وہ لوگ کہ جن کے دلوں میں کجی ہے وہ متشابہات کی پیروی کرتے ہیں وہ فتنہ

پیروی کے درپے ہیں اور متشابہات کی تأویل جوئی کرتے ہیں جبکہ ان کی تأویل خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا)۔

اس آیت میں پہلے بیمار دل افراد کا تذکرہ ہوا کہ وہ فتنہ انگیزی کی غرض سے آیات متشابہات کی پیروی کرتے ہوئے ان سے وہ معانی مراد لیتے ہیں جو ان کے حقیقی معانی نہیں، اور اس کے بعد ارشاد ہوا کہ وہ ان آیات سے ایسی تأویلیں ڈھونڈتے ہیں جو حقیقت میں ان کی تأویلیں نہیں اور وہ جس تأویل کا سہارا لے کر آیات متشابہات کی پیروی کرتے ہیں اگر وہ حقیقی تأویل ہوتی تو ان کا متشابہات کی پیروی کرنا بجا و برحق ہوتا اور اس پر ان کی مذمت نہ ہوتی اور متشابہ کا وہ معنی کہ جو محکم کے ذریعے ثابت ہوتا ہے وہ اس معنی میں تبدیل ہو جاتا جو متشابہ کا مرادی معنی نہیں لیکن ان لوگوں نے اسے مرادی معنی سمجھ کر اس کی پیروی کی۔

مذکورہ بالا مطالب سے یہ بات واضح ہوگئی کہ تأویل القرآن ان حقائق خارجیہ سے عبارت ہے جو آیات قرآنیہ کی اصل واساس ہے یعنی قرآنی آیات خواہ ان کا تعلق علوم و معارف سے ہو یا احکام و دستورات یا دیگر امور سے ہو ان سب کی بنیاد انہی حقائق پر قائم ہے کہ اگر بالفرض ان حقائق میں سے کسی ایک میں کوئی تبدیلی پیدا ہو تو متعلقہ آیات کے مضامین بھی بدل جائیں گے (گویا ان حقائق اور آیات کے درمیان ایک طرح سے روح و بدن کا رشتہ قائم ہے کہ جس طرح بدن کی اصل و اساس روح ہے اسی طرح آیات کی اصل واساس کہ جس پر ان کی وجودی شناخت قائم ہے وہ انہی حقائق سے عبارت ہے لہٰذا ان میں ذرا سی تبدیلی کا اثر آیات پر پڑ سکتا ہے،م)

اگر آپ گہری نظر سے ان مطالب پر غور کریں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ تأویل کی بحث میں جو آیہ مبارکہ ہمارے پیش نگاہ ہے وہ سورۂ زخرف کی آیت ۴ سے کامل مطابقت رکھتی ہے کہ جس میں خداوند عالم نے اس طرح ارشاد فرمایا ہے:

○ " وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۝ "

(اور اس واضح و روشن کتاب کی قسم! ہم نے اسے عربی زبان والا قرآن قرار دیا ہے تاکہ تم سمجھ سکو، اور وہ اصل کتاب میں ہمارے پاس موجود ہے کہ جو بلند مرتبہ کا حامل اور حکمت سے بھرا ہوا ہے)

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ قرآن کہ جو نازل ہوا ہے وہ خداوند عالم کے ہاں ایک نہایت بلند رتبہ والا اور دانائیوں کا خزانہ تھا کہ جس کا سمجھنا ہماری عقلوں کے بس کا روگ نہ تھا اور اسے حصہ حصہ و جزء جزء کر کے اس سے فیض یاب ہونا ہماری طاقت وقدرت سے باہر تھا لیکن خداوند عالم نے اپنے بندوں پر نظر کرم کرتے ہوئے اسے پڑھی جانے والی کتاب بنا دیا اور اسے عربی زبان میں ملبوس کر دیا تاکہ لوگ اسے سمجھ سکیں اور آسانی سے اس کے معانی کا ادراک کر سکیں، کیونکہ جب تک وہ

ام الکتاب میں ہوتا وہ اس کے فہم وادراک سے عاجز ہوتے اور ان کے پاس اس خزانہ علم وحکمت تک رسائی کا کوئی ذریعہ ہی نہ ہوتا، اور "ام الکتاب" کہ جو خداوند عالم کے ہاں بلند رتبہ اور حکمت ودانائی کی حامل ہے اس کا ذکر قرآن مجید میں یوں ہوا:

سورہ رعد، آیت ۳۹:

O " يَمۡحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثۡبِتُ ۚ وَعِنۡدَهٗۤ اُمُّ الۡكِتٰبِ ﴿۳۹﴾"

(خدا جو چاہتا ہے محو کر دیتا ہے اور جو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے، اس کے پاس ام الکتاب ہے)

سورہ بروج، آیت ۲۲:

O " بَلۡ هُوَ قُرۡاٰنٌ مَّجِيۡدٌ ﴿۲۱﴾ فِىۡ لَوۡحٍ مَّحۡفُوۡظٍ ﴿۲۲﴾"

(بلکہ وہ قرآن مجید ہے جو لوح محفوظ میں ہے......)

اسی طرح سورۂ ہود کی آیت ا بھی اجمالی طور پر پیش نظر آیہ مبارکہ کے مضمون پر دلالت کرتی ہے جس میں ارشاد الٰہی ہے:

O " كِتٰبٌ اُحۡكِمَتۡ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتۡ مِنۡ لَّدُنۡ حَكِيۡمٍ خَبِيۡرٍ"

(یہ کتاب ہے کہ جس کی آیات محکم ومضبوط کی گئی ہیں پھر انہیں دانا وآشنائے کل کی طرف سے تفصیل سے بیان کیا گیا ہے)

اس آیت میں آیات کے بارے میں دو چیزیں بیان کی گئی ہیں:

(۱) ان کا محکم ہونا

(۲) ان کا مفصل ہونا

محکم ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ خداوند عالم کے پاس اس حقیقت میں تھیں کہ ان میں کوئی حصہ وجزء اور تقسیم بندی نہ تھی بلکہ وہ یکجا تھیں، اور مفصل ہونے سے مراد یہ ہے کہ خداوند عالم نے انہیں جزء جزء اور حصہ حصہ میں تقسیم کر کے نازل کیا؟ "احکام" (ہمزہ کے نیچے زیر کے ساتھ) کا معنی یکجا کرنا اور "تفصیل" کا معنی فصل فصل یعنی جزء جزء، حصہ حصہ اور آیت آیت کرنا ہے لہٰذا آیت کا معنی یہ ہوگا کہ قرآن مجید خداوند عالم کے ہاں یکجا صورت میں تھا پھر خداوند عالم نے اسے حصہ حصہ اور آیت آیت کر کے حضرت پیغمبر اسلامؐ پر نازل فرمایا،

قرآن مجید کے جزء جزء اور حصہ حصہ کر کے نازل کئے جانے پر ایک اور آیت بھی موجود ہے جس سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ ان دونوں صفتوں یعنی محکم ہونے اور مفصل ہونے کے درمیان بنیادی تعلق پایا جاتا ہے چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

سورہ ءاسراء، آیت ۱۰۶:

O " وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّ نَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ۝۱۰۶ "

(اور قرآن کو ہم نے حصہ حصہ کر دیا تا کہ آپ اسے لوگوں کے سامنے آرام سے قرأت کریں اور ہم نے اسے تدریجی طور پر نازل کیا ہے)

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید آیتوں میں بٹا ہوا نہ تھا بلکہ یکجا تھا پھر اسے آیت آیت کر کے حضرت پیغمبر اسلامؐ پر تدریجاً نازل کیا گیا اور جزء جزء کر کے آپؐ پر وحی کی گئی تا کہ آنحضرتؐ آرام آرام سے تدریجی طور پر لوگوں کے سامنے پڑھیں، البتہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ قرآن مجید خداوندِ عالم کے پاس اسی طرح کتاب کی صورت میں تھا کہ جو اب ہمارے پاس آیات کا مجموعہ وسورتوں کی مخصوص ترتیب کا حامل مجلد صورت میں ہے اور اسے حصہ حصہ و جزء جزء کر کے تدریجی طور پر حضرت پیغمبر اسلامؐ پر نازل کیا گیا ہو تا کہ آپؐ ٹھہر ٹھہر کر لوگوں کے سامنے اسے پڑھیں جیسا کہ کوئی استاد ہر روز کتاب کا کچھ حصہ متعلمین کی استعداد و ذہنی قوت وصلاحیت کے مطابق ان کے سامنے پڑھتا ہے۔ ایسا ہرگز نہیں کیونکہ ان دونوں باتوں میں بہت فرق ہے یعنی کسی استاد کا اپنے شاگردوں کو ان کی ذہنی صلاحیت کے مطابق کتاب کے حصہ حصہ کی تدریس اور آنحضرتؐ پر قرآن کے تدریجی طور پر نزول کے درمیان فرق پایا جاتا ہے اور وہ یہ کہ آنحضرتؐ پر قرآن کے تدریجی طور پر نازل ہونے کا سبب تنزیل کے اسباب کا عمل دخل ہے یعنی اسباب نزول کے مختلف ہونے اور زمانی ومکانی حوالوں سے فرق پائے جانے کی وجہ سے آیات کے نزول کو کسی استاد کی تدریس سے مشابہت نہیں دیا جاسکتی، کیونکہ ہر آیت کا نزول اس سے مربوط امر پر موقوف ہے جبکہ کسی استاد کا اپنے شاگردوں کو ان کی ذہنی وفکری توانائی وصلاحیت کے مطابق کتاب کے بعض حصوں کی تدریس کا مسئلہ ایسا نہیں لہٰذا ان میں سے کسی ایک کو دوسرے پر قیاس نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی ان کے درمیان مشابہت ومماثلت کا کوئی پہلو پایا جاتا ہے، اس کے علاوہ ایک واضح فرق یہ بھی ہے کہ کتاب کے مختلف حصے کہ جن کی تدریس مختلف اوقات میں معلم اپنے شاگردوں کو کرتا ہے ان کی بابت یہ امکان پایا جاتا ہے کہ ان کو ایک ہی وقت میں اکٹھا کر دیا جائے اور وہ سب ایک ہی دورانیہ میں پڑھا دیئے جائیں جبکہ یہ بات قرآنی آیات کی بابت ممکن نہیں مثلاً آیہ مبارکہ: " فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ " (سورہ ءمائدہ، آیت ۱۳) ...ان سے درگزر کرو اور روگردانی کرلو...، اور آیہ مبارکہ: " قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ " (سورہ ءتوبہ، آیت ۱۲۳)... جنگ کرو ان کافروں سے جو تمہارے نزدیک ہیں...، پہلی آیت میں عفو ودرگزر کرنے اور دوسری آیت میں جنگ وقتال کا حکم دیا گیا ہے (تو یہ بات ممکن نہیں کہ دونوں آیتیں ایک ہی زمان میں آنحضرتؐ پر نازل ہوں اور آپؐ ایک ہی وقت میں لوگوں کے سامنے پڑھیں کیونکہ دونوں میں متضاد فرامین صادر کیئے گئے ہیں۔م) اسی طرح آیہ مبارکہ: " قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا " (سورہ ءمجادلہ،

آیت ۱)...... خدا نے اس عورت کی بات سنی ہے جو تم سے اپنے شوہر کے بارے میں جھگڑا کر رہی تھی......، اور آیہ مبارکہ: " خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً " (سورہ توبہ، آیت ۱۰۳)...... ان کے اموال میں سے صدقہ (زکوٰۃ) لو......، تو ان آیتوں میں سے ہر ایک کا موضوع مختلف ہے لہٰذا ان دونوں اور ان جیسی دیگر آیات کا ایک ہی مرتبہ نازل ہونا ممکن نہیں ورنہ اسباب نزول اور زمانہ نزول کے حوالے بے اثر ہو جائیں گے اور یہ کہا جائے گا کہ قرآن مجید ایک بار آغاز بعثت میں نازل ہوا یا آنحضرتؐ کی حیات طیبہ کے آخری ایام میں نازل ہوا اور لفظ قرآن کہ جو آیہ مبارکہ: " وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ " (سورہ اسریٰ، آیت ۱۰۶) میں ذکر ہوا ہے اس سے مراد وہ قرآن نہ ہو جو ہمارے پاس موجود ہے جو تالیف شدہ آیات کے معنی میں آتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ مذکورہ بالا آیات مبارکہ سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ ہم جس قرآن کی تلاوت کرتے ہیں اور اس کے معانی و مطالب کا ادراک کرتے ہیں اس سے ماوراء ایک ایسا امر حقیقت ہے کہ جس کی نسبت قرآن سے وہی ہے جو روح کی جسم سے ہوتی ہے اور متمثل (جس کی مثال دی گئی ہو) کی مثال سے ہوتی ہے اور اسے ہی خداوند عالم نے " الکتاب الحکیم " سے موسوم کیا ہے، اسی پر قرآنی معارف و مطالب اور مضامین کا دارومدار ہے، وہ الفاظ کی سنخ سے نہیں کہ جنہیں حصہ حصہ اور جملہ جملہ کر کے پیش کیا جاتا ہے اور نہ ہی ان معانی کے باب سے ہے کہ جن پر الفاظ دلالت کرتے ہیں، اور وہ بعینہ اسی تاویل سے عبارت ہے کہ جس کا ذکر مربوطہ آیات مبارکہ میں کیا گیا ہے، کیونکہ ان آیات میں تاویل کی جو اوصاف و صفات بیان کی گئی ہیں وہ سب مذکورہ امر حقیقت سے پوری مطابقت و انطباق رکھتی ہیں، اس بیان سے تاویل کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے اور یہ وجہ بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ جس کی بنیاد پر کہا گیا ہے کہ معمولی افہام اور ناپاک نفوس اسے چھو ہی نہیں سکتے، چنانچہ خداوند عالم نے اس سلسلہ میں ارشاد فرمایا ہے:

سورہ واقعہ، آیت ۷۹:

○ " اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۙ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۙ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۗ "

(یقیناً وہ عزت والا قرآن ہے کہ جو پوشیدہ کتاب میں ہے کہ جسے پاک لوگوں کے سوا کوئی چھو نہیں سکتا)

اس آیہ مبارکہ میں " **مطھرون** " اور " كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ " کے الفاظ سے بلاشبہ یہ بات واضح ہوتی ہے کہ خدا کے مطہر بندے ہی ہیں جو اس قرآن کریم کو چھو سکتے ہیں جو کتاب مکنون میں ہے (ان کی دسترس و رسائی اس قرآن تک ہے جو کتاب مکنون میں ہے) کہ جو تغیر و تبدیلی سے محفوظ ہے، اور تغیر و تبدیلی کی ایک صورت یہ ہے کہ عام اذہان کو اس میں تصرف حاصل ہو کہ وہ جس طرح چاہیں اس کے معانی و مفاہیم کا تعین کر سکیں اور " لَّا يَمَسُّهٗٓ " میں لفظ " مس " (چھونا) سے مراد اسی فہم و علم کے سوا کچھ نہیں، اور یہ بات بھی معلوم و واضح ہے کہ اس آیت مبارکہ میں " كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ " سے مراد وہ " اُمُّ الْكِتٰبِ " ہے جس کا ذکر آیہ مبارکہ " يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَاۗءُ وَيُثْبِتُ ښ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ " (سورہ رعد، آیت ۳۹)

اورآیہء مبارکہ " وَ اِنَّهٗ فِیْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَیْنَا لَعَلِیٌّ حَكِیْمٌ " (سورہء زخرف، آیت ۴) میں ہوا ہے اور" مطہرین " وہ افراد و شخصیات ہیں کہ طہارت و پاکیزگی ان کے دلوں میں اتر چکی ہے اور اس کا ان کے دلوں میں اتارنا خدا کے سوا کسی کا کام نہیں کیونکہ خداوند عالم نے جہاں بھی ان کا تذکرہ کیا ہے ان کے پاک و مطہر ہونے کے حوالہ سے اس عمل کی نسبت اپنی طرف دی ہے جیسا کہ ارشاد ہوا:

سورہء احزاب، آیت ۳۳:

O " اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَ یُطَهِّرَكُمْ تَطْهِیْرًا "

(خدا تو صرف یہ چاہتا ہے کہ گندگی کو تم سے دور رکھے اے اہل بیت! اور تمہیں پاک رکھے جس طرح پاک رکھنے کا حق ہے)

سورہء مائدہ، آیت ۶:

O " وَّلٰكِنْ یُّرِیْدُ لِیُطَهِّرَكُمْ "

(لیکن وہ تمہیں پاک رکھنا چاہتا ہے)

اور قرآن مجید میں جہاں بھی معنوی و روحانی طہارت و پاکیزگی کا تذکرہ ہوا ہے وہاں اس کی نسبت خداوندِ عالم یا اس کے اذن کی طرف دی گئی ہے، اور اس طہارت و پاکیزگی سے مراد دل سے ہر طرح کی پلیدی کے زائل ہونے کے سوا کچھ نہیں اور دل سے مراد اس قوت کے سوا کچھ نہیں کہ جو سرچشمہ ادراک و ارادہ ہے، بنابراین دل کی طہارت سے مراد نفس انسانی کی وہ پاکیزگی ہے جو اس کے اعتقاد و ارادہ میں پائی جاتی ہے کہ اس میں ان دونوں حوالوں سے گندگی دور ہوتی ہے اور اس قلبی پاکیزگی کی بازگشت اس بات کی طرف ہوتی ہے کہ انسان کا دل حق و حقیقت پر اعتقاد کی بابت ثبات و پختگی کا حامل ہوتا ہے کہ نہ تو اس میں کسی طرح سے شک کی گنجائش پیدا ہوتی ہے اور نہ ہی حق و باطل کے درمیان تزلزل کی صورت در اہیں نکلتی ہیں، اس کے ساتھ ساتھ اس قلبی پختگی کا نتیجہ علم و ادراک کے تقاضوں یعنی عملی اقدامات کی صورت میں بھی ظاہر ہوتا ہے اور انسان حق سے آگاہی حاصل کرنے کے بعد عملی مراحل میں نہ تو اپنی نفسانی خواہشوں کی پیروی کرتا ہے اور نہ ہی علمی عہد شکنی کا مرتکب ہوتا ہے، یہی بات یعنی علمی عہد و پیمان پر پورا اترنا اور اس کے عملی تقاضوں کی تکمیل ہی دراصل "رسوخ فی العلم" کہلاتا ہے کہ خداوند عالم نے ان (رَاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ) کی توصیف میں یہی بات کی ہے کہ وہ ہدایت یافتہ ہیں، اپنے علم پر ثابت و قائم ہیں اور ان کے دل فتنہ انگیزی کی غرض سے حق سے منحرف نہیں ہوتے، تو اس سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی ہے کہ "مطھرین" ہی " رَاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ " ہیں۔

لیکن مذکورہ بالا بیان سے جو نتیجہ حاصل ہوتا ہے اس سے کوئی غلط فہمی پیدا نہیں ہونی چاہیے کیونکہ اس سے صرف اس

قدر ثابت ہوتا ہے کہ " مطہرین " پاک دل افراد تاویل کا علم رکھتے ہیں اور ان کے مطہر ہونے کا لازمی امر یہ ہے کہ وہ اپنے علوم میں راسخ ہوں کیونکہ ان کے دلوں کی تطہیر کا عمل خداوند عالم سے منسوب ہے اور خداوند عالم ایسا سبب ہے، جس پر کسی کا غلبہ نہیں ہوسکتا، لہٰذا یہ کہنا و سمجھنا درست نہ ہوگا کہ رَاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ حضرات اس بناء پر تاویل کا علم رکھتے ہیں کہ وہ راسخون فی العلم ہیں یعنی ان کا راسخ فی العلم ہونا ان کے عالم بہ تاویل ہونے کا سبب ہوا ایسا ہرگز نہیں اور آیہ مبارکہ سے اس کا ثبوت نہیں ملتا، بلکہ عین ممکن ہے کہ آیت کے سیاق سے یہ بات ظاہر ہو کہ رَاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ، تاویل سے جاہل ہیں کیونکہ ارشاد خداوندی ہے کہ " یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ " (ہم اس پر ایمان لائے ہیں یہ سب ہمارے رب کی طرف سے ہے ...)، اس کے علاوہ خداوند عالم نے اہل کتاب میں سے ان لوگوں کی تعریف کی جو راسخون فی العلم ہیں اور ان کی اس صفت کو بیان کیا اور ان کے ایمان و عمل صالح پر ان کی شکر گزاری کا تذکرہ کیا چنانچہ ارشاد ہوا: " لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ....." (سورہ نسآء، آیت ۱۶۲)

لیکن ان میں سے جو رَاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ ہیں اور وہ لوگ جو ایمان لائے، وہ آپ پر اور آپ سے قبل نازل کی جانے والی ہر شے پر ایمان رکھتے ہیں ... ، ان توصیفی اظہارات کے باوجود خداوند عالم کے کلام میں ان کا عالم بہ تاویل ہونا ثابت نہیں ہوتا، اسی طرح آیہ مبارکہ " لَا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ " میں مطہرین و پاک دل افراد کی بابت صرف یہی ثبوت ملتا ہے کہ وہ فی الجملہ اور ایک حد تک کتاب سے مس یعنی اس کے حقائق تک دسترس رکھتے ہیں، لیکن جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ وہ پوری تاویل کا علم رکھتے ہیں اور اس سے ذرہ بھر نا آگاہ نہیں اور نہ ہی کسی زمانہ میں اس سے عدم آگاہی سے دوچار ہوں، تو اس سلسلہ میں یہ آیت (لَا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ) ساکت و خاموش ہے اور اس سے ان حضرات کا کل تاویل سے آگاہ ہونا ثابت نہیں ہوتا، البتہ اگر یہ مطلب ثابت ہو تو کسی دوسری دلیل سے ثابت ہوگا۔

۵۔ کتاب خدا میں متشابہات کیوں ہیں؟

قرآن مجید پر عموماً جو اعتراضات کئے جاتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس میں متشابہات پائے جاتے ہیں جبکہ مسلمانوں کا عقیدہ و دعویٰ ہے کہ اس میں قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے فرائض و واجبات بیان کر دیئے گئے ہیں اور یہ کہ قرآن ایسا کلام ہے جو حق و باطل کے درمیان تمیز کرتا ہے اور ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ الگ کر کے واضح کرنے والا ہے حالانکہ ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے تمام مذاہب و مسالک اپنے درمیان تمام تر اختلافات کے باوجود اپنے اپنے عقیدہ و نظریہ کی صحت و درستی پر قرآن سے استدلال کرتے ہیں، ان کا ایسا کرنا صرف اس وجہ سے ہے کہ

قرآن کی آیات میں تشابہ پایا جاتا ہے (یعنی وہ اپنے مقصود کے بیان میں واضح نہیں) تو کیا یہ بہتر نہ تھا کہ وہ متشابہات سے پاک رہا ہوتا اور اپنی مطلوبہ غرض سے قریب تر ہو جاتا اور اختلاف و انحراف کا مکمل سد باب کر دیتا؟

اس اعتراض کے جواب میں متعدد حوالوں سے اظہار خیال کیا گیا ہے کہ جن میں سے بعض نہایت کمزور ہیں مثلاً:

(۱) بعض مفسرین نے کہا کہ متشابہات کا وجود، حق تک رسائی کو مشکل بناتا ہے کہ جس کے لئے سخت محنت و تحقیق کی ضرورت ہوتی ہے اور حق تک رسائی کی بابت جس قدر زیادہ محنت کی جائے اس کا اجر و ثواب زیادہ ہوتا ہے (گویا آیات متشابہات اس لئے شامل کی گئی ہیں کہ لوگ حق کی پہچان اور اس تک رسائی کی بابت زیادہ محنت کریں تا کہ زیادہ سے زیادہ اجر و ثواب کے حقدار رہوں)۔

(۲) بعض اہل نظر نے یہ جواب دیا ہے کہ اگر قرآن مجید صرف ایک مذہب کی بابت واضح و صریح آیات پر مشتمل ہوتا تو دیگر مذاہب کے پیروکار اس سے دور بھاگتے اور اس میں غور و فکر سے کام نہ لیتے لیکن متشابہات کی وجہ سے انہیں اپنے مذہب کی حقانیت کے اثبات کے لئے قرآن مجید میں غور و فکر کرنے کا لالچ پیدا ہوتا ہے اور ان کے اس میں غور و فکر اور تفکر و تدبر کرنے کی وجہ سے یہ امید پیدا ہو سکتی ہے کہ وہ حق کو پہچان لیں اور اس پر ایمان لے آئیں۔

(۳) بعض ارباب دانش نے یہ کہا کہ متشابہات کا ہونا دراصل اس غرض کے تحت ہے کہ لوگ عقل کی رہنمائی حاصل کریں کہ جس میں ان کے لئے اندھی تقلید کی ظلمت سے باہر آنے اور تحقیق و اجتہاد کی نورانی وادی میں داخل ہونے کی راہیں کھل سکتی ہیں۔

(۴) بعض حضرات کا کہنا ہے کہ قرآن مجید کا متشابہات پر مشتمل ہونا اس بات کا سبب ہوا کہ اہل علم افراد اس میں گونا گوں طریقوں سے تاویلات کی راہیں نکالیں اور اس طرح مختلف علوم و فنون مثلاً علم لغت، علم صرف، علم نحو اور اصول الفقہ میں مہارت حاصل کر سکیں۔

مذکورہ بالا چار جوابات اس قدر ضعیف و کمزور بلکہ بے اساس و غیر منطقی ہیں کہ ذرا سی توجہ و التفات کرنے سے ان کی ناپختگی آشکار ہو جاتی ہے اور دیگر وہ جوابات کہ جن کی بابت بحث و اظہار خیال کرنا مناسب و بجا ہے وہ تین طرح کے ہیں:

(۱) قرآن مجید کا متشابہات پر مشتمل ہونا لوگوں کے دلوں کا امتحان لینے کے لئے ہے کیونکہ اگر اس مقدس کتاب میں ذکر کئے جانے والے تمام مطالب واضح و آشکار اور نہایت آسانی سے سمجھ میں آنے والے ہوتے کہ جن میں کسی کو کسی طرح کا شبہ لاحق نہ ہوتا تو ان پر ایمان لانا کوئی کمال نہ تھا کیونکہ اس میں خداوند عالم کے فرامین کی اطاعت اور اس کے پیغمبروں کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی بابت خضوع کی حیثیت ہی باقی نہ رہتی، (جبکہ خضوع کا تقاضہ یہ ہے کہ خدا اور رسولؐ کے فرامین و دستورات پر کسی بحث و تحقیق اور تامل کے بغیر سر اطاعت خم کر دیا جائے اور اسے ہی ایمانی کمال کہا جا سکتا ہے)۔

اس جواب کا کمزور پہلو یہ ہے کہ اس میں خضوع کو معیار ہدف اور مقصد قرار دیا گیا ہے جبکہ "خضوع" (فروتنی کرنا، سرفگندہ ہونا، بے چون و چرا سر تسلیم خم کرنا) ایک طرح کی انفعالی کیفیت کا نام ہے کہ جو کسی کمزور شخص میں اپنے سے قوی و طاقتور کے مقابلے میں پیدا ہوتی ہے، اور انسان کا کسی چیز کے سامنے خضوع کرنا تو اس وجہ سے ہوتا ہے کہ وہ اس کی عظمت کا ادراک کر لیتا ہے یا یہ کہ اس کی عظمت اس کے ادراک سے مانع ہوتی ہے جیسا کہ خداوند عالم کی غیر متناہی و غیر محدود قدرت و عظمت اور اس کی دیگر صفات عالیہ و متعالیہ ہیں کہ جب عقل ان کی طرف بڑھتی اور ان کے فہم و ادراک کی جانب رخ کرتی ہے تو واپس لوٹ آتی ہے کیونکہ وہ ان تک رسائی سے قاصر ہے، اور وہ چیزیں کہ جن تک عقل کی دسترس ہی نہیں لیکن اس خیال کی بناء پر کہ وہ ان کے ادراک پر قادر ہے دھوکہ کا شکار ہو جاتی ہے اور پھر ان سے دوری اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے تو ان کے سامنے "خضوع" کرنے کا تصور ہی بے معنی ہے جیسا کہ آیات متشابہات کی بابت عقل کی غلط فہمی اس طرح ہوتی ہے کہ وہ ان کو اپنی دسترس میں سمجھتی ہے اور یہ خیال کرتی ہے کہ ان کا فہم رکھتی ہے جبکہ حقیقت میں وہ ان کو سمجھ ہی نہیں سکتی۔

(۲) قرآن مجید اس لئے متشابہات پر مشتمل ہے کہ عقل کو ان کے بارے میں بحث و تحقیق اور غور و فکر پر آمادہ کرے تا کہ اس کا مہمل چھوڑ دینا اس کی موت کا سبب نہ بن جائے اور وہ ہمیشہ واضح و روشن امور سے سروکار کی وجہ سے اس حد تک بے اثر نہ ہو جائے کہ اس میں غور و فکر کی صلاحیت ہی باقی نہ رہے اور تفکر و تدبر کے عوامل کام کرنا ہی چھوڑ دیں جبکہ عقل انسانی وجود میں پائی جانے والی قوتوں میں سے سب سے زیادہ عزت و عظمت کی حامل قوت ہے کہ جس کی دیکھ بھال انسان کی وجودی قوتوں کی دیکھ بھال کی طرح لازم و ضروری ہے۔

یہ جواب بھی قرین صحت معلوم نہیں ہوتا کیونکہ خداوند عالم اپنے مقدس کلام میں بعض موارد و مقامات پر اجمالی و کلی طور پر افرادِ بشر کو حکم دیتا ہے کہ وہ آفاق و عالم الطبیعہ اور موجودات کہ جس میں انسان خود بھی شامل ہے سے مربوط آیات مبارکہ کی بابت عقل و فکر کی قوتوں کو کام میں لائیں، اور دیگر موارد میں تفصیلی تذکرہ کے ساتھ تفکر و تدبر کی دعوت دی ہے مثلاً آسمانوں اور زمین کی تخلیق، پہاڑوں، درختوں، چوپایوں اور انسان کے پیدا کرنے اور زبانوں و رنگوں کے مختلف ہونے کی بابت غور و فکر کرنے کا کہا، اسی طرح "سیروا فی الارض" اور کائنات ارضی میں گھوم پھر کر سابقہ اقوام کے حالات سے باخبر ہونے کا حکم دیا اور اس کے ساتھ ساتھ عقل و فکر سے استفادہ کرنے کے عمل کی بھرپور تاکید کی اور علم کی مدح و تعریف نہایت عمدہ و اعلیٰ الفاظ و انداز میں کی، تو اس سب کچھ کے بعد اس بات کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی کہ متشابہات کے ذریعے ایسے امور میں بحث و تحقیق پر آمادہ کیا جائے جن سے فکری لغزشوں اور نظریاتی انحرافات کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔

(۳) قرآن مجید میں متشابہات کا پایا جانا اس وجہ سے ہے کہ انبیاء علیہم السلام تمام افرادِ بشر کے لئے مبعوث ہوئے کہ جن میں عوام اور خواص، ذکی و ہوشمند اور کند ذہن و کم فہم اور عالم و جاہل سب شامل ہیں، اور جو مطالب و معارف

خداوند عالم نے اپنے مقدس کلام میں نازل فرمائے ہیں ان میں سے بعض ایسے ہیں کہ ان کا بیان کرنا عام فہم لفظوں اور ایسی سادہ و سلیس عبارتوں کے ذریعے ممکن نہیں کہ تمام افراد بشر ان مطالب و معارف سے آگاہ ہو سکیں اور ان کی حقیقتوں کے ادراک کو ان الفاظ کے توسط سے یقینی بنا سکیں لہٰذا مناسب ہے کہ اس طرح کے عظیم معارف کو اس طرح بیان کیا جائے کہ خواص ہی جس کا فہم و ادراک کر سکیں خواہ کنایہ و اشارہ کے ذریعے کیوں نہ ہو، اور عوام الناس کو حکم دیا جائے کہ وہ ان پر ایمان لا کر ان کا معاملہ خدا کے سپرد کر دیں۔

یہ جواب بھی خالی از اشکال نہیں کیونکہ قرآن مجید جہاں متشابہات پر مشتمل ہے وہاں محکمات بھی اس میں پائے جاتے ہیں کہ جن کے ذریعے متشابہات کا فہم المعانی ممکن ہوتا ہے اور ان کی طرف رجوع کر کے متشابہات کے معانی واضح طور پر معلوم ہو سکتے ہیں اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ متشابہات میں اس مقدار سے زیادہ معانی نہ پائے جائیں کہ جو محکمات کے ذریعے ظاہر ہوتے ہوں، تو اس صورت میں یہ سوال اپنی جگہ باقی رہے گا کہ قرآن مجید میں متشابہات کے لانے کا کیا فائدہ ہے اور محکمات کے ہوتے ہوئے ان کی ضرورت ہی کیا ہے؟ دراصل بات یہ ہے کہ جواب دینے والے حضرات کی غلط فہمی اس طرح پیدا ہوئی کہ انہوں نے آیات کے معانی کو دو مختلف قسموں میں تقسیم کر دیا:

(۱) وہ معانی کہ جن کا فہم و ادراک تمام مخاطبین خواہ عوام الناس ہوں یا خواص ہوں کر سکتے ہیں اور وہ انہی معانی سے عبارت ہیں جن پر محکمات دلالت کرتی ہیں۔

(۲) وہ معانی کہ جن کی سطح ہی ایسی ہے کہ خواص کے علاوہ کوئی انہیں سمجھ نہیں سکتا، کیونکہ وہ نہایت بلند پایہ معارف اور نہایت دقیق و گہرے مطالب پر پر از حکمت حقائق ہیں، اس تقسیم کا نتیجہ یہ ہے کہ متشابہات کے معانی کو سمجھنے کے لئے محکمات کی طرف رجوع نہ کیا جائے جبکہ یہ بات پہلے بیان ہو چکی ہے کہ اس طرح کی تقسیم اور اس سے حاصلہ نتیجہ ان آیات مبارکہ کے صریح الفاظ کے منافی ہے کہ جن میں قرآن مجید کی آیات کا ایک دوسری کی تفسیر کرنا ثابت ہوتا ہے، اور اس کے علاوہ دیگر دلائل سے بھی اس طرح کی تقسیم بندی و نتیجہ گیری کی نفی ہوتی ہے۔

بہر حال اس مقام پر جو بات لائق ذکر ہے وہ یہ کہ: قرآن مجید میں متشابہات کا ہونا ضروری ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن میں ''تاویل'' موجود ہے کہ جو آیات مبارکہ کے ایک دوسری کی تفسیر کرنے کا باعث ہوئی ہے البتہ یہاں ''تاویل'' کا وہ معنی ملحوظ ہے جو ہم واضح طور پر بیان کر چکے ہیں، تاہم یہ مطلب اس وقت مزید واضح ہو گا جب قرآنی بیانات اور خدائی تعلیمات کی مختلف جہتوں و پہلوؤں پر اچھی طرح غور و فکر اور تدبر سے کام لیا جائے اور ان امور پر توجہ و التفات کیا جائے کہ جن پر قرآنی معاف و مقاصد کی اصل و اساس قائم ہے اور وہ درج ذیل امور ہیں:

(۱) خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس کی کتاب ''تاویل'' کی حامل ہے اور قرآن کے تمام معارف، احکام،

قوانین اور دیگر تمام مندرجات وخدائی تعلیمات کا دارومدار اسی تاویل پر ہے اور وہ تاویل کہ جس پر تمام قرآنی بیانات مبنی ہیں اس کا فہم وادراک عام افراد کے بس کا روگ نہیں اور عقلیں اس کی بلندی کو نہیں پاسکتیں بلکہ اس کی طرف بڑھنے سے عاجز و قاصر ہیں، کسی کو اس تک رسائی حاصل نہیں سوائے ان ہستیوں کے کہ جنہیں خداوند عالم نے پاک قرار دیا ہے اور ہر طرح کی پلیدی ونجاست کو ان سے دور رکھا ہے اور انہیں اس خصوصیت سے نوازا ہے کہ وہ اصل الکتاب کو چھو سکیں (اس کی حقیقت و تاویل کا ادراک کر سکیں)، اور یہی وہ مقصد ہے کہ جو خداوند عالم نے انسان کی بابت طے کیا ہے اور علم وآگاہی کے بارے میں اس کی دعا وطلب کو پورا کرتے ہوئے یہ ارادہ فرمایا ہے کہ اسے اپنی کتاب کے علم سے نوازے، وہ کتاب کہ جو ہر چیز کا واضح بیان ہے، اور عطائے علم کا راستہ کہ جسے مفتاح اور کلید سے تعبیر کیا گیا ہے خداوند عالم کی طرف سے حاصل ہونے والی پاکیزگی ہے کہ جس کا تذکرہ اس آیہ مبارکہ میں ہوا ہے:

سورہ مائدہ، آیت ۷:

O "مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ"

(خدا تمہیں دین کی بابت کسی طرح سے بھی پریشانی میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا بلکہ وہ تمہیں پاک رکھنا چاہتا ہے)

اس آیت میں احکام دین کی قانون سازی کا اصل مقصد خدا کی طرف سے عطا کی جانے والی پاکیزگی کو قرار دیا گیا ہے، اور یہ انسانی کمال انہی دیگر کمالات کی مانند کہ جن کے حصول کی دعوت دی گئی ہے اور اسے آراستہ ہونے کے اسباب فراہم کرنے کی تاکید کی گئی ہے صرف خاص افراد کو حاصل ہوتا ہے اور وہی اس سے آراستہ ہونے کا شرف پاتے ہیں اگرچہ تمام افرادِ بشر کو اس کے حصول کی کوشش کرنے کی دعوت عام دی گئی ہے، البتہ لوگوں کا دینی تربیت کے مراحل طے کرنا خاص افراد ہی کے لئے نتیجہ بخش ثابت ہوتا ہے اور انہیں پاکیزگی کے کمالی درجہ پر فائز کر دیتا ہے، اور ان کے علاوہ دیگر افراد کو پاکیزگی کے بعض مراتب ودرجات سے بہرہ مند کرتا ہے البتہ پاکیزگی کے درجات کا حامل ہونا افرادِ بشر کی ذاتی خصوصیات کے مطابق ہوتا ہے، اس کی مثال اس طرح دی جاسکتی ہے کہ اسلام نے تمام افراد بشر کو عمل میں تقویٰ اختیار کرنے کی دعوت عام دی اور فرمایا: " اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ" (سورہ آل عمران، آیت ۱۰۲)..... اور تم تقوائے الٰہی اختیار کرو جس طرح پر اس کا حق ہے۔ لیکن تقویٰ کا کمال معدودے چند افراد کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں ہوتا اور ان کے علاوہ دیگر افراد تقویٰ کے کمتر درجہ کو پاتے ہیں اور الامثل فالامثل کی بناء پر ہر شخص اپنی ایمانی وعملی صلاحیت کے مطابق تقویٰ کی نعمت سے سرشار ہوتا ہے، اور یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ افراد بشر کی طبع وفہم مختلف ہوتی ہے چنانچہ یہی صورتحال معاشرتی کمالات کی ہے کہ تربیت اور دینی شعور کی بنیاد پر ان میں فرق پایا جاتا ہے جبکہ معاشرہ کی تشکیل اور اسے قائم کرنے والا شخص تمام افراد کو ہر کمال مثلاً علم، صنعت، ثروت ودولتمندی، راحت وآرام وغیرہ کے بلند ترین مقام تک پہنچنے کی دعوت دیتا ہے لیکن ان کمالات کے اعلیٰ ترین

درجہ کو چند افراد ہی پاتے ہیں اور ان کے علاوہ دیگر حضرات کو اپنی اپنی صلاحیتوں اور استعدادات کے مطابق کمالات حاصل ہوتے ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے مقاصد و بلند پایہ کمالات یا کمالات کی بلندیاں ہر ہر فرد کے بجائے مجموعی طور پر معاشرہ کو حاصل ہوتی ہیں یعنی عمومی و مجموعی طور پر معاشرہ ان کمالات کا حامل ہوتا ہے کہ جس کے تمام افراد ان سے متصف ہوتے ہیں اور کوئی ان سے عاری نہیں رہتا البتہ ہر شخص اپنی صلاحیت و استعداد کے مطابق کمالی درجات پاتا ہے۔

(۲) قرآن مجید نے بھرپور صراحت و پختگی کے ساتھ اس بات کو بیان کیا ہے کہ اس غرض و مقصد کے حصول کے لئے صرف ایک راستہ ہے اور وہ یہ کہ انسان اپنے آپ کو پہچانے جو کہ علمی و عملی تربیت کے ذریعے امکان پذیر ہے، علمی تربیت کے ذریعے اس طرح سے کہ ان حقائق کی تعلیم دی جائے جن کا تعلق مبداء و معاد اور ان دنوں کے درمیان پائے جانے والے عالم سے ہے تاکہ وہ اپنے آپ سے آگاہی حاصل کرتے ہوئے مربوطہ حقائق کی بابت حقیقی معرفت حاصل کر سکے اور عملی طور پر تربیت اس طرح ممکن ہے کہ اسے معاشرتی قوانین کی پاسداری کا پابند کیا جائے تاکہ اس کی معاشرتی زندگی کے امور درست انجام پذیر ہوں اور وہ اسے علم و معرفت کی دنیا سے دور نہ کر سکیں، پھر اس پر عبادتی اعمال واجب و لازم کر دیئے جائیں تاکہ وہ ان اعمال کے بار بار انجام دینے کے نتیجہ میں اپنے آپ سے آگاہی، مبداء و معاد کی طرف قلبی جھکاؤ، روحانیت و پاکیزگی کی حسین وادی میں قدم رکھنا اور مادی امور کی گندگی و سنگینی سے دوری جیسی کمالی صفات پا سکے،

اگر آپ اس آیہ مبارکہ میں غور و فکر اور اچھی طرح تدبر کریں کہ جس میں ارشاد خداوندی ہے: " اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ "(سورہ فاطر، آیت ۱۰)......اسی کی طرف پاکیزہ باتیں (صحیح و برحق عقائد) صعود کرتی ہیں (اوپر کی طرف بلند ہوتی ہیں) اور اعمال صالحہ انہیں مزید بلند کر دیتے ہیں......، اور اس کے ساتھ ساتھ آیہ شریفہ " وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ " کی تفسیر میں ہم نے جو مطالب ذکر کئے ہیں اور آیہ مبارکہ " عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ؕ "(سورہ مائدہ، آیت ۱۰۵) ... تم اپنا خیال رکھو تاکہ گمراہ ہونے والا شخص تمہیں نقصان نہ پہنچا سکے جبکہ تم ہدایت پا چکے ہو ...، اور آیہ مبارکہ " يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ؕ " (سورہ مجادلہ، آیت ۱۱) خدا تم میں سے ایمان والوں اور ان لوگوں کو کہ جنہیں علم عطا کیا گیا ہے بلند درجے عطا کرتا ہے ، اور اس طرح کی دیگر آیات کے معانی کو مدنظر قرار دیں تو آپ کو وہ غرض و مقصد اعلیٰ واضح طور پر معلوم ہو جائے گا جس کے تحت خداوند عالم نے دینی قوانین وضع کئے اور احکام و دستورات صادر فرمائے اور انسان کو حق کی ہدایت کے راستے بتائے، اور اس مقصد تک پہنچنے کا جو راستہ اختیار کیا (مزید غور کریں)۔

مذکورہ بالا بیان سے یہ اہم ترین نتیجہ سامنے آتا ہے کہ اسلام کے معاشرتی قوانین ان عبادتی اعمال و فرائض کے لئے مقدمہ و تمہید کی حیثیت رکھتے ہیں کہ جن کے لئے ان کو وضع کیا گیا ہے اور عبادتی فرائض خداوند عالم کی ذات اور اس کی آیات

کی معرفت کا مقدمہ ہیں، یعنی معاشرتی قوانین و دستورات کی اصل غرض عبادتی اعمال و فرائض ہیں اور عبادتی اعمال و فرائض کی اصل غرض معرفتِ خدا ہے، لہٰذا معاشرتی احکام و دستورات میں ذرہ بھر تبدیلی یا تحریف و خلل اندازی عبادتی اعمال کے فاسد ہونے کا سبب ہوگی اور عبادتی اعمال کے خراب ہونے کا نتیجہ معرفت خدا کے سلسلہ کو درہم برہم کر دے گا۔

مذکورہ بالا نتیجہ جو کہ اپنی اصل و اساس کے حوالہ سے واضح و روشن ہے اس کی تائید و تصدیق عملی تجربات سے بھی ہوتی ہے اور وہ یوں کہ: اگر آپ امتِ اسلامیہ میں دینی امور و اسلامی معارف کی بابت پیدا ہونے والی خرابیوں اور بحرانی حالات کا جائزہ لیں اور ان کے بارے میں اچھی طرح غور و فکر کر کے یہ بات سوچیں کہ یہ سب کچھ کہاں سے شروع ہوا اور کہاں تک جا پہنچا تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس سارے فتنہ کی ابتداء معاشرتی دستورات و قوانین سے روگردانی کا باعث ہوئی اور پھر وہ عبادات تک سرایت کر گیا یہاں تک کہ اس کا سلسلہ معارف و حقائق اور عقائد تک جا پہنچا (گویا معاشرتی قوانین کی خلاف ورزی اس کی اصل و اساس اور پہلا آغاز تھا اور عبادات میں بدعتوں کے ذریعے اس فتنہ کو ہوا ملی جو کہ اس کا درمیانی مرحلہ تھا اور اعتقادات و معارف تک سرایت کرنا اس کا آخری مرحلہ تھا) چنانچہ ہم آپ کو پہلے آگاہ کر چکے ہیں کہ دنیائے اسلام بلکہ دین اسلام میں فتنوں کا آغاز متشابہات کی پیروی اور ان کی تاویل جوئی کے ذریعے ہوئی اور یہ سلسلہ عصر حاضر تک جاری و ساری ہے۔

(۳) دینی ہدایت کی بنیاد کسی کی اندھی تقلید نہ کرنے اور حتی الامکان علم و دانش کے سہارے اعتقادی و عملی مراحل طے کرنے پر استوار ہے کیونکہ یہی بات دینی احکام و قوانین کے مقصدِ اعلیٰ یعنی معرفت سے ہم آہنگی و ہم رنگی رکھتی ہے، اور ایسا کیوں نہ ہو؟ کیونکہ آسمانی کتب میں سے کوئی کتاب اور ادیان الٰہی میں سے کوئی دین ایسا نہیں کہ جس میں اس حد تک علم کی عظمت و اہمیت کو واضح کر کے اس کے حصول کی ترغیب دلائی گئی ہو جتنی قرآن مجید اور اسلامی تعلیمات میں ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے انسان کو پہلے اعتقادی معارف و حقائق سے بھرپور آگاہی دلائی اور واضح طور پر ان کو بیان کیا اور پھر ان حقائق کا عملی احکام و دستورات اور شرعی قوانین سے ربط واضح کیا، دوسرے لفظوں میں یہ کہ اسے سمجھایا کہ وہ خدا کی مخلوق ہے، خدا نے اسے اپنے دست قدرت سے خلق کیا ہے اور اس کی تخلیق و بقاء میں اپنے فرشتوں اور آسمان و زمین و نباتات و حیوانات و مکان و زمان اور اپنی دیگر مخلوقات کو آمادۂ خدمت قرار دیا، اور یہ کہ وہ خواہ و نا خواہ اپنی جائے بازگشت و حقیقی وعدہ گاہ کی طرف رواں دواں ہے اور اپنے پروردگار کے حضور پہنچنے میں کوشاں ہے کہ بالآخر اس تک جا پہنچے گا، پھر اسے اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا کہ یا وہ بہشت میں جگہ پائے گا یا دوزخ اس کا ٹھکانہ ہوگا، یہ وہ مطالب ہیں جو عقائد کے حوالہ سے قرآن مجید میں مذکور ہیں، اس کے بعد قرآن مجید نے انسان کو اس کے اعمال کی بابت آگاہ کیا کہ وہ کون سے اعمال ہیں جن کا انجام دینا بہشت میں جانے کی سعادت کے حصول کا سبب بنتا ہے اور وہ کون سے اعمال ہیں جن کے ارتکاب کا نتیجہ دوزخ میں جلنے کی

بدبختی کے سوا کچھ نہیں، یعنی قرآن مجید نے عبادتی احکام ومعاشرتی قوانین کوواضح طور پر بیان کیا ہے تو یہ وہ مطالب ہیں جنہیں اعتقادات کے بیان کے بعد دوسرے مرحلہ میں بیان کیا گیا ہے، پھر قرآن مجید انسان کو اس حقیقت سے آگاہی دلاتا ہے کہ احکام وقوانین اسے سعادت وخوشبختی کی منزل تک پہنچا سکتے ہیں، یعنی اسے سمجھاتا ہے کہ دوسرے مرحلہ میں بیان کیے گئے مطالب دراصل پہلے مرحلہ میں بیان کیے گئے مطالب سے مرتبط ووابستہ ہیں اور ان کی انسان کے لئے تشریع وقانون سازی کی بنیاد ومقصد اس کی سعادت وخوشبختی ہے کیونکہ ان میں انسان کی دنیوی واخروی بہتری کا راز پوشیدہ ہے، تو یہ مطالب تیسرے مرحلہ میں قرآن مجید نے انسان کے لئے ذکر کیے ہیں۔

مذکورہ بالا بیانات سے یہ بات آپ کے سامنے واضح ہو چکی ہوگی کہ دوسرے مرحلہ میں مذکور مطالب، پہلے مرحلہ میں بیان کیے گئے مطالب کی نسبت، مقدمہ وتمہید کی حیثیت رکھتے ہیں اور دوسرے مرحلہ میں بیان کیے گئے مطالب ان کے نتیجہ کے طور پر ہیں اور تیسرے مرحلہ میں ذکر کیے گئے مطالب رابطہ اور باہمی پیوستگی ایجاد کرنے والی شے کی حیثیت رکھتے ہیں کہ جس سے دوسرے مرحلہ کے مطالب کا پہلے مرحلہ کے مطالب سے ربط قائم ہوتا ہے، بہر حال ان تمام مطالب کے بارے میں قرآنی آیات مبارکہ واضح دلالت کی حامل ہیں یعنی آیات شریفہ سے ان مطالب کی بابت واضح ثبوت ملتے ہیں لہٰذا ان سب کے تفصیلی تذکرہ کی ضرورت نہیں۔

(۴) عمومی طور پر لوگوں کے فہم وادراک کی دسترس محسوسات تک محدود ہوتی ہے اور وہ صرف انہی امور کو سمجھ سکتے ہیں جن تک ان کے حواس خمسہ کی رسائی ممکن ہوتی ہے اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں سمجھ سکتے اور ان کی عقلیں مافوق الطبیعۃ عالم تک جا ہی نہیں سکتی، وہ مادی جہان سے ماوراء کی اشیاء وامور کے ادراک سے قاصر ہیں، اور لوگوں میں سے جو افراد علمی کاوشوں وفکری ریاضتوں کے ذریعے فہم وادراک کی بلندیوں پر فائز ہو کر حقائق ومفاہیم اور اصول عقائد وقوانین کو سمجھنے میں کامیاب ہوئے وہ سب یکساں ومساوی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ ان کے درمیان درجات ومراتب کے لحاظ سے فرق پایا جاتا ہے اور اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ جن وسائل کے ذریعے وہ افراد حقائق ومفاہیم کے ادراک میں کامیاب ہوئے وہ ایک جیسے نہیں بلکہ ان میں فرق پایا جاتا ہے اور اسی کے سبب عالم محسوسات سے باہر کے مطالب کے سمجھنے میں برابری نہیں رہی بلکہ اس حوالہ سے لوگ مختلف مراتب کے حامل ہو گئے اور ان کے درمیان پائے جانے والے فہم وادراک کے شدت سے مختلف ہونے کا مسئلہ اس قدر وسیع وعریض ہے کہ کوئی شخص اس کا انکار نہیں کر سکتا۔

یہ بات بھی واضح ومسلم اور ناقابل انکار ہے کہ کسی بھی شخص کو کسی معنی وحقیقت سے آگاہی دلانے کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ ان ذہنی معلومات سے عبارت ہے جو اسے زندگی کے گوناگوں مراحل میں حاصل ہوتی ہیں، پس اگر وہ شخص حس وحسیات سے ذہنی انس رکھتا ہو تو اسے محسوسات کے ذریعے اسی حد تک مافوق المادہ مطالب ومعانی سے آگاہی دلانا ممکن

ہوگا جتنا اس کی قوت حس کے مراتب میں بلندی ہوگی جیسا کہ کم سن بچے کو شادی کی لذت و مٹھاس سے آشنا کرنے کے لئے حلوے کی مٹھاس سے مثال دی جائے اور کہا جائے کہ اس کی مٹھاس حلوہ کی مٹھاس جیسی ہے، اور اگر وہ کلیات کے ادراک اور حس وحسیات سے بالاتر معانی وحقائق تک رسائی حاصل کر چکا ہو تو جس ذریعہ سے اور جس حد تک اسے رسائی حاصل ہوئی ہو اسے اس کے مطابق مطلب سمجھایا جائے گا لہٰذا وہ ہر بیان کے ذریعے خواہ حسی ہو یا عقلی، معانی کا ادراک کر سکتا ہے یعنی اس کے لئے دونوں قسم کے بیانات یکساں ہیں جبکہ حس وحسیات سے ذہنی انس رکھنے والا شخص ایسا نہیں بلکہ وہ صرف اور صرف حسی بیان کے ذریعے معانی کو سمجھ سکتا ہے،

اور جہاں تک دینی ہدایت کا تعلق ہے تو وہ لوگوں میں سے کسی خاص طبقہ سے مختص نہیں بلکہ تمام افرادِ بشر اور ہر طبقہ کے لئے ہے، اور یہ ایک واضح وروشن حقیقت ہے،

بنا برایں لوگوں کے فہم وادراک کا مختلف ہونا اور دینی ہدایت کا تمام افرادِ بشر کے لئے عام و وسیع ہونا اور اس کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کا تاویل پر مشتمل ہونا ہی اس بات کا موجب ہوا کہ قرآنی بیانات مثالوں کی حیثیت وصورت میں ہوں اور وہ اس طرح کہ انسان جن معانی سے آشنا ہے اور ان سے ذہنی انس رکھتا ہے ان کی بناء پر قرآن مجید اسے اپنے بیانات کے ذریعے وہ معانی ومطالب واضح کرتا ہے جن سے وہ آگاہ وآشنا نہیں کیونکہ ان دونوں کے درمیان ہم رنگی پائی جاتی ہے یعنی جن معانی وحقائق سے انسان آشنا ہے اور جن سے نا آشنا ہے ان دونوں کے درمیان مناسبت وہم رنگی کی وجہ سے قرآن مجید اپنے بیانات کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ ہر فرد اپنی قوتِ فہم وادراک کے مطابق ان سے استفادہ کر سکے، اس کی مثال یوں دی جاسکتی ہے کہ جس طرح ہم اشیاء کا وزن لوہا و پتھر وغیرہ سے کرتے ہیں جبکہ ان دونوں کے درمیان کسی بھی حوالہ سے سنخیت نہیں ہوتی نہ شکل وصورت میں، نہ حجم میں اور نہ ہی نوع میں، بلکہ جن چیزوں کے ذریعے اشیاء کو تولا جاتا ہے وہ ان اشیاء سے سوائے وزن کے کسی بھی حوالہ سے ہم رنگی نہیں رکھتیں ...... مثلاً پتھر کے ذریعے مٹھائی کو تولا جاتا ہے کہ ایک کلو کا پتھر ترازو کے ایک پلڑے میں رکھ کر اس کے برابر وزن میں ایک کلو مٹھائی رکھی جاتی ہے اس طرح دونوں کا وزن یکساں ہو جاتا ہے جبکہ ان دونوں کے درمیان کوئی سنخیت ومناسبت نہیں پائی جاتی بلکہ صرف وزن معیار وملحوظ ہوتا ہے یہی بات قرآنی بیان کی تمثیلی حیثیت کے حوالہ سے ہے،م......،

سابق الذکر قرآنی آیات مبارکہ میں سے ایک یہ ہے: "اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۝" (سورہ زخرف، آیت ۴)...... بے شک ہم نے قرآن کو عربی زبان میں قرار دیا تا کہ تم سمجھ سکو اور وہ ام الکتاب میں ہمارے پاس ہے جو کہ بلند مرتبہ اور پر از حکمت و دانائی ہے......، اور اس طرح کی دیگر آیات اگرچہ اشارہ وکنایہ کے ذریعے زیر بحث موضوع کو بیان کرتی ہیں لیکن اس کے باوجود قرآن مجید نے اشارہ وکنایہ پر

اکتفاء نہیں کیا بلکہ اسے حق و باطل کی بابت مثال دے کر واضح کیا چنانچہ ارشاد ہوا:

سورہ رعد، آیت ۱۷:

O " اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ؕ وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ؕ۬ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ ؕ﴿۱۷﴾ "

(اس نے آسمان سے پانی اتارا پھر ندی نالے اپنی گنجائش کے مطابق بہنے لگے، پھر پانی کے ریلے پر پھولا ہوا جھاگ آ گیا اور اس چیز (دھات) سے بھی کہ جسے لوگ زیورات یا دیگر اسباب بنانے کے لئے آگ میں تپاتے ہیں، اسی طرح خدا حق و باطل کی مثال بیان کرتا ہے، پھر وہ جھاگ خشک ہو کر نیست و نابود ہو جاتا ہے اور وہ چیز کہ جس سے لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے وہ زمین میں برقرار رہتی ہے، اسی طرح اللہ مثالیں دیتا ہے)۔

اس آیت مبارکہ کے ذریعے خداوند عالم نے اس امر کی وضاحت فرمائی ہے کہ اس کے افعال میں تمثیلی ضابطہ کا حکم فرما و جاری ہونا اسی طرح سے ہے جیسے اس کے اقوال میں ہوتا ہے، لہٰذا اس کا فعل بھی اس کے قول کی مانند حق ہے اور اس کے قول و فعل کا مقصد و مقصود بھی حق ہے البتہ ان دونوں (قول و فعل) میں سے ہر ایک کے ساتھ کچھ ایسے امور بھی ہوتے ہیں جو اصل میں مقصود نہیں ہوتے بلکہ مفید بھی نہیں ہوتے لیکن عام طور پر ان کی طرف توجہات مبذول ہوتی ہیں اور وہی سب کی نگاہوں میں سماتے ہیں جبکہ وہ دیکھتے ہی دیکھتے زوال پذیر ہو جاتے ہیں اور ان کا نام و نشان تک باقی نہیں رہتا اور جو چیز باقی رہتی ہے اور اسے دوام حاصل ہوتا ہے وہ " حق " ہے کہ جو ہر حال میں قائم و ثابت رہتا ہے اور وہی تمام افرادِ بشر کے لئے فائدہ مند ہوتا ہے، لیکن وہ " حق " بھی کسی دوسرے حق ...... کہ جو اس سے زیادہ اہم و فائدہ بخش ہو...... کے ذریعے محو ہو جاتا ہے اس کی مثال آیہ متشابہ ہے کہ جو ایک " حق " اور مقصود معنی کی حامل ہوتی ہے جبکہ اس کے ساتھ بلکہ اس سے نمایاں تر اس کا ایک معنی ذہنوں کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے جو کہ حق و مقصود نہیں ہوتا بلکہ وہ باطل و غیر مقصود معنی ہوتا ہے کہ جو دوسرے حق کے ذریعے (یعنی آیہ محکم کے ذریعے) محو ہو جاتا ہے اور جو معنیٰ " حق " ہے وہی ثابت و قائم رہتا ہے اور وہ باطل معنی پر غالب آ جاتا ہے چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

سورہ انفال، آیت ۸:

O " لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ "

(......تا کہ وہ (خدا) حق کو ثابت و قائم رکھے اور باطل کو مٹا دے خواہ مجرم لوگ اسے ناپسند ہی کیوں نہ کریں)

اس آیت مبارکہ سے مراد یہ ہے کہ خداوند عالم کے کلام کا دو رخوں کا حامل ہونا اس غرض سے ہے کہ حق قائم رہے

اور باطل محو ہو جائے۔

بہر حال مذکورہ بالا مثال کی تطبیق کے حوالہ سے ہماری بحث اور نقطۂ نظر خداوند عالم کے کائنات میں ظاہر بہ ظاہر انجام دیئے جانے والے افعال کی بابت اسی طرح سے ہے جیسے اس کے اقوال کی بابت ہوتی ہے ان دونوں میں اس حوالہ سے کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔

خلاصہ کلام یہ کہ آیہ مبارکہ سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ خدائی حقائق و معارف اس پانی کی مانند ہیں جسے خداوند عالم آسمان سے نازل کرتا ہے جو کہ اپنی طبعی حیثیت میں صرف پانی ہے اور اس میں کوئی شرط و صنعت مثلاً مقدار و کیفیت ملحوظ و مقصود نہیں ہوتی بلکہ ہر طرح کی قید و شرط سے خالی، اسے پانی کہا جاتا ہے کہ جو بعد میں سیلاب کی طرح ندیوں نالوں میں رواں دواں ہوتا ہے اور ہر جگہ کی وسعت و تنگی کے مطابق اس کی مقدار متعین ہو جاتی ہے اور یہ مقدار و اندازے ہر جگہ میں اس کے مقام و مورد کے مطابق برقرار ہوتے ہیں یعنی جس جگہ پانی گرتا ہے اس کی ظرفیت کے عین مطابق پانی کی مقدار واضح ہوتی ہے اور جگہ کی وسعت و تنگی کے حوالہ سے پانی کی مقدار سے آگاہی حاصل ہوتی رہتی ہے یہی صورتحال اصول المعارف اور تشریعی احکام اور احکام کی ان حکمتوں و فوائد کی ہے جن کا تذکرہ ہم پہلے کر چکے ہیں اور بیان کر چکے ہیں کہ وہ حکمتیں و فوائد درحقیقت احکام اور معارف کے درمیان ربط و تعلق قائم کرنے والے امور ہیں کہ جو احکام کو برحق معارف سے مربوط کر دیتے ہیں، تو یہ ہے ان حکمتوں، مصلحتوں اور حقیقی فوائد کی اصل صورت کہ جو الفاظ کے قالب میں ڈھلنے سے قطع نظر مورد توجہ ہے اور جب وہ لفظوں کے قالب میں ڈھلتے ہیں تو گاہے کچھ ایسی زائد و اضافی چیزوں کے ہمراہ ہوتے ہیں کہ جن کی حیثیت سیلاب کے پانی پر تیرتے ہوئے جھاگ کی طرح ہوتی ہے کہ جو ابھرتا ہے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہو جاتا ہے لیکن اصل شے باقی رہ جاتی ہے، اس کی مثال ان احکام جیسی ہے جو ناسخ آیات کے ذریعے منسوخ ہو جاتے ہیں کیونکہ جو احکام منسوخ ہوتے ہیں ان کے ظاہری الفاظ سے ان کے دائمی ہونے کا عندیہ ہوتا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ وہ احکام ہمیشہ باقی رہنے والے ہیں لیکن ناسخ احکام ان کے دائمی و ہمیشہ باقی ہونے کی صفت کو محو کر دیتے ہیں اور دیگر احکام ان کی جگہ لے لیتے ہیں کہ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ منسوخ ہونے والے احکام ناسخ احکام کے نزول تک کے زمانہ کے لئے صادر ہوئے تھے اور اس کے بعد ناسخ احکام واجب الاتباع ہیں اور جو مصلحتیں منسوخ شدہ احکام میں ملحوظ و مقصود تھیں ان کی جگہ دیگر امور مورد توجہ ہیں۔

یہ تھے وہ مطالب کہ جن کا تعلق مذکورہ قرآنی اصل حقائق و معارف سے ہے کہ جن میں ان حقائق و معارف کا الفاظ کی صورت میں وارد ہونا ملحوظ نہیں بلکہ الفاظ و عبارتوں سے قطع نظر اصل معارف مدنظر تھے، لیکن جہاں تک ان کے الفاظ کی صورت میں نازل ہونے کا تعلق ہے کہ وہ الفاظ مخصوص معانی پر دلالت کرتے ہیں تو اس صورت میں (ان کی حیثیت اس پانی کی مانند ہے جو مختلف زمینوں پر گرتا ہے اور ہر زمین سے اس کے ظرف کی وسعت کے مطابق ثمر و نتیجہ حاصل ہوتا ہے، گویا

اس طرح ہر زمین اپنی صلاحیت وخصوصیت کے مطابق اس پانی کی مقدار کے تعین کا مظہر ہوتی ہے اسی طرح قرآنی حقائق و معارف جب لفظوں کی صورت میں نازل ہوتے ہیں تو) ان کے معانی کا تعین وران کے دائرۂ کار کی وسعت وعدم وسعت انہی الفاظ کی بنیاد پر ہوتی ہے اور لفظوں ہی سے ان معارف کی حدود وقیود کا اندازہ ہوتا ہے اور وہ الفاظ ان معانی وحقائق اور معارف کے آئینے میں متکلم کے مقصود ومراد کے حوالہ سے مورد توجہ قرار پاتے ہیں کہ وہ ان کے ظرف کی حیثیت رکھتے ہیں جس سے مقصودہ معانی سے آگاہی حاصل ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود کہ وہ الفاظ متکلم کے کلام میں مقصود اور بنیادی طور پر ملحوظ ہوتے ہیں مگر حقیقت میں وہ مثال کی طرح ہوتے ہیں کہ جن سے مطلق معنی کی تمثیل کا کام لیا جاتا ہے اور اس قالب کی حیثیت رکھتے ہیں جس میں اصل اشیاء کو ڈھالا جاتا ہے تو اس میں حقیقی مقصود وہ اشیاء ہوتی ہیں کہ جنہیں قالب میں رکھ کر ان کے اندازوں کا تعین کیا جاتا ہے، پھر وہ الفاظ مختلف اذہان میں وارد ہونے کے سبب غیر مقصودہ معانی کے حامل ہو جاتے ہیں جیسا کہ سیلاب میں پانی پر تیرتا ہوا جھاگ ہوتا ہے، کیونکہ ذہنوں میں جو معانی ومفاہیم گھر کرتے رہتے ہیں ور وہ (اذہان) ان سے مانوس ہو جاتے ہیں ان کی وجہ سے نئے آنے والے معانی میں تصرف کی راہ کھل جاتی ہے (تصرف سے مراد ان معانی میں کمی وبیشی اوران کے تعین میں مخصوص رجحانات کی دخل اندازی وعملداری ہے) اور اس طرح کا تصرف عموماً غیر مانوس معانی میں ہوتا ہے مثلاً بنیادی اعتقادی معارف، احکام کی حکمتیں ومصلحتیں اوران کے معیار وغیرہ کہ جن کی بابت وضاحت ہو چکی ہیں، لیکن جہاں تک اصل احکام اور عملی دستورات کا تعلق ہے تو ان کے معیاروں وحکمتوں سے قطع نظر ان میں تصرف کی نوبت اس لئے نہیں آتی کہ ذہنوں کو ان سے مانوسیت ہوتی ہے اور اس مانوسیت کی وجہ سے اذہان ان میں تصرف نہیں کرتے، اسی بیان سے متشابہات کا مسئلہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ وہ ایسی آیات ہیں جو احکام اور دینی قوانین و دستورات کی بجائے بنیادی اعتقادی معارف اور احکام کے معیاروں وحکمتوں پر مشتمل ہیں کہ جن سے عدم مانوسیت ان میں تصرف کی راہ کھولتی ہے۔

(۵) مذکورہ تمام مطالب سے یہ بات معلوم وواضح ہوگئی کہ قرآنی عبارت ولفظی بیانات دراصل خدائی حقائق و معارف کی تمثیلی صورتیں ہیں اور وہ حقائق ان آیات میں عامتہ الناس کی سطح فہم کے مطابق اترے ہیں کیونکہ عامتہ الناس کی قوت فہم کی رسائی حسی امور تک ہے اس سے زیادہ نہیں اور وہ روحانی حقائق ومعارف کا ادراک صرف اسی صورت میں کرسکتی ہے جب ان کو جسمانیات کے قالب میں ڈھال دیا جائے۔ لیکن روحانی حقائق ومعارف کو جسمانی ومادی قالب میں ڈھال کر بیان کرنے میں دو مشکلوں میں سے کسی ایک سے دوچار ہونا ناگزیر ہوگا جبکہ وہ دونوں خطرناک صورتیں ہیں۔

روایات پر ایک نظر

محکم اور متشابہ کا فرق

تفسیر العیاشی میں مذکور ہے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے محکم و متشابہ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؑ نے ارشاد فرمایا:

" المحکم ما یعمل بہٖ والمتشابہ ما اشتبہ علٰی جاھلہٖ "،

محکم اس آیت کو کہتے ہیں جس پر عمل کیا جاتا ہو اور متشابہ سے مرادوہ آیت ہے جس کا مفہوم اس کے معنی سے نا آگاہ شخص پر واضح نہ ہو۔ (تفسیر العیاشی، ج ۱ ص ۱۶۲)

مؤلفؒ: اس روایت میں امام علیہ السلام کے ارشاد گرامی سے اس مطلب کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ متشابہ کے معنی سے آگاہی پانا ممکن ہے۔

اسی کتاب (تفسیر العیاشی) میں انہی حضرتؑ سے منقول ہے کہ آپؑ نے ارشاد فرمایا:

" ان القرآن محکم و متشابہ، فاما المحکم فتؤمن بہٖ وتعمل بہ، وھو قول اللہ عزو جل: ﴿واما الذین فی قلوبھم زیغ فیتبعون ما تشابہ منہ ابتغاء الفتنۃ وابتغاء تأویلہ وما یعلم تأویلہ، الا اللہ والراسخون فی العلم یقولون 'امنا بہٖ کل من عند ربنا﴾ والراسخون فی العلم ھم ' آل محمد "،

قرآن مجید محکم اور متشابہ آیات پر مشتمل ہے، محکم سے مراد وہ آیت ہے جس پر ایمان لانا اور عمل کرنا ضروری ہے، اور متشابہ اس آیت کو کہتے ہیں جس پر صرف ایمان لانا ضروری ہوتا ہے مگر اس پر عمل نہیں کیا جاتا، اسی مطلب کو قرآن مجید میں اس طرح ذکر کیا گیا ہے (اور وہ لوگ کہ جن کے دلوں میں کجی ہے وہ متشابہ آیات کی پیروی فتنہ پردازی اور تاویل جوئی کی غرض سے کرتے ہیں، حالانکہ اس کی تاویل (اصل حقیقت) کوئی نہیں جانتا سوائے اللہ اور راسخون فی العلم کے، کہ جو کہتے ہیں کہ ہم اس (قرآن) پر ایمان لائے ہیں، سب کچھ ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے) اور " راسخون فی العلم" سے مراد ہم آل محمدؐ ہیں۔

مؤلفؒ: امامؑ کے فرمان کہ "رَاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ سے ہم آلِ محمدؐ مراد ہیں" کی وضاحت عنقریب ذکر کی جائے گی، انشاءاللہ تعالیٰ۔

ناسخ اور منسوخ کا فرق

تفسیر العیاشی میں مسعد بن صدقہ سے مروی ہے کہ میں نے حضرت امام ابوعبداللہ جعفر صادق علیہ السلام سے ناسخ و منسوخ اور محکم و متشابہ کے بارے میں پوچھا تو امامؑ نے ارشاد فرمایا:

" الناسخ الثابت المعمول بہٖ والمنسوخ ما قد کان یعمل بہٖ ثم جاء ما نسخہ، والمتشابہ ما اشتبہ علٰی جاھلہٖ "،

ناسخ اس آیت کو کہتے ہیں جو ثابت (قائم و باقی) ہو کہ جس پر عمل کرنا ضروری ہے اور منسوخ اس آیت کو کہتے ہیں جس پر عمل کیا جاتا رہا ہو اور بعد میں کوئی دوسری آیت اُسے منسوخ کر دے، اور متشابہ سے مراد وہ آیت ہے جس کا معنی اس شخص پر واضح نہ ہو جو اس سے ناآگاہ ہو،

(تفسیر العیاشی جلد ۱ ص ۱۱)

ایک روایت میں اس طرح مذکور ہے:

" الناسخ الثابت والمنسوخ ما مضٰی والمحکم ما یعمل بہٖ والمتشابہ ما یشبہ بعضہٗ بعضً "،

(ناسخ سے مراد ثابت و باقی اور منسوخ سے مراد سابق حکم ہے، محکم سے مراد وہ حکم ہے کہ جس پر عمل کیا جائے اور متشابہ سے مراد وہ آیت ہے جو ایک دوسری سے ملتی جلتی ہو) (تفسیر العیاشی جلد ۱ صفحہ ۱۰)

کتاب کافی میں امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے ایک حدیث کے ضمن میں ارشاد فرمایا: منسوخ آیات، متشابہات میں سے ہیں۔ (کافی، جلد ۲ ص ۲۸)

متشابہ و محکم کی بابت رہنمائی

کتاب عیون اخبار الرضاؑ میں مذکور ہے کہ امام علی رضا علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

"من رد متشابه القرآن الی محکمه هدی الی صراط مستقیم، (ثم قال:) ان فی اخبارنا متشابهاً کمتشابه القرآن، فردوا متشابهها الی محکمها، ولا تتبعوا متشابهها فتضلوا"،
(جو شخص قرآن کی متشابہ آیات کو اس کی محکم آیات کی طرف پلٹائے وہ سیدھی راہ کی طرف ہدایت پا گیا، (پھر ارشاد فرمایا) ہماری روایات میں بھی قرآنی آیات کی مانند متشابہات ہیں لہٰذا تم متشابہ روایات کو محکم روایات کی طرف پلٹاؤ، اور متشابہ روایات کی پیروی نہ کرو ورنہ گمراہ ہو جاؤ گے۔)

(عیون اخبار الرضاؑ، جلد ۱ ص ۲۹۰)

مذکورہ بالا روایات جیسا کہ آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں متشابہات کی تفسیر و توضیح میں قریب المعنی ہیں اور ان سے اس سابقہ بیان کی تائید و تصدیق ہوتی ہے جس میں ہم نے ذکر کیا کہ تشابہ کا دور ہونا ممکن ہے اور وہ اس طرح کہ متشابہ کو محکم کی طرف پلٹایا جائے تو اس کا معنی واضح ہو سکتا ہے۔ گویا محکم سے متشابہ کی تفسیر ملتی ہے، اور جہاں تک منسوخ آیات کے متشابہات سے ہونے کا تعلق ہے تو وہ بھی اسی طرح سے ہے چنانچہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ متشابہ کو اس لحاظ سے متشابہ کہا جاتا ہے کہ اس سے بظاہر ایسا لگتا ہے کہ اس میں مذکور حکم ابھی تک باقی و قائم ہے اور ہمیشہ نافذ العمل رہے گا جبکہ ناسخ آیت کے ذریعے معلوم ہوتا ہے کہ متشابہ آیت میں پایا جانے والا حکم ہمیشہ کے لئے نہ تھا بلکہ اس کا وقت ختم ہو گیا ہے۔ اور جہاں تک امام رضاؑ کے اس ارشاد گرامی کا تعلق ہے کہ "ہماری روایات میں بھی قرآنی آیات کی مانند متشابہات پائی جاتی ہیں اور قرآنی محکمات کی طرح محکم روایات بھی موجود ہیں" تو اس سلسلہ میں آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے کثیر روایات منقول ہیں کہ جن میں اسی مطلب کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ عقلی تائید بھی موجود ہے کیونکہ روایات شریفہ دراصل قرآنی آیات مبارکہ میں ذکر کئے گئے مطالب ہی پر مشتمل ہیں اور وہ قرآنی معارف و مطالب کے علاوہ کسی چیز کو بیان ہی نہیں کرتیں، متشابہات کی وضاحت کے ضمن میں ہم نے اس بات کو واضح طور پر بیان کیا ہے کہ "تشابہ" اس معنی کے اوصاف میں سے ہے جس پر لفظ دلالت کرتا ہے اور وہ اس طرح کہ اس کی صورت ایسی ہو جس سے مقصودہ معنی اور غیر مقصودہ معنی دونوں سمجھے جا سکتے ہوں ..... وہ معنی مقصود اور غیر مقصود دونوں پر منطبق ہو سکتا ہو...... لہٰذا تشابہ، لفظ کے اوصاف میں سے نہیں کہ اس کی حیثیت غرابت و اجمال جیسی ہو کہ جس سے لفظ کی دلالت ہی واضح طور پر معلوم نہیں ہوتی، ایسا ہرگز نہیں، اور نہ ہی لفظ و معنی دونوں سے بالاتر و وسیع تر امر کے اوصاف میں سے ہے کہ جسے اوصاف الاعم من اللفظ والمعنیٰ کہا جاتا ہے۔

اس مطلب کو دوسرے لفظوں میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ جن آیات کو متشابہات کہا جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے بیانات معارف حقۂ الٰہیہ کی نسبت مثالوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور یہی بات بعینہ روایات میں بھی پائی جاتی ہے لہٰذا ان میں بھی اسی طرح محکم اور متشابہ روایتیں موجود ہیں جس طرح قرآن مجید میں ہیں، چنانچہ حضرت پیغمبر اسلامؐ سے مروی

ہے آپ نے ارشاد فرمایا: (انا معاشر الانبیاء نکلم الناس علیٰ قدر عقولھم) ہم گروہِ انبیاء، لوگوں سے ان کی عقلوں کے مطابق کلام کرتے ہیں۔

قرآن اور معرفت الٰہی

تفسیر العیاشی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت مذکور ہے کہ آپؑ نے اپنے پدر بزرگوار حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے حوالہ سے بیان فرمایا کہ کسی شخص نے حضرت امیر المومنینؑ سے گزارش کی کہ آیا ممکن ہے کہ آپ ہمارے سامنے ہمارے رب کی اس طرح توصیف کریں کہ اس کی بابت ہماری محبت و معرفت میں اضافہ ہو جائے؟

امیر المؤمنینؑ سخت غضبناک ہوئے اور لوگوں سے مخاطب ہوئے اور اس شخص کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"علیک یا عبداللّٰہ بما دلک علیہ القرآن من صفتہٖ، وتقدمک فیہ الرسول من معرفتہٖ، واستضیٔ من نور ھدایتہٖ فانما ھی نعمۃ اوتیتھا، فخذما اوتیت وکن من الشاکرین، وما کلفک الشیطان علیہ ممالیس علیک فی الکتاب فرضہ، ولا فی سنۃ الرسول وائمۃ الھدیٰ امرہ فکل علمہ الی اللہ، ولا تقدر عظمۃ اللّٰہ، واعلم یا عبداللّٰہ: ان الراسخین فی العلم الذین اختارھم اللّٰہ عن الاقتحام فی السدد المضروبۃ دون الغیوب فلزموا الاقرار بجملۃ ما جھلوا تفسیرہٗ من الغیب المحجوب، فقالوا 'امنا بہٖ کل من عند ربنا، وقد مدح اللّٰہ اعترافھم بالعجز عن تناول مالم یحیطوا بہٖ علماً، وسمی ترکھم التعمق فیما لم یکلفھم البحث عنہ منھم رسوخاً فاقتصر علیٰ ذلک ولا تقدر عظمۃ اللّٰہ علیٰ قدر عقلک فتکون من الھالکین"۔

اے بندۂ خدا! تو انہی مطالب کی طرف توجہ رکھ جو قرآن مجید نے تیرے لئے خدا کی صفات کی بابت واضح طور پر بیان کئے ہیں اور تجھ سے پہلے حضرت پیغمبر اسلامؐ نے معرفت پروردگار کے سلسلہ میں پیش کئے ہیں (آنحضرتؐ اس حوالہ سے تجھ سے مقدم ہیں) اور تو آنحضرتؐ کے نورِ ہدایت کی ضیاء پاشیوں سے بہرہ ور ہو کہ ان کی رہنمائی ایک نعمت اور خزانۂ حکمت و دانائی ہے جو تجھے عطا کیا گیا ہے، تو جو کچھ عطا کیا جا چکا ہے اسے کافی سمجھ اور اس پر شکر گزاری کا فریضہ ادا کر، اور شیطان نے تجھے جس بات پر لگا دیا ہے اس کی بابت قرآن مجید نے تجھ پر کوئی فریضہ عائد نہیں کیا اور نہ ہی سنتِ نبویؐ و سیرتِ آئمہ ہدیٰؑ میں اس کی بابت کوئی حکم یا فرمان موجود ہے لہٰذا شیطان کے دھوکہ میں نہ آ، اور اس سلسلہ میں حقیقی علم خود خدا ہی پر واگزار کر دے اور خدا کی عظمت کے بارے میں کسی قسم کی اندازہ گیری کرنے کا اقدام نہ کر، اور آگاہ رہ اے بندۂ خدا! کہ رَاسِخُوْنَ فِی

الْعِلْمِ وہ ہستیاں ہیں کہ جنہیں اللہ تعالیٰ نے ماورائے پردۂ غیب امور کی گہرائیوں میں پڑنے سے بے نیاز کردیا ہے لہٰذا وہ غیب کے دبیز حجابوں میں چھپی حقیقتوں کی تفسیر سے ناآگاہی پر اپنی لاعلمی کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے بارے میں برملا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے ہیں، سب کچھ ہمارے پروردگار کی طرف سے آیا ہے (اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ) ، خداوندعالم نے ان کے اس فضیلتی کمال کی تعریف وستائش کی اور اسے سراہا کہ انہوں نے اپنے دائرۂ علم سے باہر کے امور پر عدم دسترس کا اعتراف کیا ہے اور غیر متعلقہ امور کی گہرائی میں جانے سے اجتناب برتنے کو سراہتے ہوئے اسے ''رسوخ''، یعنی علمی گہرائی سے موسوم کیا ہے بنابرایں تو بھی اسی پر اکتفا کر اور اس سلسلہ میں اپنی عقل کے گھوڑے دوڑا کر عظمت خداوندی کی بلندیوں کو پانے کی کوشش نہ کر ورنہ تباہ و برباد ہونے والوں میں قرار پائے گا۔

(تفسیر العیاشی جلد ا ص ۱۶۳)

روایت کی تشریح

امامؑ کا ارشاد گرامی :''**واعلم یا عبدالله ان الراسخین فی العلم**'' اس امر کا عکاس ہے کہ آیۂ مبارکہ میں خداوندعالم کے فرمان : ''وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ...'' میں حرف واو عطف کے لئے نہیں بلکہ استیناف یعنی نئے جملہ کی ابتداء کا معنی دیتا ہے جیسا کہ ہم نے آیۂ مبارکہ کے بیان میں اسی معنی کا استظہار کیا ہے، اور حرف ''واو'' کا مستأنفہ ہونا اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ آیت کے ظاہری الفاظ سے اس مطلب کی تائید نہیں ہوتی کہ راسخون فی العلم تاویل الکتاب کا علم رکھتے ہیں نہ یہ کہ ان سے اس مطلب کا اشارہ ملتا ہے کہ ان کی بابت تأویل الکتاب کا عالم ہونا ممکن ہی نہیں، بنابرایں اگر کوئی دوسری دلیل راسخین فی العلم کے بارے میں ان کا تأویل الکتاب...... یا تأویل متشابہات...... سے آگاہ ہونا ثابت کردے تو اس سے آیۂ مبارکہ کی نفی کا پہلو پیدا نہ ہوگا، جیسا کہ آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ راسخون فی العلم، تأویل الکتاب سے آگاہی رکھتے ہیں......

اور امامؑ کا ارشاد گرامی : "**الذین اختارهم اللّٰه ......اغناهم الله ..... عن الاقتام فی السدد المضروبة دون الغیب**" (راسخون فی العلم وہ ہستیاں ہیں کہ جنہیں اللہ تعالیٰ نے ماوراء پردۂ غیب امور کی گہرائیوں میں پڑنے سے بے نیاز کردیتا ہے) دراصل جملہ کی ابتداء میں ذکر کئے جانے والے حرف ''ان'' کی خبر ہے (''ان'' مبتداء اور یہ جملہ اس کی خبر ہے)، اور پورا کلام بظاہر اس طرح ہے کہ اس میں مخاطب کو ترغیب دلائی جارہی ہے کہ وہ بھی راسخون فی العلم کی روش کو اپناتے ہوئے ان امور کی بابت اپنی ناآگاہی کا اعتراف کرے جن کا اسے علم حاصل نہیں تاکہ اس کا شمار بھی رَاسِخُوْنَ فِي

الْعِلْمِ ہستیوں میں ہو، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت امیر المومنینؑ نے "راسخون فی العلم" کی تفسیر اس طرح کی کہ اس سے ہر وہ شخص مراد ہے جو ہر اس چیز کی پیروی کرے جس سے آگاہ ہو اور جس چیز سے ناآگاہ ہو اس کی طرف دست دراز کرنے سے اجتناب کرے،

اور امامؑ کے ارشاد گرامی میں "ماورائے پردۂ غیب امور" سے متشابہات کے وہ معانی و مفاہیم مراد ہیں جو عام افراد کی نگاہِ فہم و ادراک سے پوشیدہ ہیں اسی وجہ سے امامؑ نے اس مطلب کو دوسرے لفظوں میں بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: **"فلزموا الاقرار بجملة ما جهلوا تفسيرهٗ "** کہ وہ جس چیز کی تفسیر سے ناآگاہ ہیں اس کی بابت اپنی لاعلمی کا اقرار کرتے ہیں، اس جملہ میں امامؑ نے تفسیر کا لفظ ذکر فرمایا تاویل کا لفظ ذکر نہیں کیا یعنی یوں نہیں کہا کہ وہ جس چیز کی تاویل سے آگاہی نہیں رکھتے اس کی بابت اپنی لاعلمی کا اقرار کرتے ہیں۔

تاویل الکتاب سے آگاہ ہستیاں

کتاب کافی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا:

" نحن الراسخون فی العلم و نحن نعلم تأویلهٗ "

ہم راسخون فی العلم ہیں اور ہم ہی تاویل الکتاب کا علم رکھتے ہیں، (کافی، جلد ا ص ۲۱۳)

اگرچہ اس روایت سے بظاہر یہ سمجھا جاتا ہے کہ آیہ مبارکہ میں جملہ **"والراسخون فی العلم"** کا عطف، مستثنٰی پر ہے کہ جو جملہ "وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهٗ إِلَّا اللّٰهُ" میں مذکور ہے،...... یعنی آیت کا معنی یوں ہے: اور کوئی اس کی تاویل کا علم نہیں رکھتا سوائے اللہ کے اور راسخون فی العلم کے،...... لیکن سابقہ ذکر کئے گئے مطالب اور ان سے مربوط روایات کے تناظر میں اس خیال کی نفی ہوتی ہے۔ اور یہ بات قطعی بعید نہیں کہ "تاویل" سے وہی معنی مراد ہو جو متشابہ کا کیا جاتا ہے کیونکہ تاویل کا یہ معنی کہ جو متشابہ کے معنی سے ہم رنگ اور گویا اس کی تفسیر ہے وہ صدرِ اسلام میں لوگوں کے درمیان عام رائج تھا۔

اور جہاں تک امامؑ کے اس فرمان کا تعلق ہے کہ **"نحن الراسخون فی العلم"** (ہم راسخون فی العلم ہیں) تو اس حوالہ سے تفسیر العیاشی کی سابق الذکر روایت میں بھی امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا: **"والراسخون فی العلم هم 'ال محمد"** (راسخون فی العلم، آل محمدؐ ہی ہیں)۔ اس طرح کی دیگر روایات کہ جو اس باب میں منقول ہیں ان میں بھی اس طرح کے الفاظ مذکور ہیں اور وہ تمام روایات دراصل جری و تطبیق کے باب سے ہیں یعنی کلی

معنی کی اس کے مصداق پر تطبیق کی ایک صورت ہے، چنانچہ اس کے شواہد سابق الذکر روایات میں موجود ہیں اور آئندہ ذکر کی جانے والی روایات میں بھی واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔

امام موسیٰ کاظمؑ کا عالمانہ وعارفانہ ارشاد

کتاب کافی میں ہشام بن حکم سے روایت کی گئی ہے انہوں نے کہا کہ امام ابوالحسن موسیٰ بن جعفرؑ نے اپنے ایک بیان کے ضمن میں ارشاد فرمایا: اے ہشام! اللہ تعالیٰ نے ایک نیک وصالح قوم کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اس قوم کے افراد نے کہا: "رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْوَهَّابُ ۝" (اے ہمارے پروردگار! ہمارے دلوں میں کجی نہ آنے دے بعد اس کے کہ تونے ہمیں ہدایت کی ہے اور ہمیں اپنی طرف سے رحمت عطا فرما کہ بے شک تو ہی عطا کرنے والا ہے)، ان کی اس دعا سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس امر سے آگاہ ہو گئے تھے کہ دلوں میں کجی پیدا ہونے کا امکان پایا جاتا ہے اور یہ بات ممکن ہوتی ہے کہ وہ اپنے اندھے پن اور ہلاکت کی راہ پر پلٹ جائیں۔ یہ بات یقینی ہے کہ وہ شخص خدا سے ہرگز خوف نہیں کھاتا جس کا دل خدا کی طرف سے مہار نہ ہوا ہو، اور جس کا دل خدائی توفیق سے مہار نہ ہوا ہو وہ معرفت کی مضبوط منزل کو نہ پاسکے گا اور معرفت کے جس مقام کا مشاہدہ کرے گا اسے اپنے دل میں نہ اتار پائے گا۔ یعنی جس قدر بھی معرفت حاصل کرے گا وہ ناکافی و بے اثر و بے نتیجہ ہوگی کیونکہ وہ اسے اپنے دل کی گہرائی میں نہ اتار سکے گا، اور کوئی شخص اس طرح معرفت کی بلندی و بلند مرتبہ ومقام کو اپنے دل کی گہرائی میں نہ اتار سکے گا سوائے اس کے کہ جس کا قول اس کے عمل کی تصدیق کرتا ہو اور اس کا باطن اس کے ظاہر سے مطابقت وہم رنگی رکھتا ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی شخص کی عقل کے باطنی مدارج ودرجات کو صرف اسی حد تک آشکار کرتا ہے جس قدر اس کے ظاہر سے اس کی ترجمانی ہوتی ہو، گویا کسی شخص کے ظاہر سے اس کے باطن کی نشاندہی ہوتی ہے اور اس کے ظاہر کے مراتب ودرجات ہی اس کے باطنی مدارج ودرجات کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

(کافی ج ۱ حدیث ۱۲)

امامؑ کا ارشاد گرامی "وہ شخص خدا سے ہرگز خوف نہیں کھاتا جس کا دل خدا کی طرف سے مہار نہ ہوا ہو" دراصل اس آیت مبارکہ کا معنیٰ وتفسیر ہے جس میں ارشاد الٰہی ہے: " إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ ۗ " (سورۂ فاطر آیت ۲۸) کہ اس کے بندوں میں سے صرف وہی خشیت الٰہی دل میں رکھتے ہیں جو علماء ہیں)،

اور امام کا ارشاد گرامی " جس کا دل خدائی توفیق سے مہار نہ ہوا ہو " دراصل "رَاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ" کا نہایت

خوبصورت معنیٰ وتفسیر ہے کیونکہ جو بات صحیح اور پورے طور پر لوحِ عقل پر ثبت نہ ہو جائے اس کی بابت ہر طرح کے احتمال کی گنجائش باقی رہتی ہے اور اس کے بارے میں دل اضطراب وعدم اطمینان سے دوچار رہتا ہے لیکن اگر وہ لوح عقل پر ثبت ہو جائے جس طرح نقش برسنگ ہوتا ہے اور چشم دل اس کے جمال حقیقت پر جم جائے تو پھر اس کی بابت عملی پیروی کا جذبہ عروج وکمال کو پہنچ جاتا ہے کہ نفسانی خواہشیں اس کے برعکس کسی راہ پر لانا چاہیں تو نہیں لاسکتیں بلکہ جو کچھ دل میں ہوتا ہے وہی عملی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے اور زبان پر جو کچھ آتا ہے وہ دل میں موجود حقیقت ہی کا ترجمان ہوتا ہے، گویا قول و فعل میں کامل مطابقت پائی جاتی ہے،

اور امامؑ کا ارشاد گرامی "کوئی شخص اس طرح معرفت کی بلندی کو اپنے دل کی گہرائی میں نہ اتار سکے گا ..." دراصل "**رسوخ فی العلم**" کی علامت ونشانی کے معنی کی وضاحت ہے۔

"رَاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ" کے بارے میں حدیثِ نبویؐ

تفسیر دُرِّمنثور میں مذکور ہے کہ ابن جریر، ابن ابی حاتم، طبرانی بحوالہ انس، ابوامامہ، واثلہ بن اسقف اور ابودرداء سے مروی ہے کہ ایک شخص نے حضرت پیغمبر اسلامؐ سے "رَاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ" کے بارے میں سوال کیا تو آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا جو شخص اپنی قسم پر پورا اترتا ہو، اس کی زبان پر ہمیشہ سچ آتا ہو، اس کا دل مضبوط واستقامت آشنا ہو (ہر طرح کی کجی سے پاک وماوراء ہو) اس کا شکم اور شرمگاہ عفت شعار ہو تو اس طرح کے افراد "راسخون فی العلم" میں شمار ہوتے ہیں۔

(تفسیر درمنثور ج ۲ ص ۷)

اس حدیث کی توجیہ وتاویل سابق الذکر حدیث کے معنی کی طرف بازگشت کے ذریعے ممکن ہے، یعنی اگر اس حدیث سے مرادی معنی کو سمجھنا ہو تو سابقہ حدیث کے معنی کی طرف رجوع کر کے اس کے تناظر میں اس کا معنی واضح ہو سکتا ہے۔

"رَاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ" کی پہچان

کافی میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا:

" ان الراسخين في العلم من لا يختلف في علمه"

(راسخون فی العلم وہ ہیں جن کے علم میں اختلاف پیدا نہیں ہوتا)۔

(کافی، جلد اول، ص ۲۴۵)

یہ روایت، زیر نظر آیہ مبارکہ پر منطبق ہوتی ہے ...... اس کے معنی سے مطابقت کی حامل ہے...... کیونکہ آیت میں "رَاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ" کا ذکر ان افراد سے تقابلی صورت میں ہوا ہے جن کے بارے میں ارشاد ہوا: "الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ......" (وہ لوگ کہ جن کے دلوں میں کجی ہے......) بنابرایں رسوخ فی العلم سے مراد یہ ہوگا کہ کوئی اہل علم، اختلاف اور تردد کا شکار نہیں ہوتا۔

پیغمبرِ اسلامؐ کی دعا

تفسیر درمنثور میں مذکور ہے کہ ابن ابی شیبہ، احمد، ترمذی، ابن جریر، طبرانی اور ابن مردویہ نے ام سلمہ سے روایت بیان کی کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ اکثر اس طرح دعا کرتے تھے:

اللهم مقلب القلوب ثبت قلبي علىٰ دينك:

(اے اللہ، اے دلوں کو پھیر دینے والے! میرے دل کو اپنے دین پر قائم رکھ)۔

ام سلمہ نے کہا کہ میں نے آنحضرتؐ کی خدمت میں عرض کی:

يا رسول الله وان القلوب لتنقلب ؟

اے رسولِ خدا! کیا دل بھی منقلب ہوتے ہیں؟

حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ارشاد فرمایا:

نعم، ما خلق الله من بشر من بني ادم الا وقلبهٗ بين الاصبعين من اصابع الله فان شاء اقامهٗ وان شاء ازاغهٗ،

ہاں، خداوند عالم نے بنی نوع آدم میں جس بشر کو بھی پیدا کیا اس کا دل اپنی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان قرار دیا کہ اگر چاہے تو اسے سیدھا رکھے اور اگر چاہے تو اسے ٹیڑھا کردے،

(تفسیر درمنثور جلد ۲ ص ۸)

مذکورہ بالا مطلب متعدد روایات میں متعدد صحابہ کرام کے حوالوں سے ذکر ہوا ہے کہ جن میں جابر، نواس ابن

شمعان، عبداللہ بن عمر اور ابو ہریرہ شامل ہیں، اس سلسلہ میں مشہور بات وہی ہے جو نواس ابن شمعان کی روایت میں مذکور ہے کہ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا: **قلب ابن 'ادم بین اصبعین من اصابع الرحمان** ،(ابن آدم کا دل رحمان کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان قرار دیا گیا ہے)۔ انہی الفاظ پر مشتمل ایک روایت (جہاں تک مجھے یاد ہے) شریف رضی مرحوم نے کتاب" **المجازات النبویه** " میں ذکر کی ہے۔

وحی کے بارے میں حضرت علیؑ کا فرمان

حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے کہ آپؑ سے پوچھا گیا:

هل عندکم شیئ من الوحی؟

کیا آپ کے پاس وحی میں سے کچھ ہے؟

امامؑ نے ارشاد فرمایا:

لا، والذی فلق الحبة و برء النسمة الا ان یعطی اللّٰه عبداً فهماً فی کتابه ؟

نہیں، مجھے قسم ہے اس ذات کی جس نے دانہ کو شگافتہ کیا، لوگوں کو خلق فرمایا کہ اللہ ہی ہے جو کسی بندے کو اپنی کتاب کا فہم عطا کرتا ہے۔

(کتاب صافی جلد اول ص ۱۹)۔

یہ حدیث، مبارک و مقدس احادیث شریفہ میں ایک گوہر بیش بہا کی حیثیت رکھتی ہے اور اس سے کم از کم یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ حضرت امیر المؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام نے جن بلند پایہ علوم و معارف کے دریا بہائے اور جن محیر العقول مطالب کے جواہر، عالم انسانی کے سامنے پیش کئے ان سب کا سرچشمہ قرآن کریم ہے اور آپؑ نے قرآن ہی سے وہ سب کچھ حاصل کیا ہے۔

ارشاداتِ نبویؐ، ہدایت و رہنمائی کی قندیلیں !

کتاب کافی میں مذکور ہے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے پدر بزرگوار کے حوالہ سے ذکر کیا کہ انہوں نے اپنے آباء کرام کے حوالہ سے بیان فرمایا کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ارشاد فرمایا ہے:

"یا ایھا الناس، انکم فی دار ھدنۃ، وانتم علیٰ ظھر سفر، والسیر بکم سریع، وقد رأیتم اللیل والنھار والشمس والقمر یبلیان کل جدید، ویقربان کل بعید، ویأتیان بکل موعود، فاعدوا الجھاز لبعد المجاز"۔

اے لوگو! تم دار الہدنہ میں ہو، اور تم عالم سفر میں ہو، تمہارا سفر نہایت تیزی سے طے ہو رہا ہے، اور تم رات دن، سورج اور چاند کو دیکھ رہے ہو کہ وہ ہر جدید و تازہ کو کہنہ و بوسیدہ کر رہے ہیں اور ہر دور کو نزدیک کر رہے ہیں اور جس چیز کا وعدہ ہو چکا ہے اسے پورا کر رہے ہیں لہٰذا اس طولانی سفر کہ جس کی منزل بہت دور ہے اپنے آپ کو متاعِ سفر سے لیس کرو،

(کافی، جلد ۲ حدیث ۲)

راوی کا کہنا ہے کہ جب آنحضرتؐ نے مذکورہ بالا مطلب بیان فرمائے تو جناب مقداد بن اسود کھڑے ہو گئے اور پوچھا: یارسول اللہ! وما دار الھدنۃ؟ دار الھدنۃ سے کیا مراد ہے؟

فقالؐ: دار بلاغ و انقطاع، فاذا التبست علیکم الفتن کقطع اللیل المظلم فعلیکم بالقرآن فانہٗ شافع مشفع، وماحل مصدق، ومن جعلہٗ امامہٗ قادہٗ الی الجنۃ، ومن جعلہٗ خلفہٗ ساقہٗ الی النار، وھو الدلیل یدل علیٰ خیر سبیل، وھو کتاب فیہ تفصیل وبیان و تحصیل، وھو الفصل لیس بالھزل، ولہٗ ظھر و بطن، فظاھرہ حکم وباطنہٗ علم، ظاھرہٗ انیق و باطنہٗ عمیق، لہٗ تخوم وعلیٰ تخومہٖ تخوم، لا تحصیٰ عجائبہ، ولا تبلیٰ غرائبہٗ، فیہ مصابیح الھدیٰ ومنار الحکمۃ، ودلیل علی المعرفۃ لمن عرف الصفۃ، فلیجل جال بصرہ، ولیبلغ الصفۃ نظرہٗ، ینج من عطب ویخلص من نشب، فان التفکر حیوٰۃ قلب البصیر کما یمشی المستنیر فی الظلمات، فعلیکم بحسن التخلص وقلۃ التربص،......

حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ارشاد فرمایا: اس سے مراد یہ ہے کہ وہ صرف پہنچنے اور چھوڑ جانے کا گھر ہے (وہاں پہنچو اور پھر وہاں سے چلے جاؤ)، پس جب فتنے تاریک رات کے ٹکڑوں کی طرح تم پر ٹوٹ پڑیں تو اس وقت تم قرآن سے تمسک اختیار کرو کہ وہ شفاعت کرنے والا ہے کہ جس کی شفاعت قبول ہوگی، وہ اس قدر مضبوط بنیاد پر قائم ہے کہ جس کی تصدیق کئے بغیر رہا نہیں جا سکتا، جس نے اسے اپنا امام و پیشوا قرار دیا تو وہ اسے بہشت کی راہ پر لا کھڑا کرے گا اور جس نے اسے پس پشت ڈال دیا تو وہ اسے جہنم میں دھکیل دے گا۔ وہ ایسا رہنما ہے جو بہترین راستہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے وہ ایسی کتاب ہے کہ جس میں حق اور باطل کے درمیان تمیز کر دی گئی ہے، اس میں سب کچھ بیان کر دیا گیا ہے اور سب کچھ اس سے حاصل ہو سکتا ہے۔ وہ حق و باطل کے درمیان جدائی کرنے والا ہے (حق کو باطل سے الگ کرنے والا ہے) اس میں کوئی بات بے مقصد نہیں، اس کا

ظاہر بھی ہے اور باطن بھی، اس کا ظاہر حکم وفرمان اور اس کا باطن علم وعرفان ہے، اس کا ظاہر نہایت خوبصورت ودلربا اور اس کا باطن نہایت عمیق ہے، اس کی حدیں ہیں اور پھر ہر حد کی کئی حدیں ہیں، اس کی شگفت انگیزیاں قابل شمار نہیں اور اس کے گراں قدر حقائق کبھی پرانے نہیں ہوتے، اس میں ہدایت کی قندیلیں ہیں اور حکمت ودانائی کے روشن مینار ہیں۔ وہ ہر نکتہ سنج کے لئے رہنمائے معرفت ہے، بنابرایں ہر بابصیرت شخص کو چاہیے کہ اس کے معارف وحقائق حاصل کرنے کے لئے اپنی نگاہِ حق شناس اس پر جمادے اور اس سے کسب فیض کرنے کی آخری حد کو پہنچ جائے، وہ ہر پاک دل وپاک دامن شخص کا نجات دہندہ ہے اور فکر ونظر کے نشیبوں میں گھرے شخص کا چارہ گر ہے، غور وفکر کی قوتوں سے کام لینا ہی ہر بابصیرت انسان کے دل کی حیات ہے، ظلمتوں اور تاریکیوں میں ڈوبے ہوئے اس شخص کو نشانِ منزل بتاتا ہے جو روشنی کی تلاش میں محو ومنہمک ہو، لہٰذا تم پر لازم ہے کہ حسنِ اخلاص کو اپناتے ہوئے قرآن سے تمسک اختیار کر کے ظلمتوں سے چھٹکارا پاؤ اور خیالات کی دنیا میں گھومنا کم کردو،

اس روایت کو تفسیر العیاشی میں بھی ذکر کیا گیا ہے البتہ صرف جملہ "فـلـیـجـل جـال" تک!، (ملاحظہ ہو: تفسیر العیاشی جلد اول حدیث ۱)

قرآن کی صفات وفضائل

کتاب کافی اور تفسیر عیاشی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے بیان کیا کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ارشاد فرمایا ہے:

" الـقـرآن هـدىً مـن الـضـلالة، وتبيان من العمى، واستقالة من العثرة، ونور من الظلمة، وضيـاء مـن الـاحداث، وعصمة من الهلكة، ورشد من الغواية، وبيان من الفتن، وبلاغ من الدنيا الى الآخرة، وفيه كمال دينكم، وما عدل احد من القرآن الا الى النار"،

قرآن، ضلالت وگمراہی سے نجات دلانے والا ہادی ورہنما ہے، باطل کے اندھیرے سے نکال کر حق کی راہ دکھانے والا ہے، لغزشوں سے بچا کر سہارا دینے والا ہے، ظلمتوں میں نور، حوادثِ روزگار میں مینارۂ روشنی، ہلاکتوں وتباہیوں میں نجات کا واحد مرکز، گمراہی وکجروی میں سیدھی راہ دکھانے والا، فتنوں میں بچاؤ کے طریقے بتانے والا، دنیا سے۔۔۔صحیح طور پر اور سیدھی راہ پر لاکھڑا کر کے۔۔۔آخرت تک پہنچانے والا ہے، اس میں تمہارے دین کا کمال پایا جاتا ہے، جو شخص قرآن سے روگردانی کرے اس کا ٹھکانہ جہنم کی آگ کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

(کافی، جلد ۲ ص ۶۰۰ حدیث ۸، تفسیر العیاشی جلد ۱ ص ۵ حدیث ۸)

مذکورہ بالا مطالب پر مشتمل روایات واحادیث کثرت کے ساتھ وارد ہوئی ہیں اور حضرت پیغمبر اسلامؐ اور آئمہ اہل بیت علیہم السلام کے ارشادات میں اس طرح کے معارف بہت زیادہ پائے جاتے ہیں۔

حدیث نبویؐ کی تشریح بزبان امام محمد باقرؑ

تفسیر العیاشی میں فضیل بن یسار سے مروی ہے انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت امام ابوجعفر محمد باقر علیہ السلام سے حضرت پیغمبر اسلامؐ کے ارشاد گرامی: "**مافی القرآن آیة الا ولها ظهر وبطن، ومافیه حرف الا ولهٗ حد ولکل حد مطلع**" کا مطلب دریافت کیا (یعنی: قرآن مجید کی ہر آیت کا ایک ظاہر اور ایک باطن ہے، اور اس کے ہر حرف کی ایک حد ہے اور ہر حد کا مطلع وجلوہ گاہ ہے) اس میں آنحضرتؐ نے قرآنِ مجید کے ظاہر و باطن سے کیا مراد لیا ہے؟

امامؑ نے ارشاد فرمایا:

"**ظهرهٗ تنزيله و بطنهٗ تأويلهٗ، منه ما مضٰى ومنه مالم يكن بعده، يجرى كما يجرى الشمس والقمر، كلما جاء منه شيئ وقع، قال الله: وما يعلم تأويلهٗ الا الله والراسخون فى العلم، نحن نعلمهٗ**"

اس کے ظاہر سے مراد اس کے وہ الفاظ ہیں جو نازل ہوئے ہیں اور اس کے باطن سے مراد اس کے حقیقی معانی ہیں کہ جن میں سے کچھ وجود پذیر ہو چکے ہیں اور بعض کا وجود پذیر ہونا ابھی باقی ہے۔ وہ سورج اور چاند کی گردشوں کی طرح رواں دواں رہتا ہے کہ اس کی ہر چیز وقوع پذیر ہو جاتی ہے۔ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے کہ "اس کے حقیقی معانی سے کوئی آگاہی نہیں رکھتا سوائے اللہ اور راسخون فی العلم کے"۔ اور وہ ہم (اہل بیتؑ) ہیں جو اس سے آگاہی رکھتے ہیں،

(تفسیر العیاشی جلد اول ص ۱۱ حدیث ۵)

اس روایت میں انہی مطالب کو ذکر کیا گیا ہے جو اہل سنت کی کتب میں حضرت پیغمبر اسلامؐ کی بیان کردہ حدیث شریف میں مذکور ہیں لیکن اس فرق کے ساتھ کہ اس حدیث اور اس روایت کے الفاظ مختلف ہیں جبکہ معنی ایک ہے جیسا کہ تفسیر صافی جلد اول ص ۱۸ میں حضرت پیغمبر اسلامؐ سے منقول ہے آپؐ نے ارشاد فرمایا: **ان للقر ان ظهراً و بطناً وحداً و مطلعاً** ،......قرآن کا ظاہر بھی ہے اور باطن بھی، اور اس کی حد بھی ہے اور مطلع بھی (انتہاء بھی ہے اور ابتداء بھی)، اسی کتاب میں......یا اسی سلسلہ بیان میں......آنحضرتؐ سے یہ کلمات بھی منقول ہیں: **ان للقرآن ظهراً وبطناً الٰى سبعة**

ابطن، قرآن کا ایک ظاہر اور ایک باطن ہے وراس کے باطن کا بھی ایک باطن اور یہ سلسلہ سات باطنوں تک جاتا ہے،

آنحضرتؐ کے ارشاد گرامی "منه ما مضى و منه ما يأتى" میں ضمیر "ہ" کی بازگشت قرآن کی طرف ہے کیونکہ وہ تنزیل اور تاویل پر مشتمل ہے۔ (تنزیل یعنی ظاہری الفاظ اور تاویل یعنی حقیقی معانی) بناء برایں آنحضرتؐ کا ارشاد گرامی: (يجرى كما يجرى الشمس و القمر) ..... وہ سورج اور چاند کی گردشوں کی طرح رواں دواں رہتا ہے ....ان دونوں یعنی تنزیل و تاویل میں بھی یکساں و باہم جاری ہوتا ہے اور وہ اس طرح کہ تنزیل میں اس کا انطباق، "جری" کی بنیاد پر ہوتا ہے کہ جس کا معنی روایات کی اصطلاح میں یہ ہے کہ کسی کلی معنی کو اس کے مصادیق میں سے کسی ایک مصداق پر منطبق کیا جائے مثلاً سورۂ توبہ کی آیت ۱۱۹ (يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ ﴿۱۱۹﴾) میں جملہ "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا" (مؤمنین) کو ہر دور کے مؤمنین پر منطبق کرتے ہوئے کہا جائے کہ اس سے آیۂ مبارکہ کے نزول کے زمانہ کے مؤمنین اور بعد میں آنے والے ہر زمانہ کے مؤمنین مراد ہیں، تو یہ ایک قسم انطباق کی ہے، اور انطباق کی دوسری قسم کی مثال جہاد کے حکم پر مشتمل آیات کا جہاد بالنفس پر منطبق کرنا اور منافقین کے تذکرے پر مشتمل آیات کا مؤمنین سے فاسق افراد پر انطباق، (جہاد بالنفس مراد لینا اور منافقین سے فاسق مؤمنین مراد لینا) تو یہ بھی انطباق کی ایک قسم ہے جو کہ پہلی قسم سے زیادہ دقیق و باریک معنی کی حامل ہے۔ اور اس دوسری قسم سے زیادہ دقیق و گہرے معنی کی حامل قسم کی مثال یہ ہے کہ منافقین کے تذکرے پر مشتمل آیات اور گناہگاروں کے تذکرے پر مشتمل آیات کو ان لوگوں پر منطبق کیا جائے (ان سے وہ لوگ مراد لئے جائیں) جو مراقبہ، ذکر اور حضور القلب کے ساتھ خدا کو یاد کرتے ہیں کہ اگر وہ مراقبہ، ذکر اور حضور القلب کے ساتھ انجام دیئے جانے والے اعمال میں کوتاہی اور ذکر الٰہی میں تساہل و بے توجہی سے کام لیں تو گویا وہ گناہ و نفاق کے مرتکب ہوئے ہیں...... اور اس وجہ سے "منافقین" اور "مذنبین" (گناہگاروں) کا ایک مصداق کہلائیں گے......، اور اگر وہ افراد (اہل مراقبہ و ذکر وغیرہ) ذکر الٰہی میں کوتاہی و تساہل اور بے توجہی کا ارتکاب حق ربوبیت کی ادائیگی میں اپنی ذاتی خامی کی بناء پر کریں تو اس صورت میں آیات المنافقین اور آیات المذنبین (منافقوں اور گناہگاروں کے تذکرے پر مشتمل آیات) کا ان پر انطباق، سابق الذکر تمام اقسام سے زیادہ دقیق و گہرے معنی کا حامل ہوگا۔

(انطباق کی مذکورہ بالا چاروں قسمیں "جری" کہلاتی ہیں کہ جس سے آنحضرتؐ کے ارشاد گرامی (يجرى كما يجرى الشمس و القمر) کا معنی واضح طور معلوم ہو جاتا ہے۔

دواہم نکتے

مذکورہ بالاتمام مطالب سے دواہم نکتے ظاہر ہوتے ہیں:

(۱) قرآن مجید اپنے مرادی معانی کے گوناگوں مراتب ودرجات کا حامل ہے اوروہ درجات ومراتب افراد کے مقام ومنزلت کی بنیاد پراوراس کے حوالہ سے مختلف ہیں، اسی بناء پرارباب فکر ونظر نے ایمان اور ولایت کے معانی کی بابت جو بحثیں کی ہیں ان میں ان کے گوناگوں مراتب ودرجات کی تصویر کشی ہمارے ذکر کردہ مطالب سے کہیں زیادہ باریکیوں پر مشتمل ہے۔

(۲) ظاہر اور باطن دوایسے امور ہیں جو نسبت وحوالہ کے حامل ہیں اور وہ اس طرح کہ ہر ظاہر اپنے ظاہر کی نسبت، باطن ہے اور اپنے باطن کی نسبت ظاہر ہے، گویا نسبت کے لحاظ سے اس کی حیثیت کا تعین ہوسکتا ہے، چنانچہ یہی بات درج ذیل روایت سے بھی ظاہر ہوتی ہے، ملاحظہ ہو:

تفسیر العیاشی میں جابر سے روایت کی گئی ہے انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت امام ابوجعفر محمد باقر علیہ السلام سے بعض آیات قرآنیہ کی تفسیر دریافت کی تو امامؑ نے مجھے اپنے ارشادات سے فیض یاب فرمایا، اور پھر جب دوبارہ انہی آیات کے بارے میں تفسیر پوچھی تو امامؑ نے جو جواب دیا وہ پہلے جواب سے مختلف تھا، تو میں نے امامؑ کی خدمت میں عرض کی کہ میں آپؑ پر قربان جاؤں، آپؑ نے اسی سوال کے جواب میں اس سے پہلے جو کچھ ارشاد فرمایا تھا وہ اس سے مختلف تھا جو آج آپؑ نے فرمایا ہے؟ تو امامؑ نے ارشاد فرمایا:

یا جابر ان للقرآن بطناً وللبطن بطن، و ظهراً وللظهر ظهر، یا جابر ولیس شیئٌ ابعد من عقول الرجال من تفسیر القرآن، ان الآیة تکون اولها فی شیئٌ و اوسطها فی شیئٌ و آخرها فی شیئٌ وهو کلام متصل ینصرف علیٰ وجوه،

اے جابر! قرآن مجید کا ایک باطن ہے اور اس باطن کا بھی ایک باطن ہے، اور قرآن کا ایک ظاہر ہے اور اس ظاہر کا بھی ایک ظاہر ہے۔ اے جابر! تفسیر قرآن میں سے کوئی چیز بھی لوگوں کی عقلوں سے زیادہ دور نہیں، کیونکہ عین ممکن ہے کہ کسی آیت کا پہلا حصہ کسی چیز کے بارے میں ہو جبکہ درمیانی حصہ کسی دوسری چیز کے بارے میں ہو اور آخری حصہ کسی تیسری چیز کی بابت ہو، حالانکہ وہ سب کا سب ایک ہی کلام ہے کہ جس کے مختلف حصے ایک دوسرے سے متصل اور جڑے ہوئے ہیں اوران کی بازگشت گوناگوں صورتوں کی طرف ہوتی ہے۔

(تفسیر العیاشی جلداول ص ۱۲ حدیث ۸)

قرآن کی دائمی ہدایت

تفسیر العیاشی میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے ایک حدیث کے ضمن میں منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا:

"ولو ان الآیة اذا نزلت فی قوم ثم مات اولئک القوم ماتت الآیة لما بقی من القراٰن شیئ، ولکن القراٰن یجری اولہٗ علٰی اٰخرہٖ ما دامت السماوات والارض، ولکل قوم اٰیة یتلونھا ھم منھا من خیر او شر"،

قرآن مجید کی کوئی آیت کسی قوم کے بارے میں نازل ہوا اور اس قوم کے مرجانے کے بعد اگر وہ آیت بھی باقی نہ رہے تو قرآن میں سے کچھ بھی باقی نہ رہے گا، لیکن قرآن مجید تو ایسی کتاب ہے کہ جس کا پہلا حصہ اس کے آخری حصہ تک (اور عصر نزول سے لے کر بعد میں آنے والے ہر زمانہ تک) اس وقت تک قائم و دائم اور باقی رہنے والی ہے جب تک آسمانوں اور زمین کو بقاء حاصل ہے۔ اور قوم کے بارے میں ایک ... یا کئی آیات ... موجود ہیں کہ جن کی وہ تلاوت کرتے ہیں خواہ وہ ان کے خیر کا تذکرہ کرتی ہوں یا ان کے شر کو بیان کرتی ہوں۔

(تفسیر العیاشی جلد اول ص ۱۰ حدیث ۷)

قرآن کے ظاہر و باطن سے کون مراد ہیں ؟

کتاب معانی الاخبار میں حمران بن اعین سے روایت کی گئی ہے انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے قرآن کے ظاہر اور باطن کے بارے میں پوچھا تو امامؑ نے ارشاد فرمایا:

"ظھرہ الذین نزل فیھم القراٰن، وبطنہ الذین عملوا باعمالھم، یجری فیھم ما نزل فی اولئک"،

قرآن کے ظاہر سے وہ لوگ مراد ہیں جن کے بارے میں قرآن نازل ہوا ہے اور اس کے باطن سے مراد وہ لوگ ہیں جو انہی لوگوں کے اعمال جیسے اعمال بجالائیں کہ قرآن ان کے بارے میں بھی اسی حیثیت کا حامل ہوگا جو ان لوگوں کی

بابت ہے جن کے بارے میں نازل ہوا ہے،...... گویا دونوں کی بابت یکساں ہوگا،......،

(معانی الاخبار ص۲۵۹ حدیث۱)

ہر آیت کے چار معانی

تفسیر صافی میں حضرت علی علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا:

"ما من 'اية الا ولها اربعة معان: ظاهر و باطن و حد و مطلع، فالظاهر التلاوة، والباطن الفهم، والحد هو احكام الحلال و الحلال، والمطلع هو مراد الله من العبد بها"،

ہر آیت کے چار معانی ہیں: (۱) ظاہر (۲) باطن (۳) حد (۴) مطلع، ظاہر وہی الفاظ ہیں جن کی تلاوت کی جاتی ہے، باطن ان کا فہم اور سمجھنا ہے، حد سے مراد حلال وحرام کے احکام ہیں اور مطلع سے مراد وہ چیز ہے جسے خداوندِ عالم نے آیت کے ذریعے اپنے بندے سے چاہا ہے۔

(تفسیر صافی جلد اول ص۱۸)

تشریح وتوضیح

امامؑ کے ارشاد گرامی کہ" ظاہر سے مراد وہ الفاظ ہیں جن کی تلاوت کی جاتی ہے" سے مراد الفاظ کے ظاہری معنی ہیں کیونکہ امام علیہ السلام نے انہیں" معانی" میں شمار کیا ہے،

اور امامؑ کے اس فرمان کہ باطن سے مراد اس کا فہم اور سمجھنا ہے، اس سے مراد وہ معانی ہیں جو ظاہری معانی کے اندر پوشیدہ ہیں،

اور امامؑ کے فرمان کہ" حد" سے مراد حلال وحرام کے احکام ہیں، سے مراد وہ ظاہری معارف ہیں جو قرآن مجید سے عمومی طور پر سمجھے جاتے ہیں خواہ ابتدائی سطح فکر کے حامل افراد کے لئے ہوں یا درمیانی سطح فکر کے حامل افراد کے لئے ہوں، البتہ اس سے بالاتر و بلندترین سطح فکر کے افراد کے لئے جو مقام و مرتبہ ہے اسے" مطلع" سے تعبیر و موسوم کیا گیا ہے کہ وہ اپنی بلندیٔ فکر کی بنیاد پر قرآنی آیات سے عظیم ترین معارف کا ادراک کرتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ" حد" اور" مطلع" کے معانی

کی بابت یوں کہا جائے کہ وہ نسبت کے حامل افراد ہیں اوران کا حال اسی طرح ہے جیسے ''ظاہر'' اور''باطن'' کا ہے یعنی جس طرح ظاہر و باطن، نسبت کے حامل دو امور ہیں اسی طرح ''حد'' اور ''مطلع'' بھی نسبت کے حامل ہیں جیسا کہ اس سلسلہ میں پہلے ذکر کیے گئے مطالب سے واضح ہو چکا ہے، بنابرایں ہر بلند مرتبہ اپنے سے کم اور نچلے مرتبہ کی نسبت ''مطلع'' ہے، اس طرح ہر نچلا مرتبہ اپنے سے بلند مرتبہ کی نسبت ''حد'' کہلائے گا.....

'' مُطَّلَع '' م پر پیش، ط پر شدہ اور لام پر زبر کے ساتھ ''اطلاع'' سے اسم مکان ہے، یا اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے کہ م اور ل پر زبر اور ط پر سکون کے ساتھ ''طلوع'' سے اسم مکان ہے۔ (اطلاع کی جگہ یا طلوع کی جگہ)، امامؑ کے ارشاد گرامی کے مطابق اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آیت کے ذریعے اپنے بندے سے جس چیز کا ارادہ کیا ہے اور اسے اس سے چاہا ہے اسے '' مطلع '' کہتے ہیں۔

مذکورہ بالا چار امور کی بابت حضرت پیغمبر اسلامؐ کی مشہور و معروف حدیث میں بھی تذکرہ ہوا ہے چنانچہ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا:

"ان القر 'ان انزل علی سبعة احرف، لكل آية منها ظهر وبطن ولكل حد مطلع"۔

قرآن سات حروف پر نازل ہوا ہے اور ہر آیت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن، اور ہر آیت کی حد مطلع ہے،

ایک روایت میں اس طرح ذکر ہوا ہے "**ولكل حد و مطلع**" اور ہر آیت کی ایک حد اور ایک مطلع ہے۔

آنحضرتؐ کے ارشاد گرامی "**ولكل حد و مطلع**" کا معنی یہ ہے کہ آیت کے ظاہر و باطن میں سے ہر ایک کی ایک حد جو کہ مطلع بھی ہے کہ تلاوت کرنے والا اس پر نظر رکھتا ہے۔

یہ تو ہے حدیث کا ظاہری معنی، اور عین ممکن ہے کہ دوسری حدیث میں جو الفاظ ذکر کیے گئے ہیں یعنی "**وان لكل حد و مطلع**" ان کے معنی کی بازگشت بھی اسی ظاہری معنی کی طرف ہو اور اس طرح معنی کیا جائے کہ ان میں سے ہر ایک کی فی نفسہ ایک حد ہے اور ایک مطلع ہے کہ جو اس حد کا نقطۂ انتہاء ہے لہٰذا وہ آیت کی تاویل..... حقیقی معنی..... پر ناظر ہے، لیکن یہ معنی حضرت علیؑ کے ارشاد گرامی کہ جس میں آپؑ نے فرمایا "**مامن 'اية الا ولها اربعة معان......**" سے حاصلہ ظاہری معنی سے ہم رنگی و مطابقت نہیں رکھتا، البتہ ان دو معانی کے درمیان ہم رنگی صرف اس صورت میں پیدا ہو سکتی ہے کہ امامؑ کے ارشاد گرامی سے یہ مراد لیا جائے کہ ہر آیت کے چار لحاظ و حوالے ہیں کہ جن میں بعض کی دوسرے بعض کی طرف بازگشت بھی ممکن

ہے یعنی ایسا ہوسکتا ہے کہ ان میں سے کوئی ایک، دوسرے پر منطبق ہو جائے۔

بہر حال مذکورہ چار امور کے معانی کا خلاصہ یہ ہے کہ: ظہر القرآن سے مراد آیت کا وہ ظاہری معنی ہے جو بادی النظر میں سامنے آتا ہے (معلوم ہوتا ہے)، اور بطن القران سے مراد وہ معنی ہے جو ظاہری معنی کے اندر چھپا ہوا ہے خواہ وہ ایک معنی ہو یا زیادہ معانی ہوں اور خواہ ظاہری معنی سے قریب ہو یا دور ہو کہ اس ظاہری معنی اور باطنی معنی کے درمیان دیگر معانی بھی پائے جاتے ہوں اور "حد" سے مراد آیت کا اصل معنی ہے خواہ ظاہری ہو یا باطنی، اور "مطلع" سے مراد وہ معنی ہے جس سے "حد" نمودار ہوا اور وہ (مطلع) اس حد سے متصل اور جڑا ہوا ہے، (ان مطالب کی باریکیوں پر غور کریں)

قرآن اور سات حروف

فریقین شیعہ وسنی سے مروی ایک حدیث میں حضرت پیغمبر اسلام کا یہ ارشاد گرامی مذکور ہے: "انزل القرآن علی سبعة احرف"، کہ قرآن مجید سات حرفوں پر نازل ہوا ہے،.. ملاحظہ ہو تفسیر صافی جلد اول ص ۸ ۳، تفسیر در منثور جلد دوم ص ۷، سنن ابی داود جلد ۲ ص ۷۵ حدیث ۱۴۷۵)

اگر چہ یہ حدیث الفاظ میں مختصر فرق کے ساتھ ذکر کی گئی ہے لیکن اس کا معنی ومقصود بیشتر کتب میں منقول ہے اور جن روایات میں اسے ذکر کیا گیا ہے وہ سب قریب المعنیٰ ہیں اور شیعہ وسنی دونوں مکاتب فکر کے علماء نے اس کو ذکر کیا ہے؟ تاہم اس کے معنی کی بابت اہل علم حضرات کے درمیان شدید اختلاف پایا جاتا ہے یہاں تک کہ اس کے بارے میں پیش کئے جانے والے اقوال کی تعداد چالیس تک پہنچتی ہے۔ لیکن جو بات اس سلسلہ میں مسئلہ کو آسان کرتی ہے وہ یہ کہ جو روایات ذکر کی گئی ہیں خود انہی میں "سات حروف" (السبعة الاحرف) کی تفسیر موجود ہے اور ہم نے اسی کے سہارے اظہار خیال کیا ہے (ہمارے بیانات کی بنیاد اسی پر قائم ہوئی ہے) چنانچہ بعض روایات میں اس طرح ذکر ہوا ہے:

" نزل القرآن علی سبعة احرف: امر/ وز جرو ترغیب وترهیب وجدل و قصص و مثل"

قرآن سات حروف پر نازل ہوا ہے: (۱) امر (۲) نہی (۳) ترغیب (کسی کام کی طرف رغبت وتوجہ

دلانا)، (۴) ترہیب (گناہ کے ارتکاب پر دی جانے والی سزا سے ڈرانا)، (۵) جدل (مطلوب و مدعا کے اثبات کے لئے ٹھوس دلائل پیش کرنا)، (۶) قصص (سابقہ امتوں کے واقعات و حالات کا تذکرہ)، (۷) مثالیں (کسی مطلب کی وضاحت کے لئے مثال وشاہد ذکر کرنا.....،

(تفسیر صافی جلد اول ص ۳۹)

بعض روایات میں یہ الفاظ مذکور ہیں: **نزل القرآن علٰی سبعة احرف: زجر، و امر و حلال و حرام و محکم و متشابه و امثال......** قرآن سات حرفوں پر مشتمل ہو کر نازل ہوا ہے: (۱) نہی، (۲) امر، (۳) حلال، (۴) حرام، (۵) محکم، (۶) متشابہ، (۷) امثال، (یہ روایت بھی تفسیر صافی جلد اول ص ۳۹ میں مذکور ہے)۔

حضرت علیؑ سے منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا: **ان الله انزل القرآن علٰی سبعة اقسام، کل منها کاف و شاف، وهی امر و زجر و ترغیب و ترهیب و جدل و مثل وقصص،......** خداوند عالم نے قرآن مجید کو سات قسموں پر مشتمل نازل کیا ہے اور ان میں سے ہر قسم ہدایت کے لئے کافی اور شافی ہے۔ اور وہ قسمیں یہ ہیں: (۱) امر، (۲) نہی، (۳) ترغیب، (۴) ترہیب، (۵) جدل، (۶) مثالیں، (۷) قصص...... ، (صافی ج ۱ ص ۳۹)

(یہ روایت سابق الذکر حدیث نبویؐ سے متشابہ ہے کہ جس کے الفاظ کی تشریح ذکر کی جا چکی ہے)

بہر حال تمام روایات کو مدنظر رکھتے ہوئے جو یقینی نتیجہ حاصل ہوتا ہے وہ یہ کہ ان میں مذکورہ "سات حروف" سے خطاب و بیان کی سات قسمیں مراد ہیں ..... یعنی سات انداز ہائے بیان، سات لہجے، مطلب کے اظہار کی سات روشیں وغیرہ ....، اور وہ اس طرح کہ تمام قرآنی آیات ایک ہی مطلب و مقصود کو بیان کرتی ہیں جو کہ عبارت ہے اللہ کی طرف بلانے اور صراط مستقیم کو اپنانے کی دعوت دینے سے، لیکن اس مطلب کو سات مختلف انداز ہائے بیان کے ذریعے پیش کیا گیا ہے، (یعنی کبھی امر کی شکل میں، کبھی نہی کی صورت میں، کہیں ترغیب و تشویق کے انداز میں، کہیں ترہیب و انذار کے لہجے میں، کہیں جدل و بحث کی روش میں، کہیں مثالیں ذکر کر کے اور کہیں واقعات بیان کر کے، م)،

یہ بات بھی ممکن ہے کہ اس روایت سے یہ سمجھا جائے کہ تمام اصولِ معارف الٰہیہ "امثال" میں سمٹے ہوئے ہیں کیونکہ ان کے علاوہ دیگر مطالب "معارف الٰہیہ" نہیں کہلاتے بلکہ ان کا معارف الٰہیہ ہونا اضافی حوالہ کا محتاج ہے۔

روایات پر دوسری نظر

تفسیر بالرائے کے بارے میں!

تفسیر صافی میں حضرت پیغمبر اسلام کا ارشاد گرامی منقول ہے آپؐ نے ارشاد فرمایا :

" من فسر القرآن برأیه فلیتبوأ مقعدهٔ من النار "

جو شخص اپنی رائے کی بنیاد پر قرآن کی تفسیر کرے تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں قرار دے،

(تفسیر صافی جلد اول ص ۲۱)

اس مطلب کو شیعہ و سنی فریقین نے ذکر کیا ہے اور اسی مطلب پر مبنی دیگر احادیث بھی موجود ہیں جو حضرت پیغمبر اسلامؐ اور آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے منقول ہیں۔

واضح و صریح ارشاد نبویؐ

کتاب "منیة المرید" میں حضرت پیغمبر اسلامؐ سے روایت مذکور ہے، آپؐ نے ارشاد فرمایا:

" من قال فی القرآن بغیر علم فلیتبوأ مقعدهٔ من النار "

(جو شخص قرآن کے بارے میں بغیر علم کے کوئی بات کہے تو وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ کی آگ میں قرار دے،

(منیة المرید ص ۱۹۱)

اسی روایت کو ابوداؤد نے بھی اپنی کتاب "السنن" میں ذکر کیا ہے۔

کتاب منیة المرید ہی میں حضرت پیغمبر اسلام کی دیگر دو حدیثیں بھی ذکر کی گئی ہیں جن میں آپؐ نے ارشاد فرمایا:

(۱) **" من قال فی القرآن بغیر علم جاء یوم القیامة ملجماً بلجام من نار "**

(جو شخص علم کے بغیر قرآن کے بارے میں اظہار خیال کرے وہ قیامت کے دن دوزخ کی آگ کے شعلوں سے لگام لگایا ہوا آئے گا)۔

(۲) " من تکلم فی القرآن برأیه فاصاب فقد اخطاء "

(جوشخص اپنی رائے سے قرآن کے بارے میں بات کرے تو اگر اس کی بات درست ہی کیوں نہ ہوتا ہم وہ غلطی کا مرتکب ہوا)۔ (منیۃ المرید ص ۱۹۱)

اس روایت کو ابوداؤد، ترمذی اور نسائی نے بھی ذکر کیا ہے۔

مذکورہ کتاب (منیۃ المرید) ہی میں حضرت پیغمبر اسلامؐ کا ایک ارشاد گرامی مذکور ہے جس میں آپؐ نے فرمایا:

" اکثر ما اخاف علٰی امتی من بعدی رجل یناول القرآن یضعه علٰی غیر موضعه "

(مجھے اپنے بعد اپنی امت کے بارے میں زیادہ خوف اس بات کا ہے کہ وہ قرآن کو اس کے اصل مقام کے علاوہ رکھے اس کی غلط تفسیر و معنی کرے)

تفسیر بالرائے کے مرتکب کا انجام

تفسیر العیاشی میں ابوبصیر کے حوالہ سے منقول ہے کہ حضرت امام جعفر صادقؑ نے ارشاد فرمایا:

" من فسر القرآن برأیه ان اصاب لم یؤجر وان اخطاء فهو ابعد من السماء "

(جوشخص اپنی رائے سے قرآن کی تفسیر کرے اگر وہ صحیح بھی نکلے تب بھی اسے کوئی اجر نہیں دیا جائے گا، اور اگر درست نہ ہو تو وہ آسمان سے بہت دور ہوگی)

(تفسیر العیاشی جلد اول ص ۱۷ حدیث ۴)

اسی کتاب میں یعقوب بن یزید کے حوالہ سے یاسر کی روایت مذکور ہے کہ حضرت امام رضا علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: " الرأی فی کتب الله کفر "

(اللہ کی کتاب کے بارے میں اپنی رائے دینا کفر ہے)

(تفسیر العیاشی جلد اول ص ۱۸ حدیث ۶)

اسی معنی و مضمون پر مشتمل دیگر روایات بھی کتاب " کمال الدین وتمام النعمۃ "، کتاب " التوحید " اور تفسیر العیاشی وغیرہ میں مذکور ہیں۔

رائے اور تفسیر بالرائے کی بابت تفصیلی بحث

حضرت پیغمبر اسلامؐ کے ارشاد گرامی" من فسر القرآن برأیہ " میں لفظ" رأی" ذکر ہوا ہے اس کا معنی یہ ہے: هو الاعتقاد عن اجتهاد ، وہ عقیدہ وہ نظریہ جو اجتہاد یعنی فکری قوت کو استعمال میں لانے سے حاصل و پیدا ہو۔

لفظ" رأی" کبھی اس قول پر بھی استعمال ہوتا ہے جس کا سرچشمہ نفسانی خواہش (ہوائے نفس) اور استحسان (من پسندی) ہو۔ یعنی وہ بات کہ جسے دل اچھا سمجھے اور طبعی میلان ورجحان بھی اس کی طرف ہو۔

بہر حال رأی کو ضمیر سے مضاف کر کے" برایہ" ذکر کرنے میں اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ نے تفسیر قران کی بابت مطلق اجتہاد سے منع نہیں فرمایا کہ جس کے حوالہ سے یہ کہا جائے کہ تفسیر کے باب میں صرف انہی ظاہری الفاظ پر اکتفاء اور ان کا اتباع کیا جائے جو حضرت پیغمبر اسلامؐ اور آپ ؐ کے اہل بیت اطہار علیہم السلام نے بیان فرمائے ہیں جیسا کہ اہل حدیث حضرات (جو صرف حدیث کے ظاہری الفاظ پر اکتفاء کا نظریہ رکھتے ہیں) کا عقیدہ ہے، اس کے علاوہ یہ کہ اس طرح کی ممانعت کا حکم ان کثیر روایات کے منافی ہے جن میں قرآن مجید کو عربی واضح قرار دیا گیا ہے اور اس میں تدبرو تفکر کا حکم دیا گیا ہے۔ اسی طرح ان کثیر روایات کے بھی منافی ہے جن میں تفسیر قرآن کی بابت قرآن کی طرف رجوع کرتے اور قرآن ہی کے تناظر میں روایات سے استفادہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

بلکہ حقیقت الامر یہ ہے کہ تفسیر قرآن کی بابت من پسندی کو بنیاد قرار دینے کی ممانعت کی گئی ہے چنانچہ" رأی" کو اضافت کے ساتھ ذکر کیا گیا (برأیہ) کہ جس کا معنی" اپنی رائے" ہے کہ جس سے ذاتی رجحان، طبعی میلان، من پسندی اور فکری انفرادیت و استقلال سمجھا جاتا ہے یعنی اس بات کی ممانعت کی گئی ہے کہ کوئی شخص تفسیر قرآن کی بابت اور کلام الٰہی کے معانی کو سمجھنے کے لئے صرف انہی اسباب پر اکتفاء نہ کرے جن سے عام عربی کلام کے سمجھنے میں استفادہ کیا جاتا ہے کہ اس سے کلام الٰہی اور لوگوں کے کلام کی حیثیت یکساں ہو جائے گی اور کلام خدا کا قیاس کلام خلق سے ہونے لگے گا جو کہ کسی صورت میں درست نہیں،..... خالق کے کلام کا قیاس مخلوق کے کلام سے نہیں ہو سکتا۔ ،جبکہ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ جب بھی کسی متکلم کے کلام کا کوئی جملہ ہمارے سامنے آتا ہے تو ہم فوراً اس کا معنی ومقصود سمجھنے کے لئے انہی عمومی قواعد اور اصولوں کی عملداری کے ذریعے متعین طور پر کہہ دیتے ہیں کہ متکلم نے فلاں معنی کا ارادہ کیا ہے یعنی اس جملہ سے اس کا مقصود و مراد یہ ہے !، اسی روش اور طرزِ عمل کو دیگر امور میں بھی اپناتے ہیں مثلاً اقرار نامے، گواہی نامے وغیرہ، یہ سب اس لئے ہوتا ہے کہ عام طور پر ہمارے بیانات انہی قواعد پر مبنی ہوتے ہیں اور ہم الفاظ سے جو معانی مراد لیتے ہیں ان کی بنیاد وہی لغوی معانی اور ہمارے روزمرہ کے

استعمال میں آنے والے الفاظ کے مصادیق ہیں خواہ وہ حقیقی مصادیق ہوں یا مجازی، ہمارا بیان انہی پر مبنی ہوتا ہے، جبکہ قرآنی بیان اور کلام الٰہی اس طرح نہیں اور اسے ان عام قواعد کے تابع قرار نہیں دیا جاسکتا چنانچہ اس سلسلہ میں سابقہ بحثوں میں واضح ہو چکا ہے بلکہ حقیقت الامر یہ ہے کہ قرآن مجید وہ عظیم کلام ہے جس کی آیات ایک دوسرے سے جدا و منفصل ہونے کے باوجود باہم اور متصل ہیں، ان کے درمیان پائے جانے والے لفظی فاصلے ان کے معانی میں فاصلے ایجاد نہیں کرتے بلکہ وہ معانی میں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اور ان میں سے بعض، دوسرے بعض کی ترجمانی کرتے ہیں قرآن کی بعض آیات، دوسری بعض آیات کی تفسیر و توضیح کرتی ہیں ...، اور بقول حضرت امیر المومنین علیہ علیہ السلام اس کا بعض حصہ، دسرے بعض حصہ پر گواہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ (یشهد بعضهٗ علٰی بعض) بنا برایں کسی آیت کے ظاہری الفاظ سے سمجھے جانیوالے مطالب پر صرف اسی وجہ سے اکتفاء کرنا درست نہیں کہ لغت اور مربوطہ علوم کے مقررہ قواعد کی رو سے وہی مطالب سمجھے جاتے ہیں، گویا وہ علوم جو الفاظ سے ان کے معانی تک رسائی میں مدد دیتے ہیں اور ان میں اس حوالہ سے جو قواعد واصول وضع و مقرر کیے گئے ہیں انہی پر تکیہ کرتے ہوئے دیگر تمام آیات سے کہ جو موضوع سے موزونیت کی حامل ہوں کسی طرح کا استفادہ نہ کر کے اور ان میں غور و فکر اور اجتہاد و تدبر کئے بغیر آیات کے معانی کا تعین صحیح نہیں، چنانچہ اس سلسلہ میں واضح قرآنی ارشاد موجود ہے:

" اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا كَثِیْرًا ﴿۸۲﴾ "

"کہ وہ قرآن میں غور و فکر اور تدبر کیوں نہیں کرتے کہ اگر وہ اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کی طرف سے ہوتا تو لوگ اس میں کثیر اختلاف پاتے" (سورۂ نساء، آیت ۸۲)

اس آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ قرآن مجید کی تمام آیات ایک دوسرے سے معانی کے لحاظ سے وابستگی و پیوستگی رکھتی ہیں چنانچہ اس سلسلہ میں سابقہ مباحث میں وضاحت ہو چکی ہے۔

مذکورہ بالا مطالب سے واضح ہوا کہ تفسیر بالرائے کہ جس کی ممانعت ہوئی ہے اس کی بازگشت الفاظ سے مقصودہ معانی کے سمجھنے کے طریقہ کی طرف ہوتی ہے نہ کہ اس سے حاصلہ معانی کی طرف! یعنی مخصوص طریقہ کشف المعنیٰ کو ممنوع قرار دیا گیا ہے نہ کہ معنیٰ مکشوف کو!، دوسرے لفظوں میں یہ کہ کلام الٰہی کے سمجھنے میں اس طریقہ کو اپنانے سے منع کیا گیا ہے جو غیر خدا کے کلام کو سمجھنے میں اپنایا جاتا ہے، یعنی خالق اور مخلوق کے کلام کے سمجھنے میں یکساں معیار اپنانا صحیح نہیں خواہ اس معیار کو اپنانے کا نتیجہ بعض اوقات اصل معانی سے عین مطابقت کیوں نہ رکھتا ہو، یعنی اتفاقیہ طور پر وہ طریقہء کار صحیح نتیجہ بخش ثابت کیوں نہ ہو لیکن چونکہ اس کا اپنانا بنیادی طور پر صحیح و درست نہ تھا لہٰذا ایسا کرنے والا خطاو غلطی کا مرتکب ہوگا جیسا کہ ایک حدیث نبوی میں ارشاد ہوا: (من تکلم فی القرآن برأیه فاصاب فقد اخطاء) جو شخص اپنی رائے کی بنیاد پر قرآن کے بارے میں

بات کرے کہ اگر اس کی بات صحیح بھی ہو تب بھی وہ خطا کا مرتکب ہوا ... ،اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ طریقہء کار خود ساختہ ہے، کلام الٰہی کو سمجھنے کے لئے اسی روش وطریقہ کار کو اپنانا ضروری ہے جو خود خداوند عالم نے مقرر فرمایا ہے اور حضرت پیغمبر اسلامؐ و آئمہ اہل بیت علیہم السلام نے اس کی نشاندہی فرمائی ہے ... ،چنانچہ تفسیر العیاشی میں جو حدیث مذکور ہے اس میں یہ الفاظ ذکر ہوئے ہیں: (ان اصاب لم یوجر) کہ اس کی بات درست ہی کیوں نہ ہو تب بھی وہ اجر نہیں پائے گا۔

مذکورہ بالا مطالب کی تائید وتصدیق عہد نبویؐ کے حالات سے ہوتی ہے کیونکہ اس وقت قرآن مجید موجودہ صورت میں مرتب نہ تھا بلکہ سورتیں اور آیتیں متفرق صورت میں لوگوں کے پاس تھیں لہٰذا وہ ان کی تفسیر نہ کرسکتے تھے کیونکہ حصہ حصہ کی تفسیر کرنے میں اس بات کا خطرہ موجود تھا کہ کہیں اصل مقصود کے برخلاف اظہار خیال نہ ہو جائے۔

خلاصہء کلام یہ کہ تفسیر قرآن کی بابت جس چیز سے نہی کی گئی ہے وہ یہ کہ اس سلسلہ میں صرف اپنی رائے وخیال پر تکیہ نہ کیا جائے اور کسی دوسرے کی طرف رجوع کئے بغیر صرف اپنی فکر وفہم کی بنیاد پر تفسیر نہ کی جائے گویا تفسیر کرنے والے کو اس بات کا پابند بنا دیا گیا کہ وہ اس سلسلہ میں کسی دوسرے کی طرف رجوع کرے اور اس سے مدد لئے بغیر تفسیر کی بابت ہرگز اقدام نہ کرے،

اب سوال یہ ہے کہ وہ دوسرا کہ جس کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا گیا اور اس کی طرف رجوع کئے بغیر تفسیر کا عمل ہرگز درست وروا نہیں وہ کون ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ لامحالہ وہ دوسرا یا تو خود قرآن مجید ہوگا کہ اس کی آیات کی طرف رجوع کرکے اور ان سے استمداد کرتے ہوئے تفسیر کی جائے، یا سنت یعنی احادیث ہوں گی، جہاں تک سنت کا تعلق ہے تو اس کا مراد لیا جانا اس لئے صحیح نہیں کہ یہ بات قرآنی دستور کے منافی ہے بلکہ خود سنت واحادیث کے بھی منافی ہے کیونکہ سنت واحادیث میں یہ حکم موجود ہے کہ تفسیر کی بابت قرآن کی طرف رجوع کریں اور روایات واحادیث کو پیش نظر رکھتے ہوئے آیات کی تفسیر کریں، لہٰذا اب صرف ایک ہی طریقہ باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ تفسیر القرآن میں خود قرآن کی طرف رجوع کریں اس کے علاوہ کسی دوسرے کی طرف رجوع نہ کریں۔

اس بیان سے ''تفسیر بالرائے'' کی بابت جو آراء ذکر کی گئی ہیں ان کی اصل حقیقت واضح ہو جاتی ہے، اہل علم و صاحبان فکر نے اس سلسلہ میں مختلف آراء واقوال پیش کئے ہیں ذیل میں صرف دس اقوال ذکر کئے جاتے ہیں تاکہ قارئین کرام تفسیر بالرائے کے اصل معنیٰ ومفہوم سے آگاہی حاصل کرتے ہوئے تمام پہلوؤں سے آشنا ہوں۔

تفسیر بالرائے کی بابت دس اقوال

" تفسیر بالرائے " سے کیا مراد ہے؟اس کی بابت دس اقوال ملاحظہ ہوں:

پہلا قول :

تفسیر بالرائے سے مراد یہ ہے کہ تفسیر کی بابت جو علوم بنیادی حیثیت رکھتے ہیں ان سے بہرہ مند ہوئے بغیر تفسیر کا عمل کیا جائے ،یعنی جن علوم کے ذریعے تفسیر قرآن آسان وممکن ہوتی ہے ان کو حاصل کئے بغیر یہ کام کیا جائے ،ان علوم کے بارے میں جلال الدین سیوطی نے " الاتقان " میں لکھا ہے کہ وہ پندرہ ہیں،یعنی: (۱) علم لغت ،(۲) علم نحو، (۳) علم صرف، (۴) علم الاشتقاق ،(۵) علم معانی ،(۶) علم بیان ،(۷) علم بدیع ،(۸) علم قرأت ،(۹) علم اصول دین ،(۱۰) علم اصول فقہ ،(۱۱) اسباب نزول ،(۱۲) قصص (تاریخ)،(۱۳) ناسخ ومنسوخ ،(۱۴) علم فقہ ،(۱۵) علم الحدیث یعنی ان احادیث کا علم جو مجمل ومبہم الفاظ کی تفسیر وتشریح کرتی ہیں ،اس کے علاوہ علم الموہبت ہے کہ جس کا اشارہ حضرت پیغمبر اسلامؐ کے اس ارشاد گرامی میں ہوا ہے: (**من عمل بما علم ورثه الله علم ما لم يعلم**) جو شخص اس چیز پر عمل کرے جس کا اسے علم حاصل ہے خداوند عالم اسے اس چیز کے علم سے نوازے گا جو اسے حاصل نہ ہو۔ (اپنے علم پر عمل کرنے کے نتیجہ میں خداوند وہ علم عطا فرماتا ہے جو پہلے حاصل نہیں ہوتا)۔

دوسرا قول :

تفسیر بالرائے سے مراد آیات متشابہات کی تفسیر کرنا ہے کہ جن کا علم خداوند کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔

تیسرا قول :

تفسیر بالرائے کا مطلب یہ ہے کہ کسی نادرست وغلط نظریہ کو تفسیر کی بنیاد قرار دیا جائے اور وہ اس طرح کہ کسی عقیدہ ونظریہ کو بنیادی حیثیت قرار دے کر آیات کی تفسیر میں ہر ممکن طریقہ اپنایا جائے خواہ وہ ضعیف وکمزور ہی کیوں نہ ہو (گویا مخصوص نظریہ کو اصل اور حقیقی حیثیت حاصل ہو اور تفسیر کو تبعی وثانوی حیثیت ملے کہ اس طرح قرآن کو اپنے نظریات سے ہم آہنگ کرنا مطلوب ہوگا نہ یہ کہ قرآن کی بنیاد پر نظریہ قائم کرنا مقصود قرار پائے گا)۔

چوتھا قول :

تفسیر بالرائے سے مراد یہ ہے کہ کسی محکم ومضبوط دلیل کا سہارا لئے بغیر قطعی ویقینی طور پر آیت کے معنی کا تعین کرتے ہوئے کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے یہ مراد لیا ہے۔

پانچواں قول :

تفسیر بالرائے سے مراد یہ ہے کہ من پسند و دلخواہ معنی کی بنیاد پر تفسیر کی جائے اور شخصی ترجیحات کو تفسیر کی بنیاد بنایا جائے۔

یہ پانچ اقوال و آراء جلال الدین سیوطی نے اپنی کتاب "الاتقان" میں ابن نقیب کے حوالہ سے ذکر کی ہیں، ان کے علاوہ دیگر پانچ آراء کو ہم یہاں ذکر کر رہے ہیں، ملاحظہ ہو:

چھٹا قول :

تفسیر بالرائے سے مراد یہ ہے کہ جو آیات مشکل اور صعب المعنی ہیں ان کی بابت اظہار خیال کرتے ہوئے ایسے مطالب پیش کئے جائیں جن کا کوئی اشارہ صحابہ و تابعین میں سے کسی کے بیانات میں نہ پایا جاتا ہو۔ ایسا کرنا خداوند عالم کی ناراضگی مول لینے اور غضب الٰہی کو دعوت دینے کے برابر ہے۔

ساتواں قول :

تفسیر بالرائے سے مراد یہ ہے کہ آیات کے معانی کا تعین کرتے ہوئے ایسے مطالب ذکر کئے جائیں جو قطعی طور پر نادرست ہوں، یعنی یہ جانتے ہوئے کہ یہ بات امر واقعہ اور حق سے مطابقت نہیں رکھتی بلکہ اس سے منافی ہے اس کی بناء پر آیت کی تفسیر کی جائے، (دو آراء یعنی چھٹی اور ساتویں رائے ابن الانباری سے منقول ہیں)۔

آٹھواں قول :

تفسیر بالرائے سے مراد یہ ہے کہ علم و یقین کے بغیر آیات قرآنیہ کے بارے میں اظہار خیال کیا جائے، یعنی غیر علمی و غیر یقینی صورت کے ساتھ اس طرح تفسیر کی جائے کہ جو معنی کیا جا رہا ہو اس کے بارے میں معلوم ہی نہ ہو کہ وہ حق سے منافی ہے یا نہیں۔

نواں قول :

تفسیر بالرائے سے مراد یہ ہے کہ ظاہر القرآن سے تمسک کیا جائے جبکہ تمسک کرنے والا شخص یہ نظریہ رکھتا ہو کہ قرآن ظواہر سے عاری ہے اور تفسیر القرآن میں صرف ان روایات کی پیروی کی جائے جو معصومؑ سے منقول ہوں اور اس طرح واضح و صریح ہوں کہ انہیں "نص" کہا جائے، حالانکہ ایسا کرنا آیت کی تفسیر کی بجائے نص کی پیروی کہلاتا ہے اور تفسیر کی یہ روش صرف معصومین علیہم السلام سے مختص و مخصوص ہے۔ کوئی غیر معصوم اس روش کو نہیں اپنا سکتا ....،

دسواں قول :

تفسیر بالرائے سے مراد یہ ہے کہ ظاہر القرآن سے اس نظریہ کے ساتھ تمسک کیا جائے کہ قرآن اگرچہ ظواہر کا حامل ہے لیکن ہم ان ظواہر کو سمجھنے سے قاصر ہیں بلکہ تفسیر القرآن میں صرف معصومؑ سے وارد صریح بیان (نص) ہی لازم الاتباع ہے۔

یہ ہیں وہ دس اقوال و آراء کہ جنہیں تفسیر بالرائے کے معنی کی بابت پیش کیا گیا ہے، اگرچہ ان میں سے بعض ایسی آراء ہیں جن کی بازگشت دوسری بعض کی طرف خارج از امکان نہیں، تاہم یہ آراء و اقوال مدلل نہیں بلکہ ان میں سے بعض ظاہر البطلان ہیں اور بعض کا نادرست ہونا سابقہ مباحث میں ذکر کیے گئے مطالب کے حوالہ سے ظاہر و ثابت ہو جاتا ہے لہٰذا ہم ان کو دوبارہ ذکر کر کے طول دینا نہیں چاہتے۔

خلاصہء کلام یہ کہ روایات شریفہ اور آیات مبارکہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ احادیث میں تفسیر کی جو نہی و ممانعت کا حکم مذکور ہے اس کا تعلق طریقہء تفسیر سے ہے اصل تفسیر سے نہیں اور اس کا مطلب یہ ہے کہ خالق کے کلام کی تفسیر میں اس طریقہ و روش کو اختیار نہ کیا جائے جسے مخلوق کے کلام کی تفسیر میں اختیار کیا جاتا ہے چنانچہ اس سلسلہ کی بعض آیات میں اس طرح ارشاد ہوا ہے:

سورہء نساء، آیت ۸۲:

○ " اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ "

(آیا وہ قرآن میں غور و فکر اور تدبر سے کام نہیں لیتے۔۔۔؟)

سورہء حجر، آیت ۹۱:

○ " الَّذِيْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ ﴿۹۱﴾ "

(وہ لوگ کہ جنہوں نے قرآن کو تقسیم کر دیا ...)

سورہء حم سجدہ، آیت ۴۰:

○ " اِنَّ الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا لَا يَخْفَوْنَ عَلَيْنَا ۭ اَفَمَنْ يُّلْقٰى فِي النَّارِ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ يَّاْتِيْٓ اٰمِنًا يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ..... "

(جو لوگ ہماری آیات میں الحاد (تحریف) کرتے ہیں وہ ہم سے چھپ نہیں سکتے، آیا وہ شخص بہتر ہے جسے آگ میں ڈالا جائے گا یا وہ کہ جو قیامت کے دن آرام و سکون کے ساتھ آئے گا؟)

سورہء نساء، آیت ۴۶:

○ " يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ "

(وہ کلمات کو ان کے مقامات سے ہٹا دیتے ہیں ... تحریف کرتے ہیں ...)

سورہء اسریٰ، آیت ۳۶:

○ " وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ "

(جس کا تجھے علم نہیں اس کے پیچھے نہ جاؤ)
اس کے علاوہ دیگر آیات میں بھی اسی مطلب کے اشارے پائے جاتے ہیں۔

خدااور مخلوق کے کلام کا فرق

حقیقت یہ ہے کہ خداوند عالم کے کلام کا غیر خدا کے کلام سے الفاظ کے استعمال میں اپنائی گئی روش، جملہ بندی میں اختیار کیے گئے انداز اور ادبی محاوروں کے انتخاب کے حوالہ سے مختلف ہونا مراد و ملحوظ نہیں کیونکہ قرآن مجید بھی عربی زبان میں ہے اور اس میں کلام کے وہ تمام اصول اور خصوصیات ملحوظ رکھی گئی ہیں جو کسی بھی عربی کلام میں ملحوظ رکھی جاتی ہیں چنانچہ اس کا ثبوت خداوند عالم کے اس ارشاد گرامی میں موجود ہے:

سورہ ءابراہیم، آیت ۴:

O "وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ"

(ہم نے کسی رسول کو نہیں بھیجا مگر اس کی اپنی قوم کی زبان کے ساتھ، تا کہ انہیں وضاحت کر ساتھ احکام بیان کر سکے)

ایک آیت میں یوں ارشاد ہوا:

سورہ ءنحل، آیت ۱۰۳:

O "وَهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ"

(اور یہ قرآن واضح و آشکار عربی زبان ہے)

ایک مقام پر یوں فرمایا:

سورہ ءزخرف، آیت ۳:

O "اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ"

(بے شک ہم نے اسے پڑھی جانے والی عربی کتاب قرار دیا تا کہ تم سمجھ سکو)

ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ کلام الٰہی اور کلام خلق میں الفاظ کی ترتیب و ترکیب کا فرق ملحوظ نہیں بلکہ اصل میں ان دونوں کے درمیان فرق مراد اور اس مصداق کی بنیاد پر ہے جس پر کلام کا مفہوم منطبق ہوتا ہے، یعنی مرادی معنی اور اس کے مفہوم کی تطبیق کے حوالہ سے فرق پایا جاتا ہے۔

اس کی مزید وضاحت یہ ہے کہ ہمارا تعلق بالعموم چونکہ عالم طبیعہ سے ہے اور ہم افراد بشر کے درمیان باہمی وجودی ربط وارتباط کا نظام جسمانی و مادی بنیادوں پر قائم ہے کیونکہ ہم مادی دنیا میں زندگی بسر کر رہے ہیں لہٰذا ہم ہر لفظ سے وہی معنیٰ مراد لیتے ہیں جو ہماری مادی زندگی میں عموماً مراد لیا جاتا ہے اور پھر اس کا مصداق بھی وہی ذہن میں آتا ہے جس کا تعلق مادہ و مادیات سے ہوتا ہے اور ہم ہر مفہوم کو اس کے مادی مصداق پر منطبق کرتے ہیں چنانچہ ہم جب اپنے ہی جیسے کسی شخص کا کلام سنتے ہیں کہ جس میں کسی چیز کو بیان کیا جاتا ہے یا کسی شے کی خبر دی گئی ہوتی ہے تو ہم اس کے ظاہری الفاظ سے ان کے معانی کے ادراک کے بعد اسے اس مصداق پر محمول کرتے ہیں جو ہمارے ہاں متعارف ہوتا ہے اور انہی کلامی اصولوں پر منطبق کرتے ہیں جو ہمارے ہاں رائج ہیں کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ متکلم نے اس کے علاوہ کسی مصداق کا ارادہ نہیں کیا یعنی وہ اس کے سوا کسی دوسرے مصداق کو مراد لے ہی نہیں سکتا کیونکہ وہ ہم جیسا ہے اور اس کا زاویۂ فکر و فہم ہم سے مختلف نہیں بلکہ جو کچھ اور جس طرح ہم الفاظ سے معانی و مفاہیم اور ان کے مصادیق کا تعین کرتے ہیں وہ (متکلم) بھی انہی کا تعین کرتا ہے، گویا الفاظ سے معانی کے تعین میں جو اصول حکم فرما ہیں وہی مفہوم و مصداق کے تعین میں جاری ہوتے ہیں البتہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ متکلم مصداق کے تعین کے عام ورائج نظام میں استثناء کرتے ہوئے "عام" سے "خاص" اور "خاص" سے "عام" مراد لیتا ہے یا "مفہوم" میں دخل و تصرف کرتے ہوئے الفاظ کے دائرہ سے باہر کسی دوسرے حوالہ سے مصداق کا قصد کرتا ہے کہ اس طرح کے تصرفاتی عمل کو علمی اصطلاح میں "تصرف القرائن العقلیہ غیر اللفظیہ" کہا جاتا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ جب ہم اپنے بزرگوں میں سے کسی بزرگ یا ثروتمند ہستی سے یہ الفاظ سنیں "وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ" کوئی چیز بھی ہو اس کے خزانے و خزینے ہمارے پاس ہیں...... تو سب سے پہلے ان الفاظ کے مفہوم اور پھر ہر لفظ سے اس کے معنی کی تصویر ہمارے سامنے آتی ہے اور اس کے بعد ان الفاظ و معانی کو ان کے مصداق پر منطبق کرنے کے مرحلہ میں ہم اس امر پر یقین کر لیتے ہیں کہ متکلم کے پاس متعدد محفوظ مخازن موجود ہیں کہ جن میں کثیر گرانقدر اشیاء رکھی ہوئی ہیں کیونکہ مخازن و خزینوں کی تشکیل اسی غرض کے تحت عمل میں لائی جاتی ہے کہ ان میں قیمتی چیزیں محفوظ کی جائیں مثلاً سونا، چاندی، نقدی، زیورات، گھریلو ساز و سامان اور اسلحہ وغیرہ، اور عموماً انہی اشیاء کی حفاظت و اکٹھا رکھنے کے لئے خزینوں و مخازن کو بنایا جاتا ہے لیکن جہاں تک آسمان، زمین، صحرا، دریا، ستاروں اور انسانوں کا تعلق ہے تو اگر چہ وہ بھی "اشیاء" کہلاتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ ذخیرہ کرنے یا مخازن میں محفوظ کرنے والی اشیاء کے باب سے نہیں اور ان کو ایک دوسرے پر چننے کا عمل نہیں ہو سکتا بنا بر ایں ہم واضح و صریح الفاظ میں کہہ سکتے ہیں کہ متکلم کے الفاظ "وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ" سے مراد ہر شے نہیں بلکہ "شَیْءٍ" کے وسیع معنی میں شامل بعض چیزیں ہیں اور وہ بھی ایسی کہ جو مخزن میں ذخیرہ نہیں ہوتیں، (انہیں گوداموں اور سٹوروں میں محفوظ نہیں کیا جاتا)، اس طرح الفاظ سے ان کے معانی و مفاہیم کی تطبیق کا عمل محدود ہو جاتا ہے اور مصداق کے تعین کا دائرہ اپنی عمومی وسعت

پر باقی نہیں رہتا، گویا لفظ ''شَیءٍ'' اور لفظ ''خزائن'' سے ان کے وسیع مصداق کے مراد لینے کی بجائے ان کے مفاہیم نہایت مخصوص مصادیق پر منطبق کر کے کلامی اطلاق میں تقیید کا حیرت انگیز سلسلہ قائم ہو جاتا ہے۔

اور پھر جب ہم یہ سنتے ہیں کہ خداوند عالم نے اپنے نبیؐ پر یہ آیت نازل فرمائی، {وَ اِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا عِنۡدَنَا خَزَآئِنُہٗ} ...... سورۂ حجر، آیت ۲۱ ...... تو اگر ہمارا ذہن عام و معمولی سطح سے بلند نہ ہو تو ہم ان الفاظ کی تفسیر بھی اسی طرح کریں گے جس طرح کسی عام انسان کے کلام کی بابت تفسیر کرتے ہیں جبکہ اس طرح تفسیر کرنے کی کوئی دلیل ہمارے پاس موجود نہیں ہوتی اور ہم اس کے سوا کچھ نہیں جانتے کہ ان الفاظ کو ان معانی میں استعمال کیا جاتا ہے، بنابرایں ہمارا ایسا کرنا علم و آگاہی سے عاری ہماری اپنی رائے پر مبنی ہوگا۔

لیکن اگر ہم اپنی سطح فکر کو تھوڑا سا بلند کریں اور اس امر پر پختہ یقین حاصل ہو جائے کہ خداوند متعال مال کو ذخیرہ کرنے کا محتاج نہیں بالخصوص جب ہم یہ سنیں کہ اس نے اسی آیت کے ذیل میں ارشاد فرمایا ہے، ﴿وَمَا نُنَزِّلُہٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعۡلُوۡمٍ﴾ (اور ہم اس سے معلوم اندازے کے مطابق ہی نازل کرتے ہیں) ...... سورۂ حجر ۲۱ ...... اور سورۂ جاثیہ آیت ۵ میں اس نے یوں ارشاد فرمایا: ﴿وَمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ رِّزۡقٍ فَاَحۡیَا بِہِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِہَا﴾ اور خدا نے آسمان سے جو رزق نازل کیا اس سے زمین کو زندہ کر دیا جبکہ وہ مر چکی تھی۔ تو یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ لفظ ''شیئ'' سے مراد روٹی اور پانی والا رزق ہے اور اس کے آسمان سے نازل ہونے سے مراد بارش کا برسانا ہے کیونکہ ہم آسمان سے نازل ہونے کے الفاظ سے بارش برسنے کے علاوہ ہم کچھ نہیں سمجھتے، لہٰذا ان الفاظ و عبارات سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہر شے کا خداوند عالم کے پاس ذخیرہ ہونے اور اندازہ و مقدار کے ساتھ اس کے نازل ہونے سے مراد دراصل بارش کے پانی کا ذخیرہ کیا جانا اور پھر اس کا غذاؤں اور اشیاء خورد و نوش کے اگنے کی غرض سے آسمان سے نازل ہونا (برسنا) ہے کہ جسے کنایۃً ذخیرہ کرنے اور نازل کرنے کے الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے ، اس طرح کی تفسیر بھی تفسیر بالرائے ہے کہ جو جہالت و عدم آگاہی پر مبنی ہے، کیونکہ اس میں ہماری بنیاد صرف یہ ہے کہ ہم بارش کے علاوہ آسمان سے کسی چیز کے نازل ہونے کا علم ہی نہیں رکھتے، گویا ہماری دلیل اور نظریہ کی بنیاد یہ ہے کہ ہمیں اس کے سوا کسی چیز کا علم نہیں ہوتا، یعنی علم نہ ہونا اصل وجہ ہے نہ کہ اس کے علاوہ کسی چیز کے نازل نہ ہونے کا علم ہونا ہے۔ اسے علمی اصطلاح میں عدم العلم دوان العلم بالعدم کہا جاتا ہے۔

اور اگر ہم اپنی سطح فکری کو بلند کریں اور مذکورہ معیار سے کہیں اونچا ہو کر سوچیں اور قرآن کی بابت بغیر علم کے ہر طرح کے اظہار خیال سے اجتناب کریں اور کلام الٰہی کو اس کے کامل اطلاق پر باقی رکھتے ہوئے آیۂ مبارکہ '' وَ اِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا عِنۡدَنَا خَزَآئِنُہٗ '' کے بارے میں یہ نظریہ قائم کریں کہ اس میں مسئلہ خلقت کو بیان و واضح کیا گیا ہے البتہ اس حقیقت کو ملحوظ و مدِ نظر رکھیں کہ کائنات میں جو چیز بھی وجود پذیر ہوتی ہے مثلاً انسان، حیوان، نباتات وغیرہ، وہ آسمان سے نازل نہیں

ہوتی بلکہ زمین ہی میں اپنے وجودی مراحل طے کر کے جدید الحدوث موجودات میں شمار ہوتی ہے۔ تو ہم اس نتیجہ تک پہنچ سکتے ہیں کہ آیہ مبارکہ ﴿وَ اِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا عِنۡدَنَا خَزَآئِنُہٗ﴾ (سورۂ حجر، آیت ۲۱) کنایۃً اس مطلب کو بیان کرتی ہے کہ تمام موجودات اپنے وجود پانے میں ارادۂ خداوندی کے تابع ہیں اور ارادۂ الٰہی بمنزلہ مخزن ہے کہ جس میں تمام جدید الحدوث اشیاء وموجودات مخزون ومحفوظ ہیں اور ان میں سے وہی چیز اس خزانہ سے باہر آتی ہے اور خدا کی طرف سے نازل ہوتی ہے جس کو وجود عطا کرنے میں خدا کی مشیت ہو جائے، (یعنی جس کو وجود دینے کا ارادہ خدا کر لے)، لیکن آیت کی یہ تفسیر بھی جس طرح کہ آپ ملاحظہ فرمارہے ہیں ہماری رائے وخیال پر مبنی ہے کہ جو بغیر علم کے ہم قائم کرتے ہیں (یعنی تفسیر بالرائے ہے) کیونکہ اس سلسلہ میں ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی دلیل نہیں کہ زمینی موجودات خدا کی طرف سے آسمان سے نازل نہیں ہوتیں اور ہم نازل ہونے کا معنی اوپر سے نیچے آنا کرتے ہیں اس کے علاوہ اس کا کوئی معنی ہم نہیں جانتے۔ (یعنی جب ہم ''نازل ہونے'' کا معنی آسمان سے زمین پر آنا یعنی اوپر سے نیچے آنا کریں تو زمینی موجودات کے بارے میں یہی کہیں گے کہ وہ آسمان سے نیچے نہیں آئیں کیونکہ اس کے علاوہ نازل ہونے کا کوئی معنی ہمیں معلوم ہی نہیں)۔

اور اگر آپ ان چیزوں کے بارے میں غور وفکر کریں جن کی توصیف خداوند عالم نے اپنی مقدس کتاب میں کی ہے مثلاً اپنے اسماء ذات، اپنی صفات، اپنے افعال، اپنے فرشتے، اپنی کتابیں، اپنے رسول، قیامت اور اس سے تعلق رکھنے والے امور، اپنے احکامات اور ان کے معیار وغیرہ، اور پھر ان چیزوں کے بارے میں ہم عقلی قرائن کی بنیاد پر جو تفسیر کرتے ہیں اس پر بخوبی غور کریں تو آپ اس حقیقت سے آگاہ وآشنا ہو جائیں گے کہ یہ سب کچھ تفسیر بالرائے ہی کے باب سے ہے کہ جس کی اصل بنیاد ہماری لاعلمی ہے، اور یہ سب کچھ کلام خداوندی کو اس کے اصل مقام سے دور کرنے اور پھیر دینے کی ایک صورت ہے، یعنی ''تحریف'' کی ایک قسم ہے۔

ہم پانچویں فصل میں محکم ومتشابہ کی بحث کے ضمن میں اس مطلب کو بیان کر چکے ہیں کہ معارف الٰہیہ کی بابت قرآنی بیانات کی حیثیت مثالوں جیسی ہے یا خود مثالیں ہیں جو اپنے ممثلات (جن کی مثالیں قرار پائی ہیں) کی عکاسی کرتی ہیں، یعنی آیات قرآنیہ کی حیثیت وہی ہے جو مثالوں کی اصل موجودات وحقائق سے ہوتی ہے، خدائی معارف وحقائق مختلف ومتفرق آیات کے قالب میں ڈھل گئے ہیں اور دامن قرآن میں بکھرے ہوئے ان معانی ومفاہیم اور حقائق ومعارف کا ادراک اس طرح ممکن قرار پایا ہے کہ بعض آیات کے ذریعے دیگر بعض آیات کے معانی کو سمجھا جا سکتا ہے اور جو مفاہیم ومعارف قرآنی بیانات کے دامن میں پوشیدہ ہیں ان سے آگاہی حاصل کرنے میں انہی آیات میں سے ایک دوسرے کی وضاحت کے حوالے موجود ہیں اسی وجہ سے بعض آیات کو دوسری بعض آیات کے لئے شاہد ومفسر کا درجہ دیا جاتا ہے یعنی بعض آیتیں دوسری بعض آیتوں کے معانی کی تفسیر کرتی ہیں اور ان کے تعین میں شاہد قرار پاتی ہیں کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا یعنی آیات ایک دوسری کی

تفسیر نہ کرتیں تو معارف الٰہیہ اپنے حقائق میں اس طرح پوشیدہ رہتے کہ ان سے آ گاہی حاصل کرنے کا نظام ہی درہم برہم اور مختل ہو جاتا اور پھر کسی بھی آیت کا معنی سمجھنے کے لئے لاعلمی پر مبنی اس تفسیر بالرائے کے سوا کوئی چارۂ کار باقی نہیں رہتا کہ جس کی بابت واضح طور پر مطالب ذکر ہو چکے ہیں۔

نتیجہ کلام: مذکورہ بالا مطالب سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تفسیر بالرائے اسی "قول بغیر علم" کا مصداق ہے جس کے بارے میں سابق الذکر حدیث نبویؐ میں ارشاد ہوا ہے کہ "جس نے قرآن کے بارے میں بغیر علم کے بات کی (اظہار خیال کیا) تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم کی آگ ہی سمجھے" (من قال فی القرآن بغیر علم فلیتبوأ مقعدهٗ من النار)۔

اس کے علاوہ یہ مطلب بھی واضح ہو جاتا ہے کہ تفسیر بالرائے کا نتیجہ قرآنی آیات کے درمیان تنافی (ایک دوسرے کی نفی پر مبنی ہونے) کے غلط نظریہ کو جنم دینا ہے کیونکہ اس سے قرآنی مضامین و موضوعات میں پائی جانے والی معنوی ترتیب ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتی ہے کہ جس سے آیات کا جابجا ہونا اور کلمات کا اپنے اصل مقامات کی بجائے دوسری جگہوں میں قرار پانا لازم آتا ہے (یعنی تحریف کی راہ ہموار ہو جاتی ہے) اور پھر آیات کی غلط تاویلوں کا باب کھل جاتا ہے کہ بعض یا اکثر آیات سے ان کے اصل معانی کی بجائے دوسرے معانی مراد لئے جاتے ہیں جیسا کہ جبر اور تفویض کا عقیدہ رکھنے والے حضرات نے آیات کی تاویل اپنے نظریات کے مطابق کی، مثلاً جبر کا عقیدہ رکھنے والوں نے آیات الاختیار یعنی وہ آیات کہ جن میں انسان کے بااختیار ہونے کا واضح ذکر ہوا ہے ان کی تاویل اس طرح سے کی کہ جبر کا عقیدہ درست قرار پائے اور ان کے مقابلے میں تفویض کا عقیدہ رکھنے والوں نے آیات القدر یعنی وہ آیات کہ جن میں انسان کے اختیار کی محدودیت مذکور ہے ان کی تاویل اس انداز میں کی کہ جس سے تفویض کا نظریہ درست قرار پائے، بلکہ اکثر اسلامی مسالک قرآنی آیات کی تاویلوں کے مرتکب ہو گئے اور انہوں نے ہر اس آیت کی تاویل کر دی (یعنی اس کے ظاہری معنی سے موڑ کر دوسرے معنی مراد لئے) جو بظاہر ان کے نظریہ و مسلک سے موافق نہ تھی اور انہوں نے اپنے اس عمل کو صحیح قرار دینے میں عقلی قرائن کا سہارا لیتے ہوئے اس طرح اظہار سخن کیا کہ جب کسی کلام کا ظاہر، عقلی اصولوں سے مطابقت نہ رکھتا ہو تو ضروری ہے کہ کلام کو اس کے ظاہر سے پھیر کر اس سے دوسرا معنی مراد لیا جائے جبکہ یہ وہی تاویل ہے کہ جس کا سرچشمہ قول بغیر علم ہے۔

خلاصۂ بیان یہ کہ تفسیر بالرائے سے آیات کی ترتیب کے درہم برہم ہونے کے نتیجہ میں ان کے درمیان اختلاف اور ایک دوسرے کی نفی کرنے کا پہلو جنم لیتا ہے کہ جس سے آیتوں کا مقصود و مطلوب مفقود ہو جاتا ہے اور پھر قرآن کے اس دعوے کی نفی ہوتی ہے کہ اس کی آیات میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا، تو معلوم ہوا کہ آیات میں اختلاف کا پایا جانا اور ایک دوسری کی نفی کے پہلو کا حامل ہونا ان کے درمیان پائے جانے والے حقیقی ارتباط کے مضبوط سلسلے کے مختلف ہونے اور ان کے مرادی معنی کے اختلاط کا نتیجہ ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں اور یہ وہی مطلب ہے جسے روایات میں "ضرب بعض القرآن ببعض"

سے تعبیر کیا گیا ہے: روایات ملاحظہ ہوں:

○ "عن الصادق عن ابیه علیهما السلام قال: ما ضرب رجل من القرآن بعضهٔ ببعض الا کفر"،

(نہیں مارے گا کوئی شخص قرآن کے بعض حصہ کو دوسرے بعض پر، مگر یہ کہ وہ کافر ہو جائے گا)

(ملاحظہ ہو: کافی ج ۳ ص ۶۳۲ حدیث ۱۷۔ تفسیر العیاشی ج ۱ ص ۱۸ حدیث ۲)

○ "عن الصادق علیه السلام: ماضرب رجل من القرآن بعضهٔ ببعض الا کفر"،

(نہیں مارے گا کوئی شخص قرآن کے بعد حصہ کو دوسرے بعض پر، مگر وہ کافر ہو جائیگا)

(معانی الاخبار ص ۱۹۰ حدیث ۱۔ المحاسن البرقی ص ۲۱۲ حدیث ۸۶، تفسیر العیاشی ص ۱۸ حدیث ۲)

شیخ صدوق علیہ الرحمۃ نے کہا کہ میں نے ابن الولید سے اس حدیث کا معنی پوچھا تو انہوں نے کہا اس سے مراد یہ ہے کہ جب آپ سے کسی آیت کی تفسیر پوچھی جائے تو آپ اس کی بجائے کسی دوسری آیت کی تفسیر کے ذریعے جواب دیں (یعنی کسی اور آیت کی تفسیر بتائیں)

ابن الولید نے شیخ صدوق علیہ الرحمۃ کو جو جواب دیا وہ مبہم ہے اور اس میں دو پہلو ممکن و قابل تصور ہیں: ایک یہ کہ ان کا اشارہ اس عام روش و طرزِ بحث کی طرف ہو جو عموماً اہل علم حضرات کے درمیان رائج و معمول ہے اور وہ یہ کہ وہ اپنے مناظروں و مباحثوں میں ایک آیت کو دوسری آیت سے متصادم قرار دے کر ان میں سے ایک سے تمسک اختیار کر کے دوسری کی تاویل کر دیتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ ان کا مقصد یہ ہو کہ ایک آیت کا معنی سمجھنے کے لئے دوسری آیت سے استناد و استفادہ کرتے ہوئے ان میں سے ایک کو دوسری پر بطور شاہد پیش کرے (یعنی ایک آیت کے ذریعے دوسری آیت کی تفسیر کرے اور ایک آیت کے معنی کے تعین میں دسری آیت کو شاہد و مؤید قرار دے)۔ اگر ابن الولید کا مقصد پہلا معنی ہو تو بات درست بنتی ہے اور اگر ان کا مقصد دوسرا پہلو ہو تو قطعاً درست نہیں اور ان دو روایتوں سے اس دوسرے پہلو کی صریح نفی ہوتی ہے۔

امام جعفر صادقؑ کا ارشاد گرامی

تفسیر نعمانی میں مؤلف نے اپنے اسناد سے اسماعیل بن جابر سے روایت کی ہے انہوں نے کہا: میں نے ابوعبداللہ جعفر بن محمد الصادق علیہ السلام سے سنا ہے امامؑ نے ارشاد فرمایا:

" ان اللہ تبارک و تعالٰی بعث محمداً فختم بہ الانبیاء فلا نبی بعدہٗ ، و انزل علیہ کتاباً فختم بہ الکتب فلا کتاب بعدہٗ ، احل فیہ حلالاً و حرم حراماً، فحلالہٗ حلال الٰی یوم القیامۃ و حرامۃ حرام الٰی یوم القیامۃ ، فیہ شرعکم و خبر من قبلکم و بعدکم، وجعلہ النبی صلی اللہ علیہ و آلہٖ علماً باقیاً فی اوصیائہٖ، فترکھم الناس و ھم الشھداء علٰی اھل کل زمان، وعدلوا عنھم ثم قتلوھم، واتبعوا غیرھم ثم اخلصوا لھم الطاعۃ حتی عاندوا من اظھر ولایۃ ولاۃ الامر وطالب علومھم ، قال اللہ سبحانہٗ: " وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ "

سورۃ المائدۃ الآیۃ ۱۳ "وذلک انھم ضربوا بعض القرآن ببعض واحتجوا بالمنسوخ وھم یظنون انہٗ الناسخ، واحتجوا بالمتشابہ وھم یرون انہٗ المحکم، واحتجوا بالخاص وھم یقدرون انہ العام، واحتجوا باول الآیۃ وترکوا السبب فی تأویلھا، ولم ینظروا الٰی ما یفتح الکلام والٰی ما یختمہٗ، ولم یعرفوا مواردہٗ ومصادرہٗ اذلم یأخذوہ عن اھلہٖ فضلوا واضلوا، واعلموا رحمکم اللہ ! انہٗ من لم یعرف من کتاب اللّٰہ عزوجل الناسخ من المنسوخ والخاص من العام والمحکم من المتشابہ، والرخص من العزائم، والملکی والمدنی، واسباب التنزیل، والمبھم من القرآن فی الفاظہ المنقطعۃ والمؤلفۃ، وما فیہ من علم القضاء والقدر، والتقدیم والتأخیر، والمبین والعمیق، والظاھر والباطن، والابتداء والانتھاء، والسؤال والجواب، والقطع والوصل، والمستثنٰی منہ والجار فیہ ، فالصفۃ لما قبل مما یدل علٰی مابعد ، والمؤکد منہ والمفصل، وعزائمہ، ورخصۂ ، ومواضع فرائضہ واحکامہٖ ، ومعنی حلالہ و حرامہٖ الذی ھلک فیہ الملحدون، والموصول من الالفاظ والمحمول، علٰی ما قبلہٗ و علٰی ما بعدہٗ فلیس بعالم بالقرآن ولاھومن اھلہٖ، ومتی ما ادعی معرفۃ ھٰذہ الاقسام مدع بغیر دلیل فھوکاذب مرتاب مفتر علی اللّٰہ الکذب ورسولہٖ ومأواہ جھنم و بئس المصیر، "

(خداوند عالم نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھیجا (مبعوث بہ رسالت فرمایا) اور انہی پر سلسلۂ نبوت اختتام کو پہنچا (ختم نبوت ہوئی) لہٰذا ان کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا، اور ان پر کتاب نازل کی اور اس کتاب کے ذریعے کتابیں نازل کرنے کا سلسلہ اختتام پذیر ہوا، لہٰذا اس کے بعد کوئی کتاب نازل نہ ہوگی، اس کتاب میں خداوند عالم نے کچھ چیزیں حلال اور کچھ چیزیں حرام کئے جانے کو ذکر فرمایا (اس میں تمام حلال وحرام اشیاء کو بیان کر دیا) جو چیز اس کتاب میں (حضرت محمدؐ کی شریعت میں) حلال قرار دی گئی وہ قیامت تک حلال رہے گی اور جو چیز اس میں حرام قرار دی گئی وہ تا قیامت حرام رہے گی،

اس کتاب میں تمہارے تمام احکام دین مذکور ہیں، اور اس میں تم سے پہلے اور بعد میں آنے والوں کو خبریں ہیں۔ حضرت پیغمبر اسلام ؐ نے اسے ایسا سرچشمۂ علم قرار دیا جو آنحضرتؐ کے اوصیاء (آئمہ معصومینؑ) میں ہمیشہ باقی رہنے والا ہے لیکن عامۃ الناس نے ان اوصیاء و آئمہ معصومینؑ کو چھوڑ دیا حالانکہ وہ ہر زمانہ کے لوگوں پر گواہ بنائے گئے ہیں مگر لوگوں نے ان سے روگردانی کی اور پھر انہیں قتل کر دیا، ان کے علاوہ دوسروں کی پیروی کی اور اغیار کی مکمل و خالص اطاعت کرنے لگے، یہاں تک کہ انہوں نے اوصیاء برحق کی ولایت و محبت کا اظہار کرنے والوں اور ان کے علوم و معارف طلب کرنے والوں سے عناد و دشمنی مول لے لی، ایسے ہی لوگوں کے بارے میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: (وَنَسُوا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهِ ۚ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلَىٰ خَائِنَةٍ مِّنْهُمْ) انہوں نے وہ سب کچھ بھلا دیا جس کی انہیں یاد دلائی گئی اور آپ ہمیشہ ان کی خیانت کاری سے آگاہ ہوتے رہیں گے ، ان کے اس حالت سے دوچار ہونے کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے قرآن کے بعض حصہ کو دوسرے بعض پر مارا (غلط تفسیر و تاویل کی)، انہوں نے منسوخ شدہ آیت کو ناسخ سمجھ کر اس سے استدلال و استناد کیا، اور متشابہ آیت کو محکم سمجھتے ہوئے اس سے استدلال کیا، اور خاص آیت کو عام قرار دے کر اسے اپنے مدعاء کی دلیل کے طور پر پیش کیا، انہوں نے کسی آیت کے ابتدائی جملوں سے تمسک اختیار کیا مگر اس کی تاویل کے سبب کو ترک کر دیا، انہوں نے اپنے استدلال میں آیت کے بتدائی جملوں اور آخری جملوں میں توجہ و غور کئے بغیر اس سے اپنے مقصود کے اثبات میں استفادہ کی کوشش کی ،انہوں نے کلام الٰہی کے موارد و مصادر کو پہچانا ہی نہیں کیونکہ انہوں نے اسے اس کے اہل سے نہیں لیا (قرآن کو قرآن والوں سے نہیں لیا) جس کے نتیجہ میں خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کر دیا، اور تم جان لو! اللہ تم پر رحم فرمائے، کہ جو شخص کتاب خدا کے ناسخ و منسوخ، خاص و عام، محکم و متشابہ، جائز و واجب احکام، مباح و لازمی دستورات و اعمال، مکی آیات و مدنی آیات، اسباب تنزیل، قرآن کے منقطع و متصل اور غیر مرتب و مرتب الفاظ میں سے مبہم، قضاء و قدر سے مربوط آیات کا علم، مقدم و مؤخر، مبین و واضح اور عمیق، ظاہر و باطن، ابتداء و انتہاء، سوال و جواب، قطع و وصل، مستثنیٰ اور مستثنیٰ منہ، ماقبل اور مابعد سے مربوط صفات، مؤکد و مفصل، واجبات و محرمات اور مستحبات و مکروہات، فرائض و احکام سے مربوط مقامات، معانی حلال و حرام کہ جن میں تمیز کئے بغیر ملحدین ہلاکت کا شکار ہو گئے، الفاظ کے مصداقی موارد اور آیت کے اپنے ماقبل و مابعد سے ربط و تعلق سے آگاہی نہ رکھتا ہو وہ نہ تو قرآن کا عالم ہے اور نہ ہی اس کا اہل ہے۔ اور جب کوئی شخص مذکورہ اقسام کی معرفت و آگاہی کا حامل ہونے کا دعویٰ کرے تو اس کا دعویٰ بلا دلیل ہوگا اور وہ جھوٹا و فریبی ہے کہ جو چاہتا ہے کہ خدا اور رسول خداؐ پر افتراء پردازی کرے، اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے کہ جو بہت برا ٹھکانہ ہے۔ (تفسیر نعمانی ص ۵)

امیر المومنینؑ کا ارشاد گرامی

نہج البلاغہ اور کتاب الاحتجاج (طبرسیؒ) میں مذکور ہے کہ حضرت امام امیر المومنینؑ نے ارشاد فرمایا:

" ترد علٰی احدھم القضیة فی حکم من الاحکام فیحکم فیھا برأیہ، ثم ترد تلک القضیة بعینھا علٰی غیرہٖ فیحکم فیھا بخلاف قولہٖ، ثم تجتمع القضاة بذالک عندالامام الذی استقضاھم فیصوب 'ارائھم جمیعاً والٰھم واحد، ونبیھم واحد، وکتابھم واحد، أفامرھم اللہ سبحانہٗ بالاختلاف فاطاعوہ ؟ ام نھاھم عنہ فیعصوہ ؟ ام انزل اللہ دیناً ناقصاً فاستعان بھم علٰی اتمامہٖ ؟ ام کانوا شرکاء فلھم ان یقولوا وعلیہ ان یرضی ؟ ام انزل اللہ دیناً تاماً فقصر الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عن تبلیغہٖ وادائہٖ ؟ واللہ سبحانہٗ یقول: (ما فرطنا فی الکتاب من شیئ وفیہ تبیان کل شیئ)، وذکر ان الکتاب یصدق بعضہٗ بعضاً وانہٗ لااختلاف فیہ، فقال سبحانہٗ: (ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافاً کثیراً)، وان القرآن ظاھرہ انیق وباطنہٗ عمیق، لا تحصٰی عجائبہٗ ولا تنقضی غرائبہٗ ولا تکشف الظلمات الابہٖ "۔

(جب ان میں سے کسی ایک کے پاس شرعی احکام میں سے کسی حکم کے بارے میں کوئی مسئلہ پیش ہوتا ہے تو وہ اس کی بابت اپنی رائے کے مطابق فیصلہ کر دیتا ہے، پھر جب وہی مسئلہ بعینہٖ کسی دوسرے کے پاس آتا ہے تو وہ اس کے برعکس فیصلہ صادر کرتا ہے، پھر جب وہ سب مفتی حضرات اور فیصلہ کرنے والے اپنے اس امام کے پاس اکٹھے ہوتے ہیں جس نے انہیں منصب قضاوت عطا کیا اور حکم و فیصلہ صادر کرنے کا اختیار و ذمہ داری دی تو وہ ان سب کی آراء و فیصلوں کی توثیق اور انہیں درست قرار دیتا ہے، جبکہ ان کا معبود ایک، ان کا نبی ایک اور ان کی کتاب ایک ہے، تو کیا خدا نے انہیں آپس میں اختلاف سے منع کیا اور انہوں نے اس کی نافرمانی کی ؟ یا خداوند عالم نے ناقص و نامکمل دین نازل کیا اور اس کی تکمیل اور پورا کرنے میں ان سے مدد مانگی ؟ یا وہ خدا کے شریک کار ہیں لہٰذا وہ جو کچھ کہہ دیں خدا کا فرض ہے کہ اس پر راضی ہو؟ یا خداوند عالم نے تو دین مکمل نازل کیا مگر رسول خداؐ نے اس کی تبلیغ اور اسے پہنچانے میں کوتاہی کی ؟ جبکہ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے: (سورۂ انعام آیت ۳۸) "مَا فَرَّطْنَا فِی الْکِتٰبِ مِنْ شَیْءٍ" (وفیہ تبیان کل شیئ) "ہم نے قرآن میں کوئی فروگذاشت نہیں کی، (اور اس میں ہر چیز کا واضح بیان ہے) اور قرآن ہی میں مذکور ہے کہ اس کی آیات ایک دوسری کی تصدیق کرتی ہیں اور اس میں کسی طرح کا اختلاف نہیں پایا جاتا چنانچہ ارشاد الٰہی ہے: ﴿لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ

لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا)..... اگر وہ خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتا تو لوگ اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے (سورۂ نسآء، آیت ۸۲) یاد رکھو! قرآن کا ظاہر دلکش و دلربا ہے اور اس کا باطن عمیق ہے، اس کے عجائبات (اسرار و رموز اور حقائق و معارف) شمار نہیں کئے جا سکتے اور اس کے غرائب و منفرد مطالب انتہاء پذیر نہیں، ظلمات (گمراہی و جہالت کے اندھیرے اور تاریکیاں) اس کے علاوہ کسی دوسرے ذریعے سے چھٹ نہیں سکتیں۔

(نہج البلاغہ خطبہ ۱۸۔ الاحتجاج ج ۱ ص ۳۸۹)

اس روایت میں.....جیسا کہ آپ خود ملاحظہ کر رہے ہیں.....واضح وصریح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ ضروری ہے ہر دینی نظریہ کا منتہیٰ قرآن ہو، اور حضرت امیر المومنینؑ نے اپنے ارشاد میں آیت کے ساتھ جو الفاظ ذکر کئے ہیں یعنی "وفیہ تبیان کل شیئ" اور اس میں ہر شئے کا واضح بیان موجود ہے۔ تو یہ ایک قرآنی آیت کے معنی کی طرف اشارہ ہے۔ اس سے استناد ہے، آیت کا نقل بالمعنیٰ ہے۔ ،

غلط تفسیریں کرنے کا نتیجہ

تفسیر درمنثور میں مذکور ہے کہ ابن سعد سے مروی ہے، اور ابن ضریس نے اپنی کتاب "الفضائل" میں لکھا ہے، اور ابن مردویہ نے عمرو بن شعیب، ان کے والد اور دادا کے حوالہ سے روایت بیان کی ہے کہ: ایک دن حضرت پیغمبر اسلامؐ نہایت غضبناک حالت میں ان لوگوں کے پاس آئے جو قرآنی آیات کے بارے میں ایک دوسرے سے الجھ رہے تھے، آنحضرتؐ نے ان سے ارشاد فرمایا:

(بهذا ضلت الامم قبلكم باختلافهم على انبيائهم و ضرب الكتاب بعضه ببعض، وان القرآن لم ينزل ليكذب بعضه بعضاً ولكن نزل يصدق بعضهٔ بعضاً، فما عرفتم فاعملوا به وما تشابه عليكم فآمنوا به)

اسی روش کی وجہ سے تم سے پہلی امتیں گمراہ ہوئیں کہ انہوں نے اپنے انبیاء سے اختلاف کیا، اور کتابِ خدا کی غلط تفسیریں کیں، جہاں تک قرآن کی بات ہے تو وہ اس لئے نازل نہیں ہوا کہ اس کا ایک حصہ دوسرے حصہ کی تکذیب کرے بلکہ وہ ایک حصہ دوسرے حصہ کی تصدیق کرتا ہوا نازل ہوا، لہٰذا تم جس سے آگاہ ہو جاؤ اس پر عمل کرو اور جو تم پر واضح نہ ہو سکے تو اس پر ایمان لاؤ۔ (تفسیر "درمنثور" جلد ۱ ص ۶)

آیات کی تعبیر و تکذیب کی ممانعت

تفسیر درمنثور ہی میں مذکور ہے کہ احمد نے دوسرے اسناد سے عمرو بن شعیب سے ان کے والد اور دادا کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ نے سنا کہ کچھ لوگ قرآنی آیات کے بارے میں آپس میں الجھ رہے ہیں تو آپؐ نے ان سے ارشاد فرمایا:

" انما هلک من کان قبلکم بهذا ضربوا کتاب الله بعضهٔ ببعض، وانما نزل کتاب الله یصدق بعضهٔ بعضاً فلا تکذبوا بعضهٔ ببعض، فماعلمتم منه فقولوا، وما جهلتم فکلوه الٰی عالمه "

" جو لوگ تم سے پہلے تھے وہ بھی اسی طرح بحث کرنے کے نتیجہ میں تباہ ہوئے، انہوں نے کتاب خدا کی غلط انداز میں تفسیریں کیں، خدا کی کتاب اس طرح نازل ہوئی ہے کہ اس کا ایک حصہ دوسرے حصہ کی تصدیق کرتا ہے لہٰذا تم اس کی کسی آیت کے ذریعے دوسری کسی آیت کی تکذیب نہ کرو، اس سے جو کچھ جان لو وہ بیان کرو اور جس سے ناآگاہ ہو اسے اس کے عالم پر چھوڑ دو "، (تفسیر درمنثور جلد ۲ صفحہ ۶)

مذکورہ بالا روایت میں جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا ہے "**ضرب القرآن بعضهٔ بعضاً**" (قرآن کے بعض حصہ کو دوسرے بعض پر مارنا) کو "**تصدیق بعض القرآن بعضاً**" (قرآن کے بعض حصہ کا دوسرے بعض کی تصدیق کرنا) کے مقابل قرار دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "**ضرب القرآن بعضهٔ بعضاً**" سے مراد معانی و موارد کے حوالہ سے آیات کو خلط ملط کر دینا اور ان کے مقاصد کی ترتیب میں خلل ڈالنا ہے مثلاً محکم کو متشابہ اور متشابہ کو محکم قرار دینا اور اس طرح کے دیگر اعمال !

بنابرایں قرآن کی بابت اپنی رائے کی بنیاد پر اظہار سخن (تفسیر بالرائے) اور آیات کے معانی میں علم و آگاہی کے بغیر اظہار خیال کرنا، جیسا کہ سابق الذکر روایات میں بیان کیا گیا ہے اور "**ضرب القرآن بعضهٔ بعضاً**" (قرآن کے بعض حصہ کو دوسرے بعض حصہ پر مارنا) جو کہ حالیہ ذکر کی گئی روایات میں وارد ہوا ہے ان سب کا محور ایک ہی معنی ہے اور وہ یہ کہ تفسیر القرآن میں قرآن کے علاوہ کسی سے مدد لینا، (اور یہی امر مذموم، باطل اور موجب ہلاکت ہے)

ایک سوال اور اس کا جواب

سوال:

ممکن ہے آپ یہ کہیں کہ اس میں کوئی شک ہی نہیں کہ قرآن اس لئے نازل ہوا ہے کہ لوگ اسے سمجھیں اور اس کا فہم و ادراک حاصل کریں جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:

سورۂ زمر، آیت :۴۱

○ " اِنَّآ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ لِلنَّاسِ "

(بے شک ہم نے آپ پر کتاب نازل کی لوگوں کے لئے)

سورۂ آل عمران، آیت :۱۳۸

○ " هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ "

(یہ لوگوں کے لئے بیان و وضاحت ہے)

اور اس طرح کی دیگر متعدد آیات مبارکہ میں اس مطلب کو بیان کیا گیا ہے کہ قرآن لوگوں کے سمجھنے کے لئے نازل کیا گیا ہے، اور اس امر میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس کی وضاحت کرنے والے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، جیسا کہ ارشاد حق تعالیٰ ہے:

سورۂ نحل، آیت :۴۴

○ " وَاَنۡزَلۡنَآ اِلَيۡكَ الذِّكۡرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيۡهِمۡ "

(اور ہم نے آپ پر ذکر (قرآن) نازل کیا ہے تاکہ آپ واضح طور پر لوگوں کو بتائیں کہ ان کے لئے کیا نازل کیا گیا ہے)

آنحضرتؐ نے صحابہ کرام کو قرآن کی تبیین و توضیح کی اور انہیں خدا کی نازل کردہ کتاب کے معانی سے واضح طور پر آگاہ فرمایا، پھر تابعین نے صحابہ کرام سے وہ مطالب حاصل کئے، اور صحابہ کرام و تابعین حضرات نے جو کچھ آنحضرتؐ کے حوالہ سے ہم تک پہنچایا وہ بیان نبویؐ ہے کہ صریح قرآنی حکم کی بناء پر اس سے چشم پوشی و بے اعتنائی ہرگز روا نہیں۔

اور جہاں تک صحابہ کرام و تابعین حضرات کے ان بیانات کا تعلق ہے جن میں انہوں نے آنحضرتؐ کے ارشادات سے استفادہ نہیں کیا اور آپؐ کے فرمودات کا حوالہ نہیں دیا تو اگرچہ وہ حدیث نبویؐ کا درجہ نہیں رکھتے اور نہ ہی اس

کی مانند حجت قرار پاتے ہیں لیکن ان بیانات سے قلبی اطمینان حاصل ہوتا ہے (اور وہ فہم القرآن میں غیر معمولی کردار ادا کرتے ہیں) کیونکہ انہوں نے آیات کی تفسیر میں جو کچھ بیان کیا وہ دو حال سے خالی نہیں: یا انہوں نے آنحضرتؐ سے سنا ہے یا آنحضرتؐ کے بیان و تعلیم سے حاصل ہونے والے قرآن فہمی کے خاص ذوق کا نتیجہ ہے، اسی طرح ان کے شاگردوں میں سے تابعین و تبع تابعین اور ان کے بعد آنے والے اہل علم حضرات نے جو کچھ ذکر کیا اس کا مقام و درجہ بھی وہی ہے جو صحابہ و تابعین کے بیانات کا ہے، اور یہ بات کیونکر درست ہوسکتی ہے کہ ان لوگوں کو قرآن کے معانی سے آگاہی حاصل نہ ہو جبکہ وہ عربی زبان پر کامل مہارت اور اس کی بابت مکمل آشنائی رکھتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ ہمیشہ کوشاں رہے کہ قرآنی آیات کے معانی سرچشمۂ رسالت (حضرت پیغمبر اسلامؐ) سے کسب کریں اور تاریخ اس حقیقت کی گواہی دیتی ہے کہ صدرِ اسلام میں علماء دین نے اپنی پوری توجہات دین فہمی میں مبذول رکھیں، بنابرایں یہ امر واضح و آشکار ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے طریقہ و روش سے روگردانی، اور ان کے گروہ و جماعت سے باہر نکل کر کسی قرآنی آیت کی تفسیر کرنا بدعت ہے، اور جن آیات کی تفسیر میں ان کی طرف سے کوئی بیان موجود نہ ہو اور انہوں نے اس کی بابت اظہار خیال نہ کیا ہو تو اس کے بارے میں سکوت اختیار کرنا ضروری ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو مطالب ان کی طرف سے منقول ہوئے ہیں وہ قرآن فہمی کے لئے کافی و وافی ہیں کیونکہ ان کے بیانات ہزاروں روایات پر مشتمل ہیں، چنانچہ سیوطی نے ان کی تعداد سترہ ہزار تک بتائی ہے کہ جو یا حضرت پیغمبر اسلامؐ سے منقول ہیں یا صحابۂ کرام و تابعین سے منقول ہیں۔

جواب:

ہم اپنے سابقہ ذکر کئے گئے مطالب میں یہ نکتہ بیان کر چکے ہیں کہ جو آیات مبارکہ عامۃ الناس خواہ وہ کافر ہوں یا مومن اور خواہ انہوں نے عصر نبویؐ کو پایا ہو یا نزولِ قرآن کے بعد کے ادوار میں آئے ہوں، سب کو قرآن فہمی اور اس میں غور و فکر اور تدبر و تعقل کی دعوت دیتی ہیں بالخصوص آیت مبارکہ "اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا كَثِیْرًا" (سورۂ نساء، آیت ۸۲) (وہ قرآن میں غور و فکر اور تدبر کیوں نہیں کرتے کہ اگر وہ اللہ کے علاوہ کسی اور کی طرف سے آیا ہوتا تو لوگ اس میں کثیر اختلاف پاتے) اس طرح کی آیات سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ قرآنی معارف ہر تدبر اور بحث و تفکر کرنے والے شخص کے لئے قابل فہم ہیں یعنی جو شخص آیات میں غور و فکر سے کام لے و ران کے معانی کے سمجھنے کی کوشش کرے وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہوسکتا ہے اور اس کے غور و فکر کے نتیجہ میں آیات کے درمیان ظاہری طور پر دکھائی دینے والا اختلاف خود بہ خود دور ہو جائے گا۔ اور مذکورہ بالا آیت مبارکہ عمومی اعلان کر رہی ہے (کہ قرآن میں کوئی اختلاف نہیں) جو کہ ایک چیلنج ہے لہٰذا اس طرح کے مقام میں ہونے والی آیت کے باوجود آیات کے

معانی کا سمجھنا صحابہ و تابعین سے مخصوص کیا جائے اور فہم الآیات کی بابت ان کی طرف رجوع کرنا مراد لیا جائے ؟ بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ اس سے حضرت پیغمبر اسلامؐ کے بیانات وارشادات کی طرف رجوع کرنا بھی مراد نہیں لیا جا سکتا کیونکہ فرمودات نبویؐ یا تو اس معنی سے مطابقت کے حامل ہوں گے جو ظاہر الکلام سے سمجھا جاتا ہے یا اس سے مطابقت نہ رکھتے ہوں گے، پہلی صورت میں ان کی طرف رجوع کرنا اس لئے ناگزیر نہیں کہ خود ظاہر الکلام اور الفاظ آیات ...... خواہ تدبر و تفکر اور بحث وغور وفکر کرنے کے بعد ہی کیوں نہ ہو ...... اس پر دلالت کرتے ہیں، اور دسری صورت میں آیت کا عمومی اعلان اور چیلنج بے معنی ہو جاتا ہے اور اس طرح کے اظہار کا مقصد ہی باقی نہیں رہتا۔ البتہ جہاں تک احکام الٰہی کی تفصیل اور جزئیات کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں آنحضرتؐ کے ارشاداتِ عالیہ کی طرف رجوع کرنا ناگزیر ہے اس کے سوا کوئی چارۂ کار ہی نہیں جیسا کہ خود قرآن مجید نے ان کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا ہے چنانچہ ارشاد حق تعالیٰ ہے:

سورۂ حشر، آیت :۷

○ " وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ "

(جو کچھ رسول تمہیں دیں اسے لے لو اور جس چیز سے تمہیں منع کریں اس سے رک جاؤ)

اس آیت مبارکہ میں آنحضرتؐ کے فرمودات پر عمل کرنے کا صریح حکم موجود ہے ...... تو اس سے مراد یہ ہے کہ احکامات خداوندی کی تفصیلات و جزئیات کے بارے میں آنحضرتؐ کا فرمان حرف آخر ہے اور اس کا اتباع ضروری ہے ...... ، اس مطلب پر مبنی دیگر آیات بھی موجود ہیں جن میں ارشادِ نبویؐ کی پیروی کرنے اور آپؐ کے بیان کردہ احکام پر عمل کرنے کا حکم مذکور ہے۔ احکام کے علاوہ سابقہ امتوں کی داستانوں اور قیامت سے مربوط معارف و مسائل کی بابت بھی یہی قرآنی دستور ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان امور میں آنحضرتؐ کا مقام و منصب تعلیم الکتاب ہی ہے، اور تعلیم سے مراد یہ ہے کہ قابل و ماہر معلم، متعلم کے ذہن کو ان مطالب تک رسائی کی رہنمائی کرے جن کا فہم وادراک دشوار ہو اور متعلم آسانی سے ان کو حاصل نہ کر سکتا ہو نہ یہ کہ ان کا سمجھنا تعلیم کے بغیر محال و ناممکن ہو کیونکہ تعلیم دینا مطالب تک رسائی کے آسان طریقہ سے آشنا کرنے اور متعلم کے ذہن کو مقاصد و مفاہیم سے قریب تر کر دینے کا دوسرا نام ہے۔ تعلیم دینے سے مراد ہرگز یہ نہیں کہ مطالب تک رسائی کا نیا راستہ بنائے یا نیا مقصد و مفہوم ایجاد کرے، معلم کوشش کرتا ہے کہ علمی مطالب کو اس طرح مرتب و منظم کرے کہ متعلم کا ذہن نہایت آسانی کے ساتھ انہیں سمجھ لے اور ان سے فکری قرب و مانوسیت حاصل کر لے تاکہ اسے ان کے فہم و ادراک میں ان کے مرتب و منظم کرنے کی تکلیف و زحمت نہ اٹھانی پڑے کہ جس سے اس کی زندگی کے قیمتی اوقات ضائع ہوں اور اس کی فکری توانائیاں رایگاں جائیں، یا یہ کہ وہ فہم المعانی میں کسی غلطی کا مرتکب ہو جائے اور اصل مقاصد و مفاہیم کے علاوہ کچھ اور ہی سمجھنے لگے۔ یہ وہ مطلب ہے جس کا ثبوت متعدد قرآنی آیات میں پایا جاتا ہے مثلاً:

سورۂ نحل، آیت : ۴۴

○ " وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَیْهِمْ "

(اور ہم نے آپ کی طرف ذکر (قرآن) نازل کیا تا کہ آپ لوگوں کو واضح کر کے بتائیں کہ ان کے لئے کیا نازل کیا گیا ہے)

سورۂ جمعہ، آیت : ۲

○ " وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ "

(اور وہ انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے)

بنابرایں حضرت پیغمبر اسلامؐ لوگوں کو احکام خداوندی کی تعلیم دینے والے اور انہیں واضح طور پر اس معنی ومفہوم سے آگاہی دلانے والے ہیں جس پر خود قرآن دلالت کرتا ہے اور خداوند عالم جسے اپنے کلام کے ذریعے بیان کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا ان معانی ومفاہیم کا ادراک بالآخر لوگوں کے لئے ممکن ہے کیونکہ آنحضرتؐ انہیں ان معانی ومفاہیم سے آگاہی دلاتے ہیں، ایسا نہیں کہ آنحضرتؐ انہیں ان معانی سے آگاہی دلاتے ہیں جن تک رسائی لوگوں کے لئے ممکن نہیں اور لوگ کلام الٰہی کے سمجھنے سے قاصر ہیں کیونکہ ایسا ہونا ممکن ہی نہیں اور یہ بات قرآنی آیات کی تصریحات کے منافی ہے اور کسی طرح سے ظاہر الکلام سے مطابقت نہیں رکھتی مثلاً ارشاد حق تعالیٰ ہے:

سورۂ حم سجدہ، آیت : ۳

○ " كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰیٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لِّقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ "

(وہ کتاب کہ جس کی آیات کھول کھول کر نازل کی گئی ہیں، عربی زبان میں نازل ہونے والا قرآن ہے تا کہ لوگ آگاہ ہوں)

سورۂ نحل، آیت : ۱۰۳

○ " وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ "

(اور یہ واضح عربی زبان ہے)

لہٰذا یہ کہنا کہ لوگ اس کے فہم وادراک سے قاصر وعاجز ہیں درست نہیں۔

اس کے علاوہ متعدد روایات ایسی موجود ہیں جن میں حضرت پیغمبر اسلامؐ نے قرآن سے تمسک اختیار کرنے اور اس سے معارف الٰہیہ حاصل کرنے کی تاکید فرمائی ہے...... اور وہ روایات تواتر کی حد تک پہنچی ہوئی ہیں..... اور ان روایات میں آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو روایات آنجنابؐ کے حوالہ سے لوگوں تک پہنچیں تو وہ ان روایات کو قرآن کے تناظر میں

پرکھیں اور قرآنی آیات کی بناء پر ان کی صحت وعدم صحت کا تعین کریں، یہ بات اسی صورت میں درست ہوسکتی ہے جب آنحضرتؐ سے منقول تمام روایات کی بابت قرآن سے استفادہ اور رہنمائی حاصل کرنا ممکن ہو، لیکن اگر قرآن سے استفادہ کرنا آنحضرتؐ کے بیانات پر موقوف ہو......اس کے سوا قرآن فہمی ممکن ہی نہ ہو......اور آنحضرتؐ کے بیانات کا سمجھنا قرآن پر موقوف ہو تو یہ ایک محال وغیر معقول......بات ہو جائے گی کہ جسے علمی اصطلاح میں "دَور" (دال پر زبر کے ساتھ) کہتے ہیں..... اس سے مراد یہ ہے کہ مثلاً الف کا وجود، ب پر اور با کا وجود، الف پر موقوف ہو، یہ عقلی طور پر محال و ناممکن ہے۔ "دَور" کا بطلان وعدم درستی ظاہر وواضح ہے۔

اس کے علاوہ یہ کہ جو احادیث صحابہء کرام کے حوالہ سے منقول ہیں..... ان کے سلسلۂ سند سے قطع نظر.....ان میں صحابہء کرام ہی کے بیانات ایک دوسرے سے مختلف ہیں بلکہ ان میں سے کسی ایک صحابی سے منقول روایات واحادیث میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے چنانچہ یہ مطلب ہر اس حدیث شناس دانشور پر واضح ہے جو صحابہء کرام کی بیان کردہ اور ان سے منقول روایات سے آگاہی رکھتا ہے اور ان کا تتبع اور ان میں تفکر وتدبر کرتا ہے۔

اور یہ بات بھی درست نہیں کہ صحابہء کرام سے منقول ان روایات میں سے کسی ایک کا انتخاب وتعین ضروری ہے جو کسی آیت کی تفسیر میں مختلف بیانات پر مشتمل ہیں یعنی اگرچہ روایات کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود ان میں سے کسی ایک کا انتخاب ناگزیر ہے تاکہ اجماع ٹوٹنے نہ پائے اور صحابہء کرام کی جماعت سے باہر نہ نکلیں۔......اس بات کی نادرستی اس طرح ہے کہ......وہ خود اس راہ پر نہیں چلے اور انہوں نے اس طریقہ وروش کو نہیں اپنایا اور نہ ہی اس طرح کے راہِ حل کو اختیار کرنا ضروری سمجھا بلکہ انہوں نے اپنے درمیان پائے جانے والے اختلاف کی پرواہ ہی نہیں کی...... اور ہر ایک نے دوسرے کے بیان کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اظہارِ سخن کیا.....تو ان کے علاوہ دوسروں پر یہ بات کیونکر ضروری قرار پا گئی ہے کہ وہ صحابہء کرام کے بیانات کو حرفِ آخر قرار دیں اور اجماع کا تحفظ کرتے ہوئے ان کی ہر بات کو حجت قرار دیں اور ان میں سے کسی ایک کے قول ونظریہ کی مخالفت کو حرام سمجھیں جبکہ یہ کام یعنی کسی ایک کے قول ونظریہ کی مخالفت کرنا خود ان کے لئے جائز ہو۔

صدرِ اسلام کے مفسرین کرام صحابہ وتابعین کے اقوال اور ان سے منقول بیانات ہی پر اکتفاء وانحصار کرنا اور آیاتِ قرآنیہ کے معانی سمجھنے کے لئے صرف انہی کے بیان کردہ مطالب کا سہارا لینا علمی ترقی کے سفر کو متوقف کردینے کا سبب بنے گا اور نتیجتاً بحث وتحقیق اور تفکر وتدبر کی راہیں بند ہو جائیں گی جیسا کہ ہم خود اس امر کا مشاہدہ کررہے ہیں کہ صدرِ اسلام کے علماء ودانشوروں کے اقوال اور قرونِ اولیٰ میں لکھی جانے والی کتبِ تفسیر میں نہایت معمولی اور علمی وتحقیقی باریک بینی سے خالی وعاری معانی ومطالب کے سوا کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ تو اس صورت میں ان قرآنی معارف کی باریکیوں اور نہایت عمیق حقائق کا

پرکھیں اور قرآنی آیات کی بناء پر ان کی صحت وعدم صحت کا تعین کریں، یہ بات اسی صورت میں درست ہوسکتی ہے جب آنحضرتؐ سے منقول تمام رویات کی بابت قرآن سے استفادہ اور رہنمائی حاصل کرنا ممکن ہو، لیکن اگر قرآن سے استفادہ کرنا آنحضرتؐ کے بیانات پر موقوف ہو ......اس کے سوا قرآن فہمی ممکن ہی نہ ہو...... اور آنحضرتؐ کے بیانات کا سمجھنا قرآن پر موقوف ہو تو یہ ایک محال ...... وغیر معقول...... بات ہوجائے گی کہ جسے علمی اصطلاح میں " دَور "(دال پر زبر کے ساتھ) کہتے ہیں...... اس سے مراد یہ ہے کہ مثلاً الف کا وجود، ب پر اور با کا وجود، الف پر موقوف ہو، یہ عقلی طور پر محال و ناممکن ہے...... "دَور" کا بطلان وعدم درستی ظاہر وواضح ہے۔

اس کے علاوہ یہ کہ جو احادیث صحابہء کرام کے حوالہ سے منقول ہیں......ان کے سلسلہ سند سے قطع نظر...... ان میں صحابہء کرام ہی کے بیانات ایک دوسرے سے مختلف ہیں بلکہ ان میں سے کسی ایک صحابی سے منقول روایات واحادیث میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے چنانچہ یہ مطلب ہر اس حدیث شناس دانشور پر واضح ہے جو صحابہء کرام کی بیان کردہ اور ان سے منقول روایات سے آگاہی رکھتا ہے اور ان کا تتبع اور ان میں تفکر وتدبر کرتا ہے۔

اور یہ بات بھی درست نہیں کہ صحابہء کرام سے منقول ان روایات میں سے کسی ایک کا انتخاب وتعین ضروری ہے جو کسی آیت کی تفسیر میں مختلف بیانات پر مشتمل ہیں یعنی اگرچہ روایات کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود ان میں سے کسی ایک کا انتخاب ناگزیر ہے تاکہ اجماع ٹوٹنے نہ پائے اور صحابہء کرام کی جماعت سے باہر نہ نکلیں۔ ......اس بات کی نادرستی اس طرح ہے کہ...... وہ خود اس راہ پر نہیں چلے اور انہوں نے اس طریقہ وروش کو نہیں اپنایا اور نہ ہی اس طرح کے راہ حل کو اختیار کرنا ضروری سمجھا بلکہ انہوں نے اپنے درمیان پائے جانے والے اختلاف کی پرواہ ہی نہیں کی ...... اور ہر ایک نے دوسرے کے بیان کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اظہار سخن کیا......تو ان کے علاوہ دوسروں پر یہ بات کیونکر ضروری قرار پا گئی ہے کہ وہ صحابہء کرام کے بیانات کو حرف آخر قرار دیں اور اجماع کا تحفظ کرتے ہوئے ان کی ہر بات کو حجت قرار دیں اور ان میں سے کسی ایک کے قول ونظریہ کی مخالفت کو حرام سمجھیں جبکہ یہ کام یعنی کسی ایک کے قول ونظریہ کی مخالفت کرنا خود ان کے لئے جائز ہو۔

صدر اسلام کے مفسرین کرام صحابہ وتابعین کے اقوال اور ان سے منقول بیانات ہی پر اکتفاء وانحصار کرنا اور آیات قرآنیہ کے معانی سمجھنے کے لئے صرف انہی کے بیان کردہ مطالب کا سہارا لینا علمی ترقی کے سفر کو متوقف کردینے کا سبب بنے گا اور نتیجتاً بحث وتحقیق اور تفکر وتدبر کی راہیں بند ہوجائیں گی جیسا کہ ہم خود اس امر کا مشاہدہ کررہے ہیں کہ صدر اسلام کے علماء و دانشوروں کے اقوال اور قرون اولیٰ میں لکھی جانے والی کتب تفسیر میں نہایت معمولی اور علمی وتحقیقی باریک بینی سے خالی وعاری معانی ومطالب کے سوا کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ تو اس صورت میں ان قرآنی معارف کی باریکیوں اور نہایت عمیق حقائق کا

مقام کہاں ہوگا جن کا تذکرہ درج ذیل آیت مبارکہ میں ہوا ہے ؟

سورۂ نحل، آیت :۸۹

○ " وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ "

(اور ہم نے آپ پر کتاب نازل کی ہے جو ہر چیز کے واضح بیان پر مشتمل ہے)

اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ صحابہ ء کرام وتابعین حضرات کا فہم القرآن ومعانی آیات سے ناآگاہ ہونا کیونکر ممکن ہے جبکہ وہ نہایت علمی وفکری بلندی پر فائز تھے۔ اور عربی زبان میں کامل مہارت رکھتے تھے..... تو اس کا جواب خود انہی کے بیانات میں پائے جانے والے اختلاف اور آیات مبارکہ کے معانی کے تعین میں ان سے منقول متناقض آراء ہی سے معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ انہوں نے تفسیر الآیات میں کس قدر اختلاف رائے کیا۔ اور ان کے اقوال وبیانات اور آراء میں اختلاف وتناقض کا پایا جانا اس عمومی قاعدہ وکلیہ کا ایک مصداق ہے کہ اختلاف وتناقض اسی صورت میں قابل تصور ہے جب حق وواقع الامر مخفی و پوشیدہ ہو اور اصل حقیقت معلوم نہ ہو بلکہ حق وغیر حق کی راہیں واضح نہ ہوں اور ان میں خلط ملط پیدا ہو جائے۔

بنا برایک حق تو یہ ہے کہ فہم القرآن کی راہیں ہرگز مسدود نہیں بلکہ بیان الٰہی اور ذکر حکیم خود ہی اپنی حقیقت اور حقیقی معانی ومفاہیم سے آگاہی دلانے میں بہترین رہنما ہے (اور وہ خود فہم الآیات کا سیدھا راستہ ہے) یعنی وہ اپنے مقاصد کی وضاحت کے لئے کسی دوسرے راستہ وسبب کا محتاج نہیں اور یہ تصور کیونکر ممکن ہے کہ جس کتاب کی توصیف میں خداوند عالم اسے "ہادی" و "رہنما"، "نور" اور ہر چیز کا واضح بیان قرار دے وہ اپنے علاوہ کسی دوسرے ہادی ورہنما کا محتاج ہو اور اپنے علاوہ کسی دوسرے کے نور سے روشنی طلب کرے اور اپنے علاوہ کسی دوسرے سبب سے اپنے مقاصد کی وضاحت کرے ؟

ظاہر القرآن اور ظاہر البیان کی وضاحت

مذکورہ بالا مطالب کے تناظر میں ممکن ہے آپ سوال کریں کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ سے صحیح السند روایت منقول ہے آپؐ نے اپنے ایک آخری خطاب میں ارشاد فرمایا:

" انی تارک فیکم الثقلین، الثقل الاکبر والثقل الاصغر، فاما الاکبر فکتاب ربی، واما الاصغر فعترتی اهل بیتی، فاحفظونی فیهما فلن تضلوا ما تمسکتم بهما "

(میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑ رہا ہوں۔ ایک بڑی اور ایک چھوٹی، جو بڑی ہے وہ میرے پروردگار کی کتاب

ہے اور جو چھوٹی ہے وہ میری عترت اہل بیتؑ ہے، تم ان دونوں میں مجھے یاد رکھو (ان کی بابت میری نصیحتوں و تاکیدات کو ملحوظ خاطر و مدنظر قرار دو)۔ جب تک تم ان دونوں سے تمسک رکھو گے (ان سے وابستہ رہو گے) تو ہرگز گمراہ نہ ہو گے)۔

اس حدیث کو فریقین شیعہ و سنی محدثین نے تواتر کے ساتھ متعدد و کثیر صحابہ کرام کے حوالے سے آنحضرتؐ کا ارشاد گرامی ذکر کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو: کتاب وسائل الشیعہ جلد ۱۸ ص ۱۹ حدیث ۹۔ صحیح مسلم مع شرح نوی ج ۱۵ ص ۱۸۰ باب فضائل علی ابن ابی طالبؑ)۔ جن صحابہ کرام نے یہ روایت بیان کی ان کی تعداد علمائے علم حدیث نے پینتیس (۳۵) تک لکھی ہے۔ بعض اسناد میں یہ الفاظ بھی موجود ہیں: "ولن یفترقا حتی یردا علی الحوض" (اور وہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوضِ کوثر پر آ جائیں گے)۔ اس حدیث میں حضرات اہل بیت علیہم السلام کے ارشادات کے حجت و حرفِ آخر ہونے کا ثبوت ملتا ہے لہٰذا تفسیر القرآن کی بابت جو کچھ ان کی طرف سے منقول ہو اس کا اتباع واجب ہے اور معانی آیات میں صرف انہی حضرات کے فرمودات پر اقتصار و انحصار ضروری ہے ورنہ ان کے اور قرآن کے درمیان جدائی تسلیم کرنی پڑے گی　جبکہ صریح حدیث نبویؐ میں ان کے درمیان جدائی نہ ہونے کا ذکر ہے۔...،

اس کا جواب یہ ہے کہ سطورِ بالا میں ہم نے اتباعِ رسولؐ کا جو معنیٰ ذکر کیا ہے وہ بعینہٖ یہاں بھی پایا جاتا ہے اور اہل بیتؑ کے اتباع کا معنیٰ بھی وہی ہے۔ اس حدیث میں ہرگز یہ مقصود نہیں کہ ظاہر القرآن کے حجت ہونے کی نفی کی جائے اور اہل بیتؑ کے ظاہر البیان کے سوا کسی چیز کو حجت نہ سمجھا جائے (یعنی تفسیر القرآن میں ان حضرات کے ظاہر البیان ہی کو حرفِ آخر قرار دے کر دوسری ہر چیز کی نفی کی جائے) اور یہ کیونکر ممکن ہے جبکہ حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ارشاد فرمایا ہے: "لن یفترقا" (وہ ایک دوسرے سے ہرگز جدا نہ ہوں گے) آپؐ نے اپنے فرمان میں دونوں کو حجت قرار دیا ہے، اور وہ اس طرح کہ قرآن اپنے معانی پر دلالت کرتا ہے اور معارف الٰہیہ کو آشکار کرتا ہے اور اہل بیتؑ قرآنی دلالت کا راستہ بتاتے ہیں اور لوگوں کو اس کے اغراض و مقاصد کی رہنمائی کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جس طرح پیغمبر اسلامؐ سے منقول ہے کہ آپؐ نے لوگوں کو قرآن سے تمسک اختیار کرنے اور اس سے معارف و حقائق حاصل کرنے کے لئے اس میں تفکر و تدبر کرنے کی دعوت دی اور احادیث کی صحت کا معیار ان کا قرآن سے مطابقت رکھنا قرار دیا، اسی طرح حضرات اہل بیت علیہم السلام سے بھی روایات منقول ہیں جن میں انہوں نے آنحضرتؐ کے بتائے ہوئے رہنما اصول کو اختیار کرنے کی دعوت دی اور لوگوں کو معانیٔ قرآن کے فہم و ادراک کے لئے خود قرآن سے استفادہ کرنے اور جو روایات ان حضرات سے منقول ہوں ان کی صحت قرآنی آیات کے تناظر میں طے کرنے کی دعوت و حکم دیا گیا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان حضرات سے تفسیر القرآن کی بابت جو روایات منقول ہیں ان میں بہت زیادہ روایات ایسی ہیں جن میں ایک آیت کے ذریعے دوسری آیت پر استدلال کیا گیا ہے اور ایک معنیٰ سے دوسرے معنیٰ

پر استشہاد ہوا ہے اور ایسا کرنا تبھی ممکن ہے جب معنیٰ، مخاطب کے لئے قابل فہم ہو اور سننے والے کا ذہن اپنے متعین راستہ سے ہوتا ہوا اس سے انس و قرب پا سکتا ہو۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بعض روایات کہ جو آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے منقول ہیں ان میں مذکورہ بالا مطلب کو صراحت و وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جیسا کہ برقی نے اپنی کتاب "محاسن" میں اپنے اسناد سے ابوعبید بحرانی کے حوالہ سے امام ابوجعفر علیہ السلام کا ارشاد گرامی ذکر کیا ہے جس میں امامؑ نے فرمایا:

" فمن زعم ان کتاب الله مبهم فقد هلک و اهلک "

(جس نے گمان کیا کہ اللہ کی کتاب میں ابہام پایا جاتا ہے وہ خود بھی تباہ ہوا اور اس نے دوسروں کو تباہ کیا)

(المحاسن، ص ۲۷۰ حدیث ۳۶۰)

اسی روایت سے قریب المعنیٰ ایک اور روایت اسی کتاب "محاسن" میں اور کتاب "احتجاج" (طبرسیؒ) میں انہی حضرتؑ سے منقول ہے جس میں آپؑ نے ارشاد فرمایا: **" اذا حدثتکم بشيئ فاسئلوني عنه من کتاب الله "** (جب میں تم سے کچھ بیان کروں تو تم مجھ سے اس کی بابت کتاب اللہ کا حوالہ پوچھ لو)۔ (الاحتجاج، جلد ۲ ص ۵۵)

مذکورہ بالا بیان سے احادیث و روایات کے درمیان دکھائی دینے والے ظاہری اختلاف کا جامع حل معلوم ہو جاتا ہے اور وہ اس طرح کہ بعض روایات اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ قرآنی معارف کا فہم و ادراک خود قرآن ہی کے ذریعے ممکن ہے اور وہ معارف عقلوں سے پوشیدہ نہیں۔ اور بعض روایات اس سے مختلف مطلب پر دلالت کرتی ہیں مثلاً تفسیر العیاشی (جلد ا ص ۱۱ ح ۲) میں جابر کے حوالہ سے منقول ہے انہوں نے کہا کہ امام ابوعبداللہ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: **" ان للقرآن بطناً وللبطن ظهراً "** قرآن کا ایک باطن ہے اور باطن کا ایک ظاہر ہے۔ پھر امامؑ نے رشاد فرمایا: **(یاجابر! ولیس شيئ ابعد من عقول الرجال منه، ان الآیة تنزل اولها في شيئ واوسطها في شيئ و 'اخرها في شيئ، وهو کلام متصل ینصرف علیٰ وجوه)** اے جابر! قرآن سے زیادہ کوئی چیز عقلوں سے دور نہیں کیونکہ ایسی آیات بھی موجود ہیں جن کی ابتداء کسی چیز کے بارے میں ہے اور جن کا وسط و درمیانی حصہ کسی دوسری چیز کے بارے میں ہے اور جن کا آخران دو کے علاوہ کسی تیسری چیز کے بارے میں ہے، اگرچہ وہ متصل اور جڑا ہوا کلام ہے لیکن کئی معانی پر محمول کیا جا سکتا ہے.... اس سے کئی معانی مراد لئے جا سکتے ہیں ،

یہ مطلب متعدد روایات میں ذکر کیا گیا ہے اور اس روایت میں جملہ **"ولیس شيئ ابعد من عقول الرجال منه "** (کوئی چیز قرآن سے زیادہ عقلوں سے دور نہیں) حضرت پیغمبر اسلامؐ کی ایک حدیث میں بھی ذکر ہوا ہے اور حضرت

علی علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا: (ان القـرآن حـمـال ذو وجـوه) ... قرآن کئی معانی کا حامل ہے ... (نہج البلاغہ، وصیت ۷۷)

بہر حال تفسیر قرآن کی بابت جس طریقہ وروش کے اپنانے کی تاکید کی گئی ہے وہ یہ کہ قرآن کی تفسیر خود اس کے طریقہ وروش کے مطابق کی جائے اور جس طریقہ وروش کے اپنانے سے منع کیا گیا ہے وہ یہ کہ اس کی تفسیر اس کی اصل راہ کے علاوہ کے ذریعے کی جائے۔ اور یہ امر واضح وروشن ہے کہ تفسیر کی بابت متعین طریقہ وروش یہ ہے کہ قرآن ہی سے قرآن فہمی کی مدد لی جائے اور ایک آیت کی تفسیر دوسری آیت سے کی جائے، اور ایسا کرنا اسی صورت میں ممکن ہے جب حضرت پیغمبر اسلامؐ اور اہل بیت علیہم السلام سے منقول احادیث وروایات کی جمع آوری، ان میں غور وفکر اور بحث وتحقیق کی بابت تمام تر کاوشیں بروئے کار لائی جائیں اور اس کے نتیجہ میں جو علمی، فکری، تحقیقی وتفسیری ذوق حاصل ہو اس کی بناء پر تفسیر کی وادی میں قدم رکھا جائے، (اور خدا ہدایت کرنے والا ہے)

آیات ۱۰ تا ۱۸

○ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِیَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا ؕ وَاُولٰٓىِٕكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِۙ﴿۱۰﴾

○ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا ۚ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ شَدِیْدُ الْعِقَابِ﴿۱۱﴾

○ قُلْ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ؕ وَبِئْسَ الْمِهَادُ﴿۱۲﴾

○ قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰیَةٌ فِیْ فِئَتَیْنِ الْتَقَتَا ؕ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ یَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَیْهِمْ رَاْیَ الْعَیْنِ ؕ وَاللّٰهُ یُؤَیِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِی الْاَبْصَارِ﴿۱۳﴾

○ زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِیْنَ وَالْقَنَاطِیْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَیْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ﴿۱۴﴾

○ قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَیْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ لِلَّذِیْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِۚ﴿۱۵﴾

○ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا إِنَّنَا آمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿١٦﴾

○ الصَّابِرِينَ وَالصَّادِقِينَ وَالْقَانِتِينَ وَالْمُنْفِقِينَ وَالْمُسْتَغْفِرِينَ بِالْأَسْحَارِ ﴿١٧﴾

○ شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ وَالْمَلَائِكَةُ وَأُولُو الْعِلْمِ قَائِمًا بِالْقِسْطِ ۚ لَا إِلَٰهَ إِلَّا
هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿١٨﴾

ترجمہ

○ یہ بات یقینی ہے کہ کفر اختیار کرنے والوں کو ان کے اموال و اولاد خدا سے ہرگز بے نیاز نہیں کر سکتے اور وہ لوگ آگ (آتشِ جہنم) کا ایندھن ہی ہیں۔ (۱۰)

○ ان کا طرزِ عمل فرعونیوں اور ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں جیسا ہے کہ جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی، پھر اللہ نے ان کے گناہوں کے نتیجہ میں انہیں گرفت میں لے لیا اور اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔ (۱۱)

○ ان کفر اختیار کرنے والوں سے کہہ دیجئے کہ بہت جلد تم پر غلبہ پالیا جائے گا اور تمہیں دوزخ کی طرف لے جایا جائے گا اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔ (۱۲)

○ جو دو گروہ میدانِ جنگ میں ایک دوسرے کے مدمقابل آئے ان کے حالات میں تمہارے لئے (حق و باطل کی پہچان وتمیز کی) واضح نشانی موجود تھی، ان میں سے ایک گروہ خدا کی راہ میں نبرد آزما تھا اور دوسرا کافر تھا، وہ (کافر فوجی) ان (مجاہدینِ اسلام) کو اپنے سے دگنا دیکھ (اور سمجھ) رہے تھے (یہی چیز کافروں کی شکست کا سبب بنی) درحقیقت خدا جس کے بارے میں چاہتا ہے اسے اپنی مدد ونصرت کے لئے تائید وحمایت عطا کرتا ہے، اس ماجرے میں بصیرت وسوج بوجھ رکھنے والوں کے لئے درسِ عبرت ہے۔ (۱۳)

O لوگوں کے لئے عورتوں، بیٹوں، سونا و چاندی کے خزانوں وخزینوں، نشاندار گھوڑوں، مویشیوں اور کھیتیوں جیسی پرکشش چیزوں سے محبت کرنے کو زینت بنا دیا گیا ہے جبکہ یہ سب کچھ دنیاوی زندگی کا ساز و سامان ہے جو کچھ خدا کے پاس ہے وہ نیک انجام ہے۔ (۱۴)

O ان سے کہیے کہ میں تمہیں ان سب چیزوں سے بہتر سے آگاہ کروں! (اور وہ یہ کہ) تقویٰ و پرہیزگاری اختیار کرنے والوں کے لئے ان کے پروردگار کے پاس وہ جنتیں ہیں جن کے نیچے سے نہریں رواں دواں ہیں۔ انہیں ان (باغہائے بہشت) میں ہمیشہ کی زندگی (ابدی حیات) اور پاک و مطہر بیویاں اور اللہ کی رضا و خوشنودی حاصل ہوگی، اور خدا بندوں سے بخوبی آگاہ ہے۔ (۱۵)

O یہی لوگ کہتے ہیں، اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لائے، تو ہمارے گناہ معاف کر دے اور ہمیں دوزخ کی آگ کے عذاب سے محفوظ فرما۔ (۱۶)

O یہی لوگ صبر کرنے والے، سچ بولنے والے، عبادتیں کرنے والے، انفاق (خدا کی رضا کے لئے) خرچ کرنے والے اور رات کی آخری گھڑیوں میں مغفرت طلب کرنے والے ہیں۔ (۱۷)

O خدا خود شاہد و گواہ ہے کہ اس کے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں، اور فرشتے و صاحبانِ علم یہی گواہی دیتے ہیں کہ وہی یکتا برحق معبود ہے، وہ عدل پر قائم ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ غلبہ و طاقت والا، دانا ہے۔ (۱۸)

تفسیر و بیان

یہ بات پہلے ذکر ہو چکی ہے کہ جس دور میں یہ سورۂ مبارکہ نازل ہو رہا تھا اس میں امتِ مسلمہ داخلی و خارجی دونوں اطراف سے ایک خاص بحران کا شکار تھی داخلی طور پر اس طرح کہ ان کی صفوں میں منافقین رخنہ کر چکے تھے اور منافقوں و دشمنانِ اسلام کی مشترکہ سازشوں، فتنہ پردازیوں اور دعوتِ اسلامیہ کو بے اثر کرنے کی کاوشوں کے نتیجہ میں کچھ اہل اسلام اپنے عقیدہ میں تزلزل کا شکار ہونے لگے تھے، اور خارجی طور پر اس طرح کہ پوری دنیا میں ان کے خلاف بغاوت و دشمنی کا ایک طوفان اُمڈا ہوا تھا، مشرکین اور یہود و نصاریٰ اسلام کے آفاقی پیغام کا راستہ روکنے کے لئے کھڑے ہو گئے تھے، ان سب کی تمام تر توانائیاں لوگوں کے دلوں میں ایمانی حرارت کو ختم کرنے اور دین کی روشن شمع کو بجھا دینے پر صرف ہو رہی تھیں چنانچہ اس مقصد کے لئے وہ ہر ممکن ذریعہ اختیار کر رہے تھے اور زبان و ہاتھ دونوں طاقتوں سے کام لے رہے تھے۔

اور اس سورۂ مبارکہ میں مسلمانوں کو وحدت و اتحاد اور یکجہتی، صبر اور ثابت قدمی کی دعوت دی گئی ہے تاکہ ان کے امور کی اصلاح یقینی ہو جائے اور ان کی صفوں میں جو انتشار پھیل چکا ہے اور بحرانی کیفیت پیدا ہو چکی ہے وہ ختم ہو جائے، اس کے ساتھ ساتھ بیرونی سازشیں دم توڑ لیں اور دشمنوں کی طرف سے ہونے والی ہر کوشش ناکامی سے دوچار ہو۔

سابقہ آیات مبارکہ " هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ...... " تا " اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ " (یعنی آیات ۷، ۸، ۹) میں منافقین اور ان لوگوں کا اشاراتی تذکرہ کیا گیا تھا جن کے دل کجی و انحراف کا شکار ہوئے، اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ جس قدر دینی معارف سے آگاہی حاصل کر چکے ہیں اس پر ثابت قدم رہیں اور دینی حقائق و احکام اور علوم و معارف میں سے جو کچھ ابھی تک ان پر واضح و آشکار نہیں ہوا اور اس کی کنہ حقیقت سے آگاہی حاصل نہیں ہوئی اس کی بابت ایمان لا کر اس پر سرِ تسلیم خم کئے رہیں اور اس بات سے ہرگز غافل نہ ہوں کہ دینی امور میں خرابی پیدا ہونے اور اہل اسلام کے درمیان فتنوں کی آگ کے شعلہ ور ہونے اور ان کے نظامِ سعادت کے درہم برہم ہو جانے کا اصل سبب متشابہات کی پیروی کرنا اور آیات کی تاویلیں کرنا ہے کہ جس کے نتیجہ میں دین ہی انہیں ضلالت و گمراہی اور تباہی کے گہرے کھڈ میں ڈال دے گا اور ان کا اجتماع افتراق میں اور اتحاد و یکجہتی تفرقہ میں بدل جائے گی۔

اس کے بعد زیر نظر آیات مبارکہ میں کفار و مشرکین کی حالت بیان کی گئی ہے اور ان کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ بہت جلد شکست سے دوچار ہوں گے اور وہ خدا کو ہرگز بے بس نہیں کر سکتے اور نہ ہی اپنی سرکشی میں کامیاب ہوں گے، اس کے ساتھ ساتھ ان کے گمراہ ہونے اور حق کی بابت غیر یقینی کیفیت کا شکار ہونے کی اصل وجہ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ارشاد ہوا کہ یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ ان کے لئے دنیاوی لذتوں کو زینت بنا دیا گیا جس سے انہوں نے گمان کر لیا کہ انہیں جو مال و اولاد عطا ہوئی ہے وہ انہیں خداوند عالم سے کلی طور پر بے نیاز کر دینے والی ہے، جبکہ ان کا اس طرح گمان و خیال کرنا غلط و نادرست ہے کیونکہ خداوند عالم غالب علی الاطلاق ہے اور اپنے امر پر حاوی ہے، اگر مال و اولاد اور ان جیسی چیزیں خدا سے بے نیاز کرنے والی ہوتیں تو فرعونیوں اور ان سے پہلے گزری ہوئی ظالم و ستمگر قوموں کو خدا سے بے نیاز کر دیتیں کہ جو بہت طاقتور و قوی تھیں لیکن یہ سب کچھ انہیں خدا سے بے نیاز نہ کر سکا اور خدا نے انہیں ان کے گناہوں کی وجہ سے گرفت میں لے لیا، اسی طرح یہ لوگ (کفار و مشرکین) بھی بہت جلد مغلوب ہوں گے اور انہیں گرفت میں لے لیا جائے گا، لہٰذا اہل ایمان پر واجب و لازم ہے کہ وہ دنیاوی لذتوں میں تقوائے الٰہی اختیار کریں تا کہ اس طرح دنیا میں سعادت و خوش بختی، آخرت میں اجر و ثواب اور اپنے پروردگار کی رضا و خوشنودی انہیں نصیب ہو۔

بنا بر ایں زیر نظر آیات مبارکہ جیسا کہ ان کے مطالب و مضامین سے ظاہر ہوتا ہے، کفار کی حالت و انجام کار کو بیان کرتی ہیں، جبکہ ان کے بعد والی آیات اہل کتاب یہود و نصاریٰ کے حال و اعمال کے تذکرے پر مشتمل ہیں کہ بہت جلد اس کی تفصیلی ذکر ہوگی۔

کافروں کی بے بسی و بدانجامی کا تذکرہ

○ " اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ط "

(جن لوگوں نے کفر اختیار کیا انہیں ان کے اموال و اولاد خدا سے ہرگز بے نیاز نہیں کر سکتے)

اس آیت مبارکہ میں لفظ " تُغْنِيَ عَنْهُمْ " ذکر ہوا ہے۔ جو باب افعال " اغناء " سے ہے، اور جب کہا جاتا ہے: " اغنٰی عنه مالهٗ من فلان " اسے اس کے مال نے فلاں شخص سے بے نیاز کر دیا) تو اس سے مراد یہ ہوتا ہے کہ اس کے مال نے اسے بے نیازی عطا کر دی اور اس کی ضرورت پوری ہوگئی لہٰذا اب اسے اس کی احتیاج نہیں رہی۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں آنے کے ابتدائی دنوں میں اور اپنے بارے میں شعور و ادراک کی نعمت سے

بہرہ مند ہونے کے ایام ہی میں اپنے آپ کو دوسروں کا محتاج اور اپنے علاوہ دوسروں سے مدد لینے میں ناچار پاتا ہے، اور یہ انسان کی سب سے پہلی فطری آگاہی اور اس حقیقت کی معرفت کا پہلا زینہ ہے کہ وہ اپنے وجود میں آنے کے لئے ایک مدبر صانع وخالق کا محتاج ہے یعنی وہ ایسی ہستی کا محتاج ہے جس نے اسے وجود عطا فرمایا اور اس کے امور کی تدبیر کرنے والا ہے۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ جب وہ زندگی کے ارتقائی مراحل طے کرنے کی راہ پر گامزن ہوجاتا ہے اور اسباب ووسائل سے استفادہ کرنے اور اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کا احساس اس کے دامن گیر ہوجاتا ہے تو اسے اپنے مادی جسمانی کمال کی ضرورت کا احساس پیدا ہوتا ہے کہ جو غذا واولاد وغیرہ سے عبارت ہے، اس کے بعد وہ اپنے تئیں دیگر کمالات حیوانیہ سے آگاہی حاصل کرنے لگتا ہے اور وہ کمالات عبارت میں ان چیزوں سے جنہیں اس کی خیالی قوت نے اس کے سامنے جلوہ گر کر کے مزین کیا مثلاً دنیا کی چمک دمک ورنگینیاں، مالداری ودولتمندی، عمدہ وفاخرہ لباس اور عالی شان مکان، ازدواجی زندگی کی لطیف کیفیتیں وغیرہ، اس وقت غذا کی طلب، مال ودولت کی طلب میں تبدیل ہوجاتی ہے اور وہ اس لئے کہ وہ گمان کرنے لگتا ہے کہ زندگی کی تمام تر مشکلات کا واحد حل مال ودولت میں ہے اور وہی تمام امور کی کنجی ہے کیونکہ عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے اور مال ودولت ہی کے ذریعے مشکلات پر قابو پایا جاتا ہے اور ضرورتیں پوری کی جاتی ہیں، تو وہ اپنی سعادتمند زندگی کا راز مال واولاد میں مضمر سمجھنے لگتا ہے جبکہ وہ غذا واولاد کو اپنی خوش بختی کا ضامن سمجھتا تھا، اس بناء پر وہ اپنی نفسانی خواہشوں کا اسیر ہوجاتا ہے اور اپنی تمام تر توجہات وتوانائیاں ان کی تکمیل پر مرکوز ومتمرکز کردیتا ہے، وہ اسباب ہی کو اپنی توجہات کا مرکز بنالیتا ہے یہاں تک کہ اس کا ایسا کرنا اس کے دل کو اسباب سے اس قدر جوڑ دیتا ہے کہ وہ انہی اسباب کی استقلالی حیثیت کا قائل ہوجاتا ہے یعنی وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہوجاتا ہے کہ یہ اسباب ہی ہیں جو اس کی تمام تمناؤں وخواہشوں کو پورا کرنے کی کامل ومستقل صلاحیت رکھتے ہیں، ظاہر ہے کہ جب اس طرح کی سوچ پیدا ہوجائے اور آدمی ظاہری اسباب ہی کو سب کچھ سمجھنے لگے تو اس کا نتیجہ خدا فراموشی کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا ایسا شخص خدا کو بھول جاتا ہے اور انہی اسباب یعنی اموال واولاد ہی کا دامن تھامنے لگتا ہے، یقیناً اسی جہالت میں اس کی ہلاکت وتباہی کے اسباب جنم لیتے ہیں کیونکہ یہ جہالت اس کے سامنے آیات الٰہی پر پردہ ڈال دیتی ہے اور وہ ان کا انکار کرنے لگتا ہے۔ درحقیقت وہ غفلت کا شکار ہوچکا ہوتا ہے اور حقیقت الامر کو درک ہی نہیں کرپاتا، جبکہ واقع الامر یہ ہے کہ اس کا پروردگار وہ اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ زندہ وجاوید اور پائندہ ہے، کوئی چیز اس سے بے نیاز نہیں ہوسکتی اور کوئی شے کسی حال وصورت میں انسان کو خدا سے ہرگز مستغنی نہیں کرسکتی۔

اس بیان سے یہ نکتہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ آیۂ مبارکہ میں اموال کا اولاد سے پہلے کیوں ذکر کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ مال ودولت سے دل لگی جیسا کہ آپ جان چکے ہیں کہ اس کی اصل واساس غذا وخور دونوش ہے وہ اولاد سے دل لگی پر بھی مقدم ہوتی ہے چنانچہ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ انسان مال ودولت کے نشہ میں اسی طرح غرق ومست ہوجاتا ہے کہ اسے اولاد

سمیت کسی بھی چیز کی طرف کوئی توجہ ودھیان نہیں ہوتا، اگرچہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض اوقات اولاد کی محبت، مال ودولت کی محبت پر غالب آجاتی ہے۔

بہرحال آیت مبارکہ میں ایک خاص طرح کی اختصار گوئی سے کام لیا گیا ہے، گویا ایک غلط فہمی کو نہایت اشاراتی طور پر دور کیا گیا ہے لہذا آیت کو ان لفظوں کے ساتھ ملا کر پڑھیں تو مطلب واضح ہوجائے گا: "ان الذین کفروا وکذبوا بآیاتنا وزعموا ان اموالهم واولادهم تغنیهم من الله وقدا خطاؤا فلاغنی من الله سبحانهٗ فی وقت ولا فی شیئ" (کہ جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور ہماری آیات کو جھٹلا دیا اور گمان کرنے لگے کہ ان کے اموال اور ان کی اولاد انہیں اللہ سے بے نیاز کر دیں گے جبکہ وہ ایسا سوچنے میں غلطی پر ہیں (یہ ان کی غلط سوچ ہے) کیونکہ کوئی چیز کبھی بھی انہیں اللہ سے بے نیاز نہیں کر سکتی) بعد میں آنے والی آیت مبارکہ اس مطلب کو مزید واضح کرتی ہے۔

جہنم کا ایندھن

○ " وَأُولَٰئِكَ هُمْ وَقُودُ النَّارِ "
(اور وہی ہیں دوزخ کی آگ کا ایندھن)

لفظ " وقود "(واؤ پر زبر کے ساتھ) ہر اس شے کے لئے استعمال ہوتا ہے جس سے آگ جلائی و بھڑکائی جائے (ایندھن)

یہ آیت درج ذیل آیتوں جیسی ہے:

سورۂ بقرہ، آیت: ۲۴

○ " فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ "
(ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں)

سورۂ انبیاء، آیت: ۹۸

○ " إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ "
(تم اور خدا کے سوا جس کی تم عبادت کرتے ہو دوزخ کا ایندھن ہے)

سورۂ بقرہ آیت ۲۴ کی تفسیر میں اس موضوع کی بابت بعض مطالب ذکر کئے جا چکے ہیں۔

ایک ادبی نکتہ

زیرِنظر آیت مبارکہ میں ادبی حوالہ سے چند اہم امور قابل توجہ ہیں:

۱۔ آیت کو جملہ اسمیہ کی صورت میں لایا گیا ہے۔

۲۔ جملہ اسمیہ کی ابتداء اسمِ اشارہ سے کی گئی ہے۔

۳۔ اسم اشارہ بھی وہ لایا گیا ہے جو دور کا معنی دیتا ہے (اُولٰٓئِکَ)

۴۔ مبتداء اور خبر کے درمیان ضمیر "ھُم" ذکر کی گئی ہے جو اُولٰٓئِکَ (مبتداء) اور وَقُوْدُ النَّارِ (خبر) کے درمیان فاصلہ ایجاد کرتی ہے۔ (اسے ضمیر الفصل کہتے ہیں)

۵۔ لفظ "وَقُوْدُ" کو اضافت کے بغیر "وَاُولٰٓئِکَ ھُمْ وَقُوْدُ" کی بجائے لفظ "النَّارِ" کی طرف اضافت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ (وَقُوْدُ النَّارِ)

ان سب امور کی وجہ یہ ہے کہ کلام میں حصر کا اظہار مقصود ہے کہ جس کا لازمی امر یہ ہے کہ جن کافروں نے آیات کی تکذیب کی وہی دوزخ کے عذاب کی اصل بنیاد اور جہنم کی آگ کے شعلہ ور ہونے کا ذریعہ ہیں (ایندھن) اور دوسرے لوگ انہیں کی بھڑکائی ہوئی آگ میں جلیں گے۔

اس نکتہ کی تائید وتصدیق درج ذیل آیت میں بھی موجود ہے جس کی تفصیل اس کی تفسیر کے مقام میں پیش ہوگی:

سورۂ انفال، آیت: ۳۷

○ "لِیَمِیْزَ اللّٰہُ الْخَبِیْثَ مِنَ الطَّیِّبِ وَیَجْعَلَ الْخَبِیْثَ بَعْضَہٗ عَلٰی بَعْضٍ......"

(یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ خدا ناپاک کو پاک سے الگ کر دے، اور خبیثوں کو ایک دوسرے پر قرار دے۔)

فرعونیوں کے طرزِ عمل سے تمثیل

○ "کَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ......"

(فرعونیوں اور ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کے طرزِ عمل کی طرح......)

اس آیت مبارکہ میں لفظ "داْب" استعمال ہوا ہے، اس کے معنی میں اہل لغت نے لکھا ہے کہ اس کا مطلب "ہمیشہ

کی روش اور طرزِ عمل' ہے، اس معنی کی صحت کا ثبوت قرآنِ مجید میں درج ذیل آیت میں پایا جاتا ہے:

سورۂ ابراہیم، آیت: ۳۳

○ " وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ"

(اور اس نے تمہارے لئے سورج اور چاند کو مسخر کر دیا جو مسلسل چلتے رہتے ہیں)

اسی بناء پر عادت کو بھی "دأب" کہا جاتا ہے یعنی ہمیشہ کا طرزِ عمل اور جاری وساری روش! آیت مبارکہ میں بھی یہی معنی مراد ہے۔

ادبی حوالہ سے اس آیت کا تجزیہ وتحلیل کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ جملہ "كَدَأْبِ" کا ایک تقدیری جملہ (تصور و فرض کئے ہوئے پوشیدہ جملہ) سے تعلق ہے کہ سابقہ آیت " لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ "جس پر دلالت کرتی ہے اور جملہ "وَكَذَّبُوا بِاٰيٰتِنَا" اس جملہ (كَدَأْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ) کی تفسیر کرتا ہے۔ درحقیقت یہ جملہ (وَكَذَّبُوا بِاٰيٰتِنَا) " كَدَأْبِ......" کی بابت بمنزلہ" حال' ہے لہٰذا کلام کا معنی سمجھنے کے لئے عبارت کو اسی طرح فرض کرنا پڑے گا جیسا کہ پہلے بھی اس کی طرف اشارہ ہو چکا ہے:"ان الذین کفروا و کذبوا بآیاتنا واستمروا علیها دائبین فزعموا ان فی اموالهم واولادهم غنی لهم من الله کدأب آل فرعون ومن قبلهم وقد کذبوا بآیاتنا "۔ (جن لوگوں نے کفر اختیار کیا انہوں نے ہماری آیتوں کی تکذیب کی اور مسلسل اسی طرزِ عمل کو اپناتے رہے (اسے اپنی عادت ومعمول بنا لیا) انہوں نے گمان کر لیا کہ ان کے اموال واولاد انہیں خدا سے بے نیاز کر دیں گے، ان کی یہ عادت فرعونیوں اور ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں جیسی ہے کہ جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی......)

اور جملہ " فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ " میں حرف ب سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس سے سببت کا معنی مراد ہے، چنانچہ جب یہ کہا جاتا ہے:" اخذته بذنبه " میں نے اس کے گناہ پر اس کو پکڑ لیا (اس کا مؤاخذہ کیا) تو اس سے مراد یہی ہوتا ہے کہ اس کے گناہ کے سبب گناہ کی وجہ سے اس کا مؤاخذہ کیا، اسے گرفت میں لے لیا، لیکن زیرِ نظر دو آیتوں کے درمیان جو تقابلی تذکرہ ہوا ہے اور عہد رسالتؐ میں موجود کفار کی تمثیل کفارِ آلِ فرعون اور ان سے پہلے گزرے ہوئے کافروں سے ہوئی ہے اس کے پیشِ نظر یہ کہنا بجا ہوگا کہ یہاں حرف بؔ سبب کی بجائے آلہ کے معنی میں ہے کیونکہ پہلی آیت میں کفار کو "وَقُوْدُ النَّارِ" کہا گیا یعنی آگ کا ایندھن، گویا وہ خود آتش جہنم کے شعلہ ور ہونے کا سبب ہیں کہ اپنی ہی جلائی؛ بڑھکائی ہوئی آگ میں جلنے کے عذاب میں مبتلا ہوں گے جیسا کہ فرعونیوں اور ان سے پہلے گزرے ہوئے کافروں کا حال ہوا کہ وہ اپنے گناہوں کی بھینٹ چڑھے اور ان کے وہ گناہ ہی ان کے لئے عذاب کی صورت اختیار کر گئے جن کا انہوں نے ارتکاب کیا اور انہوں نے جو مکر وفریب کیا وہی ان کی گردن کا طوق بن گیا اور اس نے انہیں جکڑ کر رکھ دیا اور ان کے مظالم

خود انہی پر پلٹ آئے اور وہ اپنے ہی کیے ہوئے ظلم و جور کا شکار ہو گئے، اسی سلسلہ میں واضح قرآنی بیان موجود ہے جس میں مکر و ظلم کی بازگشت مکر کرنے والوں اور ظلم کا ارتکاب کرنے والوں کی طرف ذکر کی گئی ہے:

سورۂ فاطر، آیت: ۴۳

○ "وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ إِلَّا بِأَهْلِهِ"

(بری چال، چال چلنے والے کے سوا کسی کو اپنی لپیٹ میں نہیں لیتی)

سورۂ بقرہ، آیت: ۵۷

○ "وَمَا ظَلَمُونَا وَلَٰكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ"

(اور انہوں نے ہم پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ صرف اپنے اوپر ہی ظلم کرتے رہے)

مذکورہ بالا مطالب سے خداوندِ عالم کے "شدید العقاب" ہونے کا معنی بھی واضح ہو جاتا ہے۔ کیونکہ خدا کا عتاب اس طرح نہیں کہ کسی مخصوص طرف سے انسان پر آ پڑے اور کسی معین جگہ پر اسے گھیر لے اور مخصوص حالات میں اس پر ٹوٹ پڑے، اس طرح کا عتاب تو غیر خدا کی طرف سے ہوتا ہے کہ جو ایک انسان دوسرے ہمنوع کے ساتھ انجام دیتا ہے مثلاً یا وہ اوپر سے آتا ہے یا نیچے سے، اور وہ بھی کسی ایک جگہ پر نہ کہ ہر جگہ پر، یہی وجہ ہے کہ اس سے بچاؤ کی تدبیریں بھی ممکن ہوتی ہیں اور اس سے بچنے کے لئے کسی دوسری جگہ جا کر یا کسی سے پناہ لے کر اپنا تحفظ کر لیا جاتا ہے یا ایسا کرنا ممکن ہوتا ہے جبکہ خدائی عتاب ایسا نہیں، وہ انسان کو اس کے عمل و گناہ کے ساتھ ہی گرفت میں لے لیتا ہے اور چونکہ انسان کا عمل اس کے باطن و ظاہر دونوں میں اس کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے اور اس سے جدا نہیں ہوتا لہٰذا خدائی عتاب بھی اس کے ساتھ ساتھ رہتا ہے اور اس سے جدا نہیں ہوتا، نتیجتاً انسان خود ہی آتشِ جہنم کا ایندھن بن جاتا ہے یعنی اپنے ہی ہاتھوں دوزخ کی آگ اپنے اندر شعلہ ور کر دیتا ہے کہ جو اسے گھیر لیتی ہے، اس لئے اس سے فرار و چھٹکارا کی گنجائش و تصور ہی باقی نہیں ہوتا بلکہ اس سے بچاؤ کی تدبیر کرنا ہی بے معنی ہے اور فرار و قرار اس کی بابت یکساں ہیں، کسی صورت میں انسان اس سے بچ نہیں سکتا اور اس سے خلاصی پانے کی کوئی راہ ہی نہیں ہوتی، اس حوالہ سے خداوندِ عالم "شدید العقاب" ہے۔ (خدا کے "شدید العقاب؟" ہونے کا یہی معنی ہے)۔

اور جملہ "كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ" میں دوبار اندازِ سخن میں تبدیلی واقع ہوئی ہے یعنی غائب سے حاضر اور حاضر سے غائب کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ کیونکہ اس سے پہلی آیت میں ارشاد ہوا ہے:

○ "لَن تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُم مِّنَ اللَّهِ شَيْئًا" کہ انہیں ان کے اموال و اولاد اللہ سے ہرگز بے نیاز نہیں کر سکتے، اس میں غائب کا انداز ہے، جبکہ زیرِ نظر جملہ میں ارشاد ہوا: "كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا" انہوں نے ہماری

آیتوں کو جھٹلایا، اس میں حاضر کا صیغہ (ہماری آیات) استعمال ہوا، پھر دوبارہ غائب کا انداز اختیار کرکے یوں ارشاد ہوا:
"فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ" پھر خدا نے انہیں گرفت میں لے لیا، اب دیکھنا یہ ہے کہ اندازِ بیان کی اس تبدیلی میں کیا راز مضمر ہے؟

جہاں تک پہلی تبدیلی کا تعلق ہے یعنی غائب سے حاضر کا انداز اختیار کیا گیا (كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا) ..... انہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا..... تو اس سے سننے والے کو قلبی وفکری نشاط وسرور پہنچانا اور خبر کے قرین صحت ومقرون بہ صدق ہونے کا مقصد ملحوظ ہے، اس کی مزید وضاحت وتفہیم کے لئے یہ مثال دی جاسکتی ہے کہ جس طرح کوئی شخص کہے کہ "فلاں شخص بدزبان وبدکلام اور نہایت بری صحبت والا ہے اور میں اس کے ساتھ مجالست ومعاشرت کرنے میں مبتلا ہوگیا ہوں لہٰذا اس کے ساتھ تعلق رکھنا اور اٹھ بیٹھ کرنا واجب وضروری ہے"۔ تو اس میں جملہ: "میں اس میں مبتلا ہوگیا ہوں" (پھنس گیا ہوں) اصل خبر کو قرین صحت قرار دیتا ہے اور اس کی صداقت کو یقینی بناتا ہے کیونکہ اس کی بازگشت تفکر اور ایک طرح کی گواہی کی طرف ہوتی ہے۔ (گویا متکلم خود اس کا عینی شاہد ہے)۔

بنابراین آیتِ مبارکہ کا معنی..... واللہ اعلم..... یہ ہوگا کہ فرعونیوں کی عادت کفر وتکذیبِ آیات میں انہی کفار کی عادت جیسی تھی، اور یہ ہر طرح کے شک وشبہ سے بالاتر ہے کیونکہ ہم خود ان (فرعونیوں) پر حاضر وناظر اور انہیں دیکھ رہے تھے (عینی شاہد تھے) کہ انہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تو ہم نے انہیں اپنی گرفت میں لے لیا (ان کا مواخذہ کیا)۔

اور جہاں تک دوسری تبدیلی کا تعلق ہے یعنی حاضر سے دوبارہ غائب کے انداز کی طرف پلٹا گیا اور "پھر ہم نے انہیں گرفت میں لے لیا" کی بجائے یوں کہا گیا کہ "اللہ نے انہیں گرفت میں لے لیا" (فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ) تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مقصود حاصل ہونے اور بیان کا مقصد پورا ہونے کے بعد دوبارہ اصل کلام کی طرف لوٹا گیا جو کہ غائب کا اندازِ سخن ہے۔ اس کے علاوہ یہ نکتہ بھی ملحوظ ہے کہ اس تبدیلی میں دوبارہ مقام الوہیت کی طرف توجہات کو مرکوز کرانا مقصود ہے کہ جو پوری کائنات کے تمام امور کی تدبیر وتنظیم کا سرچشمہ ہے اور ہر چھوٹی بڑی چیز پر اسی کا تسلط وحاکمیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لفظ جلالہ (اللہ) دو مرتبہ ذکر کیا گیا، یعنی "فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ" کے بعد "وَهُوَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ" (اور وہ سخت عقاب کرنے والا ہے) کے بجائے یوں کہا گیا: "وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ" (اور اللہ سخت عقاب والا ہے) تاکہ یہ بات واضح ہوجائے کہ ان کا کفر اختیار کرنا اور آیات کو جھٹلا دینا درحقیقت اس ہستی کے ساتھ نزاع وجھگڑا اور جنگ کرنا ہے جو الوہیت وخدائی کے جلال وعظمت کی مالک ہے اور اس کے لئے گناہگار کو اس کے گناہ کے سبب اپنی گرفت میں لینا آسان ہے، وہ شدید العقاب ہے کیونکہ وہی معبود برحق (اللہ) ہے، جل اسمہٗ (بزرگ وعظیم ہے اس کا نام)۔

کافروں کے مغلوب ہونے کی اطلاع

O "قُلْ لِّلَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ......"
(کہہ دو ان لوگوں سے جنہوں نے کفر اختیار کر لیا کہ تم بہت جلد مغلوب ہو گے اور تمہیں لے جایا جائے گا......)

اس آیت میں جملہ "تُحْشَرُوْنَ" ذکر ہوا ہے، حشر کا معنی لوگوں کو ان کے ٹھکانوں سے زبردستی باہر نکالنا ہے، یہ لفظ ایک فرد کے زبردستی اخراج پر استعمال نہیں ہوتا، قرآن مجید میں اس طرح ارشاد ہوا:

سورۂ کہف، آیت: ۴۷

O "وَّحَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا"
(اور ہم نے انہیں کوچ کرایا، یہاں تک کہ ان کا کوئی ایک فرد بھی باقی نہ چھوڑا)

زیر نظر آیت مبارکہ میں لفظ "الْمِهَادُ" ذکر ہوا ہے (وَبِئْسَ الْمِهَادُ) مہاد کا معنی بستر ہے (فرش کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے)، آیت کے ظاہر السیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں "الَّذِیْنَ کَفَرُوْا" سے مراد مشرکین ہی ہیں جیسا کہ سابقہ آیت (اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَنْ تُغْنِیَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ......) میں مشرکین مراد تھے نہ کہ یہودی! یہ بات دونوں آیتوں کے باہمی ربط و پیوستگی کو یقینی بنانے میں نہایت موزوں ہے کیونکہ زیر نظر آیت مبارکہ ان پر غلبہ پائے جانے اور انہیں دوزخ کی طرف لے جائے جانے کا تذکرہ کرتی ہے جبکہ سابقہ آیت میں ان کے اس انجامِ کار کا سبب مذکور ہے یعنی انہوں نے اپنے اموال و اولاد پر گھمنڈ و تکبر اور اپنی بڑائی کا احساس و اظہار کیا۔

جنگِ بدر میں خدائی نشانی

O "قَدْ کَانَ لَکُمْ اٰیَةٌ فِیْ فِئَتَیْنِ الْتَقَتَا......"
(ان دو گروہوں میں جو ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوئے تمہارے لئے نشانی ہے۔)

آیت کے ظاہر السیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ "لَکُمْ" کا مخاطب "الَّذِیْنَ کَفَرُوْا" (وہ لوگ جنہوں نے کفر

اختیار کیا) ہیں، یہ آیت درحقیقت آنحضرتؐ کے ارشاد گرامی " سَتُغْلَبُونَ وَتُحْشَرُونَ......" (تم بہت جلد مغلوب ہو گے اور تمہیں زبردستی باہر نکال کر لے جایا جائے گا......) کا تتمہ ہے۔

یہاں یہ امکان بھی پایا جاتا ہے کہ اس کا مخاطب اہل ایمان ہوں اور وہ اس طرح کہ انہیں جنگ بدر کے دن نصرت کی صورت میں خدائی عنایت واحسان کی طرف توجہ دلا کر غور وفکر کرنے اور عبرت گیری کی دعوت دی گئی ہے کہ کس طرح خداوند عالم نے ان کی تائید وحمایت کی اور اس طرح ان کا ساتھ دیا کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں چندھیاں گئیں۔ اس بنائر پر کلام الٰہی ایک طرح کے التفاتی طرزِ سخن یعنی تبدیلی کا حامل قرار پاتا ہے کیونکہ اس سے پہلے صرف آنحضرتؐ سے خطاب ہوا (قُلْ لِّلَّذِيْنَ......) — کہہ دو — ،جبکہ " قَدْ كَانَ لَكُمْ......" میں آنحضرتؐ اور مومنین دونوں مخاطب قرار پاتے ہیں۔لیکن جس طرح آپ نے ملاحظہ کیا ہے سیاق کلام کے تناظر میں پہلا امکانی پہلو اور احتمال زیادہ مناسب لگتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ آیت کس واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ جس میں دو گروہ ایک دوسرے کے مدمقابل قرار پائے اور خداوند عالم نے اس گروہ کی حمایت ونصرت کی جو قتال فی سبیل اللہ کر رہا تھا، تو اس سلسلہ میں آیت نے واضح طور پر کسی واقعہ کی نشاندہی نہیں کی اور نہ ہی اس کا نام ذکر کیا البتہ واقعۂ بدر پر اس کی تطبیق ممکن دکھائی دیتی ہے۔ اور یہ سورۂ مبارکہ (آل عمران) واقعۂ بدر بلکہ واقعۂ احد کے بعد نازل ہوا،

اس کے علاوہ یہ بات قرین قیاس ہے کہ واقعہ کو جس انداز میں بیان کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مخاطبین کے اذہان میں موجود تھا اور وہ اس سے آگاہ اور اس کو یاد رکھے ہوئے تھے (ابھی تک اس کی یاد ان کے دلوں وذہنوں میں باقی وتازہ تھی) چنانچہ ارشاد ہوا: " قَدْ كَانَ لَكُمْ......" کہ اس کا مطلب ومعنی یہ ہے کہ " کیا تمہیں یاد نہیں کہ ایسا ہوا اور ایسا ہو...."۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید میں جنگ بدر کے واقعہ کے علاوہ کسی واقعہ وجنگ کے تذکرہ میں جنگجوؤں کی آنکھوں میں خدائی تصرف مذکور نہیں .... کہ ایک دوسرے کے مدمقابل قرار پانے والے فوجی اپنے دشمن کو اندک وناچیز سمجھنے لگے......، اور جنگ بدر کے بارے میں قرآنی تذکرہ درج ذیل آیت میں یوں ہوا:

سورۂ انفال، آیت: ۴۴

○ " وَاِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْٓ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا وَّيُقَلِّلُكُمْ فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ "

(اور یاد کرو اس وقت کو جب تمہارا آمنا سامنا ہوا تو خدا نے انہیں تمہاری آنکھوں میں نہایت کم اور ان کی آنکھوں میں تمہیں کم دکھایا تا کہ وہ کام پورا ہو جائے جس کی انجام دہی مطلوب تھی، اور تمام امور کی بازگشت خدا کی طرف ہے)۔

اگر چہ اس میں بظاہر مدمقابل فوج کے تھوڑے دکھائی دینے کے عمل کا ذکر ہے نہ کہ اس کے زیادہ کے دکھلانے کا! لیکن بعید نہیں کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ پہلے مشرکوں کی نگاہوں میں مومنین کی تعداد کا کم ہونا اس لئے ظاہر کیا گیا تا کہ وہ (مشرکین) ان پر حملہ کرنے کی جرأت پائیں اور مومنین کی کثرت وقوت کے خوف سے مقابلہ کرنے سے منہ نہ موڑیں۔ اور جب جنگ شروع ہوگئی تو خدا نے مشرکین کی نگاہوں میں مومنین کی کثرت وقوت ظاہر کردی تا کہ وہ میدان سے بھاگ جانے اور شکست سے دوچار ہونے پر مجبور ہوں۔

بہر حال جنگ بدر کے تذکرہ میں جو اہم نکتہ ملحوظ ہے وہ مدمقابل فوج کی کثرت کا اظہار ہے اور ایک دوسرے کی نظروں میں زیادہ تعداد معلوم ہوتا ہے۔ تاہم اگر یہ امکانی پہلو درست بھی قرار دیا جائے کہ آیت میں اصل خطاب مشرکین سے ہے اور وہی "لَکُمۡ" کا مصداق ہیں تب بھی اس کی تطبیق جنگ بدر کے علاوہ کسی دوسرے واقعہ پر نہیں ہوتی، اس کے علاوہ اس قرأت کی بناء پر کہ جس میں "یَّرَوۡنَھُمۡ" کے بجائے "ترونهم" پڑھا گیا ہے (یعنی تاء خطاب کے ساتھ) جس کا معنی ہے: تم انہیں دیکھتے تھے، اس سے بھی ہمارے مذکورہ بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔

خلاصہء کلام یہ کہ آیت مبارکہ کا معنی ومقصود یہ ہے: اے گروہ مشرکین! اگر تم بابصیرت اور منطقی سوچ رکھنے والے افراد ہوتے تو تمہاری عبرت اور اس امر کی حقانیت سے آگاہ ہونے کے لئے یہ کافی تھا کہ ہمیشہ حق ہی غالب ہے اور خدا جسے چاہتا ہے اپنی مدد ونصرت سے اس کی تائید وحمایت کرتا ہے اور مال واولاد جیسا کہ تم نے بدر کے دن دیکھ لیا ہرگز غلبہ وفتح نہیں دلا سکتے...... بلکہ یہ خدا ہی ہے جو حقیقی معنی میں غلبہ دلاتا ہے اور فتح وکامیابی سے ہمکنار کرتا ہے...... اور جنگ بدر میں وہ مومنین جو خدا کی راہ میں قتال کر رہے تھے اور دشمن کے سامنے ڈٹے ہوئے تھے...... تو خدا ان کی پشت پناہی ونصرت کر رہا تھا...... جبکہ وہ اس قدر کم اور کمزور افراد تھے کہ ان کی تعداد کافروں کے مقابلے میں ایک تہائی بھی نہ تھی اور قوت وطاقت کے حوالہ سے بھی کافروں سے قابل قیاس نہ تھے کیونکہ ان کی کل تعداد تین سو تیرہ افراد تھی اور ان کے پاس چھ زرہ، آٹھ تلواروں اور دو گھوڑوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا جبکہ مشرکین کا لشکر تقریباً ایک ہزار افراد پر مشتمل تھا اور وہ سب تعداد، طاقت، گھوڑوں، اونٹوں اور جنگی ساز وسامان سے لیس تھے، اس کے باوجود خداوند عالم نے مومنین کی نصرت کی اور ان کی قلیل تعداد اور اپنے دشمن کے مقابلے میں نہایت کمزور ہونے کے باوجود اس طرح ان کی مدد کی کہ وہ کافروں کی نگاہوں میں بہت زیادہ دکھائی دیئے اور وہ (مومنین) انہیں (مشرکین کو) اپنے سے دگنا نظر آنے لگے، خداوند عالم نے فرشتوں کو مومنین کی مدد کے لئے بھیجا لہٰذا مشرکین کو ان چیزوں سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوا جس پر وہ نازاں تھے یعنی مال واولاد، اور نہ ہی افرادی قوت وتعداد کی کثرت ان کے کام آئی اور نہ جنگی ساز وسامان انہیں خدا سے بے نیاز کرسکا۔

خداوند عالم نے سورۂ انفال میں بھی دو مرتبہ جنگ بدر کے تذکرے میں اسی طرح فرعونیوں اور ان سے پہلے لوگوں

کی طرف سے آیات الٰہی کی تکذیب کے مرتکب ہونے اور ان کے گناہوں کے سبب خدائی گرفت میں آنے کو بیان کیا جس طرح یہاں زیر نظر آیات مبارکہ میں مذکور ہے، یہاں یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ خداوند عالم نے مشرکین کو نصیحت کرنے کے ضمن میں انہیں جنگ بدر کی جو یاد دلائی ہے اس سے اس امر کا اشارہ مطلوب ہے کہ سابقہ آیات میں جس غلبہ کا تذکرہ ہوا ہے اس سے جنگی غلبہ مراد ہے کہ جس میں قتل کرنا اور تباہ و برباد کر دینا ہوتا ہے، بنا برایں ان آیات میں جو واقعہ بدر کے تذکرہ پر مشتمل ہیں قتال کے حوالہ سے دھمکی دے کر خبردار کیا گیا ہے۔

دو مد مقابل لشکروں کا تذکرہ

○ " فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰی کَافِرَةٌ......"
(ایک گروہ خدا کی راہ میں لڑتا تھا اور دوسرا کافر تھا.....)

اس آیت مبارکہ میں دو مدِ مقابل گروہوں کا تذکرہ ہوا ہے جو میدان کارزار میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے قرار پائے، ایک گروہ کے بارے میں کہا گیا کہ وہ اللہ کی راہ میں قتال کر رہا تھا جبکہ دوسرا گروہ کافر تھا، تقابل اس بات کا متقاضی ہے کہ اللہ کی راہ میں قتال کرنے والوں کے مقابلے میں آنے والے لشکر کے بارے میں یوں کہا جاتا کہ وہ شیطان یا طاغوت کی راہ میں قتال کر رہا تھا لیکن اس طرح نہیں کہا گیا اور نہ ہی اس سے مشابہ الفاظ استعمال کئے گئے بلکہ کہا گیا کہ دوسرا گروہ کافر تھا، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کلام میں دو راستوں کے درمیان تقابل وغیرہ کے بیان کا مقام نہیں بلکہ صرف اس مطلب کا اظہار مقصود و مطلوب ہے کہ "اللہ تعالیٰ سے بے نیازی ممکن نہیں اور یہ کہ غلبہ و کامیابی صرف خدا کے لئے ہے"، اس بناء پر یہاں درحقیقت خداوند عالم پر ایمان اور اس کی راہ میں جہاد کرنے، اور خدا کا انکار کرنے کے درمیان تقابل کا تذکرہ مقصود ہے۔

ایک ادبی بحث

آیت مبارکہ کے ظاہر السیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں جمع کی دو ضمیروں (یَرَوْنَهُمْ) (مِّثْلَیْهِمْ) کی بازگشت جملہ "فِئَةٌ تُقَاتِلُ" کی طرف ہوتی ہے، اس کا معنی یہ ہے کہ کافروں کا گروہ (لشکر) مومنین کو ان کی اصل تعداد سے دگنا دیکھتا

تھا یعنی وہ انہیں ۶۲۶ افراد کھائی دے رہے تھے جبکہ حقیقت میں ان کی تعداد تین سو تیرہ (۳۱۳) تھی،

یہاں ایک احتمال یہ بھی دیا جاسکتا ہے کہ پہلی ضمیر (یرونہم) کی بازگشت دوسری ضمیر (مثلیہم) سے مختلف ہے، اس بناء پر آیت کا معنی یوں ہوگا: کفار، مومنین کو اپنے سے دگنا دیکھ رہے تھے۔

لیکن یہ احتمال بعید ہے اور الفاظ کی ترتیب سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔

ایک احتمال یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں ضمیروں کی بازگشت "واخریٰ کافرۃ" کی طرف ہو، اس بناء پر آیت کا معنی یہ ہوگا: کفار، اپنے آپ کو مومنین سے دگنا دیکھنے لگے مثلاً ایک ہزار افراد کو دو ہزار دیکھنے لگے، اس احتمال کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ان کی نگاہوں میں مومنین ان کی نسبت بہت کم دکھائی دیئے، گویا وہ انہیں اپنی نسبت 1/6 دیکھ رہے تھے جبکہ مومنین کی تعداد ان کی نسبت 1/3 تھی۔

اس احتمال کی وجہ یہ ہے کہ جنگ بدر کے تذکرہ میں سورۂ انفال آیت ۴۴ میں اس طرح ارشاد ہوا: "وَ اِذْ یُرِیْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَیْتُمْ فِیْۤ اَعْیُنِكُمْ قَلِیْلًا وَّ یُقَلِّلُكُمْ فِیْۤ اَعْیُنِهِمْ" (اس وقت کو یاد کرو جب تم آمنے سامنے آ گئے تو خدا نے انہیں تمہاری نگاہوں میں کم دکھایا اور تمہیں ان کی نظروں میں کم دکھایا) اس طرح یہ آیت ہماری زیر نظر آیت کے منافی ہوگی، (لہٰذا ضروری ہے کہ دونوں ضمیروں کی بازگشت کفار کی طرف ہو تا کہ دو آیتوں کے درمیان ایک دوسرے کے منافی ہونے کی نوبت نہ آئے۔

اس احتمال کا جواب اس طرح دیا گیا ہے کہ اگر دونوں ضمیروں کی بازگشت کفار کی طرف ہو تو اس سے بیان میں عدم وضاحت اور معانی کا خلط ملط ہونا لازم آئے گا جو کہ قرآن مجید کہ جو سب سے زیادہ بلیغ کلام ہے کے شایان شان نہیں، اور اگر یہی مقصود تھا تو اس طرح کے الفاظ استعمال کئے جاتے: "یرون انفسھم مثلیھم" (وہ اپنے آپ کو اپنی اصل تعداد سے دگنا دیکھنے لگے) یا اس سے مشابہ عبارت ذکر کی جاتی۔

اور جہاں تک دونوں آیتوں کے ایک دوسرے کے منافی ہونے کی بات کا تعلق ہے تو وہ اس لئے درست نہیں کہ ایک دوسرے کے منافی ہونا اس وقت واقع ہوتا ہے جب دونوں کا مقام بیان ایک ہو، جبکہ ان دو آیتوں میں ایسا نہیں اور ان دونوں کے مقام بیان کے ایک ہونے کا کوئی ثبوت و دلیل موجود نہیں کیونکہ عین ممکن ہے کہ خداوند عالم نے دونوں لشکروں کو ایک دوسرے کی نظروں میں اس وقت کم دکھایا ہو جب وہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے قرار پا رہے تھے تا کہ اس طرح ان کے دل مضبوط ہوں اور ان کی جرأت بڑھ جائے لیکن جب جنگ کا آغاز ہو جائے اور دونوں لشکر ایک دوسرے پر تابڑ توڑ حملے شروع کر دیں تو اس وقت کفار، مومنین کو ان کی اصل تعداد سے دگنا دیکھنے لگیں اور خوفزدہ ہو کر میدان جنگ سے بھاگنے پر مجبور ہو جائیں اور شکست سے دوچار ہوں، تو ان دو آیتوں میں بظاہر جو اختلاف دکھائی دیتا ہے وہ درج ذیل ان دو آیتوں میں

پائے جانے والے...... یا دکھائی دیئے جانے والے اختلاف کی طرح ہے جن میں قیامت کے دن کا تذکرہ ہوا ہے:

سورۂ رحمٰن، آیت ۳۹:

○ " لَا یُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖۤ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ "

(اس دن نہ انسانوں سے اور نہ جنوں سے، ان کے گناہوں کے بارے میں پوچھ گچھ نہیں ہوگی)

سورۂ صافات، آیت ۲۴:

○ " وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْـُٔوْلُوْنَ "

(انہیں روکو، کہ ان سے پوچھ گچھ کی جانی ہے)

تو ان دونوں کے مقام بیان کے مختلف ہونے کی وجہ سے ان میں بظاہر اختلاف دکھائی دیتا ہے جبکہ ان کے درمیان ایک دوسرے کے منافی ہونے کی نسبت نہیں پائی جاتی، (وہ ایک دوسرے کے منافی نہیں)۔

بہرحال ان دو ضمیروں (یَرَوْنَهُمْ) (مِّثْلَیْهِمْ) کی بازگشت کے بارے میں مفسرین کرام نے متعدد دیگر احتمالات بھی ذکر کیے ہیں لیکن ان سب میں ایک مشترکہ نقص پایا جاتا ہے اور وہ یہ کہ وہ آیت کے ظاہری الفاظ سے مطابقت نہیں رکھتے، بلکہ ان سے قطعی مختلف ہیں لہٰذا ہم نے ان کو ذکر کرنے سے اجتناب کیا ہے، (خدا ہی اصل حقیقت سے آگاہ ہے)۔

خدائی نصرت کا اظہار

○ " وَاللّٰهُ یُؤَیِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ ۭ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِی الْاَبْصَارِ "

(اور اللہ اپنی نصرت کے ذریعے تائید کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور اس میں صاحبانِ بصیرت کے لئے عبرت و نصیحت ہے)

"یُؤَیِّدُ" کہ جس کا مصدر " تائید " (باب تفعیل) ہے وہ " اید " سے مشتق ہے کہ جس کا معنی " قوت " ہے۔

"الْاَبْصَارِ" کے بارے میں دو قول ذکر کیے گئے ہیں:

(۱) اس سے مراد ظاہری آنکھیں ہیں،

اس کی دلیل یہ ہے کہ آیت مبارکہ میں خدا کی طرف سے آنکھوں میں تصرف کرنے اور ان پر اثر انداز ہو کر ان کے دیکھنے کے عمل کی کیفیت بدل دینے کا ذکر ہے۔

(۲) اس سے مراد بصیرتیں ہیں،

اس کی دلیل یہ ہے کہ عبرت و نصیحت قلبی بصیرت سے ہوتی ہے ظاہری بصارت سے نہیں ہوتی، البتہ دونوں لحاظ سے فہم المراد آسان ہے کیونکہ خداوند عالم اپنے کلام میں عبرت حاصل نہ کرنے والوں اور حالات و واقعات سے نصیحت نہ پانے والوں کو اندھا قرار دیتا ہے اور یہ مطلب بھی بیان کرتا ہے کہ آنکھوں کا کام ہی یہ ہے (بلکہ اس پر لازم و واجب ہے) کہ وہ دیکھے اور حق و باطل کے درمیان تمیز دے، اس بیان میں گویا یہ ادعاء بھی ہے کہ وہ دین حق کہ جس کی طرف خدا تمہیں بلاتا ہے وہ ظاہر و آشکار ہے بلکہ وہ قابل احساس ہے ...... اسے ظاہر بظاہر دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے..... لہٰذا ظاہری نگاہوں پر لازم ہے کہ اسے دیکھیں اور اس کا مشاہدہ کریں، اس حوالہ سے بصیرت اور بصارت ایک طرح کے استعارہ کی بناء پر معارف الٰہیہ کی بابت ایک ہی معنی رکھتے ہیں کیونکہ وہ نہایت واضح و آشکار ہیں، اس سلسلہ میں کثیر آیات موجود ہیں..... کہ جن میں بصیرت و بصارت کو یکجا قرار دیا گیا ہے اور ابصار سے ظاہری آنکھیں مراد لی گئی ہیں ....، ان میں سے درج ذیل آیات میں نہایت واضح طور پر مطلوب و مقصود کا ثبوت ملتا ہے:

سورۂ حج، آیت ۴۶:

○ "فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِىْ فِى الصُّدُوْرِ"

(آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں لیکن وہ دل اندھے ہوتے ہیں جو سینوں میں ہیں)

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ اصل آنکھیں دلوں میں ہیں سروں میں نہیں۔

سورۂ اعراف، آیت ۱۷۹:

○ "وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا"

(اور ان کی آنکھیں ہیں کہ جن سے وہ دیکھتے نہیں)

سورۂ جاثیہ، آیت ۲۳:

○ "وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً"

(اور اس نے اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا)

بہرحال زیر نظر آیت مبارکہ میں "ابصار" سے مراد ظاہری آنکھیں ہیں اور وہ اس بناء پر کہ وہی ذریعہ عبرت ہیں اور انہی کے ذریعے حقائق سے آگاہی و آشنائی حاصل ہوتی ہے۔ تو یہاں کلام میں استعارہ بالکنایہ استعمال ہوا ہے، ...... استعارہ بالکنایہ سے مراد یہ ہے کہ ایک چیز کو دوسری چیز سے تشبیہ دیں اور جس چیز سے تشبیہ دی گئی ہو اس کی کسی عملی علامت و خصوصیت کو اس چیز کے لئے ذکر کیا جائے جس کے لئے تشبیہ دی گئی تھی، آیت مبارکہ میں ظاہری آنکھ کو چشم باطن سے تشبیہ

دے کر عبرت پانے کے عمل کو ظاہری آنکھ کے لئے ذکر کیا گیا ہے جبکہ اس کا تعلق باطنی نگاہ اور چشم قلب سے ہے......اور اس لئے ایسا کیا گیا تا کہ اس نکتہ سے آگاہی دلائی جا سکے کہ یہ مطلب اس قدر واضح و روشن اور ظاہر و آشکار ہے کہ گویا قوتِ حس بھی اس تک پہنچ سکتی ہے اور ظاہری نگاہوں سے اس کا مشاہدہ ہو سکتا ہے۔ یہاں استعارہ بالکنایہ کے استعمال کی لطافت میں اس حوالہ سے بھی اضافہ ہو جاتا ہے کہ کلام ظاہری آنکھوں میں تصرف کے خدائی عمل کے ذکر پر مشتمل ہے......اس سے اس قول کو قوت ملتی ہے کہ ابصار سے مراد ظاہری آنکھیں ہیں......

جملہ " اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ......" بظاہر اس کلام الٰہی کا تتمہ ہے جس میں خداوند عالم نے حضرت پیغمبر اسلامؐ سے خطاب فرمایا اور انہیں مخاطب قرار دیا، اور اس کلام نبویؐ کا تتمہ نہیں ہے جس پر آیت مبارکہ "قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا......" دلالت کرتی ہے، اس کی دلیل وہ "ک" ہے جو "ذٰلِكَ" میں ہے کہ جس کا مخاطب حضرت پیغمبر اسلامؐ ہیں۔ آنحضرتؐ کو خاص طور پر مخاطب قرار دینے میں اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ عام افراد کم فہم اور کور دل (دل کے اندھے) ہیں کہ وہ اس طرح کے مقامہائے عبرت سے درسِ عبرت حاصل نہیں کر سکتے۔

دنیاوی زندگی کی مادی لذتیں

○ "زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ......"
(لوگوں کے لئے زینت بنا دیا گیا ہے خواہشات کی محبت کو، عورتیں......)

یہ آیت مبارکہ اور اس کے بعد والی آیت اس آیت شریفہ کی تفسیر و بیان اور اس میں مذکور مطلب کی حقیقتِ حال کی وضاحت و تشریح کی حیثیت رکھتی ہیں کہ جو اس سے قبل ذکر ہوئی ہے جس میں ارشاد الٰہی ہے: " اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا" (جن لوگوں نے کفر اختیار کیا انہیں انکے اموال اور اولاد اللہ سے ذرہ بھر بے نیاز نہیں کر سکتے)، اس سے کفار کے اس عقیدہ کی نشاندہی ہوتی ہے کہ ان کے خیال میں ان کے اموال و اولاد انہیں اللہ سے بے نیاز کر سکتے ہیں۔ اس آیت میں ان کے اس عقیدہ و نظریہ کا سبب واضح کیا گیا ہے کہ وہ نفسانی خواہشات کے دلدل میں پھنس چکے ہیں اور مادی لذتوں پر مر مٹنے نے انہیں آخرت کے امور میں دلچسپی لینے اور اخروی حیات کے لئے بہتر زادِ راہ اکٹھا کرنے سے باز رکھا ہے، حقیقت یہ ہے کہ وہ غلط فہمی کا شکار ہو گئے اور حقیقت الامر ان پر واضح نہ ہوئی اور وہ یہ بات سمجھ نہ سکے کہ یہ سب کچھ اسی فانی دنیا کا زوال پذیر مال و متاع ہے اور اس کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ آخرت اور

خدا کے ہاں بہترین مقام و منزلت اور نیک انجام پانے کا وسیلہ و ذریعہ ہے (اس مطلب کو ان لفظوں میں بیان کیا جا سکتا ہے کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں وارد ہوا ہے " الدنیا مزرع الآخرة "، م)، اس کے باوجود انہیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ وہ خود دنیا کی محبت اور مادی لذتوں سے دل لگی کے موجد نہیں اور نہ ہی وہ اس سلسلہ میں ابتداء وابتکار کرنے والے ہیں بلکہ خداوند عالم نے ان کی طبع وجودی ہی ایسی قرار دی ہے کہ اس میں اس محبت و چاہت کا فطری جذبہ پایا جاتا ہے تا کہ وہ اس کے ذریعے مادی دنیا کی مادی زندگی سے بھرپور لطف اندوز ہو سکیں اور اس سے پوری طرح استفادہ کر سکیں کیونکہ اگر یہ طبعی وفطری جذبہ نہ ہوتا تو نوع انسانی کی زندگی اور اس کی بقاء کی صورت ہی پیدا نہ ہوتی جبکہ خداوند عالم نے اس کی تقدیر ہی میں اس کے لئے دنیاوی زندگی کی فانی لذتوں سے استفادہ کرنا قرار دیا اور دنیا کو اس کے لئے مقررہ مدت تک متاع حیات سے لطف اندوز ہونے کا ٹھکانہ قرار دیا چنانچہ ارشاد ہوا:

سورۂ بقرہ: آیت :۳۶

O " وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ "

(اور تمہارے لئے زمین میں ٹھہرنے کی جگہ اور ایک مقررہ وقت تک کی متاع ہے)

خداوندِ عالم نے نوع انسانی کو دنیاوی زندگی کی مادی لذتوں سے لطف اندوز ہونے کا موقع اس لئے فراہم کیا کہ وہ اسے آخرت کے ابدی ٹھکانہ کا ذریعہ ووسیلہ قرار دیں اور اس عارضی زندگی کی متاع ناچیز سے بھرپور استفادہ کر کے اسے اخروی حیات کی بقا شعار لذتوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے ذخیرہ کریں، نہ یہ کہ دنیا ہی سے دل لگا کر اس کی زیب و زینت اور چمک دمک کو اصل مقصد قرار دیتے ہوئے اس کے بعد والی ابدی حیات کو سرے سے ہی بھلا دیں اور راہ کو مقصد و منزل بنا لیں جبکہ وہ اپنے پروردگار کی جانب رواں دواں ہیں اور ان کے سفر کی آخری منزل ان کا رب ہے، خداوند عالم نے دنیا کی حیثیت کے بارے میں اس طرح ارشاد فرمایا:

سورۂ کہف، آیت :۸

O " إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ۝ وَإِنَّا لَجَاعِلُونَ مَا عَلَيْهَا صَعِيدًا جُرُزًا ۝ "

(ہم ہی نے روئے زمین پر موجود اشیاء کو اس کی زینت قرار دیا ہے تا کہ انہیں (روئے زمین پر رہنے والوں کو) آزمائیں کہ ان میں سب سے خوبصورت عمل کرنے والا کون ہے؟ اور ہم ہی روئے زمین پر موجود ہر شے کو خاک بنا کر زمین کو صاف و ہموار میدان بنا دیں گے)

لیکن غفلت کا شکار ان لوگوں نے خدا کے عطا کردہ ان ظاہری وسائل کو کہ جن کی حیثیت رضائے الٰہی کے حصول کی

نسبت وسیلہ وذریعہ سے زیادہ نہیں مستقل حیثیت دے کرانہی سے اپنی قلبی وابستگی قائم کرلی اورانہی کوسب کچھ سمجھنے لگے، اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے یہ گمان بھی کرلیا کہ یہ وسائل اور ظاہری ذرائع انہیں خدا سے بے نیاز کرسکتے ہیں، ان کے اس زعم باطل کے نتیجہ میں یہ سب نعمتیں ان کے لئے وبال وعذاب بن گئیں جبکہ ان سب چیزوں کوان کے بہترین اخروی مقام و منزلت اورقرب خداوندی کے حصول کا ذریعہ قرار دیا گیا تھا جیسا کہ قرآن مجید میں واضح طور پر ارشاد الٰہی ہے :

سورۂ یونس، آیت : ۳۰

○ "اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ ؕ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ اَهْلُهَاۤ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَاۤ ۙ اَتٰهَاۤ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ ... وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَشُرَكَآؤُكُمْ ۚ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ ... وَرُدُّوْۤا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ"

(دنیاوی زندگی کی مثال اس پانی جیسی ہے جسے ہم نے آسمان سے نازل کیا (برسایا) ہے پھراس سے مل کرزمین سے وہ نباتات (اگ) آئیں جوانسانوں اور چوپایوں کی خوراک ہے یہاں تک کہ جب زمین شاداب وسرسبز اورخوشنما ودیدہ زیب ہوگئی اور زمین کے باسیوں نے گمان کرلیا کہ اب وہ اس پر پورا قبضہ وقدرت رکھتے ہیں تو یکا یک اس پر رات یادن میں ہمارا حکم (عذاب) آپڑا اور ہم نے اسے کٹی ہوئی کھیتی بنادیا کہ گویا کل وہاں کوئی چیز ہی نہ تھی ......اور جس دن ہم سب کو اکٹھا کریں گے پھر شرک کرنے والوں سے کہیں گے کہ تم اور تمہارے شرکاء سب اپنی جگہ پر رک جاؤ اور ہم ان کے درمیان جدائی ڈال دیں گے ......اور وہ اللہ کی طرف پلٹا دیئے جائیں گے جو کہ ان کا حقیقی مولا وحاکم ہے اور وہ جو افتراء اور بہتان باندھتے تھے وہ اسے کھودیں گے)

ان آیات مبارکہ میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ زندگی اوراس کی زیب وزینت خداوند عالم کے دست قدرت میں ہے، خدا کے سوا اس کا حاکم وچارہ گر کوئی نہیں لیکن بنی نوع انسان ظاہری زندگی کی دلفریبیوں کے دھوکہ میں آکراس کے باطن سے غافل ہوئے اور یہ گمان کرنے لگے کہ زندگی کا سب کچھ انہی کے ہاتھ میں ہے اور وہ خود اس کی تدبیر وتنظیم پر قادر ہیں، اسی بناء پر حضرت انسان نے دنیا میں اپنے ساتھی وشرکاء مثلاً بتوں اور ان جیسی ......بے اختیار...... چیزوں مثلاً مال واولاد کا سہارا لینے کی راہ لے لی، مگر خداوند عالم بہت جلد اسے اس غلط فہمی سے آگاہ کردے گا کہ پھر یہ زیب وزینت باقی رہے گا اور نہ اس کے اوراس کے شرکاء کے درمیان کسی طرح کا ربط وتعلق قائم رہے گا بلکہ یہ سب کچھ زوال ونابودی سے دوچار ہوجائے گا، اس

وقت انسان اس چیز سے ہاتھ دھو بیٹھے گا جسے اس نے بہتان و افتراء کی بناء پر خدا کا شریک اور زندگی میں مؤثر سمجھ رکھا تھا اور اپنے عمل اور اس کی حقیقت کا اصل معنی و مفہوم بھی ظاہر ہو جائے گا جو دنیا میں اسے حاصل ہوا تھا (یعنی وہ جس غلط و نادرست مطلب کو صحیح و درست اور برحق تصور کر چکا تھا اس کی حقیقت کھل کر اس کے سامنے آ جائے گی)، اور اسے اپنے مولائے برحق، اللہ کی طرف پلٹایا جائے گا۔

ایک اہم نکتہ کی وضاحت

زیر بحث موضوع کی بابت ایک نہایت اہم مطلب قابل توجہ ہے اور وہ یہ کہ آیت مبارکہ میں ارشاد ہوا ہے کہ ''لوگوں کے لئے زینت بنا دیا گیا نفسانی خواہشوں کی محبت کو مثلاً عورتیں، اولاد، سونا چاندی وغیرہ'' تو اس میں زینت بنا دیئے جانے کو خدا کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ خدا نے ان چیزوں پر اس طرح انسان کی نظریں جما دی ہیں کہ ان کی جلوہ سامانیاں اسے خیرہ کرنے لگیں اور وہ انہی کو غرض و مقصد حیات قرار دینے لگے، کیونکہ علیم و حکیم اور آگاہ و دانا پروردگار کی ذاتِ اقدس اس سے کہیں بالاتر ہے کہ اپنی مخلوق کے امور کی تدبیر اس طرح سے کرے کہ وہ اپنی تخلیق کے پاکیزہ مقصد تک پہنچنے ہی نہ پائے، خداوند عالم نے خود ہی ارشاد فرمایا ہے:

سورۂ طلاق، آیت: ۳

○ '' اِنَّ اللّٰہَ بَالِغُ اَمْرِہٖ''

(خدا، یقیناً اپنے کام کو پورا کرنے والا ہے)

اس سے مراد یہ ہے کہ خداوند عالم اپنے امور و نظام کو مقررہ مقصد تک پہنچا ہی دیتا ہے۔

سورۂ یوسف، آیت: ۲۱

○ '' وَاللّٰہُ غَالِبٌ عَلٰٓی اَمْرِہٖ''

(اور خدا اپنے امر (فرمان و نظام) پر غالب و حاوی ہے)

یعنی ایسا ممکن ہی نہیں کہ خداوند عالم دنیاوی ساز و سامان کو انسان کی نظروں میں اس طرح جلوہ گر کرے کہ وہ انہی چیزوں کی مستقل اثر گزاری کا معتقد ہو جائے اور یہ سمجھ لے کہ اس کی زندگی کا بنیادی مقصد یہی لذتیں اور خواہشیں ہیں ...... م

بلکہ حقیقت الامر یہ ہے کہ دنیا کی مادی لذتوں وزیب وزینت کی جلوہ گری کا مذکورہ عمل اگر کسی کی طرف منسوب کیا جائے تو وہ شیطان ملعون ہے کہ جس کے بارے میں خداوند عالم نے بھی ارشاد فرمایا ہے:

سورۂ انعام، آیت: ۴۳

○ "وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ"

(اور شیطان نے ان کے اعمال کو ان کے لئے زینت بنا دیا)

سورۂ انفال، آیت: ۴۸

"وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ"

(اور جب شیطان نے ان کے اعمال ان کے لئے زینت بنا دیئے)

ان دونوں آیتوں میں دنیا کی دلفریبیوں کو شیطان کی طرف منسوب کیا گیا ہے، البتہ جو بات اس حوالہ سے خداوندِ عالم کی بابت صحیح و درست ہے وہ یہ کہ اس نے اسے (شیطان کو) ایسا کرنے کی اجازت و آزادی دی ہے تا کہ بندوں کی آزمائش و امتحان کے مراحل پورے ہوں اور ان کے آزمانے میں کوئی پہلو تشنۂ تکمیل نہ رہ جائے، اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی تربیت کے امور بھی صحیح سمت میں قرار پا کر موثر ثابت ہوں، چنانچہ ارشاد حق تعالیٰ ہے:

سورۂ عنکبوت، آیت: ۴

○ "اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ۝ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّسْبِقُوْنَا ۭ سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝"

(کیا لوگوں نے یہ گمان کر لیا ہے کہ انہیں صرف زبانی طور پر یہ کہنے کی وجہ سے کہ ہم ایمان لائے ہیں، چھوڑ دیا جائے گا اور ان کی آزمائش نہ ہوگی؟ جبکہ ہم نے ان سے پہلے لوگوں کا بھی امتحان لیا ہے، خدا ہر صورت میں یہ جاننا چاہتا ہے کہ سچ بولنے والے کون ہیں اور جھوٹ بولنے والے کون ہیں؟ یا برے اعمال انجام دینے والوں نے یہ گمان کر لیا ہے کہ وہ ہم پر سبقت لے جائیں گے، کس قدر بری سوچ ہے ان کی!)

اسی طرح درج ذیل آیت کو بھی اسی اجازت و اذن پر محمول کرنا ممکن ہے:

سورۂ انعام، آیت ۱۰۸:

○ "كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ"

(اسی طرح ہم نے ہر امت کے لئے ان کے اعمال کو زینت بنا دیا)

بظاہر اس سے بھی یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ دراصل شیطان کو ان کے عمل کی تزئین کی اجازت و آزادی دی گئی ہو، اگرچہ یہ بھی ممکن ہے کہ اسے اس معنی پر محمول کیا جائے جو ہم نے درج ذیل آیت مبارکہ کی تفسیر میں ذکر کیا ہے:

سورۂ کہف، آیت: ۷

○ " اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۝ "

(بے شک ہم ہی نے روئے زمین پر جو کچھ موجود ہے اسے زمین کی زینت قرار دیا ہے تا کہ لوگوں کو آزمائیں کہ ان میں سے اچھا عمل کرنے والا کون ہے؟)

بہرحال تزئین اور دنیا کی جلوہ گری دو طرح سے قابل تصور ہے:

(۱) آخرت سنوارنے کے وسیلہ و ذریعہ کے طور پر!

یعنی دنیا کی چمک دمک اور اس کی زیب و زینت کا انسان کی نظروں میں جمانا اس غرض سے ہو کہ وہ اس کے ذریعے اپنی آخرت سنوارے اور اپنے اخروی ابدی مقام تک پہنچ جائے اور مال و دولت، جاہ و جلال، اولاد اور افرادی قوت سے استفادہ کرتے ہوئے زندگی کے گوناگوں عملی اقدامات میں رضائے الٰہی کے حصول کو یقینی بنائے اس طرح کی جلوہ گری مستحسن، خدا پسند اور دینی قدروں کا حامل عمل ہے، اسے خداوند کریم نے اپنی مقدس ذات کی طرف منسوب کیا ہے جیسا کہ سورۂ کہف کی آیت " اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا...... " اور دیگر سابق الذکر آیات مبارکہ کے حوالہ سے بیان کیا جا چکا ہے اور درج ذیل آیت سے بھی اس کی تائید و تصدیق ہوتی ہے:

سورۂ اعراف، آیت: ۳۲

○ " قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ؕ "

(کہہ دیجئے کہ کس نے دنیاوی زندگی کی اس زینت کو کہ جسے خدا نے اپنے بندوں کے لئے بنایا ہے اور پاکیزہ رزق کو حرام قرار دیا ہے!)

(۲) دنیا سے دل بستگی اور ذکر الٰہی سے روگردانی کی غرض سے!

یعنی دلوں میں دنیا کی چمک و دمک سے وابستگی اور فریفتگی پیدا کر کے انہیں اس کی زیب و زیبائش کے نشہ میں سرمست کرتے ہوئے خدا کے ذکر اور اس کی یاد سے غافل کر دینا، تو یہ ایک شیطانی مذموم عمل ہے، ایسا کرنے کو خداوند عالم نے شیطان کی طرف منسوب کیا ہے اور اپنے بندوں کو اس سے بچ کر رہنے کی تاکید کرتے ہوئے اس کے تباہ کن نتائج و آثار سے متنبہ کیا ہے جیسا کہ سابق الذکر آیہ مبارکہ " وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ " ......سورۂ انعام، ۴۳...... (اور شیطان نے ان کے سامنے ان کے اعمال کو زینت بنا دیا) کے حوالہ میں یہ مطلب بیان کیا جا چکا ہے، اسی طرح ایک اور

مقام پر خداوندِ عالم نے شیطان کا بیان ذکر کیا ہے جس میں اس نے خدا سے واضح الفاظ میں یوں کہا:

سورۂ حجر، آیت: ۳۹

○ " قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ "

(اس نے کہا اے پروردگار! چونکہ تو نے مجھے بہکایا ہے لہٰذا میں ضرور ان کے لئے زمین میں زیب و زینت کا سامنا فراہم کروں گا اور ان سب کو ضرور بالضرور بہکا دوں گا)

ایک اور مقام پر یوں ارشاد ہوا:

سورۂ توبہ، آیت: ۳۷

○ " زُيِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ "

(ان کے لئے ان کے برے اعمال کو زینت و عمدہ بنا دیا گیا)

اس طرح کی دیگر آیات میں بھی مذکورہ مطلب بیان ہوا ہے۔

البتہ اس میں دوسری قسم کی نسبت اس حوالہ سے خدا کی طرف دی جاتی ہے کہ شیطان اور تمام اسباب خواہ ان کا تعلق خیر سے ہو یا شر سے، سب ہی اپنی عملداری میں خدا کے اذن ...... اور اجازت و عطا کردہ عملی آزادی ...... کے دست نگر ہیں۔ (اسی مطلب کو اردو زبان میں یوں بیان کیا جاتا ہے کہ "خدا کی اجازت و حکم کے بغیر کوئی پتہ بھی حرکت نہیں کر سکتا") اور یہ اس لئے ہے تا کہ خداوندِ عالم کا ارادہ نافذ ہو اور اس کی مشیت کو عملی صورت ملے اور تخلیق و ایجاد کا سلسلہ منظّم رہے، اور نتیجتاً فوز و فلاح پانے والے افراد اپنے ارادہ و اختیار کی درست و صحیح سمت میں عملداری کے ساتھ اپنی کامیابی کو یقینی بنا سکیں اور اپنے ارادہ و اختیار کو غلط و نادرست سمت میں لے جانے والے مجرم و گناہگار عناصر بے نقاب اور کھل کر سامنے آ جائیں اور ان کی کامیاب لوگوں سے تمیز ممکن ہو۔

خلاصۂ کلام یہ کہ اب تک ذکر کئے گئے مطالب سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ آیۂ مبارکہ "وَزُيِّنَ لِلنَّاسِ......" (اور لوگوں کے لئے زینت بنا دیا گیا......) میں تزئین و زینت بنانے کے عمل کا فاعل خداوندِ عالم نہیں کیونکہ اس تزئین کی نسبت کہ جسے آیت میں ذکر کیا گیا ہے اگرچہ خداوندِ عالم کی طرف اس حوالہ سے دی جاتی ہے کہ اگر اس کا مورد و مصداق درست و بجا ہو کہ جس میں خدا کی عبادت و بندگی کی دعوت ہوتی ہے تو وہ براہِ راست خدا کی طرف منسوب ہوتی ہے اور اگر اس کا مورد و مصداق خدا کے ذکر و یاد سے دور کر دینے والا ہو تو اس کی نسبت خدا کے اذن کے حوالہ سے اس کی طرف ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود چونکہ آیت میں جن امور کو ذکر کیا گیا ہے اور جن چیزوں کے انتساب و استناد کا حوالہ دیا گیا ہے وہ ہرگز براہِ راست خدا کی طرف منسوب نہیں ہو سکتیں کہ اس سلسلہ میں مزید وضاحت آئندہ سطور میں آئے گی لہٰذا ادب القرآن اس

بات کا متقاضی ہے کہ اس عمل کی نسبت خداوندِ عالم کی ذاتِ اقدس کے علاوہ دیگر کی طرف دی جائے مثلاً شیطان یا نفس (نفسانی قوتیں)۔

اس بیان سے بعض مفسرین کے اس قول ونظریہ کی صحت آشکار ہو جاتی ہے جنہوں نے کہا کہ "زُیِّنَ" (فعل مجہول الفاعل) کا فاعل، شیطان ہے، یعنی شیطان نے ان چیزوں کو لوگوں کے لئے زینت بنا دیا ہے کیونکہ نفسانی خواہشوں کی محبت ایک مذموم چیز ہے اور اسی طرح مال ودولت کی محبت بھی ایک مذموم چیز ہے، جبکہ خداوندِ عالم نے اپنے آپ کو جن چیزوں سے مختص ...... یا جو چیزیں اپنے ساتھ مخصوص...... قرار دی ہیں ان کا ذکر آیت کے آخری جملوں میں اور اس کے بعد والی آیت میں کیا ہے۔ (اس آیت میں ارشاد فرمایا: "وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ" (اور اللہ کے پاس بہترین انجام کار ہے) اور بعد والی آیت میں بہشت کے باغات وغیرہ کا تذکرہ ہے۔

اسی طرح اس بیان سے اس مفسر کے قول ونظریہ کی عدم درستی بھی واضح ہو جاتی ہے جس نے کہا کہ آیت مبارکہ میں طبع بشری کی بابت بحث وگفتگو ہو رہی ہے لہٰذا جس محبت وچاہت اور اس طرح کے دیگر امور کا سرچشمہ اور اصل واساس طبع بشری ہو ان کی نسبت کسی صورت میں شیطان کی طرف نہیں دی جا سکتی، بلکہ صرف "وسوسہ" اور اس جیسے دیگر امور کہ جو برے اعمال کو انسان کی نظر میں اچھا دکھاتے ہیں ان کی نسبت شیطان کی طرف ہوتی ہے ...... کہ وہ اس طرح لوگوں کو ورغلاتا ہے اور ان کی نگاہوں میں برے اعمال کو مزین کرتا ہے جس کے نتیجہ میں لوگ ان اعمال کی انجام دہی وارتکاب کی راہ پر چل پڑتے ہیں......،

اس مفسر نے اپنے نظریہ کی صحت پر استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ اسی وجہ سے قرآن مجید نے صرف اعمال کی تزئین یعنی ان کے ظاہری طور پر مزین کرنے کے عمل کو شیطان کی طرف منسوب کیا ہے چنانچہ ارشاد ہوا:

سورۂ انفال، آیت ۴۸:

○ "وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ"

(اور جب شیطان نے ان کے اعمال کو ان کے لئے مزین کر دیا)

سورۂ انعام، آیت: ۴۳

○ "وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ"

(اور شیطان نے ان کے کاموں کو ان کے لئے مزین کر دیا)

لیکن جہاں تک حقائق اور طبائع اشیاء کا تعلق ہے تو ان کی نسبت صرف سوائے خدائے حکیم ودانا اور واحد ویکتائے لا شریک کے سوا کسی کی طرف نہیں دی جا سکتی، چنانچہ اس کا ارشاد گرامی ہے:

سورۂ کہف، آیت: ۷

o " اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ⑦ "

(ہم ہی نے روئے زمین پر پائی جانے والی چیزوں کو زمین کی زینت قرار دیا ہے تا کہ انہیں آزمائیں کہ ان میں اچھا عمل کرنے والا کون ہے؟)

سورۂ انعام، آیت: ۱۰۸

o " كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ "

(اسی طرح ہم نے ہرامت کے لئے ان کے عمل کو زینت بنا دیا)

ان آیتوں میں امتوں کے بارے میں بات ہوئی ہے جو کہ معاشرہ کی طبائع کے بارے میں بات کرنے سے عبارت ہے۔

مذکورہ بالا نظریہ وقول کی عدم درستی کی تفصیل یہ ہے کہ:

ان کا یہ کہنا کہ حقائق وطبائع اشیاء خدائے حکیم ولاشریک کی طرف منسوب ہوتی ہیں بالکل درست ہے لیکن ان کا یہ کہنا درست نہیں کہ آیہ مبارکہ میں طبع بشری اور اس کے آثار کے بارے میں بات ہوئی ہے، وہ اس سلسلہ میں غلط فہمی میں مبتلا ہوئے ہیں کیونکہ جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا کہ اس سورۂ مبارکہ میں صرف اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ خداوند عالم اپنی تمام مخلوق پر قیومیت رکھتا ہے (ان کے تمام امور کا ذمہ دار ہے، مخلوق کے تمام امور اس کے ہاتھ میں ہیں، وہ مخلوق کے تمام امور پر نظر رکھتا ہے اور ان کا نگران ہے.....م) ان کے تمام امور یعنی ان کی تدبیر، ایمان وکفر اور اطاعت و نافرمانی سب اس کی نظر میں ہیں اور اس کے احاطۂ قدرت ودائرۂ تسلط میں ہیں، اس نے تمام مخلوق کو پیدا کیا اور انہیں ان کی سعادت وخوش بختی کی راہیں دکھائیں، اور جن لوگوں نے دین خداوندی میں نفاق سے کام لیا یا اس کی آیات کا انکار کر کے کافروں میں سے ہو گئے یا اہل کتاب میں سے وہ لوگ کہ جنہوں نے خدا کی کتاب میں اختلاف کر کے بغاوت کا ارتکاب کیا اور خلاصہ یہ کہ وہ سب لوگ کہ جنہوں نے شیطان کی اطاعت کی اور نفسانی خواہشوں کا اتباع وپیروی کی وہ ہرگز خدا کو بے بس نہیں کر سکتے اور نہ ہی اس پر غلبہ پا سکتے ہیں اور نہ اسے مغلوب کر کے اس کی قیومیت کے عظیم ومضبوط سلسلہ کو کمزور کر سکتے ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ پوری کائنات اور عالم ہستی کی تمام موجودات تقدیر الٰہی وتدبیر خداوندی سے وابستہ ہیں کہ خداوند عالم نے اپنی مخلوق کے تمام امور کو نظام الاسباب سے جوڑ دیا ہے تا کہ امتحان وآزمائش کا قانون مضبوط ومستحکم بنیاد پر قائم ونافذ ہو، بنابرایں وہ خالق ہے اور اس ہی نے موجودات کی طبیعتوں ..... طبائع الاشیاء ..... اور ان کی قوتوں، ان کی چاہتوں اور ان کے افعال کو خلق فرمایا تا کہ

وہ ان کے ذریعے اپنے پروردگار کے مقدس جوار کہ جو اس کے قرب و بزرگی کا مقام ہے کی طرف رواں دواں ہوں، اور یہ خدا ہی ہے جس نے ابلیس کو اذن و آزادی دی ہے اور اسے لوگوں کو وسوسوں کا شکار کرنے سے...... جبراً...... نہیں روکا ہے اور نہ ہی انسان کو شیطانی وسوسوں کی پیروی کرنے سے...... جبراً...... روکا ہے...... بلکہ انسان اور اس کے دشمن ابلیس دونوں کو آزاد چھوڑ دیا ہے اور انہیں کسی حوالہ سے بھی اپنی طرف سے مجبور و بے بس نہیں کیا...... تا کہ امتحان و آزمائش کا سلسلہ و نظام قائم و جاری ہو اور اللہ تعالیٰ یہ جان لے کہ ایمان لانے والے افراد کون ہیں اور پھر ان میں سے کچھ کو گواہ قرار دے۔ اور اس مطلب کو زیر نظر سورۂ مبارکہ میں خداوند عالم نے اس لئے ذکر کیا تا کہ اس طرح مؤمنین کے نفوس کو تسلی اور ان کے دلوں کو اطمینان حاصل ہو کیونکہ اس سورۂ مبارکہ کے زمانۂ نزول میں اہل ایمان نہایت تنگی و سختی اور اندرونی طور پر شدید ترین بحران و کڑی آزمائش کا شکار تھے، اس صورتحال کی وجوہات یہ تھیں :

(۱) منافقوں کی نفاق آمیز چالیں و حرکتیں،

(۲) مریض دل افراد کی جہالت، کہ جس کے باعث انہوں نے امورِ زندگی کو درہم برہم کر کے ہر چیز کو الٹ پلٹ کر دیا...... حقائق کو غلط رنگ دے کر اذہان و افکار کو سیدھی راہ سے دور کر دیا......،

(۳) اطاعت خدا اور رسولؐ کی بابت کوتاہی،

یہ تو تھے داخلی اسباب، اس کے علاوہ بیرونی عوامل بھی کار فرما تھے کہ جن میں درج ذیل امور سر فہرست ہیں :

(۱) دعوت اسلام کی دشوار ترین صورتحال اور تبلیغ دین کی راہ میں رکاوٹیں۔

(۲) کفارِ عرب کی وسیع اور ہمہ پہلو سازشیں اور عملی طور پر تخریبی اقدامات،

(۳) اہل کتاب بالخصوص یہودیوں کی معاندانہ کاروائیاں۔

(۴) روم و عجم کے کافروں کی طرف سے طاقت کے استعمال اور عسکری اقدامات کی دھمکیاں۔

یہ تمام کفار اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے افراد، دنیا اور اس کی زیب و زینت کے دھوکہ میں آ کر اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ یہی چیزیں ان کی زندگی کا مقصد اعلیٰ ہیں، دراصل وہ راہ کو منزل اور راستہ کو مقصد سمجھ بیٹھے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اصل منزل و مقصد تو اس دنیا کے بعد اور اس سے کہیں بالاتر ہے۔

بہرحال اس سورۂ مبارکہ میں جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں امتوں کی طبائع...... اور وجودی قوتوں و فطری مزاجوں...... کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے البتہ اس کا دائرہ طبائع تک محدود نہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے کہ جس میں لوگوں کی خلقت و آفرینش اور ان کی وجودی تکوین کے مراحل سمیت ان کی زندگی کی تمام جہات و صفات اور خصلتیں و عادات، سعادت بخش و شقاوت آفرین اعمال اور اطاعت و معصیت پر مبنی افعال سب شامل ہیں، اس قرآنی بیان سے یہ امر

واضح ہوتا ہے کہ انسان اپنی ذات وصفات اور اعمال وعادات سب میں خداوند عالم کی قیومیت میں ہے، خدا اپنی قدرت میں کسی کے زیر دست نہیں ہوسکتا..... وہ قاہر ہے مقہور نہیں......، وہ اپنے امر ونظام میں کسی سے مغلوب واقع نہیں ہوسکتا..... وہ غالب ہے مغلوب نہیں..... ، نہ دنیا میں مقہور ومغلوب ہوسکتا ہے اور نہ ہی آخرت میں! دنیا میں اس طرح کہ سب کچھ اس کے اذن واجازت اور اس کی عطا کردہ آزادیٔ عمل سے ممکن الوقوع ہوتا ہے اور اس نے لوگوں کی آزمائش وامتحان کے لئے ایسا کیا ہے، اور آخرت میں اس طرح کہ وہ جزا وسزا کا عالم ہے کہ جس نے نیک عمل انجام دیا اسے جزا ملے گی اور جس نے برا عمل انجام دیا اسے سزا ملے گی.....لہٰذا وہاں کسی کا خدا پر غلبہ پانا قابل تصور ہی نہیں......،

اسی طرح زیر نظر آیات مبارکہ (۱۰ تا ۱۸) یعنی "اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُھُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـــًٔا......" تا "شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا ھُوَ......" اس مطلب کو بیان کرتی ہیں کہ کفار نے اگرچہ اپنے رب کی آیات ونشانیوں کو جھٹلا دیا اور خدا کی ان نعمتوں کو بدل دیا جو اس نے انہیں عطا کیں تا کہ وہ ان نعمتوں کے ذریعے رضائے الٰہی اور اس کی بہشت کے حصول کو یقینی بنا سکیں لیکن انہوں نے انہی نعمتوں کو سب کچھ سمجھ لیا اور اپنے آپ کو اپنے پروردگار سے بے نیاز جاننے لگے اور اپنے رب کے مقام ومنزلت کو بھول گئے، اس کے باوجود وہ خدا کو بے بس نہیں کر سکتے اور نہ ہی اس پر غلبہ پا سکتے ہیں، خداوند عالم بہت جلد انہیں ان کے انہی اعمال کو ان کے گلے کا طوق بنا دے گا اور ان کے مقابلے میں اپنے مومن بندوں کی حمایت وتائید اور نصرت وتقویت کرے گا اور ان کافروں کو دوزخ کی طرف دھکیل دے گا جو کہ بہت برا ٹھکانہ ہے، حقیقت یہ ہے کہ وہ لوگ جس چیز کا سہارا لئے ہوئے ہیں اور اسے ہی سب کچھ سمجھ رہے ہیں وہ دنیاوی زندگی کا نہایت معمولی ساز وسامان اور متاع ناچیز ہے جبکہ خدا کے پاس بہترین ٹھکانہ اور عمدہ مقام ہے، بنا برایں یہ امر واضح ہو گیا کہ ان آیات مبارکہ میں کافروں کی طبائع کے بارے میں بحث وگفتگو ہوئی ہے لیکن نہایت وسیع انداز میں! کہ جس میں ان کے اعمال صالحہ وغیر صالحہ سب شامل ہوں۔

ان تمام مطالب سے قطع نظر اگر صرف اسی آیت "کذلک زینا لکل امة عملهم" پر غور کریں کہ جسے مذکورہ بالا مفسر نے بطور شاہد پیش کیا ہے اور اس کے ذریعے اس امر پر استدلال کیا ہے کہ حقائق خدا کی طرف جبکہ اعمال شیطان کی طرف منسوب ہوتے ہیں تب بھی اس سے اس مفسر کے نظریہ کی صحت ودرستی ثابت نہیں ہوتی بلکہ اس کے برعکس مطلب کا ثبوت ملتا ہے اور جو کچھ ہم نے ذکر کیا اس کی تائید ہوتی ہے، اصل آیت ملاحظہ کریں:

سورہ انعام، آیت ۱۰۸:

" وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ۠ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۱۰۸ "

(اور تم برا نہ کہو ان کو جنہیں وہ خدا کے علاوہ پکارتے ہیں ورنہ وہ دشمنی و جہالت کی بناء پر خدا کو برا کہنے لگیں گے، اس طرح ہم نے ہر امت کے لئے ان کے اعمال کو زینت بنایا۔ پھر ان کی بازگشت ان کے پروردگار کی طرف ہوگی، وہ انہیں ان کے اعمال سے باخبر کرے گا)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں اعمال سے مراد ان کے برے اعمال ہیں۔

اس بیان و وضاحت کے بعد اس مفسر کے قول کا باطل ہونا ثابت ہو جاتا ہے جس نے کہا کہ اعمال کو زینت دینا دو طرح کا ہے، ایک پسندیدہ اور دوسرا مذموم و ناپسندیدہ، اور اعمال بھی دو طرح کے ہیں، ایک اچھے اور دوسرے برے، اور ان میں سے جو پسندیدہ، قابل تعریف اور اچھے ہیں وہ خدا کی طرف منسوب ہوتے ہیں اور باقی شیطان کی طرف!

یہ قول اگرچہ ایک حوالہ سے بعض جہات میں قرین صحت ہے لیکن اس کی صحت مستقیم و بلاواسطہ نسبت کے دائرے میں محدود ہے کہ جسے "فعل" اور اس طرح کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور اس بناء پر کہا جاتا ہے کہ خداوندِ عالم کوئی فعل سوائے اچھے و خوبصورت کے، انجام ہی نہیں دیتا اور وہ برائی و گندے کام کا حکم نہیں دیتا۔ لیکن جہاں تک غیر مستقیم اور بالواسطہ نسبت کا تعلق ہے کہ جسے "اذن" (عملی آزادی دینے) اور اس طرح کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے تو اس حوالہ سے تمام اعمال کی نسبت اس کی طرف دی جا سکتی ہے اس میں کوئی مانع نہیں کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو اس کا ہر چیز کا رب، خالق اور مالک ہونا بے معنی ہو جائے گا اور ان امور میں ہر طرح کے شریک کی نفی کرنا صحیح قرار نہ پائے گا جبکہ قرآن مجید اس طرح کی نسبت سے بھرا ہوا ہے، مثلاً:

سورۂ رعد، آیت: ۲۷

○ "یُضِلُّ مَنۡ یَّشَآءُ"

(وہ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے)

سورۂ صف، آیت: ۵

○ " اَزَاغَ اللّٰہُ قُلُوۡبَہُمۡ "

(خدا نے ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا)

سورۂ بقرہ، آیت: ۱۵

○ " اَللّٰہُ یَسۡتَہۡزِئُ بِہِمۡ وَیَمُدُّہُمۡ فِیۡ طُغۡیَانِہِمۡ "

(اللہ ان کا استہزاء کرتا ہے اور انہیں ان کی سرکشی میں چھوڑ دیتا ہے)

سورۂ اسراء، آیت: ۱۴

○ " اَمَرۡنَا مُتۡرَفِیۡهَا فَفَسَقُوۡا "

(ہم نے ان کے مالدار لوگوں کو حکم دیا تو انہوں نے فسق کیا)

اس مطلب پر مشتمل دیگر متعدد آیات موجود ہیں۔

ان مفسرین کرام کی غلط فہمی کا اصل سبب یہ ہے کہ انہوں نے اشیاء وموجودات عالم ہستی اور ان کے آثار وافعال کے درمیان پائے جانے والے ربط وتعلق کی بابت اچھی طرح بحث وتحقیق نہیں کی اور یہ گمان کر بیٹھے کہ ان اشیاء وامور میں سے ہر ایک کو اپنی مستقل حیثیت حاصل ہے اور کوئی کسی دوسرے سے ربط وتعلق نہیں رکھتا بلکہ ہر شے موجودات عالم میں پائے جانے کے باوجود ان سے الگ ومستقل حیثیت رکھتی ہے اور اسے اپنے ماقبل اور مابعد کی اشیاء وموجودات سے ہرگز کوئی ربط وتعلق نہیں۔

مذکورہ بالا غلط فہمی کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے اسباب وعلل کی کارگزاری کے نتیجہ میں وجود میں آنے والی ہر چیز کو مستقل حیثیت دے کر مربوطہ سبب وعلت کے اسی نظام کا حصہ اور اس سے وابستہ قرار دیا جسے خداوند عالم نے موجودات عالم کے لئے مقرر فرمایا ہے لیکن اس طرح کہ کسی چیز کا وجود میں آنا کسی بھی دوسری چیز سے کوئی ربط وتعلق نہیں رکھتا اور کوئی شے کسی شے سے وابستگی نہیں رکھتی بلکہ ہر چیز اپنی استقلالی حیثیت میں اپنے ہی سبب وعلت سے تعلق رکھتی ہے کسی دوسرے سبب وعلت سے یا کسی دوسری چیز کے سبب وعلت سے قطعاً کوئی تعلق نہیں رکھتی لہٰذا ہر واقعہ اور وجود میں آنے والا امر اپنے ہی اسباب کی بدولت وجود میں آیا اور ہر فعل اپنے فاعل ہی کی عملداری کا نتیجہ ہے اور اس کے علاوہ ہر ایک سے کٹا ہوا ہے یعنی منقطع الوجود ہے لہٰذا کوئی دوسرا سبب وعامل اس کے وجود میں آنے میں دخیل نہیں اور نہ ہی اس کی وجود پذیری میں اس سے متصل سبب کے علاوہ کسی سبب کا کوئی حصہ وکردار ہے، بنابرایں ستارے وسیارے اپنی گردش میں، دریا وسمندر اپنی روانی میں، کشتیاں اپنے چلنے میں، زمین اپنے اوپر چلنے والوں کا بوجھ اٹھانے میں، نباتات اپنی نشوونما میں، حیوانات اپنے چلنے پھرنے میں اور انسان اپنی زندگی بسر کرنے اور کام کاج میں، کوئی کسی سے نہ کوئی روحانی تعلق رکھتا ہے اور نہ ہی جسمانی، اور نہ ہی ان کے درمیان کسی طرح کی مادی وجسمانی وحدت پائی جاتی ہے اور نہ قوت وصلاحیت کے حوالہ سے ان کے درمیان کوئی ہم آہنگی ویکجہتی موجود ہے۔

اس غلط نتیجہ گری کا طبعی اثر یہ ہوا کہ انہوں نے اشیاء وموجودات کی وجود پذیری میں ایک دوسرے سے لاتعلق ہونے کے نظریہ کو وسعت دے کر اعمال کے عناوین اور افعال کی صورتوں میں بھی عدم وحدت وناہم آہنگی کا گمان کرلیا اور یہ خیال کرنے لگے کہ خیر وشر، سعادت وشقاوت، ہدایت وگمراہی، اطاعت ومعصیت، کسی سے نیکی و اچھا سلوک کرنا اور برائی یا

برابرتاؤ کرنا اور عدل وظلم وغیرہ کے درمیان اصل وجود پذیری میں ایک دوسرے سے کوئی ربط و تعلق نہیں بلکہ وہ سب ایک دوسرے سے منقطع، متفرق، غیر متصل اور غیر مربوط و غیر مرتبط ہیں، ان میں سے کوئی، دوسرے کے وجود میں آنے سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔

یہ حضرات اپنے اس نظریہ میں اس حقیقت سے غفلت کا شکار ہو گئے کہ یہ عالم گوناگوں موجودات اور مختلف مخلوقات کے ساتھ اس طرح سے ہے کہ اس کے اجزاء ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اور اس میں پائی جانے والی اشیاء ایک دوسرے سے پیوستہ و وابستہ ہیں، اس کی کوئی ایک چیز، دوسری چیز میں بدلتی رہتی ہے اور اس کا ایک حصہ، دوسرے حصہ میں تبدیل ہو جاتا ہے، مثلاً ایک دن انسان ہے تو دوسرے دن گھاس ونبات، پھر تیسرے دن جماد و خاک ہو جاتا ہے۔ کسی دن یکجا ہے تو کسی دن متفرق، اک دن زندہ ہے تو دوسرے دن مردہ، اور اس کی زندگی بعینہٖ دوسرے کی موت ہے، ایک دن نیا ہے تو ب دوسرے دن پرانا، اور اس کا نیا ہونا بعینہٖ دوسرے کا پرانا ہونا ہے۔ اسی طرح جو واقعات رونما ہوتے ہیں وہ سب حلقہ ہائے زنجیر کی طرح ایک دوسرے سے مرتبط اور وابستہ و پیوستہ ہیں کہ ان میں سے جس واقعہ کا تصور کریں وہ اپنے مقارن اور نزدیک ترین واقعہ و واقعات میں مؤثر دکھائی دیتا ہے بلکہ اپنے سے پہلے رونما ہونے والے اور قدیم ترین واقعات میں بھی اس کی اثر گزاری کا مشاہدہ ہوتا ہے اور یہ تمام واقعات کہ جو عالم طبیعت میں رونما و وقوع پذیر ہوتے ہیں ان کی حیثیت زنجیر کے ان حلقوں جیسی ہے کہ اگر ان میں سے کسی ایک کو کھینچیں تو گویا آپ نے پوری زنجیر کو اس کے تمام حلقوں کے ساتھ کھینچا ہے، اس نسبت سے اس عالم مادی میں بھی اگر ایک ذرہ میں تبدیلی کا تصور کریں تو پورے عالم میں تبدیلی کا تصور پیدا ہو جائے گا خواہ وہ تبدیلی ہمارے علم و ادراک کے دائرے سے باہر اور ہمارے احساس سے مخفی و پوشیدہ ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ کسی چیز کو نہ جاننا اس کے نہ ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتا اور یہ ایک قاعدۂ کلیہ ہے کہ جو صدیوں سے علمی بحثوں اور علم و تحقیق کے حلقوں میں مسلم الثبوت قرار پا چکا ہے اور جدید طبعی و سائنسی علوم نے بھی اس کی حقانیت کو ثابت کر دیا ہے اور ریاضیات کی ترقی یافتہ تحقیق نے بھی اسے نہایت واضح حقیقت کے طور پر تسلیم کیا ہے، اور ان تمام علمی و فلسفی اور ریاضی و سائنسی تحقیقات سے بہت پہلے اور اس سے پہلے کہ ہم ان تحقیقات اور دوسروں کی کتب کا مطالعہ کر کے اس حقیقت کے بارے میں استقلالی نظریہ قائم کریں قرآن مجید نے ہمیں اس قاعدۂ کلیہ کی بابت نہایت خوبصورت انداز میں آگاہ و مطلع کیا ہے اور ارشاد فرمایا کہ عالم طبیعت میں جاری و ساری نظام ایک مضبوط سلسلہ و پیوستگی کا حامل ہے اور آسمانوں اور زمین میں موجود و جاری نظاموں کے درمیان ایک مرتبط سلسلہ قائم ہے کہ ان میں سے ہر ایک، دوسرے سے وابستہ اور اس میں مؤثر ہے، اس طرح وہ سب تخلیق عالم کی غرض اعلیٰ کی تکمیل میں برابر کے شریک ہیں، ان سب میں تقدیر الٰہی نافذ ہے جو انہیں معاد اور قیامت کے دن کی طرف لئے جا رہی ہے ......یہ سب اشتراک عمل کے ساتھ خدا کے مقرر نظام کے سایہ میں بسوئے محشر سفر کر رہے ہیں...... کہ بالآخر سب کی بازگشت

تیرے پروردگار کی طرف ہے (وَاَنَّ اِلٰی رَبِّکَ الْمُنْتَهٰی) ......سورۂ نجم، آیت ۴۲......

اشیاء وموجوداتِ عالم کے ساتھ ساتھ افعال کے اوصاف اور اعمال کے عناوین میں بھی ارتباط ووابستگی اور پیوستگی کا رشتہ پایا جاتا ہے اور وہ رشتۂ ارتباط اس طرح سے ہے جیسے دومتناقض ومتقابل امور کے درمیان ہوتا ہے کہ ان میں سے اگر ایک، موجود نہ ہو تو دوسرے کا تصور ہی درست نہ ہوگا جیسا کہ تخلیق وایجاد کے حوالہ سے مشاہدہ ہوتا ہے کہ ایک چیز کا وجود میں آنا کسی دوسری چیز کے نابود ہونے پر موقوف ہوتا ہے اور سابق کی پہچان، لاحق ہی کے ذریعے ممکن ہوتی ہے۔ اسی طرح اعمال میں سے اگر ایک وصف وجود میں نہ آئے تو دوسرے وصف کا وجود میں آنا قابل تصور ہی نہیں اور جب تک کسی ایک عمل کی وجودی صورت گری مکمل نہ ہو دوسرے عمل کے وجودی آثار انسانی طبیعی و مادی معاشرے میں ظاہر ہی نہیں ہوتے، یہی حال خدائی معاشرہ کا ہے کہ جو" دین حق" سے عبارت ہے کہ اس میں بھی دومدِ مقابل امور واعمال میں سے ہر ایک، دوسرے کی پہچان کرواتا ہے چنانچہ اطاعتِ الٰہی جو کہ ایک حسنہ ونیکی ہے اور اس کا نیکی ہونا اس بناء پر ہے کہ اس کے مدِ مقابل معصیت و نافرمانی ایک سیہ و برائی ہے۔ اور حسنہ ونیکی ...... یا نیک عمل ...... اس لئے موجب اجر وثواب ہے کہ اس کے مقابل سیہ و برائی ...... یا برا عمل ...... سزا وعقاب کا باعث ہے۔ اور اجر وثواب کا نیک عمل انجام دینے والے کے لئے محبوب وپسندیدہ اور لذت بخش ہونا اس لیے ہے کہ سزا وعقاب برا عمل انجام دینے والے کے لئے تکلیف دہ و دردناک ہے، اور ثواب کی لذت ایک سعادت ہے کہ جس سے بہرہ ور ہونے کی خواہش ہر دل میں ہوتی ہے اور وہ اس لئے ہے کہ عقاب کی تکلیف و درد ایک شقاوت وبدبختی ہے کہ جس سے ہر شخص دوری اختیار کرتا ہے، اور سعادت ایک ایسی پاکیزہ شے ہے جس کا حصول ہر شخص بلکہ تمام موجودات کی تخلیق کا بنیادی مقصد ومقصود ہے جبکہ شقاوت ایسی شے ہے جس سے تمام موجودات روگردانی کرتی ہیں، اگر سعادت کی مطلوبیت، محبوبیت ومرغوبیت اور شقاوت سے دوری وروگردانی نہ ہوتی تو موجودات کا وجودی تشخص ہی باقی نہ رہتا اور عالم طبیعت میں کوئی وجود ہی نہ ہوتا۔

بنا برایں اطاعت، پھر حسنہ ونیکی، پھر لذت اور پھر سعادت معصیت، پھر عقاب، پھر درد والم اور پھر شقاوت کے بالمقابل قرار پاتے ہیں، ان میں سے جب بھی کوئی ایک چیز ظہور پذیر ہوتی ہے تو اس کے مدمقابل شے پردے میں چلی جاتی ہے اور جب وہ پہلی شے مرجاتی ہے تو دوسری زندہ ہو جاتی ہے۔ تو اس صورت میں یہ کیونکر ممکن ہے کہ ان میں سے کسی چیز کے اپنانے واختیار کرنے کی دعوت دی جائے جبکہ اس کے مدمقابل شے سے باز رہنے کا نہ کہا جائے؟ اور یہ کیونکر ممکن ہے کہ مادی اغراض اور نفسانی خواہشوں کی طرف بلایا جائے جبکہ اس کے مخالف ومدمقابل امر کا اپنانا بھی ممکن وروا ہو ؟

مذکورہ بالا مطالب سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ حکمت ودانائی اس بات کی متقاضی ہے کہ یہ عالم جس طرح صلاح واچھائی پر مشتمل ہے اسی طرح فساد و برائی بھی اس میں پائی جانی چاہیے اور جس طرح اطاعت وفرماں برداری کے

مظاہر اس میں پائے جاتے ہیں اسی طرح معصیت و نافرمانی بھی اس میں پائی جائے اور ایسا ہونا خداوند عالم کے اس نظام خلقت و آفرینش اور تخلیق و ایجاد کے بنیادی ضابطوں کے عین مطابق ہے جو اس نے عالم ہستی اور اس کی موجودات کے لئے مقرر فرمایا ہے۔ البتہ اس فرق کے ساتھ کہ اعمال اور ان کے اوصاف و خصوصیات کے علاوہ دیگر تمام امور و اشیاء اور حقائق و وجودات میں ہر طرح کی نسبت خداوند عالم کی طرف ہے کیونکہ خلق و امر صرف اسی کے لئے ہے اور اس میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ وہی پورے عالم اور موجودات جہانِ ہستی کا یکتا خالق و مالک اور مختار ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ سعادت بخش اعمال بھی اس کی طرف منسوب ہوتے ہیں کیونکہ ہدایت و رہنمائی کی نسبت مستقیم و بلا واسطہ اسی کی طرف ہے اور وہ بھی اس لئے کہ اس کی عطا کردہ ہدایت ہی سر چشمۂ سعادت ہے۔ اور جہاں تک شقاوت آمیز اعمال اور ان جیسے دیگر امور کا تعلق ہے مثلاً شیطانی وسوسے، نفسانی خواہشوں کا انسان پر تسلط اور ظالم و ستمگر افراد کا لوگوں پر حاکم و فرمانروا ہونا وغیرہ تو ان امور کی نسبت خداوند عالم کی طرف بالواسطہ ہے اور وہ اس طرح کہ خداوندِ عالم نے لوگوں کو اذن و آزادیٔ عمل عطا کی اور لوگوں نے اس سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ہدایت کے راستہ کو چھوڑ دیا تو اس کے نتیجہ میں خداوندِ عالم نے انہیں حق سے محروم کر دیا اور رسوائی و ذلت اور خزلان سے دوچار کر دیا...... گویا اس کا سبب لوگوں کا سوء اختیار اور غلط انتخاب ہے جس کی سزا کے طور پر گمراہی و رسوائی ان کا مقدر بن گئی اور خدا کی طرف سے انہیں حق سے دوری و محرومی کا سامنا کرنا پڑا...... اسی حوالہ سے یہ کہا جاتا ہے کہ خداوندِ عالم نے شیطان کو اذن و اجازت..... اور آزادیٔ عمل .....دی کہ وہ لوگوں کو وسوسوں کا شکار کر سکے اور ان کے دلوں کو اپنی طرف موڑ سکے، اسی طرح خدا نے انسان کو نفسانی خواہشوں کی پیروی سے اجتناب پر مجبور نہیں کیا اور نہ ہی وہ ظالم اور اس کے ظلم کے سامنے دیوار بنا یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ سعادت و شقاوت دونوں ہی اختیاری اور لوگوں کے اپنے ہی انتخاب پر موقوف ہیں۔ لہٰذا جو شخص سعادتمند ہوا وہ اپنے اختیار کردہ راستہ پر چلنے کی وجہ سے ہوا اور جو شقاوت و بدبختی سے دوچار ہوا وہ بھی اپنے ہی اختیار کے ساتھ ہوا کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو حجت ہی پوری نہ ہوتی اور اختیار و انتخاب اور امتحان و آزمائش کا نظام ہی قائم نہ ہوتا۔

اس مقام پر یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ ان دانشوروں اور محققین کے لئے مذکورہ بالا موضوعات و مباحث میں کھل کر بحث و گفتگو کرنے میں جو چیز مانع ہوئی وہ (ان کے اپنے گمان کے مطابق) ان بحثوں سے ظاہر ہونے والے نہایت سنگین نتائج کے سوا کچھ نہ تھی، اور وہ ان نتائج سے نہایت خوفزدہ ہو گئے مثلاً ان دانشوروں میں سے جبر کا عقیدہ رکھنے والے حضرات نے یہ گمان کیا کہ اگر وہ اشیاء عالم اور موجودات جہانِ ہستی کی بابت ان کے ایک دوسرے سے مربوط و وابستہ ہونے اور ان میں اسباب کی لازمی اثر گزاری کے قائل ہو جائیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ خداوند عالم کو ان چیزوں سے لاتعلق اور ان کی بابت بے بس جانیں اور اس کا اپنی مخلوقات ہی کی بابت بے اختیار ہونا تسلیم کر کے اس کی قدرت مطلقہ کا انکار کریں، اور ان

کے علاوہ دیگر دانشوروں ...تفویض کا عقیدہ رکھنے والوں..... نے یہ گمان کیا کہ اگر وہ مذکورہ مطلب کو تسلیم کریں اور اعمال کی بابت یہ نظریہ قائم کریں کہ ان کی نسبت و اسناد خداوند عالم کے ارادہ و قدرت کی طرف ہے اور وہی ان میں مؤثر اور اصل بنیاد ہے تو وہ لازمی طور پر خدا کی مخلوق یعنی انسان کے بے اختیار ہونے کے قائل ہوں گے اور انسان کے بے اختیار ہونے کے نتیجہ میں ثواب و عقاب کا نظام اور شرعی احکام و عملی دستورات کا خدائی سلسلہ ختم و بے اساس ہو کر رہ جائے گا۔

جبر و تفویض کا عقیدہ رکھنے والے حضرات کا مذکورہ بالا نتائج سے خوفزدہ ہونا بیجا و نادرست ہے کیونکہ ان کے لئے یہ بات ممکن تھی کہ وہ کسی خوف و وحشت کا شکار ہونے کی بجائے کلام الٰہی سے دل لگاتے اور اس سے حقیقت الامر سے آگاہی کی نعمت حاصل کرتے چنانچہ خداوند عالم کا ارشاد گرامی ہے:

سورۂ یوسف، آیت: ۲۱

○ " وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓی اَمْرِهٖ "

(اور اللہ اپنے امر پر غلبہ رکھتا ہے)

سورۂ اعراف، آیت: ۵۴

○ " اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ "

(یاد رکھو، اسی کے لئے ہے خلق اور امر)..... یعنی تخلیق اور نظامِ ہستی کا اختیار اسی کے پاس ہے......

سورۂ یونس، آیت: ۵۵

○ " لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ "

(خدا ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے)

یہ آیات مبارکہ اور ان سے مشابہ دیگر آیاتِ شریفہ زیر بحث موضوع کی بابت واضح دلیل و برہان کی نشاندہی کرتی ہیں (اور اس بات کو ثابت کرتی ہیں کہ اشیاء و موجودات عالم کے درمیان ایک مضبوط اور ارتباطی سلسلہ قائم ہے اور اس سے نہ تو خدا کی قدرت و اختیار سلب ہوتا ہے اور نہ ہی انسان کا بے بس و مجبور ہونا ثابت ہوتا ہے) البتہ اس موضوع کی بابت بعض مربوطہ مطالب سورۂ بقرہ کی آیت ۲۶ " اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا ...... " کی تفسیر میں بیان ہو چکے ہیں۔

بہرحال اب ہم اپنی زیر بحث آیت مبارکہ " زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ " کی بابت جاری سلسلۂ گفتگو کی طرف واپس آتے ہیں اور واضح طور پر بیان کرتے ہیں کہ بظاہر فعل " زین " کا فاعل خدا نہیں بلکہ شیطان ہے یا نفس ہے کیونکہ:

(۱) اس مقام پر کفار کی مذمت کی گئی ہے اور مال و اولاد جیسی مادی لذتوں سے دل لگانے اور ان چیزوں کو ان کی نظروں میں زینت دے کر انہیں خدا سے بے نیاز ہونے کا احساس دلانے کو نہایت بری اور حقارت کی نظر سے دیکھا گیا ہے، تو ظاہر ہے کہ اس طرح کی زینت جو کہ خدا کے ذکر سے غافل کر دیتی ہے اس کی نسبت خداوندِ عالم کی طرف ہرگز نہیں دی جاسکتی کہ اس کی شان و عظمت اس طرح کی نسبتوں سے بالاتر ہے۔

(۲) اگر زینت دینے کی نسبت خدا کی طرف ہو تو یقیناً اس سے ان فطری چاہتوں کا عطا کیا جانا مراد ہوگا جو انسان کے وجود میں پائی جاتی ہیں، اس صورت میں مناسب و موزوں یہ تھا کہ آیت میں " لِلنَّاسِ " کے بجائے "للانسان" کا لفظ استعمال کیا جاتا یا " بنی آدم " اور اس طرح کے الفاظ ذکر کیے جاتے جیسا کہ دیگر مقامات میں یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں، ملاحظہ ہو:

سورۂ تین، آیت: ۵

○ " لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ ۫ ثُمَّ رَدَدۡنٰهُ اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ ۙ "

(ہم نے انسان کو نہایت عمدہ بنیاد پر خلق کیا ہے، پھر ہم نے اسے پست ترین مقام پر پلٹا دیا)

سورۂ اسریٰ، آیت: ۷۰

○ " وَلَقَدۡ كَرَّمۡنَا بَنِیۡۤ اٰدَمَ وَحَمَلۡنٰهُمۡ فِی الۡبَرِّ وَالۡبَحۡرِ "

(اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور انہیں میدان میں اور دریا میں سواری دی)

پہلی آیت میں لفظ "انسان" جبکہ دوسری آیت میں لفظ "بنی آدم" ذکر کیا گیا ہے اور جہاں تک لفظ "ناس" کا تعلق ہے تو عام طور پر اسے ان موارد و مقامات میں استعمال کیا جاتا ہے جہاں کوئی امتیاز یا خصوصیت ملحوظ نہ ہو بلکہ تمام امتیازات و امتیازی خصوصیات ختم کر کے بات کی جائے، یا کسی شخص کی تحقیر اور فکری پستی و انحطاط کا اظہار مقصود ہو، مثلاً:

سورۂ اسراء، آیت: ۸۹

○ " فَاَبٰۤی اَكۡثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوۡرًا "

(اکثر لوگ ناشکری و کفرانِ نعمت کے سوا کچھ نہیں کرتے)

سورۂ حجرات، آیت: ۱۳

○ " یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقۡنٰكُمۡ مِّنۡ ذَكَرٍ وَّ اُنۡثٰی "

(اے لوگو! ہم ہی نے تمہیں مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے)

مذکورہ بالا دو آیتوں اور ان جیسی دیگر متعدد آیات میں لفظ "ناس" استعمال ہوا ہے..... جس سے ہر طرح کی

خصوصیات وامتیازات سے خالی بیان کا ثبوت ملتا ہے۔ ...،

(۳) جو امور اس آیت مبارکہ میں خداوند عالم نے نفسانی خواہشوں کی وضاحت و بیان میں ذکر کئے ہیں وہ فطری تزئین اور تخلیقی طور پر وجود میں قرار دی جانے والی چاہتوں سے موزونیت نہیں رکھتے کیونکہ اگر فطری چاہتیں مقصود وملحوظ ہوتیں تو لفظ "نساء" کے بجائے ایسا لفظ ذکر کیا جاتا جو زوجیت کے عام ووسیع معنی پر مشتمل ہوتا اور لفظ "بنین" کی بجائے لفظ "اولاد" ذکر کیا جاتا اور لفظ " اَلْقَنَاطِیْرِ الْمُقَنْطَرَةِ " کی بجائے لفظ "الاموال" ذکر کیا جاتا، کیونکہ طبعی وفطری محبت و چاہت عورتوں میں بھی اپنے مردوں کے ساتھ اسی طرح پائی جاتی ہے جس طرح مردوں میں اپنی عورتوں کے ساتھ پائی جاتی ہے یعنی دونوں میں محبت و چاہت کے جذبات یکساں ہیں، جس طرح مرد اپنی عورتوں سے فطری طور پر محبت و چاہت رکھتے ہیں بعینہ عورتیں بھی اپنے مردوں کے ساتھ اسی طرح کے فطری احساسات و جذبات رکھتی ہیں، لہٰذا لفظ "نساء" کی بجائے ایسا عام لفظ استعمال کیا جانا چاہیے تھا جس میں دونوں شامل ہوسکیں ، اسی طرح جو جذبۂ محبت بنین یعنی لڑکوں کی بابت انسان کی فطرت کا حصہ ہے وہ صرف لڑکوں تک محدود نہیں بلکہ تمام اولاد کی بابت یکساں پایا جاتا ہے...... خواہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں ، یہی حال اموال کا ہے کہ اس کی چاہت بھی ہر شے سے تعلق رکھتی ہے صرف "قناطیر المقنطرة" سے مخصوص نہیں، اسی بناء پر جس مفسر نے فعل "زین" (زینت دی گئی) کا فاعل خدا کو قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ خداوندِ عالم نے ان چیزوں کو لوگوں کے لئے زینت بنایا ہے وہ بیجا زحمت میں مبتلا ہوا اور اپنے نظریہ کی صحت و درستی کو یقینی بنانے کے لئے یہ کہنے پر مجبور ہوگیا کہ آیت میں لفظ "نساء"، "بنین" اور "قناطیر" کا ذکر خصوصیت کے ساتھ صرف اس لئے کیا گیا ہے کہ یہ چیزیں اپنے موضوع کے واضح مصادیق ہیں اور عام طور پر لوگ انہی سے آگاہی رکھتے ہیں.... ورنہ "نساء" سے مراد میاں بیوی دونوں، لفظ "بنین" سے مراد تمام اولاد اور قناطیر سے تمام اموال کی طرف اشارہ ہے۔ ...،

(۴) اگر تزئین کی نسبت خدا کی طرف ہو تو آیت کے آخری جملے اس سے مطابقت نہیں رکھتے، یعنی آیت کے آخری جملوں سے تزئین کے عمل کا خدا سے منسوب کرنا بے ربط و بے معنی ہوجاتا ہے کیونکہ ان میں ارشاد ہوا: " ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ۝ قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ " یہ سب کچھ دنیاوی زندگی کا ساز و سامان ہے جبکہ خدا کے پاس بہتر ٹھکانہ ہے، کہہ دیجئے کہ آیا میں تمہیں اس سے بہتر کی نشاندہی کروں؟ ، تو ان جملوں سے بظاہر یہ مقصود ہے کہ لوگوں کو دنیاوی چاہتوں ونفسانی لذتوں سے دل لگانے سے باز رکھا جائے اور ان کے دلوں میں خدائی نعمتوں یعنی باغہائے بہشت، پاکیزہ ازواج اور رضائے ربانی کی چاہت و رغبت پیدا کیا جائے کہ ان سب کو خداوند عالم نے لوگوں کے لئے مقرر کر رکھا ہے۔ اور یہ بات قطعی طور پر بے معنی ہے کہ مقدمہ سے روگردانی کروا کر ذوالمقدمہ کی طرف توجہ کروائی جائے کیونکہ اس میں تناقض پایا جاتا ہے اور اس سے دونوں یعنی مقدمہ اور ذوالمقدمہ کا ایک ساتھ ابطال ہو

جائے گا (دنیا، مقدمہ اور آخرت ذی المقدمہ ہے، تو اگر مقدمہ ہی نہ ہو تو ذی المقدمہ کی نوبت ہی کب آئے گی؟ اور مقدمہ کے بغیر ذی المقدمہ تک رسائی اور اس کا حصول کیونکر ممکن ہے؟) اس کی مثال اس شخص جیسی ہے جو سیر ہونا چاہے اور کھانے پینے سے اجتناب کرے (سیر ہونا ذی المقدمہ جبکہ کھانا پینا مقدمہ ہے تو کچھ کھائے پیئے بغیر سیر ہونے کی خواہش بے ربط قرار پائے گی)

ایک سوال اور اس کا جواب

ممکن ہے اس مقام پر آپ کہیں کہ آیت مبارکہ "زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ......" سے جو معنی سمجھا جاتا ہے اس کا خلاصہ درج ذیل آیت شریفہ میں بھی پایا جاتا ہے:

سورۂ اعراف، آیت: ۳۲

○ " قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۭ قُلْ هِىَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ "

(کہہ دیجئے کہ کس نے اس زینت کو جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لئے مقرر کیا ہے اور پاکیزہ رزق کو حرام قرار دیا ہے، کہہ دیجئے کہ یہ سب کچھ ان لوگوں کے لئے ہے (دنیاوی زندگی کا ساز و سامان ہے) جو ایمان لائے ہیں کہ اس کا خالص قیامت کے دن انہیں ملے گا)۔

اس آیت کے تناظر میں واضح طور پر معلوم و ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح مؤخر الذکر آیت (اعراف ۳۲) میں تزئین کا فاعل خداوند عالم ہے اس طرح زیر بحث آیت مبارکہ "زُيِّنَ لِلنَّاسِ......" میں بھی خدائے قدوس ہی اس کا فاعل ہے۔

اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ ان دو آیتوں میں مقام و مورد کے حوالہ سے فرق پایا جاتا ہے کیونکہ زیر بحث آیت مبارکہ میں لوگوں کی ان دلفریب چاہتوں اور نفسانی خواہشوں کی مذمت وارد ہوئی ہے جو لوگوں کو خداوند عالم سے دور کر دیتی ہیں اور انہیں خدا کی یاد سے غافل کر کے ان دائمی و حقیقی لذتوں سے لطف اندوز ہونے کا اہل بننے ہی نہیں دیتیں جو خداوند عالم کے ہاں اپنے بندوں کے لئے مقرر ہیں، اس کے ساتھ ساتھ یہ آیت مبارکہ لوگوں کو ان تباہ کن نفسانی خواہشوں اور دنیا کی زوال پذیر مادی لذتوں سے منہ موڑنے کی ترغیب دلا کر انہیں خدا کے ہاں موجود حقیقی اور ہمیشہ باقی رہنے والی لذتوں سے آشنا ہونے کی راہ دکھاتی ہے، لیکن سورۂ اعراف کی آیت (۳۲) میں ایسا نہیں ہوا بلکہ اس میں یہ مطلب بیان کیا گیا ہے کہ دنیاوی مادی نعمتیں بنی نوع انسان کے لئے زینت بنائی گئی ہیں اور ان سے استفادہ کرنے میں مؤمنین و غیر مؤمنین

اس دنیاوی زندگی میں برابر کے شریک ہیں جبکہ آخرت میں وہ سب مؤمنین کو حاصل ہوں گی اور صرف وہی ان سے استفادہ کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ زیر بحث آیت مبارکہ میں لفظ ''الناس'' ذکر ہوا جبکہ دوسری آیت (اعراف ۳۲) میں اسے تبدیل کر کے لفظ ''العباد'' ذکر کیا گیا۔ اسی طرح پہلی آیت میں لفظ ''زین'' (زینت دیا گیا) کو تبدیل کر کے دوسری آیت میں لفظ الطیبات من الرزق'' (پاکیزہ روزی) استعمال کیا گیا۔

''زینت'' کس نے دی اور کیوں دی؟

ممکن ہے آپ سوال کریں کہ آیت مبارکہ میں تزئین کے عمل کو اصل چاہتوں و خواہشوں کے بجائے ''حُبُّ الشَّهَوٰتِ'' (چاہتوں اور خواہشوں کی محبت) سے وابستہ کیا گیا ہے اور یہ بات واضح طور پر معلوم ہے کہ انسانی وجود میں ''محبت'' سے سرشار ہونا اور اس کے دل میں ''محبت'' کا گھر کرنا ایک طبیعی و فطری امر ہے اور انسان کی ذات کی مخصوص صفات و خصوصیات میں شامل ہے اور چونکہ خداوند عالم انسان اور اس کی وجودی قوتوں کا خالق ہے لہٰذا اس پورے نظام کی بازگشت اس بات کی طرف ہے کہ خداوند عالم نے ہی نبی نوع انسان کے دلوں میں ''محبت'' قرار دی ہے یعنی اس نے ان کے دلوں میں ''محبت'' کو خلق کیا ہے، اور چونکہ خلق کرنے کی نسبت خداوند عالم کے سوا کسی کی طرف نہیں ہو سکتی لہٰذا تسلیم کرنا ہوگا کہ فعل ''زین'' کا فاعل خدا ہے۔

اس سوال کے جواب میں عرض ہے کہ اس سلسلہ میں جو قرائن ہم نے ذکر کیے ہیں اس سے یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ محبت کے زینت قرار دیئے جانے سے مراد محبت کا اس طرح قرار دیا جانا ہے کہ لوگوں کو اپنی طرف جذب کرے اور اپنے علاوہ دوسروں سے روکے، کیونکہ زینت و زیبائش ایسا مطلوب و پسندیدہ اور پرکشش امر ہے جو اپنے غیر سے منضم ہوتا ہے تا کہ انسان اس غیر کی طرف توجہ و التفات کرے اور اسے اپنی طرف جلب و جذب کرے اس کی مثال اس عورت سے دی جا سکتی ہے جو اپنے آپ کو ایسے امور سے مزین کرتی ہے جو اسے حسین و جمیل بنا دیں تا کہ ان کی وجہ سے جو حسن و جمال اسے حاصل ہو وہ مرد کو اس کی طرف مائل کر دے، بنا برایں درحقیقت وہی امور اصل مقصود اور منظور نظر ہوتے ہیں اور عورت ان سے استفادہ کرتی ہے،...... کہ اگر وہ امور نہ ہوں تو عورت مرد کو اپنی طرف جلب ہی نہ کر سکے۔ ،خلاصۂ کلام یہ کہ جملہ ''زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ......'' (چاہتوں کی محبت لوگوں کے لئے زینت بنائی گئی ہے) کے معنی کی بازگشت اس امر کی طرف ہے کہ ان کی نظروں میں اسے اس طرح جلوہ گر کیا گیا کہ ان کے دل اس کی طرف جھک جائیں اور وہ اس کے شیدائی ہو جائیں اور ان کی تمام تر توجہات اسی کی طرف مبذول ہوں، لہٰذا یہاں محبت کی اثر گزاری مقصود نہیں یعنی آیت کے معنی کی بازگشت

محبت کی تاثیر کی طرف نہیں، جیسا کہ سورۂ مریم کی آیت ۵۹ کے معنی سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس میں ارشاد الٰہی ہے: "فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا" (پھر ان کے بعد ایسے لوگ آئے جنہوں نے نماز کو ضائع کر دیا اور چاہتوں کی پیروی کی، وہ بہت جلد اپنے کیفر کردار کو پہنچ جائیں گے)۔ اس کی تصدیق وتائید ان مطالب سے بھی ہوتی ہے جو آئندہ سطور میں پیش کئے جائیں گے اور ان میں بیان کیا جائے گا کہ زینت کے موارد میں سے نساء (عورتیں) بنین (بیٹے) اور قناطیر کو کیوں ذکر کیا گیا، اس کے علاوہ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ لفظ "شہوات" سے دل لگی و دل بستگی، شیفتگی و فریفتگی، انتہائی محبت، قلبی جھکاؤ اور گرویدہ ہونے کے معانی کا ثبوت ملتا ہے جبکہ اس کا اصل معنی وہ چیزیں ہیں جن سے محبت وچاہت وابستہ ہوتی ہے۔

محبت وچاہت کے موارد

○ "مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ......"
(عورتیں، بیٹے اور سونے وچاندی سے بھری ہوئی مشکیں۔۔۔۔)

اس جملہ میں جو الفاظ ذکر کئے گئے ہیں سب سے پہلے ان کے لغوی واستعمالی معانی بیان کئے جاتے ہیں، اس کے بعد ان کی تفصیلات ذکر ہوں گی۔

(۱) "نساء" (عورتیں)

یہ جمع کا صیغہ ہے لیکن لفظوں میں اس کا مفرد کوئی نہیں آتا،

(۲) "بنین" (بیٹے)

یہ جمع کا صیغہ ہے اس کا مفرد "ابن" ہے۔ یہ لفظ اولاد میں سے لڑکوں کے لئے استعمال ہوتا ہے خواہ وہ بالواسطہ اولاد ہو یا بلاواسطہ، یعنی خواہ اپنے لڑکے ہوں یا اپنی اولاد کے لڑکے یعنی پوتے ہوں۔ سب پر لفظ "بنین" اطلاق ہوتا ہے۔

(۳) "مقنطرۃ"

یہ "قنطار" کی جمع کا صیغہ ہے۔ اس کا معنی ایک مشک کی مقدار کے مطابق سونا یا سونے سے بھری ہوئی مشک ہے۔

(۴) "مقنطرۃ"

یہ اسم مفعول لفظ "قنطار" ہی سے مشتق ہے جو کہ جامد ہے۔ (جامد یعنی جس سے کوئی چیز مشتق نہ ہو سکے) اور عربوں کی عادت ہے کہ وہ جامد الفاظ میں کسی نسبت کو ملحوظ قرار دیتے ہوئے ان الفاظ کو مصدری معانی کا حامل بنا دیتے ہیں اور پھر مصدری معنی کے تناظر میں اس کی بنیاد پر دیگر مشتقات کی تشکیل کا کام لیتے ہیں چنانچہ اس کی مثالیں درج ذیل الفاظ میں ملتی ہیں:

(۱) باقل۔ (۲) تامر۔ (۳) عطار۔ ان الفاظ کو "بقل"، "تمر" اور "عطر" سے مشتق کر کے ان اشیاء کے بیچنے والوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے یعنی باقل، جو کہ بقل (سبزیاں) سے مشتق ہے اسے سبزی بیچنے والے اور تامر، جو کہ تمر (کھجور) سے مشتق ہے اسے کھجور بیچنے والے اور عطار، جو کہ عطر (خوشبوجات) سے مشتق ہے اسے عطر بیچنے والے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس طرح کے اشتقاقی عمل کا فائدہ و غرض یہ ہے کہ جس چیز یا شخص کی کسی ایسے وصف سے توصیف کی جائے جو اس کے اپنے ہی لفظ سے لیا گیا ہو (مشتق کیا گیا ہو) اس چیز یا شخص میں اس وصف کی تثبیت ہو جاتی ہے اور اس میں اس وصف کا پایا جانا یقینی طور پر ثابت ہوتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ اس مطلب کی طرف اشارہ مقصود ہوتا ہے کہ وہ چیز یا شخص اس لفظ کے معنی کا حامل ہے اس کا فاقد ہرگز نہیں، مثلاً کہا جاتا ہے: "دنانیر مدنرۃ"، "دواوین مدونۃ"، "حجاب محجوب"، "ستر مستور"، تو ان میں "مدنوۃ" دنانیر کے وجود کو یقینی بناتا ہے، مدونۃ، دواوین کا اثبات کرتا ہے۔ مجوب، حجاب اور مستور، ستر کو یقینی طور پر ثابت کرتا ہے، اسی طرح "مقنطرۃ" میں قناطیر کے یقینی ہونے کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔

(۵) "الخیل" کا معنی گھوڑے ہے۔

(۶) "المسومۃ" جو کہ "سوم" سے مشتق ہے اس کا معنی حیوان کا چرنا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے: "سامت الابل سوماً" یعنی اونٹ چرنے کے لئے نکل پڑا کہ وہ اب چرنے لگا ہے۔ یاد رہے کہ جو حیوان اپنا چارہ گھر سے نہیں لیتے بلکہ گھوم پھر کر اور ادھر ادھر سے چر کر اپنا پیٹ بھر لیتے ہیں انہیں عربی زبان میں "سائمۃ" کہا جاتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ "مسومۃ" اس حوالہ سے کہا جاتا ہو کہ انہیں چراگاہ میں نشانی لگا کر مشخص کر دیا جاتا ہے تاکہ ان کی پہچان ہو سکے تو اس بناء پر "مسومۃ" کا اشتقاق "سامت" کی بجائے "سمت الابل فی المرعٰی" سے ہوگا جو کہ "سمۃ" یعنی نشانی و علامت سے ہے، اسی وجہ سے کہا جاتا ہے: "اسمتھا"، "سومتھا" (میں نے اسے نشانی لگائی) (میں نے اسے داغ دیا) عام طور پر حیوان پر داغ لگانے سے بھی اس کی پہچان و تمیز ممکن ہوتی ہے اس لئے "سمۃ" داغنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ بنا بر ایں لفظ "الخیل المسومۃ" سے یا تو چراگاہ کی طرف چرنے کے لئے بھیجے گئے جانور مراد ہوں گے یا نشانی

لگائے ہوئے مراد ہوں گے، یعنی وہ گھوڑے جن کو چراگاہوں میں آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ وہ اپنی مرضی سے اپنا چارہ لیں یا وہ گھوڑے جنہیں چراگاہوں میں مخصوص نشانی لگادی جاتی ہے تاکہ ان کی پہچان آسانی کے ساتھ ہو سکے۔

(۷) "الانعام" جمع کا صیغہ ہے اس کا مفرد "نَعَم" (نون پر زبر اور عین پر بھی زبر کے ساتھ) ہے۔ اس کا معنی اونٹ، گائے اور بھیڑ بکری ہے یہاں یہ بات قابل ذکر و لائق توجہ ہے کہ چوپایوں کے لئے لفظ "بھائم" بھی استعمال ہوتا ہے لیکن وہ مذکورہ بالا چوپایوں (اونٹ، گائے و ربھیڑ بکری) کے علاوہ دیگر حیوانات کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے البتہ وحشی جانوروں، پرندوں اور کیڑوں مکوڑوں (حشرات الارض) کے لئے لفظ بہائم استعمال نہیں ہوتا۔

(۸) "حرث" کا معنی زراعت و کھیتی باڑی ہے، اس میں کسب و کار کا معنی بھی پایا جاتا ہے۔ اس کا معنی نباتات کی تربیت و دیکھ بھال یا وہ تربیت شدہ و دیکھ بھال شدہ نباتات ہے تاکہ زندگی بسر کرنے میں ان سے استفادہ کیا جا سکے۔

ایک اہم نکتہ

آیت مبارکہ میں چاہتوں (شہوات) کی جو تعداد ذکر کی گئی ہے وہ اس بناء پر نہیں کہ مشتہیات (جن چیزوں کی چاہت ہوتی ہے، یا جن چیزوں سے چاہت تعلق پکڑتی ہے) کی کثرت، شہوات سے محبت کی کثرت کا سبب بنتی ہے اور وہ اس طرح کہ انسان طبعی و فطری طور پر ازواج و اولاد اور مال کی طرف مائل ہوتا ہے، کیونکہ اگر اس بات کو درست قرار دیا جائے کہ مشتہیات کی کثرت سے شہوات سے محبت کی کثرت پیدا ہوتی ہے تو آیت مبارکہ میں جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اور جو تعبیرات ذکر ہوئی ہیں ان کی توجیہ و تاویل کرنی پڑے گی مثلاً انسان کی بجائے "ناس" کیوں کہا گیا، اولاد کی بجائے "بنین" کیوں کہا گیا اور مال کی بجائے "قناطیر المقنطرۃ" کے الفاظ کیوں ذکر کئے گئے۔ چنانچہ کئی مفسرین نے اس طرح کی توجیہات و تاویلات کی زحمت کا بوجھ اپنے اوپر ڈالا ہے۔

بلکہ حقیقت یہ ہے کہ متعدد چاہتوں کا شمار کیا جانا اس بناء پر ہے کہ دنیاوی مشتہیات سے دل بستگی و فریفتگی کے حوالہ سے لوگوں کی کئی قسمیں ہیں چنانچہ کچھ لوگ ایسے ہیں جن کی چاہتوں کا محور اور کعبۂ عشق صنف نازک کے سوا کچھ نہیں اور وہ عورتوں سے دل لگی، ان کی ہم نشینی، ان کا قرب و انس اور ان سے محبت و پیار کے اندھے تعلق کے سوا اپنی زندگی اور وجود و ہستی کا کوئی مقصد ہی نہیں رکھتے، ان کی اس درجہ عاشقانہ روش انہیں بداعمالیوں اور اخلاقی پستیوں کا شکار کر دیتی ہے اور وہ خداوند عالم کی معصیتوں و نافرمانیوں کے مرتکب ہو جاتے ہیں مثلاً رقص و سرور اور ساز و آواز کی محفلیں گرم کرنا اور شراب نوشی و

منشیات کا استعمال اور اس طرح کے دیگر امور ان کی عادات اور روزمرہ کے معمولات بن جاتے ہیں۔ البتہ اس طرح کے اعمال و ناز یبا و غیر شائستہ حرکات عام طور پر مرد حضرات ہی سے مخصوص ہے، خواتین میں اس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ لوگ ایسے ہیں جو بیٹوں کے دلدادہ ہیں اور وہ ان کی کثرت کے خواہاں ہوتے ہیں اور بیٹوں کی کثرت کی بناء پر اپنے آپ کو طاقتور سمجھتے ہیں، اس طرح کے افراد زیادہ تر دیہاتوں کے باسی ہیں اور وہ اولاد میں سے صرف بیٹوں کی کثرت چاہتے ہیں بیٹیوں کی نہیں، ان دو گروہوں کے علاوہ کچھ لوگ مال و دولت پرستی کا شکار ہوتے ہیں اور ان کی تمام تر کاوشیں اس بات پر مرکوز ہوتی ہیں کہ جس قدر ممکن ہو اپنی تجوریاں بھر دیں اور اپنے خزانوں کو سرمایہ و ثروت سے پر کر دیں، اس طرح کا دیوانہ پن اور مال جمع کرنے کا جنون سونا چاندی اور نقد مال کی بابت پیدا ہوتا ہے یا ان چیزوں کی بابت ہوتا ہے جو نقد مال کی طرح اور اس کے برابر ہو، عام استعمال میں آنے والے ساز و سامان کی جمع آوری بھی صرف اسی صورت میں ان کی توجہات کا مرکز قرار پاتی ہے جب اس ساز و سامان کی حیثیت نقد سرمایہ جیسی ہو یعنی جب چاہیں اسے نقد مال میں تبدیل کر سکیں، اس طرح کے لوگ عموماً دیہاتوں کے باسی نہیں بلکہ شہروں میں زندگی بسر کرنے والے ہوتے ہیں اور وہی اس طرح کے دیوانہ پن میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ان تین گروہوں کے علاوہ کچھ افراد طاقتور گھوڑوں کا مالک بننے کو سب سے بڑا اعزاز سمجھتے ہیں اور ان کی نظروں میں اصل دولتمندی یہی ہوتی ہے۔ کچھ لوگ چوپایوں کی کثرت سے محبت کرتے ہیں اور ان کے ہاں اس سے زیادہ محبوب و پسندیدہ چیز کوئی نہیں ہوتی۔ کچھ لوگ زراعت و کھیتی باڑی...... یا زمینداری...... کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ لوگ مذکورہ بالا چیزوں میں سے بالترتیب دو یا زیادہ کے دلدادہ ہوں یا بالتفریق مذکورہ اشیاء کی محبت ان کے دلوں میں گھر کر چکی ہو۔

یہ ہیں شہوات اور چاہتوں کی وہ اقسام کہ جن کے حوالہ سے لوگ مختلف و متعدد گروہوں میں منقسم ہیں اور ہر گروہ ان اشیاء میں سے کسی ایک کو اپنا مقصدِ اعلیٰ اور زندگی کی گوناگوں نعمتوں سے بہرہ ور ہونے میں اصل ہدف و مقصود قرار دیتا ہے اور اس کے علاوہ دیگر اشیاء کو فروعی حیثیت کا حامل سمجھتے ہوئے ثانوی مقام دیتا ہے، اور بہت کم ایسے افراد پائے جاتے ہیں (یا عین ممکن ہے کہ سرے سے پائے ہی نہ جاتے ہوں) جو مذکورہ تمام اشیاء کو مساوی درجہ و حیثیت دیں اور ان سب کو زندگی کا مقصد و مقصود اعلیٰ قرار دے کر سب کو یکساں مقام دیں۔

جہاں تک جاہ و مقام اور منصب اور صدارت وغیرہ کا تعلق ہے تو وہ سب در حقیقت خیالی امور ہیں اور ان سے محبت و دل لگی کا رشتہ ثانوی بنیاد پر استوار ہوتا ہے لہٰذا اسے شہوات کی فہرست میں شمار نہیں کیا جاتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ آیت مبارکہ تمام شہوات کے جامع تذکرہ و شمار کرنے کے مقام میں نہیں۔

مذکورہ بالا مطالب کی روشنی میں اس موضوع کی تائید ملتی ہے جس کا اشاراتی تذکرہ ابتدائے بحث میں ہو چکا ہے

"حُبُّ الشَّهَوٰتِ" سے مراد، ان سے دل بستہ وفریفتہ اور شیدائی و ہرجائی ہونا ہے (اسی حوالہ سے اس کی نسبت شیطان کی طرف دی جاتی ہے) ان کی اس سے وہ اصلی وحقیقی محبت مراد نہیں جو فطری طور پر انسان میں ودیعت کی گئی ہے (اور وہی فطری چاہت ہے جو خداوندِ عالم کی طرف منسوب ہوتی ہے)۔

دنیاوی زندگی کا ساز وسامان

○ " ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا "
(وہ سب دنیاوی زندگی کا ساز وسامان ہے)

اس جملہ میں دنیاوی زندگی کے ساز وسامان کا تذکرہ مخصوص انداز میں ہوا ہے اور وہ یوں کہ پہلے ان کی فہرست ذکر کی گئی اور پھر "ذٰلِكَ" کے لفظ سے اس کی طرف اشارہ کر کے کہا گیا کہ وہ شہوات اور نفسانی خواہشات وچاہتیں ایسے امور ہیں جن سے اس دنیاوی زندگی میں استفادہ کیا جاتا ہے اور زندگی سے لطف اندوز ہونے کی غرض سے ان کا سہارا لیا جاتا ہے اور یہ دنیاوی زندگی تمہاری اخروی زندگی سے بہت نزدیک ہے، اور یہ دنیاوی زندگی اور اسی طرح وہ متاع کہ جسے اس زندگی کے لئے استعمال میں لایا جاتا ہے فانی امور میں سے ہیں اور انہیں ہرگز بقاء حاصل نہیں، نہ دنیا کا اچھا انجام ہے اور نہ اس کی متاع اور ساز وسامان کو نیک بقا میسر ہے۔ جبکہ نیک انجام اور بقاشعار زندگی وہ ہے جو خداوند عالم کے پاس ہے، اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: " وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ" (اور ہی ہے کہ جس کے پاس اچھا ٹھکانا ہے)

بہتر اور بقاءشعار زندگی کی نشاندہی

○ " قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ۚ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ...... "
(کہہ دو کہ آیا میں تمہیں اس سب کچھ سے بہتر کی نشاندہی کروں، جو لوگ متقی ہیں ان کے لئے ان کے پروردگار کے پاس باغات ہیں .....)

یہ آیت مبارکہ، جملہ "وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ" کی وضاحت کر رہی ہے، اس میں سابق الذکر فناپذیرو

زوال آشنا شہوات و چاہتوں کی جگہ ایسے امور کا تذکرہ ہوا ہے جو انسان کے لئے "خیر" ہیں اور ان کا "خیر" ہونا اس بناء پر ہے کہ وہ ہمیشہ باقی رہنے والے اور حقیقی معنی میں حسن اور اچھے ہیں کہ جنہیں فنا ہرگز مغلوب نہیں کر سکتی، اور وہ ایسے امور ہیں جو مذکورہ شہوات ہی کی مانند ہیں کہ جنہیں انسان لطف اندوز ہونے کے لئے چاہتا ہے اور ان سے حاصل ہونے والے آثار کا طلبگار اور ان کا دلدادہ ہوتا ہے البتہ اس فرق کے ساتھ کہ ان امور میں ان شہوات جیسی قبیح و بری صورتیں نہیں پائی جاتیں اور وہ انسان کو ان اعلیٰ مراتب و منازل سے محروم کرنے کا سبب نہیں ہوتے جو اس کے لئے خیر اور بہتری کے حامل ہیں۔ وہ امور بہشت، پاکیزہ ازواج اور رضائے پروردگار سے عبارت ہیں۔

دو اہم نکات

(۱) آیۂ مبارکہ میں بہشت کہ جس میں تمام لذائذ بشمول ازواج موجود ہیں کے ذکر کے ساتھ ساتھ ازواج کا ذکر خاص طور پر کیا گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی نظر میں ہم بستری سب سے بڑی جسمانی لذت ہے، اسی بناء پر ماقبل آیت میں بھی عورتوں کا نام سب سے پہلے دیا گیا اور ارشاد ہوا: "مِنَ النِّسَآءِ وَ الْبَنِيْنَ وَ الْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ......" ۔

(۲) "رضـــوان" (اسے حرف "ر" کے نیچے زیر اور پیش دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے) اس کا معنی رضایت و خوشنودی ہے اس سے مراد وہ نفسانی حالت ہے جو کسی ایسی شے کے ملنے اور سامنے آنے سے پیدا ہوتی ہے جسے طبع انسانی پسند کرتی ہے اور اس سے مانوس ہوتی ہے، یا یوں کہا جائے کہ رضایت اس کیفیت کا نام ہے جو کسی من پسند و طبع قبول چیز کے ملنے سے انسانی وجود میں پیدا ہوتی ہے اور طبع انسانی اسے خود سے دور رکھنا پسند نہیں کرتی اور نہ ہی اسے اپنے آپ سے دور کرتی ہے۔ اس حالت و کیفیت کے مقابل میں "سخط" و نارضایتی ہے کہ جو کسی ناپسندیدہ چیز کی وجہ سے طبع انسانی میں جنم لیتی ہے اور انسان اسے خود سے دور رکھنے کا خواہاں اور کوشاں ہوتا ہے۔

جہاں تک رضائے خداوندی کا تعلق ہے تو اس کا ذکر قرآن مجید میں کئی بار ہوا ہے اور وہ افعال و صفات دونوں میں قابل تصور ہے یعنی جس طرح اطاعت الٰہی کے باب میں بندوں کے افعال کی بابت خداوند عالم کی رضایت کی بات ہوتی ہے اسی طرح غیر اطاعتی امور مثلاً اوصاف و صفات اور احوال وغیرہ میں بھی رضائے پروردگار تصور کی جا سکتی ہے البتہ قرآن مجید میں جہاں بھی رضائے خداوندی کا تذکرہ ہوا ہے وہ اکثر اطاعتی امور ہیں، اسی بناء پر خدا کی رضا اور بندوں کی رضا کا تقابلی حوالہ سامنے آتا ہے اور وہ اس طرح کہ خدا کی بندوں سے رضایت ان کی اطاعت کی وجہ سے ہوتی ہے اور بندوں کی خدا سے رضایت، اطاعتی اعمال پر خدا کی طرف سے بہتر جزاء عطا کئے جانے اور اطاعت گزار بندوں کے بارے میں اچھا فیصلہ کرنے

کی بناء پر ہوتی ہے، چنانچہ درج ذیل آیات مبارکہ میں دونوں رضایتوں کا تذکرہ ہوا ہے:

سورۂ بینہ، آیت: ۸

O "رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ"

(اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے)

سورۂ فجر، آیت: ۲۸

O "يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً"

(اے نفس مطمئنہ! تو اپنے رب کی طرف واپس آ جا، رضایت کے ساتھ اور رضایت یافتہ ہو کر)

سورۂ برائۃ، آیت: ۱۰۰

O "وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ......"

(اور مہاجرین وانصار میں سے......اسلام لانے میں......سبقت لینے والے پہلے لوگ اور وہ کہ جنہوں نے ان کے بعد نیکی واچھے انداز میں اس راہ کو اختیار کیا اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے اور اس نے ان کے لئے باغہائے بہشت مقرر کئے ہیں......)

زیر نظر آیت مبارکہ میں "رضوان من اللّٰه" (رضائے خداوندی) کا تذکرہ ان امور کی فہرست میں کیا گیا ہے جو دنیاوی زندگی کی پسندیدہ چاہتوں میں سے انسان کے لئے "خیر" اور بہتر ہیں تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ خود (رضائے الٰہی) انسان کی پسندیدہ چاہتوں میں سے ایک ہے یا کسی ایسی شے کا سبب ہے جو انسان کی پسندیدہ چاہت ہے یعنی اس کا ذریعہ ووسیلہ ہے اور اس کے ذریعے پسندیدہ چاہتوں تک دستیابی کی راہ ہموار ہوتی ہے اسی وجہ سے آیت مبارکہ میں اس کا ذکر باغہائے بہشت اور پاکیزہ ازواج کے مقابل میں ہوا ہے۔ اسی طرح اسے فضل، مغفرت اور رحمت کے مقابل میں بھی ذکر کیا گیا ہے چنانچہ ارشاد ہوا:

سورۂ مائدہ، آیت: ۲

O "فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا"

(ان کے رب کی طرف سے فضل اور رضا)

سورۂ حدید، آیت :۲۹

O " ومغفرة من ربه ورضوانا "

(اور اللہ کی طرف سے مغفرت و بخشش اور رضایت)

سورۂ برائت، آیت :۲۱

O " بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ "

(اس کی رحمت اور رضایت)

مذکورہ بالا مطالب میں تدبر اور اچھی طرح غور وفکر کرنے سے اس ابہام سے بھی پردہ اٹھ جاتا ہے جو زیر بحث آیت مبارکہ میں رضایت کی بابت پیدا ہوا اور وہ اس طرح کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: " رَّضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ " (خدا ان سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے) اور " راضية مرضية " (رضایت کے ساتھ اور رضایت یافتہ ہوکر) ان آیتوں میں اپنی رضایت کو خود ان کے ساتھ قرار دے کر فرمایا " عنهم " یعنی خود ان سے راضی ہوا، جبکہ واضح ہے کہ ان سے راضی ہونے اور ان کے افعال سے راضی ہونے میں فرق ہے، اس بناء پر معنی یہ ہوگا کہ وہ اپنی طرف سے انہیں ان چیزوں کی بابت نہیں دھتکارتا جو وہ اس سے مانگتے ہیں، تو نتیجتاً اس کا معنی وہ ہوگا کہ جو اس آیہ مبارکہ میں ہے " لَهُم مَّا يَشَاءُونَ فِيهَا " ......سورۂ ق، آیت ۳۵......(ان کے لئے ہے جو وہ اس میں چاہیں گے)۔ یعنی وہ بہشت میں جو کچھ چاہیں گے اللہ انہیں عطا کردے گا۔ بنابرایں خدا کی انسان سے رضایت میں انسان کی مطلق مشیت ۔۔اور وسیع چاہت ۔ پائی جاتی ہے۔

مذکورہ بالا بیان سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ اس آیت میں رضائے الٰہی کا ذکر ماقبل آیت مبارکہ میں مذکور شہوات کے مقابل میں ہوا ہے اور یہ اس لئے ہوا تاکہ انسان کو آگاہی دلائی جائے کہ اس نے دنیا کا مال و دولت اور سونے چاندی کے ذخائر جمع کرنے میں اپنی بابت جو گمان کرلیا ہے کہ اس طرح اسے مطلق مشیت اور چاہت کا کھلا اختیار حاصل ہوجائے گا کہ وہ جو چاہے اسے مل جائے گا اور جس چیز کا ارادہ کرے وہ اسے دستیاب ہوگی لیکن وہ غلط فہمی کا شکار ہوا ہے کیونکہ یہ سب کچھ اسے رضائے خداوندی کے ذریعے حاصل ہوسکتا ہے کہ خدا ہی وہ ذات ہے جس کے دست قدرت میں ہر شے کا اختیار و اقتدار ہے۔

بندوں سے کامل آگاہی

○ "وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ"

(اور اللہ بندوں سے بخوبی آگاہ ہے)

چونکہ زیر بحث آیت مبارکہ اور اس سے ماقبل آیت سے یہ مطلب واضح و معلوم ہو چکا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے دو جہانوں (دنیا اور آخرت) میں ایسی نعمتیں مقرر کردی ہیں جن سے وہ لطف اندوز و بہرہ ور رہو اور اس کے علاوہ دیگر منافع ولذت بخش امور بھی اس کے لئے مخصوص کر دیئے ہیں جن سے اس کی طبع وجودی لذت پائے مثلاً ازواج، کھانے پینے کی چیزیں، حکومت واقتدار وغیرہ، اور وہ دونوں جہانوں میں ایک جیسی ہیں صرف اس فرق کے ساتھ کہ وہ سب ایسی ہیں جو دنیا و آخرت میں مومن وکافر دونوں کے لئے مشترک ہیں اور وہ دونوں ان سے استفادہ کرتے ہیں لیکن اخروی نعمتیں صرف مؤمن سے مختص ہیں ان میں کافر کا کوئی حصہ نہیں اور وہ ان نعمتوں سے استفادہ نہیں کرے گا، تو اس حوالہ سے یہ سوال پیدا ہو سکتا تھا کہ آخر ایسا کیوں؟ اور وہ کیا مصلحت ہے جس کی بناء پر خداوند عالم نے دنیاوی نعمتوں کو تو مومن وکافر دونوں کے لئے مشترک قرار دیا ہے جبکہ اخروی نعمتیں مومن سے مخصوص کر دیں؟ تو اس کا جواب خداوند عالم نے اس طرح دیا کہ "اللہ بندوں سے بخوبی آگاہ ہے"۔ اس کا معنی یہ ہے کہ خداوند عالم نے مومن وکافر کے درمیان دنیاوی واخروی نعمتوں کے حوالہ سے جو فرق رکھا ہے وہ عبث و بے مقصد نہیں اور خدا عبث و بے مقصد امور وافعال سے منزہ و بالاتر ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں (مؤمن وکافر) میں ایک بنیادی امر ہے جو اس فرق وامتیاز کا سبب و باعث ہے اور اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں بخوبی آگاہی رکھتا ہے، اور وہ امر "تقویٰ و پرہیزگاری" ہے جو مومن میں پائی جاتی ہے کافر میں نہیں۔ خداوند عالم نے اس امر (تقویٰ) کی وضاحت کرتے ہوئے زیر بحث آیہ مبارکہ کے بعد اور اس سے متصل آیت میں یوں ارشاد فرمایا: "اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ" (انہوں نے کہا: اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے، تو ہمارے گناہوں کو معاف کردے اور ہمیں دوزخ کی آگ سے بچالے)..... یہ مطلب بعد والی دو آیتوں کے آخری جملوں تک مذکور ہے..... اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ اپنی احتیاج اور اپنے پروردگار سے بے نیاز و مستغنی نہ ہونے کا کھلا اظہار کرتے ہیں اور اس مطلب کو اپنے اعمال صالحہ کے ذریعے ثابت بھی کرتے ہیں۔ یعنی اپنے زبانی دعوے کی تصدیق اپنے نیک وصالح عمل سے کرتے ہیں۔ لیکن کافر اپنے پروردگار سے بے نیازی کے احساس وعقیدہ کے ساتھ زندگی گزارتا ہے چنانچہ وہ دنیوی خواہشات وشہوات میں سرمست رہتا ہے اور اپنی آخرت وانجام کار کو بھلا دیتا ہے۔

ایک لطیف نکتہ

یہ دو آیتیں یعنی : " ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ " ، " قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ......" اور ان سے مشابہ دیگر آیات مبارکہ مثلاً : " قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۭ قُلْ هِىَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝۳۲ " ...... سورۂ اعراف، آیت ۳۲ ...... ان سے پوچھئے کہ کس نے اس خدائی نعمت کو حرام کیا ہے جو اس نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کی اور پاکیزہ رزق کو؟ کہہ دو کہ وہ سب کچھ دنیاوی زندگی کا ساز و سامان ہے کہ جو قیامت کے دن اہل ایمان کے لئے خاص ہوگا۔ اسی طرح ہم علم رکھنے والوں کے لئے آیات کی وضاحت کرتے ہیں...... اس اشکال و اعتراض کا جواب دیتی ہیں جو بہشت کی نعمتوں کے تذکرہ و توصیف پر مشتمل آیات مبارکہ کے ظواہر پر متعدد بحث کرنے والے حضرات پیش کرتے ہیں، ذیل میں اس اشکال و اعتراض اور اس کے جواب کی تفصیلات ذکر کی جاتی ہیں :

اشکال و اعتراض:

جو شخص عالم ہستی میں پائی و دیکھی جانے والی موجودات اور گونا گوں اشیاء کے بارے میں بخوبی غور و فکر کرے اور گہری نگاہ سے ان کی کیفیتوں کو دیکھے تو اسے اس حقیقت کی بابت کوئی شک لاحق نہ ہوگا کہ جو افعال و اعمال ان موجودات سے اپنے تحفظ کے لئے انجام پذیر ہوتے ہیں ان کا سرچشمہ وہ قوتیں و وسائل ہیں جن سے ہر مخلوق لیس ہے، اسی طرح یہ حقیقت بھی آشکار ہو جائے گی کہ لحات کا وجود پذیر ہونا نہ تو اتفاقی امر ہے اور نہ ہی عبث و بے فائدہ اور بے مقصد ہے بلکہ اس میں اہم اغراض و اہداف ملحوظ ہیں اور موجودات کی تخلیق عظیم مقاصد کے لئے انجام پائی ہے۔

ان موجودات میں سے ایک، انسان ہے کہ جو اپنے پورے جسم میں عجیب و غریب اور محیر العقول نظم و نظام رکھتا ہے، اس کا بدن گونا گوں آلات کا مجموعہ ہے مثلاً تغذیاتی آلات کہ جن کے ذریعے اس کے غذائی نظام کا سلسلہ وابستہ ہے اور یہ بات کسی وضاحت و دلیل کی محتاج نہیں کہ اس کا غذائی نظام بے مقصد و عبث نہیں بلکہ وہ غذائی مواد کی شکست و ریخت کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی جسمانی حالت و بدنی کیفیت کی درستی و درستگی اور بقاء و سلامتی کو یقینی بناتا ہے۔ گویا وہ اس لئے غذا کھاتا ہے کہ زندہ و باقی اور سلامت رہے، اسی طرح اس کا تناسلی نظام اپنے مربوطہ آلات و قوتوں اور فعال و متحرک اور ایک دوسرے

سے وابستہ و پیوستہ اشیاء کے ذریعے اس کی بقاء نسل وتحفظ نوع انسانی کو یقینی بناتا ہے، نباتات وحیوانات میں بھی انسان ہی کی طرح کا وجودی سلسلہ ونظام پایا جاتا ہے اور وہ بھی اپنے موزوں ومناسب آلات وقوتوں سے لیس وآراستہ ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی قابل التفات ہے کہ کارخانہ تخلیق نے موجودات کی تسخیر اور ان میں سے ذی شعور مخلوق کو اپنے امر وارادہ کے ماتحت رکھنے کے لئے ان کے افعال میں لذت آمیزی کا جو نظام قائم کیا ہے اور جانداروں یعنی حیوانات وانسان کی وجودی قوتوں کی کارآرائی میں لطف اندوزی کا جو سلسلہ جاری کیا ہے کہ جو اسے...... یعنی حیوان وانسان کو...... ان لذائذ سے بہرہ ور ہونے کے عملی اقدام کی راہ پر لاتا ہے جبکہ وہ خود بھی اس امر کی طرف متوجہ نہیں ہوتا کہ سرچشمۂ تخلیق اسے کس منزل کی طرف لے جانا چاہتا ہے، وہ گمان کرتا ہے کہ اس کا جسمانی نظام اس کی لذت اندوزی کے لئے ہے جبکہ اس کے فعل وانفعال کی اصل غرض اس کی وجودی بقا ہوتی ہے اور وہ بے توجہی ولاشعوری طور پر اس غرض کے تکمیلی تقاضوں کو پورا کرنے میں مصروف ہوتا ہے، اگرچہ وہ ان افعال سے لطف اندوز اور محظوظ ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ تخلیق کی غرض وغایت بھی پوری ہوتی چلی جاتی ہے، گویا ان لذائذ سے دو نتیجے حاصل ہوتے ہیں: ایک ان افعال کے انجام دینے والے کا طبعی سرور حاصل کرنا اور دوسرا کارخانہ تخلیق کا اپنی مقصود غرض کو پالینا، انجام دینے والا ان لذتوں کی کشش وجاذبیت کی وجہ سے ان کی طرف مائل ہوتا ہے اور سرچشمۂ تخلیق اس کی وجودی بقاء کا سامان کرتا ہے، بنابرایں یہ کہنا بجا ہے کہ اگر تغذیاتی وتناسلی نظام میں لذت بخش جہتیں نہ ہوتیں تو کوئی شخص ان کی طرف مائل نہ ہوتا اور نہ ہی ان کی طرف توجہ والتفات کرتا اور صرف اس لئے کہ اس کی وجودی بقا اس میں مضمر ہے اس کی انجام دہی کو ہرگز اہمیت نہ دیتا، تو اس طرح اس کی تخلیق کی اصل غرض ختم ہو جاتی اور اس کا وجود میں آنا بے مقصد وبے نتیجہ قرار پاتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے وجود میں غذا ومباشرت کی لذتیں قرار دے دیں کہ وہ ان دو لذتوں سے بہرہ ور ولطف اندوز ہونے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتا بلکہ ہر طرح کی سختی وتکلیف برداشت کرنے اور ہر قسم کی مصیبت ورنج اپنے اوپر لینے پر بھی تیار ہو جاتا ہے تاکہ جس طرح بھی ممکن ہو ان دو لذتوں سے بہرہ ور ہو جائے۔ وہ اس مقصد کے لئے سب کچھ کر گزرنے پر تیار ہو جاتا ہے اور اس حوالہ سے اپنی کسی بھی حیثیت کو خاطر میں نہیں لاتا بلکہ دیوانگی وغرور اور اپنے آپ کو دھوکہ میں ڈالتے ہوئے اپنی عزت نفس کی پرواہ بھی نہیں کرتا اور تصورات کی دنیا میں کھو کر اور ہمہ تن اسی مقصد کے حصول میں سرگرم وسرگرداں رہتا ہے، لیکن اس دوران کارخانہ خلق وایجاد اپنے ہدف کو پا لیتا ہے اور اپنی مقصودہ غرض وغایت کو حاصل کر لیتا ہے کیونکہ اسے اس نظم ونظام اور تدبیر سے فرد ونسل بشر کی بقاء کے علاوہ کچھ بھی مطلوب نہ تھا جو کہ اسے حاصل ہو جاتا ہے چنانچہ تغذیاتی نظام سے فرد کی بقاء اور مباشرت وجنسی عمل وتناسلی نظام سے نسل کی بقاء یقینی ہو جاتی ہے، یہ تو ہے نظام خلقت کی غرض ومقصد اور مطلوبہ ہدف کے حصول کا حوالہ! لیکن انسان کو اس سب کچھ میں کیا ملتا ہے؟ تو یہ واضح ہے کہ اسے اپنے ارادوں میں اپنے خیال وتصور کی تکمیل کے سوا کچھ بھی نہیں ملتا (یعنی وہ غذا وجنسی عمل سے

لاشعوری طور پر کارخانہ خلقت کے اصلی مقصد کو پورا کر رہا ہوتا ہے لیکن خود اس کے لئے اس کے تصوراتی اہداف کے علاوہ کچھ باقی نہیں رہتا)۔

مذکورہ بالا مطالب سے واضح ہوا کہ دنیاوی لذتیں ایک محدود غرض اور عارضی مقصد کے لئے مقرر کی گئی ہیں، تو اس صورت میں اس جہان میں یہ لذتیں بے معنی ہیں جہاں وہ غرض و مقصد ملحوظ ہی نہیں۔ یعنی جب دنیاوی لذتیں فرد و نسل کی بقاء کے لئے قرار دی گئی ہیں تو اخروی زندگی میں ان کا حصول و دستیابی بے معنی ہوگی کیونکہ اس زندگی کی بقاء غذا و جنسی عمل کی محتاج نہیں، کیونکہ کھانے پینے اور تمام غذائی لذتوں میں بدن کی سلامتی اور اسے وجودی اعضاء و جوارح کی تکوینی ترتیب و ترکیب میں ہر طرح کی خرابی و فنا یعنی موت سے بچانے کا ہدف ملحوظ ہے، اور جنسی عمل اور اس سے تعلق رکھنے والی متعدد و بیشمار لذتیں نوع و نسل کو فنا و نابودی اور کلی طور پر محو و ختم ہونے سے بچانے کے لئے ہیں، لہٰذا اگر انسان کے لئے ایسے وجود و ہستی کا تصور کریں جس میں نہ موت ہے اور نہ ہی فنا و نابودی بلکہ ایسی زندگی ہے جو ہر طرح کے شر اور نا گوار و ناپسند امر سے محفوظ ہے تو پھر وہاں ان بدنی قوتوں کے پائے جانے کا کیا فائدہ کہ جن کی عملداری کی غرض فردی و نوعی بقاء کے سوا کچھ نہیں؟ اور پھر بدن کو اس قدر وسیع اعضاء و جوارح اور آلات و وسائل مثلاً قوت ہاضمہ، تنفس، پھیپھڑے، جگر، تلی اور ان جیسی چیزوں سے لیس کرنے سے کیا حاصل؟ جبکہ یہ سب کچھ عارضی و محدود بقاء کو یقینی بنانے کے لئے پیدا کیا گیا ہے نہ کہ ابدی و ہمیشہ باقی رہنے والی بقاء کے لئے !

......تو جب ان تمام اعضاء و اشیاء کی تخلیق و ایجاد ہی فانی زندگی کے لئے ہے تو پھر اتنے وسیع نظام و اہتمام کی کیا ضرورت ہے؟......،

جواب:

خداوند عالم نے دنیاوی لذتوں اور ان سے تعلق رکھنے والی نعمتوں کو زمین میں زینت قرار دیا اور ان سب کو اس لئے پیدا کیا تا کہ انسان ان سے دل لگائے اور زندگی سے لطف اندوز ہو کر ان نعمتوں سے پیوستہ و وابستہ ہو، چنانچہ ارشاد الٰہی ہوا:

سورۂ کہف، آیت: ۷

○ "اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا"

(ہم ہی نے روئے زمین پر موجود جو کچھ ہے اسے اس کے لئے زینت قرار دیا ہے)

سورۂ کہف، آیت: ۴۶

O " اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا "

(مال اور اولاد دنیاوی زندگی کی زینت ہے)

سورۂ نسآء، آیت: ۹۴

O " تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا "

(تم دنیاوی زندگی کا ساز و سامان چاہتے ہو)

اس کے علاوہ ایک آیت ایسی ہے جس میں جامع صورت میں دنیاوی زندگی کی نعمتوں کے بارے میں ارشاد ہوا: (ملاحظہ ہو)

سورۂ طٰہٰ، آیت ۱۳۱ :

O " وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ۭ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴿۱۳۱﴾ "

(اپنی دو آنکھوں کو اس متاع ناچیز کی طرف نہ بڑھاؤ جو ہم نے بعض لوگوں کو دی ہے کہ جو دنیاوی زندگی کی ظاہری چمک دمک ہے، ہم نے انہیں یہ اس لئے دی تا کہ اس میں انہیں آزمائیں، جبکہ تیرے پروردگار کی روزی (رزق آخرت) بہتر اور باقی رہنے والا ہے)

سورۂ قصص، آیت: ۶۰

O " وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ "

(جو کچھ تمہیں عطا کیا گیا ہے وہ دنیاوی زندگی کا ساز و سامان اور اس کی زینت ہے، اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ بہتر اور باقی رہنے والا ہے، کیا تم سمجھتے نہیں ہو؟)

یہ اور ان کے علاوہ دیگر آیات میں بھی اس مطلب کو بیان کیا گیا ہے کہ دنیا میں پائی جانے والی نعمتیں اور ان سے تعلق رکھنے والی لذتیں سبھی اس دنیاوی زندگی کے لئے مقرر کی گئی ہیں اور یہ اسی محدود اور چند روزہ زندگی کا ساز و سامان ہے کہ جس سے نہایت قلیل دنوں میں استفادہ کیا جاتا ہے، اگر یہ زندگی نہ ہوتی تو یہ نعمتیں نہ تو پیدا کی جاتیں اور نہ ہی ان کی کوئی قدر و قیمت ہوتی، بلکہ کوئی ان پر توجہ ہی نہ دیتا۔

یہ وہ حقائق ہیں جن سے انکار نہیں ہو سکتا، لیکن اس کے باوجود یہ جاننا ضروری ہے کہ یہی وجود ہے جو انسان کے

لئے باقی رہنے والا ہے اس کے سوا کچھ بھی نہیں، یعنی یہی وجود کہ جو اس دنیا میں چند روز ٹھہرا اور ایک حالت سے دوسری حالت میں بدلتا رہا، اور یہ وہی روح ہے جس کی۔۔حاکمیت کی۔۔اصل و اساس بدن ہے اور بدن ہی پر اس کی حاکمیت ہوتی ہے جو کہ زمینی عناصر سے لئے گئے اجزاء کا مجموعہ و مرکب اور اس میں پائی جانی والی فعال و متحرک قوتیں ہیں کہ اگر ان امور کا باقی نہ رہنا فرض کر لیا جائے جو کہ انسان کی بقا کے بنیادی ارکان ہیں تو نہ وجود باقی رہے گا اور نہ ہی بقاء حاصل ہوگی یعنی ان کا نہ ہونا درحقیقت انسان ہی کا نہ ہونا قرار پائے گا نہ یہ کہ اس کے وجود کو استمرار و تسلسل حاصل نہ ہوگا بلکہ اصل ہی باقی نہ ہوگا، (اس مطلب پر اچھی طرح غور کریں)

بنا بریں انسان درحقیقت وہی ہے جو افراد کی صورت میں وجود پذیر ہوتا ہے......ایک فرد سے دوسرا فرد بنتا ہے......، کھاتا ہے، پیتا ہے، مناکحت و مباشرت کرتا ہے، ہر چیز میں تصرف کرتا ہے، لیتا ہے اور دیتا ہے، قوت حس و خیال کو کام میں لاتا ہے، سوچتا سمجھتا ہے، فرح و سرور اور مسرت و خوشی پاتا ہے، اور اس طرح کے دیگر امور! یہ سب کچھ اس کی ذات سے موزونیت و ہمرنگی کا حامل ہے اور اس کی ذات انہی امور کے مجموعہ کی ایک صورت ہے کہ جن میں سے بعض امور دوسرے بعض کے لئے مقدمہ قرار پاتے ہیں یعنی ان کا وجود دوسرے بعض کے وجود سے مقدماتی وابستگی رکھتا ہے اور وہ ایک دوسرے پر موقوف ہوتے ہیں، گویا ایک دائرے کی طرح ہے جو ایک دوسرے کے سہارے گھومتا ہے کہ ایک جزء دوسرے جزء سے جڑا ہوا ہوتا ہے۔

پس جب خداوند عالم اسے اس فانی دنیا سے ہمیشہ باقی رہنے والے جہان میں منتقل کر دیتا ہے اور اس کے لئے خلود و دوام اور ہمیشہ رہنا مقرر کر دیتا ہے خواہ ہمیشہ کا ثواب ہو یا ہمیشہ کا عذاب ہو تو اس سے اس کے حالیہ وجود کا ابطال اور ہمیشہ باقی رہنے والے وجود کی صورت گری نہیں ہوتی......یعنی ایسا نہیں کہ اس کا یہ وجود سرے ہی سے ختم ہو جاتا ہے اور ایک نیا دائمی وجود اسے عطا کیا جاتا ہے...... بلکہ اس کے اسی وجود کو ثبات عطا کیا جاتا ہے اور وہ جو کچھ اب ہے وہی رہے گا لیکن اس فرق کے ساتھ کہ پہلے زوال و تغیر سے دوچار ہوتا تھا مگر اب ایسا نہیں اور اس میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوگی، تو لامحالہ یا دنیاوی نعمتوں جیسی نعمتوں سے متنعم و بہرہ ور ہوگا جو کہ ہمیشہ باقی رہنے والی ہوں گی یا دنیاوی نعمتوں و سختیوں اور تکلیفوں و مصیبتوں سے دوچار و مبتلا ہوگا جو کہ ہمیشہ اس پر چھائی رہیں گی۔ وہ خواہ مباشرت و مناکحت سے تعلق رکھنے والی چیزیں ہوں یا کھائی اور پی جانے والی اشیاء ہوں، لباس و مسکن ہو یا دوست و ساتھی اور خوشی و مسرت ہو، یا اس طرح کے امور و اشیاء، تو یہ سب کچھ اخروی زندگی میں پایا جائے گا البتہ زوال و دوام کے فرق کے ساتھ! نتیجتاً اخروی انسان وہی انسان ہے جو اس دنیا میں ہے اور اس کی اخروی ضرورتیں وہی ہیں جو اس دنیا میں ہیں اور جو کچھ اس دنیا میں اس کے لئے وسیلہ کمال ہے آخرت میں بھی وہی سبب کمال ہوگا، دنیاوی زندگی میں جو امور و اشیاء اس کا مطلوب و مقصود تھے اخروی زندگی میں بھی وہی اس کا مطلوب و مقصود ہوں گے البتہ

دونوں جہانوں کا فرق اور مابہ الامتیاز زوال ودوام اور فنا و بقاء ہے...... دنیا زوال پذیر وفنا آشنا ہے جبکہ آخرت دوام شعار و بقا صفت ہے، دنیا ختم ہو جانے والی ہے اور آخرت ہمیشہ باقی رہنے والی ہے، دنیا دار الفناء اور آخرت دار لبقاء ہے......، چنانچہ اسی حقیقت کا اظہار خداوند عالم کے مقدس کلام سے ہوتا ہے کہ جس میں انسان کی وجودی ساخت اور تکوین و تخلیق کے مراحل و مراتب کو بیان کیا گیا ہے، ملاحظہ ہو:

سورۂ مؤمنون، آیت: ۱۶

" وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ﴿۱۲﴾ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ﴿۱۳﴾ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴿۱۴﴾ ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ﴿۱۵﴾ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ﴿۱۶﴾ "

(اور ہم نے انسان کو گندھی ہوئی مٹی کے جوہر سے پیدا کیا، پھر ہم نے اسے ایک ٹھکانے میں نطفہ بنا دیا، پھر ہم نے نطفہ کو جما ہوا خون بنایا، پھر ہم نے جمے ہوئے خون کو گوشت کا لوتھڑا بنایا، پھر ہم نے لوتھڑے کو ہڈیاں بنا دیا، پھر ہم نے ہڈیوں کو گوشت کا لباس پہنایا، پھر ہم ہی نے اسے ایک دوسری صورت میں خلق کر دیا، پس خدا برکت والا، بہترین خلق کرنے والا ہے، پھر اس کے بعد تم سب کو مرنا ہے، پھر تم قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے)۔

اس آیہ مبارکہ میں تین جملے غور طلب ہیں:

" لَقَدْ خَلَقْنَا " (ہم نے پیدا کیا)

" ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ " (پھر ہم نے اسے بنایا)

" ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ...... " (پھر تم قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے)

پہلے جملہ " لَقَدْ خَلَقْنَا " میں لفظ "خلق" پر غور کریں، اس سے مراد یکجا کرنا اور اجزاء کو ترکیب دینا ہے۔

دوسرے جملہ " ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ " میں " اَنْشَاْ " پر توجہ کریں اس سے خلق و ایجاد میں تبدیلی کا ثبوت ملتا ہے۔

تیسرے جملہ " ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ " میں " اِنَّكُمْ " پر غور کریں، اس کا مخاطب وہی ہے جسے نیا وجود عطا کیا گیا جو اس آیت میں " خَلْقًا اٰخَرَ " کا مصداق ہے۔

اسی سلسلہ میں ایک اور مقام پر ارشاد ہوا:

سورۂ اعراف، آیت: ۲۵

○ " قَالَ فِيهَا تَحْيَوْنَ وَفِيهَا تَمُوتُونَ وَمِنْهَا تُخْرَجُونَ "

(اس نے کہا کہ تم اسی میں (زمین میں) زندہ رہو گے اور اسی میں مرو گے اور اسی سے باہر نکلو گے)

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کی زندگی، زمینی زندگی ہے کہ جو زمینی نعمتوں و قسموں سے ترکیب یافتہ ہے، اس موضوع کی بابت سورۂ بقرہ کی آیت ۲۱۳ "كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً ......" کی تفسیر میں بعض مطالب بیان کئے جا چکے ہیں۔ زمینی نعمتوں کے بارے میں خداوند عالم نے یوں ارشاد فرمایا:

○ "ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا"

(یہ دنیاوی زندگی کا ساز و سامان ہے)

اور پھر ارشاد فرمایا:

سورۂ رعد، آیت: ۳۶

○ " وما الحيواة الدنيا فى الآخرة الامتاع "

(دنیاوی زندگی، آخرت میں ایک متاع و ساز و سامان کے سوا کچھ نہیں)

ان دو آیتوں میں دنیاوی زندگی ہی کو آخرت کی متاع اور ساز و سامان قرار دیا گیا ہے کہ جس سے انسان بہرہ مند و لطف اندوز ہوگا، اور اس موضوع کی بابت یہ نہایت بدیع و عمدہ ترین بیان ہے اور ایک ایسا دروازہ ہے جس سے ہزاروں دروازے کھلتے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ ایک حدیث نبویؐ کی تصدیق کا واضح اشارہ بھی اس میں پایا جاتا ہے کہ جس میں آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا: " كما تعيشون تموتون، وكما تموتون تبعثون " (تم جس طرح زندگی گزارتے ہو اسی طرح مرو گے اور جس طرح مرو گے اسی طرح اٹھائے جاؤ گے)۔

خلاصۂ کلام یہ کہ دنیاوی زندگی انسان کے اسی وجود کا نام ہے جو اس دنیا میں اپنے اچھے یا برے اعمال کے نتیجہ میں پاتا ہے اور وہ خود اس سے آخرت میں بہرہ ور ہوگا، اگر اس نے نیکیاں کمائی ہوں گی تو سعادتمندی سے لطف اندوز ہوگا اور اگر برائیوں کا ارتکاب کیا ہوگا تو اس کا مزا چکھے گا، یعنی وہ اپنے کئے کے عین مطابق جزا و سزا پائے گا کہ اس کی فوز و فلاح اور ناکامی و خسران کا ترازو اس کی اختیار کردہ راہ و روش ہے، لہٰذا وہ اپنے اچھے اعمال کے نتیجہ میں سعادت و خوش بختی سے بہرہ ور ہو کر اخروی نعمتوں کی لذتوں سے مالا مال ہوگا یا ان سے محرومی اس کا مقدر بن جائے گا، انہیں دو کو بہشت کی نعمتوں اور دوزخ کے عذاب سے موسوم کیا گیا ہے۔

اس سے واضح تر الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ انسان طبیعتاً سعادت و شقاوت کا حامل ہے کہ جو اس کی فردی و نوعی

بقاء سے وابستہ ومرتبط ہے، اور یہ سعادت وشقاوت اس کے طبعی افعال یعنی کھانا، پینا اور مناکحت ومباشرت وغیرہ پر موقوف اور ان سے جڑی ہوئی ہیں اور اس کی طبع وجودی کو ایسی لذتوں سے مزین وآراستہ کر دیا گیا ہے جو مقدمہ وتمہید کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ تو ہے اس کی طبعی صورتحال، پھر جب وہ طلب کمال کی راہ پر گامزن ہوتا ہے اور اپنے شعور وارادہ کے ساتھ سرگرم عمل ہو جاتا ہے تو اپنا نوعی تشخص پا لیتا ہے اور اس کا کمال اس کے شعور وارادہ ہی کا اختیار وانتخاب کردہ ہوتا ہے یعنی وہ جس کمال کو اپنے ارادہ واختیار سے چن لیتا ہے وہی اس کی پہچان کرواتا ہے لہٰذا وہ کمال کہ جس کا اس کے شعور وارادہ سے تعلق اور وابستگی نہیں ہوتی اگرچہ وہ اس کا وجودی، طبعی، فطری وتکوینی کمال تو ہوتا ہے مگر اس کا مخصوص فردی، شخصی اور کسبی کمال نہیں کہلاتا کیونکہ وہ ایک شعور وارادہ کا حامل فرد ہوتا ہے جس کا اکتسابی کمال ہی حقیقی معنی میں اس کی پہچان وتشخص کی علامت ہوتا ہے، یہی صورتحال اس کے مقابل کی ہے یعنی جو نقص طبعی وفطری طور پر اس میں موجود ہو اسے اس کے لئے حقیقی نقص قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ حقیقی نقص اس کے شعور وارادہ کے نادرست اختیار وانتخاب سے پیدا ہوتا ہے چنانچہ اس کی مثال اس طرح دی جا سکتی ہے کہ جن چیزوں کا تعلق ہماری چاہت سے نہیں ہوتا یعنی وہ ہماری چاہت پر موقوف ومنحصر نہیں ہوتیں ہم ان سے لطف اندوز نہیں ہوتے خواہ وہ طبعی سعادت سے عبارت کیوں نہ ہوں مثلاً بدن کی صحت وتندرستی، مال واولاد وغیرہ، جبکہ ہم ان چیزوں سے لذت اٹھاتے ہیں جن سے ہمارا شعور وچاہت وابستہ ہوتی ہے خواہ وہ صرف تصور کی حد تک محدود ہی کیوں نہ ہوں اور انہیں مصداقی وجود حاصل نہ ہو مثلاً ایک بیمار شخص صحت وتندرستی کا تصور کر کے اس سے لطف اندوز ہوتا ہے جبکہ وہ اسے ابھی حاصل نہیں ہوتی، تو یہ مقدماتی لذتیں ہی ہیں جو انسان کے لئے حقیقی کمال بنتی ہیں اگرچہ وہ طبعی حوالہ سے حقیقی کی بجائے مقدماتی کمالات ہوتی ہیں، بنابرایں اگر خداوند عالم اس انسان کو ہمیشہ کی بقاء عطا کرے تو اس کی سعادت وخوش بختی انہی لذتوں سے عبارت ہوگی جن کو اس نے چاہا ..... اور اپنے شعور وارادہ سے ان کا عملی انتخاب کیا...... اور اس کی شقاوت وبدبختی انہی چیزوں سے عبارت ہوگی جن کو اس نے نہیں چاہا اور عملی طور پر ان کی بابت شعوری اقدام نہیں کیا..... خواہ طبعی حوالہ سے وہ مقدماتی لذت ہو یا نہ ہو، کیونکہ یہ ایک واضح وبدیہی امر ہے کہ کسی شخص یا شعور وارادہ رکھنے والی قوت کی خیر وبہتری صرف اسی چیز میں ہوتی ہے جسے وہ جانتا ہے اور چاہتا ہو یعنی جسے جانے اور چاہے، جبکہ اس کے برعکس اس کے لئے "شر" اور برائی اس چیز میں ہوتی ہے جسے وہ جانے اور نہ چاہے۔ یعنی جاننے کا باوجود اس کا ارادہ نہ کرے۔

مذکورہ بالا مطالب سے یہ نتیجہ حاصل ہوا کہ انسان کی سعادت یہ ہے کہ آخرت میں زندگی کی اسے وہ تمام لذتیں مل جائیں جن سے بہرہ ور ہونا دنیا میں اس کا مقصود ومطلوب تھا خواہ ان کا تعلق کھانے، پینے اور مناکحت ومباشرت سے ہو یا ان سے بالاتر لذتیں ہوں، کہ وہ سب کچھ بہشت ہی کا دوسرا نام ہے، اور اس کی شقاوت ان لذتوں تک عدم رسائی اور ان کے حصول میں ناکامی ہے کہ اس کا نام دوزخ ہے چنانچہ اسی مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد الٰہی ہے:

○ " لَهُمْ فِيهَا مَا يَشَاءُونَ "

(ان کے لئے اس میں وہی ہے جو وہ چاہتے ہیں ..... سورۂ نحل، آیت ۳۱ ......،

متقین کی دعا

○ " اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ "

(وہ کہتے ہیں اے ہمارے پالنے والے! ہم ایمان لائے، تو ہمارے گناہ معاف فرما اور ہمیں جہنم کی آگ سے بچالے)

اس آیت مبارکہ میں ان " متقین " کی توصیف ہوئی ہے کہ سابقہ آیت میں جن کا تذکرہ ان الفاظ میں ہوا: "للذین اتقوا" یہاں انہی کی توصیف میں ان کے اپنے الفاظ ذکر کئے گئے کہ وہ کہتے ہیں: "رَبَّنَآ" (اے ہمارے پروردگار) اس میں خدا کی ربوبیت کے ذکر کے ذریعے اپنی عبدیت وعبودیت کا اظہار کیا گیا ہے، اور اس سے طلب رحم و درخواست رحمت کرتے ہوئے اپنی دعا کی قبولیت کا عاجزانہ سوال ان لفظوں میں کیا گیا ہے: " اِنَّنَآ اٰمَنَّا" (ہم ہی تو ایمان لائے ہیں)، اس جملے میں ان کا مقصد خداوند عالم کو احسان جتلانا نہیں کیونکہ احسان تو خدا کی طرف سے ہے کہ اس نے انہیں ایمان کی توفیق وعزت عطا کی ہے جیسا کہ اس کا ارشاد ہے:

سورۂ حجرات، آیت: ۱۷

○ " بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ "

(بلکہ اللہ کا تم پر احسان ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی ہدایت ..... اور توفیق ..... سے نوازا ہے)

بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس جملے میں ان کا مقصد و مقصود اس وعدۂ الٰہی کی تکمیل کی استدعا ہے جو خداوند عالم نے اپنے بندوں سے کیا ہے کہ جو شخص اس پر ایمان لائے خدا اس کے گناہوں وخطاؤں کو معاف کر دے گا، چنانچہ ارشاد ہوا:

سورۂ احقاف، آیت ۳۱:

○ " وَاٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ "

(اور تم اس پر ایمان لاؤ وہ تمہاری مغفرت کرے گا) ..... (اس پر ایمان لاؤ تا کہ وہ تمہاری مغفرت کرے .....،

یہی وجہ ہے کہ انہوں نے "رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا " (اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے ہیں) کے فوراً بعد یوں کہا:

"فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا" (پس تو ہمارے گناہ معاف کردے) اس جملے پر حرف "ف" (فاغفر) لگا کر اسے ماقبل سے جوڑ دیا گیا ہے (اسے فاء تفریع کہتے ہیں اور یہ ماقبل کی فرع کے اظہار کے لئے ہوتا ہے، یعنی جس جملہ پر یہ حرف لگایا جائے اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کا تعلق ماقبل جملے سے ویسا ہے جیسے فرع کا اصل سے ہوتا ہے، م)، اور ان کے بیان ......یا دعا...... میں حرف "ان" (اننا) درحقیقت اپنے ایمان میں سچائی و ثابت قدمی کے اظہار و ثبوت اور تاکید کے لئے ہے،

ایک سوال اور اس کا جواب

اس مقام پر ممکن ہے یہ سوال پیدا ہو کہ متقین نے اپنی دعا میں "فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا" (تو ہمارے گناہوں کو معاف کردے) کے بعد "وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ" (اور ہمیں دوزخ کی آگ سے بچا) کیوں کہا؟ گناہوں کی بخشش کے بعد دوزخ کی آگ کا مورد ہی باقی نہیں رہتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ گناہوں کی بخشش عذاب سے چھٹکارے کا لازمی سبب نہیں، اور وہ یوں کہ دوزخ کی آگ سے بچاؤ خدا کی طرف سے اپنے مومنین و عبادت گزار بندے پر خاص عنایت سے عبارت ہے، ایسا نہیں کہ بندے کا خدا پر حق بن جاتا ہے کہ وہ اسے ایمان و عبادت کے بدلے میں دوزخ کی آگ سے بچائے یا بہشت کی نعمتوں سے نوازنے پر مجبور ہو کیونکہ ایمان و اطاعت بھی خدا کی عطا کردہ نعمتوں میں سے ہیں کہ خدا اپنے بندے کو ان سے نوازتا ہے اور کوئی بندہ خود سے کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا بلکہ یہ خدا ہی ہے جو کوئی حق اپنے اوپر لے لیتا ہے، یعنی کسی بندے کا خدا پر کوئی حق نہیں بنتا سوائے اس حق کے کہ جو خدا خود اپنے اوپر قرار دیتا ہے، اور اسی طرح کے حقوق میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اپنے مومن و عبادت گزار بندے کے گناہوں کو معاف کرے اور اسے دوزخ کی آگ سے بچائے، اسی مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

سورۂ احقاف، آیت: ۳۱

O "وَاٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ"

(اور اس پر ایمان لاؤ تاکہ وہ تمہارے گناہوں کو معاف کرے اور تمہیں دوزخ کے عذاب سے بچالے)

بعض آیات مبارکہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دوزخ کی آگ سے بچانے کا مطلب مغفرت اور بہشت عطا کرنا ہی ہے، جیسا کہ ارشاد ہوا:

سورۂ صف، آیت: ۱۲

○ " هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِیْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَ تُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ یَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَیُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَیِّبَةً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ "

(کیا میں تمہیں ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں دردناک عذاب سے نجات دلائے، تم خدا اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو اپنے اموال اور اپنی جانوں کے ساتھ، کہ یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جان لو، وہ تمہارے گناہوں کو معاف کرے گا اور تمہیں باغہائے بہشت میں داخل کرے گا کہ جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں اور عدن کے باغات میں پاکیزہ محلات دے گا۔)

تو آخری دو آیتوں میں پہلی آیت کے جملہ "هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِیْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ" (کیا میں تمہیں ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں دردناک عذاب سے نجات دلائے) میں بیان کردہ اجمالی مطالب کی تفصیل ذکر کی ہے، بہرحال یہ ایک نہایت دقیق و عمیق مطلب ہے کہ انشاء اللہ اگر توفیق حاصل ہوئی تو بہت جلد کسی مناسب و موزوں مقام پر اس کی وضاحت کریں گے۔

متقین کی پانچ صفات

○ " اَلصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰدِقِیْنَ......"

(وہ صبر کرنے والے ہیں اور سچ بولنے والے ہیں......)

اس آیت مبارکہ میں خداوند عالم نے متقین کی پانچ مخصوص و امتیازی صفات ذکر کی ہیں کہ کوئی متقی ان کے بغیر تقویٰ کی پاکیزہ و عظیم صفت سے متصف نہیں ہوسکتا، وہ پانچ اوصاف یہ ہیں:

(۱) صبر، " اَلصّٰبِرِیْنَ "

(۲) صداقت، " الصّٰدِقِیْنَ "

(۳) خضوع، " الْقٰنِتِیْنَ "

(۴) انفاق، " الْمُنْفِقِیْنَ "

(۵) استغفار ، " اَلْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَ سْحَارِ "

پہلی صفت :

سب سے پہلے صبر کو ذکر کیا گیا جو کہ ہر صفت سے مقدم ہے، یہاں صبر کو مطلق اور ہر طرح کی قید و اضافت سے خالی ذکر کیا گیا ہے لہٰذا صبر کی تینوں اقسام اس میں شامل ہیں :

(۱) اطاعت پر صبر

(۲) معصیت پر صبر

(۳) مصیبت پر صبر

دوسری صفت :

صبر کے بعد متقین کی دوسری صفت صدق و صداقت ذکر ہوئی ہے کہ جس کی حقیقت کی بابت تجزیہ و تحلیل اور باریک بینی سے یہ معنی بنتا ہے : انسان کے قول و فعل سے اس کے ظاہر کی باطن سے مطابقت ! لیکن یہ معنی آیت میں مذکور دیگر تمام فضیلتوں مثلاً صبر و خضوع وغیرہ کا جامع ہے کہ اس کے بعد کسی دوسری فضیلت کے ذکر کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی لہٰذا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس سے مراد یہ جامع معنی نہیں بلکہ اس مقام پر صدق سے مراد (واللہ اعلم) صرف گفتار میں صداقت ہے یعنی سچ بولنا۔

تیسری صفت :

خضوع : قنوت یعنی خضوع اللہ تعالیٰ، اس سے مراد خدا کے حضور عاجزی اور تقاضائے بندگی کی تکمیل ہے، اس میں عبادات و اطاعتی اعمال کی تمام اقسام شامل ہیں۔

چوتھی صفت :

انفاق : اس سے مراد مستحق کی مالی مدد کرنا ہے۔

پانچویں صفت :

استغفار : الاستغفار بالاسحار سے مراد سحر خیزی اور رات کے پچھلے پہر خدا کی عبادت کے لئے کھڑا ہونا اور اس میں اس سے طلب مغفرت کرنا ہے۔ روایات میں استغفار بالاسحار سے نماز تہجد اور اس میں وتر کے قنوت میں استغفار کرنا مراد لیا گیا ہے اسی کو خداوند عالم نے " انسان کا خدا تک پہنچنے کا راستہ " قرار دیا ہے چنانچہ ارشاد ہوا :

سورۂ مزمل، آیت: ۱۹

○ "اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا"

(یہ ایک نصیحت ہے، جو شخص چاہے وہ اپنے رب کی طرف راستہ بنالے)

یہی الفاظ سورۂ دہر کی آیت ۲۹ میں بھی ذکر ہوئے ہیں۔

توحید کی گواہی

○ "شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ؕ"

(گواہی دی ہے اللہ نے کہ نہیں کوئی معبود سوائے اس کے، اور فرشتوں نے اور عدل پر قائم صاحبانِ علم نے گواہی دی)

"شہادت" کا اصل معنی آنکھ سے دیکھنا ہے، یعنی کسی چیز کو آمنے سامنے دیکھنے اور حواس سے اس کو جاننے کے معنی کے لئے لفظ "شہادت" وضع کیا گیا ہے لیکن پھر اسے ادائے شہادت یعنی گواہی دینے کے معنی میں استعمال کیا جانے لگا اور اس سے شاہد و گواہ کا اپنی معلوم و چشم دید چیز یا واقعہ کا اظہار مراد لیا گیا، پھر رفتہ رفتہ یہ لفظ گواہی اور گواہی دینے...... گواہ بننے اور گواہی دینے...... دونوں میں مشترک ہو گیا کہ دونوں کی غرض ایک ہے کیونکہ کسی چیز یا واقعہ کی گواہی کا حقیقی مقصد یہ ہوتا ہے کہ کوئی حق و واقع الامر افراد کے باہمی نزاع، غلبہ، نسیان یا مخفی رہنے کی وجہ سے ضائع نہ ہو بلکہ جیسا ہے ویسا ہی محفوظ رہے، تو گویا شہادت حق و حقیقت کے تحفظ اور اسے ضائع ہونے سے بچانے کا دوسرا نام ہے۔ اس حوالہ سے گواہی کو قبول کرنا اور اسے ادا کرنا دونوں کے لئے لفظ "شہادت" کا استعمال درست ہے یعنی حق کی حفاظت اور اسے قائم رکھنا ہی "شہادت" ہے۔ (علمی زبان میں اسے تحمل شہادت و ادائے شہادت کہا جاتا ہے)

"قسط" سے مراد عدل ہے۔

...... بنا برایں اس صفت کا مطلب یہ ہے کہ متقین حق و حقیقت کو محفوظ رکھتے ہیں اور عدل و انصاف قائم کرنے کے لئے حق کی گواہی دیتے ہیں......

چونکہ سابقہ آیات یعنی: "اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا...... تا "الْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ"، اس مطلب کو بیان کرتی تھیں کہ خداوند عالم کے سوا کوئی معبود نہیں اور کوئی

چیز اس سے بے نیاز نہیں کر سکتی اور یہ کہ انسان جس چیز کو خدا سے بے نیاز کر دینے والی سمجھتا ہے اور اسی وجہ سے زندگی میں اس کا سہارا لیتا ہے وہ زیب و زینت اور ایسا ساز و سامان ہے جسے اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے پیدا کیا ہے تا کہ وہ اس سے استفادہ کر کے اور زندگی میں اس سے لطف اندوز ہو کر اپنے لئے خیر و بہتری کو یقینی بنا سکے، اور وہ تقوائے الٰہی کے بغیر اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا اور تقویٰ ہی ہے جو اس کی مطلوبہ خیر و بہتری کا واحد ذریعہ ہے۔

دوسرے لفظوں میں یہ کہ جو نعمتیں انسان کو مرغوب و مطلوب ہیں وہ دنیا میں کافر و مومن دونوں کے لئے ہیں اور دونوں ان سے استفادہ کرنے میں برابر کے شریک ہیں لیکن آخرت میں یہ سب مومن کے لئے مخصوص و مختص قرار دی گئی ہیں، تو اس آیت مبارکہ میں یہ گواہی دی گئی ہے کہ جو کچھ ان آیات میں ذکر کیا گیا ہے وہ حق ہے اس میں کسی طرح سے شک کی گنجائش نہیں،

اور خداوند عالم نے خود ہی اس امر کی گواہی دی ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، تو چونکہ اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں لہٰذا کوئی چیز ایسی نہیں جو اس سے بے نیاز کر سکے، نہ مال، نہ اولاد اور نہ ہی ان کے علاوہ زندگی کی زیب و زینت یا کوئی سبب اس سے بے نیاز نہیں کر سکتا کیونکہ اگر اس دنیا میں کوئی چیز ایسی ہوتی جو خدا سے بے نیاز کرے تو وہ خدا کے علاوہ کوئی معبود ہوتا یا کسی معبود کا سہارا لینے والا ہوتا کہ جس کی طرف اس کی بازگشت ہوتی جبکہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں،

خداوند عالم نے توحید اور اپنی یکتائی کی گواہی قسط و عدل پر قائم ہو کر دی کہ وہ ایسا ہی ہے، وہ اپنے ہر کام میں قائم بالقسط ہے اور اپنی مخلوق میں حاکم بالعدل ہے کیونکہ اس نے کائنات میں نظام الاسباب جاری و نافذ کیا ہے اور اسباب و مسببات کے درمیان ربط و تعلق اور باہمی وابستگی و پیوستگی قائم کر کے موجودات جہانِ ہستی کے امور کی تدبیر کا مضبوط سلسلہ استوار فرمایا اور سب کو ایسی راہ پر لگایا ہے کہ ہر فرد اپنی وجودی قوتوں کو کام میں لا کر کوشش و عمل پیہم کے ساتھ اور سختیوں کو جھیلتا ہوا کمالات کی منزل بہ منزل رسائی کو یقینی بناتے ہوئے بالآخر اس کی طرف لوٹ آئے، اور اس مقصد کی راہ میں اس نے ایسی نعمتیں قرار دیں کہ جن سے انسان اس دنیا میں استفادہ کر کے انہیں اپنی آخرت کے لئے ذخیرہ کرے اور اس راہ پر چل کر اپنے مقصد اور منزل مقصود تک پہنچ جائے نہ یہ کہ انہی کو اپنی منزل قرار دے اور انہی پر تکیہ لگا کر اپنے سفر کی راہیں و مرحلے طے کرنے سے رک جائے، اس مطلب کی گواہی خود خدا نے دی اور وہی عادل گواہ ہے، اس کی گواہی عدل پر مبنی اور سراپا عدل ہے۔

ایک لطیف نکتہ

یہاں ایک نہایت لطیف نکتہ قابل توجہ ہے کہ خدا کا عدل ہی اس کے عدل اور اس کی الوہیت میں یکتائی کی گواہی دیتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا عدل بنفسہٖ و بذاتہٖ ثابت ہے اور وہ اس کی وحدانیت و یکتائی کو ثابت کرتا ہے۔ اس کی مزید

وضاحت یوں ہے کہ : ہم گواہ میں عدل کو شرط و معیار قرار دیتے ہیں تا کہ وہ زندگی میں درست راہ و روش اپنائے اور اپنے سیر وسلوک میں فطرت کی سیدھی راہ پر چلے اور ہر طرح کے افراط وتفریط سے دور رہے ورنہ وہ سیدھی راہ سے ہٹ جائے گا اور غلط روش اپنائے گا جس کے نتیجہ میں وہ کچھ کرلے گا جو اسے نہیں کرنا چاہیے تھا، اور افراط وتفریط کی ہر صورت سے دوری اختیار کرنا اس کی گواہی کو جھوٹ اور غلط بیانی سے محفوظ کردے گا، لہٰذا صدق وصداقت اور فطرت کی سیدھی راہ اپنانا انسان کو عادل بنادیتا ہے، لہٰذا عالم ہستی میں جو نظام حکم فرما اور اس کے اجزاء کے درمیان جاری و نافذ ہے جو کہ فعل خداوندی ہے وہ عدل ہی عدل ہے ...عدل محض ہے...،

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ عالم طبیعت و جہان ہستی میں رونما ہونے والے وہ تمام واقعات جو ہماری طبائع کو ناپسند و ناگوار ہوتے ہیں یا ہم انہیں اپنے طبعی میلان و رجحان کے برخلاف پاتے ہیں ......یا ہماری توقعات کے برعکس ہوتے ہیں ... پھر ہم ان پر اعتراض کرتے ہوئے ان کے وقوع پذیر ہونے کو شدید انداز میں زیر بحث لاتے ہیں تو ان پر اعتراض کے حوالہ سے ہم وہی کچھ کرتے ہیں جو ہماری عقلوں کے دریچوں سے باہر آتا ہے یا ہماری طبائع وغرائز نفسانی ان کی طرف مائل ہوتی ہیں، جبکہ وہ سب کچھ عالم طبیعت ہی پر حاکم نظام سے ماخوذ ہوتا ہے یعنی ہماری عقلوں کے تراشے اور غرائز وچاہتوں کے میلان ورجحان کا سرچشمہ نظام ہستی ہی ہے، پھر ہم ان حوادث ووقائع کی بابت مزید بحث کرتے ہیں تو واقعات کے اسباب ہم پر ظاہر وآشکار ہوجاتے ہیں اور ہم رونما ہونے والے واقعہ کے اصل سبب سے آگاہی حاصل کرلیتے ہیں، اس صورت میں یا تو ہمارا شبہ دور ہوجاتا ہے اور یا ہم سبب سے آگاہی کے حصول سے عاجز و ناتواں ہوجاتے ہیں کہ پھر ہمارے ہاتھوں میں سبب سے ناآگاہی وجہل کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا یعنی اس وقت ہمیں سبب کا علم نہیں ہوتا نہ یہ کہ سبب کے نہ ہونے کا علم ہوتا ہے (اسے علمی اصطلاح میں عدم العلم دون العلم بالعدم کہا جاتا ہے) بنابراین جہان ہستی کا نظام ... جو کہ فعل خداوندی ہے.....وہی عدل ہے، (اس مطلب پر اچھی طرح غور کریں اور اسے سمجھنے کی کوشش کریں)

اگر اس جہان ہستی میں کوئی دوسرا معبود ہوتا کہ جو ہمیں خدا سے بے نیاز کرتا تو نظام کائنات عدل مطلق نہ ہوتا بلکہ ہر معبود کا فعل اسی کے حوالہ ونسبت سے اور اسی کے دائرۂ عمل وحاکمیت میں عدل ہوتا، (یعنی پوری کائنات پر ایک ہی عدل حکمفرمانہ ہوتا)،

خلاصۂ کلام یہ کہ اللہ تعالیٰ خود گواہی دیتا ہے ... اور وہ شاہد عدل ہے، عادل گواہ ہے..... کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ یہ گواہی اپنے کلام وگفتار کے ذریعے دیتا ہے چنانچہ اس کا واضح ارشاد ہے کہ جو زیر بحث آیت مبارکہ میں اس طرح ذکر ہوا ہے، "شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ" ، تو یہ آیت خداوند عالم کی اپنی توحید و یکتائی کی شہادت پر مشتمل ہے یعنی اس میں اس نے خود ہی اپنی یکتائی کی گواہی دی ہے، اس حوالہ سے یہ آیت درج آیت کے مثل ہے :

سورۂ نساء، آیت ۱۶۶ :

○ " لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا "

(لیکن اللہ گواہی دیتا ہے اس چیز کے بارے میں جو اس نے تیری طرف نازل کی ہے کہ اسی نے اسے اپنے علم کے ساتھ نازل کیا ہے اور فرشتے گواہی دیتے ہیں اور خدا شہادت و گواہی دینے میں کافی ہے)۔

اور فرشتوں کی گواہی کے بارے میں ارشاد ہوا کہ وہ بھی گواہی دیتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، تو اس سلسلہ میں ان آیات سے پہلے نازل ہونے والی مکی آیات مبارکہ میں فرشتوں کے بارے میں اس طرح آگاہ فرمایا کہ وہ خدا کے مکرم و بااحترام بندے ہیں اور وہ اپنے پروردگار کی معصیت و نافرمانی کے مرتکب نہیں ہوتے، وہ اس کے امر و فرمان کے مطابق عمل کرتے ہیں اور اس کی تسبیح کرتے ہیں اور ان کی تسبیح میں یہ گواہی ہوتی ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، چنانچہ ارشاد ہوا :

سورۂ انبیاء، آیت ۲۷ :

○ " بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۙ﴿۲۶﴾ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ "

(بلکہ وہ مکرم و بااحترام بندے ہیں، وہ خدا کے فرمان پر سبقت نہیں لیتے، اور وہ اس کے حکم کے مطابق عمل کرتے ہیں)

سورۂ شوریٰ، آیت ۵ :

○ " وَالْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ "

(اور فرشتے اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں)

صاحبان علم کی گواہی

اس آیۂ مبارکہ میں خدا اور فرشتوں کی گواہی کے ذکر کے بعد صاحبان علم کی گواہی کو ذکر کیا گیا ہے کہ وہ گواہی دیتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ صاحبان علم آفاقی اور انفسی آیات کا مشاہدہ کرتے ہیں جو کہ ان کے انگ انگ پر چھائی ہوئی ہیں اور ان کی قوت فکر و نظر کی وسعتوں پر محیط اور عقل و شعور کی تہوں میں گھر کر چکی ہیں، جس کے نتیجہ میں وہ خدا کی وحدانیت کی گواہی دیتے ہیں۔

دو اہم نکات کا بیان

مذکورہ بالا مطالب سے دو اہم نکات واضح ہوتے ہیں:

(۱) ''شہادت'' و گواہی سے مراد...... جیسا کہ آیت سے بظاہر معلوم ہوتا ہے...... قولی گواہی ہے عملی گواہی نہیں، اگرچہ عملی گواہی اپنے طور پر درست وحق ہے کیونکہ عالم وجود و ہستی اپنے جاری نظام کی وحدت سے خداوند عالم کی وحدانیت کی وجودی و عملی گواہی دے رہا ہے اور اپنے ہر فرد کے وجود کے ذریعے...... جس میں تمام موجودات شامل ہیں...... اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ خدا ایک ہے (اگر اس کے علاوہ بھی کوئی معبود ہوتا تو عالم وجود و ہستی میں اس طرح کا واحد و باہم پیوستہ نظام نہ پایا جاتا)

(۲) جملہ "قَآئِمًا بِالْقِسْطِ" ادبی اصطلاح کے مطابق...... جملہ "شَہِدَ اللّٰہُ" کے فاعل کا ''حال'' ہے اور اس کا عامل ''شہد'' ہے، اس کی وضاحت کے لئے دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ "قَآئِمًا بِالْقِسْطِ" کو جملہ حالیہ قرار دینے سے آیت کا معنی یہ ہوگا کہ خدا کے "قائم بالقسط" ہونے کی گواہی نہیں دی گئی یعنی ایسا نہیں کہ اس سلسلہ میں خدا، فرشتوں اور صاحبان علم نے گواہی دی ہو بلکہ یہ خدا ہے کہ جس نے قائم بالقسط ہوتے ہوئے گواہی دی کہ اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور فرشتے اور صاحبان علم خدا کی وحدانیت کی گواہی دیتے ہیں، یہی بات ظاہراً آیہ سے معلوم ہوتی ہے کیونکہ جملہ "لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ" اور جملہ "قَآئِمًا بِالْقِسْطِ" کے درمیان جملہ "وَالْمَلٰٓئِکَۃُ وَاُولُوا الْعِلْمِ" ذکر ہوا ہے، اگر خدا کا قائم بالقسط ہونا گواہی میں شامل ہوتا تو آیت کے الفاظ اس طرح ہونے چاہئیں تھے: " اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ وَاُولُوا الْعِلْمِ " (خدا گواہی دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں قائم بالقسط ہے، اور فرشتے اور صاحبان علم گواہی دیتے ہیں)۔

مذکورہ بالا بیان سے ان مفسرین حضرات کے اظہارات کی نادرستی ظاہر و واضح ہو جاتی۔ ہے جنہوں نے آیت مبارکہ کی تفسیر میں دونوں امور کا نظریہ پیش کیا ہے (یعنی انہوں نے کہا کہ شہادت و گواہی سے مراد عملی شہادت ہے اور خدا کا قائم بالقسط ہونا بھی اسی شہادت میں شامل ہے) قارئین کرام ان حضرات کے اظہارات کا مطالعہ کر کے ان پر وارد ہونے والے اشکال سے بخوبی آگاہ ہو سکتے ہیں۔

ایک نہایت کمزور رائے

زیر بحث موضوع کی بابت نہایت کمزور بلکہ ردی ترین بات ان بعض مفسرین کی ہے جنہوں نے ہمارے مذکورہ بالا

مطالب پر اعتراض کی صورت میں کہا ہے کہ شہادت وگواہی کو قولی وکلامی شہادت (یعنی زبان سے اظہار) قرار دینا اس بات کو لازم قرار دے گا کہ توحید اور خداوند عالم کی یکتائی کا اثبات عقل کی بجائے ''نقل'' کے سہارے پر ہو (نقل سے یہاں قرآن مجید مراد ہے) اور'' نقل '' کے حجت اور قابل قبول ہونے کے لئے وحی کا اثبات ناگزیر ہوگا کیونکہ اس صورت میں شہادت و گواہی کا قرین صحت ہونا قرآن کے وحی ہونے کے اثبات پر موقوف ہوگا جبکہ وہ خود اس پر موقوف ہے تو اس طرح بیان میں ''دور'' لازم آئے گا جو کہ قطعاً درست نہیں (''دور'' (دال پر زبر کے ساتھ) سے مراد یہ ہے کہ کسی چیز کا وجود خود اسی کے وجود یا کسی قول کی درستی خود اس کے درست ہونے پر موقوف ہو، اسے علمی اصطلاح میں'' توقف الشیء علی نفسہ '' کہتے ہیں یعنی کسی چیز کا وجود خود اس کے وجود پر موقوف ہو اور پلٹ پلٹ کر بات وہیں کی وہیں رہ جائے،م)، اسی اعتراض بیان کی بناء پر بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہاں شہادت و گواہی سے ایک استعاری معنی مراد ہے یعنی گواہی کا لفظ استعارتاً استعمال ہوا ہے نہ کہ حقیقی معنی میں ! اور وہ اس طرح کہ خداوند عالم نے جو کچھ بھی خلق فرمایا ہے وہ سب وجودی احتیاج اور متصل و پیوستہ نظام کا حامل ہونے کی وجہ سے اپنے صانع وخالق کی وحدت و یکتائی کا ثبوت پیش کرتا ہے، ان کا اس طرح خدا کی وحدانیت کا ثبوت دینا ایسا ہے جیسے وہ اپنی زبان و بیان سے اس امر کی گواہی دے رہے ہوں کہ خدا ایک ہے اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں، گویا وہ اپنی زبان حال سے توحید کی گواہی دیتے ہیں اس لئے قرآن مجید میں اسے لفظ'' شہادت'' سے تعبیر کیا گیا ہے اور اسے خدا کی شہادت دینا قرار دیا گیا ہے، اسی طرح ملائکہ کی عبادت اور خدا کے اوامر وفرامین کی اطاعت و فرماں برداری درحقیقت خدا کی وحدانیت کی عملی شہادت ہے اور یہی حال صاحبان علم کا ہے کہ ان کا خدا کی یکتائی کی نشانیوں کا مشاہدہ کرنا اور ان کی طرف سے خدا کی وحدانیت کی گواہی دینے کے برابر ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ وہ حضرات اپنے بیان میں خلط ملط اور مغالطہ کا شکار ہوئے ہیں کیونکہ ''نقل'' (یا منقولات) پر اس صورت میں اعتماد نہیں کیا جاتا یعنی ان کا سہارا نہیں لیا جاتا جب عقل (قوتِ عقل یا معقولات) اور حس (قوتِ حس یا محسوسات) سے استفادہ کی راہ موجود نہ ہو اور ان (عقل وحس) سے موضوع کا اثبات ممکن ومقدور اور میسر نہ ہو کیونکہ ''نقل'' (یا منقولات) سے ان چیزوں اور امور میں علم ویقین حاصل نہیں ہوتا جن کی بابت علم ویقین کا حصول لازمی ہوتا ہے۔لیکن اگر کسی منقولی دلیل کے بارے میں یہ فرض کر لیں کہ اس سے علم ویقین حاصل ہوتا ہے اور وہ وہی کام کرتی ہے جو عقل و عقلی دلیل کرتی ہے یا اس سے بھی زیادہ قوی، تو اس صورت میں اس پر اعتماد کرنا اور اس کا سہارا لینا عقل و عقلی دلیل پر سہارا لینے کے برابر یا اس سے بھی زیادہ قوی ہوگا، جیسا کہ عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض اوقات تواتر سے حاصل ہونے والی خبر عقلی دلیل سے بھی زیادہ مضبوط سمجھی جاتی ہے اور اس کا اثر ونتیجہ اس موضوع ومطلب سے کہیں زیادہ واضح وروشن ہوتا ہے جس پر عقلی دلیل قائم کی گئی ہو خواہ اس کے مقدماتی امور عقلی ویقینی ہوں اور ان سے یقین حاصل کیوں نہ ہوتا ہو۔ بنابریں جب کوئی شاہد و گواہ

ایسا ہو کہ اس کی بابت جھوٹ اور غلط بیانی کا قطعی اندیشہ وتصور ہی نہ ہو اور وہ ایسی صریح و کھلی دلیل پیش کرے جو حقیقت الامر کے عین مطابق اور اس کی کامل عکاسی کرتی ہو تو اس کی گواہی اس طرح یقین کا فائدہ دے گی جس طرح کوئی عقلی و یقینی دلیل و برہان یقین کا فائدہ دیتی ہے، اور خداوند عالم کی ذات ایسی ہے (جس میں نقص و باطل اور کمزوری و غلطی کی قطعی کوئی گنجائش و راہ نہیں پائی جاتی) کہ اس کے بارے میں کذب وغلط بیانی قابل تصور ہی نہیں، لہٰذا اس کا اپنی وحدانیت کی گواہی دینا حق اور مطابق واقع ہے جیسا کہ اس کا فرشتوں اور صاحبانِ علم کی گواہی کے بارے میں خبر دینا اور مطلع کرنا ہے۔

اس کے علاوہ یہ بات قابل توجہ ہے کہ جو خدا کے لئے شریک یا شرکاء مانتا اور ثابت کرتا ہے مثلاً بت وصاحبانِ بت، تو درحقیقت وہ انہیں خدا کی بارگاہ میں شفاعت کرنے والے اور خدا اور مخلوق کے درمیان وسائط کی حقیقت میں اثبات کرتا ہے جیسا کہ ان کے بارے میں خداوند عالم نے بیان فرمایا ہے کہ وہ کہتے ہیں: "مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ؕ" (سورۂ زمر، آیت ۳) ہم ان کی عبادت نہیں کرتے مگر صرف اس لئے کہ وہ ہمیں اللہ کا تقرب اور اس سے قریب تر کردیں...... یہاں تک کہ وہ شخص جو خفی و پوشیدہ شرک کرتے ہوئے خدا کا شریک بناتا ہے مثلاً اپنی عبادات میں ہوائے نفس وذاتی خواہشوں، یا حاکم کی اطاعت وفرماں برداری، یا مال ودولت، یا اولاد کو ملحوظ ودخیل قرار دیتا ہے وہ بھی اسے خدا کا بنایا ہوا سبب مانتا ہے البتہ اس کی بابت مستقل تاثیر کا عقیدہ قائم کرلیتا ہے۔ بہر حال وہ جسے بھی خدا کا شریک قرار دیتا ہے وہ اسے شریک ہی سمجھتا ہے اور اس کی شراکت درعبودیت کا دعویٰ شریک کی ذات نہیں بلکہ شریک کرنے والے شخص کی طرف سے شرک کا ارتکاب کہلاتا ہے، اور جب خداوند عالم نے گواہی دے دی کہ اس نے اپنے لئے کوئی شریک نہیں بنایا ...... یا کسی کو شریک قرار نہیں دیا...... تو ہر اس شخص کا ادعاء باطل و بے بنیاد ہوجائے گا جو خدا کا شریک بناتا ہے، چنانچہ اسی مطلب سے ہم رنگ وہم معنی مطالب درج ذیل آیۂ مبارکہ میں مذکور ہیں:

سورۂ یونس، آیت ۱۸:

O "قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِى السَّمٰوٰتِ وَلَا فِى الْاَرْضِ ؕ"

(کہہ دیجئے کہ آیا تم خدا کو اس چیز سے باخبر کرتے ہو جسے وہ نہیں جانتا، نہ آسمانوں میں اور نہ ہی زمین میں؟)

اس سے مشرکین کے ادعاء شرک کی بنیاد ختم ہوجاتی ہے کہ جس میں وہ آسمان وزمین کی موجودات میں اپنے شریک سے لاعلم قرار پاتا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ آسمان اور زمین میں کوئی اس کا شریک نہیں اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اس سے مخفی و پوشیدہ ہو، درحقیقت یہ شہادت و گواہی ایک خبر اور اطلاع ہے اور ان خبروں اور اطلاعات میں سے ہے جو سرچشمۂ ربوبیت و مرکزِ عظمت سے آتی ہیں مثلاً اس کا ارشاد ہے:

سورۂ یونس، آیت ۱۸ :

○ "سُبۡحٰنَهٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ"

(وہ پاک اور بلند و بالاتر ہے اس سے جو وہ شرک کرتے ہیں)

البتہ زیر بحث خدائی خبر میں شہادت کے معنی کا منطبق ہونا ملحوظ ہے کیونکہ وہ ایسی شہادت ہے جو ایک دعویٰ وادعاء کے بارے میں ہے اور وہ خبر دینے والا قائم بالقسط ہے لہٰذا اسے "شہادت" وگواہی کہا جائے گا...... کیونکہ گواہی سے مراد دعوے میں عادل شخص کا بیان ہوتا ہے، اس بناء پر خدائے عادل کی خبر اور بیان کو شہادت وگواہی کہنا بالکل درست ہے...... اور آیت مبارکہ میں "شہادت" کا لفظ ذکر کرنا دراصل بیان وسخن میں تفنن کے طور پر ہے کہ اس سے متکلم کے سخنوری میں کمال اور سخن سنجی کی بلندی کا ثبوت ملتا ہے......، نتیجتاً آیت مبارکہ کے معنی کی بازگشت اس امر کی طرف ہوگی کہ اگر عالم ہستی میں خدا کے علاوہ دیگر معبود ہوتے کہ جو کائنات کی تخلیق وتدبیر کے امور میں موثر ہوتے اور خدا کے ساتھ ان امور میں شریک ہوتے یا کم از کم اس حوالہ سے شفاعت کرنے والے ہوتے تو خداوند عالم ان سے آگاہ ہوتا اور ان کے بارے میں شہادت وگواہی دیتا لیکن اس کے برعکس اس نے خبر دی ہے کہ اس کا کوئی شریک نہیں لہٰذا ماننا ہوگا کہ کوئی اس کا شریک نہیں، اور اگر اس کا کوئی شریک ہوتا تو فرشتوں کو بھی اس کا علم ہوتا وہ کہ جو مکرم و باحترام ہیں اور خدا وخلق کے درمیان وسائط اور خلقت وتدبیر میں خدا کے اوامر کو جاری کرنے والے ہیں مگر وہ بھی گواہی دیتے ہیں کہ اس کا کوئی شریک نہیں، اسی طرح صاحبان علم بھی اس سے آگاہ ہوتے اور اس کی نشانیوں سے باخبر ہوتے مگر وہ بھی آفاق وانفس میں پائی جانے والی نشانیوں کے مشاہدہ کے بعد شہادت وگواہی دیتے ہیں کہ خدا کا کوئی شریک نہیں۔

خدا کے شریک نہ ہونے کے حوالہ سے ہمارے بیان کی مثال یوں ہے کہ جیسے کہا جائے: اگر فلاں ملک میں اس کے موجودہ بادشاہ کہ جسے ہم سب جانتے اور پہچانتے ہیں کے علاوہ کوئی دوسرا بادشاہ بھی ہوتا کہ جو امور مملکت داری میں اس کا شریک ہوتا تو موجودہ بادشاہ کو اس کا علم ہوتا کیونکہ یہ بات محال وناممکن ہے کہ کسی ایک مملکت میں دو بادشاہ حکومت کرتے ہوں اور انہیں ایک دوسرے کا علم نہ ہو، اسی طرح وہ ادارے ومحکمے جو بادشاہ کے فرامین کو جاری ونافذ کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں اور وہ افراد وکارندے جو مرکز اور عوام کے درمیان واسطہ بنتے ہیں...... کہ جنہیں آج کی زبان میں وزراء کہا جاتا ہے...... وہ اس بادشاہ کو ضرور جانتے اور پہچانتے کیونکہ وہ اس سے احکامات لیتے ہیں، تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ اس وجود سے ناآگاہ ہوں اور انہیں اس کا علم ہی نہ ہو جبکہ وہ اس کے فرمانی وصول کرنے والے اور اس کے دستورات کے نفاذ وعملداری کو یقینی بنانے والے ہیں یہی حال ملک کے صاحبانِ عقل وعلم کا ہے کہ انہیں بھی اس دوسرے حاکم وبادشاہ کا علم ہوتا اور ایسا کیوں نہ ہوتا جبکہ عوام ورعایا میں عقل ودانش سے بہرہ ور افراد اپنے حاکم وبادشاہ اور فرمانروائے مملکت کے اوامر ودستورات کی پیروی کرتے

ہیں اوراس کے ملک وسلطنت میں زندگی گزارتے ہیں تو یقیناً انہیں دوسرے بادشاہ کا علم ہوتا اور وہ اس سے پوری طرح آگاہ ہوتے، لیکن موجودہ بادشاہ اس کے وجود کی نفی وانکار کرتا ہے اور حکومت کے کارندے اسے نہیں پہچانتے اور عقلائے مملکت اس کے وجود کی کوئی ایسی نشانی نہیں دیکھتے جس کی بناء پر اس کے وجود کی تصدیق کریں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہے ہی نہیں!

خدائے واحد کی قوت وحکمت

○ " لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ "
(اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ قوی وغالب اور حکیم ودانا ہے)

یہ جملہ اس جملۂ معترضہ کے مانند ہے جو کلام کے درمیان میں آتا ہے، اور یہ اس حق کے اظہار و یاد آوری اور پورا کرنے کے لئے ہے کہ اگر اسے یہاں ذکر نہ کیا جاتا تو اس حق کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ تھا جبکہ یہ جملہ کلام میں اصل مقصود نہیں، یہ بات ادب القرآن سے ہے کہ جہاں خداوند عالم کا تذکرہ ہو اور اس کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہو اور سننے والے کی لوح ذہن پر ایسے نقوش ثبت ہونے کا اشارہ ملنے لگے جو ذات باری تعالیٰ کے شایان شان اور زیبا نہ ہوں تو فوراً ان کا مداوا کیا جاتا ہے اور ایسے الفاظ ذکر کر دیئے جاتے ہیں جن سے مقام ربوبیت کی تعظیم وادائے احترام ہو مثلاً:

سورۂ یونس، آیت ۶۸ میں ارشاد ہوا:

○ " قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ "
(انہوں نے کہا کہ خدا نے بیٹا بنایا ہوا ہے، اس کی ذات پاک ہے)

اس میں لفظ "سبحانہٗ" اس لئے لایا گیا ہے کہ یہاں ایسی بات ہو رہی تھی اور ایک ایسے قول ونظریہ کو ذکر کیا جا رہا تھا کہ جو ذات باری تعالیٰ کے شایان شان نہیں لہٰذا اس کی عظمت اس کی متقاضی تھی کہ فوراً ایسا جملہ ذکر کیا جائے جس سے خدا کے اس قول ونظریہ سے منزہ ہونے کا اظہار ہو، تو لفظ "سُبْحٰنَهٗ" اس ہدف ومقصد کو پورا کرتا ہے۔

ایک حوالہ سے درج ذیل آیت مبارکہ میں بھی یہی امر ملحوظ ہے:

سورۂ مائدہ، آیت: ۶۴

○ " وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ ۚ غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ "
(یہودیوں نے کہا کہ خدا کا ہاتھ بندھا ہوا ہے، ان کے اپنے ہاتھ بندھے ہوں!)

تو اس آیت میں یہودیوں کے قول ونظریہ کے رد میں فوراً "غُلَّتْ اَیْدِیْهِمْ" کہا گیا تا کہ اس کی ذات مقدسہ کی طرف دی جانے والی غلط نسبت کے مقابلے میں اس کی عظمت کا دفاع ہو،

خلاصۂ بحث یہ کہ زیرنظر آیۂ مبارکہ کی ابتداء چونکہ خدا، فرشتوں اور صاحبانِ علم کی اس کے شریک کی نفی کی گواہی پر مشتمل تھی اور اس میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ وہ سب اس امر کی گواہی دیتے ہیں کہ خدا کا کوئی شریک نہیں، تو یہ ضروری بلکہ خدا کا حق تھا کہ جو خود اس گواہی کو بیان کرنے والا ہے (اس آیت میں متکلم خود خدا ہے) اور اسی طرح اس بیان کا سننے والا خدا سے اس کے شریک کی نفی کرتے ہوئے اس کی وحدانیت و یکتائی کا اظہار کرے اور صریح الفاظ میں کہہ دے: "لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ" کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کی ایک مثال درج ذیل آیۂ مبارکہ میں ملتی ہے جو کہ ایک تہمت کے ازالہ کی بابت نازل ہوئی:

سورۂ نور، آیت ۱۶ :

○ " وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا ۖ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ⑯ "

(تم نے جب اسے سنا تو کیوں نہیں کہا کہ ہمیں ایسی بات نہیں کرنی چاہیے، تیری ذات پاک و منزہ ہے، یہ بہت بڑا بہتان ہے)

اس میں ایک تہمت و بہتان کے ازالہ کے حوالہ سے "سُبْحٰنَكَ" اس لئے کہا گیا کہ لوگوں پر خدا کا حق ہے کہ جب وہ کوئی تہمت و بہتان سنیں اور جس پر وہ الزام لگایا گیا ہو اس کا اس سے منزہ و پاک ہونا بیان کرنا چاہیں تو پہلے ذاتِ خداوندی کا منزہ و پاک ہونا ذکر کریں کیونکہ خداوندِ عالم کی ذات سب سے زیادہ اس بات کی حقدار ہے کہ اس کی پاکیزگی اور ہر طرح کی تہمت و بہتان سے منزہ ہونا بیان کیا جائے، اس بناء پر خداوند عالم نے مذکورہ بالا آیت میں ایک طرح سے شکوہ کیا ہے کہ جب تم نے تہمت و بہتان کو سنا تو ضروری تھا کہ سب سے پہلے خدا کا منزہ و پاک ہونا بیان کرتے کیونکہ وہ ہر شخص سے زیادہ اس کا حقدار ہے اور اس کی تنزیہ و پاکیزگی کو بیان کرنا واجب ہے۔

بنابریں اس جملہ "لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ" کا مقام دراصل خداوند عالم کی ثناء کا مقام ہے تا کہ اس کی تعظیم و تکریم کا حق ادا کئے جانے کی راہ ہموار ہو، اسی لئے اس جملہ کی تکمیل اس کے دو عظیم ناموں "عزیز" اور "حکیم" سے ہوئی ہے، اگر یہاں شہادت و گواہی کا نتیجہ بیان کرنا مقصود ہوتا تو جملہ کی تکمیل میں خدا کے دو اوصاف یعنی وحدانیت اور قائم بالقسط ہونا، ذکر کئے جاتے۔ لہٰذا جب خدا کی وحدانیت و یکتائی کی گوائی کا بیان ہو تو اس کی توحید کا ذکر ہی اس کے شایان شان اور اس کا حق ہے کیونکہ وہ عزت میں یکتا ہے اور اس کی یکتائی اس سے مانع ہے کہ الوہیت میں اس کا شریک قرار دے کر اس کی تذلیل کی جائے لہٰذا "لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ" کے بعد "عزیز" کہا گیا۔ اور وہ حکمت و دانائی میں متفرد و یکتا ہے

اور اس کا ایسا ہونا اس سے مانع ہے کہ کوئی اس کے کسی فیصلہ کو نقض و کالعدم نہیں کر سکتا اور نہ ہی خلق و تدبیر میں اس کے طے کردہ امور میں رکاوٹ ڈال سکتا ہے اور نہ اس کے قائم کردہ نظام کائنات کو توڑ مروڑ اور خراب کر سکتا ہے۔

مذکورہ بالا مطالب سے یہ نکتہ بھی واضح ہو گیا کہ آیت مبارکہ میں کلمۂ توحید "لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ" دو بار کیوں ذکر کیا گیا ہے اور یہ بات بھی واضح و روشن ہو گئی کہ آیت کے آخر میں تکمیلی حوالہ سے خداوند عالم کے دو نام "عـــزیـــز" اور "حکیم" ذکر کرنے میں کیا راز ہے ؟ (واللہ العالم)..... حقائق الامور کا علم تو خدا کو ہے.....،

روایات پر ایک نظر

قریش کے برے انجام کا حوالہ

تفسیر مجمع البیان (جلد دوم ص ۴۱۳) میں آیت مبارکہ " قُلْ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ..... " کی تفسیر میں محمد بن اسحاق کی اپنے اسناد سے بیان کردہ روایت ذکر کی گئی ہے، جس میں انہوں نے کہا کہ جب حضرت پیغمبر اسلامؐ جنگ بدر کے بعد فاتحانہ انداز میں مدینہ منورہ تشریف لائے تو مدینہ کے یہودیوں کو بازار قینقاع میں جمع کیا اور ان سے فرمایا:

" یا معشر الیهود احذروا من الله مثل ما نزل بقریش یوم بدر ، واسلموا قبل ان ینزل بکم ما نزل بهم وقد عرفتم انی نبی مرسل تجدون ذلک فی کتابکم "،

اے یہودیو! اس دن سے ڈرو جب خدا تمہیں اسی طرح کے انجام سے دوچار کرے جیسا اس نے بدر میں قریش کو کیا ہے اور اس سے پہلے کہ تم پر وہ خدائی قہر نازل ہو جو قریش پر نازل ہوا ہے تم اسلام لے آؤ جبکہ تم نے جان لیا ہے کہ میں خدا کا بھیجا ہوا نبی ہوں اور تم میرے بارے میں اپنی دینی کتاب میں مرقوم واضح بیانات و مطالب پڑھ چکے ہو،

یہودیوں نے آنحضرتؐ سے کہا:

" یا محمد ! لا یغرنک انک لقیت قوما اغمارا لا علم لهم بالحرب فاصبت منهم فرصة انا والله لو قاتلناک لعرفت انا نحن الناس "،

اے محمد! جنگ بدر میں قریش پر فتح پانے پر غرور نہ کریں، کیونکہ وہاں آپ کے مقابلے میں وہ لوگ تھے جو جنگ کے طور طریقوں سے آشنا ہی نہیں تو آپ کو ان پر غلبہ پانے کا موقع مل گیا لیکن جہاں تک ہمارا تعلق ہے تو خدا کی قسم! اگر ہم آپ

سے جنگ کریں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ہم مردمیدان ہیں اور جنگ کرنا جانتے ہیں.....،

ان کے اس اظہار کے بعد یہ آیت نازل ہوئی: " قُلْ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ...... " ان کافروں سے کہہ دو کہ تم بہت جلد مغلوب ہو گے.....،

مؤلفؒ: اس روایت کو تفسیر درمنثور میں بھی محمد بن اسحاق کے حوالہ سے ذکر کیا گیا ہے، اور ابن جریر اور بیہقی نے کتاب "دلائل" میں ابن عباس کے حوالہ سے یہ روایت ذکر کی ہے۔ اس سے قریب المعنی روایت تفسیر قمیؒ میں بھی مذکور ہے، اس کے باوجود قارئین کرام ہمارے سابقہ ذکر کیے گئے مطالب کے تناظر میں اس حقیقت سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ ان آیات مبارکہ کے سیاق سے ان کے یہودیوں کے بارے میں نازل ہونے کی مناسبت ظاہر نہیں ہوتی اور قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں بلکہ آیات مبارکہ کے سیاق سے مناسبت کے لحاظ رکھتے ہوئے یہ کہنا زیادہ موزوں ہے کہ یہ جنگ احد کے بعد نازل ہوئیں (واللہ اعلم)۔ حقیقت الامر کا علم خدا کو ہے.....،

امام جعفر صادقؑ کا ارشاد گرامی

کتاب کافی (جلد ۵ ص ۳۲۱ اور تفسیر العیاشی (جلد اول ص ۱۶۴) میں حضرت امام صادق علیہ السلام سے روایت ذکر کی گئی ہے کہ آپؑ نے ارشاد فرمایا:

" ما تلذذ الناس فی الدنیا والآخرۃ بلذۃ اکبر لھم من لذۃ النساء ..... "

لوگ دنیا و آخرت میں کسی چیز سے اتنی لذت نہ پائیں گے جو صنف نازک سے حال ہونے والی لذت و سروس سے زیادہ ہو، اسی کے بارے میں خداوندعالم نے ارشاد فرمایا ہے: " زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ...... " (لوگوں کے لئے عورتوں اور بیٹوں کی محبت لذیذ بنادی گئی ہے.....)۔

(امامؑ نے آیت کی تلاوت کے بعد ارشاد فرمایا):

" وان اھل الجنۃ ما یتلذذون بشیء من الجنۃ اشھیٰ عندھم من النکاح لا طعام ولا شراب "

اہل بہشت بھی بہشت کی کسی چیز سے اس قدر لطف اندوز نہ ہوں گے جس قدر مناکحت سے لطف اندوز ہوں گے اور انہیں اس سے زیادہ لذت بخش کوئی شے نہ ملے گی نہ کھانے والی اشیاء میں اور نہ پینے والی چیزوں میں سے!

مؤلفؒ: اس روایت میں مذکور مطالب دراصل آیہ مبارکہ میں لذتوں کی جو ترتیب مذکور ہے اسی پر مبنی ہیں کیونکہ اس میں عورتوں کی محبت کو دیگر تمام محبتوں و لذائذ پر مقدم کیا گیا اور سب سے پہلے ذکر کیا گیا ہے اور جب تمام لذائذ کو ذکر کر دیا

گیا تو ان سب کو متاع دنیا ...... دنیاوی زندگی کا ساز و سامان اور زیب و زینت ..... قرار دیا گیا اور کہا گیا کہ بہشت کی لذتیں ان سے کہیں بہتر ہیں،

امام علیہ السلام کا لذت و مناکحت کو سب سے بڑی لذت قرار دینا اور اسے ہی لوگوں کی سب سے زیادہ پسندیدہ لذت سے تعبیر کرنا دوسری لذتوں سے اور ان کے تقابلی تناظر کی بنیاد پر ہے، یعنی امامؑ کا مقصد یہ ہے کہ مناکحت و مباشرت انسانی جسم سے تعلق رکھنے والی تمام لذتوں سے زیادہ بڑی ہے لیکن جہاں تک غیر جسمانی لذتوں کا تعلق ہے تو وہ امام علیہ السلام کے ارشاد گرامی میں تقابلی فہرست میں شامل ہی نہیں مثلاً انسان کا اپنے وجود و ہستی سے لطف اندوز ہونا یا اولیائے الٰہی و خدا کے مقرب بندوں میں سے کسی کا اپنے پروردگار کے قرب و تقرب اور اس کی بزرگ ترین نشانیوں، اس کے رضوان و اکرام اور نوازشات و عنایات کے مظاہر کے مشاہدہ سے لطف اندوز ہونا وغیرہ، تو امامؑ نے ان لذائذ کی تقابلی ترتیب کو مورد توجہ قرار نہیں دیا، ان حقائق پر تو ٹھوس علمی دلائل قائم ہو چکے ہیں کہ سب سے بڑی لذت کسی چیز کا اپنے وجود و ہستی کی نعمت سے لذت پانا اور لطف اندوز ہونا ہے۔ اور دیگر علمی مضبوط دلائل سے یہ ثابت ہوا ہے کہ اشیاء و موجودات عالم کا اپنے وجود و ہستی کی نعمت سے زیادہ اپنے پروردگار کے وجود و ہستی سے لطف اندوز ہونا اور لذت پانا ہے۔ اور کثیر روایات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بندہ کا اپنے رب و خالق کے حضور و تقرب سے لذت پانا اسے ہر لذت سے زیادہ اور بڑا لگتا ہے، (گویا بارگاہِ الٰہی میں شرفیابی کی لذت ہر لذت سے عظیم بلکہ ناقابل قیاس ہے) چنانچہ ان میں سے ایک روایت کتاب اصول کافی میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے جس میں آپؑ نے ارشاد فرمایا: حضرت علی بن الحسین علیہما السلام (امام زین العابدینؑ) فرمایا کرتے تھے کہ قرآن مجید کی ایک آیت ایسی ہے جس کی تلاوت کے بعد موت کا جلدی آنا اور قتل کیا جانا مجھے مرغوب لگتا ہے اور وہ آیت یہ ہے:

سورۂ رعد، آیت ۴۱ :

○ " اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا نَاْتِی الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا "

(آیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم زمین کو اس کے کناروں سے کم کر رہے ہیں)

یہاں کناروں سے کم کرنے کا مطلب علماء کا وفات پانا ہے، عنقریب اس سلسلے میں مربوط روایات اس کتاب میں موزوں مقامات پر ذکر کی جائیں گی، (کتاب کافی۔ جلد اول ص ۳۰ حدیث ۶)

دو اماموں کا بیان

آیۂ مبارکہ میں "وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ" کی تفسیر میں کتاب مجمع البیان میں ایک روایت امام محمد باقر اور امام جعفرِ صادق علیہما السلام سے منقول ہے جس میں انہوں نے ارشاد فرمایا کہ "قنطار" سے سونے سے بھری ہوئی گائے کی کھال مراد ہے۔

اسی حوالہ سے تفسیر قمی میں ایک روایت مذکور ہے جس میں امام علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ "الْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ" سے گھاس پھوس چرنے والے گھوڑے مراد ہیں۔ (تفسیر قمی جلد اول ص ۹۷)

استغفار کی اہمیت اور آثار

کتاب "من لایحضره الفقیه" اور کتاب "خصال" میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ذکر کی گئی ہے جس میں آپؑ نے ارشاد فرمایا:

" من قال فی وترہ اذا اوتر " استغفر الله و اتوب الیه سبعین مرة " وهو قائم فواظب علٰی ذلک حتی تمضی سنة کتبه الله عندهٗ من المستغفرین بالاسحار و وجبت له المغفرة من الله تعالٰی"

جو شخص نماز وتر میں کہ جو نماز شب کی آخری رکعت ہے کھڑے ہوئی حالت میں ستر مرتبہ " استغفر اللّٰه واتوب الیه " کہے اور اس عمل کو لگاتار ایک سال تک انجام دیتا رہے تو خداوند عالم اسے "مستغفرین بالاسحار" (راتوں کو جاگ جاگ کر استغفار کرنے والوں) میں شمار کرے گا اور خداوند عالم کی طرف سے مغفرت و بخشش کا لازمی حقدار بن جائے گا۔

ملاحظہ ہو: کتاب "من لا یحضره الفقیه" جلد اول ص ۳۰۹ اور کتاب الخصال ص ۵۸۱)

یہ مطلب آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے منقول دیگر روایات میں بھی ذکر ہوا ہے اور یہ عمل حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معمولات میں سے تھا۔ اس سے قریب المعنیٰ روایت تفسیر "درمنثور" (جلد دوم ص ۱۲) میں ابن جریر کے حوالہ سے امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے جس میں آپؑ نے ارشاد فرمایا: "**من صلی من اللیل ثم استغفر فی آخر اللیل سبعین مرة کتب من المستغفرین**" جو شخص نماز شب پڑھے اور پھر رات کی آخری گھڑیوں میں

ستر مرتبہ استغفار کا ورد کرے تو اس کا نام "مستغفرین" کی فہرست میں لکھا جائے گا۔

امامؑ کا ارشاد گرامی : "وجبت له المغفرة من الله" (اللہ کی طرف سے مغفرت و بخشش کا لازمی حقدار بن جائے گا) دراصل قرآن مجید میں شب زندہ داروں کی جو دعا ذکر ہوئی ہے اس سے ماخوذ ہے جس میں انہوں نے بارگاہ رب العزت میں عرض کی: "فاغفر لنا ذنوبنا" (ہمارے گناہ معاف فرما) چونکہ خداوند عالم نے ان کی دعا ذکر کرنے کے بعد اسے رد نہیں کیا لہٰذا اس سے ان کی دعا کے مستجاب ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

آیات ۱۹ تا ۲۵

○ إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ ۗ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ
الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۗ وَمَنْ يَكْفُرْ بِآيَاتِ اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿١٩﴾

○ فَإِنْ حَاجُّوكَ فَقُلْ أَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلَّهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ۗ وَقُلْ لِلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَ
الْأُمِّيِّينَ أَأَسْلَمْتُمْ ۚ فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۖ وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ ۗ وَاللَّهُ
بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ ﴿٢٠﴾

○ إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَيَقْتُلُونَ الَّذِينَ
يَأْمُرُونَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٢١﴾

○ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ ﴿٢٢﴾

○ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِنَ الْكِتَابِ يُدْعَوْنَ إِلَىٰ كِتَابِ اللَّهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ
يَتَوَلَّىٰ فَرِيقٌ مِنْهُمْ وَهُمْ مُعْرِضُونَ ﴿٢٣﴾

○ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۪ وَغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۴﴾

○ فَكَيْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۣ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۵﴾

ترجمہ

O "یقیناً، اللہ کے نزدیک اسلام ہی دین ہے، اور جن لوگوں کو کتاب دی گئی انہوں نے باہمی دشمنی کی وجہ سے اختلاف کیا، جو شخص خدا کی آیات کا انکار کرے تو خدا بہت جلد محاسبہ کرنے والا ہے" (۱۹)

O "پس اگر وہ آپ سے محاجہ اور کج بحثی کریں تو ان سے کہہ دیجئے کہ میں نے اپنا سر خدا کے حضور خم کر دیا ہے اور اسی طرح اس نے بھی جس نے میری پیروی کی، اور (اے رسول!) ان لوگوں سے کہ جنہیں کتاب دی گئی ہے اور امیین سے پوچھئے کہ کیا تم نے حق کو تسلیم کر لیا ہے، اگر وہ حق کو تسلیم کر لیں تو وہ ہدایت یافتہ ہو جائیں گے اور اگر انہوں نے روگردانی کی تو آپ کی ذمہ داری صرف پیغام پہنچا دینا ہے، اور خدا بندوں سے بخوبی آگاہ ہے" (۲۰)

O "جو لوگ خدا کی آیات کا انکار کرتے ہیں اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے ہیں اور ان لوگوں کو بھی قتل کرتے ہیں جو لوگوں میں انصاف کا حکم دیتے ہیں تو انہیں دردناک عذاب کی خبر دے دیجئے" (۲۱)

O "انہی لوگوں کے اعمال دنیا و آخرت دونوں جہانوں میں ضائع ہو گئے اور ان کی مدد کرنے والا کوئی نہیں" (۲۲)

○ " کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب میں سے تھوڑا سا حصہ دیا گیا ہے کہ انہیں خدا کی کتاب کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے، پھر ان میں سے ایک گروہ روگردانی کر لیتا ہے جبکہ وہ حق کو پس پشت ڈالنے والے ہیں " (۲۳)

○ " ان کے اس طرح کرنے کا سبب یہ ہے کہ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ ہمیں دوزخ کی آگ چند دنوں سے زیادہ ہرگز لپیٹ میں نہ لے گی، دراصل دین کی بابت ان کی افترا پردازیوں نے انہیں دھوکہ دیا ہے " (۲۴)

○ " پھر ان کا انجام کیا ہوگا جب ہم انہیں اس دن اکٹھا کریں گے جس کے بارے میں کوئی شک وشبہ نہیں پایا جاتا، اور اس دن ہر شخص کو اس کے کئے کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر ظلم وزیادتی نہیں ہوگی " (۲۵)

تفسیر و بیان

ان آیات مبارکہ میں اہل کتاب کے بارے میں مطالب ذکر کئے گئے ہیں اور وہ ان تین گروہوں میں سے آخری گروہ ہے جن کے بارے میں ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اس سورۂ مبارکہ میں ان کی بابت مطالب مذکور ہیں اور یہی گروہ (اہل کتاب) ان تینوں میں زیادہ اہمیت کے ساتھ مورد توجہ قرار پایا ہے کہ کلام الٰہی میں اکثر آیات یہودیوں اور نصرانیوں سے متعلق امور کے بیان پر مشتمل ہیں چنانچہ بعض آیات براہِ راست اور بعض ان کے حوالہ سے مربوطہ مطالب کی حامل ہیں اور بعض آیات میں مذکور مطالب کی بازگشت ان کی طرف ہوتی ہے۔

خدائی دین کا تعارف

O " اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ "
(اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے)

" اسلام " کا لغوی معنی پہلے ذکر کیا جا چکا ہے اور شاید یہاں بھی وہی معنی مراد ہے کیونکہ اس آیت میں اہل کتاب کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ اسلام کے بارے میں علم و آگاہی کے باوجود آپس میں پائی جانے والی دشمنی کی وجہ سے اس سے روگرداں ہو گئے اور اس کی بابت ایک دوسرے سے الجھ گئے، بنابرایں آیہ مبارکہ " اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ " (اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے) کا معنی یہ ہوگا کہ اللہ کے نزدیک دین ایک ہی ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا اور خدا نے اپنے بندوں کو اس کے علاوہ کسی دین کی پیروی کرنے کا حکم نہیں دیا اور اس نے اپنے انبیاء پر جو کتابیں نازل کیں ان میں بھی اسی دین کی پیروی کے سوا کسی دوسرے دین کی پیروی یا اس سے مربوط احکام کے علاوہ کسی دوسرے دین سے تعلق رکھنے والے دستورات نازل نہیں کئے، بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ جو بھی معجزہ قائم و رونما ہوا اس کا تعلق اس دین کے علاوہ کسی دوسرے دین سے نہ تھا اور وہ دین، اسلام ہے کہ جس کا مطلب حق کو تسلیم کرنا اور اعتقادی و عملی دونوں صورتوں میں

اس کی حقانیت کا اقرار کرنا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اس واحد دین سے مراد اس کے سوا کچھ نہیں کہ بارگاہ رب العزت کی طرف سے جو حقائق و معارف اور احکام و فرامین صادر ہوئے ہیں ان کو دل و جان سے قبول کیا جائے، اور وہ خدائی بیانات جیسا کہ قرآن مجید میں مذکورہ ہے اگرچہ نبیوں و پیغمبروں کی شریعتوں کے حوالہ سے کمیت و کیفیت میں قدرے مختلف ہے لیکن وہ حقیقت اور اصل و اساس کے حوالہ سے ایک ہی ہے اور اگر مختلف شریعتوں میں خدائی معارف و احکام میں فرق پایا جاتا ہے تو وہ کمال و نقص کی بنیاد پر ہے تضاد و تصادم اور ایک دوسرے کی نفی کی بنیاد پر نہیں ہے اور جہاں تک شریعتوں کے درمیان ایک دوسرے پر برتری کا تعلق ہے تو وہ انبیاء و مرسلین علیہم السلام کے درجات و مراتب کی بنیاد پر ہے ورنہ ان تمام شریعتوں کی روح ایک ہی امر ہے کہ جو ان سب میں مشترک ہے اور وہ یہ کہ خداوند عالم نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے جو احکامات اپنے بندوں تک پہنچائے ہیں ان کو تسلیم و قبول کرتے ہوئے عملی طور پر ان کی پیروی کی جائے۔ اس کے سوا کچھ نہیں، اور یہ وہ دین ہے جس کی اطاعت و فرمانبرداری اور اس پر اعتقادی و عملی طور پر سر تسلیم خم کر دینا خداوند عالم نے اپنے بندوں سے چاہا ہے اور لوگوں کو پوری طرح اس سے آگاہی بھی دلا دی۔ تو اس کا بنیادی و لازمی تقاضا یہ ہے کہ انسان ان تمام مطالب کو قبول کرلے جن کی بابت اسے پورے طور پر آگاہی حاصل ہو چکی ہو اور جو امور واضح و روشن نہ ہوئے ہوں بلکہ ان کے بارے میں غیر یقینی صورت پیدا ہو جائے ان میں اپنی طرف سے کسی طرح سے بھی کوئی نظریاتی موقف یا عملی رائے قائم کرنے کے بجائے انہیں خدائی دستورات تسلیم کرنے پر اکتفاء کرے۔

اہل کتاب کا اختلاف کیوں؟

اس مقام پر ایک سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ جب خداوند عالم نے اپنے دین کی بابت اپنے بندوں کو کامل آگاہی دلا دی اور تمام امور و مطالب واضح و روشن کر دیئے تو پھر اہل کتاب نے اس کی بابت آپس میں اختلاف کیوں کیا جبکہ ان پر خدائی کتاب نازل ہو چکی تھی اور خدا نے واضح کر دیا تھا کہ اس کے نزدیک دین صرف اسلام اور اس کی مکمل پیروی ہے؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اہل کتاب یہود و نصاریٰ کا دین کی بابت اختلاف رائے و اختلاف عمل کا شکار ہونا اس وجہ سے نہ تھا کہ وہ دین سے جہل و ناآگاہی رکھتے تھے اور حقیقت الامر ان پر آشکار نہ تھی اور وہ یہ بات نہ جانتے تھے کہ خدا نے جو دین نازل کیا ہے وہ ایک ہی ہے بلکہ ان کا دین اسلام کو قبول نہ کرنا درحقیقت باہمی دشمنی، سرکشی و تکبر اور ظالمانہ طرز عمل اختیار کرنے کی وجہ سے تھا۔ ورنہ وہ تمام حقائق سے آگاہ ہو چکے تھے اور اسلام کی حقانیت و صداقت سے انکار کی کوئی گنجائش ان کے لئے باقی نہ تھی، ان کا ایسا کرنا خداوند عالم کی ان آیات و واضح نشانیوں کا انکار تھا جن میں دین کی حقیقت اور اسلام کی حقانیت کا

کھلا ثبوت پایا جاتا ہے ورنہ وہ لوگ ذات خداوند کے منکر نہ تھے بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے وجود کا اقرار کرنے والے ہیں اور جو شخص اللہ کی آیات کا انکار کرے تو خدا اس کا محاسبہ کرتا ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی! کہ وہ سریع الحساب ہے، وہ ایسے لوگوں کو دنیا میں ذلت ورسوائی سے دوچار کر کے انہیں سعادتمند زندگی سے محروم کر دیتا ہے اور آخرت میں دردناک عذاب میں مبتلا کرے گا جیسا کہ کلام الٰہی میں اس کا ثبوت پایا جاتا ہے کہ وہ دنیا وآخرت میں سریع الحساب ہے چنانچہ زیر نظر آیات مبارکہ (۱۹ و ۲۰) کے بعد آیت ۲۱ میں یوں ارشاد خداوندی ہوا: " اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۡ وَمَا لَهُمْ "کہ یہی لوگ ہیں کہ جن کے اعمال ضائع ہوگئے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، اور کوئی ان کا مددگار نہ ہوگا۔

دواہم نکات

مذکورہ بالا مطالب سے دواہم نکات واضح ہوتے ہیں:

(۱) آیت مبارکہ میں کہا گیا ہے کہ "دین، خدا کے نزدیک اسلام ہے" اس میں "خدا کے نزدیک اور اس کے سامنے وحضور بارگاہ ہونے" سے مراد تشریعی طور پر نزدیک ہوتا ہے تشریعی وقانون گزاری کا حوالہ ملحوظ ہے یعنی یہ کہ وہ ایک ہی آئین اور ایک ہی دستور العمل ہے کہ جس میں درجات اور مختلف امتوں کی صلاحیتوں واستعدادات کی بنیاد پر فرق پایا جاتا ہے اس کے سوا کچھ نہیں، نہ یہ کہ اسے تکوینی وحدت کا حامل قرار دیا جائے اور کہا جائے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ خداوند عالم نے انسانی فطرت میں اسے ایک ہی صورت میں ودیعت کر دیا ہے اور اس حوالہ سے اس میں یگانگت و یک رنگی پائی جاتی ہے۔ ہرگز ایسا نہیں۔

(۲) " وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ " میں آیات خدا سے مراد، آیات وحی اور وہ خدائی بیانات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء پر نازل اور انہیں القاء کئے ہیں نہ یہ کہ وہ آیات یعنی کائنات کی وجودی نشانیاں مراد ہیں جو اپنی ہستی کے ذریعے خدا کی وحدانیت و یکتائی پر دلالت کرتی ہیں اور نہ ہی وہ معارف الٰہیہ مراد ہیں جو اپنی وجودی حیثیت میں خدا کی یکتائی کا ثبوت پیش کرتے ہیں،

بہرحال زیر بحث آیہ مبارکہ میں اہل کتاب کو ان کی سرکشی کے بدلہ وانتقام کی دھمکی دی گئی ہے اور یہ اسی طرح سے ہے جیسے اس سے ماقبل آیات مبارکہ میں مشرکین وکفار کو دی جانے والی دھمکی اور برے انجام کی خبر دی گئی تھی اور کہا گیا تھا: "قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ" (کہہ دیجئے کافروں سے، کہ بہت جلد تم مغلوب واقع ہو

گے اور دوزخ کی طرف اٹھا کر لے جائے جاؤ گے......) شاید اسی بنیاد پر اس کے بعد والی آیت میں اہل کتاب و مشرکین کو یکجا مخاطب قرار دے کر یوں کہا گیا: "قُلْ لِّلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ وَالْاُمِّیّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ......" (کہہ دیجئے ان لوگوں سے جنہیں کتاب دی گئی اور جو امی (مکہ والے مشرکین) ہیں کہ آیا تم اسلام لائے؟......) اس میں بھی تہدید اور دھمکی آمیز لہجہ اختیار کیا گیا ہے۔

محاجہ کی صورت میں خدائی فرمان

○ "فَاِنْ حَآجُّوْکَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِیَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ......"
(اگر وہ آپ سے محاجہ کریں تو کہہ دیجئے کہ میں اور جس نے میری پیروی کی اپنا رخ اللہ کی طرف کر لیا......)

اس آیت مبارکہ میں جملہ "حَآجُّوْکَ" (وہ آپ سے محاجہ و بحث کریں) میں ضمیر مستتر "ھم" (وہ) کی بازگشت اہل کتاب کی طرف ہے اور یہ ایک نہایت واضح و روشن مسئلہ ہے اور ان کے محاجہ اور نزاعی بحث کرنے سے مراد یہ ہے کہ وہ اختلاف کرنے کی بابت کہتے ہیں کہ ہمارا اختلاف کرنا واضح خدائی بیان آنے کے بعد سرکشی و طغیان کی بناء پر نہیں بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ ہماری عقول و افہام...... عقلیں اور فہم و ادراک کی قوتیں ......اور دینی حقائق سے آگاہ ہونے کے لئے کئے جانے والے ہمارے اجتہاد نے ہمیں اختلاف کرنے کی راہ پر لگایا ہے اور ہماری عقل و فہم اور اجتہاد نے ہمیں جس دین و مسلک سے روشناس کرایا ہے ہم اس کی بناء پر خدا کے حضور سر تسلیم خم کرتے ہیں اور اے محمدؐ! جس چیز کو آپ درست قرار دیتے ہیں اور اس کی طرف آنے کی دعوت دے رہے ہیں وہ بھی اسی باب سے ہے......یعنی ہم نے جسے درست سمجھا ہم اس کی پیروی کرتے اور اس کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے ہیں اور آپ جس راہ کو درست سمجھتے ہیں اس کی طرف دعوت دیتے ہیں...... (گویا وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ ہم دونوں ایک ہی خدا کو مانتے ہیں البتہ راہ و روش اور طریقۂ فہم میں فرق کی وجہ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں)۔ ان کے بیان سے ہم نے جو مطلب سمجھا ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ خداوند عالم نے ان کے جواب میں آنحضرتؐ کو ارشاد فرمایا: "فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِیَ لِلّٰهِ" کہہ دیجئے کہ میں نے اپنا رخ اللہ کی طرف کر لیا ہے ...... اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیا، خدا کے حضور سر تسلیم خم کر دیا ہے۔ اور "وَقُلْ لِّلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ وَالْاُمِّیّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ" (اور کہہ دیجیے اہل کتاب اور امیین و مشرکین مکہ) سے کہ آیا تم اسلام لائے ہو، تم نے اپنا رخ اللہ کی طرف کر لیا

ہے؟......تم نے خدا کے حضور سر تسلیم خم کر دیا ہے؟...) ان دو جملوں میں ان کا محاجہ اور نزاعی بحث کرنے کی بنیاد ہی توڑ دی گئی ہے نہ یہ کہ ان سے بحث کرنے سے روگردانی کی گئی ہو،

بہر حال آیت کا معنی، اس کے ماقبل آیات سے ربط کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ ہوگا کہ : اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے، خدا نے جو کتابیں نازل فرمائی ہیں ان میں اس حوالہ سے کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا اور نہ ہی عقل سلیم اس کی بابت کسی طرح سے شک کرتی ہے، اس مسلمہ حقیقت کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ (اے رسول!) تیرے اسلام اور دین خداوندی پر عمل کرنے والا ہونے کے خلاف کوئی ثبوت موجود نہیں، اس کے باوجود اگر وہ آپ سے بحث و نزاع اور محاجہ کریں تو کہہ دیجئے کہ میں نے اپنا رخ اللہ کی طرف کر لیا ہے اور اس نے بھی جس نے میری پیروی کی! (فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ) اور یہی دین خداوندی ہے اور اس کے بعد اس کی بابت بحث و نزاع کی کوئی گنجائش نہیں پائی جاتی۔ اس کے بعد ان لوگوں سے پوچھیئے کہ کیا تم اسلام لائے ہو (ءَاَسْلَمْتُمْ؟) اگر وہ اسلام لا چکے ہوں تو وہ ہدایت یافتہ ہیں اور انہیں چاہیے کہ وہ اسے قبول و تسلیم کریں جو آپ پر اور آپ سے پہلے انبیاء پر نازل کیا گیا ہے کہ اس کے بعد نہ تو ان کے خلاف کوئی حجت قائم ہو گی اور نہ ہی آپ کے اور ان کے درمیان کسی بحث و نزاع کی ضرورت باقی رہے گی، لیکن اگر وہ اسلام نہ لائیں اور دین خداوندی کی پیروی سے روگردانی کریں تو ان سے نزاع و بحث نہ کرو اور نہ ہی ان سے محاجہ و مناظرہ کرو کیونکہ ایک واضح و روشن اور ناقابل انکار و مسلم الثبوت امر کی بابت بحث کرنے کی ضرورت ہی نہیں، اور وہ امر یہ ہے کہ دین، خدا کے حضور سر تسلیم خم کر دینے اور اپنے آپ کو سراپا اس کے سپرد کر دینے ہی سے عبارت ہے۔ اور اس مطلب سے آگاہی دلانے اور بات پہنچا دینے کے علاوہ آپ پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ (وَمَا عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ)

ایک اہم نکتہ

اس آیہ مبارکہ میں خداوند عالم نے اہل کتاب اور امیین (مشرکین مکہ) دونوں کو یکجا طور پر مخاطب قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: "وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ" (اور اہل کتاب اور امیین سے کہہ دو کہ آیا تم اسلام لائے ہو؟)۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدائی دین سب کے لئے یکساں ہے اس میں مشرکین و غیر مشرکین سب اشتراک رکھتے ہیں اور ان کا توحید و تشریک کے حوالہ سے مختلف ہونا اصل دین میں تبدیلی پیدا نہیں کر سکتا، لہٰذا سب کو چاہیے کہ وہ دین خداوندی کو تسلیم کریں اور اس کے سامنے سر تسلیم خم ہو جائیں۔

دوسرا اہم نکتہ

آیت مبارکہ میں ایک اور اہم نکتہ قابل توجہ ہے اور وہ یہ کہ اس میں اسلام کو "وجــه" یعنی چہرہ یا رخ وسمت کے ساتھ متصل ومرتبط قرار دے کر ذکر کیا گیا ہے، "وجه" کسی چیز کی اس سمت کو کہتے ہیں جو آپ کے سامنے اور روبرو ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں "وجه" سے اس کا خاص معنی یعنی چہرہ مراد ہو، کیونکہ رخ اور چہرے کا بہ سوئے خدا ہونا گویا تمام حواس اور اعضاء وجوارح کا بہ سوئے خدا ہونا ہے اور اس سے پورے بدن کا اسلام مراد ہوگا، اور چہرہ کا خدا کے حضور ہو جانا دراصل رب تعالیٰ کے اوامر پر پوری طرح سر تسلیم خم ہو جانا ہے۔

(رخ کا کسی سمت ہونا ایک محاورہ ہے جس سے عموماً پوری توجہ وکامل التفات مراد لیا جاتا ہے، اس طرح کے محاورے عرب زبان میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔م)

تیسرا اہم نکتہ

آیت مبارکہ میں تیسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ " اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ " (میں نے اپنا رخ اللہ کی طرف کرلیا ہے) کے بعد حرف عطف کے ساتھ یوں کہا گیا: " وَمَنِ اتَّبَعَنِ " (اور جس نے میرا اتباع کیا)، یعنی میں نے اور اس نے کہ جس نے میرا اتباع کیا اپنا رخ اللہ کی طرف کرلیا ہے (اسلام)، اس میں یہ نکتہ ملحوظ ہے کہ آنحضرتؐ کی پیروی کے خدائی نظام کی عملی پاسداری ہو اور آپؐ کی عظمت واحترام کا اعتقادی وعملی مظہر سامنے آئے۔

دعوتِ اسلام کی ایک مخصوص صورت!

○ " وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ......"

(اور کہہ دیجئے ان سے کہ جنہیں کتاب دی گئی اور امیین سے، کیا تم اسلام لائے ہو......)

اس آیت میں " امیــن " سے مراد مشرکین ہیں۔ انہیں "امیــن" کے نام سے موسوم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہاں ان کے مقابلے میں جن کا تذکرہ ہوا ہے انہیں "اہل کتاب" سے موسوم کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ اہل کتاب خود بھی انہیں (مشرکین کو) اسی نام سے موسوم کرتے تھے جیسا کہ درج ذیل آیت مجیدہ میں خداوند عالم

نے اہل کتاب کا بیان ذکر فرمایا ہے:

سورۂ آل عمران، آیت: ۷۵

○ "لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ"

(ہمارے لئے امیین کی بابت کوئی باز پرس نہیں ہو سکتی)

یہاں "امی" سے ان کی مراد وہ شخص ہے جو لکھنا اور پڑھنا نہ جانتا ہو۔

(بظاہر اہل کتاب کا مشرکین کو اس نام سے موسوم کرنا طنزاً اور حقارت کی بنیاد پر تھا اور اس سے ان کی مراد اہل مکہ تھے) م۔

اس آیت شریفہ میں خداوند عالم کا ارشاد گرامی: " فَإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ ۗ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ " درج ذیل چند اہم نکات کی نشاندہی کرتا ہے:

(۱) مشرکین کے ساتھ بحث و مباحثہ میں سخت گیری اور لجاجت اور تندی و شدت اختیار نہ کی جائے کیونکہ بدیہی و مسلم الثبوت (ضروری) امور کا انکار کرنے والے شخص کے ساتھ مباحثہ و مناظرہ لجاجت و بے نتیجہ بحث کے سوا کچھ نہیں۔

(۲) لوگوں کے بارے میں فیصلہ و اظہار رائے کا علی الاطلاق حق صرف خداوند عالم کو حاصل ہے اور حضرت پیغمبر اسلام کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ وہ خدا کے احکام و پیغامات لوگوں تک پہنچائیں۔ آپؐ لوگوں پر مسلط و نگران اور استقلالی حیثیت میں حکمران نہیں ہیں چنانچہ اس سلسلہ میں ارشاد خداوندی ہے:

سورۂ آل عمران، آیت: ۱۲۸

○ "لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ"

(آپ کو ..... استقلالی طور پر ..... کوئی حاکمانہ اختیار حاصل نہیں ہے)

○ "لست عليهم بمسيطر"

(تو ان پر مسلط و نگران نہیں ہے)

(۳) اس آیت میں اہل کتاب اور مشرکین کو انتباہ و تہدید ہوئی ہے کیونکہ آیت کا اختتامی جملہ یہ ہے: " وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ " (اور اللہ بندوں سے پوری طرح آگاہ و باخبر ہے) جبکہ اس سے پہلے یہ فقرہ ذکر ہوا ہے: " فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ " (آپ پر تو صرف پہنچا دینا ہے) ...... اس کے علاوہ آپ کی ذمہ داری کچھ نہیں ......، ان دونوں جملوں کے یکے بعد دیگرے ذکر کرنے سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ خداوند عالم اہل کتاب اور مشرکین کو خبردار کرنا چاہتا ہے۔ اسی طرح کے

انتباہ وتہدید کی ایک مثال درج ذیل آیت شریفہ میں بھی ملتی ہے:

سورۂ بقرہ، آیت: ۱۳۷

○ "قُولُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰہِ ..... (تا) وَنَحْنُ لَہٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِہٖ فَقَدِ اھْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا ھُمْ فِیْ شِقَاقٍ ۚ فَسَیَکْفِیْکَھُمُ اللّٰہُ ۚ وَھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ"

(ان سے کہہ دو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر ..... اور ہم اس کے سامنے سرتسلیم خم کئے ہوئے ہیں، اگر وہ اسی طرح ایمان لائیں جس طرح تم اس پر ایمان لائے ہو تو پس وہ ہدایت یافتہ ہو گئے، اگر وہ روگردانی کریں تو وہ خود ہی بدبختی میں مبتلا ہوئے، بہت جلد خدا تمہیں ان کے مقابلے میں کفایت کرے گا اور وہ سننے والا اور دانا و آگاہ ہے)۔

اس آیت میں اہل کتاب کے بارے میں متوجہ کیا گیا ہے کہ وہ اگر اسلام سے روگردانی کریں تو وہ اپنی مخالفانہ روش پر مصرانہ طور پر باقی رہیں گے۔ اس کے بعد خداوند عالم ان اہل کتاب سے تہدید و انتباہ کی صورت میں اس طرح خطاب کرتا ہے جس سے حضرت رسول خداؐ کے دل کو تسلی و اطمینان نفس حاصل ہو جائے، بنابراین آیہ مبارکہ میں فقرہ: "وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْکَ الْبَلٰغُ" آنحضرتؐ سے فرمایا گیا کہ آپ ان کا معاملہ خدا کے سپرد کر دیں کہ وہ اپنے بندوں کے بارے میں زیادہ آگاہی رکھتا ہے۔ وہ ہر شخص کے بارے میں وہی حکم و فیصلہ کرتا ہے جس کا وہ حقدار ہوتا ہے اور اس کی طبع وجودی عملی حوالہ سے اس کی متقاضی ہوتی ہے۔

اس بیان سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ بعض مفسرین کا یہ قول قرین صحت نہیں کہ یہ آیت دین میں آزادیٔ عقیدہ پر دلالت کرتی ہے اور یہ کہ دین میں اکراہ و جبر کی نفی کا ثبوت فراہم کرتی ہے کیونکہ اس آیہ شریفہ میں اس موضوع کے علاوہ دیگر امور کا بیان مطلوب و مقصود قرار پایا ہے۔

آیہ مبارکہ میں فقرہ "بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ" میں "بصیر بھم" (ان سے آگاہ ہے) یا "بصیر بالناس" (لوگوں سے آگاہ ہے) کی بجائے بندوں سے آگاہ ہونے کا بیان اس امر کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ خدا کا حکم و فیصلہ لوگوں پر نافذ العمل ولازم الاجراء ہے کیونکہ وہ اس بندے ہیں اور اس کی درسگاہ فطرت کے پروردہ و تربیت یافتہ ہیں خواہ وہ اس حقیقت کو تسلیم کریں یا روگردانی کریں۔

آیات الٰہی کا انکار کرنے والے

○ " اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ......"

(جو لوگ آیات خداوندی کا انکار کرتے ہیں۔۔۔)

اس آیہ مبارکہ میں اگرچہ ایک نئے موضوع کا بیان مقصود وملحوظ ہے اور اس کا تعلق ایک جدید و مستقل مطلب سے ہے لیکن اس کے باوجود اس میں سابقہ آیت مبارکہ کے آخری فقرے میں مذکور انتباہ وتہدید کی طرف اشارہ وتوجہ بھی دلائی گئی ہے کیونکہ اس آیت شریفہ کا مضمون اہل کتاب بالخصوص یہودیوں پر منطبق ہوتا ہے اور واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اس میں انہی کے بارے میں مطالب ذکر کئے گئے ہیں۔

اس آیہ مبارکہ میں دو جملے ذکر کئے گئے ہیں: "یَکْفُرُوْنَ" (انکار کرتے ہیں)، "یَقْتُلُوْنَ" (قتل کرتے ہیں) اور یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ دونوں اعمال یعنی واضح بیان آ جانے کے بعد دشمنی وبغاوت کی بناء پر آیات خداوندی کا انکار اور انبیاء علیہم السلام کو قتل کرنا جو کہ بلاشبہ ناحق قتل ہے اور اسی طرح ان لوگوں کو قتل کرنا جو عدل وانصاف اختیار کرنے کی دعوت دیتے ہیں اور ظلم وبغاوت اور دشمنی سے روکتے ہیں ان (اہل کتاب بالخصوص یہودیوں) کی دیرینہ عادت ہے چنانچہ یہود کی تاریخ اس طرح کے خونین جرائم سے بھری ہوئی ہے کہ انہوں نے کثیر تعداد میں اپنے نبیوں اور ان نیک وصالح عبادت گزاروں کو قتل کیا جو انہیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے تھے..... نیکی اور نیک اعمال بجالانے کا حکم دیتے تھے اور برائی وبرے اعمال انجام دینے سے روکتے تھے......، یہی حال نصاریٰ کا تھا کہ وہ بھی یہودیوں کے نقش قدم پر چل کر اس طرح کے گھناؤنے جرائم کا ارتکاب کرتے تھے۔

اس آیت کے آخری جملہ " فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ " (انہیں دردناک عذاب کی خبر دو) میں ان پر خدا کے غضب کا چھا جانا اور خدا کی ناراضگی کا ان کے دامن گیر ہونا واضح طور پر ثابت ومعلوم ہوتا ہے، اور اس سے صرف اخروی عذاب ہی مقصود نہیں ہے بلکہ دنیا وآخرت دونوں کا عذاب ملحوظ ومقصود ہے چنانچہ اس کا ثبوت بعد والے فقروں میں ملتا ہے جس میں یہ الفاظ ذکر کئے گئے ہیں: " اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ......" (یہی وہ لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا وآخرت میں ضائع ہو گئے......) تو انہیں دنیا اور آخرت دونوں جہانوں کے عذاب کی خبر دی گئی ہے، آخرت کے عذاب سے مراد جہنم کی آگ کا دردناک عذاب ہے اور دنیا کے عذاب سے مراد باہمی قتل وغارت گری، دربدر ہونا اور جان ومال سے محرومی ہے۔ اور یہ بھی ان پر خدا کے عذاب کی ایک صورت ہے کہ خداوند عالم نے ان سے اپنی ناراضگی کی

وجہ سے ان کے درمیان قیامت تک باہمی عداوت و دشمنی کی راہیں کھول دیں، ان تمام امور کا واضح تذکرہ کتاب الٰہی میں متعدد آیات کے ضمن میں ہوا ہے۔

اور آیت مبارکہ کے فقرہ " أُولَٰئِكَ الَّذِينَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ " (یہی وہ لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا و آخرت میں ضائع ہوگئے اور کوئی ان کی مدد کرنے والا نہیں) میں دو امور کا ثبوت پایا جاتا ہے:

(۱) جو شخص کسی کو اس بنا پر قتل کرے کہ وہ امر بالمعروف کرتا ہے اور نہی عن المنکر کرتا ہے...... نیکی اور نیک کام بجا لانے کا حکم دیتا ہے یا برائی اور برے اعمال کے ارتکاب سے روکتا ہے...... تو اس کے تمام اعمال برباد ہو جائیں گے،

(۲) وہ قیامت کے دن شفاعت سے محروم ہوگا کیونکہ خداوند عالم نے واضح طور پر ارشاد فرمایا ہے: " وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ " (اور ان کا مددگار کوئی نہیں)۔

اہل کتاب کے بارے میں خصوصی بیان

○ " أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِنَ الْكِتَابِ...... "
(کیا تو نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جنہیں کتاب میں سے کچھ حصہ دیا گیا......)

اس آیہ مبارکہ میں اہل کتاب کے بارے میں تاکیدی طور پر بیان کیا گیا ہے کہ وہ دین حق سے دشمنی پر سختی سے قائم ہیں اور اس سے باز آنے والے نہیں، اسی بناء پر خداوند عالم نے انہیں اہل البغی قرار دیا ہے کہ وہ مخالفت کی راہ اپنا کر دین میں تفرقہ پردازی کے مرتکب ہوتے ہیں اور اختلافات کی آگ بھڑکانے میں مصروف رہتے ہیں، چنانچہ جب انہیں کتاب الٰہی کے فیصلہ کو تسلیم کرنے کی دعوت دی جاتی ہے تو وہ ماننے پر تیار نہیں ہوتے بلکہ انکار اور روگردانی کرنے لگتے ہیں، اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ:

(۱) وہ اپنے اس نظریہ کی بناء پر دھوکہ میں آئے ہوئے ہیں کہ جس کا اظہار وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں: " لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ " (ہمیں دوزخ کی آگ چند دنوں سے زیادہ ہرگز چھو نہیں سکتی)

(۲) اور وہ اپنے دین میں خدا پر تہمت لگانے کے مرتکب ہوئے ہیں۔

اس آیت میں فقرہ " الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِنَ الْكِتَابِ " (وہ کہ جنہیں کتاب سے کچھ دیا گیا) سے مراد اہل

کتاب ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ خداوند عالم نے یہ کیوں نہیں فرمایا: "الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ" (وہ کہ جنہیں کتاب دی گئی) بلکہ یہ کہا: "الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ" (وہ کہ جنہیں کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا)؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ان کے پاس کتاب میں سے جتنا کچھ ہے وہ ساری کتاب نہیں بلکہ کتاب کا کچھ حصہ ہے کیونکہ انہوں نے کتاب الٰہی میں اس قدر تحریف کی اور اس میں تبدیلیاں لا کر ردوبدل کیا کہ اس کے کثیر حصے ضائع ہو گئے جیسا کہ اس کا اشارہ ذیلی آیت کے آخری فقرے میں اس طرح ہوا: " وَغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ " (اور انہوں نے دھوکہ دیا ان کے دین میں اس چیز نے جو افتراء پردازی کرتے تھے)۔

بہرحال مقصود یہ ہے..... واللہ اعلم..... کہ وہ (اہل کتاب) خدا کی کتاب کے فیصلہ سے اس لئے روگردانی کرتے ہیں کہ وہ جس چیز کے قائل ہیں اس نے انہیں دھوکہ میں ڈال دیا ہے، وہ اس من گھڑت وخودساختہ نظریہ کی وجہ سے مغرور ہو چکے ہیں اور پھر اسی کی بناء پر اپنے آپ کو کتاب الٰہی سے بے نیاز سمجھنے لگے۔

اہلِ کتاب کا غلط نظریہ

O " ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ......"

(یہ سب اس لئے ہے کہ وہ کہتے ہیں ہمیں آگ نہیں چھوئے گی......)

آیت کا معنی واضح ہے، اور یہاں اہل کتاب کا خود اپنے افتراء وجھوٹ اور غلط بیانی ہی سے دھوکہ میں آ جانا مذکور ہے کہ جس چیز کو خود ہی انہوں نے اپنے لئے نظریہ وعقیدہ کی حیثیت دی اسی کے سبب وہ دھوکہ کا شکار ہوئے جبکہ عام طور پر کوئی شخص خود اپنے آپ سے دھوکہ نہیں کھاتا بالخصوص جب وہ یہ جانتا بھی ہو کہ اس کا نظریہ، دھوکہ وباطل اور جھوٹ کے سوا کچھ نہیں، تو آیت مبارکہ میں اس سے مراد یہ ہے کہ دھوکہ کھانے والے افراد، جھوٹ وافتراء پردازی کرنے والوں سے مختلف ہیں، جن لوگوں نے دھوکہ کھایا وہ ان لوگوں کی نسل وقوم کے افراد ہیں جنہوں نے جھوٹ، دھوکہ اور باطل نظریہ قائم کیا لیکن آیت میں صرف دھوکہ کھانے والوں کے حوالہ سے اہل کتاب کا قول اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ وہ سب یعنی اسلاف اور ان کی نسلیں دراصل ایک ہی امت وملت قرار پائے اور بعد میں آنے والی نسلیں اپنے اسلاف کے اعمال پر راضی ہوئیں، خداوند عالم نے دونوں فریقوں کو اہل کتاب کے عنوان سے یاد کیا اور ان کے اپنے ہی من گھڑت نظریہ سے دھوکہ میں

آ جانے کا مشترکہ ذکر کیا، اس بناء پر افتراء پرداز افراد اور ان کی نسل سے وہ لوگ جو ان کے نقش قدم پر چلے اور ان کے عقائد و نظریات سے پورا پورا اتفاق کیا اور راضی ہوئے سب کی حیثیت یکساں ہے اور سب ایک ہی امت کہلاتے ہیں......

اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ کوئی شخص خود اپنے آپ سے دھوکہ کھائے اور وہ بھی ایک غلط و نادرست مطلب سے کہ جسے وہ خود بھی جانتا ہو کہ یہ غلط، جھوٹ، من گھڑت اور باطل ہے اور اس غلط بیان کی بابت خود اعتراف و اقرار بھی کرتا ہو کہ اس نے خود سے گھڑا ہے، تو اس طرح کے امور اہل کتاب بالخصوص یہودیوں سے ہرگز بعید و غیر متوقع نہیں، اور انہی کے متعلق خداوند عالم نے اس طرح کے نظریات و اعمال بلکہ ان سے بھی زیادہ عجیب امور کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

سورۂ بقرہ، آیت: ۷۷

O " وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَاۗجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۝ "

(اور جب وہ ایمان لانے والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم ایمان لائے ہیں، اور جب ایک دوسرے سے خلوت میں ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ تم کیوں ایمان لانے والوں کو اس چیز سے آگاہ کرتے ہو جسے خدا نے تمہارے لئے کھول کر بیان کیا ہے وہ تو اس کے حوالہ سے تمہارے رب کے پاس تمہارے خلاف بیان دیں گے، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟ آیا وہ (اہل کتاب) یہ نہیں جانتے کہ خدا اس چیز سے باخبر ہے جسے وہ چھپاتے ہیں اور جسے وہ ظاہر کرتے ہیں (خدا ان کے ظاہری اظہار اور باطنی نظریات سے آگاہ ہے)۔

اس کے علاوہ جو اہم نکتہ قابل توجہ ہے وہ یہ کہ عام طور پر انسان کے اعمال و افعال کی بنیاد اس کی لوحِ نفس پر ثبت ہونے والے وہ ملکات نفسانیہ اور خاص رجحانات پر مبنی صورتیں و کیفیات ہوتی ہیں کہ جو اس کی نگاہِ نفس کو خیرہ کر چکی ہوتی ہیں، نہ کہ وہ امور کہ جن کی بابت اسے علم و آگاہی حاصل ہوتی ہے اس کی مثال اس شخص سے دی جا سکتی ہے جو مضر صحت اور نقصان دہ اشیاء استعمال کرتا ہے مثلاً بھنگ پیتا ہے، تمباکو نوشی کرتا ہے، مٹی کھاتا ہے اور اس طرح کی دیگر چیزیں جیسے چرس وغیرہ استعمال کرتا ہے، وہ ان اشیاء کے مضر ہونے سے آگاہ ہوتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ مضر اور نقصان دہ اشیاء کے استعمال سے اجتناب کرنا چاہیے لیکن اس کے باوجود وہ ان اشیاء کو استعمال میں لاتا ہے تو اس کی وجہ اس کے نفس اور باطن میں پیدا ہو جانے والی لذت بخش و پرکشش صورتیں ہیں جو اسے ان اشیاء کی طرف رغبت دلاتی ہیں اور اسے ان سے اجتناب و دوری اختیار کرنے کی بابت سوچنے بھی نہیں دیتیں۔ اس طرح کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں۔

مذکورہ بالا مثال کے تناظر میں اہل کتاب کے اعمال کو دیکھیں تو صورتحال پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ وہ تکبر، ظلم اورنفسانی خواہشوں کی زنجیروں میں جکڑے ہوں ہونے کی وجہ سے ہر وہ کام انجام دینے کی جرأت کر لیتے ہیں جس کی دعوت وترغیب انہیں ان کا نفس دلاتا ہے اوران کی جھوٹی انا انہیں اس کام کی انجام دہی کی راہ دکھاتی ہے۔تو دراصل ان کے غلط و نادرست نظریات اورخودساختہ وخود بافتہ افکار ہی ہیں جوان کی دینی تباہی کا باعث ہوئے ہیں۔اس کے باوجودوہ اپنے جھوٹ وافتراءاورخداوندعالم پردینے والی ناروانسبتوں کے بار بارانجام دینے کے مرتکب ہوئے اوراب تک ہورہے ہیں اورصرف اپنی غلط ونادرست روش پرقائم ہی نہیں بلکہ اس کی صحت ودرستی کے بارے میں اپنے آپ کو سمجھاتے اوریقین دلاتے رہتے ہیں کہ ان کا اس طرح اپنے آپ کوتاکیدی توجہ دلانا علم الیقین کی منزل تک پہنچا دیتا ہے چنانچہ علم النفس کے ماہرین بھی اسی طرح کی تاکیدی ومکرردرمکرر توجہات کوعلمی آثار کا موجب قرار دیتے ہیں، بنابرایں افتراء پردازی جوکہ ایک ناحق وباطل عمل ہےاس کا باربارانجام دینا اوراس کے بارے میں اپنے آپ کوتاکیدی توجہ دلانا اس امر کاسبب بنا کہ وہ اس کے دھوکہ میں آ گئے اوراپنے دین میں کجی وکجروی اختیار کرگئے اورصرف یہی نہیں بلکہ ان کی افتراء پردازی انہیں خداوندعالم کے حضورسرتسلیم خم کرنے اوراس حق کی عملی اطاعت سے مانع ہوئی جسے خداوندعالم نے اپنی کتاب میں نازل فرمایا۔(اہل کتاب بالخصوص یہود کی دینی تباہی خودان کے اپنے ہاتھوں ہوئی اوروہ من گھڑت اورخودساختہ نظریات وعقائد کی بناء پرحق کی راہ سے دور ہوگئے اورپھردین الٰہی واحکام خداوندی کی پیروی سے منہ موڑنا ان کی عادت ہوگئی)۔

قیامت کے دن کی یاددہانی

○ " فَكَيْفَ إِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيهِ...... "

(توان کا کیا حال ہوگا اس دن جب ہم انہیں اکٹھا کریں گے کہ جس میں کوئی شک نہیں... ...)

اس آیت مبارکہ میں حرف "کیف" (کیا، کس طرح، کیسے) ذکر ہوا ہے جو بعد والے حرف "اِذَا" کے ساتھ دراصل اس طرح ہے: " فکیف یصنعون " (وہ کیا کریں گے، کس طرح کریں گے، کیسے کریں گے)؟ اور جملہ "یصنعون" کلام میں مذکور نہیں بلکہ تفہیم معنی کے لئے فرض کیا جاتا ہے۔

آیت میں ان لوگوں کو انتباہ کیا گیا ہے جو حق کی پیروی سے روگردانی کرتے ہیں اور جب انہیں اس بات کی دعوت دی جاتی ہے کہ کتاب الٰہی کی تعلیمات ودستورات کو اپنائیں اوراسے ہی عقیدہ وعمل کا معیار قرار دیں تو وہ منہ پھیر لیتے ہیں،

البتہ یہاں چونکہ اصل بیان یہ مقصود ہے کہ وہ خداوند عالم کو ہرگز بے بس و عاجز نہیں کر سکتے، اور نہ ہی اپنے اس دعوے میں سچے ہیں کہ انہیں دوزخ کی آگ چند دنوں سے زیادہ چھو نہیں سکتی، لہٰذا کلام میں ان کی اس حالت کا تذکرہ ہوا ہے جس سے قیامت کے دن وہ دوچار ہوں گے اور وہ اس دن نہایت ذلت کے ساتھ حکم و فیصلہ خداوندی کے سامنے سرنگم ہوں گے، جبکہ دنیا میں جب انہیں کتاب اللہ کے حکم و فیصلہ کی طرف بلایا جاتا تھا تو وہ اس سے روگردانی کرتے تھے اور غرور و تکبر اختیار کرتے ہوئے حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنے سے سرتابی کرتے تھے۔ اس بناء پر کلام میں تقابلی لطافت ملحوظ رکھی گئی اور قیامت کے دن ان پر طاری ہونے والی حالت و کیفیت کے بیان میں یوں کہنے کی بجائے: " اذا احییناھم او بعثناھم " (جب ہم انہیں زندہ کریں گے، یا جب ہم انہیں قبروں سے اٹھائیں گے اس طرح کہا گیا: " إِذَا جَمَعْنَٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيهِ......" (جب ہم انہیں اکٹھا کریں گے اس دن جس میں کوئی شک نہیں تو فقرہ "جب ہم انہیں اکٹھا کریں گے " سے اس امر کا اظہار مقصود ہے کہ وہ یعنی اہل کتاب خدا کو عاجز و بے بس نہیں کر سکتے بلکہ خدا انہیں عاجز و بے بس کر دے گا۔

بہر حال آیت مبارکہ کا معنی...... واللہ اعلم ..... یہ ہے کہ "جب کفار کو کتاب الٰہی سے رجوع کرنے کی دعوت دی جاتی تاکہ وہ ان کے درمیان حکم و فیصلہ کرے تو انہوں نے منہ موڑا کیونکہ وہ اس چیز کے ذریعے دھوکہ میں آ گئے جس کا انہوں نے اپنے دین میں افتراء کیا (غلط طور پر اسے دین قرار دیا) اور حق کو تسلیم کرنے سے سرتابی کی تو اس دن وہ کیا کریں گے جب ہم انہیں اکٹھا کریں گے کیونکہ وہ دن ایسا ہے جس کی بابت کوئی شک وشبہ نہیں پایا جاتا، وہ دن حتمی فیصلہ کا دن ہے، وہ دن حق کی حاکمیت کا دن ہے، اس دن ہر شخص کو اس کے کیے کا پورا پورا بدلہ ...... جزا و سزا...... دیا جائے گا، اس دن عدل و انصاف پر مبنی فیصلہ ہوگا، اس دن کسی پر کوئی زیادتی اور ناروا سلوک نہیں کیا جائے گا، تو جب اس دن کی کیفیت اس طرح ہوگی تو ان لوگوں کو چاہیے کہ حق سے روگردانی نہ کریں اور نہ ہی حقیقت و کتاب الٰہی سے منہ موڑیں اور اس طرح کے اظہارات سے اجتناب کریں کہ وہ خدا کو بے بس کر سکتے ہیں اور اس کے حکم و فیصلہ پر غلبہ پا سکتے ہیں۔ بلکہ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہر طرح کی طاقت وقدرت خدا سے مخصوص ہے، وہی قدرت و غلبہ کا سرچشمہ و محور ہے، اور یہ دنیاوی زندگی در اصل چند دنوں کی مہلت اور آزمائش و امتحان کے سوا کچھ نہیں۔

روایات پر ایک نظر

دین کی حقیقت

تفسیر العیاشیؒ میں مذکور ہے محمد بن مسلم نے امامؑ سے دریافت کیا کہ اس آیت سے کیا مراد ہے؟ " اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَاللّٰہِ الْاِسْلَامُ " (اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے)

امامؑ نے ارشاد فرمایا: " الذی فیہ الایمان " اس سے مراد وہ اسلام ہے جس میں ایمان ہو۔

ملاحظہ ہو(تفسیر العیاشی جلد ۱ صفحہ ۱۶۶ حدیث ۲۲)

ولایت علی ابن ابی طالبؑ

ابن شہرآشوب نے اپنی کتاب "المناقب" میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کا ارشاد گرامی ذکر کیا ہے کہ آپؑ نے آیہ مبارکہ " اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَاللّٰہِ الْاِسْلَامُ " (اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے) کی تفسیر میں ارشاد فرمایا: "التسلیم لعلی بن ابی طالب بالولایۃ" اس سے مراد علیؑ بن ابی طالبؑ کی ولایت کو تسلیم کرنا ہے۔

(مناقب شہرابن آشوب جلد ۳ صفحہ ۹۵)

امامؑ کا فرمان کہ اسلام سے مراد علیؑ بن ابی طالبؑ کی ولایت کو تسلیم کرنا ہے، دراصل موضوع کے ایک تطبیقی مصداق کا اظہار ہے اور اس کے ایک واضح مصداق کی نشاندہی کی ایک صورت ہے، شاید ماقبل روایت کہ جس میں امامؑ نے محمد بن مسلم کے سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ اسلام سے مراد وہ ہے کہ جس میں ایمان ہو، وہ بھی "الـجـری" یعنی ایک واضح مصداق کی تطبیقی نشاندہی کے طور پر ہو۔

امام علیؑ کے ارشاد گرامی کا اتفاقی ذکر

ایک روایت ہے کہ میں امام محمد باقر علیہ السلام نے امام علیؑ کے ارشاد گرامی کا حوالہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ انہوں نے اسلام کی وضاحت میں یوں کہا:

" لانسبن الاسلام نسبة لم ینسبها احد قبلی ولا ینسبها احد بعدی : الاسلام هو التسلیم، والتسلیم هو الیقین، والیقین هو التصدیق، والتصدیق هو الاقرار، والاقرار هو الاداء، والاداء هو العمل، المؤمن اخذ دینهٗ عن ربه، ان المؤمن یعرف ایمانهٗ فی عمله، وان الکافر یعرف کفرهٗ بانکاره، ایها الناس! دینکم دینکم فان السیئة فیه خیر من الحسنة فی غیره، ان السیئة فیه تغفر، وان الحسنة فی غیره لاتقبل " (اصول کافی، ج۲، ص۴۵)

" میں اسلام کی طرف ایسی نسبت دیتا ہوں (ایسا تعارف کرواتا ہوں) جو مجھ سے پہلے کسی نے نہیں دی اور نہ میرے بعد کوئی دے گا، اسلام عین تسلیم ہے، تسلیم عین یقین ہے، یقین عین تصدیق ہے، تصدیق عین اقرار ہے، اقرار عین اداء ہے، اداء عین عمل ہے، مؤمن اپنا دین اپنے پروردگار سے لیتا ہے، مؤمن کا ایمان اس کے عمل میں دیکھا جاتا ہے اور کافر کا کفر اس کے انکار سے دکھائی دیتا ہے۔ اے لوگو! اپنے دین پر عمل کرو، اپنے دین کا خیال کرو، دین کے دائرہ میں رہ کر گناہ کرنا بے دینی میں رہ کر نیکی کرنے سے بہتر ہے کیونکہ اگر دیندار ہوتے ہوئے گناہ سرزد ہو جائے تو اس کی معافی کا امکان موجود ہوتا ہے جبکہ بے دینی کے ساتھ نیکی کرنا قابل قبول نہیں ہوتا "۔

وضاحت: امام علیؑ کے فرمان " میں اسلام کی طرف ایسی نسبت دیتا ہوں " میں نسبت سے مراد تعریف و پہچان کروانا ہے۔ جیسا کہ سورۂ اخلاص " قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ..... " کو بعض روایات میں " **سورة نسبة الرب** " رب کی نسبت کی سورت کا نام دیا گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں رب یعنی خدا کی تعریف اور اس کی پہچان کروائی گئی ہے، امامؑ نے اسلام کی تعریف یعنی تعارف میں جو فقرے ذکر کئے ہیں ان میں سے پہلے فقرہ (**الاسلام هو التسلیم**، اسلام عین تسلیم ہے) میں اسلام کی لفظی تشریح و توضیح ہے اور ایک لفظ کی پہچان دوسرے اس لفظ سے کروائی گئی ہے جو اس سے زیادہ واضح ہے، اور دوسرے فقروں میں اسلام کی تعریف و تعارف اور اس کی پہچان اس کے لازمی امور کے ذریعے کروائی گئی ہے..... کیونکہ یقین، تصدیق، اقرار، اداء اور عمل درحقیقت اسلام کے لازمی اور ناقابل جدائی امور ہیں، جیسے آگ کے لئے حرارت و گرمی، اور برف کے لئے برودت و ٹھنڈک......، یہاں یہ بھی ممکن ہے کہ اسلام سے اس کا لفظی و لغوی معنی مراد نہ ہو بلکہ اصطلاحی معنی

مراد ہو یعنی وہ دین کہ جسے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لے کر آئے کہ جس کا اشارہ اس آیہ مبارکہ " اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ " میں ہوا ہے۔ اور امامؑ کے فرمان میں "تسلیم" سے خدا کے مقرر کردہ آئین زندگی پر ظاہراً و باطناً اور قول و فعل دونوں میں اطاعت و فرمابرداری مراد ہو، تو اس طرح امام علیؑ کے بیان کردہ تمام فقروں میں اسلام کا تعارف اس کے لازمی امور کے ذریعے قرار پائے گا۔

اس بیان کی بنائر پر حدیث کا معنی یہ ہوگا: یہ دین کہ جسے اسلام کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اس بات کا متقاضی ہے کہ انسان خداوند عالم کے حضور ظاہراً و باطناً اور گفتار و کردار دونوں میں سر تسلیم خم کر دے اور خود اور اپنے اعمال کو خدا کے امر و ارادہ کے ماتحت و تابع بنا دے کہ یہی "تسلیم" ہے، "تسلیم" اور ہر حوالہ سے اپنے آپ کو خدا سے وابستہ کرنے کا نتیجہ یا لازمی امر اللہ پر یقین رکھنا اور اس کی بابت ہر طرح کے شک کا دل سے دور کرنا ہے، اور یقین، تصدیق کی راہ پر لا کھڑا کرتا ہے کہ انسان دین کی صداقت کا اظہار کرتا ہے، تصدیق، اقرار کا پیش خیمہ بنتی ہے کہ جس کا معنی دین کے استحکام اور قرار و ثبات پر کامل یقین اور پختہ اعتقاد رکھنا ہے کہ اس میں کسی طرح کی غیر مستحکم و غیر یقینی صورت نہیں پائی جاتی بلکہ وہ اپنے اصل ٹھکانہ و سرچشمہ سے وابستہ و پیوستہ ہے اور اس سے ہرگز الگ و جدا نہیں ہوسکتا، اس طرح کا اقرار، اداء کی بنیاد فراہم کرتا ہے اور اداء کا لازمی نتیجہ عمل ہے،

اور جہاں تک امامؑ کے اس فرمان کا تعلق ہے کہ " بے دینی کے دائرہ میں رہ کر نیکی کرنا قابل قبول نہیں"، تو اس میں عدم قبولیت سے مراد یہ ہے کہ آخرت میں اس پر کوئی اجر و جزا اور ثواب نہیں ملے گا، یا اس سے مراد یہ ہے کہ اس کی اللہ کے نزدیک کوئی قدر و قیمت نہیں نہ دنیا میں اور نہ ہی آخرت میں اس کا کوئی اچھا اثر ظاہر ہوگا کہ دنیا میں خدا اس کی وجہ سے اس کی زندگی کو سعادتمندی کی نعمت عطا نہیں کرے گا اور آخرت میں بہشت کی نعمت سے نہیں نوازے گا، بنابرایں یہ حدیث کفار کے بارے میں وارد ہونے والی ان احادیث سے متصادم و منافی نہیں جن میں کفار کو ان کی نیکیوں اور اچھے اعمال کی انجام دہی پر دنیاوی جزا و اجر دیئے جانے کا تذکرہ ہوا ہے اور نہ ہی اس قرآنی آیت مبارکہ میں مذکور مطلب سے کسی طرح کی نفی کا پہلو پایا جاتا ہے جس میں عمومی ضابطۂ اعمال و جزاء کا بیان ہے (آیت ملاحظہ ہو):

سورۂ زلزال، آیت: ۷

○ " فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ "

(تو جو شخص ذرہ بھر نیک عمل انجام دے وہ اسے دیکھے گا)

بنی اسرائیل کے جرائم کا تذکرہ

تفسیر مجمع البیان میں ابی عبیدہ جراح سے ایک روایت ذکر کی گئی ہے انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں عرض کیا:

یارسول اللہ! " ای الناس اشد عذاباً یوم القیامة "

اے اللہ کے رسول! قیامت کے دن کونسا شخص سب سے زیادہ سخت عذاب میں مبتلا ہوگا ؟

قال (ص): " رجل قتل نبیاً و رجلا امر بمعروف او نهی عن المنکر، ثم قرء: " الذین یقتلون النبیین بغیر حق ویقتلون الذین یأمرون بالقسط من الناس"

حضرت پیغمبر اسلام نے ارشاد فرمایا: قیامت کے دن سب سے زیادہ سخت عذاب میں وہ شخص مبتلا ہوگا جس نے کسی نبی کو قتل کیا یا اس شخص کو قتل کیا جس نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا، اس کے بعد آنحضرتؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: "الذین یقتلون النبیین بغیر حق و یقتلون الذین یأمرون بالقسط من الناس" (جو لوگ نبیوں کو (ناحق) قتل کرتے ہیں اور ان لوگوں کو قتل کرتے ہیں جو لوگوں میں عدل کا حکم دیتے ہیں)۔

ثم قال (ص): یا ابا عبیدة ! قتلت بنو اسرائیل ثلثة واربعین نبیاً فی ساعة فقام مأة رجل واثنا عشر رجلاً من عباد بنی اسرائیل فامروا من قتلهم بالمعروف و نهوهم عن المنکر فقتلوا جمیعاً آخر النهار من ذلک الیوم وهو الذی ذکره الله"

پھر آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا: اے ابو عبیدہ! بنی اسرائیل نے ایک ہی گھنٹہ میں ۴۳ نبیوں کو قتل کیا، جب بنی اسرائیل کے عابدوں نے اس خونین واقعہ کو دیکھا تو ان کے ۱۱۲ افراد کھڑے ہو گئے اور قاتلوں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا مگر ان لوگوں نے اس دن کے آخری لحوں تک سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا، اسی کا ذکر خداوند عالم نے مذکورہ آیت میں فرمایا ہے۔ (تفسیر مجمع البیان جلد ۲ صفحہ ۴۲۳)

مؤلفؒ: اسی مضمون کی حدیث تفسیر درمنثور (جلد ۲ صفحہ ۱۳) میں ابن جریر ہی سے ابن ابی حاتم کے حوالہ سے ابو عبیدہ سے منقول ہے۔

حق کی پیروی کی دعوت

تفسیر ''درمنثور'' میں ابن اسحاق، ابن جریر، ابن منذر اور ابن ابی حاتم کے اسناد سے جناب عبداللہ بن عباس کی روایت منقول ہے جس میں انہوں نے کہا، ایک دن حضرت پیغمبر اسلامؐ یہودیوں کی درسگاہ بیت المدارس تشریف لے گئے جہاں یہودیوں کی کثیر تعداد موجود تھی، آپؐ نے انہیں دعوت الی اللہ دی (حق کی پیروی کی دعوت دی) تو نعمان بن عمرو اور حرث بن زید نے آنحضرتؐ سے پوچھا:

''علیٰ ای دین انت یا محمد'' اے محمدؐ! آپ کس دین پر ہیں ؟

آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا: ''علیٰ ملة ابراهیم و دینه'' میں ابراہیم کے دین وملت پر ہوں،

یہ سن کران دونوں نے کہا: '' ان ابراهیم کان یهودیاً'' ابراہیم تو یہودیت کے دین پر تھے،

آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا: '' فهلما الی التوریٰة فهی بیننا و بینکم''، اگر ایسا ہی ہے تو پھر میرے سامنے تورات لاؤ وہی ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ کردے گی۔

آنحضرتؐ کی بات سن کر انہوں نے تورات پیش کرنے سے انکار کردیا، اس وقت خداوند عالم نے یہ آیت نازل فرمائی: '' اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ اُوۡتُوۡا نَصِيۡبًا مِّنَ الۡكِتٰبِ يُدۡعَوۡنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحۡكُمَ بَيۡنَهُمۡ ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيۡقٌ مِّنۡهُمۡ وَهُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ؀ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ قَالُوۡا لَنۡ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَيَّامًا مَّعۡدُوۡدٰتٍ ۖ وَغَرَّهُمۡ فِىۡ دِيۡنِهِمۡ مَّا كَانُوۡا يَفۡتَرُوۡنَ ؀ '' (کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا کہ وہ کتاب اللہ کی طرف بلائے جاتے ہیں تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے، پھر ان میں سے ایک گروہ روگردانی کرتا ہے جبکہ وہ حق سے منہ موڑنے والے ہیں، وہ اس لئے ایسا کرتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں ہمیں دوزخ کی آگ ہرگز نہیں چھوئے گی سوائے گنتی کے چند دنوں کے، اور انہیں ان کی افتراء پردازی نے انہیں ان کے دین کی بابت دھوکہ میں ڈال دیا ہے)۔

(ملاحظہ ہو :تفسیر درمنثور، ج ۲ ص ۱۴)

اس آیت کی تفسیر میں بعض محدثین نے بیان کیا ہے کہ یہ آیت دراصل رجم کے ایک واقعہ کی بابت نازل ہوئی ہے۔ اس واقعہ کا تذکرہ آیت مبارکہ '' يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ قَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلُنَا يُبَيِّنُ لَـكُمۡ كَثِيۡرًا مِّمَّا كُنۡتُمۡ تُخۡفُوۡنَ مِنَ الۡكِتٰبِ..... '' (اے اہل کتاب، تمہارے پاس ہمارا رسول آ گیا ہے جو ان کثیر مطالب کو تمہارے سامنے واضح کرتا ہے جسے تم کتاب الٰہی سے چھپاتے ہو) (سورہ مائدہ، آیت ۱۵) میں تفصیل سے ذکر ہوگا۔

بہرحال مذکورہ بالا دونوں روایتیں '' خبر واحد'' کے باب سے ہیں کہ جن میں معتبر و قابل قبول ہونے کی قوت و صلاحیت نہیں پائی جاتی۔

آیات ۲۶،۲۷

○ قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۖ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ۖ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ۖ إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۲۶﴾

○ تُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ ۖ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ۖ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۷﴾

ترجمہ

O "کہیے، اے اللہ ! اے کائنات کے مالک! تو جسے چاہتا ہے حکومت واقتدار عطا کرتا ہے اور جس سے چاہتا ہے حکومت واقتدار چھین لیتا ہے، اور تو جسے چاہتا ہے عزت عطا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلت سے دوچار کرتا ہے، تیرے ہی ہاتھ میں خیر ہے، تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے"

(۲۶)

O "تو رات کو دن میں چھپالیتا ہے اور دن کو رات میں چھپالیتا ہے، اور تو مردہ سے زندہ کو نکالتا ہے اور زندہ سے مردہ کو نکالتا ہے، اور تو جسے چاہتا ہے بغیر حساب روزی عطا کرتا ہے"

(۲۷)

تفسیر و بیان

ان دو آیتوں (۲۶ و ۲۷) میں مذکور مطالب سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں ماقبل آیت مبارکہ سے کہ جن میں اہل کتاب بالخصوص یہودیوں کے بارے میں مطالب ذکر کیے گئے ہیں بے ربط قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ وہ آیات یہودیوں کو دنیا و آخرت کے عذاب کی وعید اور انتباہ پر مشتمل ہیں اور یہ بھی عذاب کی ایک صورت ہے کہ خدا نے انہیں حکمرانی و اقتدار سے محروم کر دیا اور انہیں قیامت تک ذلت و بیچارگی سے دوچار کر دیا، ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا اور انہیں زندگی میں بے بسی و عجز اور بے اختیاری و عدم استقلال میں مبتلا کر کے انہیں سیادت و سرداری سے محروم کر دیا۔

اس کے علاوہ یہ نکتہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ اس سورۂ مبارکہ کی تنزیل کا مقصدِ اعلیٰ اس امر کا بیان ہے کہ پورے عالم کی تخلیق و تدبیر خداوند عالم کے دست قدرت میں ہے، وہی حقیقی اقتدار و حاکمیت کا مالک ہے، وہی جسے چاہتا ہے حکومت و اقتدار عطا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے عزت سے نوازتا ہے، خلاصۂ کلام یہ کہ وہی ہے جو جسے چاہے خیر عطا کرتا ہے اور وہی جو جسے چاہے حکومت و اقتدار، عزت و وقار اور ہر طرح کی خیر سے محروم کر دے، بنابرایں زیرِ نظر دو آیتوں (۲۶، ۲۷) اپنے مضمون و موضوع اور متن کے حوالہ سے سورۂ مبارکہ کی غرض و مقصود کے دائرہ سے باہر نہیں۔

بارگاہِ ربوبی میں طلب خیر کی التجاء

O "قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ......"

(کہیے کہ اے اللہ! اے حکومت و اقتدار کے مالک!)

اس آیہ مبارکہ میں خداوند عالم نے اپنے رسول حضرت محمدؐ کو حکم دیا کہ وہ حوادث روزگار اور ناگواریٔ حالات میں

اس سے التجاء کرتے ہوئے اور اس کی پناہ طلب کرتے ہوئے اس کی حاکمیتِ مطلقہ کا اظہار کریں، وہ خدا کہ جس کے ہاتھ میں خیر ہی خیر ہے، اور علی الاطلاق خیر و قدرت کا مالک ہے تاکہ ان موہوم و مذموم خیالات کے آثار سے نجات پائیں۔۔اور محفوظ رہیں۔۔ جو اہل کتاب اور مشرکین میں حق سے روگردانی کرنے والوں اور منافقوں کے دلوں میں موجزن ہیں کہ وہ انہی نظریات و بے بنیاد افکار کی وجہ سے گمراہ و تباہ ہوگئے اور ان کے انہی غلط و ناحق عقائد نے انہیں حق و حقیقت کی راہ سے دور کر دیا کہ انہوں نے اپنے تئیں حاکمیت و عزت اور خداوند عالم سے بے نیازی کے باطل تصورات کو اپنا لیا، وہ اپنے آپ کو ہر چیز کا مالک، ہر چیز پر حاکم، ہر ایک سے زیادہ عزت دار اور خدا سے بے نیاز ہونے کو خود اپنے ساتھ مخصوص قرار دینے لگے، لہٰذا خداوند عالم نے حضرت پیغمبر اسلامؐ کو مخاطب قرار دے کر تمام افرادِ بشر کو فرمان جاری کیا کہ اپنے آپ کو خدا کی پناہ میں قرار دیتے ہوئے اس سرچشمۂ فیض سے طلب خیر کریں اور اس کی حاکمیت مطلقہ کے سایہ میں رہیں جو جسے چاہے بے حساب رزق عطا کرنے والا ہے۔

ملکیت و مالکیت کی بحث

لفظ "مِــلک" (م کے نیچے زیر کے ساتھ) کا معنی مشہور ہے جسے ہم میں سے ہر شخص جانتا ہے اور ہم اپنے روز مرہ کے استعمالات میں اس سے بخوبی آگاہ ہیں بلکہ اس کے اصل معنی و حقیقت کے بارے میں ہم میں سے کسی کو کوئی شک لاحق نہیں ہوتا، البتہ اس کی بابت جو اہم ترین نکتہ قابل توجہ ہے وہ یہ کہ ملکیت و مالکیت کی دو قسمیں ہیں: ایک حقیقی اور دوسری مجازی؛ حقیقی ملکیت سے مراد یہ ہے کہ کوئی چیز مثلاً انسان دوسری چیز میں جس طرح چاہے تصرف کر سکے اور اس سے وجودی طور پر جس طرح بھی ممکن ہو استفادہ کر سکتا ہو، یعنی مالک اپنی مملوکہ شے کو جس طرح چاہے اس کی وجودی صلاحیتوں کے مطابق اس سے کام لے جیسا کہ انسان اپنی قوت بینائی سے جہاں چاہتا ہے کام لیتا ہے اور جہاں چاہتا ہے اس کو کام میں نہیں لاتا، گویا اس کا کام میں لانا اور نہ لانا اس کے اختیار میں ہے، اسی طرح وہ اپنے ہاتھ کے بارے میں جس طرح اور جہاں چاہتا ہے اپنی مرضی و اختیار کے مطابق فیصلہ کرتا ہے، اسی کے ذریعے لین دین کرتا ہے اور لین دین سے ہاتھ روکنے کا اختیار بھی اسے ہی حاصل ہے تو لامحالہ مالک اور اس کی مملوکہ اشیاء کے درمیان اس طرح کا ربط و تعلق حقیقی ملکیت کہلاتا ہے کہ اس میں کسی طرح کی تبدیلی کی ہرگز گنجائش نہیں پائی جاتی، اور اس معنی میں مالک اور اس کی ملکیت کے درمیان پایا جانے والا حقیقی رشتہ نہ تو کبھی ختم ہوتا ہے اور نہ ہی وہ اس سے بے نیاز ہوتا ہے بلکہ ہمیشہ اس کے ساتھ قائم و باقی ہوتا ہے جب تک وہ خود زندہ و موجود اور باقی ہوتا ہے اس کی ملکیت بھی باقی رہتی ہے اور جب وہ دنیا سے چلا جاتا ہے یعنی مر جاتا ہے تو اس کی ملکیت کا رشتہ بھی ختم ہو

جاتا ہے، ایسا نہیں کہ وہ مر جائے اور اس کی وجودی قوتیں اس کی ملکیت میں باقی رہیں، بلکہ اس کی موت ہی سے ان کے درمیان پایا جانے والا تعلق ورشتہ اور مالکانہ حقوق کا رابطہ منقطع ہو جاتا ہے، یا یہ کہ وہ ابھی زندہ ہو مگر اس کی قوتِ بینائی وشنوائی ختم ہو جائے یا اس کی آنکھ نکال دی جائے یا ہاتھ کاٹ دیا جائے تو اس صورت میں حقیقی مالکانہ رشتہ کی بنیاد ہی باقی نہ رہی تو اس کے استعمال کا تصور ہی ممکن نہیں ہوگا، تو معلوم ہوا کہ حقیقی ملکیت اس وقت تک قائم رہتی ہے جب تک مالک موجود ہو اور وہ شے بھی موجود ہو جس کا وہ مالک ہے، خداوند عالم کی مالکیت بھی اسی طرح کی ہے کہ وہ پوری کائنات کا علی الاطلاق مالک ہے اور عالم ہستی کے ذرہ ذرہ پر اس کی مالکانہ حاکمیت ہے، وہ تمام جہان کی ہر چیز اور اس سے مربوط امور کا بلاشرکت غیرے اور ہر لحاظ سے مالک ہے، اسے حق حاصل ہے کہ اپنی مملوکہ اشیاء (موجودات عالم) میں سے جس میں جس طرح چاہے تصرف کرے۔

یہ تو ہے " مِلک "(م کے نیچے زیر کے ساتھ) بمعنی مالکیت کی پہلی قسم، جہاں تک اس کی دوسری قسم کا تعلق ہے یعنی مجازی مالکیت تو اس سے مراد یہ ہے کہ کوئی شے کسی کے اختیار میں قرار پائے اور وہ اس سے استفادہ کرنے کا حق رکھتا ہو، (اسے علمی اصطلاح میں وضعی واعتباری مالکیت کہا جاتا ہے یعنی قرار دی گئی مالکیت!) اس کا معنی یہ ہوا کہ کوئی چیز مثلاً انسان اس تعلق اور مالکانہ حقوق کے رشتہ کی بنیاد پر کسی چیز سے جس طرح چاہے اور جہاں چاہے استفادہ کر سکے کہ جسے معاشرہ کے عقلاء نے معاشرتی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے قائم وتجویز کیا ہو، اس طرح مالکیت دراصل اس حقیقی مالکیت کے تناظر میں قرار دی گئی ہے جو اصل وجود اور اس کے آثار کی بابت پائی جاتی ہے تو عقلاء نے اسی کو ملحوظ رکھتے ہوئے معاشرتی امور میں بھی ایسی مالکیت قرار دی جس کی بنیاد پر عالم ہستی میں پائی جانے والی موجودات سے استفادہ کرتے ہوئے زندگی کی ضرورتوں کی تکمیل ممکن ہو اور انسان اشیاء عالم سے اس طرح کام لے سکے جس طرح اپنے وجود کے اعضاء سے کام لیتا ہے، اور چونکہ اس طرح کا مالکانہ تعلق معاشرتی زندگی کے مسائل حل کرنے کی غرض سے قرار دیا گیا ہے لہٰذا اس کا دائرہ اس حقیقی مالکیت کے دائرہ کی طرح وسیع نہیں جو وجودی اعضاء میں پائی جاتی ہے بلکہ اس میں تبدیلی کا امکان پایا جاتا ہے اور اس کے کسی دوسرے شخص کو منتقل ہونے کی گنجائش موجود ہوتی ہے مثلاً اس میں یہ بات روا ہوتی ہے کہ مالک اپنی مملوکہ اشیاء کو کسی دوسرے کی ملکیت میں قرار دے یعنی اسے بیچ دے، ہبہ وبخشش کر دے، یا دوسرے ایسے سبب کے ذریعے اپنے مالکانہ حقوق و اختیار دوسرے شخص کو دے دے، ...... جبکہ حقیقی ملکیت میں ایسا ہونا ممکن نہیں مثلاً کوئی شخص اپنی قوت بینائی بیچ نہیں سکتا اور نہ ہی اس کی ملکیت کسی بھی حوالہ سے کسی دوسرے شخص کو منتقل کر سکتا ہے م......)

اب رہی " مُلک "(م پر پیش کے ساتھ) والی مالکیت، تو اگرچہ وہ بھی "مِلک "(م کے نیچے زیر کے ساتھ) والی ملکیت ومالکیت کے باب سے ہے لیکن اس میں مالکیت کا تعلق ان اشیاء سے ہوتا ہے جس کے مالک چند لوگ ہوتے

ہیں، (اس طرح کے مالکانہ اختیار کو حکمرانی، سلطنت، بادشاہت وحکومت وغیرہ سے موسوم کیا جاتا ہے) کیونکہ اس میں مالک ہر اس چیز کا مالک ہوتا ہے جو اس کی رعایا کی ملکیت میں ہو، یعنی وہ اپنی رعایا کی مملوکہ اشیاء کا مالک ہوتا ہے اور اسے حق حاصل ہوتا ہے کہ اپنی رعایا کی مملوکہ اشیاء میں جس طرح تصرف کرے کہ اس کا تصور کرنا رعایا کے تصرف کرنے میں رکاوٹ نہ بنے اور نہ ہی ان کے تصرف کے حق کو ختم یا پامال کردے، گویا رعایا کی چاہتوں وحاکم کی چاہتوں میں دورنگی نہ پائی جائے، کیونکہ حقیقت میں اس کی مالکیت، ایک مخصوص مالکیت پر قائم ہوتی ہے اور اس طرح کی مالکیت کو اصطلاحی طور پر "طولی مالکیت" کہا جاتا ہے، اس کی مثال اس شخص کی ہے جو کسی غلام کا مالک ہوتا ہے تو وہ ہر اس چیز کا مالک بھی ہوتا ہے جو غلام کی ملکیت میں ہو، یعنی مولا اپنے عبد کا اور عبد کی تمام مملوکہ چیزوں کا مالک ہوتا ہے، بنابرایں "مُلک" (م پر پیش کے ساتھ) کی بھی اسی طرح قسمیں ہوں گی جس طرح "مِلک" (م کے نیچے زیر کے ساتھ) کی قسمیں ذکر کی گئی ہیں۔

خداوند عالم کی مالکیت مطلقہ

ملکیت ومالکیت کی بابت مذکورہ بالا مطالب کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ خداوند عالم مالک بھی ہے اور حاکم بھی! وہ ہر چیز کا علی الاطلاق مالک ہے اور وہ اس طرح سے کہ ربوبیتِ مطلقہ اور قیمومیت مطلقہ اس کا حق اور اس سے مختص ہے یعنی وہ ہر چیز کا علی الاطلاق رب ہے، ہر لحاظ سے ہر شے کا پروردگار ہے۔ ہر چیز کے امور اسی کے ہاتھ میں ہیں، ہر شے کے وجود وبقاء کی ذمہ داری اس کے پاس ہے، عالم ہستی کی تمام موجودات پر اس کا تسلط ہے، ہر شے اسی کے قبضہ قدرت و دائرۂ اختیار واقتدار میں ہے کیونکہ وہ ہر شے کا خالق وآفریدگار ہے اور ہر چیز کا وہی معبود ہے چنانچہ اس کا ارشاد ہے:

• سورۂ مومن، آیت: ۶۲

○ "ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۘ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ"

(وہ تمہارا رب ہے، ہر شے کا پیدا کرنے والا ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں)

سورۂ بقرہ، آیت: ۲۵۵

○ "لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ"

(اسی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے)

اس کے علاوہ دیگر متعدد آیات مبارکہ سے اس حقیقت کا ثبوت ملتا ہے کہ ہر وہ کہ جسے "شیئ" (چیز) کہا جاتا ہے یا کہا جاسکتا ہے وہ خدا کی ذات سے وابستہ اور اس کی محتاج ودست نگر ہے کوئی شے اپنے وجود میں خدا سے بے نیاز اور ذاتی

استقلال نہیں رکھتی۔ خدا جس چیز کے بارے میں جو کچھ چاہے اسے کوئی چیز مانع نہیں ہو سکتی اور نہ ہی کسی چیز کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا اس کی راہ میں رکاوٹ پیدا کر سکتا ہے۔ یہی معنی ہے "مِلک" (م کے نیچے زیر کے ساتھ) کا، کہ جس کا تذکرہ ہو چکا ہے۔

اور جہاں تک اس کے علی الاطلاق حاکم وفرمانروا ہونے کا تعلق ہے تو اس کی دلیل اس کا تمام موجودات کا علی الاطلاق مالک ہونا ہے، اس کی وضاحت یوں ہے کہ عالمِ ہستی کی موجودات میں سے بعض دوسری بعض کی مالک ہیں، یعنی ان میں سے کچھ موجودات ایسی ہیں جو دوسری بعض موجودات کی ملکیت میں قرار پاتی ہیں مثلاً اسباب اپنے مسببات کے مالک ہوتے ہیں اور اشیاء ان قوتوں کی مالک ہوتی ہیں جن سے استفادہ کرتی ہیں، اور وہ قوتیں اپنے افعال کی مالک ہوتی ہیں جیسے انسان اپنے اعضاء و جوارح کا مالک ہے اور اپنی وجودی قوتوں یعنی قوتِ سماعت، قوتِ بصارت اور دیگر ان تمام قوتوں کا مالک ہے جن سے اپنی ضروریات زندگی میں کام لیتا ہے اور وہ قوتیں اپنے افعال کی مالک ہوتی ہیں تو جب خداوند عالم تمام موجودات کا مالک ہے اور ہر چیز اس کی ملکیت میں ہے لہٰذا وہ ہر مالک کا مالک اور ہر مالک کی مملوکہ اشیاء کا مالک بھی ہے، یہی معنی ہے "مُلک" کا، کہ جس سے "ملیک" بنتا ہے، تو اس معنی میں خداوند عالم ملیک علی الاطلاق (حاکم مطلق) ہے چنانچہ اس حوالہ سے اس کا ارشاد ہے:

سورۂ تغابن، آیت ۱:

○ " لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ "

(اسی کے لئے ہے ملک (اقتدار) اور اسی کے لئے ہے حمد)

سورۂ قمر، آیت ۵۵:

○ " عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ "

(مقتدر حاکم کے پاس)

تو یہ ہیں خداوند عالم کے مالک ("مِلک" م کے نیچے زیر کے ساتھ) اور "مُلک" (مُلک۔ م پر پیش کے ساتھ) کی مثالیں اور حقیقی معانی!

اور جہاں تک خداوند عالم کے مجازی مالک وحاکم ہونے کا تعلق ہے تو وہ بھی صحیح وثابت ہے کیونکہ وہ مالک ہے اور وہ ملکیت عطا کرنے والا ہے، اسی نے ہر چیز کو ملکیت عطا کی ہے یعنی موجوداتِ عالم ہستی میں سے جو چیز بھی کسی چیز کی مالک ہے وہ دراصل خدا کی عطا کردہ ملکیت کی وجہ سے ہے کہ اگر خدا اس کا مالک نہ ہوتا تو وہ کسی چیز کو کسی چیز کا مالک کیونکر بنا سکتا تھا اور یہ بات لازم آتی کہ اس نے وہ چیز کسی کی ملکیت میں دی کہ جس کا وہ مالک نہیں تھا جبکہ ایسا ہونا ممکن نہیں، اس نے مالک

ہونے کی بناء پر سب کو مالک بنایا ہے چنانچہ اس کا ارشاد گرامی قدر ہے:

سورۂ نور، آیت ۳۳ :

O " وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ "

(اورتم انہیں اللہ کے اس مال سے دو جو اس نے تمہیں دیا ہے)

اور وہ "ملیک" کے دوسرے معنی کی بناء پر بھی ہر اس چیز کا مالک ہے جو لوگوں کے ہاتھوں میں ہے یعنی جس چیز کے وہ مالک ہیں، کیونکہ وہ شارع اور قانون بنانے والا ہے، وہ اپنے بندوں کے لئے احکام صادر کرتا ہے اور وہ ہر اس چیز کے بارے میں قانون گزاری کرتا اور فرمان جاری کرتا ہے جو لوگوں کی ملکیت میں ہے تو گویا لوگوں اور ان کی مملوکہ اشیاء کے بارے میں فیصلہ کرنا اسی کا کام ہے اور وہ اسی طرح بندوں اور ان کی مملوکہ اشیاء کی بابت حاکمانہ فیصلہ کرتا ہے جس طرح بادشاہ وفرمانروا حضرات اپنی رعایا وعوام کے پاس موجود اشیاء کے بارے میں اپنا قانونی حق استعمال کرتے ہوئے احکامات جاری کرتے ہیں، اس موضوع سے مربوط آیات ملاحظہ ہوں:

سورۂ ناس، آیت ۲ :

O " قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ﴿۱﴾ مَلِكِ النَّاسِ ۙ﴿۲﴾ "

(کہہ دو کہ میں پناہ چاہتا ہوں لوگوں کے پروردگار کی، لوگوں کے مالک کی)

سورۂ ابراہیم، آیت ۳۴ :

O " وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ۭ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۭ "

(اور اس نے وہ سب کچھ تمہیں عطا کیا جو تم نے اس سے مانگا، اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرو تو تم ان کا احصاء نہیں کر سکتے)

سورۂ حدید، آیت ۷ :

O " وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ "

(اور تم اس میں سے انفاق (اللہ کی راہ میں خرچ) کرو جو اس نے تمہیں دوسروں کا قائم مقام بنا کر عطا کی ہے)

سورۂ حدید، آیت ۱۰ :

O " وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ "

(اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں انفاق نہیں کرتے جبکہ اللہ کے لئے ہے آسمانوں اور زمین کی وراثت ـــ مالکیت ـــ)

سورۂ مومن، آیت ۱۶ :

○ " لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۖ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ "

(آج کے دن کس کی حکومت ہے، اللہ کی ہے جو یکتا ہے غلبہ والا ہے)

بنابرایں خداوندعالم ہر اس چیز کا مالک ہے جو ہم سے پہلے لوگوں کے پاس تھی (وہ جس کے مالک تھے) اور وہ ہر اس شے کا مالک ہے جو ہمارے پاس ہے (جس کے ہم مالک ہیں) اور وہ ہر اس شے کی میراث پائے گا (مالک ہوگا) جو ہمارے بعد ہوگی، اور اس کی ملکیت و مالکیت کا دائرہ بہت وسیع ہے۔

تین اہم نکات!

مذکورہ بالا تمام مطالب سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آیت مبارکہ " اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ " (اے اللہ ! اے مٰلِكَ الْمُلْكِ!) میں تین اہم نکات کا بیان مقصود و ملحوظ ہے :

(۱) خداوندعالم ہر " مُـلک " (م پر پیش کے ساتھ)...... حاکمیت وفرمانروائی...... اور ہر " مُـلک " حکومت واقتدار) کے " مِـلک " (م کے نیچے زیر کے ساتھ)...... ملکیت و مالکیت کے معنی ہیں...... کا مالک ہے، تو اس طرح اس کی مالکیت دراصل " الـملک علی الملک " (م پر پیش کے ساتھ) حاکمیت پر حاکمیت کے معنی میں ہوگی دراصل " مٰلِكَ الْمُلْكِ " (بادشاہوں کا بادشاہ، حاکموں کا حاکم، فرمانرواؤں کا فرمانروا) ہے کہ وہی جو ہر حاکم وفرمانروا کو حاکمیت وفرمانروائی عطا کرنے والا ہے، چنانچہ اس کا ارشاد گرامی ہے :

سورۂ بقرہ، آیت ۲۵۸ :

○ " اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ "

(کہ اللہ نے اسے مُلک واقتدار عطا کیا ہے)

سورۂ نسآء، آیت ۵۴ :

○ " وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا "

(اور ہم نے اسے عظیم بادشاہی عطا کی)

(۲) آیت میں لفظ " مٰلِكَ الْمُلْكِ " سے پہلے لفظ " اللّٰهُ " (اسم جلالہ) ذکر کرکے خداوندعالم کے

مالک الملک ہونے کے سبب سے آگاہی دلانا مقصود ہے اور وہ یہ کہ وہ مالک الملک ہے کیونکہ وہ خدا ہے اس کی کبریائی و بزرگی سب سے مافوق ہے، یہ ایک نہایت واضح امر ہے۔

(۳) آیت مبارکہ میں "مُـلک" سے مراد (واللہ اعلم) اس کا وہ معنی ہے جس میں "مُـلک" کی دونوں قسمیں یعنی حقیقی اور مجازی شامل ہیں کیونکہ پہلی آیت میں یوں ارشاد ہوا: " تُؤۡتِی الۡمُلۡكَ مَنۡ تَشَآءُ وَتَنۡزِعُ الۡمُلۡكَ مِمَّنۡ تَشَآءُ ۫ وَتُعِزُّ مَنۡ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنۡ تَشَآءُ ؕ" (تو ملک دیتا ہے جسے تو چاہتا ہے اور تو ملک چھین لیتا ہے جس سے تو چاہتا ہے، تو جسے چاہتا ہے عزت عطا کرتا ہے اور تو سے چاہتا ہے ذلت سے دوچار کرتا ہے) اس کی توضیح و تفسیر میں عنقریب مربوطہ مطالب ذکر کیے جائیں گے جن سے یہ امر واضح ہو جائے گا کہ یہ سب کچھ مجازی مُلک و اقتدار سے تعلق رکھنے والا ہے، اور جو الفاظ دوسری آیت میں ذکر ہوئے ہیں ان سے ان امور کی نشاندہی ہوتی ہے جن کا تعلق حقیقی ملک و ملکیت سے ہے، بنابرایں خداوند عالم علی الاطلاق مالک الملک ہے.....یعنی وہ حقیقی اور مجازی دونوں معنوں میں مالک الملک ہے، گویا جس یعنی میں مالکیت کا تصور کریں وہ اس لحاظ سے مالک الملک ہے.....،

عطا کرنا اور محروم کرنا سب خدا کے ہاتھ میں ہے

O " تُؤۡتِی الۡمُلۡكَ مَنۡ تَشَآءُ وَتَنۡزِعُ الۡمُلۡكَ مِمَّنۡ تَشَآءُ "
(تو جسے چاہتا ہے ملک و اقتدار عطا کرتا ہے اور جس سے تو چاہتا ہے اقتدار چھین لیتا ہے)

اس آیت مبارکہ میں لفظ "مُلک" چونکہ مطلق اور کسی اضافت کے بغیر ذکر ہوا ہے لہٰذا اس سے اس کا عام معنی مراد لیا جائے گا کہ جس میں ہر حاکمیت و اقتدار شامل ہو خواہ برحق حاکمیت و اقتدار ہو یا باطل و ناحق، خواہ مبنی بر عدل ہو یا مبنی بر ظلم ہو، کیونکہ "مُلک" (حکومت و اقتدار) جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیت مبارکہ ۲۵۸ " اَنۡ اٰتٰـهُ اللّٰهُ الۡمُلۡكَ " کی تفسیر میں بیان ہو چکا ہے بذات خود خدائی عنایات میں سے ایک عطیہ و عنایت ہے اور ایسی نعمت ہے جو انسانی معاشرہ میں اچھے آثار ظاہر کرسکتی ہے شاید اسی وجہ سے خداوند عالم نے اقتدار و حاکمیت کی محبت اور رغبت لوگوں کے دلوں میں پیدا کر دی ہے اور وہ فطری طور پر اس کے دلدادہ ہوتے ہیں، اس لحاظ سے وہ اقتدار و فرمانروائی کہ جو اس کے نااہل کے پاس ہوتی ہے وہ اصل اقتدار و حکمرانی کی حیثیت میں مذموم نہیں ہوتی بلکہ یا تو اس حوالہ و بنیاد پر مذموم ہوتی ہے کہ اسے نااہل نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہے مثلاً وہ شخص جو جور و جبر اور غصبی طور پر اقتدار پر قبضہ کرتا ہے، تو چونکہ وہ اس کا اہل و حقدار نہیں ہوتا لہٰذا اس کی مذمت

کی جاتی ہے، یا اس وجہ سے وہ حکومت واقتدار اور حکمرانی مذموم ہوتی ہے کہ وہ جس کے ہاتھوں میں ہے وہ ناپاک کردار کا مالک ہے جبکہ وہ اچھا اور پاکیزہ کردار اپنانے کی قدرت وصلاحیت رکھتا تھا لیکن اس کے باوجود اس نے غلط و باطل راہ اختیار کی لہٰذا اس حوالہ سے اس کی حاکمیت بھی مذموم ہوگی، بہرحال اس دوسری وجہ کی بازگشت بھی پہلی وجہ کی طرف ہوتی ہے۔

حکومت واقتدار کی بابت ایک اور حوالہ بھی ملحوظ ہے اور وہ یہ کہ اگر وہ اس شخص کے پاس ہو جو اس کا اہل ہے تو وہ اس کے لئے خدا کی نعمت قرار پائے گی اور جو شخص اس کا اہل نہیں اس کی نسبت سے وہ اس پر خدائی سزا ہوگی، بہرحال دونوں حوالوں اور نسبتوں سے اس کا سرچشمہ خداوند عالم ہے کہ وہ نعمت کے طور پر یا قمت وسزا کی صورت میں اس کے ذریعے بندوں کا امتحان لیتا ہے اور انہیں اس کے ذریعے آزماتا ہے۔

ایک اہم نکتہ

آیت مبارکہ میں اقتدار دینے اور واپس لینے اور اسی طرح عزت عطا کرنے اور ذلت سے دوچار کرنے کو خدا کی مشیت وارادہ سے مقید کیا گیا ہے" تشاء " (تو جو چاہتا ہے) تو اس سے مراد ہرگز یہ نہیں کہ خداوند عالم کوئی کام صرف اپنی چاہت کی بناء پر اور کسی غرض ومقصد کے بغیر بھی انجام دیتا ہے، اس کی ذات اس طرح افعال کی انجام دہی سے پاک ومنزہ اور بالاتر ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے کسی کام میں مجبور نہیں اور کوئی اس پر اس کی بابت جبر نہیں کرسکتا، بلکہ وہ جو کام کرتا ہے اپنی مشیت مطلقہ کے ساتھ انجام دیتا ہے کہ جس میں نہ تو کوئی شخص اور نہ کوئی مقصد اسے اس کی انجام دہی پر مجبور نہیں کرسکتا البتہ اس کا ہر کام ہمیشہ اچھی و پاکیزہ مصلحت پر مبنی ہوتا ہے۔

عزت وذلت خدا کے ہاتھ میں ہے

○ " وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ "

(اور تو جسے چاہتا ہے عزت عطا کرتا ہے اور تو جسے چاہتا ہے ذلت سے دوچار کرتا ہے)

لفظ "عزت" کا معنی کسی چیز کا اس طرح ہونا ہے کہ اس تک رسائی اور اس کا حصول دشوار ہو، (نایاب ہونا یا کمیاب ہونا) اسی بناء پر کمیاب چیز کو "عزیز الوجود" کہتے ہیں یعنی اس تک پہنچنا یا اسے پانا دشوار ہے، "نادر الوجود" اس چیز کو کہتے ہیں

جو کمیاب ہو، اس طرح "عزیز القوم" اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنی قوم میں سے قوی و طاقتور ہو کہ اس پر غلبہ پانا اور اسے شکست دینا آسان نہ ہو بلکہ اس کو شکست سے دوچار کرنا اور اس پر غالب آنا نہایت دشوار ہو، اور "عزیز القوم" اپنے مقام و منزلت اور قومی و معاشرتی رتبہ و عظمت کے حوالہ سے بھی ایسا ہوتا ہے کہ اس کی برابری و ہمسری آسان نہیں ہوتی بلکہ وہ اپنی قوم کی تمام تر قوت کا تنہا حامل ہوتا ہے، گویا جو مقام و مرتبہ اور قوت و عظمت پوری قوم کو حاصل ہے اس سے کہیں زیادہ اسے تنہا حاصل ہوتی ہے جبکہ اس کی قوم میں سے کوئی اس کا ہمتا نہیں ہوتا، اس معنی کے تناظر میں لفظ "عزت" کا استعمال عام ہوا یہاں تک کہ پھر اسے ہر مشکل و دشوار چیز کے بارے میں استعمال کیا جانے لگا مثلاً "یعز علی کذا" فلاں چیز مجھ پر گراں بار ہے۔

خداوند عالم کا ارشاد گرامی ہے:

سورۂ توبہ آیت ۱۲۸ :

O "عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ"

(اس پر تمہارا پریشان ہونا گراں بار ہے)

یعنی اس پر سخت دشوار ہے کہ وہ تمہیں پریشان دیکھے، رفتہ رفتہ اسے ہر غلبہ کے لئے استعمال کیا جانے لگا، چنانچہ کہا جاتا ہے: "من عز بز" (جو غالب آیا اس نے مغلوب کو تہس نہس کر دیا) خداوند عالم نے ایک آیت میں یوں ارشاد فرمایا:

سورۂ ص، آیت: ۲۳

O "وَعَزَّنِیْ فِی الْخِطَابِ"

(اور اس نے مجھے گفتگو میں مغلوب کر لیا)

بہر حال یہ ہیں اس کے استعمالی معانی و موارد، البتہ اس کا اصل معنی وہی ہے جو ذکر کیا جا چکا ہے، لفظ "عزت" کے مقابل میں لفظ "ذلت" آتا ہے کہ جس کا معنی آسانی سے پا لینا ہے خواہ حقیقی معنی میں ہو یا فرضی و تصوراتی معنی میں ہو، آیت شریفہ ملاحظہ ہوں:

سورۂ بقرہ، آیت :۶۱

O "ضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْکَنَةُ"

(ان پر ذلت و بیچارگی ڈال دی گئی) .....ان کا مقدر بن گئی.....

سورۂ اسراء، آیت ۲۴:

○ " وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ "

(ان دونوں (ماں، باپ) کے سامنے نہایت عاجزی کے ساتھ جھک جا)

سورۂ مائدہ، آیت :۵۴

○ " اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ "

(وہ مؤمنین پر نہایت نرمی کرنے والے ہیں)

عزت، فرمانروائی واقتدار اور علی الاطلاق حاکمیت کے لوازم یعنی ہمیشہ اس کے ساتھ ساتھ ہونے والے امور میں سے ہیں، کبھی اس سے جدا قابل تصور نہیں، اور چونکہ خداوند عالم حاکم علی الاطلاق ہے لہٰذا اسے ہی عزت علی الاطلاق حاصل ہے، اس کے علاوہ جو شخص بھی حاکمیت وعزت میں جس قدر بھی مقام ومرتبہ رکھتا ہو وہ درحقیقت عطائے ربانی ہے اور خداوند عالم ہی کی عنایت ہے کہ اس نے اسے اقتدار وعزت سے نوازا ہے۔ اور اگر کوئی شخص کسی قوم کا حاکم و بادشاہ ہو تو گویا اس کی بادشاہی وحاکمیت خدا کی عطا کردہ ہے اور خالص وحقیقی عزت صرف اور صرف خداوند عالم سے مختص ومخصوص ہے اور جو عزت اس کے علاوہ کسی کو حاصل ہے وہ خدا کی دی ہوئی اور عنایت کی ہوئی ہے، ارشاد خداوندی ہے:

سورۂ نسآء، آیت ۱۳۹:

○ " اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا "

(آیا وہ اپنے پاس عزت تلاش کرتے ہیں، عزت تو ساری کی ساری خدا کے لئے مخصوص ہے)

سورۂ منافقون، آیت :۸

○ " وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ "

(اور اللہ کے لئے ہے عزت اور اس کے رسول کے لئے اور مؤمنین کے لئے!)

ان آیات میں عزت اپنے حقیقی معنی میں استعمال ہوئی ہے، یعنی اس سے مراد حقیقی عزت ہے اور جہاں تک غیر حقیقی عزت کا تعلق ہے تو وہ دراصل ذلت ہے کہ جو عزت کی شکل میں ہوتی ہے، چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

سورۂ ص، آیت ۲:

○ " بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ عِزَّةٍ وَّشِقَاقٍ ۝ "

(بلکہ کافر لوگ عزت اور دشمنی میں گھرے ہوئے ہیں)

یہاں عزت سے مراد غیر حقیقی اور خیالی وموہوم ہے، اسی وجہ سے اس کے بعد والی آیت میں فوراً یوں ارشاد ہوا:

سورۂ ص: آیت :۳

○ "کَمۡ اَهۡلَکۡنَا مِنۡ قَبۡلِهِمۡ مِّنۡ قَرۡنٍ فَنَادَوۡا وَّلَاتَ حِیۡنَ مَنَاصٍ"

(ان میں سے کتنوں کو ہم نے ان سے پہلے ہلاک کر دیا کہ وہ فریادیں کرتے رہے مگر فریاد رسی کا وقت گزر چکا تھا)

یہاں یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ جس طرح "عزت" اپنے مخصوص احکام رکھتی ہے اسی طرح اس کے نقطہء مقابل میں "ذلت" بھی مخصوص احکام کی حامل ہے۔ بنابریں خداوند عالم کی ذات اقدس کے علاوہ ہر شے فی نفسہ ذلت کی حامل ہے سوائے اس کے کہ جسے خداوند عالم عزت سے نوازے۔ (تُعِزُّ مَنۡ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنۡ تَشَآءُ) ......اے خدا! تو ہی جسے چاہتا ہے عزت عطا کرتا ہے ور تو ہی جسے چاہتا ہے ذلت سے دوچار کرتا ہے......

خدا کی قدرت مطلقہ

○ "بِیَدِکَ الۡخَیۡرُ ؕ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ"

(تیرے ہاتھ میں ہے خیر، بے شک تو ہی ہر چیز پر قادر ہے)

لفظ "خیر" کا لغوی معنی انتخاب واختیار کرنا اور چن لینا ہے، اور کسی چیز کو "خیر" اس لئے کہا جاتا ہے کہ جب ہم دو چیزوں کا ایک دوسرے سے موازنہ کرتے ہیں تو ان میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا چاہتے ہیں تو جسے ہم چن لیتے ہیں وہ "خیر" کہلاتی ہے یعنی چنی ہوئی، اختیار کی ہوئی، منتخب کی ہوئی، پسند کی ہوئی، اور ہم اسے اس لئے چنتے اور اختیار کرتے ہیں کہ اس سے ہمارے مطلوب ومقصود کے حصول کی ضمانت ملتی ہے اور جو کام ہم اس سے لینا چاہتے ہیں وہ اس کے ذریعے ممکن دکھائی دیتا ہے، بنابریں جسے ہم چاہتے اور اس کا انتخاب کرتے ہیں وہی حقیقت میں "خیر" ہے، اور اگر ہم اسے کسی دوسری چیز کے لئے چاہیں تو وہ دوسری چیز اس کی وجہ سے ہمارا مقصود قرار پائی وہ اسی نسبت سے "خیر" کہلائی، تو "خیر" درحقیقت وہی شے ہے جو ہمارا مطلوب ومقصود بنی اور ہمارا مطلوب ومقصود ہونے کی وجہ سے ہی وہ "خیر" سے موسوم ہوئی کہ ہم نے اسے دوسری چیز یا چیزوں کے مقابلے میں اپنا مقصود قرار دیا، اس طرح ہر وہ چیز جسے ہم کئی چیزوں میں سے چن لیں اور منتخب کر لیں وہ "خیر" ہوگی۔

مذکورہ بالا مطالب سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کسی چیز کو "خیر" سے موسم کرنے میں اس کا دوسری شے سے

مقایسہ وموازنہ اور اس کا دوسری شے میں مؤثر ہونا ضروری ہے، اس لحاظ سے اس کے معنی میں "دوسری شے سے تقابلی نسبت" بنیادی امر ہے، شاید اسی تقابلی نسبت کے حوالہ سے بعض حضرات اس غلط فہمی میں مبتلا ہوئے ہیں کہ یہ افعل التفضیل کا صیغہ ہے یعنی اصل میں "خیر" (بروزن افعل) ہے کہ جس میں تقابلی نسبت سے برتری پائی جاتی ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ افعل التفضیل کا صیغہ نہیں ہے البتہ اس کا معنی اسم تفضیل کے معنیٰ پر منطبق ہوتا ہے کیونکہ افعل التفضیل میں ہمیشہ تقابلی برتری ملحوظ ہوتی ہے اور "خیر" میں بھی تقابلی نسبت پائی جاتی ہے چنانچہ افعل التفضیل میں اس طرح کہا جاتا ہے: " **زید افضل عن عمرو** " (زید، عمرو سے افضل ہے) تو اس کا مطلب یہ ہے کہ زید اور عمرو دونوں میں سے زید افضل ہے (**زید افضلهما**) یا کہا جاتا ہے: " **زید خیر من عمرو** " (زید عمرو سے بہتر ہے) یعنی زید اور عمرو دونوں میں سے زید بہتر ہے (**زید خیرهما**)۔

اگر لفظ "خیر" اسم تفضیل " اخیر" کا مخفف ہوتا (یعنی اصل میں " اَخیَرُ " ہوتا تو اسم تفضیل کے تمام قواعد اس پر جاری ہوتے اور جو مشتقات افعل التفضیل کے ہیں وہ اس کے بھی ہوتے مثلاً "افعل" کی جمع "افاضل" اور تانیث " فضلی " اور اس کی جمع " فضلیات" بنتی ہے اسی طرح لفظ "خیر" سے بھی یہ تمام صیغے بنائے جاتے جبکہ اس کے مشتقات افعل التفضیل جیسے نہیں بلکہ اس طرح آتے ہیں:

"خیر" (مذکر) " خیرۃ " (مؤنث) "اخیار" (خیر کی جمع مذکر) "خیرات" (خیرۃ کی جمع مؤنث)، چنانچہ اس کی مثال اس سے مشابہ لفظ "شیخ" سے دی جاسکتی ہے کہ جس کے مشتقات اس طرح آتے ہیں: "شیخ" (واحد مذکر) سے " شیخۃ" (واحد مؤنث)۔ "اشیاخ" (جمع مذکر)۔ "شیخات" (جمع مؤنث)۔ بنابریں لفظ "خیر" اسم تفضیل کا صیغہ نہیں بلکہ صفت مشبہ ہے، اور اس کے اسم تفضیل کا صیغہ نہ ہونے کی ایک دلیل بلکہ واضح ثبوت یہ ہے کہ اسے ان موارد میں استعمال کیا جاتا ہے، جہاں اسم تفضیل کا معنی ہرگز نہیں پا جاتا، اس کی قرآنی مثال ملاحظہ ہو:

سورۂ جمعہ، آیت :۱۱

○ " قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ "

(کہہ دیجئے کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ لہو ولعب سے بہتر ہے)

اس میں لہو ولعب کے مقابلے میں "خیر" کا استعمال اس امر کا بین ثبوت فراہم کرتا ہے کہ یہاں تقابلی برتری ملحوظ نہیں کیونکہ "لہو" میں خیر کا کوئی بھی پہلو پایا نہیں جاتا کہ جس کی بناء پر افعل التفضیل کا معنی درست ہو سکے، (کیونکہ اسم تفضیل میں قدر مشترک کا پایا جانا ضروری ہے تاکہ موازنہ وتقابلی نسبت درست قرار پائے)، اور بعض حضرات کا یہ کہنا بھی درست نہیں کہ "خیر" اور اس جیسے الفاظ سے اسم تفضیل کا معنی الگ کر دیا گیا ہے، چنانچہ آپ خود اس کی بابت ملاحظہ کر چکے ہیں۔ بہر حال اس سلسلہ

میں حق بات تو وہی ہے جو ہم ذکر کر چکے ہیں کہ لفظ ''خیر'' کا معنی انتخاب واختیار اور چن لینا ہے، اور کسی مقام پر اس کے مقابل امر میں کہ جس سے اس کا قیاس وموازنہ ہوا ہو کوئی خوبی پائی جائے تو وہ اسی مورد کی مخصوص صفت ہوگی، اسے تمام تقابلی موارد میں وسعت نہیں دی جاسکتی۔

مذکورہ بالا مطالب سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ خداوندِ عالم خیر مطلق ہے کیونکہ ہر چیز کا منتہیٰ وہی ہے اور ہر شے کی بازگشت اسی کی طرف ہوتی ہے اور ہر چیز کا مطلوب ومقصود اسی کی ذات ہے لیکن اس کے باوجود قرآن مجید نے لفظ ''خیــــر'' کو خداوند عالم کے دیگر مقدس اسماء مبارکہ کی طرح ان میں سے ایک اسم کے طور پر ذکر نہیں کیا، بلکہ اسے خداوند عالم کی ایک صفت کے طور پر ذکر کیا ہے، چنانچہ ارشاد ہوا:

سورۂ طٰہٰ، آیت ۷۳:

○ '' وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ''

(اور اللہ خیر اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے)

سورۂ یوسف، آیت ۳۹:

○ '' ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ''

(کیا گوناگوں اور طرح طرح کے رب بہتر ہیں یا اللہ کہ جو یکتا وغالب ہے)

البتہ جہاں اسم کے طور پر ذکر کیا گیا ہے وہاں کسی دوسرے لفظ سے اضافت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے مثلاً:

سورۂ جمعہ، آیت ۱۱:

○ '' وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ''

(اور اللہ بہتر رزق دینے والا ہے)

سورۂ اعراف، آیت ۸۷:

○ '' وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ''

(اور وہ بہتر حکم کرنے والا ہے)

سورۂ انعام، آیت ۵۷:

○ '' وَهُوَ خَيْرُ الْفٰصِلِيْنَ ''

(اور وہ بہتر فیصلہ کرنے والا ہے)

سورۂ آل عمران، آیت :۱۵۰

O " وَهُوَخَيْرُالنّٰصِرِيْنَ "

(اوروہ بہتر مدد کرنے والا ہے)

سورۂ آل عمران، آیت ۵۴:

O " وَاللّٰهُ خَيْرُالْمٰكِرِيْنَ "

(اوراللہ بہتر تدبیر کرنے والا ہے)

سورۂ اعراف، آیت :۸۹

O " وَاَنْتَ خَيْرُالْفٰتِحِيْنَ "

(اورتو بہتر فتح کرنے والا ہے)

سورۂ اعراف، آیت ۱۵۵:

O " وَاَنْتَ خَيْرُالْغٰفِرِيْنَ "

(اورتو بہتر معاف کرنے والا ہے)

سورۂ انبیاء، آیت :۸۹

O " وَّاَنْتَ خَيْرُالْوٰرِثِيْنَ "

(اورتو بہتر وارث ہے)

سورۂ مؤمنون، آیت ۲۹:

O " وَّاَنْتَ خَيْرُالْمُنْزِلِيْنَ "

(اورتو بہتر نازل کرنے والا ہے)

سورۂ مؤمنون، آیت :۱۰۹

O " وَاَنْتَ خَيْرُالرّٰحِمِيْنَ "

(اورتو بہتر رحم کرنے والا ہے)

شاید ان تمام موارد میں لفظ "خیر" میں انتخاب کا معنی ملحوظ ہو، اسی لئے "خیر" کو خداوند عالم کے اسم کے طور پر ذکر نہیں کیا گیا تا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی مقدس ذات کا قیاس وموازنہ اس کے غیر سے ہونے لگے، اور "خیر مطلق" ہونے کی بابت کوئی دوسرا بھی مقابل کے طور پر قرار پائے، ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا، اوراس کی ذات اس سے بالاتر

ہے کہ اس کا موازنہ ومقایسہ کسی سے کیا جا سکے اور پھر اس تقابل میں خدا کو "خیر" (بہتر) قرار دیا جائے، ہر شے اس کی بارگاہ میں عاجزی کے ساتھ سرنگم ہے، اور جہاں تک اضافت اور نسبت کے ساتھ لفظ "خیر" کو خدا کا اسم قرار دینے اور اسی طرح اس کی صفت کے طور پر ذکر کرنے کا تعلق ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں، اضافتی وتوصیفی اسم قرار دینے میں کوئی محذور لازم نہیں آتا۔

خلاصۂ کلام یہ کہ آیت مبارکہ "بِيَدِكَ الْخَيْرُ" سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ خیر صرف اور صرف خداوند عالم سے مخصوص ومختص ہے کیونکہ یہاں "خیر" پر الف ولام ہے (الخیر) اور وہ جملہ میں "مبتداء" ہے کہ جسے اس کی خبر یعنی "بِيَدِكَ" سے پہلے ذکر کیا گیا ہے اور جب ایسا ہو یعنی مبتداء کو خبر سے مقدم کر کے ذکر کیا جائے اور اس پر الف ولام بھی لگایا جائے تو اس سے مراد اس کے معنی کا اختصاص ظاہر کرنا ہوتا ہے، لہٰذا آیت مبارکہ کا معنی یہ ہوگا کہ ہر مطلوب خیر صرف تیرے ہاتھ میں ہے اور تو ہی ہر خیر کا سرچشمہ ومنتہاء ہے، اور تو ہی ہر خیر کا عطا کرنے والا اور فیض رساں ہے۔

آیت مبارکہ کا یہ فقرہ "بِيَدِكَ الْخَيْرُ......" سابقہ ذکر شدہ مطالب کی علت وسبب کے بیان کے طور پر ہے، یعنی فقرہ "تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ...... الخ" میں اقتدار وعزت عطا کرنا خدا سے مخصوص قرار دیا گیا ہے تو اس کی علت وسبب یہ ہے کہ "خیر" خدا کے ہاتھ میں ہے "بِيَدِكَ الْخَيْرُ" تو اس میں خاص چیز (ملک وعزت) عطا کرنے کی علت وسبب "خیر" کا خدا کے ہاتھ میں ہونا قرار دی اگیا ہے جو کہ ملک واقتدار اور عزت سمیت وسیع معنی کی حامل ہے، ("خیر" صرف انہیں دو امور میں محدود نہیں بلکہ ان سمیت دیگر امور بھی اس کا مصداق قرار پاتے ہیں کیونکہ اس کا سرچشمہ خداوند عالم ہے)

یہ تو ہے عطا کرنے کا بیان، تو جب اقتدار وعزت کا عطا کرنا "خیر" سے وابستہ ہے جو خدا کے ہاتھ میں ہے اسی طرح اقتدار سے محروم کرنا اور ذلت سے دوچار کرنا اگرچہ "شر" کا مصداق ہیں لیکن "شر" "عدم الخیر" کا دوسرا نام ہے لہٰذا اقتدار چھین لینا عزت نہ دینے ہی سے عبارت ہے، بنابرایں ہر "خیر" کا منتہا خداوند کریم کی ذات ہے جو کہ اس بات کا سبب ہے کہ "خیر" سے ہر محرومی کسی حوالہ سے خدا ہی کی طرف منتہی ہو، البتہ جو بات اہمیت کی حامل ہے وہ یہ کہ ہر اس چیز کی خداوندِ عالم سے نفی کرنا ضروری ہے جس سے متصف ہونا ذاتِ احدیت کے شایانِ شان نہیں مثلاً بندوں کے افعال میں پائی جانے والی خامیاں ونواقص اور گناہوں ومعاصی میں پائی جانے والی گندگیاں وقبائح وغیرہ، تو ان امور کی نسبت خداوند عالم کی طرف دینا درست نہیں البتہ یوں کہا جا سکتا ہے کہ خداوندِ عالم نے فلاں شخص یا قوم کو معصیت ونافرمانی کا مرتکب ہونے کی وجہ سے ذلت ورسوائی سے دوچار کر دیا یا ان سے توفیق خیر سلب کر لی یا انہیں اطاعت وفرمان برداری کی توفیق ہی نہیں دی،

خلاصۂ کلام یہ کہ خیر وشر کی دو قسمیں ہیں: تکوینی وتخلیقی اور تشریعی وقانونی، پہلی قسم یعنی تکوینی وتخلیقی خیر اور شر، تو اس کا

مثال اقتدار وعزت عطا کرنا (خیر) اور اقتدار چھین لینا اور ذلت سے دوچار کرنا (شر) ہے، اور دوسری قسم یعنی تشریعی وقانونی خیر اور شر، تو اس کی مثال اطاعت وفرماں برداری (خیر) اور معصیت ونافرمانی (شر) کی تمام صورتیں ہیں۔

مزید وضاحت!

تکوینی خیر ایک وجودی امر ہے کہ جو عطائے الٰہی سے وابستہ ہے یعنی اس کی فیض رسائی کا سرچشمہ ذات خداوندی ہے، اور تکوینی شر سے مراد ''خیر'' کا عطا نہ کرنا ہے، اس معنی میں تکوینی شر کی نسبت خدا کی طرف دینا غلط نہیں کیونکہ وہ ''خیر'' کا مالک ہے اس کے علاوہ کوئی اس کا مالک نہیں ہوسکتا، لہٰذا اگر وہ کسی کو اس سے نوازے اور کچھ ''خیر'' عطا کرے تو یہ اس کی عطا وعنایت ہے اور وہ اس پر لائق حمد وستائش ہے اور اگر وہ کسی کو ''خیر'' عطا نہ کرے یا کسی کو اس سے محروم کردے تو کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اس پر اعتراض کرے کہ وہ اس کا حق تھا اور اسے کیوں نہیں دیا گیا یا اس سے اس کا حق کیوں چھین لیا گیا کہ ایسا کرنا ظلم ہے یعنی کسی کو اس کا حق نہ دینا یا اس کے مسلم حق سے محروم کرنا ظلم ہے جبکہ خداوندِ عالم کی ذات اس طرح کے اعمال سے منزہ وپاک ہے، اس کے علاوہ اس کا کسی کو کچھ عطا کرنا اور محروم کرنا دونوں ان عمومی مصلحتوں سے وابستہ ہیں جو عالم ہستی میں جاری وساری نظام کی بہتری میں دخیل ہیں، یعنی خداوندِ عالم کسی کو کچھ عطا کرتا ہے تو اس میں وہ عمومی فائدہ ملحوظ ومقصود ہوتا ہے جس کا کائنات پر حاکم نظام کی بہتری میں دخل ہوتا ہے او اگر کسی کو محروم کرتا ہے تو اس میں بھی وہی عمومی مصلحت وفائدہ ملحوظ ومقصود قرار پاتا ہے۔

اور اس کے مقابل میں تشریعی وقانونی خیر اور شر، درحقیقت انسان سے سرزد ہونے والے افعال واعمال ہیں جو اس کے اپنے اختیار وانتخاب کی طرف منسوب ہوتے ہیں یعنی جس کا انجام دینا انسان خود اختیار کرتا ہے اور اس حوالہ سے انسان کے علاوہ کسی دوسرے کی طرف ان کی نسبت ہرگز نہیں دی جاتی، اور یہی اختیاری نسبت ان افعال کے اچھا یا برا اور خوب وبد ہونے کا اصل معیار ہے کہ اگر ان کا انجام پانا انسان کے اپنے اختیار وانتخاب پر مبنی نہ ہو تو وہ اچھے یا برے نہیں کہلا سکتے اور اس حوالہ ان کی نسبت خداوندِ عالم کی طرف بھی نہیں دی جاسکتی سوائے اس کی طرف سے حاصل ہونے والی توفیق (اطاعت میں) اور عدم توفیق (معصیت میں) کے کہ جو ان عمومی مصلحتوں کی بناء پر ہوتی ہے جو ان دونوں (توفیق اور عدم توفیق) میں سے کسی ایک کی متقاضی ہوتی ہیں۔

مذکورہ بالا مطالب سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ تمام کی تمام خیر خداوندِ عالم کے ہاتھ میں ہے اور اسی پر پورے عالم ہستی کا نظم ونظام قائم ہے کہ جس میں عطا ومحرومی اور خیر وشر سب پائے جاتے ہیں۔

ایک غلط فہمی اور اس کا ازالہ

آیۂ مبارکہ "بِيَدِكَ الْخَيْرُ" کی بابت بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ اس میں عبارت کے اختصار سے کام لیا گیا ہے ورنہ اصل میں یوں ہے: "بیدک الخیر والشر" (تیرے ہی ہاتھ میں ہے خیر اور شر) اور اس کی قرآنی مثال یہ ہے، "وَّجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ" ۔۔۔ سورۂ نحل، آیت ۸۱ ۔۔۔ (اور اس نے تمہارے لئے پوشاکیں بنائیں جو تمہیں گرمی سے بچاتی ہیں) اس میں بھی اختصار سے کام لیا گیا ہے ورنہ اصل میں یوں ہے "وجعل لکم سرابیل تقیکم الحر والبرد" (اس نے تمہارے لئے پوشاکیں بنائیں جو تمہیں گرمی اور سردی سے بچاتی ہیں) اس میں "البرد" (سردی) ذکر نہیں کیا گیا، اسی طرح زیر نظر آیۂ مبارکہ میں "الخیر" کے ساتھ "الشر" ذکر نہیں کیا گیا۔

اس غلط فہمی کا ازالہ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ دراصل اس نظریہ کے قائل حضرات نے فرقۂ معتزلہ کے عقیدہ سے کنارہ کشی کرتے ہوئے عبارت میں حذف و اختصار کا مفروضہ پیش کر دیا کیونکہ فرقۂ معتزلہ کے افراد ہر طرح کے "شر" کی نسبت کی خدا سے نفی کرتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ کسی بھی "شر" کی نسبت خدا کی طرف نہیں دی جا سکتی۔ لیکن اس سلسلہ میں حذف و اختصار کے قائل حضرات کا کلام الٰہی کی بابت اس طرح جرأت سے کام لینا نہایت تعجب آور ہے، اگرچہ فرقۂ معتزلہ کا "شر" کے حوالہ سے مطلق نفی کا نظریہ کہ جس میں بالواسطہ استناد بھی شامل ہے، قرین صحت نہیں مگر اس کے باوجود عبارت میں حذف و اختصار کا قول بھی ہرگز درست قرار نہیں دی جا سکتا بلکہ ایسا کرنا جائز ہی نہیں، چونکہ فرقۂ معتزلہ کے نظریہ کی بابت تفصیلی بحث پہلے ہو چکی ہے اور حقیقت الامر کی وضاحت بھی ہو گئی ہے لہٰذا دوبارہ اس حوالہ سے مزید اظہار خیال ضروری نہیں۔

خدا ہر چیز پر قادر ہے

○ " اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ "
(بے شک تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے)

یہ فقرہ ، "بِيَدِكَ الْخَيْرُ" (تیرے ہاتھ میں ہے خیر) کی علت و وجہ کے ذکر کے طور پر ہے کہ ہر خیر اس لئے

خدا کے ہاتھ میں ہے کہ وہ ہر شے پر قادر مطلق ہے کیونکہ ہر شے پر قادر مطلق ہونا اس بات کا متقاضی ہے کہ کوئی شخص کسی چیز پر قادر نہ ہو سوائے اس کے کہ خدا اسے اس پر قادر بنائے اور قدرت و توانائی عطا کرے، لہٰذا اگر کسی شخص کا کسی چیز یا کام پر قادر ہونا خدا کی طرف سے عطائے قدرت سے منسوب و مستند نہ ہو تو اس کا معنی یہ ہوگا کہ وہ جس چیز پر قادر ہے وہ خدا کی قدرت مطلقہ کے دائرہ سے باہر ہے جبکہ ایسا ممکن نہیں کیونکہ اس سے خدا کا ہر چیز پر قادر ہونا ثابت نہ ہوگا حالانکہ آیت مبارکہ میں واضح طور پر ارشاد ہوا ہے کہ خدا ہر شے پر قادر ہے "اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ" ۔ اور اس آیت کی رو سے ہر چیز خداوند عالم کی قدرت مطلقہ و کاملہ کے دائرے میں آتی ہے لہٰذا جس "خیر" کا بھی تصور کریں اس پر خدا کی علی الاطلاق قدرت ثابت و یقینی ہوگی، بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ اگر کوئی شخص کسی کو کوئی "خیر" عطا کرے وہ بھی خدا کی طرف منسوب ہوگی اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے اس خیر کی فیض رسائی اس شخص کے ہاتھ سے کروائی ہے تو خدا "خیر" کا سرچشمہ اور وہ شخص واسطہ و وسیلہء خیر کہلائے گا۔ بنا برایں تمام "خیر" اور "خیر" کی ہر قسم کی اصل و اساس، سرچشمہ و بنیاد اور محور و مرکز ذات خداوندی ہے اور بغیر کسی استثناء کے ہر خیر اور اس کی عطاء کا تعلق خدا سے ہے، اور اسی حصر اور اختصاص پر یہ فقرہ دلالت کرتا ہے: "بیدک الخیر" (تیرے ہاتھ میں ہے ہر خیر)......(یا، تیرے ہی ہاتھ میں ہے ہر خیر) ۔!

شب و روز کا محیر العقول نظم و نظام

○ " تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ "

(تو رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے) ۔!

"تولج" فعل مضارع ہے، اس کا مصدر "ایلاج" ہے جس کا معنی داخل کرنا ہے کہ جو "ولوج" سے مشتق ہے جس کا معنی داخل ہونا ہے۔ یہاں رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرنے سے مراد...... جیسا کہ کہا گیا ہے اور ظاہر بھی یہی ہے...... وہی ہے جس کا مشاہدہ ہم ہر روز کرتے ہیں یعنی رات اور دن کا آنا جانا، کہ جو سال بھر جاری رہتا ہے، اور جغرافیائی حوالہ سے ملکوں و شہروں میں شب و روز کی گردش اور سورج کے اتار چڑھاؤ کا جو سلسلہ قائم ہے اس کے نتیجہ میں رات اور دن کے زمانی دورانیہ میں کمی و بیشی ہوتی رہتی ہے کہ اسی کو شب کے دن میں داخل ہونے اور دن کے رات میں داخل ہونے سے تعبیر کیا گیا ہے چنانچہ اس کی مصداقی صورت موسم سرما کے ابتدائی ایام سے موسم گرما کے ابتدائی دنوں تک اور پھر موسم کی تبدیلی کے نتیجہ میں موسم گرما کے ابتدائی ایام سے موسم سرما کے ابتدائی دنوں تک واضح طور پر سامنے آتی ہے، یعنی سردیوں کے

موسم کے ابتدائی ایام میں دن، رات میں داخل ہوتے ہیں اور یہ سلسلہ گرمیوں کے موسم شروع ہونے تک جاری رہتا ہے اور پھر گرمیوں کی ابتداء میں رات دن میں داخل ہونا شروع ہوتی ہے اور یہ سلسلہ موسم خزاں کے شروع ہونے تک جاری رہتا ہے (شاید اسی وجہ سے موسم خزاں کو موسم سرما اور موسم گرما کا درمیانی زمانہ کہتے ہیں کہ اس میں موسمی اعتدال ہوتا ہے۔م)۔ یہ تبدیلیاں کرۂ ارض کے شمالی علاقوں (وہ ممالک جو خط استواء پر واقع ہیں) رونما ہوتی ہیں جبکہ جنوبی ممالک میں صورتحال اس کے برعکس ہوتی ہے (وہ ممالک جو خط استواء کے نیچے واقع ہیں) یعنی جب کرۂ شمالی میں دن کا دورانیہ کم ہوتا ہے تو کرۂ جنوبی میں زیادہ ہوتا ہے اور جب کرۂ جنوبی میں زیادہ ہوتا ہے تو کرۂ شمالی میں کم ہوتا ہے) گویا ایک سمت میں دورانیہ طولانی جبکہ دوسری جانب دورانیہ کم ہوتا ہے تو اس طرح خداوند عالم رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور یہ سلسلہ دائمی ہے اور جہاں تک خود خط استواء اور قطب شمالی وقطب جنوبی میں رات اور دن کے دورانیہ کا تعلق ہے (چھ ماہ رات اور چھ ماہ دن ہوتا ہے) تو وہ ہمیں ایسا دکھائی دیتا ہے ورنہ حقیقت میں تبدیلی کا عمومی نظام دائمی ہے اور ان علاقوں میں بھی جاری وساری ہوتا ہے۔

زندگی اور موت کا نظم ونظام

O " وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ "
(اور تو مردہ سے زندہ کو اور زندہ سے مردہ کو نکالتا ہے)

یہاں مردہ سے زندہ کو نکالنے اور زندہ کو مردہ سے نکالنے سے مراد مؤمن کو کافر کی صلب سے اور کافر کو مومن کی صلب سے نکالنا ہے کیونکہ خداوند عالم نے ایمان کو زندگی اور روشنی سے موسوم کیا ہے اور کفر کو موت اور تاریکی کا نام دیا ہے چنانچہ ارشاد ہوا:

سورۂ انعام، آیت ۱۲۲:

O " اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا "

(آیا وہ شخص کہ جو مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندہ کیا اور اس کے لئے روشنی قرار دی جس کے ذریعے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے وہ اس شخص جیسا ہے جو تاریکیوں میں پڑا ہوا ہے کہ ان سے باہر آنے والا نہیں؟)

اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد صرف ایمان و کفر نہ ہو بلکہ اس سے وسیع معنی مراد ہو کہ جس میں ان دونوں (ایمان و کفر) سمیت نباتات کا احیاء اور شعور و احساس سے محروم زمین سے حیوانات کا احیاء بلکہ خود مردہ زمین کا احیاء (زندہ کرنا) اور اسے دوبارہ زندگی عطا کرنا بھی شامل ہے کیونکہ کلام الٰہی میں ایک طرح سے صراحت پائی جاتی ہے کہ خداوند عالم مردہ کو زندہ اور زندہ کو مردہ بنا دیتا ہے چنانچہ ارشاد ہوا:

سورۂ مؤمنون، آیت: ۱۵

○ "ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ۭ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﭒ ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ"

(پھر ہم نے اسے نئی مخلوق بنا دیا، کہ اللہ بہتر خلق کرنے والا ہے پھر اس کے بعد تم مر جاؤ گے)

اس موضوع سے مربوط دیگر آیات مبارکہ سے بھی مذکورہ مطالب سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔

ایک نظریہ کی وضاحت

یہاں علم الطبیعہ کے ایک ماہر کے نظریہ کی وضاحت ضروری ہے، انہوں نے کہا ہے کہ یہ سلسلۂ حیات کہ جس کی منتہا اس کے اپنے جرثومے ہیں اس کا نظام کچھ اس طرح ہے کہ ایک زندہ جرثومہ اپنے جیسے دوسرے زندہ جرثومہ میں منتقل ہوتا رہتا ہے جس سے زندگی کا تسلسل قائم ہو جاتا ہے اور ان جرثوموں کے حیاتی نقل و انتقال کے جاری سلسلہ کا منتہا کوئی ایسا مادہ نہیں ہوتا جو شعور سے محروم ہو، یعنی ہر زندہ جرثومہ کی انتہاء اور آخری نقطہ ایک زندہ جرثومہ ہی ہوتا ہے کیونکہ مردہ جرثومہ اور شعور سے محروم مادہ سے کسی زندہ جرثومہ کا جنم لینا درست قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اس ماہر علم الطبیعہ کا مذکورہ بالا نظریہ دراصل دنیا میں کسی بھی "حادث" اور نو پیدا کے وجود کے انکار پر مبنی ہے جبکہ ان کا یہ خیال صحیح نہیں کیونکہ مشاہدہ و تجربہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حیاتی جرثومہ پر موت واقع ہوتی ہے کہ جس سے حیات کے موت میں تبدیل ہو جانے کی ناقابل انکار حقیقت واضح ہو جاتی ہے اور پھر ان دونوں یعنی زندگی اور موت کے درمیان ربط و تعلق کے مضبوط سلسلہ سے آگاہی کا حصول بھی یقینی ہو جاتا ہے اور یہ مسئلہ ہر طرح کے شبہ سے بالاتر ہو جاتا ہے کہ جرثوموں کے درمیان جاری و قائم سلسلہ حیات و موت ایک دوسرے مربوط و وابستہ ہے۔ بہر حال یہ ایک عمیق موضوع ہے اس کی وضاحت کسی موزوں مقام پر کی جائے گی۔

خداوند عالم کا اپنے حقیقی مالکانہ حق کا استعمال

زیرِ نظر آیت مبارکہ "تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ" خداوند عالم کی طرف سے اپنے حقیقی مالکانہ حقوق کے استعمال کی نشاندہی کرتی ہے اور اس امر کا واضح ثبوت فراہم کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ سرچشمۂ فیض وجود اور مرکز تخلیق و تکوین ہونے کے ناطے اپنی مخلوق و مملوک اشیاء میں تصرف کرتا ہے اور خالق و مالک حقیقی ہونے کے حوالہ سے اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ جس طرح طرح چاہے ان کے بارے میں فیصلہ کرے اور ان کی بابت نظم و نظام قائم کرے جبکہ سابقہ آیت " تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ " خداوند عالم کے اس مالکانہ حق کے استعمال کی نشاندہی کرتی ہے جو اسے طے کردہ حاکمیت سے حاصل ہے۔

اگر مذکورہ بالا دو آیتوں کے معانی پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک میں چار طرح کے تصرف کا تقابلی تذکرہ ہوا ہے، چنانچہ پہلی آیت میں حکومت و اقتدار کا عطا کرنا اور چھین لینا مذکور ہے (تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ) اور اس کے مقابل میں دوسری آیت میں رات کا دن میں داخل کرنا اور دن کا رات میں داخل کرنا مذکور ہے (تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ) اسی طرح پہلی آیت میں عزت عطا کرنا اور ذلت سے دوچار کرنا مذکور ہے (تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ) جبکہ دوسری آیت میں مردہ سے زندہ کا نکالنا اور زندہ سے مردہ کا نکالنا مذکور ہے (تُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ) تو یہ سب نہایت دلچسپ اور لطیف مناسبت کے حامل امور ہیں کہ جن کے لئے کسی وضاحت کی ضرورت نہیں کیونکہ اقتدار کا عطا کرنا درحقیقت بعض افراد کو دوسروں پر حاکم بنانا اور ان کے امور ان کے ہاتھوں میں دینا ہے (مسلط کرنا) کہ حاکم بنائے جانے والے افراد کے مقابلے میں دوسروں یعنی محکوم بنائے جانے والوں کی انسانی و معاشرتی اور طبعی و فطری آزادی کو محدود بلکہ سرے سے ختم کر دیا جاتا ہے، یعنی ان کا وجودی مسلم الثبوت حق آزادی ان سے لے لیا جاتا ہے اور یہ اسی طرح ہے جیسے رات کا دن پر مسلط کر دینا ہے کہ رات، دن کے مسلم الثبوت حصہ میں سے کچھ لے جاتی ہے اور نتیجتاً وہ چیزیں کہ جن پر دن اپنی روشنی ڈالتا تھا اور انہیں ظاہر کرتا تھا وہ ان کی روشنی سے محروم ہو کر پوشیدہ ہو جاتی ہیں، اور اقتدار کا واپس لے لینا اس کے برعکس صورت کا حامل ہے۔ اسی طرح عزت عطا کرنا ایک طرح سے اسے زندہ کرنا ہے کیونکہ جو شخص عزت سے محروم ہو وہ مردہ سے زیادہ کچھ نہیں کہ نہ تو کوئی اس کا نام لیتا ہے اور نہ ہی اس کے وجودی آثار دکھائی دیتے ہیں لیکن جوں ہی اسے عزت حاصل ہوتی ہے تو وہ شہرت پا لیتا ہے اور ہر زبان پر اس کا تذکرہ ہوتا ہے اور اس کے وجودی آثار نمایاں سے نمایاں تر ہو جاتے ہیں۔ یہی صورتحال مردہ سے زندہ کو نکالنے کی ہے اور اس کے برعکس کسی کو ذلت سے دوچار کر دینا ہے، تو گویا عزت میں ایک طرح کی زندگی اور ذلت میں ایک طرح کی

موت ہے۔

آیت کے معنی کا ایک اور پہلو

زیر نظر آیت مبارکہ کے معنی کی بابت ایک اور پہلو قابل توجہ ہے اور وہ یہ کہ خداوند عالم نے اپنے مقدس کلام میں دن کو روشن کرنے والا اور رات کو محو کرنے والی قرار دیا ہے چنانچہ ارشاد حق تعالیٰ ہے:

سورۂ اسراء، آیت: ۱۲

○ " فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ وَجَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً "

(ہم نے رات کی نشانی کو محو کر دیا اور دن کی نشانی کو روشن کرنے والا بنا دیا)

اس آیت کے تناظر میں روشن کرنے اور محو کرنے کا مظہر انسانی معاشرہ میں کسی کو حکومت واقتدار سے نوازنا اور اس سے محروم کرنا ہے، (اقتدار عطا کرنا گویا روشن کرنا اور اقتدار سے محروم کرنا گویا محو کر دینا ہے)۔

اسی طرح خداوند عالم نے زندگی کو علم وقدرت کے اظہار کا سرچشمہ اور موت کو جہل و عجز کا سبب قرار دیا ہے چنانچہ ارشاد ہوا:

سورۂ نحل، آیت: ۲۱

○ " اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ ۚ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۙ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ "

(وہ مردہ ہیں زندہ نہیں ہیں اور وہ یہ نہیں سمجھ سکتے کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے)

اسی طرح خداوند عالم نے عزت کو خود اپنے لئے اور اپنے رسول اور مومنین کے لئے مخصوص قرار دیا ہے، چنانچہ ارشاد ہوا:

سورۂ منافقون، آیت: ۸

○ " وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ "

(اور اللہ کے لئے ہے عزت اور اس کے رسول اور مومنین کے لئے ہے)

اس بناء پر عزت اور ذلت ہی انسانی معاشرہ میں زندگی اور موت کا مظہر قرار پاتے ہیں، (جسے عزت حاصل ہو گویا وہ زندہ ہے اور جو ذلت سے دوچار ہو گویا وہ مردہ ہے) یہی وجہ ہے کہ پہلی آیت میں اقتدار عطا کرنے، اقتدار سے محروم کرنے، عزت دینے اور ذلت سے دوچار کرنے کے مقابلے میں دوسری آیت میں رات کو دن میں داخل کرنے، دن کو رات

میں داخل کرنے، مردہ سے زندہ کو نکالنے اور زندہ سے مردہ کو نکالنے کا تذکرہ ہوا ہے، جس سے ان کے تقابلی معانی و موارد واضح ہو جاتے ہیں اور تطبیقی مثالیں بھی سامنے آ جاتی ہیں۔

ان دو آیتوں میں ایک اور حوالہ سے تقابلی صورت بھی سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ دوسری آیت میں ارشاد ہوا: "وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ" (اور تو جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے رزق دیتا ہے) جبکہ پہلی آیت میں ارشاد ہوا: "بِيَدِكَ الْخَيْرُ" (تیرے ہی ہاتھ میں ہے خیر)، اس سلسلہ میں عنقریب وضاحت کی جائے گی۔

بغیر حساب رزق کا عطا کرنا

O " وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ "
(اور تو جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے رزق عطا کرتا ہے)

سطور بالا میں دو آیتوں کے درمیان پائی جانے والی تقابلی صورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس امر کی نشاندہی ہوئی ہے کہ فقرہ " وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ " دراصل سابقہ ذکر شدہ مطالب یعنی اقتدار عطا کرنا، عزت دینا و رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرنا وغیرہ کی وضاحت کے طور پر ہے۔ لہٰذا یہاں عطف (کہ جو واو عاطفہ کے ساتھ ہوا ہے) عطف تفسیر قرار پائے گا یعنی اس فقرہ کے ذریعے سابقہ مطالب کی تفسیر و توضیح ہوئی ہے، اس طرح یہ فقرہ ایک خاص حکم کو اس سے عام و وسیع حکم کے ذریعے بیان کرنے کی ایک صورت قرار پائے گا۔ اور یہ اسی طرح ہوگا جیسے فقرہ "بِيَدِكَ الْخَيْرُ" اپنے ماقبل جملوں میں مذکور مطالب کے لئے تھا۔

بہرحال اس جملہ "وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ " کا معنی یہ ہوگا کہ تو ہی ہے اپنی مخلوق کے بارے میں ان تمام تصرفات کا حقیقی حقدار اور ان کے بارے میں ہر طرح کا فیصلہ کرنے والا، کیونکہ تو ہی ہے کہ جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے رزق عطا کرتا ہے۔

رزق کا قرآنی معنی

"رزق" کا معنی واضح و مشہور ہے اور اس کے استعمالی موارد سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معنی میں ایک طرح کی

بخشش، وعطاء کا حوالہ بھی پایا جاتا ہے مثلاً کہا جاتا ہے کہ بادشاہ اپنی فوج کو رزق دیتا ہے، اور یہ بات اس وقت کی جاتی ہے جب بادشاہ اپنی فوج کے لئے کھانے پینے کی اشیاء کی فراہمی کا بندوبست کرے، تو اس میں صرف غذائی اشیاء ہی مقصود ہوتی ہیں ان کے علاوہ کچھ نہیں، جیسا کہ ارشادِ حق تعالیٰ ہے:

سورۂ بقرہ، آیت ۲۳۳:

○ " وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ "

(اور جس کے ہاں بچہ پیدا ہوا ہے (والد) اس پر اپنی بیویوں کا موزوں و مناسب صورت میں رزق (کھانا پینا) اور لباس فراہم کرنا ضروری ہے)

اس آیت میں لباس کو "رزق" میں شامل قرار نہیں دیا گیا..... بلکہ علیحدہ ذکر کیا گیا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ رزق سے مراد صرف کھانے پینے کی اشیاء ہیں......

پھر "رزق" کے معنی میں وسعت ہوئی اور ہر اس غذا پر اس کا اطلاق ہوا جو انسان کو اس کے مقدر و حصہ کے مطابق اور کوشش کے ساتھ حاصل ہو خواہ اس کا عطا کرنے والا معلوم ہو یا معلوم نہ ہو، اور پھر اس کے معنی میں عمومیت و وسعت دی گئی اور حاصل ہونے والے ہر نفع و فائدہ کو "رزق" سے موسوم کیا گیا ہے خواہ وہ غذائی اشیاء نہ بھی ہوں مثلاً زندگی کی آسائشوں کے تمام اسباب یعنی مال و دولت، جاہ و عزت، خاندان و ساتھی، حسن و جمال اور علم و دانش وغیرہ،..... کہ ان میں سے ہر ایک زندگی کی آسائش و آسودگی کا سبب بنتا ہے....، اس حوالہ سے قرآن مجید میں ارشادِ حق تعالیٰ ہے:

سورۂ مومنون، آیت ۷۲:

○ " تَسْئَلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ "

(کیا تم ان سے خرچہ مانگتے ہو، تیرے رب کا عطا کردہ رزق بہتر ہے کہ وہ بہتر رزق دینے والا ہے)

اسی طرح حضرت شعیبؑ کا قول ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا کہ انہوں نے کہا:

سورۂ ہود، آیت ۸۸:

○ " يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا "

(اے میری قوم! تم نے دیکھا ہے کہ میں اپنے رب کی طرف سے مضبوط دلیل رکھتا ہوں اور اس نے مجھے بہترین رزق عطا کیا ہے)

اس آیت میں "رزق" سے مراد نبوت اور علم ہے، اس کے علاوہ دیگر آیات میں بھی موجود ہیں جن میں اسی طرح کے معانی مقصود ہیں۔

اور جہاں تک درج ذیل آیت مبارکہ کا تعلق ہے:

سورۂ ذاریات، آیت ۵۸:

○ " اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّۃِ الْمَتِیْنُ "

(بے شک اللہ ہی رزق دینے والا ہے جو زبردست طاقت والا ہے)

تو اس میں اگرچہ رزق عطا کرنے کو خدا سے مختص و مخصوص قرار دیا گیا ہے کہ یہ مقام، مقامِ حصر ہے یعنی یہ مقام ہی اس بات کا متقاضی تھا کہ یہاں انہی الفاظ میں رزق عطا کرنا ذکر کیا جائے، لیکن اس سے درج ذیل چند اہم نکات معلوم ہوتے ہیں:

(۱) حقیقی معنی میں "رزق" کی نسبت صرف خداوند عالم کی طرف ہوتی ہے اور جہاں بھی اسے خدا کے علاوہ کسی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے تو وہ خدائی عمل کو غیر خدا سے منسوب کرنے کے طور پر ہوتا ہے کہ جس کا سرچشمہ ذات پروردگار کی عطا واذن ہے، چنانچہ اس کی ایک مصداقی مثال درج ذیل آیت مبارکہ میں پائی جاتی ہے:

سورۂ جمعہ، آیت ۱۱:

○ " وَاللّٰہُ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ "

(اور اللہ بہتر رزق عطا کرنے والا ہے)

اس آیت میں رزق دینے والے دیگر افراد کا ثبوت ملتا ہے اور خداوند عالم کو ان سے بہتر قرار دیا گیا ہے۔

اور سورۂ نساء، آیت ۵ میں اس طرح ارشاد ہوا:

○ " وَّارْزُقُوْھُمْ فِیْھَا وَاکْسُوْھُمْ "

(اور انہیں رزق دو اور لباس دو)

"رزق" کی طرح اقتدار اور عزت جو کہ ذات الٰہی سے مختص و مخصوص ہے اور اس کی "ذاتی" ہے وہ اس کے علاوہ دوسروں کے لئے اس کی عطا واذن سے ہوتی ہے کہ غیر اللہ کی عزت اور اقتدار خدا کے اذن و عطا کا مرہون منت اور اس سے وابستہ ہوتا ہے، بنابرایں حقیقت میں وہی رازق ہے نہ کہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا،

(۲) مخلوق اپنے وجود میں جس چیز سے بہرہ ور ہوتی ہے وہ ان کا رزق ہے اور خدا وہ رزق عطا کرنے والا ہے چنانچہ اس مطلب کا ثبوت رزق کے ذکر و بیان پر مشتمل کثیر آیات کے ساتھ دیگر کثیر آیات میں بھی پایا جاتا ہے مثلاً وہ آیات جن سے اس حقیقت کا ثبوت ملتا ہے کہ خلق، امر، اقتدار، مالکیت، مشیت، تدبیر اور خیر خالصتاً خدائے عزوجل سے مختص و مخصوص ہے۔

(۳) انسان جس حرام سے بہرہ ور ہوتا ہے وہ معصیت کا سبب ہونے کی وجہ سے خدا کی طرف منسوب نہیں ہوتا کیونکہ خداوند عالم نے ہر طرح کے فعل حرام اور معصیت و گناہ کی نسبت کی اپنی ذات سے نفی کی ہے کہ وہ ہرگز برے کام کو روا قرار نہیں دیتا چنانچہ اس کا ارشاد گرامی ہے:

سورۂ اعراف، آیت :۲۸

○ " قُلۡ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَاۡمُرُ بِالۡفَحۡشَآءِ ؕ اَتَقُوۡلُوۡنَ عَلَی اللّٰہِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ "

(کہہ دیجئے کہ اللہ برے کام کا حکم نہیں دیتا، کیا تم خدا کے بارے میں وہ کچھ کہتے ہو جس کا تمہیں علم ہی نہیں)

سورۂ نحل، آیت :۹۰

○ " اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُ بِالۡعَدۡلِ وَ الۡاِحۡسَانِ...... وَ یَنۡہٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَ الۡمُنۡکَرِ "

(بے شک، اللہ عدل اور نیکی کرنے کا حکم دیتا ہے......اور برائی اور بدی سے روکتا ہے)

تو یہ بات ذات احدیت سے ہرگز ممکن نہیں بلکہ وہ اس سے پاک و بالاتر ہے کہ وہ کسی کام سے روکے اور پھر اسی کا حکم دے یا کسی کو کسی کام سے روکے اور پھر اس کے رزق و روزی کو اسی میں منحصر کر دے۔

تکوین و تشریع کے حوالوں سے !

اس مقام پر ایک اہم نکتہ کی وضاحت خالی از فائدہ نہ ہوگی کہ عین ممکن ہے کوئی چیز عالم تکوین میں "رزق" کا مصداق ہو جبکہ عالم تشریع میں "رزق" نہ ہو یعنی اسے حرام قرار دیا گیا ہو اور حرام قرار دیئے جانے کی بناء پر "رزق" کا مصداق نہ بنے، ان دو مطالب کے درمیان منافات یعنی ایک دوسرے کی نفی کا پہلو نہیں پایا جاتا کیونکہ عالم تکوین میں کوئی حکم ہی نہیں ہوتا کہ جس کی بناء پر کوئی چیز یا کام برا قرار پائے،......لہٰذا کسی چیز کی تخلیق اور اس کے بارے میں حکم صادر کرنے میں تضاد نہیں پایا جاتا اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جب فلاں چیز حرام ہے تو اسے خلق ہی کیوں کیا گیا ہے کیونکہ تکوین و تخلیق کا عالم کچھ اور ہے اور تشریع کا عالم کچھ اور!......، اور قرآن مجید میں رزق کی بابت جو عمومیت و وسعت مذکور ہے اور رزق و عطائے رزق کی نسبت خدا کی طرف علی الاطلاق دی گئی ہے تو اس کا تعلق عالم تکوین سے ہے اور جہاں کسی رزق سے منع کیا گیا ہے تو اس کا تعلق عالم تشریع سے ہے۔

قرآنی معارف سے غلط فہمی کیوں؟

ممکن ہے کوئی شخص سوال کرے کہ آیا بہتر نہیں کہ جو معارف عامتہ الناس کے ذہنوں میں غلط فہمی کا سبب بنتے ہیں ان کے ذکر و بیان سے پرہیز کیا جاتا اور قرآن مجید میں ان کا تذکرہ ہی نہ ہوتا تاکہ کوئی شخص ان سے غلط معنی مراد نہ لے سکتا،

تو اس کا جواب یہ ہے کہ کلام الٰہی صرف عوام الناس اور سادہ لوح افراد کے لئے نازل نہیں ہوا کہ ان کی وجہ سے حقیقی معارف کو بیان کرنے سے گریز و احتراز کیا جائے بلکہ قرآن مجید میں تمام دلوں کے لئے شفاء ہے اور اس مقدس کلام الٰہی سے صرف وہی لوگ نقصان اٹھاتے ہیں جو حق کی راہ سے بھٹکے ہوئے ہوں اور حقیقت کی روشنی سے محروم ہوں، چنانچہ اس سلسلہ میں خداوند عالم کا ارشاد گرامی ہے:

سورۂ اسراء، آیت: ۸۲

O "وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا"

(اور ہم قرآن سے جو کچھ بھی نازل کرتے ہیں وہ مومنین کے لئے شفاء اور رحمت ہے اور ظالموں کو زیادہ سے زیادہ خسارہ و نقصان کے علاوہ کچھ حاصل نہ ہوگا)۔

اس کے علاوہ قرآن مجید کی آیات مبارکہ میں واضح طور پر دکھائی دیتا ہے کہ ان میں نمرود و فرعون جیسوں کو حکمرانی و اقتدار عطا کئے جانے اور قارون جیسوں کو مال و دولت کے وسیع خزانے و خزینے عطا کئے جانے کی نسبت خداوند عالم کی طرف دی گئی ہے کہ یہ سب کچھ اسی نے انہیں دیا ہے، تو اس نسبت کی اصل بنیاد اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ سب کچھ خدا کے اذن سے ہے اور اس نے انہیں یہ نعمتیں ان کی آزمائش و امتحان کی غرض سے اور ان پر اپنی حجت تمام کرنے کے لئے دیں کہ ان نعمتوں کی بے قدری کی صورت میں انہیں ذلت و رسوائی اور خواری و بیچارگی سے دوچار کرنے کا جواز پیدا ہو سکے، تو یہ تمام نسبتیں تشریعی حیثیت میں ہیں اور جب تشریعی نسبتیں صحیح ہوں اور ان سے کوئی قباحت لازم نہ آتی ہو تو تکوینی نسبتوں کا صحیح ہونا بطریق اولیٰ واضح ہے کیونکہ ان میں عقلائی حسن و قبیح کی گنجائش ہی نہیں پائی جاتی۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی ناقابل انکار ہے کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے کہ ہر چیز اس کی مخلوق اور پیدا کی ہوئی اور اس کے خزانہ ہائے رحمت میں سے نازل کی ہوئی ہے چنانچہ درج ذیل آیت میں اس سلسلہ میں واضح بیان مذکور ہے:

سورۂ حجر، آیت :۲۱

○ " وَ اِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا عِنۡدَنَا خَزَآئِنُهٗ ۫ وَ مَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعۡلُوۡمٍ ﴿۲۱﴾ "

(کوئی چیز ایسی نہیں مگر اس کے خزانے ہمارے پاس ہیں (ہر چیز کے خزانے ہمارے پاس ہیں) اور ہم اسے نازل نہیں کرتے مگر معلوم اندازہ کے ساتھ!)

اور خداوند عالم نے یہ بھی ذکر فرمایا کہ جو کچھ بھی اس کے پاس ہے وہ "خیر" ہے چنانچہ ارشاد ہوا:

سورۂ قصص، آیت :۶۰

○ " وَ مَا عِنۡدَ اللّٰهِ خَیۡرٌ "

(اور جو کچھ خدا کے پاس ہے وہ "خیر" ہے)

ان دو آیتوں اور ان کے ہم معنی دیگر آیات مبارکہ کو ایک دوسرے سے ملا کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ موجودات عالم میں سے جو چیز بھی جو کچھ حاصل کرتی ہے اور اپنے وجود و ہستی کے حوالہ سے جس شے سے بھی بہرہ ور ہوتی ہے اس کا سرچشمہ ذات خداوندی ہے اور وہ اس کے لئے "خیر" ہوتی ہے کہ وہ اس سے استفادہ کرے، لطف اندوز ہو اور اس سے اپنی ضرورتوں کو پورا کرے چنانچہ درج ذیل دو آیتوں کو باہم ملا کر دیکھیں تو یہ مطلب واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے:

سورۂ الم سجدہ، آیت :۷

○ " الَّذِیۡۤ اَحۡسَنَ کُلَّ شَیۡءٍ خَلَقَهٗ "

(وہ کہ جس نے ہر چیز کی تخلیق نہایت خوبصورت بنائی)

سورۂ مؤمن، آیت :۶۲

○ " ذٰلِکُمُ اللّٰهُ رَبُّکُمۡ خَالِقُ کُلِّ شَیۡءٍ ۘ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ "

(وہ خدا ہے تمہارا پروردگار، جو ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں)

بعض اشیاء مضر کیوں؟

اس مقام پر ایک سوال ممکن ہے اور وہ یہ کہ جب ہر شے خدا کی مخلوق اور اس کی عطا کردہ ہے تو جو چیزیں بعض لوگوں کے لئے مضر ثابت ہوتی ہیں ان کے بارے میں کیا کہا جائے گا ؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ خداوند عالم کی عطا کردہ ہر شے "خیر" اور سراپا خیر ہے اور جہاں تک کسی چیز کے برا اور "شر"

ہونے کا تعلق ہے تو اس کا ضرر رساں و نقصان دہ ہونا اسی شخص سے مخصوص ہوتا ہے جسے وہ لاحق ہوتی ہے ہر شخص کے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے لئے وہ اپنی اصل یعنی "خیر" اور مفید ہونے کی صفت و حالت کی حامل ہوتی ہے اور وہ عالم ہستی میں جاری و ساری نظام میں اپنے وجود میں آنے کے علل و اسباب کے حوالہ سے "خیر" کا مصداق ہوتی ہے، چنانچہ اس مطلب کی طرف درج ذیل آیت مبارکہ میں ارشاد ہوا ہے:

سورۂ نسآء، آیت :۷۹

○ "وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ"

(اور تمہیں جو تکلیف پہنچے وہ تمہاری اپنی طرف سے ہوتی ہے)

اس موضوع کی بابت پہلے تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ خداوند عالم جو کچھ بھی اپنی مخلوق کو عطا کرتا ہے وہ "خیر" اور فوائد کا سرچشمہ ہے اور وہ "رزق" کا واضح مصداق ہے کہ جس پر "رزق" و روزی ہونے کا معنی پوری طرح صادق آتا ہے کیونکہ "رزق" اس عطا و عطیہ کا نام ہے جو اس چیز کے لئے نفع بخش و فائدہ مند ہو جسے عطا کیا گیا ہو، عین ممکن ہے درج ذیل آیت مبارکہ کا اشارہ بھی اسی مطلب کی طرف ہو:

سورۂ طٰہٰ، آیت :۱۳۱

○ "وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ"

(اور تیرے رب کا رزق خیر ہے)

مذکورہ بالا مطالب سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآنی بیانات کی روشنی میں رزق، اور خلق سب مساوی امور ہیں، بنا بریں ہر رزق خیر اور مخلوق ہے اور ہر مخلوق رزق اور خیر ہے، ان میں فرق اس حوالہ سے ہے کہ رزق، مرزوق (جسے رزق دیا جائے) چاہتا ہے جو رزق سے استفادہ کرے..... مرزوق کے تصور کے بغیر رزق کا تصور ہی بے معنی ہے..... چنانچہ غذا، قوت غاذیہ (وہ بدنی قوت جو غذا چاہتی ہے اور اس کا تعلق غذا سے ہوتا ہے) کے لئے رزق ہے کیونکہ وہ قوت اس کی محتاج ہوتی ہے، اور قوت غاذیہ انسان کے لئے رزق ہے کیونکہ وہ اس کا محتاج ہے، اور انسان اپنے والدین کے لئے رزق ہے کیونکہ انہیں اس کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح انسان کا وجود اس کے لئے خیر ہے کیونکہ ایسی مخلوق بھی قابل تصور ہے جو اس نعمت خداوندی سے محروم ہے چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

سورۂ طٰہٰ، آیت :۵۰

○ " اَلَّذِیۡۤ اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَهٗ "

(اور وہ کہ جس نے ہر چیز کو اس کی خلقت (وجود و ہستی) عطا کی)

یہ تو ہے رزق اور خلق و خیر کے فرق کی بات، اور جہاں تک "خیر" کا تعلق ہے تو اس کے لئے بھی کسی ایسے کا تصور ضروری ہے جو اس کا محتاج (یعنی اسے اس کی ضرورت ہو) اور اس کا طلبگار ہو کہ جو کچھ اس کے سامنے آئے وہ اس میں سے اسے اختیار کرے جس کا وہ طلبگار ہو مثلاً غذا، قوت غاذیہ کے لئے خیر ہے اور یہ اس وقت ہوتا ہے جو قوت غاذیہ کو اس کا محتاج و طلبگار تصور کریں کہ وہ خود غذاؤں میں سے کسی غذا کا انتخاب کرتی ہے اور اسے اپنے لئے پسند کرتی ہے، اور قوت غاذیہ انسان کے لئے خیر ہے اور انسان کا وجود اس کے لئے یوں خیر ہے کہ اسے اس کی احتیاج اور طلب ہو، (گویا وہ ایک دوسرے کے محتاج و ضرورت مند اور طلبگار ہونے کی بناء پر ایک دوسرے کے لئے خیر کہلاتے ہیں)۔

اور اب خلق و ایجاد کی بات، تو اس کے لئے کسی حقیقی یا فرضی چیز کی ضرورت نہیں جس سے اس کا معنیٰ تحقق پذیر ہو چنانچہ غذا، جو کہ ایک مخلوق ہے وہ اپنے طور پر وجود رکھتی ہے...... خواہ اسے کھانے والا ہو یا نہ ہو......، اسی طرح قوت غاذیہ مخلوق ہے اور انسان مخلوق ہے۔

اور چونکہ ہر رزق کا سر چشمہ فیض خدا ہے اور ہر خیر خالصتاً اللہ کے لئے ہے لہٰذا وہ جو کچھ عطا کرے اور جس خیر اور رزق سے نوازے وہ اس کا بلا عوض عطیہ ہے کہ وہ اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں لیتا اور نہ ہی اس کے عوض میں کوئی چیز قرار پا سکتی ہے کیونکہ ہم جس چیز کا بھی فرض و تصور کریں وہ حقیقی طور پر اللہ تعالیٰ کے لئے ہے یعنی اسکے عطیہ کے عوض کے طور پر جو چیز بھی فرض کریں وہ بھی اس کے عطیہ ہی کی طرح اس کا مال ہے اور حقیقی معنیٰ میں اس کی ہے، مخلوق کا اس پر کوئی حق بنتا ہی نہیں ہے سوائے اس حق کے کہ جسے اس نے خود اپنی مخلوق کے لئے اپنے اوپر قرار دیا ہے جیسا کہ اس نے رزق عطا کرنے کی بابت قرار دیا ہے چنانچہ اس کا ارشاد ہے:

سورۂ ہود، آیت :۶

○ " وَمَا مِنۡ دَآبَّةٍ فِی الۡاَرۡضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزۡقُهَا "

(اور زمین میں کوئی جاندار نہیں مگر یہ کہ اللہ پر ہے اس کا رزق و روزی!)

سورۂ ذاریات، آیت :۲۳

○ " فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثۡلَ مَاۤ اَنَّكُمۡ تَنۡطِقُوۡنَ "

(آسمان و زمین کے رب کی قسم کہ وہ (وعدۂ رزق) اسی طرح حق ہے جس طرح تمہارا بات کرنا!)

بنابراین رزق جوکہ اللہ پرایک ثابت و مسلم حق ہے چونکہ اس نے یہ حق خود اپنے اوپر ثابت و لازم قرار دیا ہے اس کا بندوں پر عطیہ ہے کہ جو مرزوق (جسے رزق دیا گیا ہے) کی طرف سے خدا پر حق کی صورت میں نہیں بلکہ خود اللہ کی طرف سے اپنے اوپر قرار دیئے جانے والا حق ہے۔

اس بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جو شخص حرام رزق کھاتا ہے وہ اپنے حلال رزق کے حصہ سے کھاتا ہے کہ جو خدا نے اسے عطا کیا ہے کیونکہ یہ بات ذات اقدس خداوند عالم کے شایان شان نہیں بلکہ وہ اس سے کہیں بالاتر اور ماوراء ہے کہ کسی انسان کا رزق و روزی اپنے اوپر ایک ثابت و مسلم حق قرار دے پھر اسے حرام طریقہ سے رزق عطا کرے اور پھر اسے اس رزق میں تصرف کرنے اور اسے کام میں لانے سے منع کر کے اس پر اس کا مؤاخذہ کرے اور سزا دے۔

مزید وضاحت

رزق، خلق اور خیر کے مساوی امور ہونے کی بابت مزید وضاحت یہ ہے کہ: رزق چونکہ خیر کے ساتھ عطیہ الٰہی ہے لہٰذا اس حوالہ سے وہ خلق پر خدا کی رحمت ہے اور جس طرح رحمت کی دو قسمیں ہیں: (۱) رحمت عام (۲) رحمت خاص، عام رحمت جو کہ تمام مخلوق کو حاصل ہوتی ہے خواہ وہ مومن ہو یا کافر، متقی ہو یا فاجر و بدکار اور انسان ہو یا غیر انسان، سب اس رحمت کے سایے میں آتے ہیں، اور خاص رحمت جو کہ سعادت کی راہ میں آتی ہے جیسے ایمان، تقویٰ، بہشت، تو رحمت کی ان دو قسموں کی طرح رزق کی بھی دو قسمیں ہیں: عام رزق اور خاص رزق: عام رزق وہ عطیہ الٰہی ہے جو ہر وجود رکھنے والی چیز کو حاصل ہوتا ہے کہ اس کی بقائے وجود و ہستی میں مددگار ثابت ہوتا ہے اور خاص رزق وہ ہے جو بذریعہ حلال حاصل ہوتا ہے، اور جس طرح عام رحمت اور عام رزق لوح تقدیر میں لکھا جا چکا ہے کہ جس کی بابت ارشاد الٰہی ہے:

سورۂ فرقان، آیت: ۲

○ " وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا "

(اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر اس کا اندازہ و تقدیر مقرر کر دی)

اسی طرح خاص رحمت اور خاص رزق بھی لوح تقدیر میں لکھے جا چکے ہیں، اور اسی طرح خاص رحمت اور خاص رزق کی دوسری صورت ہے یعنی ہدایت جو کہ خاص رحمت ہے وہ لوح تقدیر میں لکھی ہوئی ہے اور تشریعی طور پر ہر انسان کے لیے خواہ وہ مؤمن ہو یا کافر ہو مقدر و مقرر ہو چکی ہے چنانچہ اسی مقصد کے لئے خداوند عالم نے پیغمبروں کو بھیجا اور کتابیں نازل کیں، اس حوالہ سے ارشاد خداوندی ہے:

سورۂ ذاریات، آیت :۵۸

○ "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝ مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ۝ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ۝"

(اور میں نے نہیں پیدا کیا جنوں اور انسانوں کو، مگر اس لئے کہ وہ میری عبادت کریں، میں ان سے کوئی روزی نہیں چاہتا اور نہ ہی یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھانا کھلائیں، بے شک اللہ ہی ہے جو رزق دینے والا ہے اور وہ ٹھوس طاقت کا مالک ہے)

سورۂ اسراء، آیت :۲۳

○ " وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ "

(اور تیرے رب نے فیصلہ...... وحکم...... کیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو)

تو عبادت جو کہ ہدایت چاہتی ہے اور ہدایت ہی پر موقوف ہے وہ تشریعی طور پر مقدر ومقرر کی جا چکی ہے، اسی طرح خاص رزق جو کہ راہِ حلال سے حاصل ہو وہ بھی مقدر ومقرر ہو چکا ہے چنانچہ ارشادِ حق تعالیٰ ہے :

سورۂ انعام، آیت :۱۴۰

○ " قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ ۭ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ "

(یقیناً نقصان اٹھایا ان لوگوں نے جنہوں نے بے وقوفی وجہالت کی بناء پر اپنی اولاد کو قتل کیا اور خدا پر بہتان وتہمت لگاتے ہوئے اس رزق کو حرام کیا جو انہیں اللہ نے دیا، وہ گمراہ ہوئے اور وہ ہدایت پانے والے نہیں)

سورۂ نحل، آیت :۷۱

○ " وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ "

(خدا نے تم میں سے بعض کو دوسرے بعض پر رزق میں برتری دی اور وہ کہ جنہیں برتری دی گئی وہ اپنے زرخرید غلاموں کو ان کا رزق نہیں دیتے کہ وہ اس میں ان کے برابر نہ ہو جائیں)

مذکورہ بالا دونوں آیتوں میں ...... جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں...... اطلاق وعمومیت پائی جاتی ہے جس میں کافر، مومن، حلال ذریعہ سے رزق پانے والا اور حرام ذریعہ سے رزق پانے والا سب شامل ہیں، یعنی ان سب کو رزق حاصل ہوتا ہے اس حوالہ سے کسی طرح کی قید وشرط نہیں پائی جاتی کہ جس سے کسی خاص گروہ کا اختصاص ظاہر وثابت ہو بلکہ آیتوں کا

اطلاق ان سب کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔

رزق کی وسعت و تنگی

اس مقام پر ایک اہم مطلب سے آگاہی پانا واجب وضروری ہے کہ رزق جیسا کہ اس کا معنی ذکر ہو چکا ہے اس سے مراد وہ شے ہے جس سے مرزوق (جسے رزق دیا گیا ہو) استفادہ کر سکے، ظاہر ہے کہ دیئے جانے والے مال میں سے اسی مقدار کو رزق کہا جائے گا جس سے استفادہ ہوا ہو چنانچہ وہ شخص کہ جسے کثیر مال دیا گیا ہو وہ اس میں سے کم مقدار میں استعمال کرتا ہے، تو جس مقدار کو وہ استعمال کرتا ہے وہی اس کا رزق کہلاتا ہے، اور جو اس سے زائد ہو وہ استعمال نہ ہونے کی بناء پر رزق نہیں کہلاتا، اگرچہ وہ اس کو دیا جانے والا مال ضرور کہلاتا ہے لیکن اس سے استفادہ کی بناء پر صرف اسی مقدار کو رزق سے موسوم کیا جاتا ہے جسے وہ اپنے استعمال میں لا کر اس سے نفع پاتا ہے۔ بنابرایں رزق کی وسعت وتنگی، مال کے زیادہ یا کم ہونے سے کوئی تعلق نہیں رکھتی......عین ممکن ہے کہ کسی کے پاس مال زیادہ ہو مگر وہ اس سے نہایت کم مقدار میں استفادہ کرے کہ جو اس کا رزق کہلاتا ہے، اور اس کے برعکس وہ شخص کہ جس کے پاس مال کم ہو مگر وہ اس مقدار سے زیادہ استعمال میں لاتا ہو، لہٰذا مال کا زیادہ یا کم ہونا رزق کی وسعت وتنگی سے مربوط نہیں.....،

رزق کی بحث میں مزید مطالب درج ذیل آیت مبارکہ کی تفسیر میں ذکر کیے جائیں گے:

سورۂ ہود، آیت :۶

○ " وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۭ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝ "

(زمین میں کوئی جاندار نہیں مگر اللہ پر ہے اس کا رزق، اور وہ اس کے قرار پانے اور چھوڑنے کی جگہوں سے آگاہ ہے، سب کچھ واضح و کھلی ہوئی کتاب میں مرقوم ہے)

اب ہم اپنے اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہیں اور آیت مبارکہ **"وترزق من تشاء بغیر حساب"** (اور تو رزق دیتا ہے جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے) کی بابت مربوطہ مطالب ذکر کرتے ہیں:

اس آیت میں رزق کو بلاحساب ہونے کی صفت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ رزق کا عطا کیا جانا خداوند عالم کی طرف سے ہے اور وہ جنہیں رزق عطا کرتا ہے ان کو ملحوظ رکھتے ہوئے دیتا ہے، اسے رزق عطا کرنے میں کسی مرزوق سے نہ تو کسی عوض ومعاوضہ کی طلب ہوتی ہے اور نہ ہی مرزوق کے استحقاق یا طلب کا اس میں کوئی دخل ہوتا ہے

اور نہ ہی کوئی ایسی دوسری وجہ وسبب کہ جس کی بناء پر خدا کسی کو رزق دیتا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ رزق خود خدا کا مملوک ہوتا ہے اور اس کی ذات اور ذات کی تمام متعلقات کا مالک خدا ہے لہٰذا خدا کا عطیہ، مرزوق سے کسی معاوضہ سے وابستہ نہیں ہوتا، اسی وجہ سے وہ بلا حساب ہوتا ہے، (کیونکہ حساب و کتاب کا مسئلہ وہاں آتا ہے جہاں عوض و معاوضہ مطلوب و مقصود یا ملحوظ ہو، جہاں معاوضہ وغیرہ کی بات ہی نہ ہو وہاں عطیہ کا حساب و کتاب کیسا؟)

اس مقام پر اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ رزق کے بلا حساب ہونے (یعنی اس سے حساب کی نفی کرنے) سے یہ مراد لینا کہ اس کی کوئی حد و اندازہ مقرر نہیں، غلط و نادرست ہے کیونکہ آیات القدر یعنی وہ آیات مبارکہ جن میں رزق کے مقدر اور اندازہ شدہ ہونے کا ثبوت ملتا ہے اس نظریہ کی نفی کرتی ہیں، ملاحظہ ہو:

سورۂ قمر، آیت :۴۹

O "اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ﴿۴۹﴾ "

(بے شک ہم نے ہر چیز کو اندازے کے مطابق پیدا کیا ہے)

سورۂ طلاق، آیت :۳

O "وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ﴿۲﴾ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۭ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ۭ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ﴿۳﴾ "

(اور جو شخص تقوائے الٰہی اختیار کرے تو خدا اس کے لئے راہ نکال دیتا ہے اور اسے اس طرح سے رزق دیتا ہے جس کا وہ گمان بھی نہیں کرتا، اور جو شخص اللہ پر بھروسہ کرے تو خدا اس کی کفایت کرتا ہے، بے شک اللہ اپنے کام کو پورا کرنے والا ہے، اللہ نے ہر چیز کا اندازہ مقرر کیا ہے)

بنابرایں رزق، اللہ تعالیٰ کا بلا عوض عطیہ ہے لیکن اس کے باوجود اس کا اندازہ و مقدار خدا کے ارادہ سے معین کی گئی ہے، وہ جتنا جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔

بہر حال مذکورہ بالا دو آیتوں سے چار اہم مطالب بطور نتیجہ معلوم ہوتے ہیں:

(۱) "مُـلک" (م پر پیش کے ساتھ) یعنی حاکمیت واقتدار اعلیٰ، سب کا سب اللہ کے لئے ہے، وہی اس کا سرچشمہ اور محور و مرکز ہے، اور یہ اسی طرح سے ہے جیسے "مِلک" (م کے نیچے زیر کے ساتھ) یعنی مالکیت سب کی سب اللہ کے لئے ہے اور وہی ہر شے کا مالک علی الاطلاق ہے۔

(۲) ہر طرح کی "خیر" اللہ کے ہاتھ میں ہے اور وہی اس کا سرچشمۂ فیض ہے۔

(۳) رزق خدائی عطیہ ہے جو وہ مخلوق کو کسی عوض اور استحقاق کے بغیر عطا کرتا ہے یعنی نہ تو اس کے بدلے میں ان

سے کسی معاوضہ کا مطالبہ کرتا ہے اور نہ ہی کسی ایسے حق کے بدلے میں عطا کرتا ہے جو مخلوق کا خالق کے ذمہ میں بنتا ہو۔

(۴) حاکمیت و مالکیت، عزت اور معاشرتی حوالہ سے حاصل ہونے والی ہر ''خیر'' مثلاً مال و دولت، جاہ و جلال اور قوت وغیرہ سب کچھ ایک طرح کا رزق ہے جس سے مرزوق (جسے رزق عطا کیا گیا ہو) استفادہ کرتا اور کرسکتا ہے۔

روایات پر ایک نظر

مالک الملک سے کیا مراد ہے؟

کتاب کافی میں آل سام کے غلام، عبدالاعلیٰ سے مروی ہے انہوں نے امام جعفر صادقؑ سے پوچھا کہ آیت مبارکہ " اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ " (اے اللہ! اے مالک الملک، تو ملک و اقتدار عطا کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور حکومت و اقتدار چھین لیتا ہے جس سے چاہتا ہے) میں حکومت و اقتدار عطا کرنے سے مراد بنی امیہ کو عطا کیا جانے والا اقتدار نہیں ہے؟ (قد آتی الله بنی امية الملک ؟)

امامؑ نے جواب دیا:

" لیس حیث تذهب ، ان الله عزوجل آتانا الملک و اخذته بنی امية بمنزلة الرجل یکون له الثوب فیاخذه الآخر فلیس هو للذی اخذه "

ایسا نہیں جو تو نے سوچا ہے، حقیقت یہ ہے کہ خداوند عالم نے ملک و اقتدار ہمیں عطا کیا اور بنی امیہ نے اس پر اس طرح غاصبانہ قبضہ کرلیا جیسے کسی شخص کے پاس کپڑے ہوں اور کوئی دوسرا اس سے چھین لے تو وہ حقیقی معنی میں اس کے نہ ہوں گے جس نے ناجائز طور پر ان پر قبضہ جمایا ہو، (اور ایسا نہیں کہا جاسکتا کہ خدا نے وہ کپڑے اسے عطا کئے ہیں کیونکہ ان کا اصل مالک کوئی اور ہے، اسی طرح اگر بنی امیہ نے ہماری خداداد حاکمیت پر قبضہ کرلیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ خدا نے انہیں عطا کیا ہے۔ م) (روضۃ الکافی جلد ۸ حدیث ۳۸۹)

وضاحت: اسی طرح کی ایک روایت تفسیر العیاشی میں داؤد بن فرقد کے حوالہ سے امام جعفر صادق علیہ السلام سے ذکر کی گئی ہے، اور " تُؤْتِي الْمُلْكَ " (تو حکومت دیتا ہے جسے چاہتا ہے) میں حکومت دینے کا جو ذکر ہے اس سلسلے

میں پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اس کی دو قسمیں ہیں:

(۱) تکوینی طور پر عطا کرنا

(۲) تشریعی طور پر عطا کرنا

تکوینی عطیہ سے مراد تخلیقی طور پر سلطنت اور لوگوں پر حاکمیت کا پھیلاؤ اور ان میں اپنی قدرت و اقتدار کا نافذ کرنا ہے، خواہ وہ عدل پر مبنی ہو یا ظلم کے ساتھ ہو (عادلانہ طور پر ہو یا ظالمانہ طور پر) جیسا کہ خداوند عالم نے نمرود کے بارے میں ارشاد فرمایا:

سورۂ بقرہ، آیت: ۲۵۸

○ " اَنْ اٰتٰهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ "

(خدا نے اسے حکمرانی عطا کی)

اس آیت میں نمرود کی جابرانہ سلطنت کو خدا نے اپنی عطا کردہ قرار دیا ہے، سلطنت و حاکمیت سے مراد یہ ہے کہ حاکم کا فرمان و دستور نافذ العمل ہو اور وہ جو چاہے اس کی اطاعت و فرمان برداری ہو۔

حاکمیت کے تکوینی عطیہ ہونے کی بابت ہم عنقریب مزید بحث و مطالبہ ذکر کریں گے۔

تشریعی عطیہ سے مراد یہ ہے کہ خداوند عالم کسی کو حاکم قرار دے کر اس کی اطاعت و فرمانبرداری کو واجب و لازم کرے، جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:

سورۂ بقرہ، آیت: ۲۴۷

○ " اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا "

(بے شک اللہ نے تمہارے لئے طالوت کو بادشاہ بنا کر بھیجا ہے)

تشریعی حاکمیت کا اثر و نتیجہ اطاعت و فرمانبرداری کا واجب و لازمی ہونا، ولایت و حکمرانی کا قطعی و یقینی ہونا ہے اور وہ عدل پر مبنی ہونے کے سوا ممکن نہیں اور وہ ایسا مقام و منزلت ہے جو اللہ تعالٰی کے نزدیک نہایت پسندیدہ و لائق ستائش ہے اور جہاں تک اس اقتدار و حکمرانی کا تعلق ہے جو بنی امیہ کو حاصل تھی تو وہ حاکمیت و اقتدار (مُلک، م پر پیش کے ساتھ) کے مذکورہ بالا پہلے معنی کی بناء پر تھی اور اسی کا نتیجہ و اثر تھا، دراصل اس کی بابت راوئ حدیث کو غلط فہمی ہوئی ہے کہ اس نے ان کے اقتدار کو تو پہلے معنی کے ساتھ سمجھا ہے مگر اس کا نتیجہ و اثر دوسرے معنی کے ساتھ خیال کیا جو کہ تشریعی حاکمیت کا مقام ہے یعنی اس نے یہ سمجھا کہ جب تکوینی طور پر اقتدار انہیں حاصل ہوا ہے تو تشریعی طور پر بھی وہ حاکم ہیں اور ان کی اطاعت واجب و لازم ہے جبکہ حقیقت الامر اس کے مطابق نہیں اسی وجہ سے امام علیہ السلام نے اسے متوجہ و باخبر کیا کہ بنی امیہ کو تشریعی حاکمیت حاصل

نہیں بلکہ وہ صرف انہی کو (امام علیہ السلام کو) حاصل ہے اور وہی اس کے اثر و نتیجہ یعنی واجب الاطاعۃ ہونے کے حقدار ہیں، ان کے علاوہ کسی کو وہ حاکمیت یعنی خدا کی عطا کردہ حکمرانی حاصل نہیں جس کی بناء پر حاکم کی اطاعت و پیروی اور فرمانبرداری واجب و لازم ہوتی ہے، دوسرے لفظوں میں یہ کہ جو حکمرانی بنی امیہ کو حاصل تھی وہ اس صورت میں پسندیدہ و لائق ستائش ہوتی جب وہ آئمہ اہل بیت علیہما السلام کے پاس ہوتی اور چونکہ اس پر بنی امیہ نے قبضہ کیا لہٰذا وہ مذموم کہلائی کیونکہ نااہل اور غیر حقدار کے پاس ہونے کی وجہ سے لائق ستائش و قابل تعریف ہونے کی بجائے لائق مذمت ہوگئی، بنا بریں اسے خدا کا عطیہ قرار دینا ہرگز درست نہیں بلکہ اس کی حیثیت نمرود و فرعون کو حاصلہ اقتدار و حکمرانی جیسی ہے کہ جو مکر و فریب اور استحصال پر مبنی تھی۔

جو غلط فہمی راوی حدیث کو ہوئی ہے بعینہٖ وہ غلط فہمی خود بنی امیہ کو ہوئی اور وہ بھی آیت مبارکہ کے فہم المعنی میں غلطی کا شکار ہوئے، چنانچہ کتاب الارشاد (جلد اول ص ۲۴۶) میں یہ واقعہ درج ہے کہ یزید بن معاویہ علیہما الہاویہ نے شہدائے کربلا کے سرہائے مقدسہ کو دربار میں لانے کا حکم دیا (شیخ مفیدؒ اس کے بابت فرماتے ہیں) جب تمام سرہائے مقدسہ کہ جن میں حضرت سید الشہداء امام حسین علیہ السلام کا سر اقدس بھی تھا یزید کے سامنے رکھے گئے تو اس ملعون نے کہا:

نفلق هاما من رجال اعزة علينا وهم كانوا اعق اظلما

(جو لوگ ہم پر بزرگی و سرداری رکھتے تھے ہم نے ان کی گردنیں کاٹ دی ہیں اور وہ ہمارے مقابلے میں زیادہ عاق و بے نسب اور زیادہ ستمگر تھے)

پھر یزید نے دربار میں حاضر لوگوں کی طرف رخ کر کے ان سے کہا کہ یہ شخص (حضرت امام حسین علیہ السلام) مجھ پر فخر کرتا تھا اور کہتا تھا کہ میرا باپ تیرے باپ سے بہتر ہے، اور میری ماں تیری ماں سے بہتر ہے اور میرا نانا تیرے نانا سے بہتر ہے اور میں خود تجھ سے بہتر ہوں، اس کی انہی باتوں نے اسے یہ دن دکھایا اور وہ قتل ہوا، تو جہاں تک اس کی اس بات کا تعلق ہے کہ اس کا باپ میرے باپ سے بہتر ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ میرے باپ اور اس کے باپ کے درمیان خلافت کے مسئلہ پر اختلاف و نزاع ہوا تو خدا نے میرے باپ کو اس کے باپ پر فوقیت دے کر خلافت میرے باپ کو دے دی، اور اس کا یہ کہنا کہ اس کی ماں میری ماں سے بہتر ہے تو مجھے میری جان کی قسم! اس کی یہ بات بالکل درست ہے کیونکہ حضرت فاطمہؑ بنت رسول اللہ یقیناً میری ماں سے افضل تھیں، اور جہاں تک اس کا یہ قول کہ اس کا جد میرے جد سے افضل ہے تو اس بات کا درست ہونا ہر طرح کے شک و شبہ سے بالاتر ہے اور ہر وہ شخص جو خدا اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے وہ ہرگز یہ کہنے کی جسارت نہیں کر سکتا کہ میرا جد (ابوسفیان) اس کے جد (محمدؐ) سے افضل ہے، اور جو اس نے یہ کہا ہے کہ وہ خود مجھ سے بہتر و افضل ہے تو شاید اس نے قرآن مجید کی یہ آیت نہیں پڑھی جس میں خدا نے ارشاد فرمایا ہے: " قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ......" (کہہ دو، اے اللہ، اے مالک الملک! تو ملک و اقتدار عطا کرتا ہے جسے تو چاہتا ہے۔ ...)

یزید کی بات سن کر حضرت زینبؑ بنت علیؑ سے رہا نہ گیا، سیدہؑ نے اس کے دعوے کی نفی ورد میں وہی جواب دیا جسے سید ابن طاووسؒ نے (کتاب اللھوف میں) اور دیگر محدثین و مؤرخین نے امام جعفر صادق علیہ السلام کے بیان کی صورت میں ذکر کیا ہے اور وہ یہ کہ حضرت زینبؑ نے ارشاد فرمایا:

**" اظننت یا یزید حیث اخذت علینا اقطار الارض وآفاق السمآء فاصبحنا نساق کما تساق الاساریٰ ان بنا علی اللّٰہ ھواناً وبک علیہ کرامۃ، وان ذلک لعظم خطرک عندہٗ فشمخت بانفک و نظرت فی عطفک جذلان مسروراً حین رأیت الدنیا لک مستوسقۃ والامور متسقۃ، وحین صفالک ملکنا وسلطاننا، مھلاً مھلاً، انسیت قول اللّٰہ: "وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوٓا أَنَّمَا نُمْلِى لَهُمْ خَيْرٌ لِّأَنفُسِهِمْ ۚ إِنَّمَا نُمْلِى لَهُمْ لِيَزْدَادُوٓا إِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ" **

......آل عمران، ۱۷۸......

(اے یزید! کیا تو سمجھتا ہے کہ تو نے ہم پر زمین کے گوشے اور آسمان کے کنارے تنگ کر دیئے ہیں اور کیا ہمیں رسیوں اور زنجیروں میں جکڑ کر در بدر پھرانے سے تو خدا کی بارگاہ میں سرفراز اور ہم رسواء ہو گئے ہیں؟ تیرے خیال میں کیا ہم مظلوم ہو کر ذلیل ہو گئے اور تو ظالم بن کر سر بلند ہوا ہے، کیا تو سمجھتا ہے کہ ہم پر ظلم کر کے خدا کی بارگاہ میں تجھے شان و مقام حاصل ہو گیا ہے، آج تو اپنی ظاہری فتح کی خوشی میں سرمست ہے اور ناک بھوں چڑھاتا ہوا مسرت و شادمانی سے سرشار ہو کر اپنے غالب ہونے پر اترا رہا ہے اور حاکیت کے ہمارے مسلمہ حق کو غصب کر کے خوشی و سرور کا جشن منانے میں مصروف ہے، اپنی غلط سوچ پر مغرور نہ ہو اور ذرا دم لے، کیا تو نے خدا کا یہ فرمان بھلا دیا ہے جس میں اس نے ارشاد فرمایا: "کافر اور حق کا انکار کرنے والے یہ گمان نہ کریں کہ ہم نے جو مہلت انہیں دی ہے وہ ان کے لئے بہتر ہے بلکہ ہم نے اس لئے انہیں ڈھیل دے رکھی ہے تاکہ وہ جی بھر کے اپنے گناہوں میں اضافہ کر لیں اور ان کے لئے خوفناک عذاب معین ہے)۔

مومن سے کافر اور کافر سے مومن

آیت مبارکہ " وَتُخْرِجُ الْحَىَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَىِّ......" کی تفسیر میں کتاب مجمع البیان میں مذکور ہے کہ بعض حضرات نے اس کا یوں معنی کیا ہے: " وتخرج المؤمن من الکافر و تخرج الکافر من المؤمن " (تو مؤمن کو کافر کی صلب سے اور کافر کو مؤمن کی صلب سے پیدا کرتا ہے) مؤلف نے اس قول کو ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ مطلب حضرت امام محمد باقرؑ اور حضرت امام جعفر صادقؑ سے بھی منقول ہے (مجمع البیان ج ۲ ص ۴۲۸)

اس سے قریب المعنی شیخ صدوقؒ نے امام حسن عسکریؑ کی ایک روایت ذکر کی ہے۔

ایک حدیث نبویؐ

تفسیر "درمنثور" میں ابن مردویہ کے حوالہ سے ابوعثمان فہدی کے اسناد سے ابن مسعود یا سلمان کی بیان کردہ روایت ذکر کی گئی ہے کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ارشاد فرمایا: "یخرج الحی من المیت و یخرج المیت من الحی" سے مراد یہ ہے کہ خدا مؤمن کو کافر کے صلب سے اور کافر کو مؤمن کے صلب سے پیدا کرتا ہے (المؤمن من الکافر والکافر من المؤمن) (تفسیر درمنثور، جلد ۲ صفحہ ۱۵)

سلمان فارسیؓ کی ایک روایت

تفسیر "درمنثور" ہی میں ابوعثمان فہدی کے اسناد سے جناب سلمان فارسیؓ کی روایت مذکور ہے، انہوں نے کہا کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ارشاد فرمایا:

" لما خلق اللّٰہ آدمؑ اخرج ذریتہ، فقبض قبضۃ بیمینہ فقال: ھٰؤلاء اھل الجنۃ ولا ابالی، و قبض بالاخریٰ قبضۃ فجاء فیھا کل ردیٔ، فقال: ھؤلاء اھل النار، ولاابالی، فخلط بعضھم ببعض فیخرج الکافر من المؤمن و یخرج المؤمن من الکافر، فذلک قولہ: " تخرج الحی من المیت و تخرج المیت من الحی "،

(جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو ان کی ذریت میں سے کچھ افراد کو اپنے مقام مقدس کے دائیں جانب قرار دے کر فرمایا: یہ بہشت والے ہیں (اور مجھے کوئی پرواہ نہیں) اور کچھ دیگر افراد کو الگ کیا تو ان میں ہر طرح کی برائی موجود تھی، تو ارشاد فرمایا: یہ دوزخی ہیں (اور مجھے کوئی پرواہ نہیں)، پھر ان دونوں گروہوں کے افراد کو آپس میں ملا دیا اور مخلوط کر دیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کافر سے مؤمن پیدا ہوتا ہے اور مؤمن سے کافر پیدا ہوتا ہے، اسی مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن مجید میں ارشاد ہوا: " تو زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے باہر نکالتا ہے "، (ملاحظہ ہو تفسیر درمنثور جلد ۲ ص ۱۵)

اسی معنی و مضمون پر مشتمل روایات کو متعدد مفسرین کرام نے سلمان ہی کے حوالہ سے ذکر کیا ہے مگر اس کے اسناد کا سلسلہ مقطوع ہے۔ یعنی سلسلۂ روایت میں کئی راویوں کے نام مذکور نہیں ......، اور یہ روایت ان روایات میں سے ایک ہے

جوعالم ذر و میثاق سے مربوط ہیں کہ اس موضوع کی بابت اس کے موزوں مقام پر بہت جلد بحث کی جائے گی، انشاء اللہ،

خطبۂ جمعۃ الوداع کا حوالہ

کافی میں محمد بن یحییٰ، احمد بن محمد اور ہمارے متعدد راویان حدیث کے حوالہ سے سہل بن زیاد سے مروی ہے، انہوں نے ابن محبوب کے حوالہ سے ابوحمزہ ثمالی کا بیان ذکر کیا ہے کہ انہوں نے امام ابوجعفر محمد باقر علیہ السلام کا ارشاد گرامی ذکر کیا کہ آپؑ نے فرمایا: حضرت پیغمبر اسلامؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا:

" الا ان الروح الامین نفث فی روعی انہٗ لا تموت نفس حتی تستکمل رزقھا، فاتقوا اللّٰہ و اجملوا فی الطلب، ولا یحملنکم استبطاء شیئ من الرزق ان تطلبوہ بشیئ من معصیۃ اللّٰہ، فان اللّٰہ تعالیٰ قسم الارزاق بین خلقہٖ حلالاً، ولم یقسمھا حراماً، فمن اتقی اللّٰہ و صبر اتاہ رزقہ من حلہ، ومن ھتک حجاب ستر اللّٰہ عزوجل واخذہٗ من غیر حلہ قص بہٖ من رزقہ الحلال وحوسب علیہ "

(آگاہ رہو کہ، روح الامین (جبرائیلؑ) نے میرے دل میں یہ بات ڈال دی ہے کہ کوئی شخص پورے طور پر اپنا رزق حاصل کئے بغیر موت کا شکار نہیں ہوگا، (دنیا سے جانے سے قبل جو رزق خدا نے اس کے لئے مقرر کیا ہے وہ پورا پائے گا)، بنا برایں تم تقوائے الٰہی اختیار کرو اور طلب رزق میں صحیح راستہ اختیار کرو، اگر تمہیں رزق ملنے میں تاخیر ہو جائے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اسے خدا کی معصیت و نافرمانی کی راہ پر چل کر طلب کرنے لگو، کیونکہ خداوند عالم نے اپنی مخلوق میں رزق حلال کو تقسیم کیا ہے اور اسے بطور حرام تقسیم نہیں کیا (خدا نے جو رزق تقسیم کیا ہے وہ حلال ہے حرام نہیں) لہٰذا جو شخص تقوائے الٰہی اختیار کرتے ہوئے صبر سے کام لے تو اس کا رزق حلال طریقہ سے اسے مل جائے گا، اور جو شخص مشیت الٰہی کے تقدس کو پامال کرے تو وہ اپنا رزق بذریعہ حرام پائے گا کہ جس کا پورا پورا بدلہ اس سے لیا جائے گا اور جس مقدار میں اس نے اپنے رزق کو حرام طریقہ سے حاصل کیا ہوگا اتنا ہی اس سے اس کا محاسبہ ہوگا۔ (کافی۔ ج ۵۔ حدیث ۱)

رزق کے بارے میں امام علیؑ کا فرمان

نہج البلاغہ میں ہے حضرت امام علی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

" الرزق رزقان: رزق تطلبهٗ و رزق یطلبک فان لم تأتہٖ اتاک فلا تحمل ھم سنتک یومک، کفاک کل یوم ما فیه، فان تکن السنة من عمرک فان اللّٰه تعالٰی جده سیؤتیک فی کل غد جدید ما قسم لک، وان لم تکن السنة من عمرک فما تصنع بالھم لما لیس لک ولن یسبقک الٰی رزق طالب، ولن یغلبک علیه غالب، ولن یبطئ عنک ما قد قدر لک "،

(رزق کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ رزق جسے تو طلب کرتا ہے اور دوسرا وہ رزق جو تجھے طلب کرتا ہے اگر تو اس کے پاس نہ جائے تو وہ تیرے پاس آتا ہے، تو سال بھر کے لئے اپنی تمام تر کاوش آج ہی صرف نہ کرو، جو کچھ جس دن تجھے حاصل ہو وہ تیرے لئے کافی ہے، اگر تیری عمر ایک سال باقی ہے تو خداوند عالم تجھے ہر نئے دن تیرا مقدر کیا ہوا رزق عطا کرے گا اور اگر تیری عمر ایک سال بھی باقی نہیں تو جو چیز تیرے لئے ہے ہی نہیں اس کی طلب و تلاش سے تجھے کیا حاصل؟ کوئی دوسرا طلبگار تیرے رزق پر تجھ سے سبقت لے کر اسے نہیں پا سکتا اور نہ ہی کوئی شخص طاقت و قوت سے تجھے مغلوب کر کے اس پر قبضہ جما سکتا ہے اور نہ ہی اس رزق میں تاخیر واقع ہو سکتی ہے جو تیرا مقدر ہو چکا ہے، (نہج البلاغہ، کلمات قصار، ۳۷۲)

رزق کا آسمان سے نازل ہونا

کتاب قرب الاسناد میں ابن طریف کے حوالہ سے مذکور ہے کہ ابن علوان نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے پدر بزرگوار امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کی کہ انہوں نے ارشاد فرمایا: حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

" ان الرزق لینزل من السمآء الی الارض علٰی عدد قطر المطر الٰی کل نفس بما قدر لھا، ولکن للّٰه فضول فاسألوا اللّٰه من فضله "،

(رزق، بارش کی طرح اور اس کے قطروں کی مقدار کے مطابق آسمان سے ہر شخص کے لئے اس مقدار میں نازل ہوتا ہے جو اس کے مقدر و مقرر ہوئی ہے، لیکن خداوند عالم کا خزانۂ فضل و عنایت بہت وسیع ہے لہٰذا اللہ تعالٰی سے اس کے فضل و عنایت کے طلبگار بنو"۔ (ملاحظہ ہو: کتاب قرب الاسناد صفحہ ۵۵)

رزق کے آسمان سے نازل ہونے کی بابت کثرت سے روایات وارد ہوئی ہیں، اس طرح کی احادیث و روایات کے بارے میں تفصیلی بحث سورۂ ہود کی تفسیر میں ہوگی، انشاء اللہ تعالٰی۔

ایک علمی بحث

سابقہ ذکر کی جانے والی بحثوں میں سے بعض میں یہ مطلب بیان ہو چکا ہے کہ مسئلہ ملکیت و مالکیت ایک ایسا ناقابل انکار اور مسلم الثبوت امر ہے جس کی واقعیت و اعتباری حیثیت کسی بحث و دلیل کی محتاج نہیں اور وہ ان لازمی وٹھوس حقائق میں سے ایک ہے جس سے کوئی انسان بے نیاز نہیں نہ اپنی انفرادی زندگی میں اور نہ ہی اجتماعی و معاشرتی زندگی میں اس کی ضرورت سے دامن بچا سکتا ہے اور اس کی اصل و اساس کا محور و منتہا کسی چیز کا کسی چیز سے مختص ہونے یا مختص کئے جانے کا وہ اصول ہے جو اپنی اعتباری حیثیت میں یقینی و قطعی مقام رکھتا ہے۔

یہ تو ہے "مِلک" (م کے نیچے زیر کے ساتھ) بمعنی مالکیت کی بابت، جہاں تک "مُلک" (م پر پیش کے ساتھ) بمعنی حاکمیت و سلطنت اور دوسروں پر حکمرانی کا مسئلہ ہے تو وہ بھی انہی مسلم الثبوت امور میں سے ہے جن سے انسان بے نیاز نہیں لیکن اس حوالہ سے جو اہم مطلب قابل توجہ ہے وہ یہ کہ سب سے پہلے تو انسان کو ایک معاشرہ کی ضرورت ہوتی ہے، اور معاشرہ مختلف و متعدد اجزاء کے مجموعہ سے بنتا ہے کہ جس میں سے ہر جزء (فرد) اپنا مخصوص و معین مقصد رکھتا ہے، البتہ ہماری مراد یہاں معاشرہ کے ہر فرد کی مخصوص ترجیحات نہیں بلکہ معاشرہ بحیثیت معاشرہ اور مجموعۂ افراد ہمارے مدنظر ہے کیونکہ تمام افراد، معاشرہ کے اجزاء ہونے کے حوالہ سے اپنے گوناگوں ارادوں اور مختلف مقاصد کی بناء پر ہمیشہ اختلافات سے دوچار رہتے ہیں، سب کی یہ خواہش وکوشش ہوتی ہے کہ دوسروں پر فوقیت حاصل کرے اور جو کچھ دوسروں کے پاس ہے اسے ہتھیا لے، دوسروں کی حدود پھلانگ کر ان کے حقوق پر ڈاکہ ڈالے، تو اس کے نتیجہ میں انسانی معاشرہ ہرج و مرج اور خلفشار کا شکار ہو جاتا ہے اور وہ معاشرہ جسے سعادت و خوش بختی کی حامل زندگی کا بہترین وسیلہ قرار دیا گیا تھا بدبختی و تباہی کا ذریعہ و سبب بن جاتا ہے، گویا دوا بیماری بن جاتی ہے، تو اس خطرناک و وحشت ناک اور تباہ کن صورتحال سے چھٹکارا پانے کے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار باقی نہیں رہتا کہ ایک ایسی قوی و غالب مرکزیت قائم کی جائے جو تمام قوتوں سے بالاتر اور معاشرہ کے تمام افراد پر کامل اختیار و بالادستی رکھتی ہو تا کہ سرکش قوتوں کو لگام دے کر انہیں درمیانی راہ پر لا کھڑا کرے اور محروم و کمزور افراد کی دادرسی و دستگیری کرے کہ نتیجتاً معاشرہ کی تمام قوتیں یکجا ہوں اور برابری کی بنیاد پر اپنی کارآرائی سے معاشرہ کو استحکام بخشیں، اور وہ مرکزی قوت تمام افراد کو ان کا اصل مقام دلائے اور ہر ایک کو اس کی مخصوص معاشرتی منزلت سے نواز کر ہر حقدار کو اپنے مسلم حق سے بہرہ ور ہونے کا موقع فراہم کرے۔

تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ دنیائے انسانیت کسی دور میں بھی استخدامی فکر سے خالی و مبرا نہیں رہی بلکہ ہمیشہ

دوسروں سے خدمت لینے کا ایک وسیع سلسلہ افراد کے درمیان قائم رہا، چنانچہ اس حوالہ سے سابقاً اشارہ ہو چکا ہے اور یہ مطلب بیان ہو چکا ہے کہ انسانی تاریخ میں کوئی ایسا معاشرہ دکھائی نہیں دیتا جس میں ایسے افراد موجود نہ ہوں جو مسند اقتدار پر قبضہ کر کے معاشرہ کے دیگر افراد پر مسلط نہ ہوئے ہوں اور ان کے اموال ونفوس کے مالک بن کر انہیں غلاموں کی زنجیروں میں جکڑ دینے کے مرتکب نہ ہوئے ہوں، اور معاشرہ کی مرکزی قوت کی تشکیل کے فوائد میں سے کہ جو ہم نے ذکر کیے ہیں کہ اس کے ذریعے بعض افراد کی دوسرے بعض پر سرکشی کا راستہ روکا جا سکتا ہے اس میں وہ افراد بھی لپیٹ میں آتے ہیں جو ناجائز طور پر دوسروں پر غلبہ وحکمرانی کرتے ہوئے معاشرہ کو اپنی آمریت کا شکار کرتے ہیں اور خود کو "بادشاہ" کہلاتے ہیں لیکن اس کے باوجود کہ وہ خود اور ان سے وابستہ افراد اور ان کے بہی خواہ سب کے سب سرکش قوتیں اور ناحق حکمرانی کے حامل ہوتے ہیں مگر وہ خواہ وناخواہ اپنی حکومت واقتدار خواہ ناجائز وناروا ہی کیوں نہ ہو، کے ساتھ ان افراد پر عرصۂ حیات تنگ کر دیتے ہیں جو دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے کے مرتکب ہوتے ہیں اگر چہ ان کا ہدف عوام پر تسلط کو مضبوط کرنا ہوتا ہے لیکن نتیجتاً ان افراد کی مجرمانہ حرکتوں کا سد باب ہوتا ہے جو اپنے سوا کسی کو زندگی سے لطف اندوز ہونے کا حقدار نہیں سمجھتے، یہ اور بات ہے کہ بادشاہوں کو ان افراد کا راستہ روکنے میں یہ مقصد ملحوظ ہوتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ان پر بھی دھاوا بول دیں اور ان کی حکومت واقتدار کی بساط الٹ دیں جیسا کہ خود انہوں نے دوسروں کے ساتھ برتاؤ کیا اور ان کے مال وجان پر قبضہ جما کر بادشاہی کے تخت نشین بن بیٹھے ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ کہ انسانی معاشرے، اغیار کے ناروا تسلط کے خوف میں اپنے قابض وآمر حکمرانوں کی حمایت پر مجبور ہوئے اور ان کے خلاف قیام کرنے کے بجائے ان کی تعریف ومدح سرائی میں مصروف ہو گئے اور مجبوراً اپنے ظالم وستمگر بادشاہوں کی قصیدہ خوانیاں کر کے اپنے آپ کو معاشرہ کے ان مجرموں کے شر سے محفوظ رکھیں جو دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ زنی کرتے ہیں، لیکن یہ سب کچھ اس وقت تک ہوا جب تک بادشاہوں کا ظلم وجور اپنی حد سے نہ گزرا اور عوام کے استقلال وآزادی اور مسلمہ حقوق پر شب خون مارنے کی نوبت نہ آئی، اور اگر بادشاہ اپنی حدود سے آگے بڑھنے لگے اور افراد معاشرہ پر ظلم وستم کا سلسلہ وسعت اختیار کر گیا تو پھر وہ بادشاہ بھی عوامی احتجاج سے نہ بچ سکے اور قوموں کی صدائے زنجیر شکن سے ایوان ہائے سلطنت کے در وبام ہلا دیئے، چنانچہ تاریخ اس امر کی گواہی دیتی ہے کہ جب بادشاہوں اور آمر حکمرانوں کے مظالم حد سے تجاوز کر گئے اور افرادِ معاشرہ نے ان کے خلاف بھرپور قیام کیا تو ان ستمگر سلطانوں اور نام نہاد بادشاہوں کو ذلت آمیز انجام سے دوچار ہونا پڑا اور وہ محروم وستم دیدہ عوام کے ہاتھوں قتل وہلاک کر دیئے گئے۔ کہ تاریخ میں ان کا نام عبرت کا نشان بن گیا، لیکن عوام الناس پھر کسی دوسرے آمر کو زمام حکومت سپرد کرنے پر مجبور ہوئے تا کہ معاشرے میں فتنہ وفساد اور ہرج ومرج وانتشار کی طوفانی موجوں کو روکا جا سکے اور معاشرہ کو مزید تباہی وبربادی سے بچایا جا سکے، نتیجتاً وہ آمر بھی خود کو بادشاہ کہلانے لگا

اور تخت نشین ہو کر اسی طرح ظلم و جور کا بازار گرم کرنے لگا جو اس سے پہلے حکمرانوں نے کیا تھا، لوگوں کے جان و مال کو تحفظ حاصل نہ ہوا بلکہ ہر حوالہ سے عدم تحفظ کا شکار افرادِ معاشرہ ایک بار پھر ظلم کی چکی میں پسنے لگے اور آمریت کی سیاہ رات ان پر چھا گئی، یہ صورتحال انسانی معاشروں میں یکے بعد دیگرے سامنے آتی رہی یہاں تک کہ مطلق العنان بادشاہوں اور آمریت کے دلدادہ حکمرانوں کے مظالم سے تنگ آ کر لوگوں نے حکام کے لئے قواعد و ضوابط وضع کرنے کی راہ اپنائی اور بادشاہوں کو ان قواعد و ضوابط اور وضع کئے گئے قوانین کی پابندی پر مجبور کیا، جس کے نتیجہ میں بادشاہ کو آئینی طور پر مشروط حاکمیت حاصل ہوئی اور عوام الناس امور مملکت سے لاتعلق نہ رہے، البتہ بادشاہت کا نظام موروثی ہو گیا یعنی خاندانی بادشاہت کا نظام قائم ہو گیا اور تاجِ سلطنت یکے بعد دیگرے ایک ہی خاندان کے افراد کو منتقل ہوتا رہا۔

اس کے بعد معاشرہ کی صورتحال میں مطلوبہ اہداف حاصل نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں نے مملکت پر حاکم نظام میں تبدیلی ناگزیر سمجھی کیونکہ سلاطین کی طرف سے عوامی حقوق کی عدم پاسداری اور سلطنت کے موروثی ہونے کے نتیجہ میں ہر نئے آنے والے تخت نشین کے ناروا سلوک اور مظالم کے باعث حکمرانی کے خاندانی وراثت کی بابت نظام میں بنیادی ردوبدل ضروری ہو گیا چنانچہ ناقابل تبدیلی سلطنتی نظام کو جمہوری حکمرانی میں بدل دیا گیا، جس کے بعد مطلق العنان اور تاحیات موروثی بادشاہت کی حیثیت رائے عامہ کی بنیاد پر مقررہ وقت تک معین کئے گئے حاکم کی ہو گئی، تو یہ سب کچھ معاشرہ میں رونما ہونے والے ان تلخ و ناگوار حالات کے نتیجہ میں ہوا جو بادشاہوں اور حکام کے مظالم کی وجہ سے پیدا ہوئے، عین ممکن ہے کہ معاشرتی مظالم سے چھٹکارا پانے کے لئے اقوامِ عالم نے کئی دیگر نظامہائے حکومت وضع کئے ہوں کہ ان کے سہارے معاشرہ کی ابتر حالت کو بہتر کرنے میں مدد مل سکے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ مستقبل میں ایسے نظامہائے حکومت وضع کئے جائیں کہ جن کے بارے میں ہمارے ذہنوں میں ابھی کوئی خاکہ موجود نہیں اور وہ نظام اسی مقصد و ہدف کے حصول کو یقینی بنانے میں مؤثر واقع ہوں جو سابقہ یا موجودہ جمہوری نظاموں میں ملحوظ ہے یعنی یہ کہ معاشرہ میں قانون کی حکمرانی ہو اور شخصی و فردی آمریت قائم نہ ہو کیونکہ اس سے عوامی حقوق پامال ہوتے ہیں اور افراد بشر کو فطری آزادی حاصل نہیں ہوتی جبکہ حکمران طبقہ ہر طرح کی آزادی اور تمام تر معاشرتی حقوق سے بہرہ ور ہوتا ہے۔

بہر حال مذکورہ بالا تمام معاشرتی حالات اور نظامہائے حکومت میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کے مجموعی تجزیہ سے یہ بات یقینی طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ قوموں نے یہ سب کچھ اس لئے کیا کہ معاشرے کا اختیار و اقتدار اس کے سپرد کیا جائے جو تمام امور کو احسن طور چلانے کی اہلیت رکھتا ہو اور اپنی ٹھوس صلاحیت اور حکمرانی کے اعلیٰ معیار پر پورا اترنے کے ساتھ معاشرہ میں موجود گوناگوں قوتوں اور مختلف و متضاد ارادوں کو یکسوئی، یک جہتی اور ایک ہی سمت میں لا کر افراد کے حقوق کی پاسداری، رفاہ و سلامتی کو یقینی بنائے، اس سے یہ قطعی نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ انسانی معاشرہ اس طرح کے مقام و منصب اور اقتدار کے مرکز

سے بے نیاز نہیں، اب اس شخص کا نام کیا ہو اور اس میں کیا صفات وشرائط پائی جانی چاہئیں اس کا فیصلہ قوموں کی صوابدید اور اجتماعی سوچ پر موقوف ہے اور رفتارِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اس میں کیا تبدیلیاں ممکن وضروری ہیں اس کے بارے میں ہر معاشرہ اپنے حالات کے تقاضوں کے پیش نظر رائے قائم کرتا ہے اور ایسا کرنے کا حق بھی رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر قوم اپنے لئے ایک معاشرتی نظام وضع کر کے حکمران طبقہ کے لئے ضروری شرائط خود طے کرتی ہے اور ایسا کرنا ہر قوم کے لئے اس لئے ناگزیر ہوتا ہے کہ معاشرہ میں پیدا ہونیوالا انتشار اور افراتفری، ہرج ومرج اور عدم تحفظ معاشرہ میں کسی ایک ایسے شخص یا مرکز کے نہ ہونے کا نتیجہ ہوتا ہے جو طاقت کا محور اور معاشرتی مقاصد کی تکمیل کا ضامن یا اس میں مؤثر ہو، گویا تمام افراد کی خواہشوں، چاہتوں، حقوق اور ضروری امور کا ترجمان ہو۔

یہ تمام مطالب وہی ہیں جن کے بارے میں ابتدائے سخن میں بیان ہو چکا ہے کہ حاکمیت ایک ایسی ناقابل انکار اعتباری حقیقت ہے جو انسانی معاشرہ کے لئے ناگزیر ہے۔ اور وہ انہی اعتباری حقیقتوں کی مانند ہے جو انسانی معاشرے میں ضروری ہوتی ہیں اور جن کے تقاضوں کی تکمیل، بہتری، ان میں واقع ہونے والی خامیوں کی دوری اور انسانی سعادت کی راہ میں رکاوٹ بننے والے ان کے ناگوار آثار کو مٹانا ہی معاشرہ کے کرنے کا اصل کام ہے۔

تو یہ بات ثابت ہوگئی کہ معاشرہ کی تشکیل ان اعتباری حقیقتوں کے تقاضوں کی تکمیل واصلاح امور میں مؤثر کردار ادا کرنے کی غرض پر مبنی ہے لہٰذا اس حوالہ سے ''نبوت'' کا کردار بہت پختہ اور اصلاح معاشرہ میں اس کا حصہ کامل وفراواں ہے کیونکہ علم الاجتماع میں یہ مسئلہ مسلم الثبوت ہے کہ جو قول ونظریہ عوام وخواص کے درمیان موردِ توجہ قرار پائے جبکہ وہ طبع انسانی کے وابستہ، مزاج بشریت کا پسندیدہ اور دلوں کی متوقع آرزوؤں پر پورا اترنے والا ہو تو وہ گوناگوں ترجیحات کو یکجا کرنے، متفرق وپراکندہ افراد واقوام کو متحد کر کے ایک پلیٹ فارم پر لانے میں مؤثر ترین عامل بن سکتا ہے کہ جس کی بدولت معاشرہ کی تمام بکھری ہوئی قوتیں ایک ہی محور پر اکٹھی ہوں اور پورا معاشرہ ایک ایسے گھرانہ کی طرح ہو جائے جس کے تمام افراد کی آواز وآرزو ایک، چاہت ایک، راہ ایک اور منزل ایک ہو، اور پھر دنیا کی کوئی طاقت اس متحد قوت کا مقابلہ نہ کر سکے۔

اس مقام پر یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ یہ امر تاریخ کی مسلمہ حقیقتوں میں سے ایک ہے کہ جب سے سلسلۂ نبوت ظہور پذیر ہوا تو اس کی عملداری کا محور یہ تھا کہ لوگوں کو عدل کی دعوت دیں اور ظلم سے دوری اختیار کرنے کا حکم دیں، خدا کی عبادت و بندگی کی ترغیب دلائیں، احکامِ الٰہی کی اطاعت وپیروی اختیار کرنے کی طرف بلائیں اور اس کے ساتھ ساتھ معاشرے کے فرعونوں، سرکشوں، آمروں، غاصبوں اور جابر لوگوں کی پیروی کرنے سے روکیں، چنانچہ یہ سلسلہ صدیوں درصدیوں سے جاری وساری ہے اور اقوام عالم کے درمیان نسل درنسل چل رہا ہے، ہر ملت وامت اس کے سایے میں اپنا نظامِ زندگی چلا رہی ہے اگرچہ اس میں زمان ومکان اور افراد کے حوالہ سے وسعت ومحدودیت پائی جاتی ہے لیکن یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ

انسانی معاشرے میں صدیوں پر محیط اس طرح کے قوی ترین عامل وسبب کا بے اثر و بے نتیجہ ہونا محال و ناممکن ہے اور ایسا ہرگز قابل تصور نہیں کہ اس وسیع و عظیم سلسلہ کا معاشرہ میں کوئی مثبت نتیجہ نہ پایا جائے۔

اس تناظر میں قرآن مجید نے متعدد مقامات پر خداوند عالم کی طرف سے انبیاء علیہم السلام پر نازل کی جانے والی وحی میں ان کی امتوں کے برتاؤ کا تذکرہ فرمایا ہے مثلاً حضرت نوح علیہ السلام کے شکوہ کو ان لفظوں میں ذکر کیا کہ انہوں نے کہا:

سورۂ نوح، آیت :۲۳

O " رَبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِيْ وَاتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ يَزِدْهُ مَالُهٗ وَوَلَدُهٗۤ اِلَّا خَسَارًا ﴿۲۱﴾ وَمَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا ﴿۲۲﴾ وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ "

(پروردگارا! انہوں نے میری نافرمانی کی ہے اور انہوں نے ایسے کی پیروی کی ہے جس کے مال اور اولاد نے سوائے خسارہ ونقصان کے، کچھ اضافہ نہیں دیا، اور انہوں نے میرے ساتھ بہت بڑی چال چلی ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ اپنے خداؤں کو تنہا نہ چھوڑو)

اسی طرح آنجنابؑ اور ان کی قوم کے بزرگوں کے درمیان جو نزاعی بحث وجدال ہوا اس کا تذکرہ قرآن مجید نے اس طرح کیا:

سورۂ شعراء، آیت :۱۱۳

O " قَالُوْۤا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ قَالَ وَمَا عِلْمِيْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ اِنْ حِسَابُهُمْ اِلَّا عَلٰى رَبِّيْ لَوْ تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ "

(انہوں نے کہا کہ کیا ہم تجھ پر ایمان لائیں جبکہ چند پست وحقیر لوگوں نے تیری پیروی کی ہے، اس نے جواب میں کہا، مجھے کیا معلوم کہ وہ کیا کرتے ہیں، اگر تمہیں شعور ہو تو سمجھ جاؤ گے کہ ان کا حساب کتاب میرے پروردگار کے ہاتھ میں ہے)

حضرت ہود علیہ السلام کا وہ قول بھی قرآن مجید میں مذکور ہے جو انہوں نے اپنی قوم سے مخاطب ہو کر کہا:

سورۂ شعراء، آیت :۱۳۰

O " اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ﴿۱۲۹﴾ وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ "

(کیا تم ہر بلند جگہ پر بے مقصد نشانیاں بناتے رہتے ہو اور بڑے بڑے محلات تعمیر کرتے رہتے ہو جیسے تمہیں ہمیشہ ان میں رہنا ہو)

حضرت صالح کا وہ قول کہ جو انہوں نے قوم سے مخاطب ہو کر کہا:

سورۂ شعراء، آیت ۱۵۰، ۱۵۲:

○ " فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ﴿۱۵۰﴾ وَ لَا تُطِيْعُوْۤا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۱۵۱﴾ الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَ لَا يُصْلِحُوْنَ ﴿۱۵۲﴾ "

(تم تقوائے الٰہی اختیار کرو اور میری اطاعت کرو، اور حد سے گزرنے والوں کی اطاعت نہ کرو کہ وہ زمین میں فساد پھیلاتے ہیں اصلاح ہرگز نہیں چاہتے)

اس کے علاوہ تاریخ کی ناقابل انکار حقیقتوں میں سے یہ بھی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم بنی اسرائیل کے دفاع میں قیام کیا اور فرعون کی بداعمالی اور ظالمانہ و جابرانہ طرزِ عمل کے مقابلے میں میدان عمل میں کود پڑے، اور ان سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے وقت کے آمر نمرود کے مقابلے میں کھڑے ہوئے اور انقلابی تحریک کی قیادت کی، پھر حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام اور دیگر انبیاء کرام علیہم السلام اپنے اپنے دور کے جابر حکمرانوں، بدکردار سردارانِ قبائل اور مال و دولت کے سہارے لوگوں کا استحصال کرنے والوں کے خلاف برسرپیکار ہوئے اور ان کی بداعمالیوں کو بے نقاب کرتے رہے اور اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کو فسادی عناصر کی اطاعت اور سرکش افراد کی پیروی سے منع کرتے رہے۔

یہ تو ہے انبیاء الٰہی کی عملی سیرت کا حوالہ، اور جہاں تک قرآن مجید کا تعلق ہے تو یہ حقیقت کسی سے مخفی نہیں کہ اس مقدس کتاب میں لوگوں کو فساد پھیلانے والوں کی اطاعت و فرمانبرداری اور سرکشی کے پھیلنے اور ان کے سنگین نتائج ظاہر ہونے کی خبریں دی گئیں، اس سے قرآن مجید کی اصلاحی کاوشیں کھل کر سامنے آتی ہیں اور دین مقدس اسلام کے بلند پایہ اصولوں کی بابت کوئی چیز پردۂ ابہام میں باقی نہیں رہتی، انہی موارد میں سے ایک درج ذیل آیت مبارکہ ہے:

سورۂ فجر، آیت ۱۴:

○ " اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ﴿۶﴾ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ﴿۷﴾ الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ﴿۸﴾ وَ ثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ﴿۹﴾ وَ فِرْعَوْنَ ذِي الْاَوْتَادِ ﴿۱۰﴾ الَّذِيْنَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ ﴿۱۱﴾ فَاَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ ﴿۱۲﴾ فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ﴿۱۳﴾ اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ﴿۱۴﴾ "

(کیا تو نے نہیں دیکھا جو تیرے پروردگار نے قوم عاد کے ساتھ کیا سلوک کیا، وہ کہ جو بلند پایہ ستونوں (اونچی اونچی عمارتوں و محلات) والے تھے کہ ان جیسی عمارتیں کہیں بھی نہیں بنائی گئیں، اور ثمود کے ساتھ کیا سلوک کیا کہ جنہوں نے وادی میں پتھر تراش کر مکانات بنائے، اور فرعون کے ساتھ، کہ جو میخوں والے تھے، وہ کہ جنہوں نے سرکشی کا بازار گرم کر رکھا تھا اور انہوں نے بہت زیادہ فساد پھیلایا، تو تیرے رب نے ان پر عذاب کے کوڑے برسائے، بے شک تیرا پروردگار گھات میں

ہے)

اس طرح کی آیات قرآن مجید میں کثرت سے موجود ہیں۔

یہ تمام مطالب "مِلک" (م کے نیچے زیر کے ساتھ) سے مربوط ہیں اور جہاں تک " مُلک " (م پر پیش کے ساتھ)...... بمعنی حاکمیت واقتدار...... کا تعلق ہے تو وہ انسانی معاشرے کی ناقابل انکار اعتباری حقیقت ہے کہ معاشرہ جس سے بے نیاز نہیں، چنانچہ اس کا ثبوت اس کامل وجامع ترین قرآنی بیان سے ملتا ہے جو طالوت کے واقعہ کے ذکر کے بعد مذکور ہے جس میں ارشاد الٰہی ہوا:

سورۂ بقرہ، آیت :۲۵۱

○ " وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ "

(اگر خدا بعض لوگوں کو دوسرے بعض کے ذریعے نہ روکتا تو زمین تباہ ہو چکی ہوتی، لیکن اللہ کائنات پر فضل وعنایت کرنے والا ہے)

اس آیت کی بابت سورۂ بقرہ میں تفصیلی تذکرہ ہو چکا ہے اور اس سے مربوط پہلوؤں کی وضاحت کر دی گئی ہے۔

اور قرآن مجید میں کثیر آیات ایسی موجود ہیں جن میں حاکمیت واقتدار، ولایت وحکمرانی اور والی کی اطاعت و فرمانبرداری کا واجب ولازم ہونا بیان کیا گیا ہے، بعض آیات میں اسے عطائے ربانی اور نعمت سے تعبیر کیا گیا ہے چنانچہ ارشاد ہوا:

سورۂ نسآء، آیت :۵۴

○ " وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا "

(اور ہم نے انہیں عظیم اقتدار عطا کیا)

سورۂ مائدہ، آیت :۲۰

○ " وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ "

(اور اس نے تمہیں بادشاہ بنایا اور تمہیں وہ کچھ عطا کیا جو کائنات میں کسی کو بھی عطا نہیں کیا گیا)

سورۂ بقرہ، آیت :۲۴۷

○ " وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ "

(اور اللہ اپنا اقتدار جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے)

اس طرح کی دیگر آیات بھی موجود ہیں جن میں اقتدار و سلطنت کو عطیۂ الٰہی اور خداداد نعمت قرار دیا گیا ہے،

یہ بات یاد رہے کہ قرآن مجید سلطنت و اقتدار اور حکمرانی کو تقویٰ پر مبنی ہونے کی بناء پر ایک شرف و بزرگی قرار دیتا ہے کیونکہ تقویٰ ہی وہ حقیقت ہے جسے انسانی حیات کی عظیم ترین و پاکیزہ صفات میں سے کرامت و بزرگی اور شرف و عزت کا واحد ذریعہ و سبب قرار دیا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ہوا:

سورۂ حجرات، آیت :۱۳

○ " يَآ اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ؕ "

(اے لوگو! ہم نے تمہیں مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہیں گروہ گروہ اور قبیلہ قبیلہ بنایا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، بے شک تم میں سے سب سے زیادہ عزت و بزرگی اسے حاصل ہے جو تم سے زیادہ تقویٰ والا ہو)

تقویٰ چونکہ ایک ایسی قلبی صفت ہے جس کا تمام معاملہ خدا کے ہاتھ میں ہے لہٰذا اس کی بناء پر کوئی کسی پر برتری کا اظہار نہیں کر سکتا، اسی لئے کوئی کسی پر اپنی بزرگی نہیں جتلا سکتا کیونکہ اگر کسی دنیاوی چیز کی بناء پر فخر و مباہات کی جائے تو وہ اس لئے صحیح نہیں کہ دنیاوی امور کی کوئی حیثیت اور قدر و منزلت ہی نہیں، اور اگر کسی اخروی چیز کو وجہ افتخار قرار دیا جائے تو ہر اخروی امر کا حساب و کتاب خدا کے ہاتھ میں ہے، جہاں تک قدر و منزلت کا تعلق ہے تو وہ صرف دین کو حاصل ہے، بنابرایں کوئی چیز ایسی ہے ہی نہیں جس کی بناء پر فخر اور برتری کا اظہار کیا جائے، لہٰذا جو شخص سلطنت و اقتدار کی نعمت سے بہرہ ور ہو وہ ایک مسلمان کی نگاہ میں نہایت سنگین بوجھ اپنے اوپر لادنے والا اور سختی و مشقت بھری زندگی گزارنے والا شخص ہوتا ہے، البتہ اس کا مقام و مرتبہ بارگاہِ خداوندی میں بہت بلند اور وہ عظیم اجر و ثواب کا حقدار ہوتا ہے بشرطیکہ وہ عدل و تقویٰ کی راہ پر چلے، اور یہی وہ پاکیزہ سیرت ہے جسے اولیائے دین نے اپنایا اور اس سلسلہ میں ہم سیر حاصل بحث اور تفصیلی مطالب مستقل موضوع کی صورت میں حضرت پیغمبر اسلامؐ اور آئمہ معصومین علیہم السلام کی سیرت طیبہ کے تذکرے میں کریں گے اور یہ بیان کریں گے کہ اس مقدس کردار کے مثبت و دور رس آثار و نتائج انسانی معاشرہ میں بھرپور صورت میں ظاہر ہوئے، جبکہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ان عظیم ہستیوں کو اپنی حکمرانی و اقتدار سے سوائے اس کے کچھ نہ ملا کہ وہ اپنے زمانے کے جابروں و آمروں سے نبرد آزما رہے اور زمین میں فساد پھیلانے والے عناصر کے مقابلے میں میدان عمل میں نکلے، انہوں نے اپنے دور کے سرکشوں اور متکبرین کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

بنابرایں قرآن مجید نے لوگوں کو سلطنت و اقتدار کی مسندیں سجانے کے لئے معاشرہ کی تشکیل کی دعوت نہیں دی اور نہ ہی قیصریت و کسرویت کی بنیادیں مضبوط کرنے کی راہ پر لگایا بلکہ اس نے حکمرانی و اقتدار کو انسانی معاشرہ کے ان لازمی اور

نہایت ضروری امور میں سے قرار دیا جس پر معاشرتی زندگی کی سعادت وخوش بختی موقوف ہے مثلاً تعلیم اور دشمنانِ دین کو مرعوب کرنے کے لئے عسکری قوت تیار کرنا وغیرہ، بلکہ قرآن مجید نے لوگوں کو اجتماعی زندگی اور دین پر مبنی یکجہتی اور اتحاد و اتفاق کی دعوت دی، اور انہیں تفرقہ ودشمنی سے منع کیا، اور انہی امور کو حکومت داری و معاشرتی زندگی کی اصل و اساس قرار دیا چنانچہ ارشاد ہوا:

سورۂ انعام، آیت :۱۵۳

○ " وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِىْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ "

(اور یہ ہے میرا سیدھا راستہ، پس تم اس کی پیروی کرو اور دوسرے راستوں کی پیروی نہ کرو ورنہ وہ تمہیں خدا کی راہ سے دور اور پراکندہ ومتفرق کردیں گے)

ایک اور مقام پر یوں ارشاد ہوا:

سورۂ آل عمران، آیت :۶۴

○ " قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝۶۴"

(کہہ دیجئے، اے اہل کتاب! آؤ اور اس بات پر اتفاق کرو جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے اور وہ یہ کہ ہم خدا کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی چیز کو اس کا شریک قرار نہ دیں اور نہ ہی ہم میں سے کوئی شخص دوسرے کو خدا کے علاوہ رب قرار دے، لیکن اگر وہ اس سے روگردانی کریں تو کہہ دو کہ تم گواہ رہو کہ ہم تسلیم کرنے والے ہیں)

تو قرآن مجید، جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا، لوگوں کو اس کے علاوہ کسی چیز کی دعوت نہیں دیتا کہ وہ خدائے یکتا کے حضور سر تسلیم خم کریں، اور وہ دینی معاشرہ کے علاوہ کسی بھی معاشرہ کو اعتباری نظر سے نہیں دیکھتا بلکہ اس کے علاوہ ہر چیز کو مسترد کرتا ہے کہ جس میں خدا کے مدِ مقابل قرار دیئے جانے والوں کی عبادت وبندگی، ہر طاقتور آمر کے سامنے سر نیاز خم کرنا، نام نہاد معیاروں پر مبنی عظمتوں ورفعتوں سے دل بستگی، قیصری وکسروی سلطنت وحاکمیت سے دلداری وفرماں برداری، جغرافیائی حدود اور گونا گوں اوطان کی تشکیل جیسے موہوم وباطل امور شامل ہیں۔

ایک فلسفیانہ بحث

یہ بات ہر طرح کے شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ ذات باری تعالیٰ ہی عالم ہستی میں پائے جانے والے سلسلۂ علیت (علت ومعلوم کا نظام) کا منتہا ہے اور اس کے اور عالم ہستی کے درمیان جزئی وکلی ہر طرح سے ایسا رابطہ قائم ہے جو سلسلۂ علیت کی اصل واساس سے عبارت ہے (یعنی وہ موجودات عالم کی علت العلل ہے اور وجود میں آنے والی ہر شے کا سبب اسی پر منتہی ہوتا ہے)، چنانچہ علت ومعلول سے مربوط تمام بحثوں میں یہ مطلب واضح وروشن اور مرحلۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ علیت کا نظام صرف وجود و ہستی میں پایا جاتا ہے یعنی کائنات میں جو چیز بھی وجود رکھتی ہے اس کا وجود حقیقت میں اپنی علت (وجود میں آنے کا اصل سبب) کے وجود کا پرتو اور جھلک ہے، اور جہاں تک حقیقی وجود کے علاوہ کا تعلق ہے مثلاً ماہیت وغیرہ تو ان میں وجودی ترشح کا تصور ہی نہیں پایا جاتا اور نہ ہی کسی سرچشمۂ وجود سے ان کا ربط بنتا ہے بلکہ انہیں کسی علت کی ضرورت ہی نہیں، اس مطلب کو دوسرے رخ سے دیکھیں......یعنی عکس نقیض کے آئینہ میں دیکھیں..... تو یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ جو چیز حقیقی وجود نہیں رکھتی وہ "معلول" نہیں (اپنے وجود میں آنے کے لئے کسی علت سے وابستہ نہیں) اور چونکہ "معلول" نہیں لہٰذا واجب الوجود ذات باری تعالیٰ تک منتہی نہیں ہوتی۔

مذکورہ بالا مطلب کی بناء پر ایک مشکل صورت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ یہ کہ اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ جو چیز بھی حقیقی وجود نہیں رکھتی وہ معلول نہیں کہلاتی اور جو معلول نہیں اس کا منتہا ذات باری تعالیٰ نہیں، تو ان امور کی نسبت کے بارے میں کیا کہا جائے گا جو صرف اعتباری حیثیت رکھتے ہیں؟ کیونکہ اعتباری امور کا حقیقی وجود ہوتا ہی نہیں بلکہ وہ بنیادی طور پر ہی حقیقی وجود سے عاری ہوتے ہیں اور ان کا وجود وثبوت اعتباری حدود سے باہر نہیں جاتا بلکہ ان کا محور اعتباری حوالہ اور معروضی جہت و وضعی پہلو کے سوا کچھ نہیں ہوتا، اور شریعت الٰہیہ جن چیزوں پر مشتمل ہے یعنی امر، نہی، احکام اور دیگر قرار دیے جانے والے امور تو وہ سب اعتباری ہیں لہٰذا خدا کی طرف ان کی نسبت کا مسئلہ مشکل ہے، یہی بات مالکیت، عزت ورزق وغیرہ کی بابت ہے کہ وہ بھی اعتباری وقراردادی امور ہیں لہٰذا انہیں کس حوالہ سے خدا کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے؟

اس مشکل اور پیچیدگی کا حل صرف اس صورت میں ممکن وقابل تصور ہے کہ اگر چہ وہ امور جن کا ذکر ہوا ہے حقیقی وجود سے عاری ہیں لیکن ان کے کچھ ایسے آثار ہیں جو ان کے ناموں کو باقی رکھے ہوئے ہیں جیسا کہ اس مطلب کو متعدد بار پہلے ذکر کیا جاچکا ہے، اور وہ آثار حقیقی امور ہیں کہ جو اعتباری بنیاد پر مقصود واقع ہوتے ہیں اور انہیں خداوند عالم سے نسبت حاصل ہوتی ہے، تو انہی آثار کا خدائے تعالیٰ سے منسوب ہونا ان کے امور اعتباریہ کے خدا سے منسوب ہونے کو درست قرار دیتا ہے،

یعنی اعتباری امور کے آثار کا چونکہ خدا سے انتساب درست ہے لہٰذا اس حوالہ و بنیاد پر اصل امور اعتباریہ کا استناد و انتساب بھی خدا کی طرف درست قرار پاتا ہے۔اس کی وضاحت اس طرح سے ہوسکتی ہے کہ حاکمیت جو کہ ہمارے درمیان معاشرتی زندگی کے حوالہ سے ایک اعتباری وقراردادی امر ہے اوراس میں حقیقی جوود کے معنی کا کوئی پہلو نہیں پایا جاتا بلکہ وہ سراسر ایک خیالی و موہوم معنی ہے کہ جسے ہم اس کے حقیقی آثار تک پہنچنے کے لئے وسیلہ قرار دیتے ہیں کیونکہ اس موہوم حقیقت کے بغیر ان حقیقی آثار کا حصول ممکن نہیں ہوتا بلکہ وہ آثار اسی پر موقوف ہوتے ہیں اوراسی کو حقیقی تصور کرنے سے وابستہ ہیں جبکہ وہ ہمارے ہی اعتبار کردہ ہیں لیکن ان کے حقیقی آثار سے بہرہ وہ ہونا ہمارا مقصد اعلیٰ ہوتا ہے اس لئے ہم ان اعتباری امور کا سہارا لیتے ہیں اور انہیں وسیلہ و ذریعہ قرار دے کر ان کے حقیقی آثار کو حاصل کرتے ہیں چنانچہ وہ آثار جو عالم خارج میں ہمارے سامنے ہیں اور ہم ان کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ طاقتور افراد اسی موہوم اعتباری حقیقت کی بناء پر رعب وطاقت کے استعمال سے کمزور وضعیف اور معاشرے کے ناتواں لوگوں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالتے ہیں اوران کا استحصال کرتے ہیں جس کے نتیجہ میں اس اعتباری حقیقت سے محروم افراد ذلت و بیچارگی سے دوچار ہوجاتے ہیں،اسی طرح اس اعتباری حقیقت کے سہارے پر ہر حقدار کو اس کا حق دلانا اور معاشرہ کے ہر فرد کو اس کا جائز مقام عطا کرنا ممکن و یقینی ہوتا ہے،گویا اس کے ذریعے مثبت ومنفی دونوں پہلو امکان پذیر ہوتے ہیں۔

لیکن چونکہ حاکمیت کی حقیقت اوراس کا نام اس وقت تک باقی ہوتا ہے جب تک اس کے آثار خارجیہ اس پر مترتب ہوتے ہوں لہٰذا ان آثار خارجیہ کا ان کی علتوں اور وجود میں آنے کے حقیقی اسباب کی طرف منسوب ہونا بعینہٖ اصل مالکیت کا ان علل کی طرف منسوب ہونا ہے،دونوں میں کوئی فرق نہیں۔یہی حال ''عزت'' کا ہے کہ جو اعتباری امور میں سے ایک ہے یعنی اس کا اوراس کے آثار خارجیہ کا اپنی حقیقی علل کی طرف منسوب ہونا مالکیت و حاکمیت کی طرح ہے،بلکہ اس سے وسیع تر یہ کہ تمام اعتباری امور کا استناد و انتساب اسی طرح سے ہے مثلاً امر و نہی،حکم اور وضع وغیرہ،ان تمام امور کے آثارِ خارجیہ کی نسبت ان کی علل کی طرف دی جاتی ہے اور خود ان امور کی نسبت بھی ان کی علل کی طرف دی جاتی ہے۔

اسی بیان سے یہ حقیقت واضح و روشن ہوجاتی ہے کہ چونکہ تمام اعتباری امور کے آثار خداوندِ عالم کی طرف منسوب ہوتے ہیں لہٰذا خود ان کی نسبت بھی ذات باری تعالیٰ کی طرف درست ہے البتہ اس معنی وحیثیت میں کہ جو خداوندِ قدوس کی ذات والاصفات کے شایان شان اوراس کی عزت وعظمت کے زیبا ہے۔

آیات ۲۸ تا ۳۲

○ لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكٰفِرِينَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِي شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقٰىةً ۗ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۗ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيرُ ﴿۲۸﴾

○ قُلْ اِنْ تُخْفُوا مَا فِي صُدُورِكُمْ اَوْ تُبْدُوهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ۗ وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۗ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۲۹﴾

○ يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۛ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ۛ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ اَمَدًا بَعِيدًا ۗ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۗ وَاللّٰهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ ﴿۳۰﴾

○ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۳۱﴾

○ قُلْ اَطِيعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُولَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِينَ ﴿۳۲﴾

ترجمہ

○ ''مؤمنین، مؤمنین کے مقابلے میں کافروں کو اپنا دوست و حاکم نہ بنائیں، جو شخص ایسا کرے گا تو اس کا خدا سے کوئی تعلق نہ ہوگا، البتہ اگر ان سے ڈر کی وجہ سے ایسا ہو تو (اسی حد تک رہنا چاہیے) اور خدا تمہیں اپنی مخالفت سے بچنے کا حکم دیتا ہے، اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے''

(۲۸)

○ ''کہہ دیجئے کہ اگر تم اپنے دل کی بات چھپائے رکھو یا اسے ظاہر کرو اللہ اسے جانتا ہے، اور وہ اس سب کچھ کو جانتا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، اور اللہ ہر شے پر قادر ہے''

(۲۹)

○ ''اس دن ہر شخص اپنے ہر نیک اور برے عمل کو اپنے سامنے پائے گا اور جب برے عمل کو دیکھے گا تو چاہے گا کہ کاش اس کے اور اس عمل کے درمیان بہت دور کا فاصلہ ہوتا، اور اللہ تمہیں اپنی مخالفت سے ڈراتا ہے، اور اللہ بندوں پر نہایت مہربان ہے''

(۳۰)

○ ''کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میرا اتباع کرو اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا کہ اللہ معاف کرنے والا نہایت مہربان ہے''

(۳۱)

○ ''کہہ دیجئے، تم اللہ اور رسول کی اطاعت کرو، اگر تم روگردانی کرو تو یاد رکھو کہ اللہ کافروں کو پسند نہیں کرتا''

(۳۲)

تفسیر و بیان

سابقہ آیات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ حقیقت واضح طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ زیرِ نظر آیات مبارکہ (۲۸ تا ۳۲) ماقبل آیات سے ربط و تعلق سے خالی نہیں، کیونکہ ہم نے سابقہ آیات کی تفسیر میں ذکر کیا تھا کہ ان میں اہل کتاب اور مشرکین کے بارے میں مطالب ذکر کیے گئے ہیں اور چونکہ یہ مقام ہی ان لوگوں کے بارے میں تذکرہ کا ہے لہٰذا یہاں بھی انہی کی بابت مطالب ذکر کیے گئے ہیں، اور ان مطالب سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان میں "کافرین" سے یا تو اہل کتاب اور ان کے علاوہ دیگر منکرین سب مراد ہیں یا صرف مشرکین مراد ہیں، اگر پہلی صورت ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ زیرِ نظر آیات مبارکہ (۲۸ تا ۳۲) میں جن سے دوستی قائم کرنے سے روکا گیا ہے ان میں اہل کتاب اور مشرکین وغیرہ سب شامل ہیں، اور اگر دوسری صورت ہو یعنی صرف مشرکین مراد ہوں تو اس کا معنی یہ ہوگا کہ مشرکین سے دوستی کا رشتہ استوار نہ کرو بلکہ ان سے قطع تعلق کر لو اور خدا والوں کے گروہ میں شامل ہو جاؤ اور خدا کی محبت کا چراغ کاشانۂ دل کے در و بام پر روشن کر کے رسول اللہؐ کی اطاعت و فرماں برداری کا عملی دم بھرو۔

کافروں سے دوستی کی ممانعت

○ " لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ "
(مؤمنین، مؤمنین کو چھوڑ کر کافروں کو دوست و حاکم نہ بنائیں)

اس آیت مبارکہ میں لفظ "اَوْلِيَآءَ" ذکر ہوا ہے، یہ جمع کا صیغہ ہے، اس کا مفرد "ولی" ہے جو کہ "ولایت" سے مشتق ہے ولایت کا معنی دراصل کسی چیز کے امور کا مالک ہونا ہے، چنانچہ کہا جاتا ہے: "ولی الصغیر"، "ولی المجنون" "ولی المعتوہ" یعنی بچہ کا ولی، دیوانہ کا ولی، نادان کا ولی، تو ان میں ولی سے مراد ان کے امور و اموال کی

تدبیر کا کامل اختیار رکھنے والا ہے، اگرچہ وہ سب اپنے اموال کے خود ہی مالک ہوتے ہیں لیکن ان اموال کے خرچ وحفاظت اور دیگر متعلقہ امور کی تدبیر کا مالک ان کا ولی ہوتا ہے جو ان کے بارے میں فیصلہ کرنے کا مجاز ہوتا ہے۔

یہ تو ہے لفظ "ولی" کا اصل معنی، لیکن کثرت استعمال سے اسے محبت اور دوستی کے معنی میں استعمال کیا جانے لگا یہاں تک کہ اسی معنی میں اس کا استعمال زیادہ ہو گیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس میں دو دوستوں کا ایک دوسرے کے امور میں تصرف کرنا ملحوظ ہو کیونکہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ محبّ اپنے محبوب کے ارادہ وچاہت اور خواہش کے مطابق اس کے متعلقہ و پسندیدہ امور میں دخیل ہوتا ہے اور محبوب اپنے محبّ کو اپنے امور میں دخیل ہونے کا حق دیتا ہے، اور اس کا اس کے متعلقہ امور میں تصرف کرنا دراصل دل کی وابستگی کا مظہر و ذریعہ ہوتا ہے کہ جس سے قلبی و روحانی رشتہ کا ثبوت ملتا ہے، بنا بر ایں محبوب کا محبّ کی زندگی میں اس کے امور میں تصرف کرنا محبت کے رشتہ سے ہرگز خالی نہیں ہوسکتا۔

مذکورہ بالا مطالب کی روشنی میں کافروں کو اپنا ولی و دوست بنانے سے مراد ان سے روحانی رشتہ قائم کرنا ہے کہ جس کا نتیجہ ان سے قریبی میل جول رکھنا، ان کی خوشی وخوشنودی کے لئے ان کی مرضی پر چلنا، ان کے اخلاق وعادات کو اپنانا اور زندگی کے دیگر امور میں اس طرح ان سے گھل مل جانا ہے کہ وہ مؤمنین کے امور میں دخیل ہوں، چنانچہ ان سے اس قدر قریبی تعلق قائم کرنے کی ممانعت کے حکم کو "مِنۡ دُوۡنِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ" کے الفاظ سے مقید کر کے ذکر کیا گیا ہے، کیونکہ ان الفاظ میں اس امر کی طرف واضح اشارہ بلکہ صریح دلالت پائی جاتی ہے کہ "مومنین کے علاوہ" یا "مومنین کو چھوڑ کر" یا "مؤمنین کے مقابلے میں" کافروں کو مؤمنین سے دوستی ومحبت کو مؤمنین سے دوستی ومحبت پر ترجیح دینے کا معنی دیتے ہیں کہ جس کی ممانعت کی گئی ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مؤمنین کو چھوڑ کر کافروں سے دوستی کا رشتہ اس قدر محکم ومضبوط کر لیا جائے کہ مؤمنین کی بجائے کافروں کے ہاتھوں میں اپنی زندگی کی زمام امور سپرد کر دیں کہ جس کا نتیجہ کافروں کا سہارا لینا اور مؤمنین سے دوری اختیار کر کے کافروں سے قریب ہونا ہے۔

قرآنی آیات مبارکہ کا مطالعہ کرنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ان میں کافروں، یہودیوں اور نصاریٰ سے دوستی ومحبت اور انہیں اولیاء بنانے کی ممانعت کی گئی ہے، لیکن ہر آیت میں دوستی وولایت کے موارد دوسری آیت سے مختلف ہیں اور ان موارد کی تفسیر اسی آیت میں مذکور الفاظ سے ہو جاتی ہے اور معلوم ہو جاتا ہے کہ اس میں نہی کا معنی کیا ہے؟ اور ممنوعہ دوستی وولایت کی کیفیت اور حدود وقیود کیا ہیں جیسا کہ زیر نظر آیت مبارکہ میں الفاظ "مِنۡ دُوۡنِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ" کہ جو "لَا یَتَّخِذِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الۡکٰفِرِیۡنَ اَوۡلِیَآءَ" کے فوراً بعد ذکر ہوئے ہیں ان سے کافروں سے رشتۂ محبت وولایت کی کیفیت اور معیار و بنیاد سے آگاہی دلائی گئی ہے، اور اسی طرح درج ذیل آیت مبارکہ میں بھی یہی صورت دکھائی دیتی ہے:

سورۂ مائدہ، آیت :۵۱

○ " یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰی اَوْلِیَآءَ "

(اے ایمان والو ! تم یہودیوں اور عیسائیوں کو دوست نہ بناؤ)

اس آیت میں الفاظ "بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ" (کہ وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں) بھی مذکور ہیں جو ممانعت کی وجہ کو بیان کرتے ہیں۔

ایک اور آیت میں ان سے دوستی کی ممانعت اور اس کی کیفیت و وجہ اس طرح ذکر کی گئی ہے جس سے واضح طور پر اس حکم کا بنیادی فلسفہ اور مصلحت و حکمت سے آگاہی حاصل ہو جاتی ہے (ملاحظہ ہو)

سورۂ ممتحنہ، آیات ۱ تا ۸:

○ " یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَعَدُوَّکُمْ اَوْلِیَآءَ...... "

(اے ایمان والو ! تم میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ......)

اس کے تسلسل میں ارشاد ہوا:

" لَا یَنْهٰکُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ...... "

(اللہ تمہیں ان سے منع نہیں کرتا جو تم سے دین کے بارے میں لڑائی نہیں کرتے)

تو اس جملہ میں پہلے جملہ کی تفسیر مذکور ہے اور دوستی و ولایت کی حدود کا تعین ہوتا ہے۔

بنابرایں زیر نظر آیت مبارکہ میں جو اوصاف ذکر کئے گئے ہیں اور کہا گیا ہے " لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ " (مؤمنین، مؤمنین کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست و حاکم نہ بنائیں) تو اس میں حکم کی علت وسبب کا بیان مقصود ہے اور وہ یہ کہ ان دو صفتوں یعنی کفر اور ایمان کے درمیان جو دوری و بعد اور تضاد و جدائی پائی جاتی ہے وہ لا محالہ ان دو صفتوں کے حامل افراد کے درمیان بھی سرایت کرتی ہے کہ جس کے نتیجہ میں وہ دو یعنی اہل کفر اور اہل ایمان تمام متعلقہ امور میں ایک دوسرے سے مختلف و جدا ہوتے ہیں مثلاً علوم و معارف، اخلاق و عادات، عبادات و خدا کے تقرب کے لئے اختیار کئے جانے والے طرز عمل اور زندگی کے دیگر امور و مسائل میں ان کے درمیان واضح اختلاف و فرق ہوتا ہے اور وہ فرق بھی اس حد تک کہ ان کے درمیان دوستی و ولایت کا رشتہ قائم ہی نہیں ہوسکتا کیونکہ ولایت و دوستی فکری یکجہتی اور ذہنی امتزاج و ہم آہنگی چاہتی ہے جبکہ وہ دو صفتیں یعنی کفر و ایمان کہ جو ان افراد میں پائی جاتی ہیں وہ ایک دوسرے سے جدائی و بینونت کا باعث بنتی ہیں، لہٰذا اگر کسی مؤمن کے دل میں کافر کے بارے میں دوستی و محبت کے جذبات گھر کر جائیں اور ان میں قوت و شدت پیدا ہو جائے تو جتنی مقدار میں اس میں اضافہ ہوگا اتنی مقدار میں ایمان کے آثار و خصوصیات میں کمی آجائے گی یہاں

تک کہ رفتہ رفتہ وہ (ایمان) ختم ہو جائے گا اور اس کا نام و نشان تک باقی نہ رہے گا، یہی وجہ ہے کہ خداوند عالم نے کافروں سے دوستی و محبت کے رشتہ کو مستحکم کرنے کی ممانعت کا حکم صادر کرنے کے بعد فوراً ارشاد فرمایا: " الا ان تتقوا منھم تقیۃ " (مگر یہ کہ تم ان سے خوفزدہ ہو) تو اس میں تقیہ کے مورد کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے کیونکہ تقیہ کا مطلب یہ ہے کہ ظاہری طور پر ان سے اظہار ولایت کیا جائے جبکہ حقیقت میں ولایت و دوستی نہ ہو، (دل و باطن اور حقیقت میں ان سے ولایت و محبت کا کوئی رشتہ نہ ہو بلکہ صرف ڈر اور ان کے شر سے بچنے کے لئے ظاہری و زبانی طور پر اس کا اظہار کیا جائے)۔

قرآنی ادب کا ایک نمونہ

زیر نظر آیت مبارکہ میں ارشاد ہوا " مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ "، اس میں حرف " دُوْنِ "(علاوہ) ذکر ہوا ہے جو کہ ظرف کی طرح "عند" (پاس) کا معنی دیتا ہے، البتہ اس میں کمتری و ناچیزی کا معنی بھی قابل تصور ہے، اس بناء پر آیت کا معنی یوں ہوگا: مؤمنین، مؤمنین کے علاوہ کافروں کو اپنا دوست و ولی نہ بنائیں اور انہیں (کافروں کو) مؤمنین کی جگہ پر نہ لائیں کیونکہ کافرین کا مقام و رتبہ مؤمنین کے مقابلے میں کمتر و ناچیز ہے اور مؤمنین ان سے بہت بلند مقام و منزلت کے حامل ہیں۔

بظاہر حرف " دُوْنِ " کا اصل معنی یہی ہے جو ذکر کیا گیا ہے کہ اس میں پستی کی حامل نزدیکی کا مفہوم پایا جاتا ہے، چنانچہ عربوں کا قول "دونک زید" یہ معنی دیتا ہے کہ زید تیرے پاس یا تیرے مقام و رتبہ سے نیچے درجہ پر ہے جیسے ایک درجہ دوسرے درجہ سے نیچے ہوتا ہے (یا ایک سیڑھی دوسری سیڑھی کے نیچے ہوتی ہے) لیکن اسے حرف "غیر" کے معنی میں بھی استعمال کیا گیا ہے جیسا کہ ارشاد ہوا:

سورۂ مائدہ، آیت :۱۱۶

○ " اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ "

(خدا کے علاوہ دو خدا)

سورۂ نساء، آیت :۴۸

○ " وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ "

(اور وہ اس کے علاوہ جسے چاہتا ہے معاف کرتا ہے)

اس آیت (نساء، ۴۸) میں " علاوہ " اور " کمتر و پست تر " کا معنی بھی کیا جا سکتا ہے یعنی دونوں معنی ممکن ہیں۔

حرف "دون" کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ اسے اسم فعل میں استعمال کیا جاتا ہے مثلاً یوں کہا جاتا ہے: "دونک زیدا" یعنی زید کا خیال رکھنا، اس کے ساتھ ساتھ رہنا، نہ یہ کہ وہ ان تمام معانی میں مشترک لفظی ہے، یعنی ایسا نہیں کہ ہر معنی کے لئے یہی ایک لفظ بنایا گیا ہو اور ان سب میں برابر حیثیت رکھتا ہو بلکہ مختلف موارد میں منطبق ہونے کی بناء پر اسے مختلف معانی میں استعمال کیا جاتا ہے۔

کافروں کو اولیاء بنانے والوں کی حیثیت

○ " وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ "
(اور جو شخص ایسا کرے تو اس کا خدا سے کوئی تعلق نہ ہوگا)

یعنی جو شخص مؤمنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست بنائے اس کا خدا سے کوئی تعلق نہ رہے گا، اس جملہ میں لفظ "ذٰلِكَ" استعمال ہوا ہے جو کہ عام ہے یعنی کسی بھی دور کی طرف اشارہ کے لئے آتا ہے، یہاں اسے اس لئے استعمال کیا گیا کہ اس امر کی طرف اشارہ کیا جا سکے کہ متکلم کو اس کام سے کہ جس کی طرف اشارہ ہوا ہے اس قدر سخت نفرت ہے کہ وہ اس کا ذکر زبان پر لانا ہی نہیں چاہتا بلکہ عمومی لفظ کے ذریعے اس کی طرف ملتفت و متوجہ کرنا چاہتا ہے یعنی خداوند عالم کو یہ بات اس قدر ناگوار ہے کہ مؤمنین، مؤمنین کو چھوڑ کر کافروں کو دوست بنائیں کہ اس عمل کا زبان پر لانا ہی اسے گوارا نہیں لہٰذا اس نے اسے حرف "ذٰلِكَ" (وہ، ایسا) کے ذریعے بیان کیا، یہ اسی طرح ہے جیسے کسی قبیح و برے کام کا ذکر کنایۃً کیا جاتا ہے تا کہ یہ معلوم ہو کہ اس برے عمل سے شدید نفرت ہے اور اس کا زبان پر لانا ہی گوارا نہیں سمجھا جاتا، اس کے علاوہ یہ بات بھی اسی حوالہ سے ہے کہ خداوند عالم نے اس جملہ میں مؤمنین کا لفظ بھی ذکر نہیں کیا اور یوں نہیں فرمایا: "**ومن یفعل ذلک من المؤمنین**" (اور جو کوئی مؤمن ایسا کرے) بلکہ فرمایا: "وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ" (اور جو شخص ایسا کرے......) تو اس سے بھی اس امر کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ مؤمنین کی شان اس سے کہیں بالاتر ہے اور وہ اس سے مبرا ہیں کہ ان کی طرف اس طرح کے قبیح عمل کی نسبت دی جائے... کہ وہ مؤمنین کو چھوڑ کر کافروں کو اپنے دوست بنائیں...،

ادبی ظرافت کی ایک مثال

آیت مبارکہ میں ارشاد ہوا: "فَلَيْسَ مِنَ اللهِ......" تو یہاں حرف "مِنَ" ابتداء کے لئے ہے اور عام طور پر اس طرح کے موارد میں اس کا معنی "گروہ" اور "جماعت" میں سے ہوتا ہے یعنی "لیس من اللّٰہ" (اور اللہ سے نہیں) کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کے گروہ میں سے نہیں، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

سورۂ مائدہ، آیت :۵٦

○ " وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ "

(اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول اور ایمان والوں سے دوستی و محبت کرے اور ان کی ولایت کا دم بھرے تو یقیناً اللہ کا گروہ ہی غلبہ والا ہے)

اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوا کہ انہوں نے کہا:

سورۂ ابراہیم، آیت :۳٦

○ " فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ "

(تو جو شخص میری پیروی کرے گا وہ مجھ سے ہوگا)

یعنی میرے گروہ میں شمار ہوگا،

بہرحال یہاں حرف "من" کے حوالہ سے آیت کا معنی (واللہ اعلم) یہ ہوگا: "لیس من حزب اللّٰہ مستقراً فی شییء من الاحوال و الآثار" کہ وہ شخص کسی بھی حال و صورت میں ہرگز خدا کے گروہ میں قرار پانے والا نہیں۔

تقیہ کا استثناء

○ " اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً "

(مگر یہ کہ تم اِن سے سخت خوفزدہ ہو)

"تتقوا" "اتقاء" سے ہے، اس کا اصل معنی خوف سے بچنا ہے، اور چہ بسا اسے خود خوف کے معنی میں بھی ذکر کیا

جاتا ہے جو کہ مسبب کو سبب کے مورد و مقام میں استعمال کرنے سے تعبیر کیا جاتا ہے، شاید یہاں آیت مبارکہ میں تقیہ کا لفظ اسی طرح کے استعمال کی صورت میں ہو۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ یہ استثناء، استثناء منقطع ہے کیونکہ خوف کی وجہ سے ظاہری طور پر دوستی و محبت کا اظہار دل سے محبت و ولایت کا رشتہ جوڑنے سے قطعی مختلف ہے اور اسے حقیقی معنی میں دوستی و محبت اور ولایت قرار نہیں دیا جا سکتا، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ خوف اور محبت دو ایسے امور ہیں جن کا تعلق دل سے ہوتا ہے اور وہ دونوں متضاد صفتیں ہیں کہ جن میں سے ہر ایک، دوسری سے قطعی مختلف آثار رکھتی ہے اور دونوں کے آثار لوحِ دل پر ایک دوسری کے مقابل صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں، تو یہ بات کیونکر ممکن ہے کہ وہ دونوں اکٹھی ہو جائیں اور ایک دل میں دونوں ایک ہی وقت میں یکجا ہوں؟ ایسا ہونا ہرگز ممکن نہیں، بنابراین آیت مبارکہ میں تقیہ استثناء منقطع ہوگا، یعنی جس سے اس کا استثناء ہوا ہے یہ اس کی جنس سے نہیں......

یہ آیہ مبارکہ واضح طور پر تقیہ کے جواز پر دلالت کرتی ہے اور اسی کی بابت حضرات آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی روایات وارد ہوئی ہیں، جیسا کہ اس آیت مبارکہ میں تقیہ کا تذکرہ ہوا ہے جو حضرت عمار یاسر اور ان کے والدین یاسر اور سمیہ کے بارے میں نازل ہوئی جس میں یوں ارشاد الٰہی ہوا:

سورۂ نحل، آیت :۱۰۶

○ " مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ○ "

(جو شخص ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کرے، مگر وہ کہ جسے مجبور کیا جائے جبکہ اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو، لیکن جو شخص کفر کے لئے اپنا سینہ کھول دے تو ایسے لوگوں پر اللہ کا غضب نازل ہوگا اور ان کے لئے بہت بڑا عذاب ہے)

المختصر یہ کہ کتاب و سنت سے تقیہ کا جواز اجمالی طور پر ثابت ہے اور اس کے فی الجملہ جواز پر دونوں میں واضح ثبوت پائے جاتے ہیں اور اس کی تائید عقلی اصولوں سے بھی ہوتی ہے کیونکہ دین کا مقصد اور شارع مقدس کی کاوشوں کا ہدف اس کے سوا کچھ نہیں کہ حق ظاہر ہو اور زندہ و تابندہ رہے، اور چہ بسا ایسا ہوتا ہے کہ تقیہ اور دشمنان دین و مخالفین حق کے ساتھ ظاہری طور پر ہم صدا ہونا دین کے تحفظ، خدائی مصلحتوں کی پاسداری اور حق کو زندہ رکھنے کی بابت تقیہ کو ترک کرنے کے مقابلے میں زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے، اور یہ بات زمینی حقائق کے تناظر میں ناقابل تردید ہے، اس کے باوجود کوئی اس کا انکار کرے تو اس کا عمل ڈھٹائی اور واضح امور کو رد کر دینے کے باب سے ہوگا، اس کی بابت تکمیلی سلسلہ بحث "روایات پر ایک نظر" میں ہوگا اور سورۂ نحل کی تفسیر میں اس کی مذکورہ آیت (۱۰۶) "مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَ قَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ

بِالْاِیْمَانِ" کے بیان میں مزید وضاحت ہوگی۔ انشاء اللہ۔

خدا کا اپنے آپ سے خبردار کرنا

○ " وَیُحَذِّرُکُمُ اللّٰہُ نَفْسَہٗ ؕ وَاِلَی اللّٰہِ الْمَصِیْرُ "
(اور خدا تمہیں اپنے آپ سے خبردار کرتا ہے، اور اللہ کی طرف لوٹ کر جانا ہے)

" یُحَذِّرُکُمْ " ، حذر سے باب تفعیل " تحذیر " کا فعل مضارع ہے، "تحذیر" کا معنی خوفناک چیز سے بچ کر رہنا ہے۔ اس آیت میں خداوند عالم کا یہ کہنا کہ وہ اپنے بندوں کو اپنے آپ سے بچ کر رہنے کا حکم دیتا ہے تو اس کا معنی یہ ہے کہ وہ انہیں اپنے عذاب سے بچ کر رہنے کی تاکید کرتا ہے جیسا کہ ارشاد ہوا :

سورۂ اسریٰ، آیت :۵۷

○ " اِنَّ عَذَابَ رَبِّکَ کَانَ مَحْذُوْرًا "
(بے شک تیرے رب کا عذاب ایسا ہے کہ اس سے بچنا ضروری ہے)

اسی طرح خداوند عالم نے اپنے رسولؐ کو منافقوں اور کافروں کی شر انگیزیوں سے بچ کر رہنے کا حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

سورۂ منافقین، آیت :۴

" ھُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْھُمْ "
(وہ دشمن ہیں ان سے بچ کے رہو)

سورۂ مائدہ، آیت :۴۹

○ " وَاحْذَرْھُمْ اَنْ یَّفْتِنُوْکَ "
(اور ان سے بچ کے رہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تجھے اپنی فتنہ انگیزی کا شکار کر لیں)

اور زیر نظر آیۂ مبارکہ اور اس کے دو آیتوں کے بعد والی آیت میں خداوند عالم نے اپنے مؤمن بندوں کو خود اپنی ذات سے بچ کر رہنے کا حکم دیا...... کہ جس کے بارے میں بیان ہو چکا ہے کہ اس سے مراد عذاب خدا سے بچ کر رہنا ہے..... تو اس واضح وصریح بیان میں اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ خدا خود ہی خوفناک ہے کہ جس سے بچ کر رہنا ضروری ہے کہ کہیں اس کی

نافرمانی کے مرتکب نہ ہوں، ...... وہ اپنی نافرمانی سے بچ کر رہنے کا خوف خود دلاتا ہے......یعنی خدا کی نافرمانی کرنے والے مجرم اور خود خدا کے درمیان کوئی دوسری خوف آور چیز نہیں کہ جس سے بچنا کسی چیز کے ذریعے ممکن ہو یا کسی مضبوط قلعہ میں پناہ لی جا سکے بلکہ وہ خود خدا ہے کہ جس کی نافرمانی کی صورت میں اس کے عذاب سے بچانے والا کوئی نہیں اور نہ ہی نافرمانی کرنے والے شخص اور خدا کے درمیان کوئی ایسی چیز ہے جس کے ذریعے نافرمان شخص کو آنے والی سختی سے بچنے کی توقع کی جا سکے یعنی کوئی ولی اور نہ ہی کوئی شفیع ایسا ہے جو نافرمان شخص کو عذاب الٰہی سے بچا سکے۔ بنا بریں اس حوالہ سے کلام الٰہی میں شدید ترین انتباہ پایا جاتا ہے اور اس کا ایک ہی مقام میں بار بار ذکر کیا جانا اس کی شدت میں اضافہ کی نشاندہی کرتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ مزید تاکید ان ذیلی دو جملوں کے ذریعے ہوئی ہے جن میں کہا گیا:

(۱) "وَ اِلَی اللّٰهِ الْمَصِیْرُ"

(اور اللہ کی طرف ہی ہے بازگشت اور لوٹ کر جانا !)

(۲) "وَ اللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ"

(اور اللہ بندوں پر نہایت مہربان ہے)

اس سلسلہ میں مزید تفصیل عنقریب بیان کی جائے گی۔

اس کے علاوہ زیر نظر آیہ مبارکہ اور دیگر وہ آیات شریفہ کہ جن میں غیر مؤمنین سے دوستی و محبت کا رشتہ قائم کرنے کی ممانعت کی گئی ہے مجموعی طور پر اس امر کی نشاندہی کرتی ہیں کہ ایسا کرنا خدا کی بندگی کے دائرے سے باہر نکل جانے کا سبب بنتا ہے اور ولایت الٰہیہ کو ترک کر کے دشمنان خدا کے گروہ میں شامل ہو کر دینی امور میں خرابی و فساد پھیلانے کی عملی کوشش کہلاتا ہے، خلاصہ یہ کہ وہ طغیان و سرکشی اور دینی نظام کو تباہ و برباد کرنے کی ایک ایسی شدید ترین صورت ہے جو کافروں کے کفر اور مشرکوں کے شرک سے کہیں زیادہ دین کو نقصان پہنچانے کا باعث ہے کیونکہ ظاہر بظاہر دشمن کا خصمانہ عمل سامنے ہوتا ہے کہ جس کا مقابلہ آسان اور اس سے نمٹنا سہل ہوتا ہے اور اس کے شر سے بچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی لیکن دوستی و محبت کا دم بھرنے والا شخص جب دشمنوں سے دل لگی کرنے لگے اور ان کے اخلاق و آداب اور طور طریقوں کو اپنا لے تو وہ دین اور اہل دین کے لئے غیر ارادی طور پر ہی سہی نہایت نقصان دہ ثابت ہوتا ہے بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ وہ خود بھی تباہ و برباد ہو جاتا ہے اور دوسروں کی تباہی کے دروازے بھی کھول دیتا ہے کہ پھر نہ تو زندہ رہنے کی کوئی امید باقی رہتی ہے اور نہ ہی بقا و سلامتی کا کوئی راستہ دکھائی دیتا ہے۔

بہرحال یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ مؤمنوں کو چھوڑ کر کافروں سے دوستی و محبت اور ولایت کا رشتہ جوڑنا طغیان و سرکشی اور دین سے بغاوت کی عملی صورت ہے، اور سرکش و باغی کا معاملہ خود خداوند عالم کے ہاتھ میں ہے، اس ضمن میں قوم عاد

کے بارے میں قرآنی بیان ملاحظہ ہو جس میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

سورۂ فجر، آیات ۶ تا ۱۴ :

○ " اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۝ الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ۝ وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ۝ وَفِرْعَوْنَ ذِي الْاَوْتَادِ ۝ الَّذِيْنَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ ۝ فَاَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ ۝ فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ۝ اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ۝ "

(کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے پروردگار نے قوم عاد کے ساتھ کیا سلوک کیا، ستونوں والے ارم کے ساتھ، وہ کہ جن کی مثل کہیں بھی نہیں بنائی گئی، اور قوم ثمود کے ساتھ کیا سلوک کیا.... کہ جنہوں نے وادیوں میں چٹانیں تراش کر گھر بنائے ہوئے تھے، اور فرعون کے ساتھ کیا سلوک کیا کہ جو میخوں والا تھا، وہ کہ جنہوں نے ملکوں میں سرکشی کی راہ اپنائی، اور ان میں کثرت سے فساد پھیلایا، تو تیرے پروردگار نے ان پر کوڑوں کا عذاب نازل کیا، بے شک تیرا رب گھات میں ہے۔)

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ سرکش کی سرکشی اسے اس حد تک لے جاتی ہے جہاں خداوند عالم گھات میں ہے کہ پھر سوائے خداوند قدوس کے کوئی دوسرا نہیں، تو خدا اس پر عذاب کے کوڑے برساتا ہے کہ کوئی اس کو روک نہیں سکتا۔

ان مطالب سے ظاہر ہوتا ہے کہ خداوند عالم کا لوگوں کو متنبہ و آگاہ اور خبردار کرنا اور اپنے آپ سے ڈرانا (وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ..... اور اللہ تمہیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے.....) اس وجہ سے ہے کہ کافروں و مشرکوں سے دوستی و محبت کا رشتہ جوڑنا خدا سے بغاوت اور اس کے دین میں رخنہ و فتنہ اندازی کر کے اسے تباہ کرنے کی ایک واضح صورت اور کھلا مصداق ہے.... لہٰذا خداوند عالم مؤمنین کو خبردار کرتا ہے کہ سرکشی کی اس مکروہ صورت کو نہ اپنائیں ورنہ انہیں میرے سخت عذاب کا سامنا ہوگا اور کوئی انہیں اس سے بچا نہیں سکتا۔

مذکورہ بالا مطالب کہ جو نتیجہ کے طور پر ہم نے پیش کئے ہیں ان کی صحت پر واضح دلیل یہ ہے :

سورۂ ہود، آیت ۱۱۳ :

○ " فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ۭ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَاۗءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ۝ "

(پس تم استقامت اختیار کرو (اپنے مؤقف پر ڈٹے رہو) اور وہ بھی جس نے تیرے ساتھ توبہ کی، اور تم طغیان و سرکشی نہ کرو کہ یقیناً وہ تمہارے اعمال سے بخوبی آگاہ ہے، اور تم ان لوگوں کا سہارا نہ لو جنہوں نے ظلم کیا ورنہ تمہیں آگ پکڑ لے گی اور خدا کے علاوہ جن کو اولیاء سمجھے ہو وہ تمہارے کسی کام نہ آئیں گے پھر تمہاری مدد نہ کی جائے گی)

یہ وہی آیت ہے جس کے بارے میں حدیث نبویؐ میں وارد ہوا ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ اس نے مجھے بوڑھا

کر دیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دو آیتیں جیسا کہ ان میں غور و فکر اور تدبر سے کام لینے والے ہر شخص پر واضح ہے کہ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ کافروں میں سے ظالموں کا سہارا لینا طغیان و سرکشی ہے کہ جس کا نتیجہ اس آگ میں جلنا ہے جس سے کوئی بھی بچا نہیں سکتا اور وہ خدائی انتقام ہے کہ جس سے چھٹکارا ممکن نہیں اور نہ ہی کوئی مجرم اس سے اپنے آپ کو بچا سکتا ہے جیسا کہ اس سلسلہ میں مطالب پہلے ذکر ہو چکے ہیں۔

ان مطالب سے یہ نکتہ بھی معلوم و واضح ہو جاتا ہے کہ یہ فقرہ "وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ" اس امر کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ خداوند عالم کا اس انداز میں خبردار کرنا درحقیقت ایک ایسے عذاب کے بارے میں متنبہ کرنا ہے جو یقینی طور پر طے شدہ ہے کیونکہ اس فقرے میں خداوند عالم نے خود اپنے آپ سے خبردار رہنے کا کہا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ درمیان میں کوئی شے حائل نہیں ہو سکتی اور کوئی چیز خدا سے بچا نہیں سکتی کیونکہ اس نے خود عذاب کی وعید دی ہے، تو اس سے عذاب کا قطعی و یقینی طور پر واقع ہونا ثابت ہوتا ہے جیسا کہ اس کی مانند سورۂ ہود کی مذکورہ بالا دو آیتوں میں ذکر ہوا ہے کہ "ورنہ تمہیں آگ پکڑ لے گی اور تمہیں کوئی بھی مدد دینے والا نہیں ہوگا" (فتمسکم النار وما لکم من ناصرین)

اور آیہ مبارکہ کا فقرہ "وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ" اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ تمہارے لئے عذاب الٰہی سے بچنے کا کوئی راستہ موجود نہیں اور نہ ہی کوئی ایسی وجہ دکھائی دیتی ہے جس کی بنیاد پر خداوند عالم اسے نظر انداز کر دے، اس سے خدائی انتباہ میں تاکید کا ثبوت ملتا ہے۔

بہر حال ان آیات مبارکہ یعنی "لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ" اور اس کے بعد والی آیات کا قرآن مجید میں دی جانے والی غیبی خبروں پر مشتمل آیت میں شمار ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں مزید وضاحت سورۂ مائدہ کی تفسیر میں پیش ہوگی، انشاء اللہ تعالیٰ۔

خدا کی ظاہر و باطن سے آگاہی

○ "قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ"

(کہہ دیجئے کہ تم اپنے دل کی بات چھپاؤ یا ظاہر کرو خدا اس سے آگاہ ہے)

یہ آیت مبارکہ درج ذیل آیت کے مانند ہے :

سورۂ بقرہ، آیت : ۲۸۴

○ "وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ"

(اور اگر تم اسے ظاہر کرو جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے یا اسے چھپائے رکھو خدا اس کی بابت تمہارا محاسبہ کرے گا)

ان دو آیتوں میں الفاظ کی ترتیب کا جو فرق ہے اس کی بابت یہ کہا گیا ہے کہ زیر بحث آیت مبارکہ میں چھپانے کا ذکر پہلے اور ظاہر کرنے کا ذکر بعد میں ہے "تُخْفُوْا مَا فِیْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ" جبکہ سورۂ بقرہ کی آیت میں ظاہر کرنے کا ذکر پہلے اور چھپانے کا بعد میں ہوا ہے: "تبدوا ما فی انفسکم او تخفوہ"، اس حوالہ سے دونوں میں آگاہی اور محاسبہ کے مختلف الفاظ استعمال کئے گئے ہیں کیونکہ علم و آگاہی کا تعلق مخفی و پوشیدہ ہونے سے موزوں جبکہ محاسبہ کا تعلق ظاہر و آشکار ہونے سے موزوں ہے لہٰذا زیر نظر آیت مبارکہ میں چھپانے کا ذکر ظاہر کرنے سے پہلے کیا گیا جبکہ سورۂ بقرہ میں اس کے برعکس ہوا یعنی ظاہر کرنے کا ذکر مخفی کرنے سے پہلے ہوا۔

زیر بحث آیۂ مبارکہ میں خداوند عالم نے اپنے رسولؐ کو حکم دیا کہ اس حقیقت کو لوگوں تک پہنچا دیں کہ جو کچھ ان کے دلوں میں ہے خواہ اسے چھپائیں یا ظاہر کریں خدا اس سے آگاہ ہے، اس بات کو بلاواسطہ بیان نہیں کیا بلکہ اپنے رسولؐ کے ذریعے پہنچایا جبکہ سابقہ آیات میں خود اس بات کو بیان کیا اور اس کے پہنچانے میں رسول کو ذریعہ نہیں بنایا، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس کی ذات اس سے کہیں بالاتر ہے کہ ان لوگوں سے ہمکلام ہو جن کے بارے میں اسے معلوم ہے کہ وہ اس کے احکامات کی نافرمانی کے مرتکب ہوں گے، چنانچہ اس کی مثال فقرہ "وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ" میں بھی پائی جاتی ہے۔

اور آیت کے جملہ "وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ" میں سورۂ بقرہ کی مذکورہ آیت سے شباہت و مماثلت پائی جاتی ہے، کہ اس حوالہ سے مربوطہ مطالب پہلے ذکر ہو چکے ہیں۔

قیامت کے دن اعمال کا ظاہر بظاہر دکھائی دینا (تجسمِ اعمال)

○ "يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۚ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْۗءٍ"

(جس دن ہر شخص اپنے اعمال کو اپنے روبرو پائے گا خواہ اچھا عمل کیا ہو گا یا برا عمل کیا ہو گا)

سیاقِ کلام کی پیوستگی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت، ماقبل آیت میں جاری سلسلۂ گفتگو کا تتمہ ہے کہ جس میں حضرت پیغمبر اسلامؐ کو حرف "قل" کے ذریعے پیغام رسانی کا حکم دیا گیا تھا، آیت میں "يَوْمَ" ظرفِ زمان ہے (دن) تو جملہ کی تکمیل کے لئے اس سے پہلے "اذکر" (یاد کرو) فرض کرنا ہوگا تاکہ معنی واضح ہو سکے (اذکر یوم تجد ...) یاد کرو اس دن کو جب ہر شخص پائے گا ...، یا اس کا تعلق جملہ "یعلم اللہ ویعلم......" سے جوڑنا پڑے گا تو اس صورت میں

آیت کا معنی یہ ہوگا کہ خدا اس دن جان لے گا جبکہ وہ جانتا ہے، تاہم اس حوالہ سے کوئی حرج نہیں کہ اس دن کا تعلق خدا کے علم و آگاہی سے اس بنیاد پر جوڑا جائے کہ اس دن ہم قیامت کے دن کی صورتحال اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے کیونکہ وہ دن اس نسبت سے علم الٰہی کا ظرف واقع ہوگا کہ اس میں تمام صورتحال ہمارے سامنے آ جائے گی اور سب کچھ ظاہر ہو جائے گا نہ یہ کہ اس دن خدا کو علم حاصل ہوگا، اور یہ بعینہ اسی طرح سے ہے جیسے اس دن اس کی حاکمیت اعلیٰ اور قدرت وقوت ظاہر ہوگی چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

سورۂ مؤمن، آیت :۱۶

O " يَوْمَ هُمْ بَارِزُونَ ۚ لَا يَخْفَىٰ عَلَى اللَّهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ ۚ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۖ لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿۱۶﴾ "

(اس دن وہ باہر آ جائیں گے، ان کی کوئی شے اللہ سے مخفی و پوشیدہ نہ ہوگی، آج کس کی حاکمیت ہے، اللہ کی جو کہ یکتا و غالب ہے)

سورۂ ہود، آیت ۴۳:

O " لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ "

(آج کوئی بھی خدا سے بچانے والا نہیں)

سورۂ بقرہ، آیت ۱۶۵ :

O " وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ ظَلَمُوا إِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ أَنَّ الْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا "

(اگر ظلم کرنے والوں کو معلوم ہو کہ جب وہ عذاب کا مشاہدہ کریں گے کہ سب کی سب طاقت خدا کے پاس ہے)

سورۂ انفطار، آیت ۱۹ :

O " وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِلَّهِ "

(آج حاکمیت صرف اللہ سے مخصوص ہے)

ان آیات مبارکہ میں حاکمیت، قدرت، قوت و سلطنت کو خدا سے مخصوص قرار دے کر کہا گیا ہے کہ قیامت کے دن یہ سب کچھ خدا کے پاس ہوگا جبکہ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ ہر طرح کی مالکیت و حاکمیت، قدرت و توانائی اور قوت و سلطنت ہمیشہ خدا سے مخصوص ہے۔ قیامت سے پہلے اور قیامت کے بعد۔۔ اور ان امور کو قیامت کے دن خدا سے مخصوص کر کے ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ تمام امور قیامت کے دن ہم سب پر ظاہر و آشکار ہوں گے کہ جس میں کسی طرح کا شک و شبہ نہیں پایا جاتا۔

اس بیان سے یہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے کہ اگر " یَوْمَ " (ظرف زمان) کو جملہ " یَعْلَمْهُ اللّٰهُ " سے متعلق قرار دیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ خدا کو صرف قیامت کے دن بندوں کے اسرار اور اچھے و برے اعمال سے آگاہی حاصل ہو گی بلکہ اس سے ہمارے مشاہدے کا ثبوت فراہم ہو گا۔

ایک ادبی اور علمی نکتہ

آیت مبارکہ میں لفظ " حاضرا " کی بجائے " محضرا " ذکر ہوا ہے اس کی وجہ وہی ہے جو علم خدا کی بابت بیان کی جا چکی ہے کیونکہ " محضرا " جو کہ "احضار" (باب افعال) سے مفعول بہ کا صیغہ ہے اس کا معنی " حاضر کیا گیا " یا " حاضر کی گئی چیز " ہے۔ "احضار" کا اطلاق اسی مورد پر ہوتا ہے جہاں کوئی ایسی چیز لائی جائے جو موجود ہو مگر آمنے سامنے نہ ہو یعنی مخفی و پوشیدہ شے کے بارے میں "احضار" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، تو چونکہ بندوں کے اعمال موجود ہیں اور انہیں ضائع ہونے سے محفوظ کر لیا گیا ہے اور خدا ان سے آگاہ ہے وہ ان اعمال کو قیامت کے دن اپنی مخلوق کے سامنے حاضر کرے گا اور خدا کے علاوہ کوئی بھی ان کی حفاظت کرنے والا نہیں، چنانچہ اس کا ارشاد گرامی ہے :

سورہ سباء، آیت ۲۱ :

O " وَرَبُّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ "

(اور تیرا پروردگار ہر چیز پر نگران و محافظ ہے)

سورۂ ق، آیت :۴

O " وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ "

(اور ہمارے پاس محفوظ کرنے والی کتاب ہے)

آیت میں جملہ " تجد " استعمال ہوا ہے، یہ لفظ "وجدان" سے بنا ہے جس کا معنی "پانا" ہے کہ جس کا مدمقابل " فقدان " ہے یعنی "کھو دینا"، " محرومیت"،

اور حرف "من" جو جملہ "مِنْ خَيْرٍ مِنْ سُوْٓءٍ" میں استعمال ہوا ہے وہ بیانیہ ہے یعنی "مَا عَمِلَتْ" کو بیان کرتا ہے، اور لفظ "خَيْرٍ" اور "سُوْٓءٍ" کو نکرہ کی صورت میں ذکر کیا گیا ہے "الخیر" یا "السوء" نہیں کہا گیا تو اس میں تعمیم مقصود ہے یعنی ہر خیر اور اچھا کام، اور ہر برا (سوء) کام اس میں شامل ہے، تو آیت کا معنی یہ ہو گا کہ ہر شخص اپنے سامنے پائے گا ہر وہ نیک و اچھا کام جو اس نے انجام دیا ہو گا خواہ وہ کم ہی کیوں نہ ہو اور اسی طرح ہر وہ برا کام جو اس نے کیا ہو خواہ وہ

جس قدر بھی ہو، اور ظاہر السیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ جملہ " وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ " اپنے ماقبل جملہ " وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ خَیْرٍ " پر عطف ہوا ہے۔

یہ آیت مبارکہ ان آیات میں سے ایک ہے جو اعمال کے مجسم ہونے پر دلالت کرتی ہیں، اس موضوع کی بابت سورۂ بقرہ میں بحث ہو چکی ہے۔

ایک ناقابل عمل تمنا کا ذکر

○ " تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَیْنَهَا وَبَیْنَهٗٓ اَمَدًا بَعِیْدًا "
(ہر شخص چاہے گا کہ اس کے برے اعمال اور اس کے درمیان بہت دوری ہوتی!)

بظاہر یہ جملہ ایک محذوف خبر کا مبتداء ہے جو کہ وہ ضمیر ہے جس کی بازگشت "نفس" کی طرف ہوتی ہے، حرف "لو" تمنا کے لئے استعمال ہوتا ہے اور قرآن مجید میں حرف "ان" مفتوحہ مشددہ سے پہلے کثرت کے ساتھ استعمال ہوا ہے، بنابراین یہ بات قرین صحت نہیں کہ اس طرح کا استعمال غلط ہے اور قرآن میں جہاں بھی استعمال ہوا ہے اس کی تاویل کرنی چاہیے۔

لفظ "امد" زمانی فاصلہ کا معنی دیتا ہے، چنانچہ معروف لغت دان راغب اصفہانی نے اپنی شہرہ آفاق کتاب المفردات میں اس حوالہ سے بھرپور وضاحت کے ساتھ اس طرح لکھا ہے:

" الامد والابد یتقاربان، لکن الابد عبارة عن مدة الزمان التی لیس لها حد محدود ولا یتقید ، لا یقال : ابد کذا، والامد مدة لهاحد مجهول اذا اطلق ، و قدینحصر، نحوان یقال: امد کذا ، کما یقال: زمان کذا ، والفرق بین الزمان والامد ان الامد یقال باعتبار الغایة ، والزمان عام فی المبدء والغایة ، ولذا قال بعضهم : الامد والمدیٰ یتقاربان "

امد اور ابد، قریب المعنی الفاظ ہیں لیکن ابد سے مراد وہ زمانی مدت ہے جس کی کوئی حد معین نہ ہو اور نہ ہی اس میں کوئی قید پائی جاتی ہو یعنی اسے مقید نہ کیا جا سکتا ہو، چنانچہ " ابد کذا " (ایسا ابد) کے الفاظ استعمال نہیں ہوتے، اور امد اس مدت کو کہتے ہیں جس کی حد معین ہو لیکن مطلق اور کسی قید و شرط سے خالی ذکر کرنے میں وہ حد نامعلوم رہتی ہے۔ البتہ کبھی اسے مقید و منحصر صورت میں بھی ذکر کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے: "امد کذا"، فلاں امد یعنی معین مدت، یہ اسی طرح ہے جیسے

کہا جاتا ہے" زمان کذا " یعنی اتنا عرصہ، زمان اور امد کے درمیان فرق یہ ہے کہ امد صرف انتہاء کے حوالہ سے استعمال ہوتا ہے جبکہ زمان ابتداء و انتہاء دونوں کے حوالہ سے استعمال ہوتا ہے۔ اسی بناء پر بعض حضرات نے کہا ہے کہ "امد" اور "مدیٰ" دونوں قریب المعنی الفاظ ہیں۔

اور خداوند عالم کے ارشاد گرامی " تَوَدُّلَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗۤ اَمَدًا بَعِيْدًا " سے مراد یہ ہے کہ برے اعمال کا ظاہر ہونا نفس کے لئے تکلیف و اذیت کا باعث ہوتا ہے جیسا کہ اس کے بالمقابل اچھے اعمال کا ظاہر ہونا خوشی و مسرت کا سبب بنتا ہے۔

اس مقام پر ایک نکتہ قابل توجہ یہ ہے کہ خداوند عالم نے فرمایا ہے" تَوَدُّلَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗۤ اَمَدًا بَعِيْدًا " کہ نفس چاہے گا کہ اس کے برے اعمال اور اس کے درمیان بہت زیادہ دوری ہوتی، اور یہ نہیں فرمایا: " تود انہ لم یکن من اصلہ " کہ وہ چاہے گا کہ اے کاش ! یہ کام انجام پذیر ہی نہ ہوتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کر رہا ہوگا کہ خداوند عالم نے اسے محفوظ کر لیا ہے اور اب اس کے سوا کوئی چارۂ کار اور گنجائش باقی ہی نہیں کہ وہ اس سے دوری کا خواہاں ہو اور یہ چاہے کہ اے کاش، اس دشوار ترین وقت اور ہولناک ترین حالت میں وہ اس عمل کو ظاہر بظاہر نہ دیکھتا اور اس کے درمیان بہت زیادہ دوری واقع ہوتی، اور وہ اپنے برے ہم نشین سے بھی اسی طرح کے الفاظ کہے گا، چنانچہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

O " نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ اِذَا جَآءَنَا قَالَ يٰلَيْتَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ " ..... سورۂ زخرف، آیت ۳۸ .....

(ہم اس کے لئے ایک شیطان قرار دیں گے جو اس کا ہم نشین ہوگا ..... کہ جب ہمارے پاس آئے تو کہے اس سے کہ اے کاش ! میرے اور تیرے درمیان مشرق و مغرب کے درمیان کا فاصلہ ہوتا، کہ تو کس قدر برا ساتھی و ہم نشین ہے)۔

خدا کا متنبہ و خبردار کرنا

O " وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ "

(اور اللہ تمہیں اپنے آپ سے خبردار رہنے کا کہتا ہے، خدا بندوں پر بہت مہربان ہے)

یہاں دوسری مرتبہ خبردار کیا گیا ہے، اس سے پہلے ارشاد ہوا: " وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ

الْمَصِيرُ"(اور اللہ تمہیں اپنے آپ سے خبردار کرتا ہے اور اللہ کی طرف ہی بازگشت ہے) تو دوبارہ خبردار کرنا مطلب و موضوع کی اہمیت کو ثابت کرتا ہے اور اس سے خبردار کرنے کی انتہائی صورت ظاہر ہوتی ہے جو کہ ایک واضح حقیقت ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دوبارہ خبردار کرنا معصیت و گناہ کے اخروی نتائج کے تناظر میں ہو جیسا کہ آیت مبارکہ کا مورد ہی ایسا ہے، جبکہ پہلا خبردار کرنا صرف دنیائی وبال کو ملحوظ رکھتے ہوئے یا ایسا معنی ہو جو دنیا و آخرت دونوں میں حاصل ہونے والے نتائج کے حوالہ سے ہو۔

اور جہاں تک ان الفاظ کا تعلق ہے: "وَاللّٰهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ" (اور اللہ بندوں پر مہربان ہے) تو اگرچہ ان سے خداوندعالم کی رافت و رحمت اور بندوں پر مہربان ہونا ثابت ہوتا ہے جیسا کہ لفظ "عباد" سے بندگی اور کامل وابستگی کا اشارہ ملتا ہے لیکن اس کے باوجود ان لفظوں سے خبردار کئے جانے کی بابت شدت بھی ثابت ہوتی ہے کیونکہ خبردار کرنے اور ہوشیار باش دینے کے موارد میں اس طرح کے الفاظ کا استعمال نافرمانی کے سنگین نتائج کا خوف دلانے اور یہ باور کرانے کے لئے ہوتا ہے کہ متکلم ناصح و خیرخواہ ہے اور اسے اپنے مخاطب کی خیر و بہتری کے سوا کوئی چیز مطلوب و مراد نہیں، چنانچہ آپ جس کے خیرخواہ ہوں اس سے کہتے ہیں کہ خبردار فلاں کام میں میرے ساتھ تنگی و ترشی سے پیش نہ آنا کیونکہ میں نے عہد کیا ہے ...... یا قسم کھائی ہے کہ جو شخص اس کام میں میرے ساتھ بدرفتاری کرے گا میں اس سے درگزر نہیں کروں گا اور میں اس کے کئے کو نظرانداز نہیں کروں گا اور میں تجھے اس سے تیرے ساتھ اپنی رافت و شفقت کی بناء پر خبردار کر رہا ہوں۔

بنابرایں آیت کا معنی یہ ہوگا ..... واللہ اعلم کہ گویا یوں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر مہربان ہونے کی بناء پر انہیں پہلے ہی اس بات سے منع کرتا ہے کہ وہ کہیں اس طرح کی نافرمانی کے مرتکب نہ ہو جائیں کہ جن کا سنگین نتیجہ اور سخت عذاب ہر صورت میں ظاہر و رونما ہوگا اور اس میں نہ شفاعت کرنے والے کی شفاعت کارگر ثابت ہوگی اور نہ ہی کوئی روکنے والا اسے روک سکے گا۔

محبتِ خدا اور اطاعتِ رسولؐ

○ " قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ "
(کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، خدا تم سے محبت کرے گا)

اس سے پہلے سورۂ بقرہ کی آیت ۱۶۵ "وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ" کی تفسیر میں "محبت" کے معنی کی بابت

مطالب ذکر ہو چکے ہیں اور یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ محبت اپنے حقیقی معنی کے ساتھ خداوند عالم سے اسی طرح قائم ہوتی ہے جیسے غیر خدا کے ساتھ !

اور اب اس مقام پر مزید یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں پایا جاتا ..... جیسا کہ قرآن مجید میں واضح طور پر مذکور ہے..... کہ خداوند عالم اپنے بندے کو ایمان، اپنی مخلصانہ عبادت و پرستش اور شرک سے اجتناب و دوری اختیار کرنے کی دعوت دیتا ہے چنانچہ ارشاد حق تعالیٰ ہے:

سورۂ زمر، آیت ۳:

○ " اَلَا لِلّٰهِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ "

(یاد رکھو کہ اللہ کے لئے ہی ہے خالص دین)

سورۂ بینہ، آیت ۵:

○ " وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ "

(اور انہیں نہیں حکم دیا گیا مگر یہ کہ وہ اللہ کی عبادت کریں دین کو اس کے لئے خالص ومختص کر کے)

سورۂ مؤمن، آیت ۱۴:

○ " فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ "

(پس تم اللہ کو پکارو دین کو اس کے لئے خالص وخاص کر کے، خواہ کافروں کو ناپسند ہی کیوں نہ ہو)

یہ اور اس طرح کی دیگر آیات مبارکہ !

اور اس حقیقت میں کسی طرح کا شک وشبہ نہیں پایا جاتا کہ دین میں اخلاص اسی صورت میں حقیقی طور پر صورت پذیر ہوتا ہے جب اس انسان کا دل کہ جو کسی چیز کو صرف اپنی باطنی محبت اور قلبی لگاؤ کے ساتھ چاہتا ہو، خدا کے علاوہ کسی دوسرے معبود و مطلوب سے کسی طرح کے تعلق کا حامل نہ ہو مثلاً بت، مدمقابل یا کوئی دنیاوی غرض ومقصد اس کے دل کی چاہت کا مرکز قرار نہ پائے بلکہ اس سے بھی بالاتر یہ کہ اس کے علاوہ بھی کوئی چیز مطلوب ومراد واقع نہ ہو مثلاً بہشت کے حصول کی کوشش میں کامیابی یا دوزخ کی آگ سے چھٹکارا پانے میں کامیابی وغیرہ، بلکہ اس کا دل صرف اور صرف خدائی بندگی سے وابستہ ہو، تو دین میں اخلاص خدا کی محبت اور اس کے علاوہ کسی کو دل میں نہ لانے ہی کا دوسرا نام ہے۔

محبت کی حقیقت !

اب دیکھنا یہ ہے کہ محبت کی حقیقت کیا ہے اور اس کے آثار ونتائج کیا ہیں ؟

محبت درحقیقت طالب ومطلوب کے درمیان رابطہ کا واحد ذریعہ ہے اور ہر چاہنے والے کو اپنے مقصود ومراد تک پہنچنے کا وسیلہ ہے، اس کا کام محبّ کو اس کے محبوب سے ملا دینا اس غرض کی تکمیل کے لئے ہوتا ہے کہ محبّ جس نقص وکمی سے دوچار ہے وہ محبوب کے ذریعے پوری ہو جائے اور محبوب کے حصول سے اپنی تکمیل کا سامان کر سکے، تو محبّ کے لئے اس سے بڑی کوئی خوشی ومسرت کی بات نہ ہوگی کہ اسے بتایا جائے کہ اس کا محبوب اس سے محبت کرتا ہے، اس صورت میں دو محبتیں یکجا ہو جاتی ہیں اور دونوں طرف سے جذبات واحساسات کا تبادلہ ہوتا ہے۔ اس کی عام مثال یوں ہے کہ انسان غذا چاہتا ہے اور اس کے حصول کے لئے ہر ممکن کوشش کرتا ہے تو وہ اس لئے ہے کہ اس کے ذریعے اپنے اندر پائی جانے والی کمی یعنی بھوک کو دور کرنا چاہتا ہے، اسی طرح مناکحت وجنسی عمل کا خواہاں ہوتا ہے تو وہ بھی اس لئے تاکہ اس کے ذریعے اپنی نفسانی خواہش یعنی شہوت کو پورا کر سکے ...... اور وہ ایک طرح کی کمی کو پورا کرنے سے عبارت ہے......، اور اپنے دوست کی ملاقات ودیدار کی چاہت بھی اس بنیاد پر پیدا ہوتی ہے کہ اسے حاصل کر کے اس کے ذریعے اپنا من راضی کرے اور اپنی دل تنگی کی حالت پر قابو پا لے، اسی طرح اگر غلام اپنے آقا سے محبت کرتا ہے اور خادم اپنے مخدوم سے محبت کرتا ہے تو وہ بھی صرف اس لئے کہ اپنے آقا ومولا کا حق اپنے ذمہ سمجھتا ہے اور اپنے آپ کو اس کی مخدومی کے بوجھ تلے دبا ہوا پاتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس بوجھ کو دور کرے اور اپنے اوپر ثابت ومسلم ہونے والی ذمہ داری کو ادا کر سکے، بہرحال آپ اگر محبت اور قلبی چاہت ولگاؤ کے موارد میں غور کریں یا عشق ومحبت کرنے والے مختلف افراد کی گوناگوں داستانیں پڑھیں تو آپ کو ہمارے ذکر کئے ہوئے مطالب کے بارے میں کوئی شک وشبہ باقی نہ رہے گا۔

بنابرایں جو بندۂ مخلص خدا کے ساتھ اپنی محبت کا دم بھرتا ہے اس کا اس سے بڑا کوئی مقصد ہی نہیں ہوتا کہ خدا اسی طرح اس سے محبت کرے جیسا کہ وہ خدا سے محبت کرتا ہے، اور خدا بھی اسی طرح اس کا ہو جس طرح وہ خدا کا ہو گیا ہے، حقیقت الامر تو یہی ہے لیکن خداوند عالم اپنے کلام مقدس میں ہر محبت کو "محبت" قرار نہیں دیتا (درحقیقت محبت ایک ایسے گہرے تعلق کا نام ہے جو دو چیزوں کو ایک دوسرے سے ملا دیتا ہے اور ان کے درمیان ربط کا مضبوط رشتہ قائم کر دیتا ہے) اور محبت کی روح اس بات کی متقاضی ہے کہ عالم الوجود پر حکم فرما ہستی سے حقیقی لگاؤ پیدا ہو، یعنی اس کی محبت ہی اصل واساس قرار پائے، کیونکہ کسی چیز سے محبت اس سے تعلق رکھنے والی ہر شے سے محبت کا تقاضا کرتی ہے اور اس بات کو واجب ولازم قرار دیتی ہے کہ محبوب کی رضا وخوشنودی کو یقینی بنانے والے تمام امور کے سامنے سر تسلیم خم کر کے اس کا عملی ثبوت فراہم کیا جائے، بنابرایں جہاں تک خدا سے محبت کا تعلق ہے تو چونکہ وہ واحد ویکتا معبود ہے کہ ہر چیز اپنے تمام وجودی امور اور اپنی ہستی سے تعلق رکھنے والے مسائل میں اس کا سہارا لیتی ہے اور اس تک پہنچنے کا وسیلہ ڈھونڈتی ہے، اور کائنات کی ہر چھوٹی، بڑی چیز اسی کی طرف لوٹتی ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ اس سے محبت اور اخلاص کا ثبوت اس کی وحدانیت کے عقیدہ پر پختہ ایمان اور جس قدر

بھی انسانی ادراک وشعور کے بس میں ہو اس کے مطابق دین اسلام کی عملی پیروی کے ذریعے دیا جائے اور چونکہ اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے اور یہ وہی آئینِ زندگی ہے جس کی طرف خدا کے نمائندے لوگوں کو بلاتے ہیں اور اس کے انبیاء، پیغمبر اس کی تعلیمات واصولوں پر عقیدہ وعمل کی تاکیدی دعوت دیتے ہیں، اور اس خدائی دین میں اخلاص کا جو حوالہ پایا جاتا ہے وہ سب سے بلند ہے کہ اس سے بلندتر اخلاص کہیں موجود نہیں، وہی فطری دین ہے کہ جس پر تمام شریعتوں اور نبوتوں کا اختتام ہوا جیسا کہ آنحضرتؐ پر نبوت کے سلسلۂ الٰہیہ کی انتہاء ہوئی، یہ نقطہ کہ جسے ہم نے ذکر کیا ہے اس کی بابت کلام الٰہی میں تدبر و تفکر کرنے والا کوئی شخص بھی کسی طرح کا شک نہیں کرسکتا، اور شک کی گنجائش اس لئے نہیں پائی جاتی کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ نے اس راہ پر کہ جسے انہوں نے خود اپنایا (دینِ اسلام) اسے توحید کا راستہ اور اخلاص کا اصول قرار دیا اور اسی حوالہ سے اس کی پہچان کروائی کیونکہ خداوندعالم نے آپؐ کو اسی دین وآئین اور راہ وروشِ حیات کی تبلیغ اور اس کی پہچان کروانے کا حکم دیا، چنانچہ ارشادِ حق تعالیٰ ہوا:

سورۂ یوسف، آیت: ۱۰۸

○ " قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ "

(کہہ دیجئے کہ یہ میرا راستہ ہے، میں بصیرت وآگاہی کے ساتھ اللہ کی طرف بلاتا ہوں، میں اور وہ کہ جس نے میرا اتباع کیا، اور اللہ پاک ومنزہ ہے اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں)

اس آیت مبارکہ میں واضح طور پر بیان ہوا کہ آپ کا راستہ بصیرت کے ساتھ اللہ کی طرف بلانا اور اللہ سے اخلاص قائم رکھنا ہے کہ جس میں شرک کی کوئی صورت نہ پائی جاتی ہو، بنابریں یہ بات آسانی سے کہی جاسکتی ہے کہ آنحضرتؐ کا راستہ دعوت واخلاص سے عبارت ہے اور اس کی پیروی یعنی فکری وعملی طور پر اس راستہ کو اختیار کرنا اور آنحضرتؐ کے نقش قدم پر چلنا آپؐ کا اتباع کرنے والوں کی صفت وپہچان ہے،

اس کے بعد خداوندعالم نے بیان فرمایا کہ اس نے جو شریعت حضرت ختمی مرتبتؐ کے لئے مقرر کی وہ اس راستہ یعنی راہِ دعوت واخلاص کی کامل ترجمانی کرتی ہے، چنانچہ ارشادِ الٰہی ہوا:

سورۂ جاثیہ، آیت: ۱۸

○ " ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰي شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا "

(پھر ہم نے آپ کو دین کے راستہ پر قرار دیا، تو آپ اسی کا اتباع کرتے رہیں)

اور درج ذیل آیت میں اس راستہ کی پیروی کو خدا کے حضور سر تسلیم خم کرنے سے تعبیر کرتے ہوئے یوں ارشاد ہوا:

سورۂ آل عمران، آیت :۲۰

O " فَإِنْ حَآجُّوكَ فَقُلْ أَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلَّهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ "

(پس اگر وہ آپ سے جھگڑا کریں تو کہہ دیجئے کہ میں نے اپنا رخ اللہ کی طرف کیا ہے اور وہ بھی جس نے میری پیروی کی)

اس کے بعد اس راستہ کو اپنی طرف منسوب کر کے اس مطلب کو واضح کیا کہ وہ اس کا سیدھا راستہ ہے، چنانچہ ارشاد ہوا:

سورۂ انعام، آیت :۱۵۲

O " وَأَنَّ هَٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ "

(اور بے شک یہ میرا راستہ ہے جو سیدھا ہے، پس تم اس کا اتباع کرو)

مذکورہ بالا مطالب سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ اسلام جو کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ کے لئے مقرر کی گئی وہ شریعت وراہ عمل ہے جو کہ دین کے بنیادی اصولوں، اخلاقی اقدار، عملی دستورات اور آنحضرتؐ کی پاکیزہ سیرت اور طرز زندگی کا مجموعہ ہے وہی اللہ تعالیٰ کے نزدیک اخلاص کا رشتہ ہے کہ جو محبت پر مبنی اور محبت پر ہی قائم ہے، لہٰذا وہی اخلاص کا دین اور وہی محبت کا دین ہے۔

اب تک ذکر کئے گئے تمام مطالب سے زیر بحث آیہ مبارکہ کا معنی واضح وروشن ہو جاتا ہے یعنی " قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ " (کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میرا اتباع کرو) سے مراد واللہ اعلم یہ ہے کہ اگر تم چاہتے ہو کہ اللہ کی خالص بندگی کا حق ادا کرو جو کہ اس سے حقیقی محبت پر مبنی ہے تو اس شریعت اور راہ و روش کو اختیار کرو جس کی اصل واساس ہی محبت ہے کہ وہ محبت کہ جس کی عکاسی اخلاص اور اسلام سے ہوتی ہے اور وہ اللہ کا سیدھا راستہ ہے جو اپنے اوپر چلنے والے کو خدا تک لے جاتا ہے، لہٰذا اگر تم میری پیروی کرو اور میرے راستہ پر چلو جو کہ مذکورہ صفات کا حامل ہے تو اللہ تم سے محبت کرے گا، یہ بات محبت کرنے والے کے لئے سب سے بڑی خوشخبری ہے، اور جب ایسا ہو جائے تو تم جو چاہو گے وہ پاؤ گے، اور یہی وہ بلند پایہ مقصد ہے جو محبّ اپنی محبت سے پانا چاہتا ہے۔

تو یہ ہے آیت مبارکہ کے ظاہر سے سمجھا جانے والا مطلب! لیکن جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ یہ آیت ان آیات مبارکہ کے بعد آئی ہے جن میں کفار کو دوست قرار دینے سے منع کیا گیا ہے تو اس کا اپنی ماقبل آیات سے ربط و تعلق اس بات کا متقاضی ہے کہ اس حوالہ سے یہ کہا جائے کہ دوستی چونکہ حقیقی معنوں میں تب ہی ہوتی ہے جب کسی انسان اور جسے وہ

دوست رکھتا ہو کے درمیان محبت کا حقیقی رشتہ قائم ہو.... جیسا کہ اس موضوع کی بابت پہلے بیان ہو چکا ہے.....لہٰذا یہ آیہ مبارکہ لوگوں سے کہہ رہی ہے کہ اگر وہ اللہ سے اپنی دوستی کے دعوے میں سچے ہیں اور اپنے آپ کو اس کے گروہ میں شمار کرتے ہیں تو انہیں پیغمبر اسلامؐ کی پیروی کرنی چاہیے کیونکہ خدا سے دوستی کافروں کی خواہشوں کی پیروی کرنے کے ساتھ ممکن نہیں (دوستی، اتباع کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی، بلکہ دوستی کا محور ہی اتباع ہے) اور نہ ہی کافروں کے پاس جو دنیاوی عزت و اقبال اور مال و دولت ہے اس کے حصول کی چاہت اور عملی کوشش کے ساتھ، خدا سے دوستی کا رشتہ قائم ہو سکتا ہے بلکہ خدا کی دوستی اس کے دین میں اس کے نبی کی پیروی چاہتی ہے چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

سورۂ جاثیہ، آیت ۱۸، ۱۹:

O " ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۱۸ اِنَّهُمْ لَنْ يُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ۭ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝۱۹ "

(پھر ہم نے آپ کو دین کے راستہ پر قرار دیا تو آپ اسی پر چلتے رہیں اور جاہل و بے خبر لوگوں کی پیروی نہ کریں کہ وہ آپ کو ذرہ بھر بھی خدا سے بے نیاز نہیں کر سکتے، اور (یاد رکھیں) کہ ظالمین ایک دوسرے کے دوست ہیں جبکہ اللہ تقویٰ والوں کا دوست و حاکم ہے)

ان دو آیتوں میں غور کریں کہ پہلی آیت میں اتباع کا ذکر ہے اور دوسری آیت میں اتباع سے بالاتر دوستی و ولایت کا تذکرہ ہوا ہے، تو اس تناظر میں یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ جو شخص خدا سے محبت کی بناء پر اس سے ولایت اور اس کی حاکمیت پر ایمان کا دعویدار ہو اس پر لازم و واجب ہے کہ وہ رسول خداؐ کی پیروی کرے تاکہ رسولؐ کی پیروی خدا سے محبت پر مبنی حقیقی دوستی پر منتہی ہو۔

یہاں ایک قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ آیت مبارکہ میں اللہ سے ولایت کی بجائے اللہ سے محبت کا ذکر اس لئے ہوا ہے کہ وہ اصل و اساس ہے کہ جس پر ولایت قائم ہے، اور اس کے علاوہ یہ نکتہ بھی لائق توجہ ہے کہ خدا سے محبت کے ذکر پر اکتفاء کی گئی ہے نبیؐ اور مؤمنین سے محبت کو ذکر نہیں کیا گیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی کی ولایت و دوستی اور مؤمنین کی ولایت و دوستی حقیقت میں خدا کی ولایت و دوستی ہے اور ان سے دوستی کی بازگشت اللہ سے دوستی کی طرف ہوتی ہے لہٰذا خدا سے دوستی کے ذکر میں نبی و مؤمنین سے دوستی کا ذکر خود بخود ہو جاتا ہے۔

گناہوں کی بخشش کا وعدہ واعلان

○ " وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ "

(اور وہ تمہارے گناہوں کو معاف کردے گا اور اللہ معاف کرنے والا، نہایت مہربان ہے)

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ خدا کی وسیع رحمت اور اس کے روحانی و مادی فیوضات کا لامتناہی سلسلہ کسی شخص یا اس کے بندوں میں سے چند افراد اور خاص طبقہ سے تعلق رکھنے والوں سے مختص ومخصوص نہیں اور نہ ہی اس کی طرف سے مطلق فیض رسانی میں کوئی استثنائی صورت پائی جاتی ہے جس سے فیوضات کا دائرہ محدود ہوجائے اور نہ کوئی چیز اسے فیض رسانی سے رکنے پر مجبور کرسکتی ہے سوائے اس محرومی کے جو خود بندوں کے فیض پانے کی استعداد و لیاقت کے فقدان کی بناء پر ہو یا کسی ایسی رکاوٹ کے کہ جسے بندے خود اپنی اختیار کردہ غلط راہ وروش سے پیدا کرلیں، چنانچہ خداوندعالم نے اپنے فیوضات وعطائے نعمات کے بارے میں واضح الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے:

سورۂ اسریٰ، آیت :۲۰

○ " وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا "

(اور تیرے پروردگار کا عطیہ روکا نہیں جاسکتا)

تو اب دیکھنا یہ ہے کہ جو چیز عطیہ الٰہی کی راہ میں رکاوٹ بن سکتی ہے وہ کیا ہے؟ وہ گناہ ہیں جو خداوندعالم کے افاضۂ نعمات میں مانع ہوسکتے ہیں اور خداوند قدوس کے قرب وتقرب کی عظیم نعمت اور اس سے مربوط تمام امور مثلاً بہشت اور جو کچھ اس میں ہے سے محرومی کا سبب بن سکتے ہیں، جبکہ لوح دل سے گناہوں کی گندگی کو دور کرنا اور ان کی مغفرت وبخشش اور ان کی پردہ پوشی ہی وہ واحد ذریعہ ہے جسے سعادت وخوش بختی کا دروازہ کھلنے اور کاشانۂ عظمت وعزت میں داخل ہونے میں کلیدی حیثیت حاصل ہے، اسی وجہ سے خداوندعالم نے " يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ " کے فوراً بعد " وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ " فرمایا کیونکہ محبت...... جیسا کہ بیان ہوچکا ہے..... محبّ کو محبوب سے ملادیتی ہے، تو جس طرح بندے کی اپنے پروردگار سے محبت اس بات کی متقاضی ہے کہ بندہ اس سے کامل اخلاص کے ساتھ اس کا قرب اختیار کرے اور بندگی کا تعلق صرف اسی سے استوار رکھے بلکہ اس کے علاوہ کسی کو بندگی کا حقدار نہ سمجھے اسی طرح خدا کی اپنے بندے سے محبت بھی اس بات کی متقاضی ہے کہ خدا اپنے عبد سے قریب ہو اور دوری کے تمام پردے چاک کردے اور غیبت کے سیاہ بادل ہٹادے، کہ گناہ کے سوا کوئی چیز حجاب نہ بن سکے تو اس صورت میں خدا کا تقرب گناہوں کی بخشش کا پیش خیمہ ثابت ہوگا اور پھر گناہوں کی بخشش کے بعد والی بزرگی وعزت

اور فیوضاتِ الٰہیہ کی ارزانی کی بابت عطائے ربانی وسخائے سبحانی کی روانی وفراوانی ہی کافی ووافی ہوگی، جیسا کہ اس مطلب کا اجمالی تذکرہ سطور بالا میں ہو چکا ہے۔

اطاعت خدا و رسولؐ

○ " قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ۔۔۔"
(کہہ دیجئے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو۔۔۔)

اس سے ماقبل آیت مبارکہ میں رسولؐ اللہ کی پیروی کی دعوت دی گئی اور لوگوں سے کہا گیا کہ رسولؐ کا اتباع کرو، "اتباع" و پیروی کا اصل معنی نقش قدم پر چلنا یعنی نشانِ قدم دیکھ کر پیچھے پیچھے چلتے رہنا ہے جو کہ اسی صورت میں ممکن ہے جب وہ شخص کہ جس کے نقش قدم پر چلیں کسی راستہ پر چل رہا ہو اور وہ راستہ کہ جس پر رسول اللہؐ چلتے ہیں وہ صراط مستقیم ہے جو کہ راہِ خدا ہے، اور وہ شریعت وراہِ عمل ہے جو خدا نے اپنے نبیؐ کے لئے مقرر کی ہے کہ اس میں نبیؐ کی اطاعت وفرمانبرداری کو واجب ولازم قرار دیا ہے، تو اب اس آیت میں ایک بار پھر نبیؐ کے اتباع و پیروی اور نقش قدم پر چلنے کو اطاعت وفرماں برداری کے قالب میں ڈھال کر پیش کیا اور وہ اس لئے تا کہ اس امر کی طرف توجہ دلائی جائے کہ خدا سے خلوص واخلاص کا راستہ وہی ہے جو نبیؐ کا راستہ ہے جو کہ بعینہٖ اوامرونواہی اور دعوت وارشاد کے مجموعہ سے عبارت ہے لہٰذا رسولؐ کا اتباع اور ان کے راستہ پر چلتے ہوئے ان کے نقش قدم پر چلنا زندگی کی متعین راہ وروش میں اللہ اور رسول اللہؐ کی اطاعت کا نام ہے، یعنی جو شریعت اور قانونِ حیات خداوند عالم نے حضرت پیغمبر اسلامؐ کے لئے مقرر فرمایا ہے اس کے تمام احکام میں اللہ ورسولؐ کی عملی فرمانبرداری ہی رسول اللہؐ کا اتباع اور ان کے نقش قدم پر چلنا کہلاتا ہے، بنابرایں رسولؐ کے ساتھ خدا نے اپنا نام اس لئے ذکر کیا تا کہ اس حقیقت کی طرف التفات دلایا جائے کہ دونوں کی اطاعت دراصل ایک ہی اطاعت ہے، اور رسولؐ کا ذکر اپنے ساتھ اس لئے فرمایا کیونکہ گفتگو اطاعتِ رسولؐ کے بارے میں ہو رہی تھی۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

مذکورہ بالا مطالب سے اس غلط فہمی کا ازالہ بھی ہو جاتا ہے کہ آیت مبارکہ کے معنی کی بابت کہا گیا ہے کہ "اطیعوا

اللّٰہ" سے مراد یہ ہے کہ " اطیعوا اللّٰہ فی کتابہٖ " اللہ کی اطاعت قرآن میں کرو، اور " اطیعوا الرسول " سے مراد یہ ہے کہ " اطیعوا الرسول فی سنته " رسولؐ کی اطاعت ان کی سنت میں کرو،

یہ معنی ہرگز درست نہیں کیونکہ پہلی بات تو یہ ہے کہ آیت کے الفاظ جس مطلب کو ظاہر کرتے ہیں وہ یہ کہ جملہ "قل اطیعوا اللّٰہ و الرسول "دراصل جملہ " قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ "کی وضاحت کے مقام میں ہے گویا جو بات جملہ " قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ...... " میں مقصود تھی اسے اس جملہ " قُلْ اَطِيْعُوا...... " کے ذریعے واضح کر دیا ہے۔

دوسری بات یہ کہ آیت مبارکہ اس امر کی طرف توجہ دلاتی ہے کہ اللہ کی اطاعت اور رسولؐ کی اطاعت دراصل ایک ہی اطاعت ہے، اسی وجہ سے لفظ " اَطِيْعُوا " کو مکرر ذکر نہیں کیا گیا کیونکہ اگر اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کا مورد مختلف ہوتا تو اس طرح کہنا زیادہ موزوں تھا،" اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ " (اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو) جیسا کہ درج ذیل آیت مبارکہ میں مذکور ہے:

سورۂ نسآء، آیت :۵۹

○ " اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ "

(اطاعت کرو اللہ کی، اور اطاعت کرو رسول کی اور اولوا الامر کی،)

تو معلوم ہوا کہ یہاں مقامِ سخن اس بات کا متقاضی تھا کہ "اَطِيْعُوا " کو صرف ایک بار ذکر کیا جائے،

یہاں اس امر سے آگاہ رہنا ضروری ہے کہ زیر نظر آیۂ مبارکہ (قل اطیعوا اللّٰہ والرسول......) کے اطلاق اور انطباقی موارد کے حوالہ سے جو مطلب ذکر ہوا ہے وہ اسی کے مانند ہے جو ماقبل آیت مبارکہ (قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ......) میں ذکر ہو چکا ہے۔

روگردانی کرنے کا نتیجہ

○ " فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ "

(پس اگر تم روگردانی کرو تو اللہ کافروں کو دوست نہیں رکھتا)

اس آیت مبارکہ میں " اطیعوا اللّٰہ والرسول " کی حکم عدولی کرنے والے کے کفر کا ثبوت پایا جاتا ہے یعنی جو شخص خدا اور رسول کی اطاعت و فرمانبرداری سے انکار و سرتابی کرے وہ کافر ہے جیسا کہ کفار سے دوستی کی ممانعت کے حکم پر

مشتمل، دیگر آیات مبارکہ سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے، تو گویا اس میں اس مطلب کی طرف اشارہ بھی ہے کہ یہ آیت مبارکہ (فان تولوا......) ماقبل آیات کی وضاحت وتشریح کے طور پر ہے کیونکہ اس کا اختتام اطاعت کے حکم کا انکار کرنے والوں سے محبت کی نفی کے بیان پر ہو رہا ہے جبکہ پہلی آیت اتباع و پیروی کے حکم کی فرمانبرداری کرنے والے مؤمنین کے لئے محبت کے اثبات پر مشتمل تھی، (غور کریں)۔

مذکورہ بالا آیات مبارکہ کی تفسیر میں جو مطالب ذکر کئے گئے ہیں ان سے درج ذیل امور سے آگاہی حاصل ہوتی ہے:

(۱) تقیہ، فی الجملہ ایک جائز عمل ہے۔

(۲) کفار سے دوستی ومحبت کا رشتہ قائم کرنا اور اس سلسلہ میں خدائی ممانعت کی پرواہ نہ کرنا قابلِ مواخذہ گناہ ہے اور ایسا کرنے والا شخص خدائی گرفت سے بچ نہیں سکتا، اور یہ بات یقینی اور نا قابل تغیر ہے بلکہ خدا کے حتمی فیصلوں میں سے ہے۔

(۳) شریعت الٰہیہ دراصل اللہ سے اخلاص کی صورتگری کو یقینی بناتی ہے جبکہ اللہ سے اخلاص اس کی محبت کو ظاہر کرتا ہے، دوسرے لفظوں میں یہ کہ دین جو کہ معارف الٰہیہ، دستورات اخلاقیہ اور احکامات عملیہ کا مجموعہ ہے وہ اپنی تمام تر وسعتوں اور طول وتفصیل کے ساتھ خدا سے اخلاص کے علاوہ کسی مطلب پر منتہی نہیں ہوتا، یعنی اس کا محور اخلاص ہے کہ جس کا مطلب ومعنی یہ ہے کہ انسان اپنی ذات، اپنی صفات (اخلاق وعادات) اور اپنے ذاتی اعمال و افعال کو صرف اور صرف اللہ کے لئے قرار دے جو کہ واحد وقہار ہے، یکتا وغالب ہے، اور اس طرح کے اخلاص کا محور، محبت ہے، یہ تو ہے اخلاص کی تحلیل و تجزیہ کا حوالہ! اور جہاں تک اس کی ترکیب کا تعلق ہے تو وہ اس طرح سے ہے کہ محبت کا منتہا اخلاص ہے اور اخلاص کا منتہا پوری کی پوری شریعت ہے، یہ بعینہ اسی طرح ہے جیسے دین کو ایک حوالہ سے تجزیہ وتحلیل کی بناء پر تسلیم پر منتہی قرار دیا جاتا ہے اور تسلیم توحید پر منتہی ہوتی ہے۔

(۴) کافروں سے دوستی کرنا کفر ہے، اس کفر سے مراد فروع دین میں کفر کا مرتکب ہونا ہے نہ کہ اصول دین میں! جیسا کہ مانع زکوٰۃ (زکوٰۃ ادا نہ کرنے والا) اور تارک الصلوٰۃ (نماز کو ترک کرنے والا) کفر کا مرتکب ہوتا ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ کافروں سے دوستی کرنا اس لئے کفر قرار دیا گیا ہو کہ دوستی کرنے والا شخص بالآخر اصول دین میں کفر کا مرتکب ہو جاتا ہے، اس سلسلہ میں تفصیلی بیان سورۂ مائدہ کی تفسیر میں ہوگا انشاءاللہ تعالیٰ،

روایات پر ایک نظر

کفار کی سازش کا واقعہ

تفسیر "درمنثور" میں آیت مبارکہ "لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ......" کی تفسیر میں مذکور ہے کہ ابن اسحاق، ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: حجاج بن عمرو اور کعب بن اشرف کے حلیف، ابن ابی حقیق اور قیس بن زید نے مخفی طور پر مشترکہ فیصلہ کیا تھا کہ مدینہ کے چند مسلمانوں کو ان کے دین سے منحرف کر دیں، اس بات سے رفاعہ بن منذر، عبداللہ بن جبیر اور سعد بن خثیمہ بھی آگاہ تھے انہوں نے ان مسلمانوں کو خبردار کر دیا کہ ان لوگوں کے ساتھ ملنا جلنا چھوڑ دیں اور ان سے دور رہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں تمہارے دین سے منحرف کر دیں، لیکن ان مسلمانوں نے ان کی نصیحت پر کان نہ دھرے تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: "لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ......" تا "وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ"، (درمنثور جلد ۲ صفحہ ۱۶)

میرے خیال میں یہ روایت، ظاہر الآیۃ سے مطابقت نہیں رکھتی کیونکہ سابقاً بیان ہو چکا ہے کہ قرآن مجید میں "کافرین" کا لفظ اہل کتاب کے لئے استعمال نہیں ہوا لہٰذا مذکورہ واقعہ کے حوالہ سے یہ کہنا بہتر ہوگا کہ یہ ان آیات کے نزول کا سبب ہے جن میں یہود و نصاریٰ سے دوستی کرنے کی ممانعت کی گئی ہے نہ یہ کہ زیر نظر آیات (لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكٰفِرِيْنَ......) کا سبب ہے۔

تقیہ کے بارے میں واضح بیان

تفسیر صافی میں آیت مبارکہ "اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً......" کی تفسیر میں کتاب "الاحتجاج" کے حوالہ سے مذکور ہے کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا:

" وامرک ان تستعمل التقیة فی دینک فان الله یقول : وایاک ثم وایاک ان تتعرض الهلاک وان تترک التقیة التی امرتک فانک شائط بدمک ودماء اخوانک ، معرض لزوال

نعمک ونعمهم، مزلهم فی ایدی اعداء دین الله وقد امرک الله باعزازهم "،

(خداوندعالم نے تجھے حکم دیا ہے کہ اپنے دین میں تقیہ کرو، کیونکہ خدا بار بار کہتا ہے: خبردار، خبردار، کہیں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالنا، اور کہیں ایسا نہ ہو کہ تقیہ کو ترک کردو کہ جس کا میں نے تجھے حکم دیا ہے کیونکہ تقیہ کو ترک کرنے سے تو اپنا اور اپنے بھائیوں کا خون بہادے گا اور اپنی اور ان کی نعمتوں کے برباد ہونے کا خطرہ مول لے گا اور انہیں دشمنان دین الٰہی کے ہاتھوں ذلیل وخوار کردے گا جبکہ خدا نے تجھے ان کی عزت وتکریم کا حکم دیا ہے)

(تفسیر صافی جلد ۱ صفحہ ۲۵۳)

دین اور تقیہ کا ربط

تفسیر العیاشی میں مذکورہ ہے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ ارشاد فرماتے تھے: " **لا دین لمن لا تقیة لهٗ** " جو شخص تقیہ اختیار نہ کرے وہ دیندار نہیں۔ کیونکہ خداوندعالم کا ارشاد ہے:" **الا ان تتقوا منهم تقاة** "، (تفسیر العیاشی جلد ۱ صفحہ ۱۲۶ حدیث ۲۴)

تقیہ کے موارد کی وسعت

کتاب "کافی" میں امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا:

" **التقیة فی کل شیئ یضطر الیه ابن آدم و قد احل الله لهٗ** "،

(ہر اس چیز میں تقیہ روا ہے جس کی بابت فرزندِ آدم مضطر ومجبور ہو جائے کہ اس صورت میں خدا نے اس کے لیے تقیہ جائز قرار دیا ہے) (ملاحظہ ہو: کافی جلد ۲ صفحہ ۲۲۰ حدیث ۱۸)

تقیہ کے جواز پر آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی طرف سے کثرت کے ساتھ روایات منقول ہیں بلکہ وہ تواتر کی حد تک پہنچی ہوئی ہیں چنانچہ آپ زیرنظر آیت مبارکہ سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ اس میں تقیہ کے جواز پر نا قابل انکار ثبوت پایا جاتا ہے۔

محبت اور دین

کتاب "معانی الاخبار" میں سعید بن یسار سے روایت مذکور ہے انہوں نے کہا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے

ارشادفرمایا: "هل الدين الا الحب"، کیا دین محبت کے سوا کسی چیز کا نام ہے؟ (امامؑ نے اپنے ارشادگرامی پر استدلال کرتے ہوئے فرمایا) خداوند عالم نے ارشادفرمایا ہے " قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ " کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میرا اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔

اسی روایت کو کتاب کافی میں امام محمد باقر علیہ السلام کے حوالہ سے ذکر کیا گیا ہے۔(ملاحظہ ہو: کتاب روضۂ کافی صفحہ ۶۷ حدیث ۳۵) اسی طرح تفسیر القمی (جلد ا صفحہ ۱۰۰) اور تفسیر العیاشی (جلد ا صفحہ ۱۶۷ حدیث ۲۵) میں حذاء کے اسناد سے امام محمد باقر علیہ السلام کا مذکورہ فرمان ذکر کیا گیا ہے اور ربعی کے حوالہ سے امام صادق علیہ السلام سے یہی الفاظ منقول ہیں، بہرحال یہ روایت ان مطالب کی تائید کرتی ہے جو پہلے بیان ہو چکے ہیں۔

امام صادقؑ کا ایک شعر سے استناد

کتاب معانی الاخبار میں ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشادفرمایا: **ما احب الله من عصاه**، جو شخص خدا کی نافرمانی کرے خدا اسے دوست نہیں رکھتا، پھر امامؑ نے اس شعر کی مثال پیش کی:

تعصی الاله و انت تظهر حبهٗ هٰذا لعمری فی الفعال بدیع
لو کان حبک صادقاً لاطعته ان المحب لمن یحب مطیع

(تو خدا کی نافرمانی کرتا ہے اور اس سے محبت کا اظہار بھی کرتا ہے! مجھے اپنی زندگی کی قسم، یہ تو انوکھا عمل ہے، اگر خدا سے تیری دوستی و محبت سچی ہوتی تو تو اس کی فرمانبرداری و اطاعت کرتا کیونکہ دوست تو وہ ہوتا ہے جو اپنے محبوب کا فرمانبردار ہو)۔

یاد رہے کہ تفسیر برہان جلد ا صفحہ ۲۷۶ حدیث ۶ میں بھی امام جعفر صادقؑ کا یہی ارشاد مذکور ہے۔

محبتِ خدا کی شان

کتاب کافی میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے ایک حدیث میں ارشادفرمایا:

" من سرهٗ ان یعلم ان الله یحبهٗ فلیعمل بطاعة الله و لیتبعنا "

جو شخص چاہے کہ یہ جانے کہ خدا اس سے محبت کرتا ہے تو وہ اللہ کی اطاعت اور ہماری پیروی کا عملی ثبوت دے،

(اس کے بعد امامؑ نے استدلال کے طور پر یوں ارشاد فرمایا) "الم یسمع قول اللہ عزو جل لنبیه :" قل ان کنتم تحبون اللّٰہ فاتبعونی یحببکم اللہ و یغفرلکم ذنوبکم " کیااس نے یہ نہیں سنا کہ خداوند عالم نے اپنے نبی سے فرمایا: کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہوتو میرا اتباع کرو خدا تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کردے گا۔ (کافی جلد ۸ صفحہ ۱۴ حدیث ۱)۔

انشاءاللہ سورۂ نسآء آیت ۵۹ "یٰاَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوااللّٰہَ وَاَطِیْعُواالرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ " کی تفسیر میں وضاحت کے ساتھ بیان کیا جائے گا کہ آئمہ اہل بیتؑ کا اتباع و پیروی دراصل حضرت پیغمبر اسلامؐ کی اتباع و پیروی ہے۔

سنت نبویؐ سے روگردانی کا انجام

تفسیر "درمنثور" میں ہے کہ عبد بن حمید نے حسن سے روایت کی ہے کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ارشاد فرمایا: " من رغب عن سنتی فلیس منی " جو شخص میری سنت سے منہ موڑے اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں، (اس کے بعد آنحضرتؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: " قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ......" (کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو......) (تفسیر درمنثور ج ۲ ص ۱۷)

محبت کا حقیقی معیار

تفسیر "درمنثور" ہی میں ہے کہ ابن ابی حاتم اور ابو نعیم نے کتاب حلیہ میں اور حاکم نے عائشہ سے روایت کی ہے کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ارشاد فرمایا:

" الشرک اخفٰی من دبیب الذر علی الصفا فی اللیلة المظلمة و ادناه ان یحب علی شیئ من الجور و یبغض علی شیء من العدل، وهل الدین الا الحب و البغض فی اللّٰہ ؟ قال اللّٰہ تعالٰی: " قل ان کنتم تحبون اللّٰہ فاتبعونی یحببکم اللّٰہ ".

(شرک شب تاریک میں صاف و شفاف پتھر پر ذرے کی معمولی سی حرکت سے بھی زیادہ پوشیدہ ہے اور اس کا کمترین درجہ یہ ہے کہ ذرہ بھر ظلم کو پسند کیا جائے اور ذرہ بھر عدل سے نفرت کی جائے، اور دین، اللہ کے حوالہ سے محبت و نفرت

کے سوا کسی چیز کا نام ہے؟ خدا نے ارشاد فرمایا ہے : اے رسول! کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا)، (تفسیر در منثور جلد ۲ صفحہ ۱۷)۔

آنحضرتؐ کا انتباہی فرمان

کتاب " تفسیر درمنثور " میں مذکور ہے کہ احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، ابن حبان اور حاکم نے ابورافع کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ حضرت رسولِ خداؐ نے ارشاد فرمایا:

" لا القین احدکم متکئاً علیٰ اریکة یا تیه الامر من امری مما امرت به او نهیت عنه فیقول: لاندری، ما وجدنا فی کتاب اللّٰه اتبعناه "

کہیں ایسا نہ ہو کہ میں تم میں سے کسی کو مسند اقتدار پر براجمان دیکھوں کہ جب اس کے پاس میرا کوئی حکم یا نہی پہنچے تو وہ کہے کہ ہم اسے نہیں جانتے اور ہم تو صرف اسی چیز کی پیروی کریں گے جو کہ کتاب خدا میں ہے۔

(ملاحظہ ہو: تفسیر درمنثور جلد ۲ صفحہ ۱۷)

آیات ۳۳ ، ۳۴

○ اِنَّ اللّٰہَ اصۡطَفٰۤی اٰدَمَ وَ نُوۡحًا وَّ اٰلَ اِبۡرٰہِیۡمَ وَ اٰلَ عِمۡرٰنَ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۳۳﴾

○ ذُرِّیَّۃًۢ بَعۡضُہَا مِنۡۢ بَعۡضٍ ؕ وَ اللّٰہُ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۳۴﴾

ترجمہ

O ”خدانے آدم، نوح، آل ابراہیم اور آل عمران کو پوری کائنات پر منتخب کرلیا“ (۳۳)

O ”یہ سب ایک ہی نسل ہے جو ایک دوسرے سے وابستہ سلسلہ ہے،
اور اللہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے“ (۳۴)

تفسیر و بیان

ان آیات سے حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام سے تعلق رکھنے والے حالات وواقعات اوران سے مربوط ومرتبط امور کے تذکرہ کا آغاز ہوتا ہے اوران قصص وواقعات میں جو بات صحیح اور حق ہے اسے بھی ذکر کردیا گیا ہے، اس کے ساتھ ساتھ ان آیات میں اہل کتاب پر اتمامِ حجت کرتے ہوئے ان کے مؤقف کی بابت اظہارِ رائے کیا گیا ہے..... تاکہ صحیح وغلط اور حق وباطل کے درمیان تمیز ممکن ہوسکے....، ان دوآیتوں کے ذریعے ان سے ماقبل اور مابعد کی ان آیات کے درمیان ربط وتعلق کو بھی واضح کیا گیا ہے جن میں اہل کتاب کی بابت مطالب مذکور ہیں۔

انتخابِ خداوندی کا صریح اعلان

○ " اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ "
(بے شک اللہ نے منتخب کرلیا آدم کو، اور نوح کو، اور آل ابراہیم کو اور آل عمران کو پوری کائنات پر !......)

اس آیت میں لفظ "اِصْطَفٰى" ذکر ہوا ہے جس کی بابت سورۂ بقرہ کی آیت ۱۳۰ (لَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا...... ہم نے اسے دنیا میں چن لیا......) کی تفسیر میں ذکر کیا جاچکا ہے کہ اس کا لغوی معنی کسی چیز سے اس کا خالص نکالنا اور جو چیز اسے آلودہ کررہی ہو اسے اس سے دور کرنا ہے، یہ معنی "اختیار" یعنی چن لینے اور منتخب کرنے سے قریب تر ہے۔ اور یہ معنی ولایت ومحبت کے ان اعلیٰ ترین درجات پر منطبق ہوتا ہے جو اسلام کا اصل وحقیقی معنی ہے یعنی عبد کا اس مقام ومنزلت پر فائز ہونا کہ اپنے آپ کو اپنے پروردگار کی کامل فرمانبرداری کی اس حد تک لے جائے کہ ہر اس کام کو انجام دے جس میں اس کی رضا وخوشنودی کا حصول یقینی ہو، لیکن یہ معنی زیرِ نظر آیت مبارکہ پر منطبق نہیں ہوتا کیونکہ اس میں صرف "اصطفاء" ذکر نہیں ہوا بلکہ " اصطفاء علی العالمین " ذکر ہوا ہے یعنی عالمین پر! اگر یہاں بھی اس کا مذکورہ بالا لغوی معنی مراد ہوتا تو "عَلٰى

الْعٰلَمِیْنَ" کی بجائے "من العالمین" (عالمین میں سے) کے الفاظ ہوتے، اس صورت میں اسلام انہی افراد سے مختص ہو جاتا اور پھر پورے کلام کا معنی درہم برہم ہو جاتا، لہٰذا ارشاد ہوا: "عَلَى الْعٰلَمِیْنَ" جو کہ ایک طرح کا انتخاب و چن لینا اور انہیں ایک یا چند امور میں دوسروں پر مقدم قرار دینا ہے کہ جن میں ان کے علاوہ کوئی ان کا شریک نہیں۔ چنانچہ اس مسئلہ میں اسی سورۂ مبارکہ (آلِ عمران) کی درج ذیل آیت کو بطور دلیل پیش کیا جاسکتا ہے:

آیت: ۴۲

○ " وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ "

(اور جب فرشتوں نے کہا: اے مریم! اللہ نے تجھے چن لیا اور تجھے پاک بنایا اور تجھے منتخب کیا عالمین کی عورتوں پر)

اس آیت میں لفظ "اصطفیٰ" دوبار ذکر ہوا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کا معنی مستقل اور دوسرے سے مختلف وجدا ہے، اور "اصْطَفٰكِ" میں " اصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ " سے مختلف معنی پایا جاتا ہے۔ ...... کیونکہ اگر دونوں میں ایک ہی معنی مقصود ہوتا ہے تو دوبارہ "اصْطَفٰكِ" ذکر کرنے کی ضرورت نہ ہوتی......،

برگزیدگانِ الٰہی کا تذکرہ!

اس آیت مبارکہ میں جن برگزیدگان الٰہی کا تذکرہ ہوا ہے ان میں سب سے پہلے حضرت آدم اور حضرت نوح کے اسماء گرامی ذکر ہوئے ہیں، اس سلسلہ میں توضیحی بیان یہ ہے کہ جہاں تک حضرت آدم علیہ السلام کے برگزیدہ قرار دیئے جانے کا تعلق ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ نوع انسانی میں سے سب سے پہلی شخصیت ہیں جنہیں خداوند عالم نے روئے زمین پر خلیفہ مقرر فرمایا۔ چنانچہ اس حوالہ سے ارشاد رب العزت ہوا:

سورۂ بقرہ، آیت: ۳۰

○ " وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ......"

(اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا: میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں......)

تو سب سے پہلے خلیفہ ہونے کا اعزاز حضرت آدم علیہ السلام کو حاصل ہوا جس کا تذکرہ اس آیت میں صریح الفاظ

میں ہوا ہے،

اور حضرت آدم علیہ السلام ہی وہ پہلے فرد ہیں جن کے ذریعے خداوند عالم نے توبہ کا دروازہ کھولا، چنانچہ ارشاد ہوا:

سورۂ طٰہٰ، آیت :۱۲۲

○ " ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى "

(پھر اسے اس کے رب نے چن لیا، پھر اس کی توبہ قبول کی اور اسے رہنمائی کی)

اور وہ پہلی ہستی ہیں جن کے لئے دین و شریعت کی تدوین ہوئی، چنانچہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

سورۂ طٰہٰ، آیت :۱۲۳

○ " فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى "

(پس جب تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت آئے تو جو شخص میری ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ گمراہ ہوگا اور نہ شقی ہوگا)

تو یہ وہ امور ہیں جن میں کوئی دوسرا شخص حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ شریک نہیں، اور یہ آنجناب ہی کی مخصوص صفات ہیں، تو یہ کس قدر عظیم فضیلتیں ہیں جو حضرت آدم علیہ السلام کو عطا ہوئی ہیں!

اور جہاں تک حضرت نوح علیہ السلام کا تعلق ہے تو آپؑ ان پانچ اولوالعزم پیغمبروں میں سے سب سے پہلی شخصیت ہیں جنہیں کتاب اور شریعت عطا کی گئی، کہ اس سلسلہ میں درج ذیل آیت مبارکہ میں تفصیلی تذکرہ ہو چکا ہے:

سورۂ بقرہ، آیت :۲۱۳

○ " كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۣ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ...... "

(لوگ ایک امت تھے، پھر خدا نے نبیوں کو بھیجا......)

گویا حضرت نوحؑ بنی نوع انسان کے دوسرے باپ کی حیثیت رکھتے ہیں، کیونکہ جب کشتیٔ نوحؑ طوفان کی زد میں آئی تو سوائے ان کے اور ان کے افرادِ خاندان کے، کوئی شخص باقی نہ بچا،

اور حضرت نوحؑ وہ جلیل القدر ہستی ہیں جن پر خداوند عالم نے سلام بھیجا، چنانچہ ارشاد ہوا:

سورۂ صافات، آیت :۷۹

○ " وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ ۝ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۝ سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِي الْعٰلَمِيْنَ "

(اور ہم اس کی اولاد کو ہی روئے زمین میں باقی رہنے والے قرار دیا، اور ہم نے اس کی یاد بعد میں آنے والوں میں

محفوظ کردی، سلام ہو نوح پر عالمین میں!)

حضرت آدمؑ اور حضرت نوحؑ کے بعد خداوند عالم نے برگزیدگان میں آل ابراہیم اور آل عمران کا تذکرہ کیا،

لفظ "آل" کا معنیٰ "خاصة الشیئ" کسی چیز کا خاص، نچوڑ، مختص امر ہے، مشہور لغت دان راغب اصفہانی نے المفردات میں لکھا ہے کہ "آل" کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ "اھـــل" سے تبدیل شدہ ہے کیونکہ اس کا اسم تصغیر "اُھیل" آتا ہے، البتہ ان دونوں میں یہ فرق ہے کہ لفظ "آل" کی اضافت ہمیشہ باشعور اہل نطق شخصیات کی طرف ہوتی ہے اور کسی صورت میں اسم نکرہ یا زمان و مکان کی طرف اس کی اضافت نہیں ہوتی، چنانچہ کہا جاتا ہے: آلِ فلاں (فلاں شخص کی آل)، لیکن یوں ہرگز نہیں کہا جاتا" آل رجل " (مرد کی آل) " آل زمـان کـذا " (فلاں وقت کی آل)،" آل مـوضـع کـذا " (فلاں جگہ کی آل) اور یہ بھی نہیں کہا جاتا، " آل خیـاط " (درزی کی آل) بلکہ اس کی اضافت با عظمت و با فضیلت فرد کی طرف ہوتی ہے مثلاً یوں کہا جاتا ہے،" آل اللّٰہ " (اللہ کی آل)،" آل السلطان " (بادشاہ کی آل)، لیکن جہاں تک لفظ" اھـل " کا تعلق ہے تو اس کی اضافت سب کی طرف ہوتی ہے چنانچہ کہا جاتا ہے،" اھـل اللّٰہ " (اللہ کے اہل......اللہ والے......)، " اھل الخیاط " (درزی کے اہل)،" اھل زمن کذا " (فلاں زمانہ والے)،" اھل بلد کذا " (فلاں ملک والے)، بعض حضرات کا کہنا ہے کہ لفظ " آل " دراصل اسم الشخص ہے، اس کا اسم تصغیر "اویـــل" آتا ہے اور اسے ان چیزوں میں استعمال کیا جاتا ہے جو انسان کی ذات سے مختص ہوں خواہ نزدیک ترین قرابتداری کی وجہ سے ہوں یا موالات اور صمیمی دوستی کے سبب ہوں۔

بنا برایں" آل ابـراھیم " اور" آل عـمـران " سے ان دو ہستیوں کے خاندان سے خاص و مخصوص افراد اور ان سے ملحق و مربوط نزدیک ترین افراد مراد ہیں..... جیسا کہ اس سلسلہ میں پہلے مذکورہ مطالب سے آپ مطلع ہو چکے ہیں......،

تو جہاں تک" آل ابراھیم " کا تعلق ہے تو اس لفظ ہی سے ظاہر ہے کہ اس سے مراد آنجنابؑ کی نسل سے پاک افراد مراد ہیں مثلاً حضرت اسحاقؑ و حضرت اسرائیلؑ، اور بنی اسرائیلؑ میں مبعوث کئے جانے والے انبیاء، حضرت اسماعیلؑ اور ان کی نسل سے پاک ہستیاں، کہ جن کے سردار اور افضل ترین شخصیت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، اور وہ مقدس ہستیاں جو ان شخصیات کے ساتھ مقامات ولایت میں ملحق ہیں، البتہ آیت مبارکہ میں آل ابراہیم کے ساتھ صرف آلِ عمران کو ذکر کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مذکورہ بالا افرادی وسعت مقصود نہیں کیونکہ لفظ عمران جو کہ اس آیت میں ذکر ہوا ہے اس سے مراد یا حضرت مریمؑ کے والد گرامی ہیں یا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پدر بزرگوار ہیں، دونوں صورتوں میں ان کا تعلق نسل ابراہیمؑ سے ہے اور وہ "آل ابراہیمؑ" کے دائرہ میں آتے ہیں، اور آل ابراہیمؑ کے بعد آل عمران کا ذکر کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس سے تمام افرادِ نسل مراد نہیں بلکہ ان کی ذریت میں سے طاہرین مقصود ہیں (یعنی وہ ہستیاں جو خدا کی

برگزیدہ ہیں)، چنانچہ خداوند عالم نے اس سلسلہ میں اس طرح ارشاد فرمایا:

سورۂ نسآء، آیت: ۵۴

○ " اَمْ یَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰی مَآ اٰتٰھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ ۚ فَقَدْ اٰتَیْنَآ اٰلَ اِبْرٰھِیْمَ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَاٰتَیْنٰھُمْ مُّلْکًا عَظِیْمًا "

(یا وہ لوگوں سے حسد کرتے ہیں بوجہ اس کے کہ خدا نے ان لوگوں کو اپنے فضل وکرم میں سے عطا فرمایا ہے، اور ہم نے آل ابراہیمؑ کو کتاب وحکمت دی اور انہیں عظیم ملک واقتدار عطا کیا ہے)،

یہ آیت مبارکہ بنی اسرائیل پر اعتراض کے طور پر ہے جیسا کہ اس کے سیاق اور اس سے ماقبل اور مابعد آیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں آل ابراہیم سے مراد بنی اسرائیل نہیں یعنی حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ اور حضرت یعقوبؑ کی ذریت واولاد مراد نہیں کیونکہ اولادِ یعقوب بھی بنی اسرائیل ہیں، لہٰذا آل ابراہیمؑ میں صرف حضرت اسماعیلؑ کی نسل سے طاہر ومطہر نسل ہی باقی رہ جاتی ہے کہ جو حضرت پیغمبر اسلامؐ اور ان کی آل ہے،

اس کے ساتھ ساتھ ہم عنقریب اس امر کی وضاحت کریں گے کہ سورۂ نسآء کی مذکورہ بالا آیت میں لفظ "النَّاس" سے مراد حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی قدر ہے کہ جو آیت مبارکہ کی واضح دلالت کی بناء پر آل ابراہیم میں شامل ہیں۔

اس کے علاوہ درج ذیل آیات مبارکہ کے ذیلی جملوں سے بھی ہمارے مذکورہ بالا مطلوب کا ثبوت ملتا ہے، ملاحظہ ہو:

سورۂ آل عمران، آیت: ۶۸

○ " اِنَّ اَوْلَی النَّاسِ بِاِبْرٰھِیْمَ لَلَّذِیْنَ اتَّبَعُوْہُ وَھٰذَا النَّبِیُّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا...... "

(بے شک ابراہیم سے قرب کے سب سے زیادہ حقدار وہ ہیں جنہوں نے اس کی پیروی کی اور یہ نبی اور وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں......)

سورۂ بقرہ، آیت: ۱۲۹

○ " وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۱۲۷﴾ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَکَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّۃً مُّسْلِمَۃً لَّکَ ۪ وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا...... رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِکَ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَیُزَکِّیْھِمْ...... "

(اور جب گھر کی دیواریں کھڑی کر رہے تھے ابراہیم اور اسماعیل (تو انہوں نے کہا) اے ہمارے پروردگار! تو ہم

سے قبول فرما، کہ بے شک تو خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہےO اے ہمارے پروردگار! اور تو ہمیں اپنا مسلمان .....فرماں بردار وسر تسلیم خم کرنے والا..... بنا، اور ہمیں ہمارے اعمال کا مشاہدہ کروا......اے ہمارے رب! اور تو انہی میں سے ان میں ایک پیغمبر مبعوث فرما جو ان میں تیری آیات کی تلاوت کرتا ہو اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہو اور ان کا تذکیۂ نفس کرتا ہو......)

تو معلوم ہوا کہ آل ابراہیمؑ سے ان کی ذریت ونسل سے وہ پاک ہستیاں مراد ہیں جو حضرت اسماعیلؑ کی اولاد سے ہیں۔

یہاں یہ نکتہ قابل ذکر ولائق توجہ ہے کہ آیت مبارکہ چونکہ برگزیدگان الٰہی کے حصر کے مقام میں نہیں (یعنی اس مطلب کے بیان پر مشتمل نہیں کہ صرف یہی افراد برگزیدگانِ خدا ہیں) لہٰذا اس سے خود حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ اور نسلِ ابراہیمؑ سے طاہر ومطہر انبیاء علیہم السلام کے برگزیدہ ہونے سے کسی طرح کا تعارض وتضاد یا نفی کا پہلو ظاہر نہیں ہوتا،

زیر نظر آیات مبارکہ میں حضرت آدمؑ، حضرت نوحؑ اور آل ابراہیمؑ و 'ال عمرانؑ کے برگزیدہ ہونے کا تذکرہ ہوا ہے اس میں دوسروں کے برگزیدہ ہونے کی نفی کا کوئی پہلو یا اشارہ نہیں پایا جاتا لہٰذا اس میں اور ان آیات میں کوئی تعارض و تنافی نہیں پائی جاتی جن میں ان کے فضائل ومناقب اور عظمت شان و بزرگیٔ مقام ومنزلت مذکور ہے اور ان میں ان ہستیوں کے برگزیدہ ہونے کا واضح اشاراتی ثبوت پایا جاتا ہے، اس طرح کی آیات مبارکہ بہت زیادہ ہیں اور ان کے تفصیلی ذکر کی یہاں ضرورت نہیں۔ کیونکہ یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے کہ کسی چیز کا اثبات اس کے علاوہ کسی کی نفی کی دلیل نہیں بن سکتا، اس بناء پر زیر نظر آیت مبارکہ سے جن ہستیوں کے برگزیدۂ الٰہی ہونے کا ثبوت ملتا ہے اس سے ان کے علاوہ دوسروں کے برگزیدۂ خدا ہونے کی نفی ظاہر نہیں ہوتی، اور نہ ہی اس آیت سے کسی طرح کا تعارض یا کسی کے برگزیدہ ہونے کی نفی ثابت ہوتی ہے کہ جس میں خداوند عالم نے بنی اسرائیل کی تعریف کی اور ان کے بارے میں یوں ارشاد فرمایا:

سورۂ جاثیہ، آیت :۱۶

O " وَلَقَدْ اٰتَيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ "

(اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب، حکومت واقتدار اور نبوت عطا کی اور انہیں پاکیزہ چیزوں میں سے رزق عطا کیا ورانہیں عالمین پر برتری دی)

بہر حال یہ تمام مطالب واضح وروشن ہیں اور ان سے ہمارے مطلوب کا بخوبی ادراک حاصل ہوتا ہے۔

بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ بنی اسرائیل کو عالمین پر برتری دینا ان کے علاوہ کسی کو عالمین پر برتری دینے سے ہرگز

منافات نہیں رکھتا، یعنی ایسا نہیں کہ بنی اسرائیل کو برتری دیا جانا کسی دوسرے کو برتری دیئے جانے سے مانع ہو، اور نہ ہی یہ کہ خود ان پر کسی کو برتری دینے سے مانع ہو کیونکہ کسی قوم یا چند قوموں کا دوسروں پر برتری سے نوازا جانا ان کے کسی دینی یا دنیوی فضیلت میں دوسروں پر مقدم ہونے کا مستوجب ہوتا ہے لہٰذا اگر ان کا دوسروں پر برتری پانا دوسروں کے برتری پانے سے منافی ہو یا زیر نظر آیت مبارکہ میں جن ہستیوں یعنی حضرت آدمؑ، حضرت نوحؑ اور آلِ ابراہیمؑ و آلِ عمرانؑ کا عالمین پر برتری پانا ان کے علاوہ دسروں کے عالمین پر برتری پانے کے منافی ہو تو آیت میں مذکور افراد کا بھی ایک دوسرے پر برتری پانا بھی نا قابل قبول اور نادرست قرار پائے گا، جبکہ یہ صحیح نہیں اور یہ واضح و روشن ہے کہ وہ حضرات آپس میں ایک دوسرے پر بھی بعض حوالوں سے برتری رکھتے ہیں۔ بنابرایں ان کا عالمین پر برتری کا حامل قرار دیا جانا ان کے آپس میں ایک دوسرے سے برتر ہونے کے منافی نہیں جیسا کہ درج ذیل آیتوں میں انبیاء الٰہی کا ایک دسرے پر برتری کا حامل ہونا اور اسی طرح ان کا عالمین پر برتری کا حامل قرار دیا جانا مذکور ہے:

سورۂ انعام، آیت :۸۶

O " وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ "

(اور ہم نے سب کو عالمین پر فضیلت و برتری عطا کی)

سورۂ اسرئی، آیت :۵۵

O " وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ "

(اور ہم نے بعض نبیوں کو بعض پر برتری وفضیلت دی ہے)

یہ تو ہے آلِ ابراہیم کے برگزیدہ الٰہی ہونے کا بیان، اور جہاں تک آل عمران کی بات ہے تو اس میں عمران سے بظاہر حضرت مریمؑ کے والد گرامی قدر مراد ہیں اور آلِ عمران سے ان کی ذریت ونسل مراد ہے، چنانچہ اس کا اشاراتی ثبوت یہ ہے کہ ان دو آیتوں (۳۳، ۳۴) کے بعد وہ آیات ذکر ہوئی ہیں جن میں " امرأة عمران "(عمران کی زوجہ) اور "مریم ابنة عمران " (عمران کی بیٹی مریم) کے بارے میں مطالب درج ہیں۔ اور حضرت مریمؑ کے والد گرامی قدر جناب عمران کا ذکر قرآن مجید میں ان کے نام کے ساتھ بارہا ہوا ہے جبکہ حضرت موسیٰؑ کے والد گرامی قدر جناب عمران کا تذکرہ ایک بار بھی قرآن مجید میں کہیں نہیں ہوا جس سے سمجھا جا سکے کہ اس میں اس سے مراد وہی ہیں، تو اس سے مزید واضح ہوتا ہے کہ زیر نظر آیت مبارکہ میں آل عمران سے مراد حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ یا وہ دونوں اور زوجۂ عمران مراد ہیں۔

اب رہی نصاریٰ کی یہ بات کہ حضرت مریمؑ کے والد گرامی قدر کا نام عمران نہیں، تو یہ ان کی رائے وعقیدہ ہے اور قرآن ان کی آراء وخواہشات کے تابع نہیں۔

ذریت ونسل کا تذکرہ

○ " ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ "
(وہ ایک دوسرے کی ذریت ونسل سے ہیں)

لفظ " ذریت" کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اصل میں اس سے مراد چھوٹی اولاد لی جاتی تھی پھر اسے چھوٹی اور بڑی تمام اولاد کے لئے استعمال کیا جانے لگا اور یہی معنی زیر نظر آیت مبارکہ میں مقصود ہے۔

لفظ " ذریۃً " اعراب کے لحاظ سے منصوب ہے کیونکہ یہاں عطف بیان ہے (جملے میں ال ابراہیم وال عمران کی وضاحت کے طور پر ذکر ہوا ہے)

آیت میں جملہ "بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ" اس امر کی دلیل ہے کہ "ذریت" میں سے جس کسی کا بھی تصور کریں یقیناً اس کی ابتداء یا انتہاء اسی میں سے کسی دوسرے بعض پر ہوتی ہے یعنی وہ سب ابتداء وانتہاء دونوں حوالوں سے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں، تو اس کا لازمی امر اور قطعی نتیجہ یہ ہے کہ وہ سب ایک ایسے مجموعہ کی طرح ہیں جو متشابہ الاجزاء ہے کہ جس میں سے بعض اجزاء دوسرے بعض سے اوصاف وحالات میں جدا نہیں، اور ہماری گفتگو چونکہ ان کے برگزیدۂ الٰہی ہونے کی بابت ہے لہٰذا اس سے یہ حقیقت سمجھی جاسکتی ہے کہ وہ سب ایک ذریت ونسل ہے جو ان فضیلتی صفات میں ہرگز ایک دوسرے سے متفرق نہیں جن کی بناء پر خداوند عالم نے انہیں عالمین پر برتری عطا فرمائی ہے کیونکہ خداوند عالم کے افعال ہر طرح کی عدم مقصدیت سے مبرا ہیں اور اس کے افعال میں سے ایک اصطفاء یعنی چننا، برگزیدہ کرنا ہے جو کہ کائنات ہستی میں ہر قسم کی خیر ونیکی کا سرچشمہ ہے اور ہر اچھائی اسی کے فیضانِ اثر کی عکاس ہے۔

خدا کا سننا اور جاننا

○ " وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ "
(اور اللہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے)

" سَمِيعٌ " یعنی خوب سننے والا سے مراد یہ ہے کہ وہ ان کے ان تمام اقوال کو سنتا ہے جو ان کے باطن اور ضمیر کی

ترجمانی کرتے ہیں۔

"عَلِیْمٌ" یعنی خوب جاننے والا سے مراد یہ ہے کہ وہ ان کے باطن وضمیر اور دلوں میں چھپی ہوئی ہر بات سے پوری آگاہی رکھتا ہے،

یہ جملہ "وَاللّٰہُ سَمِیۡعٌ عَلِیْمٌ" گویا ان کے برگزیدہ ہونے کی علت وسبب کے بیان پر مشتمل ہے یعنی اس امر کو واضح کرتا ہے کہ وہ خدا کی نگاہِ انتخاب کا مرکز کیوں قرار پائے؟ جیسا کہ جملہ "ذُرِّیَّۃً بَعۡضُہَا مِنۡ بَعۡضٍ" بھی ان کے برگزیدہ ہونے کی وجہ بیان کرتا ہے کہ خداوند عالم نے انہیں اس عظیم وجلیل القدر عطیہ سے کیوں نوازا ہے؟

خلاصۂ کلام یہ کہ خداوند عالم نے ان ہستیوں کو عالمین پر منتخب کیا اور یہ عظیم عنایتِ خداوندی اس لئے ان کے شامل حال ہوئی کہ وہ سب ایک ذریت ونسل ہے جس کے افراد فضیلتی صفات میں ایک دوسرے کے متشابہ ہیں اور وہ سب اپنے پروردگار کے حضور سر تسلیم خم کرنے اور دل کی گہرائی سے بارگاہ ربوبی میں اپنے آپ کو پورے طور پر اپنے مولا کے سپرد کر دینے کے ساتھ ساتھ حق پر ثابت قدم رہنے میں ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ اور خداوند عالم نے انہیں عالمین پر برگزیدہ کرنے کی نعمت سے اس لئے نوازا کہ وہ خوب سننے والا اور خوب جاننے والا ہے وہ ان کی ہر بات کو سنتا ہے اور جو کچھ ان کے دلوں میں ہے اس سے بخوبی آگاہ ہے۔

روایات پر ایک نظر

اہل بیتؑ کی فضیلت پر امام رضاؑ کا بیان

کتاب عیون اخبار الرضاؑ میں امام رضا علیہ السلام اور مامون رشید عباسی کے درمیان ہونے والے مکالمہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مامون سے امام رضا علیہ السلام سے پوچھا:

"ھل فضل اللّٰہ العترۃ علٰی سائر الناس" ؟

(کیا خدا نے عترت (اہل بیتِ نبیؐ) کو تمام لوگوں پر برتری عطا کی ہے؟)

امامؑ نے ارشاد فرمایا:

"ان اللّٰہ ابان فضل العترۃ علٰی سائر الناس فی محکم کتابہٖ"

(خداوند عالم نے اپنی مقدس کتاب میں عترت کی تمام افراد بشر پر برتری کو واضح طور پر بیان کیا ہے)۔

امامؑ کا جواب سن کر مامون نے پوچھا :

" این ذلک فی کتاب اللّٰہ ؟ "

(اللہ کی کتاب میں کہاں یہ بات لکھی ہوئی ہے؟)

تو امام رضا علیہ السلام نے اس سے ارشاد فرمایا:

" فی قولہٖ: ان اللّٰـہ اصطفٰی ادم و نوحاً و ال ابراھیم و ال عمران علی العالمین ذریۃ بعضھا من بعض "،

(اس آیت مبارکہ میں: خدا نے چن لیا آدم کو، نوح کو، آل ابراہیمؑ کو اور آل عمران کو تمام عالمین پر، وہ ایک نسل ہے جو ایک دوسرے سے ہے) (کتاب عیون اخبار الرضاؑ جلد ۱ صفحہ ۲۳۰ حدیث ۱ باب ۲۳)

خدا کا ارادہ و عمل

تفسیر العیاشی میں احمد بن محمد کے حوالہ سے امام رضا علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے امام ابو جعفر محمد باقر علیہ السلام کا ارشاد گرامی ذکر کیا کہ انہوں نے فرمایا:

" مـن زعم انہٗ فرغ من الامر فقد کذب لان المشیۃ للّٰہ فی خلقہٖ، یرید ما یشاء ویفعل ما یرید، قال اللّٰہ: ذریۃ بعضھا من بعض واللّٰہ سمیع علیم، آخرھا من اولھا و اولھا من آخرھا، فاذا اخبرتم بشیء منھا بعینہٖ انہٗ کائن وکان فی غیرہٖ منہ فقد وقع الخبر علٰی ما اخبرتم عنہ "

(جو شخص یہ گمان کرے کہ اب خدا مخلوق کے امور سے فارغ ہو گیا ہے..... اب اسے مخلوق کے امور سے کوئی سروکار نہیں..... وہ جھوٹا ہے، کیونکہ خدا کی مشیت اس کی مخلوق میں جاری و نافذ ہے، وہ جو چاہتا ہے اس کا ارادہ کرتا ہے اور جس کا ارادہ کر لیتا ہے اسے انجام دیتا ہے، اسی لئے خدا نے ارشاد فرمایا ہے کہ وہ ذریت و نسل اول سے آخر تک ایک دوسرے سے پیوستہ و وابستہ ہے، اگر تم خدا کی مشیت کے بارے میں کوئی بات سنو کہ اس نے فلاں چیز کا وعدہ کیا اور وہ وعدہ کسی دوسری چیز میں پورا ہوا تو دراصل تم نے جو کچھ سنا وہی اپنی عملی صورت پایا ہے (یعنی اگر اس نے عمران کو بیٹا عطا کرنے کا وعدہ کیا اور وہ وعدہ حضرت مریمؑ سے حضرت عیسٰیؑ کی ولادت کی صورت میں پورا ہوا تو اسے خدا کے وعدہ کی تکمیل سمجھیں، اس کی تکذیب نہ کریں)۔ (تفسیر العیاشی جلد ۱ صفحہ ۱۶۹ حدیث ۲۳)

اس روایت میں بھی اسی مطلب کا ثبوت ملتا ہے جو ہم نے جملہ "ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنۢ بَعْضٍ" کے معنی کی

وضاحت میں ذکر کیا ہے۔

ذریت کی حقیقت

تفسیر العیاشی میں امام محمد باقر علیہ السلام سے ایک روایت مذکور ہے کہ آپؑ نے آیت مبارکہ " اِنَّ اللّٰہَ اصۡطَفٰۤی اٰدَمَ وَ نُوۡحًا وَّ اٰلَ اِبۡرٰہِیۡمَ وَ اٰلَ عِمۡرٰنَ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۳۳﴾ ذُرِّیَّۃًۢ بَعۡضُہَا مِنۡۢ بَعۡضٍ " کی تلاوت کی اور ارشاد فرمایا:

" نحن منهم و نحن بقية تلك العترة "

(ہم اسی ذریت میں سے ہیں اور ہم ہی اس عترت کے افراد ہیں)

امامؑ کا ارشاد گرامی ہے : " **ونحن بقية تلك العترة** " اور ہم اس عترت کے باقی افراد ہیں۔ "**عترت**" سے یہاں اس کا اصل لغوی معنی مراد ہے اس کا اصل معنی کسی چیز کی بنیاد و اساس ہے کہ جس پر وہ چیز قائم ہوتی ہے۔ اسی معنی میں لفظ عترت کسی گزرے ہوئے شخص کی اولاد اور نزدیک ترین قرابتداروں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں لفظ "عترت" خاندان کے تمام افراد میں ایک محفوظ عمود کا نام ہے جس سے وہ سب ایک دوسرے سے وابستہ ہوتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام علیہ السلام نے آیت مبارکہ کے جملہ " ذُرِّیَّۃًۢ بَعۡضُہَا مِنۡۢ بَعۡضٍ " سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو اس سلسلہ کی کڑی قرار دیا جو آدمؑ سے نوحؑ اور نوحؑ سے آل ابراہیمؑ و آلِ عمرانؑ تک قائم و جاری ہے، اور اس سے یہ نکتہ بھی ظاہر و واضح ہوتا ہے کہ آدمؑ و نوحؑ کو آلِ ابراہیمؑ اور آلِ عمرانؑ کے ساتھ یکجا کیوں ذکر کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ اصطفاء اور خدا کی طرف سے منتخب ہونے میں ایک سلسلہ کے تمام افراد ایک دوسرے سے متصل و وابستہ اور پیوستہ ہیں۔

آیات ۳۵ تا ۴۱

○ اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۳۵﴾

○ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَاۤ اُنْثٰى ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ؕ وَلَیْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى ۚ وَاِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ وَاِنِّیْۤ اُعِیْذُهَا بِكَ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ﴿۳۶﴾

○ فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّكَفَّلَهَا زَكَرِیَّا ۚؕ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَیْهَا زَكَرِیَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ یٰمَرْیَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ؕ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ﴿۳۷﴾

○ هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِیَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّیَّةً طَیِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِیْعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۸﴾

○ فَنَادَتۡهُ الۡمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيۡ فِي الۡمِحۡرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحۡيٰى مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوۡرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيۡنَ ﴿۳۹﴾

○ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوۡنُ لِيۡ غُلٰمٌ وَّقَدۡ بَلَغَنِيَ الۡكِبَرُ وَامۡرَاَتِيۡ عَاقِرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفۡعَلُ مَا يَشَآءُ ﴿۴۰﴾

○ قَالَ رَبِّ اجۡعَلۡ لِّيۡۤ اٰيَةً ؕ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمۡزًا ؕ وَاذۡكُرۡ رَّبَّكَ كَثِيۡرًا وَّسَبِّحۡ بِالۡعَشِيِّ وَالۡاِبۡكَارِ ﴿۴۱﴾

ترجمہ

○ " جب عمران کی زوجہ نے کہا: پروردگارا ! میں اس بچہ کو جو میرے شکم میں ہے آزاد کر کے تیرے لئے نذر کرتی ہوں، تو میری طرف سے قبول فرما لے، کہ تو خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے"

(۳۵)

○ " پھر جب اس نے بچہ جنا تو کہنے لگی: پروردگارا ! میں نے تو لڑکی جنی ہے، اللہ بہتر جانتا ہے کہ اس نے کیا جنا ہے، اور لڑکا لڑکی کی طرح نہیں ہوتا، میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے اور میں اسے اور اس کی ذریت کو شیطان مردود سے تیری پناہ میں دیتی ہوں "

(۳۶)

○ " تو اس کے پروردگار نے اس کی نذر کو احسن طور پر قبول کر لیا اور اس کی نشو ونما کا بہترین بندوبست کیا اور اس کی کفالت زکریا نے کی، جب زکریا اس کے مقام عبادت میں جاتے تو اس کے پاس کھانے کی چیزیں دیکھتے اور پوچھتے کہ اے مریم ! یہ تیرے پاس کہاں سے آیا ہے ؟ تو وہ کہتیں کہ یہ اللہ کی طرف سے آیا ہے اور اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق عطا کرتا ہے "

(۳۷)

○ " اس وقت زکریا نے اپنے پروردگار سے دعا کی اور کہا: اے میرے رب ! مجھے بھی اپنی طرف سے پاکیزہ اولاد عطا فرما کہ تو دعاؤں کا خوب سننے والا ہے "

(۳۸)

○ " ابھی وہ اسی مقام عبادت میں نماز ادا کر رہے تھے کہ فرشتوں نے آواز دی کہ اللہ تعالیٰ تجھے یحییٰ کی خوشخبری دیتا ہے جو اللہ کے کلمہ کی تصدیق کرنے والا ہوگا اور سید و سردار، انتہائی ضبط نفس رکھنے والا اور صالحین میں سے نبی ہوگا "

(۳۹)

○ " زکریا نے کہا: میرے ہاں لڑکا کیونکر پیدا ہوگا میں تو بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری زوجہ بانجھ ہے، اللہ نے کہا: ایسا ہی ہے، اللہ جو چاہتا ہے انجام دیتا ہے "

(۴۰)

○ " زکریا نے کہا: پروردگارا ! میرے لئے کوئی نشانی قرار دے، خدا نے کہا: تیری نشانی یہ ہے کہ تم تین دن تک لوگوں سے صرف اشارے سے بات کرو اور اپنے رب کا ذکر کثرت کے ساتھ کرو، اور صبح و شام تسبیح کرتے رہو "

(۴۱)

تفسیر و بیان

زوجۂ عمران کی منّت

○ " اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۳۵﴾ "

(جب زوجۂ عمران نے کہا: پروردگارا! میں نے تیرے لئے نذر کردیا ہے اس کو جو میرے شکم میں ہے آزاد صورت میں! تو میری نذر قبول فرما کہ بے شک تو ہی خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے)

" نذر "(منّت) کا معنی یہ ہے کہ انسان اپنے اوپر کسی اس چیز یا کام کو واجب کرے جو اس پر واجب نہ ہو ،

" محرراً "، تحریر سے اسم مفعول کا صیغہ ہے، تحریر کا معنی کسی چیز کو بندھن سے آزاد کردینا ہے، اسی بناء پر غلام آزاد کرنے کو "تحریر" کہتے ہیں (تحریر رقبة)، اور لکھنے کو بھی "تحریر" کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے ذریعے معانی کو ذہن وفکر کے نہاں خانہ کی قید سے آزاد کیا جاتا ہے۔

"تقبل" کسی چیز کو رضا وخوشی کے ساتھ قبول کرنے کے معنی میں آتا ہے مثلاً ہدیہ قبول کرنا، دعا قبول کرنا اور اس طرح کے دیگر امور۔

اور آیت مبارکہ کے جملہ "قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِیْ بَطْنِیْ" سے ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے یہ بات اس وقت کہی جب وہ حاملہ تھیں اور یہ کہ ان کا حمل جناب عمران سے تھا، یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس دعائیہ نذر کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب انہوں نے یہ دعا کی تو اس وقت ان کے شوہر عمران زندہ نہ تھے ورنہ انہیں (زوجۂ عمران کو) یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ اپنے طور پر اپنے شکم میں موجود بچہ کو آزاد کریں، چنانچہ اس کا ثبوت آیت ۴۴ "وَمَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ یُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَیُّهُمْ یَكْفُلُ مَرْیَمَ......" میں بھی موجود ہے کہ اس کی تفصیل عنقریب ذکر کی جائے گی کہ جب وہ مریم کی کفالت کے بارے میں قرعہ اندازی کر رہے تھے تو اس وقت جناب عمران زندہ نہ تھے۔

آزاد کرنے کا مرادی معنی

آیت مبارکہ میں "محررا" کا لفظ ذکر ہوا ہے یعنی زوجۂ عمران نے اپنے شکم میں موجود بچہ کو آزاد کیا، تو اس آزاد کرنے سے مراد غلام آزاد کرنے والا معنی نہیں کیونکہ باپ یا ماں کا بچہ کو آزاد کرنا غلام آزاد کرنے کے باب سے نہیں ہوتا بلکہ اس حاکمیت یا سرپرستی کی قید سے آزاد کرنا ہوتا ہے جو والدین کو بچہ پر حاصل ہوتی ہے کہ اس کی تربیت کے تمام امور کا اہتمام کریں، اپنے مقاصد اور ضروری امور کی تکمیل میں اس سے استفادہ کریں کہ اس بناء پر والدین کی اطاعت وفرمانبرداری واجب قرار دی گئی ہے۔ تو اس سرپرستی وذمہ داری کی قید سے آزاد کرنے سے بچہ والدین کی بالادستی کے دائرہ سے باہر نکل جاتا ہے اور وہ اس سے کوئی کام نہیں لے سکتے، اب اگر آزاد کرنا خدا کے لئے نذر کی صورت میں ہو تو وہ بچہ خدا کی ولایت و ذمہ داری کے دائرہ میں داخل ہو جاتا ہے کہ پھر صرف خدا کی عبادت و بندگی انجام دے اور اس کی خدمت گزاری کا حق ادا کرے، خدا کی خدمت گزاری سے مراد یہ ہے کہ مساجد وعبادت گاہوں اور خدا کی عبادت سے مختص مراکز میں خدمت کرے اور یہ اس وقت تک ہو کہ اگر اس طرح آزاد نہ ہوتا تو والدین کی خدمت گزاری میں مشغول ہوتا۔ یعنی جتنی مدت والدین کی خدمت گزاری میں مشغول رہنا اس پر واجب ولازم تھا اتنی مدت تک خدا کی خدمت گزاری میں مشغول رہے۔

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ عربوں کے ہاں عام رسم تھی کہ وہ اپنے بچہ کو اللہ کے لئے آزاد کرتے تھے کہ پھر اس سے اپنے لئے کوئی کام نہیں لیتے تھے اور اپنے متعلقہ امور میں اس سے استفادہ نہیں کرتے تھے بلکہ اسے کلیسا میں لے جاتے تا کہ وہ صفائی وغیرہ کرے اور کلیسا کے کام انجام دے، وہ بچہ بالغ ہونے تک کلیسا میں خدمت گزاری میں مشغول رہتا اور جب بالغ ہو جاتا تو وہ خود فیصلہ کرتا کہ کلیسا کی خدمت گزاری کو جاری رکھے یا اسے چھوڑ دے، اگر وہ اس خدمت گزاری کو پسند کرتا تو وہیں قیام پذیر ہو جاتا اور کلیسا کے امور انجام دیتا رہتا، اور اگر وہاں سے باہر آنا پسند کرتا تو ایسا کرنے کا اختیار اسے حاصل ہوتا تھا۔

زوجۂ عمران کی دعا کے الفاظ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ یقینی طور پر یہ سمجھ رہی تھی کہ اس کے شکم میں جو بچہ ہے وہ لڑکا ہے لڑکی نہیں ہے کیونکہ وہ بارگاہ رب العزت میں پورے یقین واعتماد کے ساتھ دعا کر رہی تھیں اور ان کی دعا میں کوئی مشروط الفاظ بھی نہیں تھے کہ وہ کہہ رہی ہوں کہ اگر مجھے لڑکا عطا ہوا تو میں اسے آزاد کر کے اس کی نذر کرتی ہوں بلکہ وہ صریح لفظوں میں اس طرح کہہ رہی تھیں: " نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا " اس میں انہوں نے اس بچہ کے لڑکا ہونے کی کوئی شرط وغیرہ ذکر نہیں کی۔

ادب القرآن کا خوبصورت حوالہ

آیت مبارکہ میں لفظ "محررا" مذکر ہے جس سے یہ گمان پیدا ہوتا ہے کہ وہ جملہ "مَا فِي بَطْنِي" میں حرف "ما" سے حال ہے کیونکہ حرف "ما" مذکر اور مؤنث دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے اور آیت کا معنی اس طرح ہے: "میں تیرے لئے نذر کرتی ہوں اسے جو میرے شکم میں ہے"۔ اس میں مذکر و مؤنث یعنی لڑکا اور لڑکی کا خاص طور پر ذکر نہیں،

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ گمان درست نہیں کیونکہ اگر زوجہ عمران نے اس طرح مطلق اور عام نذر کی ہوتی اور شکم میں موجود بچہ کے بارے میں یہ نہ سوچا ہوتا کہ وہ لڑکا ہے بلکہ لڑکا اور لڑکی دونوں میں سے کسی ایک کا تعین نہ کیا ہوتا تو بچے کی ولادت کے بعد حزن و حسرت اور افسوس کے ساتھ ہرگز یہ نہ کہتیں: "رَبِّ إِنِّي وَضَعْتُهَا أُنْثَى" پروردگارا! میں نے لڑکی جنی ہے، اور یہ بھی نہ کہا جاتا: "وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ۖ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثَى" اور اللہ خوب آگاہ ہے کہ اس نے کیا جنا ہے اور لڑکا لڑکی جیسا نہیں۔ عنقریب اس سلسلہ میں مزید مطالب ذکر کئے جائیں گے۔

کلام الٰہی میں حضرت مریمؑ کی والدہ گرامی قدر کے دعائیہ اظہارات کا تذکرہ جن الفاظ میں ہوا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انہیں اپنے شکم میں لڑکا ہونے کا پختہ یقین تھا اور ان کا یقین ناپختہ بنیاد پر مبنی نہیں تھا اور نہ ہی ان ظاہری قرائن کی بناء پر تھا جو عام طور پر خواتین کو تجربات کے نتیجہ میں حاصل ہوتے ہیں کیونکہ وہ سب ظن و گمان سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے اور انہیں یقین سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ ظن و گمان سے نہ تو حق کا اثبات ہو سکتا ہے اور نہ ہی وہ حق و حقیقت سے بے نیاز کر سکتا ہے، ویسے بھی کلام الٰہی باطل و ناحق پر مشتمل نہیں اور اگر کسی مقام پر باطل و ناحق کا تذکرہ ہوا ہے تو اس کے ساتھ اس کے ابطال اور نادرست ہونے کو بھی ذکر کر دیا گیا ہے بلکہ جہاں بھی باطل کا نام لیا گیا ہے وہاں اس کا غلط ثابت کرنا مقصود ہے اور اسے غلط ثابت کر بھی دیا گیا ہے۔ جیسا کہ درج ذیل آیت مبارکہ میں حاملہ عورت کے شکم میں موجود بچہ کے بارے میں آگاہی کی بابت ارشاد حق تعالیٰ ہے:

سورۂ رعد، آیت: ۸

○ "اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ أُنْثَىٰ وَمَا تَغِيضُ الْأَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ ۖ"

(اللہ ہی ہر عورت کے حمل سے آگاہ ہے اور اس سے بھی آگاہ ہے کہ رحموں میں کیا کمی اور کیا زیادتی ہوتی رہتی ہے)

ایک اور مقام پر یوں ارشاد ہوا:

سورۂ لقمان، آیت : ۳۴

○ " عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ "

(اس کے پاس ہی ہے قیامت کا علم، اور وہ بارش نازل کرتا ہے اور جو کچھ رحموں میں ہے اسے جانتا ہے)

تو خداوند عالم نے جو کچھ رحموں میں ہے اس سے آگاہی کو غیب کی وہ حقیقت قرار دیا ہے جو اسی سے مختص ہے۔

علم غیب کے بارے میں ارشاد ہوا:

سورۂ جن، آیت : ۲۷

○ " عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ۙ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى "

(وہ عالم الغیب ہے، وہ کسی کو اپنے غیب تک رسائی نہیں دیتا سوائے اس کے کہ جسے وہ پسند کر لے)

اس آیت میں خداوند عالم نے غیر اللہ کی علم غیب تک رسائی کو اپنی وحی سے وابستہ قرار دیا ہے۔

ان تمام مطالب سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند عالم کا زوجۂ عمران کے ان مطالب کے اظہارات کو یقین پر مبنی ہونے کی صورت میں ذکر کرنا جن کا علم خدا سے مخصوص ومختص ہے اس امر کا ثبوت ہے کہ والدۂ مریمؑ کا اپنے شکم میں لڑکا ہونے سے آگاہ ہونا کسی حوالہ وبنیاد پر وحی سے وابستہ تھا، یہی وجہ ہے کہ جب انہیں معلوم ہوگیا کہ وہ بچہ لڑکا نہیں بلکہ لڑکی ہے تو وہ اپنے ہاں لڑکے کی ولادت سے مایوس ونا امید نہیں ہوئیں اور دوبارہ پورے یقین واعتماد کے ساتھ کہنے لگیں، " وَ اِنِّيْٓ اُعِيْذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ " کہ میں اسے اور اس کی ذریت واولاد کو شیطان مردود سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔ تو ان الفاظ سے انہوں نے اپنی بیٹی کے ہاں اولاد ہونے سے آگاہی کا اثباتی اشارہ کیا جبکہ ظاہری طور پر انہیں اس کا علم نہ تھا۔

زوجۂ عمران کی دعا کے آخری لفظوں میں طلب قبولیت کی بابت ذکر کئے گئے جملہ "فَتَقَبَّلْ مِنِّيْ" (تو مجھ سے قبول کر) میں اس کا مفعول محذوف ہے یعنی انہوں نے یہ ذکر نہیں کیا کہ کیا قبول کر، تو اس سے یہ احتمال دیا جاسکتا تھا کہ ان کی مراد یہ ہو کہ خدایا، میری نذر کو قبول کر، کہ وہ عمل صالح ہے، یا میرے آزاد کئے ہوئے فرزند کو قبول کر، لیکن خدا کی طرف سے اس کی دعا کو شرف قبولیت عطا کئے جانے کی بابت یہ جملہ "فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ" (اسے اس کے پروردگار نے اچھے طور پر قبول کرلیا) اس حقیقت کی طرف واضح اشارہ یا دلیل ہے کہ ان کا مقصد آزاد کئے ہوئے فرزند کو مقبول بارگاہ خداوندی قرار دینا تھا، یعنی انہوں نے خدا سے دعا کی کہ میرے آزاد کئے ہوئے فرزند کو اپنی بارگاہ میں قبول کر لے۔

زوجۂ عمران کا اظہار حزن

O " فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ إِنِّي وَضَعْتُهَا أُنْثَى "
(پھر جب اس نے اسے جنا تو کہا: پروردگارا ! میں نے تو لڑکی جنی ہے)

اس جملے میں ایک نہایت لطیف اختصار گوئی کی صورت پائی جاتی ہے اور وہ یہ کہ " **فلما وضعت ما فی بطنها** " (پھر جب اس نے اسے جنا جو اس کے شکم میں تھا) کے بجائے " فَلَمَّا وَضَعَتْهَا " (پھر جب اس نے اسے جنا) کہا گیا یعنی جملہ "**ما فی بطنها**" کی جگہ ضمیر "**ها**" ذکر کر کے کلام کو مختصر طور پر پیش کیا گیا، جبکہ اصل میں "**ما فی بطنها**" کے الفاظ کے ساتھ پورے جملہ کا معنی واضح ہوتا ہے، تو آیت کا معنی یہ ہے کہ "جب اس نے اسے جنا جو اس کے شکم میں تھا اور واضح ہوا کہ وہ لڑکی ہے تو اس نے کہا: پروردگارا ! میں نے تو لڑکی جنی ہے" ! ان کے یہ الفاظ خدا کو باخبر و مطلع کرنے کے لئے نہ تھے بلکہ افسوس و حزن کے اظہار کے لئے تھے،...... کیونکہ خدا تو ہر شے سے آگاہ ہے......،

خدا کا علم و آگاہی!

O " وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ط وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثَى "
(اور اللہ بخوبی آگاہ ہے اس سے جو اس نے جنا، اور لڑکا لڑکی جیسا نہیں ہوتا)

یہ دونوں جملے معترضہ ہیں اور یہ خدا کا کلام ہے زوجۂ عمران کے الفاظ نہیں، اور نہ ہی یہ بات درست ہے کہ دوسرا جملہ زوجۂ عمران کا ہے جبکہ پہلا جملہ خدا کا بیان ہے، بلکہ دونوں جملے کلامِ خداوندی ہے۔ جہاں تک پہلے جملہ کا تعلق ہے تو وہ واضح ہے لیکن زوجۂ عمران نے چونکہ اپنے قلبی دکھ کا اظہار ان لفظوں میں کیا: " رَبِّ إِنِّي وَضَعْتُهَا أُنْثَى " (پروردگارا ! میں نے تو لڑکی جنی ہے) لہٰذا خدا کے اس بیان " وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ " (خدا خوب آگاہ ہے اس سے جو اس نے جنا) سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس امر کو بیان کرنا چاہتا ہے کہ ہم یہ بات جانتے ہیں کہ وہ لڑکی ہے لیکن ہم اس کی آرزو کو احسن طور پر اور اس کی دل پسند صورت میں پورا کرنا چاہتے ہیں لہٰذا اگر اسے معلوم ہوتا کہ ہم نے اس کے شکم میں لڑکی کیوں قرار دی ہے تو وہ اظہارِ افسوس نہ کرتی، اور اس طرح دکھی و مغموم نہ ہوتی کیونکہ حقیقت الامر یہ ہے کہ وہ جس لڑکے کی امید رکھتی تھی وہ اس لڑکی

کے مقام ومنزلت کا حامل ہرگز نہ ہوتا جو ہم نے اسے عطا کیا ہے اور جو کچھ اس لڑکی سے حاصل ہونا ہے وہ اس لڑکے سے قطعی طور پر حاصل نہ ہوسکتا تھا، اور وہ یہ کہ اس لڑکی سے عیسیٰ جیسی عظیم شخصیت کو جنم لینا تھا کہ جو خدا کا نبی، مادرزاد نابینا کو شفایاب کرنے والا، برص کے مرض میں مبتلا شخص کو اس سے نجات دلانے والا اور مردوں کو زندہ کرنے والا ہے، مگر اس جنم پانے والی لڑکی ہی سے ایک بچہ پیدا ہوگا جس سے کلمۃ اللہ پورا ہوجائے گا اور وہ ایسا بچہ جنے گی جو بغیر باپ کے پیدا ہوگا جس کے نتیجہ میں وہ اور اس کا بچہ، عالمین کے لئے آیت اور خدا کی نشانی قرار پائیں گے۔ وہ بچہ گہوارہ میں لوگوں سے باتیں کرے گا اور وہ روح اللہ اور کلمۃ اللہ ہوگا اور اس کی مثال اللہ کے نزدیک آدم جیسی ہوگی، تو یہ ہیں وہ روشن وواضح نشانیاں جو اس پاک ومبارک بچی اور اس کے فرزند عیسیٰ علیہما السلام کی تخلیق میں پائی جاتی ہیں۔

اس بیان سے یہ بھی ظاہر و واضح ہوتا ہے کہ "وَلَیْسَ الذَّکَرُ کَالْاُنْثٰی" خدا ہی کا کلام ہے زوجہ عمران کے الفاظ نہیں، کیونکہ اگر زوجۂ عمران کے الفاظ ہوتے تو اس طرح ہوتے: "**ولیس الانثٰی کالذکر**" (اور لڑکی تو لڑکے جیسی نہیں) جبکہ اس کے برعکس یوں کہا گیا: "وَلَیْسَ الذَّکَرُ کَالْاُنْثٰی" (اور لڑکا لڑکی جیسا نہیں) حالانکہ جو شخص کسی بلند مرتبت چیز یا مقام ومنزلت کا خواہاں ہو اور اسے اس سے کمتر چیز یا کم درجہ مقام ومنزلت دی جائے تو وہ کہتا ہے: یہ وہ نہیں جو مجھے مطلوب تھا، یا کہ جو کچھ مجھے دیا گیا ہے وہ اس جیسا نہیں جو میں چاہتا تھا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ "الذَّکَرُ" اور "الْاُنْثٰی" پر جو الف ولام ہے وہ عہد کا معنی دیتا ہے، (یعنی جو کچھ ذہن میں تھا اس کی طرف اشارہ وتوجہ دلانے کے لئے ہے) لیکن اکثر مفسرین حضرات نے جملہ "وَلَیْسَ الذَّکَرُ کَالْاُنْثٰی" کو زوجۂ عمران کے بیان کا تتمہ قرار دیا ہے اور اس کی بابت غیر ضروری وبے نتیجہ زحمت وتکلف میں مبتلا ہو کر جملہ میں "الذَّکَرُ" کے "الْاُنْثٰی" پر مقدم ہونے کے بارے میں تأویلیں کرنے میں مصروف ہوگئے جبکہ اس سے ہرگز کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں۔ جو شخص ان کے بیانات واظہارات سے آگاہ ہونا چاہے وہ ان کی کتب کا مطالعہ کرے۔

مریمؑ کی نام گزاری کا اظہار

○ " وَاِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ وَاِنِّیْٓ اُعِیْذُهَا بِكَ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ "

(اور میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے اور میں اسے اور اس کی اولاد کو شیطان مردود سے تیری پناہ میں دیتی ہوں)

لفظ "مریم" عبرانیوں کی لغت میں "عبادت گزار خاتون" اور "خدمت گزار خاتون" کے معنی میں آتا ہے۔ اسی

سے اس راز کا پتہ چلتا ہے کہ زوجہ عمران نے اپنی نومولود بیٹی کا نام اس کی پیدائش کے وقت ہی فوراً "مریم" کیوں رکھا اور یہ کہ خداوند عالم نے بھی اس کی طرف سے نام گزاری کے اس فوری عمل کا تذکرہ کیوں کیا؟ کیونکہ جب وہ بچہ کے لڑکا ہونے سے مایوس ہوئیں کہ جو عبادت کے لئے کامل آزاد اور کلیسا کی خدمت گزاری کے لئے حاضر ہو تو انہوں نے فوراً اور کسی تاخیر کے بغیر نومولود کی نام گزاری کا اقدام کیا اور اسے ایسے نام سے موسوم کر دیا جو عبادت و خدمت گزاری کے لئے مخصوص ہے، لہٰذا ان کا یہ کہنا " اِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ" کہ میں نے اس بچی کا نام مریم رکھ دیا ہے گویا ایسا ہے کہ انہوں نے کہا میں نے جو کچھ جنا ہے اسے تیرے لئے آزاد قرار دے رہی ہوں۔ ان کے اس جملہ سے نذر کے اثبات کی دلیل یہ ہے کہ اس کے بعد خداوند عالم نے ان کی نذر کو شرف قبولیت عطا کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: " فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّ اَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا" کہ اسے اس کے پروردگار نے اچھی طرح قبول کر لیا اور اسے نشو و نما کے بہترین سبب سے نوازا۔

اس کے بعد زوجہ عمران نے نومولود بچی اور اس کی اولاد و نسل کو شیطان مردود سے خدا کی پناہ میں دیتے ہوئے کہا "وَاِنِّیْۤ اُعِیْذُهَا بِكَ وَ ذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ "(میں اسے اور اس کی نسل کو شیطان مردود سے تیری پناہ میں دیتی ہوں)۔ انہوں نے اس لئے ایسا کیا تا کہ وہ عبادت و خدمت کی توفیق پائے اور اس کا نام اپنے مسمیٰ کے عین مطابق ہو۔

زوجہ عمران کے یقین کا لطیف اشارہ

اس مقام پر ایک نہایت اہم مطلب قابل توجہ ہے اور وہ یہ کہ آیت میں لفظ " ذُرِّیَّتَهَا " ہر طرح کی قید و شرط کے بغیر ذکر ہوا ہے یعنی یہ نہیں کہا کہ اگر وہ صاحب اولاد ہوئی تو اس کی اولاد کو تیری پناہ میں دیتی ہوں بلکہ مطلق الفاظ استعمال کئے اور کہا کہ اسے اور اس کی اولاد کو تیری پناہ میں دیتی ہوں جبکہ اس طرح کے الفاظ کا ادا کرنا اس شخص سے ہرگز صحیح نہیں ہوتا جو آئندہ سے باخبر نہ ہو اور یہ بات واضح ہے کہ انسان کے مستقبل کے حالات کا تعلق علم غیب سے ہے کہ جو خداوند عالم کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں یعنی مستقبل کی باتیں غیب کے باب سے ہیں کہ جس کا علم صرف خدا کو ہے۔۔ یا ان ہستیوں کو ہے جنہیں خدا خود عطا کرے۔۔م، تو ان کا اس طرح کہنا بعینہٖ اسی طرح ہے جیسے انہوں نے نذر کرتے ہوئے کہا تھا: "رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا " پروردگارا! میں تیرے لئے آزاد کر کے نذر کرتی ہوں اسے جو میرے شکم میں ہے، اس سلسلہ میں پہلے بیان ہو چکا ہے کہ ان کے اس بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ انہیں معلوم تھا کہ عمران سے ایک نیک و صالح لڑکا پیدا ہوگا۔ پھر جب وہ حاملہ ہوئیں اور عمران انتقال کر گئے تو اب انہیں اس حوالہ سے کوئی شک باقی نہ رہا کہ ان کے شکم میں وہی بچہ ہے جس کا وعدہ کیا گیا ہے، اور پھر جب انہوں نے بچے کو جنا اور انہیں معلوم ہو گیا کہ ان کا اندازہ درست نہ تھا تو انہیں یقین حاصل ہو گیا کہ وہ لڑکا اسی نومولود بچی کی نسل سے ہوگا لہٰذا انہوں نے فوراً اپنی نذر میں "بیٹے" کی بجائے "بیٹی" ذکر کیا اور

اس کا نام " مریم " (یعنی عابدہ وخدمت گزار) رکھا، اور اسے اور اس کی ذریت ونسل کو شیطان مردود سے خدا کی پناہ میں دیا۔
یہ ہیں وہ مطالب جو کلام الٰہی میں غور وفکر کرنے سے معلوم ہوتے ہیں۔

نذر کی قبولیت کا خدائی اظہار

○ " فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَّ اَنۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا "
(تو اس کے پروردگار نے اسے اچھی طرح قبول کرلیا اور اس کی نشو ونما کا اچھا بندوبست کردیا)

اس جملہ میں دو الفاظ ذکر ہوئے ہیں: ایک " تقبل " اور دوسرا " قبول "۔ جبکہ قاعدہ یہ ہے کہ جب لفظ "قبول" کو "حسن" کے ساتھ مقید کر کے ذکر کیا جائے تو اس میں " تقبل " کا معنی پایا جاتا ہے یعنی رضا وخوشی کے ساتھ قبول کرنا، بنا بر ایں اس جملے کا معنی یوں ہوگا: " فتقبلها ربها تقبلا "، (اس کے رب نے اسے قبول کرلیا جیسا کہ قبول کرنے کا حق ہے) تو یہاں آخر میں اس کے معنوی تجزیہ وتحلیل کے بعد اس کی جگہ "بقبول حسن" ذکر کیا گیا ہے جس سے اسی مطلب کا اثبات مطلوب ہے کہ یہاں حسن قبولیت کا اظہار مقصود ہے، اور صراحت کے ساتھ حسن قبولیت کا اظہار درحقیقت والدۂ مریمؑ کے اعزاز وشرف کی غرض سے ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ یہاں دو جملے ایک دوسرے کے بالمقابل ذکر ہوئے ہیں: ایک "فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَّ اَنۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا" اور دوسرا " وَ اِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ وَ اِنِّیْٓ اُعِیْذُهَا بِكَ وَ ذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ "، تو ان دونوں جملوں کی درست تطبیق کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ کہا جائے کہ جملہ: " وَ تَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ " دراصل جملہ " وَ اِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ " کی قبولیت کا مظہر ہے اور جملہ " وَّ اَنۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا " جملہ " وَ اِنِّیْٓ اُعِیْذُهَا بِكَ وَ ذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ " کی قبولیت واستجابت کا عکاس ہے، بنا بر ایں اسے حسن قبولیت سے نوازا جانے کا مطلب یہ نہیں کہ نذر کی وجہ سے زوجۂ عمران کا تقرب الی اللہ مورد قبول واقع ہوا اور انہیں اس عمل پر اخروی اجر وثواب ملے گا کیونکہ قبولیت کی بابت یہ نہیں کہا گیا کہ اس کی نذر کو اس کے رب نے شرف قبولیت عطا کیا بلکہ ارشاد ہوا: " فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا " اسے اس کے رب نے قبول کرلیا، یعنی خود مریم کو اس کے رب نے قبول کرلیا، تو معلوم ہوا کہ زوجۂ عمران سے ان کی بیٹی کو خدا نے اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت عطا کیا کیونکہ اس کا نام " مریم " رکھا گیا اور اسے خدا کے لئے آزاد کردیا گیا، اس بناء پر پورے جملہ کی بازگشت "اصطفاء" اور چن لینے کی طرف ہوگی اور

معنی یہ ہوگا کہ ہم نے اسے چن لیا، چنانچہ "اصطفا" کا معنی ہی یہ ہے کہ جسے چنا گیا ہے وہ کامل طور پر اللہ تعالیٰ کے حضور سر تسلیم خم کر کے خود کو اپنے خالق کے سپرد کر چکا ہے۔ (مزید غور فرمائیں)۔

آیت میں " وَّ اَنۡۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا " سے مراد اسے اور اس کی ذریت و نسل کو رشد و پاکیزگی کا عطا کیا جانا ہے اور اسے اور اس کی اولاد کو کہ جو اس کے شجر وجود کا ثمر ہے ایسی پاکیزہ زندگی سے فیض یاب کیا جو شیطانی القاءات اور اس کی وسوسہ انگیزی و بدخواہی کی پلیدی کا شکار نہ ہو اور یہی حقیقی معنی میں پاک و طاہر ہونا ہے۔

تو یہی دو چیزیں یعنی "قبول حسن" اور "نبات حسن" ہیں کہ جن میں سے پہلی چیز یعنی قبول حسن (حسن قبولیت) کی بازگشت "اصطفا" کی طرف ہے اور دوسری چیز یعنی "نباتِ حسن" کی بازگشت تطہیر و پاکیزگی عطا کرنے کی طرف ہے کہ ان دونوں امور کی طرف درج ذیل آیت مبارکہ میں اس طرح اشارہ کیا گیا ہے:

" وَ اِذۡ قَالَتِ الۡمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرۡيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصۡطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ...... " (اور جب فرشتوں نے کہا اے مریم! اللہ نے تجھے چن لیا ہے اور تجھے پاک بنایا ہے......)،

اس سلسلہ میں مزید وضاحت عنقریب پیش کی جائے گی، انشاء اللہ تعالیٰ،

مذکورہ بالا مطالب سے واضح ہوا کہ مریمؑ کا اصطفا و برگزیدہ ہونا اور ان کا پاک قرار دیا جانا دونوں دراصل ان کی والدۂ گرامی قدر کی استجابت کے طور پر ہے جیسا کہ حضرت مریمؑ کا عالمین کی عورتوں پر برگزیدہ ہونا ان سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کی بناء پر ہے اور ان کا اور ان کے فرزند کا عالمین کے لئے خدا کی نشانی قرار دیا جانا دراصل خداوند عالم کے اس فرمان کی تصدیق کے طور پر ہے جس میں اس نے ارشاد فرمایا: " وَلَيۡسَ الذَّكَرُ كَالۡاُنۡثٰى " کہ لڑکا، لڑکی جیسا نہیں !

مریم کی کفالت

○ " وَّ كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا "
(اور اس کی کفالت کی ذمہ داری زکریا نے لے لی)

جناب زکریاؑ نے قرعہ اندازی کے ذریعے حضرت مریمؑ کی کفالت کی ذمہ داری سنبھالی کیونکہ لوگوں میں ان کی کفالت کی بابت تنازع پیدا ہو گیا تھا، پھر انہوں نے قرعہ کشی پر اتفاق کر لیا اور قرعہ جناب زکریاؑ کے نام پر نکلا، جیسا کہ آیت مبارکہ کے الفاظ سے اس کا ثبوت ملتا ہے: " وَمَا كُنۡتَ لَدَيۡهِمۡ اِذۡ يُلۡقُوۡنَ اَقۡلَامَهُمۡ اَيُّهُمۡ يَكۡفُلُ مَرۡيَمَ ۖ وَمَا كُنۡتَ

لَدَیْهِمْ اِذْ یَخْتَصِمُوْنَ " (اور آپ اس وقت ان کے پاس موجود نہ تھے جب وہ اپنے قرعے ڈال رہے تھے کہ مریمؑ کی کفالت کون کرے گا اور آپ اس وقت ان کے پاس موجود نہ تھے جب وہ آپس میں لڑ جھگڑ رہے تھے)

زکریا کا محراب میں آنا

○ " کُلَّمَا دَخَلَ عَلَیْهَا زَکَرِیَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا "
(جب بھی زکریا محراب میں آئے تو انہوں نے اس (مریم) کے پاس رزق پایا)

" محراب" اس جگہ کو کہتے ہیں جو عبادت کے لئے مختص کی گئی ہو خواہ وہ مسجد میں ہو یا گھر میں ہو۔

مشہور لغت دان راغب اصفہانی کا کہنا ہے کہ مسجد کے محراب کی وجہ تسمیہ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اسے اس نام سے موسوم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ شیطان اور نفسانی خواہشوں سے جنگ کرنے کی جگہ ہے،

اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ اسے اس نام سے موسوم کرنے کا اصل راز یہ ہے کہ حق یہ ہے کہ انسان وہاں دنیا کے امور اور ذہنی وفکری پراگندگی کا شکار ہونے سے محفوظ قرار پائے،

بعض اہل دانش کا کہنا ہے کہ محراب اصل میں گھر کی اس جگہ کو کہا جاتا تھا جو بیٹھنے کا مرکزی مقام ہو، پھر جب مسجدیں بنائی گئیں تو ان کے مرکزی مقام کو اس نام سے موسوم کیا گیا،

اس کے برعکس بعض ارباب فکر وتحقیق نے اس طرح کہا کہ لفظ " محراب" اصل میں مسجد کی مخصوص جگہ کے لئے رکھا گیا نام ہے اور یہ نام مسجد کی اس جگہ کے لئے مخصوص کیا گیا جو مسجدوں کے وسط و مرکزی مقام میں ہو اور اسی مناسبت سے یعنی محراب مسجد سے شباہت کی بناء پر گھر کے وسط و مرکز میں مقام کو محراب کہا جانے لگا، بظاہر یہی نظریہ درست ہے اور اس موضوع کی بابت جو اقوال ذکر کئے گئے ہیں ان میں صحیح ترین بھی یہی ہے چنانچہ اس کی تائید قرآنی حوالہ سے بھی ہوتی ہے جس میں ارشاد خداوندی ہے:

○ " یَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا یَشَآءُ مِنْ مَّحَارِیْبَ وَتَمَاثِیْلَ...... " (سورۂ سباء، آیت ۱۳)......وہ اس کے لئے جو وہ چاہتا تھا بنا دیتے تھے یعنی محرابیں، مجسمے ......،

(اس آیت میں جنات کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ وہ حضرت سلیمانؑ کی چاہت و مرضی سے یہ چیزیں بناتے تھے، تو اس میں محرابوں کا تذکرہ ہوا ہے)، یہ تھا راغب اصفہانی کا لفظ محراب کی وجہ تسمیہ کی بابت تفصیلی بیان !،

اس سلسلہ میں بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ آیت مبارکہ میں لفظ "محراب" سے مراد وہ جگہ ہے جسے اہل کتاب اپنے عبادت خانوں میں "مذبح" کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور اسے عبادتخانہ کی اگلی سمت میں بنایا جاتا ہے اور اس کا مخصوص دروازہ ہوتا ہے جس سے اس میں چند پایوں والی سیڑھی کے ذریعے داخل ہوتے ہیں اور جو شخص اس میں موجود ہوتا ہے وہ عبادت گاہ میں موجود لوگوں سے مخفی ہوتا ہے۔

یاد رہے کہ اسلام میں مساجد کے محرابوں کی تشکیل کا سلسلہ بھی کلیساؤں کے محرابوں سے ملتا ہے۔ گویا ان کی دیکھا دیکھی مسلمانوں نے بھی مساجد میں اسی طرز کے محراب بنائے۔

آیت مبارکہ میں لفظ "رزقاً" نکرہ کی صورت میں ذکر ہوا ہے جس سے اس امر کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ وہ غیر معمولی رزق (طعام) تھا، چنانچہ اس سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ جناب زکریاؑ جب بھی حضرت مریمؑ کے پاس جاتے تو ان کے پاس غیر موسمی میوے پاتے مثلاً سردیوں میں موسم گرما کے پھل اور گرمیوں میں موسم سرما کے پھل ہوتے، اس قول کی تائید و تصدیق اس طرح ہوتی ہے کہ اگر وہ معمول کا رزق ہوتا...... یا موسمی پھل وغیرہ ہوتے ...اور لفظ "رِزْقًا" کا نکرہ (الف و لام کے بغیر) ذکر کیا جانا اس بات کی دلیل ہوتا کہ جناب زکریاؑ، حضرت مریمؑ کے محراب کو کبھی کھانے پینے کی چیزوں سے خالی نہ پاتے بلکہ ان کے پاس ہمیشہ رزق موجود پاتے تو جب انہوں نے مریمؑ سے پوچھا کہ یہ تیرے پاس کہاں سے آیا ہے "يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا" اور حضرت مریمؑ نے جواب میں کہا کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے کہ خدا جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے رزق دیتا ہے "هٰذَا ۖ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۖ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ"، تو ان کے اس جواب سے مطمئن و قانع ہو جاتے کیونکہ عین ممکن تھا کہ وہ طعام بعض ان لوگوں کی طرف سے ہو جو وہاں آیا جایا کرتے تھے اور مسجد میں عبادت کی غرض آتے ہوئے مریمؑ کے لئے کچھ کھانے وغیرہ لاتے ہوں اس سے قطع نظر کہ ان کا مقصد ایسا کرنے میں کیا ہو یعنی نیک غرض کے تحت لاتے ہوں یا بری غرض سے، (تو حضرت زکریاؑ کا ان کے جواب سے مطمئن ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ طعام معمول کا کھانا وغیرہ نہ تھا)۔

اس کے علاوہ یہ بات قابل توجہ ہے کہ حضرت مریمؑ کا جواب سن کر جناب زکریاؑ نے خدا کی بارگاہ میں جو دعا کی کہ پروردگارا! مجھے اپنی عنایت سے پاکیزہ اولاد عطا فرما، تو اس سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ حضرت مریمؑ کے پاس طعام کے پائے جانے کو خاص خدائی عنایت اور خارق العادت وغیر معمولی سمجھتے تھے لہٰذا ان کے دل میں یہ تمنا پیدا ہوئی کہ خدا سے دعا کریں کہ وہ انہیں اپنی خاص عنایت سے پاک اولاد عطا فرمائے، تو معلوم ہوا کہ حضرت مریمؑ کے پاس جو طعام موجود ہوتا تھا وہ آنجنابؑ پر خدا کی خاص عنایت و کرم نوازی کا مظہر تھا چنانچہ جملہ "يٰمَرْيَمُ......" اس مطلب کی طرف توجہ دلاتا ہے۔

اور جملہ "قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا" میں "وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا" کے بعد حرف عطف (واؤ) ذکر

نہیں ہوا بلکہ اس کے بغیر ہی کلام کے جاری سلسلہ کو توڑ کر حضرت زکریاؑ نے حضرت مریمؑ سے پوچھا کہ "یہ تیرے پاس کہاں سے آیا ہے"، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے یہ ساری باتیں ایک ہی دفعہ تسلسل کے ساتھ کیں اور حضرت مریمؑ نے جو جواب دیا وہ اس سے قانع و مطمئن ہو گئے اور انہیں یقین حاصل ہو گیا کہ یہ مریمؑ پر خدائی خاص عنایت ہے، تو انہوں نے فوراً خدا کے حضور استدعا کی کہ انہیں بھی پاک اولاد و ذریتِ طیبہ عطا فرمائے۔

حضرت زکریاؑ کی دعا

○ " هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهُ ۖ قَالَ رَبِّ هَبْ لِي مِن لَّدُنكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً......"

(اس وقت زکریا نے اپنے رب کے حضور دعا کی اور کہا پروردگارا! مجھے اپنی طرف سے پاک اولاد عطا فرما)

کسی چیز کے اس فرد یا حصہ کو طیب کہا جاتا ہے جو اپنے مالک کے مقصود و مراد کی تکمیل میں موزوں ہو مثلاً: "البلد الطیب" یعنی طیب شہر اسے کہا جاتا ہے جو اپنے باسیوں کے لئے زندگی کی تمام تر آسائشوں کا حامل ہو یعنی آب و ہوا اور رزق وطعام وغیرہ کے حوالہ سے نہایت عمدہ ہو، طیب شہر کی بابت ایک قرآنی آیت ملاحظہ ہو:

سورۂ اعراف، آیت: ۵۸

○ " وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ "

(اور پاکیزہ شہر کہ اس میں اگنے والی چیزیں اپنے پروردگار کے اذن سے اگتی ہیں)

پاکیزہ روزی و آسائش اور پاکیزہ زندگی اسے کہتے ہیں جس کے بعض اجزاء دوسرے بعض سے بھرپور موزونیت و مناسبت کے حامل ہوں یعنی ان میں ایسی ہم رنگی پائی جائے جس سے زندگی بسر کرنے والے افراد کو سکون قلب حاصل ہو، اسی حوالہ سے عمدہ اور دلفریب خوشبو (عطر) کو "طیب" کہا جاتا ہے، بنابرایں "ذریہ طیبہ" (پاکیزہ اولاد) سے مراد وہ نیک وصالح اولاد ہے جو اپنی صفات و افعال میں اپنے باپ کی امیدوں پر پوری اترتی ہو، لہٰذا حضرت زکریا علیہ السلام کا بارگاہِ خداوندی میں اس طرح دعا کرنا کہ پروردگارا! مجھے اپنی طرف سے پاکیزہ اولاد عنایت فرما: (رَبِّ هَبْ لِي مِن لَّدُنكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً) دراصل اس عظمت و شرف کے تناظر میں تھا جو انہوں نے حضرت مریمؑ کی بابت خدا کی طرف سے حاصل ہونے والے اعزاز کا مشاہدہ کیا تھا تو اس کے بعد ان کے دل میں اس اعزاز کے حصول کی تمنا موجزن ہوئی اور وہ اپنے اوپر قابو نہ پا

سکے اور فوراً اللہ تعالیٰ کے حضور دست بہ دعا ہوگئے کہ انہیں بھی اس عظیم اعزاز وشرف سے نوازا جائے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ "ذریۂ طیبہ" سے ان کا مقصد یہ تھا کہ جو عزت وشرف اور عظمت حضرت مریمؑ کو عطا ہوئی ہے اور ان کی شخصیت جس خدائی عنایت کی سزاوار بنی ہے اسی طرح انہیں بھی عطا ہو اور ان کی اولاد اسی عزت وشرف کی حامل ہو، چنانچہ خداوند عالم نے ان کی دعا کو ان کے مطلوب کے عین مطابق شرف قبولیت عطا کیا اور جس طرح حضرت مریمؑ کو ایک عظیم وجلیل القدر فرزند سے نوازا اسی طرح حضرت زکریا علیہ السلام کو بھی حضرت یحییٰ جیسا عظیم وجلیل القدر فرزند عطا فرمایا کہ جو تمام انبیاءؑ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے زیادہ مشابہت رکھتے تھے اور ان میں وہ تمام کمالی صفات اور عظمتیں موجود تھیں جو حضرت عیسیٰؑ اور ان کی والدہ حضرت مریمؑ کو حاصل تھیں، اور کمالی صفات وعظمتوں کی جامعیت کی صفت کا حامل ہونے کی وجہ سے خداوند عالم نے انہیں یحییٰؑ سے موسوم کیا اور ان کے بارے میں ارشاد فرمایا: "مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ" (وہ کلمتہ اللہ کی تصدیق کرنے والا، سید وسردار، پاکدامن اور صالحین میں سے ایک نبی ہے) تو یہ صفات ان عظیم وبلند پایہ کمالی اوصاف وامتیازات میں سے ہیں جن کا حامل ہونے کی بناء پر کوئی شخص حضرت مریمؑ اور ان کے فرزند حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے شباہت کی ممکنہ صورت پا سکتا ہے، اس سلسلہ میں ہم عنقریب مزید وضاحت پیش کریں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ،

حضرت زکریاؑ کو یحییٰؑ کی خوشخبری

○ " فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى......"

(تو انہیں فرشتوں نے آواز دی جبکہ وہ محرابِ عبادت میں نماز کے لئے کھڑے ہو چکے تھے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو یحییٰ کی خوشخبری دیتا ہے......)

اس آیت مبارکہ میں جو ضمیریں ذکر ہوئی ہیں مثلاً "نادتهٔ" (اسے آواز دی)۔ "وَهُوَ قَآئِمٌ" (اور وہ کھڑے ہوئے تھے)، "يُّصَلِّيْ" (وہ نماز پڑھ رہے تھے) "وَيُبَشِّرُكَ" (اور تجھے خوشخبری دیتا ہے) خواہ وہ غائب کی ضمیریں ہیں یا مخاطب کی، سب کی بازگشت حضرت زکریاؑ کی طرف ہے۔

اور "بشارت"، "ابشار" اور "تبشیر" سب کا معنی اس چیز کی خبر دینا ہے جس سے انسان خوش ومسرور ہو، اور جملہ "اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى" (اللہ آپ کو یحییٰ کی خوشخبری دیتا ہے) اس امر کی دلیل ہے کہ یحییٰ کی

نام گزاری خداوند عالم کی طرف سے تھی، جیسا کہ ان آیات کی مانند دیگر آیات جو سورۂ مریم میں ہیں ان سے بھی اسی حقیقت کا ثبوت ملتا ہے چنانچہ خداوند عالم کا ارشاد ہے :

سورۂ مریم، آیت :۷

○ " یٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ اسْمُهٗ يَحْيٰى ۙ لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا "

(اے زکریا، ہم تجھے ایسے فرزند کی خوشخبری دیتے ہیں جس کا نام یحییٰ ہے اور ہم نے اس سے پہلے اس کا کوئی ہم نام قرار نہیں دیا)۔

تو یحییٰ کی نام گزاری اور اس نام گزاری کا من جانب اللہ ہونا اور یحییٰ کی ولادت سے پہلے ان کی آمد کی خوشخبری دیتے ہوئے زکریا کو اس نام سے آگاہ کیا جانا وغیرہ سب سے اس مطلب کی تائید ہوتی ہے جو ہم نے ابھی سطور بالا میں بیان کیا ہے اور وہ یہ کہ حضرت زکریا علیہ السلام نے اپنے پروردگار سے دعا کی تھی کہ انہیں ایسا فرزند عطا کرے جس کا مرتبہ و مقام حضرت مریمؑ کے مقام و مرتبہ جیسا ہو، وہ مریم کہ جو خود اور ان کا فرزند (عیسیٰ علیہ السلام) دونوں عالمین میں خدا کی آیت و نشانی ہیں، چنانچہ اس سلسلہ میں ارشاد الٰہی ہے :

سورۂ انبیاء، آیت :۹۱

○ " وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ "

(اور ہم نے اسے اور اس کے بیٹے کو عالمین کیلئے نشانی قرار دیا)

اس آیت مبارکہ سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کو جو کمالی صفات عطا کی گئیں اور جن امتیازی خصوصیات سے نوازا گیا وہ سب حضرت یحییٰ علیہ السلام میں پائی جاتی تھیں اور حضرت مریمؑ کو جن عظمتوں سے نوازا گیا وہ سب بدرجۂ کمال حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں قرار دی گئیں، تو حضرت عیسیٰؑ کی ذات میں جو امتیازی اوصاف قرار دیئے گئے ان کی وجہ سے وہ حتی الامکان حضرت یحیٰ علیہ السلام سے کامل اور بھرپور مشابہت کے حامل ہو گئے، تاہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ان تمام امتیازات و کمالی صفات میں ان پر کامل تقدم حاصل ہے کیونکہ ان کا خلعتِ وجود زیب تن کرنا اور امتیازی صفات کا حامل ہونا حضرت یحییٰؑ کی بابت حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا کے شرف قبولیت پانے سے پہلے تھا، اسی سبقت و تقدم کی بناء پر حضرت عیسی علیہ السلام اولوالعزم انبیاء میں قرار پائے اور انہیں کتاب و شریعت عطا ہوئی، لیکن ان دونوں پیغمبروں میں جہاں تک ممکن تھا کمالی صفات و امتیازی اوصاف میں شباہت پائی جاتی تھی۔

اگر آپ ہمارے بیان کردہ مطالب کی تصدیق چاہیں تو ان دونوں (حضرت عیسیٰؑ و یحییٰؑ) کے بارے میں سورۂ مریم کی درج ذیل آیات میں غور و فکر اور تدبر کریں :

سورۂ مریم، آیت :۱۵

" یٰزَکَرِیَّاۤ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ ِۣاسْمُهٗ یَحْیٰى ۙ لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِیًّا .... یٰیَحْیٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ؕ وَ اٰتَیْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِیًّا ۙ﴿۱۲﴾ وَّ حَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَ زَكٰوةً ؕ وَ كَانَ تَقِیًّا ۙ﴿۱۳﴾ وَّ بَرًّۢا بِوَالِدَیْهِ وَ لَمْ یَكُنْ جَبَّارًا عَصِیًّا ﴿۱۴﴾ وَ سَلٰمٌ عَلَیْهِ یَوْمَ وُلِدَ وَ یَوْمَ یَمُوْتُ وَ یَوْمَ یُبْعَثُ حَیًّا ﴿۱۵﴾ "

(اے زکریا، ہم تجھے ایک فرزند کی خوشخبری دیتے ہیں جس کا نام یحییٰ ہے، ہم نے اس سے پہلے کسی کو اس کا ہمنام نہیں بنایا...... اے یحییٰ، قوت سے کتاب کو لے لو، اور ہم نے اسے (یحییٰ کو) بچپن میں حکومت عطا کی، اور اپنی طرف سے محبت و پاکیزگی سے نوازا اور وہ پاک دل، پاک دامن ہے، اور اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرنے والا ہے، اور وہ ستمگار و گناہگار نہیں، اور سلام ہو اس پر جس دن وہ پیدا ہوا اور جس دن وہ مرے گا اور جس دن اسے زندہ اٹھایا جائے گا)۔

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں یوں ارشاد ہوا:

سورۂ مریم، آیت :۳۳

" فَاَرْسَلْنَاۤ اِلَیْهَا رُوْحَنَا ...... اِنَّمَاۤ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِیًّا ...... قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَیَّ هَیِّنٌ ۚ وَ لِنَجْعَلَهٗۤ اٰیَةً لِّلنَّاسِ وَ رَحْمَةً مِّنَّا ...... فَاَشَارَتْ اِلَیْهِ ؕ قَالُوْا كَیْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِی الْمَهْدِ صَبِیًّا ﴿۲۹﴾ قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ ؕ۫ اٰتٰىنِیَ الْكِتٰبَ وَ جَعَلَنِیْ نَبِیًّا ۙ﴿۳۰﴾ وَّ جَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا اَیْنَ مَا كُنْتُ ۪ وَ اَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَیًّا ﴿۳۱﴾ وَّ بَرًّۢا بِوَالِدَتِیْ ۫ وَ لَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا ﴿۳۲﴾ وَ السَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَ یَوْمَ اَمُوْتُ وَ یَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا "

" تو ہم نے اس کی طرف اپنی روح بھیجی ہے...... میں تیرے رب کا پیغام لایا ہوں تا کہ تجھے پاکیزہ فرزند عطا کروں...... اس نے کہا: تیرا پروردگار کہتا ہے یہ کام میرے لئے آسان ہے۔۔ کہ بغیر باپ کے بچہ پیدا کروں۔۔۔ اور ہم اسے لوگوں کے لئے آیت و نشانی قرار دیں اور اپنی طرف سے رحمت بنا دیں...... تو اس (مریم) نے اس بچے کی طرف اشارہ کیا، لوگوں نے کہا ہم کس طرح اس بچے سے گفتگو کریں جو ابھی گہوارہ میں ہے، تو وہ (بچہ) بول اٹھا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب عطا کی

ہے اور مجھے نبی بنایا ہے اور میں جہاں بھی ہوں مجھے مبارک قرار دیا ہے، اور مجھے زندگی بھر کے لئے نماز پڑھنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا ہے اور اپنی والدہ کے ساتھ نیکی کرنے کی تاکید کی ہے اور اس نے مجھے ستمگار و شقی نہیں بنایا اور مجھے پر سلام ہو جس دن میں پیدا ہوا اور جس دن میں مروں گا اور جس دن میں زندہ اٹھایا جاؤں گا)

آپ نے ملاحظہ کیا کہ دونوں (حضرت عیسیٰؑ و حضرت یحییٰؑ) کے بارے میں جو کچھ ذکر کیا گیا ہے اس میں بھرپور شباہت پائی جاتی ہے اور زیر بحث آیات مبارکہ کا سورۂ مریم کی مذکورہ بالا آیات سے موازنہ کیا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ ان دونوں میں تطبیقی حوالہ سے کس قدر ہم رنگی پائی جاتی ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ ان دونوں حضرات میں جو مشترک صفات اور ارتباطی جہات پائی جاتی ہیں وہ اس طرح ہیں:

(۱) خداوند عالم نے حضرت زکریاؑ کے فرزند کا نام ''یحییٰ'' رکھا اور حضرت مریمؑ کے فرزند کا نام ''عیسیٰ'' رکھا اور ان دونوں لفظوں کا معنی ''زندہ رہے گا'' ہے،

(۲) اسے (یحییٰ کو) اپنے کلمہ یعنی عیسیٰؑ کا تصدیق کنندہ قرار دیا چنانچہ حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں ارشاد ہوا: ''بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى'' (اپنا کلمہ کہ جس کا نام مسیح عیسیٰ ہے)

(۳) اسے (یحییٰ کو) بچپن میں حکومت و اقتدار عطا کیا اور کتاب کی تعلیم دی جیسا کہ عیسیٰؑ کو بھی اسی طرح نوازا،

(۴) اسے (یحییٰ کو) اپنی طرف سے محبت و پاکیزگی سے نوازا اور اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا حکم دیا اور ستمگار نہیں بنایا جیسا کہ یہ سب کچھ عیسیٰؑ کو بھی عطا کیا،

(۵) اس پر (یحییٰ پر) تین مقامات (یوم ولادت، یوم وفات، یوم بعث) میں سلام کہا جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام پر بھی انہی تین مقامات میں سلام کہا،

(۶) اسے (یحییٰ کو) سید و سردار قرار دیا جیسا کہ عیسیٰ کو ''وجیہ'' و مقبول بارگاہ قرار دیا،

(۷) اسے (یحییٰ کو) پاک دل و پاکدامن اور صالحین میں سے نبی قرار دیا جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو قرار دیا،

خداوند عالم نے یہ تمام خصوصیات حضرت یحییٰؑ کو عطا کیں تا کہ حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا اور اس تمنا کو پورا کرے جو انہوں نے ذریۂ طیبہ اور صالح و پسندیدہ فرزند کے لئے کی اور انہوں نے یہ آرزو اس وقت کی جب ان کے دل میں حضرت مریمؑ کو خدائی عطیہ و عظمت و اعزاز سے نوازا جاتا دیکھا کہ ان کے دل میں اس اعزاز کے حصول کا شوق موجزن ہوا۔

اور جملہ ''مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللهِ'' میں اس امر کا ثبوت پایا جاتا ہے کہ حضرت یحییٰؑ کو حضرت عیسیٰؑ کی شریعت کا داعی قرار دیا گیا کیونکہ آیت میں ''بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللهِ'' سے مراد حضرت عیسیٰ مسیح ہیں جیسا کہ انہیں زیر بحث آیات مبارکہ

کے ذیل میں حضرت مریمؑ کو جو بشارت وخوشخبری دی گئی اس میں حضرت عیسیٰؑ کو "کلمتہ اللہ" سے تعبیر کیا گیا،

لفظ "سید" اسے کہتے ہیں جو عوام الناس کے امور زندگی کا ذمہ دار ہو اور ان کے امر معاش وغیرہ کا اہتمام وانتظام کرنے والا ہو یا کم از کم ان کے ہاں پسندیدہ خصوصیات وفضیلتوں میں سے کسی ایک میں ان کی سرپرستی کرنے والا ہو، یہ ہے اس لفظ کا اصل معنیٰ! مگر رفتہ رفتہ اسے کسی قوم کی بزرگ شخصیت کے بارے میں استعمال کیا جانے لگا اور ہر قوم کے بلند مرتبہ شخص کو "سید" وسردار کہا جانے لگا کیونکہ مذکورہ بالا امور کی سرپرستی، اقتدار اور جاہ وجلال یا مال ودولت یا کسی فضیلتی صفت میں بزرگی کا موجب بنتی ہے...... جو شخص ان امور میں سرپرستی کرتا ہے وہ خواہ و نا خواہ قوم کا سردار، بزرگ اور قابل احترام فرد قرار پاتا ہے......

"حصور" (پاکدامن) اسے کہتے ہیں جو نفسانی خواہشوں کا اسیر ہو کر عورتوں سے آمیزش کا دلدادہ نہ ہو، آیت مبارکہ میں سیاق کلام سے ثابت ہوتا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام زہد میں اس بلند ترین مقام پر فائز تھے کہ اس طرح کی نفسانی خواہشوں سے دوری اختیار کرتے تھے۔

حضرت زکریاؑ کا اظہارِ حیرت

○ " قَالَ رَبِّ اَنّٰی یَكُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِیَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِیْ عَاقِرٌ......"

(اس نے کہا: پروردگارا! میرے ہاں لڑکا کیونکر پیدا ہوگا جبکہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری زوجہ بانجھ ہے......)

حضرت زکریاؑ کے یہ الفاظ حیرت وتعجب پر مبنی استفہام کی صورت میں ہیں جو کہ حقیقت حال سے آگاہ ہونے کی غرض کی عکاسی کرتے ہیں، ایسا نہیں کہ انہوں نے اپنے صاحب اولاد ہونے کو بعید سمجھتے ہوئے اس طرح پوچھا اور نہ اس خیال سے ایسا جملہ کہا کہ جس سے ان کی نظر میں ان کے ہاں بچہ کا پیدا ہونا کوئی انہونی چیز ہو، کیونکہ جب خداوند عالم نے انہیں اس کی بشارت وخوشخبری دے دی اور یہ بھی بتا دیا کہ عنقریب خدا انہیں ان کی دعا وطلب کے مطابق فرزند عطا فرمائے گا تو اس کے باوجود حضرت زکریاؑ جیسی شخصیت اس سلسلہ میں ناامیدی ومایوسی کا شکار کیونکر ہو سکتی ہے جبکہ انہوں نے خود ہی اپنی دعا میں انہی دو امور کو جن کا ذکر انہوں نے اپنے استفہامی الفاظ (وَّقَدْ بَلَغَنِیَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِیْ عَاقِرٌ) میں کیا اور ان پر تعجب و حیرت کا اظہار کیا تو جب خدا کی طرف سے بشارت ملی تو وہ مایوسی وناامیدی سے دوچار کیونکر ہو سکتے تھے، چنانچہ ان کے الفاظ اس

طرح تھے:

سورۂ مریم، آیت :۵

" رَبِّ اِنِّیْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَیْبًا وَّلَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآىِٕكَ رَبِّ شَقِیًّا ﴿۴﴾ وَ اِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ وَكَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا "

(پروردگارا! میری ہڈیاں کمزور ہو چکی ہیں اور بڑھاپے کی وجہ سے میرے سر کے بال سفید ہو چکے ہیں اور پروردگارا ! میں تیرے حضور کچھ مانگ کر کبھی محروم نہیں ہوا، البتہ میں اپنے بعد اپنے عزیزوں ورشتہ داروں سے خائف ہوں، اور میری بیوی بانجھ ہو چکی ہے، تو تو مجھے اپنی عنایت سے جانشین ووارث عطا فرما)

لیکن حضرت زکریاؑ نے جس خاص وقت میں وہ الفاظ کہے اس سے ایک اور معنی کا پتہ چلتا ہے اور وہ یہ کہ گویا جب انہوں نے حضرت مریمؑ پر خاص خدا کی عنایت کا مشاہدہ کیا اور اپنے بے اولاد ہونے کو یاد کر کے اپنے اور اپنی نسل کے جاری سلسلہ کے منقطع ہو جانے کا احساس کیا تو انہیں اس کے سوا کچھ سجھائی نہ دیا کہ وہ اپنے پروردگار کے حضور استدعا کریں، چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور اپنی دعا میں انہی دو باتوں کو ذکر کیا جو ان کے متاثر و مغموم ہونے کا زیادہ سبب بنے ہوئے تھے یعنی ان کا بڑھاپا اور اپنی بیوی کا بانجھ پن! اور جب ان کی دعا کو شرف قبولیت عطا کیا گیا اور انہیں فرزند کی خوشخبری دی گئی تو اس وقت ان کی حالت ایسی تھی جیسے کوئی بیمار، صحت مند ہو جاتا ہے اور اسے افاقہ ہو جاتا ہے، وہ بالکل تندرست وتوانا سے ہو گئے اور اپنے صاحب اولاد ہونے پر اس لئے تعجب کرنے لگے کہ وہ تو بوڑھے ہیں اور ان کی زوجہ بھی بانجھ ہے تو فرزند کی خوشخبری سے ان کے چہرے پر پڑا ہوا ناامیدی وحزن کا غبار چھٹ گیا اور اس کی جگہ سرور آمیز تعجب نے لے لی، کہ وہ حیرت زدہ بھی تھے اور خوش بھی، جبکہ اس سے پہلے مایوس بھی تھے اور محزون وافسردہ بھی!،

اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ انہوں نے صاحب اولاد ہونے کی خوشخبری سننے اور اپنی حاجت کے پورا ہو جانے کے بعد اس سلسلہ میں پائی جانے والی جسمانی رکاوٹوں ...... بوڑھاپا اور بانجھ پن...... کا حوالہ کیوں دیا اور یہ کہ ان رکاوٹوں کے دور ہو جانے کی کیفیت سے آگاہ ہونے کی خواہش کا اظہار کیوں کیا؟ تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے اوپر خداوند عالم کی خاص عنایت اور فرزند کی نعمت سے بہرہ ور کئے جانے کے اسرار الٰہی کو سمجھنا چاہتے تھے تاکہ یکے بعد دیگرے نعمتوں کے فیضان سے لطف اندوز ہو سکیں، اور یہ اس طرح سے ہے جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ذریت کی خوشخبری دی گئی تھی اور انہوں نے بھی سرور آمیز حیرت کا اظہار کیا تھا کہ جس کا تذکرہ قرآن مجید میں اس طرح ہوا :

سورۂ حجر، آیت :۵۶

" وَنَبِّئْهُمْ عَنْ ضَیْفِ اِبْرٰهِیْمَ ﴿۵۱﴾ اِذْ دَخَلُوْا عَلَیْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا قَالَ اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ ﴿۵۲﴾

قَالُوْا لَا تَوْجَلْ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴿۵۳﴾ قَالَ اَبَشَّرْتُمُوْنِيْ عَلٰٓى اَنْ مَّسَّنِيَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ ﴿۵۴﴾ قَالُوْا بَشَّرْنٰكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ ﴿۵۵﴾ قَالَ وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ ﴿۵۶﴾ "

(اور انہیں ابراہیم کے مہمانوں کا بتایئے جب وہ ان کے پاس آئے تو انہیں سلام کیا، ابراہیم نے کہا: ہمیں تم لوگوں سے ڈر لگ رہا ہے، انہوں نے کہا: آپ ڈریں نہیں، ہم آپ کو علیم و دانا فرزند کی خوشخبری دے رہے ہیں، ابراہیم نے کہا، کیا تم مجھے اس طرح کی خوشخبری دیتے ہو جبکہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں تو تم مجھے کس چیز کی خوشخبری دو گے، انہوں نے کہا: ہم نے صحیح خوشخبری دی ہے آپ ناامید ہونے والوں میں سے نہ ہوں، ابراہیم نے کہا اپنے رب کی رحمت سے گمراہ لوگوں کے علاوہ کوئی بھی ناامید نہیں ہوتا)

تو معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرشتوں کی طرف سے انہیں ناامید ہونے سے منع کرنے کے جواب میں اس امر کا تذکرہ کیا کہ ان کا استفہام اور تعجب کا اظہار کرنا ناامیدی کی بناء پر نہیں تھا کیونکہ وہ گمراہ نہیں ہیں جبکہ ناامیدی گمراہی کے سوا کچھ نہیں بلکہ اس طرح ہے جیسے کوئی آقا و سردار جب اپنے غلام کے پاس آ کر اس سے قرب و انس اور اپنی خاص عنایت کا اظہار کرتا ہے تو اس غلام کی خوشی و مسرت کی کوئی انتہاء نہیں ہوتی اور وہ پھولے نہیں سماتا اور وہ اپنے اوپر اپنے آقا و سردار کی خاص کرم نوازی کو زبان پر لا کر اس سے لطف اندوز ہو چنانچہ وہ اس مقصد کے لئے ہر ممکن طریقہ اپناتا ہے اور ہر لحاظ سے اپنے دل کی سرور آمیز حیرت کو آشکار کرتا ہے۔

اور حضرت زکریا علیہ السلام کا یہ کہنا "وَقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ" کہ بڑھاپا مجھے لے گیا ہے، دراصل ادب و آداب اظہار کی عکاسی کرتا ہے کیونکہ یہ الفاظ اس مطلب کی طرف لطیف اشارہ کے طور پر ہیں کہ وہ بڑھاپا و سن رسیدہ ہونے کی وجہ سے اپنے اندر جنسی خواہش نہیں پاتے تھے، اور ان کی زوجہ بھی بڑھاپا اور بانجھ پن دونوں کا شکار ہو چکی تھیں مگر انہوں نے اس کے بارے میں صرف ان کے بانجھ پن کو ذکر کیا جبکہ ان کا اشارہ اس بات کی طرف تھا کہ وہ بھی میری طرح بوڑھی ہو چکی ہے اور بڑھاپے کے ساتھ ساتھ وہ بانجھ بھی ہے۔

خدا جو چاہتا ہے انجام دیتا ہے

○ " قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ "

(اس نے کہا اسی طرح خدا جو چاہتا ہے انجام دیتا ہے)

اس جملے میں فعل "قال" (اس نے کہا) کا فاعل یعنی کہنے والا اگرچہ خداوندعالم ہے خواہ بلاواسطہ ہو یا بالواسطہ اور ان فرشتوں کے ذریعے ہو جو حضرت زکریاؑ سے گفتگو کر رہے تھے، تو بہرحال یہ قول و بیان خدا ہی کا ہے البتہ بظاہر فرشتہ کی وساطت سے خدا کی طرف منسوب ہے، تو کہنے والا فرشتہ ہے لیکن خدا کی طرف اس لئے منسوب ہے کہ اس کا حکم خدا نے دیا، ......فرشتے خدا کے حکم کے بغیر کچھ نہیں کہتے اور نہ ہی کچھ کرتے ہیں......، چنانچہ اس کا ثبوت درج ذیل آیت میں موجود ہے:

سورۂ مریم، آیت :۹

○ " قَالَ كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَّقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْـًٔا ﴿۹﴾ "

(اس نے کہا ایسا ہی ہے، تیرے پروردگار نے کہا کہ یہ کام میرے لئے آسان ہے اور کیوں آسان نہ ہو جبکہ میں نے اس سے پہلے تجھے پیدا کیا اور تو کچھ نہ تھی)

اس میں فرشتے نے خدا کا بیان ذکر کیا، اس سے تین امور ثابت ہوتے ہیں :

(۱) حضرت زکریاؑ نے یہ بات بھی اسی طرح اور وہیں سے سنی جیسے اس سے پہلے سن رہے تھے۔

(۲) لفظ " كَذٰلِكَ " ادبی لحاظ سے ایک "خبر" ہے جس کا "مبتدا" حذف کیا گیا ہے، گویا جملہ اس طرح ہے: "الامر کذلک" (بات ایسی ہی ہے)، یعنی آپ کو جو خوشخبری دی گئی ہے وہ ہر صورت میں پوری ہونے والی ہے، اس میں اس مطلب کا اشارہ پایا جاتا ہے کہ انہیں جو خوشخبری دی گئی کہ انہیں فرزند عطا کیا گیا ہے وہ تقدیر کا حتمی فیصلہ ہے کہ جس کے وقوع پذیر ہونے میں کوئی شک نہیں ہوسکتا۔ یہ اسی جواب کی طرح ہے جو روح الامین نے حضرت مریمؑ کو دیا کہ جس کا تذکرہ خداوندعالم نے ان لفظوں میں فرمایا: "قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ...... وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا" ......سورۂ مریم، آیت ۲۱......، (اس نے کہا ایسا ہی ہے، تیرا رب کہتا ہے کہ وہ میرے لئے آسان ہے......اور وہ خدا کا حتمی فیصلہ ہے)۔

(۳) جملہ "اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ" ایک مستقل جملہ ہے جو "كَذٰلِكَ" کے مضمون و مفہوم کی علت و سبب کو بیان کرتا ہے، یعنی یہ جو ہم نے کہا ہے کہ "ایسا ہی ہوتا ہے" (كَذٰلِكَ) تو اس لئے ہے کہ خدا جو کچھ چاہتا ہے انجام دیتا ہے۔

تین دن خاموش رہنے کی ہدایت

○ " قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ۭ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا......"

(اس نے کہا: پروردگارا! میرے لئے کوئی نشانی قرار دے، خدا نے کہا تیری نشانی یہ ہے کہ تو تین دن تک لوگوں سے بات نہ کر مگر صرف اشارہ سے......)

تفسیر مجمع البیان میں مذکور ہے کہ "رمز" کا معنی لبوں سے اشارہ کرنا ہے اور کبھی ابرو، آنکھ اور ہاتھ سے اشارہ کرنے کو بھی "رمز" کہا جاتا ہے البتہ زیادہ تر پہلے معنی یعنی لبوں سے اشارہ کرنے کو رمز کہتے ہیں۔

لفظ "عشی" سے دن کا آخری پہر مراد ہے، گویا اسے "عشوۃ" سے بنایا گیا ہے جس کا معنی وہ اندھیرا ہے جو آنکھ پر چھا جاتا ہے اور کسی چیز کے دکھائی دینے میں رکاوٹ بنتا ہے، اسی مناسبت سے اس وقت کو "عشی" کہا گیا جب وہ تاریکی کی طرف بڑھ رہا ہو۔

لفظ "ابکار" سے دن کا پہلا پہر یعنی اس کا ابتدائی حصہ مراد ہے، اس کا اصل معنی استعجال یعنی جلد بازی ہے۔

اس آیت مبارکہ میں حضرت یحییٰؑ کی ولادت کے حوالہ سے حضرت زکریاؑ کے صاحب اولاد ہونے کی نشانی ان کا خاموش رہنا بتایا گیا، چنانچہ یہی صورت حال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت میں دکھائی دیتی ہے کہ ان کے پیدا ہونے کے بعد حضرت مریمؑ سے بھی یہی کہا گیا کہ جب وہ کسی شخص کو دیکھیں تو اس سے کہیں کہ میں نے خدا کے لئے منت مانی ہوئی ہے کہ کسی سے بھی بات نہ کروں گی، آیت ملاحظہ ہو،

سورۂ مریم، آیت :۲۶

○ " فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوْلِيْٓ اِنِّىْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا "

بہرحال زیر نظر آیت مبارکہ میں مذکور ہے کہ حضرت زکریاؑ نے خدا کی بارگاہ میں درخواست کی کہ ان کے لئے کوئی نشانی قرار دی جائے (قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً) آیت کا معنی کسی چیز کے وجود پر دلالت کرنے والی نشانی ہے۔ تو اب سوال یہ ہے کہ آیا ان کا نشانی طلب کرنا اس لئے تھا کہ انہیں جو آواز سنائی دی کہ اے زکریا ہم تجھے فرزند کی خوشخبری دیتے ہیں (یا زکریا انا نبشرک بغلام......) وہ خدا کی طرف ہی سے تھی نہ کہ شیطان کی وسوسہ انگیزی تھی؟ یا اس لئے تھی کہ انہیں اپنی زوجہ کے حاملہ ہونے کا وقت معلوم ہوتا کہ اس کی بنیاد پر اس کے حاملہ ہونے کی تصدیق ہو سکے، ان دونوں پہلوؤں کے

بارے میں مفسرین کرام کے اقوال مختلف ہیں، البتہ آیات کے سیاق اور واقعہ کی کیفیت سے دوسرے پہلو کا قرین صحت ہونا بعید نظر نہیں آتا لیکن یہ بات قابل ذکر ہے کہ پہلے پہلو یعنی یہ کہ حضرت زکریاؑ کا اس آواز کے رحمانی ہونے اور شیطانی نہ ہونے کے بارے میں تسلی و اطمینان کا خواہاں ہونا، کو اختیار نہ کرنے میں مفسرین کا احتیاطی رویہ اپنانا اس لئے ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا عصمت کے مقام پر فائز ہونا اس کا متقاضی ہے کہ وہ فرشتہ کے بیان اور شیطان کے وسوسہ کے درمیان تمیز کر لیتے ہوں یعنی انہیں اس سلسلہ میں کسی طرح کا شبہ ہرگز لاحق نہ ہو بلکہ یقینی طور پر وہ جانتے اور پہچانتے ہوں کہ یہ آواز کس کی ہے، ایسا نہیں کہ شیطان انہیں ورغلا سکے اور ان کے ساتھ ایسی چال چلے کہ اصل حقیقت کا فہم و ادراک ان کے لئے دشوار ہو جائے، یہ مطلب تو حق اور قطعی طور پر صحیح ہے لیکن یہ جاننا ضروری ہے کہ ان کی معرفت و آگاہی کا یہ مقام و مرتبہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آگاہی دلانے کی بناء پر ہے نہ کہ ان کی اپنی طرف سے اور ان کے ذاتی استقلال کی بنیاد پر ہے، تو اس صورت میں یہ کیوں کر جائز و درست نہ ہو کہ حضرت زکریاؑ اپنے پروردگار سے اس آگاہی کے حصول کی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے ان کے لئے کوئی نشانی قرار دینے کا کہیں؟ اس میں کیا حرج ہے؟ ہاں اگر ان کی دعا کو شرف قبولیت حاصل نہ ہوتا اور خداوند عالم ان کے لئے کوئی علامت و نشانی قرار نہ دیتا تو شاید اعتراض اپنی جگہ باقی رہ جاتا۔

اس کے علاوہ آیت مبارکہ کے متن سے ..... یعنی تین دن تک خاموشی اختیار کرنا ..... بھی اسی بات کی تائید و تصدیق بلکہ ثبوت ملتا ہے کیونکہ یہ بات مسلّم ہے کہ اگرچہ شیطان کا انبیاءؑ کے اجسام پر اثر انداز ہونا یا انبیاءؑ کے اہداف و مقاصد یعنی دین کی ترویج کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنا تاکہ لوگ ان سے دور رہیں یا ان کی تبلیغ کے نتیجہ میں دشمنانِ دین کمزور پڑیں، یہ سب کچھ ممکن ہے جیسا کہ اس کا ثبوت درج ذیل آیت میں پایا جاتا ہے:

سورۂ ص، آیت :۴۱

○ " وَاذْكُرْ عَبْدَنَآ اَيُّوْبَ ۘ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ "

(اور یاد کرو ہمارے بندے ایوب کو، جب اس نے اپنے رب کو پکارا کہ مجھے شیطان نے چھو لیا ہے سخت تکلیف اور اذیت کے ساتھ)

اس آیت میں شیطان کا حضرت ایوبؑ کو جسمانی طور پر آزار دینا واضح طور پر مذکور ہے۔

سورۂ حج، آیت :۵۲

○ " وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۭ "

(اور ہم نے آپ سے پہلے جو رسول اور نبی بھیجا اس نے جب بھی کچھ چاہا تو شیطان نے اس کی چاہت

میں خلل اندازی کی، تو اللہ نے شیطان کی خلل اندازی اور القاءات کو محو کر دیا، پھر خدا اپنی آیات کو مضبوط کرتا رہا)

اس آیت میں انبیاءؑ کی طرف سے ترویج دین کی بابت اٹھائے گئے اقدامات میں شیطان کی خلل اندازی کا تذکرہ ہوا ہے۔

سورۂ کہف، آیت : ۶۳

○ " فَاِنِّیۡ نَسِیۡتُ الۡحُوۡتَ ۫ وَمَاۤ اَنۡسٰنِیۡهُ اِلَّا الشَّیۡطٰنُ "

(میں مچھلی کو بھول گیا اور اسے نہیں بھلوایا مگر شیطان نے)

اس آیت میں شیطان کا انبیاء کے حافظہ پر اثر انداز ہونا مذکور ہے۔

مذکورہ بالا موارد میں شیطان کی انبیاء علیہم السلام کے اجسام مبارکہ تک رسائی اور ان پر اثر انداز ہونا ذکر کیا گیا ہے کہ جس کا نتیجہ انہیں جسمانی اذیت و تکلیف دینے کے سوا کچھ نہیں لیکن جہاں تک ان ہستیوں کے نفوس قدسیہ تک رسائی کا تعلق ہے تو وہ ہرگز ممکن نہیں کیونکہ وہ معصوم ہیں اور اس طرح کے شیطانی حملوں و تسلط سے محفوظ قرار دیئے گئے ہیں کہ اس سلسلہ میں انبیاء علیہم السلام کی عصمت کے اثبات کی بحث میں تفصیلی مطالب ذکر ہو چکے ہیں۔

اور جہاں تک حضرت زکریاؑ کے صاحب اولاد ہونے کی بابت نشانی قرار دیئے جانے کا تعلق ہے کہ جس کے متعلق یوں ارشاد حق تعالیٰ ہے :

" اٰیَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ اِلَّا رَمۡزًا ؕ وَاذۡكُرۡ رَّبَّكَ كَثِیۡرًا وَّسَبِّحۡ بِالۡعَشِیِّ وَالۡاِبۡكَارِ " (کہ تیری نشانی یہ ہے کہ لوگوں سے تین دن تک کلام نہ کر سوائے اشارہ کے، اور اپنے رب کو کثرت سے یاد کر اور صبح و شام تسبیح کرتا رہے) تو وہ اس بناء پر تھا کہ آنجنابؑ ان تین دنوں میں کسی سے بات کر ہی نہیں سکتے تھے اور ان کی زبان پر ذکر و تسبیح الٰہی کے سوا کچھ آ ہی نہ سکتا تھا، تو یہ نشانی نبی اللہ کی جان اور زبان پر واقع ہونے والا امر ہے اور ان کی ذات پر خاص تصرف اور اثر انداز ہونے کی ایک صورت ہے کہ اس طرح کا تصرف و اثر اندازی شیطان کے بس میں نہیں اور وہ انبیاءؑ کے نفوس قدسیہ تک اس طرح کی رسائی پر قادر ہی نہیں کیونکہ وہ ہستیاں معصوم ہیں......اور انہیں خدائی حفاظت حاصل ہے......لہٰذا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت زکریاؑ نے جو آواز سنی وہ شیطانی نہیں بلکہ خدائی و رحمانی تھی، اس بناء پر یہ آیت مبارکہ (وَقَالَ رَبِّ اجۡعَلۡ لِّیۡۤ اٰیَةً ......الخ" جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں......مذکورہ بالا دو پہلوؤں میں سے پہلے پہلو سے زیادہ موزونیت کی حامل ہے نہ کہ دوسرے پہلو سے !۔

طلب اولاد کے حوالہ سے ایک سوال اور اس کا جواب

اس مقام پر ممکن ہے یہ سوال کیا جائے کہ اگر حضرت زکریاؑ کا اپنے صاحب اولاد ہونے کے لئے کوئی نشانی طلب کرنا اس لئے تھا کہ مطمئن ہو جائیں کہ جو آواز انہوں نے سنی وہ شیطانی نہیں بلکہ خدائی تھی تو پھر انہوں نے فرزند کی خوشخبری سننے کے بعد تعجب کے ساتھ کیوں کہا: "رَبِّ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّ قَدْ بَلَغَنِیَ الْکِبَرُ وَامْرَاَتِیْ عَاقِرٌ" (پروردگارا ! میرے ہاں بچہ کیونکر پیدا ہوگا جبکہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے) کہ جس کے جواب میں خدا نے کہا: "کَذٰلِكَ اللّٰهُ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ "(اسی طرح خدا جو چاہتا ہے انجام دیتا ہے)، کیونکہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے پروردگار سے بات کی اور انہیں معلوم تھا کہ وہ خدا سے ہم کلام ہیں اور پھر انہوں نے جو کچھ مانگا اور اس کی بابت انہیں جو جواب ملا اس سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ خدا سے گفتگو کر رہے تھے، تو اگر انہیں شک تھا کہ جو آواز انہوں نے سنی ہے وہ کس کی ہے تو اس طرح گفتگو کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ اور اگر انہیں شک نہ تھا تو نشانی طلب کرنے کا کیا مطلب ؟

اس کے جواب میں ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ یہ جانتے تھے کہ کس سے مخاطب ہیں لیکن جاننے کے بھی مختلف درجات ہیں اور یہ ممکن ہے کہ انہیں اس آواز کے بارے میں بھرپور اعتماد و اطمینان ہو کہ وہ خدائی آواز ہے مگر اس کے باوجود وہ اپنے پروردگار سے بچے کی ولادت کی کیفیت کے بارے میں دریافت کرنا چاہتے ہوں کہ جس کی بابت انہیں تعجب لاحق ہوا کہ ان پر بڑھاپا طاری ہے اور ان کی زوجہ بانجھ ہو چکی ہے، اور انہیں اس اظہار تعجب کے جواب میں دوسری خدائی آواز کے ذریعے اطمینان دلایا گیا اور پھر وہ خدا سے درخواست کرنے لگے کہ ان کے لئے نشانی قرار دے جس سے ان کے اطمینان میں اضافہ ہو کہ جو آواز انہوں نے سنی وہ رحمانی تھی، اس مطلب کی تائید اس جملہ سے ہوتی ہے جس میں ارشاد ہوا: " فنادته الملائکة " (پھر اسے فرشتوں نے آواز دی) کیونکہ لفظ "ندا" عموماً دور سے سنی جانے والی آواز کو کہتے ہیں، اسی وجہ سے اونچی آواز کو بھی "ندا" کہا جاتا ہے (اونچا بولنا، پکارنا)، اور ہم اپنے روزمرہ کے استعمالات میں اونچی آواز سے بولنے والے کا مکانی طور پر دور رہنا سمجھتے ہیں نہ یہ کہ اس کا لغوی معنی یہی ہو، بلکہ اس کا اصل معنی آواز دینا ہے خواہ نزدیک سے ہو یا دور سے، اونچا ہو یا آہستہ ہو، چنانچہ اس کی ثبوتی گواہی درج ذیل آیت سے ملتی ہے جس میں حضرت زکریاؑ کے بارے میں ارشاد الٰہی ہے :

سورۂ مریم، آیت :۳

○ " اِذْ نَادٰی رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِیًّا"

(جب اس نے اپنے رب کو آواز دی، آہستہ آواز !)

اس آیت مبارکہ میں حضرت زکریا علیہ السلام کا اپنے پروردگار سے بات کرنے میں خدا کی بزرگی و رفعتِ شان اور عظمت مقام کے عملی احترام کا مظاہرہ خضوع وانکساری کے انداز میں ہونا مذکور ہے اور اس میں "نــدا" کو "خَفِيًّا" کی صفت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے لہٰذا " فـنـادتـه الـملائكة " سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت زکریاؑ نے جب وہ آواز سنی تو فرشتہ کو نہ دیکھ رہے تھے بلکہ ایک غیبی آواز سنی کہ کوئی ان سے بات کر رہا ہے۔

تین دن خاموش رہنے کا راز ؟

زیر بحث موضوع کی بابت بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ حضرت زکریاؑ کو حضرت یحییٰؑ کی ولادت کی نشانی کے طور پر تین دن تک کسی سے اشارہ کے علاوہ بات کرنے سے روکا جانا اس لئے تھا کہ وہ سب سے الگ تھلگ ہو کر صرف خداوند عالم کے ذکر و تسبیح میں مصروف ہوں اور ایسا نہیں کہ ان کی زبان کو بند کر دیا گیا کہ وہ بول ہی نہ سکیں، (اس مفسر نے اپنے قول ونظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہا:) حق بات یہ ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام کا نشانی طلب کرنا اس بنیاد پر تھا کہ طبع بشری اس امر کی متقاضی تھی کہ اپنے لئے اس خدائی عطیہ کے وقت سے آگاہ ہوں تا کہ وہ اطمینان قلب کے ساتھ اس کے بارے میں اپنے اہل خانہ کو خوشخبری دے سکیں لہٰذا انہوں نے اس کی کیفیت کے بارے میں پوچھا اور جب انہیں اس کا جواب دیا گیا تو انہوں نے اپنے پروردگار سے درخواست کی کہ ان کے لئے ایسی مخصوص عبادت قرار دیں جس سے وہ اس نعمت کا شکر ادا کر سکیں اور اس عبادت کا پورا ہونا مقصود کے حصول کی علامت ونشانی بن جائے، تو خداوند عالم نے انہیں حکم دیا کہ وہ تین دن تک لوگوں سے بات نہ کریں بلکہ اس مدت میں صبح وشام، ذکر و تسبیح خدا میں مصروف رہیں اور اگر لوگوں سے بات کرنا ناگزیر ہو تو اشاروں سے اپنا مقصود ظاہر کریں، چنانچہ انہوں نے اپنے اہل خانہ کو خدائی عطیہ کی خوشخبری تین دن گزرنے کے بعد دی۔

یہ تھا اس مفسر کا بیان! لیکن قارئین کرام! آپ بخوبی آگاہ ہیں کہ ان کے بیان میں مذکور مطالب کا زیر نظر آیت مبارکہ میں کہیں کوئی اشارہ تک نہیں ملتا، یعنی ان کا ادائے شکر کے لئے عبادت کی درخواست کرنا، تین دن کے بعد اس خدائی عنایت سے بہرہ ور ہونا، تین دنوں کے پورا ہونے کا نشانی وعلامت ہونا، جملہ "ان لـا تـكلم الناس......" (لوگوں سے بات نہ کرو......) کا خدا کی طرف سے تشریعی نہی کی صورت میں ہونا اور ان کے اپنے اہل خانہ کو خوشخبری دینے کا ارادہ کرنا، ان میں سے کسی کا بھی کوئی تذکرہ واشارہ آیت مبارکہ میں نہیں پایا جاتا۔

غیبی الہامات اور شیطانی خیالات کی اصل حقیقت اوران دونوں کی بابت اظہارات

پہلے بھی متعدد بار یہ مطلب بیان ہو چکا ہے کہ الفاظ جن معانی کے لئے بنائے جاتے ہیں ان میں وہ اغراض ملحوظ ہوتی ہیں جن سے اصل مقصود حاصل ہو سکے، چنانچہ لفظ "قول" اور "کلام" کو اس لئے آواز کہا جاتا ہے کہ وہ اس مقصد کو سننے والے تک پہنچا دیتا ہے جس کا متکلم نے ارادہ کیا ہو، اس بناء پر جو چیز بھی اس طرح کی خصوصیت وتاثیر کی حامل ہو اسے "کلام" اور "قول" کہا جائے گا خواہ وہ ایک آواز ہو یا کئی آوازیں ملی ہوئی ہوں اور یا آواز نہ ہو بلکہ اشارہ وغیرہ ہو، لہٰذا عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے کہ لوگ ہر اس آواز کو جس سے مقصود پوری طرح حاصل ہوتا ہو "کلام" کہنے میں دیر نہیں کرتے خواہ وہ آواز کسی کے بھی منہ سے نکلی ہو، اسی طرح اشارہ کو کلام سے موسوم کرتے ہیں خواہ وہ آواز پر مشتمل نہ بھی ہو۔

اسی معیار کے مطابق قرآن مجید بھی ان معانی کو جو شیطان، لوگوں کے دلوں میں ڈالتا ہے اس کا کلام وقول کہتے ہیں، چنانچہ اس سلسلہ میں خداوند عالم نے شیطان کا اپنا بیان اور اس کے اعمال کی بابت ارشاد فرمایا:

سورۂ نسآء، آیت :۱۱۹

o " وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ "

(اور میں ضرور انہیں حکم کروں گا تو وہ ضرور جانوروں کے کان چیر دیں گے)

اس میں "امر" یعنی حکم کا لفظ ذکر ہوا ہے۔

سورۂ حشر، آیت :۱۶

o " كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ "

(شیطان کی مانند کہ جب اس نے انسان سے کہا تو کفر اختیار کر)

اس میں "قول" یعنی کہنا، بات کرنا کہا گیا ہے۔

سورۂ الناس، آیت :۵

o " يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ "

(وہ لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے)

سورۂ انعام، آیت :۱۱۲

○ " یُوْحِیْ بَعْضُهُمْ اِلٰی بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ "

(وہ ایک دوسرے کو دل پسند باتیں بتاتے رہتے ہیں)

اس میں لفظ "یوحی" (بات بتانا، بات پہنچانا)...... القاء......، مذکور ہے۔

سورۂ ابراہیم، آیت :۲۲

○ " اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ "

(بے شک اللہ نے تمہارے ساتھ سچا وعدہ کیا ہے، اور میں نے بھی تمہارے ساتھ وعدہ کیا ہے)

اس میں شیطان کے اظہارات ذکر کیے گئے ہیں۔

سورۂ بقرہ، آیت :۲۶۸

○ " اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَیَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ وَاللّٰهُ یَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ "

(شیطان تم سے فقر کے وعدے کرتا ہے اور تمہیں برائی کا حکم دیتا ہے جبکہ اللہ تم سے اپنی مغفرت اور فضل وکرم کا وعدہ کرتا ہے، اور اللہ وسعت دینے والا، دانا ہے)

اس میں شیاطن کے القاءات کو وعدہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اور یہ بات واضح ہے کہ وہ سب کچھ جو شیطان کی طرف منسوب ہوا ہے وہ دلوں پر وارد ہونے والے خیالات کے سوا کچھ نہیں کہ جنہیں "امر"، "قول"، "وسوسہ"، "وحی" اور "وعدہ" سے موسوم کیا گیا ہے۔ تو یہ سب کچھ "قول" اور "کلام" ہے اگرچہ ان میں سے کوئی بھی منہ سے نکلا ہے نہ زبان ہلانے سے !

اسی بیان سے یہ مطلب بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ شیطان کے وعدۂ فقر کے مقابلے میں خدا نے مغفرت وفضل کا جو وعدہ کیا ہے وہ بھی کلام ہے کہ جسے فرشتہ کے ذریعے پیش کیا گیا ہے...... جبکہ وہ بھی زبان کی حرکت کے ذریعے اور منہ سے نکلے ہوئے الفاظ نہیں...... اور خداوند عالم نے اسے "حکمت" سے موسوم فرمایا ہے۔ اسی سے مشابہ دیگر موارد بھی ہیں بطور مثال درج ذیل آیات مبارکہ ملاحظہ ہوں :

سورۂ حدید، آیت :۲۸

○ " وَیَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ "

(اور وہ تمہارے لئے روشنی قرار دیتا ہے جس سے تم راستہ چلتے ہو)

سورۂ فتح، آیت :۴

○ " هُوَ الَّذِيٓ اَنۡزَلَ السَّكِيۡنَةَ فِيۡ قُلُوۡبِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ لِيَزۡدَادُوۡۤا اِيۡمَانًا مَّعَ اِيۡمَانِهِمۡ ؕ وَ لِلّٰهِ جُنُوۡدُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ "

(وہ کہ جس نے مؤمنین کے دلوں میں سکون ڈالا تا کہ ان کے ایمان میں اضافہ ہو، اور اللہ کے لئے ہیں آسمانوں اور زمین میں خاص لشکر۔)

لفظ "سکینت" کی بابت تفصیلی تذکرہ سورۂ بقرہ میں ہو چکا ہے، ملاحظہ ہو :سورۂ بقرہ، آیت ۲۴۸۔

سورۂ انعام، آیت :۱۲۵

○ " فَمَنۡ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنۡ يَّهۡدِيَهٗ يَشۡرَحۡ صَدۡرَهٗ لِلۡاِسۡلَامِ ۚ وَمَنۡ يُّرِدۡ اَنۡ يُّضِلَّهٗ يَجۡعَلۡ صَدۡرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ ؕ كَذٰلِكَ يَجۡعَلُ اللّٰهُ الرِّجۡسَ عَلَى الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۲۵﴾ "

(پس اللہ جسے ہدایت کرنا چاہتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے اور جسے گمراہ کرنا چاہتا ہے اس کا سینہ تنگ اور جکڑا ہوا کر دیتا ہے گویا کہ وہ آسمان کی طرف پرواز کر رہا ہے، اسی طرح اللہ ایمان نہ لانے والوں کے دلوں میں پلیدی ڈال دیتا ہے)

شیطانی وسوسہ کو "رِجۡزَ" سے بھی تعبیر کیا گیا ہے چنانچہ ارشاد ہوا:

سورۂ انفال، آیت :۱۱

○ " رِجۡزَ الشَّيۡطٰنِ "

(شیطان کا رجز)

ان تمام آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیاطین اور ملائکہ انسان سے ہمکلام ہوتے ہیں تو اسکے دل میں معانی القاء کر کے! نہ کہ زبان سے بول کر۔

یہاں ہمکلام ہونے کی ایک قسم اور بھی ہے جو کہ خداوند عالم کے ساتھ مخصوص ومختص ہے کہ جس کا ذکر درج ذیل آیت مبارکہ میں ہوا ہے:

سورۂ شوریٰ، آیت :۵۱

○ " وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنۡ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحۡيًا اَوۡ مِنۡ وَّرَآئِ حِجَابٍ "

(کسی بشر کو یہ مقام حاصل نہیں کہ خدا اس سے ہمکلام ہو سوائے بذریعہ وحی کے یا پردے کے پیچھے سے!)

اس آیت میں ہمکلام ہونے کی دو قسمیں بیان کی گئی ہیں، ایک کو "وحی" سے موسوم کیا گیا ہے کہ جس میں خدا اور

بندے کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہوتا، اور دوسری قسم یہ کہ جس میں بندے اور خدا کے درمیان حجاب ہوتا ہے۔

تو یہ ہیں ہمکلام ہونے کی قسمیں کہ جن میں سے بعض خداوند عالم سے مخصوص ہیں اور بعض فرشتوں سے اور بعض شیاطین سے !

اور خدا کا وہ کلام کہ جسے وحی سے موسوم کیا جاتا ہے وہ دیگر اقسام سے متمیز وممتاز اور مشخص ومتعین ہوتا ہے کہ جسے وہ بندہ کہ جس سے کلام ہوتا ہے جانتا وپہچانتا ہے کیونکہ خداوند عالم نے اپنے ہمکلام ہونے میں جو حجاب قرار دیا ہے اسے اٹھالیتا ہے اور پردے کے بغیر اپنے بندے سے ہمکلام ہوتا ہے لہٰذا یہ بات محال وناممکن ہے کہ اس کی بابت کوئی غلط فہمی پیدا ہو یعنی ایسا نہیں ہوسکتا کہ کوئی نبی ورسول اسے کسی دوسری چیز کے مشابہ سمجھنے لگے، لیکن جہاں تک خدا کے ہمکلام ہونے کی دوسری صورت کا تعلق ہے تو اس کی بابت دیگر قرائن کی ضرورت پڑتی ہے جس سے وحی کی درست شناخت ہوسکے۔

اور فرشتہ وشیطان کے ہمکلام ہونے کی بابت ہم نے جو آیات سطور بالا میں ذکر کی ہیں وہ ان کی پہچان وتشخیص میں کفایت کرتی ہیں، کیونکہ فرشتوں کے القاءات شرح صدر کے ساتھ جڑے ہوتے ہیں اور ان میں مغفرت وعنایت خداوندی کی طرف دعوت ہوتی ہے کہ جس کی بازگشت بالآخر ان دینی حقائق ومعارف کی طرف ہوتی ہے جو کتاب خدا اور سنت نبویؐ میں مذکور وموجود ہیں، جبکہ شیطانی القاءات ضیق الصدر (سینہ کی تنگی) اور نفس کے برے رجحان سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں کہ جو انسان کو نفسانی خواہشات کی پیروی کی دعوت دیتے ہیں، فقر وناداری سے دوچار ہونے کا خوف دل میں پیدا کرتے ہیں اور برائی کا حکم دیتے ہیں کہ ان سب کی بازگشت بالآخر ان معیاروں کی طرف ہوتی ہے جو کتاب وسنت سے عدم مطابقت اور فطرت سے منافات وبیگانگت رکھتے ہیں۔

اس مقام پر ایک اہم مطلب کا تذکرہ ضروری ہے اور وہ یہ کہ انبیاء اور ان کے ہم پلہ ومخلص ہمرکاب افراد کو ایسے مواقع میسر آتے ہیں جن میں وہ فرشتہ اور شیطان دونوں کا مشاہدہ کرتے ہیں اور انہیں پہچانتے ہیں جیسا کہ قرآن مجید میں حضرت آدمؑ، ابراہیمؑ اور لوطؑ کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ انہیں تشخص میں کسی اضافی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی تھی لیکن عدم مشاہدہ کی صورت میں دیگر مؤمنین کی طرح انہیں بھی اضافی ثبوت وقرینہ کی ضرورت یقینی طور پر ہوتی ہے کہ بالآخر اس کی بازگشت وحی کی تمیز وتشخیص کی طرف ہوتی ہے، بہرحال یہ ایک واضح معنی وروشن حقیقت ہے۔

روایات پر ایک نظر

دعائے عمران کی استجابت

تفسیر قمی میں آیت مبارکہ "واذ قالت امرأة عمران......" کی تفسیر میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد گرامی منقول ہے آپؑ نے فرمایا :

"ان اللّٰہ اوحٰی الٰی عمران انی واھب لک ذکراً سویاً مبارکاً یبرئ الاکمہ والابرص، ویحیی الموتٰی باذن اللہ، وجاعلہٗ رسولاً الٰی بنی اسرائیل، فحدث عمران امرأتہٗ حنة بذٰلک وھی ام مریم، فلما حملت کان حملھا بھا عند نفسھا غلاماً، فلما وضعتھا قالت رب انی وضعتھا انثٰی، ولیس الذکر کالانثٰی لا تکون البنت رسولاً، یقول اللّٰہ : واللہ اعلم بما وضعت فلما وھب اللّٰہ لمریم عیسٰی کان ھو الذی بشر بہٖ عمران ووعدہٗ ایاہ فاذا قلنا فی الرجل منا شیئاً وکان فی ولدہ او ولد ولدہ فلا تنکروا ذٰلک "

خداوند عالم نے ن کو وحی کی کہ میں تجھے ایک فرزند عطا کرنے والا ہوں جو لڑکا ہوگا اور صحیح وسالم ہوگا اور بابرکت ہوگا جو مادرزاد نابینا کو اور برص کے مریض کو صحت یاب کردے گا اور خدا کے اذن سے مردوں کو زندہ کرے گا اور اسے بنی اسرائیل کی طرف رسول بناؤں گا، جناب عمران نے یہ بات اپنی "حنہ" سے جو کہ مریم کی والدہ ہیں بیان کی، چنانچہ جب وہ حاملہ ہوئیں تو انہوں نے اپنے تئیں یہ سمجھا کہ ان کے شکم میں لڑکا ہے اور جب انہوں نے اسے جنا تو کہنے لگیں: پروردگارا ! یہ تو میں نے لڑکی جنی ہے اور لڑکا لڑکی جیسا نہیں ہوتا اور لڑکی تو رسول نہیں بن سکتی، خداوند عالم نے ان کے جواب میں ارشاد فرمایا: خدا بہتر جانتا ہے کہ اس (حنہ) نے کیا جنا ہے، اور پھر جب خداوند عالم نے حضرت مریم کو حضرت عیسیٰؑ سے نوازا تو معلوم ہوا کہ جس بچہ کی خوشخبری جناب عمران کو دی گئی تھی اور انہیں اس سے نوازے جانے کا وعدہ کیا گیا تھا وہ عیسیٰ ابن مریم ہی تھے، لہٰذا اب بھی اگر کسی شخص کے بارے میں کوئی پیش گوئی کی جائے اور وہ اس کی اولاد یا اولاد کی اولاد کی بابت ہو تو اس کا انکار یا اس پر تعجب نہ کیا جائے۔ (تفسیر قمی جلد ا ص ۱۰۱)

اس روایت سے قریب المعنی ایک راویت کافی میں امام جعفر صادقؑ سے اور تفسیر العیاشی میں امام محمد باقرؑ کے حوالہ سے ذکر کی گئی ہے۔

کلیسا میں ''آزاد کیئے گئے'' سے کیا مراد ہے ؟

تفسیر العیاشی میں آیت مبارکہ'' رب انی نذرت ما فی بطنی محررا '' کی تفسیر میں حضرت امام جعفر صادقؑ کا ارشاد گرامی منقول ہے کہ'' محرر'' یعنی جسے کلیسا میں آزاد کردیا جاتا ہے اس سے مراد وہ بچہ ہے جسے کلیسا سے باہر آنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی اور جب زوجہء عمران نے بچی کو جنا تو بارگاہ رب العزت میں عرض گزار ہوئیں کہ پروردگارا ! میں نے تو بچی جنی ہے اور بچہ بچی کی طرح نہیں ہوتا کیونکہ بچی کو حیض آتا ہے جس کی وجہ سے اس کا مسجد یعنی عبادگاہ سے باہر آنا ناگذیر ہوتا ہے جبکہ'' محرر'' کو عبادتگاہ سے باہر جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ نتیجتاً بچی کو'' محرر'' قرار نہیں دیا جاسکتا۔

(تفسیر العیاشی جلد ا ص ۱۷۱ ح ۳۹)

تفسیر العیاشی کی ایک روایت

تفسیر العیاشی میں امام جعفر صادقؑ اور امام محمد باقرؑ میں سے ایک کے حوالہ سے یہ روایت ذکر کی گئی ہے کہ زوجہء عمران نے منت مانی تھی کہ جو میرے شکم میں ہے اسے کلیسا میں عبادت گزاروں کی خدمت گاری کے لئے وقف کرتی ہوں، اور لڑکا خدمت گزاری میں لڑکی جیسا نہیں ہوتا، چنانچہ حضرت مریمؑ بالغ ہونے سے پہلے تک کلیسا میں خدمت گزاری کرتی رہیں اور جب سن بلوغ کو پہنچیں تو حضرت زکریاؑ نے انہیں حکم دیا کہ وہ کلیسا میں آنے والے عبادت گزاروں سے حجاب کریں۔

(تفسیر العیاشی، ج ا ص ۱۷۱ ح ۳۷)

مذکورہ بالا روایت جیسا کہ آپ ملاحظہ کررہے ہیں ہمارے سابقہ بیانات سے عین مطابقت رکھتی ہیں، البتہ ان سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ''وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثَىٰ'' (اور لڑکا لڑکی جیسا نہیں ہوتا) زوجۂ عمران کا بیان ہے نہ کہ خدا کا! لیکن اس صورت میں دو حوالوں سے اشکال باقی رہے گا: ایک یہ کہ اس میں لفظ'' الذَّكَرُ'' (لڑکا) کو لفظ'' الانثی'' (لڑکی) سے پہلے کیوں ذکر کیا گیا ہے جبکہ یہ عبری زبان کے قواعد کے خلاف ہے، اور دوسرا یہ کہ بچی کا نام'' مریم'' کیوں رکھا گیا؟ جبکہ'' مریم'' کا معنی آزاد کیا جانا ہے، البتہ اگر یہ کہا جائے کہ آزاد کئے جانے اور عبادتگاہ میں خادمہ قرار دیئے جانے میں فرق ہے تو اس صورت میں اشکال دور ہوسکتا ہے۔

اور پہلی روایت (تفسیر قمی ج ا ص ۱۰۱) میں حضرت عمران کی طرف وحی کیئے جانے کے الفاظ سے ان کے نبی ہونے کا ثبوتی اشارہ بھی پایا جاتا ہے، چنانچہ اس کی تائید درج ذیل روایت سے ہوتی ہے جس میں مذکورہ ہے کہ ابو بصیر نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ آیا عمران نبی تھے؟ تو امامؑ نے ارشاد فرمایا: ہاں، وہ نبی تھے اور انہیں ان کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا تھا، (ملاحظہ ہو: بحار الانوار ج ۱۴ ص ۲۰۲ ح ۱۴)

(عن ابی بصیر قال سألت ابا جعفر علیه السلام عن عمران أکان نبیاً، فقال: نعم، کان نبیاً مرسلاً الیٰ قومه......)

اور اس روایت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ زوجۂ عمران کا نام "حنہ" تھا اور یہی مشہور ہے، بعض روایات میں ان کا نام "مرثار" بھی ذکر ہوا ہے، تاہم اس سلسلہ میں مزید بحث ہمارے لئے زیادہ اہمیت کی حامل نہیں،

تفسیر قمی میں سابق الذکر روایت کے ذیل میں آیا ہے:

" فلما بلغت صارت فی المحراب، وارخت علیٰ نفسها ستراً، وکان لا یراها احد، وکان یدخل علیها ذکریا المحراب فیجد عندها فاکهة الصیف فی الشتاء وفاکهة الشتاء فی الصیف فکان یقول: انی لک هٰذا ؟ فتقول: هو من عند الله یرزق من یشاء بغیر حساب "

کہ جب مریمؑ سن بلوغ کو پہنچیں تو محراب عبادت میں آ گئیں اور اپنے اوپر پردہ ڈال لیا (پردہ کرنے لگیں) کہ کوئی انہیں دیکھ نہیں سکتا تھا، اور صرف حضرت زکریاؑ ان کے پاس محراب میں آتے تھے اور وہ جب بھی ان کے پاس آتے تو وہاں موسم گرما کے میوے موسم سرما میں اور موسم سرما کے میوے موسم گرما میں ان کے پاس دیکھتے اور ان سے پوچھتے تھے کہ یہ تیرے پاس کہاں سے آئے ہیں؟ تو وہ ان سے کہتیں تھیں: یہ خداوند عالم کی طرف سے ہیں اور خدا جسے چاہتا ہے بے حساب روزی عطا کرتا ہے۔

(تفسیر قمی جلد ا صفحہ ۱۰۱)

دعائے زکریاؑ اور ندائے ملائکہ

تفسیر العیاشیؒ میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا:

" ان زکریا لما دعا ربه، ان یهب لهٗ ولداً فنادته الملائکة بمانادته به احب ان یعلم ذٰلک الصوت من الله، فاوحی الیه ان آیة ذٰلک ان یمسک لسانهٗ عن الکلام ثلاثة ایام ،فلما

امسک لسانہ ولم یتکلم علم انہ لا یقدر علیٰ ذٰلک الا اللہ ، و ذٰلک قول اللّٰہ عزوجل : رب اجعل لی 'ایۃ "

حضرت زکریاؑ نے اپنے پروردگار سے استدعا کی کہ وہ اسے فرزند عطا کرے، تو فرشتوں نے انہیں ندا دی کہ جس کا ذکر قرآن میں موجود ہے، حضرت زکریاؑ نے چاہا کہ جانیں کہ وہ آواز خدا کی طرف سے ہے، تو خدا نے انہیں وحی کی کہ آپ کو جو خوشخبری دی گئی ہے اس کی خدا کی طرف سے ہونے کی نشانی یہ ہے کہ ان کی زبان تین دن تک بند ہو جائے گی، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور انہوں نے تین دن تک کسی سے کلام نہ کیا تو انہیں معلوم ہو گیا کہ وہ خوشخبری خدا کی طرف سے تھی کیونکہ ایسا کرنا خدا کے علاوہ کسی کے بس میں نہیں، یہ ہے خدا کے اس فرمان کا مطلب: "رب اجعل لی 'ایۃ "(پروردگارا! میرے لئے کوئی نشانی قرار دے)۔ (تفسیر العیاشی ج ۱ ص ۱۷۲ ح ۴۳)

اسی سے قریب المعنیٰ روایت تفسیر قمی میں ذکر ہوئی ہے (ملاحظہ ہو: تفسیر قمی ج ۱ ص ۱۰۱) اور قارئین کرام اس امر سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ آیات مبارکہ کے سیاق سے ان مطالب کی نفی نہیں ہوتی۔

لیکن بعض مفسرین ان روایات میں مذکور مطالب کا شدت سے انکار کرتے ہیں یعنی عمران کو وحی ہونا، محراب میں مریمؑ کے لئے غیر موسمی پھلوں کا پایا جانا اور زکریاؑ کا نشانی کے بارے میں اس لئے درخواست کرنا تا کہ واضح ہو جائے کہ جو آواز سنائی دی وہ خدائی تھی، ان امور کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ ان کی بابت کوئی ٹھوس دلیل موجود نہیں، نہ خدا نے ان کے بارے میں کچھ ارشاد فرمایا ہے اور نہ ہی رسول خداؐ نے کچھ اظہار کیا ہے، اور وہ ایسے امور بھی نہیں ہیں جن کی تصدیق عقل کے ذریعے ہو اور نہ ہی کسی معتبر تاریخ میں ان کا ثبوت ملتا ہے، اور اس سلسلہ میں چند اسرائیلی و غیر اسرائیلی روایتوں کے سوا کچھ نہیں، اور معانیٔ قرآن کے سمجھنے میں اس طرح کے ناقابل فہم امور کا سہارا لینے کی کوئی ضرورت بھی نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس مفسر کی اپنی باتیں بلا دلیل ہیں، اور مذکورہ بالا روایات اگرچہ اخبار الآحاد ہیں اور سند کے حوالہ سے ضعف سے مبرا نہیں اور نہ ہی ارباب تحقیق کو اس طرح کی روایات کا سہارا لینا ناگزیر اور ان میں مذکورہ مطالب سے استدلال کرنا ضروری ہے لیکن قرآنی آیات میں غور و فکر اور تدبر کرنا ان مطالب کے قرین صحت ہونے کی راہ دکھاتا ہے اور ان کی بابت آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی طرف سے جو بیانات وارد ہوئے ہیں ان میں کوئی بات ایسی نہیں جو عقل کے منافی یا عقلی اصولوں سے متصادم ہو، البتہ قدیم مفسرین میں سے بعض حضرات کی طرف سے کچھ مطالب ذکر کئے گئے ہیں جو کہ قرین قیاس نہیں بلکہ غیر معقول ہیں جیسا کہ قتادہ اور عکرمہ سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا کہ شیطان حضرت زکریاؑ کے پاس آیا اور انہیں اس خوشخبری کے بارے میں شک میں مبتلا کر دیا جو انہیں دی گئی تھی اور ان سے کہنے لگا کہ اگر یہ خوشخبری خدا کی طرف سے ہوتی تو جس طرح تو نے خدا سے مخفی و آہستہ آواز میں بات کی وہ بھی تجھ سے مخفی و آہستہ آواز میں بات کرتا، اس طرح شیطان نے

حضرت زکریاؑ کو اس خدا کے بارے میں شک میں مبتلا کر دیا، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے مطالب ہرگز درست نہیں اور کسی نبی کی شان و مرتبہ اس سے کہیں بلند ہے کہ شیطان انہیں خدائی آواز کے بارے میں شک میں مبتلا کر دے، یہ اسی طرح ہے جیسے انجیل لوقا میں مذکور ہے کہ جبریل نے زکریاؑ سے کہا کہ اب تو بول نہیں سکتا اور مقررہ وقت تک قوت گویائی سے محروم ہو گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ تو نے میری اس بات کی تصدیق نہیں کی جس کی صداقت بہ جلد ثابت ہو جائے گی، (انجیل لوقا، ا۔۲۰)

روایات پر ایک اور نظر

دل کے دو کان

کتاب کافی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا:

" ما من قلب الا ولهٗ اذنان، علٰی احدیهما ملک مرشد و علی الاخریٰ شیطان مفتن: هٰذه الشیطان یأمرهٗ بالمعاصی، والملک یزجرهٗ عنها، وذلک قول الله عزوجل: مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيدٌ "

ہر دل کے دو کان ہیں، ان میں سے ایک پر ہدایت کرنے والا فرشتہ بیٹھا ہوا ہے اور دوسرے پر فتنہ انگیز شیطان بیٹھا ہوا ہے، ایک اسے کچھ کرنے کا حکم دیتا ہے اور دوسرا اس سے منع کرتا ہے، شیطان اسے گناہوں کے ارتکاب کا حکم دیتا ہے جبکہ فرشتہ اسے ان سے منع کرتا ہے۔ تو یہی ہے اس آیت کا مطلب جس میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: انسان جب بھی کوئی بات کرتا ہے تو اس کے پاس ایک نگہبان اور ایک دشمن ہوتا ہے جو اس کے دائیں اور بائیں طرف بیٹھے ہوئے ہیں،...... سورۂ ق، آیت ۱۸......،

(کافی، ج ۲ ص ۲۶۶ ح ۱)

مذکورہ بالا مطالب پر مشتمل کثیر روایات موجود ہیں جن میں سے بعض عنقریب پیش کی جائیں گی، اور اس روایت (کافی ج ۲۔ص ۲۶۶ ح ۱) میں امامؑ نے آیت مبارکہ کی تطبیق میں فرشتہ اور شیطان کا جو تذکرہ کیا ہے وہ ان روایات سے منافی نہیں جن میں ہر انسان کے ساتھ دو فرشتوں کا موجود ہونا مذکور ہے کہ جن میں ایک نیک اعمال اور دوسرا برے اعمال رقم کرتا

ہے کیونکہ آیت مبارکہ سے اس سے زیادہ کچھ ثابت نہیں ہوتا کہ ہر شخص کے ساتھ ایک رقیب اور ایک عتید موجود ہوتا ہے جو اس کی ہر بات پر کڑی نظر رکھتا ہے، اور وہ انسان کے دائیں اور بائیں جانب مستقر ہیں، اور یہ کہ وہ دونوں فرشتے ہیں یا ایک فرشتہ اور ایک شیطان ہے تو اس سلسلہ میں آیت میں صراحت و وضاحت نہیں پائی جاتی لہٰذا اسے دونوں پہلوؤں پر منطبق کیا جا سکتا ہے۔

رسول اور نبی میں فرق

کتاب کافی میں زرارہ سے مروی ہے انہوں نے کہا:

" سألت ابا عبدالله عليه السلام عن الرسول و عن النبی و عن المحدث، قال: الرسول الذی يعاين الملک يأتيه بالرسالة من ربه يقول: يأمرک كذا و كذا، والرسول يكون نبياً مع الرسالة، والنبی لا يعاين الملک ينزل عليه الشيئ النباء علٰى قلبه فيكون كالمغمی عليه فيرى فی منامه، قلت: فما علمه الذی فی منامه حق ؟ قال: يبينه الله حتی يعلم ان ذلک حق، ولا يعاين الملک، الحديث "

میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ "رسول"، "نبی" اور "محدث" سے کیا مراد ہے؟ امامؑ نے ارشاد فرمایا: رسول اسے کہتے ہیں جو وحی لانے والے فرشتہ کو دیکھتا ہے اور اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فرشتہ اس کے پروردگار کی طرف سے اس کے لئے پیغام لایا ہے اور وہ فرشتہ اس سے گویا ہوتا ہے کہ تیرا پروردگار تجھے یہ حکم دیتا ہے اور یہ حکم دیتا ہے، تو رسول وہ نبی ہوتا ہے جس کے پاس رسالت کی ذمہ داری بھی ہوتی ہے، اور "نبی" اس فرشتہ کا مشاہدہ نہیں کرتا جو اس پر وحی لے کر نازل ہوتا ہے بلکہ وہ خدا کی طرف سے ملنے والی خبر کو اس کے دل میں ڈال دیتا ہے، چنانچہ اس کی حالت اس طرح ہو جاتی ہے جیسے وہ شخص جس پر بیہوشی طاری ہو، وہ اس حالت میں خواب میں وحی کا نظارہ کرتا ہے، (ابوبصیر نے کہا) میں نے پوچھا کہ اگر ایسا ہے تو اسے کس طرح معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ اس نے اپنے خواب میں دیکھا وہ حق ہے ؟ امامؑ نے ارشاد فرمایا کہ خداوند عالم اس پر واضح کر دیتا ہے کہ جو کچھ اس نے خواب میں دیکھا ہے وہ حق ہے، تاہم وہ فرشتہ کو نہیں دیکھتا، الخ۔

(کافی ج ۱ ص ۷۶ ح ۱۔۴)

اس روایت میں امام جعفر صادقؑ کا یہ فرمان کہ **"والرسول يكون نبياً مع الرسالة "** رسول وہ نبی ہوتا ہے جو رسالت کی ذمہ داری ساتھ لئے ہوتا ہے، اس میں اس مطلب کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ وہ دونوں صفتیں یکجا ہو سکتی

ہیں (یعنی ایک ہی شخص نبی اور رسول ہونے کے دونوں عہدوں کا حامل ہوسکتا ہے)، بہرحال سورۂ بقرہ کی آیت ۲۱۳" کَانَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً فَبَعَثَ اللّٰہُ ...... الخ " کی تفسیر میں رسالت ونبوت کی بابت تفصیلی تذکرہ ہوچکا ہے۔

اور امامؑ کا یہ فرمان کہ نبی، وحی نازل ہونے کے وقت اس شخص کی طرح ہوجاتا ہے جس پر غشی طاری ہوئی ہو، دراصل نبی کے خواب کی تفسیر ہے اور اس کا مطلب غیبی ادراک ہے نہ کہ خواب کا وہ معنی جو عام مشہور ہے۔

اور امامؑ کا یہ فرمان کہ" خدا اسے آگاہ کردیتا ہے اور اس پر واضح کردیتا ہے" تو اس سے مراد انبیاءؑ کا اس مقام پر فائز ہونا ہے کہ وہ فرشتہ اور شیطان کے القاء میں فرق وتمیز کرسکتے ہیں اور خداداد صلاحیت کی بناء پر حق کی تشخیص کرسکتے ہیں۔

بصائر الدرجات کی ایک روایت

کتاب بصائر الدرجات میں برید کے حوالہ سے امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادق علیہما السلام سے منقول ہے کہ برید نے پوچھا،" فما الرسول والنبی والمحدث؟ " کہ رسول، نبی اور محدث کسے کہتے ہیں؟ تو امامؑ نے ارشاد فرمایا:

" الرسول الذی یظھر الملک فیکلمہ، والنبی یریٰ فی المنام ، وربما اجتمعت النبوۃ والرسالۃ لواحد، والمحدث الذی یسمع الصوت ولایری الصورۃ " "

رسول اسے کہتے ہیں جس کے سامنے فرشتہ ظاہر ہوتا ہے اور وہ اس سے ہمکلام ہوتا ہے، اور" نبی" اسے کہتے ہیں جو خواب میں فرشتہ کو دیکھتا ہے اور گاہے ایسا ہوتا ہے کہ نبوت ورسالت ایک ہی شخص میں اکٹھی ہوجاتی ہیں، اور" محدث" اسے کہتے ہیں جو فرشتہ کی آواز سنتا ہے، لیکن فرشتہ کو نہیں دیکھتا، (برید نے کہا) میں نے پوچھا:

" اصلحک اللّٰہ، کیف یعلم ان الذی رأی فی المنام ھو الحق وانہ من الملک؟ "

خدا آپ کا بھلا کرے، وہ کس طرح جان لیتا ہے کہ جو کچھ اس نے خواب میں دیکھا ہے وہ حق ہے اور وہ کہ جس کی آواز سنی وہ فرشتہ ہے،

تو امامؑ نے جواب دیا:

" یوفق لذٰلک حتی یعرفہ لقد ختم اللّٰہ بکتابکم الکتب و بنبیکم الانبیاء "

خداوند عالم اسے اس کی توفیق عطا کرتا ہے جس کی بدولت وہ پہچان حاصل کرلیتا ہے، خدا نے تمہاری کتاب (قرآن) کے ذریعے کتب آسمانی کے سلسلہ کو تمام کردیا ہے اور تمہارے نبی (حضرت محمدؐ) کے ذریعے سلسلۂ نبوت کو اختتام پذیر کردیا، الخ، (بصائر الدرجات ص ۳۷۱ ح ۱۱)

یہ حدیث بھی سابق الذکر حدیث جیسی ہے اور اس میں امامؑ نے محدث کی پہچان کرواتے ہوئے جو الفاظ ذکر فرمائے اس سے محدث کی مکمل پہچان ہو جاتی ہے اور معلوم ہو جاتا ہے کہ محدث بھی غیبی آواز سن کر آواز دینے والے کو پہچان لیتا ہے،

اور امامؑ کا یہ فرمان کہ خداوند عالم نے قرآن کے ذریعے سلسلۂ کتب آسمانی کو اختتام پذیر کر دیا اور حضرت محمدؐ کے ذریعے سلسلۂ نبوت کو ختم کر دیا، اس سے اسی مطلب کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ قرآن و سنت تمام مطالب کے بیان و وضاحت کی بابت کفایت کرتے ہیں،

اور "محدث" کی بابت بعد میں ذکر کی جانے والی آیات مبارکہ کی تفسیر میں تفصیلی بحث ہوگی انشاء اللہ تعالیٰ،

آیات ۴۲ تا ۶۰

○ وَ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۲﴾

○ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾

○ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۪ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۴﴾

○ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖۗ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۴۵﴾ۙ

○ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۴۶﴾

○ قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۴۷﴾

○ وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ﴿۴۸﴾ۚ

○ وَرَسُولًا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ أَنِّي قَدْ جِئْتُكُم بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ ۖ أَنِّي أَخْلُقُ لَكُم مِّنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَأَنفُخُ فِيهِ فَيَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِ اللَّهِ ۖ وَأُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ وَأُحْيِي الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِ اللَّهِ ۖ وَأُنَبِّئُكُم بِمَا تَأْكُلُونَ وَمَا تَدَّخِرُونَ فِي بُيُوتِكُمْ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿۴۹﴾

○ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَلِأُحِلَّ لَكُم بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ ۚ وَجِئْتُكُم بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿۵۰﴾

○ إِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۗ هَٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ ﴿۵۱﴾

○ فَلَمَّا أَحَسَّ عِيسَىٰ مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ أَنصَارِي إِلَى اللَّهِ ۖ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنصَارُ اللَّهِ آمَنَّا بِاللَّهِ وَاشْهَدْ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ﴿۵۲﴾

○ رَبَّنَا آمَنَّا بِمَا أَنزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُولَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ ﴿۵۳﴾

○ وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللَّهُ ۖ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ ﴿۵۴﴾

○ إِذْ قَالَ اللَّهُ يَا عِيسَىٰ إِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۖ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيمَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ﴿۵۵﴾

○ فَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَأُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۖ وَمَا لَهُمْ مِّن نَّاصِرِينَ ﴿٥٦﴾

○ وَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَيُوَفِّيهِمْ أُجُورَهُمْ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ ﴿٥٧﴾

○ ذَٰلِكَ نَتْلُوهُ عَلَيْكَ مِنَ الْآيَاتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيمِ ﴿٥٨﴾

○ إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ ۖ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُن فَيَكُونُ ﴿٥٩﴾

○ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ فَلَا تَكُن مِّنَ الْمُمْتَرِينَ ﴿٦٠﴾

ترجمہ

O "(اس وقت کو یاد کرو) جب فرشتوں نے کہا: اے مریم! اللہ نے تجھے چن لیا ہے اور تجھے پاک بنایا ہے اور تجھے تمام عالمین کی عورتوں پر منتخب کرلیا ہے" (۴۲)

O "اے مریم! اپنے رب کے حضور خاکساری و فرمانبرداری کے ساتھ رہو، سجدہ ریز رہو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرتی رہو" (۴۳)

O "یہ غیبی خبریں ہیں جو ہم آپ پر وحی کررہے ہیں، آپ تو اس وقت وہاں موجود نہ تھے جب وہ قلمیں...... دریا میں...... پھینک کر...... قرعہ اندازی...... کررہے تھے کہ ان میں سے مریم کی کفالت کی ذمہ داری کسے ملتی ہے، اور نہ ہی آپ ان کے پاس اس وقت موجود تھے جب وہ اس سلسلہ میں آپس میں تنازع کررہے تھے" (۴۴)

O "(اور اس وقت کو یاد کرو) جب فرشتوں نے کہا: اے مریم! اللہ تجھے اپنی طرف سے ایک کلمہ (بچہ) عطا کئے جانے کی خوشخبری دیتا ہے جس کا نام عیسیٰ بن مریم ہوگا جو دنیا و آخرت میں عزت والا ہوگا اور مقرب بندوں میں سے ہوگا" (۴۵)

O "اور وہ لوگوں سے باتیں کرے گا جب وہ جھولے میں ہوگا اور جب وہ بوڑھا ہو جائے گا، اور وہ نیک و صالح افراد میں سے ہوگا" (۴۶)

○ " مریم نے...... حیرت سے...... کہا: پروردگارا! میرے ہاں بچہ کیونکر پیدا ہوگا جبکہ مجھے تو کسی انسان نے چھوا تک نہیں ہے، خدا نے کہا، اسی طرح خدا جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، وہ جب کسی کام کا ارادہ کر لیتا ہے تو اسے کہتا ہے: ہو جا، تو وہ ہو جاتا ہے " (۴۷)

○ " اور اللہ اسے کتاب و حکمت اور تورات و انجیل پڑھا دے گا " (۴۸)

○ " اور اسے بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا دے گا اور وہ ان سے کہے گا کہ میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے خاص نشانی (معجزہ) لے کر آیا ہوں، اور وہ یہ کہ میں تمہارے لئے گندھی ہوئی مٹی سے پرندہ جیسی ایک مورت بناتا ہوں اور اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے اصل پرندہ بن جائے گا اور میں اللہ کے عطا کردہ اختیار کے ساتھ مادر زاد نابینا کو بینا اور برص میں مبتلا شخص کو صحت یاب اور مُردوں کو زندہ کرتا ہوں، اور تمہیں بتا سکتا ہوں کہ تم کیا کچھ کھاتے ہو اور تم کیا کچھ اپنے گھروں میں ذخیرہ کرتے ہو، ان سب چیزوں میں تمہارے لئے واضح نشانی ہے بشرطیکہ تم ایمان والے بنو " (۴۹)

○ " اور میں اپنے سے پہلے آئی کتاب تورات کی تصدیق کرتا ہوں اور جو چیزیں تم پر حرام قرار دی گئی ہیں ان میں سے کچھ کو حلال کر دوں گا، اور میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے نشانی (اپنی نبوت کا معجزہ) لے کر آیا ہوں، لہٰذا تم تقوائے الٰہی اختیار کرو اور میری اطاعت و فرمانبرداری کرو " (۵۰)

○ " بے شک اللہ میرا پروردگار اور تمہارا پروردگار ہے، تم اسی کی عبادت کرو کہ یہی صراط مستقیم (حق کی سیدھی راہ) ہے " (۵۱)

○ " پھر جب عیسیٰ نے ان لوگوں (اپنی قوم) کی طرف سے کفر کے آثار محسوس کئے تو اعلان کیا کہ کون ہے جو خدا کے دین میں میرا مددگار بنے؟ حواریوں (عیسیٰ کے مخلص صحابہ) نے کہا: ہم دین خدا کی مدد کرتے ہیں، ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں اور آپ ہمارے خدا کے حضور سر تسلیم خم کر دینے پر گواہ ہوں " (۵۲)

○ " (انہوں نے) اظہار ایمان و نصرت کے بعد دعا کی) پروردگارا ! ہم تیرے بھیجے ہوئے دین پر ایمان لائے اور ہم نے رسول کی پیروی کی، اب ہمیں گواہی دینے والوں میں لکھ لے " (۵۳)

○ " لوگوں نے اپنی تدبیریں کیں اور اللہ نے اپنی تدبیر کی، اور خدا سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے " (۵۴)

○ " (اس وقت کو یاد کرو) جب اللہ نے کہا: اے عیسیٰ! اب میں تیری دنیاوی زندگی کی مدت پوری کر رہا ہوں اور تجھے اپنی طرف اٹھانے والا ہوں اور تمہیں ان کفر اختیار کرنے والوں کی آلودگی سے پاک کرنے والا ہوں اور میں تیرے پیروکاروں کو قیامت تک کافروں پر برتری دینے والا ہوں، پھر تم سب کی بازگشت میری طرف ہوگی اور میں ان چیزوں کے بارے میں فیصلہ کروں گا جن کی بابت تم آپس میں اختلاف رکھتے ہو " (۵۵)

○ " اور جن لوگوں نے کفر اختیار کیا انہیں دنیا و آخرت میں سخت عذاب میں مبتلا کروں گا کہ ان کا مددگار کوئی نہ ہوگا " (۵۶)

O " اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال انجام دیئے تو اللہ انہیں پورے اجر و جزا سے
نوازے گا کہ اللہ ظلم کرنے والوں کو ہرگز دوست نہیں رکھتا " (۵۷)

O " یہ سب جو ہم آپ کے سامنے پڑھتے ہیں واضح نشانیاں ہیں اور حکمت بھرا تذکرہ ہے " (۵۸)

O " یقیناً اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم جیسی ہے کہ جسے خدا نے خاک سے پیدا کیا
پھر اس نے کہا: ہو جا، تو وہ ہو گیا (وجود میں آ گیا) " (۵۹)

O " یہ سب حق ہے جو تیرے پروردگار کی طرف سے ہے، تو ہرگز شک کرنے والوں میں سے
نہ ہونا " (۶۰)

تفسیر و بیان

فرشتوں کا حضرت مریمؑ سے خطاب

○ " وَ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَ طَهَّرَكِ...... "
(اور جب فرشتوں نے کہا: اے مریم! اللہ تعالیٰ نے تجھے چن لیا ہے اور تجھے پاک بنایا ہے......)

یہ آیت سابقہ آیت (۳۵) " اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ...... " پر عطف ہے، نتیجتاً یہ آیت بھی آیت (۳۵) کی طرح ان آیات کی شرح و وضاحت کرتی ہے جن میں آل عمران کے برگزیدۂ خدا قرار دیئے جانے کا تذکرہ ہے یعنی آیات ۳۳ و ۳۴ (اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى...... الخ)۔

زیر نظر آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام " محدثہ " تھیں، فرشتے ان سے ہمکلام ہوتے تھے اور وہ ان کی باتیں سنتی تھیں جیسا کہ سورۂ مریم آیت ۱۷ " فَاَرْسَلْنَآ اِلَیْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِیًّا " (ہم نے اس کی طرف اپنی روح ...... روح القدس ...... کو بھیجا، وہ اس کے سامنے کامل انسان کی شکل میں ظاہر ہوا)، اور اس کے بعد والی آیات سے بھی اس مطلب کا ثبوت ملتا ہے، انشاء اللہ عنقریب " محدث " کے بارے میں تفصیلی تذکرہ ہوگا۔

گذشتہ صفحات میں آیت مبارکہ " فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ...... " (اس کے پروردگار نے اس کی دعا قبولیت کے اچھے طور پر قبول کی) کی تفسیر میں بیان ہو چکا ہے کہ اس میں حضرت مریمؑ کی والدہ کی اس دعا کو شرف قبولیت عطا کئے جانے کا تذکرہ ہے جس میں انہوں نے کہا: " وَ اِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ وَ اِنِّیْٓ اُعِیْذُهَا بِكَ وَ ذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ...... " (اور میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے اور میں اسے اور اس کی نسل کو شیطان مردود سے تیری پناہ میں دیتی ہوں) اور فرشتوں کا حضرت مریمؑ سے یہ کہنا: " اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَ طَهَّرَكِ...... " کہ اللہ نے تجھے چن لیا اور تجھے پاک بنایا) دراصل انہیں اس امر سے مطلع و آگاہ کرنے کے طور پر ہے کہ خداوند عالم کے نزدیک ان کی منزلت و

مقام کس قدر بلند ہے، (اس سلسلہ میں ان آیات کی تفسیر کی طرف رجوع کریں)۔

بہر حال حضرت مریمؑ کا اصطفاء اور ان کا خدا کی طرف سے چن لیا جانا دراصل ان کی عبادت الٰہی کی قبولیت سے عبارت ہے، اور ان کا پاک بنایا جانا ان کا خدا کی طرف عصمت کے مقام پر فائز ہونے کا دوسرا نام ہے، بنابرایں وہ اصطفاء اور عصمت دونوں خدائی اعزازات کی حامل ہیں، "(مصطفاۃ اور معصومہ ہیں"۔

حضرت مریمؑ کے پاک قرار دیئے جانے کی بابت ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ خدا نے انہیں "بتول" بنایا ہے کہ جسے خونِ حیض نہیں آتا، اور یہ اس لئے ہے تاکہ وہ حیض کی وجہ سے عبادتگاہ سے باہر جانے پر مجبور نہ ہو، اگرچہ اس قول میں بھی کوئی حرج نہیں لیکن جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے وہ آیات کے سیاق سے زیادہ موزوں ہے۔

نساء عالمین کی سرداری

○ "وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ"

(اور تجھے تمام جہانوں کی عورتوں پر چن لیا ہے)

سابقہ بیانات میں "اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى ...... تا ..... عَلَى الْعٰلَمِيْنَ" کی تفسیر میں یہ مطلب ذکر کیا جا چکا ہے کہ "اصطفاء" جب حرف "عَلَى" کے ساتھ متعدی ہو کر آئے تو تقدم کا معنی دیتا ہے، یعنی جسے چنا گیا ہے اسے دوسروں پر مقدم قرار دیا گیا ہے، اور وہ "اصطفاء" اس مطلق اصطفاء و برگزیدہ قرار دیئے جانے سے مختلف ہے کہ جسے حرف "عَلَى" کے بغیر ذکر کیا جاتا ہے کہ جس میں "تسلیم" کا معنی پایا جاتا ہے، بنابرایں حضرت مریمؑ کا تمام جہانوں کی عورتوں پر چن لیا جانا (ان میں سے برگزیدہ و منتخب کیا جانا) انہیں ان پر مقدم کئے جانے سے عبارت ہے، یعنی انہیں عالمین کی عوتوں پر تقدم عطا کیا گیا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ مقدم کیا جانا تمام جہات و ہر حوالہ سے ہے یا بعض جہتوں اور حوالوں سے؟

اس سلسلہ میں اس آیت کے بعد والی آیت کے جملہ "اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ....." (جب فرشتوں نے کہا اے مریم خدا تجھے خوشخبری دیتا ہے...)، اور سورۂ انبیاء کی آیت ۹۱ کے الفاظ "وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۱﴾" (اور وہ کہ جس نے اپنی شرمگاہ کی حفاظت کی، پھر ہم نے اس میں اپنی روح پھونک دی اور ہم نے اسے اور اس کے بیٹے کو عالمین کیلئے نشانی بنا دیا) اور

سورۂ تحریم کی آیت: ۱۲ "وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ" (اور یاد کرو مریم دختر عمران کو، کہ جس نے اپنی ناموس کی حفاظت کی (اپنی شرمگاہ کو پاکیزہ رکھا) تو ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی اور اس نے اپنے پروردگار کے کلمات اور کتابوں کی تصدیق کی اور وہ فرمانبرداری میں تھی) سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کی مخصوص صفات میں سے جو چیز حضرت مریمؑ کی امتیازی صفت قرار دی گئی وہ ان کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو منفرد انداز میں جنم دینا ہے، اور یہی وہ امتیازی خصوصیت ہے جس کی بناء پر انہیں تمام جہانوں کی عورتوں پر تقدم عطا کیا گیا ہے، یعنی ان کا اصطفاء تمام جہات سے نہیں بلکہ صرف ولادت عیسیٰ کی منفرد صورت کی بناء پر ہے، اور جہاں تک ان کے تذکرہ میں اصطفاء کے علاوہ دیگر صفات کے ذکر کا تعلق ہے مثلاً انہیں پاک بنایا جانا، ان کا کلمات الٰہی و کتب سماوی کی تصدیق کرنا، انکا قانتین و فرماں برداروں میں شمار ہونا، اور ان کا "محدثہ" ہونا، تو یہ امور صرف انہی سے مختص نہیں بلکہ ان کے علاوہ دوسری خواتین میں بھی پائے جاتے ہیں، اور بعض حضرات کا یہ کہنا کہ "وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ" سے ان کا اپنے زمانہ کی عورتوں میں سے منتخب و چنا جانا مراد ہے تو یہ آیت کے اطلاق کے منافی ہے لہٰذا اسے قرین صحت قرار نہیں دیا جاسکتا۔

حضرت مریمؑ کو فرماں برداری اور عبادت کا حکم

○ "يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ"

(اے مریم، اپنے پروردگار کی اطاعت و فرماں برداری کر، اور سجدہ ریز رہ اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرتی رہ!)

لفظ "قنوت" کہ جس سے فعل امر "اقْنُتِيْ" مشتق ہوا ہے اس کے معنی کی بابت کہا گیا ہے کہ اس سے مراد خضوع کے ساتھ فرماں برداری کرتے رہنا ہے۔

لفظ "سجدہ" کہ جس سے فعل امر "وَاسْجُدِيْ" بنا ہے اس کا معنی معروف اور سب کا جانا پہچانا ہے۔

لفظ "رکوع" کہ جس سے فعل امر "وَارْكَعِيْ" بنا ہے اس سے مراد خم ہونا یا ہر طرح سے خاکساری و فروتنی اور تابعداری کا عملی دم بھرنا ہے۔

اس آیت مبارکہ میں حضرت مریمؑ کو ندا دی گئی (یا مریم) اور چونکہ ندا دینا ندا دیئے گئے شخص کی تمام تر توجہ ندا دینے

والے کی طرف مرکوز کرنے کا موجب بنتا ہے لہٰذا جب بار بار ندا دی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ندا دیئے گئے شخص کو اس امر کی طرف متوجہ کیا جائے کہ اسے ندا دینے والے کی طرف سے کئی ایک امور سے باخبر کرنا مقصود ہے، آیت مبارکہ میں بھی یہی صورت پائی جاتی ہے ابو حضرت مریمؑ کو دو بار ندا دے کر اس امر کی طرف متوجہ کرنا مقصود ہے کہ ہمارے پاس تیرے لئے دو باتیں ہیں جن سے تجھے آگاہ کرنا ہے تو تو ان کو غور سے سن اور اپنی پوری توجہ ان کی طرف مبذول کر، وہ دو باتیں یہ ہیں:

(۱) خداوند عالم نے تجھے اس عظیم مقام و مرتبہ سے نوازا ہے جو تیرے لئے اس کے ہاں ہے۔

(۲) تجھ پر لازم ہے کہ اپنے فریضۂ عبدیت کو ادا کرتی رہے تاکہ خدا کے عطا کردہ مقام و منزلت کی عملی سپاس گزاری ہو، گویا بندگی کے فرائض کی ادائیگی (قنوت وسجدہ ورکوع) کا حکم جہاں عبدیت کے تقاضوں کو پورا کرنے سے تعلق رکھتا ہے وہاں خدا کی عطا کردہ منزلت و مرتبت کی نعمت کا شکر ادا کرنا بھی ہے۔

اس بناء پر آیت مبارکہ: "يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ" دراصل آیت مبارکہ: "يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ" کی فرع اور مربوط نتیجہ کے طور پر ہوگی اور اس کا معنی یوں کیا جائے گا: اب جبکہ خداوند عالم نے تجھے چن لیا ہے اور پاک بنایا ہے اور تمام جہانوں کی خواتین پر تقدم بخشا ہے تو اب تو اس نعمت پر اپنے رب کے حضور فروتنی کے ساتھ فرمانبرداری اور سجدہ و رکوع کرتی رہے،

اور یہ بعید نہیں کہ زیر نظر آیت مبارکہ میں جو تین صفاتی امور ذکر کئے گئے ہیں یعنی قنوت، سجدہ، رکوع، وہ ان تین اعزازات کے ساتھ ترتیبی ربط رکھتے ہوں یعنی قنوت (اقْنُتِيْ) اصطفاء کی فرع ہو (اصْطَفٰىكِ)، سجدہ (وَاسْجُدِيْ) پاک بنائے جانے کی فرع ہو (وَطَهَّرَكِ) اور رکوع (وَارْكَعِيْ) دوسرے اصطفاء کی فرع ہو (وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ)۔

البتہ یہ ربط نہایت خفی ہے اور اس کی بابت نہایت باریک بینی کی ضرورت ہے تاکہ ان میں سے ہر ایک کا دوسرے سے ربط واضح ہو سکے۔ (اس سلسلے میں تمام پہلوؤں سے آیات کی ترتیب و ترکیب اور جملہ بندی کی تمام کیفیتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کے درمیان پائے جانے والے ربط سے ممکن حد تک آگاہی حاصل ہو سکتی ہے اور آیت مبارکہ میں پائی جانے والی نہایت خوبصورت ہم آہنگی کے اسرار معلوم ہو سکتے ہیں)۔

غیبی خبروں سے آگاہی دلانا

○ " ذٰلِكَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡغَيۡبِ نُوۡحِيۡهِ اِلَيۡكَ "
(یہ غیبی خبریں ہیں جو ہم آپ کی طرف وحی کرتے ہیں)

خداوند عالم نے اس تاریخی تذکرہ کو غیبی خبروں میں شمار کیا ہے اور یہ اسی طرح سے ہے جیسے حضرت یوسفؑ کے واقعات کو غیبی خبروں کے طور پر حضرت پیغمبر اسلامؐ سے بیان کیا گیا، چنانچہ ارشاد ہوا:

سورۂ یوسف، آیت: ۱۰۲

○ " ذٰلِكَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡغَيۡبِ نُوۡحِيۡهِ اِلَيۡكَ‌ۚ وَمَا كُنۡتَ لَدَيۡهِمۡ اِذۡ اَجۡمَعُوۡۤا اَمۡرَهُمۡ وَهُمۡ يَمۡكُرُوۡنَ "

(یہ سب غیبی خبریں ہیں جو ہم آپ پر وحی کرتے ہیں اور آپ تو اس وقت ان کے پاس موجود نہ تھے جب وہ یوسف کے بارے میں فریب وسازش کر رہے تھے)

ان واقعات کی بابت جو مطالب اور معلومات اہل کتاب کے پاس ہیں وہ قابل اعتماد نہیں کیونکہ وہ تحریف کرنے والوں کی تحریفی کاروائیوں سے محفوظ نہیں رہیں جیسا کہ حضرت زکریاؑ کے تذکرہ میں جو تفصیلات اور اہم مطالب قرآن مجید میں مذکور ہیں وہ یہود ونصاریٰ کی کتب میں موجود نہیں۔ چنانچہ اس کا ثبوت آیت مبارکہ کے ذیلی جملہ ہی میں پایا جاتا ہے جس میں ارشاد خداوندی ہے: "وَمَا كُنۡتَ لَدَيۡهِمۡ اِذۡ يُلۡقُوۡنَ......" (اور آپ اس وقت ان کے پاس موجود نہ تھے جب وہ قرعہ اندازی کر رہے تھے......)، اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ اور آپ کی قوم ان واقعات کا مشاہداتی علم نہ رکھتے تھے اور نہ ہی کتابوں میں ان کی تفاصیل مذکور تھیں جنہیں وہ پڑھتے، جیسا کہ حضرت نوحؑ کے واقعہ کا تذکرہ کرنے کے بعد خداوند عالم نے حضرت پیغمبر اسلامؐ سے مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا:

سورۂ ہود، آیت: ۴۹

○ " تِلۡكَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡغَيۡبِ نُوۡحِيۡهَاۤ اِلَيۡكَ‌ۚ مَا كُنۡتَ تَعۡلَمُهَاۤ اَنۡتَ وَلَا قَوۡمُكَ مِنۡ قَبۡلِ هٰذَا "

(یہ غیبی خبریں ہیں جو ہم آپ کی طرف وحی کرتے ہیں کہ آپ اور نہ ہی آپ کی قوم اس سے پہلے ان سے باخبر نہ تھی)

البتہ بظاہر پہلی وجہ (یعنی ان واقعات کو غیبی خبروں سے موسوم اور تعبیر کرنا) آیت کے سیاق سے زیادہ موزونیت رکھتی ہے...... کیونکہ اس میں یہ نکتہ ملحوظ ہے کہ خدا نے ارشاد فرمایا: آپ اس وقت موجود نہ تھے، یہ نہیں فرمایا کہ آپ نے ان واقعات کو پڑھا ہی نہیں ہے......

مریمؑ کی کفالت کی بابت قرعہ اندازی

○ " وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُوْنَ أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ...... "
(اور آپ اس وقت ان کے پاس موجود نہ تھے جب وہ قرعہ اندازی کر رہے تھے کہ مریمؑ کی کفالت کون کرے)

آیت مبارکہ میں لفظ " اقلام " ذکر ہوا ہے (" أَقْلَامَهُمْ ")، یہ جمع کا صیغہ ہے اس کا مفرد "قَلَم" ......ق اور ل پر زبر کے ساتھ...... ہے، اس سے مراد وہ تیر ہے جو قرعہ اندازی میں استعمال ہوتا ہے، اسے عربی زبان میں "سہم" بھی کہتے ہیں، یہاں آیت میں "يُلْقُوْنَ أَقْلَامَهُمْ" کا معنی یہ ہے کہ وہ تیر پھینکتے تھے تاکہ ان کے ذریعہ قرعہ اندازی کر کے مریمؑ کی کفالت کرنے والے کا تعین کریں۔

اس آیت میں ان لوگوں کے درمیان باہمی نزاع و خصومت کہ جس کا تذکرہ جملہ "وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُوْنَ" میں ہوا ہے۔ اس سے مراد حضرت مریمؑ کی کفالت کی بابت ان کے درمیان پایا جانے والا اختلاف ہے کہ وہ اس سلسلہ میں اس قدر نزاع کا شکار ہو گئے کہ بالآخر انہیں قرعہ اندازی کے ذریعے مسئلہ کو حل کرنے پر اتفاق کرنا پڑا، چنانچہ انہوں نے قرعہ اندازی کی اور قرعہ جناب زکریاؑ کے نام پر نکلا اور انہوں نے حضرت مریمؑ کی کفالت کی ذمہ داری سنبھالی، اسی کا تذکرہ اس جملہ میں ہوا: "فکفلها زکریا......" (چنانچہ اس کی کفالت کی زکریا نے)۔

ایک احتمالی نظریہ اور اس کا جواب

" إِذْ يَخْتَصِمُوْنَ " میں جس خصومت و نزاع کا تذکرہ ہوا ہے اس کی بابت بعض مفسرین نے یہ رائے پیش کی ہے کہ عین ممکن ہے اس سے مراد یہ ہو کہ جب حضرت مریمؑ کا سن مبارک زیادہ ہو گیا اور وہ عالم طفولت سے تجاوز کر گئیں اور

حضرت زکریاؑ ان کی مزید کفالت کی ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے سے ناتواں ہوئے تو لوگوں نے حضرت مریمؑ کی کفالت کی بابت شدید اختلاف سے دوچار ہونے کے بعد قرعہ اندازی کا فیصلہ کیا، اس احتمالی نظریہ کا سبب یہ ہے کہ لوگوں کے باہمی نزاع اور قرعہ اندازی کے فیصلہ کا ذکر حضرت مریمؑ کی ولادت اور انہیں خواتین عالم پر چن لئے جانے اور اس دوران حضرت زکریاؑ کی طرف سے ان کی کفالت کی ذمہ داری سنبھالنے کے تذکرہ کے بعد ہوا جس سے اس بات کا امکان نظر آتا ہے کہ کفالت کا مسئلہ دوبار پیش آیا، پہلی بار اس وقت جب وہ ایام طفولت میں عبادت خانہ میں آئیں اور دوسری بار جب وہ بڑی ہوگئیں تو حضرت زکریاؑ نے اس ذمہ داری سے فارغ ہونا چاہا، دوسری بار قرعہ کے ذریعے حضرت زکریاؑ ہی کا نام اس کام کے لئے سامنے آیا اور انہوں نے اس ذمہ داری کو سنبھالا۔

جواب:

اس احتمالی نظریہ یا رائے کا جواب یہ ہے کہ کسی واقعہ کا ایک سورت میں دو مقامات پر ذکر کیا جانا اس امر کی دلیل نہیں بن سکتا کہ وہ واقعہ دوبار رونما ہوا ہے کیونکہ کسی واقعہ کی بعض خصوصیات کو دوبارہ ذکر کرنا یا اس سے متعلقہ کوئی بات دوسرے مقام پر بیان کرنا اس واقعہ کی مزید تاکید اور تاکیدی اثبات کے لئے بھی ہوتا ہے جیسا کہ حضرت یوسفؑ کے واقعہ کے تذکرہ میں ہوا ہے کہ اس کے کامل بیان کے بعد خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: " ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ " .....سورۂ یوسف، آیت ۱۰۲......(یہ غیبی خبروں میں سے ہے جسے ہم آپ کی طرف وحی کرتے ہیں، اور آپ اس وقت ان کے پاس موجود نہ تھے جب وہ باہم فیصلہ کر رہے تھے اور دھوکہ دہی میں مصروف تھے) جبکہ اس سے پہلے اس واقعہ کا تذکرہ آیات ۸، ۹ اور ۱۰ میں ہو چکا تھا۔ تو دوبارہ آیت ۱۰۲ میں اسے ذکر کرنا اس کی بعض خصوصیات کو بیان کرنے یا اصل واقعہ کی تاکید اور تاکیدی اثبات کی غرض سے ہے۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریمؑ کے حوالہ سے ان کی کفالت کے تذکرہ میں واقعہ کی بابت بعض خصوصیات کا ذکر مقصود ہے اور حضرت یوسفؑ کے حوالہ سے ان کے واقعہ کا تاکیدی اثبات مطلوب ہے، حضرت یوسفؑ کے واقعہ کی بابت ابتدائی تذکرہ میں یوں ارشاد ہوا: سورۂ یوسف، آیت ۱۰:

" اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ وَاَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيْنَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ...... لَا تَقْتُلُوْا يُوْسُفَ وَاَلْقُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ "

(جب انہوں نے کہا کہ یوسف اور اس کا بھائی ہم میں سے ہمارے باپ کی نظر میں زیادہ عزیز و پسندیدہ ہیں جبکہ ہم سب ایک جیسے بھائی ہیں...... یوسف کو قتل نہ کرو بلکہ اسے کسی گہرے کنویں میں ڈال دو کہ اسے کوئی قافلہ نکال باہر کر کے

لے جائے گا اگر تمہیں کچھ کرنا ہے تو!)

مریمؑ کو خدائی بشارت

○ " اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ......"

(جب فرشتوں نے کہا: اے مریم، خدا تجھے بشارت دیتا ہے......)

اس آیت میں حضرت مریمؑ کے لئے خدائی خوشخبری کا ذکر ہوا ہے، اور بظاہر اس سے مراد وہی خوشخبری ہے جس کا تذکرہ ایک اور مقام پر ان لفظوں میں ہوا:

سورۂ مریم، آیت :۱۹

○ " فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ﴿۱۷﴾ قَالَتْ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ﴿۱۸﴾ قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا......"

(تو ہم نے اس کی طرف اپنی روح بھیجی کہ جو مریم کے سامنے ایک کامل انسان کی صورت میں ظاہر ہوئی، مریم نے کہا کہ میں تجھ سے خدا کی پناہ چاہتی ہوں اگر تو متقی ہوتا تو یہاں نہ آتا، اس نے کہا (ہماری روح نے کہا) میں تیرے پروردگار کا پیام لایا ہوں تا کہ تجھے ایک پاکیزہ بچہ عطا کروں......)

تو جو بشارت وخوشخبری زیر بحث آیت مبارکہ میں ذکر ہوئی ہے اور جس کی نسبت فرشتوں کی طرف دی گئی ہے (اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ......) وہی بشارت وخوشخبری سورۂ مریم کی آیت میں صرف "روح" کی طرف منسوب ہے۔

زیر نظر آیت مبارکہ میں فرشتوں ("ملائکہ") کا لفظ کیوں ذکر ہوا، اس کی بابت مفسرین کرام نے مختلف آراء پیش کی ہیں، بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اصل میں اس سے مراد جناب جبریلؑ ہیں اور ان کے لئے لفظ "ملائکہ" ان کی تعظیم وتکریم کی بناء پر استعمال ہوا ہے، اور یہ بعینہٖ اسی طرح سے ہے جیسے عام طور پر کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص اپنے سفر میں کئی سواریوں پر سوار ہوا اور کئی کشتیوں پر سوار ہوا، جبکہ وہ صرف ایک سواری اور ایک کشتی پر سوار ہوا ہوتا ہے، یا عموماً یوں کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص کے بارے میں لوگ اس طرح کہتے ہیں، جبکہ کہنے والا شخص ایک ہوتا ہے مگر اس کی نسبت تمام لوگوں کی طرف دی جاتی ہے، بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ اس طرح کی لفظی تعبیرات کے مختلف ہونے کی مثال سابق الذکر واقعہ میں بھی ملتی ہے جس میں حضرت زکریاؑ کے حوالہ سے مذکور ہے: " فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ" (ملائکہ نے اسے آواز دی) پھر اس کے بعد ارشاد ہوا: " كَذٰلِكَ

اللهُ یَفعَلُ مَایَشَآءُ" (اس نے کہا خدا اس طرح ہی کرتا ہے جو چاہتا ہے)۔

بعض مفسرین نے کہا کہ لفظ ملائکہ اس لئے ذکر ہوا ہے کہ حضرت مریمؑ کو بشارت دینے میں حضرت جبریلؑ کے ساتھ دیگر فرشتے بھی موجود تھے۔

لیکن ملائکہ کے بارے میں نازل ہونے والی آیات مبارکہ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بارگاہ الٰہی میں قرب کے حوالہ سے ان کے درمیان فرق پایا جاتا ہے کہ ان میں کچھ مقدم ہیں اور کچھ مؤخر ہیں، جو مؤخر ہیں وہ مقدم فرشتوں کے اوامر کی پیروی اور سراپا ان کے پیچھے رہتے ہیں اور وہ اس طرح کہ مؤخر فرشتوں کا ہر کام بعینہٖ مقدم فرشتوں والا کام ہوتا ہے اور ان کی ہر بات مقدم فرشتوں والی بات ہی ہوتی ہے، گویا بعینہٖ اسی طرح سے جیسے ہم اپنے افعال کے بارے میں مشاہدہ کرتے ہیں اور یقین سے کہتے ہیں کہ یہ ہمارے افعال ہیں جبکہ وہ ہماری جسمانی قوتوں کے افعال تے ہیں اور ہمارے اعضاء و جوارح کے افعال ہوتے ہیں اور ہم انہیں دو طرح کے افعال نہیں کہتے، یعنی ایسا نہیں کہ ہماری جسمانی قوتوں کے افعال اور ہمارے اعضاء و جوارح کے افعال کو الگ قسموں میں تقسیم کیا جائے، چنانچہ کہا جاتا ہے :

"رأیته عینای" (میری آنکھوں نے اسے دیکھا)، اس میں دیکھنے کی نسبت آنکھوں کی طرف دی گئی ہے۔

"سمعته اذنای" (میرے کانوں نے اسے سنا)، اس میں سننے کی نسبت کانوں کی طرف دی گئی ہے۔

ان نسبتوں کے ساتھ ساتھ یوں بھی کہا جاتا ہے:

"رایتهٗ" (میں نے اسے دیکھا)، اس میں دیکھنے کو خود اپنی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

"سمعته" (میں نے اسے سنا)، اس میں سننے کو اپنی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

"فعلته جوارحی" (میرے اعضاء نے وہ کام کیا)، اس میں انجام دینے کی نسبت اعضاء کی طرف دی گئی ہے۔

"کتبته یدی" (میرے ہاتھ نے اسے لکھا)، اس میں لکھنے کی نسبت ہاتھ کی طرف دی گئی ہے۔

"رسمته انا ملی" (میری انگلیوں نے اس پر نشان لگائے)، اس میں نشان لگانے کی نسبت کانوں کی طرف دی گئی ہے۔ ان نسبتوں کے بارے میں یوں بھی کہا جاتا ہے:

"فعلتهٗ انا" (میں نے اسے انجام دیا)،

"کتبتهٗ انا" (میں نے اسے لکھا)۔

ان مثالوں میں اعضاء و جوارح کے افعال اور خود اپنے افعال کو دو طرح کے افعال نہیں کہا جاتا بلکہ وہ ایک ہی سرچشمہ سے مربوط ہوتے ہیں اور ایک ہی کہلاتے ہیں، اسی طرح مقدم فرشتوں کے افعال مؤخر فرشتوں سے مختلف نہیں

ہوتے بلکہ بعینہٖ وہی ہوتے ہیں ان کے درمیان کوئی تقسیمی فرق نہیں پایا جاتا اور نہ ہی ان کے اقوال کے درمیان کوئی تقسیمی فرق پایا جاتا ہے، گویا نہ تو مقدم فرشتوں کے افعال و اقوال مؤخر فرشتوں سے مختلف ہوتے ہیں اور نہ ہی مؤخر فرشتوں کے افعال و اقوال مقدم فرشتوں کے افعال و اقوال سے مختلف ہوتے ہیں، اور یہ بعینہٖ اسی طرح سے ہے جیسے تمام فرشتوں کے افعال دراصل خدائی افعال کہلاتے ہیں اور ان کے اقوال خدائی اقوال کہلاتے ہیں اس کی قرآنی مثالیں ملاحظہ ہوں:

سورۂ زمر، آیت :۴۲

○ " اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الۡاَنۡفُسَ حِیۡنَ مَوۡتِہَا "

(اللہ نفسوں کو پورا کرتا ہے۔۔ روحوں کو قبض کرتا ہے۔۔ ان کی موت کے وقت)

خدا نے اس آیت مبارکہ میں موت دینے کی نسبت خود اپنی طرف دی ہے۔

سورۂ سجدہ، آیت :۱۱

○ " قُلۡ یَتَوَفّٰىکُمۡ مَّلَکُ الۡمَوۡتِ الَّذِیۡ وُکِّلَ بِکُمۡ "

(کہہ دیجئے کہ تمہیں ملک الموت موت دیتا ہے وہ کہ جسے تم پر مقرر کیا گیا ہے)

اس آیت میں موت دینے کی نسبت ملک الموت کی طرف دی گئی ہے۔

سورۂ انعام، آیت :۶۱

○ " حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَحَدَکُمُ الۡمَوۡتُ تَوَفَّتۡہُ رُسُلُنَا "

(یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی ایک کی موت کا وقت آ پہنچتا ہے تو اسے ہمارے فرشتے موت دیتے ہیں)

اس آیت میں موت دینے کی نسبت تمام فرشتوں کی طرف دی گئی ہے۔

وحی کی بابت بھی صورتحال اسی طرح کی ہے کہ کسی جگہ اپنی طرف منسوب کر کے ذکر کیا اور کسی جگہ فرشتوں کی طرف نسبت دی، ملاحظہ ہو:

سورۂ نسآء، آیت :۱۶۳

○ " اِنَّاۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ "

(ہم نے آپ کی طرف وحی کی) اس میں وحی کرنے کی نسبت خداوند عالم نے اپنی طرف دی ہے۔

سورۂ شعراء، آیت :۱۹۴

○ " نَزَلَ بِہِ الرُّوۡحُ الۡاَمِیۡنُ ﴿۱۹۳﴾ عَلٰی قَلۡبِکَ "

(اسے روح الامین نے تیرے دل میں اتارا ہے) اس میں وحی کی نسبت حضرت جبریلؑ کی طرف دی

گئی ہے۔

سورۂ بقرہ، آیت :۹۷

○ " مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ "

(کون ہے جو جبریل کا دشمن ہے، وہی تو ہے جس نے قرآن کو تیرے دل پر اتارا ہے)

سورۂ عبس، آیت :۱۶

○ " كَلَّآ إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝١١ فَمَن شَآءَ ذَكَرَهُۥ ۝١٢ فِى صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۝١٣ مَّرْفُوعَةٍ مُّطَهَّرَةٍۭ ۝١٤ بِأَيْدِى سَفَرَةٍ ۝١٥ كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ ۝١٦ "

(ایسا ہرگز نہیں، یہ تو کھلی نصیحت ہے، جو چاہے اسے ذکر کرے، یہ نصیحت پاکیزہ صحیفوں میں ہے، جو کہ بلند مرتبہ و پاک ہیں، باعظمت و صالح نمائندوں کے ہاتھوں سے لکھی ہوئی ہے)

مذکورہ بالا آیات مبارکہ کے تناظر میں یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت جبریلؑ کا حضرت مریمؑ کو بشارت دینا ان کے زیر دست ملائکہ کا بشارت دینا ہی کہلاتا ہے کیونکہ یہ سرداران ملائکہ اور ان میں سے مقرب ترین فرشتوں میں سے ہیں جیسا کہ قرآن مجید میں ان کے بارے میں واضح الفاظ میں مذکور ہے:

سورۂ تکویر، آیت ۱۹ تا ۲۱:

○ " إِنَّهُۥ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ۝١٩ ذِى قُوَّةٍ عِندَ ذِى ٱلْعَرْشِ مَكِينٍ ۝٢٠ مُّطَاعٍ ثَمَّ أَمِينٍ "

(وہ بیان ہے ایک نمائندۂ الٰہی کا، جو باعظمت ہے، قوی ہے، عرش والے کے ہاں بلند رتبہ والا ہے، اس کی فرماں برداری کی جاتی ہے اور وہ امانت دار ہے)

ہمارے مذکورہ بیان کی تائید زیر بحث آیۂ مبارکہ کے بعد والی آیت سے ہوتی ہے جس میں ارشادِ حق تعالیٰ ہے:

"قَالَ كَذَٰلِكِ ٱللَّهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ" (اس نے کہا، اسی طرح خدا کرتا ہے جو چاہتا ہے) اس میں بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "قَالَ" (اس نے کہا) کا فاعل یعنی کہنے والا خداوند عالم ہے جبکہ یہی بات سورۂ مریم میں روح الامین کی طرف منسوب ہے۔ (ملاحظہ ہو)۔

سورۂ مریم، آیت :۲۱

○ " قَالَ إِنَّمَآ أَنَا۠ رَسُولُ رَبِّكِ لِأَهَبَ لَكِ غُلَٰمًا زَكِيًّا ۝١٩ قَالَتْ أَنَّىٰ يَكُونُ لِى غُلَٰمٌ وَلَمْ يَمْسَسْنِى بَشَرٌ وَلَمْ أَكُ بَغِيًّا ۝٢٠ قَالَ كَذَٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَىَّ هَيِّنٌ...... "

(اس نے کہا میں تیرے رب کا بھیجا ہوا نمائندہ ہوں تا کہ تجھے ایک پاکیزہ بچہ عطا کروں، مریم نے کہا میرے

ہاں بچہ کیونکر ہو سکتا ہے جبکہ مجھے کسی انسان نے چھوا ہی نہیں ہے اور نہ ہی میں معصیت کار ہوں، اس نے کہا ایسا ہی ہے، تیرا رب کہتا ہے کہ یہ کام میرے لئے آسان ہے)،

فرشتوں اور روح الامین کا حضرت مریمؑ سے گفتگو کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ وہ بی بی، محدثہ تھیں، بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ ان کے بارے میں سورۂ مریم میں واضح الفاظ موجود ہیں جن میں کہا گیا ہے: " فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا " (سورۂ مریم، آیت ۱۷)۔ ان لفظوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صرف فرشتوں کی آواز ہی نہیں سنتی تھیں بلکہ انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھتی بھی تھیں، اس موضوع کی بابت مزید مطالب عنقریب "روایات پر ایک نظر" میں پیش کئے جائیں گے، انشاء اللہ تعالیٰ،

کلمۂ خدا

○ " بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ "
(اپنے کلمہ سے کہ جس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہے)

خداوند عالم کے کلام کی بابت سورۂ بقرہ، آیت ۲۵۳ (تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ) کی تفسیر میں مربوطہ مطالب بیان ہو چکے ہیں۔

الفاظ " کلمة " اور " کلم "، " تمرة " اور " تمر " کی طرح ہیں۔ پہلا لفظ " کلمه، تمره " جنس کے لئے اور دوسرا لفظ " کلم، تمر " واحد مفرد کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

لفظ " کلمه " کبھی ایک بامعنی لفظ کے لئے استعمال ہوتا ہے اور کبھی پورے جملہ کو کلمہ کہا جاتا ہے خواہ وہ جملہ تامہ ہو یا ناقصہ، یعنی متکلم کا ادائے جملہ کے بعد خاموش ہو جانا صحیح ہو جیسے " زید قائم "، خواہ صحیح نہ ہو جیسے " ان کان زید قائماً "، یہ اس کی لغوی حیثیت ہے، اور جہاں تک اس کی قرآنی اصطلاح کا تعلق ہے یعنی وہ کلمہ جس کی نسبت خداوند عالم کی طرف ہے تو اس سے مراد ہر وہ شے ہے جس سے خدا کا ارادہ ظاہر ہو، یعنی ارادہ خداوندی کے مظہر کو " کلمه " کہتے ہیں، خواہ وہ کلمہ ایجاد و تکوین سے تعلق رکھتا ہو جیسے خدا کا کسی چیز کو جود عطا کرنے میں " کن " کہنا، یا وہ کلمۂ وحی والہام وغیرہ ہو۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ آیت مبارکہ میں " کلمة " سے کیا مراد ہے؟ تو اس سلسلہ میں مختلف اقوال ہیں مثلاً:

(۱) اس سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں کیونکہ ان سے ماقبل انبیاءؑ یا بالخصوص انبیاء بنی اسرائیل نے ان کے

بارے میں خوشخبری دی کہ وہ بنی اسرائیل کے نجات دہندہ بن کر آئیں گے، چنانچہ اس کے مشابہ مورد میں کہا جاتا ہے: "هذه کلمتي التي کنت اقولها" کہ یہ میرا کلمہ (کلام) ہے کہ جسے میں کہتا تھا، اور اس کی قرآنی مثال درج ذیل آیت میں بھی پائی جاتی ہے:

سورۂ اعراف، آیت: ۱۳۷

○ " وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ بِمَا صَبَرُوْا ۭ "

(اور تیرے پروردگار کا اچھا کلمہ پورا ہوا بنی اسرائیل کی بابت ان کے صبر کرنے کی وجہ سے!)

لیکن یہ قول درست نہیں کیونکہ اس کی تصدیق کتب عہدین سے تو ہو سکتی ہے مگر قرآن مجید میں اس حوالہ سے ثبوت فراہم نہیں ہوتا بلکہ قرآنِ مجید حضرت عیسیٰ ؑ کو خوشخبری دینے والا قرار دیتا ہے نہ کہ وہ کہ جس کے بارے میں خوشخبری دی گئی ہو، اس کے علاوہ آیت کے الفاظ " اسْمُهُ الْمَسِيحُ " بھی اس قول کی صحت کو یقینی نہیں بناتے کیونکہ ان الفاظ سے بظاہر یہ ثابت ہوتا ہے کہ " کلمہ " اس عیسیٰ ؑ کے ظہور کا عنوان ہے جس کے بارے میں پہلے خبر دی گئی نہ کہ خود عیسیٰ ؑ مراد ہیں، اور لفظ " اسْمُهُ الْمَسِيحُ " سے مراد یہ ہے کہ " مسیح " اس کلمہ کا نام ہے نہ کہ اس کا نام جس کے بارے میں لفظ "کلمہ" استعمال ہو چکا ہے۔

(۲) " کلمہ " سے مراد عیسیٰ ؑ ہیں کیونکہ وہی تورات کے ان معانی کو واضح طور پر بیان کرنے والے ہیں جو خداوند عالم نے اس میں مراد لئے ہیں، اور وہ ان حقائق کو آشکار کرنے والے ہیں جن کی بابت یہودیوں نے تحریفیں کیں اور دینی امور میں اختلاف پیدا کر دیا جیسا کہ اس سلسلہ میں خداوند عالم نے عیسیٰ ؑ کا قول ذکر کیا ہے جس میں انہوں نے بنی اسرائیل سے مخاطب ہو کر کہا: " وَلِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ " ......سورۂ زخرف، آیت ۶۳...... (اور میں ان چیزوں کو واضح کر دوں گا جن کی بابت تم آپس میں اختلاف رائے رکھتے ہو)۔

اس قول میں اگرچہ " کلمہ " کی بابت جو توجیہ و تاویل پائی جاتی ہے وہ درست نظر آتی ہے لیکن آیت مبارکہ میں کوئی ایسا قرینہ موجود نہیں جس سے اس توجیہ کی تصدیق و تائید ہو سکے۔

(۳) " کلمہ " سے مراد اصل خوشخبری ہے اور وہ یہ کہ حضرت مریم ؑ کو بتایا گیا کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ماں بننے والی ہیں اور آنجناب ؑ کی ولادت آپ ؑ کے بطن مبارک سے ہوگی، اس بناء پر جملہ "یبشرک بکلمة منه" (وہ تجھے اپنے کلمہ کی خوشخبری دیتا ہے) کا معنی یہ ہوگا کہ: " یبشرک ببشارة هي انک ستلدین عیسیٰ من غیر دون مس بشر " (وہ تجھے خوشخبری دیتا ہے کہ تو کسی بھی انسان سے مباشرت کے بغیر عیسیٰ کو جنم دے گی)۔

لیکن یہ قول بھی صحیح نہیں کیونکہ آیت کے ذیل میں ارشاد ہوا: " اسْمُهُ الْمَسِيحُ " (اس کا نام مسیح ہے)، لہٰذا

اس سے اصل خوشخبری مراد لینا قرین صحت نہیں۔

(۴) " کلمه " سے مراد حضرت عیسیٰؑ ہی ہیں کیونکہ وہی کلمۂ ایجاد ہیں یعنی وہ کلمۂ "کُن" کا مصداق ہیں، اورانہیں " کلمه " سے موسوم کرنے کی وجہ یہ ہے ہر انسان بلکہ ہر ذی وجود (موجودات عالم کا ہر فرد کلمۂ "کن" کا مصداق ہے اور اس کا وجود میں آنا خداوند عالم کے نظامِ تکوین کا مظہر بلکہ شاہکار ہے یعنی اسے لفظ "کن" کے ذریعے وجود عطا ہوا، اور چونکہ تمام موجودات اسی نظام سے وابستہ ہیں کہ ان کا وجود میں آنا ایک خاص کیفیت کے ساتھ ہوتا ہے، چنانچہ انسان کی پیدائش کی بابت جو عام طریقہ معین ہے وہ مرد و عورت کی مقاربت و مباشرت ہے جس کے ذریعے دونوں کے نطفوں کی آمیزش ہوتی ہے یعنی مرد کا نطفہ عورت کے نطفہ سے آمیختہ ہوتا ہے جس سے بچہ پیدا ہونے کی نسبت قائم ہوتی ہے، تو یہ اسی طرح سے ہے جیسے دیگر امور و اشیاء کی نسبت ان کے اسباب کی طرف ہوتی ہے، لیکن حضرت عیسیٰؑ کی بابت ایسا نہیں ہوا اور ان کی ولادت مرد و عورت کے نطفوں کی آمیزش کے نتیجہ میں نہیں ہوئی اور نہ ہی معمول کے دیگر اسباب کا اس میں عمل دخل تھا لہٰذا ان کا وجود پذیر ہونا ہر طرح کے عادی و مادی اسباب کی عملداری کے بغیر صرف اور صرف کلمۂ تکوین یعنی "کن" کے ذریعے ہوا تو اس لحاظ سے انہیں اصل " کلمه " (کن) کہنا درست ہے کہ وہ خود ہی " کلمه " ہیں چنانچہ اس کی تائید درج ذیل آیت مبارکہ سے بھی ہوتی ہے:

سورۂ نسآء، آیت: ۱۷۱

○ " وَكَلِمَتُهٗۤ اَلْقٰهَاۤ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ "

(اور وہ خدا کا کلمہ ہے جسے اس نے مریم پر القاء کیا ہے اور وہ اس کی روح ہے)

اس کے ساتھ ساتھ زیر بحث آیت مبارکہ کے تسلسل میں آخری آیت کے الفاظ سے بھی اس قول کی تائید ہوتی ہے جن میں کہا گیا ہے: " اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ " (خدا کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم جیسی ہے جسے خدا نے مٹی سے پیدا کیا پھر اس سے کہا: ہو جا، تو وہ ہو گیا)۔

یہ قول یا توجیہ و تاویل بظاہر دیگر اقوال و توجیہات میں سب سے بہتر ہے۔

تاہم اس موضوع کی بابت مزید غور و فکر کی ضرورت ہے اور آیات مبارکہ کے صدر و ذیل کے تناظر میں اصل حقائق سے آگاہی کا حصول ممکن ہے۔ م

لفظ "مسیح" کی بحث

لفظ "مسیح" کا معنی "مـمسـوح" (چھوا ہوا) ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اس نام سے موسوم کئے جانے کی بابت چند وجوہ قابل تصور ہیں:

(۱) وہ خیر و برکت کا مرقع تھے لہٰذا انہیں مسیح کے نام سے موسوم کرنا موزوں ہے۔

(۲) وہ تمام گناہوں سے پاک ہونے کی صفت کے حامل قرار دیئے گئے، اس لئے انہیں "مسیح" بمعنی ممسوح کہا جاتا ہے۔

(۳) زیتون کا تیل ان کے پورے بدن پر ملا گیا جس سے وہ بابرکت ہو گئے جیسا کہ دیگر انبیاء علیہم السلام زیتون کا تیل بدن پر لگاتے تھے۔

(۴) ان کی ولادت کے وقت حضرت جبریلؑ نے اپنا پر ان کے بدن سے مس کیا تا کہ وہ شیطان کے شر سے محفوظ رہیں۔

(۵) وہ ہمیشہ یتیموں کے سروں پر ہاتھ پھیرتے تھے لہٰذا انہیں مسیح کہا جاتا ہے۔

(۶) وہ نابینا افراد کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرتے تھے جس سے وہ بینا ہو جاتے تھے، اسی مناسبت سے انہیں مسیح کہا گیا۔

(۷) وہ جس بیمار شخص کے بدن پر ہاتھ پھیرتے تھا وہ شفایاب ہو جاتا تھا لہٰذا انہیں "مسیح" یا مسیحا کہا جانے لگا۔

یہ سب تاویلیں لفظ "مسیح" کی بابت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اس لفظ سے موسوم کرنے کے حوالہ سے ذکر کی گئی ہیں اور ان کی بابت مختلف دلائل بھی پیش کئے گئے ہیں لیکن اس حوالہ سے جو بات قابل توجہ ہے وہ یہ کہ یہ لفظ اس بشارت و خوشخبری کے ضمن میں موجود تھا جو حضرت جبریلؑ نے حضرت مریم علیہا السلام کو دی، چنانچہ قرآن مجید میں واضح الفاظ موجود ہیں: "اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ" (خدا تجھے اپنے کلمہ کی خوشخبری دیتا ہے کہ جس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہے) ان الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے قبل خداوند عالم نے انہیں "مسیح" سے موسوم فرمایا، تو اس لفظ کا تعلق نابینا شخص کو بینا کرنے یا بیمار شخص کو شفایاب کرنے سے نہیں......،

اور یہ لفظ (مسیح) جو کہ عربی زبان میں ہے عبرانی زبان میں "مشیحا" ہے، گویا عبرانی سے عربی میں مسیح ہوا ہے

جیسا کہ کتب العہدین سے ثابت ہے، یعنی ان میں مشیحا ذکر ہوا ہے۔

اور تاریخ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے ہاں رسم تھی کہ جب بھی ان کے بادشاہ کی تاجپوشی ہوتی تھی تو ان کے علماء اسے مقدس تیل لگاتے تھے (مسح کرتے تھے) تا کہ اس کی سلطنت بابرکت ہو، اس لحاظ سے اسے مسیحا (مشیحا) کہا جاتا تھا کہ جس کا معنی یا تو "بادشاہ" ہے یا "برکت والا" ہے۔

اور بنی اسرائیل کی کتب سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو اس لئے "مسیحا" سے موسوم کیا گیا کہ ان کی آمد کی خوشخبری میں ان کے حاکم ہونے کا حوالہ بھی موجود تھا اور یہ بھی مذکور تھا کہ عنقریب بنی اسرائیل میں ایک حاکم (بادشاہ) ظاہر ہوگا جو ان کا نجات دہندہ ہوگا، چنانچہ انجیل لوقا میں حضرت مریمؑ کی بشارت کے تذکرہ میں واضح طور پر بیان ہوا ہے کہ جب فرشتہ حضرت مریمؑ کے پاس آیا اور ان سے کہا: "**السلام علیک یا ممتلیة نعمة الرب معک مبارکة انت فی النساء**" سلام ہو آپ پر اے اپنے پروردگار کی نعمت سے سرشار ہستی، آپ خواتین میں برکت والی شخصیت ہیں، جب حضرت مریمؑ نے فرشتہ کو دیکھا تو اس کی بات سن کر ششدر رہ گئیں اور سوچ میں پڑ گئیں کہ اس سلام کا مطلب کیا ہے؟ فرشتہ نے کہا: "**لا تخا فی یا مریم فقد ظفرت بنعمة من عنداللّٰه وانت تحبلین و تلدین ابناً وتدعین اسمه یسوع، هٰذا یکون عظیماً وابن العلی یدعٰی و یعطیه الرب لهٗ کرسی داود ابیه و یملک علٰی بیت یعقوب الی الابد ولا یکون لملکه انقضاء**" آپ گھبرائیں نہیں اے مریم! آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نعمت سے بہرہ مند ہوئی ہیں، آپ حاملہ ہوں گی اور ایک بیٹا جنم دیں گی اور اس کا نام "یسوع" رکھیں گی، وہ بچہ عظیم ہستی بنے گا یہاں تک کہ اسے خدا کا بیٹا سمجھا جانے لگے گا اور اس کا پروردگار اسے اس کے باپ داؤد کی کرسئ سلطنت عطا کرے گا، وہ ابد تک بیت یعقوب پر حکمرانی کرے گا اور اس کی سلطنت کبھی ختم نہ ہوگی، (لوقا، ا۔ ۳۴)

انجیل لوقا میں مذکور اس بشارت کی وجہ سے یہودیوں نے حضرت عیسیٰؑ کی نبوت کو قبول کرنے میں لیت ولعل سے کام لیا کیونکہ اس بشارت میں ان کی سلطنت و حکمرانی کا حوالہ تھا کہ جس کی تطبیق حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نہ ہوتی تھی کیونکہ وہ اپنی دعوت الٰہی کے ایام میں اور اپنی زندگی بھر سلطنت و حکمرانی نہ پا سکے، (اس بناء پر یہودیوں نے کہا کہ خدائی بشارت میں جو بات ذکر ہوئی ہے وہ ان میں نہیں پائی جاتی لہٰذا یہ وہ شخص نہیں جس کے بارے میں بشارت آئی ہے)۔ چنانچہ اس بشارت کی توجیہ، تاویل کرتے ہوئے نصاریٰ اور ان کی پیروی میں بعض مسلمان مفسرین نے بھی کہہ دیا کہ ان کی سلطنت و حاکمیت سے مراد ظاہری حکمرانی نہیں بلکہ معنوی و روحانی حاکمیت مقصود ہے۔

یہ توجیہ و تاویل قرین صحت ہو سکتی ہے کیونکہ خدائی بشارت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو "مسیح" سے موسوم کیا گیا ہے جس کا معنی "برکت والا" ہے۔ کیونکہ بنی اسرائیل کے ہاں مقدس تیل لگایا جانا برکت کے حصول کے لئے ہوتا تھا، اور اس کی

تصدیق درج ذیل آیت مبارکہ سے بھی ہوتی ہے:

سورۂ مریم، آیت :۳۱

○ " قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰىنِیَ الْكِتٰبَ وَ جَعَلَنِیْ نَبِیًّا ۙ وَّ جَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا اَیْنَ مَا كُنْتُ "

(اس نے کہا میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب عطا کی اور مجھے نبی بنایا ہے اور میں جہاں بھی رہوں اس نے مجھے بابرکت بنایا ہے)

لفظ "عیسیٰ" کی وضاحت

آیت میں لفظ "عیسیٰ" ذکر ہوا ہے (اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ)، یہ اصل میں "یشوع" ہے، اس کا معنیٰ مخلص و نجات دہندہ کیا گیا ہے، بعض روایات میں اسے "یعیش" سے تفسیر کیا گیا ہے جس کا معنی ہے: زندہ رہے گا، اور یہ حضرت زکریاؑ کے فرزند کے نام سے مشابہت رکھنے سے موزوں نظر آتا ہے کیونکہ ان کا نام "یحییٰ" ہے جس کا معنیٰ: "زندہ رہے گا" ہے۔ اس حوالہ سے سابق الذکر مطالب میں بیان ہو چکا ہے کہ ان دونبیوں (حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ) کے درمیان کامل شباہت پائی جاتی ہے۔

اور آیت مبارکہ میں اگرچہ حضرت مریمؑ سے خطاب ہے اور انہیں ہی خدائی بشارت میں مخاطب قرار دیا گیا ہے لیکن اس کے باوجود حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ مریمؑ کا لفظ ذکر کیا گیا اور کہا گیا: اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ، (اس کا نام مسیح ہے جو عیسیٰ بن مریم ہے) تو اس کا مطلب اس امر سے آگاہی دلانا ہے کہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہوا ہے اور وہ اسی نسبت سے پہچانا جائے گا، اور مریمؑ اس اعجازی امر میں اس کی شریک ہیں، چنانچہ درج ذیل آیت اس سلسلہ میں واضح سند ہے:

سورۂ انبیاء، آیت :۹۱

○ " وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ "

(اور ہم نے اسے اور اس کے بیٹے کو عالمین کے لئے نشانی بنا دیا)

اس آیت میں دونوں (ماں، بیٹا) کو کائنات میں خدا کی قدرت کی نشانی قرار دیا گیا ہے۔

دنیا و آخرت میں عزت و تکریم

○ "وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ"

(دنیا اور آخرت میں با احترام، اور مقرب بندوں میں سے !)

وجاہت کا معنی مقبولیت ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دنیا میں مقبول ہونا ایک واضح امر ہے، اسی طرح آخرت میں بھی وہ مقبول ہوں گے چنانچہ اس سلسلہ میں قرآن مجید کی نص اور صریح بیان موجود ہے۔

اور ان کا مقربین میں سے ہونا بھی واضح حقیقت ہے کہ وہ اللہ کے نزدیک مقرب ہیں کیونکہ وہ اولیاء الٰہی کی صف میں داخل ہیں اور تقرب کے حوالہ سے ملائکہ مقربین کے ساتھ ان کا ذکر درج ذیل آیت میں ہوا ہے:

سورۂ نساء، آیت: ۱۷۲

○ "لَنْ يَسْتَنْكِفَ الْمَسِيحُ أَنْ يَكُونَ عَبْدًا لِلَّهِ وَلَا الْمَلَائِكَةُ الْمُقَرَّبُونَ"

(مسیح خدا کا عبد ہونے سے ہرگز سرتابی نہ کرے گا اور نہ ہی ملائکہ مقربین !)

اور تقرب کا معنی واضح کرتے ہوئے خداوند عالم نے سورۂ واقعہ آیات ۱۔۱۱ میں اس طرح ارشاد فرمایا:

○ "إِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ .... وَكُنْتُمْ أَزْوَاجًا ثَلَاثَةً .... وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ ⑩ أُولَٰئِكَ الْمُقَرَّبُونَ"

(جب قیامت آئے گی......اور تم تین گروہ ہوگے......اور جو سب سے پہلے ہیں وہی مقرب ہیں)

ان آیات مبارکہ سے ثابت ہوتا ہے کہ تقرب سے مراد تقرب الٰہی ہے یعنی بارگاہِ رب العزت میں مقرب ہونا مقصود ہے اور اس کی حقیقت یوں ہے کہ کوئی شخص خدا کے راستہ کی طرف پلٹ جانے کے عمل میں اپنے دیگر ہم نوع افراد پر سبقت لے جائے کہ اس عمل کا اختیار کرنا ہر انسان بلکہ ہر چیز پر فطرتاً لازم قرار دیا گیا ہے چنانچہ درج ذیل آیات مبارکہ میں اس حوالہ سے واضح اعلان موجود ہے:

سورۂ انشقاق، آیت: ۶

○ "يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَىٰ رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلَاقِيهِ"

(اے انسان! تو اپنے پروردگار تک پہنچنے میں کوشاں ہے تو ضرور اس کے حضور شرفیاب ہوگا)

سورہ شوریٰ، آیت :۵۳

○ "اَلَآ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ"

(یادرکھو، تمام امور کی بازگشت اللہ کی طرف ہے)

اگر آپ مذکورہ بالا آیات میں بخوبی غور وفکر کریں اور ان میں مذکور مقربین کی بابت توجہ کریں جو کہ انسان اور افراد ملائکہ کی صفت ہے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ضروری نہیں کہ یہ صفت اکتسابی مقام ومنزلت ہو کیونکہ فرشتوں کو خداوند عالم کے نزدیک جو مقام ومنزلت اور مرتبت حاصل ہے وہ ان کی اکتسابی نہیں کہ جس کی بناء پر ان میں سے کچھ افراد مقرب اور کچھ غیر مقرب قرار پائیں، شاید اس حوالہ سے یہ کہا جاسکے کہ مقرب بارگاہ الٰہی ہونا فرشتوں کی بابت خدائی عطا وعنایت سے ہو جبکہ انسان کی بابت اس کے عمل کی بنیاد پر ہے۔

یہاں ایک ادبی نکتہ قابل ذکر ہے اور وہ یہ کہ اس آیت میں درج ذیل چند جملے حالیہ ہیں:

(۱) "وَجِيْهًا فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ" (دنیا اور آخرت میں با احترام)

اور جو جملے اس کے بعد اس پر عطف ہوئے ہیں:

(۲) "وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ" (اور مقرب بندوں میں سے)

(۳) "وَيُكَلِّمُ" (اور وہ کلام کرتا ہے)

(۴) "وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ" (اور نیک لوگوں میں سے)

(۵) "وَيُعَلِّمُهُ" (اور وہ اسے تعلیم دیتا ہے)

(۶) "وَرَسُوْلًا" (اور رسول بنا کر)

بچپن اور بڑھاپے میں گویائی کا بیان

○ "وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِى الْمَهْدِ وَكَهْلًا"

(اور وہ گہوارہ میں رہتے ہوئے اور بڑھاپے میں لوگوں سے باتیں کرے گا)

"مھد" اس بستر کو کہتے ہیں جو شیر خوار بچہ کے لئے بنایا جاتا ہے (جھولا)

"کھــال" کہولت سے بنا ہے جس کا معنی بوڑھاپن ہے اور وہ جوانی و بڑھاپا کی درمیانی مدت کو کہتے ہیں (ختہ

سنی)، اور اس میں انسان کامل و مکمل اور طاقتور مرد بن چکا ہوتا ہے، اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ " کھل " اس شخص کو کہتے ہیں جس کی جوانی و پیری مخلوط ہو جائے، یہ بھی کہا گیا ہے کہ "کھل" اسے کہتے ہیں جس کا سن ۳۴ سال کا ہو۔

بہر حال آیت مبارکہ میں یہ ثبوت پایا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کہولت کے سن تک زندہ رہیں گے تو گویا یہ بات حضرت مریمؑ کے لئے دوسری خوشخبری تھی۔

اب جبکہ قرآن مجید میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سن کہولت تک پہنچنے کا صریح بیان موجود ہے لیکن تمام انجیلوں میں واضح طور پر مذکور ہے کہ آنجنابؑ ۳۳ برس سے زیادہ زندہ نہیں رہے تو اس میں مزید غور و فکر کی ضرورت ہے، چنانچہ اس حوالہ سے کہا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کا سن کہولت میں لوگوں سے باتیں کرنا، آسمان سے واپس آنے کے بعد ہے کیونکہ وہ آسمان پر جانے سے پہلے سن کہولت کو پہنچے ہی نہ تھے۔ اس سلسلہ میں ایک قول یہ بھی ہے کہ تاریخ کی کتب میں اس حوالہ سے اچھی طرح چھان بین اور تحقیق کے بعد ثابت ہوتا ہے کہ انجیلوں کی تصریحات کے برعکس آنجنابؑ نے تقریباً ۶۴ برس زمین میں زندگی گزاری۔

البتہ آیت مبارکہ میں جملہ (فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا) کے سیاق سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آنجنابؑ بڑھاپا کے سن کو نہ پہنچیں گے بلکہ کہولت کے سن تک زمین میں زندہ رہیں گے اور لوگوں سے ہم کلام ہونے کا دورانیہ بچپن سے بڑھاپے تک پہنچنے سے پہلے تک ہوگا یعنی اس کی ابتداء بچپن کے ایام اور انتہاء کہولت کے ایام ہیں۔

عام طور پر "بچہ کا گھوارہ میں ہونا" کا معنی یہ سمجھا جاتا ہے کہ پیدائش کے بعد اور چلنے پھرنے کے قابل ہونے سے پہلے کے دورانیہ میں اسے جھولے میں رکھا جاتا ہے یعنی دو سال کے لگ بھگ وہ جھولے میں ہوتا ہے اور اس کے بعد درست بات کرنے کا سن شروع ہوتا ہے، بنابراین بچہ کا جھولا میں کلام اور درست باتیں کرنا اگرچہ خارق العادت یعنی معجزاتی امر نہیں لیکن آیت مبارکہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ان کا جھولے میں رہنے کے دورانیہ میں مکمل کلام کرنا مذکور ہے کہ جسے عقلاء اسی طرح قابل اعتناء سمجھتے ہیں جس طرح سن کہولت میں کی جانے والی باتوں کو قابل اعتناء سمجھتے ہیں، دوسرے لفظوں میں یہ کہ آیت اس مطلب کو بیان کر رہی ہے کہ وہ لوگوں سے گھوارہ میں رہتے ہوئے اسی طرح باتیں کرے گا جس طرح سن کہولت میں ان سے باتیں کرے گا، اس کا جھولے میں رہتے ہوئے باتیں کرنا کہولت کے سن میں باتیں کرنے کی طرح ہوگا، تو ظاہر ہے کہ یہ بات معجزہ سے کم نہیں بلکہ یقیناً ایک خارق العادت امر ہے کہ بچہ دونوں دورانیہ میں یکساں صورت میں کلام کرے۔

اس کے علاوہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں نازل ہونے والی وہ آیات مبارکہ جو سورۂ مریم میں ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنجنابؑ نے اپنی ولادت کے بعد پہلی گھڑیوں ہی میں لوگوں سے کامل و درست کلام کیا جبکہ آپؑ ابھی

جھولے میں تھے، تو کسی بچہ کا اس لحہ کامل کلام کرنا یقینی طور پر معجزہ اور غیر معمولی و خارق العادت امر ہے، چنانچہ اس حوالہ سے درج ذیل آیات مبارکہ میں واضح وصریح لفظوں میں ان کا لوگوں سے ہمکلام ہونا مذکور ہے:

سورۂ مریم، آیات ۲۷ تا ۳۱:

○ " فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ؕ قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْـًٔا فَرِيًّا ﴿۲۷﴾ يٰۤاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا ﴿۲۸﴾ فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ ؕ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ﴿۲۹﴾ قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ؕ اٰتٰنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ﴿۳۰﴾ وَّ جَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ "

(وہ بچہ کو اٹھا کر اپنی قوم کے پاس آئی تو لوگوں نے کہا: اے مریم تو نے نہایت برا کام کیا ہے، اے ہارون کی بہن! نہ تو تیرا باپ برا آدمی تھا اور نہ ہی تیری ماں بدکار تھی، تو مریم نے بچے کی طرف اشارہ کیا، انہوں نے کہا ہم اس بچہ سے کیونکر بات کریں جو ابھی جھولے میں ہے، بچہ بول پڑا اور کہنے لگا: میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب دی اور مجھے نبی بنایا اور مجھے بابرکت قرار دیا میں جہاں کہیں بھی ہوں)

مریمؑ کا خوشخبری سننے کے بعد اظہاریہ

○ "قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ"

(اس نے کہا: پروردگارا! مجھے بیٹا کیونکر ہوگا جبکہ مجھے کسی انسان نے چھوا ہی نہیں)

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مریمؑ نے خدا سے بات کی جبکہ ان سے روح الامین مخاطب و ہم کلام ہوئے تھے اور انہوں نے بشارت دی تھی لیکن آپؑ نے روح الامین سے بات کرنے کی بجائے خدا سے براہ راست بات کی اور کہا: پروردگارا! میرے ہاں بیٹا کس طرح پیدا ہوگا جبکہ مجھے تو کسی بشر نے ہاتھ تک نہیں لگایا ہے، تو حضرت مریمؑ کا ایسا کرنا دراصل اسی بناء پر تھا جسے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ملائکہ اور روح الامین کا کلام کرنا حقیقت میں خدا کا کلام کرنا ہوتا ہے کیونکہ وہ خدا کے ترجمان ہیں اور حضرت مریمؑ اس امر سے پوری طرح آگاہ تھیں کہ حقیقت میں ان سے بات کرنے والا خدا ہے اور فرشتے یا روح الامین خدا کے نمائندے اور اس کے ترجمان کی حیثیت میں اس سے گویا ہوئے ہیں، لہٰذا حضرت مریمؑ نے ان کے جواب میں ان سے مخاطب ہونے کی بجائے "رب" کہہ کر خدا سے بات کی۔

تاہم اس سلسلہ میں ایک احتمالی رائے یہ بھی پیش کی گئی ہے کہ ممکن ہے حضرت مریمؑ کی بات اس استغاثہ وفریاد کی صورت میں ہو جو گفتگو و اظہارِ سخن کے درمیان میں ہوتی ہے جس طرح درج ذیل آیت میں ہے:

سورۂ مؤمنون، آیت :۹۹

o "قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ"

(وہ (کافر) کہے گا: پروردگارا! مجھے دنیا میں لوٹا دے)

خداوند عالم کا مریمؑ کو جواب

o "قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۭ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ"

(اس نے کہا کہ اسی طرح خدا جو چاہتا ہے انجام دیتا ہے، جب وہ کسی چیز کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اس سے کہتا ہے: ہو جا، وہ ہو جاتی ہے)

گزشتہ صفحات میں اس امر کی طرف اشارہ ہو چکا ہے کہ اس آیت کی، سورۂ مریم کی آیت ۲۱ پر تطبیق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ لفظ "كَذٰلِكِ" ایک مکمل جملہ ہے، کیونکہ سورۂ مریم میں ارشاد ہوا:

o "قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا"

(اس نے کہا ایسا ہی ہے، تیرا رب کہتا ہے کہ وہ میرے لئے نہایت آسان کام ہے، اور وہ اس لئے بھی ہے کہ ہم اسے لوگوں کے لیے نشانی اور اپنی طرف سے رحمت بنائیں اور یہ کام فیصلہ شدہ ہے)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ "كَذٰلِكِ" دراصل "الامر کذلک" ہے جس کا معنی یہ ہے: (صورتحال یہی ہے، ایسا ہی ہے، ایسا ہی ہوگا، ایسا ہی ہوتا ہے)، بات بالکل یہی ہے اور جو تجھے خوشخبری دی گئی ہے وہ طے شدہ فیصلہ ہے کہ جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔

اور جہاں تک اس کی بابت تعجب کا تعلق ہے تو وہ اس صورت میں درست قرار پائے گا جب خدا ایسا کرنے پر قادر نہ ہو یا اس کے لئے ایسا کرنا دشوار ہو، اور جہاں تک خدا کی قدرت کا تعلق ہے تو وہ لامحدود ہے اور وہ جو چاہتا ہے انجام دیتا ہے، اور جہاں تک اس کام کے دشوار و مشکل ہونے کا تعلق ہے تو وہ اس صورت میں قابل تصور ہے جب وہ کام اسباب و

وسائل کا محتاج ہو اور جس قدر اسباب زیادہ ہوں اتنا ہی وہ کام دشوار ہوگا کیونکہ جب تک تمام اسباب مہیا و میسر نہ ہوں اس کام کی انجام پذیری کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا جبکہ خداوند عالم کی بابت اس طرح کی حالتیں و کیفیتیں تصور نہیں کی جا سکتیں کیونکہ وہ جو کچھ خلق کرتا ہے وہ اسباب و وسائل کے ذریعے خلق نہیں کرتا بلکہ اس کا نظامِ تخلیق ایسا ہے کہ وہ جس کی خلقت کا فیصلہ کر لیتا ہے اس سے کہتا ہے "ہوجا" تو وہ وجود پذیر ہو جاتی ہے (اِذَا قَضٰۤی اَمۡرًا فَاِنَّمَا یَقُوۡلُ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ)

تو معلوم ہوا کہ لفظ "کَذٰلِکِ" اصل میں مکمل کلام ہے اور اس سے مقصود یہ ہے کہ حضرت مریمؑ کی اضطرابی کیفیت اور ان کے دل میں پیدا ہونے والی حیرت آمیز صورتحال کو ختم کیا جائے چنانچہ جملہ "اللّٰہُ یَخۡلُقُ مَا یَشَآءُ" کے ذریعے بچہ کی پیدائش کی بابت حضرت مریمؑ کے دل میں تعجب و حیرت کی جو کیفیت پیدا ہوئی اس سے خدا کی قدرتِ تخلیق کی بابت کسی طرح کے عجز و ناتوانی کا تصور پیدا نہ ہونے پائے، اور جملہ "اِذَا قَضٰۤی......" کے ذریعے بغیر باپ کے بیٹا پیدا کرنے کے دشوار و مشکل ہونے کے موہوم تصور کو دور کرنا مقصود ہے۔

حضرت عیسیٰؑ کو خدائی تعلیم

○ " وَیُعَلِّمُہُ الۡکِتٰبَ وَالۡحِکۡمَۃَ وَالتَّوۡرٰىۃَ وَالۡاِنۡجِیۡلَ "
(اور وہ اسے کتاب و حکمت اور تورات و انجیل کی تعلیم دے گا)

یہاں لفظ کتاب اور حکمت پر الف و لام (الۡکِتٰبَ، الۡحِکۡمَۃَ) جنس کا معنی دیتا ہے، اور پہلے بیان ہو چکا ہے کہ "کتاب" سے مراد وہ وحی ہے جو لوگوں کے درمیان پائے جانے والے اختلاف کو دور کرنے کے لئے نازل ہوئی، اور "حکمت" (دانائی) سے مراد وہ معرفت ہے جو لوگوں کے اعتقادات و اعمال میں مفید ہو۔

بنابرایں آیت میں تورات و انجیل کو کتاب و حکمت کی طرف عطف کرنا اور کتاب و حکمت کے ذکر کے بعد ان دو کا صراحت کے ساتھ نام لینا جبکہ وہ دو کتابیں ہیں جو حکمت پر مشتمل ہیں دراصل جنس کے ذکر کے بعد اس کے افراد کے ذکر کے طور پر ہے اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب کسی فرد یا افراد کا ذکر کرنا خاص اہمیت کا حامل ہو۔

یہ بات یاد رہے کہ لفظ "الۡکِتٰبَ" پر الف و لام، استغراق کے لئے نہیں (استغراق کا مطلب عمومیت اور تمام افراد و مصادیق کا اس کے دائرے میں قرار پانا ہے، اگر یہاں الف و لام کو استغراق کے معنی میں لیں تو اس کا مطلب تمام کتابوں کی تعلیم دینا ہوگا جبکہ یہاں یہ بات ملحوظ و مقصود نہیں) کیونکہ اس صورت میں درج ذیل آیات سے عدم مطابقت لازم

آئے گی جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اس طرح ارشاد ہوا :

سورۂ زخرف، آیت : ۶۳

O "وَلَمَّا جَآءَ عِيسَىٰ بِالْبَيِّنٰتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِأُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي تَخْتَلِفُونَ فِيهِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُونِ "

(اور جب عیسیٰ واضح دلائل ونشانیوں کے ساتھ آئے تو انہوں نے کہا: میں تمہارے پاس حکمت لایا ہوں اور میرا مقصد یہ ہے کہ میں ان بعض امور کو واضح کردوں جن کے بارے میں تم آپس میں اختلاف رکھتے ہو، پس تم تقوائے الٰہی اختیار کرو اور میری اطاعت کرو)

اس موضوع کی بابت تفصیلی بحث پہلے ہو چکی ہے۔

تورات کے بارے میں قرآنی بیان

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ تورات کے بارے میں قرآن کیا کہتا ہے اور اس سے کیا مراد لیتا ہے؟ تو اس سلسلہ میں آیات مبارکہ سے ثابت ہوتا ہے کہ تورات وہی ہے جسے خداوند عالم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر میقات میں الواح میں نازل فرمایا، چنانچہ اس کا تذکرہ سورۂ اعراف میں تفصیلی طور پر موجود ہے۔

اور جو تورات اس وقت یہودیوں کے پاس ہے کہ جو اسفار کی صورت میں معروف ہے اس کی تصدیق وتائید قرآن مجید سے نہیں ہوتی بلکہ وہ خود اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ان اسفار کا سلسلۂ سند حضرت موسیٰ علیہ السلام تک نہیں پہنچتا اور وہ بابل کے ایک بادشاہ "بخت نصر" اور فارس کے ایک بادشاہ کورش کی سلطنتوں کی درمیانی مدت ہی میں منقطع ہو گیا تھا، لیکن اس کے باوجود قرآن مجید اس امر کی تصدیق کرتا ہے کہ جو تورات یہودیوں کے پاس عصر نبویؐ میں تھی وہ اصل تورات سے مکمل طور پر مختلف نہیں، اگرچہ اس میں تحریف کاروں نے اپنے کارنامے دکھائے ہیں اور وہ ان کے تحریفی حملوں سے محفوظ نہیں رہ سکی لیکن اسے کلی طور پر اصل تورات سے فرق کا حامل قرار نہیں دیا جا سکتا، چنانچہ اس حوالہ سے قرآنی آیات مبارکہ میں واضح دلالت اور صریح بیان موجود ہے کہ موجودہ تورات میں تحریف ہوئی ہے۔

انجیل کے بارے میں قرآنی موقف

انجیل کہ جس کا معنی بشارت وخوشخبری ہے اس کی بابت قرآنی آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک ہی کتاب تھی جو حضرت عیسیٰؑ بن مریمؑ پر نازل ہوئی اور وہ وحی تھی جو انہی حضرتؑ سے مختص تھی، چنانچہ درج ذیل آیت میں اس طرح ذکر ہوا:

سورۂ آل عمران، آیت :۴

○ " وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ "

(اور اس نے نازل کی تورات اور انجیل اس سے پہلے، جو کہ لوگوں کے لئے سرچشمہء ہدایت ہے)

اور جہاں تک ان چار انجیلوں کا تعلق ہے جو متی، مرقس، لوقا اور یوحنا کی طرف منسوب ہیں تو وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد تالیف کی جانے والی کتابیں ہیں۔

اور قرآنی آیات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ دینی احکام صرف تورات میں مذکور ہیں اور انجیل میں صرف چند ناسخ احکام ذکر ہوئے ہیں، چنانچہ اس سلسلہ کی آیات میں سے ایک یہ ہے:

سورۂ آل عمران، آیت :۵۰

○ " مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ "

(میں اس لئے آیا ہوں تا کہ اپنے سے پہلے نازل ہونے والی کتاب، تورات کی تصدیق کروں اور تمہارے لئے بعض ان چیزوں کو حلال کروں جو تم پر حرام کی گئی ہیں)

اسی سلسلہ کی ایک آیت یہ ہے:

سورۂ مائدہ، آیت :۴۷

○ " وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ ۙ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ "

(اور ہم نے اسے انجیل عطا کی، اس میں ہدایت اور نور ہے اور وہ اپنے سے پہلی کتاب، تورات کی تصدیق کرتی ہے اور پرہیزگاروں کے لئے سرچشمہء ہدایت ونصیحت ہے، اور ہم نے اسے انجیل اس لئے عطا کی تا کہ وہ انجیل والوں کے درمیان ان اصولوں کے مطابق فیصلے کرے جو انجیل میں مذکور ہیں)

اس آیت سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ انجیل میں صرف ناسخ احکام ہی نہیں ہیں بلکہ دیگر موضوعات کی بابت اثباتی

احکام بھی موجود ہیں۔

قرآنی آیات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ انجیل میں بھی تورات کی طرح حضرت پیغمبر اسلام ؐ کی تشریف آوری کی خوشخبری دی گئی ہے چنانچہ اس سلسلہ میں ایک آیت یہ ہے :

سورۂ اعراف، آیت : ۱۵۷

○ " اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ "

(وہ پیروی کرتے ہیں اس رسول نبی امی کی کہ جس کا نام تورات وانجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں)

بنی اسرائیل کے لئے ہادی ورہنما

○ " وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ "

(اور وہ بنی اسرائیل کی طرف بھیجا گیا...... ہادی ہے......)

اس آیت کے ظاہری الفاظ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خاص طور پر بنی اسرائیل ہی کے لئے رسول بنا کر بھیجے گئے تھے جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں نازل ہونے والی آیات مبارکہ سے ثابت ہوتا ہے کہ انہیں بنی اسرائیل ہی کے لئے رسول بنا کر بھیجا گیا تھا، جبکہ ہم سورۂ بقرہ کی آیت ۲۱۳ (كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۟ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ......) کی تفسیر میں نبوت کی بابت تفصیلی بحث وتذکرہ کر کے اس امر کا اثبات کر چکے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح ان اولوالعزم پیغمبروں میں سے ہیں جنہیں تمام اہل دنیا کے لئے ہادی ورہنما اور نبی بنا کر بھیجا گیا، تو اس پیچیدگی کا حل ان مطالب میں مل سکتا ہے جو ہم نے رسول اور نبی کے درمیان فرق کی بابت ذکر کئے ہیں اور یہ بیان کیا ہے کہ نبوت ایک عمومی منصب وعہدہ ہے جو احکام دین کی تبلیغ کے لئے مخصوص ہے جبکہ رسالت ایک خاص نمائندگی ہے جس میں لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلے کرنے اور ان کی اصلاح امور وحوال کی ذمہ داری پائی جاتی ہے کہ جس کا نتیجہ ان کی بقا ودوام نعمت کی صورت میں یا ہلاکت وتباہی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، جیسا کہ ایک مقام پر ارشاد حق تعالیٰ ہے :

سورۂ یونس، آیت : ۴۷

○ " وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ "

(اور ہر امت کے لئے ایک رسول ہے، پس جب ان کا رسول آ جاتا ہے تو ان کے درمیان انصاف کے ساتھ

فیصلہ کر دیا جاتا ہے)

دوسرے لفظوں میں یہ کہ "نبی" وہ انسان ہے جسے اس لئے بھیجا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کو دین سے آگاہی دلائے اور "رسول" وہ ہے جسے کسی خاص حکم و پیغام کے ساتھ بھیجا جاتا ہے کہ جس کا انکار ہلاکت و تباہی اور اسے قبول کرنا بقاء و سعادت کا باعث بنتا ہے، یعنی اگر لوگ اسے تسلیم کرلیں تو سعادتمند ہو جاتے ہیں اور اگر اس کا انکار کریں اور اسے ٹھکرا دیں تو ہلاکت و تباہی ان کا مقدر بن جاتی ہے، جیسا کہ اس مطلب کی تصدیق و تائید بلکہ ثبوت و دلیل بعض رسولوں کی اپنی امتوں سے کی جانے والی گفتگو اور ان بیانات میں موجود ہے جن کا تذکرہ خداوند عالم نے قرآن میں فرمایا کہ جن میں حضرت نوحؑ، حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ اور حضرت شعیبؑ کے تذکرے واضح مثالیں ہیں۔

بنابرایں یہ ضروری نہیں کہ جس شخص کو کسی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہو وہ صرف اسی قوم کا نبی ہو بلکہ عین ممکن ہے کہ کسی شخص کو ایک خاص و معین قوم کا رسول بنا کر بھیجا جائے جبکہ اس کی نبوت کے منصب کا دائرہ وسیع ہو اور وہ تمام افرادِ بشر کے لئے نبی ہو یعنی اس قوم کے لئے بھی نبی ہو جس کے لئے اسے رسول بنایا گیا اور اس کے علاوہ دیگر اقوام کے لئے بھی نبی ہو جس کے لئے اسے رسول بنایا گیا اور اس کے علاوہ دیگر اقوام کے لئے بھی نبوت کی ذمہ داری رکھتا ہو جیسے حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام، چنانچہ اس مطلب کی گواہی قرآن مجید میں کئی مقامات پر موجود ہے، مثلاً حضرت موسیٰؑ کو فرعون کی طرف بھیجا گیا تو ارشاد ہوا :

سورۂ طٰہٰ، آیت : ۲۴

○ "اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى"

(جاؤ فرعون کے پاس کہ وہ سرکش ہو گیا ہے)

اور جب جادوگر، حضرت موسیٰؑ پر ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کا کھلا اظہار کیا جبکہ وہ بنی اسرائیل میں سے نہ تھے، ان کے بیان کو درج ذیل آیت میں ذکر کیا گیا ہے :

سورۂ طٰہٰ، آیت : ۷۰

○ "قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى"

(انہوں نے کہا: ہم ایمان لائے ہارون اور موسیٰ کے پروردگار پر)

اور قوم فرعون کو دعوتِ حق دی گئی جبکہ وہ بنی اسرائیل میں سے نہیں تھے، اس مطلب کو یوں بیان کیا گیا :

سورۂ دخان، آیت : ۱۷

○ "وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَجَآءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِيْمٌ"

(ہم نے ان سے پہلے قوم فرعون کو آزمایا اور ان کے پاس ایک معزز رسول آیا)

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والوں کے بارے میں ٹھوس شواہد موجود ہیں کہ بنی اسرائیل کے علاوہ متعدد قوموں نے آپؑ پر ایمان کا اظہار کیا مثلاً بعثت نبویؐ سے قبل رومیوں اور مغرب کی عظیم قوموں مثلاً فرانس، آسٹریا، بورسا اور انگلستان کے باشندوں اور مشرق کی قوموں مثلاً نجران کے رہنے والوں نے ان کی نبوت کا اقرار کیا جبکہ وہ سب بنی اسرائیل کے علاوہ تھے، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں جب نصاریٰ یعنی حضرت عیسیٰؑ کے پیروکاروں کا تذکرہ ہوتا ہے تو کہیں بھی بنی اسرائیل کے نصاریٰ کا تعین نہیں ہوا بلکہ اگر ان کی مدح ہوئی تو تمام نصاریٰ کی عمومی طور پر مدح ہوئی اور اگر ان کی مذمت ہوئی تو عمومی طور پر نصاریٰ کے الفاظ استعمال ہوئے، (اگر حضرت عیسیٰؑ کی نبوت صرف بنی اسرائیل کے لئے ہوتی تو ان کے نام ہی تک بیانات محدود ہوتے جبکہ لفظ "نصاریٰ" سے بنی اسرائیل اور ان کے علاوہ دیگر وہ اقوام مقصود و مراد ہیں جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا اقرار کیا اور ان کی پیروی کا اظہار کیا)۔

معجزات کے اظہارات

○ " اَنِّیْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّیْۤ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّیْنِ...... "

(میں تمہارے پاس تمہارے رب کی نشانی لے کر آیا ہوں، میں تمہارے لئے مٹی سے پرندے بناتا ہوں......)

اس آیت میں خلق کرنے کی نسبت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف دی گئی ہے کہ انہوں نے کہا: " اَنِّیْۤ اَخْلُقُ... " میں خلق کرتا ہوں، تو اب دیکھنا یہ ہے کہ خلق کرنے کا معنی کیا ہے ؟

"خلق" کا معنی کسی چیز کے اجزاء کو یکجا کرنا ہے، اسی وجہ سے اس عمل کی نسبت غیر خدا کی طرف بھی دی جاتی ہے (اگر اس سے مراد عدم سے وجود میں لانا ہوتا تو اس کی نسبت خدا کے علاوہ کسی کی طرف نہ دی جاسکتی کیونکہ اس معنی میں خدا کے سوا کوئی دوسرا خالق نہیں) چنانچہ قرآن مجید میں اس حوالہ سے یوں ارشاد ہوا :

سورۂ مؤمنون، آیت : ۱۴

○ " فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ "

(بابرکت ہے اللہ، جو خلق کرنے میں سب سے بہتر ہے)

آیت میں دوسرا جملہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

"وَ اُبْرِئُ الْاَکْمَهَ وَ الْاَبْرَصَ"

(میں اکمہ اور ابرص کو شفایاب کرتا ہوں)

"اَکْمَهَ" کا معنی وہ بچہ ہے جو نابینا پیدا ہوا (مادرزاد اندھا)، اور کبھی یہ لفظ اس شخص پر اطلاق ہوتا ہے جو نابینا ہو جائے یعنی مادرزاد نابینا نہ ہو بلکہ بعد میں بصارت سے محروم ہو جائے، چنانچہ لغت کی مشہور کتاب "المفردات" میں راغب اصفہانی نے اس حوالہ سے لکھا ہے کہ نابینا ہو جانے والے شخص کے بارے میں کہا جاتا ہے: "کمهت عیناه حتی ابیضتا" (اس کی آنکھوں کی بینائی کم ہوگئی یہاں تک اس کی آنکھیں سفید ہوگئیں)۔

"ابْرَصَ" برص کے مریض کو کہتے ہیں، برص ایک مشہور جلدی بیماری کا نام ہے اور اس سے "اَبْرَصَ" (برص میں مبتلا شخص) بنا ہے۔

جملہ "وَ اُحْیِ الْمَوْتٰی" (میں مردوں کو زندہ کرتا ہوں) میں احیاء یعنی زندہ کرنے کو لفظ "موتی" (صیغۂ جمع) کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے جس سے کثرت و تعدد کا معنی سمجھا جاتا ہے۔

اور سیاق کلام سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جملہ "بِاِذْنِ اللّٰهِ" اس حقیقت کا ترجمان ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں رونما ہونے والے معجزات کہ جن کا ذکر زیر نظر آیت مبارکہ میں ہوا وہ سب خداوند عالم کے اذن کے ساتھ تھے اور ان کا استناد و نسبت خدا کی طرف ہے کہ وہی ان کا سرچشمہ ہے اور آنجناب ان کی بابت مستقل یعنی خدا سے بے نیاز نہ تھے (بلکہ خدا کے اذن کے ساتھ وہ سب کچھ انجام دیتے تھے)، اور جملہ "بِاِذْنِ اللّٰهِ" کا بار بار ذکر کیا جانا اس استناد و نسبت کی بابت تاکیدی توجہ دلانے کی غرض سے ہے کیونکہ اس سلسلہ میں لوگوں کا اصل حقیقت سے غافل ہونے اور ان کے گمراہی سے دوچار ہونے کا اندیشہ تھا کہ وہ ان معجزات کی بناء پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں خدائی کا عقیدہ اختیار کر سکتے ہیں، لہٰذا ان تمام معجزات کے بیان کے ساتھ "بِاِذْنِ اللّٰهِ" (اللہ کے اذن کے ساتھ) کے الفاظ شامل کئے اور پھر بیان کا اختتام بھی ایسے جملہ پر کیا جس سے ہر طرح کی غلط فہمی دور ہو لہٰذا یوں ارشاد فرمایا: "اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَ رَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ" (بے شک اللہ ہی میرا رب اور تمہارا رب ہے، تم اسی کی عبادت کرو، یہی سیدھا راستہ ہے)

اور حضرت عیسیٰ کا یہ فرمانا "اَنِّیْ اَخْلُقُ لَکُمْ......" (میں تمہارے لئے خلق کرتا ہوں......) کسی چیلنج یا محض دعوے کے طور پر نہ تھا بلکہ ایک عملی حقیقت پر مبنی تھا اور آنجناب وہ سب معجزات انجام دیتے تھے، کیونکہ اگر صرف دعویٰ یا لوگوں کو مرعوب کرنے کی غرض وغیرہ کی بناء پر اس طرح کے الفاظ کہتے تو ان کے ساتھ قید۔ شرط بھی ذکر کرتے اور یوں کہتے کہ اگر تم

مجھ سے مطالبہ کرو گے یا پسند کرو گے تو میں مردوں کو زندہ کر دوں گا اور بیماروں کو شفایاب کر دوں گا وغیرہ، لیکن انہوں نے اس طرح کے الفاظ سے خالی اعلان فرمایا، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ان معجزات کو عملی طور پر انجام دیتے تھے اور ان کا اعلان خالی دعویٰ یا اتمامِ حجت وغیرہ کے لئے نہ تھا۔

اس کے علاوہ درج ذیل آیات مبارکہ میں بھی واضح طور پر اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ معجزات کو انجام دیتے تھے چنانچہ خداوند عالم کا قیامت کے دن عیسیٰؑ سے مخاطب ہو کر ان کا حوالہ دینا قرآن مجید میں اس طرح مذکور ہے :

سورۂ مائدہ، آیت : ۱۱۰

○ "اِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِیْ عَلَیْكَ وَعَلٰی وَالِدَتِكَ ... مِنَ الطِّیْنِ كَهَیْـَٔةِ الطَّیْرِ بِاِذْنِیْ فَتَنْفُخُ فِیْهَا فَتَكُوْنُ طَیْرًا بِاِذْنِیْ وَتُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَ الْاَبْرَصَ بِاِذْنِیْ ۚ وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰی......"

(قیامت کے دن) جب خدا کہے گا: اے عیسیٰ بن مریم! تو یاد کر، میری اس نعمت کو جس سے میں نے تجھے اور تیری والدہ کو نوازا......اور جب تو میرے اذن سے مٹی سے پرندہ کی شکل بناتا تھا پھر اس میں پھونک مارتا تھا تو وہ میرے اذن سے پرندہ ہو جاتا تھا اور تو میرے اذن سے مادر زاد نابینا اور برص کے مریض کو شفایاب کرتا تھا اور جب تو میرے اذن سے مُردوں کو قبروں سے باہر نکالتا تھا......)۔

ایک ضروری وضاحت

اس آیت اور اس موضوع سے مربوط ذکر کئے گئے مطالب سے بعض مفسرین کا یہ بیان غلط ثابت ہو جاتا ہے جس میں انہوں نے زیر بحث آیت کی بابت کہا ہے کہ : "اس آیت سے زیادہ سے زیادہ یہی ثابت ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے حضرت عیسیٰ بن مریمؑ کو ایک راز عطا فرمایا تھا اور آنجناب نے اسی کی بناء پر لوگوں کے سامنے کھلا اعلان کیا اور ان پر اتمام حجت کیا کہ اگر وہ ان سے ان امور میں سے کسی کا بھی مطالبہ کریں تو وہ ان کی انجام دہی پر قادر ہیں، لیکن آیا وہ تمام امور یا ان میں سے بعض امور وجود پذیر ہوئے بھی ہیں اس بات کا ثبوت آیت میں موجود نہیں "۔

غیبی خبروں کا اعلان

○ "وَاُنَبِّئُكُم بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ فِیْ بُیُوْتِكُمْ"
(اور میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تم کیا کھاتے ہو اور کیا اپنے گھروں میں بچا کر رکھتے ہو)

یہ جملہ غیبی خبریں دینے کے اظہار پر مشتمل ہے جو کہ خداوند عالم اور ان رسولوں سے مختص و مخصوص ہے جنہیں خداوند عالم نے وحی کے ذریعے اس اعزاز سے نوازا ہے، اور یہ بذات خود ایک معجزہ ہے اور اس غیب کی خبر پر مشتمل ہے جس کا انجام پذیر ہونا صریح و واضح ہے کہ جس میں کسی طرح کے شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں پائی جاتی کیونکہ عام طور پر کوئی شخص اس چیز کے بارے میں شک وشبہ کا شکار نہیں ہوتا جو اس نے کھایا ہو یا جو کچھ اپنے گھر میں ذخیرہ کیا ہو۔

غیبی خبریں اور اذن الٰہی

اس مقام پر ایک سوال ممکن ہے اور وہ یہ کہ کسی بھی معجزہ کا رونما ہونا خدا کے اذن پر موقوف ہے اور کوئی معجزہ اذن الٰہی کے بغیر انجام پذیر نہیں ہوسکتا تو اس آیت میں غیبی خبریں دینے کو اذن الٰہی کے بغیر کیوں ذکر کیا گیا ہے بلکہ صریح لفظوں میں ارشاد ہوا (وَاُنَبِّئُكُم بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ فِیْ بُیُوْتِكُمْ) ...... میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تم کیا کھاتے ہو اور کیا کچھ اپنے گھروں میں ذخیرہ کرتے ہو......، جبکہ درج ذیل آیت میں صراحت و وضاحت کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ ہر معجزہ خدا کے اذن کے ساتھ ہوتا ہے:

سورۂ مؤمن، آیت :۷۸

○ "وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِیَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ"
(کوئی رسول کوئی معجزہ نہیں لاسکتا مگر خدا کے اذن کے ساتھ!)

اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں جس معجزہ کا ذکر ہوا ہے اسے انباء یعنی خبر دینے سے تعبیر کیا گیا ہے (اُنَبِّئُكُم) جو کہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کلام ہے اور یہ کام خود انہی سے مخصوص ہے کہ جسے خدا کی طرف منسوب کرنا موزوں نہیں جبکہ سابقہ دو آیتوں میں صورتحال اس طرح کی نہیں کیونکہ خلق اور احیاء حقیقت میں خدا کے افعال ہیں اور ان کی نسبت غیر اللہ کی طرف صرف خدا کے اذن کے ساتھ دی جاسکتی ہے، اس کے اذن کے بغیر روا نہیں۔

اس کے علاوہ یہ کہ سابقہ دو آیتوں میں خلق واحیاء کا تذکرہ ہوا ہے جو کہ انباء یعنی خبر دینے سے قطعی مختلف ہیں کیونکہ ان میں لوگوں کے گمراہی سے دوچار ہونے کا خطرہ خبر دینے کی نسبت کہیں زیادہ وسریع ہے اور وہ اس طرح کہ سادہ لوح افراد کے دل ذرا سی بے توجہی وغلط فہمی کی بناء پر اس شخص کو خدا ماننے کی طرف جلدی مائل ہو سکتے ہیں جو مٹی سے پرندے کی شکل بنا کر اسے اصل پرندہ بنا دے اور مردوں کو زندہ کر دے جبکہ غیبی خبریں دینے والے کے بارے میں اس قدر سرعت کے ساتھ اس کی خدائی کے معتقد نہیں ہوتے کیونکہ عامتہ الناس غیبی خبریں دینے کو خداوند عالم کے ساتھ مخصوص نہیں سمجھتے بلکہ اسے ایک معمولی کام سمجھتے ہیں اور ہر کاہن وشعبدہ بازی کے ماہر شخص سے اس کا سرزد ہونا ممکن سمجھتے ہیں۔ بنابرایں یہ ضروری تھا کہ سابق الذکر دو معجزوں یعنی خلق واحیاء کو خدا کے اذن کے ساتھ مقید کر کے ذکر کیا جائے جبکہ آخری معجزہ یعنی غیبی خبریں دینے کو اس کے بغیر ذکر کیا جائے۔

اسی طرح ابراء یعنی بیماروں کو شفایاب کرنے کے تذکرہ میں بھی اس قدر کافی تھا کہ اس کی بابت یہ بیان کیا جائے کہ وہ معجزۂ الٰہی ہے، بالخصوص جبکہ اظہار سخن ان لوگوں سے تھا جو ایمان لانے کا دعویٰ کرتے تھے جیسا کہ آیت کے ذیل میں یوں ارشاد ہوا: "اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ" (اس میں نشانی (معجزہ) ہے تمہارے لئے، اگر تم مؤمن ہو) یعنی اگر اپنے دعوائے ایمان میں سچے ہو۔

تورات کی تصدیق اور بعض احکام کا بیان

○ "وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِیْ حُرِّمَ عَلَیْكُمْ"

(اور تصدیق کرنے والا ہوں اس کا جو میرے سامنے (مجھ سے پہلے نازل ہوئی) ہے اور تاکہ میں ان بعض چیزوں کو حلال کروں جو تم پر حرام کر دی گئی ہیں)

یہ آیت سابق الذکر جملہ "وَرَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ" پر عطف ہے۔

اس مقام پر ایک ادبی مطلب قابل ذکر ہے اور وہ یہ کہ سابق الذکر جملہ یعنی معطوف علیہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو غائب فرض کیا گیا اور کہا گیا: "وَرَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ" (وہ بنی اسرائیل کی طرف بھیجا گیا پیغمبر ہے) جبکہ زیر نظر آیت میں جو کہ معطوف ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام متکلم کے مقام میں ہیں اور یہ جملہ "وَمُصَدِّقًا............" خود انہی کا بیان ہے، تو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ معطوف اور معطوف علیہ میں کلامی حیثیت کے حوالہ سے یکسانیت ہونی چاہئے لیکن

یہاں غائب و متکلم کے فرق سے معطوف اور معطوف علیہ کے عمومی اصول کی نفی نہیں ہوتی ہے اور وہ اس طرح کہ زیر نظر آیت (معطوف) سے پہلے جملہ "وَرَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ" کی تفسیر جملہ "اَنِّیْ قَدْ جِئْتُكُمْ" کے ذریعے ہو چکی ہے اور کلام کا رخ غیبت سے تکلم کی طرف مڑ چکا ہے لہٰذا اس تبدیلی کی بناء پر عطف درست و صحیح اور بجا ہے کہ اس طرح متکلم کے سیاق کا عطف متکلم کے سیاق پر ہوگا۔

آیت مبارکہ میں ارشاد ہوا کہ "میں تصدیق کرنے والا ہوں تورات کی"، تو اس سے مراد اس تورات کی تصدیق ہے جس کا علم خداوند عالم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو عطا فرمایا جیسا کہ سابقہ آیت سے بخوبی معلوم ہوتا ہے اور وہ اصل تورات تھی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی، بنابرایں اس سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس تورات کی تصدیق کرتے تھے جو ان کے زمانہ میں موجود تھی کہ وہ تحریف سے مبرا تھی، اور یہ بعینہٖ اسی طرح ہے جیسے ہمارے نبی حضرت پیغمبر اسلام محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں قرآن مجید نے صریح لفظوں میں کہا ہے کہ وہ تورات کی تصدیق کرنے والے ہیں کہ جو ان سے پہلے نازل ہوئی تھی، تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ جو تورات اس زمانہ میں یہودیوں کے ہاں رائج تھی وہ تحریف سے مبرا تھی ...... بلکہ اس سے مراد بھی اصل تورات ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی اور خداوند عالم نے اس کا علم حضرت محمدؐ کو عطا فرمایا کہ اس حوالہ سے آنحضرتؐ تورات کی تصدیق کرنے والے قرار پائے ......،

بعض احکامِ شریعت کا حوالہ

- "وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِیْ حُرِّمَ عَلَیْكُمْ"
(اور تاکہ میں تم پر حلال کروں بعض وہ چیزیں جو تم پر حرام قرار دی گئیں)

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے بعض پاکیزہ چیزوں کو بنی اسرائیل پر حرام قرار دیا تھا کہ جو حضرت عیسیٰؑ بن مریمؑ کے ذریعے حلال کر دی گئیں چنانچہ اس کا ثبوت درج ذیل آیت میں بھی موجود ہے:

سورۂ نسآء، آیت: ۱۶۰

- "فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِیْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَیْهِمْ طَیِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ ......"

(یہودیوں کی طرف سے ارتکابِ ظلم کی وجہ سے ہم نے کچھ پاک چیزیں جو ان کے لئے حلال تھیں ان پر حرام

کردیں......)

بہر حال زیر بحث آیت مبارکہ سے اس حقیقت کا ثبوت ملتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تورات کے تمام احکام پر مہر تصدیق ثبت کی سوائے ان چند احکام کے کہ جنہیں خداوند عالم نے ان کے ہاتھوں منسوخ کیا اور وہ احکام اس لئے منسوخ کئے گئے کہ وہ یہودیوں پر نہایت شدید اور گراں تھے، (یعنی ان پر نرمی کی غرض سے ان احکام کو منسوخ کیا گیا) اسی وجہ سے یہ کہا گیا کہ انجیل شریعت و دستورات کی کتاب نہیں...... کیونکہ اس میں احکام موجود ہی نہیں......،

جملہ "وَلِاُحِلَّ" کا عطف جملہ "بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ" پر ہے اور اس میں حرف لام غرض و غایت کے بیان کے لئے ہے، اس بناء پر آیت مبارکہ کا معنی یہ ہوگا: "قد جئتکم لانسخ بعض الاحکام المحرمة المکتوبة علیکم" میں تمہارے پاس اس لئے آیا ہوں تا کہ ان بعض احکام کو منسوخ کروں جن میں تم پر کچھ چیزیں حرام قرار دی گئی ہیں۔

پروردگار کی نشانی

○ "وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ"

(اور میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے نشانی لایا ہوں)

اس جملہ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جملہ "فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ" اظہار معجزہ کی فرع و نتیجہ ہے اور اس کا حرام کردہ چیزوں کو حلال کرنے سے کوئی تعلق نہیں، یعنی تقویٰ اختیار کرنے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اطاعت و فرمابرداری کرنے کا حکم اظہار معجزہ کی وجہ سے ہے نہ یہ کہ اس وجہ سے کہ حضرت عیسیٰؑ نے بعض چیزوں کو حلال کیا،

شاید اس مفسر کے بیان کا مقصد بھی یہی ہو جس نے کہا کہ جملہ "وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ" کا دوبارہ ذکر کیا جانا اس غرض سے ہے کہ اس سے پہلے ذکر کئے گئے مطالب اور اس کے بعد ذکر کئے جانے والے مطالب کے درمیان فرق واضح ہو، کیونکہ اگر یہ غرض مقصود و ملحوظ اور مراد نہ ہو تو ایک ہی جملہ کا دوبار ذکر کیا جانا ادبی حوالہ سے کلام کی خصوصیت و کمال قرار نہیں پاتا۔

بندگیٔ خدا کا واضح اعلان

O "اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْهُ......"

(بے شک، اللہ میرا پروردگار اور تمہارا پروردگار ہے پس تم اس کی عبادت کرو......)

اس جملہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں خدائی کے باطل عقیدہ وخیال کی نفی مقصود ہے کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی فراست یا بذریعۂ وحی اس بات سے آگاہ ہو چکے تھے کہ کچھ نادان لوگ معجزات دیکھ کر گمراہ ہو جائیں گے اور ان کے بارے میں خدائی کا عقیدہ قائم کر لیں گے، چنانچہ اسی وجہ سے حضرت عیسیٰؑ نے معجزات کو "بِاِذْنِ اللّٰهِ" کے الفاظ کے ساتھ مقید کیا مثلاً " فَیَکُوْنُ طَیْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ "، " وَاُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰهِ "، البتہ اس حوالہ سے درج ذیل آیت مبارکہ سے ظاہر وثابت ہوتا ہے کہ آنجنابؑ بذریعہ وحی اس طرح کے باطل عقیدہ سے آگاہ ہوئے تھے:

سورۂ مائدہ، آیت :۱۱۷

O "مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِیْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبَّکُمْ "

(میں نے ان سے اس کے سوا کچھ نہیں کہا جو تو نے مجھے حکم دیا کہ اللہ کی عبادت کرو جو میرا اور تمہارا رب ہے)

حضرت عیسیٰؑ کی پکار

O " فَلَمَّآ اَحَسَّ عِیْسٰی مِنْهُمُ الْکُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰهِ "

(پھر جب عیسیٰ نے ان سے کفر محسوس کیا تو کہا: کون ہے میرا مددگار خدا کی طرف!)

حضرت مریمؑ کو جو بشارت دی گئی تھی وہ چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بابت اہم مطالب کے عنوانی ذکر پر مشتمل تھی کہ جس میں ولادت سے پہلے حضرت مریمؑ کے شکم میں ہونا (حمل)، ان کی رسالت اور دعوت توحید کا تذکرہ شامل تھا لہٰذا اس میں اجمالی بیان پر اکتفاء کی گئی اور پر تتمۂ کلام کے طور پر ان کے انصار وحواریوں کے چناؤ، ان کی قوم کا ان کے خلاف مکر کرنا اور خدا کا لوگوں کے مکر کو ناکام بنا کر عیسیٰؑ کو ان سے نجات دلانا اور انہیں آسمان پر لے جانا ذکر کیا گیا تا کہ سلسلۂ بیان کی تکمیل ہو جائے۔

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے مربوط مطالب کے تذکرہ میں اسی مقدار کے ذکر پر اکتفاء کی گئی جن کا نجران کے نصاریٰ کے سامنے پیش کیا جانا ضروری و کافی تھا کیونکہ جب یہ آیات نازل ہو رہی تھیں انہی ایام میں وہ لوگ وفد کی صورت میں مدینہ منورہ آئے ہوئے تھے تا کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ سے بحث و گفتگو اور مناظرہ کریں، اسی وجہ سے آنجنابؑ سے تعلق رکھنے والے دیگر ان امور کا تذکرہ اس مقام پر نہ کیا گیا جو دوسری قرآنی سورتوں مثلاً سورۂ نسآء، سورۂ مائدہ، سورۂ انبیاء، سورۂ زخرف اور سورۂ صف میں مذکور ہیں۔

زیر بحث آیت مبارکہ میں لفظ ''احساس'' ذکر ہوا ہے (فَلَمَّآ اَحَسَّ عِیْسٰی مِنْهُمُ الْكُفْرَ (جب اس نے ان لوگوں سے کفر محسوس کیا) جبکہ کفر ایک قلبی کیفیت ہے جسے محسوس نہیں کیا جا سکتا، تو یہاں اس کا ذکر اس بناء پر ہے کہ ان کا باطنی کفران کے اعمال سے اس قدر شدید صورت میں ظاہر ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے ارادوں اور قلبی کیفیتوں کو بھانپ گئے یا یہ کہ انہوں نے اپنے کفر کی وجہ سے آنجنابؑ کو اذیت دینے اور ان کے قتل کی سازش و کوشش کی، جس سے حضرت عیسیٰؑ نے ان کے دل میں چھپے ہوئے کفر کو محسوس کر لیا، اسی مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آیت میں ارشاد ہوا: ''فَلَمَّآ اَحَسَّ عِیْسٰی'' جب عیسیٰ نے محسوس کیا یعنی اسے بھانپ لیا، اور لفظ ''مِنْهُمْ'' (ان سے) سے مراد وہ بنی اسرائیل ہیں جن کا نام بشارت میں مذکور ہے، ان سے کفر کی بو آنے لگی تو حضرت عیسیٰؑ نے کہا: '' مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰهِ '' (کون ہے جو خدا تک جانے والے راستہ میں میرا مددگار ہو)، اس سوال میں آنجنابؑ کا مقصد یہ تھا کہ اپنی قوم کے ان مخلص بندوں کو جان لیں جو حق کے طرفدار ہیں تا کہ ان کی تعداد اور ہمت و قوت کی بناء پر اپنے توحیدی مشن کو فروغ دے سکیں اور ان کا سلسلۂ تبلیغ دین افرادی قوت کے حوالہ سے واضح خطوط پر استوار ہو، دراصل یہی وہ بنیادی نکتہ ہے جو ہر طبعی و اجتماعی قوت کی عملداری میں ملحوظ ہوتا ہے کہ اس کے ابتدائی مراحل ہی میں ایک مرکزی نکتہ کا تعین ضروری ہو جاتا ہے تا کہ اس پر تمام مربوطہ عملی اقدامات ترتیب پائیں اور وہی تمام مربوطہ سرگرمیوں کا محور ہو، کہ اس کے بغیر کوئی اقدام درست سمت میں واقع نہیں ہو پاتا بلکہ تمام کاوشیں بے نتیجہ رہ جاتی ہیں۔ چنانچہ اس کی ایک مثال دعوت اسلام میں بھی ملتی ہے کہ ایک بیعت عقبہ کا واقعہ ہے جب ہجرت نبویؐ سے پہلے مدینہ کے لوگ عقبۂ منیٰ میں جمع ہوئے اور آنحضرتؐ کی بیعت کی، اور دوسرا بیعت شجرہ کا واقعہ ہے کہ جسے بیعت رضوان بھی کہا جاتا ہے اور جو صلح حدیبیہ کے دوران ہوا اس میں پیغمبر اسلامؐ نے لوگوں کو ایک نکتہ پر اکٹھا کرنے اور اہل اسلام کی طاقت کو متمرکز کرنے کی کوشش کی تا کہ اس سے توحیدی مشن کو سروسامان دے سکیں اور مربوطہ امور و اقدامات درست سمت میں نظم و نظام پائیں۔

بہر حال جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یقین ہوا کہ ان کی دعوت تمام بنی اسرائیل میں یا ان کی اکثریت میں کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو رہی اور وہ ہر صورت میں اپنے کفر پر باقی اور ڈٹے ہوئے ہیں کہ اگر انہیں مزید موقع مل جائے تو وہ آنجنابؑ

کی دعوت توحید کو ہرگز آگے بڑھنے نہ دیں گے بلکہ مزید مشکلات پیدا کر کے حالات کو بگاڑ دیں گے اور صورتحال کو یکسر خراب کر دیں گے تو آنجنابؑ نے اپنے مشن کی بقا کے لئے یہ تجویز سوچی کہ لوگوں سے کھلے لفظوں میں مدد طلب کی جائے تاکہ اہل حق و اہل باطل کے درمیان تمیز کی واضح صورت سامنے آسکے چنانچہ انہوں نے اللہ تک پہنچنے کے راستہ میں ہمراہیوں کو پکارا اور کہا: کون ہے جو اس راہ میں میرا مددگار ہو، تو آنجنابؑ کی دعوت و پکار پر حواریوں نے لبیک کہا جس سے اہل حق کی پہچان ممکن ہوئی اور ایمان لانے والے مشخص و واضح ہو گئے، یہی وہ مرحلہ تھا جب ایمان اور کفر کے درمیان فرق کی بنیاد قائم ہو گئی اور دعوتِ دین اور غلبۂ حق کی راہیں کھل گئیں، اسی مطلب کو درج ذیل آیت مبارکہ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

سورۂ صف، آیت: ۱۴

○ " يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا أَنصَارَ اللَّهِ فَآمَنَت طَّائِفَةٌ مِّن بَنِي إِسْرَائِيلَ وَكَفَرَت طَّائِفَةٌ فَأَيَّدْنَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَىٰ عَدُوِّهِمْ فَأَصْبَحُوا ظَاهِرِينَ "

(اے ایمان لانے والو! تم اللہ کے مددگار بنو، چنانچہ بنی اسرائیل کے ایک گروہ نے قبول کر لیا اور ایک گروہ نے انکار کر دیا، تو ہم نے قبول کرنے والوں (اہل ایمان) کی ان کے دشمن کے مقابلے میں مدد کی تو وہ غالب آگئے)

آیت مبارکہ میں حضرت عیسٰی علیہ السلام کے کلام میں لفظ "انصاری" (میرے مددگار) کو " إِلَى اللَّهِ " کے ساتھ مقید کر کے ذکر کیا گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا مقصد لوگوں کے دلوں میں خدا تک جانے کے جذبہ کو بیدار کرتے ہوئے انہیں عملی آمادگی دلانا تھا تاکہ وہ اس سلسلہ میں صدق دل کے ساتھ فوری اقدام کرنے کی طرف بڑھیں، اور یہی وہ غرض تھی جس کے لئے آنجنابؑ نے ان سے پوچھا کہ میرا مددگار کون ہوگا؟ یہ بعینہٖ اسی طرح سے ہے جیسے درج ذیل آیت میں قرض کی بات پوچھا گیا:

سورۂ بقرہ، آیت: ۲۴۵

○ " مَن ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا...... "

(کون ہے جو خدا کو اچھا قرض دے......)

ایک ادبی نکتہ

لفظ " إِلَى اللَّهِ " جو کہ ظرف ہے اس کا تعلق " انصاری " کے ساتھ ہے، اور " انصاری " (میری نصرت کرنے

والے) میں نصرت و مدد میں ساتھ چلنے، جانے اور ہمراہ ہونے جیسے معانی پائے جاتے ہیں اس لیے اسے لفظوں میں حرف "الٰی" کے ساتھ متعدی کہا گیا ہے۔ اس کی مثال حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیان میں بھی ملتی ہے جس میں انہوں نے کہا:

سورۂ صافات، آیت: ۹۹

○ "اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ"

(میں اپنے پروردگار کی طرف جارہا ہوں، وہ بہت جلد میری رہنمائی کرے گا)

بعض مفسرین نے حرف "اِلٰی" کے بارے میں کہا ہے کہ ممکن ہے یہاں "مَعَ" کے معنی میں استعمال ہوا ہو، لیکن یہ بات نہ تو کسی دلیل سے ثابت ہوتی ہے اور نہ ہی ادب القرآن سے اس کی بابت تصدیقی اشارہ ملتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ خدا کو ایک عام انسان قرار دے کر غیر اللہ کے ساتھ ذکر کریں اور غیر اللہ کو اللہ کی طرح اپنا مددگار قرار دیں، اور نہ ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حوالہ سے اس طرح کا تصور ممکن ہے کیونکہ آنجنابؑ کے بارے میں جس طرح قرآن مجید نے تذکرہ کیا ہے اس کی روشنی میں یہ بات کیونکر درست ہوسکتی ہے کہ وہ غیر اللہ کو اللہ کی طرف اپنا مددگار قرار دیں،

اس کے علاوہ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اعلان کیا کہ "مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَى اللّٰهِ" (کون ہے جو اللہ کی طرف جانے میں میری مدد کرے) تو حواریوں نے کہا: "نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ" (ہم اللہ کے مددگار ہیں)، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حرف "اِلٰی" بمعنی "مَعَ" نہیں ورنہ وہ اس طرح کہتے: "نحن انصارک مع اللّٰہ" (ہم بھی اللہ کے ساتھ آپ کے مددگار ہیں)۔ مزید غور کریں،

عیسیٰؑ کے اعلان پر حواریوں کا جواب

○ "قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ"

(حواریوں نے کہا: ہم اللہ کے مددگار ہیں، ہم اللہ پر ایمان لائے اور آپ گواہ ہوں کہ ہم مسلمان ہیں (آپ کے حکم پر سر تسلیم خم کرنے والے ہیں)

"حواری" کسی شخص کے نزدیک ترین فرد کو کہا جاتا ہے، اس کی بابت کہا جاتا ہے کہ اس کا لفظی اشتقاق "حور" سے ہے جس کا معنی بہت زیادہ سفیدی ہے، لیکن قرآن مجید میں یہ لفظ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خاص اصحاب و ساتھیوں کے علاوہ کسی کے لئے استعمال نہیں ہوا۔

اوران کا کہنا: "اٰمَنَّا بِاللّٰهِ" (ہم اللہ پر ایمان لائے) دراصل ان کے قول "نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ" (ہم اللہ کے مددگار ہیں) کی تفسیر کے طور پر ہے، یعنی ہم نے جو کہا کہ ہم اللہ کے مددگار ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں۔

اس سے ہمارے اس بیان کی تصدیق بھی ہوتی ہے جو ہم نے جملہ "اَنْصَارِیْۤ اِلَی اللّٰهِ" کی بابت پیش کیا کہ اس میں ساتھ چلنے اور راستہ طے کرنے کا معنی پایا جاتا ہے یعنی وہ راستہ جو خدا تک پہنچتا ہے اس پر چلنا مقصود ہے، اور ایمان ایک راستہ ہے جس پر چل کر بندہ اپنے رب تک پہنچتا ہے۔ تو جب "ایمان" نصرت و مدد کی تفسیر ہے تو نصرت بھی ایک راستہ کہلائے گا لہٰذا یہ کہنا درست ہوگا کہ خدا کی نصرت سے مراد خدا تک جانے میں نصرت ہے۔

یہاں ایک سوال ممکن ہے اور وہ یہ کہ حواریوں کا کہنا کہ ہم ایمان لائے ہیں "اٰمَنَّا"، آیا پہلی مرتبہ ایمان لانے کو ثابت کرتا ہے یا یہ کہ وہ پہلے ایمان لا چکے تھے اور اب اس کا دوبارہ اظہار کیا ؟

اس سلسلہ میں درج ذیل آیت مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلی مرتبہ والا ایمان نہ تھا بلکہ وہ لوگ اس سے پہلے ایمان لا چکے تھے اب اسی کا دوبارہ اظہار حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اعلان کے بعد کیا :

سورۂ صف، آیت :۱۴

○ "كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ"

(جیسا کہ عیسیٰ بن مریم نے حواریوں سے کہا کہ کون ہے جو خدا کی راہ میں میرا مددگار ہو، تو حواریوں نے کہا: ہم اللہ کے مددگار ہیں، بنی اسرائیل کا ایک گروہ ایمان لایا......)

اس حوالہ سے بظاہر کوئی حرج لازم نہیں آتا کہ ان کا "اٰمَنَّا" کہنا سابقہ ایمان کے اظہار کے طور پر ہو جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ایمان اور اسلام کے کئی مراتب و درجات ہیں کہ جن میں سے بعض درجات دوسرے بعض سے بالاتر اور مافوق ہیں۔

بلکہ اس سلسلہ میں درج ذیل آیت مبارکہ سے بھی استفادہ و استدلال ہو سکتا ہے :

سورۂ مائدہ، آیت :۱۱۱

○ "وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَبِرَسُوْلِيْ ۚ قَالُوْۤا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ"

(اور جب میں نے حواریوں کو وحی کی کہ تم مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ تو انہوں نے کہا ہم ایمان لائے

اور تو گواہ رہے کہ ہم ہی اسلام لانے والے ہیں)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اعلان کے جواب میں انہوں نے جو "اٰمَنَّا" کہا وہ خدائی وحی پر مبنی تھا جو ان پر نازل ہوئی تھی، اور ان پر وحی کے نزول سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ انبیاء تھے اور انہوں نے حضرت عیسیٰ کے سوال کے جواب میں جس ایمان کا اظہار کیا وہ ایمان کے بعد ایمان تھا، (گویا ایمانی مراتب و درجات کے حوالہ سے ایک بالاتر صورت و مرحلہ تھا)

اور ان کے بیان میں جملہ "وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۵۲﴾ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ......" سے بھی مذکورہ بالا مطلب یعنی ایمان کے بعد ایمان کا ثبوت ملتا ہے، اور یہاں "اسلام" سے ان تمام احکام و دستورات کی عملی پیروی اور ان کے سامنے سر تسلیم خم کرنا مراد ہے جو خداوند عالم نے ان کیلئے صادر فرمائے ہیں اور ان سے تعلق رکھتے ہیں کہ کسی بھی بحث اور چوں و چرا کے بغیر ان فرامین کو عملی جامہ پہنائیں، اسلام کا یہ بلند درجہ صرف انہی اہل ایمان کا حصہ و خاصہ ہے جو صدق دل سے حق کو تسلیم کر چکے ہیں اور اس پر کامل صورت میں عمل پیرا ہوں نہ یہ کہ جو شخص ظاہری و زبانی طور پر توحید و نبوت کی گواہی دے وہ اس مقام و درجۂ ایمانی کا حامل ہوگا۔

مزید وضاحت

سابقہ مباحث میں ایمان اور اسلام کے مراتب و درجات کے حوالہ سے تفصیلی تذکرہ ہو چکا ہے اور واضح طور پر یہ بات ذکر ہو چکی ہے کہ ایمان کے ہر درجہ و مقام سے پہلے اسلام کا ایک درجہ و مقام ہوتا ہے، یعنی جو شخص اسلام کے اعلیٰ درجہ و مقام کو حاصل کر لیتا ہے وہ ایمان کے درجہ و مقام کو پالیتا ہے، چنانچہ جملہ "اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ" سے بھی اس کی تائید و تصدیق ہوتی ہے کیونکہ اس میں ایمان کو فعل کے صیغہ "اٰمَنَّا" کے ساتھ اور اسلام کو صفت کے صیغہ "مُسْلِمُوْنَ" میں ذکر کیا گیا ہے۔

بنابرایں اسلام کے ابتدائی مراتب و درجات میں سب سے پہلا درجہ و مقام اصل دین کو صدق دل سے تسلیم کرنا اور اجمالی طور پر اس کی گواہی دینا ہے اور اس کے بعد اس زبانی و ظاہری گواہی کا دل میں فی الجملہ یقین پیدا کرنا ہے، اس کے بعد (اسلام کے تیسرے مرتبہ و درجہ میں) ایمان کے معنی و حقیقت کو دل سے تسلیم کرنا ہے، جو شخص اسلام کے اس درجہ کو پالیتا ہے اس کے دل میں خدائی دستورات کی بابت کسی طرح سے بھی کوئی وسوسہ وغیرہ پیدا نہیں ہوتا، اسی کو دین کی عملی پیروی اور احکام خداوندی کو عملی جامہ پہنانے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد (ایمان کے دوسرے مرحلہ و درجہ میں) عمل میں خلوص اور تمام اعمال و افعال میں عبدیت و بندگی کی صفت کا پیدا ہونا ہے، اس کے بعد (اسلام کے تیسرے مرحلہ و درجہ میں) اللہ کی

محبت اور اس کے ارادہ پر سر تسلیم خم کرنا ہے کہ اس مرحلہ و درجہ میں بندہ جو کچھ چاہتا ہے اور جس چیز کا ارادہ کرتا ہے وہ صرف خدا کیلئے کرتا ہے اسے کوئی چیز اور کوئی کام خدا کی محبت کے دائرہ سے باہر نہ تو پسند آتا ہے اور نہ ہی زیب دیتا ہے بلکہ اس کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا ہی خدا کی محبت اور ارادۂ الٰہی کی عملی پیروی قرار پاتا ہے، وہ صرف وہی کچھ پسند کرتا ہے جو خدا کو پسند ہو اور وہی کچھ چاہتا ہے جو خدا چاہے، گویا اس کی پسند و چاہت کا معیار خدا کی پسند و چاہت کے سوا کچھ نہیں ہوتا، وہ اپنی ذاتی ترجیحات کو ہرگز خاطر میں نہیں لاتا اور نہ ہی انہیں اہمیت کی نگاہ سے دیکھتا ہے، اس کی چاہتوں اور خواہشوں کا محور خدا کی چاہت ہوتی ہے۔ اس کے بعد (ایمان کے تیسرے درجہ و مرحلہ میں) تمام اعمال کا بندگیٔ خدا کے سانچے میں ڈھل جانا ہے کہ ہر عمل عبدیت کی حقیقی روح کا مظہر و آئینہ دار ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا مطالب کو ملحوظ و مدِ نظر رکھتے ہوئے اگر آپ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بیان میں مذکوران الفاظ پر غور کریں جن میں انہوں نے کہا : "فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۞ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ" (تقوائے الٰہی اختیار کرو اور میری اطاعت کرو، بے شک خدا میرا اور تمہارا پروردگار ہے تم اسی کی عبادت کرو کہ یہی سیدھا راستہ ہے) تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ آنجنابؑ نے سب سے پہلے تقوائے الٰہی اختیار کرنے اور اپنی اطاعت کا حکم دیا پھر اس حکم کی بنیاد اور وجہ کو بیان کیا کہ "اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ" کیونکہ خدا میرا اور تمہارا رب ہے، یعنی اللہ تم سب لوگوں کا پروردگار ہے اور اپنے اس رسول کا بھی پروردگار ہے جسے اس نے تمہاری طرف بھیجا ہے، لہٰذا تم پر واجب ہے کہ تم اس پر ایمان لاتے ہوئے اس کا تقویٰ اختیار کرو اور میری پیروی کرتے ہوئے میری اطاعت کا دم بھرو، خلاصہ یہ کہ تم اس کی عبادت و پرستش کرو تقویٰ اختیار کر کے، اور رسول کی اطاعت کر کے، یعنی ایمان لا کر اور اتباع و پیروی کر کے! ،

یہ ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بیان کی روشنی میں حاصل ہونے والے مطالب کا خلاصہ، اسی بناء پر تقویٰ اور اطاعت کے حکم کے بعد اس کی علت و سبب کے بیان میں اسے اس جملہ میں تبدیل کر دیا: "فَاعْبُدُوْهُ" (تم اس کی عبادت کرو)، انہوں نے اس لئے ایسا کیا تا کہ تقویٰ و اطاعت کا خدا سے مربوط ہونا واضح ہو جائے اور ان دو امور یعنی تقویٰ و اطاعت کا خدا کی بندگی سے ربط آشکار ہو، اس کے بعد آنجنابؑ نے اس عبادت و بندگی کو صراط مستقیم سے تعبیر فرمایا، اور اسے ایسا راستہ قرار دیا جو اپنے چلنے والے کو خدائے قدوس تک پہنچا دیتا ہے۔

اس کے بعد جب آنجنابؑ نے اپنی قوم کے افراد سے کفر محسوس کیا اور ان کے عام (اکثر) افراد کی بابت مایوسی ظاہر ہوئی تو فرمایا: "مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ" (کون ہے جو راہ خدا میں میرا مددگار ہو؟) یعنی اس سیدھے راستہ پر چلنے والوں کو بلانا جس کی طرف انہیں بلا رہے تھے کہ جو عبودیت و بندگی سے عبارت ہے یعنی تقویٰ و اطاعت ! تو آپؑ کے اعلان اور بلاوے کے جواب میں حواریوں نے کہا: "نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ" ہم اللہ کے مددگار ہیں، پھر حواریوں نے اپنے جواب کی

وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں اور آپ گواہ ہوں کہ ہم ہی مسلمان ہیں، (اٰمَنَّا بِاللّٰہِ ۚ وَاشْھَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ) اس میں ان کا مقصد اسلام لانے سے یہ تھا کہ اس کی اطاعت و اتباع کرتے ہیں، اسی وجہ سے انہوں نے اپنے پروردگار سے بات کرتے ہوئے انکساری و کمتری کا اظہار کیا اور جو وعدہ حضرت عیسیٰؑ سے کیا تھا اس کو ذکر کرتے ہوئے کہا: "رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ" (پروردگارا ! ہم ایمان لائے اس پر جو تو نے نازل کیا اور ہم نے رسول کی پیروی کی)

تو اس میں انہوں نے "اسلام" (مسلمون) کو "اتباع" (اتَّبَعْنَا) میں تبدیل کر دیا اور "اٰمَنَّا" یعنی ایمان لانے کی بابت وسعت کے ساتھ کہا کہ جو کچھ تو نے نازل کیا ہے (بِمَآ اَنْزَلْتَ) یعنی اللہ نے جو کچھ نازل کیا اس سب پر ایمان لانے کا اظہار کیا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ہر اس چیز پر ایمان لائے جو خداوند عالم نے نازل کی کہ جس کی تعلیم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دی یعنی کتاب و حکمت اور تورات و انجیل، اور انہوں نے ان سب میں رسول کی پیروی کی، تو یہ مرحلہ جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں ایمان کا پہلا درجہ نہیں بلکہ اس کے اعلیٰ و بلند ترین درجات میں سے ہے۔

حواریوں نے اپنے اسلام اور اتباع رسول پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو گواہ بنایا اور یوں نہیں کہا: "اٰمَنَّا بِاللّٰہِ ۚ وَاشْھَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ" (ہم اللہ پر ایمان لائے اور ہم مسلمان ہیں) یا اس کے ہم معنی الفاظ ذکر نہیں کئے بلکہ آنجنابؑ کو گواہ بنا کر اپنے عقیدہ کا اظہار کیا تا کہ وہ اپنے پروردگار کے سامنے اپنے اعتقاد کی بابت پختہ دلیل قائم کر سکیں چنانچہ انہوں نے یہ الفاظ ورد زبان کئے: "وَاشْھَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۵۲﴾ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ" (پروردگارا ! ہم اس پر ایمان لائے جو کچھ تو نے نازل کیا اور ہم نے رسول کی پیروی کی، تو گویا انہوں نے کہا کہ پروردگارا ! یہ ہے ہمارا حال کہ جس پر تیرا رسول گواہ ہے۔

گواہوں میں شمار کرنے کی درخواست

○ "رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰھِدِيْنَ"

اے ہمارے پروردگار ! تو نے جو کچھ نازل کیا ہم اس پر ایمان لائے ہیں اور ہم نے رسول کی پیروی کی ہے لہٰذا ہمیں گواہوں میں لکھ دے)

یہ آیت دراصل حواریوں کا بیان ہے اور اس سے پہلے "قالوا" (انہوں نے کہا) کے الفاظ اس لئے حذف کئے گئے

تا کہ بیان کا متن براہ راست سامنے آ جائے، اور یہ روش و انداز قرآن مجید کے اسلوب و طرز سخن کی خصوصیات میں شامل ہے کہ اس سلسلہ میں پہلے وضاحت ہو چکی ہے۔

اس بیان میں حواریوں نے اپنے پروردگار سے درخواست کی کہ انہیں گواہوں میں شمار کرے (فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ) (ہمیں گواہوں میں لکھ دے) انہوں نے اپنی اس درخواست کو فاء تفریع (ف) کے ساتھ پیش کیا یعنی اسے اپنے ایمان اور اسلام کی فرع اور اس سے وابستہ نتیجہ قرار دے کر ذکر کیا کیونکہ رسول کا اپنی رسالت کی ذمہ داریوں کو ادا کر دینا اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے جب وہ قول و فعل میں خداوند عالم کی طرف سے نازل ہونے والے احکام و دستورات کو بیان کر دے یعنی دینی حقائق و معارف سے لوگوں کو آگاہ کرے اور خود ان پر عمل پیرا ہو، تو لوگوں کا گواہی دینا اسی صورت میں درست قرار پاتا ہے جب رسول انہیں تمام خدائی احکامات سے آگاہی دلا کر ان سے عملی ثبوت دیکھے تا کہ ان کی بنیاد پر وہ گواہ ہو کہ جس چیز کی طرف اس نے انہیں بلایا تھا وہ اس کے عین مطابق عمل پیرا ہیں اور اسی طرح لوگ بھی اسی صورت میں گواہی دے سکیں گے جب وہ رسول کے قول و فعل میں ہم آہنگی و مطابقت دیکھیں اور جن دستورات پر عمل کرنے کی دعوت اس نے لوگوں کو دی ان پر اسے بھی عمل پیرا پائیں کہ جس میں کوئی کمی و کوتاہی اور حد سے تجاوز نہ ہو۔ گویا دونوں صورتوں میں قول و فعل کی مطابقت ضروری ہے، اور یہاں حواریوں کی اپنے رب سے درخواست میں انہوں نے گواہوں میں لکھنے کی خواہش اس بناء پر ہے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ان تمام احکامات و دستورات پر خود عمل پیرا دیکھا جن سے انجنابؑ نے انہیں آگاہ فرمایا تھا لہٰذا ان کا گواہوں میں شمار کرنے کی درخواست دینا درست و بجا قرار پاتا ہے۔

بظاہر یہ وہی شہادت و گواہی ہے جس کا ذکر درج ذیل آیت مبارکہ میں ہوا ہے:

سورۂ اعراف، آیت: ۶

○ "فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ"

(ہم یقیناً ان سے باز پرس کریں گے جس کی طرف رسولوں کو بھیجا گیا اور یقیناً رسولوں سے بھی باز پرس کریں گے)

یہی گواہی درحقیقت تبلیغ پر گواہی ہے۔ اور جہاں تک درج ذیل آیت میں گواہوں میں شامل کئے جانے کی درخواست کا تعلق ہے تو اس میں تبلیغ پر گواہی مقصود نہیں بلکہ رسول کی برحق رسالت پر گواہی مراد ہے:

سورۂ مائدہ، آیت: ۸۳

○ "وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ"

(اور جب انہوں نے رسول پر وحی نازل ہونے کا سنا تو آپ نے دیکھا کہ ان کی آنکھیں حق کی معرفت کی شوق میں اشک ریز ہوگئیں اور وہ کہنے لگے: پروردگارا! ہم ایمان لائے ہیں، ہمیں گواہوں میں لکھ لے)

بہرحال یہ مطالب ہی آیت مبارکہ سے بظاہر معلوم ہوتے ہیں تاہم اصل حقیقت کا علم خدا کو ہے۔

حواریوں کی درخواست کہ "ہمیں گواہوں میں شمار کر لے" سے یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ انہوں نے یہ درخواست چونکہ رسول سے اپنے اسلام پر گواہی دینے کی درخواست کے بعد پیش کی لہٰذا اس سے مراد یہ ہے کہ خداوند عالم انہیں اعمال کے گواہ بنائے جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ وحضرت اسماعیلؑ کی دعا میں مذکور تھا کہ انہوں نے کہا: "رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۠ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا" (سورۂ بقرہ، آیت ۱۲۸)...... پروردگارا! ہمیں اپنے لئے سر تسلیم خم کرنے والا بنا اور ہماری ذریت واولاد میں سے یک امت کو اپنا تابع فرمان بنا، اور ہمیں ہمارے اعمال کا مشاہدہ کروا......،

اس آیت کی تفسیر میں جو مطالب ہم نے ذکر کئے ہیں ان کا مطالعہ کریں تو مقصود واضح ہو جائے گا۔

دونوں طرف سے مکر ؟

O "وَمَكَرُوْا وَمَكَرَاللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُالْمٰكِرِيْنَ"

(اور انہوں نے مکر کیا اور خدا نے مکر کیا، اور خدا بہتر مکر کرنے والا ہے)

اس آیت میں "وَمَكَرُوْا" (انہوں نے مکر کیا) سے مراد بنی اسرائیل ہیں کہ جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف سازش کی اور دھوکہ دہی کی، اس کی دلیل یہ جملہ ہے: "فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ" (جب عیسیٰ نے ان سے کفر محسوس کیا)،

اور جہاں تک اللہ کے مکر کرنے کی بات ہے تو اس سلسلہ میں سورۂ بقرہ کی آیت ۲۶ (وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ) کی تفسیر میں تفصیلی بحث ہو چکی ہے......اور بیان کیا جا چکا ہے کہ اللہ کا مکر کرنا دراصل لوگوں کے مکر اور سازش و چال کو ناکام بنانے کا معنی رکھتا ہے......،

خدا کا عیسیٰؑ سے خطاب

○ " اِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسٰی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ"

(جب خدا نے کہا اے عیسیٰ میں تیرا وقت پورا کرنے والا ہوں)

" توفّی" کا معنی کسی چیز کو پورا پورا لے لینا ہے، اسی مناسبت سے موت کو وفات پانا کہا جاتا ہے کیونکہ خداوند عالم موت کے وقت انسان کی پوری جان لے لیتا ہے، چنانچہ اس حوالہ سے قرآن مجید میں مختلف الفاظ کے ساتھ اس موضوع کو بیان کیا گیا ہے مثلاً:

سورۂ انعام، آیت :۶۱

○ " تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا"

(اسے ہمارے بھیجے ہوئے لے لیتے ہیں.....موت دیتے ہیں......)

سورۂ سجدہ، آیت :۱۱

○ " وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِی الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ ...... قُلْ یَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِیْ وُكِّلَ بِكُمْ"

(اور انہوں نے کہا: کیا جب ہم زمین میں بوسیدہ ہو جائیں گے تو پھر ہم نئی خلقت پائیں گے...... کہہ دیجیے کہ تمہیں موت کا فرشتہ لے لے گا وہ کہ جسے تم پر مقرر کیا گیا ہے)

اس میں "لے لے گا" سے مراد "موت دے گا" ہے۔

سورۂ زمر، آیت :۴۲

○ " اَللّٰهُ یَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِهَا فَیُمْسِكُ الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْهَا الْمَوْتَ وَیُرْسِلُ الْاُخْرٰٓی"

(اللہ جانیں لیتا ہے جب ان کی موت کا وقت آ جاتا ہے اور اس کی بھی جان لیتا ہے جو مرا نہ ہو بلکہ نیند کی حالت میں ہو کہ اگر اس کی موت کا فیصلہ ہو چکا ہو تو خدا اسے روک لیتا ہے ورنہ اسے جانے دیتا ہے)

مذکورہ بالا آیات میں سے آخری دو آیتوں میں غور و فکر کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ لفظ "توفّی"

قرآن مجید میں بمعنی موت کے استعمال نہیں ہوا بلکہ "اخـذ" یعنی لینے اور پکڑنے اور محفوظ کرنے کے حوالہ سے موت کا معنی مقصود لیا گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ "تـوفـی" کا لفظ اس لحہ کے لئے استعمال ہوا جب موت آتی ہے تو جان لے لی جاتی ہے تاکہ یہ حقیقت واضح رہے کہ نفس انسانی اس موت کے آنے سے محو و نابود اور فنا نہیں ہو جاتا جس کے بارے میں جاہل لوگ گمان کرتے ہیں کہ وہ فنا اور مرمٹ جاتا ہے اور ختم ہو جاتا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جانوں کو اپنے قبضہ میں لے لیتا ہے اور انہیں محفوظ کر لیتا ہے تاکہ قیامت کے دن انہیں اٹھائے کہ وہ اس کی طرف لوٹ آئیں، البتہ جہاں لفظ "تـوفـی" سے جان لینے کا حوالہ مقصود و ملحوظ نہ ہو تو وہاں موت کا لفظ ہی استعمال کیا جاتا ہے مثلاً:

سورۂ آل عمران، آیت :۴۴

○ "وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ "

(اور نہیں ہے محمد مگر اللہ کا رسول، اس سے پہلے کئی رسول گزر چکے ہیں، تو کیا اگر وہ مر جائے یا اسے قتل کر دیا جائے تو تم پچھلے پاؤں پلٹ جاؤ گے (دوبارہ کفر اختیار کر لو گے))

سورۂ فاطر، آیت :۳۶

○ " لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا "

(ان کا عذاب ختم نہیں ہوگا کہ وہ مر جائیں)

اس کے علاوہ دیگر متعدد آیات اس موضوع کی بابت موجود ہیں یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں جو آیات وارد ہوئی ہیں ان میں بھی لفظ موت ذکر ہوا ہے، ملاحظہ ہو:

سورۂ مریم، آیت :۳۳

○ " وَالسَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا "

(اور سلام ہو مجھ پر جس دن میں پیدا ہوا اور جس دن میں مروں گا اور جس دن دوبارہ زندہ اٹھایا جاؤں گا)

سورۂ نساء، آیت :۱۵۹

○ " وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا "

(اہل کتاب میں سے کوئی نہیں مگر یہ کہ وہ اس پر اس کی موت سے پہلے ضرور ایمان لائے گا اور وہ قیامت کے دن ان لوگوں پر گواہ ہوگا)

بنابرایں یہ بات ثابت ہوئی کہ لفظ "توفّی" صریح طور پر موت کے معنی میں نہیں۔

اس کے علاوہ مذکورہ بالا آیت یعنی سورۂ نسآء، ۱۵۹ میں خداوند عالم نے یہودیوں کے اس دعوے کو رد کرتے ہوئے کہ انہوں نے عیسیٰ بن مریم کو قتل کر دیا ہے یوں ارشاد فرمایا:

"وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ۭ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۝ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝ وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا"

(اور ان کا کہنا کہ ہم نے مسیح عیسیٰ بن مریم کہ جو اللہ کا رسول ہے اسے قتل کیا (درست نہیں) حالانکہ انہوں نے اسے قتل نہیں کیا اور نہ ہی اسے سولی پر لٹکایا ہے لیکن وہ غلط فہمی میں مبتلا ہوئے ہیں، اور جن لوگوں نے اس کے بارے میں اختلاف رائے پیدا کیا وہ اس کی بابت شک کا شکار ہوئے ہیں، انہیں اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں، وہ صرف گمان کی پیروی کر رہے ہیں، جبکہ انہوں نے یقیناً قتل نہیں کیا بلکہ خدا نے اسے اپنی طرف اٹھا لیا ہے اور اللہ غلبہ والا اور دانائی والا ہے، اور اہل کتاب میں سے کوئی نہیں مگر یہ کہ وہ ضرور اس پر اس کی موت سے پہلے ایمان لائے گا اور وہ ان لوگوں پر قیامت کے دن گواہ ہوگا)۔

اس میں بھی ہمارے مدعا کی تصدیق پائی جاتی ہے کیونکہ یہودی دعویٰ کرتے تھے کہ انہوں نے عیسیٰؑ بن مریمؑ کو قتل کر دیا ہے اور اسی طرح نصاریٰ بھی گمان کرتے تھے کہ یہودیوں نے عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کو پھانسی دے کر قتل کر دیا ہے البتہ وہ یعنی نصاریٰ کا عقیدہ یہ تھا کہ قتل کئے جانے کے بعد خداوند عالم انہیں قبر سے نکال کر آسمان پر لے گیا، جیسا کہ موجودہ انجیل میں مذکور ہے، لیکن جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا کہ آیات مبارکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کئے جانے اور سولی پر لٹکائے جانے کے واقعہ کی واضح و صریح لفظوں میں تکذیب کرتی ہیں، اور آیت مبارکہ "وان من اهل الكتاب الا ليؤمنن به......" سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خداوند عالم کے پاس زندہ ہیں اور اس وقت تک انہیں موت نہ آئے گی جب تک تمام اہل کتاب ان پر ایمان نہ لائیں گے، اس بناء پر آنجنابؑ کی توفی کا معنی انہیں یہودیوں کے ہاتھوں سے لے لینا ہوگا لیکن اس کے باوجود آیت مبارکہ اس معنی پر بھی صراحت کے ساتھ دلالت نہیں کرتی بلکہ صرف اس میں ظہور رکھتی ہے، تاہم اس موضوع کی بابت سورۂ نسآء کی آخری آیات کی تفسیر میں تفصیلی بحث کی جائے گی۔

عیسیٰؑ کا آسمان کی طرف اٹھایا جانا ؟

○ " وَرَافِعُكَ إِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا "
(اور تجھے میری طرف اٹھانے والا اور تجھے کافروں سے پاک کرنے والا ہے......)

" رَافِعُكَ " میں " رافع " اسم فاعل کا صیغہ ہے، اس کا معنی اٹھانے والا، بلند کرنے والا ہے، عربی زبان میں " رفع " کا معنی اٹھانا، بلند کرنا ہے، یہ "وضع" کے مقابلے میں آتا ہے جس کا معنی رکھنا، نیچا کرنا ہے۔

"مُطَهِّرُكَ" میں " مطهر " اسم فاعل ہے، یہ "طھارت" سے مشتق ہے جس کا معنی پاک ہونا ہے، یہ "قذارت" کے مقابلے میں آتا ہے جس کا معنی ناپاکی ہے، "طھارت" کے معنی کی بابت ہم پہلے بحث کر چکے ہیں، اور یہاں "رَافِعُكَ" کے ساتھ " إِلَيَّ " (میری طرف) ذکر کیا گیا ہے تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں "رفع" یعنی اٹھائے جانے سے مراد معنوی و روحانی اٹھایا جانا ہے نہ کہ ظاہری و جسمانی، کیونکہ خداوند عالم کسی بلند مکان و جگہ میں نہیں جو کہ جسمانی جگہوں میں شمار ہوتی ہو کہ جس میں اجسام قیام پذیر ہوتے ہیں، وہ نہ تو جسم و جسمانیات والی جگہوں میں ہے اور نہ ہی اس معنی میں اس کی بابت قرب و بعد یعنی نزدیک ہونا اور دور ہونا قابل تصور ہے بلکہ یہاں " إِلَيَّ " اس " إِلَيَّ " کے باب سے ہے جو آیت کے ذیلی جملہ میں یوں مذکور ہے: " ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ " (پھر تمہاری بازگشت میری طرف ہوگی)، بالخصوص جب "توفّی" سے مراد، روح کا قبض کیا جانا ہو تو مزید واضح ہو جائے گا کہ "رفع" سے مراد معنوی و روحانی بلندی ہے یعنی بلندیٔ درجہ اور خدائے متعال کا قرب ! اس کی مثال درج ذیل آیتوں میں بھی پائی جاتی ہے :

سورۂ آل عمران، آیت :۱۶۹

○ " أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ "

(وہ زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس)

اس میں خدا کی راہ میں شہید ہونے والوں کی زندگی کا تذکرہ ہے اور یہ کہ وہ خدا کے پاس روزی پاتے ہیں، تو یہاں "خدا کے پاس" کا مطلب مکانی طور پر پاس ہونا نہیں۔

اور حضرت ادریسؑ کے بارے میں یوں ارشاد ہوا:

سورۂ مریم، آیت :۵۷

○ "وَّرَفَعۡنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا"

(اور ہم نے اسے بلند جگہ پر اٹھالیا)

اس میں بھی بلند جگہ سے مراد بلندئ مرتبت و رفعتِ شان ہے نہ کہ مادی جگہ پر لے جانا!

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے کی بابت ایک قول یہ ہے کہ انہیں بلند کئے جانے اور اٹھائے جانے سے مراد یہ ہے کہ انہیں روح و بدن دونوں کے ساتھ زندہ حالت میں آسمان کی طرف اٹھایا گیا کیونکہ قرآن مجید سے بظاہر یہی ثابت ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے آنجناب کو زندہ حالت میں آسمان پر اٹھایا جو کہ مادی و جسمانی ہے اور وہی خداوند عالم کے قرب کا مقام، نزول برکات کی جگہ اور مکرم فرشتوں کا مسکن و قیام گاہ ہے، اگر ہمیں توفیق حاصل ہوئی تو ہم بہت جلد سماء (آسمان) کی حقیقت کے بارے میں تفصیلی ذکر کریں گے انشاءاللہ تعالیٰ۔

آیت مبارکہ میں پہلے آنجناب کی توفی، پھر ان کا آسمان کی طرف اٹھایا جانا اور پھر انہیں کافروں سے پاک کیا جانا مذکور ہے، گویا کافروں سے پاک کیا جانا آسمان کی طرف اٹھائے جانے کے بعد اور اس کی فرع و مربوط امر کی حیثیت رکھتا ہے اس سے بھی کافروں سے پاک کئے جانے کا معنوی و روحانی ہونا ثابت ہوتا ہے نہ کہ ظاہری و جسمانی پاک ہونا! اور اس سے مراد آنجناب کی کافروں سے دوری، ان کے ساتھ مل جل کر رہنے سے بچنا اور ان کے کفر و الحاد سے بھرے ہوئے معاشرہ کا فرد قرار نہ پانا ہے۔

مؤمنین کی کافروں پر برتری

○ "وَجَاعِلُ الَّذِيۡنَ اتَّبَعُوۡكَ فَوۡقَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اِلٰى يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ"

(اور جن لوگوں نے تیری پیروی انہیں قیامت تک کافروں پر برتری دینے والا ہوں)

اس آیت میں خداوند عالم کا وعدہ ذکر کیا گیا ہے جو اس نے عیسیٰ علیہ السلام سے کیا کہ بہت جلد ان کے پیروکاروں کو ان کی نبوت کا انکار کرنے والوں پر برتری عطا کرے گا، اور یہ برتری قیامت کے دن تک باقی رہے گی،

خداوند عالم نے برتری پانے والوں اور ان کے مدمقابل لوگوں کے تقابلی تذکرہ میں ان دونوں گروہوں کی علامات و نشانیاں اور صفات یہ ذکر کیں کہ برتری پانے والے وہ ہیں جنہوں نے عیسیٰ کی پیروی کی اور ان کے علاوہ وہ لوگ ہیں

جنہوں نے عیسیٰؑ کا انکار کردیا یعنی انہیں اللہ کا نبی نہ مانا، یہاں اللہ تعالیٰ نے ان گروہوں میں سے کسی کا نام ذکر نہیں کیا یعنی بنی اسرائیل یا یہودیوں کا نام لئے بغیر صرف "عیسیٰؑ کی پیروی کرنے والے" اور "اس کا انکار کرنے والے" کے الفاظ ذکر کیے، تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے برتری کے معیار اور اس سے محروم ہونے والوں کے سبب سے آگاہی دلانا چاہی، کہ جنہوں نے عیسیٰؑ کی مخالفت کی وہ کافر ہوگئے، اس سے ثابت ہوا کہ عیسیٰؑ کی پیروی کرنے سے مراد حق کی پیروی کرنا ہے یعنی خدا کی رضا و خوشنودی کی پیروی کرنا، بنابریں جملہ " الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ " (وہ لوگ جنہوں نے تیری پیروی کی) صرف ان نصاریٰ پر صادق آئے گا جنہوں نے ظہورِ اسلام سے پہلے اور اسلام کے ذریعے دینِ عیسیٰؑ کے منسوخ ہو جانے سے پہلے آنجنابؑ کی پیروی کرتے رہے اور اس پر استقامت و پائیداری دکھائی، اور ان کے ساتھ ساتھ ان مسلمانوں پر بھی صادق آتا ہے جنہوں نے ظہورِ اسلام کے بعد اسلام کے سایہ میں حق کی پیروی کا دم بھرا اور اس پر قائم رہے کہ نتیجتاً وہ بھی حق کی پیروی کرنے کے حوالہ سے عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں میں شمار ہوں گے۔

اس سے ثابت ہوا کہ برتری سے مراد مادی طاقت وسلطنت کی بنیاد پر دوسروں سے مافوق ہونا نہیں بلکہ دلیل و منطق اور عقیدہ میں پختگی کی بناء پر برتری مقصود ہے، لہٰذا آیت کا معنی یہ ہوگا کہ "تیرے پیروکار خواہ وہ نصاریٰ میں سے ہوں یا مسلمانوں میں سے ہوں، بہت جلد اپنی دلیل و منطق اور درست اعتقاد کی بنیاد پر ان یہودیوں پر برتری پائیں گے جنہوں نے تیرا انکار کیا اور یہ برتری قیامت تک باقی رہے گی۔

یہ ہے وہ معنی جو آیت کی تفسیر میں بعض مفسرین نے پیش کیا ہے اور اسے دیگر مفسرین نے بھی پسند کیا۔

لیکن میری نظر میں آیت مبارکہ کے الفاظ اور معانی دونوں سے اس رائے کی صحت ثابت نہیں ہوتی کیونکہ آیت مبارکہ کے ظاہری الفاظ " اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ " مستقبل کے حالات کی خبر دیتے ہیں کہ بہت جلد یعنی اب سے تھوڑے عرصہ کے بعد یہ تینوں امور واقع ہوں گے (توفی، آسمان پر اٹھایا جانا اور کافروں سے پاک کیا جانا) اور جملہ "وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ......" ایک اچھے وعدہ اور خوشخبری پر مشتمل ہے کہ جس کا بہت جلد وقوع پذیر ہونا یقینی امر ہے، اور یہ بات واضح ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں کی دلیل و حجت درحقیقت حضرت عیسیٰؑ ہی کی دلیل و حجت ہے اور وہ وہی ہے جس کا تذکرہ خداوند عالم نے ان آیات مبارکہ میں فرمایا ہے جن میں حضرت مریمؑ کو بشارت دی گئی اور وہ ایسی دلیلیں ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ حضور میں بھی برتری رکھتی تھیں اور ان کے آسمان کی طرف اٹھائے جانے کے بعد بھی برتری کی حامل تھیں، بلکہ ان کے زمانہ حضور میں زیادہ مضبوط اور مخالفوں و کفار کا منہ توڑنے والی تھیں اور حق کے منکروں کے شبہات کو دور کرنے والی تھیں، اس بناء پر یہ معنی کیونکر درست قرار دیا جا سکتا ہے کہ مستقبل میں تیرے پیروکاروں کی

دلیل و حجت مخالفین پر فوقیت وغلبہ پالے گی؟ اور پھر اس فوقیت وغلبہ کو" اِلٰی یَوۡمِ الۡقِیٰمَةِ " کے الفاظ کے ساتھ ذکر کرنے کا کیا معنی ہے؟ جبکہ حجت و دلیل کے غلبہ کی بابت زمانی قید وغیرہ کے ذکر کی ضرورت ہی نہیں ہوتی بلکہ اس کا کسی وقت سے مربوط قرار دیا جانا ہی بے معنی ہے، اور اس سے بالاتر یہ کہ دلیل و حجت کا غلبہ و برتری قیامت کے دن بھی اپنے حال پر باقی ہو گی جیسا کہ قیامت کے دن سے مربوط آیات مبارکہ میں اس دن کے حالات کے تذکرہ سے ثابت ہوتا ہے۔

دلیل وحجت کی برتری ؟

اس مقام پر ایک سوال ممکن ہے کہ دلیل و حجت کی برتری سے مراد شاید اس کے مقبول عام ہونے کے حوالہ سے ہے اور وہ اس طرح کہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں کی دلیل و حجت پر زیادہ کان دھریں گے اور زیادہ اس کی اطاعت کریں گے کہ جس کے نتیجہ میں عیسیٰؑ کے پیروکاروں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوگا، ان کی بنیاد مضبوط ہوگی اور ان کی اجتماعی وملی قوت بڑھ جائے گی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس امکانی واحتمالی رائے کی بازگشت یا تو اس بات کی طرف ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حقیقی پیروکاروں کو سلطنت وحاکمیت اور معاشرتی قوت کے حوالہ سے برتری حاصل ہوگی جو کہ امر واقعہ کے خلاف ہے، اور یہ احتمال کہ آیت مبارکہ میں مستقبل کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ آخر الزمان میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں میں کچھ لوگ ایسے بھی ائیں گے جو مخالفین پر برتری وغلبہ پائیں گے، یہ وہ بات ہے جس کی تصدیق وتائید آیت کے الفاظ سے نہیں ہوتی، یا اس احتمالی رائے کی بازگشت اس بات کی طرف ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں کی تعداد بڑھ جائے گی وہ کثیر تعداد میں ہوں گے اور آیت میں ان کی برتری سے مراد یہ ہے کہ وہ کافروں پر غلبہ پائیں گے یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد حق والے افراد باطل والوں سے زیادہ ہو جائیں گے۔ لیکن یہ بات بھی امر واقعہ کے خلاف ہے اور میدانی حقائق سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عہد سے لے کر اب تک یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ اہل باطل کی تعداد بڑھ رہی ہے اور وہ اہل حق کے مقابلے میں زیادہ تعداد میں ہیں جبکہ آنجنابؑ کے بعد ہمارے زمانہ تک تقریباً بیس صدیاں گزر چکی ہیں، اس کے ساتھ ساتھ آیت کے الفاظ سے بھی اس کی تائید نہیں ہوتی کیونکہ آیت مبارکہ میں فوقیت و برتری کا جو تذکرہ ہوا ہے اگر اسے اس تناظر میں دیکھا جائے کہ اس میں یہودیوں پر خداوند عالم کی ناراضگی اور غیض وغضب نازل ہونے کی خبر دی گئی ہے تو اس صورت میں فوقیت و برتری ان کے تسلط وغلبہ کے حوالہ سے متصور ہوگی خواہ وہ دلیل و حجت کی بنیاد پر حاصل ہو یا سلطنت واقتدار کی حیثیت میں ہو، لیکن تعداد کی کثرت کی بنیاد پر برتری کا کوئی ثبوت آیت سے نہیں ملتا جیسا کہ اس کے

الفاظ اور سیاق وسباق سے ظاہر ہے۔

ایک اہم نکتہ

آیت مبارکہ میں دونوں فریقوں کے بارے میں جو الفاظ ذکر ہوئے ہیں وہ یہ ہیں :

(۱) " الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْكَ "،

(۲) " الَّذِیْنَ كَفَرُوْا "،

یعنی" وہ لوگ جنہوں نے تیری پیروی کی" اور " وہ لوگ جنہوں نے انکار کیا "۔

تو جملہ فعلیہ کسی کام کے واقع ہونے اور انجام پانے پر دلالت کرتا ہے نہ یہ کہ وہ کام صفت کی صورت میں ہے یعنی "متبعین" اور "کافرین" کہ ان الفاظ سے اتباع اور کفر پر قائم ہونا سمجھا جاتا ہے : اور یہ بات واضح ہے کہ کسی امت کے بعض افراد کی طرف سے کسی کام کا کیا جانا جبکہ امت کے دیگر افراد اس پر راضی ہوں اور عملی طور پر اس کام کو انجام بھی دیں یعنی اسی طریقہ وروش کو اپنائیں جو ان بعض افراد نے اپنائی اس کام کی امت کے تمام افراد کی طرف نسبت کو درست قرار دیتا ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں یہودیوں کو ان کے اسلاف کے متعدد افعال کے حوالہ سے سرزنش ہوئی ہے مثلاً انبیاء کو قتل کرنا اور انہیں اذیت وتشدد کا نشانہ بنانا، خداوند عالم کے فرامین ودستورات پر عمل کرنے سے تکبر وسرتابی کرنا اور کتاب خدا کی آیات میں تحریف کرنا وغیرہ، تو ان اعمال کی وجہ سے جو ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں نے انجام دیئے ان کو مورد عتاب قرار دیا گیا، بنابرایں " الَّذِیْنَ كَفَرُوْا " (وہ لوگ، جنہوں نے کفر اختیار کیا) سے یہودی اور " الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا " (وہ لوگ جنہوں نے پیروی کی) سے نصاریٰ مراد لینا درست وصحیح ہے، اور نصاریٰ کے اسلاف کے اعمال کی بناء پر اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے اور آنجناب کی پیروی کے حوالہ سے سب کو ایک ہی نگاہ سے دیکھا جائے گا، البتہ ان کے ایمان سے مراد حقیقی ودرست عقیدہ ہے کہ جو خدا کے نزدیک پسندیدہ اور مورد قبول ہے اسی کے حوالہ سے انہیں یہودیوں پر فوقیت وبرتری عطا کرنے کا ذکر ہوا ہے، نہ کہ ان نصاریٰ کے عقیدہ کے حوالہ سے کہ جنہوں نے دعوت اسلام کے ظاہر ہونے سے پہلے تثلیث یعنی تین خداؤں کے نظریہ کی پیروی کی، لہٰذا آیت مبارکہ میں برتری وفوقیت سے مراد یہ ہے کہ نصاریٰ یعنی وہ لوگ جن کے اسلاف نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیروی کی انہیں یہودیوں یعنی ان لوگوں پر جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کیا اور آنجناب کے ساتھ مکر وفریب کے مرتکب ہوئے، برتری حاصل ہوگی، گویا اس مقام پر اصل مقصد یہ ہے کہ یہودیوں کا خدا کے غضب وناراضگی سے دوچار ہونا، خدا کے مکر کا نشانہ بننا اور ان کی پوری قوم پر خدائی عذاب کا شدید ترین شکل میں نازل

ہونا بیان کیا جائے، اور ہم نے ابتدائے سخن میں جو ذکر کیا ہے کہ ان کے اتباع و پیروی کرنے سے مراد اتباع حق ہے کہ جس کی بناء پر انہیں فوقیت حاصل ہوگی اس سے یہودیوں پر خدائی غضب و ناراضگی وغیرہ کی بات سے کسی طرح کا بیانی تصادم لازم نہیں آتا اور نہ ہی معنی میں ایک دوسرے کی نفی کا پہلو پیدا ہوتا ہے، چنانچہ اس کی تائید و تصدیق بعد والی آیت مبارکہ میں اسلوب سخن کی تبدیلی سے ہوتی ہے کہ جس میں ارشاد ہوا: "وَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ......" (اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک اعمال انجام دیئے......)، کیونکہ اگر "الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْكَ" (وہ لوگ جنہوں نے تیری پیروی کی) سے نصاریٰ میں سے اہل حق افراد اور مسلمان مراد ہوتے تو موزوں یہ تھا کہ یوں کہا جاتا: "**واما الذین اتبعوک فیوفیھم اجورھم**" (اور وہ لوگ جنہوں نے تیری پیروی کی انہیں ان کا پورا پورا صلہ دیا جائے گا) اور سیاق کلام اور طرز بیان کو تبدیل نہ کیا جاتا، لہٰذا "الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْكَ" کے بعد "وَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا......" کہنا اس بات کی دلیل ہے کہ پیروی کرنے والوں سے حقیقی اور ظاہری دونوں طرح کے پیروی کرنے مراد ہیں کہ اگر صرف حقیقی پیروی کرنے والے مراد ہوتے تو بیان کے تسلسل میں یک رنگی برقرار رہتی۔

اس مقام پر ایک نظریہ یہ بھی موجود ہے کہ "الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا" (وہ لوگ جنہوں نے پیروی کی) سے تمام نصاریٰ اور تمام مسلمان مراد لئے جائیں اور یہ کہا جائے کہ آیت مبارکہ اس بات کی خبر دے رہی ہے کہ یہودی قیامت تک ان لوگوں کے ہاتھوں ذلیل و خوار رہیں گے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیروی کو واجب و لازم سمجھتے ہیں، تو یہ بھی سابقہ بیان کی طرح ہے، اگر اس میں بخوبی غور و فکر کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ بات آیت کی تفسیر کے حوالہ سے سب سے بہترین ہے۔

قیامت کے دن کا تذکرہ

○ "ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَیْنَكُمْ فِیْمَا كُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ"

(پھر تمہاری بازگشت میری طرف ہوگی تو میں اس کے بارے میں فیصلہ کروں گا جس کی بابت تم آپس میں اختلاف کرتے ہو)

اس آیت میں خداوند عالم نے عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے پیروکاروں اور ان کا انکار کرنے والوں سے مجموعی طور پر خطاب کیا ہے اور فرمایا ہے کہ سب کی بازگشت قیامت کے دن میری طرف ہوگی، اس بیان سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ اختتام پذیر ہوا کہ جس میں ان کی والدہ کو ان کی ولادت کی خوشخبری دیئے جانے سے لے کر ان کی دعوتِ حق اور اس سے مربوط امور اور انجام کار تک مطالب شامل ہیں۔

کافروں کا برا انجام

○ " فَاَمَّا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِیْدًا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ......"
(لیکن وہ لوگ جو کافر ہوئے تو میں انہیں سخت ترین عذاب میں مبتلا کروں گا دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی......)

بظاہر یہ آیت، جملہ "فَاَحْكُمُ بَیْنَكُمْ" کی فرع اور اس سے مربوط ہے، گویا اس جملہ کے اجمال کی تفصیل ہے، یعنی جو مطلب اس میں بطور اجمال ذکر کیا گیا تھا (کہ خدا قیامت کے دن فیصلہ کرے گا) یہ اس کی تفصیل ہے اور وہ یہ کہ خداوند عالم قیامت کے دن یہودیوں کو سخت عذاب میں مبتلا کر کے انہیں کیفر کردار تک پہنچائے گا اور ایمان والوں کو ان کا پورا پورا اجر عطا کرے گا۔

لیکن آیت میں عذاب کا دنیا میں ہونا بھی مذکور ہے " فِی الدُّنْیَا "، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آیت مبارکہ، جملہ "فاحکم بینکم" کی فرع اور اس سے ہی مربوط نہیں بلکہ پورے جملہ "وَجَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَیْنَكُمْ....." کی فرع اور اس سے مربوط ہے، اس بناء پر یہ بات ثابت ہوگی کہ جعل (وَجَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْكَ) یعنی برتر و مافوق قرار دیا جانا اور رجوع یعنی سب کی خدا کی طرف بازگشت کا عملی نتیجہ یہ ہے کہ کافر، دنیا میں ان لوگوں کے ہاتھوں شدید ترین عذاب کا شکار ہوں گے جنہیں خداوند عالم نے ان پر فوقیت دی اور برتری عطا فرمائی، اور آخرت میں جہنم کی آگ میں جلیں گے، اور کوئی ان کی مدد کرنے والا نہ ہوگا۔

یہ مطلب اپنے مقام پر ان شواہد میں سے ایک ہے جن سے ثابت ثابت ہوتا ہے کہ آیت مبارکہ میں فوقیت و برتری سے مراد دلیل و حجت کے ذریعے برتری عطا کرنا نہیں بلکہ سلطنت و طاقت کے ذریعے بالا دستی مراد ہے۔

اور جملہ "وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ" سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ لوگ قیامت کے دن شفاعت سے محروم ہوں گے کہ جو عذاب کو روک سکتی ہے، اور جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ یہ بات یہودیوں کے بارے میں خدا کا حتمی و یقینی فیصلہ ہے۔

شفاعت کے حوالہ سے تفصیلی بحث اس سے مربوطہ آیات مبارکہ کی تفسیر میں ہو چکی ہے اور آئندہ مباحث میں بھی موضوع کی مناسبت سے مربوطہ مطالب بیان کئے جائیں گے انشاء اللہ،م

ایمان والوں کا پورا پورا اجر

○ " وَ اَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَیُوَفِّیْهِمْ اُجُوْرَهُمْ......"
(اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال انجام دیئے تو خدا انہیں ان کا پورا پورا صلہ و اجر دے گا......)

اس آیت میں ان اہل ایمان کے ساتھ کیا جانے والا خدائی وعدہ مذکور ہے جنہوں نے حضرت عیسیٰؑ کی پیروی کی، اس میں انہیں جزائے خیر کی خوشخبری دی گئی ہے، لیکن اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ صرف ظاہری طور پر پیروکار کہلانا عظیم اجر و ثواب کا سبب نہیں ہو سکتا کیونکہ سابق الذکر مطالب کی روشنی میں آپ اس امر سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ اتباع و پیروی ایک ایسی صفت ہے جو کسی امت پر اس کے ان افراد کے حوالہ سے صادق آتی ہے جو واقعی و حقیقی معنی میں اسے اپناتے ہیں البتہ اس کا اثر جمیل اور ثوابِ جزیل صرف اسے حاصل ہوتا ہے جو عملی طور پر حقیقی معنی میں اسے اپناتا اور اختیار کرتا ہے اور جو صرف ظاہری و زبانی طور پر پیروکار کہلائے وہ اس اجر و ثواب سے بہرہ ور نہیں ہوتا، اسی بناء پر اس آیت میں " الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْكَ " (جنہوں نے تیری پیروی کی) کے الفاظ کو تبدیل کر کے " الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ " کہا گیا تاکہ اصل مقصد واضح و ثابت اور ظاہر و آشکار ہو سکے کیونکہ سعادت و خوش بختی اور نیک انجام کا دارومدار حقیقت پر ہوتا ہے صرف نام پر نہیں ہوتا، جیسا کہ درج ذیل آیت مبارکہ سے اس مسلمہ حقیقت کا ثبوت ملتا ہے:

سورۂ بقرہ، آیت: ۶۲

○ " اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِیْنَ هَادُوْا وَ النَّصٰرٰی وَ الصّٰبِـِٕیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ "

(وہ لوگ جو ایمان لائے اور وہ جو یہودی، نصرانی اور صابئین ہیں ان میں سے جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لائے اور عمل صالح انجام دے تو ایسے لوگوں کے لئے ان کے رب کے پاس اجر ہے اور انہیں نہ تو کوئی خوف لاحق ہوگا اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے)

تو زیر نظر آیت مبارکہ میں جس اجر و ثواب کا ذکر ہوا ہے وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ان پیروکاروں کے لئے مخصوص ہے جو ایمان لائے اور نیک اعمال انجام دیئے، ان لوگوں کو خداوند عالم ان کے اعمال کا پورا پورا صلہ عطا فرمائے گا، اور جو ان کے علاوہ ہیں یعنی صرف ظاہری طور پر پیروکار کہلانے والوں کو کچھ حاصل نہ ہوگا، چنانچہ اسی مطلب کی طرف اشارہ

کرتے ہوئے آیت کے آخر میں یہ الفاظ ذکر ہوئے: "واللّٰہ لا یحب الظالمین" (اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا)، انہی الفاظ سے آیت کے اختتام کا راز بھی ظاہر ہوتا ہے کیونکہ یہ آیت رحمت و جنت کی آیات میں سے ایک ہے اور عموماً اس طرح کی آیات کہ جو رحمت و نعمت کے ذکر پر مشتمل ہوتی ہیں ان کے اختتام میں رحمت و مغفرت کے اسماء ذکر کیے جاتے ہیں یا ان لوگوں کی مدح و تعریف ہوتی ہے جن کی شان میں آیت کا نزول ہوتا ہے، ملاحظہ ہو:

سورۂ حدید، آیت :۱۰

○ " وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ "

(اور سب سے اللہ نے اچھا وعدہ کیا ہے، اور اللہ تمہارے اعمال سے بخوبی آگاہ ہے)

سورۂ تغابن، آیت :۱۷

○ " اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ "

(اگر تم اللہ کو نیک قرض دو تو وہ تمہیں اس کا دگنا دے گا اور وہ تمہاری مغفرت کرے گا، اور اللہ بڑا شکر گزار و بردبار ہے)

سورۂ تغابن، آیت :۹

○ " وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ "

(اور جو شخص اللہ پر ایمان لائے اور عمل صالح انجام دے تو خدا اس کی خطاؤں سے درگزر کرے گا اور اسے ان باغات میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں چلتی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، یہی بہت بڑی کامیابی ہے)

سورۂ جاثیہ، آیت :۳۰

○ " فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ "

(لیکن وہ لوگ جو ایمان لائے اور اعمال صالحہ انجام دیئے تو انہیں ان کا پروردگار اپنی رحمت میں داخل کرے گا کہ یہ واضح کامیابی ہے)

اور اس طرح کی دیگر آیات میں عملی پیروی کا ذکر ہوا ہے، اور زیر نظر آیت مبارکہ میں جملہ "وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ" دراصل انہی افراد کے بارے میں ہے جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیروی کا ظاہری دعویٰ کیا مگر عملی

اتباع نہ کیا کہ جن کے مقابلے میں وہ لوگ ہیں جنہوں نے اتباع کا دعویٰ بھی کیا اور ایمان لانے کے ساتھ ساتھ اعمالِ صالحہ بھی بجالائے۔

آیات کی تلاوت

○ " ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ "
(یہ وہی ہے جو ہم آپ کے سامنے آیات اور دانائی والے ذکر سے پڑھتے ہیں)

یہ آیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی داستان کا آخری جملہ ہے یعنی اس پر ان سے متعلق مطالب کے تذکرہ کا اختتام ہوتا ہے۔ اس میں "ذکر حکیم" سے مراد قرآن مجید ہے کہ جو ذکر خدا ہے اور اپنی آیات و بینات کے حوالہ سے نہایت مضبوط و مستحکم ہے کہ جس میں باطل و ناحق کی ہرگز گنجائش نہیں اور نہ ہی کسی بے معنی و بے مقصد مطلب کی آمیزش قابل تصور ہے۔

حضرت عیسیٰؑ کی تخلیق کا تذکرہ

○ " اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ "
(بے شک عیسیٰ کی مثال آدم جیسی ہے جسے خدا نے مٹی سے پیدا کیا، پھر اس سے کہا "ہوجا" تو وہ ہوگیا)

اس آیت مبارکہ میں حضرت عیسیٰؑ کے تذکرۂ جمیل کو خلاصۃً ان کی تخلیق کے حوالہ سے پیش کیا گیا ہے جو کہ تفصیل کے بعد اجمال کی ایک صورت ہے یعنی تفصیلی تذکرہ کے بعد اجمالی ذکر کے طور پر ہے اور اس اہم نکتہ و مورد کی طرف توجہ مبذول کروانا مقصود ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی داستان میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے کہ جسے بحث و مباحثہ اور استدلال کے مقام پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ اور یہی بات کلام الٰہی کی اہم ترین خصوصیات میں سے ایک ہے، اور اس سلسلہ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تذکرہ پر مشتمل آیات مبارکہ کے نزول میں بھی یہی مقصد ملحوظ و مدِنظر قرار پایا ہے تاکہ نجران کے نصاریٰ کا

جو وفد حضرت پیغمبر اسلامؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اس کا پس منظر و پیش منظر واضح ہو سکے، لہٰذا ضروری تھا کہ آنجنابؐ کے حوالہ سے تفصیلی بحث و گفتگو کے بعد ان کی خلقت کی طرف اجمالی اشارہ ہوتا کہ یہ حقیقت ثابت و آشکار ہو جائے کہ ان کی ولادت ایک انسان کی ولادت ہی کی طرح تھی اس کے علاوہ نہیں یعنی وہ بھی اسی طرح دنیا میں آئے جس طرح حضرت آدم علیہ السلام آئے اور ان کی تخلیق چونکہ حضرت آدمؑ جیسی تھی لہٰذا ان کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ کہنا صحیح نہیں جو حضرت آدمؑ کے بارے میں کہا جاتا ہے یعنی یہ کہ وہ ایک بشر ہیں جنہیں خداوند عالم نے باپ کے بغیر پیدا کیا۔

بنا برایں آیت مبارکہ کا معنی یوں ہوگا: عیسیٰؑ کی مثال اللہ کے نزدیک آدمؑ جیسی ہے یعنی خداوند عالم کے ہاں عیسیٰؑ کی تخلیق کی بنیاد اور کیفیت آدمؑ جیسی ہے کہ اس نے جس طرح آدمؑ کو پیدا کیا اسی طرح عیسیٰؑ کو پیدا کیا اور وہ یوں کہ اس کے اجزاء مٹی سے اکٹھے کئے پھر اس سے کہا: ''ہو جا'' تو وہ بغیر باپ کے بشر کی صورت میں وجود میں آ گیا۔

اس بیان سے حقیقی معنی میں دو مضبوط دلیلیں تشکیل پاتی ہیں کہ جن میں سے ہر ایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کی نفی میں کفایت کرتی ہے:

پہلی دلیل:

حضرت عیسیٰؑ خدا کی مخلوق ہیں اور چونکہ خداوند عالم ان کی خلقت سے پورے طور پر آگاہ ہے اور وہ اپنی آگاہی و علم میں ہرگز غلطی نہیں کر سکتا، اس نے حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں بتایا ہے کہ اس نے اسے بشری خلقت عطا کی اور وہ میری مخلوق ہے اگرچہ اس کا باپ کوئی نہیں لیکن اس کا مخلوق ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ وہ عبد ہے رب نہیں (بندہ ہے خدا نہیں)۔

دوسری دلیل:

حضرت عیسیٰؑ کی خلقت میں حضرت آدمؑ کی خلقت سے زائد کچھ نہیں پایا جاتا کہ جس کی بناء پر انہیں بشریت سے ربوبیت کا مقام حاصل ہو، اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خلقت کی کیفیت اس بات کی متقاضی ہو کہ انہیں خدائی کا مقام دیا جائے تو حضرت آدمؑ کی خلقت بھی اسی کی متقاضی ہوگی جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا ماننے والے حضرات حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں اس طرح کا عقیدہ نہیں رکھتے، لہٰذا واجب ہے کہ اس طرح کی بات یعنی خدائی کا عقیدہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بھی نہ رکھیں کیونکہ دونوں کی تخلیقی مماثلت یہی تقاضا کرتی ہے۔

بہرحال آیت مبارکہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ عیسیٰؑ کی خلقت آدمؑ کی خلقت کی طرح طبیعی و مادی خلقت تھی اگرچہ اس کی کیفیت اس طور و طریقہ سے قطعی مختلف تھی جو بنی نوع آدم کے توالد و تناسل کی بابت جاری و ساری ہے کہ جس میں کسی

بچہ کا وجود میں آنا باپ کے ذریعے ہوتا ہے، اور جملہ "فَيَكُوْنُ" گزرے ہوئے حال کو بیان کرتا ہے، اور اس سے جملہ "ثُمَّ قَالَ لَهُ كُنْ" جو کہ فوریت اور عدم تدریج پر دلالت کرتا ہے سے نفی و تصادم کا کوئی پہلو پیدا نہیں ہوتا کیونکہ نسبتیں مختلف ہیں اور یہ تمام موجودات خواہ تدریجی الوجود ہوں یا غیر تدریجی الوجود (یعنی ان کا وجود میں آنا تدریجی طور پر اور تخلیق و تکوین کے مراحل طے کرنے کے بعد ہو یا دفعتاً اور کسی طرح کے مراحل طے کرنے کے بغیر ہو) سب خداوند عالم کی تخلوق اور اس کے اس امر سے وجود میں آئی ہیں جسے کلمۂ "كُنْ" سے تعبیر کیا گیا ہے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: "اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ" (سورۂ یٰس، آیت ۸۲) اور جب ان موجودات کی بابت تجزیہ و تحلیل کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کثیر موجودات تدریجی صورت میں وجود میں آئی ہیں لیکن یہ اس حوالہ سے ہے کہ ان کا وجودی تجزیہ ان کے تدریجی اسباب کی بناء پر کیا جائے، اور اگر ان کی بابت خدا سے تعلق کے حوالہ سے تجزیہ کیا جائے تو اس میں تدریجی صورت یا زمانی فاصلہ ہرگز ملحوظ نہیں ہوتا جیسا کہ خداوند عالم کا ارشاد ہے:

سورۂ قمر، آیت :۵۰

○ "وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍۢ بِالْبَصَرِ"

(ہمارا امر صرف ایک ہے جو آنکھ جھپکنے جیسا ہے)

اس موضوع کی بابت مزید تفصیل اس کے مقام پر ذکر ہوگی، انشاء اللہ تعالیٰ،

مذکورہ بالا مطالب کے علاوہ جو نہایت اہم نکتہ اس مقام پر قابل ذکر و لائق بیان ہے وہ یہ کہ جملہ "ثُمَّ قَالَ لَهُ كُنْ فَيَكُوْنُ" سے اس حقیقت کا کھلا ثبوت ملتا ہے کہ خداوند عالم کسی چیز کی تخلیق میں اسباب کا محتاج نہیں کہ جن کی وجہ سے اس کی پیدا کردہ موجودات کی کئی قسمیں ہو جائیں کہ جن میں سے بعض کا پیدا کرنا ممکن اور بعض کا محال و ناممکن، بعض کا آسان اور بعض کا مشکل، بعض کا نزدیک اور بعض کا دور ہو، بلکہ حقیقت الامر یہ ہے کہ اس کے نظام تخلیق میں اسباب کا مختلف ہونا موثر نہیں ہوتا بلکہ وہ جو کچھ چاہتا ہے اور جسے پیدا کرنے کا ارادہ کرتا ہے اس سے کہتا ہے "ہو جا" تو وہ ہو جاتا ہے اور پھر اسے ان عام و معمول کے اسباب کی ضرورت نہیں ہوتی جو کسی چیز کے وجود میں آنے میں دخیل ہوتے ہیں، (بلکہ اس کی قدرت کاملہ اور ارادہ ہی کافی ہوتا ہے اور اسی سے اس کی ارادہ کردہ شے وجود میں آ جاتی ہے)

تخلیق کے حوالہ سے یہ بات قابل ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ میں جو نظام قائم کیا ہے اس میں اصل و اساس اس کا ارادہ و مشیت ہے کہ جو ہر چیز پر غالب و حاکم ہے کوئی شے اسے مغلوب نہیں کر سکتی اور یہ کوئی چیز اس پر اثر انداز ہو کر اسے مقصد و مراد سے محروم کر سکتی ہے بلکہ وہ حتمی و یقینی نتیجہ کا سرچشمہ ہوتا ہے اس بناء پر اللہ کا ارادہ ہی حقیقی بنیاد ہے اس کے سوا کوئی سبب کارگر ثابت نہیں ہو سکتا۔ م

خدا، سرچشمۂ حق وحقیقت

○ " اَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنۡ مِّنَ الۡمُمۡتَرِيۡنَ "
(حق تیرے پروردگار کی طرف سے ہے لہٰذا تو شک کرنے والوں میں سے نہ ہو)

یہ آیت سابقہ آیت (اِنَّ مَثَلَ عِيۡسٰى ......) میں مذکور مطلب کی تاکید مزید پر مشتمل ہے حالانکہ سابقہ آیت میں حرف "ان" کے ساتھ موضوع کی تاکید وارد ہوئی تھی، اور یہ اسی طرح سے ہے جیسے اصل واقعہ اور اس کی تفصیل کی بابت تاکید کرتے ہوئے ارشاد ہوا: " ذٰلِكَ نَتۡلُوۡهُ عَلَيۡكَ مِنَ الۡاٰيٰتِ وَالذِّكۡرِ الۡحَكِيۡمِ "، اس تاکید کے ساتھ ساتھ حضرت پیغمبر اسلامؐ کے قلب مبارک کی خوشی اور انہیں اس مطلب سے باخبر کر کے ان کی طیب خاطر کا سامان فراہم کرنا مقصود ہے کہ وہ حق پر ہیں اور نصاریٰ کے مقابلے میں مضبوط دلائل سے لیس ہونے کی بناء پر اپنے مؤقف میں صحیح سمت پر قائم ہیں بلکہ اس سلسلہ میں ان کی حوصلہ افزائی بھی ہو جائے۔

یہ جملہ یعنی " اَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّكَ " قرآن مجید کے نہایت عمدہ و فصیح و بلیغ ترین بیانات میں سے ایک ہے کیونکہ اس میں "حــق" کو صرف "مــن" کے ساتھ مقید کر کے ذکر کیا گیا ہے جو کہ ابتداء پر دلالت کرتا ہے اور اس کے علاوہ کوئی حرف اس خصوصیت کا حامل نہیں، مثلاً اگر یوں کہا جاتا: " **الحق مع ربک** " (حق تیرے پروردگار کے ساتھ ہے) تو اس سے وہ معنی جو حرف "مــن" میں ملحوظ وظاہر ہے ہرگز نہ سمجھا جا سکتا بلکہ اس کے برعکس اس میں شرک کا شائبہ پایا جاتا اور یہ سمجھا جاتا کہ حقیقت میں خدا ناتواں ہے، ..... جبکہ یہ دونوں نسبتیں یعنی شرک و عجز و ناتوانی، خداوند عالم کی بابت نا قابل تصور اور غلط و نادرست ہیں۔ ، اور اس میں ایک نہایت اہم نکتہ یہ ہے کہ ہر قول حق اور ہر وہ چیز جو اپنے آپ میں ایک مسلمہ حقیقت کی حامل ہے خواہ وہ جس قدر یقینی اور نا قابل انکار کیوں نہ ہو جیسے "چار، دو کا، دگنا ہے" اور "ایک، دو کا آدھا ہے" اور اس طرح کے دیگر امور، وہ سب ایسی چیزیں ہیں جو عالم موجودات میں پائی جاتی ہیں یعنی انسان انہیں وجود کے لباس میں ملبوس پاتا ہے اور جہاں تک وجود کا تعلق ہے تو اس کا سرچشمہ ذاتِ خداوندی ہے یعنی ہر وجود اسی سے ہے لہٰذا سب کا سب حق اسی سے ہے اور وہی اس کا سرچشمہ اور اصل و اساس ہے اور یہ اسی طرح سے ہے جیسے ہر طرح کی خیر کا سرچشمہ ذاتِ خداوندی ہے، اسی بناء پر اس کی بابت یہ بات برحق ہے کہ وہ جو کچھ کرتا ہے اس کے بارے میں اس سے باز پرس نہ ہو گی جبکہ لوگوں سے باز پرس ہو گی (لَا يُسۡـَٔلُ عَمَّا يَفۡعَلُ وَهُمۡ يُسۡـَٔلُوۡنَ)، اس حوالہ سے غیر خدا کا کام اس صورت میں حق کے ساتھ کہلائے گا

جب وہ حق ہوگا لیکن خداوند عالم کا کام چونکہ سراپا وجود ہے لہٰذا اس کی عملی صورت حق ہی حق ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔

روایات پر ایک نظر

حضرت مریمؑ کا خدائی انتخاب

تفسیر قمی میں آیت مبارکہ "یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰکِ وَطَہَّرَکِ وَاصْطَفٰکِ عَلٰی نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ" کی تفسیر میں مذکور ہے کہ امامؑ نے ارشاد فرمایا:

" اصطفاها مرتين، اما الاولٰى فاصطفاها اى اختارها، واما الثانية فانها حملت من غير فحل فاصطفاها بذلك علٰى نساء العالمين"،

خداوند عالم نے انہیں دوبارہ چنا پہلی بار چننے کا ذکر ان لفظوں میں ہوا ہے: "اصْطَفٰکِ وَطَہَّرَکِ" کہ تجھے چن لیا اور پاک بنایا، اور دوسری بار چننے کا ذکر ان لفظوں میں ہوا: "وَاصْطَفٰکِ عَلٰی نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ" اور تجھے تمام عورتوں میں سے چن لیا، یعنی بغیر شوہر کے حاملہ ہو جانے کے حوالہ سے تمام خواتین پر امتیاز بخشا،

(تفسیر قمی، جلد ۱، ص ۱۰۲)

اصطفاء کا مخصوص معنی !

تفسیر مجمع البیان میں مذکور ہے کہ امام ابو جعفر محمد باقر علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

" معنى الآية اصطفاك لذرية الانبياء، و طهرك من السفاح، واصطفاك لولادة عيسٰى من غير فحل"،

آیت کا معنی یہ ہے کہ خدا نے تجھے انبیاءؑ کی ذریت و نسل کے لئے چن لیا، اور تجھے برائی (غیر شرعی جنسی تعلق) سے پاک رکھا، اور تجھے شوہر کے بغیر عیسیٰؑ کی ولادت کے لئے منتخب کیا،

(تفسیر مجمع البیان جلد ۲ صفحہ ۴۴۰)

امامؑ کے ارشاد گرامی میں جملہ "اصطفاک للذرية الانبياء" (تجھے انبیاء کی ذریت ونسل کے لئے چن لیا) کا مطلب یہ ہے کہ تجھے اس مقصد کے لئے چنا کہ تو نیک وصالح ذریت ہو جو انبیاء سے نسبت پانے کے لائق ہو، اور جملہ "وطهرک من السفاح" کا معنی یہ ہے کہ تجھے برے عمل (زنا) سے عصمت عطا کی، اگر چہ حضرت مریمؑ ہر برائی و گناہ سے پاک ومعصومہ بی بی تھیں لیکن بالخصوص زنا سے عصمت عطا کرنے کا ذکر اس وجہ سے ہوا کہ انہوں نے بغیر شوہر کے عیسیٰ علیہ السلام کو جنم دیا، بنا بریں امامؑ کا فرمان درحقیقت اصطفاء اور پاک قرار دیئے جانے کے بعض لوازم کے بیان پر مشتمل ہے، لہٰذا مذکورہ بالا دو روایتوں کے درمیان تعارض وتصادم نہیں پایا جاتا جیسا کہ دونوں روایتوں کے الفاظ سے بخوبی عیاں ہے، اور اس سے پہلے بیان ہو چکا ہے کہ آیت مبارکہ سے بھی بظاہر اسی معنی ومطلب کا ثبوت ملتا ہے۔

احادیثِ نبویہؐ سے اقتباس

پہلی حدیث نبویؐ

تفسیر "درمنثور" میں مذکور ہے کہ احمد اور ترمذی (کہ انہوں نے حدیث کو صحیح قرار دیا ہے) اور ابن منذر، ابن حبان اور حاکم نے انس سے روایت کی ہے انہوں نے کہا کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ارشاد فرمایا:

"حسبک من نساء العالمين مريم بنت عمران و خديجة بنت خويلد و فاطمة بنت محمد و آسية امراة فرعون"

عالمین کی عورتوں میں سے ..... ان سے بڑھ کر کوئی نہیں...... : عمران کی بیٹی مریمؑ، خویلد کی بیٹی خدیجہؑ، محمدؐ کی دختر فاطمہؑ اور فرعون کی زوجہ آسیہ،

(تفسیر "درمنثور" جلد ۲ صفحہ ۲۳)

سیوطی نے لکھا ہے کہ اس روایت کو ابن ابی شیبہ نے حسن سے مرسل طور پر (یعنی سند وحوالہ کے ذکر کے بغیر) پیش کیا ہے۔

دوسری حدیث نبویؐ

تفسیر "درمنثور" ہی میں ہے کہ حاکم نے اس حدیث کو صحیح قرار دیتے ہوئے جناب عبداللہ ابن عباس سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ارشاد فرمایا: **"افضل نساء العالمين خديجة و فاطمة و**

مریم و آسیة امرأة فرعون"،

(تمام جہانوں کی عورتوں سے افضل یہ چار ہیں: خدیجہ، فاطمہ، مریم اور آسیہ زوجۂ فرعون)،

(ملاحظہ ہو، تفسیر درمنثور ج ۲ ص ۲۳)

تیسری حدیث نبویؐ

اسی کتاب "درمنثور" میں ہے کہ ابن مردویہ نے حسن سے روایت کی کہ انہوں نے کہا: حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"ان اللّٰہ اصطفٰی علٰی نساء العالمین اربعة: آسیة بنت مزاحم، مریم بنت عمران، خدیجة بنت خویلد و فاطمة بنت محمدؐ"

خداوند عالم نے کائنات کی تمام خواتین میں سے چار کو منتخب فرمایا ہے: (۱) آسیہ بنت مزاحم، (۲) مریم بنت عمران (۳) خدیجہ بنت خویلد (۴) فاطمہ بنت محمدؐ (بحوالہ مذکورہ بالا)

چوتھی حدیث نبویؐ

تفسیر "درمنثور" ہی میں ابن ابی شیبہ اور ابن جریر سے منقول ہے انہوں نے حضرت فاطمہ زہراء علیہا السلام کا ارشاد گرامی بیان کیا کہ آپؑ نے فرمایا: میرے والد گرامی قدر حضرت پیغمبر خداؐ نے مجھ سے ارشاد فرمایا: **"انت سیدة نساء اهل الجنة لا مریم البتول"**

تو ہی بہشت کی خواتین کی سردار ہے نہ کہ حضرت مریمؑ عذراء!

پانچویں حدیث نبویؐ

"درمنثور" ہی میں ابن عساکر کے حوالہ سے جناب عبداللہ ابن عباس کی روایت مذکور ہے انہوں نے کہا کہ حضرت رسول خداؐ نے ارشاد فرمایا ہے:

"سیدة نساء اهل الجنة مریم بنت عمران ثم فاطمة ثم خدیجة ثم آسیة امرأة فرعون"

(جنت کی خواتین کی سردار یہ ہیں: مریم دختر عمران، پھر فاطمہ، پھر آسیہ، پھر زوجۂ فرعون)

چھٹی حدیث نبویؐ

اسی کتاب تفسیر "درمنثور" میں ابن عساکر کے حوالہ سے مقاتل کے اسناد سے ضحاک کی روایت ذکر کی گئی ہے انہوں نے کہا کہ جناب عبداللہ ابن عباس نے بیان کیا کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ارشاد فرمایا ہے:

" اربع نسوة سادات عالمهن: مريم بنت عمران و آسية بنت مزاحم و خديجة بنت خويلد و فاطمة بنت محمدؐ و افضلهن عالماً فاطمة "،

چار خواتین اپنے اپنے زمانہ کی عورتوں کی سردار ہیں: پہلی مریم بنت عمران، دوسری آسیہ بنت مزاحم، تیسری خدیجہ بنت خویلد اور چوتھی فاطمہ بنت محمدؐ، اور ان سب میں سے فاطمہ کو اپنے دور کی بافضیلت ترین سردار ہونے کا مقام حاصل ہے۔

ساتویں حدیث نبویؐ

تفسیر "درمنثور" ہی میں ابن ابی شیبہ کی ایک روایت مذکور ہے کہ انہوں نے عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کے حوالہ سے بیان کیا کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ارشاد فرمایا:

" فاطمة سيدة نساء العالمين بعد مريم ابنة عمران و آسية امرأة فرعون و خديجة ابنة خويلد "،

فاطمہ تمام جہانوں کی عورتوں کی سردار ہے، اس سے پہلے مریم بنت عمران، آسیہ زوجۂ فرعون اور خدیجہ بنت خویلد اس مقام پر فائز تھیں، (مذکورہ بالا تمام حدیثیں تفسیر درمنثور کے مندرجہ بالا حوالہ سے منقول ہیں)

آٹھویں حدیث نبویؐ

کتاب "خصال" میں مؤلف نے اپنے اسناد سے عکرمہ کی روایت ذکر کی ہے کہ جناب ابن عباس نے کہا: حضرت رسول خداؐ نے زمین پر چار لکیریں کھینچیں اور فرمایا:

"خير نساء الجنة مريم بنت عمران و خديجة بنت خويلد و فاطمة بنت محمد و آسية بنت مزاهم امرأة فرعون "

بہشت کی خواتین کی سردار مریم دختر عمران اور خدیجہ دختر خویلد اور فاطمہ بنت محمد اور آسیہ بنت مزاحم زوجۂ عمران ہے، (ملاحظہ ہو: کتاب خصال شیخ صدوق، صفحہ ۲۰۵ حدیث ۲۲)

نویں حدیث نبویؐ

خصال ہی میں شیخ صدوقؒ نے اپنے اسناد سے ابوالحسنؑ الاول یعنی حضرت علی علیہ السلام کا بیان ذکر کیا ہے انہوں نے کہا کہ حضرت رسول خداؐ نے ارشاد فرمایا:

" ان اللّٰہ عزوجل اختار من النساء اربعاً: مریم و آسیة و خدیجة و فاطمة "

خداوند عالم نے خواتین میں سے چار کو منتخب فرمایا: مریم، آسیہ، خدیجہ اور فاطمہ،

(بحوالہ کتاب خصال، صفحہ ۲۲۵ حدیث ۵۸)

مذکورہ بالا موضوع کی بابت فریقین یعنی شیعہ و سنی کے حوالوں سے کثیر قریب المعنی روایات موجود ہیں اور ان چاروں خواتین کا تمام جہانوں کی عورتوں کی سرداری کے مقام پر فائز ہونا اس لحاظ سے خالی از اشکال ہے کہ ان کے درمیان ایک دوسری پر برتری کے درجات پائے جاتے ہیں جیسا کہ مذکورہ بالا چھٹی حدیث نبویؐ اور اسی طرح کی دیگر احادیث مبارکہ میں ذکر کردہ مطالب سے ثابت ہے، اس طرح کی ایک بحث اسی سورۂ مبارکہ کی آیت ۳۳ (**ان اللّٰــہ اصطفٰی آدم و نــوحــاً......**) کی تفسیر میں گزر چکی ہے، البتہ جو اہم مطلب اس موضوع میں توجہ طلب ہے وہ یہ کہ آیت مبارکہ میں "**اصطفاء**" جبکہ روایات میں "**سیادت**" مذکور ہے اور ان دونوں میں فرق ہے، "**اصطفاء**" کے بارے میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس کا معنی چن لینا ہے...... جبکہ سیادت کا معنی سرداری ہے...... اور سرداری درحقیقت اصطفاء کے مراتب کمال میں سے ہے...... اس بناء پر احادیث مبارکہ میں چار خواتین کی سرداری کا ذکر دراصل ان کے اصطفاء کے اعلیٰ ترین مراتب و درجات کے اظہار کی غرض سے ہے۔

مریمؑ کی کفالت کا مسئلہ

تفسیر العیاشی میں آیت مبارکہ " اِذْ یُلْقُوْنَ اَقْلَامَھُمْ اَیُّھُمْ یَكْفُلُ مَرْیَمَ " کے ذیل میں امام محمد باقر علیہ السلام کا ارشاد گرامی مذکور ہے جس میں آنجنابؑ نے ارشاد فرمایا: "**یقرعون بھا حین ایتمت من ابیھا**" کہ وہ لوگ ان کے بارے میں اس وقت قرعہ اندازی کر رہے تھے جب ان کے والد گرامی قدر کا انتقال ہوا اور وہ یتیم ہوگئیں کہ اب ان کی کفالت و سرپرستی کون کرے؟

(تفسیر العیاشی جلد اول صفحہ ۱۷۳ حدیث ۴۷)

حضرت مریمؑ کا دو مرتبہ اصطفاء

تفسیر قمی میں آیت مبارکہ "وَ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ" کی تفسیر میں مذکور ہے کہ خداوند عالم نے حضرت مریمؑ کو دو مرتبہ اصطفاء سے نوازا، پہلی مرتبہ اس وقت انہیں اس مقام و مرتبت پر فائز کیا جب، انہیں تمام خواتین عالم میں سے چن لیا، اور دوسری مرتبہ اس وقت جب وہ بغیر شوہر کے حاملہ ہوئیں تو اس حوالہ سے خداوند عالم نے انہیں تمام جہانوں کی خوتین پر امتیازی خصوصیت عطا کر کے چنا، (اس بیان کے تسلسل میں قمی مرحوم نے کہا) پھر خداوند عالم نے اپنے نبی (حضرت محمدؐ) سے فرمایا: "ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ...... يَا مُحَمَّد...... وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ" (یہ غیبی خبریں ہیں جو ہم تیری طرف وحی کرتے ہیں...... اے محمد...... اور تو اس وقت ان کے پاس نہ تھا جب وہ اپنے قرعے ڈال رہے تھے کہ کون مریم کی کفالت کرے گا اور تو اس وقت ان کے پاس موجود نہ تھا جب وہ آپس میں جھگڑ رہے تھے)، اور جب حضرت مریم پیدا ہوئیں تو آل عمران ان کی بابت آپس میں گومگو کرنے لگے اور سب کہنے لگے کہ ہم اس کی کفالت کریں گے، یہاں تک کہ وہ عبادت گاہ گئے اور قرعہ اندازی کرنے لگے، بالآخر قرعہ حضرت زکریاؑ کے نام پر نکلا،

(تفسیر قمی، جلد اول، صفحہ ۱۰۲)

اس روایت اور اس سے ماقبل روایت کی صحت و درستی کی تائید ہمارے سابقہ بیان سے ہوتی ہے اور اس موضوع کے حوالہ سے یہ بات معلوم رہے کہ حضرت مریمؑ کو دی جانے والی بشارت اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت اور اسی طرح آنجنابؑ کے توحیدی مشن اور معجزات کی بابت کثیر روایات وارد ہوئی ہیں لیکن اس سلسلہ سے مربوط آیات مبارکہ کی تفسیر میں ہم نے جو مطالب ذکر کیے ہیں اور جن روایات سے استناد کی عزت حاصل کی ہے وہ تفسیری بیان و بحث میں کفایت کرتی ہیں لہٰذا ان کے علاوہ دیگر احادیث و روایات کے ذکر کی ضرورت باقی نہیں رہتی، اس لئے ہم نے صرف انہی روایات کے ذکر پر اکتفاء کی ہے جن سے موضوع کے بنیادی پہلو واضح ہو جاتے ہیں۔

حضرت عیسیٰؑ اور بنی اسرائیل کے درمیان دلچسپ مکالمہ

تفسیر قمی میں آیت مبارکہ "وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ......" کی تفسیر میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کا ارشاد

حضرت مریمؑ کا دو مرتبہ اصطفاء

تفسیر قمی میں آیت مبارکہ "وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِکَةُ یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰکِ وَطَهَّرَکِ وَاصْطَفٰکِ عَلٰی نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ" کی تفسیر میں مذکور ہے کہ خداوند عالم نے حضرت مریمؑ کو دو مرتبہ اصطفاء سے نوازا، پہلی مرتبہ اس وقت انہیں اس مقام و مرتبت پر فائز کیا جب، انہیں تمام خواتین عالم میں سے چن لیا، اور دوسری مرتبہ اس وقت جب وہ بغیر شوہر کے حاملہ ہوئیں تو اس حوالہ سے خداوند عالم نے انہیں تمام جہانوں کی خوتین پر امتیازی خصوصیت عطا کر کے چنا، (اس بیان کے تسلسل میں قمی مرحوم نے کہا) پھر خداوند عالم نے اپنے نبی (حضرت محمدؐ) سے فرمایا: "ذٰلِکَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِ اِلَیْکَ ...... یا محمد...... وَمَا کُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ یُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَیُّهُمْ یَکْفُلُ مَرْیَمَ وَمَا کُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ یَخْتَصِمُوْنَ" (یہ غیبی خبریں ہیں جو ہم تیری طرف وحی کرتے ہیں......اے محمد......اور تو اس وقت ان کے پاس نہ تھا جب وہ اپنے قرعے ڈال رہے تھے کہ کون مریم کی کفالت کرے گا اور تو اس وقت ان کے پاس موجود نہ تھا جب وہ آپس میں جھگڑ رہے تھے)، اور جب حضرت مریم پیدا ہوئیں تو آل عمران ان کی بابت آپس میں گومگو کرنے لگے اور سب کہنے لگے کہ ہم اس کی کفالت کریں گے، یہاں تک کہ وہ عبادت گاہ گئے اور قرعہ اندازی کرنے لگے، بالآخر قرعہ حضرت زکریاؑ کے نام پر نکلا،

(تفسیر قمی ،جلد اول،صفحہ،۱۰۲)

اس روایت اور اس سے ماقبل روایت کی صحت و درستی کی تائید ہمارے سابقہ بیان سے ہوتی ہے اور اس موضوع کے حوالہ سے یہ بات معلوم رہے کہ حضرت مریمؑ کو دی جانے والی بشارت اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت اور اسی طرح آنجنابؑ کے توحیدی مشن اور معجزات کی بابت کثیر روایات وارد ہوئی ہیں لیکن اس سلسلہ سے مربوط آیات مبارکہ کی تفسیر میں ہم نے جو مطالب ذکر کیے ہیں اور جن روایات سے استناد کی عزت حاصل کی ہے وہ تفسیری بیان و بحث میں کفایت کرتی ہیں لہٰذا ان کے علاوہ دیگر احادیث و روایات کے ذکر کی ضرورت باقی نہیں رہتی، اس لئے ہم نے صرف انہی روایات کے ذکر پر اکتفاء کی ہے جن سے موضوع کے بنیادی پہلو واضح ہو جاتے ہیں۔

حضرت عیسیٰؑ اور بنی اسرائیل کے درمیان دلچسپ مکالمہ

تفسیر قمی میں آیت مبارکہ "وَاُنَبِّئُکُمْ بِمَا تَاْکُلُوْنَ......" کی تفسیر میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کا ارشاد

گرامی مذکور ہے آپ نے ارشاد فرمایا:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل سے کہا کرتے تھے کہ میں اللہ کا رسول ہوں اور مجھے تمہاری طرف بھیجا گیا ہے اور میں تمہارے لئے مٹی سے پرندہ کی شکل بناتا ہوں پھر اس میں پھونک ماروں گا تو اللہ کے حکم سے وہ حقیقی پرندہ بن جائے گا اور میں مادرزاد نابینا اور برص کے مریض کو تندرست کردوں گا **(انی رسول اللّٰہ الیکم وانی اخلق لکم من الطین کھیئة الطیر فانفخ فیه فیکون طیرا باذن اللّٰہ و ابرء الاکمه والابرص"** ......یاد رہے کہ عربی زبان میں "**اکمه**" کا معنی وہ بچہ ہے جو ماں کے شکم سے نابینا پیدا ہو......

بنی اسرائیل حضرت عیسیٰؑ سے کہتے تھے کہ یہ جو کچھ آپ کرتے ہیں ہم اسے جادو کے سوا کچھ نہیں سمجھتے **(ما نری الذی تصنع الاسحراً)** اگر آپ اپنے دعووں میں سچے ہیں تو ہمیں کوئی نشانی دکھائیں جس سے ہمیں آپ کے سچا ہونے کا یقین ہو جائے، **(فارنا ایة نعلم انک صادق)**،

حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے جواب میں یوں کہتے :"**ارأیتکم ان اخبرتکم بما تأکلون و ما تدخرون فی بیوتکم**" کہ اگر میں تمہیں اس سے پہلے کہ تم باہر نکلو یہ بتا دوں کہ تم نے اپنے گھروں میں کیا کھایا اور تم نے رات کو کیا کچھ جمع کر کے رکھا ہوا ہے تو کیا تمہیں میرے سچا ہونے کا یقین حاصل ہو جائے گا؟ **(تعلمون انی صادق؟)**

بنی اسرائیل کہتے: ہاں ! تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان میں سے ہر ایک سے کہتے تھے کہ تو نے یہ کھایا، تو نے یہ پیا اور تو نے یہ چیز اٹھائی، ان میں سے کچھ افراد تصدیق کرتے تھے اور کہتے تھے کہ آپ نے بالکل درست کہا ہے تو وہ ایمان لے آتے تھے اور کچھ افراد انکار کرتے تھے اور اپنے کفر پر باقی رہ جاتے تھے۔ اور ان امور میں ان کے لئے واضح نشانی موجود تھی اگر وہ ایمان لانے والے ہوتے ! (تفسیر قمی، جلد ۱، صفحہ ۱۰۲)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کے تذکرہ میں آیات کے سیاق کی تبدیلی سے مذکورہ بالا روایت کی صحت کا ثبوت ملتا ہے چنانچہ اس حوالہ سے پہلے اشارہ ہو چکا ہے۔

انبیاءؑ کی شریعتوں اور کتب کا تذکرہ

تفسیر العیاشی میں آیت مبارکہ "وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِأُحِلَّ لَكُمْ......" کی تفسیر میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد گرامی مذکور ہے جس میں آپؑ نے ارشاد فرمایا:

"کان بین داود و عیسیٰ اربع مأة سنة، وکانت شریعة عیسیٰ انه بعث بالتوحید

والاخلاص وبما اوصی بہ نوح و ابراھیم و موسٰی، وانزل علیه الانجیل، واخذ علیه المیثاق الذی اخذ علی النبیین، و شرع له الکتاب: اقامة الصلٰوة مع الدین، والامر بالمعروف ،والنھی عن المنکر، و تحریم الحرام، و تحلیل الحلال، وانزل علیه فی الانجیل مواعظ وامثال وحدود، لیس فیھا قصاص ولا احکام حدود ولا فرض مواریث، وانزل علیه تخفیف ماکان علٰی موسٰی فی التوراة وھو قول اللّٰه فی الذی قال عیسٰی لبنی اسرائیل: ولاحل لکم بعض الذی حرم علیکم وامرعیسٰی من معهٗ ممن اتبعه من المؤمنین ان یؤمنوا بشریعة التوراة والانجیل "

حضرت داوٗدعلیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان چار سو سال کا فاصلہ تھا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت یہ تھی کہ انہیں توحید، اخلاص اور وہ تمام احکام دے کر مبعوث کیا گیا تھا جن کی تبلیغ حضرت نوحؑ ،حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی امتوں کو کی تھی، اور ان پر انجیل نازل کی گئی، اور ان سے وہ میثاق بھی لیا گیا جو تمام انبیاءؑ سے لیا گیا تھا، اور ان کی کتاب میں جو احکام اور دستورات خداوندی ذکر کیے گئے ان میں دین پر عمل کرتے ہوئے اقامۂ صلوٰۃ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور حرام سے اجتناب اور حلال کو اختیار کرنا شامل تھا، اور ان پر انجیل میں مواعظ اور اخلاقی دستورات اور امثال وحدود نازل ہوئے لیکن اس میں نہ قصاص کا حکم تھا اور نہ حدود کے احکام تھے اور نہ ہی میراث کے مسائل تھے، بلکہ اس میں ان احکام کی بابت تخفیف کی گئی تھی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات میں نازل ہوئے تھے چنانچہ اسی مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خداوند عالم نے حضرت عیسیٰؑ کا وہ قول ذکر کیا جو انہوں نے بنی اسرائیل سے کہا تھا کہ میں تم پر وہ بعض چیزیں حلال کرتا ہوں جو تم پر حرام کی گئیں (وَلِاُحِلَّ لَکُمْ بَعْضَ الَّذِیْ حُرِّمَ عَلَیْکُمْ)، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے ان ساتھیوں کو جو ان پر ایمان لائے تھے حکم دیا کہ وہ تورات اور انجیل میں ذکر کیے گئے احکام و دستورات اور شرعی ضوابط پر ایمان لائیں،

(تفسیر العیاشی، جلد اول، صفحہ ۱۷۵، حدیث ۵۲)

اس روایت کو کتاب " قصص الانبیاء " میں تفصیلی طور پر حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے حوالہ سے ذکر کیا گیا ہے البتہ اس میں ہے کہ حضرت داوٗد اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے درمیان چار سو اسی (۴۸۰) سال کا فاصلہ تھا، لیکن ان دونوں روایتوں میں ذکر کیے گئے زمانی فاصلوں کی تصدیق اہل کتاب کی تاریخ سے نہیں ہوتی۔

حواریوں کی وجہ تسمیہ

کتاب عیون اخبار الرضاؑ میں ایک روایت ذکر کی گئی ہے جس میں مرقوم ہے کہ ایک شخص نے حضرت امام رضا علیہ

السلام سے پوچھا کہ حواریوں کو اس نام سے کیوں موسوم کیا گیا ہے؟ امامؑ نے ارشاد فرمایا: اس سلسلہ میں عام لوگوں کا خیال یہ ہے کہ انہیں اس نام سے موسوم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ دھوبیوں کا کام کرتے تھے اور لوگوں کے میلے کپڑے دھو کر صاف کرتے تھے اور یہ لفظ یعنی "حوار" دراصل "خبز الحوار" سے مشتق ہے، لیکن ہم اہل بیتؑ کی نظروں میں انہیں اس لئے اس نام سے موسوم کیا گیا کہ انہوں نے اپنے آپ کو بھی خلوص و اخلاص سے مالا مال کیا ہوا تھا اور دوسروں کو بھی وعظ و نصیحت اور خدا و قیامت کی یاد دلا دلا کر گناہوں کی گندگی و غلاظت سے پاک و صاف کیا ہوا تھا،

(کتاب عیون اخبار الرضاؑ، جلد ۲ صفحہ ۷۹ حدیث ۱۰)

کتاب "التوحید" میں امام رضا علیہ السلام کے حوالہ سے روایت ذکر کی گئی ہے انہوں نے ارشاد فرمایا: "انهم كانوا اثنا عشر رجلاً و كان افضلهم واعلمهم لوقا" کہ وہ یعنی حضرت عیسیٰؑ کے حواری بارہ آدمی تھے اور ان سب میں سے افضل اور اعلم (زیادہ علم والے) جناب لوقا تھے،

(توحید، صدوقؒ، صفحہ ۴۲۱)

حضرت عیسیٰؑ کا تاریخی تذکرہ

کتاب اکمال الدین میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے آپؑ نے ایک حدیث کے ضمن میں ارشاد فرمایا:

"بعث الله عيسى بن مريم و استودعه النور و العلم والحكم و جميع علوم الانبياء قبلهٗ، وزاده الانجيل، و بعثه الى بيت المقدس الٰى بنى اسرائيل يدعوهم الٰى كتابهٖ و حكمتهٖ والى اليمان بالله و رسولهٖ، فابىٰ اكثرهم الا طغياناً وكفراً، فلما لم يؤمنوا دعا ربه، وعزم عليه فمسخ منهم شياطين ليريهم ٰاية فيعتبروا فلم يزدهم ذلك الاطغياناً وكفراً، فاتىٰ بيت المقدس فمكث يدعوهم و يرغبهم فيما عند الله ثلاثة وثلاثين سنة حتي طلبته اليهود وادعت انها عذبته و دفنته فى الارض حياً، وادعىٰ بعضهم انهم قتلوه وصلبوه، وما كان الله ليجعل لهم سلطاناً عليه وانما شبه لهم، وما قدروا علىٰ عذابهٖ وقتلهٖ ولا علىٰ قتلهٖ وصلبه لانهم لو قدروا علىٰ ذلك لكان تكذيباً لقولهٖ: ولكن رفعه الله بعد ان توفاه "

خداوند عالم نے حضرت عیسیٰؑ بن مریمؑ کو مبعوث بہ نبوت فرمایا اور انہیں نور، علم و حکمت اور ان سے پہلے گزرے

ہوئے انبیاء کے تمام علوم عطا فرمائے، اس کے ساتھ ساتھ انجیل بھی ان پر نازل کی، اور انہیں بیت المقدس بھیجا تا کہ بنی اسرائیل کو اپنی کتاب وحکمت اور اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے کی دعوت دیں، لیکن ان کے اکثر افراد نے انکار کیا اور اپنی سرکشی وکفر پر ڈٹے رہے، اور ان لوگوں کے اس شدید رویہ کی وجہ سے اور ایمان لانے سے انکار پر ڈٹ جانے کی بناء پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے خدا سے دعا کی کہ وہ انہیں اس کی سزا دے، چنانچہ خداوند عالم نے ان میں سے چند شیطان صفت افراد کو مسخ کر دیا تا کہ دوسروں کے لئے نمونۂ عبرت ہوں لیکن اس کے باوجود ان لوگوں کی سرکشی وکفر میں اضافہ ہوتا گیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام بیت المقدس تشریف لے آئے اور لوگوں کو حق کی دعوت دیتے رہے اور انہیں ۳۳ برس تک خداوند عالم کے وعدہ ہائے آخرت یاد دلا کر راہ خدا پر آنے کی ترغیب دلاتے رہے اور بالآخر یہودی ان کے پیچھے پڑ گئے اور انہوں نے افواہ اڑا دی کہ انہوں نے عیسیٰؑ کو نہایت تشدد کے ساتھ زمین میں زندہ دفن کر دیا ہے، اور ان میں سے بعض افراد دعویٰ کرنے لگے کہ انہوں نے انہیں قتل کر دیا اور پھانسی پر لٹکا دیا ہے جبکہ حقیقت میں خداوند عالم نے یہودیوں کو ان پر تسلط و غلبہ نہ پانے دیا بلکہ انہیں ان کی بابت شبہ میں ڈال دیا اور وہ لوگ آنجنابؑ کو تشدد کا نشانہ بنانے اور انہیں قتل کرنے اور پھانسی دینے پر قادر ہی نہ تھے کیونکہ اگر ایسا کرنا ان کے بس میں ہوتا تو خدا کے اس بیان کی تکذیب عمل میں آجاتی جس میں اس نے ارشاد فرمایا کہ ''اللہ نے اسے ان کا وقت پورا ہونے پر اٹھالیا''، (اکمال الدین ص ۲۲۴ حدیث ۲۰)

اس روایت میں بنی اسرائیل کے چند شیطانوں کے مسخ کرنے کا ذکر ہوا ہے تو اس سے ان کے شریر ترین افراد مراد ہیں۔

اور امامؑ کا یہ ارشاد کہ حضرت عیسیٰؑ ۳۳ سال ان میں رہے، تو اس سے ان کی عمر مبارک کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ مشہور بھی یہی ہے کیونکہ آنجنابؑ گہوارہ سے بڑھاپا تک لوگوں سے ہم کلام رہے اور بچپن ہی میں نبوت کے منصب پر فائز تھے جیسا کہ ان کے تذکرہ میں ان کا اپنا صریح وواضح بیان قرآن مجید میں اس طرح موجود ہے:

''فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ ۖ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِى الْمَهْدِ صَبِيًّا ۝١٩ قَالَ اِنِّىْ عَبْدُ اللّٰهِ ۗ اٰتٰنِىَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِىْ نَبِيًّا''

(مریمؑ نے نومولود کی طرف اشارہ کیا تو لوگوں نے کہا کہ ہم اس سے کیونکر بات کریں وہ تو گہوارہ میں بچہ ہے، اس نے بول کر کہا میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب دی اور مجھے نبی بنایا ہے)،

اور امامؑ کا یہ ارشاد کہ اگر وہ لوگ حضرت عیسیٰؑ کو تشدد کا نشانہ بنانے اور انہیں قتل کرنے و پھانسی پر لٹکانے پر قادر ہوتے تو اس سے خدا کے اس فرمان کی تکذیب ہو جاتی '' لکن رفعه الله بعد ان توفاه ''، دراصل یہ الفاظ امامؑ کے اپنے ہیں جو کہ آیت مبارکہ سے نقل بالمعنی کے طور پر ہیں کیونکہ آیت میں اس طرح ہے: ''ولکن رفعه الله......'' اور

"انــی متــوفیک ورافــعک الــیّ......" توامامؑ نے ان دوآیتوں کے تقدم وتاخر کی بناء پر پہلے آنجنابؑ کی توفی (وفات، وقت پورا ہوجانا) کو ذکر کیا پھر ان کے آسمان پر اٹھائے جانے کو ذکر کیا اور اس طرح فرمایا: "ولـکـن رفعـه اللّٰـه بعدان توفاه" کہ خدا نے انہیں وفات دینے کے بعد اٹھالیا۔

ایک نوجوان حضرت عیسیٰؑ کی شبیہ بنا

تفسیر قمیؒ میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا:

"ان عیسٰی وعـد اصـحابهٗ لیلةِ رفعه اللّٰه الیه ، فاجتمعوا الیه عند المساء وهم اثنا عشر رجلاً ، فـادخـلهم بیتاً، ثم خرج الیهم من عین فی زاویة البیت وهو ینفض رأسهٗ عند الماء فقال: ان اللّٰـه اوحـی الـیّ انـهٗ رافـعی الیه الساعة و مطهری من الیهود فایّکم یلقی علیه شبحی فیقتل ویصلب ویکون معی، فی درجتی ؟، فقال شاب منهم: انا یا روح اللّٰه ! قال فانت هوذا، فقال لهم عیسٰی: اما ان منکم من یکفر بی قبل ان یصبح اثنتی عشرة کفرة ؟ فقال رجل منهم انا هو یا نبی اللّٰـه ! فقال لهٗ عیسیٰ: اتـحـس بـذلـک فـی نفسـک ؟ فلتکن هو، ثم قال لهم عیسٰی: اما انکم ستفترقون بعدی ثلاث فرق: فرقتین مفتریتین علی اللّٰه فی النار، وفرقة تتبع شمعون صادقة علی اللّٰـه فـی الـجـنـة، ثم رفع اللّٰه عیسٰی الیه من زاویة البیت وهم ینظرون الیه ، ثم قال: ان الیهود جـائـت فـی طلب عیسٰی من لیلتهم فاخذوا الرجل الذی قال لهٗ عیسٰی: ان منکم لمن یکفر بی قبـل ان یـصبـح اثـنتی عشرة کفرة ، واخذوا الشاب الذی القی علیه شبح عیسٰی فقتل وصلب، و کفر الذی قال لهٗ عیسٰی: یکفر قبل ان یصبح اثنتی عشرة کفرة "

حضرت عیسیٰؑ نے اس شب کو جس میں انہیں خداوند عالم نے اپنی طرف اٹھایا اپنے صحابہ کو بلایا، چنانچہ وہ ان کے پاس شام کے وقت اکٹھے ہوئے اور وہ بارہ افراد تھے، حضرت عیسیٰؑ انہیں ایک گھر میں لے گئے، پھر آپؑ اس چشمہ سے باہر نکلے جو گھر کے کونے میں تھا اور ان کے سر سے پانی ٹپک رہا تھا، آپؑ نے فرمایا: خداوند عالم نے میری طرف وحی کی ہے کہ وہ ابھی ابھی مجھے اپنی طرف اٹھانے والا ہے اور مجھے یہودیوں سے پاک کرنے والا ہے، کیا تم میں سے کوئی ایسا ہے جو اس بات پر راضی ہو کہ اسے خدا میری شبیہ و ہم شکل بنا دے اور میرے بجائے وہ قتل ہوجائے اور پھانسی چڑھ جائے کہ خدا اسے میرے ساتھ میرے مقام میں قرار دے ؟ ان میں سے ایک جوان اٹھا اور کہنے لگا، میں حاضر ہوں اے روح اللہ! حضرت عیسیٰؑ

نے فرمایا: ہاں وہ تو ہی ہے، پھر حضرت عیسیٰؑ نے دیگر افراد کی طرف رخ کر کے فرمایا: تم میں سے ایک شخص صبح ہونے سے پہلے بارہ دفعہ میرا انکار کرے گا (کافر ہو جائے گا) لوگوں میں سے ایک شخص نے کہا: میں ہی وہ ہوں اے اللہ کے نبی! حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس سے فرمایا: کیا تو نے اپنے اندر اس بات کو محسوس کر لیا ہے؟ تو پھر تو ہی وہ ہو جا، پھر ان لوگوں سے مخاطب ہو کر حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا: میرے بعد تم بہت جلد تین گروہوں میں بٹ جاؤ گے، دو گروہ خدا پر افتراء و جھوٹی نسبت دیں گے وہ جہنم کی آگ میں جلیں گے، ایک گروہ شمعون کی سچے دل سے پیروی کریں گے اور خدا کے ہو کر رہیں گے وہ بہشت میں جائیں گے، حضرت عیسیٰؑ نے یہ کہا اور پھر خداوند عالم نے اسے لوگوں کے سامنے ہی گھر کے کونہ سے اپنی طرف اٹھا لیا اور لوگ دیکھتے رہے، ادھر یہودی جو کہ حضرت عیسیٰؑ کے خون کے پیاسے تھے اسی رات کو ان کی تلاش میں نکل پڑے اور اسی گھر میں اس شخص کو پکڑ لیا جس سے حضرت عیسیٰؑ نے کہا تھا کہ وہ صبح ہونے سے پہلے بارہ دفعہ میرا منکر ہوگا اور اس نوجوان کو بھی پکڑ لیا جو حضرت عیسیٰؑ کی شبیہ و ہم شکل بن چکا تھا تو انہوں نے اسے قتل کر دیا اور پھانسی دے دی اور جس شخص کے کافر ہو جانے کے بارے میں حضرت عیسیٰؑ نے پیشگوئی کی تھی اس نے بارہ مرتبہ کفر اختیار کیا،

(عیون اخبار الرضاؑ، جلد اول ص ۲۱۵)

اس سے قریب المعنی روایت جناب عبداللہ ابن عباس، قتادہ اور دیگر راویوں کے اسناد سے بھی وارد ہوئی ہے، ان میں سے بعض حضرات نے کہا ہے کہ وہی نوجوان کہ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہم شکل بننے کو تیار ہوا تھا اسی نے یہودیوں کو اطلاع دی کہ حضرت عیسیٰؑ کہاں ہیں تاکہ انہیں پکڑ لیں اور قتل کر دیں، اور بعض راویوں نے اس کے علاوہ مطالب ذکر کئے ہیں، لیکن قرآن مجید ان باتوں کی بابت ساکت ہے اور کسی آیت میں اس حوالہ سے مطالب مذکور نہیں، ہم اس موضوع کی بابت آیت مبارکہ "وما قتلوه وما صلبوه ولکن شبه لهم......" کی تفسیر میں تفصیلی بحث کریں گے، انشاء اللہ تعالیٰ

حضرت عیسیٰؑ کی منفرد شخصیت

کتاب عیون اخبار الرضاؑ، جلد اول، ص ۲۱۵ میں مذکور ہے کہ حضرت امام رضاؑ نے ارشاد فرمایا:

"انهٗ ما شبه امر احد من انبياء الله وحججه على الناس الا امر عيسىٰ وحدهٗ لانه رفع من الارض حياً و قبض روحهٗ بين السماء والارض ثم رفع الى السمآء، و رد عليه روحهٗ، وذلک قوله تعالىٰ: "اذ قال الله يا عيسىٰ انى متوفيک ورافعک الىّ و مطهرک"، وقال الله عزوجل حکاية لقول عيسىٰ يوم القيامة "وكنت شهيداً عليهم مادمت فيهم فلما توفيتنى كنت انت

الرقیب علیهم وانت علیٰ کل شیئٍ شهید"

(انبیائے الٰہی اور لوگوں پر خدا کی حجت بنائے جانے والوں میں سے سوائے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے، کسی کے بارے میں صورت حال غیر واضح نہیں ہوئی، ان کے بارے میں اس لئے ایسا ہوا کہ وہ زمین سے زندہ اٹھائے گئے اوران کی روح آسمان وزمین کے درمیان قبض ہوئی، پھر انہیں آسمان کی طرف اٹھایا گیا اور انہیں ان کی روح پلٹا دی گئی، اسی مطلب کو بیان کرتے ہوئے خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: "جب خدا نے کہا اے عیسیٰؑ! میں تیرا وقت پورا کرنے والا ہوں اور تجھے اپنی طرف اٹھانے والا ہوں اور تجھے پاک کرنے والا ہوں"، اور قیامت کے دن حضرت عیسیٰؑ کے بیان کا تذکرہ کرتے ہوئے خدا نے فرمایا کہ وہ قیامت کے دن یوں کہے گا: "جب تو نے میرا وقت پورا کر دیا تو تو خود ان کا نگہبان تھا اور تو ہر چیز پر گواہ ہے"۔

دنیا کی زینت

تفسیر العیاشی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا بیان مذکور ہے کہ انہوں نے ارشاد فرمایا:

"رفع عیسیٰ بن مریم بمدرعة صوف من غزل مریم ومن نسج مریم ومن خیاطة مریم، فلما انتهیٰ الی السمآء نودی یا عیسیٰ الق عنک زینة الدنیا "

جب حضرت عیسیٰؑ بن مریمؑ کو آسمان پر لے جایا گیا تو انہوں نے پشمی لباس زیب تن کیا ہوا تھا جسے حضرت مریمؑ نے کاتا تھا اور حضرت مریمؑ نے ہی اسے بنا اور سیا تھا، پھر جب وہ آسمان تک پہنچے تو آواز دی گئی: اے عیسیٰ دنیا کی زینت کو اتار دو، (تفسیر العیاشی، ص ۱۷۵، حدیث ۵۳)

عیسیٰؑ کی مماثلت کے بارے میں!

تفسیر "درمنثور" میں آیت مبارکہ " اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰهِ ......" کی تفسیر میں مذکور ہے کہ عبد بن حمید اور ابن جریر نے قتادہ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: اہل نجران کے دو بزرگ عالم دین کہ جن میں سے ایک کا نام "سید" اور دوسرے کا نام "عاقب" تھا حضرت پیغمبر اسلامؐ کی خدمت اقدس میں آئے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں دریافت کیا کہ ہر شخص ماں باپ کے ذریعے پیدا ہوتا ہے تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ عیسیٰؑ کا باپ نہ ہو، اس وقت یہ آیت

مبارکہ نازل ہوئی: " اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ......" کہ عیسیٰ کی مثال خدا کے نزدیک آدم جیسی ہے......"
(تفسیر "درمنثور"، جلد ۲، صفحہ ۳۷)

اس سے قریب المعنی روایت سدی اور عکرمہ وغیرہ کے حوالوں سے بھی ذکر کی گئی ہے اور قمی مرحوم نے بھی اپنی تفسیر میں آیت کے شان نزول کے بارے میں نجران کے دو بزرگوں کا حوالہ دیا ہے۔

(ملاحظہ ہو: تفسیر قمی جلد ا صفحہ ۱۰۴)

محدث کے معنی میں روایات پر ایک نظر !

رسول، نبی اور محدث میں فرق

کتاب بصائر الدرجات میں زرارہ کے حوالہ سے روایت ذکر کی گئی ہے انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے دریافت کیا کہ "رسول"، "نبی" اور "محدث" کے درمیان کیا فرق ہے ؟

امامؑ نے ارشاد فرمایا: "رسول" اسے کہتے ہیں جو اس فرشتہ کو ظاہر بظاہر دیکھتا ہے جو اس کے پاس خدا کی طرف سے پیغامات لے کر آتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ تیرے رب نے یہ احکام تیرے لئے صادر فرمائے ہیں، رسول، پیغمبری کے ساتھ ساتھ نبوت کے منصب پر بھی فائز ہوتا ہے۔ اور "نبی" اسے کہتے ہیں جو فرشتہ کو ظاہر بظاہر نہیں دیکھتا بلکہ فرشتہ خدا کے پیغام کو اس کے دل میں ڈال دیتا ہے اور اس وقت نبی پر غشی جیسی حالت طاری ہو جاتی ہے اور وہ نیند کی حالت میں خدا کے فرامین کا مشاہدہ کرتا ہے،

میں نے پوچھا کہ اسے کس طرح معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ اس نے نیند کی حالت میں دیکھا ہے وہ خدائی پیغام اور حق ہے؟

امامؑ نے ارشاد فرمایا: خداوند عالم اس پر آشکار و واضح کر دیتا ہے جس سے وہ آگاہ ہو جاتا ہے کہ جو کچھ اس نے مشاہدہ کیا ہے وہ خدائی فرمان اور حق ہے لیکن وہ فرشتہ کو نہیں دیکھتا۔

اور ''محدث'' اسے کہتے ہیں جو صرف آواز سنتا ہے مگر آواز دینے والے کا مشاہدہ نہیں کرتا۔
روایت کی اصل عبارت ملاحظہ ہو :

" فی البصائر عن زرارة قال: سألت ابا عبدالله (ع) عن الرسول و عن النبی و عن المحدث قال: الرسول الذی یعاین الملک یأتیه بالرسالة من ربه یقول: یأمرک کذا و کذا، والرسول یکون نبیاً مع الرسالة، والنبی لا یعاین الملک ینزل علیه الشیئ النباء علٰی قلبه فیکه ن کالمغمٰی علیه فیریٰ فی منامه، قلت: فما علمه ان الذی رأی فی منامه حق ؟ قال(ع): یبینه الله حتی یعلم ان ذٰلک حق ولایعاین الملک، والمحدث الذی یسمع الصوت ولایریٰ شاهداً "

(کتاب بصائر الدرجات صفحہ ۳۷۱ حدیث ۱۲)

اس روایت کو کتاب ''کافی'' میں بھی حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے حوالہ سے ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں امامؑ کے ارشاد " لا یریٰ شاهداً " سے مراد " صائتاً حاضراً " ہے یعنی وہ بولنے والے کو ظاہر بظاہر نہیں دیکھتا، ممکن ہے کہ لفظ " شاهداً " فعل " لا یری " کے فاعل کا ''حال'' ہو اور اس کا معنی یہ ہو کہ محدث جبکہ خود شاہد ہے تو وہ کسی کو نہ دیکھتا ہو۔ (کتاب اصول کافی جلد ۱ صفحہ ۱۳۵)

اسی کتاب میں برید کے حوالہ سے امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کی حدیث ذکر کی گئی ہے جس میں مذکور ہے کہ برید نے پوچھا: رسول، نبی اور محدث کسے کہتے ہیں؟ امامؑ نے ارشاد فرمایا:

" الرسول الذی یظهر الملک فیکلمه والنبی یریٰ فی المنام و ربما اجتمعت النبوة والرسالة لواحد، والمحدث الذی یسمع الصوت ولایری الصورة: قال: قلت اصلحک الله ! کیف یعلم ان الذی رأی فی المنام هو الحق وانهٗ من الملک ؟ قال: یوفق لذلک حتی یعرفهٗ لقد ختم الله بکتابکم الکتب و بنبیکم الانبیاء، (الحدیث)"

رسول وہ ہے جس پر فرشتہ ظاہر ہوتا ہے اور اس سے ہم کلام ہوتا ہے جبکہ نبی خواب میں دیکھتا ہے، اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دونوں عہدے یعنی نبوت و رسالت ایک ہی شخص میں اکٹھے ہو جاتے ہیں، اور محدث اسے کہتے ہیں جو آواز سنتا ہے مگر شکل نہیں دیکھتا، راوی کہتا ہے میں نے عرض کیا کہ خدا آپ کا بھلا کرے یہ فرمایئے کہ اسے کیونکر معلوم ہوتا ہے کہ جسے اس نے خواب میں دیکھا وہ حق ہے اور وہ فرشتہ ہے؟ امامؑ نے ارشاد فرمایا: خداوند عالم اسے توفیق دیتا ہے جس سے وہ اسے پہچان لیتا ہے، خداوند عالم نے تمہاری کتاب (قرآن) کے ذریعے آسمانی کتب کا اختتام کیا اور تمہارے نبی کے ذریعے سلسلۂ انبیاءؑ

کا اختتام ہوا، (اصول کافی جلد ا ص ۱۳۵)

محمد بن مسلم کی روایت

کتاب "کافی" میں محمد بن مسلم کے حوالہ سے ایک روایت درج ہے جس میں انہوں نے کہا میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں "محدث" کے بارے میں دریافت کیا تو امامؑ نے ارشاد فرمایا: " انهٔ یسمع الصوت ولایری الصورة "، وہ آواز سنتا ہے مگر شکل نہیں دیکھتا،

میں نے پوچھا: خدا آپ کا بھلا کرے یہ فرمایئے کہ اسے کس طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ فرشتہ کی آواز ہے؟

امامؑ نے ارشاد فرمایا: " انهٔ یعطی السکینة والوقار حتی یعلم انهٔ ملک " خدا اسے سکینت ووقار اور ہمت وقوت قلب عطا کرتا ہے جس سے اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ فرشتہ ہے۔

(اصول کافی جلد اول ص ۲۷۱ حدیث ۴)

محدث کی نشانی امام صادقؑ کی زبانی

کتاب کافی میں ابوبصیر سے منقول ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

" کان علی (ع) محدثاً وکان سلمان محدثاً "

حضرت علیؑ محدث تھے اور جناب سلمان بھی محدث تھے،

ابوبصیر نے کہا: میں نے عرض کی کہ محدث کی کیا نشانی ہے ؟ (فما آیة المحدث؟)

امامؑ نے ارشاد فرمایا: "یأتیه الملک فینکت فی قلبه کیت وکیت"، فرشتہ اس کے پاس آتا ہے اور اس کے دل میں مطالب ڈال دیتا ہے کہ فلاں بات یہ ہے اور فلاں حکم یہ ہے ! (بحوالہ فوق الذکر)

خدا دوست بندے

کتاب "کافی" میں حمران بن اعین کے حوالہ سے مذکور ہے کہ حضرت امام ابوجعفر محمد باقر علیہ السلام نے مجھ سے

ارشاد فرمایا کہ حضرت علیؑ محدث تھے، حمران نے کہا کہ اس کے بعد ہمارے دوستوں نے کہا کہ اب جب بھی امامؑ سے ملاقات ہو تو ہر سوال سے پہلے ان سے یہ پوچھنا کہ کون حضرت علیؑ سے بات کرتا تھا؟ پھر جونہی مجھے امامؑ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تو میں نے ان کی خدمت میں عرض کی کہ آپؑ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ حضرت علیؑ محدث تھے؟ امامؑ نے ارشاد فرمایا: ہاں، میں نے کہا تھا، تو میں نے عرض کی: کون ان سے گفتگو کرتا تھا؟ امامؑ نے ارشاد فرمایا: فرشتہ! میں نے عرض کی کہ اگر ایسا ہے تو پھر میں ان کے بارے میں یہ عقیدہ رکھ سکتا ہوں کہ وہ (حضرت علیؑ) نبی یا رسول تھے؟ امامؑ نے فرمایا: نہیں، بلکہ ان کے بارے میں وہی عقیدہ رکھو جو حضرت سلیمان کے ساتھی اور حضرت موسیٰؑ کے ساتھی کے بارے میں رکھتے ہو اور جو عقیدہ ذوالقرنین کے بارے میں رکھتے ہو، کیا تم نے نہیں سنا کہ حضرت علیؑ سے ذوالقرنینؑ کے بارے میں پوچھا گیا کہ آیا وہ نبی تھے؟ تو حضرت علیؑ نے جواب دیا: نہیں، بلکہ وہ خدا کے ایسے بندے تھے جو خدا دوست تھے اور خدا بھی انہیں دوست رکھتا تھا اور وہ رضائے خدا کے لئے وعظ ونصیحت کرتے تھے اور خدا نے بھی انہیں اس کے شایان شان اجر و رتبہ عطا کیا، حضرت علیؑ بھی انہی کی طرح تھے۔ (اصول کافی ص ۲۷۱ ح ۵)

محدث کے معنی کی وضاحت میں کثیر روایات آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی طرف سے وارد ہوئی ہیں کہ جنہیں کتاب بصائر الدرجات، کافی، کنز العمال اور الاختصاص وغیرہ میں ذکر کیا گیا ہے، اور اہل سنت کی کتب میں بھی اس طرح کی روایات موجود ہیں۔ اور ان روایات میں رسول، نبی اور محدث کے درمیان جو فرق ذکر کیا گیا ہے اسے ہم رسول اور نبی کے درمیان فرق کے تذکرے میں بیان کر چکے ہیں اور وحی کے بارے میں وضاحت کر چکے ہیں کہ اس سے مراد خدا کا اپنے بندوں میں سے کسی سے ہمکلام ہونا ہے جو کہ اس بندے کے لئے بذاتِ خود علم الیقین کا باعث بنتا ہے اور اس کے ساتھ مزید کسی دلیل و حجت کی ضرورت باقی نہیں رہتی، بنابرایں خدائی القاءات ان بدیہی علوم کی طرح ہیں جن کے حصول کے لئے انسان کو علمی و منطقی اصولوں کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

اور جہاں تک اولیائے الٰہی کے خواب دیکھنے کا تعلق ہے تو جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا کہ روایات میں اس سے خواب دیکھنے کا وہ عام معنی مراد نہیں لیا گیا جو عام افرادِ بشر کے خواب دیکھنے کا معنی مراد لیا جاتا ہے کہ جس میں شب و روز میں عام طور پر دیکھی جانے والی چیزیں دکھائی دیتی ہیں بلکہ اس سے مراد ایک ایسی حالت ہے جو غشی سے ملتی جلتی ہے کہ جس میں نبی کے حواس کو ٹھہراؤ حاصل ہوتا ہے اور وہ اس حالت میں اسی طرح دیکھتا ہے جس طرح ہم بیداری کی حالت میں چیزوں کو دیکھتے ہیں، اور جب وہ مشاہدہ کر لیتے ہیں...... جس چیز کا بھی مشاہدہ کریں..... تو خداوند عالم ان کے دل میں یقین پیدا کر دیتا ہے جس سے ان میں ایک خاص ہمت و قوت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اچھی طرح جان لیتے ہیں کہ جو کچھ انہوں نے مشاہدہ کیا ہے وہ من جانب اللہ ہے نہ کہ شیطانی وسوسے ہیں۔

اور محدث جو کہ "تحدیث" سے بنا ہے اس کا معنی فرشتہ کی آواز سننا ہے البتہ ظاہری سماعت سے نہیں بلکہ قلبی سماعت سے! اور وہ اس ذہنی القاء کے باب سے نہیں کہ جسے مجاز بعید سے استفادہ کئے بغیر سنی جانے والی آواز یا آواز سننا نہیں کہا جا سکتا، اسی وجہ سے۔۔جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا ہے کہ۔۔روایت میں تحدیث کے معنی میں دونوں کو باہم ذکر کیا گیا ہے یعنی آواز سننا اور دل میں اترنا، لیکن اس کے باوجود ہم اسے تحدیث اور تکلیم کہتے ہیں، اس بناء پر محدث فرشتہ کی آواز سنتا ہے اور اسے اسی طرح اپنے خزانۂ سماعت میں محفوظ کر لیتا ہے جس طرح ہم عام کلام اور مادی جہان میں سنی جانے والی آوازوں کو اپنے خزانہ سماعت میں محفوظ کرتے ہیں البتہ اس فرق کے ساتھ کہ محدث جو کچھ فرشتہ سے سنتا ہے وہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں سنتا، اسی حوالہ سے اسے قلبی کیفیت کہا جاتا ہے۔

اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ اسے یعنی محدث کو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ فرشتہ کی آواز ہے نہ کہ شیطان کا وسوسہ، تو یہ خدائی تائید اور توفیق کے ساتھ ہوتا ہے جیسا کہ محمد بن مسلم کی سابق الذکر روایت میں بیان ہو چکا ہے کہ اسے خدا کی طرف سے سکینت ووقار اور قوت وہمت عطا ہوتی ہے جس سے وہ جان لیتا ہے کہ وہ فرشتہ ہے، کیونکہ شیطانی وسوسہ کی دو صورتیں ممکن ہیں: ایک یہ کہ وہ باطل کی شکل ہی میں مؤمن شخص کے سامنے ہوتا ہے، تو ظاہر ہے کہ وہ اس صورت میں خدا کے مکرم فرشتوں کی بات نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ خدا کی نافرمانی کے مرتکب نہیں ہوتے، دوسری صورت یہ کہ وہ حق کی شکل میں سامنے آئے تو چونکہ وہ اصل میں باطل ہے لہٰذا اس کی باطل ادائی بھی اس کے ساتھ ساتھ ہوگی کہ اسے وہ نورِ الٰہی جو بندۂ مومن کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے آشکار کر دیتا ہے، چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

سورہء انعام، آیت ۱۲۲ :

○ "اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ"

(کیا وہ شخص جو مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندہ کیا اور اسکے لئے نور قرار دیا جس کے ذریعے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے)

لیکن اس کے باوجود شیطانی وسوسہ کے بارے میں یہ بات یاد رہے کہ وہ بے چینی اور اضطراب نفس وقلبی ہیجان سے خالی نہیں جیسا کہ ذکرِ خدا اور اس کا بندے سے کلام کرنا سکونِ قلب اور اطمینان باطن سے خالی نہیں ہوتا، چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

سورہء، آل عمران، آیت ۱۷۵:

○ " ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ "

(یہ شیطان ہی ہے جو اپنے دوستوں کو خوف دلاتا رہتا ہے)

سورہ رعد، آیت ۲۸ :

O "اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ"

(یادرکھو کہ خدا کے ذکر سے دل مطمئن ہوتے ہیں)

سورہ اعراف، آیت ۲۰۱ :

O "اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ"

(یقیناً جو لوگ پرہیزگار ہیں جب کوئی شیطان ان پر مسلط ہونے لگتا ہے تو وہ خدا کو یاد کرتے ہیں اور حقیقت الامر سے آگاہ ہو جاتے ہیں)

بنابرایں سکینت واطمینانِ قلب جو کسی آواز کے سننے یا کسی مطلب کے دل میں اترنے کے احساس سے حاصل ہوتا ہے وہ خدائی القاء کی دلیل قرار پاتا ہے جیسا کہ اس کے برعکس اضطراب و بے چینی شیطانی القاء کی دلیل بنتی ہے اور اسی سے جلد بازی، جزع وفزع اور بیجا فریادیں اور نادانی و ناآگاہی کے آثار وغیرہ ظاہر ہوتے ہیں۔

اور محدث کے بارے میں روایات میں جو ذکر ہوا ہے کہ وہ آواز سنتا ہے مگر فرشتہ کو نہیں دیکھتا تو اس سے یہی مطلب سمجھا جاتا ہے نہ کہ دونوں معنوں کے یکجا ہونے کا ناممکن ہونا ! تو کسی انسان کا محدث ہونا اس حوالہ سے ہے کہ وہ آواز سنتا ہے اور یہ ضروری نہیں کہ وہ آواز دینے والے کا مشاہدہ کرے، تو اگر کبھی ایسا ہو کہ آواز سننے کے دوران فرشتہ کا مشاہدہ بھی کرے تو یہ اس کے محدث ہونے کی بناء پر نہیں ہوتا کیونکہ آیات مبارکہ میں صریح لفظوں میں ذکر ہوا ہے کہ بعض محدث افراد نے گفتگو کے دوران فرشتوں کا مشاہدہ کیا جیسا کہ حضرت مریمؑ کے بارے میں ارشاد الٰہی ہے :

سورہ مریم، آیت ۱۹ :

O "فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ۝ قَالَتْ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ۝ قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا"

(ہم نے اس کی طرف اپنی روح کو بھیجا کہ جو کامل انسان کی صورت میں اس کے سامنے آیا، اس (مریم) نے کہا: میں تیرے شر سے خدا کی پناہ چاہتی ہوں، اگر تو پرہیزگار ہے تو مجھ سے دور ہو جا، اس نے کہا: میں تیرے رب کا بھیجا ہوا ہوں، تاکہ تجھے ایک پاک بچہ عطا کروں)

اور حضرت ابراہیمؑ کی زوجہ کے بارے میں بشارت دیئے جانے کے تذکرہ میں یوں ارشاد الٰہی ہے :

سورہ ہود، آیت ۷۳ :

O " وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ...... وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا

بِاِسْحٰقَ ۙ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ۝ قَالَتْ يٰوَيْلَتٰٓى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِىْ شَيْخًا ۭ اِنَّ هٰذَا لَشَىْءٌ عَجِيْبٌ ۝ قَالُوْٓا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ۭ اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ "

(اور ہمارے پیغام رساں ابراہیم کے پاس خوشخبری لے کر پہنچے، انہوں نے انہیں سلام کہا، ابراہیم نے بھی سلام کیا...... اور ابراہیم کی زوجہ وہاں کھڑی ہوئی ہنستی رہی، پھر ہم نے اسے اسحاق کی خوشخبری دی اور اسحاق کے بعد یعقوب کی خوشخبری دی، اس نے کہا: یہ کیونکر ہوسکتا ہے؟ کیا میں بچہ جنوں گی جبکہ میں بڑھیا ہوں اور یہ میرا شوہر بوڑھا ہو چکا ہے، یہ تو بڑی تعجب والی بات ہے، ہمارے پیغام رسانوں نے کہا: کیا تو اللہ کے فیصلہ پر تعجب کرتی ہے، اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہوں تم پر اے اہل بیت ! یقیناً خدا ہر تعریف کا سزاوار اور بزرگی والا ہے)

اس مقام پر ایک اور احتمالی نظریہ بھی قابل تصور ہے اور وہ یہ کہ محدث کا فرشتہ کا مشاہدہ نہ کرنا شاید اس معنی میں ہو کہ وہ فرشتہ کی حقیقت کا مشاہدہ و دیدار نہیں کرتا نہ یہ کہ اس کی مثالی صورت بھی نہیں دیکھ سکتا، کیونکہ آیات مبارکہ سے مثالی صورت کے مشاہدہ سے زیادہ کچھ ثابت نہیں ہوتا۔

یہاں ایک تیسری احتمالی رائے بھی پیش کی گئی ہے اور وہ یہ کہ محدث کے بارے میں جس مشاہدہ کی نفی کی گئی ہے وہ تشریعی وحی کا مشاہدہ ہے کیونکہ وہ صرف رسولوں و انبیاء سے مخصوص و مختص ہے اور خدا چاہتا ہے کہ اس مقام و منصب کو انہی تک محدود رکھے، لیکن یہ احتمال بعید نظر آتا ہے کہ فرشتہ کے مشاہدہ سے یہ مراد لیا جائے کہ اس پر شرعی احکام نازل نہیں ہوتے۔

آیات ۶۱ تا ۶۳

○ فَمَنْ حَآجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَآءَنَا وَأَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَأَنْفُسَنَا وَأَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِينَ ﴿٦١﴾

○ إِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ إِلٰهٍ إِلَّا اللّٰهُ ۚ وَإِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٦٢﴾

○ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللّٰهَ عَلِيمٌ بِالْمُفْسِدِينَ ﴿٦٣﴾

ترجمہ

○ " پس جو شخص اس سلسلہ میں آپ سے بحث کرے بعد اس کے کہ آپ کے پاس علم آ چکا ہے تو کہہ دیجئے کہ تم آؤ ہم بلائیں اپنے بیٹوں کو اور تم بلاؤ اپنے بیٹوں کو، ہم اپنی عورتوں کو اور تم اپنی عورتوں کو اور ہم اپنے بھائیوں کو اور تم اپنے بھائیوں کو ، پھر ہم مباہلہ کریں اور اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت قرار دیں "

(۶۱)

○ " یہی سچے واقعات ہیں اور خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور خدا ہی غلبہ و حکمت والا ہے "

(۶۲)

○ " پس اگر وہ روگردانی کریں تو خدا فسادیوں کو بہتر جانتا ہے "

(۶۳)

تفسیر و بیان

علم و آگاہی کے بعد نزاع کیوں ؟

○ " فَمَنۡ حَآجَّكَ فِيۡهِ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الۡعِلۡمِ... "
(اور جو شخص آپ سے نزاع کرے بعد اس کے کہ آپ کے پاس علم آ گیا ہے۔۔۔)

ابتدائے آیت میں حرف "ف" تفریع کے لئے ہے یعنی اس سے مباہلہ کی دعوت دینے کے حکم کا خدا کی طرف سے عیسیٰؑ کے بارے میں واضح بیان کے ساتھ علم عطا کرنے کے بعد سے تعلق ثابت ہوتا ہے اور خدا کی طرف سے اس سلسلہ میں علم عطا کئے جانے کی تاکید اس اختتامی جملہ سے ہوتی ہے: " اَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنۡ مِّنَ الۡمُمۡتَرِيۡنَ " (حق تیرے رب کی طرف سے ہے، پس تو شک کرنے والوں میں شامل نہ ہونا)،

آیت مبارکہ میں " فِيۡهِ " کی ضمیر کی بازگشت یا تو عیسیٰ کی طرف ہے یا سابقہ آیت میں مذکور " حق " کی طرف ہوتی ہے۔

سابقہ آیت میں مذکور مطلب جو کہ خداوند عالم کی طرف سے ہونے کی وجہ سے ہر طرح کے شک وشبہ سے بالاتر تھا لیکن اس کے باوجود وہ ایک نہایت محکم دلیل اور واضح وٹھوس ثبوت پر مشتمل تھا جو اس جملہ سے ثابت ہے: " اِنَّ مَثَلَ عِيۡسٰى عِنۡدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ...... " (اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم جیسی ہے)، بنابرایں اس موضوع کی بابت حاصل ہونے والا علم، دلیل و برہان پر مبنی علم بھی کہلائے گا، اسی وجہ سے اس کا اثر حضرت پیغمبر اسلامؐ اور ان کے علاوہ ہر سننے والے پر ظاہر ہوگا۔ لہٰذا اگر کوئی سننے والا اس سلسلہ میں صرف اس بناء پر شک کرے کہ وہ وحی الٰہی پر مبنی ہے لیکن وہ اس کے دلیل و برہان پر مشتمل ہونے کی وجہ سے اس کی بابت ہرگز شک نہیں کر سکتا کیونکہ عقل سلیم اس کی صحت و درستی کی تصدیق و تائید کرتی ہے، شاید اسی بناء پر یہ الفاظ کہے گئے: " مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الۡعِلۡمِ "، اور یوں نہیں کہا: " **من بعد ما بیناہ لھم** "،...... اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کی بابت صرف وحی نہیں بلکہ قطعی دلیل اور واضح برہان بھی موجود ہے۔

اس مقام پر ایک اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ خداوند عالم کی طرف سے آنحضرتؐ کو جملہ "مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ" کے ذریعے جو یاددہانی کروائی گئی ہے اس میں آپؐ کا سرور قلب مقصود ہے کہ آپؐ ہی خدا کی عنایت واذن کے ساتھ غلبہ پائیں گے اور یہ کہ آپؐ کا پروردگار آپ کا ناصر و مددگار ہے اور وہ ہرگز آپؐ کو کسی کے سامنے رسوا نہ ہونے دے گا۔

دعوت مباہلہ

○ " فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ "

(تو کہہ دیجئے کہ آجاؤ، ہم اپنے بیٹوں کو بلاتے ہیں اور تم اپنے بیٹوں کو بلاؤ، ہم اپنی عورتوں کو بلاتے ہیں اور تم اپنی عورتوں کو بلاؤ، اور ہم اپنوں (بھائیوں) کو بلاتے ہیں اور تم اپنوں (بھائیوں) کو بلاؤ۔)

اس آیت مبارکہ میں جمع متکلم مع الغیر "نَدْعُ" کی ضمیر دوسرے جمع کے صیغوں مثلاً "اَبْنَآءَنَا"، "نِسَآءَنَا"، "اَنْفُسَنَا" کی ضمیروں سے مختلف ہے یعنی "نَدْعُ" (ہم بلائیں) میں "ہم" سے مراد دونوں فریقین ہیں یعنی حضرت رسولِ خداؐ اور نجران کے نصاریٰ کے بزرگ حضرات ! جبکہ دیگر تین صیغوں "اَبْنَآءَنَا"، "نِسَآءَنَا" اور "اَنْفُسَنَا" میں صرف حضرت پیغمبر اسلامؐ مراد ہیں۔ بنابرایں آیت کا معنی یوں ہوگا: آیئے ہم بلائیں بیٹوں، عورتوں اور اپنوں کو، تو ہم اپنے بیٹوں کو، اپنی عورتوں کو اور اپنوں کو بلاتے ہیں اور تم اپنے بیٹوں کو، اپنی عورتوں کو اور اپنوں کو بلاؤ،......، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کلام میں اختصار گوئی کی نہایت لطیف صورت اختیار کی گئی ہے۔

اور مباہلہ وملاعنہ اگرچہ بظاہر صرف حضرت پیغمبر اسلامؐ اور نصاریٰ کے بزرگوں کے درمیان محاجہ ومناظرہ کے معنی میں ہے لیکن اسے عمومیت و وسعت دے کر بیٹوں اور عورتوں کو اس میں شامل کرنا اس غرض سے ہے تاکہ دعوت دینے والے کے دعوے کی صداقت واضح و آشکار ہو اور اس کا برحق ہونا ثابت ہوجائے، کیونکہ بیٹوں اور عورتوں کی محبت اور ان پر شفقت ایسی فطری حقیقت ہے جسے خداوند عالم نے ہر انسان کے دل میں ودیعت کردیا ہے چنانچہ یہ بات عام مشاہدہ میں آتی ہے کہ ہر شخص ان کی حفاظت کرتا ہے اور خود ہر طرح کے مسائل ومشکلات اور سختیوں کو برداشت کر کے انہیں تحفظ فراہم کرتا ہے اور ان کے بچاؤ اور غیرت ودفاع میں کسی بھی اقدام سے کوتاہی نہیں کرتا بلکہ اپنے تمام وسائل بروئے کار لا کر ان کے سکون واطمینان اور حفاظت کو یقینی بنانے میں کوشاں رہتا ہے، اور بعینہٖ اسی بناء پر پہلے بیٹوں کا ذکر ہوا ہے، اس کے بعد عورتوں کا اور پھر اپنوں

کا، کیونکہ بیٹوں کی محبت انسان کے دل میں سب سے زیادہ اور پائیدار ہوتی ہے۔

اس بیان سے وہ قول باطل و بے اساس ہو جاتا ہے جو بعض مفسرین حضرات نے پیش کیا ہے کہ " نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ......" سے مراد یہ ہے کہ آؤ ہم تمہارے بیٹوں، تمہاری عورتوں اور تمہارے اپنوں کو بلاتے ہیں اور تم ہمارے بیٹوں، ہماری عورتوں اور ہمارے اپنوں کو بلاؤ، کیونکہ اس قول سے اس اہم مقصد کی نفی ہوتی ہے جو ان سب کو مباہلہ کے عمل میں شامل کرنے کی بابت ہم نے ذکر کی ہے۔

اور مباہلہ میں شامل افراد کا تفصیلی ذکر اس امر کی صحت پر مزید ثبوت فراہم کرتا ہے کہ دعوت دینے والا اپنے مشن پر اور اپنی بات کی صداقت و برحق ہونے پر کس قدر پختہ یقین رکھتا ہے، گویا وہ کہہ رہا ہے: آؤ تا کہ ہم سب مل کر (ہم سب اور تم سب) مباہلہ کریں یعنی ایک دوسرے کے خلاف بددعا کریں اور سب مل کر جھوٹوں پر خدا کی لعنت قرار دیں تا کہ لعنت و عذاب بیٹوں، عورتوں اور اپنوں سمیت سب پر آئے اور جھوٹوں کی بیخ کنی ہو اور باطل پرستوں کی بنیاد ہی اکھڑ جائے۔

اس وضاحت کے بعد یہ نکتہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ کلام الٰہی کی مصداقی جہت کا درست ہونا بیٹوں کی کثرت پر موقوف نہیں اور نہ ہی عورتوں اور اپنوں کی کثرت پر موقوف ہے کیونکہ مباہلہ کے نتیجہ میں فریقین میں سے ایک کی ہلاکت وتباہی مقصود ہے خواہ اس میں چھوٹے اور بڑے، اور مرد و عورتیں جتنی بھی کیوں نہ ہوں، چنانچہ مفسرین کے متفقہ اظہارات اور روایات وتاریخ کی تصدیق وتائید سے یہ حقیقت پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ جب مباہلہ کے لئے سامنے آئے تو ان کے ساتھ علیؑ و فاطمہؑ اور حسنؑ و حسینؑ علیہم السلام کے علاوہ کوئی نہ تھا، یعنی دو نفس (بھائی، اپنے) دو بیٹے اور ایک خاتون کے سوا کوئی ہمراہ نہ تھا، اور آنحضرتؐ نے ان افراد کو ساتھ لے کر حکم خداوندی کا امتثال کیا۔

اس مقام پر یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ آیت کے الفاظ سے "مراد" ایک مسئلہ ہے اور اس کے "مصداق کا تعین" دوسرا مسئلہ ہے، چنانچہ قرآن مجید میں کثرت سے مثالیں موجود ہیں کہ حکم یا وعدہ و وعید تمام افراد کے لئے ہوتا ہے جبکہ شان نزول کے حوالہ سے ایک فرد اس کا مصداق ہوتا ہے مثلاً:

سورہ مجادلہ، آیت ۲:

○ " اَلَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَآىِٕهِمْ مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ "

(جو لوگ تم میں سے اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں۔۔انہیں اپنی ماں کہتے ہیں۔۔وہ حقیقت میں ان کی مائیں نہیں ہیں)

سورہ مجادلہ، آیت ۳:

○ "وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآىِٕهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا "

(جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں پھر اپنی بات سے پلٹ جاتے ہیں)

سورہء آل عمران، آیت ۱۸۱:

○ " لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ "

(خدا نے ان لوگوں کی بات سن لی جنہوں نے کہا اللہ فقیر و نادار ہے اور ہم بے نیاز و مالدار ہیں)

سورۂ بقرہ، آیت ۲۱۹ :

○ " وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۭ قُلِ الْعَفْوَ "

(وہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا انفاق کریں، کہہ دیجئے کہ درگزر کرو)

اس کے علاوہ دیگر کثیر آیات ہیں جن میں جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے جبکہ ان کا شان نزول ایک شخص ہے۔

آیت کے الفاظ کی تشریحات

آیت مبارکہ میں ارشاد ہوا:

" ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ " (پھر ہم مباہلہ کریں تو اللہ کی لعنت قرار دیں جھوٹوں پر)

" نبتهل "، ابتہال کا مصدر " بهلة " (ب پر زبر اور پیش دونوں کے ساتھ) ہے اس کا معنی لعنت ہے، یہ ہے اس کا اصل ولغوی معنی، پھر وہ کثرت استعمال سے دعا (بددعا) اور سوال یعنی مانگنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا البتہ اس دعا وسوال میں استعمال ہوا جس میں اصرار وسماجت شامل ہو،

اور جملہ " فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ " دراصل ابتہال کی وضاحت کے طور پر ہے، اور یہاں "نسأل" کی بجائے "نجعل" کہنے سے اس امر کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ یہ دعوت یعنی مباہلہ، رد نہیں ہوگی کیونکہ اس سے حق و باطل کے درمیان بنیادی امتیاز کا اظہار مقصود تھا اور حق کی حقیقت کا آشکار ہونا اسی پر متوقف ومبنی تھا،

اور لفظ " الْكٰذِبِيْنَ " پر الف ولام عہد کا معنی دیتا ہے یعنی وہ جھوٹے جن کے بارے میں معلوم ہے کیونکہ اس میں ہر جھوٹا اور تمام جھوٹے مقصود نہیں بلکہ صرف وہی جھوٹے مقصود ہیں جو اس (مباہلہ) میں دو فریقوں میں سے ایک فریق کے افراد ہیں کہ جن میں سے ایک حضرت محمد مصطفیٰؐ پیغمبر اسلام اور ان کے ساتھ آنے والے افراد ہیں کہ جو کہتے ہیں کہ خدا ایک ہے اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور حضرت عیسیٰؑ خدا کے عبد اور اس کے رسول ہیں، جبکہ دوسرا فریق نصاریٰ ہیں جو کہتے ہیں کہ عیسیٰ ہی خدا ہیں یا وہ اللہ کے فرزند ہیں یا یہ کہ اللہ تین خداؤں میں سے تیسرا ہے۔

بنابرایں یہ مطلب واضح ہے کہ اگر ادعاء اور اس پر ہونے والا مباہلہ صرف حضرت پیغمبر اسلامؐ اور نصاریٰ کے

درمیان ہوتا یعنی فریقین میں سے ایک صرف آنحضرتؐ جبکہ دوسری طرف کثیر افراد ہوتے تو ضروری تھا کہ آیت مبارکہ میں ایسے الفاظ استعمال کئے جاتے جو ایک فرد اور گروہ دونوں پر یکساں صادق آتے مثلاً یوں کہا جاتا: " **فنجعل لعنة اللّٰه علٰی من کان کاذباً** " کہ ہم اللہ کی لعنت اس پر قرار دیں جو جھوٹا ہو، لیکن عبارت یوں ہے: " فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ " کہ ہم اللہ کی لعنت قرار دیں جھوٹوں پر! تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مناظرہ و مباہلہ کے دو گروہوں یعنی فریقین میں سے ایک گروہ و فریق کے افراد " کاذبین " یعنی جھوٹے ہونے کا مصداق ہوں گے نہ کہ ایک فرد، خواہ وہ نبیؐ کے گروہ والے ہوں یا نصاریٰ کے گروہ والے!، اور اس سے یہ بھی معلوم و ثابت ہوتا ہے کہ جو افراد مباہلہ میں موجود تھے وہ سب اصل مسئلہ و موضوع میں شریک تھے کیونکہ جھوٹ، ادعاء ہی میں قابل تصور ہوتا ہے، لہٰذا جو بھی حضرت پیغمبر اسلامؐ کے ساتھ تھا یعنی علیؑ و فاطمہؑ و حسنؑ و حسینؑ، وہ سب اصل ادعاء میں بھی شریک تھے اور دعوتِ مباہلہ میں بھی برابر کے شریک تھے اور یہ بات ان فضائل و مناقب میں سے سب سے بڑی ہے جس سے خداوند عالم نے اہل بیت علیہم السلام کو نوازا ہے جیسا کہ امت کے تمام مردوں، عورتوں اور فرزندوں میں صرف انہی کو آنحضرتؐ کے نفس (اپنے)، نساء (خواتین) اور ابناء (بیٹے) ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔

مفرد اور جمع کے صیغوں کا استعمالی فرق

مذکورہ بالا مطالب میں بیان کیا گیا ہے کہ قرآن مجید میں جمع کا صیغہ استعمال کر کے اس سے مفرد مراد لینا کثرت سے موجود ہے اور اسی آیت میں لفظ "نِسَآءَ" (عورتیں) ذکر ہوا ہے جبکہ مباہلہ میں صرف حضرت سیدہ فاطمہ زہراء علیہا السلام موجود تھیں، تو اس بناء پر اگر لفظ " کاذبین " (جھوٹے) بھی اسی طرح استعمال ہوا ہو کہ اس سے ایک فرد مراد ہو تو اس میں کیا حرج لازم آتا ہے؟ یعنی یوں کہا جائے کہ فریقین میں سے کاذبین کا مصداق اس طرح متعین کریں کہ ایک طرف نصاریٰ کے تمام افراد ہوں جبکہ ان کے مقابلہ میں صرف حضرت پیغمبر اسلامؐ ہوں، اور حضرت علیؑ و فاطمہؑ اور حسنؑ و حسینؑ اس میں شامل نہ ہوں اور نہ ہی اصل ادعاء اور دعوتِ مباہلہ میں شامل ہوں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں موارد میں فرق ہے اور وہ یوں کہ آیات میں جمع کا صیغہ مفرد کے لئے اس لئے استعمال ہوا ہے کہ وہاں ایک فرد مقصود نہیں بلکہ جو کام بیان ہوا ہے اس کا انجام پذیر ہونا کثیر افراد سے ممکن ہے لہٰذا اس سے ان سب کا اس میں شامل قرار پانا یکساں قابل تصور ہے، اسی لئے جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے تا کہ اگر دیگر افراد اسے انجام دینا چاہیں تو اس کی گنجائش موجود ہو، لیکن جہاں اس طرح کی گنجائش نہ پائی جاتی ہو بلکہ ایک فرد سے زیادہ کا انجام دینا ممکن نہ ہو اور آیت

ایک فرد سے زیادہ سے انجام پذیر نہ ہوسکنے والے عمل پر مشتمل ہو تو اس صورت میں جمع کا صیغہ استعمال کرنا ہرگز جائز نہ ہوگا جیسا کہ درج ذیل آیات مبارکہ میں مذکور ہے :

سورۂ احزاب، آیت : ۳۷

○ "وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْٓ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاَنْعَمْتَ عَلَیْہِ اَمْسِكْ عَلَیْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰہَ"

(اور جب تو اس شخص سے کہہ رہا تھا جس پر خدا نے انعام کیا اور تو نے بھی انعام کیا کہ اپنی بیوی کو روک لے اور اللہ سے خوف کھا......)

سورۂ نحل، آیت : ۱۰۳

○ " لِسَانُ الَّذِیْ یُلْحِدُوْنَ اِلَیْہِ اَعْجَمِیٌّ وَّھٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ "

(اس کی زبان کہ جس کی طرف یہ لوگ قرآن کی ناحق نسبت دیتے ہیں وہ عجمی ہے جبکہ یہ واضح عربی زبان ہے)

سورۂ احزاب، آیت : ۵۰

○ " اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِیْٓ اٰتَیْتَ اُجُوْرَھُنَّ...... وَامْرَاَۃً مُّؤْمِنَۃً اِنْ وَّھَبَتْ نَفْسَھَا لِلنَّبِیِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِیُّ اَنْ یَّسْتَنْكِحَھَا خَالِصَۃً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ "

(ہم نے تیرے لئے وہ ازواج حلال کردیں ہیں جن کے مہر تو نے ادا کیے......اور وہ مومنہ عورت جو اپنے آپ کو نبی کے لئے ہبہ کردے اگر نبی اس سے نکاح کرنا چاہے تو وہ اس پر حلال ہوگی، یہ حکم صرف تیرے لئے خاص ہے دوسرے مؤمنین کے لئے نہیں)

مباہلہ کی آیت بھی ایسی ہی ہے کہ اس کے مورد میں وسعت نہیں پائی جاتی اور وہ مورد حضرت پیغمبر اسلامؐ کا نصاریٰ سے مباہلہ ہے لہٰذا اگر اس میں فریقین سے کئی افراد موجود نہ ہوں تو جمع کا صیغہ "الکاذبین" لانا درست نہیں ہوسکتا،

فریقین کے دعووں کی بابت ایک سوال

اگر یہ کہا جائے کہ جو نصاریٰ حضرت پیغمبر اسلامؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے وہ سب اپنے ادعاء میں برابر کے شریک تھے اور ان کا دعویٰ یہ تھا کہ عیسیٰ خدا ہے یا خدا کا بیٹا ہے یا تین خداؤں میں تیسرا ہے، اس دعوے میں ان کے درمیان ہرگز کوئی اختلاف نہ تھا بلکہ ان کے مرد یہی دعویٰ کرتے تھے اور ان کی عورتیں بھی یہی دعویٰ کرتی تھیں، ادھر دوسری جانب یعنی حضرت پیغمبر اسلامؐ کی طرف سے بھی صورتحال ایسی ہی تھی کہ وہ جو دعویٰ کرتے تھے یعنی یہ کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور

عیسیٰ بن مریم اللہ کے بندہ اور اس کے رسول ہیں، اس دعوے میں آنحضرتؐ اور تمام مؤمنین شامل تھے، سب یہی دعویٰ کرتے تھے اور یہ دعویٰ صرف ایک شخص سے مختص نہ تھا یہاں تک کہ آنحضرتؐ سے بھی مختص نہ تھا، لہٰذا آنحضرتؐ جن افراد کو اپنے ہمراہ لے گئے انہیں دیگر مؤمنین پر کوئی امتیازی برتری حاصل نہ تھی بلکہ صرف اتنی بات تھی کہ آنحضرتؐ انہیں مومنین کے نمونہ کے طور پر لے گئے تھے جیسا کہ آیت مبارکہ سے ظاہر ہے کہ ان میں ہر گروہ سے نمونہ کے طور پر چند افراد لانے کا حکم دیا گیا ہے یعنی بیٹوں، عورتوں اور انفس (اپنوں، بھائیوں) میں سے کچھ افراد ساتھ لائیں، اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ آیت میں مباہلہ کی دعوت کا تذکرہ ہے نہ کہ اصل ادعاء کا، جبکہ سطور بالا میں کہا گیا ہے کہ وہ سب دعویٰ و دعوت دونوں میں شریک تھے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر آنحضرتؐ کا ان افراد کو لانا مومنین میں سے نمونہ کے طور پر ہوتا تو ضروری تھا کہ کم از کم ہر طبقہ میں سے کچھ افراد لے جاتے یعنی کم از کم دو مرد، تین خواتین اور تین فرزند لے جاتے، لہٰذا جن افراد کو ہمراہ لے گئے دراصل انہی کا لے جانا ہی مقصود تھا اور وہی حکم خداوندی کے امتثال میں کافی تھے، انہی کے ذریعے خدا کے فرمان کی اطاعت متحقق ہوئی تھی دوسرے لفظوں میں یہ کہ ان کے علاوہ کوئی ایسا نہ تھا جس کے ساتھ لے جانے سے خدا کے حکم کا امتثال ہو جاتا اور وہ ایک مرد (حضرت علیؑ) ایک خاتون (حضرت فاطمہ زہراؑ) اور دو بیٹے (حضرت حسنؑ اور حضرت حسینؑ) تھے۔

اگر آپ اس واقعہ یعنی مباہلہ کی بابت بخوبی غور کریں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ نجران کے نصاریٰ کا ایک وفد مدینہ آیا تا کہ حضرت عیسیٰؑ بن مریم کے حوالہ سے حضرت پیغمبر اسلامؐ سے بحث و گفتگو اور مناظرہ و محاجہ کریں کیونکہ آنحضرتؐ نے جو دعویٰ کیا تھا کہ وہ اللہ کے بندہ اور اس کے بھیجے ہوئے (رسول) ہیں وہ وحی پر مبنی تھا کہ جس کے بارے میں آنحضرتؐ مدعی تھے کہ وہ ان پر نازل ہوئی ہے، اور آنحضرتؐ کے علاوہ وہ افراد جو آپؐ پر ایمان لا کر آپؐ کی پیروی کا دم بھرتے تھے ان سے نصاریٰ کو کوئی کام نہ تھا اور نہ وہ ان سے ملاقات کے خواہاں و مشتاق تھے، جیسا کہ آیت مبارکہ کے ابتدائی الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ جن میں ارشادِ الٰہی ہوا: " فَمَنْ حَآجَّكَ فِيهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ....." (پس جو تجھ سے اس کے بارے میں بحث و مناظرہ کرے بعد اس کے کہ تیرے پاس علم آ چکا ہے تو کہہ دیجئے.....''، اس میں صرف آنحضرتؐ مخاطب قرار پائے ہیں، اسی طرح اس سے ماقبل چند آیات میں خداوند عالم کا ارشاد ہے: " فَإِنْ حَآجُّوكَ فَقُلْ أَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلَّهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ " (پس اگر وہ آپ سے بحث و محاجہ کریں تو کہہ دیجئے کہ میں نے اور میری پیروی کرنے والوں نے اپنا رخ اللہ کی طرف کر لیا ہے)۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ان افراد کو مباہلہ کے لئے اپنے ہمراہ لے جانا نمونہ کے طور پر نہ تھا کیونکہ مؤمنین کا مؤمنین ہونے کے حوالہ سے اس محاجہ و مباہلہ میں کوئی دخل و حصہ ہی نہ تھا کہ جس کی بناء پر

اس لعنت وعذاب کے مستحق افراد میں قرار پائیں جو ان کے اور ان کے مدِمقابل افراد کے درمیان تھا یعنی ان پر یا ان کے مقابل آنے والوں میں سے کسی ایک پر آنے والا تھا، اور آنحضرتؐ جن افراد کو اپنے ساتھ لے گئے انہیں اپنی منصبی حیثیت میں لے گئے کیونکہ آپؐ خود اس بحث ومناظرہ اور ادعاء میں فریق تھے تو حق تو یہ تھا کہ خود ہی اس امتحان گاہ میں پیش ہوتے کہ جہاں جھوٹ ثابت ہونے کی صورت میں لعنت وعذاب ان کا انتظار کر رہا تھا، تو اسے برداشت کرتے، بنابرایں اگر وہ دعویٰ جو آنحضرتؐ نے کیا تھا اس میں وہ افراد اسی طرح شریک نہ ہوتے جس طرح خود آنحضرتؐ تھے تو انہیں ساتھ لے جانا بے مقصد و بے سود ہوتا، لہٰذا ثابت ہوا کہ ان ہستیوں کا ساتھ لے جانا اس بناء پر تھا کہ وہ اس دعویٰ میں برابر کے شریک تھے کہ جن میں بیٹے، خواتین اور انفس شامل تھے۔ اور انہیں بطور نمونہ ساتھ نہ لے گئے تھے، اس طرح یہ بات درست قرار پاتی ہے کہ جو دعویٰ آنحضرتؐ نے کیا تھا (کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور عیسیٰؑ بندۂ خدا اور خدا کے نبی ہیں) وہ ان افراد کے ساتھ اسی طرح قائم تھا جس طرح خود آنحضرتؐ کے ساتھ !

اور یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ نصاریٰ جو آنحضرتؐ سے ملنے اور بحث ومحاجہ ومناظرہ کرنے آئے تھے وہ صرف اس بناء پر نہیں آئے تھے کہ صرف آنحضرتؐ کا عقیدہ ہے کہ عیسیٰؑ بن مریمؑ بندۂ خدا اور رسولِ خدا ہیں اور یہ آپؐ ہی کا ایمان و نظریہ ہے بلکہ اس بناء پر آئے تھے کہ آنحضرتؐ اس کے مدعی ہیں اور انہیں یعنی نصاریٰ کو بھی اس کی طرف بلاتے ہیں، لہٰذا یہ دعوت وبلاوا ہی اس بات کا سبب ہوا کہ وہ وفود بھیجیں اور بحث ومناظرہ کریں، اس حوالہ سے آنحضرتؐ اور جو ہستیاں آپؐ کے ہمراہ مباہلہ کے لئے آئیں وہ دعویٰ ودعوت دونوں کی طرف سے تھا اور وہ ہستیاں آپؐ کے ساتھ دعوتِ دین کے عمل میں اسی طرح شریک تھیں جس طرح کے اصل دعویٰ میں شریک تھیں۔

ایک فنی وتکنیکی سوال اور اس کا جواب

یہاں ایک سوال ممکن ہے اور وہ یہ کہ اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ ان ہستیوں کا مباہلہ کے لئے آنحضرتؐ کے ہمراہ آنا اس بناء پر تھا کہ وہ آنحضرتؐ ہی سے تھے اور یہ صفت انہی سے مخصوص تھی اور ان کے علاوہ کوئی بھی اس صفت وخصوصیت کا حامل نہ تھا لیکن عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے عزیز ونزدیک ترین افراد کو بظاہر خطرناک وخوفناک مقامات میں لاتا ہے تو اس کا یہی عمل اس حقیقت کا ثبوت ہوتا ہے کہ وہ ان کے بارے میں وثوق واطمینان رکھتا ہے کہ وہ ہر طرح سے محفوظ رہیں گے اور انہیں کسی طرح سے کوئی خطرہ لاحق نہ ہوگا بلکہ پوری حفاظت کے ساتھ سلامتی وعافیت سے ہمکنار ہوں گے، اس بناء پر آنحضرتؐ کا ان ہستیوں کو اپنے ہمراہ لانا بھی اسی طور پر تھا، اس سے زیادہ کوئی چیز ملحوظ نہ تھی لہٰذا ان کا دعوتِ مباہلہ میں

برابر کا شریک قرار پانا ان کے وہاں آنے سے ہرگز ثابت نہیں ہوتا بلکہ اس کا ان کے وہاں آنے سے دور کا بھی ربط نہیں، گویا اس سے ان کی فضیلت و برتری وغیرہ ثابت نہیں ہوتی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آیت مبارکہ کے ابتدائی الفاظ سے تو یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ وہ دعوت میں برابر کے شریک تھے بلکہ اس سے اس مطلب سے زیادہ کچھ ثابت نہیں ہوتا جو ذکر کیا گیا ہے لیکن سوال یا اعتراض کرنے والے کو معلوم ہے کہ آیت کے ذیلی الفاظ یعنی "عَلَی الْکٰذِبِیْنَ" سے ثابت ہوتا ہے کہ مباہلہ و مناظرہ کے دو فریقوں میں سے ایک یقینی طور پر جھوٹا تھا بلکہ اسے جھوٹا ہونا بھی چاہیے کیونکہ محاجہ و مباہلہ میں فریقین میں سے کسی ایک کا برحق اور دوسرے کا ناحق ہونا ضروری ہوتا ہے، اور یہ تبھی درست ہوتا ہے جب دونوں طرفوں کے افراد اس عمل میں برابر کے شریک ہوں، خواہ سچوں کی طرف کے افراد ہوں یا جھوٹوں کی طرف کے افراد ہوں، بنا برایں اس جملہ سے ثابت ہوتا ہے کہ جو افراد حضرت پیغمبر اسلامؐ کے ہمراہ آئے تھے وہ آپؐ کے ساتھ اصل ادعاء اور دعوتِ مباہلہ دونوں میں برابر کے شریک و حصہ دار تھے جیسا کہ پہلے یہ مطلب بیان ہو چکا ہے۔ اس حوالہ سے ان ہستیوں کے حصہ دار ہونے اور آنحضرتؐ کے توحیدی مشن اور اثباتِ حق کے لئے مباہلہ کے عمل میں برابر کے شریک ہونے میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہتا۔

ایک اہم اصولی سوال اور اس کا جواب

مذکورہ بالا مطالب کی روشنی میں ایک اہم بلکہ نہایت حساس مسئلہ سامنے آ سکتا ہے اور وہ یہ کہ اگر وہ افراد جو آنحضرتؐ کے ساتھ مباہلہ میں آئے تھے اصل ادعاء و دعوت میں برابر کے شریک ہوں تو اس سے ان کی نبوت تسلیم کرنا پڑے گی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا ہرگز نہیں جیسا کہ ہم سورۂ بقرہ کی آیت ۲۱۳ کی تفسیر میں واضح طور پر نبوت کی بابت مربوطہ مباحث میں بیان کر چکے ہیں کہ تبلیغ و دعوت نہ عین نبوت ہے اور نہ ہی عین بعثت ہے البتہ یقیناً ان کے لازمی امور میں شامل ہے بلکہ اس کے منصبی تقاضوں کا حصہ ہے یعنی تمام خدائی عہدوں اور منصوبوں کی بنیادی ذمہ داریوں میں سے ہے، اسی طرح سورۂ بقرہ کی آیت ۱۲۴ کی تفسیر میں بھی امامت کی بحث میں یہ امر واضح طور پر بیان ہو چکا ہے کہ تبلیغ و دعوت عین امامت نہیں البتہ ایک حوالہ سے اس کے لازمی امور اور بنیادی تقاضوں کا حصہ ہے۔

سچے واقعات

○ " اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ "
(یقیناً یہی سچے و برحق واقعات ہیں، اور اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں)

اس آیت میں لفظ "هٰذَا" سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے مربوط واقعات سے تعلق رکھنے والے مطالب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، عربی ادب کی اصطلاح میں یوں کہا جاتا ہے کہ یہ کلام قصر القلب پر مشتمل ہے اس کا معنی یہ ہے کہ عیسیٰؑ کے متعلق ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے وہی حق ہے نہ کہ وہ جو نصاریٰ نے عیسیٰؑ کے بارے میں دعویٰ کیا ہے !

اور یہاں حرف "اِنَّ" اور حرف لام اور ضمیر "لَهُوَ" اس لئے ذکر کی گئی ہے کہ اس جملہ میں جو مطلب بیان کیا گیا ہے اس کی تاکید مزید ہو جائے تاکہ آنحضرتؐ کی طیب خاطر اور مباہلہ کی بابت حوصلہ افزائی و تقویت قلب کا سامان ہو کہ آپؐ اپنے پختہ یقین، کامل بصیرت اور خدا کی طرف سے نازل ہونے والی وحی کی بابت اپنے بھرپور اعتماد کے ساتھ میدان میں اتریں، چنانچہ اس تاکید پر مزید تاکید اس حقیقت کے ذکر کے ذریعے ہوئی جو دعوتِ حق کا بنیادی تقاضہ و نتیجہ تھا یعنی "وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ" (اور کوئی معبود نہیں سوائے خدا کے !) کیونکہ یہ جملہ (توحید پر مشتمل ہونے کی وجہ سے) مذکورہ واقعات کے برحق ہونے کا لازمی نتیجہ ہے۔

خدا کا غلبہ و دانائی

○ " وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ "
(اور یقیناً خدا ہی ہے جو غالب و دانا ہے)

یہ جملہ ابتدائے آیت پر عطف ہے اور اس کا نہایت تاکید پر مشتمل ہونا آنحضرتؐ کے طیب خاطر اور تقویت قلب و حوصلہ افزائی کے خدائی حوالہ کا امین ہے کہ خدا حق کی نصرت و تائید سے عاجز و ناتواں نہیں ہے اور نہ ہی وہ اس سلسلہ میں کسی بے توجہی و نادانی کے سبب غفلت و بے پرواہی کرتا ہے کیونکہ وہ غلبہ والا ہے (جس چیز کا ارادہ کرتا ہے اس کے پورا کرنے میں ناتواں نہیں) اور وہ حکمت و دانائی والا ہے (وہ ناآگاہ و بے پرواہی کرنے والا نہیں)، لہٰذا وہی معبود برحق ہے نہ کہ وہ معبود

ہیں جنہیں دشمنان حق نے خدا کے مقابلے میں معبود قرار دیا ہوا ہے۔

اس بیان سے یہاں ان دو ناموں (عزیز، حکیم) کے ذکر کی وجہ بھی واضح ہو جاتی ہے اور یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ یہ کلامِ خداوندی قصر القلب کے لئے ہے یا قصر الافراد کے لئے ہے۔

خدا فسادیوں سے آگاہ ہے

○ " فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِیۡمٌۢ بِالۡمُفۡسِدِیۡنَ "
(خدا فساد برپا کرنے والوں کو بخوبی جانتا ہے)

چونکہ محاجہ و مباہلہ کی اصل غرض اور حقیقی مقصد حق کا اظہار تھا لہٰذا یہ بات ہرگز معقول نہ تھی کہ اس عظیم غرض و مقصد کے حصول کا خواہاں اس راہ سے روگردانی کرے، پس اگر نصاریٰ مباہلہ و محاجہ کے ذریعے حق کا واضح و آشکار ہونا چاہیں جبکہ وہ بخوبی آگاہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ حق کے ساتھ ہے اور وہ حق کو مغلوب و بے نتیجہ ہوتا نہیں دیکھ سکتا تو وہ مباہلہ سے ہرگز روگردانی نہیں کریں گے، لیکن اگر وہ اس سے روگردانی کریں تو اس کا سبب و مطلب یہ ہوگا کہ وہ حق کا اظہار اور حقیقت کا آشکار ہونا چاہتے ہی نہیں بلکہ صرف ظاہری غلبہ کا حصول، دنیاوی نام و نمود کا تحفظ اور اپنی دیرینہ عادات و رسوم کی بقا کے خواہاں ہیں، بنا بریں ان کا مقصد اپنی ہوا و ہوس سے آمیختہ اور نفسانی خواہشات سے آلودہ زندگی سے لطف اندوز ہونا ہے اور وہ صالح و پاکیزہ زندگی چاہتے ہی نہیں جو حق و سعادت سے ہم رنگ و ہم آہنگ ہو، درحقیقت وہ اصلاح نہیں چاہتے بلکہ اپنی سعادتمند زندگی کو تباہ و برباد کر کے دنیا کی تباہی و نابودی کے درپے ہیں، پس اگر وہ روگردانی کریں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ فسادی ہیں۔

اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں جزاء میں سبب کو مسبب کی جگہ رکھ دیا گیا ہے یعنی فساد (فساد کی تباہی پھیلانے) کو حق کے عدم اظہار کے ارادہ کی جگہ ذکر کیا گیا ہے، اور جملہ میں جزاء کو وصف علم یعنی جاننے و آگاہ ہونے سے آمیختہ کر دیا ہے چنانچہ ارشاد ہوا: " فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِیۡمٌۢ " (بے شک خدا آگاہ و باخبر ہے) پھر حرف "اِنَّ" کے ذریعے تاکید مزید کر دی گئی تاکہ یہ بات ثابت ہو کہ فساد اور تباہی پھیلانا ان کے نفوس میں رچ بس گیا ہے اور ان کے دلوں میں اس کی جڑیں مضبوط ہو چکی ہیں، اس سے ان کی مباہلہ سے یقینی روگردانی کا اشارہ ملتا ہے، چنانچہ عملی طور پر ان کا کردار کلام الٰہی کی صداقت کا ثبوت بن گیا اور انہوں نے اپنی فسادی و افسادی طبع کے آثار کے ذریعے خدا کے فرمان کی تصدیق کر دی۔

روایات پر ایک نظر

نجران کے نصاریٰ کا وفد، مدینہ میں!

تفسیر قمی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد گرامی ذکر کیا گیا ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

جب نجران کے نصاریٰ کا وفد حضرت پیغمبر خداؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس کے سربراہ ''اھتم''، ''عاقب'' اور ''سید'' نامی افراد تھے، ان کی نماز کا وقت ہوا تو وہ گھنٹیاں بجانا شروع ہو گئے اور پھر نماز پڑھنے میں مصروف ہو گئے، آنحضرتؐ کے اصحاب نے کہا: اے اللہ کے رسول! یہ آپ کی مسجد میں ایسا ہو رہا ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو، چنانچہ وہ اپنی نماز سے فارغ ہو گئے تو آنحضرتؐ کے قریب آئے اور آپؐ سے پوچھنے لگے کہ آپ لوگوں کو کس دین کی دعوت دے رہے ہیں؟ حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ارشاد فرمایا: خدا کی توحید اور اپنی رسالت پر ایمان لانے اور حضرت عیسیٰؑ کو بندۂ خدا تسلیم کرنے کی دعوت دے رہا ہوں کہ وہ خدا کی مخلوق تھے کھاتے، پیتے اور باتیں کرتے تھے، انہوں نے کہا: اگر ایسا ہے تو پھر یہ بتائیے کہ ان کا باپ کون ہے؟ اس وقت حضرت پیغمبر اسلامؐ پر وحی نازل ہوئی اور خدا نے ارشاد فرمایا: ان سے پوچھئے کہ تم آدمؑ کے بارے میں کیا کہتے ہو، کیا وہ خدا کا بندہ اور مخلوق خدا تھا جو کھاتا، پیتا، بولتا اور مناکحت کرتا تھا؟ آنحضرتؐ نے ان سے پوچھا تو وہ کہنے لگے، ہاں، آپؐ نے پوچھا: اس کا باپ کون تھا؟ تو وہ حیرت زدہ ہو گئے اور بوکھلاہٹ کا شکار ہو گئے، اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: '' اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَہٗ مِنْ تُرَابٍ...... '' اور یہ آیت '' فَمَنْ حَآجَّکَ فِیْہِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَکَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَکُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَکُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَکُمْ ۟ ثُمَّ نَبْتَہِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰہِ عَلَی الْکٰذِبِیْنَ ''، تو حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ان سے فرمایا: آؤ تم مجھ سے مباہلہ کرو، اگر میں سچا ہوں تو تم پر خدا کی لعنت نازل ہو گی اور اگر میں جھوٹا ہوں تو مجھ پر نازل ہو گی، نصاریٰ نے کہا کہ آپ نے یہ انصاف کی بات کی، چنانچہ انہوں نے مباہلہ کا طے کر لیا، جب وہ اپنے گھروں کو واپس گئے تو ان کے بزرگوں اور وفد کے سربراہوں نے کہا کہ وہ خود اور اپنی قوم کے ساتھ مباہلہ کو آئے تو ہم ضرور مباہلہ کریں گے کیونکہ وہ نبی نہیں، اور اگر وہ خود اور اپنے اہل بیت کے ساتھ مباہلہ کے لئے آئے تو ہم مباہلہ نہیں کریں گے کیونکہ یہ بات مسلم ہے کہ کوئی شخص اس وقت تک اپنے اہل بیت کو خطرے میں ڈالنے پر تیار نہیں ہوتا جب تک اسے اپنے سچا

ہونے کا یقین نہ ہو، جب صبح ہوئی تو وہ لوگ حضرت پیغمبر اسلامؐ کے پاس آئے اور حسب وعدہ مباہلہ کے لئے پہنچ گئے، انہوں نے دیکھا کہ حضرت رسول خداؐ کے ساتھ امیر المومنین علیؑ، فاطمہ زہراءؑ، حسنؑ و حسینؑ ہیں تو انہوں نے پوچھا: یہ کون ہیں؟ انہیں بتایا گیا کہ وہ مرد آپؐ کے چچازاد بھائی، وصی اور داماد علیؑ بن ابی طالبؑ ہیں اور یہ خاتون آپؐ کی دختر فاطمہؑ اور یہ دو فرزند آپؐ کے نواسے حسنؑ و حسینؑ ہیں، یہ سن کر وہ پیچھے ہٹ گئے اور انہوں نے آنحضرتؐ سے کہا: ہم آپ پر راضی ہیں آپ ہمیں مباہلہ سے معاف کریں، تو آپؐ نے جزیہ پر ان سے مصالحت کر لی اور وہ واپس چلے گئے۔

(تفسیر قمی، جلد اول صفحہ ۱۰۴)

عترت اور امت کے درمیان فرق

کتاب عیون اخبار الرضاؑ (عیون اخبار الرضاؑ، ج ۱، ص ۲۲۸، حدیث ۱، باب ۲۳) میں ریان بن صلت کے حوالہ سے مروی ہے کہ حضرت امام رضا علیہ السلام نے مامون عباسی اور اس کے بلائے ہوئے علماء سے طویل بحث و مباحثہ میں عترت اور امت کے درمیان فرق کو بیان کیا اور عترت کی امت پر فضیلت و برتری کو ثابت کیا، چنانچہ علماء نے امامؑ سے پوچھا: "**هل فسر الله الاصطفاء في كتابه**؟ کیا خداوند عالم نے اپنی کتاب میں اصطفاء کی تفسیر بیان کی ہے؟ امامؑ نے ارشاد فرمایا: "**فسر الاصطفاء في الظاهر سوى الباطن في اثني عشر موضعا**، خداوند عالم نے قرآن مجید میں بارہ مقامات پر اصطفاء کی ظاہری تفسیر بیان کی ہے جبکہ باطنی تفسیر کچھ اور ہے، پھر امامؑ نے ان بارہ مقامات کو بیان کیا اور مربوطہ آیات پڑھیں، اپنے بیان میں امامؑ نے ان مقامات میں سے تیسرے مقام کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا: تیسرا مقام وہ ہے جس میں خدا نے اپنے پاک بندوں کو دوسروں سے امتیاز بخشا اور اپنے نبی کو حکم دیا کہ نصاریٰ کے ساتھ مباہلہ کریں چنانچہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: " فَمَنۡ حَآجَّكَ فِيۡهِ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الۡعِلۡمِ فَقُلۡ تَعَالَوۡا نَدۡعُ اَبۡنَآءَنَا وَاَبۡنَآءَكُمۡ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمۡ وَاَنۡفُسَنَا وَاَنۡفُسَكُمۡ " (پس جب تجھ سے بحث و محاجہ کریں بعد اس کے کہ تیرے پاس علم آچکا ہے تو کہہ دو کہ آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلاتے ہیں تم اپنے بیٹوں کو بلاؤ، ہم اپنی عورتوں کو بلاتے ہیں تم اپنی عورتوں کو بلاؤ اور ہم اپنوں کو بلاتے ہیں تم اپنوں کو بلاؤ)، علماء نے کہا کہ یہاں "**انفس**" سے مراد خود آنحضرتؐ ہیں، امامؑ نے فرمایا: تم غلط فہمی کہہ رہے ہو، اس سے مراد علیؑ بن ابی طالبؑ ہیں، اس کی دلیل آنحضرتؐ کا وہ فرمان ہے جو قبیلہ بنی ولیعہ کے بارے میں آپؐ نے فرمایا، اس میں یوں ارشاد ہوا: "**لينتهين بنوا وليعة او لابعثن اليهم رجلا كنفسي**" بنو ولیعہ اپنی حرکتوں سے باز آجائیں ورنہ میں ان کی طرف ایسے شخص کو بھیجوں گا جو میری طرح ہے، اس میں لفظ "**کنفسی**" سے مراد

علیؑ بن ابی طالبؑ ہیں، اور "ابنـــاء" (بیٹوں) سے مراد حسنؑ و حسینؑ ہیں اور "نســاء" سے مراد فاطمہؑ ہیں ، **فهـذه خصـوصيـة لـا يتـقـدمهم فيها احد ، وفضل لا يلحقهم فيه بشر ، وشرف لا يسبقهم اليه خلق اذ جعل نفس علي (ع) كنفسه** یہ وہ خصوصیت اور امتیازی صفت ہے کہ پوری امت میں سے کوئی فرد اس میں ان ہستیوں پر تقدم نہیں رکھتا، اور ایسی فضیلت ہے کہ جسے ان کے سوا کوئی انسان نہیں پاسکتا اور ایسا شرف و اعزاز ہے کہ ان کے علاوہ کوئی اس کا حامل نہیں ہوسکتا، کیونکہ آپؐ نے علیؑ کو اپنا "نفس" قرار دیا۔

اولا درسولؐ سے کیا مراد ہے؟

کتاب عیون اخبار الرضاؑ ہی میں مؤلفؒ نے اپنے اسناد سے حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کا ارشاد گرامی ذکر کیا ہے کہ آپؑ نے رشید عباسی سے گفتگو اور بحث میں وضاحت فرمائی، رشید نے امامؑ سے کہا: **كيف قلتم : انا ذرية النبي (ص) والنبي لـم يعقب ، وانما العقب للذكر لا للانثیٰ، وانتم ولد البنت ولا يكون له عقب ؟** آپ کس طرح دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نبیؐ کی ذریت و اولاد ہیں؟ جبکہ نبیؐ کا کوئی بیٹا نہ تھا اور ذریت و نسل کا سلسلہ مردوں سے چلتا ہے عورتوں سے نہیں، اور آپ نبیؐ کی بیٹی کی نسل سے ہیں لہٰذا آپ رسول اللہؐ کی اولاد و نسل نہیں کہلا سکتے، امامؑ نے فرمایا کہ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ اس سے کہوں کہ تجھے قرابت و قبر رسولؐ اور خود رسولؐ کا واسطہ دیتا ہوں کہ مجھے اس بحث سے دور رکھ، چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا، رشید نے میری طرف اور وہاں موجود دیگر سادات کی طرف رخ کر کے کہا: **تـخبـرني بحجتكم فيه يا ولد علي و انت يا موسى يعسوبهم و امام زمانهم** ، اے اولادِ علیؑ اور اے موسیٰ کہ جوان کا سردار اور ان کا امام زمانہ ہے، مجھے اس موضوع کا اثبات مطلوب ہے اور تم مجھے اپنے دعوے کی ٹھوس دلیل پیش کرو، رشید نے خاص طور پر میری طرف رخ کر کے کہا: **ولسـت اعفيـك فـي كـل مـا اسئلـك عنه حتى تاتيني فيه بحجة من كتاب اللـه وانتـم تـدعـون مـعشـر ولـد علي انه لا يسقط عنكم منه شيي ء لا الف ولا واو الا تاويله عندكم واحتـجـجتم بقوله : مافرطنا في الكتاب من شيي ء،** کہ میں آپ کو ہرگز معاف نہیں کروں گا جب تک کہ اس سلسلہ میں میرے ہر سوال کا ٹھوس جواب نہ دو اور کتاب اللہ سے واضح ثبوت پیش نہ کرلو، اور تم اولادِ علیؑ دعویٰ کرتے ہو کہ کتاب اللہ کی کوئی بات تم سے پوشیدہ نہیں، نہ اس کا الف اور نہ واو، بلکہ تم سب کی حقیقت سے آگاہ ہو اور تم اپنے ادعاء پر یہ دلیل پیش کرتے ہو کہ خدا نے فرمایا ہے: "**مـافرطنا في الكتاب من شيئي**"، اور تم اپنے آپ کو تمام علماء کے نظریہ اور قیاس سے بے نیاز سمجھتے ہو!

رشید کی یہ بات سن کر میں نے اس سے کہا: کیا مجھے جواب دینے کی اجازت ہے ؟ اس نے کہا: ہاں، جو کچھ آپ کے پاس ہے پیش کریں، تو میں نے کہا: "اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، وَ مِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَ اِلْيَاسَ" تو اے ہارون (اپنے آپ کو امیر المومنین سمجھنے والے) یہ بتاؤ کہ عیسیٰ کا باپ کون تھا ؟

ہارون رشید نے کہا: ان کا کوئی باپ نہ تھا، تو میں نے کہا: جبکہ عیسیٰ کا کوئی باپ نہ تھا تو خدا نے اسے اس کی والدہ حضرت مریمؑ کے ذریعے انبیاء کی ذریت میں شامل کر دیا، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہماری مادر گرامی قدر فاطمہؑ کے ذریعے نبیؐ کی ذریت میں شامل کر لیا، کیا مزید کچھ کہوں اے وہ کہ جو خود کو مومنوں کا امیر کہلاتے ہو ؟

رشید نے کہا: مزید کچھ پیش کریں، تو میں نے اس آیت کی تلاوت کی: " فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ۣ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ" ، اور کہا کہ کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ آنحضرتؐ نے نصاریٰ سے مباہلہ میں اسے چادر کے نیچے اپنے ساتھ رکھا ہو سوائے علیؑ بن ابی طالبؑ، فاطمہؑ اور حسنؑ و حسینؑ کے، لہٰذا کلام الٰہی کی تفسیر و تاویل یوں ہوگی : " اَبْنَآءَنَا" یعنی حسنؑ و حسینؑ، " نِسَآءَنَا" یعنی فاطمہؑ اور " اَنْفُسَنَا" یعنی علیؑ بن ابی طالبؑ ،

(کتاب عیون اخبار الرضاؑ ، جلد اول صفحہ ۸۴، ۸۵)

اس کے علاوہ مامون نے حضرت امام رضا علیہ السلام سے جو سوالات کئے ان میں ایک سوال یہ تھا کہ آپ کے جد علی بن ابی طالب کی خلافت کی دلیل کیا ہے؟ تو امامؑ نے جواب دیا: " اَنْفُسَنَا" کی آیت اس کی دلیل ہے، مامون نے کہا: ہاں اگر " نِسَآءَنَا" نہ ہوتا، امامؑ نے فرمایا: ہاں، اگر " اَبْنَآءَنَا" نہ ہوتا۔

وضاحت: امامؑ نے " اَنْفُسَنَا" سے استدلال کیا کہ اس میں حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ مراد ہیں کہ خدا نے انہیں نفس نبیؐ قرار دیا ہے، اس پر مامون نے اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ یہ بات تب درست تھی جب آیت میں لفظ "نِسَآءَنَا" نہ ہوتا کیونکہ اس لفظ کی بناء پر " اَنْفُسَنَا" سے مرد مراد ہیں تو اس سے فضیلت کی کونسی بات ثابت ہوتی ہے؟ امامؑ نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا: تیری بات تب درست تھی جب اس میں لفظ " اَبْنَآءَنَا" نہ ہوتا اور یہ لفظ " اَبْنَآءَنَا" تیرے دعوے کی صریح نفی کرتا ہے کیونکہ اگر " اَنْفُسَنَا" سے عام مرد، مراد ہوتے تو بیٹوں (اَبْنَآءَ) کے ذکر کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی بلکہ حسنؑ و حسینؑ کہ جو بیٹوں کی جگہ پر ساتھ تھے وہ بھی مردوں میں شامل ہونے کی وجہ سے " اَبْنَآءَنَا" کا مصداق نہ بنتے، تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ لفظ " اَنْفُسَنَا" سے مراد عام مرد نہیں بلکہ خاص طور پر حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ مراد ہیں۔

فضائل علیؑ بزبان علیؑ

تفسیر العیاشی میں مؤلف نے اپنے اسناد سے حریز کی روایت ذکر کی ہے کہ اس نے بیان کیا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: ایک شخص حضرت امیر المومنینؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا کہ اپنے فضائل بیان کریں، امامؑ نے اپنے کچھ فضائل بیان کئے تو لوگوں نے کہا: کچھ مزید بیان فرمائیں، امامؑ نے ارشاد فرمایا:

" ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم اتاہ حبران من احبار النصاریٰ من اھل نجران فتکلما فی امر عیسیٰ فانزل اللّٰہ ھٰذہ الآیۃ: ان مثل عیسیٰ عنداللّٰہ کمثل آدم...... الخ، فدخل رسول اللّٰہ فاخذ بیدی والحسن والحسین و فاطمۃ ثم خرج و رفع کفہٗ الی السمآء و فرج بین اصابعہٖ ودعاھم الی المباھلۃ "

نجران کے نصاریٰ کے علماء میں سے دو عالم حضرت پیغمبر اسلامؐ کی خدمت میں آئے اور آپ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں گفتگو کی، اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: "عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم جیسی ہے جسے خدا نے مٹی سے پیدا کیا......"، چنانچہ رسول خداؐ گھر میں تشریف لائے اور میرا ہاتھ پکڑا اور حسنؑ و حسینؑ و فاطمہؑ کو ساتھ لیا اور باہر آ گئے اور اپنی ہتھیلی آسمان کی طرف اٹھا کر جبکہ آپؐ کی انگلیاں کھلی ہوئی تھیں نصاریٰ کو مباہلہ کے لئے بلایا...... جب ان دو عیسائی بزرگ علماء نے دیکھا تو ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا: **"واللّٰہ لئن کان نبیاً لنھلکن و ان کان غیر نبی کفانا قومہ "** خدا کی قسم! اگر وہ نبی ہو تو ہم سب تباہ ہو جائیں گے اور اگر وہ نبی نہ ہو تو اس کی قوم ہماری مدد کو کافی ہوگی، چنانچہ انہوں نے مباہلہ نہ کیا اور واپس چلے گئے۔ (تفسیر العیاشی، جلد اول، صفحہ ۱۷۵، حدیث ۵۴)

تحقیقی اظہار خیال

مذکورہ بالا یا ان سے قریب المعنی مطالب شیعہ محدثین نے اپنے حوالوں سے متعدد روایات میں ذکر کئے ہیں اور ان تمام روایات میں یہ بات درج ہے کہ جو ہستیاں حضرت پیغمبر اسلامؐ کے ہمراہ گئی تھیں وہ حضرت علیؑ، حضرت فاطمہ زہراءؑ اور امام حسنؑ و امام حسینؑ تھے، چنانچہ شیخ طوسی نے اپنی کتاب "امالی" میں عامر بن سعد کے حوالہ سے روایت ذکر کی ہے کہ انہوں

نے اپنے والد کے اسناد اس مطلب کو بیان کیا (امالی شیخ طوسی جلد ۱ صفحہ ۳۱۴)، شیخ مرحوم ہی نے اپنے اسناد سے عبدالرحمٰن بن کثیر کی روایت ذکر کی ہے کہ انہوں نے امام جعفر صادقؑ کا ارشاد گرامی بیان کیا، اسی طرح شیخؒ نے دو روایتیں مزید ذکر کیں جن میں سے ایک سالم بن ابی جعد کے حوالہ سے ہے کہ انہوں نے اپنے اسناد سے حضرت ابوذر غفاری رضوان اللہ علیہ کا بیان ذکر کیا ہے اور دوسری روایت میں ربیعہ بن ناجد کے سلسلۂ سند سے حضرت امیر المومنین علیؑ کا ارشاد گرامی ذکر کیا گیا ہے (ملاحظہ ہو: امالی، جلد ۲، ص ۱۷۷، اور جلد ۱ ص ۲۶۱) اور اسی روایت کو شیخ مفیدؒ نے کتاب الاختصاص میں اپنے حوالہ سے محمد بن زبرقان کی روایت ذکر کی کہ انہوں نے امام موسیٰ بن جعفر علیہما السلام کا ارشاد گرامی بیان کیا، (الاختصاص، صفحہ ۵۴) اور اسی روایت کو کتاب ''اختصاص'' ہی میں محمد بن منکدر کے حوالہ سے ذکر کیا کہ انہوں نے اپنے والد اور دادا کے اسناد سے بیان کیا، (کتاب الاختصاص، ص ۱۱۲) اور عیاشیؒ نے اپنی تفسیر میں محمد بن سعید اردنی کے حوالہ سے موسیٰ بن جعفر بن محمد بن رضا کے اسناد سے بیان کیا کہ انہوں نے اپنے بھائی کے حوالہ سے ذکر کیا، (تفسیر العیاشی جلد اول صفحہ ۱۷۶ حدیث ۵۵) مرحوم عیاشیؒ ہی نے اپنی تفسیر میں ابوجعفر احول کے حوالہ سے امام جعفر صادقؑ کا ارشاد گرامی ذکر کیا اور اسی کتاب میں ایک اور روایت میں احول کے حوالہ سے امام جعفر صادقؑ کا فرمان ذکر کیا ہے، اور منذر کے حوالہ سے امام علیؑ کا ارشاد گرامی بھی ذکر کیا ہے اور ایک روایت اپنے اسناد سے عامر بن سعد کے حوالہ سے ذکر کی ہے، اور فرات بن ابراہیمؒ نے اپنی تفسیر میں پورے سلسلۂ روایت کے ذکر کے ساتھ امام ابوجعفرؑ کا ارشاد اور ابورافع، شعبی، امام علیؑ اور شہر بن حوشب کی روایات ذکر کی ہیں، (تفسیر فرات کوفی، صفحہ ۱۴ تا صفحہ ۱۷) اور اسی روایت کو کتاب روضۃ الواعظین صفحہ ۱۶۴، کتاب اعلام الوریٰ صفحہ ۱۳۵، کتاب خرائج راوندی صفحہ ۱۲۶ اور دیگر کتب میں ذکر کیا گیا ہے۔

نصاریٰ کی مباہلہ سے روگردانی

تفسیر ثعلبی میں مجاہد اور کلبی کے حوالہ سے ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ نے جب نجران کے نصاریٰ کو مباہلہ کی دعوت دی تو انہوں نے کہا: ہم واپس جا کر اس سلسلہ میں مشورہ کرتے ہیں اور اس پر غور کرتے ہیں، چنانچہ انہوں نے تنہائی میں بیٹھ کر غور وخوض کے بعد عاقب...... جو کہ ان میں سے زیادہ معتبر اہل نظر تھا...... سے کہا ''یاعبد المسیح ماتری؟'' اے عبدالمسیح! تیری کیا رائے ہے؟ اس نے جواب دیا:

''واللّٰہ لقد عرفتم یا معشر النصاریٰ ان محمداً نبی مرسل ولقد جاء کم بالفصل من امر صاحبکم، واللّٰہ ما باھل قوم نبیاً قط فعاش کبیرھم ولانبت صغیرھم، ولئن فعلتم لنھلکن

فان ابیتم الا الف دینکم والاقامة علٰی ما انتم علیه فوا دعوا الرجل وانصرفوا الٰی بلادکم"

خدا کی قسم اے گروہِ نصاریٰ! تم بخوبی آگاہ ہو کہ محمدؐ نبی ہیں جنہیں خدا کی طرف سے بھیجا گیا ہے اور وہ تمہارے پاس حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں واضح دلیل لائے ہیں اور اس سلسلہ میں انہوں نے آپ کو کھلا چیلنج کیا ہے، قسم بخدا! جس قوم نے بھی کسی نبی سے مباہلہ کیا تو نہ ان کا بوڑھا بچا اور نہ ہی ان کے چھوٹے بچے...... بلکہ سب کے سب تباہ ہو گئے، اگر تم نے مباہلہ کیا تو ہم سب تباہ ہو جائیں گے، اگر تم اپنے پسندیدہ دین کو بچانا چاہتے ہو اور جس حال میں ہو اس پر باقی رہنا چاہتے ہو تو اس شخص (محمدؐ) سے معاہدہ کر لو اور اپنے دیار کو پلٹ جاؤ، چنانچہ وہ رسول اللہؐ کی طرف روانہ ہو گئے اور جب وہاں پہنچے تو دیکھا کہ:

" وقد غدا محتضناً بالحسین اخذاً بید الحسن و فاطمة تمشی خلفهٗ و علی خلفها وهو یقول: اذا انا دعوت فامّنوا، فقال اسقف نجران: یا معشر النصارٰی انی لاریٰ وجوهاً لوسألوا اللّٰه ان یزیل جبلاً من مکانهٖ لازالهٗ بها فلا تباهلوا فتهلکوا ولا یبقی علٰی وجه الارض نصرانی الٰی یوم القیامة "

حضرت رسول خداؐ نے حسینؑ کو آغوش میں لیا ہوا تھا اور حسنؑ کا ہاتھ پکڑ کر آ رہے تھے جبکہ فاطمہؑ ان کے پیچھے پیچھے چل رہی تھیں اور علیؑ فاطمہؑ کے پیچھے چلتے ہوئے آ رہے تھے، حضرت رسول خداؐ نے ان سے کہا: جب میں دعا کروں تو تم آمین کہنا، نجران کے پادری نے جب حضرت رسول خداؐ اور ان کے ساتھ آنے والوں کو دیکھا تو اپنے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا: اے نصرانیو! یقیناً میں ایسے چہرے دیکھ رہا ہوں کہ اگر وہ خدا سے چاہیں کہ پہاڑ کو اس کی جگہ سے ہٹا دے تو وہ ہٹا دے گا، ان سے مباہلہ ہرگز نہ کرنا ورنہ تباہ و ہلاک ہو جاؤ گے اور قیامت تک کوئی نصرانی روئے زمین پر باقی نہ رہے گا،

اسقف کی بات سن کر نصرانیوں نے آنحضرتؐ سے کہا:

"یا ابا القاسم رأینا ان لا نباهلک و ان نقرک علٰی دینک و نثبت علٰی دیننا "

اے ابوالقاسم! ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ آپ سے مباہلہ نہ کریں اور آپ کو اپنے دین پر رہنے دیں اور ہم اپنے دین پر باقی رہیں، آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا:

" فاذا ابیتم المباهلة فاسلموا یکن لکم ما للمسلمین وعلیکم ما علیهم "

اگر تم مباہلہ نہیں کرنا چاہتے تو اسلام قبول کر لو تا کہ تم مسلمانوں کے ساتھ ہر طرح کے نفع و نقصان میں برابر ہو جاؤ، لیکن انہوں نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا، تو حضورؐ نے ارشاد فرمایا:

"فانی انا جزکم" تو پھر میں تم سے اعلان جنگ کرتا ہوں،

انہوں نے کہا: " ما لنا بحرب العرب طاقة ولكن نصالحك علىٰ ان لا تغزونا ولا تخيفنا ولا تردنا عن ديننا علىٰ ان نؤدی اليک کل عام الفي حلة : الف فی صفر، الف فی رجب و ثلاثين درعاً عادية من حديد "

ہم عربوں کے ساتھ جنگ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے البتہ ہم آپ سے مصالحت ومعاہدہ کرنا چاہتے ہیں کہ آپ ہم سے جنگ نہ کریں، ہمیں نہ ڈرائیں، اور ہمیں ہمارے دین سے روگرداں نہ کریں، ہم اس کے مقابلے میں آپ کو ہر سال دو ہزار حلے (کپڑوں کے جوڑے) دیں گے، ایک ہزار صفر کے مہینے میں، ایک ہزار رجب کے مہینے میں دیں گے اور تیس لوہے کی بنی ہوئی زرہ بھی دیں گے۔

آنحضرتؐ نے اسی پر ان سے معاہدہ کرلیا اور فرمایا:

"والذی نفسی بيده ان الهلاک قد تدلی علیٰ اهل نجران ولو لا عنوا لمسخوا قردة وخنازير، ولاضطرم عليهم الوادی ناراً، ولا ستاصل الله نجران و اهلهٗ حتی الطير علیٰ رؤس الشجر، ولما حال الحول علی النصاریٰ کلهم حتی يهلکوا "

مجھے اس ذات کی قسم جس کے قبضہء قدرت میں میری جان ہے کہ ہلاکت نجران کے نصاریٰ پر چھا چکی تھی، اگر وہ مباہلہ کرلیتے تو بندر اور خنزیر کی شکلوں میں مسخ ہو جاتے اور زمین ان کے پاؤں کے نیچے آگ اگلتی، بالآخر خداوند عالم نجران اور وہاں کے باسیوں کو تباہ و برباد کر دیتا یہاں تک کہ درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندے بھی ہلاک ہو جاتے، اور ان کے علاوہ دیگر نصرانی سال بھر میں سب کے سب ہلاک ہو جاتے۔ (ملاحظہ ہو: تفسیر البرہان، جلد ۱ ص ۲۹۰ حدیث ۱۵)

اس سے ملتا جلتا واقعہ کتاب "المغازی" میں ابن اسحاق کے حوالہ سے ذکر کیا گیا ہے اور مالکی نے الفصول المہمۃ فی معرفۃ الائمۃ صفحہ ۲۳ میں اس روایت کو مفسرین کے حوالہ سے بیان کیا ہے اور اس سے قریب قریب ایک روایت حموی نے ابن جریج کے حوالہ سے ذکر کی ہے۔

اور روایت میں نصاریٰ کی طرف سے جزیہ کے اوقات میں سب سے پہلے ماہ صفر کا ذکر کیا گیا اور کہا گیا " الف فی صفر" یعنی ایک ہزار کپڑے صفر کے مہینہ میں دیں گے، تو اس سے مراد ماہ محرم ہے کیونکہ عربوں کے نزدیک اسے ہی سال کا پہلا مہینہ قرار دیا جاتا ہے اور اسے زمانہء جاہلیت میں پہلا صفر کہا جاتا تھا اور صفر کے مہینہ کو دوسرا صفر کہا جاتا تھا، اور ان کے ہاں رسم یہ تھی کہ اگر پہلے صفر یعنی ماہ محرم میں کوئی جنگ درپیش ہو جاتی تو اس میں چونکہ ان کے ہاں بھی جنگ کرنا حرام و ممنوع تھا جیسا کہ اسلام میں بھی ہے کہ محرم میں جنگ ممنوع ہے لہٰذا وہ اس حرمت و ممنوعیت کے حکم کو پہلے صفر کی بجائے دوسرے صفر میں منتقل کر دیتے تھے تاکہ پہلے صفر میں جنگ کر سکیں اور اس منتقل کرنے کو "نسیئ" کہتے تھے لیکن اسلام نے نسی کو

غلط قرار دیا اور پہلے صفر یعنی محرم ہی میں جنگ کی حرمت وممنوعیت کے حکم کو برقرار رکھا اور اسی مناسبت سے اسے "شہر اللہ المحرم" یعنی خدا کا حرمت والا مہینہ (یعنی وہ کہ جس میں جنگ کرنا حرام قرار دیا گیا ہے) سے موسوم کیا گیا جو کہ بعد میں "محرم" کے لفظ سے مشہور ہو گیا۔

اہل بیتؑ کا تعارف

صحیح مسلم میں عامر بن سعد بن ابی وقاص کے حوالہ سے روایت ذکر کی گئی ہے کہ اس نے اپنے باپ یعنی سعد کے حوالہ سے بیان کیا کہ معاویہ بن ابی سفیان نے سعد کو حکم دیا کہ وہ ابوتراب علی بن ابی طالبؑ کو گالیاں بکے، لیکن سعد نے اس حکم پر عمل کرنے سے انکار کیا تو معاویہ نے پوچھا کہ تم ایسا کرنے سے کیوں انکار کرتے ہو؟ (**ما یمنعک ان تسب علیا ؟**) سعد نے جواب دیا: "**اما ماذکرت ثلاثاً قالهن رسول اللّٰہ فلن اسبهٗ لان یکون لی واحدة منهن احب الیّ من حمر النعم**" مجھے حضرت پیغمبر اسلامؐ کے تین ارشادات یاد ہیں لہٰذا میں علیؑ کو ہرگز گالیاں نہیں بک سکتا، اگر ان تین باتوں میں سے کوئی ایک وہ میرے بارے میں ارشاد فرماتے تو وہ مجھے بڑی سے بڑی نعمت سے زیادہ عزیز و پسندیدہ ہوتی، اس کے بعد سعد نے وہ تین باتیں بیان کیں اور کہا:

"**سمعت رسول اللّٰہ (ص) یقول حین خلفه فی بعض مغازیه فقال لهٗ علی(ع): یا رسول اللّٰہ (ص) ! خلفتنی مع النسآء والصبیان؟ فقال لهٗ رسول اللّٰہ (ص): اما ترضٰی ان تکون منی بمنزلة هارون من موسٰی الا انهٗ لا نبی بعدی؟ وسمعته یقول یوم خیبر : لاعطین الرایة غداً رجلاً یحب اللّٰہ و رسوله ویحبه اللّٰہ و رسولهٗ، قال: فتطاولنا لها، فقال: ادعوا لی علیاً فاتی بهٖ ارمد العین فبصق فی عینیه ، ودفع الرایة الیه ففتح اللّٰہ علٰی یدهٖ، ولما نزلت هذه الآیة: قل تعالوا ندع ابنائنا و ابنائکم ونسائنا ونسائکم وانفسنا و انفسکم ثم نبتهل، دعا رسول اللّٰہ(ص) علیاً و فاطمة و حسناً و حسیناً وقال: اللّٰهم هٰؤلاء اهل بیتی**"

(میں نے حضرت پیغمبر اسلامؐ سے سنا ہے کہ جب وہ ایک جنگ کو جاتے ہوئے علیؑ بن ابی طالبؑ کو مدینہ میں اپنا جانشین بنا کر جا رہے تھے تو علیؑ نے آنحضرتؐ کی خدمت میں عرض کی: اے اللہ کے رسولؐ! کیا آپ مجھے عورتوں اور بچوں میں چھوڑ کر جا رہے ہیں؟ تو آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا: کیا تو راضی نہیں کہ تیرا مقام میری نسبت سے وہ ہو جو ہارون کا موسیٰ کی نسبت سے تھا اس فرق کے ساتھ کہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا، (یہ پہلی بات) اور میں نے آنحضرتؐ سے سنا کہ خیبر کے دن

ارشاد فرمایا: کل میں پرچم اسلام اس شخص کو دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول کو دوست رکھتا ہے اور خدا اور اس کا رسول اسے دوست رکھتے ہیں، آنحضرتؐ کے فرمان کے بعد ہم سب پرچم اسلام پانے کے اعزاز کی بابت بحث اور انتظار کرتے رہے لیکن آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا: علیؑ کو بلاؤ، چنانچہ علیؑ کو لایا گیا جبکہ ان کی آنکھوں میں تکلیف تھی، آنحضرت نے ان کی آنکھوں میں اپنا لعاب دہن ڈالا تو وہ صحت یاب ہو گئے تو آنحضرتؐ نے انہیں پرچم اسلام عطا فرمایا اور خداوند عالم نے ان کے ہاتھوں اسلام کو فتح عطا کی، (یہ ہے دوسری بات) اور تیسری بات یہ کہ جب مباہلہ کی آیت نازل ہوئی تو حضرت پیغمبر اسلامؐ نے علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ کو بلایا اور کہا: اے اللہ! یہ ہیں میرے اہل بیت !

(صحیح مسلم مع شرح نووی، ج ۱۵، ص ۱۷۵)

اس روایت کو صحیح ترمذی (جلد ۵، صفحہ ۶۳۸، حدیث ۳۷۲۴) میں بھی ذکر کیا گیا ہے اور اسے ابو مؤید الموفق بن احمد نے کتاب ''فضائل علیؑ'' میں، ابونعیم نے حلیۃ الاولیاء میں عامر بن ابی وقاص کے حوالہ سے اور حمویتی نے کتاب فرائد السمطین میں ذکر کیا ہے۔

حلیۃ الاولیاء میں ابونعیم نے اپنے اسناد سے عامر بن ابی وقاص کے حوالہ سے ذکر کیا کہ اس نے اپنے والد کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ جب مباہلہ کی آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ کو بلایا اور کہا: ''اللھم ھؤلاء اھل بیتی'' اے اللہ! یہ ہیں میرے اہل بیت !

اسی کتاب میں مؤلف نے اپنے اسناد سے شعبی کے حوالہ سے بیان کیا کہ جابر بن عبداللہ انصاری نے کہا: عاقب اور طیب (نصاریٰ کے دو بزرگ علماء) حضرت پیغمبر اسلامؐ کی خدمت میں آئے تو آنحضرتؐ نے انہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی، انہوں نے کہا: ہم نے اسلام قبول کر لیا ہے اے محمدؐ! آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا: تم جھوٹ بولتے ہو، اگر تم چاہو تو میں تمہیں بتاؤں کہ کس چیز نے تمہیں اسلام لانے سے روکا ہوا ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں، ہمیں بتائیے، آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا: وہ تین چیزیں ہیں: (۱) صلیب کی محبت۔ (۲) شراب خوری۔ (۳) خنزیر کا گوشت کھانا، (جابر نے کہا) آنحضرتؐ نے علیؑ کا ہاتھ تھاما اور حسنؑ و حسینؑ و فاطمہؑ کو ساتھ لیا اور مقررہ جگہ پہنچ کر کسی کو ان دو یعنی عاقب و طیب کے پاس بھیجا تو انہوں نے انکار کر دیا اور مباہلہ کرنے کی بجائے آنحضرتؐ کی حقانیت و صداقت کا اقرار کر لیا، اس وقت آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا: ''والذی بعثنی بالحق لو فعلا لامطر علیھم الوادی ناراً'' مجھے اس ہستی کی قسم جس نے مجھے حق کے ساتھ مبعوث فرمایا کہ اگر وہ مباہلہ کر لیتے تو پوری وادی ان پر آگ برساتی، (جابر نے کہا) ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ''نَدۡعُ اَبۡنَآءَنَا وَاَبۡنَآءَكُمۡ'' (ہم اپنے بیٹے بلاتے ہیں تم اپنے بیٹے بلاؤ)...... جابر نے کہا...... ''اَنۡفُسَنَا'' سے مراد رسول اللہؐ اور علیؑ ہیں، ''اَبۡنَآءَنَا'' سے مراد حسنؑ و حسینؑ ہیں اور ''نِسَآءَنَا'' سے مراد فاطمہؑ ہیں۔

اسی روایت کو ابن مغازلی نے اپنی کتاب ''المناقب'' (صفحہ ۲۶۳، حدیث ۳۱۰) میں اپنے اسناد سے بحوالہ شعبی، جابر کی سند سے ذکر کیا ہے اور اسی روایت کو حموینی نے فرائد السمطین (جلد ۲ صفحہ ۲۳ حدیث ۳۶۵) میں اپنے اسناد سے جابر کے حوالہ سے ذکر کیا ہے اور مالکی نے کتاب فصول مہمہ (صفحہ ۲۵) میں اسناد کے ذکر کے بغیر جابر کے حوالہ سے ذکر کی ہے اور اسے ابوداؤد طیالسی کے حوالہ سے شعبۂ شعبی کی سند سے کسی دوسرے اسناد کے بغیر ذکر کیا ہے، تفسیر درمنثور (جلد ۲ صفحہ ۳۸) میں حاکم کے حوالہ سے (کہ اس نے اسے صحیح روایت قرار دیا ہے) اور ابن مردویہ کے حوالہ سے اور ابونعیم کے اسناد سے بحولہ جابر اس روایت کو ذکر کیا گیا ہے۔

نصاریٰ کا چودہ رکنی وفد

تفسیر ''درمنثور'' میں ہے کہ ابونعیم نے کتاب دلائل میں کلبی کے اسناد سے بحوالہ ابوصالح جناب ابن عباس سے روایت ذکر کی ہے کہ انہوں نے کہا:

''ان وفد نجران من النصاریٰ قدموا علیٰ رسول الله (ص) وهم اربعة عشر رجلاً من اشرافهم منهم السید وهوالکبیر، والعاقب وهوالذی یکون بعدهٗ وصاحب رایهم''

نجران کے نصاریٰ کا جو وفد رسول اللہؐ کی خدمت میں آیا تھا وہ چودہ افراد پر مشتمل تھا جو نصاریٰ کے بزرگ تھے، ان میں سے ایک کا نام ''سید'' تھا جو ان سب سے بڑا تھا، اور ایک کا نام ''عاقب'' تھا جو مقام و رتبہ میں اس کے بعد تھا لیکن نصاریٰ کے ہاں اسے خاص مقام حاصل تھا کہ وہ اپنے تمام امور میں اس سے مشورہ کرتے اور اس کی رائے لیتے تھے، گویا وہ ان میں ایک مفکر کی حیثیت رکھتا تھا۔ (تفسیر درمنثور، جلد ۲، صفحہ ۳۹)

نصارائے نجران کے نام مکتوب نبویؐ

تفسیر درمنثور میں ہے کہ بیہقی نے کتاب دلائل میں سلمہ بن عبد یشوع کے حوالہ سے ذکر کیا ہے کہ اس نے اپنے والد اور دادا کے حوالہ سے بیان کیا کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ نے سورۂ نمل کے نازل ہونے سے پہلے نجران کے نصاریٰ کے نام ایک خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا:

''بسم اللّٰه اله ابراهیم و اسحاق و یعقوب، من محمد رسول اللّٰه الیٰ اسقف نجران و

اهل نجران ! ان اسلتم فانی احمد الیکم اللّٰہ الٰہ ابراهیم و اسحاق و یعقوب، اما بعد، فانی ادعوکم الیٰ عبادة اللّٰہ من عبادة العباد، وادعوکم الیٰ ولایة من اللّٰہ من ولایة العباد ، فان ابیتم فالجزیة، وان ابیتم فقد آذنتکم بالحرب والسلام "

اللہ کے نام سے، جو ابراہیم واسحاق ویعقوب کا معبود ہے، یہ خط محمد رسول اللہ کی طرف سے نجران کے پادری وراہل نجران کے نام ہے، اگرتم اسلام قبول کرلو تو میں تمہاری طرف خدا کی حمد کرتا ہوں کہ جو ابراہیم واسحاق ویعقوب کا معبود ہے، اما بعد، میں تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ بندوں کی بندگی چھوڑ کر خدا کی بندگی اختیار کرو اور بندوں کی حاکمیت کے سایے میں رہنے کی بجائے اللہ کی حاکمیت کے سایے میں آ جاؤ، اگرتم میری دعوت کو قبول نہ کرو تو جزیہ ادا کرو، اور اگر اس سے بھی انکار کرو تو میں تم سے اعلان جنگ کرتا ہوں، والسلام،

جب اسقف نے خط پڑھا تو سخت پریشان ہوا اور کانپنے لگا، پھر اس خط کو نجران کے ایک شخص جس کا نام شرحبیل بن وداعہ تھا کی طرف بھیجا، اس نے آنحضرتؐ کے خط کو پڑھا، اسقف نے اس سے پوچھا کہ اس سلسلہ میں تیری رائے کیا ہے؟

شرحبیل نے کہا:

" قد علمت ما وعد اللّٰہ ابراهیم فی ذریة اسماعیل من النبوة فما یؤمن ان یکون هذا الرجل؟لیس لی فی النبوة رای ، لو کان رای من امر الدنیا ارت علیک فیه و جهدت لک "

تجھے معلوم ہے کہ خدا نے ابراہیم سے وعدہ کیا ہے کہ اسماعیل کی نسل میں نبوت قرار دے گا، تو ممکن ہے یہی وہ شخص ہو جسے نبوت عطا ہوئی، البتہ میں نبوت کے بارے میں کوئی اظہار خیال نہیں کرتا، اگر تو کسی دنیاوی مسئلہ میں مجھ سے رائے پوچھتا تو میں ضرور اپنی رائے دیتا اور بھرپور طور پر اس میں تیری مدد کرتا،

اس کے بعد اسقف نے وہ خط اہل نجران کے تمام افراد کی طرف ایک ایک کو بھیجا، سب نے وہی جواب دیا جو شرحبیل نے دیا تھا، پھر انہوں نے طے کیا کہ شرحبیل بن وداعہ، عبداللہ بن شرحبیل اور جبار بن فیض کو بھیجیں تا کہ وہ رسول اللہ کے بارے میں معلومات لے آئیں، چنانچہ وہ لوگ حضرت رسول خداؐ کے پاس آئے اور آنحضرتؐ سے گفت وشنید کی اور کچھ سوالات کئے، آنحضرتؐ نے ان کے تمام سوالوں کے جوابات دیئے، بالآخر انہوں نے آپؐ سے پوچھا:

"ماتقول فی عیسیٰ بن مریم " آپؐ عیسیٰ بن مریم کے بارے میں کیا عقیدہ رکھتے ہیں؟

آنحضرتؐ نے جواب دیا:

"ما عنده فیه شیئ یومی هذا، فاقیموا حتی اخبرکم بما یقال فی عیسیٰ صبح الغد"

آج میں عیسیٰ کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا، تم مدینہ میں رہو اور میں کل صبح عیسیٰ کے بارے میں بتاؤں گا "،

اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی: " اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ...... (تا) فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰہِ عَلَی الْکٰذِبِیْنَ" (عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی طرح ہے کہ خدا نے اسے مٹی سے پیدا کیا...... پھر ہم جھوٹوں پر اللہ کی لعنت قرار دیں)،

یہ سن کر ان لوگوں نے کہا: ہم یہ بات نہیں مانتے، دوسرے دن آنحضرتؐ حسب معاہدہ مباہلہ کے لئے ان کی طرف روانہ ہوئے اور ایک چادر اپنے اور حسنؑ وحسینؑ پر تان لی جبکہ فاطمہؑ آپؐ کے پیچھے چل رہی تھیں، اس دن آنحضرتؐ کے خانۂ اقدس میں متعدد خواتین موجود تھیں، شرحبیل نے اپنے ساتھیوں سے کہا:

" انی اری امراً مقبلاً ان کان هذا الرجل نبیاً مرسلاً فلا عناه لا یبقی علی وجه الارض منا شعر ولاظفر الاهلک "

میں ایک بہت بڑی بات اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں، اگر یہ شخص خدا کا بھیجا ہوا برحق نبی ہے تو اس سے ملاعنہ و مباہلہ کرنے میں ہماری تباہی ہی تباہی ہوگی کہ روئے زمین پر ہمارا کچھ بھی باقی نہ رہے گا بلکہ ہمارے چھوٹے بڑے سب ہلاک ہو جائیں گے،

شرحبیل کے ساتھیوں نے کہا: اس صورت حال میں تیری رائے کیا ہے؟

اس نے کہا: میرے خیال میں یہ فیصلہ اسی پر چھوڑ دیں کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ وہ ہرگز غلط و نادرست فیصلہ نہیں کرے گا (رأیی ان احکمهٗ فانی اریٰ رجلاً لا یحکم شططاً ابداً)،

اس کے ساتھیوں نے کہا: ہم تجھے اختیار دیتے ہیں تو جو مناسب سمجھتا ہے انجام دے،

چنانچہ شرحبیل حضرت پیغمبر اسلامؐ کے پاس آیا اور کہنے لگا: " انی قد رأیت خیراً من ملاعنتک " میرے پاس ایک تجویز ہے جو آپ سے ملاعنہ ومباہلہ کرنے سے بہتر ہے،

آنحضرتؐ نے فرمایا: وہ کیا ہے؟

اس نے کہا: اب سے رات تک اور رات سے صبح تک آپ سوچیں اور پھر جو آپؐ کا فیصلہ ہوگا وہ ہمیں قابل قبول ہوگا،

اس کے بعد رسول خداؐ ملاعنہ ومباہلہ کئے بغیر واپس چلے گئے اور ان سے جزیہ لینے پر مصالحت کرلی،

(تفسیر درمنثور، جلد ۲، ص ۳۸)

اسی کتاب (درمنثور) میں مذکور ہے کہ ابن جریر نے علباء بن احمد لشکری سے روایت کی ہے انہوں نے کہا:

" لما نزلت هذه الآیة:" قل تعالوا ندع ابنائنا و ابنائکم.. ... الخ" ارسل رسول اللّٰه (ص)

الٰی علی و فاطمة وابنیهما الحسن والحسین، ودعا الیهود لیلاعنهم، فقال شاب من الیهود: ویحکم الیس عهدتم الامس اخوانکم الذین مسخوا قردة وخنازیر؟ لا تلاعنوا فانتهوا"

جب یہ آیت نازل ہوئی: "فَقُلْ تَعَالَوْا......" (آیت مباہلہ) تو حضرت رسول خداؐ نے علی و فاطمہؑ و حسن و حسین علیہم السلام کو بلوایا اور یہودیوں کو بلایا تاکہ ان سے ملاعنہ کریں، ایک یہودی نوجوان نے کہا: تمہیں کیا ہو گیا ہے، کیا تم نے کل اپنے ان بھائیوں سے عہد و پیمان نہیں کیا ہے جو بعد میں بندر اور سور کی شکلوں میں مسخ ہو گئے تھے کہ کبھی ملاعنہ نہ کرو گے؟ یہ سن کر یہودی ملاعنہ کرنے سے رک گئے۔ (تفسیر "درمنثور"، جلد ۲، صفحہ ۳۹)

یہ روایت اس مطلب کی تائید و تصدیق کرتی ہے کہ جملہ "فَمَنْ حَآجَّكَ فِيهِ" میں ضمیر کی بازگشت لفظ "اَلْحَقُّ" کی طرف ہے جو پہلے ذکر ہوا ہے یعنی "اَلْحَقُّ مِن رَّبِّكَ"، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مباہلہ کا حکم صرف حضرت عیسیٰؑ بن مریمؑ کے مسئلہ میں نصاریٰ ہی سے مخصوص نہ تھا بلکہ نجران کے نصرانیوں سے حضرت عیسیٰؑ بن مریمؑ کے حوالہ سے مباہلہ کے واقعہ کے بعد یہودیوں سے بھی مباہلہ کا تذکرہ متعدد روایات میں موجود ہے کہ ان میں سے اکثر روایات کو ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔

ابن طاووس کا بیان

ابن طاووس نے کتاب "سعد السعود" میں لکھا ہے کہ میں نے کتاب "**ما نزل من القرآن فی النبی و اهل بیته**" (تالیف: محمد بن عباس بن مروان) میں لکھا ہوا دیکھا ہے کہ انہوں نے مباہلہ کی روایت کو اکیاون (۵۱) اسناد سے ذکر کیا ہے اور ان میں صحابہ و دیگر افراد کے نام پیش کئے ہیں اور ان میں ان حضرات کو بھی شمار کیا ہے: حسن بن علی علیہما السلام، عثمان بن عفان، سعد بن ابی وقاص، بکر بن سمال، طلحہ، زبیر، عبدالرحمٰن بن عوف، عبداللہ بن عباس، ابو رافع غلام رسولؐ، جابر بن عبداللہ، براء بن عازب اور انس بن مالک۔

یہی بات کتاب "المناقب" میں متعدد راویوں اور مفسرین کے حوالہ سے ذکر کی گئی ہے اور سیوطی نے تفسیر درمنثور میں بھی اسے ذکر کیا ہے۔

ایک عجیب وغیر منطقی قول

مباہلہ کے حوالہ سے بعض مفسرین نے اپنی تحریروں میں ایک عجیب بات لکھی ہے اور وہ یہ کہ: تمام روایات اس موضوع پر متفق ہیں کہ حضرت رسول خداؐ نے مباہلہ کے لئے علیؑ و فاطمہؑ اور ان کے دو فرزندوں کو منتخب کیا اور لفظ "نِسَآءَنَا" سے فاطمہؑ اور "اَنْفُسَنَا" سے صرف علیؑ کو مراد لیا ہے، اور ان روایات کے مصادر و مآخذ سب کے سب شیعہ ہیں اور اس طرح کے مطالب ذکر کرنے سے ان کا مقصد بھی معلوم وواضح ہے، اور شیعوں نے ان روایات کو ہر ممکن طریقہ و وسیلہ سے عام کرنے کی بھرپور کوشش کی یہاں تک کہ اکثر اہل سنت کے درمیان بھی اسے رائج و عام کرنے میں کامیاب ہو گئے لیکن اس طرح کی روایات جعل کرنے والے افراد مباہلہ کے واقعہ کو آیت پر اچھی طرح منطبق نہ کر سکے کیونکہ لفظ "نِسَآءَنَا" جمع کا صیغہ ہے جس کا معنی ہے "عورتیں" اور اسے ایک سے زیادہ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور کوئی عرب اسے صرف ایک خاتون اور وہ بھی بیٹی کے لئے استعمال نہیں کرتا، بالخصوص جبکہ استعمال کرنے والے کی بیویاں بھی موجود ہوں لہٰذا "ہماری عورتیں" سے صرف بیٹی مراد لینا عربی زبان والوں کے ہاں ہرگز مفہوم نہیں رکھتا، اور اس سے زیادہ بعید از قیاس یہ کہ لفظ "اَنْفُسَنَا" سے صرف علیؑ کو مراد لیا گیا جو کہ کسی صورت میں درست نہیں کیونکہ یہ بھی جمع کا صیغہ ہے، اس کے علاوہ یہ کہ نجران کے وفد میں نہ ان کی عورتیں شامل تھیں اور نہ ہی ان کے بیٹے شامل تھے کہ جن کے مقابلے میں رسول اللہؐ اپنی خواتین اور بیٹے ساتھ لاتے، بنابرایں آیت مبارکہ سے صرف اتنا ہی سمجھا جاتا ہے کہ حضرت پیغمبر خداؐ کو حکم دیا گیا کہ وہ ان اہل کتاب کو جو حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں بحث و مباحثہ اور مناظرہ و مجادلہ کرتے ہیں دعوت دیں کہ اپنے مردوں، عورتوں اور بچوں کو اکٹھا کریں اور وہ (رسول اللہؐ) بھی مؤمنین کے مردوں، عورتوں اور بچوں کو اکٹھا کر کے لاتے ہیں اور پھر اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کرتے ہیں کہ وہ جو عیسیٰؑ کے بارے میں جھوٹا غلط عقیدہ رکھتا ہے اس پر لعنت بھیجے، اس طرح سے کھلی دعوت دینا اس حقیقت کی دلیل ہوتی ہے کہ دعوت دینے والا اپنے مؤقف وعقیدہ کی صحت پر پختہ یقین رکھتا ہے اور اسے اپنی بات اور ادعا کی درستی پر مکمل اعتماد ہے اور اس کے مقابلے میں اس کے مدمقابل فریق کا مباہلہ وملاعنہ سے انکار وروگردانی کرنا ...... خواہ وہ اہل کتاب میں سے نجران کے نصاریٰ ہوں یا ان کے علاوہ کوئی ہو...... اس امر کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ وہ اپنے مدعا پر کوئی ٹھوس ثبوت نہیں رکھتے بلکہ وہ اپنے مؤقف کی درستی وصحت کی بابت شک کا شکار ہیں اور انہیں اپنے برحق ہونے کا یقین نہیں، اور وہ اپنے دین کے بارے میں متزلزل نظریہ رکھتے ہیں کہ جس کی پختہ دلیل ان کے پاس موجود نہیں ہے، اور یہ کیونکر ممکن ہے کہ جو شخص خدا پر ایمان رکھتا ہو وہ اس بات پر راضی ہو جائے کہ اہل حق اور اہل باطل دونوں ایک جگہ اکٹھے ہو کر خدا کے حضور یہ دعا کریں

کہ جو حق پر نہیں وہ اس پر لعنت بھیجے اور اسے اپنی رحمت سے دور کرے؟ کہ اس سے بڑھ کر خدا کے حضور جرأت و جسارت اور اس کی قدرت کا مذاق اڑانے کی کیا صورت ہو سکتی ہے ؟

یہ بات واضح ہے کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ اور مومنین حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں جو عقیدہ رکھتے تھے اس میں ان کا یقین و پختہ نظریہ کسی بحث و وضاحت کا محتاج نہیں کیونکہ ان کے یقین کی بابت خدا کا یہ ارشاد مضبوط دلیل کے حوالہ سے کافی ہے جس میں ارشاد ہوا: "مِنۢ بَعۡدِ مَا جَآءَكَ مِنَ ٱلۡعِلۡمِ" (تیرے پاس علم آ جانے کے بعد)، تو اس طرح کے اعتقادی مسائل میں "علم" سے مراد یقین ہی ہے اس کے علاوہ کچھ نہیں۔

اور جملہ "نَدۡعُ أَبۡنَآءَنَا وَأَبۡنَآءَكُمۡ......" میں دو احتمال اور امکانی پہلو پائے جاتے ہیں :

(۱) فریقین میں سے ہر ایک دوسرے کے لئے بددعا کرے یعنی تم ہماری عورتیں اور بچوں کے لئے بددعا کرو اور ہم تمہاری عورتوں اور بیٹوں کے لئے بددعا کرتے ہیں۔

(۲) ہر گروہ اپنی عورتوں اور بیٹوں کے لئے بددعا کرے یعنی ہم مسلمان اپنی عورتوں اور بیٹوں کے لئے اور تم عیسائی اپنی عورتوں اور بیٹوں کے لئے بددعا کرو۔

ان دو احتمالی صورتوں میں سے کسی ایک پر بھی کوئی اشکال وارد نہیں ہوتا بلکہ اشکال و اعتراض صرف اس بات پر ہوتا ہے کہ شیعہ اور ان کے ہم فکر افراد کا عقیدہ یہ ہے کہ آیت مبارکہ میں " أَنفُسَنَا "، " نِسَآءَنَا " اور " أَبۡنَآءَنَا " سے مخصوص افراد یعنی علیؑ و فاطمہؑ اور حسنؑ و حسینؑ مراد ہیں، جو کہ درست نہیں۔ (ملاحظہ ہو: تفسیر المنار، ج ۳ ،ص ۳۲۲)

مضبوط اور منطقی جواب

قارئین کرام خود ملاحظہ کر سکتے ہیں کہ یہ قول کسی پڑھے لکھے شخص کا ہو سکتا ہے؟ اگر ہم اس کے بارے میں کوئی سخت جملہ کہیں تو اسے گستاخی نہ سمجھا جائے کیونکہ اس طرح کی باتیں کسی دانشور اور علمی شخصیت سے متوقع نہیں، ہم نے اسے یہاں اس لئے ذکر کیا ہے کہ قارئین ملاحظہ کریں کہ اس میں کس قدر کمزوری اور ناپختگی بلکہ بے اساسی پائی جاتی ہے، اور انہیں معلوم ہو کہ نزاعی سوچ اور تعصب کسی شخص کو نافہمی اور پست فکری کی کس حد تک لے جاتا ہے کہ وہ اپنے ہی ہاتھوں اپنی ہی تعمیر کردہ عمارت کو منہدم اور منہدم کردہ عمارت کو تعمیر کرنے لگتا ہے اور اپنے کیئے کی درستی و نادرستی کو خاطر میں ہی نہیں لاتا، اور اسے اس بات کی پرواہ تک نہیں ہوتی کہ برائی سے آگاہ ہونا ضروری ہے تا کہ اس سے دوری اختیار کی جائے،

اس کے بیان کے تناظر میں دو حوالوں سے بحث ممکن ہے :

(۱) آیت مبارکہ سے حضرت علی علیہ السلام کی افضلیت کا ثابت ہونا، یہ بحث خالصتاً علم کلام سے تعلق رکھتی ہے جو کہ ہماری اس کتاب جو کہ آیات قرآنیہ کے معانی میں غور کرنے سے تعلق رکھتی ہے کے دائرہ، بحث سے خارج ہے، کیونکہ ہم صرف تفسیری حوالوں سے بحث کرتے ہیں۔

(۲) اس قول و بیان کا تعلق چونکہ آیت مبارکہ کے مدلول و مصداق کے تعین سے ہے اور ان روایات کی صحت و سقم سے ہے جن میں حضرت پیغمبر اسلامؐ اور نجران کے وفد کے درمیان ہونے والی گفتگو اور واقعہ کو ذکر کیا گیا ہے لہٰذا یہ تفسیری بحث ہے جو کہ ہماری اس کتاب کی غرض کے دائرے میں آتی ہے۔

قارئین کرام ! آپ اس حقیقت سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ آیت مبارکہ کس مطلب پر دلالت کرتی ہے اور اس سے کن حقائق و امور کا ثبوت ملتا ہے؟ اور یہ کہ ہم نے جو متعدد و کثیر روایات و احادیث پیش کی ہیں وہ سب اسی مطلب سے مطابقت رکھتی ہیں جو آیت مبارکہ سے ثابت ہوتا ہے، ان امور پر توجہ کرنے اور اچھی طرح غور کرنے سے مذکورہ بالا قول کی عدم صحت اور بے بنیاد ہونا کھل کر سامنے آجاتا ہے اور یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس قول کا سر پیر کوئی نہیں، ذیل میں تفصیلی بحث ملاحظہ ہو:

اس بحث میں سات نکات زیر نظر ہیں:

پہلا نکتہ:

اس قول میں کہا گیا ہے کہ "جن روایات میں یہ بیان ہوا ہے کہ آیت مباہلہ میں آنحضرتؐ کے ہمراہ مخصوص افراد یعنی علیؑ و فاطمہؑ و حسنؑ و حسینؑ تھے وہ سب شیعہ راویوں اور انہی کی کتب میں پائی جاتی ہیں"، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ "شیعوں نے ان روایات کو عام کرنے میں بھرپور کوششیں کیں یہاں تک کہ اہل سنت کی کثیر تعداد ان کے ہم فکر ہوگئی"، جبکہ اس سے پہلے اس قول میں کہا گیا تھا کہ اس حوالہ سے تمام روایات یکساں ہیں اور سب اس پر متفق ہیں کہ جو افراد آنحضرتؐ کے ہمراہ تھے وہ صرف علیؑ و فاطمہؑ و حسنؑ و حسینؑ تھے، اب مجھے معلوم نہیں کہ اس نے وہ کونسی روایات مراد لی ہیں جو ان ہستیوں کے بارے میں یکساں ہیں اور ان سب میں ان حضرات کے حوالہ سے اتفاق رائے موجود ہے ؟ آیا ان سے مراد وہی روایات ہیں جن کے بارے میں تمام محدثین نے اجماعی و متفقہ رائے دی ہے کہ وہ صحیح ہیں اور ان سے چشم پوشی نہیں ہو سکتی بلکہ ان کے مبنی بر صحت ہونے کی وجہ سے انہیں ہر لحاظ سے قابل اعتماد قرار دیا جائے گا، اور وہ روایات تعداد کے حوالہ سے ایک، دو یا تین نہیں کہ جن کے تذکرے اور قابل قبول ہونے پر تمام محدثین کا اتفاق ہے اور ان روایات کو احادیث کی تمام جامع کتب میں مؤلفین نے ذکر کیا ہے کہ جن میں صحیح مسلم اور صحیح ترمذی شامل ہیں اور مؤرخین نے بھی ان کی تائید و تصدیق کی ہے۔

اس کے علاوہ تمام مفسرین کرام نے بھی ان روایات کو اپنی کتب میں ذکر کیا ہے اور ان کی بابت کسی طرح کے شک و شبہ کا اظہار نہیں کیا، اور ان مفسرین میں ایسے حضرات بھی دکھائی دیتے ہیں جو خود محدثین میں بھی شمار ہوتے ہیں مثلاً طبری، ابوالفداء ابن کثیر اور سیوطی اور ان جیسے دیگر حضرات! تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اس طرح کے بزرگ مفسرین و محدثین نے ان روایات کو ذکر کیا اور ان کے قابل اعتماد و صحیح اور ہر طرح کے شک وشبہ سے مبرا ہونے کا متفقہ اظہار کیا تو پھر وہ ان روایات سے کون سی روایات مراد لیتے ہیں جو صرف شیعوں نے بیان کی ہیں ؟ کیا ان کا اشارہ ان روایات کی طرف ہے جن کا سلسلہ ء سند سعد بن ابی وقاص، جابر بن عبداللہ اور عبداللہ بن عباس اور ان جیسے اکابر صحابہ ء کرام تک پہنچتا ہے؟ یا وہ روایات جو تابعین نے ان حضرات سے نقل کی ہیں کہ جن میں ابوصالح، کلبی، سدی اور شعبی جیسے حضرات شامل ہیں، ان حضرات کو صرف انہی روایات کے ذکر کرنے کی بناء پر شیعہ قرار دیا گیا چونکہ وہ روایات اس قول کے قائل کی پسندیدہ نہیں جبکہ یہ حضرات اور ان جیسے دیگر محدثین ہی ہیں جن کے توسط سے احادیث نبویؐ ہم تک پہنچی ہیں، اگر ان سب کو ترک اور نظر انداز کر دیا جائے تو نہ کوئی حدیث و روایت باقی رہے گی اور نہ ہی سیرت نبویؐ سے آگاہی حاصل ہوگی اور یہ کیونکر ممکن ہے کہ کوئی مسلمان یا عالم دین بلکہ کوئی غیر مسلم محقق و دانشور سنت و سیرت نبویؐ کا کلی طور پر انکار کرے اور تمام احادیث و روایات کی نفی کرے اور پھر اسلام اور حضرت پیغمبر اسلامؐ کی تعلیمات و دستورات سے آگاہ ہونے کا خواہاں و درپے ہو؟ جبکہ قرآن مجید قول و سیرت نبویؐ کی حجیت کا منہ بولتا ثبوت ہے اور دین الٰہی کی بقاو دوام کا واضح و صریح اعلان کر رہا ہے، اگر سنت نبویؐ کا سرے ہی سے انکار کر دیا جائے اور اس کی بابت کسی ثبوت و سند کو اعتبار و اعتماد کی نظر سے نہ دیکھا جائے تو قرآن کا نام و نشان باقی رہے گا اور نہ اس کے نازل ہونے کا عملی نتیجہ وثمر سامنے آئے گا۔

اور اگر وہ یہ کہیں کہ شیعوں نے ان احادیث کو جوامع الحدیث اور کتب تاریخ میں گھسیڑ دیا ہے تو اس سے بھی سنت نبویؐ کے سرے ہی سے ساقط ہو جانے اور شریعت کا نام و نشان مٹ جانے کی خطرناک صورت پیدا ہو جائے گی بلکہ اس کا نتیجہ عمومی تباہی اور دینی حوالہ سے وسیع تر خرابیوں کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

دوسرا نکتہ :

اس قول میں کہا گیا ہے کہ " شیعہ حضرات آیت میں لفظ "نِسَآءَنَا" کا مصداق فاطمہؑ کو اور لفظ "اَنْفُسَنَا" کا مصداق علیؑ کو قرار دیتے ہیں، یعنی شیعہ قائل ہیں کہ لفظ "نِسَآءَنَا" آیت میں صرف فاطمہؑ کیلئے اور لفظ "اَنْفُسَنَا" صرف علیؑ کے لئے استعمال ہوا ہے۔

شاید اس قول کے قائل نے یہ بات ان بعض روایات کے حوالہ سے ذکر کی ہے جو پہلے ذکر ہو چکی ہیں مثلاً ایک

روایت میں جابر بن عبداللہ انصاری کا بیان مذکور ہے کہ انہوں نے کہا: "نِسَآءَنَا" یعنی فاطمہؑ اور "اَنْفُسَنَا" یعنی علیؑ ہیں، دراصل یہ اس قائل کی نافہمی کا ثبوت ہے کہ اس نے اس روایت کی بناء پر شیعوں پر الزام دھر دیا ہے کیونکہ روایت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آیت میں لفظ "نِسَآءَنَا" سے مراد فاطمہؑ اور لفظ "اَنْفُسَنَا" سے مراد علیؑ ہیں بلکہ اس سے یہ مقصود ہے کہ چونکہ حضرت پیغمبر اسلامؐ حکم الٰہی کی اطاعت و امتثال میں صرف حضرت فاطمہؑ اور حضرت علیؑ کو ساتھ لے گئے تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لفظ "نِسَآءَنَا" کا واحد مصداق حضرت فاطمہؑ اور لفظ (اَنْفُسَنَا) کا واحد مصداق حضرت علیؑ اور لفظ "اَبْنَآءَنَا" کا مصداق حسنؑ و حسینؑ ہیں، گویا آیت میں "ابناء، نساء اور انفس" سے مراد اہل بیت رسولؐ ہیں جیسا کہ بعض روایت میں ذکر ہوا ہے کہ آنحضرتؐ نے ان ہستیوں کو اپنے ہمراہ لانے کے بعد بارگاہ الٰہی میں عرض کی: "اللھم ھؤلاء اھل بیتی" اے میرے معبود! یہ ہیں میرے اہل بیت! اس جملہ کا معنی یہ ہے کہ میں نے ان کے سوا کسی کو نہ پایا جسے اپنے ساتھ مباہلہ کے لئے لے آتا۔

جابر کی روایت سے مرادی معنی کی بابت جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے اس کا ثبوت بعض روایات میں وارد ہونے والے ان الفاظ سے ملتا ہے جن میں کہا گیا ہے کہ "انفسنا" سے مراد رسول اللہؐ اور علیؑ ہیں، اس عبارت سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ آیت کا مصداق بیان کیا گیا ہے الفاظ کے معانی بیان نہیں کئے گئے۔

تیسرا نکتہ:

اس قول میں کہا گیا ہے کہ "مباہلہ کی بابت روایات جعل کرنے والوں نے آیت پر ان کی تطبیق صحیح طور پر نہیں کی کیونکہ لفظ "نسائنا" کہنے والا کوئی عرب اس سے اپنی بیٹی مراد نہیں لیتا بالخصوص جبکہ اس کے ہاں بیویاں بھی موجود ہوں، اور نہ ہی کوئی عربی زبان سے آگاہ شخص اس لفظ سے "بیٹی" سمجھتا ہے بلکہ اس سے زیادہ بعید از قیاس بات یہ ہے کہ لفظ "اَنْفُسَنَا" سے علیؑ مراد لئے جائیں"۔

اس مفسر نے اپنی کج فہمی کی بناء پر جو عجیب و غریب معنی ذکر کیا ہے وہ اس کا سبب بنا کہ وہ مباہلہ کے واقعہ کے تذکرہ پر مبنی روایات کو ان کی کثرت کے باوجود، رد کر دے اور پھر ان کے راویوں کی اعتباری حیثیت کو طعن و تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے ہر اس شخص کو غیر معتبر قرار دے جو ان روایات کو صحیح و مورد قبول قرار دے بلکہ ان روایات کے بیان کرنے والے ہر شخص کو غلط الزامات کے تیروں کا ہدف بنائے، جبکہ اس پر لازم و ضروری تھا کہ تفسیر قرآن لکھتے وقت اپنے مؤقف کو درست بنیادوں پر استوار کرتا اور اپنی کتاب میں آئمۂ علم بلاغت اور اساتذۂ علم البیان کے حوالہ جات پیش کرتا اور مفسرین کرام و محدثین عظام کی ذکر کردہ ان روایات کو اہمیت کی نگاہ سے دیکھتا جو انہوں نے اپنی تفسیروں اور تالیفات میں کسی غیر یقینی صورت

یا اعتراض کے بغیر درج کی ہیں، چنانچہ اساتذہ فن میں سے ایک زمخشری ہیں جنہوں نے آئمہ قرأت کی قرأتوں میں پائی جانے والی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے وہ اپنی تفسیر ''کشاف'' میں مباہلہ کی آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

" وفیه دلیل لا شیئ اقویٰ منه علٰی فضل اصحاب الکساء علیهم السلام وفیه برهان واضح علٰی صحة نبوة النبیؐ لانهٗ لم یرو احد من موافق ولا مخالف انهم اجابوا الٰی ذٰلک"

(یہ وہ دلیل ہے کہ اصحاب کساء علیہم السلام کی فضیلت پر اس سے زیادہ مضبوط دلیل کوئی نہیں اور یہ حضرت پیغمبر اسلامؐ کی نبوت کی صحت پر واضح برہان وکھلا ثبوت ہے کیونکہ کسی بھی موافق ومخالف نے یہ نہیں لکھا کہ نجران کے نصاریٰ نے اصحاب کساء کے مقابلے میں مباہلہ کرنا قبول کیا۔

تو ان بزرگ علماء وعلم بلاغت کے بلند پایہ ماہرین اور ادب کے سپوتوں پر یہ بات کس طرح پوشیدہ رہی کہ حدیث کی مشہور وجامع کتب میں کثیر اور بار بار ذکر کی جانے والی روایات قرآن کی طرف غلط وغیر صحیح معنی کی نسبت دے رہی ہیں کہ اس میں لفظ ''نساء'' جوکہ جمع کا صیغہ ہے صرف ایک فرد کے لئے استعمال ہوا ہے ؟

نہیں، ہرگز ایسا نہیں، مجھے اپنی جان کی قسم! ایسا نہیں ہوسکتا کہ تمام مفسرین ومحدثین واساتذۂ فن پر اصل حقیقت پوشیدہ ہوئی ہو، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خود اسی مفسر اور اس قول کے قائل کو غلط فہمی ہوئی ہے اور وہ مصداق ومفہوم کے درمیان تمیز وفرق نہیں کرسکتا بلکہ ان دونوں کے درمیان خلط ملط میں مبتلا ہوگیا اور یہ گمان کر بیٹھا کہ خداوند عالم نے اپنے نبیؐ کو جو حکم دیا کہ ''فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ......'' (پس جو شخص اس سلسلہ میں تجھ سے محاجہ وبحث کرے جبکہ تیرے پاس علم آچکا ہے تو کہہ دو کہ آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں اور تم اپنے بیٹوں کو بلاؤ......) اور یہ بات صحیح ہے کہ آیت کے نزول کے وقت محاجہ وبحث کرنے کے لئے جو لوگ آئے وہ نجران کے نصاریٰ کا وفد تھا اور وہ چودہ آدمی تھے کہ جن میں عورتیں اور بیٹے شامل نہ تھے، اور یہ بھی درست ہے کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ جب ان کے مقابلے میں مباہلہ کے لئے نکلے تو آپؐ کے ساتھ علیؑ وفاطمہؑ اور حسنؑ وحسینؑ ہی تھے ان کے علاوہ کوئی نہ تھا، لہٰذا اس سے یہ سمجھا جائے کہ ''فَمَنْ حَآجَّكَ'' کا معنی نجران کا وفد، ''نِسَآءَنَا'' کا معنی ایک خاتون، ''اَنْفُسَنَا'' کا معنی ایک شخص ہے اور لفظ ''نِسَآءَكُمْ'' اور ''اَبْنَآءَكُمْ'' بے معنی ہیں کیونکہ وفد کے ساتھ عورتیں اور بیٹے نہ تھے !

اس مفسر پر یہ بھی لازم وضروری تھا کہ اپنے اس نادرست مؤقف ونقطۂ نظر میں اضافہ کرتے ہوئے یہ بھی کہتا کہ آیت میں لفظ ''اَبْنَآءَنَا'' جو کہ جمع کا صیغہ ہے اسے تثنیہ یعنی دو افراد (حسنؑ وحسینؑ) کے لئے کیوں استعمال کیا گیا ہے کیونکہ وہ استعمال جمع کے لفظ کو مفرد کے لئے استعمال کرنے سے زیادہ بیجا ونادرست ہے کیونکہ جمع کے صیغہ کے مفرد میں استعمال ہونے کی مثالیں گاہے غیر عرب جدت پسند اہل فن کے کلام میں مل جاتی ہیں جبکہ اصل عرب کے محاورات میں اس طرح

کا استعمال نہیں پایا جاتا سوائے اس کے کہ واحد متکلم بڑائی و تعظیم کی غرض سے کہے کہ ہم نے ایسا کیا اور ہم نے ایسا کہا، لیکن جمع کے صیغہ کا تثنیہ میں استعمال ہونا ہرگز درست نہیں اور نہ ہی اس کی استعمالی مثالیں وشواہد کسی کلام میں پائے جاتے ہیں۔

بہرحال یہ ہیں وہ اسباب جن کی بناء پر اس مفسر نے مباہلہ کی روایات کو ٹھکرایا ہے اور ان کے جعلی ہونے کا اظہار کیا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کا خیال بیجا و نادرست اور ایک موہوم سوچ سے زیادہ کچھ نہیں بلکہ حقیقت الامر وہی ہے جسے ہم نے بیان کیا ہے۔

مزید وضاحت:

اس مطلب کی مزید وضاحت یہ ہے کہ بلیغ کلام اسے کہتے ہیں جس میں مقتضائے مقام کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہو کہ جس سے متکلم کا مطلوبہ معنی ومقصود آشکار ہو جائے، یعنی اس کے الفاظ وعبارتیں ایسی ہوں جو کلام کرنیوالے کے مقصد کو اسی طرح ظاہر کریں جس طرح وہ چاہتا ہو اور مخاطب اس کے مفہوم و مراد کو سمجھ جائے، چنانچہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بیان و گفتگو دو افراد یا دو قبیلوں و گروہوں کے درمیان ہوتی ہے کہ جو ایک دوسرے کو نہیں پہچانتے یا یہ کہ مصلحتاً ایک دوسرے کے بارے میں تجاہل عارفانہ کرتے ہیں (یعنی پہچاننے کے باوجود ظاہری طور پر ناآشنائی کا اظہار کرتے ہیں) تو اس صورت میں کلام کو حالات و ماحول کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرتے ہوئے اس طرح قرار دیا جاتا ہے جس سے بات پوری ہو جائے، لہٰذا جب دو متخاصم گروہ (کہ جن کے درمیان خصومت و جھگڑا ہو) ایک دوسرے کو اپنے عملی اقدامات سے آگاہ کرنا چاہیں تو ان میں سے ایک، دوسرے سے اس طرح کہتا ہے: "ہم تم سے خصومت رکھتے ہیں اور ہماری جنگ تم سے ہے" اور وہ اپنا بیان طبع حال اور عادت و معمول کے تقاضوں کے عین مطابق قرار دے کر پیش کرتا ہے، عام طور پر چونکہ ہر گروہ وقبیلہ کے ہاں عورتیں اور بچے بھی ہوتے ہیں تو مقتضائے حال یہ ہوتا ہے کہ متکلم اپنے بیان میں مدمقابل پر واضح کرے کہ وہ سب ایک ہیں اور دشمن کے مقابلے میں ہاتھ کی انگلیوں کی طرح ساتھ ساتھ ہیں یعنی ہم سب یکجا، یک زبان و یک دل ہیں کہ ہماری حیثیت ایک ہاتھ جیسی ہے، لیکن اگر اس طرح کہے: ہماری تم سے خصومت ہے اور ہم اپنے تمام مردوں، عورتوں اور بچوں کے ساتھ تم سے جنگ کرتے ہیں، تو اس صورت میں اسے اپنے مقصود کی وضاحت کے لئے اور اپنے افراد کی پہچان کروانے کے لئے مزید توضیحی الفاظ و انداز اختیار کرنا پڑے گا تاکہ معمول سے زائد مطلوبہ معانی و مطالب کا پورا پورا اظہار ہو سکے۔

یہ تو ہے دو ایسے متخاصم گروہوں کے درمیان ہونے والی گفتگو کا مسئلہ جو ایک دوسرے سے ناآشنا و ناآگاہ ہوں (حقیقتاً یا ظاہراً)، لیکن جب دو گروہ ایسے ہوں جو ایک دوسرے کو پہچانتے ہوں اور ان کے درمیان دوستی و صمیمانہ تعلقات ہوں اور ان میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ کو ضیافت و مہمانی یا خاص مراسم کی دعوت دے تو مقتضائے طبع و عادت کے مطابق اس طرح کہتا ہے: ہم سب مرد، عورتیں اور بچے آپ لوگوں کو دعوت دیتے ہیں، اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دعوتی الفاظ میں اپنی

شناسائی کا حوالہ بھی دیا جاتا ہے، چنانچہ اس طرح کہا جاتا ہے: ہم اپنے مردوں اور بیٹی اور دو کم سن نواسیوں کے ساتھ آپ کی خدمت گزاری کے لئے حاضر ہیں، اس صورت میں ایک اضافی بات کا اظہار ہو جاتا ہے۔

بنابرایں یہ مسئلہ واضح ہوا کہ طبع و عادت اور ظاہر الحال کی ایک مخصوص حیثیت ہے جبکہ واقع الامر اور اصل حقیقت کی حیثیت اپنی ہے! اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف اور قطعی طور پر الگ الگ ہوتی ہیں لہٰذا اگر متکلم اپنے بیان میں ظاہر الحال کو بنیاد قرار دے اور طبع و عادت اور معمول کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے بات کرے لیکن اس کے بعد واقع الامر اور اصل حقیقت کو بنیاد بنا کر بات کرے تو اسے غلط قرار نہیں دیا جائے گا اور نہ ہی اسے جھوٹا اور فضول گو کہا جائے گا۔

ہماری زیر بحث آیت مبارکہ بھی کچھ اسی طرح کی صورتحال کی حامل ہے چنانچہ خدا کا ارشاد گرامی: " فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ....." اس مطلب و مقصود پر مبنی ہے کہ: "اے پیغمبر! انہیں دعوت دیں کہ آپ خود اور اپنے اہل میں سے ان خاص افراد کے ساتھ جائیں جو اس دعوت و علم میں آپ کے ساتھ شراکت رکھتے ہیں اور وہ لوگ اپنے اہل میں سے اپنے خاص افراد کو لے آئیں، اور پھر دونوں مباہلہ کریں"، تو یہ بیان ظاہر الحال اور عام حالات کے عین مطابق ہے کہ جس میں دونوں طرفوں سے مرد، عورتیں اور بچے شامل ہوتے ہیں یعنی اس سے بظاہر یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول خداؐ کے اہل میں مرد، عورتیں اور بچے (بیٹے) ہیں اور مد مقابل لوگوں کے اہل میں بھی مرد، عورتیں اور بچے (بیٹے) ہیں کہ دونوں ان سب کو لائیں گے، جبکہ واقع الامر اور اصل حقیقت اس سے مختلف ہے اور وہ یہ کہ آنحضرتؐ کے ساتھ مردوں میں صرف ایک فرد (حضرت علیؑ) اور عورتوں میں صرف ایک فرد (بیٹی، حضرت فاطمہؑ) اور بیٹوں میں دو نواسے (امام حسنؑ و امام حسینؑ) پیش ہوئے اور مد مقابل یعنی نصاریٰ میں سے صرف ان کے مرد آئے اور کوئی خاتون اور بچہ ان کے ہمراہ نہ تھا، تو جب آنحضرتؐ اپنے ہمراہ ایک مرد، ایک عورت اور دو فرزند لائے تو نصاریٰ نے آپؐ پر اعتراض نہیں کیا اور نہ ہی آپؐ کی تکذیب کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے تو سب مردوں، عورتوں اور بیٹوں کو لانے کا کہا تھا جبکہ یہ تو مخصوص افراد ہیں اور نہ ہی یہ کہا کہ ہم اس لئے مباہلہ نہیں کرتے کہ ہمارے ساتھ عورتیں اور بچے نہیں ہیں جبکہ آپ نے عورتوں اور بچوں (بیٹوں) کو لانے کا کہا تھا، اس طرح کسی بھی محقق اور دانشور یا عام شخص نے مباہلہ کا تذکرہ و روایات سن کر آیت سے عدم مطابقت اور روایات کے جعلی و من گھڑت ہونے کا اظہار نہیں کیا۔

اس توضیحی بیان سے اس مفسر کے اظہار کا غلط و نادرست ہونا واضح ہو جاتا ہے اور اس کے اس بیان کی قلعی کھل جاتی ہے جس میں اس نے روایات پر تنقید کرتے ہوئے ان کی آیت سے عدم مطابقت کا اظہار کیا اور کہا کہ شیعوں نے من گھڑت روایات میں اس بات کا خیال نہیں رکھا کہ اس سے آیت کے الفاظ سے عدم مطابقت لازم آتی ہے، کیونکہ آیت میں دونوں

جانب سے عورتوں اور بچوں (بیٹوں) کے لانے کی دعوت مذکور ہے جبکہ نجران کے وفد میں نہ عورتیں تھی اور نہ بچے، حالانکہ شیعہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ آیت نجران کے نصاریٰ کے بارے میں نازل ہوئی ہے اگر شیعوں کا ادعاء صحیح ہوتو نجران کے وفد میں عورتوں اور بچوں کا شامل ہونا ضروری ہوگا جبکہ ایسا نہیں ہے۔

چوتھا نکتہ:

اس مفسر نے کہا ہے کہ: "آیت سے صرف یہی سمجھا جاتا ہے کہ خداوند عالم نے حضرت پیغمبر اسلامؐ کو حکم دیا کہ اہل کتاب میں سے جو لوگ عیسیٰؑ کے بارے میں آپ سے بحث ومحاجہ اور مجادلہ و جھگڑا کریں انہیں دعوت دو کہ وہ اپنے مردوں، عورتوں اور بچوں کے ساتھ ایک جگہ اکٹھے ہو جائیں اور وہ (رسولِ خداؐ) بھی مؤمنین مردوں، عورتوں اور بچوں کو لے کر اکٹھے ہو جاتے ہیں اور بارگاہ خداوندی میں گڑگڑا کر دعا مانگتے ہیں کہ جو شخص عیسیٰؑ کے بارے میں غلط وجھوٹا عقیدہ رکھتا ہو خدا اس پر لعنت بھیجے، (اس مفسر نے اپنے بیان کے تسلسل میں کہا:) تو جو شخص خدا پر ایمان رکھتا ہو وہ کیونکر اس بات پر راضی ہوسکتا ہے کہ اس طرح سے اہل حق واہل باطل کے افراد ایک مقام پر اکٹھے ہو کر بارگاہ الٰہی میں لعنت اور رحمت سے دوری کی دعا کریں؟ اس طرح سے خدا کے حضور جرأت و جسارت اور اس کی عظیم قدرت و بزرگی کا مذاق اڑانے کا کون سوچ سکتا ہے؟"۔

اس مفسر کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ آیت مبارکہ میں فریقین میں سے مخصوص افراد ملحوظ نہیں بلکہ اس میں دونوں طرف سے دعوت عام دی گئی ہے کہ ہر گروہ اپنے مردوں، عورتوں اور بچوں کو ہمراہ لے آئے اور ایک جگہ اکٹھا ہو کر ایک دوسرے کے خلاف بددعا کریں۔

اب اس مفسر سے پوچھنا ہوگا کہ اس اجتماع اور اکٹھا ہونے سے مراد کیا ہے ؟

آیا اس سے مراد یہ ہے کہ فریقین کے تمام افراد اکٹھے ہوں؟ یعنی تمام مؤمنین اور تمام نصاریٰ، اور تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت اہل ایمان میں عرب کے قبائل ربیعہ و مضر کے افراد کو سمجھا جاتا تھا کہ جو یمن وحجاز اور عراق و دیگر علاقوں میں آباد تھے اور نصاریٰ کے افراد کہ جو قبیلہ نجران (اہل یمن) اور شام، بحرالابیض، روم، فرانس، انگلینڈ اور نمسا اور دیگر علاقوں میں بسنے والے تھے سب مراد ہیں۔

(بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ مباہلہ کی آیت ۹ ہجری میں نازل ہوئی اور بعض کا کہنا ہے کہ دس ہجری میں مباہلہ کا حکم آیا، البتہ یہ دونوں اقوال قابل بحث ہیں بلکہ اشکال سے خالی نہیں، اس سلسلہ میں مزید تفصیلات زیر نظر آیات کے بعد والی آیات کی تفسیر میں "روایات پر ایک نظر" کے عنوان میں ذکر ہوں گی)

اس وقت ان تمام افراد کو شمار کرنا آسان نہ تھا کیونکہ مشرق و مغرب میں پھیلے ہوئے افراد بشر کہ جن میں مرد، عورتیں

اور بچے شامل تھے کروڑوں سے زائد تھے اور کوئی عقلمند اس سلسلہ میں شک نہیں کر سکتا کہ اتنی بڑی تعداد کا ایک جگہ اکٹھا ہونا ناممکن ہے اور عادی اسباب و وسائل اپنی تمام تر قوتوں اور وسعتوں کے ساتھ اسے عملی جامہ نہیں پہنا سکتے، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قرآن مجید نے لوگوں کو ایک محال و ناممکن کام کی دعوت دی ہے اور اس کی نا قابل انکار حقیقتوں کا ظاہر و آشکار ہونا اور حق کا واضح ہونا ایک ناممکن چیز پر موقوف و مبنی ہے، تو اس طرح نصاریٰ کی طرف سے پیغمبر اسلامؐ کی دعوت مباہلہ کو قبول نہ کرنے کا عذر بلکہ بہترین عذر بن سکتا تھا بلکہ اس سے آنحضرتؐ کی دعوت کو زبردست ٹھیس پہنچ سکتی تھی اور اس کا نقصان نصاریٰ سے زیادہ پیغمبر اسلامؐ کے مشن کو ہوتا۔

یا فریقین کے اجتماع اور اکٹھا ہونے سے مراد دونوں طرف کے ان افراد کا اکٹھا ہونا ہے جو وہاں موجود و حاضر تھے یعنی مدینہ اور قرب و جوار کے تمام اہل ایمان اور نجران اور قرب و جوار کے تمام نصاریٰ ! اگر چہ اس بات میں پہلی بات کی نسبت نا معقولیت کم پائی جاتی ہے لیکن عملی طور پر اس کا ناممکن ہونا بھی پہلی صورت جیسا ہی ہے کیونکہ یہ بات کس کے مقدور میں تھی کہ تمام اہل مدینہ اور تمام اہل نجران کو عورتوں و بچوں سمیت ایک میدان میں ملاعنہ ومباہلہ کے لئے جمع کرے، کیا یہ اس طرح کی دعوت کو ایک محال و ناممکن امر سے وابستہ کرنا نہیں کہلاتا ؟ اور کیا یہ اس بات کا عملی اعتراف نہیں کہ حق کا ظہور پذیر ہونا ممکن نہیں ؟

یا اس اجتماع سے مراد خصومت و جدال میں ملوث فریقین، یعنی پیغمبر اسلامؐ ور آپؐ کے ساتھ موجود اہل ایمان اور نجران کے نصاریٰ کے وفد کے ارکان کا اکٹھا ہونا ہے، اگر چہ یہ اجتماع اور اکٹھا ہونا ممکن الوقوع ہے لیکن اگر اسے ہی آیت مبارکہ کا مقصود قرار دیا جائے تو اس پر وہ اعتراض وارد ہوگا جو اس مفسر نے اپنے بیان میں ذکر کیا ہے کہ ''نجران کے وفد میں کہ جن کے بارے میں آیت کے نزول کا دعویٰ کیا جاتا ہے ان کی عورتیں اور ان کے بچے شامل نہ تھے''، اس طرح اس اعتراض کو وقوعی صورت مل جائے گی۔

پانچواں نکتہ :

اس مفسر نے کہا کہ ''جہاں تک حضرت پیغمبر اسلامؐ اور مؤمنین کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں عقیدہ کا تعلق ہے تو وہ مبنی بر یقین تھا اور اس کے دلیل کے طور پر آیت کا یہ جملہ ''من بعد ما جاء ک من العلم'' ہی کافی ہے کیونکہ اعتقادی مسائل میں علم سے یقین ہی مراد لیا جاتا ہے''۔

اس کی یہ بات کہ اس طرح کے مسائل میں ''علم'' سے مراد یقین ہی ہوتا ہے حق و درست ہے لیکن سوال یہ ہے کہ آیا آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مؤمنین، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں یقین پر مبنی عقیدہ رکھتے تھے ؟ میری نظر میں

یہ بات ثابت نہیں ہوتی، اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ (مفسر) کس طرح اسے آیت سے ثابت کر سکتا ہے؟ کیونکہ آیت مبارکہ کے الفاظ " فَمَنْ حَآجَّكَ فِيهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ " سے صرف حضرت پیغمبر اسلام ؐ کی ذاتی خصوصیت ثابت ہوتی ہے، اس میں مؤمنین کا تذکرہ و اشارہ تک موجود نہیں، اور وہ اس میں شامل ہو بھی نہیں سکتے کیونکہ خطاب و گفتگو کا مقام ہی ایسا ہے کہ اس میں آپ ؐ کے علاوہ دیگر مؤمنین کو شامل سمجھنا درست نہیں کیونکہ نجران کے نصاریٰ کا وفد صرف حضرت پیغمبر اسلام ؐ سے بحث و محاجہ اور مناظرہ کرنے آیا تھا اور ان لوگوں کو مؤمنین سے ملنے تک کی کوئی خواہش نہ تھی بلکہ انہوں نے مؤمنین میں سے کسی سے بھی بات نہیں کی اور نہ ہی مؤمنین نے ان سے کوئی بات کی۔

ہاں، اگر آیت کے الفاظ "مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ" میں حضرت پیغمبر اسلام ؐ کے علاوہ کسی کے شامل ہونے کا ثبوت پایا جائے تو وہی افراد ہو سکتے ہیں جنہیں آنحضرت ؐ اپنے ہمراہ مباہلہ کے لئے لائے تھے، چنانچہ اس سلسلہ میں ہم سابقہ بیانات میں لفظ "من الکاذبین" سے آنحضرت ؐ کے ہمراہ آنے والوں کی بابت اصل مقصود واضح کر چکے ہیں۔

بلکہ قرآن مجید تمام مؤمنین کی بابت علم و یقین کی نفی پر دلالت کرتا ہے چنانچہ ارشاد ہوا:

سورۂ یوسف، آیت :۱۰۶

○ " وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُم بِاللَّهِ إِلَّا وَهُم مُّشْرِكُونَ "

(اور ان کی اکثریت اللہ پر ایمان نہیں رکھتی مگر شرک کے ساتھ!)

اس آیت میں ایمان والوں کے شرک کا ذکر ہوا ہے، تو شرک اور یقین کس طرح اکٹھے ہو سکتے ہیں؟

سورۂ احزاب، آیت :۱۲

○ " وَإِذْ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ إِلَّا غُرُورًا "

(اور جب منافقین اور بیمار دل لوگوں نے کہا کہ جو وعدہ ہم سے خدا اور رسول خدا ؐ نے کیا ہے وہ دھوکہ و فریب کے سوا کچھ نہیں)

سورۂ محمد، آیت :۲۳

○ " وَيَقُولُ الَّذِينَ آمَنُوا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُورَةٌ ۖ فَإِذَا أُنزِلَتْ سُورَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَذُكِرَ فِيهَا الْقِتَالُ ۙ رَأَيْتَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ يَنظُرُونَ إِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۖ فَأَوْلَىٰ لَهُمْ ﴿٢٠﴾ طَاعَةٌ وَقَوْلٌ مَّعْرُوفٌ ۚ فَإِذَا عَزَمَ الْأَمْرُ فَلَوْ صَدَقُوا اللَّهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ...... أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فَأَصَمَّهُمْ وَأَعْمَىٰ أَبْصَارَهُمْ "

(جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ کہتے ہیں کہ کوئی سورت کیوں نازل نہیں ہوتی، پھر جب کوئی محکم و واضح سورت

نازل ہوتی ہے اور اس میں قتال کا حکم ہوتا ہے تو آپ دیکھتے ہیں کہ بیمار دل افراد آپ کی طرف اس شخص کی طرح دیکھنے لگتے ہیں جن پر موت طاری ہو چکی ہو، تو ان کے لئے موت ہی بہتر ہے، ہمارا حکم اطاعت چاہتا ہے اور وہ بہترین بات ہے، اگر وہ خدا سے سچ بولتے تو ان کے لئے بہتر تھا...... یہی وہ لوگ ہیں جن پر خدا نے لعنت بھیجی اور انہیں گونگے و اندھے بنا دیا)

اس سے معلوم ہوا کہ اہل ایمان میں سے صرف انہی افراد کو یقین حاصل ہوتا ہے جو بابصیرت اور پیغمبر اسلامؐ کے سچے پیروکار ہوں۔

سورۂ آل عمران، آیت :۲۰

○ "فَاِنۡ حَآجُّوۡكَ فَقُلۡ اَسۡلَمۡتُ وَجۡهِىَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ"

(پس اگر وہ آپ سے محاجہ و مناظرہ کریں تو کہہ دیجئے کہ میں نے اور میرے پیروکاروں نے اپنا رخ اللہ کی طرف کر لیا ہے)

سورۂ یوسف، آیت :۱۰۸

○ "قُلۡ هٰذِهٖ سَبِيۡلِىۡۤ اَدۡعُوۡۤا اِلَى اللّٰهِ ‌ؔعَلٰى بَصِيۡرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِىۡ"

(کہہ دیجئے کہ یہ ہے میرا راستہ ! میں بصیرت کے ساتھ اللہ کی طرف بلاتا ہوں، میں اور میرے پیروکار!)

چھٹا نکتہ :

اس مفسر نے کہا کہ " نَدۡعُ اَبۡنَآءَنَا وَاَبۡنَآءَكُمۡ......" میں دو احتمالی معنی پائے جاتے ہیں: پہلا یہ کہ ہر فریق دوسرے کے لئے بددعا کرے......الخ)

اس پہلے معنی کا نادرست ہونا واضح ہو چکا ہے اور قارئین کرام آگاہ ہو چکے ہیں کہ یہ معنی آیت پر منطبق نہیں ہوتا کیونکہ مباہلہ کی غرض اسی جملہ سے حاصل ہو سکتی تھی: " تَعَالَوۡا نَبۡتَهِلۡ فَنَجۡعَلۡ لَّعۡنَتَ اللّٰهِ عَلَى الۡكٰذِبِيۡنَ" (آؤ تاکہ مباہلہ کریں اور پھر جھوٹوں پر اللہ کی لعنت قرار دیں) لیکن اس میں اضافہ کرتے ہوئے یوں کہا گیا: " تَعَالَوۡا نَدۡعُ اَبۡنَآءَنَا وَاَبۡنَآءَكُمۡ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمۡ وَاَنۡفُسَنَا وَاَنۡفُسَكُمۡ " (آؤ، ہم بلائیں اپنے بیٹوں کو اور تم اپنے بیٹوں کو، اور ہم اپنی خواتین کو اور تم اپنی خواتین کو، اور ہم اپنوں کو اور تم اپنوں کو،) یہ اضافہ اس لئے ہوا تاکہ اس سے ثابت ہو کہ فریقین میں سے ہر ایک پر لازم و ضروری ہے کہ وہ مباہلہ کے وقت اپنی سب سے زیادہ عزیز و پسندیدہ اور محبوب چیز پیش کرے اور وہ بیٹوں، عورتوں اور انفس (بھائیوں، اپنوں) سے عبارت ہے (اہل اور خواص) تو یہ اس صورت میں درست ہو سکتا ہے جب آیت کا

معنی یہ ہو: " **ندعو نحن ابنائنا و نسائنا و انفسنا وتدعون انتم ابنائکم ونسائکم و انفسکم، ثم نبتھل** " (ہم اپنے بیٹوں، اپنی عورتوں اور اپنے بھائیوں (اپنوں) کو بددعا کریں اور تم اپنے بیٹوں، اپنی عورتوں اور اپنے بھائیوں (اپنوں) کو بددعا کرو، پھر ہم مباہلہ کریں)، لیکن اگر آیت کا معنی یہ ہو: " **ندعوا نحن ابنائکم و نسائکم و انفسکم و تدعون انتم ابنائنا و نسائنا وانفسنا ثم نبتھل** " (ہم تمہارے بیٹوں، تمہاری عورتوں اور تمہارے بھائیوں (اپنوں) کو بددعا کریں اور تم ہمارے بیٹوں، ہماری خواتین اور ہمارے بھائیوں (اپنوں) کو بددعا کرو، پھر ہم مباہلہ کریں) تو اس سے مطلوبہ غرض و مقصد حاصل نہ ہوگا۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ یہ معنی خود ایسا ہے جسے طبع سلیم پسند نہیں کرتی کیونکہ یہ بات نہایت بے معنی ہے کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ نصاریٰ کو اپنے بیٹوں (ابناء) اور اپنی خواتین (نساء) پر بددعا کرنے کی ہمت دیں اور اس کے مقابلہ میں ان سے درخواست کریں کہ وہ بھی آنحضرتؐ کو اپنے بچوں اور اپنی خواتین پر بددعا کرنے کی اجازت دیں تا کہ اس طرح دونوں جانب سے متعلقہ افراد کی موجودگی یقینی ہونے کے ساتھ ساتھ مباہلہ کے لازمی ارکان و تقاضے پورے ہو سکیں، جبکہ یہ بات ممکن تھی کہ دونوں فریق اپنے اپنے بچوں و عورتوں کے لئے بددعا کرتے تب بھی مباہلہ کی عملی صورت وجود پذیر ہو جاتی۔

اس کے علاوہ یہ پہلو نظرانداز نہیں ہو سکتا کہ اگر آیت مبارکہ سے مذکورہ معنی ہی سمجھا جائے تو اس سے وہی مسئلہ درپیش ہوگا جس کا اشارہ سطور بالا میں ہو چکا ہے اور وہ یہ کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ اپنے اہل بیتؑ پر بددعا کرنے کی ہمت و حق نصاریٰ کو دیں، جو کہ نہایت بے معنی بات ہے۔

لہٰذا ثابت ہوا کہ یہ احتمالی پہلو درست نہیں بلکہ وہی دوسرا معنی قرین صحت ہے کہ ملاعنہ سے مراد صرف یہ ہے کہ ہر فریق اپنے بچوں و عورتوں کے لئے جھوٹا ہونے کی صورت میں بددعا کرے۔

ساتواں نکتہ:

اس مفسر نے کہا کہ "اس میں کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا کہ خداوند عالم نے آنحضرتؐ کو حکم دیا کہ اپنے بچوں، عورتوں اور انفس (اپنوں) کو ہمراہ لے جائیں چنانچہ آنحضرتؐ نے خدا کے حکم پر عمل کرتے ہوئے مؤمنین میں سے ان تین صنفوں کا انتخاب کیا، لیکن اعتراض صرف یہ ہے کہ شیعوں اور ان کے ہم فکر حضرات نے ان افراد کے بارے میں تخصیص کر دی اور کہا کہ ان سے مراد علیؑ و فاطمہؑ و حسنؑ و حسینؑ ہیں جبکہ یہ بات درست نہیں"،

اس اعتراض سے دراصل اس کا مقصد اسی سابق اعتراض کو دہرانا ہے جو اس نے آیت کے بارے میں کیا ہے اور

وہ یہ کہ اس سے یہ لازم آئے گا کہ انسان خود اپنے آپ کو بلائے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس اعتراض کا سابق الذکر دو احتمالی معانی سے کوئی تعلق و ربط ہی نہیں بلکہ اس کا اعتراض صرف یہ ہے کہ "اَنْفُسَنَا" میں انفس سے مراد خود رسول خداؐ ہیں جیسا کہ بعض مذہبی مناظرات سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ ایک فریق نے دعویٰ کیا کہ "اَنْفُسَنَا" سے مراد حضرت پیغمبر اسلامؐ ہیں تو اس مفسر نے اس پر یہ اعتراض کر دیا کہ اگر یہی معنی مراد لیا جائے تو آیت میں "نَدْعُ اَنْفُسَنَا" (ہم اپنے انفس کو بلاتے ہیں) کا مطلب یہ ہوگا کہ آنحضرتؐ اپنے آپ کو بلائیں جبکہ یہ غلط و غیر معقول ہے اور اسی کی طرف اشارہ ہوا ہے اس دوسری روایت میں جو عیون اخبار الرضاؑ سے ذکر کی گئی ہے۔

اس بیان سے اس مفسر کا شیعوں پر الزام عائد کرنا بے اساس ثابت ہو جاتا ہے کیونکہ جیسا کہ بیان ہو چکا ہے کہ شیعہ قائل ہیں کہ "اَنْفُسَنَا" سے رسول اللہؐ کے اہل بیتؑ سے مرد مراد ہیں اور وہ مصداق کے تناظر میں حضرت رسول اللہؐ اور حضرت علیؑ ہی قرار پاتے ہیں کیونکہ "نِسَآءَنَا" کا مصداق حضرت فاطمہ زہراءؑ اور "اَبْنَآءَنَا" کا مصداق حضرت امام حسنؑ و امام حسینؑ ہیں اور ان کے علاوہ لفظ "اَنْفُسَنَا" باقی رہتا ہے کہ جو رسول اللہؐ اور حضرت علیؑ پر منطق ہوتا ہے اس بناء پر ان کا ایک دوسرے کو بلانا خالی از اشکال ہوگا۔ تو اس طرح شیعوں پر کیا جانے والا اشکال کہ وہ انفسنا سے حضرت علیؑ مراد لیتے ہیں بھی باقی نہ رہے گا کیونکہ نبیؐ کا علیؑ کو بلانا قطعی طور پر درست و بجا ہے کہ جس کی بابت کسی طرح سے اعتراض کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

اس مفسر کے شاگرد نے تفسیر المنار میں روایات کی طرف اشارہ کرنے کے بعد کہا ہے کہ ابن عساکر نے جعفر بن محمد (علیہما السلام) کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ ان کے والد گرامی قدر نے آیت مبارکہ "فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ......" کی تفسیر میں ارشاد فرمایا: حضرت رسول خداؐ مباہلہ کے لئے ابوبکر اور ان کے صاحبزادہ، عمر اور ان کے صاحبزادہ اور عثمان اور ان کے صاحبزادہ کو ہمراہ لائے، بظاہر یہ بات اہل ایمان کے گروہ کے بارے میں ہے۔

اس کے بعد اس شاگرد نے اپنے استاد کے اس بیان کا حوالہ دینے کے بعد کہ جسے ہم سطور بالا میں ذکر کر چکے ہیں کہا: اس آیت میں جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں کہ معاشرتی امور میں عورتوں کو بھی شریک کرنے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ قومی ہم آہنگی و ملی یکجہتی اور دینی پختگی کے تقاضوں کی تکمیل ہو، تو یہ حکم عورت کو مرد کے برابر لانے پر مبنی ہے کہ وہ چند معاملات کے علاوہ معاشرہ کے تمام عمومی امور میں اس کے ساتھ ہو، (اس کے بعد اس نے اپنے بیان کو طولانی کرتے ہوئے مزید مطالب ذکر کیے)،

جہاں تک اس کی ذکر کردہ روایت کا تعلق ہے تو وہ غیر مستند ہونے کے ساتھ ساتھ ان تمام روایات سے معنی کے لحاظ سے متصادم ہے جو اس آیت کی تفسیر میں وارد ہوئی ہیں جبکہ وہ روایات کثرت و شہرت کی حامل ہیں، اس کے علاوہ یہ کہ مفسرین

نے مذکورہ بالا روایت کونظر انداز کیا ہے، ان تمام باتوں سے قطع نظر اس روایت میں مذکور ایک مطلب ایسا ہے جو واقع الامر سے ہرگز مطابقت نہیں رکھتا بلکہ میدانی حقائق اس کی نفی کرتے ہیں اور وہ یہ کہ اس میں مذکور تمام افراد کو صاحب فرزند ذکر کیا گیا ہے جبکہ اس دن ان میں سے کسی کے ہاں بیٹا نہ تھا (یعنی ابوبکر، عمر اور عثمان میں سے کسی کے ہاں فرزند نہ تھا)، اسی طرح اس مفسر کا یہ کہنا بھی خلاف واقع ہے کہ "بظاہر یہ بات مؤمنین کے ایک گروہ کے بارے میں ہے"، کیونکہ وہ اپنے اس بیان سے شاید یہ بتانا چاہتا ہو کہ میرا خیال ہے کہ حضرت رسولِ خداؐ نے تمام مؤمنین اور ان کی اولاد کو اکٹھا کیا تھا، گویا ابوبکر اور ان کے فرزند، اور دیگر حضرات اور ان کے فرزندوں کے نام کنایہ کے طور پر لئے گئے کہ جن سے عام مؤمنین کو ہمراہ لانے کی طرف اشارہ ہے، دراصل اس شاگرد نے اپنے استاد کے ذکر کردہ مطلب کو درست ثابت کرنے کے لئے اس طرح کی بات کی ہے جبکہ قارئین کرام اس روایت کے بارے میں سند اور متن کے حوالہ سے بخوبی آگاہ ہیں کہ اسے کوئی سندی حیثیت حاصل نہیں اور نہ ہی مفسرین نے اسے کوئی اہمیت دی بلکہ انہوں نے اسے نظر انداز کر دیا، اور اس کے علاوہ یہ کہ اس مفسر نے جو معنی بیان کیا ہے وہ آیت کے الفاظ سے ہرگز ثابت نہیں تھا۔

اس کے علاوہ اس مفسر کا یہ کہنا بھی بے بنیاد ہے کہ آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں بھی معاشرتی امور میں مردوں کے ساتھ شریک ہیں، اگر اس کی یہ بات درست تسلیم کر لی جائے تو اس سے بچوں کا بھی معاشرتی عمومی مسائل و امور میں شریک ہونا تسلیم کرنا پڑے گا، جبکہ وہ ہرگز درست نہیں، بلکہ اسی سے اس کے دعوے کی قلعی کھل جاتی ہے اور اس کے پورے بیان کا بے اساس ہونا واضح ہو جاتا ہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہم اپنی کتاب (المیزان) کی دوسری جلد میں طلاق کی آیت کی تفسیر میں عورتوں کے مردوں کے ساتھ معاشرتی امور میں شریک ہونے کی بابت مربوطہ مطالب ذکر کر چکے ہیں اور اس حوالہ سے دیگر آیات میں بھی موضوع کی مناسبت کو ملحوظ رکھتے ہوئے مربوطہ مطالب ذکر کئے جائیں گے کہ جن کی روشنی میں اس موضوع کی متعلقہ جہات واضح ہو جائیں گی اور اس مفسر نے آیت سے جس طرح استدلال پیش کیا ہے اس طرح کے استدلال کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔

آیات ۶۴ تا ۷۸

○ قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾

○ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ وَمَاۤ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۵﴾

○ هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۶﴾

○ مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۶۷﴾

○ اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۸﴾

○ وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۶۹﴾

○ يَٰٓأَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۷۰﴾

○ يَٰٓأَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۷۱﴾

○ وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ
النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۷۲﴾

○ وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ
مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ
مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾

○ يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۴﴾

○ وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ
بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ
عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾

○ بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۷۶﴾

○ اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ وَلَا
يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۠ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۷﴾

○ وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ
الْكِتٰبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ
الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۸﴾

ترجمہ

○ "(اے نبی!) ان سے کہیے: اے اہل کتاب! اس بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے (کہ اس پر اتفاق کرلیں) کہ ہم اللہ کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ ہی اس کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیں اور نہ ہی خدا کے علاوہ ہم آپس میں سے کسی کو رب بنائیں، لیکن اگر وہ اس سے روگردانی کریں تو ان سے کہہ دیں کہ تم گواہ رہو کہ ہم اسلام پر ہیں"

(۶۴)

○ "اے اہل کتاب! تم ابراہیم کے بارے میں بحث ونزاع کیوں کرتے ہو حالانکہ تورات وانجیل تو ان کے بعد نازل کی جانے والی کتابیں ہیں، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے"

(۶۵)

○ "اب تک تم انہی چیزوں کے بارے میں بحث ونزاع کرتے رہے جن کی بابت تمہیں کچھ علم تھا، تو ان چیزوں کے بارے میں کیوں بحث ونزاع کرتے ہو جن کی بابت کچھ بھی نہیں جانتے؟ (حقیقت یہ ہے کہ) اللہ جانتا ہے جبکہ تم کچھ نہیں جانتے"

(۶۶)

○ "(حق یہ ہے کہ) ابراہیم نہ تو یہودی تھے اور نہ ہی نصرانی تھے بلکہ وہ خالص مسلمان تھے اور وہ ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے"

(۶۷)

o " یقینی بات یہ ہے کہ ابراہیم کے حقدار تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس کی پیروی کی اور یہ نبی اور جو لوگ ایمان لائے (وہ ان کے حقدار ہیں) اور اللہ ایمان والوں کا حاکم و آقا ہے "

(۶۸)

o " اہل کتاب کے ایک گروہ نے تمہیں گمراہ کرنے کی بھرپور تمنا کی مگر وہ اپنے آپ کو گمراہ کرتے رہے لیکن انہیں اس کا شعور ہی نہیں ہے "

(۶۹)

o " اے اہل کتاب! تم خدا کی نشانیوں کا انکار کیوں کرتے ہو جبکہ تم گواہ ہو "

(۷۰)

o " اے اہل کتاب! تم حق کو باطل کا اور باطل کو حق کا لباس کیوں پہناتے ہو جبکہ تم اچھی طرح آگاہی رکھتے ہو "

(۷۱)

o " اہل کتاب کے ایک گروہ نے کہا کہ ایمان لانے والوں پر جو کچھ نازل ہوا ہے اس پر دن کی ابتدائی گھڑیوں میں ایمان لاؤ اور دن کے آخری پہر میں اس کا انکار کردو تا کہ وہ لوگ پلٹ آئیں (اپنے عقیدہ سے رجوع و روگردانی کرلیں) "

(۷۲)

○ " اور (وہ کہتے ہیں کہ) تم کسی کی بات نہ مانو سوائے اس شخص کے کہ جو تمہارے دین کی پیروی کرے، کہہ دیجئے کہ خدائی ہدایت ہی اصل ہدایت ہے، (اور وہ آپس میں ایک دوسرے سے یہ بھی کہتے تھے کہ) کہیں ایسا نہ ہو کہ جو کچھ تمہیں عطا ہوا ہے اس جیسا کسی اور کو عطا ہو جائے یا وہ تمہارے رب کے حضور تمہارے خلاف دلیل پیش کر سکیں (اے رسول) ان سے کہیے کہ فضل و کرم خدا کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور اللہ وسعت والا، بہت جاننے والا ہے "

(۷۳)

○ " خدا جسے چاہتا ہے اپنی رحمت سے خاص کر دیتا ہے کہ اللہ عظیم فضل و عنایت والا ہے "

(۷۴)

○ " اہل کتاب میں ایسے بھی ہیں کہ اگر آپ ان کے پاس مال کثیر امانت رکھیں تو وہ آپ کو واپس دے دیں گے اور کچھ ایسے بھی ہیں کہ اگر آپ ایک دینار بھی ان کے پاس امانت رکھیں تو وہ آپ کو واپس نہیں کریں گے جب تک کہ آپ ان کے سر پر کھڑے نہ رہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا نظریہ یہ ہے کہ ہم پر (غیر یہودی) عربوں کی کوئی ذمہ داری نہیں، حالانکہ وہ خدا پر جھوٹ باندھتے ہیں جبکہ انہیں (حقیقت حال) معلوم ہے "

(۷۵)

○ " ہاں، جو شخص اپنا وعدہ پورا کرے اور متقی ہو جائے تو یقیناً خدا متقی لوگوں سے محبت کرتا ہے "

(۷۶)

O "جو لوگ خدائی عہد و پیمان اور اپنی قسموں کو نہایت کم قیمت پر بیچ دیتے ہیں یقیناً ایسے ہی لوگوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں، (بلکہ) قیامت کے دن خدا ان سے کلام کرے گا اور نہ ان کی طرف نظر کرے گا اور نہ ہی انہیں پاک کرے گا بلکہ ان کے لئے دردناک عذاب مقرر ہے"

(۷۷)

O "اور ان (اہل کتاب) میں سے کچھ افراد ایسے ہیں جو کتاب کو پڑھتے پڑھتے اپنی زبانیں اس طرح گھماتے ہیں کہ آپ ان لفظوں کو کتاب ہی کا حصہ سمجھیں جبکہ وہ کتاب کا حصہ نہیں ہوتے، اور وہ کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے حالانکہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتا، (حقیقت یہ ہے کہ) وہ سب کچھ جاننے کے باوجود خدا پر جھوٹ باندھتے و تہمت لگاتے ہیں"

(۷۸)

تفسیر و بیان

ان آیات میں تمام اہل کتاب بالخصوص نصاریٰ کے بارے میں سلسلہء بیان اور اس سے ملحق و مربوط مطالب و موضوعات کے دوسرے مرحلہ کا آغاز ہوا ہے کیونکہ اس سے پہلے جو آیات گزری ہیں ان میں اس موضوع کے پہلے مرحلہ یعنی اہل کتاب کے بارے میں عمومی طور پر مطالب ذکر ہوئے اور وہ اس طرح سے کہ پہلے ارشاد ہوا:

" اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ " (دین اللہ کے نزدیک اسلام ہے)......سورۂ آل عمران، آیت ۱۹......،

اور فرمایا: " اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ " (کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب میں سے کچھ حصہ دیا گیا)......آل عمران، آیت ۲۳......،

اس کے بعد خطاب کا رخ نصاریٰ کی طرف کرتے ہوئے یوں ارشاد فرمایا:

" اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَ نُوْحًا...... " (خدا نے چن لیا آدم کو، اور نوح کو......)......آل عمران ۳۳......،

پھر اس سلسلۂ بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے اثناء گفتگو میں مؤمنین کی کافروں سے دوستی کے بارے میں یوں ارشاد ہوا:

" لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ " (مؤمنین، کافروں کو دوست نہ بنائیں)......آل عمران، آیت ۲۸......،

یہ تھے پہلے مرحلہ میں ذکر کیے گئے مطالب، اس کے بعد اس سلسلۂ بیان میں دوبارہ ان مطالب کو ذکر کیا جو گزشتہ آیات میں ذکر ہو چکے تھے لیکن اس میں سابقہ اسلوب سخن اور ترتیب موضوعات سے مختلف روش اختیار کی گئی چنانچہ مذکورہ بالا آیات مبارکہ اور ان سے ملحق دیگر آیات میں موضوع کی مناسبت کے حامل گوناگوں مطالب کو ذکر کیا گیا اور ان سب میں آیات کے بیانات کی خصوصیات ملحوظ رہیں مثلاً یوں ارشاد ہوا: " قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ " (آل عمران، آیت ۹۸) (کہہ دیجئے! اے اہل کتاب! تم اللہ کی آیات کا انکار کیوں کرتے ہو)

اس کے بعد ارشاد ہوا:

○ " قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ "

(کہہ دیجئے! اے اہل کتاب! تم اللہ کی راہ سے کیوں روکتے ہو......آل عمران، آیت ۹۹ ...،

اور نصاریٰ کی بابت اظہار مطالب میں حضرت عیسیٰ کے بارے میں ان کے عقیدہ کے حوالہ سے ارشاد ہوا :

○ " مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴿۷۹﴾ "

(کسی بشر کے لئے روا نہیں کہ جسے خدا کتاب عطا کرے اور حکومت و نبوت دے پھر وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میرے عبادت گزار بنو، بلکہ وہ کہے کہ تم اللہ والے بنو کیونکہ تم کتاب کی تعلیم دیتے ہو اور تم اس سے درس حاصل کرتے ہو)......آل عمران، آیت ۷۹......

اور پھر متفرق و کثیر آیات میں مؤمنین سے مربوط مطالب کا تذکرہ ہوا: مثلاً اسلام پر قائم رہنے کی دعوت، اتحاد و یکجہتی کی دعوت، کفار کی دوستی سے بچنے کی دعوت، مؤمنین کے علاوہ دوسروں کو رازدار بنانے سے اجتناب برتنے کی دعوت، اور ان کے علاوہ دیگر مطالب و مضوعات وغیرہ،

اہل کتاب کو دعوتِ حق

○ " قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ "

(کہہ دیجئے، اے اہل کتاب! تم آؤ اس بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر...... مشترک ......ہے)

اس آیت مبارکہ میں عمومی طور پر اہل کتاب سے خطاب کیا گیا ہے، اور جملہ "تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ" کے ذریعے جو دعوت دی گئی ہے وہ درحقیقت یکجا ہو کر ایک مشترک بات پر عمل کرنے کی دعوت ہے، اس جملہ میں کہا گیا ہے "تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ" (تم آؤ اس کلمہ (بات) کی طرف) تو اس میں "كَلِمَةٍ" کی طرف بلائے جانے کی بات اس حوالہ سے ہوئی کہ عام طور پر یہی زبان زدِ عام و خاص ہوتا ہے کہ " لوگ اس "بات" پر متفق ہو گئے کہ فلاں کام اس طرح ہوگا"، تو اس میں لفظ "كَلِمَةٍ" یقین و پختہ عزم، اعتقاد و قبولیت اور نشر و اشاعت کے معانی کا حامل ہوتا ہے، یعنی کہا جاتا ہے کہ لوگ اس امر پر پختہ یقین و عزم کے ساتھ اس کے مقبولِ خاص و عام ہونے پر اتفاق رائے رکھتے ہیں، تو "كَلِمَةٍ" بمعنی رائے و پختہ نظریہ ہے، بناء براین آیت مبارکہ کا معنی یہ ہوگا: آؤ کہ ہم اس امر پر اتفاق رائے کرتے ہوئے باہمی تعاون اور یکجہتی کے ساتھ اس کے عام کرنے اور اس کے تقاضوں کی تکمیل پر مل کر کام کریں۔

لفظ "سَوَآءٍ" اصل میں مصدر ہے لیکن بطور صفت بمعنی "مساوی الطرفین" (برابر) استعمال ہوتا ہے، لہٰذا جملہ "سَوَآءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ" کا معنی یہ ہے کہ وہ ایسا کلمہ (بات) ہے جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک حیثیت رکھتا ہے اور ہمیں اور تمہیں دونوں کو اس پر عمل کرنا اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنا ضروری ہے،

بنا برایں آیت میں "کَلِمَةٍ" کی توصیف "سَوَآءٍ" کے ساتھ اس حوالہ سے ہوئی ہے کہ اس میں اس پر عمل کرنا اور اسے اختیار کرنا ملحوظ ہے، گویا یہ صفت خود کلمہ کی نہیں بلکہ اس سے تعلق رکھنے والے امر یا امور کی ہے، اور آپ اس حقیقت سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ عمل کرنے کا تعلق "کَلِمَةٍ" کے معنی سے ہے نہ کہ خود "کَلِمَةٍ" سے، اور یہ اسی طرح سے ہے جیسے اجتماع و اکٹھا ہونے کا تعلق "کَلِمَةٍ" کے معنی سے ہے خود "کَلِمَةٍ" سے نہیں، اور اس جملہ میں اجتماع یعنی دونوں گروہوں کے اکٹھا ہونے کا اظہار کلمہ کے معنی سے تعلق کے حوالہ سے جس طرح ہوا ہے اس میں مجازی حوالہ ملحوظ ہے، اس بناء پر کلام میں چند مجازی حوالے پائے جاتے ہیں:

(۱) اجتماع اور دونوں گروہوں کے اکٹھا ہونے کی نسبت کلمہ کے معنی کی بجائے خود کلمہ کی طرف دی گئی،

(۲) معنی کی جگہ خود "کَلِمَةٍ" کا لفظ ذکر کیا گیا،

(۳) "کَلِمَةٍ" کی توصیف "سَوَآءٍ" کے ساتھ کی گئی،

ایک قول اور اس کی وضاحت

اس مقام پر ایک قول یہ ہے کہ آیت مبارکہ میں "کَلِمَةٍ" کے "سَوَآءٍ" ہونے سے مراد یہ ہے کہ قرآن، تورات اور انجیل تینوں کتب اس "کَلِمَةٍ" کی طرف دعوت کی بابت متفق و یکساں ہیں اور وہ کلمہ توحید ہے، اس بناء پر جملہ "تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ" کے بعد جملہ "اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ" دراصل اس کلمہ یعنی کلمہء توحید کی حقیقی و برحق تفسیر قرار پائے گا کہ جس پر تمام کتب آسمانی کا اتفاق ہے، اور وہ تفاسیر باطل و غلط ہیں جن میں ہوا و ہوس میں آلودہ اذہان نے کلمہ کی بابت اظہارِ معنی میں حلول (یعنی خدا کا حضرت مریمؑ کے بدن میں داخل ہو جانا) اور عیسیٰؑ کا بیٹا بنانا، تین خداؤں کا عقیدہ، علماء (احبار و قسیسوں اور استقفوں کی عبادت و پرستش کو شامل کیا، لہٰذا آیت کا معنی یہ ہوگا: "**تعالوا الی کلمة سواء بیننا و بینکم وهی التوحید**"، آؤ اس کلمہ کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر و یکساں (مشترک) ہے اور وہ کلمہء توحید ہے، اور توحید کے عقیدہ کا لازمی امر یہ ہے کہ ہر طرح کے شرک و شرکاء کو مسترد کر دیا جائے اور اللہ تعالیٰ کے

علاوہ کسی کو رب قرار نہ دیا جائے۔

البتہ آیت کا اختتامی جملہ یعنی " فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ " پہلے معنی کی تائید کرتا ہے کیونکہ اس کی بناء پر آیت کا معنی یوں ہے: آؤ اس کلمہ کی طرف، یعنی یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، کیونکہ اسلام جو کہ خدائی دین ہے اس کا مقتضائے حقیقی یہی ہے، اگرچہ اسلام بھی توحیدی عقیدہ کا لازمی حصہ ہے لیکن اس آیت مبارکہ میں جو دعوت دی گئی ہے (تعالوا) وہ عملی توحید کی طرف ہے کہ جو عملی طور پر غیر خدا کی عبادت کو ترک کرنا ہے نہ کہ صرف توحید کا عقیدہ رکھنا ہے، (ان دونوں میں فرق ہے، اس پر اچھی طرح غور کریں اور اسے بخوبی سمجھیں)۔

کلمۂ توحید کی حقیقت

○ " اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ "
(یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، اور اس کے ساتھ کسی کو شریک قرار نہ دیں، اور اللہ کے علاوہ ایک دوسرے کو رب بنائیں)

یہ جملہ "كَلِمَةٍ" کی تفسیر کرتا ہے جو کہ اسلام یعنی بارگاہِ رب العزت میں سر تسلیم خم کر دینے کا بنیادی تقاضا ہے۔

اور جملہ " اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ " سے مراد غیر اللہ کی عبادت و پرستش کی نفی ہے اللہ کی عبادت کا اثبات نہیں جیسا کہ سابقہ مباحث میں کلمۂ اخلاص " لا الہ الا اللہ " کے معنی کا ذکر کرتے ہوئے بیان ہو چکا ہے کہ "الا اللہ" استثناء کے لئے نہیں بلکہ بدل کے طور پر ہے اور اس بناء پر اس کا تقاضا یہ ہے کہ " لا الہ الا اللہ" کا سیاق، شریک کی نفی کے بیان کے لئے ہو نہ کہ معبود کے اثبات کے لئے!، کیونکہ قرآن مجید معبود کے وجود کے اثبات اور اس کی حقیقت کو مسلم الثبوت امر قرار دیتا ہے کہ جس کے لئے کسی بیان و دلیل کی ضرورت نہیں۔

چونکہ سیاقِ کلام، شریک کی نفی ہے اور اس میں عبادت میں خدا کے شریک کی نفی کا بیان مقصود ہے تو ضروری تھا کہ ایسا جملہ ذکر کیا جائے جس سے شرک کی بنیاد ہی ختم ہو جبکہ جملہ "اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ" سے یہ مطلوب حاصل نہیں ہو سکتا تھا، اس لئے اس کے فوراً بعد یوں ارشاد ہوا: "وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ" (کہ ہم خدا کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بنائیں اور نہ ہی ہم خدا کے علاوہ ایک دوسرے کو رب قرار دیں)۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ "عبادت" اس وقت تک "عبادتِ خدا" نہیں کہلا سکتی جب تک وہ شرک آمیز عقائد و نظریات سے پورے طور پر خالص و پاک

نہ ہو ورنہ وہ اللہ کی عبادت تو کہلائے گی مگر شرک کے ساتھ! یعنی ایسی عبادت ہوگی جس کے ذریعے دو شریکوں (معبودوں) میں سے ایک کو معبود قرار دے کر اس کی پرستش کی گئی ہو، اس طرح کی عبادت، خدائے یکتا کی عبادت نہیں کہلا سکتی، اگر چہ اس کی نسبت خدا کی طرف ہوتی ہے اور اسے خدا کی عبادت کا نام دیا جاتا ہے لیکن اس کی کڑیاں شرک سے ملتی ہیں اور وہ بھی اس طرح کہ عبادت کو تقسیم کر کے اس میں سے ایک حصہ خدا کے ساتھ مخصوص کر دیا جاتا ہے اور پھر اس کی بناء پر اسے "عبادتِ خدا" کہا جاتا ہے جبکہ اس میں اللہ کے علاوہ دیگر معبودوں کی عبادت بھی موجود ہوتی ہے۔

اور وہ خالص عبادت کہ جو صرف خدا کے لئے ہے اور اس میں معبود یکتا ذاتِ خداوند متعال ہے اس کی طرف حضرت پیغمبر اسلامؐ نے بحکم خدا، لوگوں کو بلایا، اور اسی کا ثبوت اس آیت مبارکہ میں پایا جاتا ہے: "اَلَّا نَعۡبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشۡرِكَ بِهٖ شَيۡـًٔـا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعۡضُنَا بَعۡضًا اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ " اور یہی وہ غرض و مقصدِ اعلیٰ ہے جس پر انبیاء علیہم السلام کی سیرت اور اس عملی دعوت کا دارومدار ہے جس کے ذریعے وہ اس عظیم مقصد کو دنیائے انسانیت کے گوشہ گوشہ تک پھیلانے کا ہدف حاصل کرنے آئے تھے، چنانچہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۱۳ " كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً " کی تفسیر میں بیان ہو چکا ہے کہ نبوت ایک خدائی ذمہ داری اور حقیقی تحریک ہے کہ جس کے ذریعے اعلائے کلمۂ حق اور دین کے پیغام کو عام کرنے کا ہدف ملحوظ و مقصود قرار پاتا ہے، اور دین کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسانی معاشرہ کو زندگی کی عادلانہ صورت عطا کی جائے کہ جس میں فردی زندگی کو درست سمت میں لانے کا ہدف بھی حاصل ہو جاتا ہے اور پھر پوری انسانی کائنات اپنی اس منزل کو پالیتی ہے جو اس کی تخلیق کی اصل بنیاد و مقصد ہے یعنی ہر فردِ بشر اپنی تخلیقی غرض و غایت کو حاصل کر لیتا ہے، چنانچہ پورا معاشرہ عدل و انصاف کے ساتھ حریت و آزادی اور فطری کمالات سے بہرہ مندی کی سعادت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے، اور جب معاشرہ اس پاکیزہ صفت و عظیم نعمت سے مالا مال ہوتا ہے تو اس کے ضمن میں ہر فرد کو زندگی کی گونا گوں جہتوں میں بھرپور بلکہ مطلق آزادی حاصل ہو جاتی ہے اور وہ اپنی سوچ اور ارادہ کی راہنمائی میں جو کچھ بھی کرنا چاہتا ہے کرنے لگتا ہے لیکن اسے اپنی انفرادی سوچ و ارادہ کی بنیاد پر کئے جانے والے کاموں اور آزادی کی نعمت سے بہرہ مندی و استفادہ میں ان امور و اقدامات کی بابت ہرگز آزادی حاصل نہیں ہوتی جو معاشرہ کی زندگی و بقاء کے لئے نقصان دہ ہوں، چنانچہ زیر نظر آیت مبارکہ کے اختتامی جملہ میں ان تمام امور کو خدا کی عبودیت و بندگی اور اس کے سامنے کامل طور پر سر تسلیم خم کر دینے سے وابستہ کر دیا گیا ہے اور غیبی طاقت و سلطنت کے سامنے عملی خضوع کو ان تمام اعمال کا محور قرار دیا گیا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ تمام انبیاء الٰہی علیہم السلام نے نوع انسانی کو انفرادی و اجتماعی دونوں صورتوں میں اس راہ پر چلنے کی دعوت دی جو ان کی فطری و تخلیقی بنیادوں سے کامل مطابقت رکھتی ہے یعنی کلمۂ توحید (یکتا پرستی) کہ جس کا بنیادی تقاضا ہی یہ ہے تمام اعمال کو خواہ ان کا تعلق فردی و نجی زندگی سے ہو یا اجتماعی و معاشرتی حیات سے ہو خدا سے کامل وابستگی و سپردگی اور عدل

وانصاف کے تقاضوں سے ہمرنگ وہم آہنگ کیا جائے، یعنی زندگی کے حقوق میں مساوات وبرابری کا عملی تحفظ ونفاذ اور نیک ارادہ وعمل صالح میں حریت وآزادی سے بہرہ مندی کو یقینی بنایا جائے، اوران مقاصد کا حصول سوائے اس کے ممکن نہیں کہ اختلاف کی جڑوں کو کاٹ دیا جائے، ناحق بغاوت ودشمنی کی بنیادوں کا قلع قمع کر دیا جائے، طاقتور کی بالادستی اوراس کے کمزورو ناتواں افراد پر حاکمانہ تسلط کی راہ بند کردی جائے اور کوئی ضعیف انسان کسی قوی شخص کی غلامی اختیار نہ کرے، اور عقیدہ وعمل میں اس حقیقت کا ثبوت دیا جائے کہ کوئی معبود نہیں سوائے خدا کے ! (لا الـه الا اللّـه) ،کوئی رب نہیں سوائے خدا کے! (لا رب الا اللّٰه) اور کسی کو حکمرانی کا حق حاصل نہیں سوائے خدا کے ! (لا حکم الا للّٰه)، اور یہی وہ حقیقت ہے جس پر یہ آیت دلالت کرتی ہے: " اَلَّا نَعۡبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشۡرِكَ بِهٖ شَيۡـئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعۡضُنَا بَعۡضًا اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ "، اسی کے مانندوہ آیت ہے جس میں خداوند عالم نے یوسف علیہ السلام کی بات ذکر کی ہے کہ انہوں نے اپنے ساتھی قیدی سے کہا :

" يٰصَاحِبَىِ السِّجۡنِ ءَاَرۡبَابٌ مُّتَفَرِّقُوۡنَ خَيۡرٌ اَمِ اللّٰهُ الۡوَاحِدُ الۡقَهَّارُ ﴿۳۹﴾ مَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسۡمَآءً سَمَّيۡتُمُوۡهَاۤ اَنۡتُمۡ وَاٰبَآؤُكُمۡ مَّاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنۡ سُلۡطٰنٍ ؕ اِنِ الۡحُكۡمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ " (سورۂ یوسف، آیت ۴۰)

(اے میرے قید کے ساتھی! کیا گوناگوں ارباب بہتر ہیں یا اللہ، کہ جو یکتا وغلبہ والا ہے، جن کی تم پوجا کرتے ہو وہ کچھ بھی نہیں سوائے ان ناموں کے جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھے ہیں، کہ ان کے بارے میں خدا نے کوئی دلیل نازل نہیں کی، حکمرانی کسی کو حاصل نہیں سوائے خدا کے، اس نے حکم دیا ہے کہ تم کسی کی عبادت نہ کرو سوائے اس کے، کہ یہی مضبوط دین ہے)،

ایک اور مقام پر ارشاد ہوا:

سورۂ توبہ، آیت :۳۱

○ " اِتَّخَذُوۡۤا اَحۡبَارَهُمۡ وَرُهۡبَانَهُمۡ اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَالۡمَسِيۡحَ ابۡنَ مَرۡيَمَ ۚ وَمَاۤ اُمِرُوۡۤا اِلَّا لِيَعۡبُدُوۡۤا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ سُبۡحٰنَهٗ عَمَّا يُشۡرِكُوۡنَ"

(انہوں نے اپنے علماء اور راہبوں کو خدا کے مقابلے میں رب بنالیا اور مسیح بن مریم کو (رب بنالیا)، حالانکہ انہیں اس کے علاوہ کوئی حکم نہیں دیا گیا کہ وہ ایک معبود کی پرستش کریں، کوئی معبود نہیں سوائے اس کے !)

اس موضوع کی بابت مذکورہ بالا آیتوں کے علاوہ دیگر متعدد آیات موجود ہیں۔

دعوتِ انبیاءؑ کا قرآنی تذکرہ

قرآن مجید میں بعض انبیاء علیہم السلام مثلاً نوحؑ، ہودؑ، صالحؑ، ابراہیمؑ، شعیبؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کی توحیدی دعوت کا تذکرہ نہایت واضح الفاظ میں ہوا ہے چنانچہ اس حوالہ سے چند آیات بطور نمونہ پیش کی جاتی ہیں جن میں ان ہستیوں کے عمل اور ردِعمل سے مربوط مطالب مذکور ہیں :

حضرت نوحؑ کے تذکرہ میں ہے کہ انہوں نے بارگاہِ رب العزت میں عرض کی :

سورۂ نوح، آیت :۲۱

○ "رَّبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِیْ وَاتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ یَزِدْهُ مَالُهٗ وَوَلَدُهٗۤ اِلَّا خَسَارًا"

(پروردگارا ! ان لوگوں نے میری نافرمانی کی ہے اور ایسے شخص کی پیروی کی کہ جسے اس کے مال واولاد سے سوائے خسارہ ونقصان کے کچھ حاصل نہ ہوا)

حضرت ہودؑ نے اپنی قوم سے جو کہا اس کا تذکرہ یوں ہوا :

سورۂ شعراء، آیت :۱۳۰

○ "اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ﴿۱۲۹﴾ وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ"

(کیا تم ہر بلند جگہ پر بے مقصد نشانیاں بناتے ہو اور بڑے محلات تعمیر کرتے ہو کہ گویا ان میں ہمیشہ رہنے والے ہو، اور جب تم کسی کمزور پر غصہ کرتے ہو تو نہایت جابر و بے رحم بن کر کرتے ہو)

حضرت صالحؑ نے اپنی قوم سے یوں فرمایا :

سورۂ شعراء، آیت :۱۵۱

○ "وَلَا تُطِيْعُوْۤا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ"

(اور تم اسراف کرنے والوں کے احکامات کی اطاعت نہ کرو)

حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ (چچا) اور اپنی قوم سے یوں کہا :

سورۂ انبیاء، آیت: ۵۴

○ " مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ﴿۵۲﴾ قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ﴿۵۳﴾ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۵۴﴾ "

(یہ صورتیں (مورتیں) کیا ہیں کہ تم جن کے گرویدہ ہو چکے ہو؟، انہوں نے کہا کہ ہم نے اپنے آباء کو ان کی عبادت کرتے ہوئے پایا ہے، اس نے کہا کہ بے شک تم اور تمہارے آباء کھلی گمراہی میں تھے)

خداوند عالم نے حضرت موسیٰؑ اور ان کے بھائی کو فرعون کے پاس جانے کا حکم دیا، اس کا ذکر قرآن مجید میں اس طرح ہوا:

سورۂ طٰہٰ، آیت: ۴۷

○ " اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ...... فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ "

(تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ کیونکہ اس نے سرکشی کی ہے...... اس کے پاس آ کر اس سے کہو کہ ہم دونوں تیرے رب کی طرف سے پیغام لائے ہیں (رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں)، تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے اور ان پر سختی و ظلم نہ کر)

حضرت عیسیٰؑ نے جو کچھ اپنی قوم سے کہا اس کا ذکر اس طرح ہوا:

سورۂ زخرف، آیت: ۶۳

○ " وَلِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ "

(اور تا کہ میں تمہارے لئے بعض ان مسائل کو واضح طور پر بیان کروں جن میں تم اختلاف رکھتے ہو، تم تقوائے الٰہی اختیار کرو اور میری اطاعت کرو)

مذکورہ بالا آیات سے اس حقیقت کی نشاندہی ہوتی ہے کہ فطری دین وہی ہے جو دشمنی و فساد کی نفی کرتا ہے کیونکہ یہ مظالم اور ناحق آمرانہ اعمال، سعادت و خوش بختی کی بنیادوں کو منہدم کر دیتے ہیں اور حق و حقیقت کی عمارتوں کو اوندھا منہ گرا دیتے ہیں۔

اور حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے (جیسا کہ مشہور مورخ مسعودی نے کتاب مروج الذہب میں دس ہجری کے واقعات میں لکھا ہے) حجۃ الوداع کے موقع پر ارشاد فرمایا:

" الا وان الزمان قد استدار کھیئته یوم خلق الله السموات والارض"

(یادرکھو کہ زمانہ اپنی اسی شکل پر پلٹ گیا ہے جیسے خدا نے اسے اس دن پیدا کیا جب آسمانوں اور زمین کو خلق فرمایا)،

گویا آنحضرتؐ کا مقصد یہ ہے کہ لوگ اب اپنی فطری راہ پر چل پڑے ہیں کیونکہ ان کے درمیان اسلامی اقدار عملی طور پر حکم فرما ہو گئے ہیں۔

بہرحال آیت مبارکہ "اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ" جہاں نبوت کے مقصدِ اعلیٰ کو بیان کرتی ہے وہاں حکم کے سبب و معیار کو بھی واضح کرتی ہے۔

اور جہاں تک اس پورے جملہ کا تعلق ہے" اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا " (ہم عبادت نہ کریں کسی کی سوائے خدا کے، اور ہم اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بنائیں) تو اس کی وجہ یہ ہے کہ الوہیت ہی تمام موجودات کی توجہات کا مرکز اور ان کے قلبی التفات کا محور ہوتا ہے لہٰذا وہی کائنات میں پائی جانے والی کثیر اور ایک دوسری سے مرتبط و وابستہ اشیاء کے ہر کمال کا سرچشمہ ہے کیونکہ تمام موجودات اپنے وجود و بقاء میں محتاج ہونے کے حوالہ سے یکساں ہیں اور معبود کو ایسا ہونا چاہئے جس میں ہر وہ کمال پایا جائے جس کی ان موجودات کو ضرورت ہو اور یہ مقصد صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جب وہ یعنی معبود یکتا ہو، اس کے ساتھ الوہیت میں کوئی شریک نہ ہو، اور ایسا مالک ہو کہ ہر چیز کی تدبیر و بقاء کا نظام اسی کے ہاتھ میں ہو، اس بناء پر ضروری ہے کہ "اللہ" کی عبادت و پرستش کی جائے کیونکہ وہ واحد و یکتا ہے کہ جس کا کوئی شریک نہیں، اور ضروری ہے کہ اس کی عبادت و پرستش میں کسی کو اس کے ساتھ شریک نہ کیا جائے، اس مطلب کو دوسرے لفظوں میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ یہ جہان اور جو کچھ بھی اس میں پایا جاتا ہے اس کی بابت یہ بات ہرگز درست و روا نہیں کہ وہ ایک محور و مرکز کے علاوہ کسی کے سامنے خاضع و سر خم کرے کیونکہ تمام اہل عالم اپنے وجودی نظام اور اس کی وابستگی کی اکائی و وحدت کے مرہون منت ہیں کہ اسی پر ان کی پرورش و تربیت کا دارومدار ہے، ان سب کا ایک ہی رب ہے اور ایک ہی خالق ہے، اس کے سوا ان کا کوئی پروردگار اور پیدا کرنے والا نہیں۔

اور جہاں تک جملہ "وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ" کا تعلق ہے تو اس سے ایک اہم مطلب کی نشاندہی ہوتی ہے اور وہ یہ کہ انسانی معاشرہ اپنے افراد کی کثرت اور اشخاص کے مختلف و جدا جدا ہونے کے باوجود ایک ہی حقیقت کے حصے ہیں کہ جسے "انسان" اور اس کی نوع کا نام دیا جاتا ہے، اس میں کارخانہ تخلیق نے جو قوتیں و صلاحیتیں ودیعت کی ہیں اور جن حقوق سے نوازا ہے ان کا یکساں و مساوی ہونا اس امر کا متقاضی ہے کہ نوع انسانی کے تمام افراد زندگی کے حقوق اور ان سے استفادہ کرنے کے مواقع و موادر میں بھی برابر درجہ رکھتے ہوں، اور ان میں سے اگر کچھ افراد اپنی ذاتی صلاحیت کی بنیاد پر انسانی زندگی کے عمومی حقوق سے زیادہ یا مخصوص امتیازی صفات کے حامل و حقدار ہوں تو انہیں ان کی

صلاحیتوں کے مطابق ان کا مقام دیا جانا چاہیے اور اس مقام کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے انہیں معاشرتی زندگی کے حقوق سے بہرہ مند کیا جائے کیونکہ کارخانہ تخلیق میں نوع انسانی کے افراد کے درمیان صنفی خصوصیات متعین کر دی گئی ہیں مثلاً ازدواج، ولادت اور معالجہ کے حقوق وخصوصیات جو کہ انسانیت کے عمومی مسائل میں سے ہیں لیکن ان کی اختصاصی حیثیت اس طرح سے ہے کہ ازدواج کا حق اس انسان کو حاصل ہوتا ہے جو بالغ ہو خواہ مرد ہو یا عورت، اور بچہ جننے کی خصوصیت عورت کو عطا کی گئی اور معالجہ کا حق بیمار شخص کے حوالہ سے متعین ہوتا ہے، تو معلوم ہوا کہ افرادِ بشر اجتماعی ومعاشرتی حیثیت میں اس طرح ہیں کہ سب ایک ہی جیسی حقیقت کے ایک ہی جیسے اجزاء وحصے ہیں لہٰذا کسی کو کسی پر اپنا ارادہ وخواہش مسلط کرنے کا حق حاصل نہیں سوائے ان موارد کے کہ جن میں طرفین ایک دوسرے کو اپنے ارادہ وچاہت کے استعمال کا برابر وعادلانہ حق دیں اور اسے عملی طور پر بھی ثابت کریں کہ اسے ہی زندگی کی خصوصیات سے استفادہ کی بابت باہمی تعاون کہا جاتا ہے لیکن جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ پورا معاشرہ یا کوئی ایک فرد کسی فرد کے تابع فرمان ہو جائے یعنی تمام افراد یا بعض افراد، کسی ایک فرد کے زیر دست ہوں کہ جس سے وہ فرد انسانیت کا جزء ہونے کے دائرہ سے باہر بالاتر حیثیت اختیار کر لے اور برتری و بالاتری اور آمرانہ وحاکمانہ تسلط کے ذریعے دیگر افراد بشر سے انسانی برابری سے مافوق درجہ مل جائے کہ اسے رب قرار دیتے ہوئے اس کی چاہت وفرمان کو لازم الاتباع سمجھا جائے اور اسے مطلق العنان حکمرانی کا حق دے کر اس کے ہر امر ونہی کی اطاعت وفرمانبرداری کی جائے تو اس سے فطرت کی سراسر نفی اور انسانیت کی بنیادوں کا منہدم ہو جانا لازم آتا ہے، یعنی تمام انسانی حقوق پامال ہو جائیں گے اور تخلیقی اقدار واصول کی عملی نفی ہو جائے گی، اس کے ساتھ ساتھ یہ خرابی پیدا ہو گی کہ ربوبیت جو کہ خداوند عالم کے ساتھ مختص ومخصوص ہے کہ اس کے سوا کوئی رب نہیں اس کی نفی ہو جائے گی کیونکہ کسی انسان کا خود کو اپنے جیسے انسان کے اس طرح سپرد کر دینا کہ وہ اس کے بارے میں جو چاہے فیصلہ واقدام کرے جبکہ اسے اس کے بارے میں کسی قسم کے فیصلہ واقدام کا حق حاصل نہ ہو درحقیقت خدا کو چھوڑ کر کسی کو رب قرار دینے سے عبارت ہے کہ اس طرح کا کام کوئی مسلمان اور اپنے آپ کو خدا کے تابع فرمان سمجھنے والا شخص ہرگز نہیں کر سکتا۔

مذکورہ بالا مطالب سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ جملہ "وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ" دو امور کو آشکار کرتا ہے:

(۱) تمام افرادِ بشر ایک ہی حقیقت کے اجزاء ہیں،

(۲) ربوبیت، الوہیت وخدائی کی خصوصیات ومخصوص صفات میں سے ہے۔

مسلمان ہونے کا کھلا اعلان

○ " فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَقُوۡلُوا اشۡهَدُوۡا بِاَنَّا مُسۡلِمُوۡنَ"
(پس اگر وہ رخ موڑ لیں تو کہہ دو کہ تم گواہ رہو ہم مسلمان ہیں)

اس آیت مبارکہ میں مسلمان ہونے کے کھلم کھلا اعلان کے حوالہ سے کہا گیا ہے کہ اگر وہ لوگ (اہل کتاب) کلمہء توحید کی پیروی پر تمہارا ساتھ نہ دیں بلکہ روگردانی کر لیں تو کہہ دو کہ تم گواہ رہو کہ ہم مسلمان ہیں۔

اس آیت میں اہل کتاب کو اس بات پر گواہ بنانے کا ذکر ہے کہ وہ یعنی نبیؐ اور ان کے پیروکار اس دین پر ہیں جو خدا کا پسندیدہ ہے یعنی اسلام! کہ اسی کے بارے میں ارشاد الٰہی ہے: " اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰهِ الۡاِسۡلَامُ " (آل عمران، آیت ۱۹)...... بے شک اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے...... اس واضح اظہار کے بعد کسی کے جھگڑا کرنے اور بحث و تمحیص کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کیونکہ حق اور اہل حق کے مقابلہ میں کوئی حجت کارگر نہیں ہو سکتی، اور اس بیان میں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہے کہ عبادت میں توحید و یکتا پرستی اسلام کے لازمی و بنیادی اصولوں و تقاضوں میں سے ہے۔

اہل کتاب کی توبیخ

○ "یٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوۡنَ فِیۡۤ اِبۡرٰهِیۡمَ...... **الخ**"
(اے اہل کتاب! تم ابراہیم کے بارے میں کیوں محاجہ کرتے ہو...... الخ)

یہ جملہ بظاہر سابقہ آیت کے خطابی جملہ کا تتمہ ہے اور وہ جملہ بھی اسی طرح سے ہے جو چار آیات کے بعد آئے گا جس میں ان سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا: "یٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ......"، تو اس طرح یہ خطابی جملہ دراصل حضرت رسولِ خداؐ کے لئے ہے کہ وہ اہل کتاب سے کہیں، اگرچہ دو آیتوں کے بعد جو جملہ ذکر ہوا ہے وہ بظاہر خدا کا کلام ہے نہ کہ رسولؐ کا کلام کہ جو انہوں نے خدا کے اذن کے ساتھ فرمایا ہو، کیونکہ اس میں یوں ارشاد ہوا: " اِنَّ اَوۡلَی النَّاسِ بِاِبۡرٰهِیۡمَ لَلَّذِیۡنَ اتَّبَعُوۡهُ وَهٰذَا النَّبِیُّ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا " (بے شک لوگوں میں سے ابراہیم کے زیادہ حقدار وہ افراد ہیں جنہوں نے اس کی پیروی کی اور یہ نبی اور وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں)،

حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں محاجہ سے مراد یہ ہے کہ ہر گروہ انہیں اپنے ساتھ ملحق کرے اور یہ دعویٰ کرے کہ ابراہیمؑ ہم میں سے ہیں یعنی یہودی یہ کہیں کہ ابراہیمؑ کہ خدا نے جن کی تعریف اپنی کتاب میں کی ہے وہ ہم میں سے ہیں اور نصاریٰ یہ کہیں کہ ابراہیمؑ حق پر تھے اور عیسیٰؑ کے ظہور پذیر ہونے کے ساتھ ہی حق بھی ظہور پذیر ہو گیا لہٰذا ابراہیمؑ ہم میں سے تھے، ان دونوں کے اس طرح کے اظہارات کے بعد ان کے درمیان لجاجت وتعصب کی آگ بھڑک اٹھے چنانچہ یہودی صریح لفظوں میں ادعاء کرنے لگیں کہ ابراہیمؑ تھے ہی یہودی، اور نصاریٰ مدعی ہوں کہ ابراہیمؑ تھے ہی نصرانی، جبکہ وہ دونوں گروہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ یہودیت اور نصرانیت کا ظہور پذیر ہونا تورات وانجیل کے نزول کے بعد ہے اور وہ دونوں حضرات یعنی موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ، حضرت ابراہیمؑ کے بعد تشریف لائے، تو یہ بات کیونکر ممکن ہے کہ انہیں یہودی قرار دیا جائے یعنی وہ اس دین کی پیروی کرنے والے ہوں جو حضرت موسیٰؑ کے ساتھ مختص ہے، یا انہیں نصرانی کہا جائے یعنی وہ اس شریعت کے پیروکار ہوں جو حضرت عیسیٰؑ سے مختص ہے، بنابرایں حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں کچھ کہنا ہو تو ضروری ہے کہ یوں کہا جائے کہ وہ حق پر تھے (حق کے پیروکار تھے) اور خالص دین کی پیروی کرنے والے تھے، اور وہ ہر طرح کے باطل سے پاک، صرف حق کی راہ پر چلنے والے، خداوند عالم کے کامل فرماں بردار اور بارگاہ رب العزت میں سر تسلیم خم کرنے والے تھے، بہر حال زیر نظر آیات مبارکہ درج ذیل آیات شریفہ سے ہم رنگ وہم سیاق ہیں :

سورۂ بقرہ، آیت : ۱۴۰

○ " اَمۡ تَقُوۡلُوۡنَ اِنَّ اِبۡرٰهٖمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ وَيَعۡقُوۡبَ وَالۡاَسۡبَاطَ كَانُوۡا هُوۡدًا اَوۡ نَصٰرٰى ؕ قُلۡ ءَاَنۡتُمۡ اَعۡلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ وَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنۡ كَتَمَ شَهَادَةً عِنۡدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۴۰﴾ "

(کیا تم کہتے ہو کہ ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اسباط، یہودی تھے یا نصرانی؟ ان سے کہو کہ آیا تم بہتر جانتے ہو یا اللہ؟ اور کون اس شخص سے بڑا ظالم ہو سکتا ہے جو اس خدائی گواہی کو چھپائے جو اس کے پاس ہے)

جانتے اور نہ جانتے ہوئے محاجہ؟

○ " هٰۤاَنۡتُمۡ هٰۤؤُلَاۤءِ حَاجَجۡتُمۡ فِيۡمَا لَكُمۡ بِهٖ عِلۡمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوۡنَ فِيۡمَا لَيۡسَ لَكُمۡ بِهٖ عِلۡمٌ ...... "

(اب تم اس چیز کی بابت محاجہ کرتے ہو جس کا تمہیں علم ہے، تو جس کا تمہیں علم ہی نہیں اس کے بارے میں کیوں محاجہ کرتے ہو؟)

یہ آیت مبارکہ اہل کتاب (محاجہ کرنے والوں) کے لئے ایک علم کو ثابت کرتی ہے اور ایک علم کی نفی کرتی ہے اور جس علم کی ان سے نفی کرتی ہے اسے اللہ کے لئے ثابت کرتی ہے، اسی بناء پر مفسرین نے لکھا ہے کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ تم ابراہیم کے بارے میں محاجہ و جھگڑا کرتے ہو جبکہ تمہیں ان کے بارے میں معلوم ہے یعنی تم علم رکھتے ہو کہ وہ نبی بن کر آئے تھے، اور جس چیز کے حوالہ سے ان کے بارے میں تمہیں علم نہیں یعنی یہ کہ آیا وہ یہودی تھے یا نصرانی، تو اس سلسلہ میں کیوں محاجہ و نزاع کرتے ہو ؟ اس سلسلہ میں اللہ کو علم ہے مگر تمہیں علم نہیں، لہٰذا اس کی بابت تمہارا بحث و مباحثہ اور نزاع و جھگڑا کرنا بیجا ہے، یا اس علم سے مراد یہ ہے کہ تم عیسیٰؑ اور ان کی نبوت کے بارے میں کچھ جانتے ہو اور اس بناء پر تم محاجہ و مناظرہ اور بحث و گفتگو کرتے ہو لیکن جس چیز کا تمہیں کوئی علم نہیں اور وہ یہ کہ آیا ابراہیم یہودی تھے یا نصرانی ؟ تو اس سلسلہ میں کیوں جھگڑا کرتے ہو اور دلیلیں لانے کی کوشش کرتے ہو ؟

یہ ہیں وہ دو معانی جو مفسرین نے آیت کی تفسیر میں ذکر کیے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی آیت کے کے ظاہر السیاق سے مطابقت نہیں رکھتا، اور وہ اس طرح کہ پہلے معنی کے تناظر میں دیکھیں تو اس کی آیت سے عدم مطابقت اس حوالہ سے ہے کہ ان کا محاجہ ابراہیمؑ کے وجود اور ان کی نبوت کے بارے میں نہیں ہوا، اور دوسرے معنی کے حوالہ سے دیکھیں تو حضرت عیسیٰؑ کی بابت ان کے درمیان جو محاجہ و بحث ہوئی وہ بے بنیاد و نادرست تھی کیونکہ انہوں نے ان کے بارے میں غلط عقیدہ پیش کیا اور جھوٹا دعویٰ کیا، لہٰذا یہ بات کیونکر درست ہو سکتی ہے کہ ان کا محاجہ مبنی بر علم تھا؟ لیکن کلام الٰہی یقینی طور پر ان کی طرف سے ایک محاجہ کا اثبات کرتا ہے کہ جو مبنی بر علم تھا جیسا کہ ایک محاجہ کا اثبات کرتا ہے کہ جو مبنی بر علم نہ تھا، یعنی آیات مبارکہ سے ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے اس چیز کی بابت محاجہ کیا جس کا انہیں علم تھا اور اس چیز کی بابت بھی محاجہ کیا جس کا انہیں علم نہ تھا، تو اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون سا محاجہ تھا جس میں وہ علم رکھتے تھے؟ البتہ ظاہر الآیۃ سے ثابت ہوتا ہے کہ دونوں محاجے خود اہل کتاب ہی کے درمیان واقع ہوئے نہ کہ ان کے اور مسلمانوں کے درمیان! ورنہ مسلمانوں کا اس محاجہ میں غلطی پر ہونا ثابت ہو جائے گا جس میں اہل کتاب کو علم تھا، اور یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ جس کا واضح و آشکار ہونا مسلم ہے۔

تاہم اس موضوع کی بابت جو مطلب قابل ذکر ہے اور اسے آیت کی تفسیر میں پیش کیا جا سکتا ہے (واللہ العالم) وہ یہ کہ یہود و نصاریٰ کے درمیان تمام اختلافی مسائل میں سب سے زیادہ اہم موضوع حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا تھا کہ ان کی بابت نصاریٰ کہتے تھے کہ وہ یا تو خدا ہیں، یا خدا کا بیٹا ہیں یا تین خداؤں میں سے ایک ہیں، تو نصاریٰ حضرت عیسیٰؑ کی بعثت و نبوت کے بارے میں یہودیوں سے محاجہ و مباحثات کرتے تھے جبکہ انہیں آنجنابؑ کے بارے میں علم تھا، اور یہودی نصرانیوں سے محاجہ و مباحثات میں حضرت عیسیٰؑ کی خدائی اور نبوت اور تثلیث (یعنی تین خداؤں میں سے ایک ہونا) کو نادرست قرار دیتے تھے، جبکہ انہیں بھی آنجنابؑ کے بارے میں علم تھا، تو یہ تھا ان کا وہ محاجہ جس میں وہ علم رکھتے تھے، لیکن ان

دونوں کا وہ محاجہ جس میں وہ علم سے بے بہرہ تھے وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں تھا کہ آیا وہ یہودی تھے یا نصرانی؟ اس سلسلہ میں وہ ہرگز علم نہ رکھتے تھے لیکن اس کے باوجود آپس میں دست وگریباں رہتے تھے۔

اوران کے حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں جاہل ولاعلم ہونے سے مراد یہ نہیں کہ وہ یہ نہ جانتے تھے کہ تورات وانجیل ابراہیمؑ کے بعد نازل ہوئیں کیونکہ یہ تو ایک واضح حقیقت ہے، اور نہ ہی ان کے جہل سے مراد یہ ہے کہ وہ اس امر سے غافل تھے کہ پہلے گزرا ہوا انسان بعد میں آنے والے کے تابع نہیں ہوتا کیونکہ یہ تو عقلی بات ہے اوران لوگوں کے بارے میں خداوندعالم نے ارشادفرمایا:" اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ " (کیاتم عقل سے کام نہیں لیتے)، اگران کے جہل سے مراد یہ لیا جائے کہ وہ سابق کے لاحق کا تابع نہ ہونے کی مسلمہ حقیقت سے غافل تھے تو اس سے جملہ "اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ" بے نتیجہ ہوگا جو کہ صحیح نہیں کیونکہ اس جملہ سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ بات اس قدر واضح ہے کہ اسے سمجھنے میں معمولی سی توجہ ہی کافی ہے، لہٰذا ثابت ہوا کہ یہود ونصاریٰ کو علم تھا کہ حضرت ابراہیمؑ تورات وانجیل کے نازل ہونے سے پہلے تشریف لائے تھے لیکن اس کے باوجود وہ اس امر سے غافل تھے کہ ان کے اس جاننے کا مطلب ونتیجہ یہ بنتا ہے کہ وہ نہ یہودی تھے اور نہ ہی نصرانی، بلکہ وہ خدا کے خالص دین یعنی اسلام پر تھے کہ جو اپنے آپ کو خدا کے سپرد کردینے اوراس کی بارگاہ میں کامل سرتسلیم خم کرنے سے عبارت ہے، لیکن یہودی کہتے تھے کہ دین حق تو ایک ہی ہوسکتا ہے اوروہ یہودیت ہے لہٰذا ابراہیمؑ لامحالہ یہودی تھے، اور نصاریٰ نے بھی اسی طرح کی بات کی اوراسی بناء پر حضرت ابراہیمؑ کو نصرانی قرار دیا، تو درحقیقت وہ دونوں اس حوالہ سے جہالت کا شکار ہوئے نہ کہ غفلت کا، اوروہ یہ کہ خدا کا دین ایک ہے اوروہ یہ کہ کامل طور پر خدا کے حضور سرتسلیم خم کردینا، اوروہ ایک ہی حقیقت ہے، ایک ہی دین وآئین ہے کہ جو مرورِزمانہ اوروقت کے ساتھ ساتھ لوگوں کی استعداد اورصلاحیتوں کے تدریجی طور پر بسوئے کمال رواں دواں ہونے کے ساتھ خدا کی طرف سے کامل تر ہوتا چلا گیا اوروہ دین واحد کہ جس کا نام اسلام ہے یہودیت ونصرانیت سے پہلے موجود تھا اور یہودیت ونصرانیت اسلام کے سلسلہ ءکمال وتکامل کی دوکڑیاں ہیں، دوشعبے ہیں، دو مرحلے ہیں، اورانبیاء علیہم السلام میں سے ہرایک اس دین کی بنیادیں کھڑی کرنے والوں میں شامل ہے اوران حضرات میں سے جس نے بھی اس دین کی اساس مضبوط کرنے اوراس کی سربلندی میں جتنا کردار ادا کیا اسے اسکے مطابق درجہ ومقام حاصل ہے، گویا خداوندعالم نے ان میں سے ہرایک کو دین کی بنیادیں مضبوط کرنے کے مرحلہ درمرحلہ عمل میں جو ذمہ داری عطا کی اس کے تناظر میں اسے عظمت ومقام اورمنزلت حاصل ہوگئی اوروہ اسی مقام ومنزلت کے حوالہ سے پہچانا گیا۔

خلاصۂ کلام یہ کہ یہود ونصاریٰ اس اہم وبنیادی نکتہ سے جاہل رہے کہ اگرحضرت ابراہیمؑ کو اسلام کے ایک مرحلہ کی تاسیس کا منصب حاصل ہوا اور وہ مؤسس اسلام کہلائے اور اسلام چونکہ حقیقی دین خداوندی ہے کہ جو دیگر مراحل میں

یہودیت ونصرانیت کے نام سے ظہور پذیر ہوا اور وہ دونوں نام دراصل دین اسلام ہی کے کمالی مرحلوں کے نام ہیں، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ کو یہودی یا نصرانی قرار دیا جائے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ خالص مسلمان تھے اور انہیں اسی اسلام کے نام کی نسبت سے پہچانا گیا کہ انہوں نے خود جس کی تاسیس کی، وہ اسلام دراصل اپنے بعد کے کمالی مراحل یعنی یہودیت ونصرانیت کی اصل واساس ہے، ورنہ ان دونوں کی اپنی استقلالی حیثیت کچھ نہ تھی کیونکہ ان کی نسبت اپنی اصل کی طرف تھی اور یہ مسلمہ قاعدہ کلیہ ہے کہ ہمیشہ فرع اپنی اصل کی طرف منسوب ہوتی ہے کوئی اصل اپنی فرع کی طرف منسوب نہیں ہوتی، بنابرایں ضروری ہے کہ یہودیت ونصرانیت کو اسلام کی طرف منسوب کیا جائے اور اسلام سے ان کا جو رشتہ ناطہ ہے اسی حوالہ سے بات کی جائے نہ یہ کہ اس کے برعکس بات ہو۔

ایک اہم سوال اور اس کا جواب

اس مقام پر عین ممکن ہے یہ سوال پیدا ہو کہ اگر اسلام اصل ہے اور دیگر ادیان اس کی فرع ہیں تو اس بناء پر حضرت ابراہیمؑ کو بھی مسلمان کہنا درست نہ ہوگا کیونکہ جس طرح یہودیت ونصرانیت حضرت ابراہیمؑ کے بعد ظہور پذیر ہوئیں اسی طرح اسلام یعنی شریعت محمدیہؐ بھی حضرت ابراہیمؑ کے بعد بلکہ یہودیت ونصرانیت کے بھی بعد ظہور پذیر ہوئی،

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو مسلمان کے نام سے موسوم کرنا ان کے شریعت محمدیہؐ کا پیروکار ہونے کو ثابت نہیں کرتا کیونکہ "اسلام" سے شریعت محمدیہؐ یا شریعت قرآن مراد لینا نزول قرآن اور پیغام محمدیؐ کے وسیع پیمانہ پر پھیل جانے کے بعد ہوا اور وہ "اسلام" کہ جس کی توصیف حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمائی اس سے مراد خداوند عالم کی بارگاہِ ذی جاہ میں کامل تسلیم اور اس کے مقام ربوبیت کے سامنے خاضع ہو جانا ہے جو کہ اصل دین الٰہی ہے، لہٰذا اس حوالہ سے کسی اعتراض کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔

اور جہاں تک ان کے جہل کی بابت ہمارے مذکورہ بالا بیان کا تعلق ہے کہ وہ حقیقی دین سے ناآگاہ تھے جو کہ ایک ایسی حقیقت واحدہ ہے جو مختلف مراتب ودرجات کی حامل اور تدریجی طور پر مرحلہ بہ مرحلہ کمال کو پہنچتی ہے، تو شاید اسی کا اشارہ جملہ "وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۞ مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا......" میں ہوا ہے، اور اس کی تائید آیتِ مبارکہ: "اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ......" سے ہوتی ہے اور درج ذیل آیت کہ جو زیر بحث آیت مبارکہ کے بعد والی آیات میں سے ہے اس میں بھی اس کی تصدیق وتائید پائی جاتی ہے:

"قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ

وَمَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی وَعِیْسٰی وَالنَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ" (آل عمران، آیت ۸۵)

(کہہ دو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس پر جو ہم پر نازل کیا گیا اور جو ابراہیم و اسماعیل و اسحاق و یعقوب و اسباط پر نازل کیا گیا، اور جو کچھ موسیٰ و عیسیٰ اور نبیوں کو ان کے پروردگار کی طرف سے عطا کیا گیا، ہم ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے اور ہم تو خدا کے حکم پر سر تسلیم خم کیے ہوئے ہیں (اسلام پر ہیں یعنی مسلمان ہیں)، اور جو شخص اسلام کے علاوہ کسی دین کو چاہے تو اس سے وہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا)۔

اس آیت کی تفسیر عنقریب پیش ہوگی۔

ابراہیمؑ کے یہودی و نصرانی ہونے کی نفی

○ " مَا کَانَ اِبْرٰهِیْمُ یَهُوْدِیًّا وَّلَا نَصْرَانِیًّا"

(ابراہیم نہ یہودی تھا اور نہ نصرانی ......الخ)

اس آیت کی تفسیر سطور بالا میں ہو چکی ہے، اس موضوع کی بابت بعض حضرات کا کہنا ہے کہ جس طرح یہودی و نصرانی یہ دعویٰ کرتے تھے کہ حضرت ابراہیمؑ ان میں سے تھے اور ان کے دین پر تھے اسی طرح زمانۂ جاہلیت کے بت پرست عرب بھی مدعی تھے کہ وہ خالص دین یعنی دین ابراہیمیؑ پر ہیں (دین حنیف جو کہ دین ابراہیمؑ ہے اس کے پیروکار ہیں) چنانچہ اسی بناء پر اہل کتاب انہیں "حنفاء" کے لقب سے یاد کرتے تھے اور "حنیفیت" سے وثنیت یعنی بت پرستی مراد لیتے تھے۔ اور جب خداوند عالم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو "حنیف" کے لقب سے یاد کیا اور ارشاد فرمایا: "وَّلٰکِنْ کَانَ حَنِیْفًا" (لیکن وہ حنیف تھا) تو ضروری تھا کہ حنیف کے معنی کی وضاحت ہو، تا کہ اس سے بت پرستی کا تصور پیدا نہ ہو، لہٰذا اس کے فوراً بعد ارشاد فرمایا: "مُّسْلِمًا وَمَا کَانَ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ" (مسلمان تھا اور مشرکوں میں سے نہ تھا) یعنی وہ خدا کے پسندیدہ دین یعنی اسلام پر تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا جیسا کہ جاہل عرب ہیں۔

ابراہیمؑ کے حقداروں کا تعین

○ " اِنَّ اَوۡلَی النَّاسِ بِاِبۡرٰهِیۡمَ لَلَّذِیۡنَ اتَّبَعُوۡهُ وَهٰذَا النَّبِیُّ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا "

(بے شک ابراہیم کے زیادہ حقدار وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس کی پیروی کی اور یہ نبی اور وہ لوگ جو ایمان لائے)

یہ آیت مبارکہ سابق الذکر مطلب کی وجہ وسبب اور زیر بحث موضوع میں حقیقت الامر کو بیان کرتی ہے، لہٰذا اس کا معنی (واللہ العالم) یہ ہے کہ اس جلیل القدر نبی یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قیاس ان لوگوں کے ساتھ کیا جائے جوان کے بعد آئے خواہ وہ اس کے دین کے پیروکار ہوں یا ان کے علاوہ ہوں تو حق یہ ہے کہ انہیں (حضرت ابراہیمؑ کو) اپنے بعد میں آنیوالوں کا تابع و پیروکار قرار نہ دیا جائے بلکہ اس سلسلہ میں انہی کی ذات کو معیار قرار دے کر ان سے اولویت واقربیت کے حامل افراد کا تعین کیا جائے۔ بنابریں اس صاحب شریعت وصاحب کتاب نبی سے زیادہ قرب کے حامل وہی لوگ ہوں گے جو حق کی پیروی میں اس کے ساتھ ساتھ شانہ بہ شانہ شریک ہوں اور جو دین وہ لائے اس کی کامل پیروی کریں، اس معنی میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اولویت اور اقربیت حضرت پیغمبر اسلامؐ اور ان کے ساتھ دیگر ایمان لانے والے حضرات کو حاصل ہوگی کیونکہ وہی سب اس اسلام پر ہیں جس پر خداوند عالم نے ابراہیمؑ کو برگزیدہ فرمایا، اسی طرح وہ لوگ بھی آنجنابؑ سے اولیٰ واقرب ہوں گے جو ان کی پیروی کریں گے نہ کہ وہ لوگ جو آیات الٰہی کا انکار اور حق کو باطل کا روپ دینے کے مرتکب ہوں۔

اور جملہ "لَلَّذِیۡنَ اتَّبَعُوۡهُ" میں کنایۃً واشارۃً اہل کتاب یعنی یہود ونصاریٰ کو مطلع وآگاہ کیا گیا ہے کہ تم ابراہیمؑ کے حقدار اور ان کی نسبت اولویت واقربیت کے حامل نہیں ہو کیونکہ تم نے اسلام اور اللہ تعالیٰ کے حضور تسلیم ہونے میں ان کی پیروی نہیں کی۔

اور جملہ "وَهٰذَا النَّبِیُّ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا" میں حضرت پیغمبر اسلامؐ اور ان کے پیروکار مؤمنین کو حضرت ابراہیمؑ کے پیروکاروں میں سے انفرادیت کے ساتھ ذکر کرنے کی اصل وجہ آنحضرتؐ کی تجلیل وتکریم کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ آپؐ کے لئے "پیروکار" ہونے کا لفظ استعمال نہ ہو کیونکہ آپؐ کا عظیم رتبہ وبلند مقام اس کا متقاضی ہے کہ اس طرح کے الفاظ کا اطلاق آپؐ پر نہ ہو، جیسا کہ اسی مطلب کا اشارہ درج ذیل آیت مبارکہ میں بھی پایا جاتا ہے:

سورۂ انعام، آیت :۹۰

○ "اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ"

(یہی وہ لوگ ہیں جنہیں خدا نے ہدایت کی، تو آپ ان کی ہدایت کی اقتداء کریں)

اس میں " فبھم اقتدہ " (ان کی اقتداء کریں) کی بجائے " فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ " (ان کی ہدایت کی اقتداء کریں) کہا گیا ہے کیونکہ یہ جملہ " فبھم اقتدہ " میں افراد و اشخاص کی اقتداء جبکہ دوسرے جملہ " فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ " میں اصل ہدایت الٰہی کی اقتداء و مطلوب مذکور ہے۔

اس آیت میں موضوع کی تکمیل اور مطالب کی تعلیل کا بیان اس جملہ پر تمام ہوتا ہے: " وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ " (اور اللہ مؤمنین کا ولی و حاکم ہے) کیونکہ ابراہیمؑ کی ولایت (یعنی ان کا ولی اللہ ہونا) کا سرچشمہ خدا کی ولایت ہے اور خدا ایمان والوں کا ولی و حاکم ہے نہ کہ ان کے علاوہ ان لوگوں کا جو خدا کی آیات کا انکار کرتے ہیں اور حق کو باطل کے روپ میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اہل کتاب کی ناحق خواہش و کوشش

○ " وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ"

(اہل کتاب کے ایک گروہ کی خواہش ہے کہ وہ تمہیں گمراہ کر دیں، جبکہ وہ کسی کو گمراہ نہیں کرتے سوائے اپنے آپ کے، اور وہ اس کا شعور نہیں رکھتے)

عربی زبان میں لفظ "طَّآئِفَةٌ" کا معنی گروہ، چند لوگ ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ لوگ بالخصوص عرب اس زمانہ میں گروہ گروہ اور قبیلہ قبیلہ ہو کر بدوی و صحرائی طرز زندگی اپنائے ہوئے تھے، اور آب و دانہ کی تلاش میں اپنے مویشیوں کے ہمراہ گرمیوں اور سردیوں میں مختلف مقامات کو جایا کرتے تھے اور وہ ڈاکوؤں اور دشمنوں سے بچنے کے لئے گروہ گروہ بن کر چکر کاٹتے رہتے تھے لہٰذا اس حوالہ سے ہر گروہ کو " طَّآئِفَةٌ " کہا جانے لگا، پھر رفتہ رفتہ یہ لفظ اپنے صفتی معنی سے قطع نظر دلالتی معنی پر استعمال ہوتے ہوئے "گروہ" کے لئے استعمال کیا جانے لگا۔

اس آیت مبارکہ میں اہل کتاب کے بارے میں ارشاد رب العزت ہے کہ وہ اپنے علاوہ کسی کو گمراہ نہیں کرتے

(يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ) تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی فضیلتوں کی پہلی کڑی حق کی طرف میلان اور اس کا اتباع و پیروی کرنا ہے، بنابرایں لوگوں کو حق سے پھیر کر باطل کی طرف لانے کی خواہش و چاہت چونکہ انسان کے باطنی اطوار و اندرونی صفاتی کیفیات میں سے ہے لہٰذا وہ ایک نفسانی رذیلت و پست صفت ہے (جو کہ نہایت پست صفت ہے اور اس سے زیادہ پست صفت اور کیا ہو سکتی ہے) اور نفسانی گناہوں و معصیتوں اور ناحق بغاوتوں و پلید چاہتوں میں سے ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ حق کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ گمراہی کے سوا کچھ نہیں، لہٰذا اہل کتاب کا مؤمنین کو جو کہ حق پر ہیں گمراہ کرنے کی خواہش کرنا اور انہیں حق سے منحرف کر دینے کی چاہت بعینہٖ اپنے آپ کو گمراہ کرنے کی خواہش اور حق سے منحرف و روگرداں ہونے کی چاہت ہے البتہ وہ خود اس کا شعور نہیں رکھتے۔

اور اسی طرح اگر وہ کسی کے دل میں شبہ ڈال کر اسے گمراہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو دراصل انہوں نے سب سے پہلے اپنے آپ کو گمراہ کیا کیونکہ انسان جو بھی عمل انجام دے خواہ خیر ہو یا شر، وہ خود اپنے ہی لئے انجام دیتا ہے یعنی اس کا نفع و نقصان خود اسے ہی ہوتا ہے، چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:

سورۂ حٰم سجدہ، آیت: ۴۶

O " مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ۭ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝ "

(جو شخص نیک عمل انجام دے وہ اس کے اپنے لئے فائدہ مند ہے اور جو شخص برا عمل کرے تو اس کا نقصان خود اسے ہی ہوگا، اور تیرا پروردگار بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں)

اگر کوئی شخص اہل کتاب کو گمراہ کرنے کی وجہ سے گمراہ ہوا تو وہ ان کے گمراہ کرنے کے نتیجہ میں نہیں ہوا بلکہ اپنے برے عمل اور پست و پلید ارادہ کے نتیجہ میں ہوا جو کہ خداوند عالم کے مقررہ اصولوں کے عین مطابق ہے (یعنی خدا نے یہ اصول مقرر کیا ہے کہ جو شخص بری نیت و برے عمل کا مرتکب ہوگا وہ حق سے دور ہو جائے گا اور باطل کی پستی و پلیدی اس کے دامن گیر ہو جائے گی۔م) چنانچہ خدا کا ارشاد ہے:

سورۂ روم، آیت: ۴۴

O " مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ ۚ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِاَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُوْنَ ۝ "

(جو شخص کفر اختیار کرے تو اس کا کفر اس کے لئے نقصان دہ ثابت ہوگا اور جو شخص نیک عمل انجام دے تو اس طرح کے لوگ اپنے لئے توشۂ آخرت جمع کرتے ہیں)

سورۂ شوریٰ، آیت :۳۱

○ " وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ۞ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ "

(جو مصیبت تم پر آئے وہ تمہارے ان اعمال کی وجہ سے ہوتی ہے جو تم نے خود اپنے ہاتھوں انجام دیئے، خدا تو تمہارے کثیر گناہوں سے درگزر کرتا ہے، اور تم اپنی ان نافرمانیوں کی وجہ سے کہ روئے زمین پر جن کا ارتکاب کرتے ہو خدا کو عاجز و ناتواں نہیں کر سکتے اور خدا کے علاوہ کوئی بھی تمہارا ولی و مددگار نہیں)

اعمال کی خصوصیات و آثار کے بارے میں سورۂ بقرہ کی آیت ۲۱۷ "حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ" کی تفسیر میں بعض مطالب بیان کئے جا چکے ہیں۔

بہرحال جملہ "وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ" کی تفسیری بحث میں جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے وہ ان قرآنی معارف کا حصہ ہے جو افعالی توحید کے معنی و مفہوم سے حاصل ہوتے ہیں اور یہ بات واضح ہے کہ افعالی توحید خداوند عالم کی علی الاطلاق ربوبیت و مالکیت کی فرع اور اس کی وسیع و جامع حقیقت کا مربوط حصہ ہے۔

بنابرایں زیر بحث آیت مبارکہ سے جو انحصاری معنی ظاہر ہوتا ہے اس کی توجیہ و تاویل ممکن و آسان ہو جاتی ہے، اور دیگر مفسرین کرام نے اس آیت مبارکہ کے معنی کی بابت جو توجیہات ذکر کی ہیں وہ مذکورہ انحصاری معنی کی وضاحت کی بابت کافی نہیں اور نہ ہی ان سے موضوع کی مربوطہ جہات کے آشکار ہونے میں مدد ملتی ہے، لہٰذا ہم نے ان کو یہاں ذکر کرنے سے اجتناب برتا ہے۔

اہل کتاب کو تنبیہ

○ " يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ "

(اے اہل کتاب تم خدا کی نشانیوں کا انکار کیوں کرتے ہو حالانکہ تم گواہ ہو)

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اللہ کی آیات کا انکار، خود اللہ کے انکار سے مختلف ہے کیونکہ خدا کا انکار کرنے سے مراد صریح طور پر عقیدہ رکھنا ہے کہ خدائے یکتا کا کوئی وجود ہی نہیں جیسا کہ وثنیوں (بت پرستوں) اور دہریوں کا عقیدہ ہے اور آیات الٰہی کا انکار کرنے سے مراد یہ ہے کہ حق کے واضح و آشکار ہونے اور حقیقت الامر سے آگاہی حاصل کرنے کے بعد معارف الٰہیہ

میں سے کسی ایک کو قبول کرنے سے انکار کیا جائے، تو جہاں تک اہل کتاب کا تعلق ہے تو وہ عالم ہستی میں خدائے یکتا کے وجود کا انکار نہیں کرتے بلکہ وہ ان امور و حقائق کا انکار کرتے ہیں جن کا واضح ثبوت ان پر اور ان کے علاوہ دیگر اقوام پر نازل ہونے والی آسمانی کتب میں موجود ہے مثلاً حضرت پیغمبر اسلام محمد مصطفیٰ ؐ کی نبوت، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بندۂ خدا اور خدا کی طرف سے رسول ہونا، حضرت ابراہیمؑ کا یہودی و نصرانی نہ ہونا، خدا کے ہاتھ کا ہمیشہ کھلا ہونا (قدرت خداوندی کی وسعت) اور خداوند عالم کا غنی و بے نیاز ہونا وغیرہ، تو قرآن کی زبان میں اہل کتاب کو "آیات الٰہی کا انکار کرنے والے" کہا گیا ہے نہ کہ خدا کا انکار کرنے والے ! اور اس سے اس آیت کی نفی نہیں ہوتی جس میں خدا نے ارشاد فرمایا:

سورۂ توبہ، آیت :۲۹

" قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ "

(اہل کتاب میں سے ان لوگوں سے قتال کرو جو خدا اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں لاتے اور نہ اللہ اور اس کے رسول کے حرام کئے گئے کاموں (یا چیزوں) کو حرام قرار دیتے ہیں اور نہ ہی دین حق کو قبول کرتے ہیں)

اس آیت میں ان سے صریح الفاظ میں ایمان کی نفی کی گئی ہے کہ جسے "کفر" کہا جاتا ہے لیکن اس سے مراد خدا کا انکار نہیں بلکہ آیات خدا کا انکار ہے کیونکہ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ خدا کے حرام کردہ کو حرام قرار نہیں دیتے اور دین حق کو دین نہیں مانتے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انہیں غیر مؤمن کہنے سے مراد ان کے لازم الحال کو ظاہر کرنا ہے کیونکہ ان کی طرف سے آیات الٰہی کے انکار کا لازم الحال، اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان نہ لانا ہے، اگر وہ خود اس کا شعور نہیں رکھتے اور انہیں اس کی سمجھ ہی نہیں ہے، یعنی وہ خود بھی اس امر کا ادراک نہیں رکھتے کہ اس طرح وہ خدا کا انکار کرتے ہیں بلکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں، لیکن ظاہر بظاہر وہ آیات الٰہی کا انکار کرتے ہیں اور صریح الفاظ میں خدا کا انکار نہیں کرتے۔

اور جملہ "وانتم تشھدون" میں شہادت یعنی گواہی کا ذکر ہوا ہے جس کا معنی حضور اور وہ علم ہے جس کا سرچشمہ "حس" ہو، اس سے صاف ظاہر بلکہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کے آیاتِ خداوندی کا انکار کرنے سے مراد حضرت خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کا انکار کرنا ہے جبکہ تورات و انجیل میں آنحضرتؐ کی آمد کی بشارت موجود ہے اور جو نشانیاں ان کتابوں میں آنحضرتؐ کے بارے میں ذکر کی گئی ہیں وہ سب آپؐ پر منطبق ہوتی ہیں۔

اس بیان سے بعض مفسرین کا یہ کہنا بھی نادرست ثابت ہو گیا کہ یہاں لفظ "آیات" عمومیت رکھتا ہے اور اس سے تمام آیات مراد ہیں لہٰذا اسے آیات نبوت سے مخصوص و مختص کرنا درست نہیں بلکہ ان کے کفر سے مراد تمام آیات کا انکار کرنا ہے"۔ اس قول کی نادرستی واضح و ظاہر ہے۔

ایک بار پھر اہل کتاب کی سرزنش

○ "یَآ اَھْلَ الْکِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ......"
(اے اہل کتاب تم حق کو باطل کے روپ میں کیوں پیش کرتے ہو......)

" تَلْبِسُوْنَ " فعل مضارع، کا مصدر "لَبس" (لام پر زبر کے ساتھ) ہے جس کا معنی غلط فہمی پیدا کرنا، دل میں شبہ ڈالنا اور حق کو باطل یا باطل کو حق کی صورت میں پیش کرنا ہے، تو اس کا معنی یہ ہوگا کہ اے اہل کتاب، تم حق کو باطل کی شکل میں کیوں پیش کرتے ہو ؟

اور جملہ "وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ " میں اس بات کا ثبوت یا اشارہ پایا جاتا ہے کہ " لبس "سے مراد دینی معارف و حقائق پر پردہ ڈالنا ہے اس سے مراد ان آیات کو چھپانا نہیں جو مشاہدہ میں آتی ہیں مثلاً وہ آیات کہ جن کی انہوں نے خود ہی تحریف کی یا ان کا کتمان کیا یا ان کے غیر مرادی معانی سے ان کی تفسیر کی۔

یہ دو آیتیں یعنی "یَآ اَھْلَ الْکِتٰبِ لِمَ تَکْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَاَنْتُمْ تَشْھَدُوْنَ ۝ یَآ اَھْلَ الْکِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَکْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ "دراصل آیت مبارکہ "وَدَّتْ طَّآئِفَۃٌ مِّنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ لَوْ یُضِلُّوْنَکُمْ ط وَمَا یُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ وَمَا یَشْعُرُوْنَ "کا تتمہ ہے۔

بنابرایں اہل کتاب کے بعض افراد کی غلط کاریوں کی بناء پر تمام اہل کتاب کو موردِ عتاب و سرزنش قرار دینا اس حوالہ سے ہے کہ وہ سب طبیعت و نسل و صفات میں ایک جیسے ہیں اور وہ ایک دوسرے کے برے اعمال سے راضی ہوتے ہیں، چنانچہ اس طرح کی نسبتیں قرآن مجید میں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔

اہل کتاب کے ایک گروہ کا بیان

○ " وَقَالَتْ طَّآئِفَۃٌ مِّنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِیْٓ......"
(اور اہل کتاب کے ایک گروہ نے کہا کہ تم ایمان لاؤ اس پر جو......)

آیت مبارکہ میں لفظ "وَجْہَ النَّھَارِ" (دن کا چہرہ) ذکر ہوا ہے اور اس کے مقابلے میں "" اٰخِرَہٗ " کے الفاظ

استعمال ہوئے ہیں جس سے اس امر کا اشارہ ملتا ہے کہ "وَجْهَ النَّهَارِ" سے مراد دن کی ابتدائی گھڑیاں ہیں کیونکہ کسی چیز کا "وَجْهَ" یعنی چہرہ ہی وہ پہلی چیز ہے جو دیکھنے والے کے سامنے اس چیز کا تشخص وتعین یقینی بناتا ہے، اس بناء پر دن کا چہرہ دراصل اس کی وہ ابتدائی گھڑیاں ہیں جن سے اس کا آغاز ہوتا ہے اور وہ اس کا تعین کرتی ہیں، اہل کتاب کے سیاق کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ پر دن کی ابتدائی گھڑیوں میں جو وحی آتی تھی وہ ان کے عقیدہ سے مطابقت رکھتی تھی اور دن کے آخری لحات میں جو وحی نازل ہوتی تھی وہ ان کے عقیدہ کے مخالف ہوتی تھی، اسی وجہ سے وہ کہتے تھے کہ جو وحی دن کی ابتداء میں نازل ہو اس پر ایمان لاؤ اور جو دن کے آخری لحوں میں نازل ہو اس کا انکار کرو۔

بنا برایں جملہ "بِالَّذِيٓ أُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا" سے مراد وحی کا وہ خاص حصہ ہے جو اہل کتاب کے عقائد سے مطابقت رکھتا تھا، اور جملہ "وَجْهَ النَّهَارِ" ظرف (ظرف زمان) ہونے کی بناء پر منصوب ہے اور اس کا تعلق جملہ "انزل" سے ہے نہ کہ جملہ "اٰمَنُوْا" (صیغۂ امر) سے! کیونکہ وہ اس سے زیادہ قریب ہے (اور ادبی اصولوں کی روشنی میں جملوں کے ارتباطی حوالہ کا تعین قرب کی بناء پر ہوتا ہے)۔ اس بناء پر آیت کا معنی یہ ہوگا: "تم ایمان لاؤ اس پر جو دن کی ابتدائی گھڑیوں میں نازل ہو (اٰمِنُوْا بِالَّذِيٓ أُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ) اور جملہ "وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ" کا معنی یہ ہوگا کہ جو کچھ دن کے آخری لحات میں نازل ہو اس کا انکار کردو (واکفروا بما انزل فی 'اخرہ)" "دن کے آخری لحوں میں" ایسا ظرف ہے جو مجاز عقلی کی بناء پر اپنے مظروف کی جگہ پر آیا ہے...... اس کی بابت عقلی قرینہ موجود ہے......، چنانچہ اس کی مثال درج ذیل آیت مبارکہ ہے:

سورۂ سبأ، آیت: ۳۳

○ "بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ"

(بلکہ شب وروز نے چال چلی)

اس میں چال چلنے کی نسبت بظاہر لیل ونہار کی طرف دی گئی ہے جبکہ حقیقت میں یہ ظرف زمان ہے یعنی دن اور رات میں چال چلی گئی نہ کہ خود دن اور رات نے چال چلی ہو۔

اس بیان کی تصدیق وتائید ان روایات سے ہوتی ہے جو آیات کے شانِ نزول کی بابت آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی طرف سے وارد ہوئی ہیں، ان روایات میں مذکور ہے کہ اہل کتاب نے یہ بات اس وقت کہی جب قبلہ کی تبدیلی کا حکم نازل ہوا، آنحضرتؐ نے صبح کی نماز بیت المقدس کی طرف منہ کر کے پڑھی جو کہ یہودیوں کا قبلہ تھا، پھر جب قبلہ کی تبدیلی کا حکم آیا تو آپؐ نے ظہر کی نماز کعبہ کی طرف رخ کر کے ادا کی، اس وقت یہودیوں میں سے کچھ لوگوں نے کہا کہ "اٰمِنُوْا بِالَّذِيٓ أُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ" جو کچھ ایمان لانے والوں پر صبح کے وقت نازل ہوا اس پر ایمان لے آؤ، اس

بیان سے ان کا مقصد بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا تھا ، "وَاکۡفُرُوۡۤا اٰخِرَہٗ" (اور جو دن کے آخر میں نازل ہوا اس کا انکار کردو) اس سے مراد کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا تھا۔

اس مطلب کی تائید ان کے بعد آنے والے بیان سے بھی ہوتی ہے جس میں انہوں نے کہا: "وَلَا تُؤۡمِنُوۡۤا اِلَّا لِمَنۡ تَبِعَ دِیۡنَکُمۡ" اور تم صرف اس کی بات پر ایمان لاؤ جو تمہارے دین کا پیروکار ہو۔ یعنی جو تمہارے دین کی پیروی نہیں کرتا اس پر اعتماد و بھروسہ کر کے اس پر ایمان نہ لاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اسرار اس پر عیاں ہو جائیں اور وہ بشارتیں و خوشخبریاں جو تمہارے پاس ہیں وہ آشکار ہوں اور ان بشارتوں میں نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت کی نشانیوں میں سے ایک یہ ذکر کی گئی ہے کہ قبلہ تبدیل ہو جائے گا اور کعبہ کو قبلہ قرار دیا جائے گا۔

وجہ النہار کے بارے میں بعض مفسرین کی رائے

لفظ "وَجۡهَ النَّهَارِ" کے بارے میں بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ اس کا تعلق صیغہء امر "اٰمِنُوۡا" سے ہے اور اس سے مراد ابتدائے روز ہے، اور لفظ "اٰخِرَہٗ" میں حرف "فِي" محذوف ہے اور اس کا تعلق "وَاکۡفُرُوۡۤا" سے ہے یعنی "وَاکۡفُرُوۡۤا فِي اٰخِرَہٗ"، اور "اٰمِنُوۡا بِالَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ......" سے مراد یہ ہے کہ دن کی ابتداء میں کچھ لوگ قرآن پر ایمان لے آئیں اور ایمان لانے والوں کے ساتھ مل جائیں، پھر دن کے آخری لمحوں میں مرتد ہو جائیں یعنی اس کا انکار کر دیں اور یہ کہیں کہ وہ دن کی ابتداء میں جب ایمان لائے تھے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ انہیں دعوتِ اسلام کی صحت و صداقت کی نشانی دکھائی دے رہی تھی لیکن دن کے آخر میں اس لئے انکار کیا کہ ان پر واضح ہو گیا کہ وہ غلط و نادرست تھا اور نبوت کی جو نشانیاں اور حقانیت کی جو بشارتیں ان کے پاس تھیں وہ نبیؐ پر منطبق نہیں ہوئیں، تو یہ وہ چال تھی جو اہل کتاب نے چلی اور اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ اس طرح مؤمنین اپنے دین کے بارے میں شک کا شکار ہو جائیں گے اور ان کے پختہ ارادے کمزور پڑ جائیں گے جس کے نتیجہ میں ان کی قوت ختم ہو جائے گی اور ان کا مشن ناکام ہو جائے گا۔

یہ رائے فی نفسہ بعید از قیاس نہیں اور عین ممکن ہے کہ یہودیوں نے اس طرح کی چال چلی ہو کیونکہ تاریخ شاہد ہے کہ انہوں نے اسلام کے خلاف سازشیں کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی، بلکہ ہر ممکن طریقہ و حیلہ سے شمع اسلام کو گل کرنے کی کوشش کی لیکن مسئلہ یہ ہے کہ آیت مبارکہ کے الفاظ سے اس کا ثبوت نہیں ملتا۔...... آیت کے الفاظ یہودیوں کی ممکنہ مذکورہ سازش کے وقوعی پہلو سے مطابقت نہیں رکھتے......، بہر حال اس بحث کا تتمہ عنقریب "روایات پر ایک نظر" کے عنوان میں پیش کیا جائے گا، انشاء اللہ تعالیٰ،

دو قول اور ان کی تحقیق

(۱) بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ان کے بیان سے مراد یہ ہے کہ کعبہ کی طرف نماز پڑھنے کے حکم پر دن کی ابتداء میں ایمان لاؤ اور دن کے آخر میں اس کا انکار کردو تاکہ وہ یعنی مؤمنین بھی اسلام سے روگردانی کرلیں،

(۲) بعض حضرات کا کہنا ہے کہ ان کے بیان کا معنی یہ ہے کہ تم نے چونکہ پہلے آخری نبیؐ کی صفات کے حوالہ سے ان پر ایمان لانے کا اقرار کیا تھا لہٰذا اب اسی کی بناء پر دن کی ابتداء میں اس پر ایمان لے آؤ اور دن کے آخر میں یہ کہہ کر اس کا انکار کردو کہ نبی آخر الزماں کے بارے میں جو صفات ہماری کتب میں مذکور ہیں وہ اس نبی (محمدؐ) پر منطبق نہیں ہوتیں، اس طرح ممکن ہے کہ اس پر ایمان لانے والے شک میں مبتلا ہو جائیں اور پھر اپنے دین سے منہ پھیر لیں۔

یہ دو قول آیت کے معنی کی بابت ذکر کیے گئے ہیں لیکن اس حوالہ سے تحقیقی بیان یہ ہے کہ آیت کے ظاہری الفاظ سے ان میں سے کسی کی صحت کی گواہی نہیں ملتی۔

بہرحال اہل کتاب کے بیان سے مراد جو کچھ بھی ہو لیکن آیت میں اجمال نہیں پایا جاتا۔

اہل کتاب کا تاکیدی و توضیحی بیان

○ " وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ"

(اور کسی پر ایمان نہ لاؤ سوائے اس کے کہ جو تمہارے دین کی پیروی کرے......)

سیاقِ کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ جملہ "وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ" اہل کتاب ہی کا بیان ہے جو کہ ان کے اس بیان کا تتمہ ہے: " اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ "، اور اس کا تعلق ان کے اس بیان سے بھی ہے: " اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَاۗجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ "، جبکہ اس کے بعد والا جملہ " قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ " جو کہ جملہ معترضہ ہے وہ خداوند عالم کی طرف سے ان کے تمام بیانات "اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا" سے "لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ" تک کا جواب ہے، اس طرح جملہ "قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ" خدا کی طرف سے ان کے اس بیان کا جواب ہے "اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ......"

تو یہ سب کچھ درحقیقت کلام کے اجزاء کی ترکیب وترتیب کے باہمی ارتباط اور دونوں آیتوں کے معانی کی ہم رنگی و یک رنگی اور اس کے ساتھ ساتھ ان دو آیتوں کے تناظر میں ان آیات پر نگاہ کرنے سے مستفاد ہے جن میں یہودیوں کے جدالی افکار اور سازشی مزاج کے عکاس اقوال ذکر کیے گئے ہیں۔

بہرحال آیت مبارکہ کا معنی ...... واللہ اعلم ...... یہ ہے کہ اہل کتاب کا ایک گروہ ...... یعنی یہودیوں نے کہا۔ یعنی ایک دوسرے سے کہا: "تم نبی اور ان پر ایمان لانے والوں کی تصدیق کرو لیکن صرف ان کی ابتدائے روز میں بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کی بابت! اور انہوں نے دن کے آخر میں کعبہ کی طرف رخ کر کے جو نمازیں پڑھیں ان کی بابت ان کی تصدیق نہ کرو اور تم اس سلسلہ میں بات کرنے میں کسی پر بھروسہ واعتبار نہ کرو ورنہ وہ مؤمنوں کو بتا دیں گے کہ جس نبی کے آنے کی بشارت دی گئی تھی اس کی نبوت کے دلائل وشواہد میں سے ایک یہ ہے کہ قبلہ بیت المقدس سے کعبہ کی طرف تبدیل ہو جائے گا (قبلہ کی تبدیلی اس نبی کی صداقت کے شواہد میں سے ایک ہے) اگر تم قبلہ کی تبدیلی اور کعبہ کے قبلہ قرار دیئے جانے کی تصدیق کرو اور نبوت کی صداقت کی ان نشانیوں کو ظاہر وافشاء کر دو جن کا تمہیں علم ہو چکا ہے اور ان نشانیوں میں سے ایک کعبہ کا قبلہ قرار دیا جانا ہے تو اس سے تمہیں یہ نقصان ہوگا کہ جس طرح تمہیں قبلہ عطا کئے جانے کا اعزاز حاصل ہوا ہے اسی طرح مسلمانوں کو بھی اپنا قبلہ مل جائے گا اور وہ بھی اس اعزاز کے حامل ہو جائیں گے جس کے نتیجہ میں تمہاری امتیازی خصوصیت اور قبلہ عطا کئے جانے کے اعزاز کی اہمیت جاتی رہے گی۔ اور دوسرا نقصان یہ ہوگا کہ وہ قیامت کے دن بارگاہ خداوندی میں تم پر حجت قائم کر سکیں گے کہ تم نے نئے قبلہ کے بارے میں سب کچھ جاننے اور اس کی حقیقت کے گواہ ہونے کے باوجود اس پر ایمان لانے سے انکار کیا"۔

خداوند عالم نے ان کی ان باتوں کا ترتیب وار جواب یوں دیا کہ انہوں نے کہا:

"ایمان لاؤ اس پر جو دن کے شروع میں نازل ہوا اور جو دن کے آخر میں نازل ہوا اس کا انکار کر دو اور قبلہ کی تبدیلی کی بات مسلمانوں کو نہ بتاؤ ورنہ وہ حق کی ہدایت پالیں گے"۔ (اٰمِنُوْا بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ)"۔

اس کے جواب میں خداوند عالم نے فرمایا: "مؤمنین جس ہدایت کے محتاج ہیں وہ حق کی ہدایت ہے اور حق کی ہدایت تو وہی ہے جو خدا کی عطا کردہ ہدایت ہے" (قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ) تمہاری ہدایت حق کی ہدایت نہیں اور مؤمنوں کو تمہاری ہدایت کی ہرگز ضرورت نہیں، اب یہ تم پر ہے کہ اسے مانو اور اس کا اتباع وپیروی کرو یا اس کا انکار کرو اور چاہو تو قبلہ کی تبدیلی کا راز آشکار کرو یا اس کا کتمان کرو۔

ان کی دوسری بات یہ تھی کہ "اگر تم قبلہ کی تبدیلی کا راز مسلمانوں کو بتا دو کہ نتیجتاً کعبہ قبلہ قرار پائے تو مسلمان بھی

تمہاری طرح کا اعزاز پالیں گے اور جو امتیازی خصوصیت تمہیں حاصل ہے وہ انہیں حاصل ہو جائے گی " (اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ "،

اس کا جواب خداوند عالم نے اس طرح دیا: " فضیلتیں خدا کے ہاتھ میں ہیں وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے" (اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ) یعنی یہ فضیلت و اعزاز تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے کہ تم چاہو تو اسے اپنے ساتھ مخصوص و مختص سمجھو اور اپنے علاوہ دوسروں کو اس سے محروم قرار دو۔

ان کی تیسری بات یہ تھی کہ " کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اس کی بناء پر تمہارے پروردگار کے پاس تمہارے خلاف حجت قائم کر سکیں" (اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ) " یعنی وہ خدا کو بتا دیں کہ قبلہ کی تبدیلی کے بارے میں انہیں معلوم تھا تو پھر تم انکار نہ کر سکو گے اور یہ نہ کہہ سکو گے کہ ہم نے تبدیلیٔ قبلہ کی بات اپنی کتاب میں نہ دیکھی تھی"،

ان کی یہ بات اس قدر واضح البطلان تھی کہ خداوند عالم نے اسے جواب کے قابل ہی نہ سمجھا جیسا کہ خدا نے ایک اور مقام پر بھی اسی طرح کیا اور ایک لطیف اشارہ کے ساتھ مطلب بیان کر دیا، ملاحظہ ہو:

سورۂ بقرہ، آیت: ۷۷

○ " وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ "

(اور وہ جب ایمان لانے والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم بھی ایمان لائے ہیں اور جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ کیا تم انہیں وہ راز بتاتے ہو جو خدا نے تم پر آشکار کیا ہے تاکہ وہ تمہارے پروردگار کے پاس تمہارے خلاف دلیل پیش کر سکیں کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے، آیا وہ جانتے نہیں کہ اللہ ہر ایک چیز کو جانتا ہے جسے وہ چھپاتے ہیں اور جسے وہ ظاہر کرتے ہیں۔)

اس آیت میں جملہ "اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ" ان کی بات کا جواب نہیں کیونکہ اس میں حرف "واؤ" عطف کے لئے ہے جس کی بازگشت ان کے جملہ "اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ" کی طرف ہے، اگر یہ جملہ (اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ) ان کی بات کا جواب ہوتا تو اس میں حرف عطف لانے کی ضرورت ہی نہ تھی بلکہ یوں کہا جاتا "الا يعلمون"، بہرحال یہ جملہ "اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ" اس مطلب کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ان کی بات غیر معقول ہے کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ خداوند عالم کے نزدیک پوشیدہ و ظاہر یکساں ہیں۔

بنابرایں جملہ "وَلَا تُؤْمِنُوْٓا" کا معنی یہ ہوگا کہ ان پر اعتماد و بھروسہ نہ کریں اور ان کی بات کو درست قرار دے کر

اس کی تصدیق نہ کریں بلکہ راز کو راز ہی رہنے دیں ، لہٰذا جملہ "وَلَا تُؤْمِنُوٓا" سورۂ برائت کی آیت ۶۱ کے جملہ "وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِينَ" کی طرح ہے کیونکہ اس میں بھی ایمان کا معنی اعتماد و بھروسہ کرنا ہے۔

اور جملہ "لِمَنْ تَبِعَ" سے مراد یہودی ہیں (یعنی تم یہودی صرف یہودیوں پر بھروسہ کرو)

زیر بحث پورے جملہ سے مراد، تورات میں مذکور قبلہ کی کعبہ کی طرف تبدیلی کی بات کو کسی کے سامنے ظاہر نہ کرنا ہے چنانچہ یہی بات سورۂ بقرہ کی آیت ۱۴۶ میں بھی ذکر ہوئی ہے اور اس کی تفسیر میں مربوطہ مطالب ذکر ہو چکے ہیں، آیت اس طرح ہے:

" فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ --- وَإِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَٰبَ لَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّهِمْ --- الَّذِينَ آتَيْنَٰهُمُ الْكِتَٰبَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَآءَهُمْ ۖ وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ "

(پس تو اپنا رخ مسجد الحرام کی طرف کر لے ۔۔۔ اور جن لوگوں کو کتاب دی وہ بخوبی جانتے ہیں کہ وہ ان کے رب کی طرف سے حق ہے ۔۔۔ وہ لوگ جنہیں ہم نے کتاب دی وہ اسے (رسول کو) اسی طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں، اور ان میں سے ایک گروہ جان بوجھ کر حق پر پردہ ڈالتا ہے)

زیر بحث آیت کے معنی کے تعین میں مفسرین کی طرف سے مختلف اقوال عام طور پر پیش کئے جاتے ہیں مثلاً:

(۱) جملہ "وَلَا تُؤْمِنُوٓا" اور جملہ "مَآ أُوتِيتُمْ أَوْ يُحَآجُّوكُمْ عِندَ رَبِّكُمْ" میں جمع کے صیغہ کا مخاطب مؤمنین ہیں، اور دونوں موارد میں مفرد کے صیغہ "قل" کا مخاطب حضرت پیغمبر اسلامؐ ہیں۔

(۲) جملہ "وَلَا تُؤْمِنُوٓا إِلَّا لِمَن تَبِعَ دِينَكُمْ" یہودیوں کا بیان ہے اور جملہ "قُلْ إِنَّ الْهُدَىٰ هُدَى اللَّهِ ۙ أَن يُؤْتَىٰٓ أَحَدٌ ....." خداوند عالم کا کلام ہے جو یہودیوں کے بیان کے جواب میں ہے۔

اس اختلاف کی طرح مفسرین کرام کے درمیان " إِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللَّهِ " میں " فضل" کے معنی کی بابت بھی اختلاف رائے پایا جاتا ہے چنانچہ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اس سے مراد "دین" ہے، بعض کہتے ہیں اس سے مراد دنیاوی نعمتیں ہیں اور بعض کا قول ہے کہ اس سے مراد غلبہ ہے اور دیگر حضرات نے دیگر آراء پیش کی ہیں۔

بہر حال یہ اقوال اپنی کثرت کے باوجود سیاقِ آیت سے مطابقت کے حامل دکھائی نہیں دیتے جیسا کہ ہم اس حوالہ سے اشارہ کر چکے ہیں لہٰذا اس سلسلہ میں ہم مزید بحث کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔

سب کچھ خدا کے ہاتھ میں ہے

O " قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ "
(کہہ دو کہ فضل، خدا کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور اللہ وسعت دینے والا، آگاہ ہے)

لفظ "فضل" کسی چیز کی درمیان حد سے "زائد" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اسے پسندیدہ چیز کے بارے میں استعمال کیا جاتا ہے جیسا کہ لفظ "فضول" مذموم و ناپسندیدہ چیز کے لئے استعمال ہوتا ہے، مشہور لغت دان راغب اصفہانی نے لکھا ہے کہ جس عطیہ کا دینا ضروری و لازمی نہ ہو اسے "فضل" کہا جاتا ہے جیسا کہ خدا نے ارشاد فرمایا: "واسألوا اللّٰہ من فضلہ"، "ذٰلک فضل اللّٰہ"، "ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ"، (ان تین آیتوں میں "فضل" سے مراد مادی نعمت ہائے خداوندی ہے)۔

بنا برایں آیت "قل بفضل اللّٰہ"، "ولولا فضل اللہ" میں بھی جو کہ بظاہر معنوی و روحانی امور و نعمات سے تعلق رکھتی ہیں لیکن مادی و معنوی دونوں قسموں کی نعمات کا "فضل" ہونا اس بناء پر ہے کہ خداوند عالم بندوں کے استحقاق سے زائد انہیں عطا فرماتا ہے۔

مذکورہ بالا بیان کی روشنی میں جملہ " اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ" ایجاز اور مختصر گوئی کے باب سے ہے اور وہ اس طرح کہ گویا اس میں ایک قیاسی و منطقی برہان کے کبریٰ یعنی بنیادی امر کے بیان پر اکتفاء کی گئی ہے اور وہ یوں ہے کہ اس آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ ان سے کہہ دو کہ کتاب کا نازل ہونا اور عطیۂ خداوندی کا عطا کیا جانا کہ جسے تم اپنے ساتھ مخصوص و مختص قرار دے کر ایمان والوں پر اپنی برتری جتاتے ہو اور ایک دوسرے کو رسول ؐ کی آمد اور تبدیلی قبلہ کی بشارتوں کو چھپانے کی تاکید کرتے ہو یہ ایسی چیزیں نہیں کہ جن کی ذمہ داری خدا پر عائد ہوتی ہو بلکہ یہ تو خدا کی عنایت و فضل ہے اور ہر طرح کا فضل خدا کے ہاتھ میں ہے کہ مالکیت و حاکمیت اسی کے ساتھ مخصوص ہے لہٰذا اسے اختیار حاصل ہے کہ جسے چاہے اپنا فضل عطا کرے کہ اللہ وسعت والا، بہت جاننے والا ہے۔

بہر حال آیت میں یہودیوں کے اس بیان اور عملی اظہار کی ہمہ جہت نفی کا پہلو پایا جاتا ہے جس میں وہ خدائی نعمتوں کو اپنے ساتھ مخصوص قرار دیتے ہیں کیونکہ بعض لوگوں کا خدائی نعمتوں سے بہرہ ور ہونا اور بعض کا ان سے محروم ہونا جیسا کہ یہودی، دین اور قبلہ کی نعمت سے بہرہ ور ہوئے اور دوسرے اس سے محروم ہوئے تو اس کی تین احتمالی صورتیں ممکن ہیں یعنی تین وجوہات قابل تصور ہیں:

پہلی یہ کہ اس فیصلہ یعنی فضل ونعمت عطا کرنے میں خدا کے ساتھ کسی دوسرے کی عملداری ودخل ہو جو خدا کی مشیت کے پورا ہونے میں رکاوٹ بن جائے اور خدا کے فضل وعنایت کو کسی ایک جانب محدود کر کے اسے کسی بھی دوسری جانب سے روک لے (جیسا کہ یہودیوں کا عقیدہ ہے)۔

لیکن یہ احتمالی وجہ ہرگز قرین صحت نہیں ہو سکتی کیونکہ فضل، خدا کے ہاتھ میں ہے وہ خود جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے "(اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ)۔

دوسری یہ کہ خدا کا فضل وعنایت کم ونا کافی ہو جبکہ اس سے بہرہ مند ہونے والے زیادہ ہیں جس کی بناء پر ان میں سے بعض کو عطا کرنے اور بعض کو عطا نہ کرنے میں کسی ترجیحی حوالہ کی ضرورت ہو لہٰذا خدا عطیہ پانے والوں کے بارے میں فرضی ترجیحات کا سہارا لے۔

لیکن یہ احتمالی صورت اس لئے درست نہیں کہ خداوند عالم وسیع فضل والا ہے اور اس کی قدرت محدود نہیں۔ (واسع)

تیسری وجہ یہ کہ اگر چہ اس کا فضل وعنایت وسیع ہے اور وہ اس کے اپنے ہی ہاتھ میں ہے لیکن ممکن ہے وہ لوگوں کے بارے میں لاعلمی کی وجہ سے صحیح حقدار کو نہ پہچان سکے اور اس کی جہالت ولاعلمی کی بناء پر دیگر حقدار محروم ہو جائیں۔

لیکن یہ احتمالی وجہ بھی صحیح نہیں کیونکہ خداوند عالم "علیم" ہے کہ جس پر جہل ولاعلمی طاری ہو ہی نہیں سکتی، (علیم)۔

خلاصۂ کلام یہ کہ خداوند عالم کے فضل وعنایت کے اختصاص کی بابت یہودیوں کا ادعاء ہرگز درست نہیں کیونکہ اس سے خداوند عالم کا عجز وجہل ثابت ہوتا ہے جو کہ کسی بھی صورت میں قابل تصور نہیں۔ م

خدا کی رحمت کے اختصاص کا بیان

○ "يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ"
(وہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت سے مختص کرتا ہے، اور اللہ بڑے فضل والا ہے)

اس آیت میں خداوند عالم کے وسیع اختیار وقدرت کو بیان کیا گیا ہے کہ جس کی بناء پر وہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت عطا کرتا ہے بلکہ اپنی رحمت اس سے مختص کرتا ہے کیونکہ فضل وعنایت خدا کے ہاتھ میں ہے، وہ وسعت والا اور آگاہ ہے لہٰذا اسے حق حاصل ہے کہ اپنی نعمت اپنے بعض بندوں کے ساتھ مخصوص کر دے کیونکہ وہ اپنی ملکیت ومملوکہ چیز کے بارے میں تصرف کر سکتا ہے، اور چونکہ وہ اپنے فضل وعنایت میں تصرف کرنے میں کامل اختیار رکھتا ہے اور اس سلسلہ میں کسی بھی طرح

کی ممنوعیت ومحدودیت اس کی بابت قابل تصور نہیں لہٰذا اس کے فضل وعطاء کے موارد کا تعین بھی اس کے ہاتھ میں ہے اور ایسا نہیں کہ اس پر لازم وواجب ہو کہ وہ اپنا ہر فضل ہر شخص کو عطا کرے کیونکہ یہ بھی ممنوع التصرف ہونے کی ایک صورت ہے بلکہ یہ اس کا حق ہے کہ جسے چاہے اپنے فضل وعنایت سے نوازے۔ (وہ اپنی عطا میں مورد اور حقدار کے تعین کا کامل اختیار رکھتا ہے، م)

زیر بحث آیت مبارکہ کا اختتام ان الفاظ میں ہوا: "وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ"، یہ جملہ درحقیقت تمام سابقہ معانی کی تعلیل کے طور پر ہے یعنی ان امور کی علت وسبب اور بنیاد کو واضح کرنے کے لئے ہے کیونکہ علی الاطلاق فضل کی عظمت اس امر کی متقاضی ہے کہ اسے ہی یہ حق حاصل ہو کہ :

(۱) اپنا فضل جسے چاہے عطا کرے۔

(۲) اس کا فضل وسیع ہو کہ اس میں کسی طرح سے کمی نہ ہو۔

(۳) وہ اپنے بندوں کے بارے میں بخوبی آگاہ ہو تا کہ ان کی حالت کے مطابق انہیں فضل سے نوازنے کا تعین کر سکے۔

(۴) اس سب کچھ کے ساتھ ساتھ اسے یہ حق حاصل ہو کہ وہ جسے چاہے اپنے فضل سے نوازے۔

ایک اہم نکتہ

آیت مبارکہ میں " اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ " (فضل، اللہ کے ہاتھ میں ہے) کے بعد "يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ" کہا گیا ہے یعنی "فضل" کی بجائے "رحمت" کا لفظ استعمال کیا گیا جبکہ بظاہر یوں ہونا چاہیے تھا: "یختص بفضلہ من یشاء"، تو اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ "فضل" جو کہ غیر واجب عطیہ ہے وہ "رحمت" کی ایک قسم ہے، چنانچہ "وسیع فضل" کو "وسیع رحمت" سے تعبیر کرتے ہوئے یوں ارشاد ہوا:

سورہ اعراف، آیت ۱۵۶:

"وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ" (میری رحمت ہر چیز پر وسعت رکھتی ہے)

اور "فضل" کے غیر واجب علیہ ہونے کی بابت اس طرح ارشاد ہوا:

"وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا" (اور اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی تو تم میں سے کوئی ایک بھی پاکیزگی نہ پاتا)......سورۂ نور، آیت ۱۵۶......

ہر چیز کی بابت خدا کے کامل اختیار کا ذکر اس طرح ہوا:

سورہء اسریٰ، آیت ۱۰۰ :

" قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآىِٕنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ "

(کہہ دیجئے کہ اگر تم میرے پروردگار کی رحمت کے خزانوں کے مالک ہوتے تو پھر بھی ان کے ختم ہونے کے ڈر سے انفاق (اللہ کی راہ میں خرچ کرنے) سے ہاتھ روکتے)۔

اہل کتاب کے بارے میں!

○ " وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ......"

(اور اہل کتاب میں سے کچھ وہ ہیں کہ اگر آپ انہیں سونے کی بوریوں سے لدے اونٹوں کی قطار بھی دیں تو وہ آپ کو واپس کردیں گے۔۔۔)

اس آیت میں اہل کتاب کے بارے میں عہد و پیمان اور امانتوں کی بابت بیان ہوا ہے کہ ان میں اس حوالہ سے شدید مختلف صورت پائی جاتی ہے اور وہ یوں کہ ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں کہ اگر آپ انہیں سونے کی بوریوں سے لدا اونٹ بھی دیں تو وہ آپ کو واپس کردیں گے اور کچھ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ایک درہم بھی انہیں امانۃً دیں تو وہ واپس نہیں کریں گے، ان کے اس طرح کے فرق اور مختلف عملی صفت کے باوجود جو کہ بعض افراد میں خیانت کی شکل میں ہے اور وہ یقیناً قابل توجہ ہے وہ یہ کہ اگرچہ یہ پست صفت ان کے درمیان اس طرح پھیلی ہوئی ہے کہ پوری قوم کی طرف منسوب ہے لیکن اس کا اصل سبب ان لوگوں کی نظریاتی صفت ہے اور وہ یہ کہ وہ کہتے ہیں: " لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ " کہ امیوں کے بارے میں ہم پر کوئی ذمہ داری نہیں (یعنی ان کی امانتوں کی واپسی ہم پر ضروری نہیں)، وہ لوگ اپنے آپ کو "اہل کتاب" اور اپنے علاوہ دوسروں کو "امّی" کہتے تھے، تو ان کا یہ کہنا کہ ہم پر امیوں کے بارے میں کوئی ذمہ داری یا قانون وضابطہ لاگو نہیں ہوتا، اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی غیر اسرائیلی کو اسرائیلی پر کوئی برتری حاصل نہیں، انہوں نے اس بات کو دینی رنگ دے کر ایک اعتقادی اصول بنالیا چنانچہ اس کا ثبوت بعد والی آیت کے الفاظ سے ملتا ہے جس میں ارشاد ہوا: " وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ بَلٰى...... " (اور وہ خدا پر جھوٹ بولتے ہیں جبکہ انہیں معلوم ہے......)

اس بناء پر یہودیوں کا نظریہ وعقیدہ تھا...... جیسا کہ اس دور میں بھی ہے...... کہ خداوند عالم نے انہیں اپنی خاص عنایات سے نوازا ہے اور جو اعزاز انہیں ملا ہے وہ ان کے علاوہ کسی کو بھی نہیں ملا اور وہ یہ کہ انہی میں نبوت، کتاب اور اقتدار

عطا کیا گیا لہذا انہیں سرداری و برتری اور دوسروں پر امتیاز حاصل ہے۔

اس باطل نظریہ وعقیدہ کی بناء پر انہوں نے اپنے لئے اس طرح نتیجہ اخذ کیا کہ قوانین واحکام اور ضابطوں کا اطلاق خود انہی کے درمیان ہوتا ہے، ان کے اور ان کے علاوہ دوسروں کے درمیان کوئی ضابطہ وقانون نافذ العمل نہیں یعنی سود کی حرمت، دوسروں کے اموال پر قبضہ کرنے کی ممانعت اور لوگوں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنا اور ان جیسے دیگر احکام وقوانین صرف اہل کتاب کے درمیان لازم الاجراء ہیں کہ کسی یہودی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے یہودی کا مال غصب کرلے یا اس کے مال میں خیانت کرے یا اس کی امانت واپس نہ کرے یا سود نہ لے لیکن اگر کسی غیر یہودی سے سود لے یا اس کے مال میں خیانت کرے یا اس کی امانت واپس نہ کرے تو اس کا ایسا کرنا حرام و ناجائز نہ ہوگا کیونکہ غیر یہودی کا یہودی پر کوئی حق نہیں،

خلاصہ یہ کہ اہل کتاب آپس میں ایک دوسرے پر حق رکھتے ہیں اور تمام احکام وقوانین کا اطلاق ان کے درمیان ہی ہوگا اور اہل کتاب کے علاوہ دیگر حضرات کا اہل کتاب پر کوئی قانونی وشرعی حق نہیں لہذا اہل کتاب کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ غیر اہل کتاب کے ساتھ جس طرح چاہیں برتاؤ کریں اور ان کے اموال وحقوق کے بارے میں جو اقدام وفیصلہ کریں انہیں کسی طرح کی باز پرس نہیں ہوسکتی، تو اس طرح کے نظریات ہی اس بات کا باعث بنے کہ یہودی، غیر یہودیوں کے ساتھ زبان بستہ حیوان کی طرح سلوک کریں اور ہر طرح کا امتیازی وغیر انسانی برتاؤ روا جانیں۔

حقیقت الامر یہ ہے کہ اس طرح کا عقیدہ ان کے پاس موجود کتب آسمانی مثلاً تورات وغیرہ میں بھی نہیں پایا جاتا بلکہ اس طرح کے نظریات انہوں نے اپنے علماء کی زبانوں سے سنے اور پھر ان کو اپنا لیا اور اس طرح اپنایا کہ اب ان کی حیثیت دینی اصولوں جیسی ہوگئی، اور وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کو اپنے علاوہ کسی پر لاگو نہیں سمجھتے بلکہ بنی اسرائیل کے علاوہ کسی کو اس میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتے اور اسے اپنی قومی شناخت قرار دیتے ہیں لہذا اس نظریہ وعقیدہ کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اس اعزاز کو اپنے لئے مخصوص سمجھتے ہوئے اس پر عملی طور پر مباہات کرتے رہتے ہیں اور اس حوالہ سے اپنی برتری کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جو شخص اسرائیل سے نسبت رکھتا ہے وہ دوسروں پر علی الاطلاق تقدم و برتری رکھتا ہے، ظاہر ہے کہ جب اس طرح کی باغیانہ سوچ کسی قوم میں پیدا اور راسخ ہوجائے تو انہیں زمین میں فساد پھیلانے اور انسانی اقدار کی پامالی جیسے اعمال کی راہ پر لا کھڑا کرتی ہے کہ جس سے انسانی معاشرہ تباہ و برباد ہوجاتا ہے اور اس غیر انسانی سوچ کے مذموم آثار پھیلتے چلے جاتے ہیں۔

البتہ یہ بات اصولی طور پر درست ہے کہ عمومی حقوق بعض افراد اور گروہوں سے سلب کرلئے جاتے ہیں اور ایسا کرنا انسانی معاشرہ میں ناگزیر ہوتا ہے لیکن یہ اس وقت اور اس صورت میں ہوتا ہے کہ جب صالح انسانی معاشرہ میں کچھ لوگ عمومی حقوق اور معاشرتی اصولوں کو پامال کریں اور عملی طور پر ان کی ہتک و بے حرمتی و بے احترامی کے مرتکب ہوں تو اس صورت میں

انہیں عمومی حقوق سے محروم کر دیا جاتا ہے...... تاکہ قانون کی حکمرانی کو عملی طور پر چیلنج کرنے کی جرأت کسی کو نہ ہو......

اب سوال یہ ہے کہ اس حوالہ سے کیا معیار مقرر ہے جس کی بناء پر کسی کے بارے میں عمومی حقوق کے ثبوت یا نفی کا تعین ہو؟

تو اس سلسلہ میں اسلام نے دو اصول بتائے ہیں: ایک توحید پرستی اور دوسرا اہل ذمہ ہونا (یعنی اسلامی حکومت کے ساتھ معاہدہ کی بنیاد پر معاشرتی قوانین کی پاسداری کا عہد کرنا کہ اس بناء پر اسلامی حکومت ان کی جان و مال و ناموس کی حفاظت کی ذمہ دار ہوتی ہے)، لہٰذا جو شخص توحید پرست یعنی مسلمان نہ ہو اور نہ ہی اہل ذمہ میں سے ہو...... بلکہ اہل دین کے ساتھ نبرد آزما ہو...... اسے معاشرتی حقوق حاصل نہیں ہوں گے بلکہ اسے زندہ رہنے کا بھی حق حاصل نہیں کیونکہ جو شخص دوسروں کو زندگی کے حق سے محروم کرنے کے درپے ہو اور کسی کے لئے زندہ رہنے کے حق کا قائل نہ ہو اسے زندہ رہنے کا کیا حق حاصل ہے؟ اس بناء پر اسلام نے جو معیار مقرر کیا ہے اور عمومی حقوق سے بہرہ مندی کا جو اصول بنایا ہے وہ فطرتِ سلیمہ کے عین مطابق ہے اور انسانی معاشرہ کی بقا کا راز اس کے عملی احترام میں مضمر ہے۔

ان مطالب کے ذکر کے بعد اب ہم اپنے سلسلۂ بحث کی طرف لوٹتے ہیں کہ آیت مبارکہ "وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ" میں دوبارہ "اہل کتاب" کا نام صراحت کے ساتھ لیا گیا ہے جبکہ اس سے پہلے ان کا نام صریحاً ذکر ہو چکا ہے اور اگر یہاں دوبارہ ان کا نام ذکر کرنے کی بجائے ضمیر کے ساتھ اشارہ کر دیا جاتا تو کافی تھا یعنی یوں کہہ دیا جاتا: "وَمِنْهُمْ" (اور ان میں سے)، لیکن اس کی بجائے اصل نام کے ساتھ مطلب کو بیان کیا گیا تو بظاہر اس کی وجہ یہ ہے کہ ظاہر کی جگہ ضمیر لا کر ایک ممکنہ غلط فہمی کا راستہ روکا گیا ہے کیونکہ عین ممکن تھا کہ کوئی یہ سمجھتا کہ یہاں "مِنْهُمْ" سے وہ بعض افراد مراد ہیں جن کا ذکر سابقہ دو آیتوں میں ہوا ہے کہ جنہوں نے کہا: "اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ" کہ جو کچھ دن کی ابتداء میں نازل ہوا اس پر ایمان لے آؤ اور جو دن کے آخر میں نازل ہوا اس کا انکار کرو، جبکہ وہ لوگ مقصود نہیں تھے لہٰذا دوبارہ ضمیر کی بجائے ان کا نام لے کر مطلب کو بیان کیا گیا، اور جب اس طرح کی غلط فہمی کا موقع گزر گیا تو بعد والی آیت میں ضمیر کے ساتھ ان کی طرف اشارہ ہوا اور یوں ارشاد ہوا: "وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ" (اور ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو کتاب پڑھتے ہوئے اپنی زبانوں کو گھماتے ہیں......)

اس مقام پر ایک قابل توجہ مطلب یہ بھی ہے کہ آیت مبارکہ میں ان کا اہل کتاب ہونا ان کے وصف کے طور پر ذکر ہوا ہے اور جب کسی کے بارے میں اظہار خیال یا بیان مطلب میں اس کے وصف کو ذکر کیا جائے تو اس کے اس مطلب کے سبب و وجہ کا اظہار بھی مقصود ہوتا ہے، یہاں اہل کتاب کے بعض اعمال کے بیان میں ان کا نام دراصل ان کے وصف کے طور پر مذکور ہے لہٰذا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے اعمال کی وجہ کا بیان و اظہار بھی مقصود ہے، یعنی جملہ "وَمِنْ اَهْلِ

الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ" کے تسلسل میں ان کی یہ بات کہ "لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ" اوران کا لوگوں کے اموال پر ناجائز قبضہ وغصب اس لئے تعجب وحیرت کا باعث نہ ہوتا کہ وہ امی ہوتے اور نبوت وکتاب سے بے خبرو بے بہرہ ہوتے، لیکن اس طرح کے اعمال کا ارتکاب اس لئے باعث تعجب ہے کہ وہ تو اہل کتاب ہیں اور انہیں کتاب میں مذکور حکم الٰہی کا علم ہے اور وہ جانتے ہیں کہ آسمانی کتاب انہیں اس طرح کے اعمال کے ارتکاب کی ہرگز اجازت نہیں دیتی اور انہیں لوگوں کے اموال پر ناجائز قبضہ کرنے کو مباح وجائز قرار نہیں دیتی لہٰذا ان کے اہل کتاب ہونے اور ان تمام مطالب سے آگاہ ہونے کے باوجود اس طرح کے اعمال کا ارتکاب کرنے پر نہایت حیرت ہے، اس بناء پر ان کو تنبیہ کرنا اور ان اعمال پر ان کی شدید سرزنش بجا ہے بلکہ نہایت ضروری ہے۔

آیت مبارکہ میں مذکور لفظ "قنطار" اور "دینار" کے معنے مشہور ہیں اور یہاں ان کا تقابلی تذکرہ اپنی ادبی خوبصورتی اور علم بدیع کی کمالی جہات کا حامل ہونے کے ساتھ ساتھ موضوع اور مورد بیان سے کامل مطابقت رکھتا ہے کیونکہ یہاں امانت کی بات ہو رہی ہے لہٰذا "قنطار" اور "دینار" کو مال کے کثیر اور قلیل ہونے سے کنایۃً ذکر کیا گیا ہے، اور اس سے مراد یہ ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں کہ وہ امانت میں ہرگز خیانت کے مرتکب نہیں ہوتے خواہ وہ جتنی زیادہ کیوں نہ ہو اور ان میں سے بعض ایسے ہیں جو اس میں خیانت کا ارتکاب کرتے ہیں خواہ وہ کم ہی کیوں نہ ہو۔

اور جملہ "تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ" (اگر تو اسے سونے سے لدا اونٹ بھی امانت کے طور پر دے تو وہ تجھے واپس کر دے گا) کسی متعین شخص کی طرف اشارہ نہیں بلکہ ہر اس مخاطب سے کنایہ کے طور پر ہے جو اس کلام کا مخاطب قرار پائے، یعنی یہ ایک عمومی مطلب کا بیان ہے جو کسی ایک شخص سے مخصوص نہیں، بنابرایں اس جملہ کا معنی یہ ہوگا کہ اگر کوئی بھی امانت دینے والا اسے امانت دے خواہ وہ سونے سے لدا اونٹ ہی کیوں نہ ہو وہ اسے واپس کر دے گا۔

اور جملہ "مادمت قائماً" میں حرف "ما" کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ مصدر کا ہے لہٰذا عبارت کا معنی سمجھنے کے لئے اسے یوں فرض کرنا پڑے گا: "الا ان تدوم قائماً علیه" (مگر یہ کہ تو اس کے سر پر کھڑا ہی رہے)، یہاں قیام یعنی سر پر کھڑا رہنے کا لفظ تاکید اور فوری مطالبہ کی شدت کو بیان کرنے کے لئے استعمال ہوا ہے۔ یعنی امانت دینے والا شخص اپنی امانت واپس لینے میں سنجیدہ ہے اور فوریت چاہتا ہے، بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس جملہ میں حرف "ما" ظرف کا معنی دیتا ہے، لیکن یہ قول قابل توجہ نہیں۔

جملہ "ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ" میں حرف "ذٰلِكَ" کے ذریعے سابقہ ذکر کئے گئے مطالب کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ ان میں سے کوئی ایسا بھی ہے کہ اگر آپ سونے سے لدا اونٹ بھی اس کے پاس امانت رکھیں تو وہ واپس کر دے گا اور کوئی ایسا بھی ہے کہ اگر اس کے پاس ایک دینار بھی امانت رکھیں تو وہ واپس نہیں کرے گا، یعنی

بعض امانتدار ہیں اور بعض خیانت کرنے والے ہیں، ان کا یہ عمل اس وجہ سے ہے کہ وہ قائل ہیں کہ ہم پر امیوں کے بارے میں کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی (ان کے حوالہ سے ہم پر کوئی قانون لاگو نہیں ہوتا)، ان کے اس نظریہ وقول نے ان کے درمیان روحی صفات کے مختلف ہونے کو جنم دیا مثلاً امانتداری اور لوگوں کے حقوق کا تحفظ، اور موہوم وخیالی اعزازات پر غرور کرنا، یعنی کچھ لوگ اس عقیدہ کو غلط سمجھتے ہوئے امانتداری کی صفت اپنا گئے اور کچھ لوگ اسے درست سمجھے ہوئے خیانت کار بن گئے، حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ خداوند عالم نے اپنی کتاب میں اس طرح کا کوئی ضابطہ قرار نہیں دیا اور نہ ہی اس طرح کے اعمال سے راضی ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ حرف "ذٰلِکَ" آیت میں مذکور صرف دوسرے گروہ کی طرف اشارہ کے لئے ہو کہ جس کے بارے میں کہا گیا ہے: "وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖۤ اِلَيْكَ" (ان میں سے بعض وہ ہیں کہ اگر انہیں ایک دینار بھی امانت دیں تو وہ واپس نہیں کریں گے)، اس بناء پر پہلے گروہ یعنی امانتدار لوگوں کا ذکر دراصل دونوں قسم کے افراد کا پورا اور منصفانہ تذکرہ کرنے کے طور پر ہوا ہے تا کہ تصویر کے دونوں رخ واضح وآشکار ہوں۔

مذکورہ بالا دو امکانی پہلو "يَقُوْلُوْنَ" اور "وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ" کی ضمیر ہائے جمع کے بارے میں بھی پائے جا سکتے ہیں اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ معنی کے لحاظ سے ممکن ہے ان کی بازگشت تمام اہل کتاب کی طرف ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ صرف ان لوگوں کی طرف ہو جو امانتوں میں خیانت کے مرتکب ہوتے ہیں کہ جن کے بارے میں کہا گیا ہے " مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖۤ اِلَيْكَ"، اسی طرح "علینا" میں جمع کی ضمیر کے بارے میں بھی دو احتمال پائے جاتے ہیں، ایک یہ کہ اس کی بازگشت تمام اہل کتاب کی طرف ہے اور دوسرا یہ کہ صرف خیانت کار لوگوں کی طرف ہے۔

بہرحال ان احتمالات کی بناء پر آیت کا معنی بھی مختلف ہو جائے گا البتہ یہ تمام احتمالات قرین صحت ہیں تاہم آپ ان کے بارے میں خود مزید غور وفکر کریں۔

جان بوجھ کر جھوٹ بولنا

○ " وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ "
(اور وہ جان بوجھ کر خدا پر جھوٹ بولتے ہیں)

یہ جملہ یہودیوں کے اس دعوے واظہار کے باطل ونادرست ہونے کو ثابت کرتا ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ امیوں

کو ہم پر کسی طرح کا اعتراض کرنے کا حق حاصل نہیں، اور وہ اپنے اس قول وعقیدہ کو آسمانی وحی اور دینی حکم پر مبنی سمجھتے ہیں، ......لیکن ان کا یہ قول وعقیدہ دراصل خدا پر تہمت اور جھوٹا الزام و نا درست نسبت ہے۔

وفائے بہ عہد اور تقویٰ

○ "بَلٰی مَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰی فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ"

(ہاں، جو شخص اپنا عہد و پیان پورا کرے اور تقویٰ اختیار کرے تو خدا تقویٰ اختیار کرنے والوں سے محبت کرتا ہے)

اس آیت مبارکہ میں یہودیوں کے ادعاء کو رد کیا گیا ہے اور انہوں نے جس بات کی نفی کی تھی اور کہا تھا کہ "لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ" (ہم پر امیوں کے بارے میں کوئی قانون نہیں) اس کا اثبات ہوا ہے، اور "اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ" میں ایفاء سے مراد یہ ہے کہ عہد و پیان کو پورا کرنے میں ہر طرح کی کمی اور بہانہ جوئی سے دوری اختیار کی جائے، یہ باب "افعال" ہے، اور "توفیہ" (جو کہ باب تفعیل سے ہے) کا معنی عطا کرنا اور پورا پورا دینا ہے، اور "استیفاء" (جو کہ باب استفعال سے ہے) کا معنی پورا پورا واپس لینا ہے۔

یہاں عہد و پیان سے مراد یا تو وہ فطری عہد ہے جو خداوند عالم نے اپنے بندوں سے لیا ہے کہ وہ اس پر ایمان لائیں اور اس کی عبادت کریں جیسا کہ بعد والی آیت میں ارشاد ہوا: "اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا" (جو لوگ خدا سے کئے گئے وعدہ اور اپنی قسموں کو تھوڑی قیمت پر بیچ دیتے ہیں)، یا اس سے مراد مطلق عہد و پیان ہے یعنی ہر طرح کا وعدہ ہے کہ جس میں خدائی عہد بھی شامل ہے۔

جملہ "فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ" اس طرح ہے جیسے کسی جزئی مورد کی جگہ قاعدہ کلیہ لایا جائے، (علم منطق میں جزئی مورد کو "صغریٰ" اور قاعدہ کلیہ کو "کبریٰ" کہتے ہیں) یہاں اختصار کی غرض سے ایسا کیا گیا ہے، اور عبارت کو اس طرح فرض و تصور کریں تو معنی واضح ہو جاتا ہے، "بَلٰی مَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰی فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ، **فان الله يحبه لانهٔ متق و الله يحب المتقين**" (ہاں! جو شخص اپنا وعدہ پورا کرے اور تقویٰ اختیار کرے تو خدا اسے دوست رکھتا ہے کیونکہ وہ متقی ہے اور خدا متقیوں کو دوست رکھتا ہے)، بنابرایں اس جملہ کا معنی و مقصود یہ ہوگا کہ خدائی اعزاز کا حصول اس قدر آسان نہیں کہ جو بھی چاہے اسے اپنے آپ سے منسوب کر لے اور ہر طرح کے حیلہ و وسیلہ مثلاً ذاتی و قومی بنیادوں پر خود کو اس کا

حقدار قرار دے بلکہ اس سے بہرہ ور ہونے میں بنیادی شرط یہ ہے کہ خدائی عہد و پیمان کو پورا کرے اور دین میں تقویٰ اختیار کرے، جب یہ شرطیں پوری ہو جائیں تو اعزاز کا حصول یقینی ہو جائے گا جو کہ عبارت ہے محبت و ولایت الٰہیہ سے!، کہ جو خدا کے متقی و پرہیزگار بندوں کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں ہوتی، اور اس کا اثر و نتیجہ خدائی نصرت اور پاکیزہ زندگی ہے کہ جس سے دنیا آباد اور اس سے مربوط تمام امور کی درستی کے ساتھ ساتھ اخروی درجات کی بلندی نصیب ہوتی ہے، تو یہ ہے عظمت اور خدائی اعزاز! نہ یہ کہ خدا کچھ لوگوں کو اپنے بندوں..... خواہ وہ صالح ہوں یا بدکار..... پر مسلط کر دے اور وہ ان پر جس طرح چاہیں آمرانہ طرزِ عمل اپنائیں اور جس طرح کا بھی سلوک کریں، اور کبھی یوں کہیں کہ ہم پر امیوں کو کوئی برتری حاصل نہیں " لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ "، اور کبھی کہیں کہ ہم ہی ہیں اللہ کے خاص دوست، ہمارے سوا کوئی نہیں " نحن اولیاء اللّٰہ من دون الناس "، اور کبھی کہیں کہ ہم ہی خدا کے بیٹے اور اس کے دوست ہیں " نحن ابناء اللّٰہ و احبائہٗ "، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ خدا اس طرح ظالموں کو زمین میں تباہی پھیلانے اور اموال و نسلوں کو برباد کرنے کی اجازت دے۔

عہد الٰہی کو بیچنا

O " إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا "

(جو لوگ خدائی عہد و پیمان اور اپنی قسموں کو تھوڑی قیمت پر بیچ دیتے ہیں)

اس آیت میں سابقہ آیت میں مذکور حکم کی وجہ و سبب کو بیان کیا گیا ہے، لہٰذا یہاں اس مطلب کا اظہار مقصود ہے کہ خدائی عظمت و اعزاز اس شخص کے ساتھ مخصوص ہے جو خدا سے کئے گئے وعدے کو پورا کرے اور تقویٰ اختیار کرے کیونکہ جو لوگ ان کے علاوہ ہیں یعنی وہ کہ جو خدا سے کئے ہوئے وعدے اور اپنی قسموں کو نہایت تھوڑی قیمت پر بیچتے ہیں انہیں کوئی عزت و اعزاز حاصل نہیں۔

اور چونکہ خدا سے کئے ہوئے وعدے کو توڑنا اور تقویٰ کو چھوڑنا دنیاوی رنگینیوں و شہوتوں سے لطف اندوز ہونے کی غرض سے ہے اور دنیاوی لذتوں کو اخروی لذتوں پر مقدم و ترجیح دینے کے طور پر ہے لہٰذا یہ اس طرح سے ہے کہ خدائی عہد و تقویٰ کی جگہ دنیاوی متاع کو رکھا جائے اور خدا سے کئے ہوئے وعدے کو تبدیل کر دیا جائے (وعدہ خلافی کی جائے)، اسی بناء پر اس طرح کے عمل کو معاملہ یعنی لین دین کا نام دیا گیا ہے کہ جس میں خدائی عہد و پیمان کو قابل فروخت مال کی حیثیت حاصل ہوتی ہے کہ جسے دنیاوی مال و متاع کے بدلے میں خریدا گیا ہو۔

آیت میں دنیا کے مال ومتاع کو جو کہ قلیل ہے" تھوڑی قیمت" سے موسوم کیا گیا ہے،" اشتـراء " کا معنی بیچنا ہے اس لئے ارشاد ہوا: " يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا " یعنی وہ بیچتے ہیں خدائی عہد کو، اس سے مراد یہ ہے کہ وہ خدائی عہد و پیان اور اپنی قسموں کو دنیاوی مال ومتاع سے تبدیل کرتے ہیں۔

بدعہدی کا انجام

O " اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ"
(ایسے لوگوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور نہ ہی خدا ان سے کلام کرے گا......)

لفظ"خلاق" کا معنی حصہ اور " تذکیہ " کا معنی کسی چیز کی اچھی پرورش کرنا ہے، یہاں چونکہ لوگوں کے اس گروہ کے بارے میں اظہار خیال مقصود ہے جو ان دیگر افراد کی توصیف کے مقابل میں قرار پایا ہے جن کے بارے میں ارشاد ہوا: " مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى ......"، اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی بابت چند سلبی اوصاف بیان کئے گئے ہیں مثلاً آخرت میں ان کے حصہ پانے کی نفی اور خدا کے ان کے ساتھ کلام کرنے کی نفی، تو اس سے درج ذیل نکات معلوم ہوتے ہیں:

(۱) لفظ" اُولٰٓئِكَ "جو کہ دور کی طرف اشارہ کے لئے ہے اسے یہاں استعمال کر کے اس مطلب کی طرف متوجہ کرنا مقصود ہے کہ وہ لوگ بارگاہِ خداوندی سے کوسوں دور ہیں جبکہ ان کے برعکس خدائی عہد و پیان کو پورا کرنے والے متقی افراد کو بارگاہِ ربوبیت سے قرب کا شرف حاصل ہے کیونکہ خداوند عالم ان سے محبت کرتا ہے، اور یہ اسی محبت کا نتیجہ ہے کہ وہ قرب الٰہی سے بہرہ مند ہیں۔

(۲) خدا کی محبت کے آثار یہ ہیں: آخرت میں حصہ پانا، خدا کا ان سے کلام کرنا اور قیامت کے دن ان پر نگاہِ کرم کرنا، تذکیہ اور مغفرت یعنی دردناک عذاب سے نجات پانا۔

ان کے مقابل میں خداوند عالم نے ان لوگوں کی بابت جنہوں نے عہد الٰہی کو توڑا اور اپنی قسموں پر پورا نہ اترے درج ذیل تین چیزیں ذکر کیں:

(۱) آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہ ہوگا، آخرت سے مراد جہان آخرت ہے (یہاں موصوف کی جگہ اس کی صفت کو ذکر کیا گیا ہے) اس سے مراد مرنے کے بعد آخرت کی زندگی ہے، یہ اس طرح ہے جیسے لفظ "دنیا" سے مراد دنیا کی زندگی ہے یعنی مرنے سے پہلے دنیا کی حیات ! اور آخرت میں ان کے حصہ پانے کی نفی کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے اس کے

مقابلے میں دنیا میں حصہ پانے کو ترجیح دی، دنیا کو آخرت پر مقدم کیا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ " ثـمـن قـلـيـل " (کم قیمت) سے مراد دنیا ہے، سابقہ مطالب میں ہم نے اسے متاع الدنیا سے اس لئے تعبیر کیا تھا کہ خداوند عالم نے اسے " قلیل " (کم) قرار دیا، چنانچہ اس کا ثبوت درج ذیل آیت میں پایا جاتا ہے :

سورۂ نساء، آیت : ۷۷

○ " قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ "

(کہہ دیجئے کہ دنیا کا مال تھوڑا ہے)

ظاہر ہے کہ متاع دنیا وہی دنیا ہی ہے اس کے علاوہ کچھ نہیں۔

(۲) خداوند عالم قیامت کے دن نہ ان سے کلام کرے گا اور نہ ہی ان پر نظر کرے گا، یہ دو باتیں متقین کے ساتھ خدا کی محبت کے مقابل میں ذکر ہوئی ہیں کیونکہ محبت اس بات کا موجب بنتی ہے کہ محبّ، محبوب سے ہمکلام رہنے اور اس کا دیدار کرتا رہنے کا مشتاق ہوتا ہے اور جب اس سے ملتا ہے تو اس سے لگاتار بات کرتا ہے اور اس کی نگاہ اس پر جمی رہتی ہے، اور چونکہ خداوند عالم ان آخرت فروشوں کو دوست نہیں رکھتا لہٰذا قیامت کے دن ان سے کلام نہ کرے گا اور نہ ہی ان کی طرف نظر کرے گا جبکہ وہ دن حاضر ہونے اور پیشی کا دن ہے۔

اور کلام کرنے کو نگاہ کرنے سے پہلے ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں چیزوں کے درمیان قوت وضعف کی نسبت پائی جاتی ہے کیونکہ کلام کرنا جذبۂ محبت کی فراوانی کا ترجمان ہوتا ہے جبکہ نگاہ کرنا اس سے کمتر اور دوسرے درجہ کا حامل ہے، اس بناء پر کلام کرنے کو نگاہ کرنے پر مقدم کر کے ذکر کیا گیا ہے، گویا اس طرح کہا گیا کہ ہم انہیں نہ کسی بڑے شرف واعزاز سے نوازیں گے اور نہ ہی چھوٹے اعزاز سے بہرہ مند کریں گے (یعنی نہ ان سے بات کریں گے اور نہ ہی ان کی طرف نگاہ کریں گے)۔

(۳) خدا ان کا تزکیہ نہیں کرے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب مقرر ہے، کلام میں تزکیہ نہ کرنے اور عذاب میں مبتلا کرنے کو مطلق صورت میں ذکر کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا اور آخرت دونوں جہانوں میں یہ دونوں مقصود ہیں، یعنی نہ دنیا میں ان کا تزکیہ ہوگا اور نہ آخرت میں، اور دنیا میں بھی ان کے لئے دردناک عذاب ہے اور آخرت میں بھی دردناک عذاب میں مبتلا ہوں گے۔

کتاب پڑھتے ہوئے زبانیں پھیرنا

○ " وَاِنَّ مِنۡهُمۡ لَفَرِيۡقًا يَّلۡوٗنَ اَلۡسِنَتَهُمۡ بِالۡكِتٰبِ لِتَحۡسَبُوۡهُ مِنَ الۡكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الۡكِتٰبِ "

(ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو کتاب پڑھتے وقت اپنی زبانوں کو پھیرتے ہیں تا کہ اسے کتاب ہی کا حصہ سمجھا جائے جبکہ وہ کتاب میں سے نہیں ہوتا)

" لـیّ " کا معنی رسی کا بٹنا ہے (اس میں پیچ وخم آنا)، سر اور زبان کے بٹنے سے مراد ان کا پھیرنا ہے یعنی انہیں غیر طبعی وغیر اصلی حالت میں لانا، اس کی قرآنی مثالیں ملاحظہ ہوں:

سورۂ منافقون، آیت :۵

○ " لَوَّوۡا رُءُوۡسَهُمۡ "

(وہ اپنے سروں کو پھیر لیتے ہیں)

سورۂ نسآء، آیت :۴۶

○ " لَيًّاۢ بِاَلۡسِنَتِهِمۡ "

(وہ اپنی زبانوں کو گھماتے ہیں)

اس بناء پر جملہ "يَلۡوٗنَ اَلۡسِنَتَهُمۡ" سے مراد یہ ہوگا کہ وہ اپنے جعل کردہ ومن گھڑت مطالب کو کہ جن کی جھوٹی نسبت خدا کی طرف دیتے ہیں اس لحن وانداز میں پڑھتے ہیں جس طرح تورات کو پڑھتے ہیں تا کہ یہ ظاہر کریں کہ وہ مطالب بھی تورات میں سے ہیں جبکہ وہ تورات میں سے نہیں،......اس طرح لوگوں کو غلط فہمی میں مبتلا کرتے ہیں اور دھوکہ دیتے ہیں......،

اس آیت میں لفظ "کتاب" تین دفعہ ذکر ہوا ہے تا کہ کسی قسم کی غلط فہمی پیدا نہ ہونے پائے کیونکہ ان تینوں میں معانی مختلف ہیں چنانچہ پہلے لفظ "کتاب" سے مراد وہ تحریر ہے جسے انہوں نے اپنے ہاتھوں سے لکھا اور اسے خدا کی طرف منسوب کر دیا، اور دوسرے لفظ "کتاب" سے مراد وہ کتاب ہے جو خداوند عالم نے بذریعہ وحی نازل کی، اور تیسرے لفظ "کتاب" سے مراد بھی وہی آسمانی کتاب ہے جسے خداوند عالم نے وحی کے ذریعے نازل فرمایا اور اس کے دوبارہ ذکر کرنے کا

مقصد اس کی بابت غلط فہمی کا راستہ روکنا ہے اور اس بات کی طرف اشارہ و توجہ دلانا مقصود ہے کہ اللہ کی کتاب ان میں من گھڑت و جعلی مطالب پر مشتمل ہونے سے بالاتر ہے، کیونکہ لفظ کتاب میں وصفیت کا معنی پایا جاتا ہے جو کہ اس میں مذکور حکم کی علت و وجہ کا ترجمان ہوتا ہے۔ اس کی مثال لفظ جلالہ "اللہ" کے دوبارہ ذکر کئے جانے میں ملتی ہے چنانچہ ارشاد ہوا:
"وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ" (اور وہ کہتے ہیں کہ وہ اللہ کی طرف سے ہے، حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہے) کہ اس کا معنی یہ ہے کہ وہ "اللہ" کی طرف سے نہیں کہ جو برحق معبود ہے اور حق کے سوا کچھ نہیں کہتا، چنانچہ اس کا ارشاد ہے: "اَلْحَقَّ اَقُوْلُ" (اور میں تو حق بات ہی کرتا ہوں)......سورۂ ص، آیت ۸۴......

اور جملہ "وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ" پہلی تکذیب کے بعد دوبارہ تکذیب کو بیان کرتا ہے، اس میں ان کی خودساختہ وحی کی تکذیب ہے کہ جسے انہوں نے خدا کی طرف منسوب کیا اور یہ تکرار یعنی دوبارہ تکذیب کرنا اس لئے ہے کہ یہودی لہجہ و انداز کے ذریعے لوگوں کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیتے تھے اور خدا نے اسے ان الفاظ میں مسترد کیا:
"وَمَا مِنَ الْكِتٰبِ" (جبکہ وہ کتاب میں سے نہیں)، پھر وہ اپنی زبانوں سے کہتے تھے کہ وہ اللہ کی طرف سے ہے تو خدا نے پہلے ان کی تکذیب ان لفظوں میں کی: "وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ" (جبکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہے) اور پھر فرمایا:
"وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ" (اور وہ خدا پر جھوٹی نسبت دیتے ہیں) اس میں دو مطالب کا بیان مقصود تھا: پہلا یہ کہ جھوٹ بولنا اور جھوٹی نسبت دینا یہودیوں کی عادت و معمول ہے، دوسرا یہ کہ ان کا جھوٹی نسبت دینا ان کی لاعلمی یا غلط فہمی کی وجہ سے نہیں بلکہ وہ جان بوجھ کر یعنی سب کچھ کا علم ہونے کے باوجود عمداً ایسا کرتے ہیں۔

روایات پر ایک نظر

اہلِ کتاب کو دعوتِ عام

تفسیر درمنثور میں آیۂ مبارکہ "قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ" کے ذیل میں ابن جریر سے سعدی کے حوالہ سے بیان کیا گیا ہے کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ نے انہیں یعنی نصارائے نجران کے وفد کو دعوت دی اور فرمایا: اے اہل کتاب! آؤ اس بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر و مشترک ہے (يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ......" (تفسیر درمنثور ج ۲ ص ۴۰)

اس مطلب پر مشتمل ایک روایت ابن جریر نے محمد بن جعفر بن زبیر سے بھی ذکر کی ہے، اور روایت سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت انہی کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اور ہم نے اس سورۂ مبارکہ کی تفسیر کے آغاز ہی میں ایک روایت ذکر کی جس سے ثابت ہوتا تھا کہ ابتدائے سورۂ سے لے کر تقریباً اسی (۸۰) سے کچھ زیادہ آیات نجران کے نصاریٰ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں اور زیر نظر آیت مبارکہ انہی آیات میں سے ایک ہے کیونکہ ابھی سلسلۂ بحث انہی کے متعلق جاری ہے اور آیات کی مذکورہ تعداد پوری نہیں ہوئی۔

بعض روایات میں وارد ہوا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے مدینہ کے یہودیوں کو دعوت دی کہ وہ مشترک نکتہ کی طرف آئیں، کہ بالآخر انہوں نے جزیہ کو قبول کر لیا، یہ آیت کے نجران کے وفد کے بارے میں نازل ہونے کی نفی نہیں کرتی اور نہ ہی اس سے متصادم ہے۔

بادشاہِ روم کے نام مکتوبِ نبویؐ

صحیح بخاری میں مؤلف نے اپنے اسناد سے ابن عباس کی ایک روایت بحوالہ ابوسفیان ذکر کی ہے، اس طویل حدیث میں اس خط کا تذکرہ ہے جو حضرت پیغمبر اسلامؐ نے بادشاہِ روم ہرقل کو لکھا، ہرقل نے آنحضرتؐ کا خط پڑھا تو اس میں یہ لکھا ہوا تھا:

" بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم، من محمد رسول اللّٰہ الیٰ ہرقل عظیم الروم، سلام علیٰ من اتبع الھدیٰ، اما بعد، فانی ادعوک بدعایۃ الاسلام، اسلم تسلم، واسلم یؤتک اللّٰہ اجرک مرتین، فان تولیت فان علیک اثم الاریسین، ویا اھل الکتاب تعالوا الیٰ کلمۃ سواء بیننا و بینکم الا نعبد الا اللّٰہ ولا نشرک بہٖ شیئاً ولا یتخذ بعضنا بعضاً ارباباً من دون اللّٰہ فان تولّوا فقولوا اشھدوا بانا مسلمون "

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے، جو مہربان و نہایت رحم کرنے والا ہے، یہ خط محمد رسول اللہ کی طرف سے روم کے شہنشاہ ہرقل کے نام ہے، سلام ہو اس پر جس نے ہدایت کی پیروی کی، اما بعد، میں آپ کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دیتا ہوں، اسلام لائیں اور خدا کے فرمان پر سر تسلیم خم کر دیں تا کہ سلامتی کے ساتھ رہیں اور خداوند آپ کو دوگنا اجر عطا کرے گا، لیکن اگر آپ اس سے منہ موڑیں تو تمام لوگوں (کمزور و محکوم طبقہ) کا گناہ آپ کے ذمہ ہوگا، اور اے اہل کتاب! اس کلمۂ واحدہ کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر و مشترک ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو

شریک قرار نہ دیں اور ہم اللہ کے علاوہ آپس میں ایک دوسرے کو خدا نہ مانیں، پس اگر وہ روگردانی کریں تو ان سے کہو کہ تم گواہ ہو کہ ہم اسلام لائے ہیں...... خدا کے فرمان پر سر تسلیم خم کئے ہوئے ہیں......،

(صحیح بخاری ج ۴ ص ۵۷)

اس روایت کو مسلم نے اپنی صحیح میں، سیوطی نے "درمنثور" میں نسائی، عبدالرزاق، ابن ابی حاتم اور ابن عباس کے اسناد سے ذکر کیا ہے۔ (صحیح مسلم مع شرح نووی جلد ۱۲ صفحہ ۱۰۳) (تفسیر درمنثور جلد ۲ ص ۴۰)

بعض حضرات نے لکھا ہے کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ نے جو خط قبطیوں کے سردار مقوقس کے نام لکھا اس میں بھی یہی الفاظ درج تھے: "یَآ اَھْلَ الْکِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ" (اے اہل کتاب! تم آؤ اس کلمہ کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر و مشترک ہے)

ایک خط جو حضرت پیغمبر اسلامؐ کی طرف منسوب ہے اور کوفی رسم الخط کے ساتھ لکھا ہوا ہے وہ اس خط سے مشابہت رکھتا ہے جو آنحضرتؐ نے ہرقل کے نام لکھا تھا، اس خط کو جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے محفوظ کر کے اس کی کاپیاں بنائی گئی ہیں اور اب وہ متعدد افراد کے پاس موجود ہے۔

بہر حال مؤرخین نے لکھا ہے کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ نے کئی خطوط لکھے اور اس زمانہ کے بادشاہوں کی طرف وفود بھیجے، چنانچہ ایک خط روم کے بادشاہ ہرقل، ایک خط ایران کے فرماں روا یزدگر کسریٰ اور ایک خط حبشہ کے حکمران نجاشی کے نام لکھا، یہ سب کچھ ۶ ہجری کو ہوا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ زیر نظر آیت مبارکہ ۶ ہجری میں یا اس سے پہلے نازل ہوئی، جبکہ مؤرخین مثلاً طبری، ابن اثیر اور مقریزی نے لکھا ہے کہ نجران کے نصاریٰ کا وفد ۱۰ ہجری کو حضرت پیغمبر اسلامؐ کی خدمت میں آیا، اور بعض مؤرخین مثلاً ابوالفداء نے البدایۃ والنہایہ میں اور اس کے مانند سیرہ حلبیہ میں مذکور ہے کہ نصاریٰ کا وفد ۹ ہجری کو آیا، تو اس بناء پر آیت کا نزول ۹ ہجری یا ۱۰ ہجری کو ماننا پڑے گا۔

(ملاحظہ ہو: تاریخ طبری جلد ۳ صفحہ ۱۳۹، الکامل فی التاریخ جلد ۲ صفحہ ۲۹۳، البدایہ والنہایہ جلد ۵ صفحہ ۵۲، سیرہ حلبی ج ۳ ص ۲۱۲)

ایک قول یہ ہے کہ یہ آیت مبارکہ ان آیات میں سے ہے جو ہجرت کے پہلے سال میں نازل ہوئیں، چنانچہ اس سلسلہ میں روایات بھی موجود ہیں جو عنقریب ذکر ہوں گی۔

ایک قول یہ ہے کہ یہ آیت دوبار نازل ہوئی، اس قول کو حافظ ابن حجر نے ذکر کیا ہے۔

البتہ آیات کے سیاق سے جس قول کی تائید ملتی ہے...... جیسا کہ ابتدائے سورت میں اس کی بابت اشارہ ہو چکا ہے...... وہ یہ کہ یہ آیت مبارکہ ۹ ہجری سے پہلے نازل ہوئی اور نصاریٰ کے وفد کی آمد کا واقعہ ۶ ہجری یا اس سے پہلے کا ہے،

اور یہ بات بعید نظر آتی ہے کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ نے دور دراز کے حکمرانوں یعنی روم، قبط اور فارس کے بادشاہوں کو خطوط لکھے ہوں اور نجران والوں کو نظر انداز کر دیا ہو جبکہ وہ مدینہ کے نزدیک رہتے تھے۔

اس روایت میں ایک قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ کے مکتوب گرامی کا آغاز "بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" سے ہوا ہے، اس سے نجران کے وفد کے بارے میں جو بعض روایات ہم ذکر کر چکے ہیں ان میں پایا جانے والا سقم ظاہر ہو جاتا ہے جیسا کہ بیہقی نے کتاب دلائل میں لکھا ہے:

" ان رسول اللّٰہؐ کتب الی اھل نجران قبل ان ینزل علیه طس سلیمان :بسم الله اله ابراهیم و اسحاق و یعقوب، من محمد رسول اللّٰہ الٰی اسقف نجران، ان اسلمتم فانی احمد الیکم اللّٰہ اله ابراهیم و اسحاق و یعقوب، اما بعد فانی ادعوکم الٰی عبادة اللّٰہ من عبادة العباد والٰی ولایة اللّٰہ من ولایة العباد (فان ابیتم فالجزیة وان ابیتم فقد اٰذنتکم بالحرب، والسلام "

(حضرت پیغمبر اسلامؐ نے اہل نجران کے نام خط لکھا اور یہ خط سورۂ طس سلیمان (نمل) کے نزول سے پہلے لکھا گیا، اس میں آپؐ نے یہ لکھا: شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو معبود ہے ابراہیم واسحاق و یعقوب کا، اس کے بعد میں تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ بندوں کی بندگی چھوڑ کر اللہ کی بندگی اختیار کرو اور بندوں کی ولایت و حاکمیت کی قید سے نکل کر اللہ کی ولایت و حاکمیت کے دائرے میں آ جاؤ، اگر تم اسے قبول نہیں کرتے تو جزیہ ادا کرنے کا کہتا ہوں اور اگر اس کا بھی انکار کرو تو تم سے اعلان جنگ کرتا ہوں، والسلام)......تفسیر درمنثور ج ۲ ص ۳۸......،

اس روایت پر جو اشکال وارد ہوتا ہے وہ یہ کہ سورۂ نمل ان سورتوں میں سے ہے جو مکہ میں نازل ہوئیں اور اس کی آیات کے مطالب سے اس بات کا واضح ثبوت ملتا ہے کہ وہ ہجرت نبویؐ سے پہلے نازل ہوئی، تو اس کا نجران کے وفد کے واقعہ سے کیا ربط بنتا ہے اور کیونکر یہ بات درست قرار دی جا سکتی ہے کہ اس خط میں حضرت پیغمبر اسلامؐ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی بجائے بسم اللہ الہ ابراہیم سے آغاز کیا، اس کے ساتھ ساتھ یہ کہ اس خط میں دیگر مطالب بھی مذکور ہیں کہ جن کی توجیہ و تاویل ممکن نہیں مثلاً جزیہ ادا کرنا، اعلان جنگ وغیرہ، کیونکہ اسلام ہجرت سے قبل اس قدر قوی نہ ہوا تھا کہ آنحضرتؐ دوسری قوموں سے جزیہ کا مطالبہ کریں یا اعلان جنگ کریں، (واللہ اعلم)،

تفسیر "درمنثور" میں ہے کہ طبرانی نے ابن عباس کے حوالہ سے روایت ذکر کی ہے انہوں نے کہا کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ نے تمام کفار کو اپنے خطوط میں لکھا: "تَعَالَوْا اِلٰی كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَكُمْ......" (آؤ اس کلمہ کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے......) (تفسیر "درمنثور" جلد ۲ صفحہ ۴۰)

سبیل سکینہؑ
حیدرآباد لطیف آباد، یونٹ نمبر C1-8

حضرت ابراہیمؑ کا دین ؟

"درمنثور" میں آیہ مبارکہ "یٰٓاَھۡلَ الۡکِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوۡنَ" کی تفسیر میں مذکور ہے کہ ابن اسحاق اور ابن جریر، اور بیہقی نے کتاب دلائل میں جناب ابن عباسؓ سے روایت ذکر کی ہے انہوں نے کہا:

" اجتمعت نصاریٰ نجران و احبار یهود عند رسول اللّٰهؐ فتنازعوا عندهٗ، فقالت الاحبار: ما كان ابراهيم الا يهودياً، وقالت النصاریٰ، ما كان ابراهيم الا نصرانياً، فانزل اللّٰه فيهم : يا اهل الكتاب لم تحاجون فی ابراهيم وما انزلت التوراة والانجيل الا من بعدهٖ افلا تعقلون، ها انتم هٰؤلاء حاججتم فيما لكم بهٖ علم فلم تحاجون فيما ليس لكم بهٖ علم واللّٰه يعلم وانتم لا تعلمون، ما كان ابراهيم يهودياً ولانصرانياً ولكن كان حنيفاً مسلماً وما كان من المشركين، ان اولى الناس بابراهيم للذين اتبعوه وهٰذا النبی والذين 'امنوا واللّٰه ولی المؤمنين"۔

(نجران کے نصاریٰ اور یہودیوں کے بزرگ علماء (احبار) حضرت رسولِ خداؐ کے پاس اکٹھے ہوئے اور حضورؐ کے سامنے حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں نزاع کرنے لگے، احبار نے کہا کہ ابراہیمؑ تو بس یہودی تھے، نصاریٰ نے کہا کہ ابراہیمؑ تو بس نصرانی تھے، اس وقت خداوندعالم نے ان کے بارے میں یہ آیات نازل کیں: اے اہل کتاب! تم ابراہیم کے بارے میں کیوں جھگڑا و بحث کرتے ہو حالانکہ تورات و انجیل تو ان کے بعد نازل ہوئی ہیں کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے، اللہ کو علم ہے لیکن تمہیں علم نہیں، ابراہیم نہ یہودی تھا اور نہ نصرانی، بلکہ وہ خالص مسلمان تھا اور وہ ہرگز مشرکوں میں سے نہ تھا، بے شک وہی لوگ ابراہیم کے زیادہ حقدار ہیں جنہوں نے اس کی پیروی کی اور یہ نبی اور وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں، اور اللہ ایمان والوں کا ولی و حاکم ہے)

اس وقت ابورافع قرظی (بنی قریضہ کا یہودی) کہنے لگا کہ:

" اتريد منا يا محمد ان نعبدک كما تعبد النصاریٰ عيسیٰ بن مريم ؟"

اے محمد کیا آپ چاہتے کہ جس طرح نصاریٰ عیسیٰ بن مریمؑ کی پرستش کرتے ہیں اسی طرح ہم آپ کی پوجا کریں؟

" فقال رجل من اهل نجران : اذلک تريد يامحمد ؟"

اس وقت اہل نجران میں سے ایک شخص نے کہا: اے محمد! کیا آپ یہی چاہتے ہیں ؟

" فقال رسول اللهؐ (ص): معاذ اللّٰه ان اعبد غیر اللّٰه او امر بعبادة غیره، ما بذلک بعثنی ولا امرنی" ،

حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ارشاد فرمایا: میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ میں اللہ کے علاوہ کسی کی عبادت کروں یا اللہ کے علاوہ کسی کی عبادت کا حکم دوں، مجھے خدا نے ہرگز اس کام کے لئے نہیں بھیجا اور نہ ہی ایسا کرنے کا حکم دیا ہے،

"فانزل اللّٰه فی ذلک من قولهما: ما کان لبشر ان یؤتیه اللّٰه الکتاب والحکم والنبوة ثم یقول للناس کونوا عبادا لی من دون الله ولکن کونوا ربانیین بما کنتم تعلمون الکتاب و بما کنتم تدرسون، ولایأمرکم ان تتخذوا الملائکة والنبیین ارباباً ایأ مرکم بالکفر بعد اذ انتم مسلمون"

اس وقت ان دونوں کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی: "کسی بشر کے لئے یہ روا نہیں کہ خدا اسے کتاب، حکومت اور نبوت عطا کرے تو وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میری عبادت کرو، بلکہ (اسے یہ کہنا چاہیے کہ) تم خدا پرست بنو کیونکہ تم کتاب کی تعلیم دیتے ہو اور خود بھی پڑھتے ہو، اور وہ تمہیں یہ حکم نہیں دیتا کہ تم فرشتوں اور نبیوں کو خدا قرار دے دو، کیا وہ تمہیں کفر کا حکم دے سکتا ہے جبکہ تم مسلمان ہو چکے ہو؟،......اس کے بعد آنحضرتؐ نے اسی سورۂ مبارکہ کی آیت ۸۱ کی تلاوت کی جس میں خدا نے ان (یہود و نصاریٰ) سے اور ان کے آباء و اجداد سے رسول اللہؐ کے بارے میں میثاق لیا کہ وہ جب آئیں تو ان پر ایمان لانا اور ان کی تصدیق کرنا، حضرت رسول خداؐ نے انہیں اس میثاق اور اس پر ان کی طرف سے اقرار کو یاد دلایا، (تفسیر در منثور ج۲ ص۴۰)

میں سمجھتا ہوں کہ یہ آیات مبارکہ (۷۹، ۸۰) "مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ" اپنے سیاق کی بناء پر پیغمبر اسلامؐ کی بجائے نہایت آسانی اور بھرپور مطابقت کے ساتھ حضرت عیسیٰ بن مریمؑ پر منطبق ہوتی ہیں، اس سلسلہ میں مزید وضاحت ان آیات کی تفسیر میں ہوگی، البتہ مذکورہ بالا روایت میں ان آیات کے شان نزول کی بابت جو کچھ ذکر ہوا کہ وہ حضرت پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں شاید یہ بات جناب ابن عباس کی ذاتی رائے و استنباط ہو، ورنہ قرآنی اسلوب تو یہ ہے کہ اس طرح کے موضوعات کا تذکرہ سوال و جواب یا بیان ورد کی صورت میں کرتا ہے جبکہ یہاں ایسا نہیں ہوا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابن عباس کی اپنی سوچ ہے جس کا آیات کے شانِ نزول سے کوئی تعلق نہیں۔

ایک سبق آموز واقعہ

تفسیر ''خازن'' میں مذکور ہے کہ کلبی نے ابوصالح کے حوالہ سے ابن عباس سے، اور محمد بن اسحاق نے ابن شہاب کے حوالہ سے اپنے اسناد کے ساتھ مسلمانوں کی بسوئے حبشہ ہجرت کے بارے میں بیان کیا ہے کہ جب جعفر ابن ابی طالب اور چند صحابۂ کرام نے حبشہ کی طرف ہجرت کی اور وہاں سکونت پذیر ہو گئے اور حضرت پیغمبر اسلامؐ نے مدینہ کی طرف ہجرت کی اور جنگ بدر کا واقعہ پیش آیا تو قریش نے دارالندوہ میں اجتماع کیا اور فیصلہ کیا کہ ہم بدر میں مارے جانے والے اپنے افراد کا بدلہ محمدؐ کے ان اصحاب سے لیں جو اس وقت حبشہ میں ہیں، چنانچہ انہوں نے کافی مال جمع کیا اور اسے نجاشی کو ہدیہ بھیجا کہ شاید وہ ان لوگوں کو ان کے سپرد کر دے، اس مقصد کے لئے انہوں نے اپنے دو معتبر و سمجھدار افراد کا انتخاب کیا، چنانچہ عمرو بن عاص اور عمارۃ بن ابی معیط کو وہ تمام اموال و ہدایا دے کر نجاشی کی طرف روانہ کیا، وہ دونوں کشتی پر سوار ہوئے اور حبشہ پہنچ گئے، جب وہ نجاشی کے دربار میں داخل ہوئے تو انہوں نے سب سے پہلے اسے سجدہ کیا اور پھر سلام کیا، اس کے بعد انہوں نے اپنا مقصد بیان کرتے ہوئے کہا کہ ہماری قوم کے افراد آپ کے خیرخواہ اور شکرگزار ہیں اور اہل حبشہ سے انہیں بہت محبت ہے، انہوں نے ہمیں آپ کے پاس بھیجا ہے تاکہ آپ کو ان لوگوں کے بارے میں باخبر کریں جو آپ کے علاقہ و ملک میں آباد ہوئے ہیں کہ وہ ایک ایسے شخص کے پیروکار ہیں جو جھوٹا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ وہ خدا کا رسول ہے، ہم میں سے کسی نے اس کی بات نہیں مانی سوائے چند بیوقوف لوگوں کے، ہم نے ان پر عرصہ حیات تنگ کر دیا تھا اور انہیں اپنے علاقہ میں ایک شعب میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا تھا تاکہ کوئی شخص ان کے پاس نہ جا سکے، جس سے وہ نہایت تنگی کا شکار ہو گئے اور بھوک و پیاس سے مرنے لگے، اور جب پانی سر سے گزرنے لگا اور اس شخص کو ہر طرف مشکلات نے گھیر لیا تو مجبور ہو کر اس نے اپنے چچازاد کو آپ کے پاس بھیجا تاکہ وہ آپ کے دین اور ملک و قوم کو تباہ کرے، لہٰذا اگر آپ ان کے شر سے بچنا چاہتے ہیں تو ان لوگوں کو ہمارے سپرد کر دیں ہم آپ کو ان کے شر سے بچا سکتے ہیں، اور ان کی نشانی ہم آپ کو بتائے دیتے ہیں کہ وہ جب آپ کے پاس آئیں گے وہ آپ کو سجدہ نہ کریں گے اور نہ ہی اس طرح سلام و ادائے احترام کریں گے جس طرح دوسرے لوگ آپ کو سلام و آداب بجالاتے ہیں کیونکہ وہ آپ کے دین اور آداب کے قائل ہی نہیں بلکہ اسے مسترد کرتے ہیں،

چنانچہ نجاشی نے مہاجرین اسلام کو دربار میں پیش ہونے کے لئے بلوایا، جونہی وہ آئے تو سب سے پہلے جناب جعفر نے دروازہ پر کھڑے ہو کر دربار میں داخل ہونے کی اجازت طلب کی اور یہ الفاظ بلند آواز میں کہے:

خدا کی جماعت آپ سے اجازت طلب کرتی ہے،

نجاشی نے کہا: اس سے کہو کہ دوبارہ اپنا جملہ دہرائے،

جعفر نے دوبارہ وہی الفاظ بلند آواز میں کہے،

نجاشی نے کہا: بس، وہ خدا کی حفاظت وامان میں دربار میں داخل ہوجائیں،

یہ بات سنتے ہی عمرو بن عاص نے اپنے ساتھی سے کہا: تونے سنا ہے کہ ان لوگوں نے کس دریدہ دہنی کے ساتھ اپنے آپ کو خدا کی جماعت کہا اور بادشاہ نے انہیں کس طرح جواب دیا؟ گویا انہیں اس سے سخت دکھ ہوا،

پھر مہاجرین دربار میں داخل ہوئے مگر انہوں نے نجاشی کو سجدہ نہ کیا، عمرو بن عاص نے موقع پاکر نجاشی سے کہا کہ آپ نے دیکھا ہے کہ یہ لوگ کس قدر متکبر ہیں کہ آپ کو سجدہ کرنا گوارا نہیں کرتے!

نجاشی نے مہاجرین سے پوچھا کہ تم لوگوں نے مجھے سجدہ کیوں نہیں کیا اور جس طرح دنیا بھر سے آنے والے مجھے سلام کرتے ہیں اور میرے سامنے آداب بجالاتے ہیں تم نے اس طرح سلام وادائے احترام کیوں نہیں کیا؟

انہوں نے جواب دیا کہ ہم تو صرف اللہ کو سجدہ کرتے ہیں جس نے آپ کو اور آپ کے ملک کو پیدا کیا ہے، ہم نے جس طرح آپ کو سلام کیا ہے یہی ہمارا طرزِ سلام وآداب ہے، ہم بتوں کی پوجا کرتے تھے پھر خداوند عالم نے ہم میں ایک سچا نبی بھیجا تو اس نے ہمیں اس طرح سلام کرنے کا حکم دیا جو خدا کو پسند ہے اور وہ سلام ہے جو اہل بہشت کا طرز آداب ہے،

ان کی بات سن کر نجاشی جان گیا کہ ان کی بات درست اور حق ہے اور یہ بات تورات وانجیل میں لکھی ہوئی ہے،

نجاشی نے پوچھا کہ تم میں سے کس نے بلند آواز سے سلام کیا اور اجازت طلب کی تھی؟

جعفر نے کہا: وہ میں ہوں، اور آپ روئے زمین پر موجود بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ ہیں کہ جن کا تعلق اہل کتاب سے ہے، آپ کے حضور زیادہ باتیں کرنا اور ناروا بولنا صحیح نہیں البتہ میں چاہتا ہوں کہ اپنے ساتھیوں کی طرف سے ان دو حضرات کی باتوں کا جواب دوں، انہیں حکم دیں کہ وہ اپنی بات کریں لیکن اس طرح کہ ان میں سے ایک بولے اور دوسرا خاموش رہے اور آپ ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو کو سنتے رہیں،

اس وقت عمرو بن عاص نے جعفر سے کہا: آپ بات کریں،

جعفر نے نجاشی سے کہا:

آپ ان سے پوچھیں کہ ہم غلام تھے یا آزاد؟ اگر ہم غلام تھے اور اپنے آقاؤں سے دامن چھڑا کر بھاگ کے آئے ہیں تو آپ اے نجاشی! ہمیں ہمارے آقاؤں کے سپرد کردیں،

نجاشی نے ان دو سے پوچھا، کیا یہ لوگ غلام ہیں یا آزاد؟

عمرو بن عاص نے کہا: یہ لوگ غلام نہیں ہیں بلکہ آزاد اور عزت دار لوگ ہیں،

نجاشی نے کہا: غلامی کا مسئلہ تو حل ہوا اور ثابت ہوگیا کہ وہ غلام نہیں،

جعفر نے کہا: ان سے پوچھیں کہ آیا ہم نے کوئی ناحق خون بہایا ہے کہ جس کا قصاص ہم سے کیا جائے؟

عمرو نے کہا: نہیں، انہوں نے ایک قطرہ خون بھی نہیں بہایا۔

جعفر نے کہا: ان سے پوچھیں کہ آیا ہم نے لوگوں کا مال ناحق طور پر ان سے چھینا ہے کہ جسے واپس کرنا ہماری ذمہ داری ہے؟

نجاشی نے کہا: اگر وہ مال سونے سے لدا اونٹ ہی کیوں نہ ہو وہ میں خود واپس کر دوں گا۔

عمرو نے کہا: نہیں، ایک کوڑی بھی انہوں نے کسی کی نہیں لی ہے،

نجاشی نے پوچھا: تو پھر تم ان لوگوں سے کس چیز کا مطالبہ رکھتے ہو؟

عمرو نے جواب دیا، بات یہ ہے کہ ہم اور یہ لوگ سب ایک دین پر تھے جو کہ ہمارے آباء واجداد کا دین تھا مگر ان لوگوں نے اسے چھوڑ دیا اور نئے دین کی پیروی کرنے لگے لہٰذا ہماری قوم کے افراد نے ہمیں بھیجا تا کہ آپ انہیں ہمارے سپرد کریں،

نجاشی نے پوچھا: وہ کون سا دین تھا جس پر تم سب تھے اور انہوں نے اسے چھوڑ کر جس دین کی پیروی کی وہ کیا ہے؟

جعفر نے اس کے جواب میں کہا: ہم نے جس دین کو چھوڑا ہے وہ شیطانی دین تھا، ہم خدا کا انکار کرتے تھے اور پتھروں کی پوجا کرتے تھے، اور اب ہم نے جس دین کو اختیار کیا ہے وہ خدائی دین ہے جو کہ اسلام ہے اور وہ اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا ایک شخص لایا ہے اور ایک آسمانی کتاب بھی اس کے پاس ہے کہ جو عیسیٰ بن مریم کی کتاب جیسی ہے اور اس کے عین مطابق ہے۔

نجاشی نے کہا: اے جعفر! تو نے بہت بڑی بات کہہ دی ہے!

پھر نجاشی نے حکم دیا کہ نقارہ بجایا جائے، چنانچہ نقارہ بجایا گیا جسے سن کر تمام قسیس وراہب جمع ہو گئے، جب وہ سب نجاشی کے دربار میں آ گئے تو اس نے ان سے کہا: میں تمہیں اس اللہ کی قسم دیتا ہوں جس نے عیسیٰ پر انجیل نازل کی، کیا تم عیسیٰ اور قیامت کے دن اور قیامت کے دن سے پہلے کسی خدا کی طرف سے بھیجے جانے والے نبی کا تذکرہ کہیں پاتے ہو؟

ان سب نے کہا: ہاں، خدا گواہ ہے ہمیں عیسیٰ نے اس کے آنے کی بشارت دی اور فرمایا ہے کہ جو اس پر ایمان لائے گا گویا وہ مجھ پر ایمان لایا اور جو اس کا انکار کرے گا گویا اس نے میرا انکار کیا،

نجاشی نے جعفر سے پوچھا: وہ شخص تم سے کیا کہتا ہے؟ اور تمہیں کس چیز کا حکم دیتا ہے؟ اور کس چیز سے منع کرتا ہے؟

جعفر نے کہا: وہ خدا کی کتاب ہمارے سامنے پڑھتا ہے اور ہمیں نیکی کا حکم دیتا ہے اور برائی سے روکتا ہے، وہ ہمیں حکم دیتا ہے کہ ہمسایہ کے ساتھ نیک سلوک کرو، صلہ رحمی کرو اور یتیم پروری کرو، وہ ہمیں حکم دیتا ہے کہ ہم خدائے یکتا کی عبادت

کریں) کہ جس کا کوئی شریک نہیں،

نجاشی نے کہا: جو کچھ وہ تم لوگوں کے سامنے پڑھتا ہے اس میں سے مجھے بھی سناؤ،

جعفر نے سورۂ عنکبوت اور سورۂ روم کی تلاوت کی، تو نجاشی اور اس کے درباریوں کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اور انہوں نے کہا: کچھ اور بھی سنائیں اور اس پاکیزہ کلام سے مزید کچھ تلاوت کریں،

جعفر نے سورۂ کہف کی تلاوت کی،

عمرو بن عاص نے صورتحال دیکھی تو اس سے رہا نہ گیا اور نجاشی کو غصہ دلانے کے لئے اس کے پاس اس کے سوا چارۂ کار نہ تھا کہ اسے ان کے بارے میں غلط معلومات دے کر اپنا مطلوب حاصل کرے چنانچہ اس نے نجاشی سے کہا کہ یہ لوگ عیسیٰ اور ان کی مادرِ گرامی کو برا بھلا کہتے ہیں،

جعفر نے سورۂ مریم کی تلاوت شروع کر دی اور جب عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریمؑ کا ذکر آیا تو نجاشی نے اپنے مسواک کا ایک نہایت چھوڑا سا ٹکڑا اٹھایا اور کہنے لگا: خدا کی قسم! حضرت مسیح نے اس چھوٹے سے ٹکڑے کے برابر بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جسے تم نے پڑھا اور جس کے تم قائل ہو،

پھر نجاشی نے جعفر اور ان کے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ آپ لوگ جائیں اور اب میری مملکت میں بے خوف و خطر زندگی بسر کریں، تمہیں کوئی شخص گزند نہیں پہنچا سکتا، تم امن و امان کے ساتھ رہو، اس کے بعد وہ کہنے لگا: میں تمہیں خوشخبری دیتا ہوں اور یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ کوئی شخص تمہاری طرف پھیکی وٹیڑھی نظر اٹھا کے نہیں دیکھے گا، میری حکومت میں ابراہیمی گروہ کو کوئی خطرہ لاحق نہیں،

عمرو نے پوچھا، اے نجاشی! ابراہیمیؑ گروہ سے مراد کون لوگ ہیں (ہم یا یہ لوگ؟)

نجاشی نے جواب دیا کہ ابراہیمیؑ گروہ یہ مہاجرین ہیں جو میرے پاس آئے ہیں اور ان کا وہ بزرگ کہ جس کی طرف سے یہ لوگ یہاں آئے ہیں اور ہر وہ شخص جو ان کی پیروی کرے،

نجاشی کی بات ان مشرکوں کو ناگوار گزری اور انہوں نے اسے قبول نہ کیا اور دعویٰ کرنے لگے کہ ہم بھی ابراہیمؑ کے دین پر ہیں (ہم ہی ابراہیمیؑ گروہ ہیں)،

پھر نجاشی نے عمرو اور عمارہ کو وہ مال واپس کر دیا جو وہ اس کے لئے لائے تھے اور ان سے کہا کہ تمہارا یہ ہدیہ دراصل رشوت ہے تم اسے لے لو، مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے، خداوند عالم نے یہ حکمرانی و سلطنت مجھ سے رشوت لے کر مجھے عطا نہیں کی،

جعفر نے اس روداد کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ پھر ہم وہاں سے واپس آئے اور ہم نے نجاشی کے دیار میں نہایت

عمدہ ہمسائیگی پائی، اس واقعہ اور نجاشی کے دربار میں ہونے والی گفتگو کو عمرو بن عاص و عمارہ اور جعفر کے درمیان ہونے والی گفتگو کے حوالہ سے خداوند عالم نے حضرت پیغمبر اسلامؐ پر جو کہ اس وقت مدینہ میں تھے یہ آیت نازل فرمائی: "اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ" (ابراہیم کے زیادہ حقدار وہ ہیں جنہوں نے اس کی پیروی کی اور یہ نبی اور وہ لوگ جو ایمان لائے، اور اللہ ایمان لانے والوں کا ولی ہے)

یہ واقعہ متعدد دیگر اسناد سے بھی مذکور ہے اور اہل بیت علیہم السلام کے حوالہ سے بھی منقول ہے، ہم نے اس کے طولانی ہونے کے باوجود اسے یہاں اس لئے بیان کر دیا ہے کہ اس سے صدر اسلام کی تاریخ کے نہایت اہم مراحل و ادوار کا پتہ چلتا ہے اور یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس دور میں مسلمان مہاجرین کس قدر شدید حالات و بحرانوں کا شکار ہوئے، البتہ یہ بات یاد رہے کہ اس واقعہ کا آیت مبارکہ کے نزول سے تعلق نہیں اور نہ ہی ہم نے اس آیت کے شانِ نزول کے طور پر ذکر کیا ہے،

دین ابراہیمیؑ کی وضاحت

تفسیر العیاشی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد گرامی مذکور ہے کہ آپؑ نے آیۂ مبارکہ "مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا" کی تفسیر میں ارشاد فرمایا:

قال امير المؤمنينؑ: لا يهودياً يصلي الى المغرب ولا نصرانياً يصلي الى المشرق لكن كان حنيفاً مسلماً علىٰ دين محمدؐ"

حضرت امیر المؤمنینؑ نے فرمایا ہے کہ حضرت ابراہیم نہ یہودی تھے کہ مغرب کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے اور نہ نصرانی تھے کہ مشرق کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے بلکہ وہ خالص مسلمان اور دین محمدیؐ پر تھے۔

(تفسیر العیاشی ج ۱ ص ۱۷۷)

سابق الذکر مطالب میں اس حدیث کے معنی کی وضاحت ہو چکی ہے اور یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ حضرت ابراہیم کا دین محمدیؐ پر ہونا کیونکر ہے؟ اس روایت میں کعبہ کا قبلہ قرار دیا جانا بھی مورد توجہ واقعہ ہوا ہے، کیونکہ قبلہ کی تبدیلی کا حکم مدینہ منورہ میں نازل ہوا اور شہر مکہ اور خانہ کعبہ تقریباً مدینہ کی جنوبی سمت میں واقع ہے، چونکہ یہودیوں اور نصرانیوں نے کعبہ کا قبلہ ہونا تسلیم نہیں کیا لہٰذا وہ اس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنے کی بجائے مغرب و مشرق کی طرف رخ کرنے لگے چنانچہ یہودی نے مکہ سے مغرب کی جانب بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنے لگے کیونکہ بیت المقدس مدینہ کی نسبت غربی سمت میں واقع ہے

اور نصاریٰ تو مشرق کی طرف ہی منہ کر کے نماز پڑھتے تھے، اس حوالہ سے ان دونوں گروہوں کو حد وسط سے روگردان قرار دیا گیا چنانچہ اس سلسلہ میں آیت مبارکہ کے الفاظ میں کہ جو مسلمانوں کے بارے میں وارد ہوئے انہیں ''درمیانی امت'' سے موسوم کیا گیا (وکذلک جعلناکم امۃ وسطاً......)، بہرحال یہ روایت اس سے زیادہ کسی مطلب کو بیان نہیں کرتی بلکہ اسی خاص ولطیف نکتہ کی عکاسی کرتی ہے جو ہم نے بیان کیا ہے (یعنی ابراہیمؑ کا دین محمدؐ پر ہونا اور مشرق کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرنا مدینہ سے جغرافیائی سمت کے حوالہ سے ہے)

''حنیف'' کا معنی

کافی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا: ''حنیف'' کا معنی خالص ومخلص ہے یعنی حضرت ابراہیمؑ خالص توحید پرست تھے اور ان کے بارے میں شرک و بت پرستی کا ذرہ بھر گمان نہیں ہو سکتا۔ (کافی ج ۲ ص ۱۵ ح ۱)

آنحضرتؐ سے دوستی ودشمنی کا معیار

تفسیر ''مجمع البیان'' میں آیت مبارکہ ''اِنَّ اَوْلَی النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ......'' کے ذیل میں مذکور ہے کہ حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

''ان اولی الناس بالانبیاء اعملهم بما جاؤا به، ثم تلا هٰذه الآیة وقال: ان ولی محمد من اطاع اللّٰه وان بعدت لحمتهٗ، و ان عدو محمد من عصی اللّٰه وان قربت لحمتهٗ''

(بے شک لوگوں میں سے انبیاء علیہم السلام کا زیادہ حقدار وہ ہے جو ان کے لائے ہوئے دین وآئین پر زیادہ عمل پیرا ہو، اس کے بعد امامؑ نے یہ آیت تلاوت فرمائی (اِنَّ اَوْلَی النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ ......)، اور فرمایا: بے شک حضرت محمدؐ کا دوست ومحبّ وہ ہے جو خدا کا اطاعت گزار ہو خواہ وہ آنحضرتؐ کا قریبی نہ ہو، اور حضرت محمدؐ کا دشمن وہ ہے جو خدا کی نافرمانی کرتا ہو خواہ وہ آنحضرتؐ کا قرابت دار کیوں نہ ہو)،

(تفسیر مجمع البیان ج ۲ ص ۴۵۸)

آئمہؑ اطہار اور ان کے پیروکار

کافی اور تفسیر العیاشی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشادِ گرامی مذکور ہے جس میں آپؑ نے فرمایا:
حضرت ابراہیمؑ کے زیادہ حقدار آئمہ اور ان کے پیروکار ہیں، (هم الائمة و من اتبعهم)
(ملاحظہ ہو: کافی جلد۱ صفحہ ۴۱۶ حدیث ۲۰، تفسیر العیاشی جلد۱ صفحہ ۱۷۷ حدیث ۶۲)

تم آلِ محمدؐ میں سے ہو!

تفسیر قمی اور تفسیر العیاشی میں عمر بن اذینہ کے حوالہ سے ایک روایت ذکر کی گئی ہے کہ امامؑ نے اس سے فرمایا:
"انتم واللّٰه من 'ال محمد" (خدا کی قسم! تم آل محمد میں سے ہو) عمر بن اذینہ نے عرض کی: میری جان آپ پر فدا ہو، کیا ہم انہی میں سے ہیں؟ امامؑ نے ارشاد فرمایا: "نعم واللّٰه من انفسهم؟" ہاں! خدا کی قسم! خود انہی میں سے ہو، (امامؑ نے اس جملہ کو تین بار دہرایا) پھر امامؑ نے میری طرف اور میں نے امامؑ کی طرف بھرپور نگاہ کی، پھر امامؑ نے مجھ سے مخاطب ہو کر یہ آیت تلاوت فرمائی: "ان اولی الناس......،"
(تفسیر العیاشی جلد۱، صفحہ ۱۷۷، تفسیر قمی جلد۱ صفحہ ۱۰۵)

تبدیلیٔ قبلہ اور اہلِ کتاب کا ردِ عمل

تفسیر قمی میں آیت مبارکہ "وَقَالَتْ طَّآ ئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا" کی تفسیر میں حضرت امام محمد باقرؑ علیہ السلام کا ارشادِ گرامی مذکور ہے کہ آپؑ نے فرمایا:
" ان رسول اللّٰهؐ لما قدم المدينة وهو يصلى نحو بيت المقدس اعجب ذلک القوم فلما صرفه الله عن بيت المقدس الٰى بيت الله الحرام وجدت اليهود من ذلک، وكان صرف القبلة صلٰوة الظهر، فقالوا صلى محمد الغداة واستقبل قبلتنا فآمنوا بالذى انزل علٰى محمد وجه النهار واكفروا 'اخرهٗ يعنون القبيلة حين استقبل رسول اللّٰهؐ المسجد الحرام "
(جب حضرت پیغمبر اسلامؐ مدینہ تشریف لائے تو بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرتے تھے جس سے

سب لوگ خوش تھے اور جب تبدیلی قبلہ کا حکم آیا اور خداوند عالم نے بیت المقدس کی بجائے خانہ کعبہ کی طرف رخ کرنے کا فرمان جاری کیا تو یہ بات یہودیوں کو سخت ناگوار گزری، قبلہ کی تبدیلی نماز ظہر کے دوران ہوئی، یہودیوں نے کہا کہ محمدؐ نے صبح کی نماز ہمارے قبلہ یعنی بیت المقدس کی طرف منہ کر کے پڑھی لہٰذا تم اسی پر ایمان لاؤ جو محمدؐ پر صبح کے وقت نازل ہوا اور جو ان پر دن کے آخر میں نازل ہوا اس کا انکار کرو، دراصل "دن کے آخر" سے ان کا مقصد ظہر کے وقت تبدیلی قبلہ کا حکم ہے)

(تفسیر قمی ج ۱ ص ۱۰۴)

اس روایت میں جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں جملہ "وَجْهَ النَّهَارِ" کو جملہ "أُنْزِلَ" کا ظرف قرار دیا گیا ہے نہ کہ "آمَنُوا" کا، اس سلسلہ میں ہم اپنے سابقہ بیانات میں وضاحت کر چکے ہیں۔

یہودیوں کی شاطرانہ کوشش

تفسیر "درمنثور" میں مذکور ہے کہ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے عوفی کے حوالہ سے آیت مبارکہ "وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ...... الخ" کی تفسیر میں ابن عباس کی روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: **"ان طائفة من اليهود قالت : اذا لقيتم اصحاب محمد اول النهار فآمنوا، واذا كان آخرهٔ فصلوا صلوٰتكم لعلهم يقولون: هؤلاء اهل الكتاب وهم اعلم منا لعلهم ينقلبون عن دينهم"**

یہودیوں کے ایک گروہ نے کہا کہ جب تم دن کی ابتداء میں محمدؐ کے ساتھیوں سے ملو تو ایمان لے آؤ (ایمان لانے کا اظہار کرو)، اور جب دن کا آخر ہو تو اپنی نمازیں...... اپنے طور پر بیت المقدس کی طرف رخ کر کے...... ادا کرو، شاید وہ آپس میں کہیں کہ یہ تو اہل کتاب ہیں اور یہ ہم سے زیادہ دین و شریعت کا علم رکھتے ہیں، ممکن ہے اس طرح بات کرنے سے وہ (مسلمان) اپنے دین سے روگردانی کر لیں۔ (تفسیر درمنثور ج ۲ ص ۴۳)

مؤلف تفسیر درمنثور نے اس روایت کو سدی اور مجاہد کے حوالہ سے بھی ذکر کیا ہے۔

عہد الٰہی کو بیچنے کا انجام

کافی میں آیت مبارکہ "إِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللهِ...... الخ" کی تفسیر میں امام محمد باقر علیہ السلام کا ارشاد گرامی مذکور ہے کہ آپؑ نے فرمایا: قرآن مجید میں "عہد" کی بابت یہ آیت نازل ہوئی ہے: "إِنَّ الَّذِيْنَ

يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۠ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ، **والخلاق النصيب، فمن لم يكن له نصيب فی الآخرة فبای شیئ یدخل الجنة،**" اس آیت میں لفظ "خلاق" ذکر ہوا ہے جس کا معنی حصہ ہے تو جس شخص کا آخرت میں کوئی حصہ نہ ہو وہ بہشت میں کیسے داخل ہو سکتا ہے؟ (کتاب کافی ج ۲ ص ۲۸)

ایک تفسیری بحث

کتاب "امالی" میں شیخؒ نے اپنے اسناد سے عدی بن عدی کے حوالہ سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے اپنے والد سے روایت بیان کی کہ انہوں نے کہا "امرؤ القیس" کا حضر موت کے ایک شخص سے کسی زمین کی ملکیت کے بارے میں جھگڑا تھا وہ دونوں حضرت پیغمبر اسلامؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپؐ نے امرؤالقیس سے پوچھا: کیا تیرے پاس اس زمین کی مالکیت کا ثبوت ہے؟ اس نے کہا: نہیں، آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا: تو پھر مدعیٰ علیہ کی قسم کے مطابق فیصلہ ہوگا، اس نے کہا خدا کی قسم! اس طرح تو میری زمین میرے ہاتھ سے چلی جائے گی، آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا کہ اگر حقیقت میں زمین تیری ہے اور وہ جھوٹی قسم کھا کر تیری زمین لے گا تو خداوند عالم قیامت کے دن اس کی طرف نگاہ ہی نہ کرے گا اور نہ ہی اس کا تزکیہ کرے گا بلکہ وہ دردناک عذاب میں مبتلا ہوگا، یہ سننا ہی تھا تو وہ شخص خوفزدہ ہو گیا اور اس نے وہ زمین امرؤالقیس کو واپس کر دی۔ (کتاب امالی، ج ۱ ص ۳۶۸)

جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں اس روایت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ واقعہ ہی آیت مبارکہ کا شان نزول ہے اور اہل سنت کی اسناد سے متعدد روایات میں مذکور ہے کہ یہی واقعہ آیت کا شان نزول ہے، لیکن ان میں بھی تعارض پایا جاتا ہے اور وہ اس طرح کہ بعض روایات میں ہے کہ امرؤالقیس اور حضر موت کے ایک شخص کے درمیان نزاع تھا جیسا کہ مذکورہ بالا روایت میں ہے، اور بعض روایات میں ہے کہ اشعث بن قیس اور ایک یہودی شخص کے درمیان زمین کا جھگڑا تھا، اور بعض روایات میں ہے کہ یہ آیت ایک کافر کے بارے میں نازل ہوئی جو بازار میں کھڑا ہو کر سامان بیچ رہا تھا اور خدا کی قسمیں کھا کر کہہ رہا تھا کہ فلاں شخص یہ چیز اس قیمت پر خریدنا چاہتا تھا مگر میں نے نہیں دی، تو اس طرح وہ مسلمانوں کو دھوکہ دے کر زیادہ قیمت وصول کرنا چاہتا تھا، اس وقت یہ آیت اتری (اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ...... الخ)،

بہر حال آپ اس امر سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ ظاہر الآیۃ سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ سابقہ آیات میں مذکور مطالب کی علت و سبب کے بیان پر مشتمل ہے لہٰذا اس سلسلہ میں جو روایات وارد ہوئی ہیں اور ان میں مختلف واقعات کا حوالہ دیا گیا ہے تو وہ مختلف واقعات کی آیت پر تطبیق کے باب سے ہے نہ یہ کہ وہ آیت کے شان نزول کے بیان میں ہیں۔

آیات ۷۹ ، ۸۰

○ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝۷۹

○ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ؕ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ
مُّسْلِمُوْنَ ۝۸۰

ترجمہ

○ '' کسی بشر کے لئے روا نہیں کہ جسے خدا کتاب، اقتدار اور نبوت دے تو وہ لوگوں سے
کہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میری عبادت کرو، لیکن (وہ کہتا ہے) کہ تم اللہ والے بنو کیونکہ
تم کتاب کی تعلیم دیتے ہو اور کتاب کو پڑھتے ہو '' (۷۹)

○ '' اور وہ تمہیں ہرگز یہ حکم نہیں دیتا کہ تم فرشتوں اور نبیوں کو رب بناؤ، کیا وہ تمہیں کفر
اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے جبکہ تم مسلمان ہو چکے ہو '' (۸۰)

تفسیر و بیان

ان آیات مبارکہ کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے مربوط آیات کے فوراً بعد ذکر کیا جانا اس بات کا اشارہ دیتا ہے کہ یہ آیات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پاکیزگی اور ان کی ذاتِ والا صفات کا ان مطالب سے منزہ ہونا ثابت کرتی ہیں جو اہلِ کتاب میں سے نصاریٰ آنجنابؑ کی طرف منسوب کرتے ہیں، گویا آیات کا مضمون یوں ہے :

جس طرح تم گمان کرتے ہو عیسیٰ ویسے نہیں، وہ نہ تو رب ہے اور نہ وہ خود رب ہونے کا دعویدار ہے، اس کے رب نہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ وہ بشری مخلوق ہے، اسے اس کی ماں نے جنا اور گہوارہ میں اس کی پرورش کی، بات صرف اتنی ہے کہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہوا ہے اور یہ اسی طرح سے ہے جیسے آدمؑ کی خلقت، ماں اور باپ کے بغیر ہوئی، لہٰذا اللہ کے نزدیک اس کی مثال آدم جیسی ہے، اور جہاں تک دوسری بات کا تعلق ہے تو اس کی دلیل یہ ہے کہ وہ نبی ہے کہ جسے کتاب، اقتدار اور نبوت عطا کی گئی ہے، تو جو اس طرح کا ہو وہ بندگیٔ خدا کا اعزاز ہرگز ہاتھ سے نہ جانے دے گا اور اس سے ہرگز یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ وہ لوگوں سے کہے کہ مجھے رب مانو اور خدا کو چھوڑ کر میری عبادت کرو، اسی طرح یہ بھی اس کے لئے روا نہیں کہ اپنے علاوہ کسی دوسرے بندۂ خدا مثلاً کسی بادشاہ یا نبی کے بارے میں اس طرح کی بات کرے کہ بندگانِ خدا میں سے کسی کو وہ منصب دے جو اس کا حق نہ ہو یا انبیاء الٰہیؑ میں سے کسی سے اس کے خدائی منصب مثلاً رسالت کی نفی کر کے اس سے خدا کا عطا کردہ حق چھین لے۔

خدائی ضابطۂ اخلاق

○ " مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ "

(کسی بشر کے لیے روا نہیں کہ جسے اللہ کتاب، اقتدار و نبوت عطا کرے کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میرے عبادت گزار بنو)

لفظ "بشر" لفظ "انسان" کے مترادف ہے، یہ لفظ ایک انسان اور کثیر انسانوں کے لئے یکساں استعمال ہوتا ہے یعنی

ایک انسان کو بھی '' بشر'' کہتے ہیں اور انسانوں کے ایک گروہ اور کثیر تعداد کو بھی ''بشر'' کہا جاتا ہے۔

لفظ ''بشر'' پر حرف لام یہاں ملکیت کا معنی دیتا ہے، اس بناء پر آیت کا معنیٰ یوں ہوگا کہ کوئی بشر اس کا مالک نہیں یعنی اسے حق حاصل نہیں، اس کی قرآنی مثالیں یہ ہیں:

سورۂ نور، آیت :۱۶

○ '' مَّا یَکُوۡنُ لَنَاۤ اَنۡ نَّتَکَلَّمَ بِہٰذَا ''

(ہمیں یہ حق حاصل نہیں کہ یہ بات زبان پر لائیں)

سورۂ آل عمران، آیت :۱۶۱

○ '' وَمَا کَانَ لِنَبِیٍّ اَنۡ یَّغُلَّ''

(کسی نبی کو حق حاصل نہیں کہ وہ خیانت کرے) یعنی کوئی نبی خیانت نہیں کرسکتا۔

جملہ '' اَنۡ یُّؤۡتِیَہُ اللّٰہُ الۡکِتٰبَ وَالۡحُکۡمَ وَالنُّبُوَّۃَ ''، حرف '' کَانَ'' (مَا کَانَ لِبَشَرٍ) کا اسم ہے، اس کے ساتھ ساتھ بعد والے جملہ ''ثُمَّ یَقُوۡلَ لِلنَّاسِ'' کے لئے مقدمہ وتمہید کی حیثیت رکھتا ہے، اور اس جملہ کا مقدمہ وتمہید کے طور پر یہاں ذکر کیا جانا جبکہ اس کے بغیر بھی آیت کا معنی درست وواضح تھا ظاہراً اس لئے ہے کہ جملہ ''ماکان لبشر'' کے معنی کی دوسری جہت معلوم رہے اور وہ یہ کہ اگر یوں کہا جاتا: ''ماکان لبشر ان یقول......'' (کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ لوگوں سے کہے......) تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ خدا کی طرف سے کسی انسان کو یہ حق نہیں دیا گیا جبکہ ممکن ہے وہ اس طرح کی بات خدا کی نافرمانی وسرکشی کرتے ہوئے کہے، لیکن جب یوں کہا جائے: مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنۡ یُّؤۡتِیَہُ اللّٰہُ الۡکِتٰبَ وَالۡحُکۡمَ وَالنُّبُوَّۃَ ثُمَّ یَقُوۡلَ لِلنَّاسِ......الخ'' (کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ جسے اللہ کتاب واقتدار اور نبوت عطا کرے تو وہ لوگوں سے کہے......) تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جب خداوند عالم کسی کو علم اور فقہ سے نوازے اور اسے حقائق سے آگاہی دلائے اور آغوش ربانی میں اس کی تربیت کرے تو اسے بندگی کے طور وطریقوں کے دائرہ سے باہر جانے نہیں دیتا اور نہ ہی اسے یہ اختیار دیتا ہے کہ وہ جو چاہے انجام دے خواہ وہ اس کا حق نہ بھی ہو! جیسا کہ خداوند عالم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تذکرہ میں ارشاد فرمایا:

سورۂ مائدہ، آیت ۱۱۶:

○ '' وَاِذۡ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیۡسَی ابۡنَ مَرۡیَمَ ءَاَنۡتَ قُلۡتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوۡنِیۡ وَاُمِّیَ اِلٰـہَیۡنِ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ ؕ قَالَ سُبۡحٰنَکَ مَا یَکُوۡنُ لِیۡۤ اَنۡ اَقُوۡلَ مَا لَیۡسَ لِیۡ ٭ بِحَقٍّ ''

(اور جب اللہ نے کہا: اے عیسیٰ بن مریم! کیا تو نے لوگوں سے کہا ہے کہ اللہ کو چھوڑ کر مجھے اور میری ماں کو دو معبود

مانو؟ اس نے کہا: تیری ذات پاک ہے، میں ہرگز ایسا نہیں کر سکتا کہ وہ بات کہوں جس کا مجھے حق حاصل نہیں)

اس بیان سے جملہ " اَنْ یُّؤْتِیَهُ اللّٰهُ ..... الخ" سے ایک اہم نکتہ معلوم ہوجاتا ہے وروہ یہ کہ یہاں فعل ماضی کی بجائے فعل مضارع استعمال ہوا ہے یعنی "**ما کان لبشر اتاہ اللہ الکتاب والحکم والنبوۃ ان یقول**" (کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ جسے خدا نے کتاب واقتدار اور نبوت عطا کی ہو وہ لوگوں سے کہے......) کی بجائے یوں کہا گیا: "مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ......" (کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ جسے خدا کتاب واقتدار اور نبوت عطا کرے تو وہ لوگوں سے کہے......) اور یہ اس لئے ہوا کہ اگر فعل ماضی استعمال کیا جاتا تو آیت کا معنی یوں ہوتا کہ خدا نے کسی نبی کو یہ اجازت نہیں دی کہ وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم خدا کو چھوڑ کر میری بندگی کرو (جبکہ اس طرح کی اجازت دینا ممکن تھا) لیکن جملہ " اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ" سے یہ سمجھانا مقصود ہے کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کو چھوڑ کر میری عبادت کرو، یعنی ربانی تربیت اور خدائی ہدیت اپنے مقصد سے تخلف پذیر نہیں ہوسکتی، چنانچہ ایک مقام پر یوں ارشاد الٰہی ہے:

سورۂ انعام، آیت :۸۹

○ "اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ"

(یہ وہ افراد ہیں جنہیں ہم نے کتاب، حکومت اور نبوت عطا کی، اب اگر لوگ اس (شریعت) کا انکار کریں......انہیں تسلیم نہ کریں......تو ہم نے اس (شریعت) پر کچھ لوگ مقرر کردیئے ہیں جو ہرگز اس کا انکار کرنے والے نہیں)

بہرحال آیت سے یہ معنی سمجھا جاتا ہے کہ کسی انسان کے بس میں نہیں......اسے یہ حق واختیار حاصل نہیں......کہ وہ ان خدائی نعمتوں یعنی کتاب واقتدار ونبوت سے بہرہ ور ہو اور اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کو اپنی پرستش کی دعوت دے، تو آیت مبارکہ اپنے سیاق کے حوالہ سے درج ذیل آیت کے مشابہ ہے:

سورۂ نسآء، آیت :۱۷۳

○ لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ (تا) وَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَاسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا"

(نہ مسیح اس کا انکار کرسکتا ہے کہ وہ بندۂ خدا ہے اور نہ ہی مقرب فرشتے! (تا) اور جو لوگ اس کا انکار کرتے ہیں اور تکبر سے کام لیتے ہیں تو خدا انہیں دردناک عذاب میں مبتلا کرے گا اور وہ خدا کے سوا اپنے لئے کوئی ولی ومددگار نہیں پائیں گے)

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ مسیحؑ اور مقرب فرشتوں کا مقام ومنزلت اس سے کہیں بالاتر ہے کہ وہ خدا کی عبادت وپرستش سے انکار کریں...... یا اسے عار سمجھیں...... کیونکہ خدا کی عبادت سے روگردانی وانکار دردناک عذاب کا سبب بنتا ہے، اور یہ کیونکہ ممکن ہے کہ خداوند عالم اپنے مکرم نبیوں اور اپنے مقرب فرشتوں کو عذاب میں مبتلا کرے۔

ایک ادبی سوال اور اس کا جواب

اس مقام پر ممکن ہے کوئی شخص یہ سوال کرے کہ آیت مبارکہ میں حرف ''ثُمَّ'' ذکر ہوا ہے (ثُمَّ یَقُوْلَ لِلنَّاسِ......) اور اردو میں اس کا ترجمہ ''پھر'' کیا جاتا ہے کہ جس میں ''اس کے بعد'' کا مفہوم پایا جاتا ہے تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس سے ''اس کے باوجود'' یا ''اس کے ساتھ'' کا معنی مراد لیں جیسا کہ مذکورہ بالا بیان میں مراد لیا گیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ہم نے اپنے بیان میں یہ کہا ہے کہ ادعائے نبوت اور ادعائے ربوبیت اکٹھے نہیں ہوسکتے، یعنی ایسا ہونا ممکن نہیں کہ ایک شخص اپنے آپ کو خدا کا نبی کہلائے اور پھر لوگوں سے کہے کہ میں خدا ہوں میری عبادت کرو، اور اکٹھا ہونا اور ساتھ ساتھ ہونا جس طرح ان دو چیزوں کے درمیان قابل تصور ہے جو زمانا متحد ہوں یعنی ایک ہی وقت میں پائی جائیں، اسی طرح ان دو چیزوں کے درمیان بھی قابل تصور ہے جو ایک دوسرے کے بعد قرار پائیں، لہٰذا جو شخص نبوت کے منصب پر فائز ہونے کے بعد لوگوں کو اپنی عبادت کی دعوت دے گویا اس نے ان دونوں کو اکٹھا کرلیا یعنی حق اور باطل کو یکجا کردیا، تو یہ اسی طرح ہے جیسے یہ کہا جائے کہ اس نے نبوت کے منصب پر فائز ہونے کے باوجود اور اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کو اپنی بندگی کی دعوت دی،

اور جملہ ''کُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ'' میں لفظ ''عباد'' لفظ عبید کی طرح ''عبد'' کی جمع کا صیغہ ہے، ان دونوں میں یہ فرق ہے کہ لفظ ''عباد'' عام طور پر خدا کی بندگی اور لفظ ''عبید'' بندوں کی بندگی کے موارد میں استعمال ہوتا ہے چنانچہ کہا جاتا ہے: ''عبادالله''، اور بندوں کی بندگی میں ''عبادالناس'' کی بجائے ''عبیدالناس'' کہا جاتا ہے۔ اور یہاں ''عِبَادًا لِّیْ'' کے ساتھ ''مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ'' اس لئے کہا کہ مقام اسی کا متقاضی ہے کیونکہ خداوند عالم کے ہاں صرف وہی عبادت قابل قبول ہوتی ہے جو خالص اس کی رضا وخوشنودی کے لئے انجام دی جائے جیسا کہ درج ذیل آیت

مبارکہ میں ارشاد ہوا:

سورۂ زمر، آیت :۳

O " اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ؕ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ؕ۬ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ "

(آگاہ رہو کہ خالص دین صرف خدا کے لئے ہے، اور جو لوگ خدا کے علاوہ اولیاء بناتے ہیں (وہ کہتے ہیں) ہم ان کی عبادت نہیں کرتے مگر صرف اس لئے کہ وہ ہمیں خدا کے قریب کردیں، بے شک خدا ہی ان کے درمیان پائے جانے والے اختلافی امر کے بارے میں فیصلہ کرے گا کیونکہ خدا کسی جھوٹے، کافر کو ہدایت سے نہیں نوازتا)،

تو اس میں خداوند عالم نے اس شخص کی عبادت کو رد کردیا جو اس کی عبادت کے ساتھ اس کے غیر کی عبادت کرے خواہ وہ تقرب، توسل اور شفاعت کی غرض سے کیوں نہ ہو،

اس کے ساتھ ساتھ یہ نکتہ بھی قابل توجہ و لازم الالتفات ہے کہ عبادت کی حقیقت ہی یہ ہے کہ معبود کی استقلالی حیثیت کا عقیدہ رکھا جائے، یہاں تک کہ شریک قرار دینے میں بھی استقلالی حوالہ ملحوظ ہے کیونکہ شریک، شریک ہونے کی حیثیت میں بھی اپنی حد تک ایک طرح کا استقلالی حوالہ و حیثیت رکھتا ہے، اور جہاں تک خداوند عالم کی ذات کا تعلق ہے تو اسے مطلق ربوبیت حاصل ہے اور اسے رب اور معبود ماننا اسی صورت میں صحیح و کامل قرار دیا جاسکتا ہے جب اس کے علاوہ ہر چیز کے استقلال کی ہر حوالہ سے نفی کی جائے، اس بناء پر غیر اللہ کی عبادت، صرف اسی کی عبادت ہی ہوگی اس کا خدا کی عبادت سے کوئی تعلق نہ ہوگا خواہ اس کے ساتھ خدا کو شریک عبادت کیوں نہ قرار دیں......لیکن اس کا خدا سے کوئی تعلق نہ ہوگا کیونکہ اس میں خدا کے کامل استقلال کی عملی نفی کا پہلو پایا جاتا ہے......،

خدا کی ربوبیت کی دعوت

O " وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ "

(لیکن تم اللہ والے بنو کیونکہ تم کتاب کی تعلیم دیتے ہو ور تم اسے پڑھتے ہو)

"رَبّٰنِيّٖنَ" جمع کا صیغہ ہے اس کا مفرد "ربانی" ہے، اس کی نسبت "رب" کی طرف ہے، لفظی طور پر اسے

"ربی" ہونا چاہیے تھا لیکن اس میں الف اور نون کا اضافہ کیا گیا اور "ربانی" کہا گیا، یہ اضافہ نسبت کی عظمت کو ظاہر کرنے کے لئے ہے جیسا کہ "لحیانی"، اسے کہتے ہیں جس کی داڑھی (لحیہ) لمبی ہو جبکہ لفظ "لحیہ" کی بناء پر "لحیی" کہنا چاہئے لیکن الف ونون کے اضافہ سے اس کے لمبا ہونے کا بیان مقصود ہوتا ہے، عربی زبان میں اس طرح کے الفاظ کثرت سے پائے جاتے ہیں، لہذا لفظ "ربانی" رب کے ساتھ شدید اختصاص اور اس کی بندگی وعبادت میں کثیر الاشتغال ہونے کا معنی دیتا ہے۔

اور لفظ "بِمَا کُنۡتُمۡ" میں حرف با سبب کے لئے ہے اور حرف "ما" مصدر ہے، اور کلام میں قول اور معنی دونوں کے تصور پر آیت کا معنی یوں کیا جائے گا: "لیکن وہ کہتا ہے کہ تم رب والے بنو کیونکہ تم لوگوں کو کتاب کی تعلیم دیتے ہو اور آپس میں اسے پڑھتے رہتے ہو"، "**ولکن یقول: کونوا ربانیین بسبب تعلیمکم الکتاب للناس ودراستکم ایاہ فیما بینکم**"

لفظ "دراسة" (تَدۡرُسُوۡنَ) میں "تعلیم" کی نسبت زیادہ خصوصیت کا پہلو پایا جاتا ہے کیونکہ اسے عام طور پر کتاب پڑھنے سے حاصل ہونے والے علم (تحقیق) اور خوب توجہ کے ساتھ پڑھنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، لغت کے مشہور دانشور راغب اصفہانی نے لکھا ہے کہ "درس الدار" کا معنی گھر کے نشان کا باقی رہ جانا ہے، اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ چیز جس کا نشان باقی رہ گیا ہو خود محو ونابود ہو جائے، اس بناء پر "درس" کا معنی محو ہو جانا کیا گیا ہے، اسی طرح جب کہا جاتا ہے: "درس الکتاب" (اس نے کتاب پڑھی) اور "درست العلم" (میں نے علم پڑھا) تو اس سے مراد اس حاصل کئے ہوئے علم کے اثر کو ذہن میں محفوظ کرنا ہے اور چونکہ بار بار پڑھنے سے ذہن میں محفوظ کرنا یقینی ہوتا ہے لہذا بار بار اور لگاتار وباقاعدگی سے پڑھنے کو حفظ کر لینے سے تعبیر کیا جاتا ہے چنانچہ قرآن مجید میں اس طرح ذکر ہوا ہے: ○ "ودرسوا ما فیہ" (اور انہوں نے اسے یاد کر لیا جو کچھ اس میں ہے)، اور زیر بحث آیت میں یوں ارشاد ہوا: ○ "بِمَا کُنۡتُمۡ تُعَلِّمُوۡنَ الۡکِتٰبَ وَبِمَا کُنۡتُمۡ تَدۡرُسُوۡنَ" (بہ سبب اس کے، جو تم کتاب کی تعلیم دیتے ہو اور بہ سبب اس کے، جو تم درس حاصل کرتے ہو)،

ایک مقام پر یوں ارشاد ہوا: ○ "وَمَاۤ اٰتَیۡنٰهُمۡ مِّنۡ کُتُبٍ یَّدۡرُسُوۡنَهَا" (اور ہم نے اپنی جو کتاب انہیں دی وہ اس سے درس لیتے ہیں)،

خلاصہ کلام یہ کہ جو انسان اس مقام ومنصب پر فائز ہو اس کی شان وشیوہ یہ ہے کہ وہ تمہیں ایمان کے زیور سے آراستہ ہونے کی دعوت دیتا ہے اور جس کتاب کی تم تعلیم دیتے ہو اور اس سے معارف الٰہیہ کے بنیادی اصولوں کا درس حاصل کرتے ہو اس پر یقین رکھنے کا کہتا ہے اور وہ تمہیں پاکیزہ کردار اور بلند پایہ اخلاق اپنانے اور ان اعمال صالحہ بجالانے کی تاکید

کرتا ہے جن کی لوگوں کو تم دعوت دیتے ہوتا کہ تم اس وسیلہ سے مادی دنیا کی آلودگی سے دور ہو کر اپنے پروردگار کی بارگاہ اقدس تک پہنچ جاؤ اور نتیجتاً علمائے ربانی بن جاؤ۔

او چونکہ جملہ "بِمَا کُنْتُمْ" فعل ماضی پر مشتمل ہے جو کہ گزرے ہوئے زمانہ میں وقوع پذیر ہونے والے کام پر دلالت کرتا ہے لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ آیت مبارکہ میں نصاریٰ پر اعتراض آمیز انداز سے اشارہ کیا گیا ہے کہ ان میں سے کچھ افراد کہتے ہیں کہ عیسیٰ نے ہی انہیں اپنے بارے میں بتایا ہے کہ وہ خدا کا بیٹا ہے اور ان کے اس بیان کی تفسیر بعض نصاریٰ نے کلمۃ اللہ ہونے سے کی ہے یعنی انہوں نے کہا کہ بیٹا ہونے سے مراد کلمۂ خدا ہونا ہے، اور یہ باتیں انہوں نے اس لئے کیں کہ بنی اسرائیل وہ واحد قوم تھی جن کے پاس آسمانی کتاب تھی جسے وہ ایک دوسرے کو تعلیم دیتے اور اس سے معارف و معالم حاصل کرتے تھے اور اس میں مذکور مطالب کے بارے میں آپس میں بحث و گفتگو کرتے تھے، چنانچہ وہ کتاب کی بابت آپس میں شدید اختلاف رائے کا شکار ہو گئے جس کا نتیجہ مطالب کی تبدیلی اور تحریف کی صورت میں ظاہر ہوا، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اسی لئے مبعوث کیا گیا کہ وہ ان کے درمیان پائے جانے والے اختلافی موارد میں ان کی رہنمائی کریں اور جو بعض چیزیں ان پر حرام کی گئیں وہ حلال کریں، خلاصہ یہ کہ انہیں تعلیم و تدریس کے فرائض کی ادائیگی اور دینی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی دعوت دیں، یعنی کتاب الٰہی کی تعلیم اور اس سے علوم و معارف کسب کرنے میں ربانی یعنی خدا سے وابستہ و پیوستہ ہوں (خدا والے بنیں)،

بہر حال آیت مبارکہ کی ایک حوالہ سے حضرت پیغمبر اسلامؐ پر تطبیق بھی ممکن ہے کیونکہ آپؐ بھی ان اہل کتاب کو مذکورہ بالا امور کی دعوت دیتے تھے جو کتاب الٰہی کی تعلیم دیتے اور اس سے درس لیتے تھے لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اس کی تطبیق اس لئے زیادہ واضح طور پر ہے کہ وہ آنحضرتؐ سے پہلے تھے اور ان کی رسالت خاص طور پر بنی اسرائیل کے لئے تھی جبکہ حضرت پیغمبر اسلامؐ ایسے نہ تھے بلکہ ان کی رسالت کا دائرہ قیامت تک وسعت رکھتا ہے، البتہ دیگر اولوالعزم انبیاء اور صاحبان کتاب مثلاً حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ پر اس آیت کی تطبیق اس لئے نہیں ہو سکتی کہ ان کا واسطہ اہل کتاب لوگوں سے نہ تھا اور نہ ہی وہ کسی اہل کتاب قوم کے لئے جو کتاب کی تعلیم و تدریس میں مشغول ہو مبعوث ہوئے تھے۔

غلط الزام کی دوسری صورت

○ " وَلَا يَأْمُرَكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ أَرْبَابًا"
(اور وہ تمہیں حکم نہیں دیتا کہ تم فرشتوں اور نبیوں کو رب بناؤ)

یہ جملہ "یَقُوْلَ" پر عطف ہے البتہ یہ اس مشہور قرأت کی بناء پر ہے جس میں فعل مضارع "یَأْمُرَ" کو رَ پر زبر کے ساتھ پڑھا جاتا ہے کیونکہ "یَقُوْلَ" بھی منصوب ہے یعنی لام پر زبر کے ساتھ پڑھا جاتا ہے، اس طرح دونوں جملوں کے ربط کے ساتھ آیت مبارکہ کا معنی یوں ہوگا: "کسی انسان کے لئے یہ ممکن نہیں کہ جسے خدا کی طرف سے کتاب و اقتدار اور نبوت عطا کی گئی ہو وہ لوگوں سے کہے کہ خدا کو چھوڑ کر مجھے رب مانو یا انہیں حکم دے کر فرشتوں اور نبیوں کو رب مانو، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب میں سے کچھ لوگ ایسے تھے جو فرشتوں کو خدا مانتے تھے جیسے صائبین، اور وہ لوگ اسے دینی اصول قرار دیتے تھے، اور کچھ لوگ ایسے تھے جو فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے جیسے زمانہ جاہلیت کے عرب، اور وہ دعویٰ کرتے تھے کہ وہ حضرت ابراہیمؑ کے دین کے پیروکار ہیں۔

یہ تو تھا فرشتوں کو رب قرار دینے کا مسئلہ، اور جہاں تک نبیوں کو رب قرار دینے کا مسئلہ ہے تو وہ یہودیوں کا عقیدہ تھا اور وہ برملا کہتے تھے کہ "عزیر ابن اللّٰہ" (عزیر خدا کا بیٹا ہے) چنانچہ اس کا تذکرہ قرآن مجید میں انہی لفظوں میں ہوا ہے حالانکہ موسیٰ علیہ السلام نے ان کے لئے اس طرح کی بات کو روا قرار نہیں دیا تھا اور نہ ہی تورات میں اس کی بابت کوئی تذکرہ آیا ہے بلکہ تورات میں صرف خداوند عالم کی یکتائی اور ایک ہی رب کی بات ہوئی ہے، اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے لئے اس طرح کا عقیدہ رکھنا جائز قرار دیا ہوتا تو انہیں اس کا حکم بھی دیتے، مگر ان کی شان و مقام اس سے بالاتر ہے کہ وہ کسی کو شرک کی راہ پر لائیں،

آیات کے سیاق کی بابت ایک اہم نکتہ

یہاں یہ مطلب قابل ذکر ہے کہ زیر بحث دو آیتیں یعنی " ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ" اور " وَلَا يَأْمُرَكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ أَرْبَابًا " دو حوالوں سے سیاق میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں، وہ اس طرح کہ پہلی آیت میں مخاطبین عام افرادِ بشر (الناس) ہیں جبکہ دوسری آیت میں انہی افراد کو مخاطب قرار دیا گیا ہے جو

آیت کے اصل مخاطب ہیں (یَأْمُرَكُمْ)، اور دوسرا یہ کہ پہلی آیت میں معبود بنانے کی بات ہے (كُونُوا عِبَادًا لِّي) جبکہ دوسری آیت میں رب قرار دینے کا حکم ہے" أَرْبَابًا")۔

ان دو آیتوں کے سیاق کے مختلف ہونے کی وجہ یہ ہے کہ پہلی صورت میں چونکہ سلسلۂ کلام نصاریٰ کو عیسیٰؑ کی عبادت کرنے پر مورد اعتراض قرار دینے میں تھا کہ وہ صراحت کے ساتھ انہیں معبود سمجھتے تھے اور اس عقیدہ کو خود حضرت عیسیٰؑ کی دینی دعوت سے منسوب کرتے تھے اور کہتے تھے کہ انہوں نے ہی کہا ہے کہ میرے عبادت گزار بنو (كُونُوا عِبَادًا لِّي)، جبکہ فرشتوں اور نبیوں کو معبود قرار دینے کی بجائے انہیں رب (أَرْبَابًا) قرار دینے کی بات ہوئی، اور اس معنی میں ہے جو عیسیٰؑ کے علاوہ دوسروں کے بارے میں کہا گیا کیونکہ اس بناء پر وہ الوہیت سے التزامی صورت میں تضاد کی حامل ہے نہ کہ صراحت کے ساتھ ! یہی وجہ ہے کہ " الهة " کی بجائے "أَرْبَابًا" کہا گیا ہے۔

اور سیاق کے مختلف ہونے کی دوسری صورت کا سبب یہ ہے کہ دونوں جملوں میں جو حکم مذکور ہے یعنی "كُونُوا عِبَادًا لِّي" (میرے عبادت گزار بنو)، "يَأْمُرَكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا " (وہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم بناؤ) اس کے مخاطبین اگر کوئی ہو سکتے ہیں تو وہ اہل کتاب اور اس زمانہ کے عرب ہیں لیکن جو اہم بات قابل توجہ ہے وہ یہ کہ پہلی آیت میں " قول" (یقول) جبکہ دوسری آیت میں "امر" (يَأْمُرَكُمْ) استعمال ہوا ہے اور "قول" بالمشافہ اور آمنے سامنے بات کرنے کے موارد میں استعمال ہوتا ہے جبکہ آیت کے زمانہ نزول میں موجود لوگ حضرت عیسیٰؑ یا حضرت موسیٰؑ کے دور میں موجود نہ تھے، اس لئے ضروری تھا کہ..... "ثم يقول لكم" (پھر وہ تم سے کہے) کی بجائے یوں کہا جائے: "ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ"، لیکن جہاں تک "امــــر" کا تعلق ہے کہ جو دوسری آیت میں ذکر ہوا ہے (يَأْمُرَكُمْ) تو اس میں بالمشافہ ہونا ضروری نہیں بلکہ وہ غائب کے بارے میں ممکن ہے کیونکہ جو حکم اسلاف اور پہلے گزرے ہوئے لوگوں کے بارے میں ہو وہ اخلاف یعنی بعد میں آنے والوں کے لئے بھی ہو سکتا ہے جب وہ ایک ہی قوم کے افراد ہوں، جبکہ "قــول" اور بات کرنے میں آواز کا کانوں تک پہنچانا مقصود ہوتا ہے لہٰذا وہ بالمشافہ اور آمنے سامنے ہونے کا متقاضی ہوتا ہے سوائے ان موارد کے کہ جن میں قول سے فقط مطلب و مطلوب سے آگاہی دلانا مقصود ہو۔

بنابرایں دونوں آیتوں کے سیاق میں بنیادی نکتہ مخاطبین کا حاضر و موجود ہونا اور صیغۂ جمع کے ساتھ ان سب کو مخاطب قرار دینا ہے جیسا کہ دوسری آیت میں یہ نکتہ ملحوظ ہے "وَلَا يَأْمُرَكُمْ......" ......اور پہلی آیت میں اس سیاق کا ملحوظ نہ ہونا اسی وجہ سے ہے جو ذکر ہو چکی ہے......،

اسلام کے بعد کفر؟

○ " اَیَاْمُرُکُمْ بِالْکُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ "
(کیا وہ تمہیں اسلام لانے کے بعد کفر کا حکم دیتا ہے ؟)

اس آیت میں بظاہران تمام اہل کتاب کو مخاطب قرار دیا گیا ہے جو اپنے آپ کو نبیوں سے منسوب قرار دیتے ہیں یا وہ لوگ جو نبیوں سے منسوب ہونے کے دعویدار ہیں جیسا کہ زمانہ جاہلیت کے عرب اپنے آپ کو "حنفاء" سمجھتے تھے۔

اس آیت میں تصوراتی بنیاد پر بات کی گئی ہے لہٰذا آیت کا معنی و مفہوم یوں ہوگا کہ گویا ان سے کہا گیا ہے کہ جب تم اس انسان کی دعوت پر لبیک کہتے ہو جسے کتاب، اقتدار اور نبوت عطا کی گئی ہے کہ اس بناء پر تم خدا کو تسلیم کرتے ہو اور اسلام کے زیور سے آراستہ ہو کر اپنے آپ کو اسلامی قالب میں ڈھال چکے ہو تو یہ بات کیونکر ممکن ہے کہ وہ تمہیں کفر کا حکم دے اور تمہیں اس راہ سے گمراہ کر دے جس کی طرف اس نے خدا کے اذن و حکم کے ساتھ تمہیں ہدایت کی ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام سے مراد وہی دین توحید ہے جو تمام انبیاءؑ کے نزدیک دین خداوندی ہے جیسا کہ اس کا ثبوت درج ذیل آیات مبارکہ میں پایا جاتا ہے:

سورۂ آل عمران، آیت :۱۹

○ " اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ " (بے شک، دین، اللہ کے نزدیک اسلام ہے)

اس کے بعد ارشاد ہوا: " اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰہِ یَبْغُوْنَ " (کیا وہ خدائی دین کے علاوہ کچھ چاہتے ہیں)، اس کے تسلسل میں یوں ارشاد ہوا:

"وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ"

(آل عمران، آیت ۸۵)

(اور جو شخص اسلام کے علاوہ کوئی دین چاہے تو اس سے ہر گز قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا)

بعض مفسرین کا قول

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ آیت مبارکہ "مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّؤْتِیَهُ اللّٰهُ......" سے مراد حضرت رسول خداؐ ہیں

کیونکہ اس آیت کے شان نزول میں ایک روایت موجود ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ابورافع قرضی اور نجران کا ایک نصرانی حضرت رسول خداؐ کی خدمت میں آئے اور آپؐ سے عرض کی: "اترید ان نعبدک یا محمد" (اے محمد! کیا آپ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کی پرستش کریں؟) ان کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی: "مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ......" (کسی انسان کو روا نہیں کہ جسے خدا کتاب دے.....) ......دونوں آیتوں کے آخر تک......،

اس مفسر نے اس روایت کی تائید میں اس جملہ کا حوالہ دیا جو ان آیتوں کے آخر میں ذکر ہوا ہے یعنی "بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ" اور کہا کہ چونکہ اسلام اسی دین کا نام ہے جو حضرت محمد مصطفیٰؐ لائے لہٰذا یہاں "بشر" سے مراد آنحضرتؐ ہیں۔

لیکن یہ قول قرین صحت نہیں کیونکہ اس مفسر نے اس اسلام کہ جسے قرآنی اصطلاح میں توحیدی دین قرار دیا گیا ہے کہ جس پر تمام انبیاء الٰہیؑ مبعوث ہوئے اور اسلام کے درمیان خلط ملط کیا ہے جو زمانہ نزول قرآن کے بعد مسلمانوں میں نئی اصطلاح کے ساتھ مشہور ہوا (یعنی وہ دین جو حضرت محمدؐ لائے اسے ہی اسلام کہتے ہیں)، بہرحال اس موضوع کی بابت ہم پہلے تفصیلی بحث کر چکے ہیں......اور یہ ثابت کر چکے ہیں کہ قرآنی بیانات کی رو سے اسلام توحیدی دین کا نام ہے جس کی دعوت تمام انبیاء الٰہی علیہم السلام نے دی......،

چند فصول پر مبنی خاتمۂ بحث

پہلی فصل:

حضرت عیسیٰؑ اور ان کی والدہ کا قرآنی تذکرہ

جب حضرت مسیحؑ کی والدہ گرامی قدر حضرت مریم بنت عمران کی والدہ حاملہ ہوئیں تو انہوں نے منت مان لی کہ جو بچہ ان کے شکم میں ہے جب وہ پیدا ہوا تو اسے آزادی دے کر مسجد کی خدمت گزاری میں دے دیں گی، منت مانتے وقت ان کا خیال تھا کہ وہ بچہ "لڑکا" ہوگا لیکن جب انہوں نے اسے جنا اور انہیں معلوم ہوگیا کہ وہ لڑکی ہے تو وہ بہت غمگین وافسردہ ہوگئیں اور انہوں نے اس بچی کا نام "مریم" رکھا جس کا معنیٰ "خادمہ" ہے۔ حضرت مریمؑ کے والد گرامی قدر جناب عمران، ان کی ولادت سے پہلے ہی انتقال کر چکے تھے تو ان کی والدہ انہیں مسجد میں لائیں اور انہیں مسجد کے کاہنوں کے سپرد کر دیا کہ جن میں

سے ایک حضرت زکریاؑ بھی تھے، کاہنوں نے حضرت مریمؑ کی کفالت کے بارے میں آپس میں شدید اختلاف کیا، چنانچہ طے پایا کہ قرعہ اندازی کی جائے قرعہ اندازی میں حضرت زکریاؑ کا نام نکلا تو انہوں نے حضرت مریمؑ کی کفالت کی، اور جب وہ بالغ ہوگئیں تو حضرت زکریاؑ نے ان کے اور کاہنوں کے درمیان پردہ بنا دیا اور وہ وہاں خدا کی عبادت میں مشغول رہتی تھیں، حضرت زکریاؑ کے سوا کوئی ان کے پاس نہ آسکتا، اور حضرت زکریاؑ جب بھی محراب میں حضرت مریمؑ کے پاس آتے تو ان کے پاس کھانا پاتے، ایک دن انہوں نے پوچھا: اے مریم یہ کھانا تیرے پاس کہاں سے آتا ہے؟ (**یا مریم ! انی لک هٰذا؟**) تو حضرت مریمؑ نے جواب دیا: "**ھو من عنداللّٰہ، واللّٰہ یرزق من یشاء بغیر حساب**" کہ یہ خدا کی طرف سے ہے اور خدا جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے روزی عطا کرتا ہے،

حضرت مریمؑ صدیقہ تھیں اور خدا کی عطا کردہ عصمت کی حامل تھیں، طاہرہ اور خدا کی برگزیدہ ہستی تھیں اور محدثہ تھیں، فرشتے ان سے ہمکلام ہوئے اور انہیں خدا کی طرف سے عطا کی جانے والی نعمت سے آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ خدا نے انہیں چن لیا ہے اور انہیں پاک بنایا ہے، حضرت مریمؑ قانتین میں سے تھیں اور پوری کائنات کے لئے خدا کی نشانیوں میں سے ایک تھیں، (ملاحظہ ہو: سورۂ آل عمران، آیت ۳۵ تا ۴۴، سورۂ مریم آیت ۱۶، سورۂ انبیاء آیت ۱۹، سورۂ تحریم آیت ۱۲)

پھر خداوند عالم نے روح کو ان کے پاس بھیجا اور وہ اس وقت حجاب میں تھیں، روح (فرشتہ) ان کے سامنے انسان کی صورت میں آیا اور ان سے کہا کہ اسے خدا نے بھیجا ہے تاکہ انہیں حکم الٰہی سے ایسے فرزند کی نعمت سے نوازے جو بغیر باپ کے متولد ہوگا، فرشتے نے انہیں خوشخبری دی کہ ان کے فرزند کے ہاتھوں عظیم معجزات رونما ہوں گے، اور انہیں یہ بھی بتایا کہ خداوند عالم روح القدس کے ذریعے ان کی تائید فرمائے گا اور اسے کتاب وحکمت اور تورات وانجیل کی تعلیم دے گا اور وہ بنی اسرائیل کی طرف بھیجا گیا خدا کا رسول ہوگا کہ جو واضح نشانیاں پیش کرے گا، اور انہیں اس فرزند کے بارے میں مزید بتایا اور ان کی تمام سرگذشت سے آگاہ کیا، پھر ان میں روح پھونکی تو وہ حاملہ ہوگئیں جس طرح ہر عورت اپنے بچہ کی حاملہ ہوتی ہے، (ملاحظہ ہو سورۂ آل عمران، آیات ۳۵ تا ۴۴)،

حاملہ ہونے کے بعد حضرت مریمؑ بہت دور مکان میں چلی گئیں، یہاں تک کہ انہیں دردِ زہ شروع ہوا...... یعنی بچہ کی پیدائش کا مرحلہ آپہنچا...... تو وہ درد کی شدت کے ساتھ کھجور کے درخت کے قریب آگئیں اور انہیں اس قدر تکلیف ہوئی کہ وہ اپنے آپ سے کہنے لگیں: اے کاش! میں اس سے پہلے ہی مرگئی ہوتی اور یہ سب کچھ بھول چکی ہوتی،...... میں سب کو بھول جاتی اور سب مجھے بھلا دیتے......، اس وقت ہاتف غیبی سے ایک آواز آئی کہ غمگین نہ ہو، تیرے پروردگار نے تیرے زیر پا ایک چشمہ جاری کر دیا ہے، کھجور کے تنے کو اپنی طرف ہلاؤ کہ اس سے تازہ خرمے اگیں گے، پھر کھاؤ، پیو اور اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرو اور اگر کسی شخص کو وہاں دیکھو تو کہہ دو کہ میں نے رحمٰن کے لئے روزہ رکھنے کی منت مانی ہے لہٰذا آج میں کسی انسان

سے بات نہ کروں گی، پھر وہ اس بچے کو اٹھا کر اپنی قوم کے پاس آئی، (فَحَمَلَتۡهُ فَانۡتَبَذَتۡ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ۝ فَاَجَآءَهَا الۡمَخَاضُ اِلٰى جِذۡعِ النَّخۡلَةِ‌ۚ قَالَتۡ يٰلَيۡتَنِىۡ مِتُّ قَبۡلَ هٰذَا وَكُنۡتُ نَسۡيًا مَّنۡسِيًّا ۝ فَنَادٰٮهَا مِنۡ تَحۡتِهَاۤ اَلَّا تَحۡزَنِىۡ قَدۡ جَعَلَ رَبُّكِ تَحۡتَكِ سَرِيًّا ۝ وَهُزِّىۡۤ اِلَيۡكِ بِجِذۡعِ النَّخۡلَةِ تُسٰقِطۡ عَلَيۡكِ رُطَبًا جَنِيًّا ۝ فَكُلِىۡ وَاشۡرَبِىۡ وَقَرِّىۡ عَيۡنًا‌ۚ فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الۡبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوۡلِىۡۤ اِنِّىۡ نَذَرۡتُ لِلرَّحۡمٰنِ صَوۡمًا فَلَنۡ اُكَلِّمَ الۡيَوۡمَ اِنۡسِيًّا‌ ۝ فَاَتَتۡ بِهٖ قَوۡمَهَا تَحۡمِلُهٗ) ......سورۂ مریم آیات ۲۰ تا ۲۷......،

ان آیات کے اندازِ بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا شکم مادر میں ہونا اور جنم لینا اور بات کرنا اور دیگر وجودی امور دیگر افرادِ بشر کے امور ہی کی سطح سے تھے،

جب حضرت مریمؑ کی قوم نے انہیں اس حال میں دیکھا (کہ وہ بچہ گود میں اٹھائے ہوئے ہیں) تو ہر طرف سے ان پر طعن و تشنیع اور مذمت و ملامت کی بوچھاڑ کر دی کیونکہ انہوں نے دیکھا کہ ایک لڑکی شوہر کے بغیر حاملہ ہو کر بچہ کی ماں بنی ہے، انہوں نے حضرت مریمؑ سے کہا:

" يٰمَرۡيَمُ لَقَدۡ جِئۡتِ شَيۡـئًـا فَرِيًّا ۝ يٰۤاُخۡتَ هٰرُوۡنَ مَا كَانَ اَبُوۡكِ امۡرَاَ سَوۡءٍ وَّمَا كَانَتۡ اُمُّكِ بَغِيًّا ۝ فَاَشَارَتۡ اِلَيۡهِ‌ ؕ قَالُوۡا كَيۡفَ نُـكَلِّمُ مَنۡ كَانَ فِى الۡمَهۡدِ صَبِيًّا ۝ قَالَ اِنِّىۡ عَبۡدُ اللّٰهِ ؕ اٰتٰٮنِىَ الۡكِتٰبَ وَجَعَلَنِىۡ نَبِيًّا ۝ وَّجَعَلَنِىۡ مُبٰـرَكًا اَيۡنَ مَا كُنۡتُ وَاَوۡصٰنِىۡ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمۡتُ حَيًّا ۝ وَّبَرًّا ۢ بِوَالِدَتِىۡ وَلَمۡ يَجۡعَلۡنِىۡ جَبَّارًا شَقِيًّا ۝ وَالسَّلٰمُ عَلَىَّ يَوۡمَ وُلِدْتُّ وَيَوۡمَ اَمُوۡتُ وَيَوۡمَ اُبۡعَثُ حَيًّا " (سورۂ مریم، آیات ۲۷ تا ۳۳)

(اے مریم! تو نے یہ نہایت عجیب کام کیا ہے، اے ہارون کی بہن! تیرا باپ برا آدمی نہیں تھا اور نہ ہی تیری ماں بدکارہ تھی، مریم نے بچہ کی طرف اشارہ کیا...... کہ اس سے بات کرو...... انہوں نے کہا کہ ہم اس سے کیونکر بات کریں جو بچہ ابھی گہوارہ میں ہے، اس وقت عیسیٰ بول پڑے اور کہنے لگے، میں خدا کا بندہ ہوں، خدا نے مجھے کتاب عطا کی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے اور میں جہاں بھی رہوں مجھے بابرکت قرار دیا ہے اور مجھے نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے کا حکم دیا ہے اور یہ کہ جب تک میں زندہ رہوں اپنی والدہ کے ساتھ نیکی و نیک سلوک کرتا رہوں، خدا نے مجھے نہ تو ظالم و جابر بنایا ہے اور نہ ہی بدکار، مجھ پر سلام ہو جس دن میں پیدا ہوا اور جس دن میں مروں گا اور جس دن مجھے زندہ اٹھایا جائے گا)۔

حضرت عیسیٰؑ کا یہ بیان اپنے مستقبل کے لائحہ عمل کا نہایت عمدہ انداز و الفاظ میں اظہار تھا، انہوں نے اس بیان میں خوبصورت اسلوب کے ساتھ اپنے مشن کے اہم مقاصد ظاہر کئے یعنی یہ کہ وہ بہت جلد سرکشی و ظلم کے خاتمہ اور شریعت موسیٰؑ کے احیاء اور اس کے عملی نفاذ کی تقویت کے لئے کام کریں گے اور اس مقدس شریعت کے معارف کی تجدید کریں گے اور اس میں جن آیات کی بابت لوگ آپس میں اختلاف رائے رکھتے ہیں ان کی حقیقت بیان کریں گے،

پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوران کودکی سے جوانی کو پہنچے اور اپنی والدہ کے ہمراہ عام انسانی زندگی کے مراحل طے کرنے میں مصروف ہو گئے، وہ دونوں کھاتے پیتے اور اسی طرح زندگی گزارتے تھے جس طرح دوسرے افرادِ بشر زندگی گزارتے ہیں اور ان تمام حالات و وجودی کیفیات سے دوچار ہوتے تھے جس طرح بنی نوع انسان کے دیگر افراد دوچار ہوتے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کے لئے رسول مبعوث کیا گیا اور خدا کی طرف سے انہیں حکم ملا کہ وہ بنی اسرائیل کو توحیدی دین کی دعوت دیں چنانچہ وہ ان لوگوں کو خدائے واحد کی پرستش کرنے کا کہتے تھے اور ان سے کہتے تھے:

"اَنِّیْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّیْۤ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّیْنِ كَهَیْـَٔةِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْهِ فَیَكُوْنُ طَیْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْیِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِیْ بُیُوْتِكُمْ، اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لَّكُمْ، اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ"

(میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک نشانی لے کر آیا ہوں، میں تمہارے سامنے مٹی سے پرندے کا مجسمہ بناتا ہوں پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ خدا کے اذن کے ساتھ حقیقی پرندہ بن جائے گا، اور میں مادرزاد نابینا اور برص کے مریض کو شفایاب کرتا ہوں، اور میں اللہ کے اذن سے مردوں کو زندہ کرتا ہوں اور میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تم کیا کھاتے ہو اور کیا کچھ گھروں میں ذخیرہ کرتے ہو، اس میں تمہارے لئے نشانی ہے کیونکہ خدا میرا اور تمہارا پروردگار ہے پس تم اسی کی عبادت کرو)۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام لوگوں کو اپنی جدید شریعت کہ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کی تصدیق کرنے والی تھی کی طرف دعوت دیتے تھے، البتہ کچھ چیزیں جو یہودیوں پر سختی کرنے کے لئے حرام قرار دی گئیں تھیں انہیں حلال کیا یعنی جن احکام میں وہ چیزیں حرام قرار دی گئی تھیں انہیں منسوخ کیا، وہ لوگوں سے کہتے تھے:

"یا بنی اسرائیل انی رسول اللّٰہ الیکم مصدقاً لما بین یدی من التوراۃ مبشراً برسول یاتی من بعدی اسمہٗ احمد"

(اے بنی اسرائیل! میں تمہاری طرف اللہ کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں، میں اپنی ماقبل کتاب تورات کی تصدیق کرنے والا ہوں، میں اس رسول کی خوشخبری دینے والا ہوں جو میرے بعد آئے گا جس کا نام احمد ہے)۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے جن معجزات کا وعدہ کیا تھا ان سب کو پورا کیا مثلاً پرندہ خلق کرنا، مردوں کو زندہ کرنا، مادرزاد نابینا اور برص کے مریض کو شفایاب کرنا اور غیبی خبریں دینا، یہ سب کچھ انہوں نے اذن خدا کے ساتھ انجام دیا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام مسلسل بنی اسرائیل کو خدا کی یکتائی اور اپنی جدید شریعت کی طرف دعوت دیتے رہے اور جب ان کے ایمان لانے سے مایوس ہوئے اور لوگوں کی طرف سے نافرمانی و دشمنی اور کاہنوں اور یہودی علماء کی طرف سے تکبر و سرتابی کے مظاہرے دیکھے تو اپنے اور ایمان لانے والے نہایت قلیل افراد میں سے کچھ لوگوں کو اپنا مددگار منتخب کیا تاکہ وہ خدا کی راہ میں ان کی نصرت کریں۔

پھر یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف عملی طور پر بغاوت شروع کر دی اور ان کو قتل کرنے کی ٹھان لی، لیکن خداوند عالم نے آنجناب کو یہودیوں کے چنگل سے نجات بخشی اور انہیں اپنی طرف اٹھالیا، اس سلسلہ میں یہودی غلط فہمی کا شکار ہو گئے، کچھ لوگ گمان کرنے لگے کہ انہوں نے عیسیٰ کو قتل کر دیا ہے، بعض لوگ کہنے لگے کہ انہوں نے انہیں سولی پر چڑھا دیا ہے، لیکن خداوند عالم نے حقیقت حال ان پر واضح نہ کی اور انہیں اسی طرح غلط فہمی میں مبتلا رکھا،

(ملاحظہ ہوں آیات مبارکہ: سورۂ آل عمران ۴۵ تا ۵۸، سورۂ زخرف ۶۳ تا ۶۵، سورۂ صف ۶، ۱۴، سورۂ مائدہ ۱۱۰-۱۱۱، سورۂ نساء ۱۵۷، ۱۵۸)

تو یہ ہے حضرت عیسیٰ بن مریم اور ان کی والدہ کے قرآنی تذکرہ کا خلاصہ و اجمالی بیان !

دوسری فصل:

حضرت عیسیٰ کی شخصیت اور بارگاہ الٰہی میں ان کا مقام

قرآن مجید میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بائیس صفات ذکر کی گئی ہیں جن کی فہرست یہ ہے:

۱۔ وہ بندۂ خدا اور نبی تھے

(سورۂ مریم، آیت ۳۰)

۲۔ وہ بنی اسرائیل کی طرف بھیجے گئے خدا کے رسول تھے

(سورۂ آل عمران۔ آیت ۴۹)

۳۔ وہ پانچ اولوا العزم رسولوں میں سے ایک تھے، صاحب شریعت اور صاحب کتاب (انجیل) تھے،

(سورۂ احزاب آیت ۷، سورۂ شوریٰ آیت ۱۳، سورۂ مائدہ آیت ۴۶)

۴۔ خداوند عالم نے ان کا نام "مسیح عیسیٰ" رکھا۔

(سورۂ آل عمران، آیت ۴۵)

۶،۵۔ وہ "کلمۃ اللہ" اور "روح اللہ" تھے

(سورۂ نسآء، آیت ۱۷۱)

۷۔ وہ "امام" تھے

(سورۂ احزاب، آیت ۷)

۸۔ وہ "اعمال کے گواہ" تھے

(سورۂ نسآء، آیت ۱۵۹، سورۂ مائدہ، آیت ۱۱۷)

۹۔ وہ حضرت پیغمبر اسلامؐ کی آمد کی خوشخبری دینے والے تھے۔

(سورۂ صف، آیت ۶)

۱۰۔۱۱۔ وہ دنیا و آخرت میں محترم اور مقربین میں سے تھے

(سورۂ آل عمران، آیت ۴۵)

۱۲۔ وہ برگزیدگان الٰہی میں سے تھے۔

(سورۂ آل عمران، آیت ۳۳)

۱۳، ۱۴۔ وہ "مجتبین" (خدا کے منتخب کردہ) اور "صالحین" میں سے تھے۔

سورۂ انعام، آیات ۸۵، ۸۷)

۱۵ تا ۲۰۔ وہ ہر جگہ بابرکت تھے، پاکیزہ تھے، لوگوں کے لئے خدا کی نشانی تھے، اللہ کی رحمت تھے، اپنی والدہ کے ساتھ نیک سلوک کرنے والے تھے اور ان افراد میں سے تھے جن پر خدا نے سلام کیا،

(سورۂ مریم، آیات ۱۹ تا ۳۳)

۲۱، ۲۲۔ وہ خدا کی طرف سے کتاب و حکمت کی تعلیم حاصل کرنے والے کا اعزاز پانے والوں میں سے تھے۔

(سورۂ آل عمران، آیت ۴۸)

یہ بائیس صفات کہ جو ولایت کے بلند پایہ مراتب میں سے ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کی طرف سے عطا کردہ عظیم اوصاف کا مجموعہ ولب لباب ہے کہ ان کے ذریعے خداوند عالم نے ان کی شان بلند کردی،

ان صفات کی دو قسمیں ہیں:

(۱) کسبی

(۲) وہبی

پہلی قسم کی مثال: عبودیت و بندگی، قربِ الٰہی اور صلاح و نیکی،

دوسری قسم کی مثال: نبوت، رسالت، کلمۃ اللہ و روح اللہ ہونا وغیرہ

ان دونوں قسموں سے مربوط صفات کے بارے میں ہم نے اس کتاب میں اپنی قوتِ فہم کے مطابق وضاحت کی ہے، قارئین کرام خود ان امور میں ان مطالب کا مطالعہ کر سکتے ہیں،

تیسری فصل:

حضرت عیسیٰؑ نے کیا کہا؟ اور ان کے بارے میں کیا کہا گیا؟

قرآن مجید نے واضح الفاظ میں بیان کیا ہے کہ عیسیٰؑ عبد خدا اور رسول تھے، اور یہ کہ انہوں نے ہرگز وہ بات نہیں کی جو ان کی طرف منسوب کی گئی اور نہ ہی اپنے رسول ہونے کے علاوہ کسی حوالہ سے لوگوں سے بات کی، چنانچہ اس سلسلہ میں درج ذیل آیات میں ان کے متعلق یوں ارشاد ہوا:

سورۂ مائدہ، آیات ۱۱۶ تا ۱۱۹:

○ "وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ ۤ بِحَقٍّ ڲ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ۭ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۱۱۶﴾ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ۭ وَاَنْتَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۱۱۷﴾ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۱۸﴾ قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ"

(اور جب خدا نے کہا: اے عیسیٰ بن مریم! کیا تو نے لوگوں سے کہا ہے کہ خدا کو چھوڑ کر مجھے اور میری ماں کو دو خدا مانو؟ اس نے کہا: تیری ذات پاک ہے، میرے لئے روا نہیں کہ میں وہ کچھ کہوں جس کا مجھے حق حاصل نہیں، اگر میں نے کہا ہوتا تو تو اس سے آگاہ ہوتا، تو تو میرے دل کی ہر بات کو جانتا ہے لیکن میں تیری کوئی بات نہیں جانتا، بے شک تو علام الغیوب ہے (چھپی ہوئی چیزوں کو بہتر جاننے والا ہے) میں نے اس کے علاوہ لوگوں سے کچھ نہیں کہا جو تو نے مجھے حکم دیا ہے کہ تم اللہ کی عبادت کرو جو میرا رب ہے اور تمہارا رب ہے،

میں جب تک ان میں موجود تھا ان پر گواہ تھا اور جب تو نے میرا وقت پورا کر دیا تو تو خود ان پر نگران تھا اور تو ہر چیز پر گواہ اور اس کا دیکھنے والا ہے، اگر تو ان پر عذاب نازل کرے تو وہ تیرے ہی بندے ہیں اور اگر تو انہیں معاف کر دے تو تو ہی غلبہ والا، دانا ہے، خدا نے کہا (قیامت کے دن کہے گا) کہ یہ دن وہ ہے جب سچ بولنے والوں کو ان کا سچ بولنا فائدہ دے گا۔)

یہ نہایت بلند پایہ کلام کہ جو عبودیت کی حقیقتوں پر مشتمل اور ادب کی اعلیٰ ترین جہتوں کا حامل ہے اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اپنے پروردگار سے رابطۂ بندگی کا کمال اور لوگوں سے تعلق کے حوالہ سے ہادیانہ وناصحانہ اور شفیقانہ روش و طرز عمل واضح طور پر معلوم ہوتا ہے، یعنی خدا اور خلق دونوں سے تعلق کی بابت ان کے عملی مؤقف کی عکاسی وترجمانی ہوتی ہے، چنانچہ اس میں مذکور ہے کہ حضرت عیسیٰ اپنے آپ کو اپنے پروردگار کی نسبت ایک عبد سمجھتے تھے کہ جس کا کام اپنے مولا کے فرامین کی اطاعت کے سوا کچھ نہیں اور وہ اس کے حکم سے قطع نظر کسی چیز کا ارادہ ہی نہیں کرتا اور نہ ہی اس کے فرمان کے بغیر کوئی عمل انجام دیتا ہے، اور اسے اس کے سوا کوئی حکم وفریضہ نہیں دیا گیا کہ وہ لوگوں کو خدائے یکتا کی بندگی کی طرف دعوت دیں، اسی بناء پر اس نے لوگوں سے صرف یہی کہا: "اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ" کہ تم اللہ کی عبادت کرو جو میرا اور تمہارا پروردگار ہے،

اسے خداوند عالم کی طرف لوگوں کی بابت صرف یہ ذمہ داری دی گئی تھی کہ ان کے اعمال پر نگران وگواہ ہو اور جب ضرورت ہو تو ان کے اعمال کے بارے میں گواہی دے، اس کے علاوہ کچھ نہیں، اب یہ کام خدا کا ہے کہ وہ قیامت کے دن لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کرے اور ان کے بارے میں کیا فیصلہ کرے، اس کا عیسیٰ سے کوئی تعلق نہیں، یعنی یہ فیصلہ خدا نے خود ہی کرنا ہے کہ لوگوں کو معاف کر دے یا سزا دے،

حضرت عیسیٰ کی شفاعت اور خدا کی قدرت

مذکورہ بالا مطالب کے تناظر میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ آپ نے شفاعت کی بحث میں جو کہ سابقہ مباحث میں ہو چکی ہے حضرت عیسیٰ کو قیامت کے دن شفاعت کرنے والوں میں شمار کیا اور اب آپ کہتے ہیں کہ قیامت کے دن سب کچھ خدا کے ہاتھ میں ہوگا اور حضرت عیسیٰ کا اس سے کوئی تعلق نہ ہوگا، تو کیا یہ تضاد نہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں یہ بات درست ہے کہ حضرت عیسیٰ قیامت کے دن شفاعت کرنے والوں میں سے ایک ہیں اور قرآن مجید میں اس حوالہ سے صریح یا مثل صریح بیان موجود ہے چنانچہ ارشاد حق تعالیٰ ہے:

سورۂ زخرف، آیت :۸۶

○ " وَلَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ"

(اور وہ لوگ شفاعت کا حق نہیں رکھتے جنہیں یہ خدا کے علاوہ پکارتے ہیں، شفاعت صرف وہی کر سکیں گے جو حق کے ساتھ گواہی دیں اور وہ علم رکھتے ہوں)

سورۂ نسآء، آیت :۱۵۹

○ " وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا"

(اور وہ قیامت کے دن ان پر گواہ ہوگا)

اس آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو گواہ کہا گیا ہے۔

سورۂ مائدہ، آیت :۱۱۰

○ " وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ"

(اور جب میں نے تجھے کتاب، حکمت تورات اور انجیل کی تعلیم دی)

اس آیت میں حضرت عیسیٰؑ کو خدا کی طرف سے کتاب وحکمت اور تورات وانجیل کا عالم کہا گیا ہے۔

شفاعت کی بحث میں تمام مربوطہ جہات وضاحت وتفصیل کے ساتھ بیان ہو چکی ہیں اور اس سلسلہ میں سیر حاصل بحث ہو چکی ہے، للہذا شفاعت اور فدیہ دیئے جانے کے بارے میں نصاریٰ کے عقیدہ میں بہت فرق ہے، فدیہ دیئے جانے کے عقیدہ کی بناء پر قیامت کے دن جزاء کے نظام کی نفی ہوتی ہے، کیونکہ اس سے خداوند عالم کی علی الاطلاق حاکمیت بے نتیجہ و بے اثر ہو جاتی ہے کہ انشاء اللہ اس موضوع کی بابت تفصیلی مطالب عنقریب ذکر کیے جائیں گے۔

بہر حال یہ آیت مبارکہ صرف اسی عقیدہ کی نفی کرتی ہے اور جہاں تک شفاعت کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں آیت مبارکہ اثبات یا نفی میں سے کسی بھی پہلو کو بیان نہیں کرتی کیونکہ اگر وہ اس کے اثباتی پہلو کے بیان پر مشتمل ہوتی (جو کہ اس مورد ومقام کے منافی ہے) تو "وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ" کی بجائے "وان تغفر لهم فانک انت الغفور الرحیم" کہا جاتا، اور اگر شفاعت کی نفی کے بیان پر مشتمل ہوتی تو اس میں قیامت کے دن لوگوں کے اعمال پر گواہ ہونے کا تذکرہ ہی نہ ہوتا۔

بہر حال مذکورہ بالا آیات کے حوالہ سے جو کچھ بیان ہوا وہ اجمالی تذکرہ ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ تفصیلی مطالب ان آیات کی تفسیر (سورہ مائدہ) میں پیش کئے جائیں گے۔

اور جہاں تک عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں لوگوں کے اظہارات کا تعلق ہے تو اگر چہ آنجنابؑ کے بعد لوگ مختلف

مذاہب میں بٹ گئے اور گوناگوں مسالک کا شکار ہو گئے کہ کم وبیش ان گروہوں کی تعداد...... مذاہب ومسالک اور عقائد و نظریات میں اصولوں وکلیات اور جزئیات کے حوالہ سے...... ستر یا اس سے بھی زیادہ ہے، لیکن قرآن مجید نے صرف عیسائیوں کے انہی اظہارات کا تذکرہ کرنے پر توجہ مرکوز رکھی جو انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ گرامی قدر حضرت مریمؑ کے بارے میں کئے کیونکہ ان مطالب کا ربط توحید کی اصل واساس سے تھا جو کہ تمام قرآنی معارف وبیانات اور فطری دینؐ کی طرف دعوت کی اصل غرض وغایت ہے، البتہ اس موضوع کی بعض جزئیات مثلاً مسئلہ تحریف اور فدیہ دیئے جانے کی بات، تو ان کی بابت غیر معمولی توجہ نہیں دی اور نہ ہی ان کے بارے میں اہمیت کے ساتھ اظہار خیال ہوا،

قرآن مجید میں عیسائیوں کے اظہارات یا ان کی طرف منسوب مطالب کا تذکرہ درج ذیل آیات مبارکہ میں پایا جاتا ہے:

سورۂ توبہ، آیت :۳۰

○ "وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ"

(اور نصرانیوں نے کہا کہ مسیح خدا کا بیٹا ہے)

اس آیت میں ان کی طرف سے عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دینے کا ذکر ہوا ہے جو کہ ان کے اظہارات کا حصہ ہے، اسی سلسلہ میں ایک آیت اس طرح گویا ہے:

سورۂ انبیاء، آیت :۲۶

○ "وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ"

(انہوں نے کہا کہ رحمٰن نے بیٹا بنایا ہوا ہے، خدا اس سے پاک ہے)

اس آیت میں عیسائیوں کے اظہارات کے حوالہ سے ان کے عقیدہ کا تذکرہ ہے۔

سورۂ مائدہ، آیت :۷۲

○ "لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ"

(کافر ہو گئے وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ اللہ ہی مسیح ابن مریم ہے)

اس آیت میں صریح لفظوں میں عیسائیوں کے اظہارات کا تذکرہ ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا ہی نہیں بلکہ خدا سمجھتے ہیں۔

سورۂ مائدہ، آیت :۷۳

o " لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ "

(یقیناً کافر ہوئے وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا تیسرا ہے)

اس آیت میں تین خداؤں کے حوالہ سے عیسائیوں کے عقیدہ کا اظہار وتذکرہ ہوا ہے کہ وہ اللہ کو تیسرا معبود مانتے ہیں یعنی پہلا حضرت عیسیٰؑ، دوسرا حضرت مریمؑ اور تیسرا اللہ!،

سورۂ نسآء، آیت :۱۷۱

o " وَلَا تَقُولُوا ثَلٰثَةٌ ط اِنْتَهُوا "

(اور تم تین خدا نہ کہو)

اس آیت میں انہیں عقیدۂ تثلیث کی ممانعت کے حوالہ سے تذکرہ ہوا ہے،

یہ تمام آیات اگرچہ بظاہر مختلف الفاظ پر مشتمل ہونے کے حوالہ سے ایک دوسرے سے متفاوت مضامین ومعانی کی حامل ہیں کہ جن کی وجہ سے انہیں ان لوگوں کے مختلف مذاہب کے بیان پر مشتمل سمجھا گیا اور کہا گیا کہ ان آیات میں عیسائیوں کے تین مختلف مسالک کا تذکرہ ہوا ہے مثلاً:

(۱) ملکانیوں کا عقیدہ کہ حضرت عیسیٰؑ خدا کے حقیقی فرزند ہیں،

(۲) نسطوریوں کا عقیدہ کہ حضرت عیسیٰؑ اور ان کا خدا کا بیٹا ہونا اس طرح سے ہے جیسے روشنی کسی صاف وشفاف چیز مثلاً شیشہ پر پڑے،

(۳) یعقوبیوں کا عقیدہ کہ جو انقلاب یعنی خدا کی ماہیت کے تبدیل ہو جانے کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا گوشت وخون بن گیا،

(یہ تفصیل شہرستانی نے اپنی کتاب "الملل والنحل" میں ذکر کی ہے جو کہ تاریخ ادیان اقوام کی مشہور کتاب ہے)۔

لیکن ظاہر یہ ہے کہ قرآن مجید ان کے مختلف مذاہب کی خصوصیات کا ترجمان نہیں اور نہ ہی ان کی تفصیلات کا بیان اس کا مقصد ومقصود ہے بلکہ اسے صرف ایک ہی موضوع سے سروکار ہے کہ جو ان سب کے درمیان قدر مشترک ہے اور وہ ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا فرزندِ خدا ہونا! اور یہ کہ حضرت مسیحؑ کو الوہیت کا درجہ حاصل ہے، اسی طرح وہ امور جو عقیدہ تثلیث سے تعلق رکھتے ہیں، یہ اور بات ہے کہ وہ لوگ اس اعتقاد کے معنی اور تثلیث سے مراد کے تعین میں آپس میں اختلاف رائے رکھتے ہیں اور اس حوالہ سے ان کے درمیان ایک وسیع جنگ چھڑی ہوئی ہے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ قرآن مجید میں ان سب کے غلط عقائد ونظریات کی نفی میں ایک ہی طرزِ استدلال واسلوب خطاب اپنایا گیا ہے اور ان سب کو ان کے درمیان

پائے جانے والے مشترک مسئلہ کے حوالہ سے مخاطب قرار دیا گیا ہے۔

اس مسئلہ کی مزید وضاحت یہ ہے کہ موجودہ تورات وانجیل دونوں میں ایک طرف تو واضح وصریح الفاظ میں خدا کی وحدانیت ویکتائی بیان کی گئی ہے لیکن دوسری طرف انجیل میں صراحت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے کہ مسیح خدا کا بیٹا ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی صریح طور پر بیان ہوا ہے کہ بیٹا ہی باپ ہے اس کے علاوہ نہیں۔

اورانہوں نے بیٹا ہونے کی تاویل میں اسے اعزازی اور برکت کے لئے بھی قرار نہیں دیا حالانکہ انجیل میں اسے کئی مقامات پر صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ ان میں سے ایک یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ نے فرمایا:

"میں تم سے کہتا ہوں کہ تم اپنے دشمنوں سے دوستی کرو، اور جو تم پر لعنت کرے اس کے لئے دعائے برکت کرو، اور جو تم سے دشمنی کرے اس کے ساتھ نیکی کرو، اور جو تمہیں دھتکار دے اس کے ساتھ صلہ رحمی و پیوستگی کرو تا کہ اپنے باپ کے بیٹے بن کر رہو، وہ باپ کہ جو آسمانوں میں ہے کیونکہ وہ ایسی ذات ہے جس کا سورج نیکیوں اور بدکاروں سب کو برابر روشنی دیتا ہے اور اس کی بارش سچوں اور ظالموں دونوں قسم کے لوگوں پر برابر ومساوی طور پر برستی ہے، اگر تم صرف اس سے دوستی کرو جو تم سے دوستی کرے تو پھر کیا فضیلت اور کیا اجر؟ یہ تو عام افرادِ معاشرہ اور باہم مل جل کر رہنے والوں کا شیوہ وطرز عمل ہے، اگر تم صرف اپنے بھائیوں کو سلام کرو تو پھر تمہاری کیا فضیلت ہے؟ تو کیا بت پرست اس کے علاوہ کرتے ہیں؟ (ان کا طرزِ عمل ایسا ہی ہے)، پس تم آؤ اور اپنے آسمانی باپ کی طرح کامل بنو کہ وہ کامل ہے"، (عربی متن ملاحظہ ہو)

(احبوا اعدائكم، وباركوا علىٰ لاعنيكم، واحسنوا الىٰ من ابغضكم، وصلوا علىٰ من يطردكم و يعسفكم كيما تكونوا بني ابيكم الذى فى السماوات لانه المشرق شمسهٗ على الاخيار والاشرار والممطر على الصديقين والظالمين، واذا احببتم من يحبكم فأى اجرلكم؟ اليس العشارون يفعلون كذلك؟ وان سلمتم علىٰ اخوتكم فقط فأى فضل لكم؟ اليس كذلك يفعل الوثنيون، كونوا كاملين مثل ابيكم السماوى فهو كامل)

(ملاحظہ ہو انجیل متی، آخر اصحاح پنجم، مطبوعہ ۱۸۱۱، متن عربی، ہم نے انجیل کے مندرجات اسی سے لئے ہیں)

اسی طرح انجیل متی، اصحاح پنجم میں مذکور ہے کہ حضرت مسیحؑ نے فرمایا:

" فليضيئ نوركم قدام الناس ليروا اعمالكم الحسنة ويمجدوا أباكم الذى فى السماوات "

(تمہارا نور تمام لوگوں کے سامنے درخشاں ہونا چاہیے تا کہ وہ تمہارے نیک اعمال کا مشاہدہ کریں اور تمہارے آسمانی باپ کی مجد وتعریف کریں)

اسی انجیل میں حضرت مسیحؑ کا یہ فرمان مذکور ہے:

(۱) "لا تصنعوا جميع مراحمكم قدام الناس كى يروكم فليس لكم اجر عند أبيكم الذى فى السماوات"

(اورتم دکھاوے وریاکاری کی غرض سے اپنے رحم لانہ اعمال انجام نہ دو ورنہ تمہارے باپ کے پاس کہ جو آسمانوں میں ہے تمہارے لئے کوئی اجر نہ ہوگا)

(۲) اسی میں حضرت عیسیٰؑ کا یہ ارشاد گرامی قدر مذکور ہے جو انہوں نے نماز کے بارے میں فرمایا:

"وهكذا تصلون أنتم يا ابانا الذى فى السماوات تقدس اسمک"

(اورتم اسی طرح نماز پڑھو، اے ہمارے باپ کہ جو آسمانوں میں ہے، تیرا نام مقدس ہے)۔

(۳) اسی میں حضرت مسیحؑ کا یہ فرمان مذکور ہے:

"فان غفرتم للناس خطايا هم غفرلكم ابوكم السماوى خطاياكم"

(اگر تم لوگوں کی غلطیاں معاف کرو تو تمہارا آسمانی باپ تمہاری غلطیاں معاف کردے گا،

(یہ تینوں بیانات انجیل متی، اصحاح ۶ میں بھی ہیں)

انجیل لوقا، اصحاب ۶ میں اس طرح مذکور ہے کہ حضرت مسیحؑ نے ارشاد فرمایا:

"وكونوا رحماء مثل ابيكم الرحيم"

(اورتم اپنے رحیم باپ کی طرح رحم والے بنو)

انجیل یوحنا، اصحاب ۲۰ میں ہے کہ حضرت مسیحؑ نے مریم مجدلیہ سے فرمایا:

"امضى الىٰ اخوتى وقولى لهم: انى صاعد الىٰ ابى الذى هوا بوكم والٰهى الذى هو الٰهكم"

(میرے بھائیوں کے پاس جا کر ان سے کہو کہ میں اپنے باپ کی طرف کہ جو تمہارا بھی باپ ہے اور اپنے معبود کی طرف کہ جو تمہارا بھی معبود ہے پرواز کرنے والا ہوں)

ان عبارتوں اور تینوں انجیلوں میں موجود ان جیسی دیگر عبارتوں میں لفظ "باپ" خداوند عالم اور حضرت عیسیٰؑ اور دیگر کے لئے استعمال ہوا ہے اور جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا کہ یہ استعمال اعزازی بنیاد پر ہے، اگرچہ ان کے علاوہ دیگر بعض عبارتوں میں بیٹا اور باپ ہونا اعزازی ہی نہیں بلکہ ایک طرح کی کمالی جہت وحیثیت میں ہے کہ جس کا نتیجہ دونوں کا ایک ہو جاتا ہے، چنانچہ انجیل یوحنا، اصحاح ۱۷ میں اس طرح مذکور ہے:

"تكلم المسيح بهٰذا ورفع عينيه الى السمآء فقال: يا ابته قد حضرت الساعة فمجد

ابنک یمجد ابنک، ثم ذکر دعائهٔ لرسلهٖ من تلامذته ثم قال: ولست اسأل فی هؤلاء فقط بل وفی الذین یؤمنون بی بقولهم لیکونوا باجمعهم واحداً کما انک یا ابت ثابت فی وانا ایضاً فیک لیکونوا ایضاً فینا واحداً لیؤمن العالم انک ارسلتنی وأنا اعطیتهم ؟د الذی اعطیتنی لیکونوا واحداً کما نحن واحد انا فیهم وانت فی ویکونوا کاملین لواحد لکی یعلم العالم انک ارسلتنی وأننی اجبتهم کما أحببتنی"

(حضرت مسیحؑ نے جب یہ بات کی تو انہوں نے اپنی آنکھیں آسمان کی طرف اٹھائیں اور فرمایا: اے باپ! اب وہ وقت آ پہنچا ہے، اب اپنے بیٹے کی تعریف کر، تا کہ تیرا بیٹا بھی تیری تعریف کرے، اس کے بعد انہوں نے اپنے شاگردوں سے اپنے نمائندوں کے لئے جو دعا کی اس کا تذکرہ اس طرح ہوا کہ انہوں نے فرمایا: میں یہ دعا صرف انہی کے لئے نہیں کر رہا بلکہ یہ ان تمام لوگوں کے بارے میں ہے جو ان نمائندوں کے کہنے پر مجھ پر ایمان لائے ہیں، تا کہ وہ سب ایک ہوں کہ جس طرح سے اے میرے باپ! تو مجھ میں سمایا ہے اور میں تجھ میں سما گیا ہوں، تا کہ وہ سب ہم میں سما جائیں، اور تا کہ پوری کائنات اس بات پر ایمان لائے کہ تو نے مجھے بھیجا ہے (میں تیرا بھیجا ہوا رسول ہوں) اور میں نے لوگوں کو عزت و آبرو سے نوازا ہے کہ جو تو نے مجھے عزت و آبرو عطا کی ہے تا کہ وہ اسی طرح ایک ہوں جس طرح ہم ایک ہیں، میں ان میں ہوں اور تو مجھ میں ہے اور وہ سب ایک کے لئے کامل ہوں تا کہ سارا عالم یہ جان لے کہ تو نے مجھے رسول بنایا ہے اور میں تجھ سے محبت کرتا ہوں جس طرح سے تو مجھ سے محبت کرتا ہے۔)

لیکن موجودہ انجیلوں میں بعض ایسی عبارتیں اور الفاظ ہیں کہ جن کے ظاہر سے اس امر کا کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ بیٹا اور باپ ہونا اعزازی ہے،...... اگرچہ ان انجیلوں میں صریح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ احترام واعزاز کے طور پر ہیں لیکن اس کے برعکس بعض مقامات میں ان نسبتوں کے اعزازی ہونے کی نفی پائی جاتی ہے...... مثلاً: انجیل یوحنا، اصحاب: ۱۴

" قال لهٔ لوقا: یا سید ما نعلم أین تذهب؟ وکیف نقدر ان نعرف الطریق؟ قال له یسوع: انا هو الطریق و الحق والحیاة لا یأتی احد الٰی ابی الابی، لو کنتم تعرفوننی لعرفتم ابی ایضاً ومن الآن تعرفونهٔ وقدراً یتموه ایضاً، قال لهٔ فیلبس: یا سید ارنا الاب وحسبنا، قال لهٔ یسوع: انا معکم کل هٰذا الزمان ولم تعرفنی یا فیلبس؟ من رانی فقدرای الاب فکیف تقول انت: ارناالاب ؟ اما تؤمن انی فی ابی و ابی فی، وهٰذا الکلام الذی اقولهٔ لکم لیس هو من ذاتی وحدهٔ، بل ابی الحال فی هو یفعل هٰذه الافعال، امنوا بی، أنا فی ابی و ابی فی "

(لوقا نے حضرت مسیحؑ سے کہا: اے آقا! ہمیں کچھ علم نہیں کہ آپ کہاں جاتے ہیں؟ اور ہم کس طرح راستہ سے

آ گاہ ہو سکتے ہیں؟ عیسیٰؑ نے فرمایا: میں ہی وہ راستہ ہوں، مجھے حق اور زندگی کی قسم! کوئی شخص میرے بغیر میرے باپ تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا، اگر تم نے مجھے پہچانا ہوتا تو میرے باپ کو بھی پہچانا ہوتا، اور ابھی سے تم اسے پہچان گئے ہو کیونکہ تم نے اسے دیکھ بھی لیا ہے، اس وقت فیلبس نے پوچھا: اے آقا! آپ ہمیں ہمارے باپ کا دیدار کروا دیں اور بس، یہی ہمارے لئے کافی ہے، یسوع نے فرمایا: اے فیلبس! میں اس پورے دور میں تمہارے ساتھ تھا تو کیا تو نے مجھے نہیں پہچانا؟ جس نے مجھے دیکھا گویا اس نے باپ کو دیکھا، تو تو کیونکر یہ کہتا ہے کہ ہمیں باپ کا دیدار کراؤ؟ کیا تو ابھی تک اس بات پر ایمان نہیں لایا کہ میں باپ میں ہوں اور باپ مجھ میں ہے (ہم ایک دوسرے میں حلول کر چکے ہیں)، یہ بات جو میں تم سے کہہ رہا ہوں یہ صرف میری اپنی بات نہیں ہے بلکہ یہ میری اور میرے باپ کی ہے جو مجھے میں حلول کر چکا ہے، وہی ہے جو یہ سب کام کر رہا ہے، میری اس بات پر یقین کے ساتھ ایمان لاؤ کہ میں اپنے باپ میں اور میرا باپ مجھ میں ہے)

اور انجیل یوحنا، اصحاح ۸ میں حضرت عیسیٰؑ یہ قول مذکور ہے:

"لکنی خرجت من اللّٰہ و جئت ولم 'ات من عندی بل ھو ارسلنی"

(لیکن میں خدا سے باہر نکلا اور آ گیا مگر میں اپنی طرف سے...... اپنی مرضی سے...... نہیں آیا بلکہ اس نے مجھے بھیجا ہے)

انجیل یوحنا، اصحاح ۱۰ میں آنجنابؑ کا یہ ارشاد مذکور ہے:

"أنا و ابی واحد نحن"

(میں اور میرا باپ ہم دو، ایک ہی ہیں)

اور انہوں نے اپنے شاگردوں سے جو کچھ کہا اس کا تذکرہ انجیل متی، اصحاح ۲۸ میں اس طرح ہوا کہ انہوں نے ان سے کہا:

"اذھبوا وتلمذوا کل الامم وعمدوھم باسم الاب والابن وروح القدس"

(تم جاؤ اور ہر قوم کے افراد کو میرا شاگرد بناؤ اور انہیں باپ، بیٹا اور روح القدس کے نام پر تعمید کرو (نہلاؤ)، ......تعمید عیسائیوں کے ایک خاص مذہبی غسل کو کہتے ہیں جو ہر مسیح پر لازم و واجب ہوتا ہے تا کہ وہ گناہوں سے پاک ہو جائے......،

انجیل یوحنا، اصحاح ۱ میں اس طرح مذکور ہے:

" فی البدء کان الکلمة والکلمة کان عند اللّٰہ، واللّٰہ کان الکلمة منذء البدء کان ھذا عند اللّٰہ کل بہٖ کان وبغیرہ لم یکن شیئ مما کان بہٖ کانت الحیاة، والحیاة کانت نور الناس"۔

(ابتداء میں وہ ایک کلمہ تھا، اور کلمہ خدا کے پاس تھا اور خدا ہی وہ کلمہ تھا، وہ شروع ہی سے خدا کے پاس تھا، ہر چیز اسی کے ذریعے وجود میں آئی اور اس کے بغیر کوئی چیز وجود پذیر نہ ہوئی، ان چیزوں میں سے ایک زندگی ہے اور زندگی لوگوں کا نور ہے)

تو مذکورہ بالا بیانات اور ان جیسے دیگر اظہارات جو انجیل میں مذکور ہیں کہ جن کے باعث نصاریٰ کو تین خدا ماننے کی راہ ملی،

بہر حال انجیل میں ان بیانات واظہارات کے تذکرہ کا مقصد یہ تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خدا کا بیٹا ہونے کے عقیدہ کا تحفظ ہو اور اس کے ساتھ ساتھ خداوند عالم کی وحدانیت و یکتائی کا نظریہ بھی محفوظ رہے، یعنی دونوں باتیں درست قرار پائیں کیونکہ حضرت عیسیٰؑ نے تو خود ہی خدا کی توحید کی تعلیم دی اور واضح الفاظ میں ارشاد فرمایا:

"ان اول کل الوصایا: اسمع یا اسرائیل الرب الهک الله واحد هو"

(میری سب سے پہلی وصیت و نصیحت یہ ہے: اے اسرائیل! رب جو کہ تیرا معبود ہے وہی یکتا معبود ہے)

(ملاحظہ ہو: انجیل مرقس، اصحاح ۱۲!)

ان کے اقوال کا خلاصہ یہ ہے (اگرچہ اس کی برگشت کسی معقول و قابل قبول معنی کی طرف نہیں ہوتی) کہ ذاتِ خداوندی یکتا جوہر ہے کہ اس کے تین "اقنوم" ہیں، "اقنوم" سے مراد وہ صفت ہے جو ذات کی جلوہ افروزی و تجلی کا ذریعہ ہوتی ہے کہ جس سے اس ذات کی جلوہ سامانیاں یقینی ہوتی ہیں، گویا وہ ذات کا مظہر ہوتی ہے، البتہ وہ صفت موصوف کی غیر نہیں ہوتی یعنی اس سے الگ حیثیت کی حامل نہیں ہوتی، اور وہ تین اقنوم جو ذاتِ خداوندی کے مظاہر ہیں ان میں سے ایک اقنوم وجود ہے، دوسرا اقنوم علم جو کہ "کلمہ" ہے اور تیسرا اقنوم حیات ہے کہ جو روح ہے۔

یہ تین اقنوم ہی ہیں جن میں سے ایک کو باپ، دوسرے کو بیٹا اور تیسرے کو روح القدس کہا جاتا ہے، پہلا یعنی "باپ" اقنوم الوجود، دوسرا اقنوم العلم والکلمۃ اور تیسرا اقنوم الحیات کہلاتا ہے۔ تو بیٹا اقنوم الکلمہ اور اقنوم العلم ہے جو باپ ...... جو کہ اقنوم الوجود ہے ...... کے پاس سے روح القدس کے ہمراہ ...... جو کہ اقنوم الحیات ہے کہ جس کے سبب سے تمام اشیاء و موجودات عالم ہستی روشنی حاصل کرتی ہیں ...... نازل ہوا،

یہ ہے ان امور کا اجمالی بیان، اور اس کی تفصیل و تفسیر میں نصاریٰ اس قدر اختلاف کا شکار ہوئے کہ کئی گروہوں میں تقسیم ہو گئے یہاں تک کہ ان کے مختلف و متعدد مذاہب و مسالک کی تعداد ستر سے زیادہ ہو گئی، ان کی بابت کچھ مطالب جو اس کتاب میں سما سکے اور ان کے بیان کی گنجائش ہوئی عنقریب پیش کئے جائیں گے۔

اگر آپ مذکورہ بالا مطالب پر اچھی طرح غور کریں اور ان کے معانی پر بھرپور توجہ دیں تو آپ بخوبی آگاہ ہو جائیں

گے کہ قرآن مجید میں نصاریٰ کے جو بیانات واظہارات ذکر کئے گئے ہیں یا جن باتوں کی ان کی طرف نسبت دی گئی ہے ان سب کی بازگشت ایک ہی مطلب کی طرف ہوتی ہے (یعنی وحدت کی تثلیث) تو وہ نصرانیت میں جنم دینے والے تمام مذاہب ومسالک کے درمیان قدر مشترک ہے کہ جس کی وضاحت ''وحدت کی تثلیث'' کے معنی میں ہم پہلے پیش کر چکے ہیں چنانچہ اس حوالہ سے جو آیات ذکر ہو چکی ہیں ان کا اشاراتی ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے:

- " وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ......"
- " لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ......"
- " لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ......"
- " وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ۭ اِنْتَهُوْا......"

بہرحال قرآن مجید میں اسی قدر مشترک کو بیان کرنے پر اکتفا ہوئی ہے کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حوالہ سے نصرانیوں کے اقوال پر ان کے کثیر ومتفرق ہونے کے باوجود جو اشکالات وارد ہوئے ہیں کہ جن کی بناء پر قرآن مجید میں ان کے خلاف حجت قائم کی گئی ہے ان سب کا محور ایک ہے اور وہ ایک ہی طرز واسلوب کے حامل ہیں، اس سلسلہ میں بہت جلد وضاحت کی جائے گی۔

چوتھی فصل:

عقیدۂ تثلیث کی نفی میں قرآنی بیانات

قرآن مجید میں عیسائیوں کے عقیدۂ تثلیث اور اس کی بابت ان کے اقوال کو دو طریقوں وحوالوں سے رد کیا گیا ہے:

۱۔ کلی وعمومی طریقہ وحوالہ

۲۔ مخصوص ومختص طریقہ وحوالہ

کلی وعام طریقہ اپناتے ہوئے بیان کیا گیا کہ کلی طور پر خدا کا صاحب فرزند ہونا محال اور فی نفسہ ناممکن ہے خواہ عیسیٰؑ کو بیٹا کہا جائے یا کسی دوسرے شخص کو!

اور مخصوص ومختص طریقہ اپناتے ہوئے بیان کیا گیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہ تو خدا کے فرزند تھے اور نہ ہی معبود تھے، بلکہ بندۂ خدا اور مخلوق تھے۔

یعنی پہلی صورت میں اصل مسئلہ ملحوظ تھا جبکہ دوسری صورت میں خاص طور پر حضرت عیسیٰؑ کے حوالہ سے بات کی گئی،

مزید وضاحت:

پہلی صورت کی وضاحت یہ ہے کہ کسی کا کسی سے متولد ہونا اور فرزند قرار پانا حقیقت میں اس طرح ہوتا ہے کہ ان زندہ مادی موجودات میں سے کوئی ایک اپنے جسم سے کوئی حصہ الگ کرے مثلاً کوئی انسان یا حیوان یا نباتات میں سے کوئی نبات اپنے جسمانی مادہ سے کچھ جدا کرے، پھر اسے تدریجی نشو ونما کے ذریعے اپنی ہی نوع کا ایک فرد بنادے جو اس ہی جیسا ہو اور وہ انہی خصوصیات و آثار کا حامل بنے جو اس انسان، حیوان یا نبات میں موجود ہیں جس سے یہ جدا ہوا، مثلاً کوئی حیوان اپنے آپ سے نطفہ کو جدا کرتا ہے، اور نبات (گھاس) اپنے آپ سے "لقاح"......اپنے مادۂ منویہ.....کو جدا کرتی ہے، پھر اس کی تدریجی تربیت ونشو ونما کا اہتمام کرتی ہے یہاں تک کہ وہ جدا ہونے والی چیز اس جیسا حیوان یا نبات بن جاتی ہے، اور یہ واضح ومعلوم ہے کہ خداوند عالم کے حوالہ سے اس طرح کی کیفیت محال وناممکن ہے کیونکہ:

۱۔ اس میں خدا کا مادی جسم والا ہونا تسلیم کرنا پڑے گا جبکہ اللہ تعالیٰ مادہ اور اس کی بنیادی احتیاجات مثلاً حرکت اور زمان ومکان وغیرہ سے پاک ومنزہ ہے۔

۲۔ خداوند عالم اپنی علی الاطلاق الوہیت وربوبیت کے حوالہ سے ہر چیز پر علی الاطلاق قیومیت وبرتری اور بے نیازی رکھتا ہے لہٰذا ہر چیز وجود میں آنے اور بقا پانے میں اس کی محتاج ودست نگر ہے (ہر چیز کی وجود پذیری وموجودیت اسی سے وابستہ ہے) تو پھر کسی ایسی چیز کا تصور کیونکر ممکن ہے جو اس کی ہم نوع ہو، مثل ہو، اپنی ذات وموجودیت میں اس کی محتاج نہ ہو بلکہ اس سے بے نیاز اپنی استقلالی حیثیت رکھتی ہو، اپنی ذات، اوصاف اور خصوصیات کے حوالہ سے یعنہٖ خدا کی طرف ہو اور ان میں سے کسی کی بابت خدا کی احتیاج نہ رکھتی ہو؟

۳۔ اگر خداوند عالم کی بابت بچے پیدا کرنے جیسے اعمال کو روا سمجھیں تو اس سے افعال تدریجی انجام دینے کو بھی درست ماننا پڑے گا جبکہ وہ اس سے بالاتر ہے، اور اسے مادہ وحرکت کے عمومی نظام کے ماتحت تسلیم کرنا پڑے گا جو کہ قطعی طور پر نادرست اور خلاف واقع ہے بلکہ حقیقت الامر یہ ہے کہ خداوند عالم کا ہر کام اس کے ارادہ ومشیت کے ساتھ انجام پذیر ہوتا ہے اور اس کی مشیت زمانی فاصلہ اور تدریج کی محتاج نہیں...... بلکہ اس طرح کے امور سے بالاتر ہے......، چنانچہ اس کا ثبوت واضح وصریح الفاظ کے ساتھ درج ذیل آیت مبارکہ میں پایا جاتا ہے:

سورۂ بقرہ، آیت: ۱۱۷

O " وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۱۱۶﴾

بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ وَاِذَا قَضٰۤی اَمۡرًا فَاِنَّمَا یَقُوۡلُ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ﴿۱۱۷﴾"

(اور انہوں نے کہا کہ خدا نے بیٹا بنالیا ہے، وہ اس سے منزہ و پاک ہے، بلکہ آسمانوں اور زمین کی ہر چیز اس کی ملکیت ہے، سب اس کے حضور خضوع کرنے والے ہیں، وہ آسمانوں اور زمین کا بغیر کسی نمونہ و مثال کے خالق ہے، اور وہ جب کسی چیز کا حتمی فیصلہ کرلیتا ہے تو اس سے کہتا ہے، ہوجا! تو وہ ہوجاتی ہے)

اس آیت میں لفظ "سبحان"...... ہمارے بیان کردہ مطالب کی روشنی میں...... زیر بحث موضوع کی ایک مستقل دلیل ہے...... اس میں خدا کی پاکیزگی اور مادہ و مادیت کے تقاضوں سے منزہ ہونا ملحوظ و مقصود ہے، اور جملہ "لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ کُلٌّ لَّہٗ قٰنِتُوۡنَ" دوسری دلیل ہے...... کہ اس میں خداوند عالم کا قیوم ہونا ملحوظ و مقصود ہے...... اور جملہ "بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ وَاِذَا قَضٰۤی اَمۡرًا......" تیسری دلیل ہے...... کہ اس میں تدریجی نشو و نما کی نفی اور خداوند عالم کے ارادہ و مشیت کے فرمانی فاصلہ کی عدم احتیاج ملحوظ و مقصود ہے......،

جملہ "بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ" کے بارے میں بھی یہ امکان بھی پایا جاتا ہے کہ وہ صفت کی اپنے فاعل کی طرف اضافت کے باب سے ہو، اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوگا کہ خداوند عالم کی تخلیق کسی ایسی مثال کی بناء پر نہیں جو اس سے پہلے تھی لہٰذا اس کا بچہ پیدا کرنا غیر ممکن اور ناقابل تصور ہے کیونکہ اس طرح اس کی تخلیق سابقہ نمونہ کی بناء پر ہوجائے گی کیونکہ عیسائی حضرت عیسیٰؑ کو عین و مثل خدا مانتے ہیں، بنابرایں یہ جملہ ہمارے زیر بحث موضوع کی ایک اور دلیل قرار پاتا ہے، ...... اس حوالہ سے ہمارے موضوع کی چار دلیلیں اسی ایک آیت مبارکہ میں پائی جاتی ہیں یعنی لفظ "سبحان" پہلی دلیل، جملہ "**لہ ما فی السماوات والارض کل لہٗ قانتون**" دوسری دلیل، جملہ "بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ" تیسری دلیل اور جملہ "اِذَا قَضٰۤی اَمۡرًا......" چوتھی دلیل ہے،

اگر بالفرض ان کے قول "اتَّخَذَ اللّٰہُ وَلَدًا" (خدا نے بیٹا بنالیا ہے) کو مجازی و غیر حقیقی قرار دیں اور کہیں کہ انہوں نے یہ بات بیٹا اور بچہ کے معنیٰ کے دائرہ کی وسعت کی بنیاد پر کی ہے اور وہ یوں کہ اس سے یہ مراد لیا جائے کہ ایک چیز دوسری چیز سے منفصل و الگ ہوئی ہے جو کہ حقیقت میں اس کے مثل ہو کہ مادی اشیاء کے ایک دسرے سے الگ ہونے یا زمانی تدریج کے بغیر ایسا ہو (یہی وہ بات ہے جو نصاریٰ کے قول و عقیدہ یعنی "الۡمَسِیۡحُ ابۡنُ اللّٰہِ" (مسیح خدا کا بیٹا ہے) کی بابت بھرپور چھان بین کے بعد معلوم ہوتی ہے کہ ان کا مقصد بھی یہی ہے) لیکن اس کے باوجود مماثلت والا اشکال اپنی جگہ باقی رہ جاتا ہے۔

اس کی مزید وضاحت یہ ہے کہ باپ اور بیٹا ہونے کے اثبات کا لازمی نتیجہ ان کے عدد (ایک سے زیادہ ہونے) کا اثبات ہے جو کہ حقیقی کثرت کا اثبات ہی ہے، کیونکہ اس بناء پر باپ اور بیٹا کے درمیان نوعی وحدت فرض بھی کریں جیسا کہ نوع

انسانی سے باپ اور بیٹا ہوتے ہیں (ان میں سے ایک فرد کو باپ اور دوسرے کو بیٹا کہا جاتا ہے جبکہ وہ دونوں ایک ہی نوع انسانی کے افراد ہیں) لیکن وہ انسانی حقیقت میں ایک اور نوع انسان کے حوالہ سے دو فرد ہیں، لہٰذا اگر ہم معبود کو ایک مانیں تو اس کے علاوہ جو بھی ہے...... کہ جس میں بیٹا بھی شامل ہے...... وہ اس کا غیر، اس کا مملوک اور اس کا دست نگر و محتاج ہوگا اور جسے بیٹا سمجھا گیا ہے وہ اس کے مثل معبود نہ ہوگا کیونکہ خدا محتاج نہیں جبکہ وہ (بیٹا) اپنے وجود میں آنے کے لئے باپ کا محتاج ہوتا ہے، اور اگر یہ کہیں کہ وہ (بیٹا) اس جیسا ہے مگر اس کا محتاج نہیں بلکہ اس کی طرح اپنے وجود میں آنے میں استقلال رکھتا ہے اور کسی کا دست نگر نہیں تو اس سے عقیدہ توحید کی سرے ہی سے نفی ہو جائے گی اور خداوند عالم کی یکتائی بے بنیاد ہو جائے گی،

چنانچہ درج آیت مبارکہ بھی اسی مطلب پر دلالت کرتی ہے:

سورۂ نسآء، آیت :۱۷۱

○ "وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا"

(اور تم تین خداؤں کی بات نہ کرو، اس سے باز آ جاؤ تمہارے لئے بہتر ہوگا، بس اللہ ہی یکتا معبود ہے، اس کی ذات پاک و منزہ ہے اس سے کہ اس کا کوئی بیٹا ہو، اسی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، اور اللہ کا سہارا ہی کافی ہے)

اور جہاں تک دوسری صورت کا تعلق ہے اور وہ یہ کہ بالخصوص حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہ تو خدا کے بیٹے ہیں اور نہ ہی خدا کے ساتھ الوہیت کی حقیقت میں شریک ہیں تو اس کی دلیل آنجناب کا بشر اور بشریت کی خصوصیات کا حامل ہونا ہے، ......تو ظاہر ہے کہ جو شخص لباسِ بشریت زیب تن کئے ہو وہ الوہیت کے مقام پر فائز نہیں ہو سکتا، اس کی وضاحت یہ ہے کہ حضرت مریمؑ ان کی حامل تھیں اور انہوں نے اپنے رحم میں ان کی نشو و نما کی اور پھر جس طرح ہر ماں بچہ پیدا کرتی ہے انہوں نے بھی انہیں جنا، اس کے بعد اپنے نومولود کی اس طرح تربیت کی جس طرح ہر ماں اپنے نوزائیدہ بچہ کی نگہبانی و حضانت کے فرائض سرانجام دیتی ہے، پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے نشو و نما اور زندگی کے مراحل طے کرنا شروع کیے اور عمر کے مدارج میں یکے بعد دیگرے ترقی و پیشرفت کرتے ہوئے بچپن سے جوانی اور پھر بڑھاپا تک پہنچے، ان تمام مراحل میں ان کی حالت ایک عام انسان جیسی تھی کہ جو اپنی طبع انسانی کے ساتھ زندگی کی گوناگوں کیفیات سے دوچار ہوتا ہے، چنانچہ وہ عام انسان کی طرح ان تمام کیفیتوں سے گزرے مثلاً بھوک، سیر ہونا، خوش و ناخوش ہونا، لذت و الم پانا، کھانا پینا، سونا و بیدار رہنا اور تھکن و سختی اور راحت و آرام وغیرہ،

یہ تمام کیفیتیں ایسی ہیں جن کا مشاہدہ اس دور میں سب نے کیا جب آنجنابؑ لوگوں کے درمیان رہے، تو کوئی عقلمند انسان اس بات میں شک نہیں کرسکتا کہ جو شخص اس طرح کی جسمانی کیفیات سے دوچار ہو وہ اپنے دیگر ہم نوع افرادِ بشر کی طرح "انسان" ہی ہے اور نتیجتاً اسی طرح وہ مخلوق اور کارخانہ صنعت الٰہی کا شاہکار ہے جس طرح اس کی نوع کے دیگر افراد ہیں، اور جہاں تک ان کے ہاتھوں خارق العادت و معجزات کے رونما ہونے کا تعلق ہے مثلاً مردوں کو زندہ کرنا، پرندہ کی تخلیق، مادرزاد نابینا اور برص کے مریض کا شفایاب ہونا، اسی طرح ان کے اپنے وجود پانے میں جو خارق العادت امور ظاہر ہوئے مثلاً ان کا بغیر باپ کے پیدا ہونا وغیرہ تو وہ تمام غیر معمولی و خارق العادت ہیں کہ جو عالم طبیعت میں جاری و ساری عام نظام سے مطابقت نہیں رکھتے اور ان کا وقوع پذیر ہونا نادر ہے (وہ نادر الوجود ہیں) لیکن وہ ناممکن و محال ہرگز نہیں، حضرت آدمؑ ہی کو دیکھ لیں کہ جن کے بارے میں آسمانی کتب واضح طور پر بیان کرتی ہیں کہ وہ مٹی سے پیدا کئے گئے اور بغیر باپ......اور بغیر ماں...... کے پیدا ہوئے، اور انبیاء الٰہی مثلاً صالح، ابراہیم اور موسیٰ علیہم السلام کے ہاتھوں بے شمار معجزات و خارق العادت امور رونما ہوئے کہ جن کا تذکرہ آسمانی کتب میں ہوا ہے اور وہ ان حضرات کے لئے کسی طرح سے بھی الوہیت و خدائی کا اثبات نہیں کرتے اور نہ ہی ان اعمال کی بناء پر انہیں انسانیت کی وادی سے نکال کر خدائی کے منصب پر فائز ظاہر کرتے ہیں،

یہ طریقہ استدلال وہی ہے جو قران مجید میں اختیار کیا گیا ہے چنانچہ ارشاد ہوا:

سورۂ مائدہ، آیت :۷۵:

○ "لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ إِلَٰهٍ إِلَّا إِلَٰهٌ وَاحِدٌ...... مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَأُمُّهُ صِدِّيقَةٌ ۖ كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ ۗ انْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْآيَاتِ ثُمَّ انْظُرْ أَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ"

(کافر ہو گئے وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ اللہ، تین میں کا تیسرا ہے، حالانکہ خدائے یکتا کے سوا کوئی معبود نہیں...... مسیح بن مریم تو صرف رسول تھا کہ اس سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں اور اس کی ماں سچی تھی، وہ دونوں کھانا کھاتے تھے، آپ دیکھیں کہ ہم کس طرح یہ نشانیاں لوگوں کے لئے کھول کھول کر بیان کرتے ہیں، پھر دیکھیں کہ وہ کس طرح اور کس قدر جھوٹ والزام تراشیاں کرتے ہیں)

اس آیت میں حضرت مسیحؑ کا کھانا کھانا خاص طور پر مذکور ہے کیونکہ یہ ایسا عمل ہے جو تمام اعمال میں سے زیادہ واضح و مضبوط دلیل کی حیثیت رکھتا ہے کہ اسے انجام دینے والا شخص مادی جسمانی ضروریات سے دوچار ہوتا ہے اور اس سے اس کی احتیاج و دست نگری ظاہر و ثابت ہوتی ہے جو کہ یقینی طور پر الوہیت و خدائی کے منافی ہے کیونکہ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ جب طبعی طور پر بھوک اور پیاس لگے اور پھر وہ کچھ کھا کر یا پی کر سیر و سیراب ہو جائے تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ سراپا

احتیاج ہے اور اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے پر خود قادر نہیں بلکہ اس مقصد کے لئے کسی دوسرے کا دست نگر ہونے کے بغیر اس کے پاس کوئی چارہ کار نہیں، تو اس طرح کے شخص کی خدائی کیا معنی رکھتی ہے؟ کیونکہ جو شخص اس حد تک احتیاجات میں گھرا ہوا ہو اور اپنے تئیں انہیں دور کرنے پر قادر نہ ہو وہ ناقص و نامکمل ہوتا ہے اور اس کے امور کی تدبیر اس کے ہاتھ میں نہیں ہوتی بلکہ کوئی دوسرا اس کے نظام حیات کو اپنے ہاتھ میں لئے ہوتا ہے یعنی وہ معبود و غنی بالذات نہیں ہوسکتا بلکہ وہ اس ہستی کا خلق کردہ (مخلوق) اور اس کے نظام تدبیر کا پروردہ ہے جو پوری کائنات کا خالق اور مدبر ہے کہ ہر چیز کی تدبیر کی بازگشت اسی کی طرف ہوتی ہے۔ بنابرایں ممکن ہے اسی کی طرف درج ذیل آیت مبارکہ کی بازگشت ہو،

سورۂ مائدہ، آیت: ۱۷

○ "لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قُلْ فَمَنْ يَمْلِكُ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ أَنْ يُهْلِكَ الْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ۗ وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۚ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ"

(یقیناً وہ لوگ کافر ہوگئے جنہوں نے کہا کہ اللہ ہی مسیح ابن مریم ہے، کہہ دیجئے تو پھر یہ بتائیں کہ اگر اللہ مسیح ابن مریم اور ان کی والدہ اور روئے زمین پر موجود تمام لوگوں کو ہلاک کرنا چاہے تو کون اسے روک سکتا ہے؟ اور اللہ ہی آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کا مالک ہے، وہ جو چاہتا ہے خلق کرتا ہے، اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے)

یہی مطلب سابق الذکر آیت مبارکہ (یعنی سورۂ مائدہ آیت ۷۵) کے بعد والی آیت "۷۶" میں نصاریٰ کو مخاطب قرار دے کر ان الفاظ میں مذکور ہے:

"قُلْ أَتَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا ۚ وَاللَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ"

(کہہ دیجئے کہ آیا تم اللہ کے علاوہ کسی ایسی چیز کی عبادت کرتے ہو جو تمہارے لئے نہ نقصان دہ اور نہ ہی فائدہ بخش ہے! اور اللہ سننے والا، بہت آگاہ ہے)

تو اس طرح کے دلائل پر مبنی بیانات میں اصل ملاک و معیار یہ ہے کہ جو کچھ حضرت مسیحؑ کی زندگی میں ان سے دیکھا گیا وہ یہ تھا کہ وہ انسانی زندگی میں جاری و ساری عام نظام کے تحت زندگی بسر کرتے تھے اور نوع انسانی کی تمام صفات و کیفیات ان میں پائی جاتی تھیں، وہ دیگر ہم نوع افراد جیسے افعال و اعمال انجام دیتے تھے مثلاً کھانا، پینا اور اس طرح کی دوسری انسانی ضرورتیں اور مخصوص بشری امور و اوصاف وغیرہ، اور اس طرح کے اعمال کی انجام دہی اور بشری صفات کا حامل ہونا ظاہری و خیالی طور پر نہیں تھا بلکہ حقیقی صورت میں تھا اور حضرت مسیحؑ ایک انسان ..... نوع انسانی ہی کے ایک فرد ..... تھے جن

میں مذکورہ بالا صفات واحوال اور افعال پائے جاتے تھے، چنانچہ موجودہ انجیلوں میں بھی یہی بات واضح طور پر مذکور ہے کہ آنجناب اپنے آپ کو انسان اور ابن الانسان کہتے تھے اور انجیلیں ان واقعات سے بھری ہوئی ہیں جن میں آنجناب کا کھانا، پینا، سونا، چلنا پھرنا، سفر کرنا، سفر کی تھکن، لوگوں سے باتیں کرنا اور اس طرح کے دیگر اعمال کا تذکرہ ہے کہ اسے کسی بھی صورت میں غیر انسانی حوالہ سے الگ نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی ان کی کسی دوسری صورت میں تاویل ہوسکتی ہے، اس بناء پر وہ تمام حوالے آنجناب پر منطبق ہوتے ہیں جو دیگر افرادِ بشر میں پائے جاتے ہیں اور وہ بھی دوسروں کی طرح کسی استقلالی مالکیت کے حامل نہیں بلکہ عین ممکن ہے کہ ان کے سلسلۂ زندگی کا اختتام بنی نوع انسان کے دیگر افراد کی طرح ہو، اسی طرح ان کے عبادتی و دعائیہ اعمال بھی ہیں کہ ان کی بابت کوئی شک وشبہ نہیں پایا جاتا کہ وہ جو عبادتی عمل انجام دیتے تھے وہ خداوند عالم کا قرب حاصل کرنے اور بارگاہ ربوبیت میں خضوع واظہار عجز کی غرض سے ہوتا تھا اور اس میں ہرگز یہ بات مقصود وملحوظ نہیں ہوتی تھی کہ وہ ان عبادات واعمال کو صرف لوگوں کو تعلیم دینے کے لئے انجام دیتے ہوں یا ان میں اس طرح کی دیگر اغراض ملحوظ ہوں، بلکہ وہ تمام عبادتیں خدا کی رضا وتقرب کے لئے انجام دیتے تھے، چنانچہ ان کی عبادت کے حوالہ سے درج ذیل آیت مبارکہ واضح دلیل ہے:

سورۂ نسآء، آیت: ۱۷۲

○ "لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا"

(مسیح ہرگز اس بات سے انکار وروگردانی نہیں کرتا کہ وہ اللہ کا بندہ ہے اور نہ ہی مقرب فرشتے ایسا کرتے ہیں، اور جو شخص اللہ کی عبادت وبندگی سے انکار وروگردانی اور تکبر کرے تو خدا سب کو اپنی طرف پلٹا دے گا)

تو حضرت مسیح کا عبادت کرنا ہی سب سے بڑی اور پہلی دلیل ہے کہ وہ معبود نہ تھے بلکہ وہ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ الوہیت کسی اور ہستی کا حق ہے اور اس حق میں ان کا کوئی حصہ نہیں، اس بناء پر یہ بات کیا معنی رکھتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو کسی کا بندہ ومملوک سمجھیں اور پھر اپنے آپ کو معبود ومالک قرار دیں؟ اور اسی حوالہ سے اپنی ذاتی حیثیت کے قائل ہوں جو اپنے معبود کے بارے میں سمجھتے ہیں؟ ایسا ہرگز ممکن نہیں کہ عبد بھی ہوں اور معبود بھی، مالک بھی ہوں اور مملوک بھی، مستقل بھی ہوں اور محتاج بھی، اور اپنے آپ کو اسی حیثیت کے حامل سمجھیں جو اپنے معبود کو سمجھتے ہوں! اسی طرح فرشتوں کا عبادت کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ وہ خدا کی بیٹیاں نہیں اور نہ ہی روح القدس معبود ہے بلکہ وہ سب اللہ کے عبادت گزار اور اس کے فرمانبردار ہیں چنانچہ اس سلسلہ میں ارشاد الٰہی ہے:

سورۂ انبیاء، آیت :۲۸

○ "وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴿۲۶﴾ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۷﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ"

(اور انہوں نے کہا کہ رحمٰن نے بیٹا بنایا ہے، اس کی ذات پاک ہے، بلکہ وہ (فرشتے) عزت والے بندگان خدا ہے جو خدا پر کسی بات میں سبقت نہیں کرتے اور وہ تو خدا کے فرمان پر عمل کرتے ہیں، خدا ان کے حال و مستقبل سے آگاہ ہے، اور وہ کسی کی شفاعت نہیں کریں گے مگر صرف اس کی جس سے خدا راضی ہو، اور وہ خشیت الٰہی سے لرزہ براندام رہتے ہیں)

اس کے علاوہ تمام انجیلوں میں جگہ جگہ یہ مطلب مذکور ہے کہ روح، خداوند عالم اور اس کے رسولوں کی اطاعت گزار ہے اور خدا کے تابع فرمان اور احکام و دستورات الٰہی پر عمل پیرا ہے، لہٰذا یہ بات بے معنی ہے کہ کوئی چیز اپنے آپ کو فرمان دے اور خود ہی اپنی اطاعت کرے، اور نہ ہی یہ بات معقول ہے کہ کوئی چیز خود اپنے تابع اور اپنی ہی مخلوق ہو،

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ حضرت مسیحؑ خدا کی عبادت کرتے تھے اور ان کا خدا کی عبادت کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ وہ خود خدا نہیں، تو اسی کے مانند یہ بات بھی ان کے غیر خدا ہونے کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ وہ لوگوں کو خدا کی عبادت کی دعوت دیتے تھے، ان کا یہی عمل یعنی لوگوں کو خداوند عالم کی عبادت کا حکم دینا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ خود کو معبود نہیں سمجھتے تھے، چنانچہ اس مطلب کی طرف درج ذیل آیت مبارکہ میں اشارہ ہوا ہے:

سورۂ مائدہ، آیت :۷۲

○ "لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ"

(یقیناً کافر ہو گئے وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ مسیح ابن مریم ہی خدا ہے، حالانکہ مسیح نے کہا: اے بنی اسرائیل! تم اللہ عبادت کرو جو میرا رب ہے اور تمہارا رب ہے کہ جو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرے تو خدا اس پر بہشت کو حرام کردے گا اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور ظالموں کی مدد کرنے والا کوئی نہیں)

اس آیت مبارکہ سے مطلوبہ معنی کا اثبات نہایت واضح ہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ انجیلیں اس مطلب کے تذکرہ سے بھری ہوئی ہیں کہ حضرت مسیحؑ لوگوں کو خداوند عالم

کی طرف بلاتے تھے، البتہ ان (انجیلوں) میں "اعبدوا اللّٰہ ربی و ربکم" جیسا جامع جملہ موجود نہیں لیکن ایسی عبارتیں کثرت سے پائی جاتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آنجناب لوگوں کو خدا کی عبادت بجالانے کی دعوت دیتے تھے اور واضح و صریح الفاظ میں اس بات کا اقرار و اعتراف کرتے تھے کہ خداوند عالم ہی وہ پروردگار ہے جس کے دست قدرت میں ان (مسیحؑ) کے تمام امور کی باگ ڈور ہے اور یہ کہ وہی تمام لوگوں کا رب ہے، انجیلوں میں کوئی ایسا جملہ نہیں ملتا جس سے ثابت ہو کہ آنجنابؑ نے صراحتاً یا اشارتاً ایک دفعہ ہی سہی لوگوں کو اپنی عبادت کا کہا ہو، اور جہاں تک ان کی طرف منسوب اس جملہ کا تعلق ہے: "انا وابی واحد نحن" ......انجیل یوحنا، اصحاب ۱۰...... (میں اور میرا باپ ہم ایک ہی ہیں) تو اگر اسے درست مانا جائے تو ضروری ہے کہ اس سے مراد یہ لیا جائے کہ میری اطاعت دراصل اللہ ہی کی اطاعت ہے، جیسا کہ خداوند عالم نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا:

سورۂ نسآء، آیت :۸۰

○ " مَنۡ يُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰهَ "

(جو شخص رسول کی اطاعت کرے گویا اس نے اللہ کی اطاعت کی)

پانچویں فصل:

مسیحؑ، شفاعت کرنے والے ہیں، فدیہ بننے والے نہیں

نصاریٰ کا گمان ہے کہ حضرت مسیحؑ اپنے مقدس خون سے لوگوں کے گناہ کا فدیہ بنے ہیں، اسی حوالہ سے انہوں نے "فادی" کا لقب دیا۔ اور انہوں نے کہا کہ جب آدم نے خدا کی نافرمانی کرتے ہوئے درخت سے پھل کھایا تو وہ خطا کار بن گئے اور ان کا یہ خطا کارانہ عمل ان کے دامن گیر ہوگیا اور اسی طرح ان کے بعد ان کی ذریت واولاد میں سلسلہ در سلسلہ جڑ پکڑ گیا، یہی وجہ ہے کہ ان کی نسل میں خدا کی نافرمانی کا ایسا سلسلہ چلا کہ جو بھی پیدا ہوگا وہ خطا کار ہوگا اور خطا و نافرمانی کی سزا اخروی عذاب اور ہمیشہ کی تباہی ہے کہ جس سے چھٹکارا ممکن نہیں حالانکہ خداوند عالم رحم کرنے والا، عادل ہے،

اسی بیان سے ایک پیچیدہ و ناقابل حل اعتراض پیدا ہوا اور وہ یہ کہ اگر خداوند عالم آدمؑ اور ان کی ذریت و نسل کو ان کی خطاؤں کی وجہ سے سزا دے تو یہ اس کی اس رحمت کے منافی ہے جس کی بناء پر اس نے انہیں پیدا کیا ہے اور اگر انہیں معاف کردے تو یہ اس کے عدل کے منافی ہوگا کیونکہ عدل کا تقاضہ یہ ہے کہ مجرم کو اس کے جرم و غلط کاری پر سزا دی جائے جیسا کہ

تقاضائے عدل ہے کہ نیکی کرنے والے اطاعت گزار بندہ کو اس کی نیکی پر اجر و ثواب دے، (یہ عام نصاریٰ کا نظریہ ہے البتہ ان میں سے بعض مثلاً قسیس مار اسحٰق کی رائے یہ ہے کہ جرم کے مرتکب کو سزا دینا روا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ وعدہ کی خلاف ورزی جائز نہیں البتہ وعید (جرم پر سزا کی دھمکی) کو واپس لیا جا سکتا ہے اور اس پر عمل نہ کرنے میں کوئی حرج نہیں، یہ اعتراض و پیچیدگی حضرت عیسیٰؑ کی ولادت سے پہلے تک باقی تھی کہ بالآخر خداوند عالم نے حضرت مسیحؑ کی برکت سے اسے حل کر دیا اور وہ اس طرح کہ حضرت مسیحؑ (جو کہ خدا کے فرزند اور خود ہی خدا ہیں) نے آدمؑ کی نسل میں سے ایک خاتون یعنی حضرت مریم البتول کے رحم میں حلول کیا اور اس سے اسی طرح پیدا ہوئے جیسے عام انسان پیدا ہوتے ہیں، لہٰذا وہ ایک کامل انسان تھے کیونکہ وہ انسان سے پیدا ہونے کے حوالہ سے انسان کے فرزند تھے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ کامل معبود تھے کیونکہ وہ خدا کے فرزند تھے اور خدا کا بیٹا جو کہ خود بھی خدا ہے وہ تمام گناہوں اور خطاؤں سے پاک و معصوم ہے۔

پھر حضرت مسیحؑ ایک قلیل عرصہ تک لوگوں میں رہے اور ان کے ساتھ گھل مل کر زندگی بسر کرتے رہے، ان کے ساتھ کھاتے پیتے تھے، ان سے ہم کلام ہوتے تھے اور ان کا اٹھنا بیٹھنا ان کے ساتھ تھا، یہاں تک کہ انہوں نے اپنے دشمنوں کو اپنے اوپر مسلط کر دیا تاکہ وہ انہیں نہایت سفا کی و بے دردی سے قتل کر دیں جو کہ انہیں سولی پر لٹکانے کی صورت میں ہوا حالانکہ کتاب الٰہی میں سولی والا ملعون قرار دیا گیا ہے مگر انہوں نے اس لعنت اور اس کی سختی و رنج کو برداشت کیا اور اپنے آپ کو فدا کر دیا تاکہ اس کے بندے آخرت کے عذاب سے نجات پائیں اور ہمیشہ باقی رہنے والی تباہی سے دوچار نہ ہوں، لہٰذا حضرت عیسیٰؑ اپنے ماننے والوں بلکہ تمام اہل عالم کے گناہوں کا کفارہ بن گئے، (یوحنا کے پہلے رسالہ کی پہلی فصل میں اس طرح مذکور ہے) کہ:

اے میرے بیٹو! میں یہ الفاظ اس لئے تمہارے لئے لکھ رہا ہوں کہ تم گناہ کا ارتکاب نہ کرو اور اگر تم میں سے کوئی ایک گناہ کا مرتکب ہوا تو خدا کے پاس ہمارا ایک عادل سہارا موجود ہے کہ جو حضرت یسوع مسیح ہے اور وہی ہمارے گناہوں کی بخشش کا وسیلہ ہے بلکہ صرف ہمارے گناہوں کی بخشش کا وسیلہ ہی نہیں بلکہ تمام اہل عالم کے گناہوں کی بخشش کا وسیلہ ہے۔

یہ ہے نصاریٰ کا وہ قول و نظریہ جسے وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں پیش کرتے ہیں کہ وہ کفارہ بنے، اسی نظریہ کو نصاریٰ نے اپنے مشن کی بنیاد اور اصل و اساس قرار دیا ہے اور یہ نظریہ ہی ان کے اعتقادات کا نقطۂ آغاز و انجام اور محور ہے اور یہ اسی طرح سے بنیادی حیثیت کا حامل ہے جس طرح قرآن مجید میں توحید کو اسلام کی دعوت اور مقدس مشن کا محور و مرکزی نقطہ قرار دیا گیا ہے چنانچہ خداوند عالم نے اپنے رسول گرامی قدر حضرت محمد مصطفیٰؐ سے ارشاد فرمایا: " قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ " (سورۂ یوسف، آیت ۱۰۸)...... کہہ دیجئے کہ یہ میرا راستہ ہے، میں اللہ کی طرف بصیرت و آگاہی کے ساتھ دعوت دیتا ہوں، میں اور ہر وہ شخص جو میرا پیروکار ہے اور اللہ کی ذات پاک ہے، اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں......، اور حضرت مسیح علیہ السلام نے

بھی (جیسا کہ انجیلوں میں صراحت کے ساتھ مذکور ہے اور سطور بالا میں بھی اس کا ذکر ہو چکا ہے) اپنی نصیحتوں میں توحید و محبت الٰہی ہی کو بنیاد اور اصل و اساس و محور قرار دیا،

بہر حال علماء اسلام اور دیگر محققین نے نصاریٰ کے عقائد و نظریات پر کھل کر تفصیلی بحث کی ہے اور ان پر وارد ہونے والے اشکالات میں ان کے عقائد کے بطلان و نادرستی کو آشکار کر دیا ہے چنانچہ اہل علم و ارباب دانش حضرات نے اس سلسلہ میں متعدد کتابیں لکھیں، رسالے شائع کئے اور نصاریٰ کے عقائد باطلہ کی رد میں تحریروں کا ڈھیر لگا دیا اور ان میں اس حوالہ سے واضح دلائل کے ساتھ ثابت کیا کہ ان کے عقائد نہ تو معقول ہیں اور نہ ہی کتب عہدین سے مطابق رکھتے ہیں، لیکن یہاں جو بات ہمارے لئے اہمیت کی حامل ہے اور اس تفصیلی تذکرہ کی اصل غرض ہے وہ یہ کہ ہم ان جہات کو بیان کرنا چاہتے ہیں جو قرآنی تعلیمات کے بنیادی اصولوں کے منافی ہیں، اور اس بحث کے اختتام پر ہم اس فرق کو بیان کریں گے جو شفاعت ......کہ جس کا اثبات قرآن مجید میں ہوا ہے...... اور فدیہ و کفارہ......کہ نصاریٰ جس کے قائل ہیں...... کے درمیان پایا جاتا ہے۔

یہاں یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید نے صریح لفظوں میں بیان کیا ہے کہ خداوند عالم نے لوگوں سے ان کی عقلوں کے عین مطابق بات کی ہے اور اپنے بیانات کو ان کی قوت فہم و ادراک سے قریب تر قرار دیا ہے، یہی وجہ ہے کہ انسان حق و باطل کے درمیان بخوبی تمیز کر سکتا ہے اور درست پہچان کرنے کے بعد حق کی پیروی کا دم بھرتے ہوئے باطل سے کنارہ کشی کرتا ہے بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ خیر و شر اور مفید و مضر کے درمیان تمیز کرتے ہوئے خیر و مفید کو اپنا لیتا ہے اور شر و مضر کو جھٹلا دیتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ ہم نے قرآنی بیانات کے حوالہ سے جو کچھ ذکر کیا ہے کہ وہ عقل سلیم کے عین مطابق ہے اس کی تصدیق ہر اس شخص کے لئے آسان و یقینی ہے جو اس مقدس کتاب الٰہی کا مطالعہ کرے (قرآن مجید کی مقدس آیات کا مطالعہ کرنے والا ہر شخص مذکورہ بالا مطالب کی تصدیق و تائید با آسانی و بالیقین کر سکتا ہے اور اس امر سے بخوبی آگاہ ہو سکتا ہے کہ قرآن مجید نے خیر و شر اور مفید و مضر کی جو معیاری و اصولی پہچان کروائی ہے عقل سلیم بھی اس کی تصدیق کرتی ہے)۔

عیسائیوں کے عقائد پر دس اعتراضات

پہلا اعتراض:

انہوں نے کہا ہے کہ حضرت آدمؑ نے ممنوعہ درخت سے پھل کھا کر خدا کی نافرمانی کا ارتکاب کیا۔

ان کی اس بات کو قرآن مجید میں دو طرح سے رد کیا گیا ہے:

(۱) خداوند عالم کی طرف سے حضرت آدم علیہ السلام کو درخت سے پھل کھانے کی نہی (ممانعت) ارشادی

(خیر خواہانہ) نہی کے باب سے تھی کہ جس میں نہی کرنے والے کی شخصیت و آقائی حیثیت کی عملداری کی بجائے نہی شدہ شخص کی بہتری و بھلائی مقصود ہوتی ہے، اور اس طرح کے احکامات کی بجا آوری پر ثواب ملتا ہے اور نہ ان کی عدم بجا آوری پر عقاب وسزا دی جاتی ہے بلکہ ان کی حیثیت مشورہ دینے والے شخص کے اوامر ونواہی جیسی ہوتی ہے کہ جو وہ مشورہ طلب کرنے والے کو دیتا ہے، یا طبیب و معالج کے اوامر ونواہی جیسی ہوتی ہے کہ جو بیمار شخص کی بہتری و صحت یابی کے لئے دیتا ہے، اس بناء پر ارشادی احکامات کی بجا آوری کا فائدہ اس شخص کو پہنچتا ہے جسے وہ احکام صادر کئے جاتے ہیں اور ان کی عدم بجا آوری کا نقصان بھی اسے ہی پہنچتا ہے جس کے لئے وہ احکام و دستورات صادر ہوتے ہیں، گویا ان دستورات یا رہنمائیوں پر عمل کرنا اسی شخص کے فائدہ و مصلحت کو یقینی بناتا ہے جس کے لئے وہ دی گئیں اور ان کو ترک کرنا بھی اسی شخص کے مفسدہ و ضرر کا باعث بنتا ہے۔

اس حوالہ سے حضرت آدم علیہ السلام خدا کے ارشادی حکم یا خیر خواہانہ رہنمائی پر عمل نہ کر کے بہشت سے باہر نکلنے اور قرب الٰہی کی راحت اور رضائے خداوندی کے سرور سے محروم ہوئے، اور جہاں تک اخروی عقاب کا تعلق ہے تو وہ اس لئے اس کا شکار نہ ہوئے کہ انہوں نے کسی ایسے فرمان کی مخالفت نہیں کی جو مولا و آقا کی حیثیت میں ان کے لئے صادر کیا گیا ہو کہ جس کی عدم بجا آوری پر عقاب ہوتا ہے، اس موضوع کی تفصیلات کے لئے سورۂ بقرہ کی آیات مبارکہ ۳۵ تا ۳۹ کا مطالعہ کریں۔

(۲) حضرت آدم علیہ السلام نبی تھے اور قرآن مجید انبیاء الٰہی علیہم السلام کی ذوات مقدسہ کو معصیت و نافرمانی سے پاک و منزہ قرار دیتا ہے اور انہیں گناہوں کی دلدل میں پھنسنے سے مبرا سمجھتا ہے اور اس بات کو واضح و صریح طور پر بیان کرتا ہے کہ وہ عظیم ہستیاں ہرگز اوامر خداوندی کی خلاف ورزی نہیں کرتیں، اس قرآنی بیان کو عقلی تائید بھی حاصل ہے اور عقل سلیم بھی یہی کہتی ہے کہ خداوند عالم کے منتخب کردہ انبیاءؑ خدا کے فرامین کی نافرمانی کے مرتکب نہیں ہوتے کیونکہ وہ خود لوگوں کو خدا کے احکامات و دستورات کی اطاعت کی دعوت دیتے ہیں تو جو شخص منصبی حوالہ سے ایسا ہو وہ خود کیونکر ان دستورات سے سرتابی کر سکتا ہے؟، انبیاء الٰہی کی عصمت کے بارے میں تفصیلی تذکرہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۱۳ کی تفسیر میں ہو چکا ہے اس کی طرف رجوع کریں۔

دوسرا اعتراض:

انہوں نے کہا ہے کہ حضرت آدمؑ نے جو خطا کی وہ ان کے دامن گیر ہوگئی، یہ بات درست نہیں کیونکہ قرآن مجید اس حوالہ سے اس طرح گویا ہے:

O " فَتَلَقّٰی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ " (سورۂ طٰہٰ، آیت ۱۲۲)

(پھر اس کے پروردگار نے اسے چن لیا تو اس کی توبہ قبول کی اور اسے ہدایت کی نعمت سے نوازا)

O "فَتَلَقّٰی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ"

(سورۂ بقرہ، آیت ۳۷)

(پھر آدم نے اپنے رب سے کچھ کلمات حاصل کئے تو خدا نے اس کی توبہ قبول کی کہ وہ توبہ قبول کرنے والا، نہایت مہربان ہے)

عقل سلیم نے بھی اس قرآنی بیان کی تصدیق وتائید بلکہ وضاحت کی ہے کیونکہ نافرمانی وگناہ پر سزا وعقاب کا یقینی ہونا عقلی طور پر مولا وآقا کی شخصیت ومقام کے حوالہ سے اس بات کا متقاضی ہے کہ معصیت ونافرمانی سے اجتناب کیا جائے اور آقا کے احکام ودستورات کی خلاف ورزی نہ کی جائے تاکہ نظام الامور صحیح سمت میں اور مستحکم رہے کیونکہ اگر ثواب وعقاب نہ ہو اور اطاعت وفرمانبرداری پر جزاء اور معصیت ونافرمانی پر سزا نہ دی جائے تو حاکم کی حاکمیت کا سلسلہ برقرار رہے گا اور نہ کوئی شخص اطاعت وفرمانبرداری کو اہمیت دے گا یا معصیت ونافرمانی کی پرواہ کرے گا، لہٰذا جس طرح آقا وحاکم کی حاکمیت کے اہم ترین کاموں میں سے ایک یہ ہے کہ مجرموں کو ان کے جرائم کے ارتکاب پر سزا دے اور اطاعت گزاروں کو جزا وثواب سے نوازے اسی طرح اس کے مولا وآقا ہونے کے حوالہ سے اس کے اختیارات میں یہ بات بھی شامل ہے کہ وہ اپنی حاکمیت کے دائرہ میں ہر طرح کا فیصلہ کرسکتا ہے اور اسے پورے طور پر یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ چاہے تو خطاکاروں کی خطاؤں اور نافرمانی کرنے والوں کی نافرمانیوں سے عفو ودرگزر کرے اور انہیں معاف کردے کیونکہ ایسا کرنا ہی کامل اختیار کا حصہ ہے اور حاکمیت اعلیٰ کے شایان شان بھی یہی ہے کہ مواخذہ وعدم مواخذہ کا اختیار اسے حاصل ہو، یعنی اگر مقتضائے مصلحت یہ ہو کہ مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچایا جائے تو ان کا مواخذہ ہوگا ورنہ انہیں معاف کرنے میں بہتری ہوگی، بلکہ طاقتور حکام کا خطاکاروں کو معافی دینا ایسا مستحسن عمل ہے جس کے فی الجملہ ثبت ومطلوب ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں پایا جاتا اور بنی نوع انسان کے عقلمند افراد اس روش کو اپناتے چلے آرہے ہیں،

بنابرایں کسی انسان سے خطا ومعصیت کا سرزد ہونا اس کے اس سے دامن گیر وہمیشہ باقی رہ جانے کا سبب نہیں قرار پاسکتا، یعنی ایسا نہیں کہ اگر کوئی شخص گناہ کا مرتکب ہو تو اب وہ ہمیشہ ہی گناہوں کا ارتکاب کرتا رہے گا کیونکہ اگر ایک بار گناہ کا ارتکاب اس کے دائمی طور پر باقی رہنے کا یقینی سبب ہو تو عفو وبخشش کا دروازہ ہی بند ہوجائے جبکہ عفو وبخشش خطاؤں کو محو کرنے اور گناہ کے آثار کو مٹانے کا کام دیتے ہیں اور اگر خطاؤں وگناہوں کو دوام حاصل ہو اور وہ انسان کے ساتھ چمٹے رہیں کہ ان کا جدا ہونا قابل تصور نہ ہو تو عفو وبخشش کی گنجائش ہی باقی نہ رہے گی اور سرے ہی سے اس کی نفی ہوجائے گی حالانکہ وحی الٰہی یعنی

قرآن مجید عفوو بخشش کے تذکرہ سے بھرا ہوا ہے اور اسی طرح کتب عہدین، تورات و انجیل میں بھی عفوو بخشش کا ذکر کثرت سے موجود ہے یہاں تک کہ زیر نظر بیان بھی عفوو بخشش کے اشاراتی تذکرہ سے خالی نہیں،

خلاصۂ کلام یہ کہ کسی گناہ یا خطا و غلطی کا اس کے مرتکب میں ہمیشہ باقی رہ جانا کہ توبہ و استغفار اور پشیمانی کے باوجود قابل عفوو بخشش نہ ہو ہرگز درست نہیں اور عقل سلیم و طبع مستقیم سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی...... بلکہ اس کی نفی ہوتی ہے......،

تیسرا اعتراض:

انہوں نے کہا ہے کہ آدمؑ کی خطا جس طرح خود ان کے ساتھ چمٹ گئی اسی طرح قیامت تک آنے والی ان کی نسل وذریت کے ساتھ بھی چمٹ گئی ہے کہ اب بنی نوع آدم کے تمام افراد خطا کار ہی ہوں گے۔

یہ بات اس لحاظ سے درست نہیں کہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک شخص کا گناہ اور اس کے آثار ان افراد میں بھی پائے جائیں جو آقا کے آقا ہونے کی حیثیت میں صادر ہونے والے احکام کی نافرمانی کے مرتکب نہ ہوئے ہوں، دوسرے لفظوں میں یہ کہ کسی شخص کی غلطی خود اس کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لے اور اس غلطی کے آثار کا دائرہ اس قدر وسیع ہو کہ جو لوگ اس کے مرتکب نہ بھی ہوئے ہوں وہ بھی اس کا شکار ہو جائیں، البتہ کسی شخص کے گناہ پر راضی ہونے والے افراد کا معاملہ اس سے مختلف ہے یعنی اگر کوئی قوم کسی معصیت کا ارتکاب کرے اور دوسری اقوام اس کی معصیت پر خوش اور قلبی طور پر اس کی تائید کریں تو وہ بھی اس معصیت کے آثار کا سامنا کریں گے لیکن جہاں تک ہمارے زیر بحث مسئلہ کا تعلق ہے تو اس میں غلطی و خطاء پر راضی و خوش ہونے کا حوالہ نہیں پایا جاتا بلکہ صرف معصیت کار شخص کی نسل سے تعلق رکھنے کا حوالہ پایا جاتا ہے کہ قرآن مجید نے اس طرح کے حوالہ کی بنیاد پر گناہ اور اس کے آثار کے دائرہ کی وسعت کی نفی کی ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کو کسی خطا و جرم کے ارتکاب کے بغیر سزا کا مستحق قرار دیا جائے یعنی کسی کے کئے کی سزا کسی اور کو ملے، یہ بات قرآنی اصولوں سے متصادم ہے چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

سورہ نجم، آیت ۳۹:

" اَلَّا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ۝ وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی "،

(کوئی شخص کسی کے کئے کی سزا نہیں بھگتے گا۔۔۔اور یہ کہ انسان کو اس کے کئے کے صلہ کے سوا کچھ حاصل نہیں)۔

اس قرآنی اصول کی تائید عقل سلیم بھی کرتی ہے کیونکہ کسی شخص کو اس گناہ کی سزا دینا جس کا اس نے ارتکاب نہ کیا ہو قبیح و مذموم ہے، مزید مطالب جاننے کے لئے سورۂ بقرہ کی آیات مبارکہ: ۲۱۶ تا ۲۱۸ کی تفسیر کے ذیل میں ہونے والی افعال کی بحث کی طرف رجوع کریں۔

چوتھا اعتراض:

مسیحیوں کے اظہارات و بیانات اس بات پر مبنی ہیں کہ ہر خطا و گناہ کا اثر و نتیجہ..... یا سزا و کیفر..... ابدی ہلاکت ہے اور اس حوالہ سے گناہوں و خطاؤں کے درمیان کوئی فرق نہیں، ان کے اس نظریہ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ کوئی گناہ و خطا، چھوٹا اور بڑا ہونے کے حوالہ سے ایک دوسرے سے مختلف نہ ہو بلکہ سب گناہ ایک ہی جیسے ہوں یعنی کبیرہ اور تباہ کن ہوں جبکہ قرآن مجید کی تعلیمات میں اس بات کا واضح اظہار ہوا ہے کہ گناہوں و معاصی میں فرق ہے اور ہر خطا و معصیت دوسری خطا و معصیت سے مختلف ہے کہ ان میں سے بعض کبیرہ اور بعض صغیرہ گناہ ہیں، اور بعض گناہ قابل بخشش جبکہ بعض گناہ ناقابل معافی ہیں اور گناہوں میں سے بعض ایسے ہیں جو توبہ کے ذریعہ بخشش و معافی کے قابل ہیں مثلاً شرک کہ جس کے بارے میں ارشاد الٰہی ہے:

سورۂ نسآء، آیت :۳۱

○ " اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ "

(اگر تم ان کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرو جن سے تمہیں منع کیا گیا ہے تو ہم تمہاری غلطیوں سے درگزر کریں گے)

سورۂ نسآء، آیت :۴۸

○ " اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ "

(خدا ہرگز یہ معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جائے اور اس کے علاوہ جسے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے)

تو خداوند عالم نے محرمات اور ممنوعہ اعمال میں سے بعض گناہوں کو کبائر (بڑی نافرمانیاں) اور بعض کو غلطیاں و کوتاہیاں یعنی چھوٹی نافرمانیاں قرار دیا اور ان دونوں کا تذکرہ ایک دوسرے کے مقابل میں کیا جس سے ان کی اقسام کا واضح ثبوت ملتا ہے، اسی طرح بعض گناہوں کو ناقابل بخشش اور بعض کو معافی و بخشش کے قابل قرار دیا، اس سے پتہ چلتا ہے کہ گناہوں میں بہر حال فرق ہے اور وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں لہٰذا ہر گناہ کو ابدی ہلاکت اور ہمیشہ دوزخ میں جلتا رہنے کا موجب قرار دینا درست نہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ عقل سلیم تمام گناہوں کو ایک ہی لڑی میں پرونا اور ایک جیسا قرار دینا صحیح نہیں سمجھتی کیونکہ ہر عمل یکساں حیثیت نہیں رکھتا بلکہ ہر ایک اپنی مخصوص نوعیت و کیفیت کے ساتھ اپنا اثر رکھتا ہے، طمانچہ مارنا اور قتل کرنا ایک جیسا نہیں،

بری نظر سے دیکھنا اور زنا ایک دوسرے سے مختلف اعمال ہیں، یہی وجہ ہے کہ عقلائے عالم نے کسی بھی دور میں کسی گناہ وخطا کو کسی دوسرے گناہ وخطا کی جگہ قرار نہیں دیا بلکہ وہ ہر گناہ وجرم پر عذاب وسزا اور مواخذہ کا عمل اسی کے مطابق متعین کرتے ہیں اور مختلف جرائم پر مختلف سزاؤں کے قائل ہیں، اور یہ بات قرین حقیقت ہے کہ ہر جرم کو اس کی مربوطہ خصوصیات وحالات کے مطابق دیکھا جائے اور اس پر سزا اسی کے تناظر میں طے ہو، بنابرایں یہ کیونکر ممکن ہے کہ اعمال کے ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود سب کو ایک ہی رنگ دیا جائے اور سب کو ایک جیسا قرار دیا جائے بلکہ ضروری ہے کہ ان کی شدت وضعف کی بناء پر سزاؤں کا تعین ہو کہ ان میں سے جو اس حد تک شدید اور بڑا گناہ ہو کہ جس کی سزا ہمیشہ باقی رہنے والا عذاب اور ابدی ہلاکت کے سوا کچھ نہ ہو جیسے شرک باللہ (خدا کے ساتھ کسی کو شریک عبادت قرار دینا) کہ جس کی بابت واضح قرآنی بیان موجود ہے، تو ایسا کرنا یقیناً قرین صحت ہوگا، اور یہ مطلب واضح وآشکار ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا ممنوعہ درخت سے پھل کھانا یعنی خداوند عالم کی طرف سے صادر ہونے والے حکم کی خلاف ورزی کو کفر باللہ اور اس طرح کے بڑے گناہوں کے باب میں نہیں قرار دیا جا سکتا، لہٰذا اس پر اس قدر سخت سزا وعقاب یعنی ہمیشہ کا عذاب مقرر کرنا بیجا ہوگا، (اس سلسلہ میں افعال کی بابت جو بحث سورۂ بقرہ کی آیات ۲۱۶ تا ۲۱۸ میں ہو چکی ہے اس کا مطالعہ کریں)

پانچواں اعتراض:

عیسائیوں کے عقائد میں سے ایک یہ ہے کہ خداوند عالم کی صفت ''رحمت'' اور ''عدالت'' کے درمیان تزاحم وتصادم کی صورت پیدا ہوئی تو اسے دور کرنے کے لئے حضرت عیسیٰؑ نازل ہوئے اور پھر پرواز کر گئے...... ان کا یہ بیان ان کی طرف سے نزول وصعود کی خاص توجیہ وتاویل پر مبنی ہے......

اس عقیدہ وبیان اور اس کے آثار ونتائج پر بخوبی غور کرنے والا شخص اس امر سے آگاہ ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ معتقد ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی وہ ہستی ہے کہ پوری کائنات اور تمام مخلوق اپنے وجود پذیر ہونے میں اس کی طرف منسوب ہوتی ہے اور وہی سب کا منتہا ہے، لیکن اس کے باوجود اس کے افعال اس کے ارادہ اور ذاتی علم پر مبنی ہوتے ہیں اور وہ جس کام کا ارادہ کرتا ہے تو اس کی انجام دہی کی بابت تمام پہلوؤں کا جائزہ لیتا ہے کہ اگر اس کی انجام دہی میں مصلحت معلوم ہو تو اسے انجام دیتا ہے ......ورنہ اسے ترک کر دیتا ہے...... اور یہ بعینہٖ اسی طرح سے ہے جیسے انسان جب کسی کام کی انجام دہی کو ترجیح دیتا ہے تو اپنے ذاتی فکری رجحان کی بناء پر اس کا ارادہ کرتا ہے اور اسے عملی جامہ پہنا دیتا ہے، تو خداوند عالم بھی مصلحت ومفسدہ کو مد نظر وملحوظ رکھتے ہوئے اپنے افعال کو ان پر منطبق کرتا ہے یعنی جس کام کی انجام دہی میں مصلحت سمجھتا ہے اسے انجام دیتا ہے چنانچہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ وہ مصلحت کی تشخیص میں غلطی کرے اور پھر اس کام کی انجام دہی پر نادم وپشیمان ہو، اس حوالہ سے تورات کے

سفر تکوین کے اصحاح ششم میں یوں مرقوم ہے کہ خداوند عالم نے بنی نوع آدم کا زمین میں خلق کرنا ناپسند کیا (ملاحظہ ہو: تورات عربی، مطبوعہ ۱۸۱۱ عیسوی)۔ اور ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ کسی کام کے بارے میں غور کرے مگر اس کی سوچ کسی جانب مرکوز نہ ہو اور وہ اس کی بابت فیصلہ نہ کر سکے کہ آیا اس کی انجام دہی بہتر ہے یا نہیں؟ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا کسی کام کے بارے میں غور وفکر کرنا اسے کسی نتیجہ تک نہ پہنچائے اور وہ اس کی بابت جہالت ولاعلمی کا شکار ہو،

خلاصہ یہ کہ مسیحیوں کی نظر میں خداوند عالم اپنے اوصاف وافعال میں انسان ہی کی طرح ہے کہ جو کچھ کرتا ہے اس کے بارے میں پہلے غور وفکر کرتا ہے اور مصلحت اندیشی کی بناء پر اس کی انجام دہی کا فیصلہ کرتا ہے، گویا وہ اپنے افعال میں ملحوظہ مصلحتوں کے تابع اور ان کی بناء پر مجبور وبے کس ہوتا ہے لہٰذا اس بات کا امکان باقی رہتا ہے کہ مصلحت کی تشخیص میں صحیح جانب اختیار کرے یا غلطی وغلط فہمی کا شکار ہو جائے اور حقیقت سے غفلت وحق سے گمراہ ہو، اور یہ بھی ممکن ہوتا ہے کہ کسی کام کی مصلحت سے آگاہ ہو یا جاہل وناآگاہ ہو، اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ کبھی وہ بیرونی عوامل پر غالب آئے یا وہ اس پر غالب آ جائیں، لہٰذا اس کی قدرت بھی اس کے علم کی طرح محدود ہے۔

عیسائیوں کے اس عقیدہ کی رو سے جب اس طرح کی کیفیات خداوند عالم کے بارے میں ممکن ہوں تو وہ تمام حالتیں وکیفیتیں بھی اس کی بابت ممکن وروا سمجھی جائیں گی جو ہر اس فاعل یعنی کسی بھی کام کرنے والے کی بابت ممکن ہوتی ہیں جو اپنے کام کو غور وفکر اور مصلحت اندیشی کی بناء پر انجام دیتا ہے کہ وہ کبھی اپنے کیے پر خوش ومسرور اور کبھی ناخوش ومغموم ہوتا ہے، کبھی اپنے کام کو خوب واچھا قرار دیتا ہے اور کبھی اس پر نادم وپشیمان ہوتا ہے، کبھی اپنے کیے پر نازاں اور کبھی شرمندہ ہوتا ہے، تو جو اس طرح کا ہو وہ ان مادی جسمانی موجودات میں سے ایک ہوگا کہ جن پر حرکت، تغیر وتبدل اور مرحلہ بہ مرحلہ کمال پانے کے عمومی ضابطہ (تکامل) کا اطلاق ہوتا ہے، اور جو اس طرح کا ہو وہ ممکن الوجود مخلوق ہے بلکہ عام انسان سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت ومقام نہیں اور وہ واجب الوجود نہ ہوگا کہ جو ہر چیز کا خالق وآفریدگار ہے۔

قارئین کرام! اگر آپ کتب عہدین کا مطالعہ کریں تو ہمارے اس بیان کی صداقت وحقانیت آپ پر واضح وعیاں ہو جائے گی جو ہم نے ان کی طرف منسوب کیا ہے کہ وہ خداوند عالم کو جسمانی سمجھتے ہیں اور اسے جسمانیت کی تمام خصوصیات و اوصاف سے متصف کرتے ہیں اور بالخصوص انسانی صفات کا حامل قرار دیتے ہیں۔

جبکہ قرآن مجید مذکورہ بالا تمام امور میں خداوند عالم کو منزہ وپاک سمجھتا ہے اور تمام خرافی وبیہودہ نسبتوں سے مبرا قرار دیتا ہے چنانچہ واضح لفظوں میں بیان ہوا ہے: "سُبْحٰنَ اللّٰہِ عَمَّا یَصِفُوْنَ" ......سورۂ صافات، آیت ۱۵۹......(خدا اس سے پاک ہے جس سے وہ لوگ اس کی توصیف کرتے ہیں)۔ اور عقلی یقینی دلائل سے بھی اس حقیقت کا واضح ثبوت ملتا ہے کہ خداوند عالم تمام کمالی صفات کی جامع ذات ہے (اس میں تمام صفات کمالیہ یکجا ہیں)، اصل وجود اسی سے مختص ہے کہ

جس میں عدم کا سرے ہی سے تصور و گمان ہی ممکن نہیں، وہ قدرت مطلقہ رکھتا ہے کہ عجز سے ہرگز دوچار نہیں ہوتا، اس کا علم علی الاطلاق ہے کہ جس پر جہل ہرگز طاری نہیں ہوتا، وہ سراسر زندگی ہے کہ جو علی الاطلاق ہے یعنی ہر طرح کی قید و شرط سے مبرا ہے اور اس میں موت وفنا کا کوئی امکان نہیں پایا جاتا، جب عقلی ٹھوس دلائل سے یہ سب کچھ اس کی بابت ثابت ہے تو اس میں کسی قسم کی تبدیلی کا گمان ہی بیجا ہے، اس کے وجود میں یا اس کے علم یا قدرت و حیات میں کسی طرح کا تغیر ناقابل تصور ہے، اسی طرح اس کی بابت جسم و جسمانیت کا بھی گمان نہیں ہوسکتا کیونکہ اجسام اور جسمانیات پر تغیرات و تبدیلیاں چھائی رہتی ہیں اور وہ ہر طرح کی ممکنہ حالتوں، ناداریوں اور احتیاجات کی زد میں رہتی ہیں، تو جب خداوند عالم جسم و جسمانیت سے پاک ہے تو اس پر مختلف حالتیں اور گوناگوں کیفیتیں بھی طاری نہیں ہوسکتیں مثلاً غفلت، سہو و نسیان، غلط فہمی، ندامت و پشیمانی، تحیر و سرگردانی، بیرونی عوامل سے اثر پذیری، شرمندگی، خواری و مغلوبیت اور اس طرح کی دیگر کیفیات وغیرہ، چنانچہ ان تمام امور کے حوالہ سے ہم نے اسی کتاب میں موزوں و مناسب مقامات پر تفصیلی بحثیں کی ہیں کہ قارئین کرام کی نظروں سے ضرور گزریں گی، اب یہ کام اہل بصیرت و ارباب فکر و فہم کا ہے کہ وہ ان دونوں یعنی قرآنی بیانات اور کتب عہدین میں مذکور مطالب کے درمیان تقابلی جائزہ لیں اور دیکھیں کہ قرآن مجید نے کائنات کے معبود کے بارے میں جو کچھ بیان کیا ہے اس میں اور کتب عہدین میں اس حوالہ سے جو کچھ مذکور ہے اس میں کیا بنیادی فرق ہے ؟ قرآن مجید خدا کے بارے میں ہر کمالی صفت کا اثبات کرتا ہے اور اسے ہر نقص و ناقص صفت سے پاک و منزہ قرار دیتا ہے اور نتیجتاً اسے محدود و معین دنیا میں بسنے والوں کے افہام و ادراک کی دسترس سے بالاتر ایک عظیم و برتر ہستی تسلیم کرتا ہے جبکہ یہود و نصاریٰ کی کتب میں خداوند عالم کے بارے میں جو کچھ مذکور ہے وہ یونانیوں کی من گھڑت باتوں، قدیم ہند اور چین والوں کے خرافات و نامعقولات مطالب کے سوا کچھ نہیں جو کہ پہلے افراد بشر کے اوہام نے تراشے اور ان کی ناقص فکری قوت نے جو کچھ سمجھا انہوں نے اسے ہی درست قرار دے کر اپنا لیا، ...... ان دو متقابل نظریاتی مطالب کا بغور مطالعہ و جائزہ لینے سے حق و حقیقت کی اصل صورت نظر آ جائے گی اور معقول و فطری حقائق کے مقابلے میں نامعقول مطالب و خرافات کی قلعی کھل جائے گی کہ پھر کسی طرح کے اشتباہ و غلط فہمی کی گنجائش ہی باقی نہ رہے گی ......م،

چھٹا اعتراض:

دین مسیحیت کے پیروکاروں کا کہنا ہے کہ خدا نے اپنے بیٹے مسیح کو بھیجا اور اسے حکم دیا کہ ارحام میں سے ایک رحم میں حلول کرے تا کہ ایک انسان کی صورت میں متولد ہو جو کہ خدا ہو ،

یہ وہی نامعقول قول و نظریہ ہے جسے قرآن مجید نے رد کیا اور اس کے باطل و بے بنیاد ہونے پر ٹھوس دلائل ذکر

کئے۔ بلکہ اس کی نادرستی کو آشکار کرنا ہی قرآن مجید کا اصل ہدف ہے، اس سلسلہ میں ہم سابقہ بیانات میں بھرپور وضاحت کر چکے ہیں اور یہاں اسے دوبارہ بیان کرنا ضروری نہیں سمجھتے، اور یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ اس عقیدہ ونظریہ کو عقلی تائید بھی حاصل نہیں چنانچہ جب آپ ان صفات کے بارے میں بخوبی غور کریں جن کا واجب الوجود ذات میں پایا جانا ضروری ہے مثلاً سرمدی ثبات...... ازلی وابدی ہونا......، عدم تغیر وتبدل، عدم محدودیت (نامحدود ہونا)، ہر چیز پر کامل تسلط اور زمان ومکان اور ان کے لوازم وآثار سے پاک ومنزہ ہونا، اور اس کے ساتھ ساتھ آپ انسان کے تکوینی وتخلیقی مراحل اور وجود میں آنے کے حالات یعنی نطفہ سے لے کر رحم میں جنین بننے تک کے مرحلوں پر غور کریں...... خواہ ان مراحل کی بابت ''ملکائیوں'' کے بیانات کو درست قرار دیں یا ''نسطوریوں'' یا ''یعقوبیوں'' یا ان کے علاوہ دیگر حضرات کے نظریات کو بنیاد بنائیں...... تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ جسم وجسمانیت اور اس کے اوصاف وآثار کے حامل اور جسمانیت اور زمان ومکاں اور حرکت وتغیر وغیرہ سے پاک ومنزہ ہستی کے درمیان تقابلی نسبت ہی نہیں پائی جاتی، لہٰذا ان دونوں کے درمیان یکسانیت کا تصور ہی غیر معقول ہے کیونکہ ان کے درمیان کوئی وجہ اشتراک ہی نہیں پائی جاتی، اور مسیحیوں کے اس غیر معقول نظریہ کا عقلی اصولوں سے عدم مطابقت کا حامل ہونا ہی اس بات کا سبب بنا کی قدیسین کے سربراہوں مثلاً بولس وغیرہ نے فلسفہ اور عقلی مباحث کی مذمت اور ان کے نادرست ہونے کے بارے میں کھل کر بیانات دیئے، چنانچہ بولس کا کہنا ہے کہ

''میں نے اس سلسلہ میں جو عملی اقدام کیا ہے اور جو کچھ لکھا اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ فلسفیوں کے نظریات اور فقہاء کے بیانات کو غلط ونادرست ثابت کروں بلکہ ان کی آراء واظہارات کا نام ونشان مٹا دوں، یہ فلسفہ وحکمت کے مدعی کہا، یہ مؤلف واہل قلم کہا، یہ محقق اور اس دور کے اہل نظر کہا اور ہمارے نظریات کہا؟ (ان بیچاروں کو ہمارے اعتقادی اصولوں تک دسترس ہی حاصل نہیں) اگر یہودی ہم سے کسی معجزہ کا مطالبہ کریں اور اگر یونانیوں کو یہ جرأت ہو کہ وہ اپنے فلسفیانہ اصولوں کے ساتھ ہمارا سامنا کریں تو ہم پکار پکار کر کہیں گے کہ حضرت مسیح انہی معجزہ وفلسفہ کی سولی پر چڑھے''۔

(رسالہ بولس، اصحاح اول)

اس طرح کی دیگر باتیں بولس اور اس جیسے دیگر مسیحی علماء کے بیانات میں کثرت سے پائی جاتی ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے اظہارات کا مقصد بیان بازی اور پروپیگنڈہ کا بازار گرم کرنے کے سوا کچھ نہیں، ان بیانات اور نظریات پر بخوبی غور کرنے اور بولس وغیرہ کے رسائل وکتب کا بنظر غائر مطالعہ کرنے والا ہر شخص ان کے طرز تکلم وانداز بیان ہی سے ان کے بارے میں ہمارے مؤقف کی تصدیق کرے گا اور اسے حق وباطل کے درمیان فرق سے آگاہی حاصل ہو جائے گی،

مسیحیوں کے مذکورہ بالا نظریات وعقائد اور اقوال وآراء کے تناظر میں ان کے اس عقیدہ کی قلعی بھی کھل جاتی ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ ''خداوند عالم گناہوں وخطاؤں سے معصوم وپاک ہے'' کیونکہ وہ جس خدا کے قائل ہیں اور اس کے بارے میں انہوں نے جو تصویر کشی کی ہے اس کے مطابق وہ خطاؤں سے محفوظ ومبرا نہیں قرار پایا یعنی اس کا فہم وادراک اور فعل

وعمل میں غلطی سے پاک ہونا ثابت نہیں ہوتا، اور جہاں تک خطاو گناہ سے معصوم ومصون ہونے کے اس معنی کا تعلق ہے کہ وہ اپنے مولاو آقا کی نافرمانی کا مرتکب نہیں ہوتا تو یہ بات خداوند عالم کے حوالہ سے نا قابل تصور ہے کیونکہ وہ خدا کے لئے کسی مولاو آقا کے قائل نہیں کہ جس کی فرمانبرداری واجب ولازم ہواور اس کی نافرمانی سے محفوظ ومعصوم ہونے کی بات کی جائے، لیکن فہم وادراک اور فعل وعمل میں ہر طرح کی غلطی وخطا سے محفوظ ہونا جو کہ خدا کے لئے یقیناً ثابت ہے مسیحی حضرات اس کے قائل نہیں، بنابرایں ان کے عقیدہ کے مطابق خداوند عالم معصوم عن الخطاء قرار نہیں پاتا۔

ساتواں اعتراض:

مسیحی حضرات کہتے ہیں کہ ”حضرت مسیح جب انسان کی صورت میں آئے تو انہوں نے ایک عام انسان کی طرح دیگر افرادانسان سے معاشرت کی اور ان میں انہی کی طرح بن کر رہے، یہاں تک کہ اپنے آپ پر اپنے دشمنوں کو مسلط کر دیا“۔

ان کے اس نظریہ پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اس صورت میں واجب الوجود، واجب الوجود ہونے کے باوجود ممکن الوجود کی صفات کا حامل ہوگا یعنی ایک ہی وقت میں واجب الوجود بھی ہوگا اور ممکن الوجود بھی ہوگا اور ایک ہی وقت میں خدا بھی ہوگا اور انسان بھی ہوگا، گویا یہ بات درست پائے گی کہ واجب الوجود اپنی مخلوق میں سے ایک ہو جائے یعنی موجودات عالم میں سے ہر نوع کی حقیقت سے متصف ہو مثلاً کبھی انسانوں میں سے ایک انسان ہو جائے، کبھی گھوڑا، کبھی پرندہ، کبھی کیڑا مکوڑا، اور کبھی کچھ اور ہو جائے، اور کبھی ایک سے زیادہ نوع بن جائے مثلاً ایک ہی وقت میں انسان، گھوڑا اور حشرات الارض میں سے کوئی ایک ہو، یعنی ایک ہونے کے ساتھ ساتھ متعدد اور کئی ایک ہو، اسی طرح یہ بھی جائز ودرست قرار پائے گا کہ اس سے ہر طرح کا فعل سرزد ہو اور وہ موجودات عالم کے افعال میں کسی بھی فعل کو انجام دے کیونکہ جب اس کا اپنی مخلوق سے مختص افعال کا انجام دینا بھی جائز ہوگا، اور پھر یہ بھی درست وروا ہوگا کہ اس سے متقابل ومتضاد افعال سرزد ہوں مثلاً عدل وظلم، اور یہ بھی ممکن وجائز ہوگا کہ وہ متقابل ومتضاد صفات سے متصف ہو مثلاً علم وجہل، قدرت وعجز، حیات وموت اور بے نیازی و ناداری،...... خداوند عالم اس طرح ہونے سے بلند وبرتر وماوراہے۔

یہ اعتراض سابقہ اعتراض (۶) سے مختلف ہے۔

آٹھواں اعتراض:

ان کا کہنا ہے کہ ”خدا نے سولی پر چڑھنا اور لعنت کا طوق پہننا بھی خود ہی اختیار کیا کیونکہ سولی پر لٹکایا جانے والا شخص ملعون ہوتا ہے“۔

ان کی اس بات پر ہمارا اعتراض وسوال یہ ہے کہ آخروہ اس سے کیا مراد لیتے ہیں کہ "خدا نے لعنت کا طوق پہننے کو اختیار کیا ؟" اور اس لعنت سے کیا مراد ہے؟ کیا اس سے مراد وہی لعنت ہے جو عرف عام میں مشہور ہے اور لغت میں اس کا معنی رحمت، کرامت وعزت وحرمت وغیرہ سے محرومی ودوری ہے؟ اگر ان کی مراد وہی معنی ہے جو عرف ولغت میں کیا جاتا ہے تو پھر اس کا انطباق خداوند عالم کی ذات پر کیونکر ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو رحمت سے دور ومحروم کرتا ہے یا کوئی دوسرا اسے رحمت سے دور و محروم کرتا ہے؟ کیا رحمت کا معنی "وجود وہستی کا عطا کرنا، نعمتوں سے نوازنا اور وجود وہستی کی خصوصیات و آسائشوں سے بہرہ ور کرنا" کے علاوہ کچھ ہے ؟ جب ایسا ہے تو ان سب سے محرومی ودوری اور لعنت کی بازگشت مال یا جاہ وجلال وغیرہ سے دنیا یا آخرت یا دونوں جہانوں میں محرومی کی طرف ہوگی، یعنی جو شخص لعنت کے مذکورہ معنی کا حامل ہوگا وہ دنیا وآخرت یا دنیا و آخرت دونوں میں مال یا جاہ وجلال وغیرہ سے محروم قرار پائے گا، اس بناء پر خداوند عالم کا اپنے لئے لعنت اختیار کرنا کیا معنی رکھتا ہے اور کس حوالہ ونسبت سے اس معنی کو اس کی ذات اقدس پر منطبق کیا جا سکتا ہے؟ حالانکہ خداوند عالم خود غنی بالذات ہے اور وہ جہان ہستی کی ہر چیز کو محرومی وناداری سے بچاتا ہے،

اور جہاں تک قرآنی تعلیمات کا تعلق ہے تو ان میں اس طرح کے عجیب وغریب مطالب کی پورے طور پر نفی پائی جاتی ہے چنانچہ صریح وواضح الفاظ میں ارشاد خداوندی ہے :

سورۂ فاطر، آیت :۱۵

○ " يَاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ "

(اے لوگو! تم اللہ کے محتاج ہو اور اللہ ہی ہے جو غنی وبے نیاز ہے)

اور قرآن مجید میں خداوند عالم کے جو مقدس ومبارک اسماء گرامی وصفات عالیہ ذکر ہوئی ہیں ان کے حوالہ وتناظر میں اس کی بابت کسی طرح کی محرومی وناداری، احتیاج ونقص، فقدان وعدم، بدی وبرائی، ذلت وخواری اور اس طرح کے امور کا تصور ہی ممکن نہیں، اس کی ذات اس قسم کے امور سے منزہ وپاک اور ماوراء ہے۔

اس مقام پر عین ممکن ہے کہ مسیحیوں کے زیر بحث عقیدہ کے حوالہ سے کوئی شخص یہ کہے کہ ذلت وخواری اور لعنت اختیار کرنے کی بات خدا کی انسان کے ساتھ یکجائی کی بناء پر ہے کہ وہ ایک مادی وجسمانی انسان میں حلول کر گیا ہے لہٰذا اس کا تمام مذکورہ بالا امور سے متصف وحامل ہونا درست قرار پاتا ہے ورنہ اس حوالہ کے علاوہ اس کی ذات اس طرح کے امور و صفات سے یقینی طور پر بالاتر اور ماوراء ومنزہ ہے۔

اس کے جواب میں ہم یہ کہیں گے کہ آیا خدا کی انسان کے ساتھ یکجائی اس بات کا موجب بنی کہ خدا لعنت اور دیگر مذکورہ بالا سنگین قسم کے امور سے حقیقی طور پر متصف وحامل ہو یا مجازی طور پر؟ اگر پہلی صورت ہو یعنی حقیقی طور پر ان کا حامل ہوا

ہوتو اس سے وہی مشکل پیش آئے گی جو ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں، اور اگر دوسری صورت ہوتو وہی اشکال دوبارہ لازم آئے گا، یعنی حضرت مسیح کے جنم لینے کی کہانی، خدا کی رحمت وعدل کے تزاحم وتصادم کی بابت پیدا ہونے والے اشکال کی دوری کا باعث نہیں بنی کیونکہ غیر خدا کا مصائب اور سختی ولعنت سے دوچار ہونا فدیہ یعنی خداوند عالم کے بنی نوع انسان کے لئے فدیہ ہوجانے کی بات پوری نہیں ہوتی، اور یہ ایک واضح حقیقت ہے۔

نواں اعتراض:

مسیحیوں کا کہنا ہے کہ ''حضرت عیسیٰ مسیح کا سولی پر چڑھنا تمام مؤمنین بلکہ پوری کائنات کے گناہوں وخطاؤں کا کفارہ ہے''۔

ان کے اس عقیدہ ونظریہ سے ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے گناہوں، خطاؤں اور ان پر اخروی عذاب کے حقیقی معنی کو سمجھا ہی نہیں اور نہ ہی اس مطلب کو سمجھ پائے کہ اخروی عذاب کیونکر لاحق ہوگا؟ بلکہ وہ تو یہ بھی نہیں سمجھے کہ گناہوں وخطاؤں اور ان پر مقرر کی گئی سزاؤں کی قانون گزاری کے ربط وارتباط کی حقیقت کیا ہے اور اس قانون گزاری کا فلسفہ اور اصل راز کیا ہے؟ اور اس حوالہ سے جو کچھ قرآنی بیانات وارشادات سے ظاہر ومعلوم ہوتا ہے وہ ان حضرات کے تصوراتی نظریات سے ہرگز مطابقت وہم رنگی نہیں رکھتا بلکہ ان بیانات سے ان حضرات کی عدم آگاہی کا ثبوت ملتا ہے......

اور ہم اسی کتاب کی بعض سابق بحثوں کہ جن میں سورۂ بقرہ کی آیت ۲۶ (اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَحْیٖۤ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا) کی تفسیر اور سورۂ بقرہ آیت ۲۱۳ کے ذیل میں مذکور مطالب شامل ہیں، بیان کر چکے ہیں کہ وہ احکام وقوانین کہ جن کی خلاف ورزی اور ان سے سرتابی اور پھر گناہ وخطا کا ارتکاب ہوتا ہے وہ ایسے قرار دیئے گئے اور طے کردہ امور ہیں جن کو قانونی حیثیت دینے میں مقصد ومقصود یہ ہوتا ہے کہ ان پر عمل کر کے اور ان کا عملی احترام وپاسداری کرنے سے انسانی معاشرہ کی عمومی مصلحتوں کا تحفظ کیا جائے اور ان احکام وقوانین کی نافرمانی وخلاف ورزی پر مقرر کیا جانے والا عقاب وسزا صرف اس غرض سے ہے کہ اس کی وجہ سے احکام وقوانین پر عمل کرنے کا جو فریضہ افرادِ بشر پر عائد کیا گیا تھا اس کی ادائیگی سے منہ موڑنے اور فرماں برداری سے سرتابی کے ارتکاب سے روکا جاسکے، یہ ہے احکام وقوانین اور ان پر مقرر کی جانے والی سزاؤں کی بابت انسانی معاشرہ کے بانی عقلاء حضرات کا مؤقف !

لیکن جہاں تک قرآنی تعلیمات وارشادات کا تعلق ہے تو ان میں اس سے کہیں بالاتر واعلیٰ ترین مؤقف ومقصد ملحوظ ومقصود ہے کہ جس کی تائید سابق الذکر عقلی مباحث سے بھی ہوتی ہے اور وہ یہ کہ جو شخص خداوند عالم کی طرف سے اپنے لئے مقرر کئے گئے احکام ودستورات کی پیروی کرے اس کے باطن میں نہایت پاکیزہ وپسندیدہ صفات جنم لیتی ہیں اور جو شخص ان

دستورات کی خلاف ورزی کا مرتکب ہو اور فرمانبرداری کی راہ اختیار نہ کرے اس کا باطن ناپاک و نہایت پست صفتوں کی آماجگاہ بن جاتا ہے، اسی بناء پر اخروی نعمت یا نقمت کے اسباب فراہم ہوتے ہیں کہ ان احکام و قوانین اور دستوراتِ خداوندی پر عمل کرنے والا شخص نعمت کا حقدار اور نافرمانی و سرکشی کرنے والا شخص نقمت و عذاب کا مستحق قرار پاتا ہے، یہ نعمت کہ جسے بہشت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے درحقیقت خداوند عالم کے قرب سے عبارت ہے اور یہ نقمت کہ جسے دوزخ کہا جاتا ہے درحقیقت خداوند عالم کے قرب سے دوری کی صورت ہے، بنابرایں نیکیاں یا خطائیں ان حقیقی امور سے وابستہ و پیوستہ ہوتی ہیں جن کی اصل و اساس ایک حقیقی نظام پر قائم ہے نہ کہ قرار دیئے جانے والے اور خود طے کردہ نظام پر !

اور یہ حقیقت بھی واضح و آشکار ہے کہ شریعت الٰہیہ اور خدائی قوانین و دستورات دراصل خداوند عالم کے نظام خلقت کی تکمیل کا تتمہ اور تکوینی ہدایت کو اس کی مقصودہ غرض و غایت اور خلقت کے ہدف و مقصد سے ہم کنار کرنا ہے، دوسرے لفظوں میں یہ کہ خداوند عالم کی شان خالقیت و مقام ربوبیت کی عملداری ہی اس صورت میں ہے کہ وہ جہانِ ہستی کی تمام موجودات کو ان کے وجودی کمالات سے بہرہ ور کرنا چاہتا ہے کہ ہر چیز اپنی نوعی حیثیت میں اپنے وجودی کمال اور اپنی ذات کے بنیادی ہدف کو پالے، اور انسان کا وجودی کمال یہ ہے کہ وہ دنیا میں ایک صالح نوعی نظام کے تحت زندگی بسر کرے اور آخرت میں خدائی نعمتوں سے مالا مال سعادتمند زندگی سے لطف اندوز ہو، اور ان دو اہم و بنیادی مقاصد کے حصول کا یقینی راستہ وہ دین ہے جو معاشرہ کی اصلاح کے ضامن صالح اصولوں و قوانین اور عبادات کے نام پر قرب خداوندی کی بنیادی جہتوں کا حامل ہو کہ ان قوانین و دستورات اور عبادتی احکام پر عمل کر کے انسان اپنی دنیاوی زندگی کے امور کو منظم کرے اور اپنے باطن و ذات اور اعمال میں اخروی سعادتوں اور خدائی اعزازات و کرامتوں سے بہرہ ور ہونے کی صلاحیت پیدا کرے، اور یہ سب کچھ اس کے دل کی نورانیت اور نفس کی پاکیزگی پر موقوف ہے کہ جو دستورات الٰہی کو عملی جامہ پہنانے کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہے، تو یہ ہے حقیقت الامر !

مذکورہ بالا مطالب سے یہ حقیقت ثابت ہوئی کہ انسان کا خدا سے قرب و بعد ہی حقیقت میں اس کی دائمی سعادت و شقاوت اور دنیا میں اس کی معاشرتی زندگی کی بہتری...... یا ابتری...... کے دو معیار ہیں اور دین وہ واحد ذریعہ و سبب ہے جو اس قرب و بعد کے پیدا ہونے کی راہوں کی صحیح نشاندہی کرتا ہے اور یہ تمام مطالب حقائق اور حقیقی امور ہیں ان میں کسی طرح کا بے معنی و بے بنیاد حوالہ نہیں پایا جاتا۔

اب اگر یہ فرض کریں کہ ایک گناہ کا ارتکاب مثلاً آدمؑ کا ممنوعہ درخت سے پھل کھانا خود ان کے لئے بلکہ ان کی تمام نسل کی دائمی ہلاکت و تباہی کا باعث ہوا اور اس دائمی ہلاکت سے نجات کا راستہ حضرت مسیحؑ کے فدیہ بننے کے سوا کوئی نہ ہو تو پھر حضرت مسیحؑ سے پہلے کسی دین و شریعت کا بننا بے فائدہ ہوگا اور پھر اس کے باوجود کسی قانون گزاری کا اثر کیا ہوگا؟ یعنی حضرت

مسیحؑ سے پہلے، ان کے ساتھ اور ان کے بعد کسی دین و آئین کا فائدہ ہی کیا ہوگا؟ کیونکہ جب گناہ کے ارتکاب کی بناء پر دائمی عذاب اور اخروی عذاب کو حتمی ثابت قرار دیا جائے کہ اس سے نجات پانے کے لئے کوئی عمل کام آئے گا اور نہ توبہ کارگر ہوگی سوائے فدیہ یعنی حضرت مسیحؑ کے اپنی جان بطور فدیہ دینے کے! تو پھر خداوند عالم کی طرف سے شریعتوں کا بنانا، احکام و دستورات صادر کرنا، کتابوں کا نازل کرنا اور انبیاء و پیغمبروں کا بھیجنا سب کچھ بے معنی و بے مقصد ہو جائے گا اور اسی طرح اطاعت و فرمانبرداری پر جزاو بہشت کے وعدے، معصیت و نافرمانی پر سزا و دوزخ کی وعید اور عذاب سے ڈرانا اور بندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے پر انعام کی خوشخبری وغیرہ کی حیثیت خواب و خیال سے زیادہ نہ ہوگی اور ان کے قرین صحت ہونے کی بات ہوا کا جھونکا کہلائے گی، عذاب کے لازمی و یقینی اور ہلاکت کے حتمی ہونے کے مفروضہ کے بعد مذکورہ بالا امور کی وقعت ہی کیا ہوگی؟ لیکن اگر سابقہ شریعتوں پر عمل کر کے وجودی کمال سے بہرہ ور ہونے والوں کو دیکھیں کہ جن میں سابقہ امتوں کے انبیاء کرام و اولیائے الٰہی اور اسی طرح پیغمبر بزرگوار حضرات ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام بھی شامل ہیں کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ مسیحؑ سے پہلے اور مسیحیوں کے بقول ان کے فدیہ قرار پانے سے قبل زندگی گزری اور دنیا سے چلے گئے تو ان کے بارے میں کیا کہیں گے؟ ان کے بارے میں آپ کیا کہیں گے کہ انہوں نے شقاوت پر زندگی بسر کی یا سعادت پر؟ اور مرنے کے بعد اور جہان آخرت میں جاتے ہوئے کس چیز سے ان کا سامنا ہوا؟ آیا عقاب و عذاب اور ہلاکت و نابودی نے انہیں گھیر لیا یا ثواب اور سعادت مند زندگی ان کا مقدر بنی؟ جبکہ حضرت مسیحؑ نے صراحت کے ساتھ کہا کہ انہیں گناہگاروں اور خطا کاروں کو چھٹکارا دلانے کے لئے بھیجا گیا لیکن جو لوگ نیک و صالح اور اطاعت گزار ہیں انہیں ان چیزوں کی ضرورت نہیں، (ملاحظہ ہو: انجیل لوقا، اصحاح پنجم، اس میں مذکور ہے کہ یہودیوں اور ان کے خشک مقدس کاہنوں و ملاؤں نے حضرت مسیحؑ کے شاگردوں کو سخت تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے کہا کہ تم گناہگاروں اور خطا کار لوگوں کے ساتھ مل کر کیوں کھاتے پیتے ہو؟ تو یسوع نے انہیں جواب دیا کہ جو لوگ صحت مند اور صحیح و سالم ہیں انہیں طبیب و معالج کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن جو لوگ بیمار ہیں انہیں طبیب و معالج کی ضرورت ہوتی ہے اور میں اس لئے نہیں آیا کہ صدیقین کو دعوت دوں لیکن خطا کاروں کو توبہ کرنے کا کہتا ہوں)۔

خلاصۂ کلام یہ کہ مذکورہ بالا مطالب کی روشنی میں حضرت مسیحؑ کے فدیہ ہونے سے پہلے کسی بھی شریعت الٰہیہ اور دینی تعلیمات کی پاکیزہ حقیقتوں کی تشکیل میں کوئی ایسی صحیح غرض باقی دکھائی نہیں دے گی جو اسے عبث و بے مقصد ہونے سے بچا سکے اور نہ ہی اس انوکھے سلسلہ کے قیام کی بابت خدائی مصلحت کا کوئی حوالہ متعین ہو سکے گا، البتہ صرف یہ بات کہی جا سکے گی (کہ جس کا نادرست ہونا عنقریب بیان کیا جائے گا) کہ خداوند عالم کو معلوم تھا کہ اگر آدمؑ کی خطا کا مداوا نہ ہوا تو شریعتوں کی تشکیل بے فائدہ ہوگی لہٰذا اس نے احتیاطاً ان کی تشکیل کو صورت بخشی کہ شاید وہ دن بھی آئے جب آدمؑ کی خطا کا مداوا ہو سکے اور پھر ان شریعتوں کی تشکیل کا پھل مل جائے کہ جس سے تخلیق عالم اور تشریع دین کی مقصود و مطلوب غرض حاصل ہو اور اس کی تمنائیں

برآئیں چنانچہ خدا نے اس راز کو اپنے نبیوں و پیغمبروں اور عام لوگوں پر آشکار کئے بغیر شریعتوں کی تشکیل کا کام کیا اور یہ بات ان سے پوشیدہ رکھی کہ جب تک آدمؑ کی خطا کا مداوا نہ ہو جائے اس وقت تک تمام انبیاءؑ و مومنین کی کاوشیں نتیجہ بخش ثابت نہ ہوں گی اور شریعتوں کی تشکیل بے غرض و بے مقصد رہے گی بلکہ خدا نے انبیاءؑ اور اہل ایمان و بنی نوع آدم کے سامنے دینی دستورات و احکام صادر کرنے کا سنجیدگی و مبنی بر حقیقت ہونا ظاہر کیا۔

اس مفروضہ کی رو سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ (معاذ اللہ) خدا نے لوگوں کو اور اپنے آپ کو بھی دھوکہ میں رکھا اور وہ اس طرح کہ لوگوں کو یوں دھوکہ میں رکھا کہ ان کو اس غلط فہمی میں مبتلا رکھا کہ اگر وہ ان شرعی احکام و دینی دستورات پر عمل کریں تو وہ سعادت مند ہو جائیں گے اور وہ ان کے گناہوں کو بخش دے گا، اور اپنے آپ کو اس طرح دھوکہ میں رکھا کہ حضرت مسیحؑ کے فدیہ ہونے ذریعے آدمؑ کی خطا کا مداوا ہو جانے کے بعد ان شریعتوں کا وجود بے مقصد و بے فائدہ ہو جائے گا اور اس کا لوگوں کی سعادت مندی میں اس طرح کوئی کردار نہ ہوگا جس طرح مداوا ہونے سے پہلے وہ بے نتیجہ تھیں، تو یہ ہے فدیہ ہو جانے کے وقت سے پہلے دینی دستورات کی قانون گزاری کا حال! اور یہی حال بلکہ بے مقصد ہونے میں اس سے زیادہ واضح و روشن صورتحال فدیہ ہونے کے زمانہ اور اس کے بعد کی ہے، بنابریں دینی حقائق پر ایمان لانے کا کیا فائدہ؟ اور اعمال صالحہ بجا لانے سے کیا حاصل؟ کیونکہ خطاؤں کا مداوا ہو جانے کے بعد عقیدہ و عمل کی کوئی حیثیت ہی باقی نہ رہے گی بلکہ خداوند عالم کی طرف سے تمام بنی نوع انسان پر مغفرت و رحمت کا نازل ہونا لازمی و ضروری ہوگا خواہ کوئی مومن ہو یا کافر، نیک ہو یا برا، اور خواہ کوئی تقویٰ و پرہیزگاری میں ہر متقی و پرہیزگار سے زیادہ مقام رکھتا ہو یا کوئی برے اعمال انجام دینے میں دوسروں سے کہیں آگے بڑھا ہوا ہو یعنی متقی ترین شخص اور گنہگار ترین شخص کے درمیان کوئی فرق باقی نہ رہے گا، بلکہ وہ سب خطاؤں کا مداوا ہونے سے پہلے تک دائمی ہلاکت کا شکار ہونے میں مشترک تھے اور فدیہ کے ذریعے خطاؤں کا مداوا ہونے کے بعد رحمتِ خداوندی سے فیض یاب ہونے میں بھی یکساں ہوں گے کیونکہ مفروضہ صورت میں اگر فدیہ نہ ہوتا تو خطاؤں کے مداوا میں کوئی عمل صالح فائدہ مند نہ ہوتا۔

حضرت عیسیٰؑ کی بشارت کے حوالہ سے ایک سوال!

اس مقام پر ممکن ہے کہ کوئی شخص یہ کہے کہ حضرت مسیحؑ کا فدیہ ہونا صرف اسی کے لئے فائدہ مند ہوگا جو ان پر ایمان لائے لہٰذا دعوت دینیہ سودمند ہے، چنانچہ حضرت مسیحؑ نے اپنی ایک بشارت میں صریح الفاظ میں یوں کہا ہے:

"میں صاف صاف تم سے کہتا ہوں کہ جو شخص لوگوں کے سامنے مجھ پر ایمان لانے کا اظہار و اعتراف کرے تو بنی

نوع انسان کے تمام افراد قیامت کے دن فرشتگان الٰہی کے روبرو اس شخص کی تصدیق کریں گے اور اس کے ایمان کی توثیق کریں گے، اور جو شخص لوگوں کے سامنے میرا انکار کرے تو تمام افرادِ بشر قیامت کے دن فرشتوں کے روبرو اس کی تکذیب کریں گے، جو شخص کسی فرد بشر کے بارے میں غلط الفاظ ادا کرے تو اسے معاف کر دیا جائے گا اور جو شخص روح القدس کے بارے میں بدکلامی کرے تو اسے ہرگز معاف نہیں کیا جائے گا''۔

(انجیل لوقا، اصحاح ۱۲)

اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے تو یہ بات اس مطلب سے متصادم ہے جو یوحنا کے رسالہ میں مذکور ہے کہ جس کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں اور دوسری بات یہ کہ اس سے سابق الذکر تمام اصولوں کی سرے ہی سے نفی ہو جائے گی کیونکہ اس مفروضہ کی بناء پر آدمؑ سے لے کر قیامت تک آنے والے افراد میں سے معدودے چند کے علاوہ کوئی بھی نجات اور گناہوں سے چھٹکارا نہیں پا سکے گا اور صرف وہی چند لوگ ہی نجات یافتہ ہوں گے جو حضرت مسیحؑ اور روح القدس پر ایمان لائے ہوں گے اور وہ بھی ان کے مختلف گروہوں و فرقوں میں صرف ایک فرقہ، نہ کہ تمام فرقوں کے افراد ! ان کے علاوہ سب دائمی ہلاکت کا شکار رہیں گے، اب یہ معلوم نہیں کہ حضرت مسیحؑ سے پہلے گزرے ہوئے انبیاء عالی قدر اور ان کی امتوں میں سے نیک و صالح افراد پر کیا گزرے گی؟ اور ان انبیاءؑ الٰہی کی دعوتِ حق کہ جس میں وہ کتاب و حکمت لائے اس کی حیثیت و وقعت کیا ہوگی؟ اور اس دعوتِ حق کو قرین صحت و صداقت قرار دیا جائے گا یا جھوٹ پر مبنی کہا جائے گا ؟ اور پھر ان انجیلوں کے بارے میں سوال پیدا ہو جائے گا جو تورات اور اس کی تعلیمات کی تصدیق کرتی ہیں اور ان میں روح القدس اور فدیہ وغیرہ کا کوئی تذکرہ نہیں ہے، کہ ان کی تصدیق میں کہاں تک صداقت پائی جاتی ہے یا وہ کسی جھوٹی کتاب کی تصدیق کرتی ہیں ؟

حضرت عیسیٰؑ کی آمد کے حوالہ سے ایک سوال

یہاں ایک اور سوال بھی ممکن ہے اور وہ یہ کہ سابقہ کتب آسمانی میں جہاں تک ہمیں معلوم ہے حضرت مسیحؑ کی تشریف آوری کی خوشخبری دی گئی ہے اور یہی بات دین مسیحؑ کی طرف اجمالی دعوت ہے، اگرچہ ان کتب میں حضرت مسیحؑ کی تشریف آوری و نزول کی کیفیت تفصیلی طور پر مذکور نہیں لیکن اس سے یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ خداوند عالم اپنے انبیاءؑ کو حضرت مسیحؑ کی آمد سے مطلع و آگاہ اور اس کی خوشخبری دیتا رہا تا کہ لوگ ان پر ایمان لائیں اور ان کے اعمال سے طیب نفس پائیں۔

جواب:

اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس طرح کی خوشخبری کا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے آنے والے انبیاءؑ سے کوئی ربط نہیں بنتا بلکہ ان کی بابت اس خوشخبری کا حوالہ غیب گوئی کی ناقابل قبول صورت کے سوا کچھ نہیں، اور اگر اس طرح کی بشارت وخوشخبری کو درست قرار بھی دیا جائے تو گناہوں سے خلاصی وچھٹکارا پانے کی بشارت تو کہا جاسکتا ہے لیکن حضرت مسیحؑ پر ایمان لانے اور ان کی شریعت کی پیروی کی دعوت قرار نہیں دیا جاسکتا۔

دوسری بات یہ کہ اس سے فروع دین میں اخلاقیات اور اعمال صالحہ کی انجام دہی کی دعوت کے بے مقصد ہو جانے کا حوالہ باقی رہ جائے گا یہاں تک کہ حضرت مسیحؑ بھی اس کی تائید کرتے ہیں اور انجیلیں بھی اس سے بھری پڑی ہیں۔

تیسری بات یہ کہ خطاؤں کی بابت ذکر کیا گیا اہم ترین مشکل حوالہ اور سلسلہ تخلیق وہدایت کے خدائی نظام کے بے مقصد ہو جانے کا مسئلہ جوں کا توں رہے گا کیونکہ خداوند عالم نے بنی نوع انسان کو خلق فرمایا تاکہ ان سب کو اپنی رحمت سے نوازے اور سب پر اپنی نعمتوں اور سعادتوں کے دروازے کھول دے، جبکہ مسیحیوں ...... بولس اور ان جیسے دیگر اکابر مسیحی علماء کے بیانات ...... کے مطابق رحمت ونعمت اور سعادت کی بجائے خداوند عالم نے معدودے چند افراد کے علاوہ سب کو اپنے عقاب وغضب کا نشانہ بنایا اور سب کو دائمی ہلاکت سے دوچار کر دیا۔

تو یہ ہیں بولس کے بیانات واظہارات کے نادرست ہونے کی چند عقلی جہات وحوالے! اور ان کی تائید وتصدیق بلکہ انہی حقائق کا بیانی تسلسل قرآن مجید کی مقدس آیات مبارکہ میں دکھائی دیتا ہے، چنانچہ ارشاد حق تعالیٰ ہے:

سورۂ طٰہٰ، آیت :۵۰

○ "الَّذِیۡۤ اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَہٗ ثُمَّ ہَدٰی"

(اس نے ہر چیز کو اس کی خلقت عطا کی، پھر ہدایت کی)

اس آیت مبارکہ میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ ہر چیز کو اس کے مقصد تخلیق کی راہ دکھائی گئی ہے اور وجودی تقاضوں کی تکمیل کی ہدایت وراہنمائی کی گئی ہے کہ جس میں تکوینی وتشریعی دونوں قسم کی ہدایت شامل ہے، تو ثابت ہوا کہ ہدایت کے وسیع سلسلہ کا قیام دراصل سنت الٰہیہ ہے اور اس سلسلہ کی ایک کڑی انسان کو دینی ہدایت سے نوازنا ہے کہ اس دینی ہدایت کے پہلا مرحلہ میں خداوند عالم نے حضرت آدمؑ اور ان کے ہمراہیوں کو جنت سے نیچے اتارتے ہوئے فرمایا:

سورۂ بقرہ، آیت :۳۹

○ "قُلۡنَا اہۡبِطُوۡا مِنۡہَا جَمِیۡعًا ۚ فَاِمَّا یَاۡتِیَنَّکُمۡ مِّنِّیۡ ہُدًی فَمَنۡ تَبِعَ ہُدَایَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَلَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَکَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَاۤ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ

هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ"

(ہم نے کہا: تم سب یہاں سے نیچے چلے جاؤ، پھر جب تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جو شخص میری ہدایت کی پیروی کرے گا تو ایسے لوگ نہ خوفزدہ ہوں گے اور نہ ہی محزون و غمگین ہوں گے، اور جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا تو وہی ہمیشہ دوزخ میں رہنے والے ہیں)۔

اس آیت میں جہاں خدا کی طرف سے دینی سلسلۂ ہدایت کے پہلے مرحلہ کا ذکر ہوا ہے وہاں قیامت تک آنے والی شریعتوں و دستوراتِ خداوندی کی تفصیلات کا خلاصہ ولب لباب بھی بیان کر دیا گیا ہے جس میں شریعتوں کی تشکیل اور وعدو وعید کے یقینی نظام کا واضح اشارہ موجود ہے، اپنے بیان و گفتار کی بابت خداوند عالم کا صریح ارشاد ہے:

سورۂ ص، آیت: ۸۴

O "اَلْحَقَّ اَقُوْلُ"

(میں حق بات ہی کہتا ہوں)

اپنے نظام کے درست بنیاد پر استوار ہونے کی بابت فرمایا:

سورۂ ق، آیت: ۲۹

O "مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ"

(میرے ہاں بات میں تبدیلی نہیں آتی اور میں بندوں پر ہرگز ظلم کرنے والا نہیں)

اس آیت میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ خدا جس چیز کا پختہ ارادہ کر لیتا ہے اس کی بابت تردد و غیر یقینی کی کیفیت کا شکار نہیں ہوتا اور جس حکم و فیصلہ کو نافذ کرتا ہے اسے نقض نہیں کرتا ...... اسے غیر مؤثر نہیں کرتا......، جس کام کی انجام دہی کو طے کر لیتا ہے اسے کر گزرتا ہے، اپنے ہر فیصلہ پر قائم رہتا ہے، اس کا کام اس کے ارادہ کی سمت سے باہر نہیں جاتا یعنی ایسا نہیں کہ کسی کام کے کرنے کا ارادہ کرے اور پھر اس کی انجام دہی میں متردد ہو جائے...... کہ اسے انجام دے یا نہ دے......، یا کسی کام کے کرنے کا ارادہ کرے اور پھر کسی وجہ سے اسے انجام نہ دے، یا یہ کہ کسی کام کا ارادہ کرے اور نہایت پختگی کے ساتھ اس کی انجام دہی کا فیصلہ کرے اور پھر کوئی ایسی رکاوٹ پیدا ہو جس کا رکاوٹ ہونا عقلی طور پر درست ہو یا اس کام کی انجام دہی کی راہ میں کوئی ایسا اشکال پیدا ہو اور عملی طور پر مشکلات پیش آئیں کہ اس کام کو انجام نہ دے، تو یہ سب بیرونی عامل کی کارگزاری کی مختلف صورتیں ہیں کہ جو ارادۂ الٰہی پر غالب آنے کے اسباب کی نشاندہی کرتی ہیں جبکہ قرآن مجید نے واضح طور پر اس کی نفی کرتے ہوئے خداوند عالم کے غلبہ کو بیان کیا ہے چنانچہ ارشاد ہوا:

سورۂ یوسف، آیت :۲۱

○ " وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمۡرِهٖ "

(اور اللہ اپنے ہر امر پر غالب ہے)

اور ارشاد ہوا:

سورۂ طلاق، آیت :۳

○ " اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمۡرِهٖ "

(بے شک اللہ اپنے امر......وحراو......کو پانے والا ہے)

ایک آیت میں حضرت موسیٰؑ کا قول ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا:

سورۂ طٰہٰ، آیت :۵۲

○ " عِلۡمُهَا عِنۡدَ رَبِّىۡ فِىۡ كِتٰبٍ‌ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّىۡ وَلَا يَنۡسَى "

(اس کا علم میرے رب کے پاس کتاب میں ہے، کہ میرا رب نہ تو گمراہ ہوتا ہے اور نہ ہی بھولتا ہے)

ایک مقام پر قیامت کے دن محاسبہ کے حوالہ سے اس کے مبنی بر عدل ہونے کی بابت یوں ارشاد ہوا:

سورۂ مؤمن، آیت :۱۷

○ " اَلۡيَوۡمَ تُجۡزٰى كُلُّ نَفۡسٍۢ بِمَا كَسَبَتۡ‌ ؕ لَا ظُلۡمَ الۡيَوۡمَ‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيۡعُ الۡحِسَابِ "

(آج ہر شخص کو اس کے کیئے کی پوری پوری جزا دی جائے گی، آج کوئی ظلم نہیں ہوگا، بے شک خدا جلد حساب کرنے والا ہے)

ان آیات اور ان سے مشابہ آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے کائنات کو خلق فرمایا تو اپنی مخلوق کے بارے میں ہرگز غفلت نہیں برتی اور نہ ہی ان سے سرزد ہونے والے افعال واعمال سے ناآگاہی وجہالت میں رہا اور نہ اپنے کسی کام پر ندامت وپشیمانی کا شکار ہوا، پھر اس نے اپنی مخلوق کے لئے قوانین بنائے اور قانون گزاری کے عمل میں کسی غیر یقینی کی حالت وکیفیت یا غیر سنجیدگی، خوف وامید کی بناء پر کوئی فیصلہ نہیں کیا بلکہ نہایت پختگی ویقین کے ساتھ تشریع وقانون گزری کے مراحل انجام دیئے، پھر اس نے ......اپنے عدل کا عملی مظاہرہ کرتے ہوئے...... ہر شخص کے لئے اس کے عمل کے مطابق جزا مقرر کی کہ اگر وہ عمل اچھا ہوا تو اس پر جزا وانعام اور اگر برا ہوا تو سزا دے گا، یہ سب کچھ اس نے کسی سے مغلوب ومحکوم ہو کر انجام نہیں دیا اور نہ ہی قیامت کے دن کوئی اس پر غالب وحاکم ہوگا، اس کے کسی کام میں کوئی شریک نہیں اور نہ ہی فدیہ، قریبی تعلق اور اس کے اذن کے بغیر شفاعت وغیرہ کا اس کے امور میں کوئی دخل ہے اور نہ ہی ان میں سے کوئی چیز قیامت کے دن

اس کے عدل کی راہ میں حائل ہو سکے گی کیونکہ یہ سب کچھ اس کے مالک علی الاطلاق ہونے کے منافی ہے جبکہ وہ اپنی تمام مخلوق کا علی الاطلاق اور بلا شرکت غیرے حاکم و مالک ہے۔

دسواں اعتراض:

مسیحیوں کے بیانات وعقائد اور اظہارات میں حضرت مسیحؑ کے فدیہ ہونے کے بارے میں جو مطالب موجود ہیں ان پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ فدیہ کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کوئی ایسا کام کرے...... ایسے فعل کا مرتکب ہو...... جس کے نتیجہ میں جانی و بدنی یا مالی سزا کا مستحق ٹھہرے اور اس سزا سے بچنے کے لئے اس کے بدلہ میں کوئی چیز عوض قرار دے، وہ چیز خواہ کچھ بھی ہو اسے "فدیہ" کہا جاتا ہے، تو "فدیہ" ہر اس عوض کو کہتے ہیں جو کسی بھی برے نتیجہ وانجام سے بچنے کے لئے دیا جائے مثلاً جنگی قیدی اپنی رہائی کے لئے کوئی دوسرا شخص یا کوئی مال دیتا ہے، تو اسے "فدیہ" کہتے ہیں، یا جرم وجنایت پر مقررہ سزا سے بچنے کے لئے مال دیا جاتا ہے تو اس بدل وعوض کو "فدیہ" سے موسوم کیا جاتا ہے، بنا برایں "تفدیہ" یعنی فدیہ دینا ایک طرح کا معاملہ ہے جس کے ذریعے کسی حقدار کا حق...... جانی، مالی، تسلطی وغیرہ...... فدیہ دینے والے سے لے کر اس کو عطا کیا جاتا ہے جس کے نتیجہ میں فدیہ دینے والا شخص سزا و کیفر سے بچ جاتا ہے۔

اس بیان سے یہ مطلب واضح ہو جاتا ہے کہ جو امور خداوند عالم سے تعلق رکھتے ہیں ان میں "فدیہ" معقول نہیں کیونکہ سلطنت وحاکمیت الٰہی انسانوں کی طے کردہ حاکمیت وتسلط کے برعکس حقیقی واصیل اور ناقابل تبدیلی حاکمیت وتسلط ہے اور اس میں کسی کی دخل اندازی وتصرف محال وناممکن ہے، بنا برایں تمام اشیاء عالم اور جہانِ ہستی کی موجودات اپنی ذوات اور اصل وجود اور ان کے آثار کے ساتھ خداوند عالم کے ساتھ قائم و وابستہ ہیں تو یہ بات کیونکر ممکن ہے کہ کسی واقع الامر اور حقیقت کی اصل صورت میں تبدیلی کا تصور ہو، اور جس چیز کا تصور ہی ممکن نہ ہو تو اس کا وقوع پذیر ہونا کیونکر ممکن ہوگا، البتہ جہاں تک ہم افرادِ بشر کے درمیان رائج وموجود حاکمیت وسلطنت اور حقوق کا تعلق ہے تو وہ سب اور ان جیسے دیگر امور ہمارے ہی طے کردہ اور بنائے ہوئے ہیں کہ جن کی باگ ڈور ہمارے ہی ہاتھوں میں ہے اور یہ ہم ہی ہیں جو اپنی زندگی ومعاشی مصلحتوں کو ملحوظ و پیش نظر رکھتے ہوئے کبھی تو ان کو کالعدم کرتے ہیں اور کبھی ان میں تبدیلیاں وترامیم کرتے ہیں۔

(اس سلسلہ میں سورۂ فاتحہ کی آیت ۴ (مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ) اور سورۂ آل عمران کی آیت ۲۶ (قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ) کی تفسیر میں ذکر کی گئی بحثوں ومطالب کا مطالعہ کریں)

"فدیہ" کے حوالہ سے خداوند عالم نے بالخصوص اس کی نفی کی اور یوں ارشاد فرمایا:

سورۂ حدید، آیت :۱۵

○ " فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ وَّلَا مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ "

(آج تم سے کوئی فدیہ نہیں لیا جائے گا اور نہ ہی کفر اختیار کرنے والوں سے، تمہارا ٹھکانہ جہنم کی آگ ہے)

اسی حوالہ سے یہ مطلب پہلے ذکر کی جا چکا ہے کہ خداوند عالم نے حضرت مسیحؑ کے تذکرہ میں اُن سے ہونے والی گفتگو اس طرح بیان کی:

سورۂ مائدہ، آیت :۱۱۸

○ "وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ ۤ بِحَقٍّ (تا) مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ۭ وَاَنْتَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۱۱۷﴾ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ "

(اور جب اللہ نے کہا: اے عیسیٰ بن مریم! کیا تو نے لوگوں سے کہا ہے کہ تم مجھے اور میری ماں کو خدا کے علاوہ دو معبود بناؤ، اس (عیسیٰ) نے کہا: تیری ذات پاک ہے مجھے یہ بات روا نہیں کہ میں کوئی ایسی بات کروں جس کا مجھے حق نہ ہو (تا) میں نے ان سے صرف وہی کچھ کہا ہے جس کا تو نے مجھے حکم دیا اور وہ یہ کہ تم اللہ کی عبادت کرو جو میرا رب ہے اور تمہارا رب ہے، اور میں ان پر گواہ ہوں جب تک میں ان میں موجود ہوں، پھر جب تو میرا وقت پورا کر دے گا تو تو خود ان پر نگہبان ہے اور تو ہر چیز پر گواہ ہے، اگر تو ان پر عذاب نازل کرے تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو انہیں معاف کر دے تو بے شک تو غالب و طاقتور اور دانا ہے)

اس آیت مبارکہ میں حضرت مسیحؑ کا جملہ "كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ" اس معنی و مطلب کو بیان کرتا ہے کہ آنجنابؑ نے گویا یوں کہا:

پروردگارا! میری ذمہ داری اس کے علاوہ کچھ نہ تھی کہ میں تیرے حکم و فرمان کے مطابق عمل کرتے ہوئے تیرے پیغامات لوگوں تک پہنچاؤں، اور ان کے اعمال پر گواہ رہوں...... اس ادائے رسالت کے سوا تو نے کوئی ذمہ داری مجھ پر عائد نہیں اور جو کچھ تو نے مجھے سونپا اسے میں نے پوری طرح ادا کر دیا...... اب تو انہیں ہلاک کرے، نجات بخشے، انہیں عذاب میں مبتلا کرے یا معاف کر دے یہ سب کچھ تیرے ہاتھ میں ہے، اس میں کسی کا کوئی تعلق و دخل نہیں اور نہ ہی مجھے اس سلسلہ میں کسی قسم کا کوئی اختیار حاصل ہے کہ جس کی بناء پر میں انہیں تیرے عذاب سے نکال باہر کروں یا ان پر تیرے تسلط کو ختم

کروں......اگر تو انہیں ان کے کیے کی سزا دے اور عذاب میں مبتلا کرے تو انہیں اس سے بچانے کی مجھ پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی......،

حضرت مسیحؑ کے اس بیان سے ان کے فدیہ قرار پانے کی واضح نفی ہوتی ہے کیونکہ اگر یہاں "فدیہ" کا مسئلہ ہوتا اور حضرت مسیحؑ لوگوں کو ان کے گناہوں کی سزا سے بچانے کے لئے خود فدا ہوئے ہوتے تو ان کے اعمال سے اپنے آپ کو لاتعلق قرار دے کر عذاب یا مغفرت دونوں کا معاملہ خداوند عالم کی مرضی پر نہ چھوڑتے اور ان دونوں کی بابت اپنے آپ کو کلی طور پر بے تعلق قرار نہ دیتے۔ اور ہر گز یوں نہ کہتے کہ میں نے تیری عائد کردہ ذمہ داری کو پورا کر دیا ہے اب ان کے بارے میں تو خود ہی فیصلہ کرنے والا ہے بلکہ بارگاہ رب العزت میں یوں عرض کرتے کہ جب میں نے اپنے آپ کو ان کے گناہوں کا فدیہ بنا دیا ہے تو اب تو ان پر عذاب نازل نہ کر......،

مذکورہ بالا مطلب کا اظہار درج ذیل آیات مبارکہ میں بھی ہوا ہے:

سورۂ بقرہ، آیت: ۴۸

○ "وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّ لَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّ لَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّ لَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ"

(اور اس دن سے ڈرو جب کسی کو کسی کے بدلہ میں کوئی سزا نہیں دی جائے گی اور نہ ہی کسی کی شفاعت قبول کی جائے گی اور نہ ہی کسی سے کوئی عوض لیا جائے گا اور نہ ہی لوگوں کی مدد کی جائے گی)

سورۂ بقرہ، آیت: ۲۵۴

○ "يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ"

(اس دن کوئی لین دین نہ ہوگا، نہ کوئی دوستی ہوگی اور نہ ہی شفاعت)

سورۂ مومن، آیت: ۳۳

○ "يَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِيْنَ مَا لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ"

(اس دن جب تم پیٹھ پھیر کر لوٹو گے، تمہیں کوئی شخص خدا سے بچانے والا نہ ہوگا)

ان تین آیات میں تین مختلف الفاظ ذکر ہوئے ہیں:

(۱) عدل بمعنی عوض و بدل، (وَّ لَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ)

(۲) بیع (معاملہ و لین دین یا سودے بازی)، (لَّا بَيْعٌ فِيْهِ)

(۳) عصمت (بچاؤ)، (مَا لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ)

یہ تینوں الفاظ فدیہ کی تطبیقی صورتوں کو ظاہر کرتے ہیں اور ان کی نفی سے فدیہ کی بھی نفی ہو جاتی ہے،......اگر عوض و بدل کی گنجائش ہوتی یا معاملہ ولین دین ممکن ہوتا یا کوئی شخص کسی مجرم و گناہگار کو اس کے کیئے کی سزا سے بچا سکتا تو یقیناً اسے ''فدیہ'' کی ایک صورت کہا جاتا لیکن آیات مبارکہ میں ان کی نفی ہوئی ہے جس سے فدیہ کی خود بخود نفی ہو جاتی ہے۔

البتہ قرآن مجید میں حضرت مسیحؑ کی شفاعت کا اثبات ہوا ہے، نہ کہ ان کے فدیہ ہونے کا کہ جس کا اثبات مسیحی حضرات کرتے ہیں، ان دونوں میں فرق یہ ہے (جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیت مبارکہ ۴۸ ''وَاتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ......'' کی تفسیر میں اس حوالہ سے بحث ہو چکی ہے) کہ شفاعت دراصل شفاعت کرنے والے کے اس شخص سے قرب اور اس کے نزدیک بلند مقام و مرتبت ہونے کا مظہر ہوتی ہے جس سے شفاعت کی جاتی ہے اور اس میں ہرگز یہ حوالہ نہیں ہوتا کہ شفاعت کرنے والا اس شخص کی طرف سے اس کام کا مالک و مختار ہے یا اس شخص کو اس کے اختیار و سلطنت سے محروم کر دیتا ہے یا اس کے اس فیصلہ کو کالعدم کر دیتا ہے جو اس نے جرم کا ارتکاب کرنے والے کے لئے سزا کی بابت صادر کیا ہے یا سرے سے سزا کے قانون کو ختم و غیر مؤثر کر دیتا ہے، بلکہ شفاعت کی اصل حقیقت ایک دعا و استدعا کی ہے کہ شفاعت کرنے والا اس ذات کے حضور کہ جس سے شفاعت کرتا ہے یعنی پروردگار، یہ درخواست کرتا ہے کہ وہ اپنے مسلمہ مالکانہ اختیارات استعمال کرتے ہوئے جرم کے مرتکب کو سزا کا مستحق ہونے کے باوجود معاف کر دے کیونکہ معاف کر دینا مولا کا حق و اختیار ہے جبکہ وہ چاہے تو اس کی نافرمانی کی بناء پر سزا و عقوبت کے قانون کے مطابق اس کے ساتھ برتاؤ کر سکتا ہے۔

بنا بر ایں شفاعت کرنے والا، مولا سے عفو و درگزر اور معاف کر دینے کا اختیار استعمال کرنے کی درخواست کرتا ہے اور اس سے عرض گزار ہوتا ہے کہ نافرمانی پر سزا کے مستحق شخص پر رحم کرتے ہوئے اس سلسلہ میں اپنے معاف کر دینے کا حق استعمال کرے، کہ اس میں مولا کی مالکیت و حاکمیت کے اختیارات سلب ہونے کی کوئی صورت نہیں پائی جاتی، جبکہ فدیہ میں ایسا نہیں کیونکہ ''فدیہ'' جیسا کہ بیان ہو چکا ہے ایک طرح کا معاملہ ولین دین ہے جس کے ذریعے کسی چیز کا حاکمانہ اختیار کسی دوسری چیز میں تبدیل کر دیا جاتا ہے جو کہ ''فدیہ'' کا عمل کہلاتا ہے اور جس کے عوض فدیہ دیا جاتا ہے اس پر فدیہ قبول و وصول کرنے والے کا کوئی اختیار و سلطنت باقی نہیں رہتی چنانچہ اس مطلب کی دلیل درج ذیل آیت مبارکہ میں پائی جاتی ہے:

سورۂ زخرف، آیت :۸۶

○ ''وَلَا یَمْلِكُ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ''

(اور وہ اللہ کے علاوہ جنہیں پکارتے ہیں وہ شفاعت کا حق نہیں رکھتے سوائے اس کے کہ جو علم و آگاہی کے ساتھ حق کی گواہی دے)

اس آیت مبارکہ میں شفاعت کا حق نہ رکھنے والوں میں سے مستثنیٰ کیئے گئے افراد کی شفاعت کے واقع ہونے کا

صریح بیان موجود ہے اور حضرت مسیحؑ ان افراد میں شامل ہیں جنہیں ان کے پیروکار خدا کے علاوہ معبود قرار دے کر پکارتے تھے جبکہ قرآن مجید نے واضح لفظوں میں آنجنابؑ کے بارے میں ذکر کیا ہے کہ خداوند عالم نے انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دی اور وہ قیامت کے دن گواہوں میں سے ہوں گے، چنانچہ اس حوالہ سے ارشاد ہوا:

سورۂ آل عمران، آیت :۴۸

○ " وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ "

(اور اسے کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے)

سورۂ مائدہ، آیت :۱۱۷

○ " وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ "

(اور میں جب تک ان میں موجود رہا ان پر گواہ وناظر تھا)

سورۂ نسآء، آیت :۱۸۹

○ " وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا "

(اور قیامت کے دن وہ ان پر گواہ ہوگا)

جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں کہ مذکورہ بالا آیات مبارکہ میں حضرت مسیحؑ کے گواہ ہونے کا ثبوت پایا جاتا ہے چنانچہ اس موضوع کی بابت سورۂ بقرہ کی آیت ۴۸ " وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا...... " کی تفسیر میں تفصیلی تذکرہ ہو چکا ہے۔

چھٹی فصل:

حضرت مسیحؑ کے بارے میں نظریات کا سرچشمہ؟

قرآن مجید اس بات کی قطعی نفی کرتا ہے کہ حضرت مسیحؑ نے اپنے پیروکاروں کو ان عقائد ونظریات کی تعلیم دی اور ان کے درمیان پائے جانے والے بے بنیاد خیالات کو عام کیا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے اس طرح کے خرافات و باطل نظریات میں اپنے دینی رہنماؤں کی پیروی کی اور اس سلسلہ میں تمام امور انہی کو سونپ کر ان کے پیچھے چل پڑے جبکہ ان کے دینی رہنماؤں نے یہ بے بنیاد و غلط عقائد ونظریات قدیم بت پرستوں سے لئے، چنانچہ اس حوالہ سے قرآن مجید میں ارشاد خداوندی ہے:

سورۂ توبہ، آیت :۳۱

○ "وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَ قَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ۚ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ۚ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۳۰﴾ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ......"

(اور یہودیوں نے کہا کہ عزیز اللہ کا بیٹا ہے، اور نصاریٰ نے کہا کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے، یہ سب ان کی زبانی باتیں ہیں، وہ اپنے سے پہلے گزرے ہوئے کافروں کی باتوں کی پیروی و اندھی تقلید کرتے ہیں، خدا انہیں مارے، یہ کہاں بھٹکے جا رہے ہیں، انہوں نے اپنے احبار (دینی رہنماؤں) اور راہبوں (دنیا سے قطع تعلق کرنے والے مقدس مآبوں) کو اور عیسیٰ بن مریم کو خدا کے علاوہ رب بنالیا ہے حالانکہ انہیں اس کے علاوہ کوئی حکم نہیں دیا گیا کہ وہ صرف ایک معبود کی پرستش کریں کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کی ذات پاک ہے اس سے جو وہ شرک کرتے ہیں (اس کے ساتھ دوسرے معبود قرار دیتے ہیں)۔)

اس آیت کے فقرہ "يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ" میں جن کافروں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ان سے زمانہء جاہلیت کے بت پرست عرب مراد نہیں کیونکہ وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں سمجھتے تھے اور کہتے تھے "ان الملائکۃ بنات اللّٰہ" (فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں) اور جہاں تک یہود و نصاریٰ کے خدا کا بیٹا قرار دینے کے عقیدہ کا تعلق ہے تو اس کا تاریخی پس منظر ان کے عربوں سے تعلقات و روابط اور آمد و رفت اور میل جول سے بہت پہلے ہے اور اس حوالہ سے یہودی اس عقیدہ میں دوسروں (نصاریٰ) پر سبقت رکھتے ہیں جبکہ آیت مبارکہ میں "مِنْ قَبْلُ" کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگ یہودیوں و نصرانیوں سے پہلے یہ عقیدہ رکھتے تھے، اس کے علاوہ یہ مطلب بھی قابل توجہ ہے کہ بت پرستی کا عقیدہ خود عربوں کی ایجاد نہیں بلکہ انہوں نے دوسروں سے لیا اور اسے اختیار کیا۔

بت پرستی کے حوالہ سے کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے جس شخص نے کعبہ کی چھت پر بت رکھا اور لوگوں کو اس کی پوجا کی دعوت دی اس کا نام "عمرو بن لحی" تھا کہ جو شاپور ذوالاکتاف کے زمانہ حکومت میں رہتا تھا اور وہ مکہ میں اپنی قوم کا سردار تھا اور خانہء کعبہ کی حفاظتی اور انتظامی ذمہ داریاں بھی اس نے سنبھال رکھی تھیں، پھر اس نے ارضِ شام کے شہر "بلقاء" کا ایک سفر کیا اور وہاں دیکھا کہ لوگ بتوں کی پرستش کر رہے تھے، تو اس نے ان سے ان بتوں کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا کہ یہ بت ہمارے ارباب (خدا) ہیں جنہیں ہم نے آسمانی شکلوں اور بشری صورتوں میں بنایا ہے، ہم ان سے مدد طلب کرتے ہیں تو یہ ہماری مدد کرتے ہیں اور ہم ان سے بارش طلب کرتے ہیں تو یہ ہمیں بارش سے نوازتے ہیں، عمرو بن لحی نے ان سے ایک بت

مانگا تو انہوں نے اسے " ہبل " نامی بت دے دیا، پھر وہ مکہ واپس آیا تو اس نے وہ بت خانہ ءکعبہ کی چھت پر رکھ دیا اور لوگوں کو اس کی پوجا کرنے کی دعوت دی، اس کے ساتھ دو بت "اساف اور نائلہ" میاں بیوی کی شکلوں میں تھے تو اس نے لوگوں کو ان کی پرستش کی دعوت دی اور کہا کہ ان کے ذریعے اللہ کا قرب طلب کریں (اس واقعہ کو کتاب "الملل والنحل اور تاریخ کی دیگر کتب میں ذکر کیا گیا ہے)، عجیب بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں حضرت نوحؑ کے تذکرہ میں عربوں کے چند بتوں کے نام ذکر کیے گئے ہیں اور حضرت نوحؑ کا اپنی قوم کے بارے میں شکوہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا: خدایا! یہ لوگ کہتے ہیں کہ اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑو اور نہ ہی "ود"، "سواع"، "یغوث"، "یعوق" اور "نسر" کو چھوڑو، (وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا ۙ وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا)......سورۂ نوح، آیت ۲۳......،

اس کے علاوہ بت پرستی کے حوالہ سے یہ بات ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے کہ روم، یونان، مصر، شام اور ہندوستان کے بت پرست فلسطین اور اس کے اردگرد کے علاقوں میں رہنے والے اہل کتاب سے زیادہ نزدیک تھے جس کی وجہ سے ان کے عقائد و دینی نظریات کا اہل کتاب تک پہنچنا نہایت آسان اور اس کے اسباب و وسائل نہایت فراوان تھے۔

بنا برایں آیت مبارکہ میں جن کافروں کے عقائد و نظریات کی اندھی تقلید کرنے کے حوالہ سے اہل کتاب کے فرزندیٔ خدا کے عقیدہ کا تذکرہ ہوا ہے ان سے قدیم ہندوستان و چین کے بت پرستوں اور مغرب سے روم و یونان اور شمالی افریقہ کے بت پرستوں کے علاوہ کوئی دوسرا مراد نہیں، جیسا کہ تاریخ بیان کرتی ہے کہ ان کے دینی عقائد و نظریات کی مثالیں یہود و نصاریٰ کے ہاں موجود عقائد و نظریات میں دکھائی دیتی ہیں مثلاً بیٹا ہونا، باپ ہونا، تثلیث اور سولی پر چڑھنا، فدیہ ہونا وغیرہ۔

تو یہ وہ تاریخی حقائق ہیں جن کی طرف قرآن مجید توجہ دلاتا ہے اور ان کے بارے میں بھرپور آگاہ کرتا ہے۔

سابقہ آیات کی مانند اس حقیقت کا ثبوت درج ذیل آیت مبارکہ میں بھی پایا جاتا ہے:

سورۂ مائدہ، آیت :۷۷

○ " قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ "

(کہہ دو، اے اہل کتاب! تم اپنے دین میں ناحق غلو......حد سے باہر نکلنا اور تجاوز......سے کام نہ لو اور نہ ہی ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی کرو جو اس سے پہلے گمراہ ہو گئے اور کثیر لوگوں کو گمراہ کیا اور سیدھی راہ سے بھٹک گئے)

اس آیت مبارکہ میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ ان کا دین میں ناحق غلو و تجاوز اور حد سے بڑھ جانا ان لوگوں کی

اندھی تقلید اوران کی خواہشوں کی پیروی کرنے کے باعث ہوا جو ان سے پہلے گمراہی کا شکار ہو چکے تھے، یہاں "ان لوگوں" سے ان کے احبار و علماء اور راہب حضرات مراد نہیں کیونکہ آیت کے الفاظ میں کوئی قید ذکر نہیں کی گئی بلکہ مطلق اور ہر طرح کی اضافی شرط سے خالی ہیں چنانچہ "اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا" کہا گیا، اور جیسا کہ بیان ہو چکا ہے ان سے مراد زمانہ جاہلیت کے عرب بھی نہیں، اور ان لوگوں کی پہچان کرواتے ہوئے کہا گیا کہ انہوں نے کثیر افراد کو گمراہ کر دیا (وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا) تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ لوگ ایسے گمراہ کرنے والے رہنما تھے جن کی تقلید و پیروی کی جاتی تھی جبکہ اس دور میں عربوں کی حالت یہ تھی کہ وہ نہایت پسماندہ وان پڑھ تھے اور علم و تمدن اور ترقی سے بے بہرہ تھے تو کسی کا ان کی پیروی کرنا نا قابل تصور تھا جبکہ اس دور میں دوسری ترقی یافتہ و مہذب اقوام فارس، روم اور دیار ہند وغیرہ میں آباد تھیں۔

بنا بر ایں آیت مبارکہ میں "قوم" سے مراد مذکورہ بالا میں سے کوئی بھی نہیں سوائے چین و ہند اور مغرب میں رہنے والے بت پرستوں کے!

ساتویں فصل:

اہل کتاب کی طرف منسوب کتاب کون سی اور کیسی ہے؟

اگر چہ اہل کتاب کے تشخص و تعین سے مربوط روایت میں مجوس کو بھی ان میں شامل کیا گیا ہے کہ جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی بھی خاص کتاب ہو یا ان آسمانی کتابوں میں سے کسی ایک سے ان کی نسبت ہو جن کا ذکر قرآن مجید نے کیا ہے مثلاً حضرت نوحؑ کی کتاب، حضرت ابراہیمؑ کے صحیفے، حضرت موسیٰؑ کی تورات، حضرت عیسیٰؑ کی انجیل، حضرت داؤد کی زبور، لیکن قرآن مجید نے نہ تو مجوس کے بارے میں کوئی خاص تذکرہ کیا ہے اور نہ ہی ان سے مخصوص کسی کتاب کا ذکر کیا ہے، اور ان کے پاس جو کتاب ہے کہ جسے "اوستا" کہتے ہیں اس کا ذکر بھی نہیں ہوا اور نہ ہی ان کی کسی بھی کتاب کا تذکرہ ہوا ہے۔

اور قرآن مجید میں جہاں بھی لفظ "اہل کتاب" ذکر ہوا ہے اس سے مراد یہودی و نصرانی ہیں اور اس نسبت کی وجہ وہی کتاب ہے جو خداوند عالم نے ان میں نازل فرمائی۔

یہودیوں کے پاس جو مقدس کتب موجود ہیں ان کی تعداد ۳۵ ہے جن میں سے ایک تورات ہے جو حضرت موسیٰؑ پر نازل ہوئی اور وہ پانچ اسفار پر مشتمل ہے (یعنی: سفرِ خلیقہ، سفرِ خروج، سفرِ احبار، سفرِ عدد، سفرِ استثناء)۔ ان میں سے کتب المؤرخین ہیں جن کی تعداد بارہ ہے:

(۱) یوشع کی کتاب

(۲) بنی اسرائیل کے قاضیوں کی کتاب
(۳) راعوث کی کتاب
(۴) سموئیل کے اسفار میں سے پہلا حصہ
(۵) سموئیل کے اسفار میں سے دوسرا حصہ
(۶) اسفار الملوک سے پہلا حصہ
(۷) اسفار الملوک سے دوسرا حصہ
(۸) اخبار الایام کا پہلا حصہ
(۹) اخبار الایام کا دوسرا حصہ
(۱۰) عزرا کا پہلا سفر
(۱۱) عزرا کا دوسرا سفر
(۱۲) استیر کا سفر

اس کے علاوہ ان کی کتب میں سے ایک حضرت ایوبؑ کی کتاب ہے، اور حضرت داؤدؑ کی زبور اور حضرت سلیمانؑ کی تین کتب ہیں:

(۱) کتاب الامثال
(۲) کتاب الجامعہ
(۳) کتاب تسبیح التسابیح

اس کے علاوہ کتب النبوات ہیں جن کی تعداد سترہ ہے:

(۱) کتاب نبوت اشعیا
(۲) کتاب نبوت ارمیا
(۳) کتاب مراثی ارمیا
(۴) کتاب حزقیال
(۵) کتاب نبوت دانیال
(۶) کتاب نبوت یوشیع
(۷) کتاب نبوت یوئیل

(۸) کتاب نبوت عاموص

(۹) کتاب نبوت عویذیا

(۱۰) کتاب نبوت یونان

(۱۱) کتاب نبوت میخا

(۱۲) کتاب نبوت ناحوم

(۱۳) کتاب نبوت حیقوق

(۱۴) کتاب نبوت صفونیا

(۱۵) کتاب نبوت حجی

(۱۶) کتاب نبوت زکریا

(۱۷) کتاب نبوت ملاخیا

مذکورہ بالا تمام کتب میں سے قرآن مجید میں صرف دو کتابوں کا ذکر آیا ہے:

(۱) حضرت موسیٰؑ پر نازل ہونے والی تورات،

(۲) حضرت داوٗد پر نازل ہونے والی زبور۔

اور نصرانیوں کے پاس جو مقدس کتب موجود ہیں ان کی فہرست یہ ہے:

(۱) انجیل متی

(۲) انجیل مرقس

(۳) انجیل لوقا

(۴) انجیل یوحنا

(۵) کتاب اعمال الرسل

(۶) کتاب رؤیائے یوحنا

ان کے علاوہ درج ذیل چند رسائل ہیں:

(۱) بولس کے چودہ رسالے

(۲) یعقوب کا رسالہ

(۳) بطرس کے دو رسالے

(۴) یوحنا کے تین رسالے

(۵) یہودا کا رسالہ

مذکورہ بالا تمام کتب و رسائل میں سے قرآن مجید نے کسی کا بالخصوص ذکر نہیں کیا البتہ صرف یہی تذکرہ کیا ہے کہ ایک آسمانی کتاب جسے خداوند عالم نے حضرت عیسیٰؑ پر نازل فرمایا اس کا نام "انجیل" ہے، اور وہ چار انجیلیں نہیں بلکہ صرف ایک انجیل ہے، لیکن نصاریٰ نہ تو اسے جانتے و پہچانتے ہیں اور نہ ہی اسے مانتے ہیں البتہ ان کے بزرگوں کے بیانات و اظہارات کے اشاراتی حوالوں میں اس بات کا اعتراف دکھائی دیتا ہے کہ حضرت مسیحؑ کے پاس ایک کتاب تھی جس کا نام انجیل تھا، چنانچہ اہل غلاطیہ کے نام پولس کے ایک خط میں اس طرح مرقوم ہے کہ: مجھے تعجب ہے کہ تم اتنی جلدی حضرت مسیحؑ کی نعمت سے روگردانی کر کے دوسری انجیل کو اپنا چکے ہو جبکہ وہ حقیقی انجیل نہیں البتہ کچھ لوگ جبراً اسے تم پر ٹھونسنا چاہتے ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ وہ اصل انجیل میں ردوبدل کر دیں یعنی تحریف کریں"۔

اس کے علاوہ نجار نے قصص الانبیاء میں پولس کے مذکورہ بالا خط اور اس کے دیگر خطوط کے اقتباسات کا حوالہ دے کر لکھا ہے کہ ان چار معروف انجیلوں کے علاوہ ایک انجیل تھی جسے انجیل المسیح کہا جاتا تھا۔

تاہم قرآن مجید اس حقیقت کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ حقیقی تورات کا کچھ حصہ یہودیوں کے پاس موجود ہے اور اسی طرح حقیقی انجیل کا بعض حصہ نصرانیوں کے پاس موجود ہے چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

سورۂ مائدہ، آیت: ۴۳

○ "وَكَيْفَ يُحَكِّمُونَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيهَا حُكْمُ اللّٰهِ"

(اور وہ کیونکر تیرے حکم پر سرِ تسلیم خم کرتے حالانکہ ان کے پاس تورات ہے جس میں خدا کا حکم موجود ہے)

سورۂ مائدہ، آیت: ۱۴

○ "وَمِنَ الَّذِينَ قَالُوٓا اِنَّا نَصٰرٰىٓ اَخَذْنَا مِيثَاقَهُمْ فَنَسُوا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهٖ"

(اور ان میں سے جنہوں نے کہا ہم نصاریٰ ہیں، ہم نے عہد و پیمان لے لیا پھر انہوں نے اس میں سے کہ جس کی انہیں یاد دہانی کروائی گئی کچھ حصہ بھلا دیا)

ان آیات کی ہمارے مقصود و مطلوب پر دلالت ظاہر و واضح ہے۔

ایک تاریخی بحث

اس بحث میں دو حوالوں سے مطالب ذکر کئے جائیں گے، ایک موجودہ تورات کے بارے میں اور دوسرا حضرت مسیحؑ اور انجیل کے بارے میں !

۱۔ موجودہ تورات کا تذکرہ

بنی اسرائیل جو کہ آل یعقوب کے نواسے و پوتے ہیں وہ پہلے صحرا نشین، دیہاتی، بدو قبائل کی طرح زندگی بسر کرتے تھے، پھر فراعنۂ مصر نے انہیں شہروں میں منتقل کر دیا اور ان کے ساتھ قیدی غلاموں جیسا برتاؤ کرتے تھے، بالآخر خداوند عالم نے انہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے فرعون اور اس کے بدترین غیر انسانی سلوک سے نجات بخشی۔

وہ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور میں اپنے امام یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بعد ان کے جانشین حضرت یوشعؑ کی ہدایت و رہنمائی کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے، پھر ایک عرصہ تک ان کی باگ ڈور اور تدبیر امور اس دور کے قاضیوں مثلاً ایہود اور جدعون وغیرہ کے ہاتھوں میں رہی، اس کے بعد ان پر سلطنتی نظام حکومت قائم ہو گیا، اور ان کا پہلا بادشاہ ''شاؤل'' تھا کہ جسے قرآن مجید نے ''طالوت'' کے نام سے موسوم کیا ہے، طالوت کے بعد داؤد اور پھر سلیمان نے تختِ سلطنت سنبھالا۔

پھر مملکت تقسیم ہو گئی اور اقتدار کی مرکزیت ٹوٹ پھوٹ سے دوچار ہو گئی لیکن اس سب کچھ کے باوجود ان میں کثیر بادشاہوں نے حکمرانی کی مثلاً رحبعام، ابیام، یربعام، یہوشافاط، یہورام اور ان کے علاوہ تیس سے زیادہ بادشاہ آئے، مگر مملکت کی تقسیم اور ٹکڑے ٹکڑے ہونے کے بعد ان کی طاقت میں کمی کا رجحان جوں کا توں رہا اور پھر صورتحال یہ ہو گئی کہ بابل کے بادشاہوں نے ان پر غلبہ پالیا اور وہ اورشلیم کہ جو بیت المقدس ہے کو اپنے قبضہ میں لے لیا، اور یہ تقریباً چھ سو سال قبل از مسیحؑ کی بات ہے، اسی دوران ''بخت نصر'' (بنوکدنصر) نے بابل کی حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی، پھر جب یہودیوں نے اس کی حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تو اس نے ان کی سرکوبی کے لئے اپنی فوج بھیج دی جس نے انہیں گھیرے میں لے کر ان کے علاقہ کو فتح کر لیا، اور ان کے سلطنتی خزانوں سمیت خزائن الہیکل (مسجد اقصیٰ) کی لوٹ مار کی، اور ان کے

ثروتمندوں، طاقتوروں اور صنعت گروں میں تقریباً دس ہزار افراد کو یرغمال بنا کر اپنے ساتھ بابل لے گئے، یہاں تک کہ اس سرزمین پر چند کمزور و ناتواں اور نادار لوگوں کے سوا کوئی باقی نہ رہا، بخت نصر نے ''صدقیا'' نامی شخص کو اپنی نمائندگی و نیابت میں وہاں کا بادشاہ مقرر کر دیا جو کہ بنی اسرائیل کا آخری بادشاہ تھا اور اس کو بادشاہ بنانے میں یہ شرط رکھ دی کہ وہ اس (بخت نصر) کے تابع فرمان رہے گا۔

''صدقیا'' تقریباً دس سال تک اسی طرح بادشاہ رہا، اس دوران اس نے اپنے پاؤں مضبوط کر لئے اور اپنا اقتدار مضبوط و مستحکم دیکھتے ہی فراعنۂ مصر میں سے ایک حکمران سے روابط قائم کر کے بخت نصر سے بغاوت کا اعلان کر دیا اور اس کے حکم و فرمان کی اطاعت و پیروی سے انکار کر دیا، اس پر بخت نصر شدید غصہ میں آیا اور اس نے کئی فوجی دستے ان کی طرف روانہ کر دیئے جنہوں نے ان کے تمام علاقوں کا محاصرہ کر لیا، ''صدقیا'' کے عوام نے قلعوں میں پناہ لی اور وہ ڈیڑھ برس تک انہی قلعوں میں پھنس کر رہے گئے جس کے نتیجہ میں قحط اور گوناگوں بیماریوں کا شکار ہو گئے، بخت نصر اپنے موقف پر ڈٹا رہا اور اس نے محاصرہ برقرار رکھا بالآخر اس نے ان کے تمام قلعوں کو فتح کر لیا اور ان پر قابو پا لیا، یہ واقعہ میلادِ مسیحؑ سے پانچ سو چھیاسی برس پہلے ہوا، بخت نصر نے ان کے قتل عام کا حکم دے دیا چنانچہ ان کے خون کی ہولی کھیلی گئی اور ان کے گھروں کو مسمار کر دیا گیا یہاں تک کہ خانۂ خدا کو بھی خاک سے یکساں کر دیا گیا، بخت نصر کے سپاہیوں نے وہاں ہر طرح کی دینی علامات و نشانی کو محو کر دیا اور ان کے ہیکل و عبادت گاہ کو مٹی کے ٹیلہ میں تبدیل کر دیا، ان خونی و وحشت ناک کاروائیوں میں تورات اور وہ صندوق کہ جس میں تورات رکھی ہوئی تھی ضائع ہو گئی یہاں تک کہ اس کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔

یہ صورتحال کم و بیش پچاس برس تک جوں کی توں رہی، اور جو لوگ بابل میں باقی رہ گئے تھے ان کے پاس نہ تو ان کی آسمانی کتاب سے کچھ باقی تھا اور نہ ہی ان کی عبادت گاہ اور ملک و دیار سے کچھ بچا تھا بلکہ وہ سب کچھ مٹی کے ٹیلے میں بدل چکا تھا۔

پھر جب فارس کے بادشاہوں میں سے ''کورش'' تخت نشین ہوا اور اس نے بابل کے لوگوں سے جو سلوک کیا سو کیا کہ بالآخر اس نے بابل کو فتح کر لیا اور بابل میں داخل ہو گیا، اس نے بابل میں موجود بنی اسرائیلی قیدیوں کو رہا کر دیا، اور اپنے مقرب بارگاہ افراد میں سے مشہور و معروف شخص کو جس کا نام ''عزرا'' تھا اسرائیلیوں پر حاکم مقرر کر دیا اور اسے اجازت دی کہ ان کے لئے تورات لکھوائے اور ''ہیکل'' کو دوبارہ تعمیر کرے اور انہیں ان کی سابقہ زندگی کی طرف لوٹا دے، چنانچہ عزرا نے چار سو ستاون قبل از مسیحؑ میں بنی اسرائیل کو بیت المقدس واپس بھیج دیا اور پھر اس نے کتب عہد عتیق کی جمع آوری و تصحیح کا کام انجام دیا اور یہ وہی تورات ہے جو آج یہودیوں کے پاس موجود و رائج ہے۔

(یہ تفصیلات ''قاموس کتاب مقدس'' مؤلفہ مسٹر ہاکس امریکی ہمدانی، اور دیگر کتب تاریخ سے ماخوذ ہیں)

قارئین کرام! مذکورہ بالا تفصیلات پر غور کرنے سے آپ بخوبی اس حقیقت سے آگاہ ہو سکتے ہیں کہ موجودہ تورات جو کہ اس وقت یہودیوں کے پاس ہے اس کا سلسلہ سند حضرت موسیٰ علیہ السلام تک نہیں پہنچتا اور پچاس برس تک اس کا سلسلۂ سند حضرت موسیٰؑ سے منقطع رہا اور پھر صرف ایک شخص تک منتہی ہوا جس کا نام "عزرا" ہے کہ جس کے بارے میں پانچ حوالوں سے سوالات جنم لیتے ہیں:

(۱) اس شخص کی ذاتی پہچان ہی نہیں ہو سکی...... کہ وہ کون ہے؟......،

(۲) اس کا تورات کے بارے میں علم وآگاہی اور اس حوالہ سے اس کی علمی منزلت وفکری مقام واضح نہیں۔

(۳) اس کی علمی امانتداری ہمارے لئے مجہول ہے۔

(۴) اس نے اسفار تورات کے نام سے جو کچھ اکٹھا کیا اس کا ماخذ کیا ہے؟ (اس نے یہ سب کچھ کہاں سے حاصل کیا؟)

(۵) تصحیح کے عمل میں اس نے کس معیار کو اختیار کیا؟

ان پانچ حوالوں سے جنم لینے والے سوالات کی وجہ سے موجودہ تورات کی اعتباری حیثیت مخدوش ومشکوک ہو جاتی ہے۔

یہ ناگوار سانحہ ایک ناگوار اثر کا باعث بنا اور وہ یہ کہ مغرب کے متعدد تاریخ نگاروں و محققین نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وجود ہی کا انکار کر دیا اور آنجنابؑ اور آپؑ سے تعلق رکھنے والے امور کے بارے میں صاف صاف کہہ دیا کہ وہ ایک فرضی وخیالی شخص ہے اس کا حقیقی وجود نہیں، اور یہ اسی طرح ہے جیسے اس سے پہلے اسی طرح کے اظہارات انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کیے، لیکن کوئی مسلمان اس قسم کی باتوں کو قرین صحت نہیں مان سکتا کیونکہ قرآن مجید نے آنجنابؑ کے حقیقی وجود کا ذکر نہایت صراحت کے ساتھ کیا ہے اور واضح الفاظ میں ان کے بارے میں مطالب ذکر کیے ہیں۔

(۲) مسیحؑ اور انجیل کی تاریخی حیثیت

یہودی اپنی قومی تاریخ اور اپنے ماضی کے حالات و واقعات کو محفوظ کرنے کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور اس سلسلہ میں انہوں نے بھرپور عملی اقدامات اٹھائے ہیں، لیکن اس کے باوجود اگر آپ ان کی تمام دینی کتب اور مذہبی نگارشات کا بغور جائزہ لیں تو آپ کو کہیں بھی حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کا نام دکھائی نہیں دے گا۔ نہ تو ان کی اولاد کی کیفیت کے

بارے میں اور نہ ہی ان کے بطور نبی ظہور پذیر ہونے اور لوگوں کو اپنی پیروی کی دعوت دینے کے بارے میں، نہ ہی ان کی سیرت اور ان معجزات کے بارے میں جو خداوند عالم نے ان کے دست مبارک پر ظاہر فرمائے اور نہ ہی ان کی زندگی ختم ہونے کے بارے میں، کہ آیا وہ طبعی موت سے دنیا سے گئے یا انہیں قتل کر دیا گیا یا سولی پر لٹکایا گیا؟ ان امور میں سے کسی بھی مطلب کا کوئی حوالہ ان کی کتابوں وتحریروں میں آپ کو نہیں ملے گا، اب دیکھنا یہ ہے کہ اس کا کیا سبب ہے؟ کیا وجہ ہے کہ وہ حضرت مسیح علیہ السلام کے حالات سے آگاہ وباخبر نہیں؟ یا باخبر ہونے کے باوجود انہوں نے ان کے حالات پر پردہ کیوں ڈالا؟

قرآن مجید ان کے بارے میں بیان کرتا ہے کہ انہوں نے حضرت مریمؑ کو قذف کیا...... ان پر برائی (زنا) کی تہمت لگائی...... اور حضرت عیسیٰؑ کی ولادت کے حوالہ سے ان پر بہتان تراشی کی، اور انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کو قتل کرنے کا دعویٰ بھی کیا، چنانچہ ان کے بارے میں خداوند عالم نے اس طرح بیان کیا:

سورۂ نسآء، آیت :۷۵

○ "وَّبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ﴿۱۵۶﴾ وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ۭ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا"

(اور ان کے کفر کی وجہ سے، اور یہ کہ انہوں نے مریم پر بہت بڑا بہتان لگایا، اور یہ کہ انہوں نے کہا: ہم نے اللہ کے رسول مسیح عیسیٰ بن مریم کو قتل کیا ہے حالانکہ انہوں نے اسے قتل نہیں کیا، اور نہ ہی اسے سولی پر چڑھایا، بلکہ ان کے لئے اس کا شبیہ بنا دیا گیا...... اس کی بابت حقیقت حال ان پر واضح نہ ہوسکی......، جن لوگوں نے اس کے بارے میں اختلاف کیا وہ اس کی بابت شک میں ہیں، وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے، وہ صرف گمان ہی کرتے ہیں، وہ انہیں قتل کرنے میں کوئی یقین نہیں رکھتے۔۔ انہوں نے اسے یقیناً قتل نہیں کیا۔۔)

اس صریح وواضح قرآنی بیان کے بعد دیکھنا یہ ہے کہ وہ کس بناء پر حضرت مسیحؑ کو قتل کردینے کے دعویدار ہیں جبکہ ان کی کتب میں بھی اس حوالہ سے کوئی بات مذکور نہیں، تو کیا اس کی بنیاد ان کے درمیان مشہور قومی واقعات تو نہیں جن کا وہ آپس میں تذکرہ کرتے رہتے تھے؟ کیونکہ وہ واقعات سنے سنائے ہی ہوتے تھے کہ جن کا ذکر کسی کتاب میں نہیں ہوا کہ جس طرح ایسی کہانیاں وقصے ہر قوم کے درمیان مشہور ہوتے ہیں کہ جب تک ان کے بارے میں ٹھوس ثبوت اور صحیح حوالہ نہ ملے ان کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انہوں نے یہ سب باتیں حضرت مسیحؑ کے پیروکاروں (نصاریٰ) سے بار بار سنی ہوں کیونکہ وہ لوگ آنجنابؑ کی ولادت، ظہور اور دعوت کا تذکرہ کرتے رہتے تھے، پھر انہوں نے ان کی باتیں سن سن کر

حضرت مریمؑ پر الزام تراشی کی ہو اور حضرت مسیحؑ کے قتل کا دعویٰ کر دیا ہو! تو اس حوالہ سے کوئی بات واضح نہیں ہو سکی سوائے اس کے کہ قرآن مجید نے...... جیسا کہ سابق الذکر آیت مبارکہ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے...... صریح لفظوں میں ان سے منسوب اس دعویٰ کا تذکرہ کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں ہم نے مسیح کو قتل کیا ہے، البتہ ان کے سولی پر چڑھانے کی بات بھی نہیں ہوئی، اور قرآن یہ بھی بیان کرتا ہے کہ وہ لوگ اس کے بارے میں شک میں ہیں اور ان کے بارے میں اختلاف رائے رکھتے ہیں!

اور جہاں تک حضرت مسیحؑ، انجیل اور بشارت کے حوالہ سے نصاریٰ کے ہاں مسلم الثبوت مطالب وحقائق کا تعلق ہے تو وہ یہ ہے کہ ان کے پاس حضرت مسیحؑ اور ان سے تعلق رکھنے والے امور ومطالب کی بابت جو کچھ موجود ہے اس کا مدرک و ماخذ ان کے ہاں موجود کتب مقدسہ ہیں یعنی چار انجیلیں ...... انجیل متی، انجیل مرقس، انجیل لوقا، انجیل یوحنا......، کتاب اعمال الرسل کہ جسے لوقا نے لکھا، اور بولس، بطرس، یعقوب، یوحنا اور یہوذا کے لکھے ہوئے چند رسائل کہ جن کی اعتباری حیثیت کی طرف ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ ان چار انجیلوں کے بارے میں کچھ جانیں:

(۱) انجیل متی:

تصنیف اور نشر ہونے کے حوالہ سے انجیلوں میں سے یہ سب سے قدیمی انجیل ہے کہ بعض مسیحی مؤرخین نے کہا ہے کہ ۵۰ء تا ۶۰ء کے درمیان لکھی گئی ہے۔ (ملاحظہ ہو کتاب قاموس الکتاب المقدس، مؤلفہ مسٹر ہاکس، لفظ ''متی'' کے ذیل میں!)۔ بہر حال وہ حضرت مسیحؑ کے بعد لکھی گئی۔

انجیل متی کے حوالہ سے تمام قدیم وجدید مسیحی محققین نے لکھا ہے کہ وہ اصل میں عبرانی زبان میں لکھی گئی، پھر یونانی و دیگر زبانوں میں اس کا ترجمہ کر دیا گیا، اور جہاں تک اس کے اصل عبرانی نسخہ کا تعلق ہے تو وہ اب مفقود و نایاب ہے اور جو تراجم اس وقت موجود ہیں وہ مجہول الحال ہیں اور ان کے مترجمین کے بارے میں بھی معلوم نہیں کہ وہ کون تھے؟ (ملاحظہ ہو: کتاب میزان الحق، کتاب قاموس الکتاب المقدس میں بھی اس حوالہ سے احتمال موجود ہے)

(۲) انجیل مرقس:

مرقس دراصل بطرس کا شاگرد تھا اور وہ حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں میں سے نہیں تھا، اس کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس نے اپنی انجیل بطرس کے کہنے بلکہ اسی کے حکم پر لکھی، اور وہ حضرت مسیحؑ کو خدا نہیں سمجھتا تھا (یہ بات عبدالوہاب نجار سے منقول ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب قصص الانبیاء میں اسے لکھا ہے اور ان کا مدرک وماخذ بطرت قرماج کی کتاب مروج

الاخبار فی تراجم الاخیار ہے) اسی بناء پر بعض حضرات نے لکھا ہے کہ مرقس نے اپنی انجیل قبائلیوں اور دیہاتیوں کے لئے لکھی چنانچہ اس نے اس میں حضرت مسیحؑ کو خدا کا بھیجا ہوا رسول اور شرائع خداوندی کے مبلغ کے طور پر پہنچوایا (کتاب قاموس الکتاب المقدس میں لکھا ہے کہ اہل علم وارباب تحقیق نے واضح طور پر بیان کیا ہے کہ مرقس نے اپنی انجیل کو رومی زبان میں لکھا اور وہ بطرس اور پولس کی وفات کے بعد منظر عام پر آئی، لیکن یہ بات کوئی زیادہ درست نہیں کیونکہ اس کی انجیل سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اسے قبائلیوں اور دیہاتیوں کے لئے لکھا نہ کہ شہریوں اور بالخصوص رومیوں کے لئے!)۔ اب آپ خود اس کے بیان پر غور کریں۔

(۴) انجیل لوقا:

لوقا بھی حضرت مسیحؑ کے حواریوں سے نہ تھا اور نہ ہی اس ٭ نے آنجنابؑ کو دیکھا، بلکہ اس نے نصرانیت کا مسلک پولس سے حاصل کیا حالانکہ پولس ایک نہایت متعصب یہودی تھا اور نصرانیت کے سخت خلاف تھا، وہ مسیحؑ پر ایمان لانے والوں کو اذیت وآزار کا نشانہ بناتا تھا اور مطالب کو ان کے سامنے توڑ مروڑ کر بیان کرتا تھا، ناگاہ اس نے پلٹا کھایا اور اس بات کا دعویٰ کرنے لگا کہ اس پر غشی طاری ہوگئی تھی اور عالم غشی میں حضرت مسیحؑ نے اسے چھوا...... ان سے ملاقات ہوئی...... تو انہوں نے اسے اپنے پیروکاروں کو اذیت وآزار کا نشانہ بنانے پر سخت لہجہ میں مورد مذمت وملامت قرار دیا، اسی حال میں وہ حضرت مسیحؑ پر ایمان لایا اور آنجنابؑ نے اسے حکم دیا کہ وہ لوگوں کو اس کی انجیل کی بشارت دے۔

اور اسی پولس نے موجودہ نصرانیت کی بنیادیں مضبوط کیں اور وہ اب جس صورت میں ہے یہ پولس ہی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے (ملاحظہ ہو: کتاب "قاموس الکتاب المقدس، لفظ پولس) چنانچہ اس نے اپنی تعلیمات کی بنیاد ہی یہ قرار دی کہ نجات حاصل کرنے کے لئے حضرت مسیحؑ پر ایمان لانا ہی کافی ہے اور اس کے لئے کسی عمل کی ضرورت نہیں، اس نے مردار اور خنزیر کا گوشت کھانا بھی مسیحیوں کے لئے حلال کر دیا، اور ختنہ و دیگر عملی فرائض جو تورات میں مذکور ہیں سب حرام کر دیئے (ملاحظہ ہو: کتاب اعمال الرسل، اور پولس کے رسائل) حالانکہ انجیل تو تورات کی تصدیق کرنے کے لئے نازل ہوئی تھی اور اس نے صرف چند چیزوں کو حلال کیا۔

خلاصۂ کلام یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس لئے تشریف لائے تاکہ تورات کے احکام و دستورات کو عملی طور پر نافذ و قائم کریں اور مقدس کتاب الٰہی سے روگردانی اور اس کی نافرمانی کرنے والوں کو دوبارہ اس کی طرف لوٹا دیں نہ یہ کہ عمل کو غیر ضروری قرار دے کر صرف ایمان لانے کو سعادت وخوش بختی کا ضامن بنائیں۔

بہرحال لوقا نے اپنی انجیل، مرقس کی انجیل کے بعد لکھی کہ اس وقت بطرس اور بولس وفات پا چکے تھے، متعدد مسیحی دانشوروں نے صراحت کے ساتھ کہا ہے کہ لوقا کی انجیل دوسری انجیلوں کی الہامی کتاب نہیں جیسا کہ اس کی انجیل کے ابتدائی صفحات میں درج مطالب سے بھی اس کے الہامی کتاب نہ ہونے کا ثبوت ملتا ہے، (اس نے اس میں کہا ہے: چونکہ اکثر لوگوں نے ان واقعات کو غلط رنگ دے دیا جن کے بارے میں ہم بخوبی آگاہ ہیں اور ہمارے پاس جو معلومات ہیں وہ ہم نے اپنے ان پہلے لوگوں سے حاصل کیں جنھوں نے ان واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور وہ دین مسیحیت کے خدمتگار تھے لہٰذا اس نے مناسب سمجھا کہ ان واقعات پر ایک کتاب لکھوں کیونکہ میں نے ہر چیز پر نہایت تحقیق کی اور بخوبی چھان بین کر کے اسے دیکھا، تو اے محترم ثاوفیلا! میں اپنی کاوش آپ کو پیش کرتا ہوں)۔ اس بیان سے واضح طور پر ظاہر و ثابت ہوتا ہے کہ وہ کتاب لوقا کے اپنے نظریات کا مجموعہ ہے الہامی کتاب نہیں ہے اور یہی بات مسٹر کدل کی کتاب رسالۃ الالہام میں بھی مذکور ہے، اور جیروم نے بھی صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ہمارے متقدمین نے انجیل لوقا کے پہلے دو ابواب کو شک کی نگاہ سے دیکھا ہے کیونکہ وہ دو باب فرقہ مارسیونی کے پاس انجیل لوقا کا جو نسخہ موجود ہے اس میں شامل نہیں، اور اکہارن نے بھی اپنی کتاب کے صفحہ ۹۵ پر یقین کے ساتھ اس مطلب کو لکھا ہے کہ انجیل لوقا کے صفحہ ۴۳ تا ۴۷ پر جو کہ اس کے باب ۲۲ سے مربوط ہیں مذکورہ مطالب اضافہ اور بعد میں شامل کئے گئے ہیں، اور اکہارن ہی نے اپنی کتاب کے صفحہ ۶۱ پر لکھا ہے کہ لوقا نے اپنی انجیل میں جو معجزات درج کئے ہیں ان میں حقیقت و بناوٹ اور سچ و جھوٹ کو اس طرح مخلوط کر دیا ہے کہ اس میں واقع الامر کے اظہار و بیان کی بجائے شاعرانہ انداز زیادہ پایا جاتا ہے اس لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ ان میں سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے؟ اور کلی می شیس کا کہنا ہے کہ انجیل متی اور انجیل مرقس میں تحریر کے حوالہ سے فرق ہے اور اگر کسی مقام پر ان دونوں میں ایک ہی مطلب بیان کیا گیا ہو تو ان دونوں میں مذکور مطلب کو انجیل لوقا میں مذکور مطلب پر ترجیح دی جائے گی

(ملاحظہ ہو کتاب قصص الانبیاء، مولفہ عبدالوہاب تجار، صفحہ ۴۷۷)

(۴) انجیل یوحنا:

یوحنا کے بارے میں اکثر نصرانیوں نے کہا ہے کہ یہ وہی یوحنا بن زبدی الصیاد ہے جو حضرت مسیحؑ کے ان بارہ شاگردوں میں سے ایک ہے جنھیں "حواری" کہا جاتا ہے اور یہی وہ ہے جو حضرت مسیحؑ کو اپنے تمام شاگردوں میں سے سب سے زیادہ محبوب و عزیز تھا، (ملاحظہ ہو: قاموس الکتاب المقدس، مادہ "یوحنا")

یوحنا کی انجیل کے حوالہ سے بیان کیا گیا ہے کہ "شیرینطوس" اور "ابیسون" اور ان کے ہم نوا ساتھیوں کا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت مسیحؑ ایک انسان ہیں کہ جنھیں خلق کیا گیا ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ وہ اپنی والدہ سے پہلے موجود نہ تھے بلکہ اپنی

والدہ کے بطن سے پیدا ہوئے، چنانچہ اسی عقیدہ کی بناء پر ایشیا کے مسیحی علماء (اسقف) اور ان کے علاوہ دیگر اکابرین ۹۶ء میں یوحنا کے پاس اکٹھے ہوئے اور اس سے درخواست کی کہ ان کے لئے انجیل لکھیں اور اس میں ایسے مطالب درج کریں جو دوسروں نے اپنی انجیلوں میں نہ لکھے ہوں اور مخصوص انداز میں اور ہر طرح کے ابہام سے خالی اسلوب کے ساتھ حضرت مسیحؑ کی وجودی ماہیت کو بیان کریں، چنانچہ یوحنا ان کی درخواست کو رد نہ کر سکا اور اس نے ان کی خواہش کے مطابق انجیل لکھی،

(ملاحظہ ہو: کتاب قصص الانبیاء، بحوالہ جرجس زوین الطوحی اللبنانی)

البتہ انجیل یوحنا کی تالیف کی بابت مؤرخین کے اقوال مختلف ہیں، بعض نے ۶۵ء، بعض نے ۹۶ء اور بعض نے ۹۸ء لکھا ہے۔

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یہ انجیل اس یوحنا کی لکھی ہوئی نہیں جو حضرت مسیحؑ کا شاگرد تھا۔

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ وہ مدرسہ اسکندریہ کے ایک طالب علم کی تالیف ہے (یہ مطالب کیتھولک ہرالڈ کی کتاب کی ساتویں جلد کے صفحہ ۲۰۵ مطبوعہ ۱۸۴۴ء سے لئے گئے ہیں اور اس نے استادلن سے اخذ کئے ہیں (کتاب قصص الانبیاء)، (کتاب قاموس الکتاب المقدس میں مادۂ یوحنا میں بھی ان مطالب کی طرف اشارہ ہوا ہے)،

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یہ ساری انجیل اور اسی طرح وہ رسائل جو یوحنا کی طرف منسوب ہیں ان میں سے کوئی بھی یوحنا کی تالیف نہیں بلکہ دوسری صدی کے شروع میں بعض مسیحیوں نے لکھے اور ان کی نسبت یوحنا کی طرف دے دی تا کہ ان کی اعتباری حیثیت قائم ہو اور لوگ ان کا احترام کریں، (منقول از برطشفیدر"، بحوالہ کتاب الفاروق جلد اول،...... قصص الانبیاء......)

بعض مسیحی دانشوروں نے لکھا ہے کہ انجیل یوحنا اصل میں بیس ابواب پر مشتمل تھی، پھر یوحنا کی وفات کے بعد افاس کے کلیسا نے اپنی طرف سے اس میں اکیسواں باب شامل کر دیا (سابقہ حوالہ)۔

تو یہ ہے ان چار انجیلوں کی تاریخ! اگر ہم چاہیں کہ ان انجیلوں کے سلسلہ اسناد سے آگاہ ہوں تو ان میں سے قدر متیقن افراد کا تعین کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام انجیلوں کا سلسلہ سند درج ذیل سات افراد تک پہنچتا ہے:

(۱) متی

(۲) مرقس

(۳) لوقا

(۴) یوحنا

(۵) بطرس

(۶) پولس

(۷) یہوذا

ان تمام حضرات نے مذکورہ بالا چار انجیلوں ہی کو مورد اعتماد قرار دیا اور ان چار انجیلوں میں سب سے زیادہ قابل اعتماد بلکہ مرکزی حیثیت ان میں سے سب سے مقدم انجیل ہے جو کہ انجیل متی ہے کہ جس کے بارے میں بیان ہو چکا ہے کہ اس کا اصل نسخہ مفقود ہو چکا ہے اور جو ترجمہ شدہ انجیل متی اس وقت موجود ہے اس کے مترجم کا تعین نہیں ہو سکا کہ جس کی بناء پر اس کی اعتباری حیثیت واضح ہو، کیونکہ جب تک مترجم کے بارے میں معلوم نہ ہو تو یہ کہنا بھی مشکل ہوگا کہ وہ حضرت مسیحؑ کو خدا کا رسول سمجھتا تھا یا ان کی خدائی کا قائل تھا؟ ان ترجمہ شدہ انجیلوں میں لکھا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص ظہور پذیر ہوا کہ جس کا نام عیسیٰ بن یوسف النجار تھا، اس نے لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دی، اور وہ دعویٰ کرتا تھا کہ وہ خدا کا بیٹا ہے اور کسی بشری باپ سے پیدا نہیں ہوا اور اسے اس کے باپ نے اسے بھیجا ہے تا کہ خود سولی پر چڑھ کر اور قتل ہو کر لوگوں کے گناہوں کا فدیہ بنے، اور اس نے مردوں کو زندہ کیا، مادرزاد نابینا اور برص کے مریض کو تندرست کیا اور جن زدہ لوگوں کو ان کے ابدان سے جنات کو نکال کر شفایاب کر دیا، اور اس کے بارہ شاگرد تھے کہ جن میں سے ایک ''متی'' تھا جس نے انجیل لکھی، اور خدا نے انہیں برکت دی اور انہیں دین مسیحیت کی تبلیغ کے لئے بھیجا۔ الخ،

تو یہ ہے دین مسیحیت کا تاریخی پس منظر اور روئے زمین پر مشرق و مغرب میں ان کے کروفر کی داستان کا خلاصہ، کہ جس کے تمام تر اصول و فروع کا محور ایک ہی شخص ہے جو مجہول الحال اور بے نام ونشان ہے اور اس کی کوئی صفت واثر معلوم نہیں۔

اسی نہایت کمزور و بے بنیاد پس منظر کا نتیجہ ہے کہ یورپ کے بعض آزاد خیال دانشوروں نے یہ راگ الاپا کہ مسیحؑ عیسیٰ بن مریم ایک خیالی و فرضی شخص کا نام ہے جسے بعض دین پرست نما لوگوں نے حکومت ہائے وقت کے خلاف یا ان کی حمایت میں عوام الناس کو جوش دلانے کی غرض سے گھڑ لیا ہے اور انہیں اس کا حقیقی وجود باور کرانے کی کوشش کی،

اسی سے ملتا جلتا ایک اور واقعہ بھی تاریخ میں موجود ہے کہ خرافی عقائد کے حوالہ سے دونوں کامل شباہت رکھتے ہیں اور وہ ہے ''کرشنا'' کا مسئلہ، کہ جس کے بارے میں قدیم ہندو بت پرست دعویٰ کرتے تھے کہ وہ خدا کا بیٹا ہے اور خدا کے عالم لاہوت سے نازل ہوا اور اس نے اپنے آپ کو سولی پر چڑھا کر لوگوں پر فدیہ بنایا تا کہ ان کے گناہوں وخطاؤں سے انہیں نجات بخشے، بعینہ یہی باتیں حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں مسیحی حضرات کرتے ہیں کہ اس کی تفصیلات عنقریب ذکر کی جائیں گی انشاء اللہ،

انہی خرافاتی بیانات ونظریات کے باعث بعض نقاد دانشوروں کو جرأت ہوئی کہ وہ کہیں کہ دنیا میں دو مسیح آئے:

ایک وہ مسیح جسے سولی پر نہیں چڑھایا گیا اور دوسرا وہ مسیح جسے سولی پر چڑھایا گیا اور ان دونوں کے درمیان پچاس صدیوں سے زائد عرصہ گزرا۔

جبکہ میلادی عیسوی تاریخ کا آغاز جو کہ ہمارے موجودہ سال (۱۹۵۶)......اس کتاب (المیزان) کی تالیف کا سال......کی بنیاد ہے وہ ان دو مسیحوں میں سے کسی ایک کے زمانۂ ظہور سے مطابقت نہیں رکھتا کیونکہ جس مسیح کو سولی پر نہیں چڑھایا گیا وہ دو سو پچاس برس اس سے پہلے تھا اور وہ تقریباً ساٹھ سال زندہ رہا، اور دوسرا مسیح کہ جسے سولی پر چڑھایا گیا وہ اس عیسوی میلادی تاریخ کے آغاز کے دو سو نوے برس بعد ظہور پذیر ہوا اور وہ ۳۳ برس زندہ رہا، (ملاحظہ ہو: زعیم فاضل ''بہروز'' کی تازہ ترین تصنیف جو انہوں نے بشاراتِ نبویہ کے موضوع پر لکھی کہ اس سے اقتباسات، سورۂ نساء کی آخری آیات کی تفسیر میں پیش کرنے کی کوشش کریں گے) تاہم جو بات قدر متیقن ہے وہ یہ کہ مسیحیت کی تاریخ میں درستی نہیں پائی جاتی، بلکہ اس کی عدم صحت کے بارے میں خود مسیحیوں نے بھی کہا ہے کہ میلادی تاریخ حضرت مسیحؑ کے روز ولادت سے مطابقت نہیں رکھتی، ان کا یہ اعتراف تاریخ کی حرکت رک جانے کا کھلا ثبوت فراہم کرتا ہے۔

اس کے علاوہ کئی دیگر امور بھی ہیں جن کی وجہ سے مسیحیوں کی انجیلوں کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا ہوئے ہیں مثلاً: وہ کہتے ہیں کہ میلادِ مسیحؑ کی پہلی دو صدیوں میں متعدد انجیلیں لکھی گئیں جن کی تعداد ایک سو سے زیادہ تک بتائی جاتی ہے کہ مشہور چار انجیلیں بھی انہی میں سے ہیں، لیکن کلیسا نے ان تمام انجیلوں میں سے صرف مشہور چار انجیلوں کو قابل اعتماد قرار دیا اور ان کے علاوہ باقی سب کو ممنوع کر دیا، ان چار انجیلوں کو اس لئے قانونی حیثیت دی گئی کہ وہ کلیسا کی تعلیمات سے مطابقت رکھتی تھیں۔

اسی حوالہ سے دوسری صدی کے فیلسوف ''شیلسوس'' نے اپنی کتاب ''الخطاب الحقیقی'' میں نصرانیوں کو موردِ ندامت وملامت قرار دیا کہ انہوں نے انجیلوں کو کھلونا بنا دیا اور جب چاہا اور جو چاہا اس میں شامل کر دیا کہ جو کچھ کل لکھا اسے آج مٹا دیا اور جو کچھ آج لکھا اسے کل مٹا دیا، اور ۳۸۴ء میں پاپ ''داماسیوس'' نے حکم دیا کہ عہد قدیم وعہد جدید کا جدید لاتینی زبان میں ترجمہ کیا جائے اور اسے ہی دنیا بھر کے کلیسوں میں قانونی حیثیت دی جائے، اس دور کا بادشاہ ''نیودوسیس'' مسیحی علماء کے تنازعات سے تنگ آ چکا تھا اور انجیل کے بارے میں ان کے بیانات ومخاصمانہ اظہارات سے سخت نالاں تھا، بالآخر وہ ترجمہ کہ جس کا نام ''فولکان'' رکھا گیا پایۂ تکمیل کو پہنچا اور وہ صرف چار انجیلوں (انجیل متی، انجیل مرقس، انجیل لوقا، انجیل یوحنا) کا ترجمہ تھا۔ اور ان چار انجیلوں کو مرتب کرنے والے نے کہا تھا کہ ''ہم نے انجیلوں کے قدیم یونانی نسخوں کو ایک دوسرے کے سامنے رکھ کر ان کو مرتب کیا ہے، یعنی تحقیق اور چھان بین کے بعد دین مسیحیت سے متصادم ومنافی مطالب کو نکال کر باقی کو اسی حال پر رہنے دیا''، اس کے بعد اسی نئے مرتب شدہ ترجمہ کو ادارہ ''ترید منتینی'' نے ۱۵۴۶ء میں یعنی گیارہ صدیاں گزرنے

کے بعد مورد تائید قرار دیا مگر ۱۵۹۰ء میں سیستوس پنجم نے اسے نادرست قرار دے کر اس کی دوبارہ طباعت کا حکم دے دیا، پھر کلیمنضوس ہشتم نے اسے بھی نادرست قرار دے دیا اور حکم دیا کہ اسے نئے سرے سے طبع کیا جائے چنانچہ اس وقت کیتھولک فرقہ کے پاس وہی موجود ہے، (منقول از تفسیر الجواہر جلد ۲، صفحہ ۱۲۱ طبع دوم)

جو انجیلیں متروک ہوگئی تھیں ان میں سے ایک انجیل برنابا ہے کہ اس کا ایک نسخہ چند سال پہلے دریافت ہوا اور اس کا عربی و فارسی زبانوں میں ترجمہ کر دیا گیا، یہ وہ انجیل ہے جس میں مذکور تمام واقعات ان مطالب سے مطابقت رکھتے ہیں جو قرآن مجید میں حضرت مسیح عیسیٰؑ بن مریمؑ سے متعلق موجود ہیں، وہ انجیل ایطالیائی زبان میں تھی کہ مصری دانشور ڈاکٹر خلیل سعادہ نے اس کا عربی میں اور فاضل دانشور ''سردار کابلی'' نے ایران میں اس کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ وہ تاریخی مواد جسے غیر یہودی دانشوروں نے بھی ذکر کیا ہے اس میں ان مطالب کی تفصیلات نہیں ملتیں جن کی نسبت انجیل نے حضرت مسیحؑ کے دعوتی مشن کی طرف دی مثلاً ان کا خدا کا بیٹا ہونا اور لوگوں کے گناہوں وخطاؤں کے عوض فدیہ ہونا وغیرہ۔

مشہور امریکی مؤرخ ''ہنڈرک ولیم وان لون'' نے تاریخ بشر کے موضوع پر اپنی کتاب میں ایک خط کا تذکرہ کیا ہے جسے رومی طبیب ''اسکولا بیوس کولتلوس'' نے ۶۲ء میں اپنے بھائی ''جلادیوس انسا'' کے نام لکھا کہ جو فلسطین میں تعینات رومی فوج کا سپاہی تھا، اس خط میں اس نے لکھا کہ میں روم میں ایک بیمار کی عیادت کے لئے گیا جس کا نام بولس تھا اور میں اس کی باتوں سے بہت متاثر ہوا، اس نے مجھے دین مسیحیت قبول کرنے کی دعوت دی اور مجھے حضرت مسیحؑ اور ان کے دینی مشن کے بارے میں قدرے آگاہی دلائی، مگر اس کے بعد میرا اور اس کا رابطہ منقطع ہوگیا اور میں نے اسے نہ دیکھا یہاں تک کہ طویل عرصہ تک اس کی تلاش کے بعد میں نے سنا کہ ''اوستی'' میں اسے قتل کر دیا گیا ہے، اب تم چونکہ فلسطین میں ہو لہٰذا براہ کرم اس اسرائیلی نبی کے بارے میں معلوم کرو جس کے متعلق بولس نے مجھے بتایا تھا اور خود بولس کے بارے میں بھی معلومات حاصل کر کے مجھے مطلع کرو۔

''جلادیوس انسا'' نے ڈیڑھ ماہ بعد یورشلم کی فوجی چھاؤنی سے اپنے بھائی حکیم ''اسکولا بیوس کولتلوس'' کو اس کے خط کا جواب بھیجا اور اس میں لکھا کہ میں نے اس شہر کے معمر اور بزرگ افراد سے عیسیٰ مسیح کے بارے میں پوچھا مگر میں نے محسوس کیا کہ وہ اس سلسلہ میں مجھے کچھ بتانا پسند نہیں کرتے (یہ ۶۲ء کی بات ہے اور جن لوگوں سے اس نے پوچھا وہ یقیناً بوڑھے تھے) بالآخر ایک دن ایک زیتون فروش سے ملاقات ہوئی تو میں نے اس سے عیسیٰ مسیح کے بارے میں پوچھا تو اس نے خندہ پیشانی سے پیش آ کر مجھے ایک شخص جس کا نام یوسف ہے کا بتایا اور کہا کہ اس کام کے لئے تم اس کے پاس جاؤ کیونکہ وہ عیسیٰ مسیح کے محبوں و پیروکاروں میں سے ہے اور وہ ان کے حالات وواقعات سے بخوبی آگاہ و مطلع ہے اور وہی تمہیں ان سوالوں کا صحیح و

درست جواب دے سکتا ہے، چنانچہ کئی دنوں کی تلاش وکوشش کے بعد آج مجھے یوسف سے ملنے میں کامیابی ہوئی ہے، وہ نہایت معمر وسن رسیدہ شخص تھا اور وہ کسی زمانہ میں اس علاقہ کے بعض دریاؤں سے مچھلیاں پکڑتا تھا، اگرچہ اب وہ بہت بوڑھا ہو چکا تھا مگر اس کے ہوش وحواس بالکل درست تھے اور اس کی قوت حافظہ پوری طرح کام کرتی تھی چنانچہ اس نے وہ تمام واقعات مجھے سنائے جو اس نے اپنی زندگی میں دیکھے تھے اور ان حالات کے بارے میں بھی بتایا جو ہنگاموں کے عروج میں رونما ہوئے اس نے مجھے بتایا کہ "فونٹیوس فیلاطوس" سامراء کا حاکم تھا اور یہودیہ (فلسطین) میں قیصر روم کے ایک گورنر "ٹی بریوس" کی حکومت تھی، اس کی حکومت کے دنوں میں یورشلم میں فسادات پھوٹ پڑے لہٰذا "فونٹیوس فیلاطوس" ہنگاموں کی بھڑکتی ہوئی آگ کو بجھانے کے لئے وہاں گیا، ہنگاموں وفسادات کی اصل وجہ یہ تھی کہ "ناصرہ" کے رہنے والے ایک شخص نے جس کا نام "ابن نجار" تھا حکومت کے خلاف تحریک شروع کر دی اور لوگوں کو مظاہروں وہنگاموں پر اکسا رہا تھا، لیکن جب اس کے بارے میں تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ جس ابن نجار کو ملزم ٹھہرایا جا رہا ہے وہ ایک عقلمند نوجوان ہے اور اس نے کوئی سیاسی تحریک نہیں چلائی اور نہ ہی کسی قسم کا کوئی سیاسی کام کیا ہے، اور جو کچھ اس کے بارے میں کہا گیا تھا وہ پروپیگنڈہ سے زیادہ کچھ نہ تھا اور یہ تہمت وپروپیگنڈہ یہودی انتہا پسندوں کی کارستانی تھی کیونکہ وہ اس کے سخت دشمن اور اس سے نفرت کرتے تھے اور اسی بناء پر انہوں نے حاکم یعنی فیلاطوس کو غلط اطلاع دی کہ ناصرہ کا یہ نوجوان لوگوں سے کہتا پھرتا ہے کہ جو شخص خواہ وہ یونانی ہو یا رومی یا فلسطینی، اگر عدل وشفقت کے ساتھ لوگوں سے برتاؤ کرے تو خدا کے نزدیک وہ اس شخص کی طرح ہوگا جس نے اپنی زندگی خدا کی کتاب کے مطالعہ اور اس کی آیات کی تلاوت میں گزاری ہو، یہودیوں کے پروپیگنڈے کی قلعی کھل گئی اور فیلاطوس نے ان کے الزامات پر کان نہ دھرے، لیکن جب اس نے سنا کہ لوگ معبد کے گرد جمع ہو گئے ہیں اور ان کا جم غفیر وہاں موجود ہے اور وہ عیسیٰ اور ان کے ساتھیوں کو گرفتار کر کے انہیں موت کے گھاٹ اتارنا اور ان کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا چاہتے ہیں تو اس نے سوچا کہ بہتر ہے اس نجار نوجوان کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دے تاکہ وہ ان ہنگاموں وفسادات میں لوگوں کے ہاتھوں مارا نہ جائے۔

فیلاطوس تمام تر تحقیق کے بعد اس اصل سبب سے پوری طرح آگاہ نہ ہو سکا کہ آخر یہ لوگ عیسیٰ سے اس قدر نالاں کیوں ہیں؟ چنانچہ وہ جب بھی لوگوں سے ان کے بارے میں بات کرتا اور ان سے حقیقت الامر معلوم کرنے کی طرف بڑھتا تو وہ اسے کچھ بتانے کی بجائے شور مچانا شروع کر دیتے اور اونچی اونچی آوازوں کے ساتھ کہنے لگتے: وہ کافر ہے، وہ ملحد ہے، وہ خائن ہے، بالآخر فیلاطوس کی کوشش نتیجہ بخش ثابت نہ ہوئی اور اس نے فیصلہ کیا کہ کیوں نہ ہو خود عیسیٰ ہی سے بات کرے، اس نے عیسیٰ کو بلوایا اور ان سے پوچھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں اور جس دین کی تبلیغ آپ کر رہے ہیں اس سے آپ کا مقصد کیا ہے؟ عیسیٰ نے اسے جواب دیا کہ نہ تو مجھے حکومت چاہیے اور نہ مجھے کسی سیاسی کام سے کوئی غرض ہے، میں صرف روحانی زندگی کی

تبلیغ کرتا ہوں، میں روحانی زندگی کو جسمانی زندگی سے زیادہ اہمیت دیتا ہوں اور میرا نظریہ یہ ہے کہ افرادِ بشر ایک دوسرے کے ساتھ نیکی و نیک سلوک کریں اور ہر شخص اس خدائے واحد و یکتا کی عبادت و پرستش کرے جو مخلوقات کے تمام ارباب حیات و زندہ لوگوں کے باپ کا درجہ رکھتا ہے۔

فیلاطوس ایک تعلیم یافتہ شخص تھا اور راقیسیون اور دیگر فلاسفہ کے نظریات و مسالک سے بخوبی آگاہی رکھتا تھا، اس نے عیسیٰ کی باتیں غور سے سنیں تو اسے ان میں کوئی قابل گرفت بات نہ ملی کہ جس کی بناء پر ان کا مواخذہ کرے، لہٰذا اس نے ایک بار پھر عزم کر لیا کہ اس سچی کھری اور عمدہ و مضبوط باتیں کرنے والے دانا و سلیم الطبع نبی کو یہودیوں کے شر سے نجات دلائے اور اسے قتل کرنے کے فیصلہ پر عملدرآمد کرنے میں حیلہ سازی سے کام لے کر اسے انجام نہ ہونے دے، لیکن یہودی اس پر خاموش نہ ہوئے اور انہوں نے گوارا نہ کیا کہ عیسیٰ کو اسی طرح آزاد چھوڑ دیا جائے بلکہ انہوں نے یہ پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ فیلاطوس بھی عیسیٰ کے دھوکہ و فریب کا شکار ہو گیا ہے اور اس کی من گھڑت باتوں میں آ کر قیصر کے ساتھ خیانت کرنا چاہتا ہے، چنانچہ انہوں نے اس کے خلاف شواہد اکٹھا کرنے شروع کر دیئے اور اجتماعی یادداشتیں مرتب کیں جن میں ان کی طرف سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ قیصر اسے حکومت سے معزول کر دے، اس سے پہلے بھی فلسطین میں ہنگامے اور فسادات پھوٹ چکے تھے اور انقلاب در انقلاب رونما ہو چکے تھے جس کے نتیجہ میں قیصر کے حامیوں و مخلص لوگوں کی تعداد میں خاصی کمی آ گئی تھی اور وہ لوگوں کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے اور ان کی صدائے احتجاج کو دبانے میں ناکام ہو چکا تھا لہٰذا اس نے اپنے گورنروں اور حکومتی کارندوں کو حکم دے دیا تھا کہ لوگوں کے ساتھ ایسا برتاؤ نہ کریں جس سے وہ احتجاج کرنے پر مجبور ہوں اور قیصر کی حمایت چھوڑ دیں۔ اسی وجہ سے فیلاطوس کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار باقی نہ تھا کہ وہ امن عامہ کے پیش نظر لوگوں کے مطالبہ کو پورا کرتے ہوئے اس کے قتل کا ناگوار فیصلہ کرے اور اس پر عمل درآمد کو یقینی بنائے۔ لیکن عیسیٰ ؑ نے اس کے قتل پر کوئی ردِ عمل ظاہر نہ کیا اور کسی طرح سے جزع فزع اور اضطراب کا اظہار نہ کیا بلکہ نہایت صبر و بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے برداشت کیا اور اس کے قتل سے پہلے ہی اس کے قتل میں ملوث افراد کو معاف کر دیا، یہاں تک کہ اس کے سولی پر لٹکائے جانے کا حکم نافذ ہو گیا اور اس نے تختۂ دار پر جان دے دی جبکہ لوگ اس کا مذاق اڑاتے اور اسے برا بھلا کہتے تھے۔

"جلادیوس انسا" نے اپنے خط کے آخر میں لکھا کہ یہ وہ باتیں ہیں جو یوسف نے عیسیٰ مسیح کے بارے میں مجھے بتائیں اور یہ سب کچھ بیان کرتے ہوئے اس کی آنکھیں اشکبار تھیں اور وہ زار و قطار رو رہا تھا، میں نے جاتے ہوئے اسے سونے کے چند سکے دیئے مگر اس نے انہیں قبول نہ کیا اور کہنے لگا کہ یہاں دیگر ایسے افراد موجود ہیں جو مجھ سے زیادہ نادار ہیں، یہ انہیں دے دو۔ پھر میں نے اس سے تیرے پیارے دوست "بولس" کے بارے میں پوچھا لیکن وہ اس کے بارے میں زیادہ کچھ نہ جانتا تھا، اس نے اس کے بارے میں صرف اتنا کہا کہ وہ خیمہ سازی کا کام کرتا تھا پھر اس نے وہ کام چھوڑ کر اس جدید

مذہب کی تبلیغ شروع کردی جو کہ اس مہربان ورحم کرنے والے رب و معبود کا مذہب ہے جس کے اور "یہوہ" (یہودیوں کے معبود) کے مذہب کہ جس کے بارے میں یہودی علماء سے ہم سنتے رہتے ہیں اس قدر فرق ہے جتنا آسمان اور زمین کے درمیان ہے۔

اور جہاں تک بولس کا تعلق ہے تو بظاہر یہ ہے کہ اس نے پہلے وسطی ایشیا کا سفر کیا، پھر یونان چلا گیا اور وہ جہاں بھی گیا وہاں کے غلاموں اور کنیزوں سے کہتا تھا کہ وہ سب باپ کے بیٹے ہیں اور باپ ان سب سے محبت کرتا ہے اور ان پر مہربان ہے اور اس نے لوگوں میں سے کسی خاص گروہ کو سعادتمندی سے نہیں نوازا بلکہ سبھی اس سے بہرہ ور ہوتے ہیں اور تمام افرادِ بشر اس سے استفادہ کر سکتے ہیں خواہ وہ نادار ہوں یا ثروتمند! مگر شرط یہ ہے کہ وہ آپس میں بھائی چارہ کے ساتھ زندگی بسر کریں اور پاکیزگی وسچائی کے ساتھ اپنے سفر حیات کو طے کریں۔

(یہ ہے ان مطالب کا خلاصہ جو امریکی مؤرخ نے اپنی تالیف "تاریخ بشر" میں مذکورہ بالا خط کے حوالہ سے لکھے ہیں۔ اور ہم نے اس کتاب سے صرف انہی مطالب کے ذکر کرنے پر اکتفاء کی ہے جن کا تعلق ہمارے زیر بحث موضوع سے تھا)۔

بہر حال اس خط کے جملوں وفقروں کے متن پر غور کرنے سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ مسیحیت کا مشن حضرت عیسی علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل میں ظہور پذیر ہوا اور اس میں خداوند عالم کی طرف سے ایک نبی کے مبعوث بہ رسالت ہونے کے سوا کچھ نہ تھا، اور اس میں الوہیت کے ادعاء، لاہوت کے ظہور ونزول اور فدیہ کے موضوعات میں سے کوئی بات مذکور نہ تھی۔

پھر حضرت عیسیٰؑ کے چند شاگردوں یا ان سے منسوب افراد مثلاً بولس اور اس کے شاگردوں کے شاگرد حضرت عیسیٰؑ کے سولی پر چڑھنے کے بعد دنیا کے مختلف خطوں مثلاً ہندوستان، افریقہ، روم وغیرہ میں گئے اور مسیحیت کے مشن کو عام کرنے میں کوشاں ہو گئے لیکن کچھ زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ ان مبلغین کے درمیان اصولی اختلافات پیدا ہو گئے اور وہ دین مسیح کی اصل بنیادوں ہی کی بابت آپس میں الجھ گئے مثلاً مسیح کی لاہوتیت، مسیح کی الوہیت، شریعت موسیٰؑ پر عمل کرتے ہوئے مسیحؑ پر ایمان لانے کی کفایت اور یہ کہ آیا دین مسیحؑ اصیل اور دین موسیٰؑ کا ناسخ ہے (اس کی وجہ سے شریعت موسیٰؑ منسوخ ہو گئی) وہ تورات کی شریعت ودستورات کے تابع اور اس کا تکمیل کنندہ ہے ؟ انہی امور کے حوالہ سے ان کے درمیان کئی گروہ اور فرقے وجود میں آگئے، چنانچہ کتاب "اعمال الرسل" اور بولس کے مکتوبات میں ان مطالب کی طرف اشارہ موجود ہے۔

البتہ جو اہم نکتہ قابل توجہ ولائق التفات ہے وہ یہ کہ وہ اقوام کہ جن میں سب سے پہلے دین مسیحیت ظہور پذیر ہوا اور اس کا پیغام پھیلا مثلاً روم وہند وغیرہ، وہ سب اس سے پہلے بت پرست تھے، کچھ صابئی تھے، کچھ برہمنی اور کچھ بودائی تھے، اسی

وجہ سے اس میں کچھ تصوف کے اصول، کچھ برہمنیوں کی فلاسفی اور زیادہ تر یہ عقیدہ ونظر نمایاں تھا کہ لاہوت نے ناسوت کے قالب میں ظہور کیا، اس کے ساتھ ساتھ مسیحیوں کے اعتقادی اصول یعنی تثلیث الواحد......ایک کا تین ہونا......، لاہوت کا ناسوت کے لباس میں نازل ہونا اور خلق اللہ کے گناہوں کے کفارہ کے لئے فدیہ ہو کر سولی پر چڑھنے کو قبول کرنا بھی قدیم ہند، چین، مصر، کلدان، آشور اور فارس وغیرہ میں رہنے والے بت پرستوں میں عام مشہور ورائج تھے، اسی طرح مغرب کے قدیم بت پرستوں مثلاً رومیوں، اسکنڈینیوں وغیرہ کے ہاں بھی یہ نظریات وعقائد عام تھے چنانچہ ادیان ومذاہب قدیم کے بارے میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان بھی ان عقائد کا تذکرہ وحوالہ ملتا ہے، ان میں سے ایک کتاب ''تورات اور اس کے مشابہ دیگر ادیان کے خرافات'' میں اس کے مؤلف ''دوان'' نے لکھا ہے کہ جب ہم اہل ہند کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی سب سے بڑی اور مشہور ترین لاہوتی عبادت، تثلیث ہے اور وہ اسے اپنی زبان میں ''تری مورتی'' کہتے ہیں جو کہ سنسکرتی زبان میں دو لفظوں کا مجموعہ ہے: ''تری'' اور ''مورتی''، تری کا معنی تین اور مورتی کا معنی صورتیں وشکلیں ہے جو کہ تین اقنوم سے عبارت ہے یعنی: ''برہما''، فشنو''، ''سیفا''، اور وہ تین اقنوم ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں کہ جو اپنی اکائی سے جدا نہیں ہوتے اور وہ ان کے عقیدہ وگمان کے مطابق ایک معبود ہے۔ اور ان کے عیقدہ کے مطابق ''برہما'' باپ، ''فشنو'' بیٹا اور ''سیفا'' روح القدس ہے۔ اور وہ ''سیفا'' کو ''کرشنا'' جس سے متولد ہوا، (اسے ہی انگریزی زبان میں ''کرس'' کہا جاتا ہے یعنی مخلص مسیک)۔ بنا برایں ''فشنو'' وہی معبود ہے جو ناسوت کے لباس میں زمین پر ظہور پذیر ہوا تا کہ لوگوں کو نجات بخشے اور وہ ان تین اقانیم میں سے ایک ہے جو درحقیقت خدائے یکتا ہے۔ اور اہل ہند اس تیسرے اقنوم کو کبوتر کی صورت میں رمز قرار دیتے تھے......یا رمز کے طور پر ذبح یا قتل کرتے تھے......جیسا کہ اسی طرح کا عقیدہ مسیحیوں کا ہے۔ (یہ ہے ''دوان'' کے بیان کردہ مطالب، کہ جو اس نے اپنی کتاب میں درج کئے ہیں)۔

یہاں یہ مطلب قابل ذکر ہے کہ سولی پر لٹکانا بہت پرانی رسم وطریقہ ہے اور یہ طریقہ اس شخص کے لئے اختیار کیا جاتا تھا جو بہت بڑے جرم کا مرتکب ہوا ہو اور اس کا فعل نہایت شرمناک ہو، صلیب یعنی سولی پر چڑھنا موت کے گھاٹ اتارنے کی کربناک صورت ہے اور اس کا نام ہی خوفناک ہے، اس کا طریقہ یہ تھا کہ لکڑی کے دو تختوں کو اس طرح آپس میں جوڑتے تھے کہ ان میں سے ایک کا بالائی حصہ دوسرے کے درمیان اس صورت میں پھنس جائے کہ صلیب کی طرح کا ہو جائے اور ایک انسان کو اس پر لٹایا جا سکے، پھر مجرم کو اس پر رکھا جاتا تھا اور اس کے دونوں ہاتھوں کو صلیب کے دونوں جانبوں پھیلا دیا جاتا تھا اور اس کے دونوں پاؤں تختہ دار کے دو عمودی جانب میخوں سے باندھ دیئے جاتے تھے، کبھی باندھنے کی بجائے اس کے دونوں پاؤں کھینچے جاتے تھے، پھر تختے کو اس طرح اوپر کی طرف اٹھایا جاتا تھا کہ مجرم کے پاؤں اور زمین کے درمیان دو ذراع یعنی تقریباً ایک میٹر کا فاصلہ ہو، اسی حالت میں اسے ایک دن یا چند دنوں تک رہنے دیا جاتا تھا پھر پنڈلیوں تک اس کے دونوں

پاؤں کاٹ دیئے جاتے تھے کہ وہ پھانسی پر لٹکا ہوا ہی مرجائے یا پھر اسے تختہ سے نیچے اتار کر اس کا سر قلم کر دیتے تھے، البتہ مجرم کو تختہ دار پر لٹکانے سے پہلے کوڑے مارے جاتے تھے اور اس کا مثلہ کیا جاتا تھا یعنی اس کے ہونٹ، ناک، انگلیاں اور نازک اعضاء کو کاٹا جاتا تھا، سزا کا یہ طریقہ اس قدر وحشت ناک تھا کہ جس قوم کا فرد سولی پر لٹکایا جاتا تھا وہ اس کے لئے نہایت معیوب و باعث شرم سمجھا جاتا تھا۔

مسٹر''فیبر'' نے اپنی کتاب''اصل الوثنیہ'' (بت پرستی کی اصل حقیقت) میں لکھا ہے کہ جس طرح ہم ہندوؤں میں ''تالوث'' کو پاتے ہیں کہ جو''برہما''، '' فشنو'' اور''سیفا'' کا مجموعہ ہے اسی طرح بودائیوں میں بھی''ثالوث'' پایا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی قائل ہیں کہ'' بوذ '' معبود ہے اور اس کے تین اقنوم ہیں۔اسی طرح'' بوذیو ''(جینسٹ) کا عقیدہ ہے کہ ''جیفا'' تین اقانیم کا مجموعہ ہے اور چینی''بوذہ'' کی عبادت کرتے ہیں اور اسے''فو'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور ہندوؤں کی طرح وہ بھی قائل ہیں کہ وہ تین اقانیم کا مجموعہ ہے۔

''دوان'' نے اپنی مذکورہ بالا کتاب میں لکھا ہے کہ مصر کے کلیسائے منفیس کے بزرگ علماء (قسیس) ابتدائی دینی تعلیم حاصل کرنے والوں کو''مقدس ثالوث'' کا اس طرح تعارف کرواتے تھے کہ پہلے نے دوسرے کو خلق کیا، دوسرے نے تیسرے کو خلق کیا اور پھر وہ تینوں ایک ہوگئے، اس طرح مقدس ثالوث وجود میں آیا۔

ایک دن مصر کے بادشاہ''تولیسو'' نے اپنے دور کے مشہور کاہن'' تنیشوکی'' سے پوچھا کہ کیا اس سے پہلے کوئی کاہن گزرا ہے جو اس سے بڑا تھا یا اس کے بعد کوئی کاہن آئے گا جو اس سے بڑا ہوگا ؟ تو اس نے جواب دیا کہ ہاں: ایک ہے جو اس سے بڑا اور عظیم تر ہے اور وہ خدا (اللہ) ہے جو ہر چیز سے پہلے ہے اور اس کے بعد کلمہ ہے اور ان دونوں کے ساتھ روح القدس ہے، اور یہ تینوں ایک ہی طبع وجودی رکھتے ہیں اور ذات میں ایک ہیں، وہی ابدی قوت کا سرچشمہ ہیں، پس اب تو چلا جا اے فانی !اور اے قلیل زندگی والے !

''بونویک'' نے اپنی کتاب''عقائد قدماء المصریین'' میں لکھا ہے کہ مصریوں کے دینی عقائد میں یہ عجیب وغریب بات عام ہے کہ وہ کلمہ کی لاہوتیت کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ ہر چیز اسی کے ذریعے وجود پذیر ہوئی اور خود اس کا وجود خدا سے ہے اور وہی خدا ہے، (اسی عبارت سے انجیل یوحنا کی ابتداء ہوتی ہے)۔

''ھیجن'' نے بھی اپنی کتاب''انگلوساکسن'' میں لکھا ہے کہ اہل فارس''متروس'' کو کلمہ، واسطۂ فیض وجود اور فارس کا نجات دہندہ سمجھتے تھے۔

کتاب''سکان اوربۃ الاولین'' (قدیم یورپ کے باسی) سے منقول ہے کہ قدیم بت پرستوں کا عقیدہ تھا کہ معبود، تین اقانیم والا ہے۔

اسی طرح یونانیوں، رومیوں، فنلا دیوں، اسکیڈ ینیویوں سے بھی مذکورہ بالا تالوث کا عقیدہ منقول ہے، اور کلمہ کا عقیدہ کلدانیوں، آشوریوں اور فینیقیون سے منقول ہے۔

ان مطالب کے ذکر کے ساتھ ساتھ دوان نے اپنی کتاب ''تورات اور اس کے مشابہ دیگر ادیان کے خرافات'' میں صفحہ ۱۸۱ و ۱۸۲ پر لکھا ہے جس کا تلخیصی ترجمہ یہ ہے:

'' خداؤں میں سے ایک خدا کے بارے میں یہ عقیدہ کہ اس نے اپنے آپ کو ذبح کروا کر لوگوں کے گناہوں کا کفارہ وفدیہ بنادیا قدیم ترین ہندو بت پرستوں اور دیگر کا ہے ''۔

اس مطلب کے شواہد ذکر کرتے ہوئے مؤلف نے لکھا ہے کہ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ ''کرشنا'' نوزائیدہ کہ جو فقط وہی ہے کہ نہ جس کی ابتداء ہے اور نہ انتہا، محبت و مہربانی کے طور پر زمین کو اس کے بوجھ سے کہ جسے اس نے اٹھایا ہوا تھا نجات دلانے کے لئے آیا اور اپنے آپ کو قربان کر کے انسان کو نجات بخشی۔

دوان نے لکھا ہے کہ مسٹر مور نے کرشنا کی تختۂ دار پر لٹکی ہوئی تصویر بنائی اور اسے اس تصویر کے عین مطابق بنایا جو ہندوؤں کی کتابوں میں بنی ہوئی ہے یعنی ایک انسان کی شکل ہے جس کے دونوں ہاتھوں اور دونوں پیروں پر کیلیں لگی ہوئی ہیں اور اس کی قمیص پر انسان کے الٹائے ہوئے دل کی تصویر بنی ہوئی ہے۔

اور دوان نے لکھا ہے کہ میں نے کرشنا کی ایک تصویر دیکھی ہے جس میں اسے تختہ دار پر لٹکایا ہوا دکھایا گیا ہے اور اس کے سر پر سونے کا تاج ہے، اور نرصانی قائل ہیں کہ جب حضرت یسوع مسیح کو تختہ دار پر لٹکایا گیا تو ان کے سر پر کانٹوں کا تاج تھا۔

''ہوک'' نے اپنے سفرنامہ کی جلد اول ص ۳۲۶ پر لکھا ہے کہ بت پرست ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ بعض معبودوں نے انسان کی صورت ڈھال لی اور نوع انسانی کی نجات کے لئے اپنے آپ کو اس کے گناہوں کے عوض فدیہ کر دیا۔

موریفور لیمس کی کتاب ''الہنود'' صفحہ ۲۶ کا حوالہ دیتے ہوئے ''ہوک'' نے لکھا ہے کہ بت پرست ہندو اصل خطا کا عقیدہ رکھتے ہیں، چنانچہ اس کا ثبوت ان کی ان دعاؤں و مناجات کے الفاظ سے ملتا ہے جو انہوں نے ''کیاتری'' کے بعد کیں اور ان میں یوں پکارا:

'' اے میرے معبود! میں گناہگار ہوں، میں خطا کار ہوں، غلطی کا مرتکب ہوں، میری طبع وجودی ہی شریر ہے، میری ماں نے مجھے گناہ کے ساتھ جنا ہے، اب تو مجھے نجات عطا کر، اے حمد قوقی آنکھ والے! اے گناہگاروں و خطا کاروں کو ان کے جرائم سے چھٹکارا بخشنے والے! ''

مشہور مسیحی عالم قسیس ''جارج کوکس'' نے اپنی کتاب ''الدیانات القدیمہ'' (قدیم ادیان و مذاہب) میں ہندوؤں

کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہندو اپنے معبود "کرشنا" کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ نہایت شجاع و بہادر اور سراپا لاہوت تھا کیونکہ اس نے اپنے آپ کو قربانی کے لئے پیش کر دیا...... تا کہ گناہگاروں کے گناہوں کا عوض و کفارہ ہو جائے......،

"ہیجین" نے "اندارادا الکروزوبوس" کہ جو نیپال و تبت کا سفر کرنے والا پہلا یورپی باشندہ ہے کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس نے "اندرا" کہ ہندو جس کی پرستش کرتے ہیں کے بارے میں کہا کہ اس نے افرادِ بشر کو ان کے گناہوں سے نجات دلانے کے لئے تختۂ دار پر اپنا خون بہا دیا اور اپنے ہاتھ پاؤں صلیب کی کیلوں کو دے دیئے۔ ہندوؤں کی کتابوں میں اب بھی اس کی تختۂ دار پر لٹکی ہوئی تصویر موجود ہے، اور مشہور راہب "جورجیوس" کی کتاب میں اسی معبود "اندرا" کی تختۂ دار پر لٹکی ہوئی تصویر موجود ہے، اس تصویر میں صلیب کو اس طرح دکھایا گیا ہے کہ دونوں جانب عرض میں برابر اور طول میں مختلف ہے یعنی سولی کا بالائی حصہ اس کے نچلے حصہ سے چھوٹا ہے اور بالائی حصہ میں "اندرا" معبود کی شکل (چہرہ) نمایاں ہے کہ اگر یہ شکل یعنی چہرہ نہ ہوتا تو کسی کو معلوم نہ ہوسکتا کہ تختۂ دار پر لٹکے ہوئے کسی انسان کی تصویر ہے۔

اور جہاں تک بودائیوں کا "بوذا" کے بارے میں عقیدہ کا تعلق ہے تو وہ اس سلسلہ میں دیگر ادیان و مذاہب کی نسبت نصاریٰ کے عقیدہ سے زیادہ مطابقت رکھتے ہیں یہاں تک کہ وہ بوذا کو "مسیح" کا نام دیتے ہیں اور اسے یکتا مولود اور کائنات کا نجات دہندہ سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ کامل انسان اور کامل معبود ہے کہ جو ناسوت کے قالب میں ڈھلا، اور وہ تختۂ دار پر لٹک گیا تا کہ نوعِ بشر کے گناہوں کا کفارہ بنے اور انہیں گناہوں سے پاک کر دے کہ پھر ان پر ان کا مواخذہ نہ ہو سکے بلکہ وہ ملکوت سماوی کے وارث بن جائیں، یہ مطلب مغرب کے اکثر علماء نے بیان کیا ہے مثلاً "ہوک" نے اپنے سفرنامہ میں اور "موالر" نے اپنی کتاب "تاریخ الآداب السنسکریتیہ" (سنسکریتی ادب کی تاریخ) میں اور ان کے علاوہ دیگر متعدد تاریخ نویسوں نے اسے لکھا ہے۔

قارئین کرام! مذکورہ بالا مطالب تفسیر المنار جلد ۶ میں سورۂ نساء کی تفسیر میں مذکور ہیں اور بیشتر دائرۃ المعارف اور کتاب "العقائد الوثنیہ فی الدیانات النصرانیہ" (دین مسیحیت میں بت پرستی کے عقائد) اور دیگر کتب میں بھی موجود ہیں،

یہ ہے لاہوت کے ناسوت کے لباس میں آنے کے عقیدہ کا نمونہ یا چند حقائق کی ایک جھلک! اور یہ ہے حضرت مسیح کے سولی پر چڑھنے اور گناہگاروں کے گناہ کے عوض فدیہ و کفارہ بننے کی ان داستانوں کا خلاصہ و پس منظر جو ان قدیم ادیان میں مذکور ہیں جن پر سابقہ امتوں نے اپنے عقائد کی بنیادیں کھڑی کیں اور ان کو اپنے دینی نظریات کا محور بنایا اور یہ کام اسی دن سے شروع ہو گیا جب دین مسیحیت کے تمام کرۂ ارضی میں پھیلنے کا آغاز ہوا اور مسیحیوں کی تبلیغی سرگرمیاں زور پکڑ گئیں، تو اس سلسلہ کے وسعت پذیر ہونے سے پہلے ہی لوگوں کے دلوں میں ان نظریات نے گھر کر لیا تھا اور مسیحی مبلغین نے دنیا کے گوشہ گوشہ میں ان کو عام کر دیا تھا۔ تو اس سب کچھ کے باوجود کیا اس حوالہ سے کوئی شک و شبہ باقی رہ جاتا ہے کہ مسیحی مبلغین

نے اپنے اصول وفروع کو بت پرستی کے قالب میں ڈھال کر لوگوں کو اپنی طرف راغب ومتوجہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی تا کہ لوگ ان کی دعوت پر آسانی سے لبیک کہیں اوران کی تعلیمات کو صمیم قلب سے قبول کر لیں۔ چنانچہ اس کی تصدیق وتائید بولس اوراس کے علاوہ دیگر حضرات کے ان اظہارات سے ہوتی ہے جن میں انہوں نے فلسفہ اور فلاسفہ کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا اور عقلی طریقہء استدلال کو کلی طور پر نادرست قرار دیا اور کہا کہ رب کردگار بیوقوف کی بیوقوفی کو عقلمند کی عقل پر ترجیح دیتا ہے، اس کے اس طرح کے اظہارات کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان کا تبلیغاتی تعلیمات کا مقابلہ عقلی استدلال کی قوت کے حامل مکاتب فکر سے ہوا کہ جنہوں نے ان کی غیر معقول تعلیمات ور مضحکہ خیز اصولوں کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا اوراس حوالہ سے واضح موقف اختیار کیا کہ استدلال کی صحیح ومعقول بنیاد کے بغیر ان کے دینی معارف ہرگز قابل قبول نہیں، بنابریں مسیحی مبلغین نے اس کے سوا کوئی چارۂ کار باقی نہ دیکھا کہ اپنے تبلیغی مشن کو مکاشفہ اور روح مقدس کی کامل آمیختگی کی بنیاد پر استوار کریں، گویا انہوں نے اس روش واسلوب کو اختیار کیا جسے اہل تصوف کے جاہل افراد اپناتے ہیں جو کہ عقلی طور وطریقہ سے قطعی اجنبی بلکہ اس یک برعکس ہے۔

اس کے علاوہ جیسا کہ کتاب ''اعمال الرسل والتواریخ'' میں ہے کہ مسیحی مبلغین نے رہبانیت اور ترک دنیا کی روش اختیار کرتے ہوئے دنیا کے گونا گوں ملکوں کا سفر کیا اور سیار تبلیغ کی راہ میں چل پڑے، چنانچہ انہوں نے ہر خطہ وعلاقہ میں جا کر دین مسیحیت کی تبلیغ کا بازار گرم کیا اوران کی اس سعیء پیہم اور وسیع کوشش کو دیکھ کر ہر خطہ وعلاقہ کے عوام نے ان کا گرم جوشی سے استقبال کیا، ان کی کامیابی کا دنیا بھر میں بالعموم اور امپراطوریٔ روم میں بالخصوص ایک راز یہ بھی تھا کہ لوگ اپنے معاشرتی عمومی حالات سے فکری وروحانی طور پر سخت پریشان تھے اور حکمرانوں کے ظلم واستبداد اور جبر وجور کی چکی میں پسے ہوئے تھے یہاں تک کہ حکام نے عوم الناس کو اپنی بندگی کے بندھنوں میں جکڑ رکھا تھا اورانہیں غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا تھا جس کے باعث معاشرہ طبقاتی امتیازات کی لپیٹ میں آ چکا تھا کہ حکمران طبقہ اور عوام کے درمیان ایک دوسرے سے بہت دوریاں پیدا ہو چکی تھیں اور دولتمندوں وعیش پرستوں کا طرز زندگی معاشرہ کے نادار ومساکین اور غلاموں کی عمومی زندگی سے ناقابل قیاس حد تک مختلف ہو چکا تھا، اس نہایت شدید طبقاتی امتیازات سے بھرے ہوئے ماحول میں زندگی بسر کرنے والوں نے مسیحی مبلغین کے تبلیغی اظہارات کو اپنے لئے نجات کی نوید سمجھا کیونکہ وہ مبلغین اپنے بیانات میں بھائی چارہ، باہمی محبت و رواداری، انسانی برابری، افرادِ بشر کی ایک دوسرے سے اچھی معاشرت، دنیا کی آلودہ وفانی زندگی کی عیش وعشرت کو چھوڑ کر ملکوت سماوی کی صاف ستھری وسعادتمند زندگی کی طرف توجہ کرنے کی دعوت عام دیتے تھے اسی وجہ سے حکمران طبقہ سلاطین و ملوک اور قیصری تخت وتاج کے رسیا ان مبلغین کی باتوں کو درخور اعتناء نہیں سمجھتے تھے البتہ انہیں اذیت وآزار کا نشانہ بھی نہیں بناتے تھے اور نہ ہی انہیں سیاست کے بازار میں دھکیل کر سیاسی چالوں کا شکار کرتے تھے اور نہ انہیں معاشرے سے نکال باہر

کرتے تھے، اسی کے نتیجہ میں ان کی تعداد روز بروز بڑھتی چلی گئی اور کسی شور وغل وغیرہ کے بغیر ان کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا، ان کی افرادی قوت اور اجتماعی طاقت میں اضافہ ہونے لگا یہاں تک کہ سلطنت روم، افریقہ، ہندوستان اور دیگر ممالک میں ان کے حامیوں ور پیروکاروں کی کثرت وجود میں آ گئی، چنانچہ اپنی روز افزوں تعداد کے ساتھ ساتھ انہوں نے کلیسا بنانے شروع کر دیئے اور ان کے دروازے عوام الناس پر کھول دیئے، اس طرح ہر کلیسا کی تعمیر کے نتیجہ میں ایک بت خانہ بند ہوتا گیا اور اس کے دروازے بزرگان قوم کی طرف سے ان کے عبادت خانوں کے مسمار ہونے کے باعث کسی بھی احتجاج و مزاحمت کو درخور اعتناء نہیں سمجھتے تھے اور نہ سلاطین و حکام وقت کے سامنے ان کے احکام و دستورات کی خلاف ورزی و تمرد کا راستہ اختیار کرتے تھے، ان کی اس روش کے نتیجہ میں بسا اوقات ان کی ہلاکت وقتل اور قید و بند تک نوبت پہنچ جاتی تھی کہ ان کے کچھ افراد کو قتل کر دیا جاتا تھا، کچھ کو جیل میں ڈال دیا جاتا تھا اور کچھ کو شہر بدر و ملک بدر کر دیا جاتا تھا، یہ سلسلہ سلطان قیصر "کنستانتین" کے برسر اقتدار آنے تک جاری رہا، اس نے دین مسیحیت قبول کر لیا اور اپنے مسیحی ہونے کا برملا اظہار و اعلان کر دیا بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ اس نے دین مسیحیت کو اپنی مملکت کا آئینی دین قرار دے دیا چنانچہ روم اور اس کے تابع دیگر ممالک میں کلیسا تعمیر ہوئے، یہ سب چوتھی صدی عیسوی کے نصف آخر میں ہوا۔ ان ایام میں کلیسائے روم نصرانیت کا مرکز قرار دیا گیا کہ وہاں سے مسیحی مبلغین و علماء دنیا کے گوشہ گوشہ کو بھیجے جاتے تھے تاکہ ہر علاقہ و ملک میں کلیساؤں کا جال بچھا دیں، دیر اور مدارس تعمیر کروائیں اور انجیل کی تعلیم دلوائیں۔

اس مقام پر جو اہم بات قابل توجہ ہے وہ یہ کہ ان مبلغین نے اپنی تبلیغ کا محور انجیل کے مسلمہ اصولوں کو قرار دیا مثلاً باپ، بیٹا، روح القدس، سولی پر چڑھایا جانا، فدیہ ہونا اور اس طرح کے دیگر وہ نظریات جو دین مسیحیت کے بنیادی اصول سمجھے جاتے ہیں کہ مبلغین نے ان اصولوں مسلم الثبوت امور قرار دے کر اپنی تمام تبلیغات و تعلیمات کو انہی پر استوار کیا۔ یہی بات ان کے تمام دینی افکار و اعمال کے کمزور و متزلزل بنیادوں پر قائم ہونے کی پہلی کڑی ہے کیونکہ عمارت خواہ جتنی بلند و بالا و مضبوط و مستحکم کیوں نہ ہو لیکن وہ اپنی اس بنیاد کی کمزوری کو دور نہیں کر سکتی جس پر اسے بنایا گیا ہو...... بلکہ اپنی کمزور بنیاد کی وجہ سے ہر لحہ منہدم ہونے کے خطرہ سے دوچار ہوتی ہے...... اور ان مبلغین نے دین مسیحیت کی عمارت عقیدۂ تثلیث، تختہ دار پر چڑھنا اور فدیہ قرار پانا کی بنیاد پر کھڑی کی جو کہ غیر معقول ہے...... عقل اس طرح کے عقیدہ کو درست قرار نہیں دیتی......، چنانچہ اس کے غیر معقول ہونے کا اعتراف متعدد مسیحی محققین نے بھی کیا ہے لیکن یہ کہہ کر اپنے بے بس ہونے کا اظہار کیا کہ یہ ان دینی مسائل میں سے ہے جن کو تعبداً و اطاعۃً قبول کرنا ضروری ہوتا ہے اور یہ بات صرف دین مسیحیت میں نہیں بلکہ دیگر ادیان کی بابت بھی یہی صورتحال ہے کہ ان کے مسائل و مطالب اور اصول عقائد کو عقل محال و ناممکن قرار دیتی ہے جبکہ انہیں تسلیم کرنا ضروری ہوتا ہے۔

ان محققین کی یہ بات بلکہ غلط توجیہ وتاویل دراصل ان کی غلط دینی بنیاد کا نتیجہ ہے کیونکہ کسی محال وناممکن مسئلہ کا دین حق میں تصور کیونکر ممکن ہے؟ ہم تو دین کو عقل کی بنیاد پر برحق تشخیص دے کر تسلیم کرتے ہیں، تو یہ کس طرح قابل تصور ہے کہ کسی برحق عقیدہ کی بنیاد ایسے امر پر قائم ہو جسے عقل باطل ونادرست اور محال وناممکن قرار دے؟ کیا یہ واضح وصریح تناقض نہیں؟ (یعنی حق کو باطل پر استوار کرنا نہیں؟)۔ البتہ یہ بات ممکن ہے کہ دین میں ایسے امور پائے جائیں جو عام طور پر وقوع پذیر نہ ہوتے ہوں جبکہ ممکن الوقوع ہوں اور ان کا وقوع پذیر ہونا دائرہء امکان میں ہو لیکن جہاں تک کسی ایسے مسئلہ کا تعلق ہے جو ذاتاً محال وناممکن ہو تو اس کا دینی حقائق میں سے ہونا ہرگز ممکن وقابل تصور نہیں، چنانچہ یہی طرز بحث باعث ہوا کہ نصرانیت کے ظہور پذیر ہونے اور اس کی تبلیغ کے ابتدائی ایام ہی میں روم واسکندریہ اور دیگر ممالک کے مسیحی دینی مدارس میں زیر تعلیم طلبہ کے درمیان تنازعات کی آگ بھڑک اٹھی اور ان کے اہل تحقیق اور ارباب فکر ونظر اس حوالہ سے شدید اختلافات کا شکار ہو گئے۔ کلیسا کی طرف سے بگڑتی ہوئی صورتحال پر قابو پانے اور شیرازۂ ملت کے مزید بکھرنے کو روکنے کے لئے شدید وسیع اقدامات کئے گئے اور نت نئے عقائد وبدعات کا سد باب کرنے کے لئے ایک مرکزی تحقیقاتی بورڈ قائم کیا گیا جو دینی مبلغین و علماء پر کڑی نظر رکھے اور سب کو ایک ہی جیسے اصول اپنانے کی تلقین وتاکید کرے کہ اگر ان میں سے کوئی اس کی ہدایت پر کان نہ دھرے اور اپنی من مانی وڈھٹائی پر قائم رہے تو اسے دائرۂ دین سے خارج کرنے، ملک بدر کرنے، معاشرتی قطع روابط اور قتل کئے جانے کی سزاؤں میں سے کوئی سزا دے، چنانچہ سب سے پہلا بورڈ جو اس غرض سے تشکیل پایا وہ نیقیہ کا تھا جو "اریوس" کے خلاف بنا کیونکہ اس نے کہا تھا کہ اقنوم بیٹا، اقنوم باپ کے برابر نہیں ہوسکتا اور اللہ ...... یعنی اقنوم باپ ...... قدیم ہے جبکہ مسیح ...... یعنی اقنوم بیٹا ...... مخلوق ہے۔ اس کے ان اظہارات ونظریات کی مذمت وروک تھام کے لئے تین سو تیرہ اسقف ودانشور قسطنطنیہ میں اکٹھے ہوئے اور سب کے سب اس دور کے حاکم "کنسانتین" کے دربار میں آئے اور اپنے عقائد کا اجتماعی طور پر برملا اظہار کرتے ہوئے کہا:

(۱) "ہم خدائے یکتا پر ایمان رکھتے ہیں جو باپ ہے، ہر چیز کا مالک ہے، دیکھی جانے والی اور نہ دیکھی جانے والی تمام چیزوں کا پیدا کرنے والا ہے"،

(۲) "اور ہم یکتا فرزند یسوع مسیح پر ایمان رکھتے ہیں جو خدائے یکتا کا بیٹا ہے، تمام مخلوق سے بے ہمتا ہے، وہ مصنوع نہیں بلکہ برحق معبود ہے جو برحق معبود سے ہے اور اپنے باپ کے جوہر ذات سے ہے کہ جس باپ کے ہاتھوں ہر جہان اور ہر چیز وجود پذیر ہوئی، وہ ہمارے لئے اور ہماری نجات کے لئے آسمان سے اترا اور روح القدس سے مجسم ہوا اور مریم البتول سے متولد ہوا، اسے "فیلاطوس" کے دور میں تختہ دار پر چڑھایا گیا اور پھر دفن کر دیا گیا، پھر وہ تین دن کے بعد قبر سے باہر نکلا اور آسمان کی طرف پرواز کر گیا اور اپنے باپ کے دائیں جانب بیٹھ گیا، وہ مردوں اور زندوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے

لئے دوبارہ زمین پر اترنے کو تیار ہے"۔

(۳) " اور ہم روح القدس پر ایمان رکھتے ہیں جو یکتا ہے کہ جو اس کے باپ سے نکلتی ہے"،

(۴) "اور ہم گناہوں کی بخشش کے لئے معمودیہ واحدہ پر ایمان رکھتے ہیں "(معمودیۂ واحدہ سے مراد باطنی پاکیزگی و تقدس ہے)۔

(۵) "اور ہم جماعت واحدۂ قدسیۂ مسیحیت، جاثلیقیہ پر ایمان رکھتے ہیں"۔

(۶) "اور ہم مرنے کے بعد اپنے ابدان کے دوبارہ اٹھنے اور ہمیشہ باقی رہنے والی زندگی پر ایمان رکھتے ہیں"۔

(ملاحظہ ہو کتاب "الملل والنحل" مؤلفہ شہرستانی)

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مذکورہ بالا عقائد میں انہوں نے مرنے کے بعد اپنے ابدان کے دوبارہ اٹھنے اور ابدی زندگی کا جو ذکر کیا ہے وہ معاد جسمانی کے عقیدہ سے مطابقت دیکھتا ہے جبکہ نصاریٰ، انجیل کی تعلیمات کے مطابق معاد روحانی کے قائل ہیں، میرے خیال میں انجیل، قیامت کے دن جسمانی دنیاوی لذتوں سے بہرہ ور ہونے کو ثابت نہیں کرتی، اور نہ ہی اس میں انسان روح مجرد و خالی از جسم ہونے کا کوئی ثبوت پایا جاتا ہے بلکہ اس میں یہ ثبوت ملتا ہے کہ قیامت کے دن انسان فرشتوں کی طرح کا ہو جائے گا کہ جن کے درمیان ازدواجی تعلق نہیں پایا جاتا، اس سے بالاتر بات یہ ہے کہ کتب عہدین میں تو خداوند عالم اور فرشتوں سب کا قیامت کے دن جسم بن جانا ثابت ہوتا ہے۔

بہر حال یہ ہے اس مرکزی بورڈ کے اجتماع و اجلاس کی کہانی، اس کے بعد دیگر متعدد بورڈ قائم ہوئے جن میں نئے وجود میں آنے والے مسیحی مذاہب و مسالک اور فرقوں سے اظہار برائت کیا گیا مثلاً نسطوریہ، یعقوبیہ، الیانیہ، الیلیاریسیہ، مقدانوسیہ، سبالیوسیہ، نوئتوسیہ، بولسیہ اور دیگر متعدد فرقے !

لیکن ان تمام مسالک کے وجود میں آنے کے باوجود مرکزی کلیسا کی طرف سے اعتقادات پر کڑی نظر رکھنے کا سلسلہ باقی و جاری رہا اور اس حوالہ سے ہرگز بے توجہی نہیں ہوئی بلکہ اس میں وسعت پیدا ہوئی اور روز بروز دین مسیحیت کے مشن کو عام کرنے کا عمل مضبوط ہوتا گیا، یہاں تک کہ ۴۹۶ء یعنی پانچویں صدی عیسوی کے اواخر میں اس کا دائرہ روس کے علاوہ یورپ کے دیگر ممالک تک پھیل گیا، مثلاً فرانس، انگلینڈ، اسٹریا، سپین، پرتگال، بیلجیئم، ہالینڈ وغیرہ، ایک طرف تو دین مسیحیت کے پرچار کا سلسلہ وسیع ہو رہا تھا اور دنیا بھر میں اس کا چرچا عام تھا اور دوسری طرف شمالی اقوام اور صحرا نشین قبائلیوں کی طرف سے سلطنت روم کے خلاف تحریک زور پکڑ گئی اور پے در پے جنگوں اور فسادات سے قیصروں کی حاکمیت کی جڑیں کمزور ہو رہی تھیں، بالآخر معاملہ یہاں تک پہنچا کہ اہل روم اور روم کی فاتح قوموں نے اجتماعی طور پر یہ فیصلہ کیا کہ امور مملکت کی باگ ڈور اسی طرح مرکزی کلیسا کے سپرد کر دی جائے جس طرح دینی امور کا نظام اس کے ہاتھ میں ہے، چنانچہ کلیسا روحانی و

دینی اور جسمانی و دنیاوی سلطنت کا مرکز بن گیا، ان ایام یعنی ۵۹۰ء میں چونکہ کلیسا کا سربراہ پاپ گریگوار تھا لہٰذا امور مملکت کا نظام بھی اسی کے ہاتھ میں آ گیا۔ اور اس طرح کلیسائے روم کو پورے جہان مسیحیت پر مطلق حکمرانی حاصل ہوگئی، لیکن زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ سلطنت روم دو حصوں میں تقسیم ہوگئی، ایک حصہ مغربی روم کی سلطنت کا تھا جس کا دارالخلافہ روم تھا اور دوسرا حصہ مشرقی روم کی سلطنت کا تھا جس کا مرکزی مقام قسطنطنیہ (استنبول) تھا، مشرقی روم کے حکمران اپنے آپ کو اپنی مملکت کے دینی رہنما سمجھتے تھے اور مغربی کلیسائے روم سے ہدایات لینے کے پابند نہیں تھے، اسی سے دین مسیحیت کے پیروکاروں کی مسلکی تقسیم ہوئی اور وہ دو واضح فرقوں میں بٹ گئے: ایک کیتھولک کہلائے جو کلیسائے روم کے تابع ہوئے اور دوسرا فرقہ ارتودوکس کہلائے جو کلیسائے قسطنطنیہ (استنبول) کے پیروکار ہوئے،

یہ صورتحال قسطنطنیہ کے عثمانیوں کے ہاتھوں فتح ہونے تک جاری رہی یہاں تک کہ مشرقی روم کے آخری حکمران ''بالی اولوکوس'' کو جو اس وقت کا سربراہ کلیسا بھی تھا کلیسا ایا صوفیا میں قتل کر دیا گیا۔ قیصر روم کے قتل کے بعد قیصر ہائے روس اس کے دینی منصب کی وراثت کے مدعی ہوگئے، انہوں نے اپنے دعوے پر یہ دلیل دی کہ وہ اس کے سببی رشتہ دار ہیں اور آپس میں سببی رشتہ داریوں کا وسیع سلسلہ ہے، یہ دسویں صدی عیسوی کی بات ہے اور اس وقت روسی، دین مسیحیت اختیار کر چکے تھے، اس طرح روسی سلاطین اپنی سرزمین کے کلیساؤں کے قسیس و سربراہ بھی بن گئے تھے کہ جو کلیسائے روم کے تابع نہ تھے، یہ واقعات ۱۴۵۴ء میں وقوع پذیر ہوئے۔

یہ حالات تقریباً پانچ صدیوں تک جوں کے توں رہے یہاں تک کہ ''تزار نیکولا'' کو قتل کر دیا گیا کہ جو سلطنت روس کا آخری تاجدار تھا، اسے اس کے تمام اہل خانہ سمیت ۱۹۱۸ء میں کمیونسٹوں نے موت کے گھاٹ اتار دیا، اس طرح کلیسائے روم اپنی تقسیم سے پہلے کی حالت کو پلٹ آیا یعنی دوبارہ مغربی و مشرقی روم کے تمام کلیساؤں کا مرکز بن گیا۔ لیکن ایک سنگین بحران سے دوچار ہوا اور وہ یہ کہ جب قرون وسطیٰ میں لوگوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی کی باگ ڈور سربراہ کلیسا کے ہاتھوں میں تھی اور وہ ان کی زندگی کے سفید و سیاہ کا مالک تھا، گویا وہ دور کلیسا کے کمال و عروج کا بلند ترین زمانہ تھا کہ جس میں کلیساؤں کے آقا ہی لوگوں کے ارادوں پر حاکم تھے، تو اس کے نتیجہ میں لوگوں کی زندگی اجیرن بن چکی تھی لہٰذا اس کے ردعمل کے طور پر متدین لوگوں کی کثیر تعداد کلیسا کی حاکمیت کے خلاف سراپا احتجاج بن گئی اور ان پابندیوں سے آزادی کا مطالبہ کر دیا جو کلیسا کے آقاؤں نے ان پر عائد کر رکھی تھیں۔ چنانچہ ان میں کئی لوگوں نے سربراہان کلیسا اور ہر پوپ کی حکم عدولی کے ساتھ ساتھ انجیل کی تعلیمات و دستورات پر عمل کرنے میں صرف اپنے مقامی علماء و کشیشوں کی ہدایات و فتاویٰ کو حرف آخر قرار دے دیا، اس فرقہ کو ''ارندوکس'' کہا جاتا ہے۔

ان کے علاوہ ایک گروہ ایسا سامنے آیا جس نے کلیسائے روم کی پیروی اور پاپائے روم کے کسی بھی حکم کو ماننے سے

انکار کر دیا لہٰذا وہ کلیسائے روم کے بارے میں انجیل کی ہدایات کو تسلیم ہی نہیں کرتے اور نہ ہی اس کے فرامین کو درخور اعتناء سمجھتے ہیں، ان لوگوں کو پروٹسٹنٹ کہتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ دنیائے مسیحیت تین حصوں میں تقسیم ہوگئی اور ان میں تین نمایاں فرقے تشکیل پا گئے :

(۱) کیتھولک : وہ کلیسائے روم اور اس کی تعلیمات کے پیروکار ہیں۔

(۲) ارتودکس : وہ کلیسائے روم کی تعلیمات کی پیروی تو کرتے تھے مگر خود کلیسا کے تابع نہ تھے، یہ فرقہ کلیسا میں تقسیم و فرقہ بندی اور بالخصوص کلیسائے قسطنطنیہ کے ماسکو (روس) منتقل ہونے کے بعد وجود میں آیا۔

(۳) پروٹسٹنٹ : یہ نہ کلیسا اور نہ ہی اس کی تعلیمات کی پیروی کرتے تھے بلکہ انہوں نے اپنا مستقل طریقہ اختیار کر لیا۔ یہ فرقہ گیارہویں صدی عیسوی میں ظہور پذیر ہوا۔

یہ ہے مسیحیت کے بیس صدیوں تک رونما ہونے والے واقعات اور نشیب و فراز کا اجمالی بیان! اور جو حضرات ہماری اس کتاب کی تالیف کے مقصد و مقصود سے آگاہی رکھتے ہیں انہیں بخوبی معلوم ہے کہ ہم نے مسیحیت کے تاریخی پس منظر و پیش منظر کے حوالہ سے جو مطالب ذکر کئے ہیں ان میں درج ذیل تین اہم نکات و اغراض ملحوظ ہیں :

(۱) بحث و تحقیق کرنے والے شخص کو ان کے مذہب کے تاریخی نشیب و فراز سے بخوبی آگاہی حاصل ہو اور اسے معلوم ہو کہ دین مسیحیت میں جو عقائد موجود ہیں وہ کس طرح اور کہاں سے ان میں آئے اور کیونکر وہ نظریات دینی رنگ اختیار کر گئے؟ آیا دینی ورثہ کے طور پر نسل در نسل منتقل ہوتے رہے یا دیگر ادیان کے پیروکاروں سے میل جول کے نتیجہ میں ان میں آ گئے؟ یا بت پرستوں کے عقائد مسیحی علماء کو اس قدر پسند آ گئے کہ انہوں نے وہ سب اپنے دین میں داخل کر دیئے؟ یا یہ کہ مسیحی بزرگوں اور مبلغین نے دوسروں سے الفت کے رشتے قائم کرنے اور استوار و برقرار رکھنے کی غرض سے ان کے عقائد و نظریات کو اپنا لیا؟ یا یہ کہ بت پرستوں کے عقائد ہی کو اپنا لیا اور انہیں اپنے دین کے اصولوں کی حیثیت دے دی؟

(۲) کلیسا بالخصوص کلیسائے روم کا اقتدار تدریجی طور پر وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا اور قرون وسطیٰ میں اپنے انتہائی عروج کو پہنچ گیا، یہاں تک کہ دینی و دنیاوی دونوں اقتدار اسے حاصل ہو گئے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ بادشاہوں کے تقرر و معزولی کا اختیار بھی اسی کے پاس تھا، کلیسا کے آقاؤں کے فیصلہ پر ہی تخت و تاج سلطنت کسی کو ملتا یا اس سے چھنتا تھا، (ملاحظہ ہو کتاب ''الفتوحات الاسلامیہ'') چنانچہ اس حوالہ سے بیان کیا جاتا ہے کہ بابائے روم نے ایک مرتبہ جرمن بادشاہ کو سخت سردی کے موسم میں حکم دیا کہ وہ تین دن تک اپنے محل کے دروازہ پر ننگے پاؤں کھڑا رہے، کیونکہ بادشاہ سے کوئی غلطی سرزد ہوئی تھی جس کی معافی کے لئے بابائے روم نے یہ سزا مقرر کی۔

اسی طرح ایک دفعہ ایک بادشاہ بابائے روم کے پاس اپنے کسی گناہ کو بخشوانے کے لئے آیا تو اس نے بادشاہ کے

تاج کو پاؤں کی ٹھوکر سے نیچے گرا دیا۔

مسیحی علماء اپنے پیروکاروں کو مسلمانوں کے بارے میں اس طرح بتاتے رہتے تھے کہ ان لوگوں کو یقین ہو گیا کہ اسلام بت پرستی کا دین ہے چنانچہ اس کا ثبوت سالہا سال جاری رہنے والی ان صلیبی جنگوں میں مسلمانوں کے خلاف لوگوں کے جذبات برانگیختہ کرنے کی غرض سے دیئے جانے والے بیانات، نعروں و اشعار میں پایا جاتا ہے۔

''ہنری دو کاستری'' نے اپنی کتاب ''دین اسلام'' کی پہلی فصل میں لکھا ہے کہ مسلمان بتوں کی پوجا کرتے ہیں اور تین خداؤں پر ان کا ایمان ہے کہ بالترتیب جن کے نام یہ ہیں:

(۱) ''ماہوم'' کہ جسے ''بافومید'' اور ''ماہومند'' بھی کہا جاتا ہے، یہ ان کا پہلا معبود ہے اور وہی ''محمد'' ہے۔

(۲) ''ابلین''، یہ ''محمد'' کے بعد ان کا دوسرا معبود ہے۔

(۳) ''ترفاجان''، یہ ان کا تیسرا خدا ہے۔

اور مسلمانوں کے بعض بیانات و اظہارات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تین خداؤں کے علاوہ ان کے دیگر دو خدا بھی ہیں کہ ایک کا نام ''مارتوان'' اور دوسرے کا نام ''جوبین'' ہے لیکن ان دو کا مقام و مرتبہ پہلے تین خداؤں کے بعد اور کمتر ہے، اور مسلمان کہتے تھے کہ محمد نے اپنے مشن کی بنیاد یہ رکھی کہ اپنی خدائی کا دعویٰ کیا، اور کبھی کہا کہ محمد نے اپنے لئے ایک طلائی بت بنایا جو خود اسی سے مختص تھا۔

مشہور مسیحی شاعر ''رچرڈ'' نے فرانسیسی فوجیوں کو مسلمانوں کے خلاف برانگیختہ کرنے کی غرض سے جو اشعار کہے ان میں واضح لفظوں میں ان سے کہا:

''قیام کرو اور ماہومند اور ترفاجان کو سرنگوں کر دو اور انہیں نذر آتش کر دو تاکہ تمہیں تمہارے خدا کا تقرب حاصل ہو''

''رولان'' نے اپنے اشعار میں ''ماہوم'' کو مسلمانوں کا خدا قرار دیتے ہوئے کہا:

'' اسے بھرپور سونے اور چاندی سے بنایا گیا کہ اسے دیکھ کر آپ کو یقین ہو جائے گا کہ کوئی بنانے والا اس سے زیادہ خوبصورت بنانے کا سوچ بھی نہیں سکتا چہ جائیکہ ایسا بنا سکے کہ اس کا جسم عظیم، اس کی بناوٹ عمدہ و دلکش اور اس کے سراپا میں جلالت کے آثار نمایاں ہوں، ہاں! ''ماہوم'' سونے اور چاندی سے بنا ہوا ہے اور اس کی چمک دمک آنکھوں کو چندھیا دیتی ہے، اسے ایک ہاتھی پر بٹھایا گیا ہے جو نہایت خوبصورت اور دیدہ زیب و دلربا ہے، یوں تو اس کے اندر کچھ نہیں مگر دیکھنے والا اس کے پیٹ سے ایک روشنی پھوٹتی محسوس کرتا ہے کہ اسے نہایت قیمتی چمکدار پتھروں و ہیروں سے اس طرح سجایا گیا ہے کہ اس کے ظاہر سے اس کا باطن دکھائی دیتا ہے، وہ اپنی بناوٹ و سجاوٹ میں اپنی مثال آپ ہے، اور چونکہ مسلمانوں کے یہ

خدا انہیں سختی وشدت کی حالت میں وحی کرتے تھے لہٰذا بعض جنگوں میں مسلمان فرار ہوئے تو مدمقابل فوج کے سربراہ نے ان کے مکہ میں مقیم خدا (محمدؐ) کو گرفتار کرنے کے لئے اپنے سپاہیوں کو ان کا پیچھا کرنے کا حکم دیا، چنانچہ اس واقعہ کے ایک عینی گواہ کا کہنا ہے کہ مسلمانوں کا خدا (یعنی محمدؐ) مسلمانوں کے پاس آیا تو اس کے پیروکاروں کا جم غفیر اس کے گرد جمع ہوگیا اور وہ سب خوشی میں بینڈ باجے اور ڈھول اور چاندی کے بنے ہوئے نقارے بجاتے ہوئے نغمہ سرا ہوکر رقص کرنے لگے اور اسی طرح اسے خوشیوں ورنگینیوں کے ساتھ لشکر گاہ تک لے آئے، لشکر گاہ میں اس کا خلیفہ اس کی آمد کا انتظار کر رہا تھا، اس کے آتے ہی وہ اس کے سامنے احترام کے انداز میں کھڑا ہوگیا اور پھر نہایت خضوع وخشوع کے ساتھ اس کی عبادت وپرستش کرنے لگا''۔

''رچرڈ'' ہی نے اس معبود ''ماہوم'' کے بارے میں جس کا تذکرہ ابھی آپ نے پڑھا یوں کہا:

'' جادوگروں نے ایک جن کو مسخر کر کے اسے اس بت کے پیٹ میں رکھ دیا چنانچہ وہ جن پہلے اونچی آواز نکالتا ہے، پھر بلائیں لیتا ہے پھر مسلمانوں سے گفتگو کرتا ہے اور مسلمان پوری توجہ کے ساتھ اس کی باتیں سنتے ہیں''۔

بہرحال اس طرح کے بے بنیاد مطالب بلکہ ناروا تہمتیں مسیحیوں کی ان کتب میں جو صلیبی جنگوں کے دور میں لکھی گئیں بلکہ ان جنگوں کے بعد ان کی تاریخ کے حوالہ سے تالیف ہوئیں ان سب میں کثرت سے پائی جاتی ہیں، یہاں تک کہ ان کی اس طرح کی مضحکہ خیز ونامعقول باتیں سن کر ان کتب کا مطالعہ کرنے والا ہر شخص تعجب وحیرت زدہ ہو جاتا ہے اور ایسی کیفیت کا شکار ہو جاتا ہے کہ اس کے لئے ان کی کسی بھی بات کی تصدیق مشکل ہو جاتی ہے کیونکہ وہ مطالب ہی ایسے ہیں کہ کوئی مسلمان ان کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا چہ جائیکہ عالم بیداری میں ان کا مشاہدہ کرے۔

(۳) بحث وتحقیق کرنے والے اہل فکر ونظر اور ارباب فہم وتدبر گذشتہ صدیوں سے آج تک دین مسیحیت میں آنے والے نشیب وفراز اور ترقی کے سفر کے مراحل کی کیفیتوں سے آگاہی حاصل کریں اور اس حقیقت سے آشنا ہوں کہ بت پرستی کے عقائد کو مخفیانہ طور پر اور نہایت ماہرانہ انداز میں دین مسیحیت میں داخل کیا گیا چنانچہ پہلے حضرت مسیحؑ کی بابت غلو کیا گیا اور انہیں حد سے بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا، اس کے بعد تدریجاً تثلیث یعنی تین خداؤں: باپ، بیٹا اور روح القدس کے عقیدہ کو دین کی اصل واساس قرار دے دیا گیا، اور پھر صلیب یعنی سولی پر چڑھنے......اور فدیہ وکفارہ ہونے کا نظریہ شامل کیا گیا، اس کا نتیجہ عمل سے بے نیازی اور اعتقاد ہی کو کافی سمجھنے کی صورت میں ظاہر ہوا، یہ سب کچھ پہلے دین کی شکل میں تھا اور کلیسا کے آقاؤں کے ہاتھوں میں عبادات یعنی نماز وروزہ وغیرہ کی بجاآوری کے احکامات صادر کرنے کی باگ ڈور تھی، اور لوگ انہی کے فرامین ودستورات پر عمل کرتے تھے، لیکن الحاد وبے دینی بڑھتی جا رہی تھی اور اس کا دامن اس قدر وسیع ہوگیا کہ اس کے نتیجہ میں گروہ بندی کا بازار گرم ہوگیا اور پھر نوبت یہاں تک پہنچی کہ پروٹسٹنٹ پیدا ہوئے اور ان کا فتنہ زور پکڑ گیا، چنانچہ دین وشریعت کے احکام ودستورات کہ جن کے نتیجہ میں معاشرہ ہرج ومرج کا شکار ہو چکا تھا اور سیاسی خلفشار وبحران پیدا

ہو گئے تھے ان کی جگہ ان رسمی قوانین نے لے لی جو قانون کے دائرہ سے باہر آزادی کی بنیاد پر بنائے گئے تھے یعنی وہ احکام جو افراد معاشرہ کو قانون کی پاسداری کے علاوہ زندگی کے دیگر امور میں آزادی دلاتے تھے معاشرہ پر حکم فرما ہو گئے، اسی وجہ سے دین مسیحیت روز بروز کمزور ہوتا گیا اور اس کی تعلیمات کی روشنی ماند پڑ گئی کہ جسے بچانے کی ہر کوشش ناکامی سے دوچار ہونے لگی، یہاں تک کہ تدریجی طور پر اخلاق وفضائل انسانی کی بنیادیں متزلزل ہو گئیں اور پدر مادر آزادی نے اشتراکیت کے پھیلاؤ میں اہم کردار ادا کیا، کمیونزم واشتراکیت نے دو بنیادوں پر اپنی جڑیں مضبوط کیں: (۱) دیالکتیک میٹریالیزم (تغیر وتحول کے اصولوں پر مبنی مادہ پرستی) کا فلسفہ، (۲) دینی نظریات یعنی عقیدۂ لاہوت، پاکیزہ اخلاق اور دینی اقدار سے روگردانی، اس کے نتیجہ میں انسانیت کی معنوی وروحانی عظمتیں پامال ہو گئیں اور ان کی جگہ درندگی ووحشی گری کے مجموعہ مرکب مادی حیوانی طرز عمل نے لے لی، کہ پھر دیکھتے ہی دیکھتے پوری دنیا اس پر ٹوٹ پڑی اور اس کی گرویدہ بن گئی۔

اس اثناء میں وہ دینی تحریکیں جو پوری دنیا پر چھا چکی تھیں وہ اپنے منطقی انجام کو پہنچیں کیونکہ وہ سیاسی چالوں کے سوا کچھ نہیں کہ جو سیاستدانوں کی سیاست بازی کی مختلف شکلیں ہیں اور وہ ان کے ذریعے اپنے مخصوص مقاصد ومفادات کو تحفظ دینے کے درپے ہوتے ہیں، تو حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دور کی سیاست ایک فن ہے کہ جس کا فنکار اپنے مقصد کے حصول کے لئے ہر دروازہ پر دستک دیتا ہے اور ہر پناہ گاہ کا رخ کرتا ہے۔

ڈاکٹر جوزف شیٹلر نے کہ جو شکاگو کے لوتران کالج میں دینی علوم کا پروفیسر ہے، کہتا ہے کہ امریکہ میں جو نئی دینی تحریک سامنے آئی ہے اس کا ہدف اس کے سوا کچھ نہیں کہ جدید تمدن میں زندگی کے امور کو دین سے ہم آہنگ کیا جائے اور یہ بات لوگوں کو باور کرائی جائے کہ جدید تمدن کا دین سے کوئی تضاد وتصادم نہیں کیونکہ اگر یہ ہدف حاصل نہ ہو تو اس بات کا خطرہ باقی رہے گا کہ عوام الناس جدید تمدن سے حاصلہ نتائج کی بناء پر اپنے آپ کو دین حق کے صحیح پیروکار سمجھنے لگیں اور پھر حقیقی دینی تحریک۔ اگر کبھی ان کے درمیان ظہور پذیر ہو..... تو اپنے آپ کو اس سے بے نیاز سمجھتے ہوئے اسے درخور اعتناء قرار نہ دیں، (ملاحظہ ہو امریکی رسالہ ''لائف'' شمارہ ۶ فروری ۱۹۵۶ء)

امریکہ میں روسی کلیسائے اورتودوکس کے سب سے بڑے حامی ڈاکٹر جارج فلورفسکی کا کہنا ہے کہ امریکہ میں جو دینی تعلیمات سامنے آئی ہیں وہ دلوں کو جھوٹی تسلیاں دینے کے سوا کچھ نہیں کیونکہ اگر وہ حقیقی معنی میں حیات بخش دینی تعلیمات ہوتیں تو ضروری تھا کہ حقیقی وعمیق بنیادوں پر استوار ہوتیں، (مذکورہ بالا امریکی رسالہ ''لائف'' سے اقتباس)

قارئین کرام! آپ خود توجہ فرمائیں کہ دینی کارواں کہاں سے چلا اور کہاں پر رک گیا، ابتداء میں احیائے دین (عقیدہ) واخلاق (پاکیزہ عادات) اور شریعت (اعمال) کے نام پر جلوہ گر ہوا اور بالآخر ان تمام امور سے روگردانی اور ان کی جگہ حیوانی لذتوں سے لطف اندوز ہونے پر اختتام پذیر ہو گیا، اس تمام تر تبدیلی کا اصل سبب صرف اور صرف بولس کہ جسے

"قدیس" کہا جاتا تھا کے فکری انحراف کا عروج تھا۔اور اسے "حضرت مسیح کا حواری وقوت بازو" بھی کہا جاتا تھا، بہتر یہ ہے کہ مسیحی حضرات اس جدید تمدن کو کہ جس کے بارے میں دنیا اعتراف کرتی ہے کہ اس نے عالم انسانیت کو تباہی کے کنارے پر لا کھڑا کیا ہے بولسی تمدن سے موسوم کریں کیونکہ بولس ہی اس نام کا زیادہ حقدار ہے نہ کہ حضرت مسیحؑ کہ جسے مسیحی حضرات جدید تہذیب وتمدن کا قائد اور پرچم دار قرار دیتے ہیں! (یہ منصب حضرت مسیحؑ کو دینے کی بجائے بولس کو دیں تو زیادہ بہتر ہے کیونکہ یہ سب کچھ اسی کا کیا دھرا ہے)۔

روایات پر ایک نظر

تفسیر قمیؒ کی ایک روایت

تفسیر قمیؒ میں آیۂ مبارکہ "مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ" کی تفسیر میں یوں مذکور ہے:

"ان عیسیٰ لم یقل للناس انی خلقتکم فکونوا عباداً لی من دون اللّٰہ، ولکن قال لھم کونوا ربانیین ای علماء"

حضرت عیسیٰؑ نے لوگوں سے یہ نہیں کہا کہ میں نے تمہیں پیدا کیا ہے لہٰذا تم خدا کی بجائے میری پرستش کرو، بلکہ انہوں نے لوگوں سے کہا: تم رب والے بنو یعنی علماء بنو۔ (تفسیر قمیؒ جلد ۱ ص ۱۰۶)

ہمارے سابقہ بیانات میں مذکورہ بالا روایت کی صحت کے قرائن موجود ہیں، اس روایت میں امام علیہ السلام کا ارشاد گرامی کہ "حضرت عیسیٰؑ نے لوگوں سے یہ نہیں کہا کہ میں نے تمہیں پیدا کیا" دراصل اس طرح کی بات نہ کرنے کا حوالہ دے کر احتجاج کے برابر ہے کیونکہ اگر انہوں نے کہا ہوتا کہ میری پرستش کرو تو ضروری تھا کہ اس سے پہلے انہیں مطلع وآگاہ کرتے کہ اس نے انہیں پیدا کیا ہے، جبکہ انہوں نے ان سے نہ تو اس طرح کی بات کی اور نہ ہی ایسا کام کیا...... انہیں اپنے خالق ہونے کی بابت کوئی خبر دی اور نہ ہی انہیں خلق کیا کہ جس کی بناء پر ان سے اپنی پرستش کا کہتے......

تفسیر قمیؒ ہی میں آیۂ مبارکہ "وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا......" کی تفسیر میں مذکور ہے کہ امامؑ نے اس کی بابت ارشاد فرمایا:

" کان قوم یعبدون الملائکۃ، وقوم من النصاریٰ زعموا ان عیسیٰ رب، والیھود قالوا: عزیر ابن اللّٰہ، فقال اللّٰہ: ولایآمرکم ان تتخذوا الملائکۃ والنبیین ارباباً "

(چونکہ ایک قوم فرشتوں کی عبادت کرتی تھی اور قوم نصاریٰ کا عقیدہ تھا کہ عیسیٰؑ رب ہیں، یہودی معتقد تھے کہ عزیر خدا کا بیٹا ہے، تو خداوند عالم نے ارشاد فرمایا کہ وہ (عیسیٰ) تمہیں فرشتوں اور نبیوں کو رب بنانے کا حکم نہیں دیتا)۔

(ملاحظہ ہو: تفسیر قمی، جلداول صفحہ ۱۰۶)

اس موضوع کی بابت گذشتہ مباحث میں گوناگوں حوالوں سے تفصیلی تذکرہ ہو چکا ہے۔

اہل نجران کی پیغمبر اسلامؐ سے گفتگو

تفسیر "درمنثور" میں ہے کہ ابن اسحاق، ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم اور بیہقی نے کتاب الدلائل میں جناب عبداللہ ابن عباس کے حوالہ سے بیان کیا کہ انہوں نے کہا:

قال ابو رافع القرظی حین اجتمعت الاحبار من الیھود والنصاریٰ من اھل نجران عند رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلم، و دعاھم الی الاسلام: اتریدیا محمد ان نعبدک کما تعبد النصاریٰ عیسی بن مریم؟ فقال رجل من اھل نجران نصرانی، یقال لہ الرئیس: او ذاک ترید منا یا محمد؟ فقال رسول اللّٰہؐ: معاذ اللّٰہ ان نعبد غیر اللّٰہ او نأمر بعبادۃ غیرہ ما بذٰلک بعثنی ولا بذٰلک امرنی، فانزل اللّٰہ من قولھما: "ماکان لبشر ان یؤتیہ اللّٰہ الکتاب -- الی -- بعد اذ انتم مسلمون "--

(ابو رافع قرظی ___ یہودی الاصل کہ جو بعد میں مشرف بہ اسلام ہوا ___ نے بیان کیا ہے کہ جو نجران کے یہودی و عیسائی علماء حضرت پیغمبر اسلامؐ کی خدمت میں آئے اور آنحضرتؐ نے انہیں اسلام کی دعوت دی انہوں نے کہا: اے محمدؐ! کیا تو چاہتا ہے کہ ہم اسی طرح تیری عبادت کریں جس طرح نصاریٰ عیسیٰ بن مریم کی پرستش کرتے ہیں؟ وہاں موجود ایک نصرانی نے جسے "رئیس" کہا جاتا تھا آنحضرتؐ سے پوچھا: کیا واقعی تو ہمیں ایسا ہی کہتا ہے؟ اس وقت حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ارشاد فرمایا: خدا کی پناہ! کہ ہم خدا کے علاوہ کسی کی عبادت کریں یا اس کے علاوہ کسی کی عبادت کا حکم دیں، نہ تو خدا نے مجھے اس کام کے لئے بھیجا اور نہ ہی مجھے اس کا حکم دیا، تب یہ آیہ مبارکہ نازل ہوئی: "کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ خدا تو اسے کتاب وحکومت ونبوت عطا کرے پھر وہ لوگوں سے کہتا پھرے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میری عبادت کرو......تا آخر آیہ ۸۰ یعنی

"بعد اذ انتم مسلمون" بعد اس کے تم مسلمان ہو)۔ (تفسیر" درمنثور" جلد ۲ صفحہ ۴۶)

غیر خدا کو سجدہ کرنے کی ممانعت

تفسیر" درمنثور" ہی میں ہے کہ عبد بن حمید نے حسن سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا:

" بلغنی ان رجلاً قال: یا رسول اللّٰہ! نسلم علیک کما یسلم بعضنا علیٰ بعض افلا نسجدلک ؟ قال(ص): لا، ولکن اکرموا نبیکم، واعرفوا الحق لاھلہٖ فانہٗ لا ینبغی ان یسجد لاحد من دون اللّٰہ، فانزل اللّٰہ: "ماکان لبشران یؤتیہ اللّٰہ الکتاب......الخ

(مجھے معلوم ہوا ہے کہ ایک شخص حضرت پیغمبر اسلامؐ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور عرض کی : اے اللہ کے رسول! ہم تو آپ کو اسی طرح سلام کرتے ہیں جس طرح ہم ایک دوسرے کو سلام کرتے ہیں، کیا بہتر نہیں کہ ہم آپ کو سجدہ کریں؟ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا: نہیں، بلکہ تم اپنے نبی کا احترام واکرام کرو اور حق کو اس کے اہل کے لئے جانو (جو جس کا حق ہے وہی اسے دو)، کیونکہ خدا کے علاوہ کسی کے لئے سجدہ ریز ہونا روا نہیں، اسی وقت یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی: "کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ جب خدا اسے کتاب وحکومت ونبوت عطا کرے تو وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کو چھوڑ کر میری پرستش کرو...)۔ (تفسیر" درمنثور" جلد ۲ صفحہ ۴۷)

اس آیہ مبارکہ کے شان نزول کی بابت مذکورہ بالا دو واقعات کے علاوہ دیگر واقعات بھی بیان کئے گئے ہیں، البتہ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ یہ راویوں کے طرز تفکر کا نتیجہ ہے اور ہر ایک کے زاویہ نظر کی بات ہے، اس سلسلہ میں ہم پہلے تفصیلی تذکرہ کر چکے ہیں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک آیت کے نزول کے متعدد اسباب ہوں، ...... ایک آیت کا ایک سے زیادہ واقعات کے حوالہ سے نازل ہونا ممکن ہے......، واللہ اعلم ......خدا بہتر آگاہ ہے......،

آیات ۸۱ تا ۸۵

○ وَ اِذۡ اَخَذَ اللّٰهُ مِيۡثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَاۤ اٰتَيۡتُكُمۡ مِّنۡ كِتٰبٍ وَّحِكۡمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمۡ لَتُؤۡمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنۡصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقۡرَرۡتُمۡ وَاَخَذۡتُمۡ عَلٰى ذٰلِكُمۡ اِصۡرِىۡ ؕ قَالُوۡۤا اَقۡرَرۡنَا ؕ قَالَ فَاشۡهَدُوۡا وَاَنَا مَعَكُمۡ مِّنَ الشّٰهِدِيۡنَ ۝٨١

○ فَمَنۡ تَوَلّٰى بَعۡدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۤئِكَ هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ۝٨٢

○ اَفَغَيۡرَ دِيۡنِ اللّٰهِ يَبۡغُوۡنَ وَلَهٗۤ اَسۡلَمَ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ طَوۡعًا وَّكَرۡهًا وَّاِلَيۡهِ يُرۡجَعُوۡنَ ۝٨٣

○ قُلۡ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنۡزِلَ عَلَيۡنَا وَمَاۤ اُنۡزِلَ عَلٰٓى اِبۡرٰهِيۡمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ وَيَعۡقُوۡبَ وَالۡاَسۡبَاطِ وَمَاۤ اُوۡتِىَ مُوۡسٰى وَعِيۡسٰى وَالنَّبِيُّوۡنَ مِنۡ رَّبِّهِمۡ ۖ لَا نُفَرِّقُ بَيۡنَ اَحَدٍ مِّنۡهُمۡ ۖ وَنَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ ۝٨٤

○ وَمَنۡ يَّبۡتَغِ غَيۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِيۡنًا فَلَنۡ يُّقۡبَلَ مِنۡهُ ۚ وَهُوَ فِى الۡاٰخِرَةِ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ۝٨٥

ترجمہ

○ " اس وقت کو یاد کرو جب اللہ نے نبیوں سے عہدو پیمان لیا کہ جب میں تمہیں کتاب وحکمت دوں اور پھر تمہارے پاس وہ رسول آئے جو اس کی تصدیق کرتا ہو جو تمہارے پاس ہے (دین وشریعت)، تو تم پر لازم ہے کہ اس پر ایمان لاؤ اور اس کی مدد کرو، خدا نے پوچھا: کیا تم نے اقرار کرلیا ہے اور اس پر میرے ساتھ عہد کرتے ہو؟ انہوں نے عرض کی: ہمیں اقرار ہے، خدا نے کہا: تو تم گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں"

(۸۱)

○ " تو جو شخص اس کے بعد بھی روگردانی کرے تو ایسے لوگ ہی فاسق (ونافرمان) ہیں"

(۸۲)

○ " کیا وہ دین الٰہی کے علاوہ کسی دین کو چاہتے ہیں حالانکہ آسمانوں اور زمین کے تمام باسیوں نے طوعاً و کرہاً، خدا ہی کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا ہے اور اسی کی طرف انہیں لوٹایا جائے گا "

(۸۳)

○ " کہہ دیجئے کہ ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں، اور جو کچھ ہم پر نازل کیا گیا اس پر ایمان لائے ہیں اور جو کچھ ابراہیم و اسماعیل و اسحاق و یعقوب و اسباط (ان کی نسل) پر نازل کیا گیا اور جو کچھ موسیٰ و عیسیٰ اور نبیوں کو ان کے پروردگار کی طرف سے عطا کیا گیا اس پر ایمان لائے ہیں، ہم ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے اور ہم خدا ہی کے حضور سر تسلیم خم کرنے والے ہیں"

(۸۴)

○ "جو شخص اسلام کے علاوہ کوئی دین تلاش کرے...... پسند کرے...... تو اس سے وہ دین قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان پانے والوں میں سے ہوگا "

(۸۵)

تفسیر و بیان

یہ آیات مبارکہ اپنی ماقبل آیات سے ارتباط سے خالی نہیں کیونکہ ان سب کا سیاق ایک ہے اور تمام آیات میں وہی ایک سیاق جاری و ساری ہے،...... گویا یہ آیات سابقہ آیات کا تتمہ ہے......، اور وہ اس طرح سے کہ جب خداوند عالم نے اہل کتاب کے بارے میں بیان کر دیا کہ وہ ہمیشہ اپنے پاس موجود علم الکتاب سے منہ موڑتے رہے، کلمات خداوندی میں تحریف کر کے انہیں جا بجا کرتے رہے، لوگوں کو دین کے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا کرتے رہے، انبیاء الٰہی کے درمیان فرق کے قائل ہوئے، حضرت پیغمبر اسلام ؐ کی نبوت کا انکار کرتے رہے، اور اس بات کی نفی کر دی کہ موسیٰ ؑ و عیسیٰ ؑ جیسے انبیاء میں سے کوئی نبی لوگوں سے یہ کہے کہ اسے یا دیگر نبیوں اور فرشتوں کو رب بناؤ، جیسا کہ نصاریٰ کے صریح لفظوں میں اور یہودیوں کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے، (یہ سب کچھ بیان کرنے کے بعد) خداوند عالم نے ان لوگوں کی شدید مذمت کی اور نہایت شدید لہجہ میں فرمایا کہ ایسا کیونکر ممکن ہے جبکہ خدا نے نبیوں سے عہد لے لیا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے آئے ہوئے ہر نبی پر ایمان لائیں اور اس کی نصرت کریں خواہ وہ ان سے پہلے آیا ہو یا ان کے بعد آئے، اور وہ اس طرح کہ ہر نبی اپنے ماقبل نبی کی تصدیق کرے اور اپنے بعد آنے والے نبی کی خوشخبری دے، جس طرح حضرت عیسیٰ ؑ نے حضرت موسیٰ ؑ کی نبوت اور ان کی شریعت کی تصدیق کی اور حضرت محمد مصطفیٰ ؐ کی تشریف آوری کی بشارت و خوشخبری دی، اسی طرح خداوند عالم نے انبیاء سے وعدہ لیا کہ اپنی اپنی امتوں سے بھی ایسا کرنے کا عہد و پیمان لیں اور انہیں اس پر گواہ بنائیں، خداوند عالم نے واضح طور پر بیان کر دیا کہ یہی وہ اسلام ہے جو آسمانوں اور زمین میں تمام رہنے والوں کا دین و آئین ہے۔

اس کے بعد خداوند عالم نے حضرت پیغمبر اسلام ؐ کو حکم دیا کہ وہ بھی اس عہد و پیمان پر عمل کریں اور صمیم قلب سے اسے قبول کرتے ہوئے اسے عملی جامہ پہنائیں کہ اللہ پر ایمان لائیں اور انبیاء الٰہی کے درمیان کوئی فرق کئے بغیر ان پر جو کچھ نازل کیا گیا اس پر ایمان لائیں اور خدا کے حضور سر تسلیم خم کر دیں...... اس کی مطلق اطاعت کا دم بھریں۔ اور یہ سب کچھ خود بھی کریں اور اپنی امت کو بھی ایسا کرنے کا حکم دیں، یہ ہے آنحضرت ؐ سے میثاق و عہد لینے کا معنیٰ، کہ آنحضرت ؐ سے بلاواسطہ لیا گیا اور آپ ؐ کی امت سے آپ ؐ کے ذریعے لیا گیا، مزید تفصیل عنقریب بیان ہوگی۔

انبیاءؑ سے عہد و پیمان

○ "وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ"

(اور اس وقت کو یاد کرو جب اللہ نے نبیوں سے وعدہ لے لیا کہ جب میں تمہیں کتاب وحکمت دے دوں، پھر تمہارے پاس وہ رسول آئے جو اس سب کچھ کی تصدیق کرنے والا ہو جو تمہارے پاس ہے تو تم ضرور اس پر ایمان لانا اور ضرور اس کی مدد کرنا)

یہ آیت مبارکہ ایک عہد و پیمان سے آگاہی دلا رہی ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ اس سے کون سا عہد و پیمان مراد ہے؟ آیا وہ عہد و پیمان مراد ہے جو خداوند عالم نے لوگوں سے نبیوں کے بارے میں لیا ؟ یا وہ عہد و پیمان مراد ہے جو خود نبیوں سے لیا ؟ دونوں کے بارے میں آیات مبارکہ سے شواہد ملتے ہیں، چنانچہ جملہ " ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ" سے ثابت ہوتا ہے کہ لوگوں سے انبیاء کے لئے لیا جانے والا عہد و پیمان مراد ہے، جیسا کہ جملہ "ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ" اور جملہ " قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ......" سے خود انبیاء سے لئے جانے والے عہد و پیمان کا ثبوت ملتا ہے، تو در حقیقت وہی عہد و پیمان ہے جو انبیاءؑ کے لئے لیا گیا اور خود انہی سے لیا گیا اگرچہ دوسروں سے ان کے ذریعے لیا گیا۔

بنا برایں یہ بات درست ہے کہ آیت مبارکہ میں "مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ" میں 'مِيْثَاقَ' سے یا تو وہ میثاق مراد ہے جو انبیاء سے لیا گیا یا وہ میثاق ہے جو ان کے لئے لیا گیا، تاہم وہ حقیقت میں ایک ہی میثاق ہے، اور "النَّبِيّٖنَ" سے وہ انبیاء مراد ہو سکتے ہیں جن کے لئے عہد لیا گیا اور وہ انبیاء بھی مراد ہو سکتے ہیں جن سے عہد لیا گیا لیکن آیت مبارکہ "مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ......" دو آیتوں کے آخر تک، کا سیاق اور زیر نظر آیہ مبارکہ (وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ) سے اس کے ربط کے تناظر میں اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ "النَّبِيّٖنَ" سے مراد وہی انبیاء مراد ہیں جن سے عہد لیا گیا، کیونکہ وحدت سیاق سے ثابت ہوتا ہے کہ انبیاء الٰہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتاب وحکمت و نبوت ملنے کے بعد لوگوں کو شرک کی دعوت نہیں دے سکتے، اور یہ ممکن بھی کیونکر ہے حالانکہ ان سے تو یہ عہد لیا گیا ہے کہ وہ ان تمام نبیوں پر ایمان لائیں گے اور ان کی مدد کریں گے جو لوگوں کو توحید وخدا کی وحدانیت کی دعوت دیتے ہیں؟ اس بناء پر موضوع کی مناسبت و موزونیت اسی میں ہے کہ ابتدائے سخن میں انبیاء سے لئے جانے والے میثاق کا حوالہ دیا جائے۔

ایک ادبی حوالہ !

آیت میں جملہ " لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ " میں دوطرح کی قرائتیں ہیں، ایک مشہور قرأت ہے جس کی رو سے " لَمَآ " میں لام پر زبر ہے اور دوسری قرأت حمزہ کی ہے جس میں " لِمَآ " کے لام کے نیچے زیر ہے کہ اس میں لام کو بغرض تعلیل اور حرف "ما" کو موصولہ قرار دیا گیا ہے، البتہ ان دو قرأتوں میں سے پہلی قرأت کو ترجیح دی جاتی ہے کہ جس کی بناء پر لام پر زبر اور "ما" مخففہ یعنی بغیر شدہ کے پڑھا جائے گا تو اس میں ما موصولہ ہوگا اور جملہ "اٰتَيْتُكُمْ" ......کہ جسے "اتینکم" بھی پڑھا گیا ہے......اس کا صلہ ہوگا اور اس میں صلہ سے موصول کی طرف پلٹنے والی ضمیر محذوف سمجھی جائے گی کیونکہ جملہ "مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ" سے اس ضمیر کا ثبوت ملتا ہے، تو یہاں موصول مبتدا اور جملہ "لتؤمنن به" اس کی خبر قرار پائے گا لہٰذا "لـمـا" کا لام ابتدائیہ اور "لتـؤمـنـن" کا لام، لام القسم ہوگا، اور پورا جملہ "لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ......الـخ" اس میثاق کا بیان ہے جو لیا گیا، تو آیت مبارکہ کا معنی یہ ہوگا کہ "اس وقت کو خاطر میں لاؤ جب خدا نے نبیوں سے عہد لیا جو کہ یہ تھا کہ میں نے تمہیں کتاب وحکمت سے جو کچھ عطا کیا ہے تو پھر جب وہ رسول آ جائے جو اس کتاب و حکمت کی تصدیق کرنے والا ہو تو تم نے یقیناً اس پر ایمان لانا ہے اور اس کی مدد کرنی ہے۔

یہاں پر یہ بھی ممکن ہے کہ "لَمَآ" میں ما حرف شرط ہو اور جملہ "لتؤمنن به" اس کی جزا ہو، اس بناء پر آیت کا معنی یہ ہوگا کہ " یاد کرو اس وقت کو جب خدا نے نبیوں سے عہد لیا کہ اگر میں تمہیں کتاب وحکمت دوں اور پھر ایک رسول تمہارے پاس آئے جو اس کتاب وحکمت کی تصدیق کرنے والا ہو تو تم ضرور اس پر ایمان لانا اور اس کی نصرت کرنا"، یہ بات قرین قیاس بھی ہے کیونکہ اہل ادب کے ہاں جملہ شرطیہ کی جزا میں اس لام القسم کا آنا کہ جس کی قسم جزاء میں ذکر نہ کی گئی عام شہرت رکھتا ہے، ("لَتُؤْمِنُنَّ" اور "لتنصرن" میں لام، لام القسم ہے) تو اس طرح آیت کا معنی سلیس وآسان تر اور روشن وواضح تر ہے، اس کے ساتھ ساتھ میثاق وعہد کے موارد میں شرط کا ذکر بھی معمول کی بات ہے۔

بہر حال "لِمَآ" میں لام کے نیچے زیر ہو تو لام کو حرف تعلیل اور ما موصولہ ہوگا، لیکن ترجیح اسی میں ہے کہ لام کو مفتوح یعنی زبر کے ساتھ پڑھا جائے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ جملہ "اٰتَيْتُكُمْ" اور جملہ "جَآءَكُمْ" میں "كُمْ" کا مخاطب کون ہے؟

ابتدائے نظر میں تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان میں انبیاء مخاطب ہیں لیکن اس کے بعد والا جملہ "ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ" اس بات کا قرینہ ہے کہ یہاں انبیاء اور ان کی امتیں دونوں ہی مخاطب ہیں یعنی خطاب تو انبیاء سے مختص ہے یعنی انہیں ہی مخاطب کیا گیا ہے لیکن اس میں جو حکم مذکور ہے وہ انبیاء اور ان کی امتوں دونوں کے لئے ہے، لہٰذا امتوں پر بھی

اس رسول پر ایمان لانا اور اس کی مدد کرنا اسی طرح واجب وضروری ہے جس طرح خود انبیاء پر واجب و لازم ہے۔

آیت مبارکہ میں ایک اور حوالہ بھی قابل توجہ ہے اور وہ یہ کہ جملہ "ثُمَّ جَآءَکُمۡ رَسُوۡلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَکُمۡ" میں حرف "ثُمَّ" (پھر) زمانی تاخر کو ثابت کرتا ہے (مستقبل)۔ یعنی سابق نبی پر لازم ہے کہ لاحق نبی پر ایمان لائے اور اس کی نصرت و مدد کرے۔ البتہ جملہ "کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰہِ......" سے بظاہر یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایمان لانے اور نصرت کرنے کے عہد و پیمان سے سابق و لاحق تمام انبیاء سے لیا جانے والا عہد و پیمان ہے یعنی لاحق پر واجب ہے کہ سابق پر اور سابق پر واجب ہے کہ لاحق پر ایمان لائے اور اس کی نصرت و مدد کرے۔

بہرحال اس طرح کا استفادۂ کلامی، قرائن ہی سے ممکن ہے ورنہ آیت کے الفاظ اس پر دلالت نہیں کرتے، اس سلسلہ میں مزید مطالب عنقریب بیان کئے جائیں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ،

ادبی حوالہ سے ایک اہم نکتہ کا التفات

ادبی حوالہ سے جملہ "لَتُؤۡمِنُنَّ بِہٖ وَلَتَنۡصُرُنَّہٗ" میں ضمیر "ہ" کی بازگشت اگرچہ بظاہر "رَسُوۡلٌ مُّصَدِّقٌ" کی طرف ہو سکتی ہے کیونکہ کسی نبی کا کسی دوسرے نبی پر ایمان لانا بلا مانع ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں جیسا کہ اس کا ثبوت سورۂ بقرہ کی آیت ۲۸۵ میں موجود ہے جس میں ارشاد الٰہی ہے: "اٰمَنَ الرَّسُوۡلُ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡہِ مِنۡ رَّبِّہٖ وَالۡمُؤۡمِنُوۡنَ ؕ کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ......" (رسول ایمان لایا اس پر جو کچھ اس کی طرف اس کے رب کی طرف سے نازل کیا گیا اور مومنین ایمان لائے، ہر ایک ایمان لایا اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر......) لیکن جملہ "قُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡنَا وَمَاۤ اُنۡزِلَ اِلٰۤی اِبۡرٰہٖمَ......الخ" سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ "لَتُؤۡمِنُنَّ بِہٖ" کی ضمیر کی بازگشت "لَمَاۤ اٰتَیۡتُکُمۡ مِّنۡ کِتٰبٍ وَّ حِکۡمَۃٍ" کی طرف ہے اور "لَتَنۡصُرُنَّہٗ" کی ضمیر کی بازگشت "رسول" کی طرف ہے، اس بناء پر آیت کا معنی یہ ہوگا کہ میں نے تمہیں جو کتاب و حکمت عطا کی ہے اس پر ضرور ایمان لانا اور اس رسول کی نصرت ضرور کرنا جو تمہارے پاس تمہاری کتاب و حکمت کی تصدیق کرنے والا بن کر آئے۔

عہدِ الٰہی کا اقرار و پختگی

○ "قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰی ذٰلِكُمْ اِصْرِیْ ۚ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا"

(خدا نے پوچھا: کیا تم نے اقرار کرلیا اور اس پر میرے ساتھ پختہ عہد کرلیا ہے؟ انہوں نے عرض کی: ہاں ہم نے اقرار کرلیا)

یہاں استفہام یعنی خداوند عالم کا ان سے اقرار کے بارے میں پوچھنا مطلب کی پختگی کی غرض سے تھا اور "اقرار" کا معنی معروف ہے، "اصر" کا معنی عہد و پیمان ہے اور یہاں "اَخَذْتُمْ" کا مفعول بہ واقع ہوا ہے، اور اخذ العہد میں آخذ یعنی عہد لینے والے کے علاوہ ماٴخوذ منہ یعنی جس سے عہد لیا گیا ہو، ضروری ہوتا ہے اور وہ آیت مبارکہ میں انبیاءؑ کی امتوں کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا، لہٰذا آیت کا معنی یہ ہوگا کہ کیا تم نے اس عہد و پیمان کا اقرار کرلیا ہے؟ اور کیا تم نے میری عہد پر اپنی امتوں سے وفا کرنے کا وعدہ لے لیا ہے؟ انبیاء نے کہا: ہاں، ہم اپنے اقرار پر ہیں۔

اخذ العہد کے بارے میں بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ انبیاءؑ نے اسے اپنے لئے قبول کرلیا، تو اس بناء پر جملہ "وَاَخَذْتُمْ عَلٰی ذٰلِكُمْ" جملہ "ءَاَقْرَرْتُمْ" کا عطف بیان ہے، کیونکہ انبیاءؑ نے جواب میں "اخذنا" کی بجائے "اَقْرَرْنَا" کہا، لہٰذا میثاق سے مراد انبیاءؑ سے لیا جانے والا عہد و میثاق ہے کہ جس میں ان کے علاوہ کوئی دوسرا شامل نہیں۔

لیکن جملہ "قَالَ فَاشْهَدُوْا" اس قول کی صحت کو مخدوش کر دیتا ہے کیونکہ گواہی ہمیشہ کسی دوسرے کے بارے میں ہوتی ہے نہ کہ خود اپنے بارے میں یا اپنے خلاف! اسی طرح جملہ "قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ......" (کہہ دو کہ ہم ایمان لائے) بھی اس قول کی بابت "فَاشْهَدُوْا" جیسا کردار ادا کرتا ہے کیونکہ اگر ان کے علاوہ کوئی دوسرا اس میں شامل نہ ہوتا تو یوں کہا جاتا: "قل 'امنت......" (کہہ دو کہ میں ایمان لایا) تو صاف ظاہر ہے کہ "امنا" آنحضرتؐ اور آپؐ کی امت دونوں کی طرف سے اظہار ایمان ہے۔ لیکن یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ان دو جملوں: "فَاشْهَدُوْا" اور "قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ" سے امتوں کا انبیاءؑ کے ساتھ اشتراک عمل ثابت ہوتا ہے، البتہ جملہ "وَاَخَذْتُمْ" سے اس سلسلہ میں کسی مطلب کا ثبوت نہیں ملتا۔

گواہی کا اظہار

○ " قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ "
(اس نے کہا تم گواہی دو اور میں تمہارے ساتھ گواہی دینے والوں میں سے ہوں)

بظاہر شہادت و گواہی ...... جیسا کہ سابق الذکر مطالب میں بیان ہو چکا ہے...... کسی دوسرے کے بارے میں (اس حق میں یا اس کے خلاف) ہوتی ہے، تو اس آیت میں جس شہادت و گواہی کا ذکر ہے اس سے انبیاء اور ان کی امتوں دونوں کی گواہی مراد ہے چنانچہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہی بات جملہ "قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ" سے ثابت ہوتی ہے اور آیت کا سیاق بھی اسی کی تصدیق کرتا ہے کیونکہ ان آیات میں اہل کتاب کو پیغمبر اسلام کی دعوتِ حق پر لبیک نہ کہنے پر اسی طرح مورد مذمت قرار دیا گیا ہے جس طرح حضرت عیسیٰ و حضرت موسیٰ علیہما السلام کی طرف ناروا نسبتیں دینے کی بناء پر ان کی مذمت کی گئی چنانچہ آیت مبارکہ " اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ " اور دیگر آیات سے ان کی مذمت کا ثبوت ملتا ہے۔

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ جملہ "فَاشْهَدُوْا" سے بعض انبیاء کی دوسرے بعض انبیاء کے بارے میں گواہی دینا مراد ہے،

اسی طرح ایک قول یہ بھی ہے کہ "فَاشْهَدُوْا" کا مخاطب انبیاء نہیں بلکہ ملائکہ ہیں۔

اگرچہ یہ دو احتمال قرین قیاس قرار دیے جا سکتے ہیں لیکن آیت کے الفاظ سے ان میں سے کسی کا اشارہ و ثبوت نہیں ملتا کیونکہ اس حوالہ سے کلام میں کوئی قرینہ نہیں پایا جاتا بلکہ جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا اور آگاہ ہو چکے ہیں کہ کلام میں اس کے برعکس اور اس کی نفی کا قرینہ پایا جاتا ہے۔

ایک لطیف نکتہ

اس آیۂ مبارکہ میں ایک لطیف نکتہ یہ ہے کہ جملہ "وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ (تا) ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ" کو سورۂ بقرہ کی آیت ۲۱۳ " كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً " کی تفسیر میں ذکر کیے گئے مطالب کے تناظر میں دیکھا جائے تو نبوت و رسالت کے درمیان پائے جانے والے فرق سے آگاہی حاصل ہوتی ہے اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ

رسول، نبی سے اخص ہوتا ہے یعنی سلسلۂ ہدایت کی ان دو کڑیوں کا رتبہ میں فرق یہ ہے کہ ہر نبی، رسول نہیں ہوتا مگر ہر رسول، نبی ہوتا ہے،......اور رسالت کا درجہ نبوت سے بالاتر ہے......لہٰذا آیت مبارکہ کے الفاظ اس حقیقت پر دلالت کرتے ہیں کہ جو عہد و میثاق انبیاء سے لیا گیا وہ دراصل مقام نبوت سے مقام رسالت کے لئے لیا گیا تھا لیکن اس کا الٹ نہیں یعنی مقامِ رسالت سے مقامِ نبوت کے لئے کوئی عہد نہیں لیا گیا۔

اس لطیف نکتہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے زیر بحث آیۂ مبارکہ کی تفسیر میں بعض مفسرین کے ان ذکر کردہ مطالب پر بحث و تمحیص کی راہ کھل جاتی ہے جن میں انہوں نے کہا کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ تمام انبیاء سے تمام انبیاء کے لئے میثاق لیا گیا کہ وہ ایک دوسرے کی تصدیق کریں یعنی ہر نبی دوسرے نبی کی نبوت کو تسلیم کرے اور اس پر ایمان لانے کا حکم دے، گویا آیۂ مبارکہ اس مطلب کو بیان کرتی ہے کہ دین ایک ہے اور تمام انبیاءؑ اسی کی دعوت دیتے ہیں،......اس پر بحث و مباحثہ کا امکان کسی وضاحت کا محتاج نہیں......،

آیت کے معنی کا خلاصہ یہ ہے کہ خداوند عالم نے تمام انبیاءؑ اور ان کی امتوں سے یہ عہد و پیمان لیا کہ اگر اللہ انہیں کتاب و حکمت عطا کرے اور ان کے پاس وہ رسول آئے جو ان کے پاس موجود خدا کی عطا کردہ......کتاب و حکمت......کی تصدیق کرنے والا ہو تو وہ خدا کی دی ہوئی کتاب و حکمت پر ضرور ایمان لائیں اور اس رسول کی نصرت و مدد کریں تو یہی کام انبیاءؑ کی طرف سے ایک دوسرے کی تصدیق کرنے کا نام ہے یعنی بعد میں آنے والے نبی کی طرف سے اپنے ماقبل اور اپنے ہم عصر نبی کی تصدیق اور پہلے آنے والے نبی کی طرف سے بعد میں آنے والے نبی کی تشریف آوری کی بشارت و خوشخبری ہے اور امت کو اس پر ایمان لانے اور اس کی اطاعت کا تاکیدی فرمان ہے۔ اسی طرح امت کی طرف سے ان انبیاءؑ پر ایمان لانے، ان کی تصدیق کرنے اور ان کی نصرت و مدد کرنے کا معنی بھی یہی ہے، اسی کو دین کا ایک ہونا کہا جاتا ہے......اور اسی سے دین کی وحدت کا ثبوت ملتا ہے......،

اس مقام پر ایک قول یہ بھی ہے کہ جسے بعض مفسرین نے پیش کیا ہے اور وہ یہ کہ آیۂ مبارکہ سے مراد یہ ہے کہ خداوند عالم نے انبیاء سے عہد و پیمان لیا کہ وہ حضرت خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصدیق کریں اور اپنی امتوں کو ان کی بعثت و تشریف آوری کی بشارت و خوشخبری دیں۔

اگرچہ یہ مطلب اصل میں صحیح ہے اور جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں آیات کے سیاق سے تو اس کا ثبوت ملتا ہے البتہ زیر نظر آیۂ مبارکہ کے الفاظ اس پر دلالت نہیں کرتے کیونکہ آیت کے الفاظ میں عمومیت پائی جاتی ہے اور اس میں تمام انبیاء شامل ہیں، بلکہ آیت کا مورد و محل یہ ہے کہ وہ اہل کتاب کے خلاف احتجاج کے مقام میں ہے اور انہیں اپنی کتابوں میں تحریف کرنے، آیاتِ نبوت کا کتمان کرنے......انہیں چھپانے......اور واضح و صریح حق سے دشمنی و عناد رکھنے پر مورد مذمت قرار

دے رہی ہے۔

میثاق کی تاکید

○ " فَمَنۡ تَوَلّٰى بَعۡدَ ذٰلِكَ "
(جو شخص اس کے باوجود منہ موڑے)

یہ جملہ انبیاء سے لئے گئے مذکورہ عہد و پیمان کی تاکید مزید کرتا ہے، اس کا معنی واضح ہے۔

دین الٰہی کے علاوہ دوسرا دین کیوں؟

○ " اَفَغَيۡرَ دِيۡنِ اللّٰهِ يَبۡغُوۡنَ "
(کیا وہ دین الٰہی کے علاوہ چاہتے ہیں؟)

یہ جملہ انبیاءؑ سے عہد و پیمان لینے کے بیان پر مشتمل آیت کی فرع و نتیجہ کی حیثیت رکھتا ہے، اس بناء پر اس کا معنی یہ ہے کہ اب جبکہ یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ خدا کا دین ایک ہے اور اسی پر تمام انبیاءؑ اور ان کی امتوں سے عہد لیا گیا کہ ہر پہلے آنے والا نبی اپنے بعد آنے والے نبی کی آمد کی بشارت دے اور جو کچھ وہ لائے اس پر ایمان لا کر اس کی تصدیق کرے، تو اس کے بعد یہ اہل کتاب کیا چاہتے ہیں اور آپ کا انکار کیوں کرتے ہیں؟ ان کے ظاہر الحال سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی دوسرے دین کی تلاش میں ہیں، تو کیا وہ اسلام کہ جو توحیدی دین ہے کے علاوہ کسی دین کو پسند کرتے ہیں؟ اور اسی وجہ سے وہ آپ کی تصدیق نہیں کرتے...... آپ پر ایمان نہیں لاتے...... اور نہ ہی وہ دین اسلام کو اختیار کرتے ہیں حالانکہ ان پر دین سے وابستہ رہنا واجب و لازمی ہے کیونکہ وہ فطری دین ہے، اس کی بنیاد فطرت پر استوار ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ اسے ہی دین و آئین زندگی اور دستور حیات قرار دیں اور اسلام کی حقانیت کی دلیل اس حقیقت کو قرار دیں کہ آسمانوں اور زمین میں بسنے والے تمام عقلمند و باشعور افراد نے جس طرح تکوینی و تخلیقی طور پر خدائے واحد کے حضور سر تسلیم خم کر دیا اسی طرح اب تشریعی حوالہ سے بھی اس کو مانیں اور اس کے فرامین و دستورات کو فکری و عملی طور پر تسلیم کریں۔

تمام مخلوق بارگاہِ ربوبیت میں سرنگوں!

○ " وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا "

(اور اسی کے حضور سرِ تسلیم خم کئے ہوئے ہے ہر وہ شخص جو آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے طوعاً و کرہاً)۔

اس آیت مبارکہ میں جس اسلام (سرِ تسلیم خم کرنے) کا ذکر ہوا ہے اس کے مصداقی اطلاق کا دائرہ وسیع ہے، اس میں آسمانوں اور زمین کے بسنے والے کہ جن میں اپنے آپ کو غیر مسلم کہلانے والے اہلِ کتاب بھی ہیں، سب کے سب شامل ہیں، اور "اسلم" فعل ماضی کا صیغہ ہے جس سے گذشتہ زمانہ میں وقوع پذیر ہونے والے امر کا ثبوت ملتا ہے اور یہاں اس سے مراد عالمِ تکوین میں امرِ خداوندی کو تسلیم کرنا ہے، عبودیت و بندگی کے طور پر عملی فرمانبرداری مقصود نہیں، چنانچہ اس کی تصدیق یا ثبوت "طوعاً و کرہاً" کے الفاظ میں موجود ہے۔

بنا بر ایں جملہ "وَلَهٗٓ اَسْلَمَ" (اور اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر لیا ہے) ان موارد میں استعمال ہونے والے جملوں کی طرح ہے جہاں اصل مطلب و مقصود کے بیان کی بجائے اس کی دلیل و سبب کے بیان پر اکتفاء کی جاتی ہے، لہٰذا آیت کی توضیحی عبارت یوں فرض کی جائے گی:

"افغیر الاسلام یبغون؟ وھو دین اللّٰہ لان من فی السمٰوات والارض مسلمون لہٗ منقادون لامرہٖ، فان رضوا بہٖ کان انقیادھم طوعاً من انفسھم، وان کرھوا ماشائہ، وارادوا غیرہٗ کان الامر امرہٗ وجری علیھم کرھاً من غیر طوع"

(کیا وہ اسلام کے علاوہ کوئی دین تلاش کرتے ہیں؟ حالانکہ اسلام خدا کا دین ہے کیونکہ آسمان اور زمین میں موجود ہر شخص اسی کے تابع اور اس کے حکم کا فرماں بردار ہے، لہٰذا اگر وہ اس کے حکم پر راضی ہو جائیں تو ان کی فرماں برداری خود ان کی اختیار کردہ ہوگی، اور اگر خواستۂ خدا کو ناپسند کریں اور اس کے علاوہ کچھ چاہیں تو حکم اسی کا ہوگا البتہ ان پر ان کی ناپسندیدگی اور عدم اطاعت کے ساتھ نافذ ہوگا)۔

اس بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ "طوعاً و کرہاً" میں حرف واو، تقسیم کے لئے ہے، اور "طوع" سے ان کی اس چیز میں رضایت مراد ہے جس میں خدا کو ان کی رضایت مطلوب ہو، اور "کرہ" سے ان کی اس چیز میں عدم رضایت و ناپسندیدگی مراد ہے جو خدا ان کے لئے چاہے مثلاً موت، فقر، بیماری اور اس طرح کی دیگر چیزیں!

سب کی بازگشت اللہ کی طرف!

O " وَّ اِلَیۡهِ یُرۡجَعُوۡنَ "
(اور اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے)

خدا کی طرف سب کی بازگشت ایک ایسا امر ہے جو اسلام کو دین کے طور پر تسلیم کرنے کے واجب و لازمی ہونے کا سبب ہے، کیونکہ اللہ کی طرف ان کی بازگشت ان کے حقیقی آقا و مولا کی طرف بازگشت ہے، نہ کہ اس کی طرف ہے جسے ان کا کفر و شرک لے جاتا ہے۔

دائرۂ ایمان کی وسعت

O " قُلۡ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنۡزِلَ عَلَیۡنَا "
(کہہ دو کہ ہم اللہ پر اور جو کچھ ہم پر نازل کیا گیا اس پر ایمان لائے)

اس جملہ میں خدا نے حضرت پیغمبر اسلام ؐ کو حکم دیا کہ عہد و پیان اور میثاق کے مطابق عمل کرتے ہوئے خود بھی کہیں اور اپنی امت سے بھی کہلوائیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اللہ پر اور اس پر جو ہم پر نازل کیا گیا......،

یہ فرمان الٰہی خود اس حقیقت کی دلیل ہے کہ وہ میثاق، انبیاءؑ اور ان کی امتوں دونوں سے لیا گیا تھا، چنانچہ سطور بالا میں اس مطلب کی طرف اشارہ ہو چکا ہے۔

سابقہ انبیاءؑ پر ایمان

O " وَمَاۤ اُنۡزِلَ عَلٰۤی اِبۡرٰهِیۡمَ وَ اِسۡمٰعِیۡلَ..... الخ"
(اور اس پر ایمان لائے جو نازل کیا گیا ابراہیم و اسماعیل پر......)

اس آیہ مبارکہ میں جن انبیاءؑ کے اسماء گرامی قدر مذکور ہیں وہ آل ابراہیمؑ سے ہیں، یہ آیت اس مطلب کے بیان

سے خالی نہیں کہ "اسباط" سے ذریت یعقوبؑ سے انبیاءؑ یا اسباط بنی اسرائیل مراد ہیں مثلاً حضرت داؤد، حضرت سلیمانؑ حضرت یونسؑ، حضرت ایوبؑ اور دیگر حضرات انبیاء کرامؑ !

تمام انبیاء الٰہی پر ایمان کا ذکر!

○ " وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ...... "
(اور ان کے پروردگار کی طرف سے تمام انبیاء......)

یہ جملہ کلام کا مصداق دائرہ وسیع کرتا ہے تا کہ اس میں حضرت آدمؑ، حضرت نوحؑ اور ان کے علاوہ سب اس میں شامل ہوں، پھر ان تمام انبیاءؑ کو اس جملہ میں یکجا بیان فرمایا : " **لانفرق بین احد منهم و نحن له مسلمون** " (ہم ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے اور ہم تو خدا کے حضور سرِ تسلیم خم کئے ہوئے ہیں)۔

میثاق پر عمل کرنے کا تاکیدی بیان

○ " وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ "
(اور جو شخص اسلام کے علاوہ کوئی دین چاہے تو اس سے قبول نہ کیا جائے گا)

اس آیت میں اس مورد کی نفی کی گئی ہے جس کے بارے میں میثاق نہیں لیا گیا یعنی اسلام کے علاوہ دوسرا دین ! تو یہ بیان میثاق پر لازمی عمل کرنے کی تاکیدی صورت ہے۔

(اللہ تعالیٰ نے اسلام کو حقیقی معنی میں دین کا نام دیا ہے البتہ اس کے علاوہ جو راہ و روش اپنائی جائے اسے دین سے موسوم تو کیا جا سکتا ہے مگر وہ خدائی دین نہیں کہلا سکتا، خدائی دین صرف اسلام ہے جو کہ دین فطرت ہے اور اسی کی تعلیم و تبلیغ تمام انبیاء کرتے رہے اور ان سب میں بنیادی اصول یکساں ہیں ۔م)

روایات پر ایک نظر

انبیاءؑ سے خدائی عہد و پیمان

تفسیر مجمع البیان میں مذکور ہے کہ حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

" ان اللّٰہ اخذ المیثاق علی الانبیاء قبل نبینا ان یخبروا اممھم بمبعثہٖ ، و یبشروھم بہٖ و یأمروھم بتصدیقہٖ "

(خداوند عالم نے ہمارے نبیؐ سے ماقبل انبیاء کرامؑ سے عہد لیا کہ وہ اپنی امتوں کو آنحضرتؐ کی تشریف آوری و بعثت اور صفات و اوصاف سے آگاہ کریں اور انہیں ان کی آمد کی بشارت و خوشخبری دیں اور انہیں ان کی تصدیق کرنے ......ان پر ایمان لانے......کا حکم دیں۔

(مجمع البیان ج ۱ ص ۴۶۸)

ہر نبی سے ایک ہی وعدہ

تفسیر " درمنثور " میں ابن جریر کی بیان کردہ روایت ذکر کی گئی ہے کہ حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالبؑ نے ارشاد فرمایا:

" لم یبعث اللّٰہ نبیاً 'ادم فمن بعدہٗ الا اخذ علیہ العھد فی محمد (ص) لئن بعث وھو حی لیؤمنن بہٖ ولینصرنہٗ ویأمرہٗ فیأخذ العھد علٰی قومہٖ ، ثم تلا: " واذاخذ اللّٰہ میثاق النبیین لما اٰتیتکم من کتاب وحکمۃ...... الخ"

(حضرت آدم علیہ السلام اور ان کے بعد خدا نے جس نبی کو بھی مبعوث فرمایا اس سے حضرت محمدؐ مصطفٰی کی بعثت کے بارے میں عہد و پیمان لیا کہ اگر اس کی زندگی میں آنحضرتؐ مبعوث ہوئے تو ضرور ان پر ایمان لائے اور ان کی مدد کرے، اور اسے حکم دیا کہ وہ اپنی امت سے بھی عہد لے، پھر امامؑ نے یہ آیت تلاوت کی :

" وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ ...الخ "

(تفسیر در منثور ج ۲ ص ۴۷)

میثاق کے انطباقی مورد کا بیان

تفسیر مجمع البیان اور جوامع میں حضرت امام جعفر صادقؑ سے ایک روایت مذکور ہے کہ آپؑ نے زیر نظر آیت مبارکہ کی تفسیر میں ارشاد فرمایا :

" و اذ اخذ اللّٰہ میثاق امم النبیین کل امۃ بتصدیق نبیھا و العمل بما جائھم بہ فما و فوا بہ و ترکوا کثیراً من شرائعھم و حرفوا کثیراً "

(یاد کرو اس وقت کو جب خدا نے انبیاءؑ کی امتوں سے عہد لیا کہ ہر امت اپنے نبی کی تصدیق کرے (اس پر ایمان لائے) اور وہ جو حکم الٰہی لائیں اس پر عمل کرے، لیکن امتوں نے اس عہد کو پورا نہ کیا اور ان کے اکثر فرائین ودستورات کو ترک کر دیا اور کثیر احکام میں ردو بدل کر دی)۔

(تفسیر مجمع البیان ج ۲ ص ۴۵۸)

اس روایت میں آیت مبارکہ کے ایک واضح مصداق کو بیان کیا گیا ہے، لہٰذا اس سے آیت میں انبیاءؑ اور ان کی امتوں دونوں کے مراد ہونے کی نفی نہیں ہوتی۔

اقرار وعہد کی وضاحت

تفسیر مجمع البیان میں مذکور ہے کہ حضرت امیر المومنینؑ نے ارشاد فرمایا: خداوند عالم نے انبیاء علیہم السلام سے پوچھا:

" ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ "

(کیا تم نے اقرار کر لیا ہے اور اس پر پختہ عہد لے لیا)

تو اس سے مراد یہ ہے کہ کیا تم نے اقرار کر کے اس پر اپنی امتوں سے عہد لے لیا ہے (**أ اقررتم و اخذتم العھد بذلک علی اممکم**)؟

قالوا: أ قررنا بما امرتنا بالاقرار به ،

انہوں نے (انبیاءؑ اور ان کی امتوں نے) کہا: ہاں، تو نے ہمیں جس چیز کے اقرار کا حکم دیا ہم نے اس کا اقرار کر لیا ہے۔

" قال اللّٰه: فاشهدوا بذلک علٰی امکم و انا معکم من الشاهدین علیکم و علٰی امکم، "

(خدا نے فرمایا کہ تم اس میں اپنی امتوں کے گواہ رہو ، اور میں تم پر اور تمہاری امتوں پر گواہ ہوں)۔

(تفسیر مجمع البیان جلد ۲ صفحہ ۴۶۸)

گواہی کے معنی کی وضاحت

تفسیر " درمنثور " میں ابن جریر سے روایت مذکور ہے کہ انہوں نے کہا حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالبؑ نے آیت مبارکہ "قَالَ فَاشْهَدُوا" کی تفسیر میں ارشاد فرمایا:

" قال فاشهدوا علٰی امکم بذلک و انا معکم من الشاهدین علیکم و علیهم فمن تولّٰی عنک یا محمد بعد هذا العهد من جمیع الامم فاولٰئک هم الفاسقون، هم العاصون فی الکفر "

(تم اپنی امتوں پر اس کے گواہ رہو اور میں تم پر اور ان پر تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں، تو تمام امتوں میں سے جو شخص اس عہد و پیمان کے بعد تم سے روگرداں ہوا، اے محمدؐ! تو ایسے لوگ ہی فاسق و نافرمان اور کفر کی حالت میں گناہگار ہیں)۔ (" درمنثور "، ج ۲ ص ۴۸)

اس روایت کے معنی کی توجیہ ذکر ہو چکی ہے۔

عالم ذر کے حوالے سے عہد و پیمان کا تذکرہ !

تفسیر قمیؒ میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا:

" قال لهم فی الذر: أ أقررتم واخذتم علٰی ذٰلکم اصری ای عهدی ؟ قالوا اقررنا، قال اللّٰه للملائکة فاشهدوا "

خداوند عالم نے ان سے کہا: کیا تم نے اقرار کرلیا اور اس پر میرے اصر یعنی عہد کو پختہ بنا دیا؟ انہوں نے کہا: ہم نے اقرار کرلیا ہے، تب خداوند عالم نے فرشتوں سے فرمایا: تم گواہ رہو !

(تفسیر قمی، جلد ۲ ص ۱۰۷)

آیت کے الفاظ سے اس روایت کی نفی تو نہیں ہوتی البتہ سابق الذکر مطالب سے بظاہر یہ معنی سمجھا نہیں جاتا۔

اعمال کی گویائی

تفسیر" درمنثور" میں آیت مبارکہ "ومن يبتغ غير الاسلام ديناً فلن يقبل منه " کی تفسیر میں لکھا ہے کہ احمد نے، اور " الاوسط" میں طبرانی نے ابو ہریرہ سے روایت کی ہے کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ارشاد فرمایا:

" تجيئ الاعمال يوم القيامة فتجيئ الصلوٰة فتقول: يا رب ! انا الصلوٰة ، فيقول: انک علیٰ خير، و تجيئ الصدقة فتقول: يارب! انا الصدقة ، فيقول: انک علیٰ خير، ثم يجيئ الصيام فيقول : انا الصيام ، فيقول : انک علی خير ، ثم يجيىء الاعمال ولکل ذلک يقول الله: انک علیٰ خير، بک اليوم آخذ، وبک اعطي، قال الله فی کتابه: ومن يبتغ غير الاسلام دينا فلن يقبل منه وهو فی الآخرة لمن الخاسرين "

قیامت کے دن اعمال آئیں گے...... بارگاہ خداوندی میں پیش ہوں گے......نماز آئے گی اور کہے گی: پروردگارا! میں نماز ہوں، خداوند عالم کہے گا: تو خیر پر ہے، اور صدقہ آئے گا اور کہے گا: پروردگارا ! میں صدقہ ہوں، خداوند عالم کہے گا: تو خیر پر ہے، پھر روزہ آئے گا اور کہے گا: پروردگارا ! میں روزہ ہوں، خدا کہے گا: تو خیر پر ہے، اس کے بعد سب اعمال یکے بعد دیگرے آئیں گے اور خداوند عالم ہر ایک سے کہے گا: تو خیر پر ہے اور آج تو ہی میرے اخذ و عطا کا معیار ہے۔ خداوند عالم نے اپنی کتاب میں ارشاد فرمایا ہے: " جو شخص اسلام کے علاوہ کوئی دین چاہے تو وہ اس سے قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ قیامت کے دن نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا "۔

(تفسیر" درمنثور" ج ۲ ص ۴۸)

کتاب " توحید" صدوق" حدیث ۷، اور کتاب تفسیر العیاشی ج ۱ ص ۱۸۲ حدیث ۷۸ میں حضرت امام جعفر صادق علیہا السلام کا ارشاد گرامی مذکور ہے آپؑ نے اس آیہ مبارکہ کی تفسیر میں فرمایا کہ اسی سے لوگوں کی توحید و یکتا پرستی کا پتہ چلتا ہے،

اس توحید و یکتا پرستی سے مراد یہ ہے کہ خداوند عالم نے جو کچھ اپنے بندوں سے کہا اور طلب کیا اور انہیں حکم دیا اس پر سر تسلیم خم کر کے اسے عملی جامہ پہنایا جائے۔

اگر اس سے ہر شریک کی نفی مقصود ہو تو " طوعاً و کرہاً " سے اختیاری و اضطراری دلالت مراد ہوگی۔

قارئین کرام ! یہاں کچھ دیگر روایات بھی موجود ہیں جو تفسیر العیاشی، تفسیر قمی اور دیگر کتب تفسیر میں ذکر کی گئی ہیں ان میں آیۂ مبارکہ "وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ" کی معنوی تفسیر کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے کہ "لَتُؤْمِنُنَّ بِہٖ " سے مراد یہ ہے کہ تم پیغمبر اسلامؐ پر ایمان لانا، اور "وَ لَتَنْصُرُنَّہٗ" سے مراد یہ ہے کہ تم امیر المومنین علی ابن ابی طالبؑ کی نصرت کرنا، یعنی " لَتُؤْمِنُنَّ بِہٖ" میں "بِہٖ " کی ضمیر کی بازگشت حضرت پیغمبر اسلامؐ کی طرف ہے اور "لَتَنْصُرُنَّہٗ " میں ضمیر " ہٗ " کی بازگشت حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی طرف ہے۔ لیکن آیت کے الفاظ اس پر دلالت نہیں کرتے، البتہ تفسیر العیاشی میں ایک روایت مذکور ہے جس میں سلام بن مستنیر نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد گرامی بیان کیا ہے کہ آپؑ نے فرمایا: انہوں نے اپنے آپ کو اس نام سے موسوم کیا ہے کہ خداوند عالم نے حضرت علی بن ابی طالبؑ کے علاوہ کسی کو اس نام سے موسوم نہیں کیا البتہ ابھی اس کی تاویل سامنے نہیں آئی، سلام بن مستنیر نے کہا کہ میں نے پوچھا: میری جان آپ پر قربان ہو، یہ بتائیے کہ اس کی تاویل کب آئے گی؟ امامؑ نے ارشاد فرمایا کہ اس کی تاویل اس وقت آئے گی جب خداوند عالم انبیاءؑ و مومنین کو آنجنابؑ کے روبرو اکٹھا کرے گا کہ اس کی نصرت کریں، اور یہی معنی ہے اس آیۂ مبارکہ کا:

"وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَآ اٰتَیْتُکُمْ مِّنْ کِتٰبٍ وَّ حِکْمَۃٍ ......تا...... وَ اَنَا مَعَکُمْ مِّنَ الشّٰھِدِیْنَ"

(ملاحظہ ہو : تفسیر العیاشی، ج ۱ ص ۱۸۱)

مذکورہ بالا بیان سے روایت کے مصداقِ معنی کے تعین کی بابت پیدا ہونے والے اشکال کا معاملہ آسان ہو جاتا ہے کیونکہ اشکال اسی صورت میں پیدا ہوگا جب روایات میں آیت کی تفسیر بیان کی گئی ہو لیکن اگر تفسیر کی بجائے تاویل یعنی مصداقِ معنی کے تعین کا حوالہ ہو تو اشکال ختم ہو جائے گا کیونکہ تاویل لفظ کی ملحوظہ معنی پر دلالت کا نام نہیں اور نہ ہی اس کا لفظ سے کوئی تعلق ہوتا ہے چنانچہ اس موضوع کی بابت سورۂ ال عمران آیت ۷ " ھُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ......" کی تفسیر میں مربوطہ مطالب ذکر ہو چکے ہیں۔

آیات ۸۶ تا ۹۱

○ كَيْفَ يَهْدِي اللَّهُ قَوْمًا كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ وَشَهِدُوا أَنَّ الرَّسُولَ حَقٌّ وَجَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿٨٦﴾

○ أُولَٰئِكَ جَزَاؤُهُمْ أَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿٨٧﴾

○ خَالِدِينَ فِيهَا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ ﴿٨٨﴾

○ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ وَأَصْلَحُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٨٩﴾

○ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الضَّالُّونَ ﴿٩٠﴾

○ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْ أَحَدِهِمْ مِلْءُ الْأَرْضِ ذَهَبًا وَلَوِ افْتَدَىٰ بِهِ ۗ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ ﴿٩١﴾

ترجمہ

○ " ان لوگوں کو خدا کس طرح ہدایت کی راہ پر لائے جو ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے اور انہوں نے رسول کے برحق ہونے کی گواہی بھی دی اور ان کے پاس واضح دلائل بھی آ گئے، ہاں، خدا ظالموں کو ہدایت کی نعمت عطا نہیں کرتا (۸۶)

○ " ان لوگوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر خدا، فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے " (۸۷)

○ " وہ ہمیشہ اس کا شکار رہیں گے، ان کی سزا میں کمی نہ کی جائے گی اور نہ ہی انہیں مہلت دی جائے گی " (۸۸)

○ " سوائے ان لوگوں کے کہ جنہوں نے بعد میں توبہ کی ور پھر اپنی اصلاح کر لی، تو خدا معاف کرنے والا، نہایت مہربان ہے" (۸۹)

○ "جو لوگ ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے پھر کفر میں بڑھتے ہی چلے گئے ان کی توبہ ہرگز قبول نہ ہو گی اور وہی حق کی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں " (۹۰)

○ " جو لوگ کافر ہوئے اور مرتے دم تک کافر رہے وہ پوری زمین سونا بھر کر فدیہ بھی دیں تب بھی ان سے قبول نہ کیا جائے گا، انہی کے لئے دردناک عذاب ہو گا اور ان کی کوئی مدد نہ کی جائے گی " (۹۱)

تفسیر و بیان

ان آیات مبارکہ کے بارے میں دو امکانی پہلو موجود ہیں ایک یہ کہ ان کا ربط و تعلق ماقبل آیات شریفہ سے ہے جو کہ اہل کتاب کے بارے میں مطالب پر مشتمل ہیں اور دوسرا یہ کہ ان کا سابقہ آیات سے کوئی ربط و تعلق نہیں بلکہ یہ اپنے موضوع میں مستقل حیثیت رکھتی ہیں، ان دونوں احتمالوں اور ممکنہ پہلوؤں کا حوالہ ایک ظاہر و واضح حقیقت ہے۔

ایمان کے بعد کفر اختیار کرنے والے

○ "كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ"

(خدا کیونکر ان لوگوں کو ہدایت کی نعمت عطا کرے جو ایمان لانے کے بعد دوبارہ کافر ہو گئے)

"كَيْفَ يَهْدِي" کے الفاظ استفہام انکاری کی ایک صورت ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ لوگ ہدایت خداوندی کی نعمت سے بہرہ ور نہیں ہوں گے، یہاں ان کے ہدایت پانے کو بعید قرار دینے سے مراد یہ ہے کہ ممکن ہی نہیں وہ ہدایت یافتہ ہو سکیں، چنانچہ اس کا اشارہ آیت مبارکہ کے اختتامی الفاظ میں موجود ہے جس میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: "وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ" کہ خدا ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا۔ اس طرح کے جملوں کی بابت متعدد بار بیان ہو چکا ہے کہ ان میں مذکورہ وصف سے حکم کی علت و سبب کا پتہ چلتا ہے، تو اس بناء پر یہاں جو وصف مذکور ہے اس کے تناظر میں کہا جا سکتا ہے کہ ان لوگوں میں اس وصف کے ہوتے ہوئے خدا انہیں ہدایت سے ہرگز نہیں نوازے گا۔ البتہ اس سے ان کے توبہ کرنے اور ایمان کی راہ پر واپس آ جانے کی صورت میں خدا کی ہدایت سے بہرہ ور ہونے کے امکان کی نفی نہیں ہوتی، یعنی ایمان کے بعد کفر اختیار کرنے کی صورت میں خدائی نعمت ہدایت سے محرومی اور دوبارہ ایمان لانے اور اپنے کئے پر ندامت کے بعد توبہ کرنے کی صورت میں خدائی نعمت ہدایت سے بہرہ ور ہونے کا حقدار بننے میں منافات نہیں پائی جاتی۔

رسولؐ کے برحق ہونے کی گواہی

○ " وشهدوا ان الرسول حق "
(اور انہوں نے گواہی دی کہ رسول حق ہے)

اگر اس جملہ میں شہادت و گواہی دینے والوں سے مراد اہل کتاب ہوں تو ان کے گواہی دینے سے مراد یہ ہوگا کہ انہوں نے ان آیات نبوت کو حضرت پیغمبر اسلامؐ پر کامل منطبق پایا، یعنی ان آیات کی تطبیق کا مشاہدہ کیا، چنانچہ اس کی تائید بعد والے الفاظ " وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ " سے بھی ہوتی ہے، اور اگر گواہی دینے والوں سے مراد وہ لوگ ہوں جو مسلمان ہونے کے بعد مرتد ہو گئے تو ان کی گواہی سے مراد یہ ہوگا کہ انہوں نے رسالت کا اقرار ظاہری طور پر اور جہالت و ناآگاہی اور جاہلانہ قومی تعصب وغیرہ کی بناء پر نہیں کیا بلکہ حق وحقیقت کے واضح و آشکار ہونے کی بناء پر کیا چنانچہ اس کی تائید بھی اسی بعد والے جملہ "وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ" سے ہوتی ہے۔

بہر حال گواہی دینے والوں سے مراد خواہ اہل کتاب ہوں یا دوسرے لوگ ہوں، دونوں صورتوں میں "وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ" کے الفاظ کا ابتدائے کلام سے انضمام اس بات کی دلیل ہے کہ "کفر میں کفر" سے مراد حق کے ظاہر و آشکار ہونے اور حجت پوری ہونے کے بعد کفر اختیار کرنا اور انکار کر دینا ہے، تو وہ حق سے عناد و دشمنی اور اہل حق سے بے بنیاد الجھنے کی بناء پر ہوگا جو کہ ناحق بغاوت و سرکشی اور ایسا ظلم ہے کہ جس کا مرتکب نجات و فلاح نہیں ہو سکتا۔

ایک ادبی نکتہ

جملہ "وَشَهِدُوْٓا" کے بارے میں بعض اہل ادب کا کہنا ہے کہ وہ " اِيْمَانِهِمْ " پر عطف ہے اور "ایمان" اگرچہ اسم ہے کہ جس کا عطف فعل کی طرف نہیں ہوتا لیکن یہاں اس لئے فعل کی طرف اس کا عطف ہوا ہے کہ اس میں فعل کا معنی پایا جاتا ہے، اس بناء پر آیت کا معنی سمجھنے کے لئے عبارت کو اس طرح فرض کرنا پڑے گا: "**كفروا بعد ان 'امنوا و شهدوا......**" (انہوں نے کفر اختیار کیا بعد اس کے کہ ایمان لائے اور گواہی دی......)

" وَشَهِدُوْٓا " میں حرف واو کے بارے میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ حال کا معنی دیتا ہے اور یہ جملہ حالیہ ہے لہٰذا اس میں حرف "قد" فرض کر کے آیت کا معنی سمجھنے میں آسانی ہوگی، گویا عبارت اس طرح قرار پائے گی: " **كفروا بعد**

ان امنوا وقد شھدوا......"(انہوں نے کفر اختیار کیا بعد اس کے کہ وہ ایمان لائے حالانکہ انہوں نے گواہی دی......)

لعنت کی صورت میں سزا

○ " اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ...... الخ"
(انہی لوگوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ کی لعنت ہے......)

اس جملہ میں ایمان کے بعد کفر اختیار کرنے والوں کی طرف اللہ، فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت کی بازگشت کو بیان کیا گیا تو اس موضوع یعنی لعنت کی بازگشت...... یا ان پر لعنت برسنا...... کے بارے میں سورۂ بقرہ کی آیت ۱۵۹ "اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ" کی تفسیر میں مربوطہ مطالب بیان کئے جا چکے ہیں اور یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ لعنت کرنے والوں (اللہ، فرشتے، تمام افرادِ بشر، تمام لعنت کرنے والی موجودات) کی لعنت سے کیا مراد ہے اور اس کے نازل ہونے کا کیا معنی ہے ؟

سچی توبہ و اصلاح نفس

○ " اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا...... الخ"
(البتہ جو لوگ اس کے بعد توبہ کر لیں اور نیک راہ پر چل پڑیں......الخ)

یہاں سچی توبہ کا ذکر ہے اور آیت سے مراد یہ ہے کہ ان کی توبہ ایسی ہونی چاہیے جو کفر کی گندگی کو ان سے دھو دے اور ان کے باطن کو ایمان کی پاکیزگی عطا کر دے، ان کے دامن پر لگے ہوئے کفر کے داغ دھبے مٹا دے اور ان کے باطن کو پاک کر دے۔ اور جہاں تک اعمال صالحہ کا تعلق ہے (وَاَصْلَحُوْا) تو وہ صمیم قلب سے کی جانے والی توبہ کی فرع اور لازمی آثار میں سے ضرور ہے لیکن ایسا نہیں کہ وہ اس کی بنیاد اور اصل واساس ہے یا اس کے سہارے پر قائم واستوار ہے کیونکہ آیت میں اس طرح کا کوئی اشارہ نہیں ملتا جس سے اعمال صالحہ کے بارے میں اس کا توبہ سے مذکورہ تعلق ثابت ہو۔

اور "اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا" کے بعد "فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ" کے الفاظ

درحقیقت، علت کومعلول کی جگہ پر لانے کی ایک صورت ہے، یعنی خدا کے غفورورحیم ہونے کو اس کے مغفرت کرنے اور رحم فرمانے کی جگہ ذکر کیا گیا ہے، لہٰذا آیت کے فہم المعنی کے لئے عبارت کو اس طرح فرض کیا جائے گا: "فیغفر اللّٰہ لہٗ و یرحمہٗ فان اللّٰہ غفور رحیم " (تو اللہ اسے بخش دے گا اور اس پر رحم کرے گا کیونکہ اللہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے)

ایمان کے بعد کفر میں اضافہ کے مراحل

○ " اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بَعۡدَ اِیۡمَانِہِمۡ ثُمَّ ازۡدَادُوۡا کُفۡرًا......الخ"

(جن لوگوں نے ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کیا پھر وہ کفر میں بڑھتے چلے گئے......الخ)

یہ دو آیتیں (۹۰،۹۱) آیت ۸۶ کے ابتدائی الفاظ " کَیۡفَ یَہۡدِی اللّٰہُ قَوۡمًا کَفَرُوۡا " کی وجہ وسبب کو بیان کرتی ہیں، تو یہ اس طرح سے ہے جیسے کسی قاعدۂ کلیہ کو اس کے ایک خاص فرد پر منطبق کیا جائے، بنابراین آیت کا معنی یوں ہوگا کہ جو شخص حق کے ظاہر ہونے اور حجت کے پورا ہونے کے باوجود کفر اختیار کرے اور پھر سچے دل سے توبہ (توبۂ نصوح) بھی نہ کرے تو وہ درج ذیل دو قسم کے لوگوں میں سے ایک ہوگا:

(۱) وہ کافر، جو کفر اختیار کرتا ہے پھر کفر میں بڑھتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ طغیان وسرکشی کا مرتکب ہو جاتا ہے کہ پھر اس کی صلاح واصلاح کا کوئی راستہ باقی نہیں رہتا، ایسے شخص کو خداوند عالم نہ تو ہدایت کی نعمت عطا کرتا ہے اور نہ ہی اس کی توبہ قبول کرتا ہے لیکن اس کا توبہ کرنا اور حق کی راہ پر واپس آنا حقیقی طور پر نہیں ہوتا، وہ گمراہی کے دلدل میں اس طرح پھنس چکا ہوتا ہے کہ اس کے ہدایت پانے کی توقع وامید ہی ختم ہو جاتی ہے۔

(۲) وہ کافر، جو توبہ کئے بغیر اپنے کفر اور حق سے عناد ودشمنی کے ساتھ ہی مر جاتا ہے، تو ایسے شخص کو اخروی ہدایت حاصل نہیں ہوگی یعنی خداوند عالم اسے صمیم قلب سے اپنے پروردگار کی طرف واپس نہ آنے کی وجہ سے بہشت میں آنے ہی نہ دے گا اور اس وقت نہ کوئی شفاعت کرنے والا اور مددگار ایسا ہوگا جو اس کی شفاعت کرے یا اس کی مدد کرے؟

اس بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ آیت ۹۰ کا آخری جملہ "وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الضَّآلُّوۡنَ" چونکہ جملہ اسمیہ ہے اور اس میں حرف "اُولٰٓئِکَ" ذکر کیا گیا ہے کہ جو دور کے اشارہ کے لئے آتا ہے، اور "ھُمۡ" ضمیر فعل بھی ہے اور جملہ اسمیہ کی خبر یعنی "الضَّآلُّوۡنَ" پر الف ولام لایا گیا ہے لہٰذا ان تمام خصوصیات کے حوالہ سے اس سے ان لوگوں کے گمراہی کی اس آخری حد میں ہونے کا ثبوت پایا جاتا ہے، ان کی ہدایت کی امید ہی نہیں کی جا سکتی۔

اسی طرح جملہ "وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ" سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ انہیں ان لوگوں کی شفاعت کوئی فائدہ نہ پہنچائے گی جو قیامت کے دن مدد کرنے والے ہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قیامت کے دن کچھ ایسے افراد ہوں گے جو شفاعت و مدد کریں گے مگر انہیں یعنی ایمان کے بعد کفر اختیار کر کے کفر میں بڑھتے رہنے والوں کو ان کی شفاعت نفع نہ دے گی چنانچہ آیت مبارکہ میں لفظ "ناصرین" جمع کے صیغہ میں ذکر ہوا ہے جس سے ایسے افراد اور ہستیوں کا قیامت کے دن موجودہ ہونا ثابت ہوتا ہے جو دوسروں کی مدد کریں گے، اس کی مثال سورہء بقرہ کی آیت ۴۸ کے جملہ "فمالنا من شافعین" کی تفسیر میں شفاعت کے موضوع پر ہونے والی بحث و استدلال میں موجود ہے (رجوع کریں)

زیر نظر سلسلۂ بحث کی دوسری آیت (۹۱) قیامت کے دن فدیہ اور مددگاروں کی نفی کے واضح و صریح بیان پر مشتمل ہے کیونکہ وہ دونوں عوض و بدل کی طرح ہیں اور عوض و بدل اسی چیز کا ہوتا ہے جس سے انسان ہاتھ دھو بیٹھے اور اسے کھو دے، تو یہاں وہ لوگ دنیا میں توبہ سے ہاتھ دھو بیٹھے کہ جس کا عوض و بدل آخرت میں کوئی چیز نہیں ہوگی۔

مذکورہ بالا مطالب سے معلوم ہوتا ہے کہ جملہ "وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ" (اور وہ مر گئے جبکہ وہ کافر تھے) اس معنی میں ہے کہ وہ توبہ نہ کر سکے، بنابرایں اس بیان میں جو حصر نمایاں ہے وہ درج ذیل آیت مبارکہ سے مخدوش و بے اثر نہیں ہوتا:

سورۂ نساء، آیت :۱۸

○ " وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰۤى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ۗ اُولٰۤىِٕكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا "

(اور ان لوگوں کی توبہ کی کوئی حیثیت نہیں جو برائیوں پر برائیاں کئے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ ان میں سے کسی کو موت آ جائے تو وہ کہے کہ اب میں توبہ کرتا ہوں، اور نہ ہی وہ لوگ جو مر جاتے ہیں جبکہ وہ کافر ہوتے ہیں، انہی لوگوں کے لئے ہم نے دردناک عذاب مقرر کیا ہے)

اس آیت میں "اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ" (ان میں سے کسی ایک کو موت آ جائے) سے مراد موت کے آثار کا ظاہر ہونا اور دنیا سے سلسلۂ تعلق کا منقطع ہونا ہے کہ پھر اس وقت توبہ کا مقام باقی نہیں رہتا..... گویا کفر کی حالت میں مرنا اور موت کے آثار ظاہر ہونے کے وقت توبہ کرنا دونوں برابر ہیں......

جملہ "مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا" میں لفظ "مِّلْءُ" سے مراد کسی چیز کی وہ مقدار ہے جس سے برتن پورا بھر جائے، یہاں "الْاَرْضِ" یعنی زمین کو برتن تصور کیا گیا ہے کہ جسے سونے سے بھر دیا جائے، لہٰذا یہ جملہ استعارۂ تخیلیہ اور استعارۂ بالکنایہ ہے،...... استعارہ تخیلیہ اس بناء پر ہے کہ سونے سے بھرا ہوا اتنا بڑا برتن صرف عام خیال میں قابل تصور ہے حقیقی وجود میں نہیں ! اور استعارہ بالکنایہ اس حوالہ سے ہے کہ اگر بالفرض ایسا برتن موجود بھی ہو تب بھی وہ کسی کام کا نہیں ہوگا

کیونکہ سونے کی قیمت تو دنیا ہی میں دیکھی جاتی ہے اور اسے قیمتی چیز سمجھا جاتا ہے لیکن آخرت میں ایسی مادی اشیاء کی کوئی قدر و حقیقت نہیں ہوگی، اس طرح آیت مبارکہ میں "مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا" سے دراصل ایک تصوراتی شے کا تذکرہ کر کے سمجھایا گیا ہے کہ خواہ کتنی قیمتی چیز فدیہ وعوض کیوں نہ دی جائے کہ وہ پورے کرۂ ارض کے سونے سے بھرا ہوا ہونے کی صورت میں کیوں نہ ہو لیکن اس کا ہرگز کوئی فائدہ نہ ہوگا......،

روایات پر ایک نظر

حارث بن سوید کا واقعہ

تفسیر "مجمع البیان" میں آیت مبارکہ "كَيْفَ يَهْدِى اللّٰهُ قَوْمًا......" کی تفسیر میں کہا گیا ہے کہ یہ آیت انصار کے ایک شخص حارث بن سوید بن صامت کے بارے میں نازل ہوئی کہ جس نے مجدد بن زیاد البلوی کو بے گناہ قتل کیا اور فرار ہو کر مکہ چلا گیا اور اسلام سے مرتد ہو گیا، وہ مکہ کے مشرکوں کے ساتھ ہو گیا، پھر وہ اپنے کئے پر پشیمان ہوا اور اس نے اپنی قوم کو پیغام بھجوایا کہ وہ حضرت پیغمبر اسلامؐ سے دریافت کریں کہ کیا میرے لئے توبہ کی گنجائش ہے؟ اس کی قوم والوں نے آنحضرتؐ سے پوچھا تو اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی کہ جس میں "اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا" کے الفاظ میں توبہ کی گنجائش موجود ہونے کا تذکرہ تھا، چنانچہ اس کی قوم کا ایک شخص وہ آیت مبارکہ حارث کے پاس لے آیا (مکہ آ کر آیت کے نازل ہونے بتایا) تو حارث نے کہا: میں بخوبی جانتا ہوں کہ تو سچا ہے اور حضرت پیغمبر اسلامؐ تجھ سے زیادہ سچے ہیں اور اللہ تعالیٰ تم سب سے زیادہ سچا ہے، پھر وہ مدینہ منورہ واپس آ گیا اور توبہ کر کے اپنے اسلام کو خوبصورت بنا گیا (صحیح معنی میں مسلمان ہو گیا)، ......اس روایت کو مجاہد اور سدی نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے حوالہ سے بیان کیا ہے۔

(تفسیر "مجمع البیان" جلد ۲ ص ۴۷۱)

"درمنثور" کی ایک روایت

تفسیر "درمنثور" میں ہے کہ ابن اسحاق اور ابن منذر نے جناب عبداللہ بن عباس کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ

حارث بن سوید نے جنگ احد کے دن مجدر بن زیاد اور بنی ضبیعہ کے ایک شخص قیس بن زید کو قتل کر دیا تھا اور فرار کر کے مشرکین قریش کے پاس چلا گیا اور کچھ عرصہ تک ان کے ساتھ مکہ میں رہا، پھر اس نے اپنے بھائی جلاس کو پیغام بھجوایا کہ اس کے لئے توبہ طلب کرے تا کہ وہ اپنی قوم میں واپس آ سکے، تو اس وقت خداوند عالم نے یہ آیت نازل فرمائی: " كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا...... الخ"۔

(تفسیر "درمنثور" ج ۲ ص ۴۹)

یہ واقعہ متعدد اسناد سے بیان کیا گیا ہے اور اس کی بابت روایات مختلف ہیں، ان روایات میں سے ایک روایت عکرمہ سے ہے جس میں کہا گیا ہے کہ یہ آیت ابو عامر راہب، حارث بن سوید بن صامت اور وحوح بن اسلت سمیت ان بارہ افراد کے بارے میں نازل ہوئی جو اسلام سے روگرداں ہو گئے تھے اور قریش کے ساتھ ملحق ہو گئے تھے، پھر انہوں نے اپنے خاندان کو خطوط بھیجے کہ آیا ان کے لئے توبہ کی گنجائش ہے؟ (ان کے خاندان والوں نے آنحضرتؐ سے پوچھا) تو یہ آیات نازل ہوئیں: " اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ...... الخ"۔

یہ روایت بھی تفسیر "درمنثور" ج ۲ ص ۴۹ میں مذکور ہے، انہی روایات میں سے ایک روایت "مجمع البیان" میں آیت مبارکہ " اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا...... الخ" کی تفسیر میں مذکور ہے کہ یہ آیت حارث بن سوید کے گیارہ ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی اور وہ یوں کہ جب حارث واپس آ گیا تو انہوں نے کہا کہ ابھی ہم کفر کی حالت ہی میں مکہ میں قیام پذیر رہتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ہمارے لئے حالات کیا رخ اختیار کرتے ہیں، پھر جب ہم واپسی کا ارادہ کریں گے تو واپس چلے جائیں گے اور جو کچھ حارث پر بنی وہ ہم پر بھی بن جائے گی، جب حضرت پیغمبر اسلامؐ نے مکہ فتح کر لیا تو ان میں سے جو شخص دائرۂ اسلام میں آ گیا اس کی توبہ قبول ہوگئی اور جو اسی طرح کفر کی حالت میں مر گیا تو ایسے لوگوں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی: " اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ...... الخ" ،

مؤلفؒ نے اس روایت کو بعض راویوں کی طرف منسوب کیا ہے۔

تاہم آیت کے شان نزول کی بابت ایک قول یہ ہے کہ وہ اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی،

اور بعض اہل تحقیق نے کہا کہ آیت " اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا...... الخ" خاص طور پر یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی کیونکہ وہ ایمان لائے پھر حضرت عیسیٰؑ کا کفر کیا (انہیں تسلیم کرنے سے انکار کیا) اور پھر اپنے کفر میں اضافہ کرتے ہوئے حضرت پیغمبر اسلام محمد مصطفیٰؐ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا،

بعض مفسرین نے آیت کے شان نزول کے بارے میں دیگر اظہارات بھی کئے ہیں، لیکن ان تمام اقوال و مختلف روایات میں ذکر کی گئی آراء میں غور و فکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب سابقہ مفسرین کے اجتہادی نکتہ ہائے نظر ہیں جیسا

کہ ان میں سے بعض حضرات اس مطلب کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کا اقرار واعتراف بھی کیا ہے، اور جہاں تک حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی طرف منسوب مذکورہ روایت کا تعلق ہے تو وہ مرسلہ ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے، البتہ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی آیت یا متعدد آیات کے شان نزول میں بھی ایک سے زیادہ واقعات ہوں، (واللہ اعلم)

آیات ۹۲ تا ۹۵

○ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۹۲﴾

○ كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَاۗءِيْلُ عَلٰي نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ

التَّوْرٰىةُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْھَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۳﴾

○ فَمَنِ افْتَرٰى عَلَي اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۹۴﴾

○ قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ ۣ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۹۵﴾

ترجمہ

○ " تم ہرگز نیک نہیں بن سکتے جب تک کہ اپنی پسندیدہ چیزوں میں سے خدا کی راہ میں خرچ نہ کرو، اور تم جو کچھ بھی خرچ کرو خدا اس سے بخوبی آگاہ ہے" (۹۲)

○ " تمام کھانے بنی اسرائیل کے لئے حلال تھے سوائے اس کے جو اسرائیل نے تورات نازل ہونے سے پہلے اپنے اوپر حرام کر لئے تھے، ان سے کہیے کہ اگر تم سچے ہو تو تورات لے آؤ اور اسے پڑھو " (۹۳)

○ " اب جو بھی اس کے بعد خدا پر بہتان تراشی کرے گا اس کا شمار ظالموں میں ہوگا " (۹۴)

○ " کہہ دیجئے کہ خدا نے سچ کہا ہے، بس تم ابراہیمؑ کے آئین کی پیروی کرو کہ جو خالص خدا پرست تھے اور وہ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے " (۹۵)

تفسیر و بیان

ان آیات مبارکہ میں سے پہلی آیت کا ماقبل آیات سے ربط و تعلق واضح نہیں ہے اور یہ ممکن ہے کہ اس کا نزول ان دیگر آیات مبارکہ کے ضمن میں نہ ہوا ہو جن کا ایک دوسرے سے مرتبط ہونا ہر طرح کے شک و گمان سے خالی ہے، اس کی مثال سابق الذکر آیت ۶۴ (سورۂ آل عمران) کی تفسیر میں تاریخ نزول کے حوالہ سے کی گئی بحث میں موجود ہے۔ اور وہاں بھی اس کی تطبیق کے حوالہ سے تاریخ نزول کے مختلف ہونے کی بناء پر صورتحال قدرے مشکل ہو جاتی ہے اور یہاں بھی اس طرح کا مسئلہ ہے......،

البتہ اس کے نزول کی بابت یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس میں خطاب کا رخ بنی اسرائیل کی طرف ہے اور اب تک انہی کی طرف ہے، بنابرایں آیت کا خلاصۂ معنی یہ ہے کہ انہیں ان کی دنیا پرستی اور دنیا کے فنا پذیر مال و دولت کو دین خداوندی پر ترجیح دینے کی وجہ سے مورد مذمت و ملامت قرار دینے کے بعد ارشاد ہوا کہ تم اپنے آپ کو خدا اور اس کے انبیاء سے منسوب کرنے میں جھوٹے ہو اور اپنے آپ کو نیک و متقی کہلانے میں بھی سچے نہیں ہو کیونکہ تم تو دنیا کے خوشنما مال و دولت سے اس قدر محبت کرتے ہو اور اس کے فدائی بن چکے ہو کہ اسے خرچ کرنے میں بخل سے کام لیتے ہو اور اگر کچھ خرچ بھی کرتے ہو تو وہ اس قدر ردی و ناچیز ہوتا ہے کہ جسے کوئی پسند نہیں کرتا اور نہ ہی اس سے محرومی کو خاطر میں لاتا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ کوئی شخص اس وقت تک نیکی نہیں پاسکتا جب تک اپنے مال میں سے نہایت قیمتی اور اپنی دل پسند چیز کا انفاق (خدا کی راہ میں خرچ) نہ کرے کیونکہ جو چیز خدا کی راہ میں خرچ کی جائے وہ خدا کے ہاں محفوظ رہتی ہے۔

تو یہ ہے آیت کے بارے میں اس کے اپنے ماقبل اور مابعد سے ربط و تعلق کی بابت بعض حضرات کے توجیہی بیان کا خلاصہ، لیکن اس طرح کی باتیں کرنا بے نتیجہ کوشش اور موہوم تصورات کی دنیا میں گھومنے کے سوا کچھ نہیں۔

لیکن جہاں تک دیگر آیات کا تعلق ہے تو ان کا سابقہ بیانات سے مرتبط ہونا ہر طرح کے شک و شبہ سے بالاتر ہے،

پسندیدہ مال کا انفاق

O " لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ "
(تم ہرگز نیکی نہیں پا سکتے جب تک کہ وہ کچھ خرچ نہ کرو جسے پسند کرتے ہو)

" تَنَالُوا " فعل مضارع مخاطب کا صیغہ ہے، اس کی اصل "نیل" ہے جس کا معنی کسی چیز تک پہنچنا ہے۔

لفظ " بر " کار خیر میں وسعت کا حامل ہوتا ہے، مشہور لغت دان راغب اصفہانی کا کہنا ہے کہ لفظ "بَر" (ب پر زبر کے ساتھ)......خشکی......"بحر" کے مقابل میں آتا ہے اور چونکہ اس لفظ " بَر " سے وسعت کا معنی ہی ذہنوں میں جلوہ گر ہوتا ہے لہٰذا اسی مناسبت سے لفظ "بِر" (ب کے نیچے زیر کے ساتھ)......نیکی......کو کار خیر میں وسعت کے معنی میں استعمال کرنے کے لئے بنایا گیا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر و لائق توجہ ہے کہ کار خیر سے اس کی مراد دل اور اعضاء و جوارح دونوں کے اعمال ہیں، دل کا عمل جیسے عقیدۂ حق اور پاک نیت، اور اعضاء کا عمل جیسے خدا کی عبادت اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنا، چنانچہ ان دونوں قسموں کا یکجا ذکر درج ذیل آیت مبارکہ میں ہوا ہے:

سورۂ بقرہ، آیت :۱۷۷

O " لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَ فِي الرِّقَابِ ۚ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ......الخ "

(نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے رخ مشرق و مغرب کی طرف کر لو بلکہ نیک وہ شخص ہے جو ایمان لائے اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور کتاب پر، اور نبیوں پر، اور اللہ کی محبت میں مال دے قریبیوں کو، یتیموں کو، مسکینوں کو، مسافروں کو، مانگنے والوں کو اور غلام آزاد کرانے میں، اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ ادا کرے اور وہ لوگ اپنے کئے ہوئے وعدوں کو پورا کرنے والے ہیں اور تکلیفوں، زحمتوں و سختیوں اور سخت وقت میں صبر سے کام لینے والے ہیں......الخ)

اس آیت کو زیر نظر آیت مبارکہ کے ساتھ ملا کر دیکھیں تو واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ مال کی محبت کے باوجود اسے اللہ کی راہ ورضا میں خرچ کرنا "برّ" کے ان بنیادی ارکان میں سے ایک ہے جن کے یکجا ہونے کے بغیر "برّ" وجود میں نہیں آ سکتا، البتہ آیت مبارکہ میں انفاق کو "برّ" کے حصول کی غرض قرار دیا جانا اس بات کا عکاس ہے کہ خداوند عالم نے اسے خاص توجہ و اہمیت دی ہے کیونکہ اس کی بابت طبع انسانی میں مال اکٹھا کرنے کی قلبی چاہت ولگاؤ پایا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ اسے اپنی جان کا حصہ سمجھتا ہے کہ اگر اس سے محروم ہو تو گویا اپنی زندگی کے ایک حصہ سے محروم ہو گیا جبکہ دیگر عبادات و اعمال میں ایسا نہیں ہوتا کہ ان میں کمی یا ان کی عدم ادائیگی سے کسی چیز سے محرومی کا احساس پیدا ہو۔

اس بیان سے بعض مفسرین کے اس قول میں پائی جانے والی خامی بھی ظاہر ہو جاتی ہے جس میں انہوں نے کہا کہ "برّ" سے مراد ہی اپنی پسندیدہ چیز کا انفاق ہے۔ گویا انہوں نے آیت مبارکہ "لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ" کو اس مقولہ جیسا قرار دیا ہے کہ کوئی شخص کسی سے کہے کہ تو بھوک کی تکلیف سے اس وقت تک نجات نہیں پا سکتا جب تک کہ کھانا نہ کھائے......کھانا کھانے کے بغیر تیری بھوک ختم نہیں ہو سکتی......، لیکن اس قول کا ہمارے ذکر کردہ مطالب کے تناظر میں نا قابل قبول ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔

سورۂ بقرہ کی مذکورہ بالا آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں "برّ" سے اس کا ظاہری لغوی معنی مراد ہے یعنی کار خیر میں وسعت! کیونکہ اس میں "برّ" کو تمام نیکیوں خواہ وہ اعتقادی ہوں یا عملی ہوں سب کا جامع قرار دیا گیا ہے۔

بنا برایں بعض مفسرین کا یہ کہنا کہ "برّ" سے مراد خداوند عالم کا احسان و انعام ہے اور بعض حضرات کا یہ کہنا کہ اس سے مراد بہشت ہے، قرین صحت نہیں۔

اللہ بخوبی آگاہ ہے

○ "وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ شَیۡءٍ فَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیۡمٌ "

(اور تم جو کچھ بھی خرچ کرو اللہ اس سے بخوبی آگاہ ہے)

یہ جملہ انفاق کرنے والوں کے سرور و تسکین قلب کے لئے ہے کہ وہ اپنے پسندیدہ و محبوب مال میں سے جو کچھ خرچ کرتے ہیں وہ ضائع و بے اجر و بے نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ وہ اللہ کہ جس نے اس کے انفاق کا انہیں حکم دیا ہے وہ انہیں اور ان کے عمل انفاق سے بخوبی آگاہ ہے۔

بنی اسرائیل کے لئے ہر غذا کی حلیت

○ " کُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِیٓ اِسْرَآءِیْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِیْلُ عَلٰی نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ "

(ہر کھانا بنی اسرائیل کے لئے حلال تھا مگر وہ کہ جسے اسرائیل نے تورات نازل ہونے سے پہلے اپنے اوپر حرام کر دیا)

لفظ "طعام" سے مراد ہر وہ چیز ہے جو غذا کے طور پر کھائی جائے، البتہ اہل حجاز کی لغت میں اسے صرف گندم کے لئے بولا جاتا تھا کہ جب بھی اسے استعمال کیا جاتا تو اس سے گندم ہی مراد لی جاتی تھی۔

لفظ "حلّ" حرمت کے مقابل میں آتا ہے، گویا اسے اس لفظ "حلّ" سے لیا گیا ہے جو "عقد" (گرہ لگانا) اور "عقل" (باندھ دینا) کے مقابل میں آتا ہے تو اس بناء پر اس کا معنی آزاد کرنا و آزادی دینا ہوگا۔

یہاں اسرائیل سے حضرت یعقوب نبی اللہ علیہ السلام مراد ہیں، انہیں اس نام سے اس لئے موسوم کیا گیا کہ وہ اللہ کی راہ میں سخت مجاہدت کرتے تھے اور اس میں کامیاب و کامران تھے، اہل کتاب کا کہنا ہے کہ اسرائیل کا معنی اللہ پر کامیابی و غلبہ پانے والا ہے اور حضرت یعقوبؑ کو اس لئے اسرائیل کہا جاتا ہے کہ انہوں نے "فنیئیل" کے مقام پر خدا سے کشتی لڑی اور اسے چت کر دیا، (بحوالہ تورات)، مگر قرآن مجید اس کی تکذیب کرتا ہے اور عقل اسے محال و ناممکن قرار دیتی ہے۔

جملہ " اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِیْلُ عَلٰی نَفْسِهٖ" مذکورہ بالا طعام سے استثناء کے بیان پر مشتمل ہے اور جملہ "من قبل ان تنزل التوراة " کا تعلق پہلے جملہ میں مذکور حرف " کان" سے ہے، لہٰذا آیت کا معنی یہ ہوگا کہ خداوند عالم نے تورات کے نزول سے پہلے کھانے کی کوئی چیز بنی اسرائیل پر حرام قرار نہیں دی سوائے اس کے کہ جسے اسرائیل نے خود اپنے اوپر حرام کر دیا تھا۔

ایک اہم نکتہ

آیت مبارکہ کے جملہ "قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ" میں اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ تورات نازل ہونے سے پہلے بنی اسرائیل اپنے لئے ہر طعام کے حلال ہونے کو تسلیم نہیں کرتے تھے چنانچہ اس کی ایک دلیل یہ ہے کہ وہ شریعتوں کے منسوخ ہونے یعنی احکام میں نسخ کے قائل ہی نہیں بلکہ اسے محال سمجھتے ہیں، ان کے اس عقیدہ کی بابت

تفصیلی تذکرہ سورۂ بقرہ کی آیت ۱۰۶ کی تفسیر میں ہو چکا ہے، بنابرایں وہ طبعاً اس آیت میں مذکورہ مطالب کو تسلیم ہی نہیں کرتے تھے جس میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: " فَبِظُلۡمٍ مِّنَ الَّذِیۡنَ ہَادُوۡا حَرَّمۡنَا عَلَیۡہِمۡ طَیِّبٰتٍ اُحِلَّتۡ لَہُمۡ " کہ یہودیوں کے ظلم کی وجہ سے ہم نے ان پر وہ پاک چیزیں حرام کر دیں جو ان کے لئے حلال کی گئی تھیں، (سورۂ نساء، آیت ۱۶۰)۔

اسی طرح آیت ۹۵ کے الفاظ " قُلۡ صَدَقَ اللّٰہُ فَاتَّبِعُوۡا مِلَّۃَ اِبۡرٰہِیۡمَ حَنِیۡفًا " سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ جس چیز کا انکار کرتے تھے (یعنی تورات سے پہلے ہر طعام کا حلال ہونا اور ان کے ظلم کی وجہ سے پاک چیزوں کے حلال ہونے کے حکم کا منسوخ ہو کر ان چیزوں کا ان پر حرام کیا جانا) اسے مسلمانوں کو غلط فہمی میں مبتلا کرنے اور حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اس بیان پر اعتراض کرنے کا ذریعہ قرار دیتے تھے کہ جس میں آنحضرتؐ نے اپنے پروردگار کی طرف سے لوگوں کو آگاہ کیا کہ دین خداوندی وہی آئین ابراہیمیؑ ہے اور وہی آئین فطرت ہے کہ جس میں کوئی افراط پایا جاتا ہے اور نہ تفریط پائی جاتی ہے، تو یہ کیونکر ممکن ہے حالانکہ وہ تو اس بات کے قائل تھے کہ ابراہیمؑ یہودی تھے اور تورات کے احکام پر عمل کرتے تھے، پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ ان کا آئین ان احکام پر مشتمل ہو جو تورات سے مختلف بلکہ اس کے برعکس ہوں یعنی اس میں تورات کی حرام کردہ چیزوں کو حلال قرار دیا گیا ہو جبکہ منسوخ ہونا روا نہیں۔

بنابرایں یہ بات واضح ہو گئی کہ آیت مبارکہ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے مقام میں ہے کہ یہودی جسے پھیلانے کے درپے تھے، اس کے ساتھ ساتھ آیت میں اصل غلط فہمی کا تذکرہ نہ کیا جانا یہ ثابت کرتا ہے کہ ان کا مقصد صرف مؤمنین کو اس میں مبتلا کرنا تھا اور انہیں ہی اس کا شکار کرنا مقصود تھا، چنانچہ اس طرح کے موارد میں قرآنی روش و اسلوب یہی ہے، ملاحظہ ہو:

سورۂ مائدہ، آیت: ۶۴

○ " وَقَالَتِ الۡیَہُوۡدُ یَدُ اللّٰہِ مَغۡلُوۡلَۃٌ "

(اور یہودیوں نے کہا کہ اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں)

سورۂ بقرہ، آیت: ۸۰

○ " وَقَالُوۡا لَنۡ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَیَّامًا مَّعۡدُوۡدَۃً "

(اور انہوں نے کہا کہ ہمیں جہنم کی آگ معدودے چند دنوں کے سوا ہرگز نہیں چھوئے گی)

سورۂ بقرہ، آیت: ۸۸

○ " وَقَالُوۡا قُلُوۡبُنَا غُلۡفٌ "

(اور انہوں نے کہا کہ ہمارے دل بند ہیں)

یہ اور دیگر متعدد آیات میں مذکورہ بالا قرآنی اسلوب بیان کا ثبوت ملتا ہے، اسی طرح زیر بحث آیت مبارکہ کے بعد والی آیات میں سے درج ذیل آیت میں بھی یہ روش معمول ہوئی ہے:

سورۂ آل عمران، آیت :۱۰۰

○ " قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ مَنْ آمَنَ تَبْغُونَهَا عِوَجًا وَأَنْتُمْ شُهَدَاءُ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٩٩﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تُطِيعُوا فَرِيقًا مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ يَرُدُّوكُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ كَافِرِينَ "

(کہہ دیجئے کہ اے اہل کتاب! تم کیوں روکتے ہو اللہ کی راہ سے اسے کہ جو ایمان لایا ہے، تم اس راہ میں کجی پیدا کرنے کے درپے ہو جبکہ تم خود گواہ ہو...... کہ وہ راستہ درست ہے...... اور اللہ تمہارے اعمال سے غافل نہیں، اے ایمان والو! اگر تم اہل کتاب کے کسی گروہ کے اطاعت گزار بن گئے تو وہ تمہیں تمہارے ایمان لانے کے بعد دوبارہ کافر بنادیں گے)

بہرحال مذکورہ بالا مطالب سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہودی غلط فہمی پر مبنی اپنے اظہارات حضرت پیغمبر اسلامؐ کے سامنے نہیں کرتے تھے بلکہ صرف مؤمنین کے سامنے کرتے تھے اور جب بھی ان سے ملتے اور ان سے گفتگو کرتے تو انہیں اس طرح کے اظہارات کے ذریعے غلط فہمی میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتے تھے، ان کے بیانات و اظہارات کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ مؤمنین سے کہتے تھے کہ یہ تمہارا نبی کیونکر سچا ہوسکتا ہے جو کہ نسخ کی باتیں کرتا ہے اور کہتا ہے کہ خداوند عالم نے بنی اسرائیل کے ظلم کی وجہ سے ان پر پاک وطیب چیزیں حرام کردیں حالانکہ ایسا کرنا سابقہ حکم کو منسوخ کرنا ہے یعنی حلال چیز کو حرام کرنا ہے جو کہ خداوند عالم کے بارے میں اس طرح کا نظریہ قائم کرنا جائز نہیں کیونکہ جو چیز حرام کردی گئی ہے وہ ہمیشہ کیلئے حرام ہے اور حکم خداوندی میں تبدیلی ممکن ہی نہیں، ان کے اس طرح کے بیانات واظہارات کا جواب کہ جو آنحضرتؐ نے خداوند عالم کے فرمان کے مطابق دیا وہ یہ تھا کہ تورات واضح طور پر بیان کررہی ہے کہ اس کے نزول سے پہلے ہر طعام حلال تھا لہٰذا اگر تم اپنی باتوں میں سچے ہو تو تورات لے آؤ میں اسے پڑھتا ہوں. تمہیں پڑھ کر سناتا ہوں کہ اس میں وہی کچھ لکھا ہوا ہے جو میں نے کہا ہے...... اسی سوال وجواب کا ذکر آیت مبارکہ ۹۳ " كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِبَنِي إِسْرَائِيلَ إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَائِيلُ عَلَىٰ نَفْسِهِ مِنْ قَبْلِ أَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرَاةُ ۗ قُلْ فَأْتُوا بِالتَّوْرَاةِ فَاتْلُوهَا إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ " میں ہوا ہے)۔ اور اگر تم تورات لانے سے انکار کرتے ہو اور اسے پڑھ کر حقیقت سے آگاہ نہیں ہونا چاہتے تو پھر اعتراف کرلو کہ تم خدا پر جھوٹ باندھتے ہو...... اس کی طرف جھوٹی نسبت دیتے ہو...... اور یہ کہ تم ظالم ہو (اس کا ذکر آیت ۹۴ میں یوں ہوا: " فَمَنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ")۔ اسی سے یہ بات ثابت وواضح ہوجاتی ہے کہ میں اپنے

مشن میں سچا ہوں لہٰذا تم بھی میرے دین وملت کی پیروی کرو جو کہ ابراہیم خلیل اللہ کا دین وآئین ہے (اس مطلب کو آیت ۹۵ میں یوں بیان کیا گیا ہے: "قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ")۔

تو یہ ہے زیر نظر آیت مبارکہ کے حوالہ سے مربوط مطالب کا بیان کہ جسے ہم نے پیش کیا ہے، البتہ آیت کے معنی و تفسیر میں دیگر مفسرین کرام نے مختلف بیانات پیش کئے ہیں لیکن جو بات تمام حضرات کے بیانات میں قدر مشترک ہے وہ یہ کہ سب نے کہا ہے کہ یہ آیت یہودیوں کی طرف سے پھیلائی جانے والی اس غلط فہمی کی تفصیلات بیان کرتی ہے جو انہوں نے نسخ کے حوالہ سے پیدا کرنے کی کوشش کی۔

آیت کی بابت عجیب قول

زیر بحث آیت مبارکہ کے حوالہ سے بعض مفسرین نے نہایت عجیب اظہار خیال کیا ہے اور وہ یہ کہ یہ آیت دراصل یہودیوں کی طرف سے نسخ کے بارے میں پیدا کی جانے والے غلط فہمی کے جواب پر مشتمل ہے اور وہ اس طرح کہ گویا یہودی کہتے تھے کہ اے محمدؐ! اگر آپ ابراہیمؑ اور ان کے بعد آنے والے نبیوں کے دین پر ہیں جیسا کہ آپ خود اس کے مدعی ہیں تو پھر جو کچھ حضرت ابراہیمؑ اور دیگر انبیاءؑ پر حرام تھا اسے حلال کیوں کرتے ہیں مثلاً اونٹ کا گوشت وغیرہ، آپؐ نے تو ان چیزوں کو مباح وحلال قرار دے دیا جو انبیاءؑ پر حرام تھیں تو پھر آپؐ کے لئے ہرگز روا نہیں کہ اپنے آپ کو ان انبیاءؑ کا تصدیق کنندہ اور ان کے دین وآئین سے اتفاق کرنے والا ہونے کا دعویٰ کریں، اور بالخصوص حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں ان سے اپنی نسبت کا اظہار کرتے ہوئے یہ نہ کہیں کہ میں دوسروں سے زیادہ ان کا حقدار ہوں۔

ان کے اس بہتان اور غلط فہمی پیدا کرنے والے اظہارات کے جواب کا خلاصہ ولب لباب یہ ہے کہ ہر طعام تمام انسانوں کے لئے حلال تھا اور ان میں بنی اسرائیل بھی شامل ہیں لیکن بنی اسرائیل نے خود اپنے ہاتھوں اور اپنے مظالم و گناہوں کے ارتکاب کی بناء پر کچھ چیزیں اپنے لئے حرام قرار دے دیں، چنانچہ اس سلسلہ میں ارشاد حق تعالیٰ ہے:

سورۂ نساء، آیت ۱۶۰:

"فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ"

(یہودیوں کے مظالم کی وجہ سے ہم نے وہ پاک چیزیں ان کے لئے حرام کر دیں جو ان کے لئے حلال تھیں)۔

تو اس آیت میں "اسرائیل" سے مراد صرف حضرت یعقوب علیہ السلام نہیں بلکہ پوری قوم بنی اسرائیل مراد ہے چنانچہ اس طرح کا استعمال بنی اسرائیل کے ہاں عام ہے کہ وہ لفظ "اسرائیل" کے استعمال سے پوری قوم مراد لیتے ہیں، اور

طیبات کو اپنے اوپر حرام قرار دینے کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے مظالم کا ارتکاب کیا اور گناہوں و برائیوں کو انجام دینے کے رسیا ہو گئے جس کے نتیجہ میں طیب و پاک چیزیں ان پر حرام کر دی گئیں، اور جملہ "مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تُنَزَّلَ التَّوۡرٰىةُ " کا تعلق جملہ "حَرَّمَ اِسۡرَآءِيۡلُ" سے ہے، اور اگر یہاں "اسرائیل" سے صرف حضرت یعقوب علیہ السلام مراد ہوتے تو جملہ "مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تُنَزَّلَ التَّوۡرٰىةُ" زائد اور بے معنی ہو جاتا کیونکہ یہ بات ایک واضح و روشن حقیقت ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام تورات کے نزول سے پہلے تھے لہٰذا اسے کلام میں بیان کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔

یہ ہے اس مفسر کے بیان کا خلاصہ، اس کے مانند دیگر مفسر نے بھی اظہار خیال کیا ہے البتہ انہوں نے اپنے بیان میں کہا کہ بنی اسرائیل کے اپنے اوپر پاکیزہ چیزیں حرام قرار دینے سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے ان چیزوں کو خود اپنے اوپر حرام کر دیا تھا اور ان کا ایسا کرنا ان کے کسی نبی پر خدا کی طرف سے بذریعہ وحی، حکم صادر ہونے کی بناء پر نہ تھا بلکہ یہ اسی طرح سے تھا جیسے زمانہ جاہلیت کے عرب عام طور پر کچھ چیزوں کو اپنے لئے حرام قرار دیتے تھے چنانچہ ان کی اس عام عادت کے تذکرے خداوند عالم نے اپنی مقدس کتاب میں کئے ہیں۔

مذکورہ بالا دونوں مفسرین کرام نے اپنے اظہارات سے بیجا و غیر ضروری تکلف سے کام لیا یعنی اپنے آپ کو زحمت میں مبتلا کیا اور ایسی تفسیر پیش کی جو اہل نظر کے ہاں پسندیدہ واقع نہیں ہوتی کیونکہ اس سے کلام کی صورت بگڑ جاتی ہے اور اس کا جاری سلسلہ اپنی اصل شکل پر باقی نہیں رہتا، ان کے اپنے آپ کو اس طرح زحمت میں مبتلا کرنے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں حضرات نے جملہ "مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تُنَزَّلَ التَّوۡرٰىةُ" کا تعلق جملہ "حَرَّمَ اِسۡرَآءِيۡلُ" سے جوڑا ہے حالانکہ اس کا تعلق آیت کے ابتدائی الفاظ "كَانَ حِلًّا" سے ہے اور جملہ "اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسۡرَآءِيۡلُ عَلٰى نَفۡسِهٖ" جملہ استثنائیہ معترضہ ہے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہاں "اسرائیل" سے بنی اسرائیل مراد لینے کی کوئی وجہ نہیں اور ان دو مفسرین نے یہ گمان کر لیا کہ اگر اسرائیل سے بنی اسرائیل مراد نہ لیں تو آیت کا معنی درست نہیں بنتا۔

اس کے علاوہ یہ بات قابل ذکر و لائق توجہ ہے کہ اگرچہ لفظ "اسرائیل" سے بنی اسرائیل مراد لینے میں کوئی حرج نہیں جیسا کہ لفظ **"بکر"** سے بنی بکر، لفظ **"تغلب"** سے بنی تغلب، لفظ **"توار"** سے بنی ترار اور لفظ **"عدنان"** سے بنی عدنان مراد لئے جاتے ہیں لیکن بالخصوص بنی اسرائیل کے بارے میں اس طرح کا استعمال نزول آیت کے زمانہ میں رائج نہ تھا اور نہ ہی قرآن مجید میں اس لفظ کے استعمال میں (اس مورد کے علاوہ کہ جس کے بارے میں یہ حضرات دعویٰ کرتے ہیں) اس طرح کی روش اپنائی گئی ہے حالانکہ قرآن مجید میں لفظ **"بنی اسرائیل"** تقریباً چالیس بار ذکر ہوا ہے کہ ان میں سے ایک یہی مورد ہے کہ جس میں ارشاد ہوا: " كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسۡرَآءِيۡلُ عَلٰى

نَفْسِہٖ" توان کے قول کی بناء پر آیت مبارکہ کے ان دو مقامات میں کیا فرق ہے کہ جس کی وجہ سے ان کے بارے میں پہلے "بنی اسرائیل" اور پھر "اسرائیل" کہا گیا جبکہ یہ مقام غلط فہمی پیدا ہونے کے واضح ترین موارد میں سے ایک ہے، یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ مفسرین کی کثیر تعداد نے جملہ "اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِیْلُ عَلٰی نَفْسِہٖ" میں لفظ "اِسْرَآءِیْلُ" سے حضرت یعقوب علیہ السلام کو مراد لیا ہے نہ کہ ان کی اولاد کو! چنانچہ اس کی بہترین دلیل وشاہد یہ ہے کہ آیت میں لفظ "عَلٰی نَفْسِہٖ" مذکور ہے اور ضمیر مفرد مذکر "ہ" کی بازگشت "اسرائیل" کی طرف ہوتی ہے اور اگر اس سے "بنی اسرائیل" مراد ہوتے تو ضروری تھا کہ یوں کہا جاتا: "علٰی نفسھا" یا "علٰی انفسھم"، لیکن اس کی بجائے "عَلٰی نَفْسِہٖ" کہا گیا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس سے فرد واحد یعنی حضرت یعقوبؑ (اسرائیل) مراد ہیں،

خدا کی طرف سے کھلا اعلان

○ " قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ "
(کہہ دو کہ پھر تورات لے آؤ تا کہ میں اسے پڑھوں، اگر تم سچے ہو!)

اس میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا کہ تم تورات لے آؤ اور میں تمہارے سامنے اس کی تلاوت کروں تا کہ یہ بات واضح ہو جائے کہ دونوں فریقوں میں سے کون حق پر ہے ؟ میں یا تم؟

یہ جملہ دراصل خدا کی طرف سے حضرت پیغمبر اسلامؐ پر ان لوگوں کو جواب دینے کے لئے القاء ہوا۔

خدا پر جھوٹا الزام لگانے والے!

○ " فَمَنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ "
(تو جو شخص اس کے باوجود خدا پر جھوٹا الزام لگائے تو ایسے لوگ ہی ظالم ہیں)

آیت کے الفاظ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خداوند عالم کا کلام ہے جو اس نے اپنے پیغمبرؐ کو مخاطب قرار دے کر کیا ہے اور اس کا مقصد اور بنیادی غرض یہ ہے کہ آنحضرتؐ کو خوشحال و خورسند کیا جائے کہ ان کے یہودی دشمن ہی ظالم و

ستمگار ہیں کیونکہ انہوں نے خدا پر جھوٹ باندھا ہے اور غلط بیانی سے کام لیا ہے۔

اس کلام خداوندی میں جہاں آنحضرتؐ کے لئے طیب نفس کا سامان کیا گیا ہے وہاں یہودیوں کی مذمت کا پہلو بھی ملتا ہے، گویا کنایہ ہی کنایہ میں بات کی گئی ہے۔

اور جہاں تک اس رائے اور احتمالی نظریہ کا تعلق ہے کہ یہ جملہ آنحضرتؐ کے کلام کا تتمہ ہے تو یہ اس لئے قرین قیاس نظر نہیں آتا کہ ظاہر الکلام میں "ذٰلِكَ" مفرد کا اشارہ مذکور ہے یعنی "مِنۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ"، بہرحال اس حوالہ سے بھی کلام کنایہ پر مشتمل ہے اور اس میں مغلوب واقع ہونے والے دشمن و مدمقابل کے سامنے مسلم الثبوت مطلب کو پردے میں رکھ کر پیش کیا گیا ہے تاکہ اس کے دل میں اسے تسلیم کرنے کی راہ ہموار ہو جائے چنانچہ اس کی مثال درج ذیل آیت مبارکہ میں ملتی ہے:

سورۂ سباء، آیت: ۲۴

O "اِنَّاۤ اَوۡ اِیَّاکُمۡ لَعَلٰی هُدًی اَوۡ فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ" (ہم یا تم، ہدایت کی راہ پر یا کھلی گمراہی میں ہیں)

اور جملہ "مِنۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ" میں حرف "ذٰلِكَ" کا اشارہ سابق الذکر دلیل و برہان کی طرف ہے...... اس سے مراد یہ ہے کہ اس واضح و مضبوط دلیل کے باوجود جو شخص خدا پر جھوٹ باندھے تو ایسے لوگ ظالم و ستمگار ہیں......

اب یہاں یہ نکتہ قابل غور ہے کہ ہر جھوٹ باندھنے والا.... جھوٹا الزام لگانے والا.... ظالم ہوتا ہے تو یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ جو شخص اس کے بعد جھوٹ باندھے وہ ظالم ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اس لئے کہا گیا کہ بقولے، حقیقت کے آشکار ہونے سے قبل "ظلم" تحقق پذیر ہوتا ہی نہیں اور جملہ "فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ" (وہی ظالم ہیں) میں "قصر القلب" کی روش اپنائی گئی ہے یعنی اس سے یہ اظہار مقصود ہے کہ ہر صورت میں وہی ظالم ہیں اور ظالم بس وہی ہیں۔

آئین ابراہیمیؑ کی پیروی کا حکم

O "قُلۡ صَدَقَ اللّٰهُ فَاتَّبِعُوۡا مِلَّةَ اِبۡرٰهِیۡمَ حَنِیۡفًا......"

(کہہ دو کہ اللہ نے سچ کہا ہے، پس تم آئین ابراہیمؑ کہ جو خالص و مخلص تھا، کی پیروی کرو)

اس آیت مبارکہ کے ذریعے یہودیوں کو دعوت دی گئی کہ جب یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ میں نے جو کچھ تمہیں بتایا ہے اور جس دین و آئین کو اختیار کرنے کا تم سے کہا ہے وہ برحق ہے اور اس میں حق میرے ساتھ ہے تو تمہیں چاہیے کہ تم

میرے دین وآئین کی پیروی کرو اور اونٹ کے گوشت سمیت ان تمام پاک چیزوں کے حلال ہونے کا اقرار کرو جو خداوند عالم نے تم پر حلال کیں اور اگر اس نے اس سے پہلے ان چیزوں کو حرام قرار دیا تھا تو وہ تمہارے مظالم اور زیادتیوں کی سزا کے طور پر تھا جیسا کہ اس کے بارے میں خداوند عالم نے خود ہی تمہیں باخبر کر دیا ہے۔

یہاں جملہ "فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا" دین مصطفویؐ کی پیروی کے اشاراتی ذکر یعنی کنایہ کے طور پر ہے، اور بعینہٖ اس کا نام اس لئے نہیں لیا گیا کیونکہ وہ لوگ دین ابراہیمؑ کے معتقد تھے اور آنحضرتؐ نے دین ابراہیمیؑ کی پیروی کا حکم دے کر اس مطلب کی طرف اشارہ فرمایا کہ میں جس دین کی تمہیں دعوت دیتا ہوں وہ خالص فطری دین وآئین ابراہیمیؑ ہی ہے کیونکہ فطرت ہرگز انسان کو پاک گوشت اور دیگر پاک چیزیں کھانے سے منع نہیں کرتی۔

روایات پر ایک نظر

اونٹ کے گوشت کی کہانی

کافی اور تفسیر العیاشی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا:

" ان اسرائیل کان اذا اکل لحم الابل هیج علیه وجع الخاصرة فحرم علٰی نفسه لحم الابل و ذلک قبل ان تنزل التوراة ، فلما نزلت التوراة لم یحرمه ولم یأکلهٗ "

جناب اسرائیل جب بھی اونٹ کا گوشت کھاتے تو ان کے پہلو کا درد شدید ہو جاتا لہٰذا انہوں نے اپنے لئے اونٹ کا گوشت حرام کر دیا، اور یہ تورات کے نازل ہونے سے پہلے تھا، پھر جب تورات نازل ہو گئی تو انہوں نے نہ تو اسے حرام قرار دیا اور نہ ہی خود کھایا۔ (کافی ج ۵ ص ۳۰۶ ح ۹۔ تفسیر العیاشی، جلد اول ص ۱۸۴)

اس سے قریب المعنی روایت اہل سنت والجماعت کی اسناد سے بھی ذکر کی گئی ہے۔

اس روایت میں جملہ " لم یحرمه ولم یاکله " (انہوں نے نہ تو اسے حرام قرار دیا اور نہ ہی خود کھایا) میں فاعل کی ضمیریں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف لوٹتی ہیں کیونکہ مقام ومورد اسی پر دلالت کرتا ہے لہٰذا اس کا معنی یہ ہوگا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اونٹ کا گوشت حرام قرار نہ دیا اور خود بھی نہ کھایا۔

یہ بھی ممکن ہے کہ جملہ "ولم یاکله " باب تفعیل (تاکیل) سے ہو کہ جس کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے کسی کو کھلایا بھی نہیں، اس کا ثبوتی اشارہ لغت کی مشہور کتاب تاج اللغات میں پایا جاتا ہے کہ جس میں لکھا ہوا ہے کہ مادۂ "اکل" میں باب تفعیل اور باب مفاعلہ ایک ہی معنی میں آتا ہے......" تاکیل" یعنی کسی کو کچھ کھلانا اور "مؤاکله " ایک دوسرے کو کچھ کھلانا ہے......"

آیات ۹۶ ، ۹۷

○ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۶﴾

○ فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ۗ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ۗ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۷﴾

ترجمہ

○ " یقیناً سب سے پہلا وہ گھر جو لوگوں کے لئے ...... بغرض عبادت ...... بنایا گیا وہ مکہ میں ہے جو کہ بابرکت اور کائنات کی ہدایت کا سرچشمہ ہے "

(۹۶)

○ " اس گھر میں واضح نشانیاں اور مقام ابراہیم ہے، جو شخص اس گھر میں داخل ہوا وہ امن میں آ گیا، اور جو شخص استطاعت رکھتا ہو اس پر خدا کی عبادت کی غرض سے اس گھر کا حج واجب ہے، اور جو شخص انکار کرے تو خدا پوری کائنات سے بے نیاز ہے "

(۹۷)

تفسیر و بیان

یہ دوآیتیں یہودیوں کی طرف سے نسخ کے بارے میں مؤمنین پر کئے جانے والے اعتراض...... یا غلط فہمی...... کے جواب میں ہیں اور اعتراض یا غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش وہی تھی جس کا تعلق بیت المقدس سے کعبہ کی طرف قبلہ کی تبدیلی سے تھا، چنانچہ اس سلسلہ میں سورۂ بقرہ کی آیت ۱۴۴ " فَوَلِّ وَجۡهَكَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ...... " کی تفسیر میں مربوطہ مطالب ذکر ہو چکے ہیں اور یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ قبلہ کی تبدیلی اہل کتاب بالخصوص یہودیوں کے لئے روحانی و مادی دونوں حوالوں سے نہایت اہم مسئلہ تھا اور وہ اسے اپنے لئے حیاتی اور زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ سمجھتے تھے اس کے ساتھ ساتھ یہ بات نہایت اہمیت کی حامل تھی کہ یہ بات ان کے عقیدۂ نسخ سے متصادم تھی کیونکہ وہ نسخ کو ناجائز و محال سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے قبلہ کی تبدیلی کا حکم آنے کا بعد ان کے اور مسلمانوں کے درمیان بحثوں و تنازعات کا بازار عرصہ دراز تک گرم رہا۔

آیت مبارکہ کے ابتدائی الفاظ " اِنَّ اَوَّلَ بَيۡتٍ...... " سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب نے مسئلۂ نسخ اور قبلہ کی تبدیلی کے حکم کو دین ابراہیمؑ کی طرف منسوب کرنے کو یکجا کر دیا، چنانچہ ان کے اظہارات و بیانات کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ کہتے تھے کہ آئین ابراہیمؑ میں کعبہ، کیونکہ قبلہ قرار پا سکتا ہے جبکہ خدا نے بیت المقدس کو قبلہ قرار دیا ہے تو کیا اس کا مطلب آئین ابراہیمؑ میں جو کہ حق و برحق ہے مسئلہ نسخ کو درست ماننا نہیں؟ حالانکہ نسخ ایک محال و باطل اور ناجائز کام ہے !

ان کے جواب میں آیت کے الفاظ یوں آئے " اِنَّ اَوَّلَ بَيۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىۡ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّ هُدًى لِّلۡعٰلَمِيۡنَ " اس سے مراد یہ ہے کہ کعبہ ہی ہر جگہ مثلاً بیت المقدس سے پہلے عبادت کی غرض سے بنایا گیا، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اسے حضرت ابراہیمؑ نے تعمیر کیا اور اس کی تعمیر کا مقصد صرف عبادت تھا، اس میں پائی جانے والی نشانیاں مثلاً مقام ابراہیمؑ اس حقیقت کی گواہی دیتی ہے، اور جہاں تک بیت المقدس کا تعلق ہے تو اسے حضرت سلیمانؑ نے تعمیر کیا جو کہ حضرت ابراہیمؑ سے کئی صدیاں بعد میں آئے۔

پہلا عبادت خانہ

○ " اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا......الخ "
(بے شک وہ پہلا گھر جو لوگوں کے لئے بنایا گیا وہ مکہ میں ہے جو بابرکت ہے......الخ)

لفظ "بَيْتٍ" کا معنی واضح ومشہور ہے (یعنی گھر)، اور آیت میں اسے لوگوں کے لئے بنائے جانے سے مراد یہ ہے کہ اسے لوگوں کے لئے اس لئے بنایا گیا کہ وہ اپنی عبادات بجالائیں اور وہ اس طرح کہ اسے عبادت خداوندی کا ذریعہ ووسیلہ بنائیں، خدا کی عبادت وپرستش کے لئے اس سے مدد لیں، اس کی طرف رخ کر کے بندگی پروردگار کریں، دور دراز سے اس کے پاس آ کر اپنے فریضہ عبادت کی ادائیگی کو یقینی بنائیں اور اس کے علاوہ تقرب الٰہی کے دیگر اعمال انجام دیں۔ اس کا ثبوت آیت مبارکہ کے الفاظ ہیں کہ جن میں اسے بابرکت اور عالمین کے لئے مایۂ ہدایت قرار دیا گیا ہے، چنانچہ کعبہ کو "لَلَّذِىْ بِبَكَّةَ" سے تعبیر کر کے لوگوں کے اس کے پاس آ کر طواف کرنے، نماز پڑھنے ور عبادات ودیگر اعمال بجالانے کی طرف لطیف اشارہ کیا گیا ہے، لیکن جہاں تک روئے زمین پر اس کے سب سے پہلا گھر ہونے اور لوگوں کے فائدہ کے لئے بنائے جانے کا تعلق ہے تو آیت کے الفاظ میں اس کا ثبوت نہیں پایا جاتا...... کہ اس سے پہلے کوئی گھر روئے زمین پر نہیں بنایا گیا تھا......

لفظ "بكة" سے مراد سرزمین مکہ ہے کہ جہاں یہ گھر واقع ہے، اسے لفظ "بکہ" سے موسوم کرنے کی وجہ وہاں لوگوں کے جم غفیر کا اکٹھا ہونا ہے، یہ بھی کہا گیا ہے کہ "بکہ" ہی مکہ ہے اور اس میں ب کو میم میں تبدیل کر دیا گیا ہے جیسا کہ عربوں میں لفظ "لازم" کو لازب اور لفظ "راتم" کو راتب پڑھا جاتا ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ "بکہ" خانہ کعبہ کا نام ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ یہ مسجد الحرام کا نام ہے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ "مطاف" (طواف کرنے کے مخصوص احاطہ) کا نام ہے۔

لفظ "مُبٰرَكًا" جو کہ باب مفاعلہ (مبارکہ) سے ہے کہ جس کا اشتقاق "برکت" سے ہے، اس کا معنی خیر کثیر ہے۔ "مبارکہ" کا معنی اس پر خیر کثیر نازل کرنا اور اسے خیر کثیر کا گہوارہ قرار دینا ہے، اگرچہ اس میں دنیوی واخروی دونوں برکات شامل ہیں لیکن چونکہ اس کا تقابل "هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ" سے ہوا ہے لہٰذا اس سے مراد صرف دنیوی برکات کا نزول ہے کہ جس میں رزق کی فراوانی، حج وزیارت کے ذریعے وہاں جمع ہونے اور اس کے ادائے احترام کے لئے تقربی اعمال

انجام دینے کی غرض سے اس کو آباد رکھنے جیسے امور سرفہرست ہیں، چنانچہ اس معنی کی بازگشت درج ذیل آیت مبارکہ کی طرف ہوتی ہے:

سورۂ ابراہیم، آیت: ۳۷

○ "رَبَّنَآ اِنِّیۤ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْۤ اِلَیْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ یَشْكُرُوْنَ"

(اے ہمارے پروردگار! میں نے اپنی اولاد کو تیرے گھر کے پاس ایک غیرآباد علاقہ میں قیام پذیر کیا ہے تاکہ وہ نماز قائم کریں، لہٰذا تو لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف جھکا دے اور انہیں پھلوں کا رزق عطا فرما، تاکہ وہ شکرگزار بنیں)

اور قرآن مجید کے "هُدًى لِّلْعٰلَمِیْنَ" ہونے سے مراد یہ ہے کہ چونکہ خداوند عالم نے اسے عبادت کی غرض سے بنایا اور اس کے پاس متعدد اطاعتی اعمال کی تشریع فرمائی لہٰذا اس حوالہ سے گویا وہ لوگوں کو ان کی اخروی سعادت کی نشاندہی کرتا ہے اور انہیں قرب خداوندی کی عظیم منزل پر فائز کرتا ہے، اور یہ سلسلہ اس وقت سے جاری ہے جب حضرت ابراہیمؑ نے اسے تعمیر کیا کہ یہ مقدس گھر خدا کے قرب کا قصد کرنے والوں کا مرکز اور عبادت گزاروں کا معبد بنا ہوا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ قرآن مجید میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ فریضۂ حج سب سے پہلے عہد ابراہیمیؑ میں اس وقت شروع ہوا جب حضرت ابراہیم نے خانۂ کعبہ کی تعمیر کا کام مکمل کر لیا، آیت ملاحظہ ہو:

سورۂ بقرہ آیت: ۱۲۵

○ "وَعَهِدْنَآ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ اَنْ طَهِّرَا بَیْتِیَ لِلطَّآىٕفِیْنَ وَ الْعٰكِفِیْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ"

(اور ہم نے ابراہیم و اسماعیل سے عہد لیا کہ وہ میرے گھر کو پاک بنائیں طواف کرنے والوں کے لئے اور اعتکاف انجام دینے والوں کے لئے اور رکوع و سجود بجالانے والوں کے لئے!)

حضرت ابراہیمؑ سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد الٰہی ہوا:

سورۂ حج، آیت: ۲۷

○ "وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ"

(اور لوگوں میں حج کا اعلان کرو کہ وہ دور دراز علاقوں سے پیدل چل کر اور سواریوں پر سوار ہو کر تیرے پاس آئیں)

یہ آیت مبارکہ جیسا کہ آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں اس مطلب پر دلالت کرتی ہے کہ حج کے اعلان پر دور دراز کے عشائر وقبائل نہایت گرمجوشی کے ساتھ لبیک کہیں گے اور جوق در جوق بیت اللہ کی طرف آئیں گے۔

اور یہ آیت اس بات کی دلیل بھی ہے کہ یہ خدائی شعار یعنی حج حضرت شعیبؑ کے زمانہ تک لوگوں میں معروف و رائج تھا جیسا کہ درج ذیل آیت مبارکہ میں خداوند عالم نے حضرت شعیب کا موسیٰؑ سے یہ کہنا ذکر کیا ہے کہ جس میں حج کا تذکرہ ہے، ملاحظہ ہو:

سورۂ قصص، آیت :۲۷

○ " اِنِّيْۤ اُرِيْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَى ابْنَتَيَّ هٰتَيْنِ عَلٰۤى اَنْ تَاْجُرَنِيْ ثَمٰنِيَ حِجَجٍ ۚ فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ "

(میں چاہتا ہوں کہ اپنی ان دو بیٹیوں میں سے ایک کا نکاح تجھ سے کر دوں بشرطیکہ میری طرف سے آٹھ حج بجا لاؤ، اگر دس پورے کرو تو وہ تمہاری طرف سے ہوگا......)

اگرچہ آیت کے ظاہری الفاظ سے اعمال حج بجالانا ثابت ہوتا ہے لیکن یہاں مناسک حج مراد نہیں بلکہ آٹھ سال خدمت انجام دینا مراد ہے اور لفظ "حج" ایک سال کے معنی میں ہے تو "ثمانی حجج" سے مراد آٹھ سال ہے کیونکہ اس زمانہ میں تاریخ کا حساب، حج کے ایام سے ہوتا تھا اور سالوں کی گنتی کا معیار بھی حج تھا کہ اسی کی بناء پر سالوں کو شمار کیا جاتا تھا لہٰذا آیت میں بھی وہی مراد و مقصود ہے۔

اسی طرح دعوتِ ابراہیمؑ میں بھی اس حقیقت کے شواہد کثرت کے ساتھ پائے جاتے ہیں کہ بیت اللہ ہی مرکز عبادت اور مینارِ ہدایت رہا۔ (تفصیلات کے لئے سورۂ ابراہیم کا مطالعہ کریں)۔

تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ زمانہء جاہلیت میں بھی عرب، خانہ کعبہ کو نہایت عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور شریعت ابراہیمیہ میں قرار پانے والا فریضہ سمجھتے ہوئے حج کرنے آتے تھے، اور تاریخ سے یہ بھی ثابت ہے کہ عربوں کے علاوہ دیگر لوگ بھی خانہ کعبہ کی تعظیم کرتے اور اسے نہایت احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ یہی بات اس کے "ہدی للعالمین" ہونے کی دلیل ہے کہ اس کے ذریعہ لوگ قلبی توجہ کے ساتھ خداوند عالم کا ذکر کرتے تھے، اور ظہور اسلام کے بعد کی صورتحال واضح ہے کہ روئے زمین کے مشرق و مغرب میں خانہ کعبہ کا نام عام ہے اور اس نے لوگوں کی سوچوں اور دلوں میں اپنی محبت اور اپنی یاد کا چراغ روشن کر دیا ہے اور مسلمانوں کی عبادات، اطاعتی اعمال، قیام وقعود، اٹھنا بیٹھنا، جانور ذبح کرنا اور زندگی کے تمام دیگر امور میں بیت اللہ کی طرف رخ کرنا بنیادی عقیدہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

بنابرایں خانہء کعبہ ہدایت کے تمام حوالوں کا امین ہے یعنی فکر اور سوچ سے لے کر عمل کے وسیع دائرہ تک اسے ہی

مرکزیت حاصل ہے اور خدا کے مخلص بندوں میں سے طاہر و پاک افراد ہی اس سے وابستہ رہتے ہیں ان کے علاوہ کوئی اسے چھو بھی نہیں سکتا۔

اس کے علاوہ یہ کہ خانہء کعبہ تمام مسلمانان عالم کو ان کی دنیوی سعادت کی راہ بھی دکھاتا بلکہ اس پر لاتا ہے کہ جو وحدت کلمہ اور اتحاد امت اور باہمی ہم آہنگی و یکجہتی کے عملی آثار و فوائد سے عبارت ہے، اس کے ساتھ ساتھ وہ غیر مسلم دنیا کے لئے بھی ہادی و راہنما کا کام کرتا ہے کہ انہیں خواب غفلت سے بیدار کرتا ہے اور انہیں امت کی وحدت و اتحاد و ہم آہنگی و یکجہتی اور مختلف و پراگندہ قوتوں کے یکجا ہونے کے بعد نتائج و فوائد سے آگاہی دلاتا ہے۔

ان مطالب سے یہ ثابت ہوا کہ :

(۱) خانہء کعبہ دنیا و آخرت دونوں کی سعادت کے حصول کی راہ دکھاتا ہے اور اس میں ہدایت کے تمام مدارج و مراتب شامل ہیں لہٰذا اس کی ہدایت، مطلق ہے کہ جس کا دائرہ وسیع اور تمام اقسام کا جامع ہے۔

(۲) خانہء کعبہ تمام عالمین کے لئے ہادی و راہنما ہے نہ کہ کسی خاص زمانہ اور مخصوص قوم و قبیلہ کے لئے، مثلاً آل ابراہیمؑ کے لئے یا عربوں یا صرف مسلمانوں کے لئے، بلکہ اس کی ہدایت کا دائرہ وسیع ہے، وہ ہر زمانہ اور ہر قوم کے لئے سرچشمۂ ہدایت ہے۔

واضح نشانیاں اور مقام ابراہیمؑ

○ " فِيهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ "
(اس میں واضح نشانیاں، مقام ابراہیم ہے)

آیات کی توصیف بینات سے ہوئی ہے یعنی آیات کو بینات (واضح نشانیاں) کہا گیا ہے اس سے آیات کا اس خصوصیت سے بہرہ ور ہونا ثابت ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود اس خصوصیت کے بارے میں ابہام دور نہیں ہوتا بلکہ صورتحال غیر واضح رہتی ہے کیونکہ یہاں بیت اللہ کی خصوصیات کا تذکرہ مقصود ہے اور اس امتیازی صفت کا بیان مطلوب ہے جس کی بناء پر اسے دیگر جگہوں پر برتری حاصل ہے لہٰذا اس حوالہ سے مقامی مناسبت واضح بیان کی متقاضی ہے کہ ایسی توصیف ہو جس میں ابہام تو بجائے خود، اجمال بھی نہ پایا جائے۔

بنا برایں یہ کہنا بجا ہوگا کہ جملہ "مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ۭ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ...... الـــخ"

دراصل "اٰیٰتٌ بَیِّنٰتٌ" کی تفسیر وتوضیح ہے یعنی آیات سے مراد، مقام ابراہیم، بیت اللہ میں داخل ہونے کا باعث امن ہونا اور تمام مستطیع لوگوں پر اس کا حج واجب ہونا ہے۔

لیکن بعض مفسرین کا یہ اظہار خیال درست نہیں کہ یہ تین جملے (مقام ابراہیم، وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا، وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا "، "اٰیٰتٌ بَیِّنٰتٌ" کا بدل یا عطف بیان ہے، کیونکہ اگر ایسا ہو تو اس میں کلام کو یوں فرض کرنا پڑے گا: "هی مقام ابراهیم......الخ" کہ وہ آیات یہ ہیں: "مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ......الخ"، اور اس میں حرف "ان" بھی فرض کرنا پڑے گا کہ "وَمَنْ دَخَلَهٗ" خواہ جملہ انشائیہ ہو یا جملہ خبریہ ہو اس کی بازگشت مفرد کی طرف ہے، اور یہ بھی کہنا پڑے گا کہ جملہ انشائیہ "وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ......" کی بازگشت جملہ خبریہ کی طرف ہے کہ اس بناء پر پھر اسے سابقہ جملہ کی طرف عطف کر کے اسے مفرد کی حیثیت دی جائے گی یا اس میں بھی حرف "ان" مقدر مانا جائے گا، لیکن کلام الٰہی میں ایسا کوئی ثبوت یا اشارہ نہیں ملتا جس کی بناء پر ان تمام امور میں سے کسی ایک کی تائید ہوتی ہو، لہٰذا ان تین جملوں کو نہ تو "اٰیٰتٌ بَیِّنٰتٌ" کا بدل قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ ہی عطف بیان مانا جا سکتا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ تینوں جملے ایک خاص غرض کے لئے لائے گئے ہیں اور وہ یہ کہ بتایا جائے کہ مقام ابراہیم اسی جگہ ہے اور یہ کہ بیت اللہ کا حج واجب ہے، اس بناء پر ان تین جملوں کا ذکر کیا جانا اہم ترین مقصد کا حامل ہے، اس کی مثال ہمارے روزمرہ کے اظہارات میں بھی موجود ہے اور وہ یہ کہ ہم ایک دوسرے سے کہتے ہیں کہ فلاں شخص شریف آدمی ہے، وہ فلاں کا بیٹا ہے، مہمان نواز ہے، ہمیں بھی اس جیسا ہونا چاہیے......تو اس میں آخری تین جملے (وہ فلاں کا بیٹا ہے، مہمان نواز ہے، ہمیں بھی اس جیسا ہونا چاہیے) پہلے جملہ کا نہ تو بدل ہے اور نہ ہی عطف بیان ہیں......،

مقام ابراہیمؑ کا تذکرہ

○ "مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ"
(ابراہیم کا مقام)

یہ الفاظ یعنی "مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ" ایک محذوف خبر کا مبتداء ہے لہٰذا اصل جملہ یوں تصور کیا جائے گا: "فیه مقام ابراهیم" (اس میں مقام ابراہیم ہے)۔

مقام ابراہیم اس پتھر کو کہتے ہیں جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدموں کا نشان ثبت ہے، کثیر روایات سے

ثابت ہوتا ہے کہ اسی جگہ وہ پتھر مدفون ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیمؑ نے خانہء کعبہ کی دیواریں کھڑی کی تھیں، اس کا محل وقوع مطاف کے نزدیک ملتزم کے بالمقابل ہے، اسی مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عم الرسولؐ حضرت ابوطالب علیہ السلام نے اپنے قصیدۂ لامیہ میں یوں ارشاد فرمایا:

"وموطیء ابراهیم فی الصخر رطبة علٰی قدمیه جافیاً غیر فاعل"

(ابراہیم کے قدموں کی جگہ تازہ نرم پتھر میں ہے کہ جس پر ان کے بغیر نعلین کے پاؤں ثبت ہیں)

لفظ "مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ" سے یہ بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ یا تو بیت اللہ ہی مقام ابراہیم ہے یا بیت میں مقام ابراہیم واقع ہے کہ یہاں وہ عبادت الٰہی بجالاتے تھے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ آیت سے فہم المعنی کے لئے عبارت کو یوں فرض کیا جائے: "هی مقام ابراهیم والامن والحج" (وہ آیات مقام ابراہیم، امن اور حج سے عبارت ہے) اور پھر ان دو جملوں: "وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا" اور "وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا" جو کہ ایک فرمان اور حکم انشائی پر مشتمل ہیں دو خبری جملوں کی حیثیت دی جائے (انشائی جملوں کو خبری جملے قرار دیا جائے)، تو یہ بات قرآن مجید کے نہایت عمدہ ترین اسلوب بیان کا ایک نمونہ ہوگا کہ اس میں کلام سے دو مقصد و معنی ملحوظ ہیں یعنی جو کلام کسی خاص معنی و غرض کے لئے ہے اسے اس غرض کے ساتھ ساتھ کسی دوسری غرض و معنی کے لئے بھی استعمال کیا جائے تو ایک کی جگہ دوسری کو لاکر سننے والے کی توجہ ایک معنی سے دوسرے معنی کی طرف منتقل ہو جائے اور ایک کلام دو معنوں کا افادہ کرے۔ اور اس میں دونوں ملحوظ جہتیں محفوظ رہیں، اور یہ اس ی طرح سے ہے جیسے کسی کے کلام کو بیان کرنے میں خبر دینے کا اسلوب اپنایا جائے، اس کی قرآنی مثالیں ملاحظہ ہوں:

سورۂ بقرہ، آیت ۲۸۵:

○ "كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ"

(سبھی ایمان لائے اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر، ہم اس کے رسولوں میں سے کسی ایک کے درمیان فرق نہیں کرتے)

اس آیت میں پہلے ہر شخص کے ایمان لانے کا تذکرہ ہوا، پھر ان کی زبانی انبیاء الٰہی علیہم السلام کے درمیان عدم تفریق کی بات بیان کی گئی۔

اس کی مانند ایک آیت یہ ہے:

سورۂ بقرہ، آیت :۲۵۸

○ "اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِيْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ

وَ يُمِيْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْيٖ وَ اُمِيْتُ ؕ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ "

(کیا تو نے نہیں دیکھا اس شخص کو جو ابراہیم سے اس کے رب کے بارے میں بحث ونزاع کر رہا تھا کہ خدا نے اسے حکمرانی عطا کی تھی، جب ابراہیم نے کہا کہ میرا رب زندہ کرتا ہے اور موت دیتا ہے تو اس نے کہا میں بھی زندہ کرتا ہوں اور موت دیتا ہوں، ابراہیم نے کہا کہ اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو مغرب سے نکال لے، تو کافر مبہوت ہو گیا، اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا)۔

ایک آیت میں یوں ارشاد ہوا:

سورۂ بقرہ، آیت :۲۵۹

○ " اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّ هِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَ شَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۚ وَ انْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَ لِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَ انْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ؕ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ "

(یا اس شخص کی طرح کہ جو ایک بستی سے گزرا جو کہ اوندھے منہ گری ہوئی تھی (تباہ و برباد ہو چکی تھی) تو اس نے کہا کہ اللہ اسے مرنے کے بعد کس طرح زندہ کرے گا؟ تو اللہ نے اسے ایک سو سال تک موت کے منہ میں دے دیا، پھر اسے اٹھایا اور پوچھا کہ تو کتنی دیر یہاں قیام پذیر رہا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ ایک دن یا دن کا کچھ حصہ! خدا نے کہا کہ تو ایک سو سال یہاں قیام پذیر رہا ہے، تو اپنا کھانا پانی دیکھ کہ ابھی تک خراب نہیں ہوئے اور اپنے گدھے (سواری) کو دیکھ، ہم نے یہ سب اس لئے کیا ہے تا کہ تجھے لوگوں کے لئے نشانی بنا دیں، اب تو ہڈیوں کو دیکھ کہ کس طرح ہم ان کو جوڑتے ہیں اور پھر ان کو گوشت کا لباس پہناتے ہیں، جب یہ تمام حقائق اس پر واضح ہو گئے تو کہنے لگا کہ میں بخوبی آگاہ ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے)

مذکورہ بالا دونوں آیتوں (۲۵۸، ۲۵۹) میں جو اسلوب بیان اختیار کیا گیا ہے اس کی وضاحت دوسری آیت (۲۵۹) کی تفسیر میں ہو چکی ہے۔

دیگر دو آیتیں ملاحظہ ہوں:

سورۂ شعراء، آیت :۸۹

○ " یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ۙ اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ "

(اس دن نہ مال کوئی فائدہ دے گا اور نہ ہی اولاد کام آئے گی سوائے اس شخص کے کہ جو بارگاہِ الٰہی میں قلب سلیم کے ساتھ آئے)۔

سورۂ بقرہ، آیت :۱۷۷

○ "لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ ۚ وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ ۙ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَی الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ "

(نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے رخ مشرق یا مغرب کی طرف کرلو، بلکہ نیکی یہ ہے کہ جو شخص اللہ پر، آخرت کے دن پر، فرشتوں پر، کتابوں پر اور نبیوں پر ایمان لائے اور اللہ کی محبت میں اپنا مال دے قریبیوں کو، یتیموں کو، مسکینوں کو، مسافروں کو، مانگنے والوں کو اور غلام آزاد کرانے میں !اور نماز قائم کرے، اور زکوٰۃ ادا کرے، اور وہ اپنے وعدوں کو پورا کرنے والے ہوں جب بھی وعدہ کریں، اور تکلیفوں وسختیوں اور شدت کے وقت صبر کرنے والے ہوں، وہی لوگ سچے اور وہی پرہیز گار ہیں)

تو اس آیت میں نیکی کی جگہ نیک شخص کا ذکر ہوا ہے۔

سورۂ بقرہ، آیت :۱۷۱

○ " وَمَثَلُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِیْ یَنْعِقُ بِمَا لَا یَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً ؕ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ "

(کافروں کی مثال اس شخص جیسی ہے جو ریوڑ کو چیخ چیخ کر آواز دیتا ہے کہ جسے جو سنتا نہیں سوائے اس کی پکار اور ہمہمہ کے، وہ گونگے، بہرے اور اندھے ہیں، وہ کچھ بھی نہیں سمجھتے (عقل سے عاری ہیں)

اس طرح کے اسلوبِ بیان پر مشتمل متعدد آیات قرآن مجید میں موجود ہیں کہ جن میں مثالوں کے ذریعے مطلوبہ معنی پیش کیا گیا ہے۔

بنابرایں آیت مبارکہ " فِیْهِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِیْمَ ۚ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ وَلِلّٰهِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ

الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْهِ سَبِیْلًا ؕ وَمَنْ کَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ"، انشاء اور اخبار کے درمیان مردد ہونے کے حوالہ سے درج ذیل آیت مبارکہ کی طرح ہے:

سورۂ ص، آیت: ۴۴

○ " وَاذْکُرْ عَبْدَنَآ اَیُّوْبَ ۘ اِذْ نَادٰی رَبَّهٗٓ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الشَّیْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ ؕ ﴿۴۱﴾ اُرْکُضْ بِرِجْلِکَ ۚ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ ﴿۴۲﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنَّا وَذِکْرٰی لِاُولِی الْاَلْبَابِ ﴿۴۳﴾ وَخُذْ بِیَدِکَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ ؕ اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ؕ نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ "

(ہمارے بندے ایوب کو یاد کرو کہ جب اس نے اپنے پروردگار کو پکارا کہ شیطان نے مجھے سخت تکلیف و دکھ پہنچایا ہے (ہم نے اس سے کہا) اپنا پاؤں زمین پر مارو، یہ ٹھنڈا اور پینے کا پانی ہے (اس سے غسل کرو اور اسے پیو) اور ہم نے اپنی رحمت سے اسے اس کے اہل وعیال اور ان جیسے دیگر بھی عطا کیے، جو کہ صاحبان عقل کے لئے مایۂ نصیحت ہے، اور (ہم نے اس سے کہا) سینکوں کا ایک گچھا ہاتھ میں لے لو اور اسی سے اسے مارو اور اپنی قسم کی خلاف ورزی نہ کرو، ہم نے اسے صابر اور بہترین بندہ پایا، بے شک وہ بڑی لو لگانے والا تھا)۔

اس آیت مبارکہ میں بھی ہماری زیر بحث آیت کی طرح خبری اور انشائی دونوں طرح کے جملے پائے جاتے ہیں اور ان کے درمیان اس قدر آمیزش ہے کہ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔

اور ہم نے جو مطالب پیش کئے ہیں وہ ان مطالب سے مختلف ہیں جو دیگر مفسرین نے زیر بحث آیت مبارکہ کی تفسیر میں پیش کیے اور کہا کہ یہ تین جملے (مَّقَامُ اِبْرٰهِیْمَ ، وَمَنْ دَخَلَهٗ کَانَ اٰمِنًا ، وَلِلّٰهِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ) ابتدائی الفاظ "فِیْهِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ" کا بدل ہیں، اگر ہم ان کو بدل ہی قرار دیں تو بہتر ہے کہ صرف الفاظ "مقام ابراہیم" ہی کو بدل قرار دیں اور دوسرے دو جملوں کو جملہ ہائے مستانفہ (نئے جملے، مستقل کلام) قرار دیں کہ جو بدل قرار پائے، دو محذوف جملوں کی نشاندہی کرتے ہیں، اس بناء پر آیت سے فہم المعنیٰ کے لئے عبارت یوں فرض کرنی پڑے گی، "**فیه آیات بینات مقام ابراهیم و أمن الداخل و حج المستطیع للبیت**"، (اس میں واضح نشانیاں مقام ابراہیم اور داخل ہونے والے کے لئے امن اور استطاعت رکھنے والے کے لئے بیت اللہ کا حج) اور یہ بات ہر طرح کے شک وشبہ سے خالی ہے کہ مذکورہ تین امور میں سے ہر ایک اپنے تئیں خداوند عالم کے وجود کی روشن دلیل ونشانی ہے اور اس کے عظیم مقام ومرتبہ کی یاد تازہ کرتی ہے کیونکہ لفظ "آیت" کا معنی ہی علامت ونشانی اور کسی چیز کے وجود پر دلالت کرنے والی چیز ہے خواہ جس حوالہ و بنیاد پر دلالت کرے، تو "مقام ابراہیم" سے بالاتر کون سی علامت ونشانی ایسی ہوسکتی ہے جو اہل دنیا کی نگاہ میں خداوند عالم کا عظیم و بلند

مقام یاد دلائے، اور بیت اللہ سے بڑھ کر کون سی ایسی عمارت ہے جو اپنے اندر داخل ہونے والوں کے لئے امن وامان کا گہوارہ ہو؟ اور اعمال ومناسک حج سے بالاتر کون سے ایسے عبادتی اعمال ہیں جو سالہا سال سے افرادِ بشر کی اجتماعی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں کہ ہر سال لاکھوں کروڑوں انسان ان اعمال کی انجام دہی کے ذریعے خدا کی بارگاہ میں اظہار عبودیت وبندگی کرتے ہیں اور گردش لیل ونہاران کی تازگی کو کم نہیں کر سکتی؟ تو ان امور کا آیت وعلامت ہونا ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔

اب رہی یہ بات کہ آیا ضروری ہے کہ ہر آیت وعلامت خارق العادت ہو اور عالم الطبیعہ میں جاری وساری نظام واصولوں سے ماوراء ہو؟ تو اس کا جواب منفی ہے اور اسے ہرگز واجب ولازمی قرار نہیں دیا جا سکتا، نہ تو لفظ ''آیت'' اپنے مفہوم کے ساتھ اس پر دلالت کرتا ہے اور نہ ہی قرآنی استعمال سے اس کا اس معنی میں منحصر ہونا ثابت ہوتا ہے کیونکہ کسی چیز کا معجزہ وخارق العادت ہونا اس لفظ کے مصادیق میں سے ایک تو ہو سکتا ہے لیکن اس کا معنی ہرگز نہیں ہو سکتا چنانچہ سورۂ بقرہ، آیت ۱۰۶ ''مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا'' (ہم جو آیت منسوخ کرتے ہیں اسے بھلواتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی لے آتے ہیں) اس آیت مبارکہ میں لفظ ''آیت'' وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے یہاں تک کہ اس میں شریعت کے منسوخ احکام بھی شامل ہیں، اور سورۂ شعراء، آیت ۱۲۸ میں لفظ ''آیت'' کو علامت ونشانی کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے چنانچہ ارشاد ہوا: ''اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ'' (کیا تم ہر بلند جگہ پر بے مقصد نشانیاں بناتے رہتے ہو؟)۔ اس کے علاوہ بھی قرآن مجید میں متعدد آیات موجود ہیں جن میں لفظ ''آیت'' معجزہ کے علاوہ دیگر معانی میں استعمال ہوا ہے۔

مذکورہ بالا مطالب سے بعض مفسرین کی طرف سے ''مقام ابراہیم'' کو خارق العادت اور آیت المعجزہ قرار دینے پر مصر ہونے کا راز بھی کھل جاتا ہے اور یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امن اور حج کا تذکرہ آیت کے مقصودہ معنی کو واضح کرنے کی غرض کے علاوہ کے لئے ہوا ہے، لفظ ''آیت'' کی وضاحت کے لئے نہیں ہوا۔

اسی طرح ان مفسرین کرام کے اظہارات سے بھی پردہ اٹھ جاتا ہے جنہوں نے ''آیات بینات'' سے قطعی طور پر ان تین چیزوں کے علاوہ خانۂ کعبہ کی دیگر خصوصیات مراد لی ہیں، (ہم نے ان اقوال وآراء کو یہاں ذکر کرنے سے گریز کیا ہے لہٰذا جو شخص ان سے آگاہی حاصل کرنا چاہے وہ ان تفاسیر کا مطالعہ کرے جن میں وہ تفصیلات مذکور ہیں) کیونکہ اس قول کی بنیاد بھی یہ ہے کہ لفظ ''آیات بینات'' سے معجزہ وخارق العادت امور مراد ہوں، جبکہ اس مطلب کا کوئی ثبوت ودلیل ہمارے پاس موجود نہیں جیسا کہ ہم سابقہ بیانات میں ذکر کر چکے ہیں۔

بنا برایں حق بات تو یہ ہے کہ جملہ ''وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا'' کسی تکوینی خصوصیت کو بیان نہیں کرتا بلکہ ایک تشریعی حکم وعملی دستور کے بیان پر مشتمل ہے، البتہ یہ بات ممکن ہے کہ اس جملہ خبریہ کے بارے میں یہ کہا جائے کہ اس میں ایک

سابقہ تشریعی حکم کی خبر دی گئی ہے کہ جو امن کی غرض کا حامل ہے چنانچہ سورۂ بقرہ اور سورۂ ابراہیم میں مذکورہ دعا دعوت ابراہیمیؑ سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے اور اس کی مزید تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ بعثت نبویؐ سے قبل بھی زمانہء جاہلیت میں عرب بیت اللہ کو اسی مقام کا حامل سمجھتے تھے اور اس کی کڑیاں بلکہ بنیاد حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ سے ملتی ہے۔

امن و امان سے کیا مراد ہے؟

ممکن ہے کہ جملہ "وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ اٰمِنًا" (جو اس میں داخل ہوا وہ دائرہء امن میں آ گیا) سے یہ سمجھا جائے کہ اس کے ذریعے مطلع کیا گیا ہے کہ امن و امان کو تباہ کرنے والے حوادث و ہولناک فتنے اس گھر میں وقوع پذیر نہیں ہوں گے اور نہ ہی دیگر علاقوں میں رونما ہونے والے وحشت ناک واقعات اس مقدس گھر کو اپنی لپیٹ میں لے لیں گے۔

لیکن اس قول و رائے کا نادرست ہونا اس میں وقوع پذیر ہونے والے ناگوار واقعات، قتل و غارت اور تباہ کن جنگوں ہی سے ثابت ہوتا ہے بالخصوص وہ واقعات جو زیر بحث آیت مبارکہ کے نزول سے پہلے وہاں رونماں ہوئے۔

اور جہاں تک سورۂ عنکبوت کی آیت ۶۷ کا تعلق ہے کہ جس میں ارشاد الٰہی ہوا:

" اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ "

(کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے حرم کو امن و امان کی جگہ قرار دیا ہے جبکہ اس کے اردگرد کے علاقے دشمنوں کے حملوں کا نشانہ بنے ہوئے ہیں)

تو اس سے صرف یہی ثابت ہوتا ہے کہ حرم میں امن و امان قائم و باقی رہے گا، اس سے زیادہ کوئی مطلب ثابت نہیں ہوتا اور وہ صرف اس حوالہ سے کہ لوگ اس کو نہایت عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھیں گے اور اس کی تعظیم واجب و لازمی قرار دیں گے کہ جس کا ثبوت و حکم شریعت ابراہیمیؑ میں موجود ہے اور بالآخر خداوند عالم اسے عبادتی حیثیت عطا کرے گا اور اسے تشریعی فرمان میں ڈھال دے گا۔

یہی صورت حضرت ابراہیمؑ کی دعاؤں میں ملتی ہے جن میں انہوں نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا: (ملاحظہ ہو)

سورۂ ابراہیم، آیت: ۳۵

○ "رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا"

(پروردگارا! اس شہر کو گہوارۂ امن بنا دے)

سورۂ بقرہ، آیت :۱۲۶

○ "رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا"

(پروردگارا ! اس شہر کو امن دینے والا بنا دے)

ان دعاؤں میں حضرت ابراہیمؑ نے خداوند عالم سے شہر مکہ کے لئے امن مانگا ہے، تو خدوند عالم نے ان کی دعا کو شرف قبولیت عطا کرتے ہوئے ایک تشریعی فرمان جاری کر کے اسے گہوارۂ امن بنا دیا اور ایسا عبادتی حکم جاری کر دیا کہ لوگ جوق در جوق اس کی طرف آئیں اور ہر زمانہ میں اپنے قلبی لگاؤ کے ساتھ حکم خداوندی پر سر تسلیم خم کرنے کا عملی مظاہرہ کرتے رہیں۔

فریضہء حج کا فرمان

○ "وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا"

(اور اللہ کے لئے لوگوں پر بیت کا حج واجب ہے جو بھی اس تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو)

لفظ "حج"، ح کے نیچے زیر کے ساتھ......اور ح پر زبر کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے......کا معنی قصد وارادہ ہے، پھر وہ ان اعمال کی انجام دہی کے لئے بیت اللہ کا قصد کرنے کے معنی میں استعمال سے مختص ہو گیا جو شریعت نے بیان کئے۔

لفظ "سَبِيلًا" ادبی حوالہ سے فعل "استطاع" سے تمیز واقع ہوا ہے۔

یہ آیت مبارکہ فریضۂ حج کے فرمان خداوندی پر مشتمل ہے اور یہ وہی اعمال ومناسک حج ہیں جن کا آغاز حضرت ابراہیمؑ سے ہوا چنانچہ اس کا ثبوت سورۂ حج کی آیت ۲۷ میں ان الفاظ میں ملتا ہے، "وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ" ......لوگوں میں فریضہء حج کا اعلان کرو......، اس میں خداوند عالم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ لوگوں کو فریضہء حج سے آگاہی دلائیں اور ان میں اس فرمان خدائی کا اعلان کریں۔ اس سے یہ بھی ظاہر وواضح ہوتا ہے کہ جملہ "وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ" جملہ "وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا" کی طرح سابقہ تشریعی حکم کی خبر دیتا ہے، اگرچہ یہ بھی ممکن ہے کہ جملہ انشائیہ ہو یعنی اس میں سابقہ حکم سے آگاہی دلانے کی بجائے مستقل فرمان جاری کرنا مقصود ہو البتہ امضائی صورت میں ! یعنی حضرت ابراہیمؑ کے شروع کردہ اعمال حج پر مہر تصدیق ثبت کرنے کی صورت میں ہو، لیکن سیاق الکلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا جملہ خبریہ ہونا زیادہ اقرب الی الواقع ہے یعنی تشریعی حکم کی خبر پر مشتمل ہونا زیادہ واضح وروشن ہے۔

حج کا انکار

○ " وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ "
(اور جوشخص انکار کرے تو خدا، عالمین سے بے نیاز ہے)

یہاں لفظ" کفر" سے مرادفروع دین کا انکار ہے اور یہ اسی طرح ہے جیسے نماز وزکوۃ کو ترک کرنا کفر ہے، تو" کفر" سے مراد ترک کرنا ہے، اس بناء پر یہ کلام ایسا قرار پائے گا جس میں سبب کی جگہ مسبب اور سرچشمۂ اثر کی جگہ اثر کو لایا گیا ہو جیسا کہ جملہ " فان الله غنی عن العالمین " معلول کی جگہ علت کو ذکر کرنے کے طور پر ہے۔ لہٰذا آیت سے فہم المعنی کے لئے عبارت کو اس طرح فرض کرنا پڑے گا: "ومن ترک الحج فلا یضر الله شیئاً فان الله غنی عن العالمین" (اور جوشخص حج کو ترک کرے یعنی اسے انجام نہ دے تو وہ خدا کو کوئی ضرر ونقصان نہیں پہنچائے گا کیونکہ خدا تمام عالمین سے بے نیاز ہے)۔

روایات پر ایک نظر

پہلا گھر ہونے کا معنی

ابن شہر آشوب نے حضرت امیر المؤمنینؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے آیت مبارکہ " ان اول بیت وضع الناس......الخ" کی تفسیر میں اس شخص کے جواب میں جس نے امامؑ سے پوچھا کہ کیا خانۂ کعبہ ہی پہلا گھر ہے؟ ارشاد فرمایا:

" لا، قد كان قبله بيوت ولكنه اول بيت وضع للناس مباركاً فيه الهدى والرحمة والبركة، واول من بناه ابراهيم ثم بناه قوم من العرب من جرهم، ثم هدم فبنت العمالقة، ثم هدم فبناه قريش"۔

نہیں ایسا نہیں ہے، بلکہ اس سے پہلے بھی دیگر گھر موجود تھے، لیکن خانۂ کعبہ وہ پہلا برکت والا گھر ہے جو لوگوں کے لئے بنایا گیا کہ جس میں ہدایت، رحمت اور برکت ہے، اور سب سے پہلے اسے حضرت ابراہیمؑ نے بنایا، پھر جرہم کے عربوں

نے بنایا، پھر وہ گر گیا تو عمالقہ نے اسے تعمیر کیا، پھر گر گیا تو قریش نے اس کی تعمیر نو کی،
(ملاحظہ ہو، تفسیر البرہان، جلد اول ص ۳۰۱)

درمنثور کی روایت

تفسیر "درمنثور" میں مذکور ہے کہ ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے شعبی کے حوالہ سے امام علی بن ابی طالب علیہما السلام سے روایت کی ہے کہ آپؑ نے آیت مبارکہ " اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىْ بِبَكَّةَ " کی تفسیر میں ارشاد فرمایا: "**کانت البیوت قبلهٔ ولکنه کان اول بیت وضع لعبادة الله**"، اس سے پہلے گھر تو موجود تھے مگر وہ پہلا گھر ہے جو لوگوں کے لئے خدا کی عبادت کی غرض سے بنایا گیا، (تفسیر "درمنثور"، جلد دوم، صفحہ ۵۲)

اس روایت کے مانند ابن جریر نے مطر کے حوالہ سے ایک روایت بیان کی ہے، البتہ اس مطلب کی حامل روایات کثرت سے موجود ہیں۔

بکہ اور مکہ

کتاب علل الشرائع میں حضرت امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا: "**موضع البیت بكة والقرية مكة**"، بکہ وہ جگہ ہے جہاں خانہ خدا واقع ہے اور "مکہ" بستی کا نام ہے،
(علل الشرائع، صفحہ ۳۹۷ باب ۱۳۷)

بکہ کی وجہ تسمیہ

علل الشرائع ہی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا فرمان مذکور ہے، آپؑ نے ارشاد فرمایا:
"**انما سمیت بکة بكة لان الناس یبکون فیها**"
بکہ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ لوگ یہاں کثرت کے ساتھ جمع ہوتے ہیں (ہجوم کرتے ہیں)۔
(علل الشرائع، ص ۳۹۷ باب ۱۳۷)

"یبکون" سے مراد، یزدحمون ہے یعنی ازدحام کرتے ہیں۔

اسی کتاب میں ایک روایت حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا:

" انما سمیت مکة بکة ، لانه یبک بها الرجال والنساء، والمرأة تصلی بین یدیک و عن یمینک و عن شمالک و معک ولاباس بذلک، انما یکره ذلک فی سائر البلدان "

مکہ کو بکہ اس لئے کہا جانے لگا کہ وہاں مردوں اور عورتوں کا مخلوط ہجوم ہوتا تھا، (اب بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ) عورت تمہارے سامنے، تمہارے دائیں و بائیں اور تمہارے ساتھ کھڑی ہو کر نماز ادا کرتی ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں جبکہ دیگر مقامات میں اس طرح کھڑے ہو کر نماز پڑھنا مکروہ ہے۔

(علل الشرائع، باب ۱۳۷، صفحہ ۳۹۷)

کعبہ کی منفرد ساخت

کتاب علل الشرائع میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا: خداوند عالم نے جب زمین کو خلق کرنا چاہا تو ہواؤں کو حکم دیا کہ پانی پر تھپیڑے دیں، تو اس سے موجیں بنتی گئیں، پھر وہ تہہ بہ تہہ جھاگ بنتا گیا اور پھر ایک جگہ جمع ہو گیا، اسی جگہ خانہء کعبہ واقع ہے، پھر اسے جھاگ کا پہاڑ بنا دیا، اور پھر اس کے نیچے سے زمین کو پھیلا دیا، اسی مطلب کو آیہء مبارکہ **" ان اول بیت وضع للناس للذی ببکة مبارکاً "** میں بیان کیا گیا ہے، تو روئے زمین پر خلق ہونے والا سب سے پہلا مقام خانہء کعبہ ہے کہ زمین کا دامن اسی سے پھیلتا چلا گیا۔

" لما اراد اللّٰه ان یخلق الارض امر الریاح فضربن متن الماء حتی صار موجاً، ثم ازبد فصار زبداً واحداً، تجمعه فی موضع البیت ، ثم جعلهٗ جبلاً من زبد، ثم دحی الارض من تحته، وهو قول اللّٰه " ان اول بیت وضع للناس للذی ببکة مبارکاً "، فاول بقعة خلقت من الارض الکعبة، ثم مدت الارض منها "۔ (علل الشرائع، باب ۱۳۷، صفحہ ۳۹۸)

دحوالارض یعنی زمین کے کعبہ کے نیچے سے پھیلائے جانے کے بارے میں کثرت سے روایات وارد ہوئی ہیں کہ جو نہ تو کتاب اللہ سے متصادم ہیں اور نہ ہی عقلی دلائل سے ان کی نفی ہوتی ہے، البتہ علم الطبیعہ کے قدیم ماہرین نے زمین کے بارے میں اس کے بسیط و قدیم عنصر ہونے کا نظریہ پیش کیا ہے جس کا مذکورہ بالا روایات کے تناظر میں نادرست ہونا ثابت ہے کہ جس کی وضاحت ضروری نہیں۔

بہرحال یہ ہیں وہ روایات جو آیت مبارکہ " ان اول بیت وضع الناس للذی ببکۃ مبارکاً " کی تفسیر میں وارد ہوئی ہیں اور ان میں بیت یعنی خانہء کعبہ کو روئے زمین پر واقع سب سے پہلا گھر قرار دیا گیا ہے، اگرچہ پہلی دو روایتیں آیت مبارکہ کے متن سے مطابقت کی حامل ہونے کے حوالہ سے زیادہ واضح ہیں۔

آیات بینات سے کیا مراد ہے؟

کتاب کافی اور تفسیر العیاشی میں مذکور ہے کہ ایک شخص نے " فِیۡہِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ " کی تفسیر کے حوالہ سے امام جعفر صادقؑ سے پوچھا کہ اس سے کیا مراد ہے ؟ تو امامؑ نے ارشاد فرمایا: اس سے مقام ابرہیمؑ کہ جہاں حضرت ابراہیمؑ پتھر پر کھڑے ہوئے تو ان کے قدموں کے نشان نقش و ثبت ہو گئے، اور حجر الاسود اور منزل اسماعیل مراد ہے۔

" انہٗ سئل ما ھذہ البینات ؟ قال(ع): مقام ابراھیم حیث قام علی الحجر فأثرت فیہ قدماہ، والحجر الاسود و منزل اسماعیلِ "

(کافی، جلد ۴ ص ۲۲۳ حدیث اول) (تفسیر العیاشی، جلد اول، ص ۱۸۷)

یاد رہے کہ "آیات بینات" کی تفسیر میں دیگر روایات بھی وارد ہوئی ہیں کہ ان میں جو چیزیں ذکر کی گئی ہیں شاید اس کی وجہ صرف ان کو شمار کرنا ہو، اگرچہ ان میں سے بعض کا ذکر آیات مبارکہ میں نہیں ہوا۔

مسجد الحرام کی توسیع کی کوشش

تفسیر العیاشی میں عبدالصمد سے روایت ذکر کی گئی کہ انہوں نے کہا: **"طلب ابو جعفر ان یشتری من اھل مکۃ بیوتھم ان یزید فی المسجد فأبوا، فارغبھم فامتنعوا، فضاق بذلک، فاتیٰ ابا عبداللّٰہ (علیہ السلام) فقال لہٗ: انی سألت ھؤلاء شیئاً من منازلھم وافنیتھم لنزید فی المسجد وقد منعوا فی ذلک فقد غمنی غماً شدیداً، فقال ابوعبداللّٰہ (ع) : لم یغمک ذلک وحجتک علیھم ظاھرۃ، فقال : وبما احتج علیھم؟ فقال (ع): بکتاب اللّٰہ، فقال: فی ایّ موضع؟ فقال (ع): قول اللّٰہ: " ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ "، وقد اخبرک اللّٰہ: ان اول بیت وضع للناس ھو الذی ببکۃ، فان کانوا ھم تولوا قبل البیت فلھم افنیتھم، وان کان البیت قدیماً فیھم فلہٗ فنائہ،**

فدعاهم ابو جعفر فاحتج علیهم بهٰذا، فقالوا لهٗ: اصنع ما احببت "

ابوجعفر (منصور دوانیقی) نے اہل مکہ سے درخواست کی کہ مسجد الحرام کے نزدیک اپنے گھروں کو اس کے ہاتھوں فروخت کریں تا کہ وہ مسجد میں توسیع کر سکے، مگر ان لوگوں نے انکار کر دیا، ابوجعفر نے انہیں راضی کرنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ نہ مانے اور اپنے انکار پر ڈٹے رہے۔ بالآخر ابوجعفر، حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور تمام روئیداد بیان کرتے ہوئے امامؑ کی خدمت میں عرض کی کہ میں نے ان لوگوں سے مسجد الحرام کی توسیع کی غرض سے کہا کہ وہ مسجد کے اطراف میں موجود اپنے گھر اس کے ہاتھوں بیچیں تا کہ وہ اس منصوبہ کو مکمل کر سکے مگر انہوں نے میری پیشکش قبول نہیں کی جس کی وجہ سے مجھے سخت رنج پہنچا ہے، امامؑ نے ارشاد فرمایا: تم رنجیدہ وغمگین نہ ہو کیونکہ تیرا مؤقف قوی اور ان پر تیری دلیل واضح ہے، ابوجعفر نے پوچھا: میری دلیل ومنطق کیا ہے؟ امامؑ نے ارشاد فرمایا: خدا کی کتاب ! اس نے پوچھا: یہ بات کتاب خدا میں کہاں مرقوم ہے ؟ امامؑ نے ارشاد فرمایا: یہ آیت مبارکہ ہے: "اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ......"، اس میں خداوند عالم نے تجھے آگاہ کیا ہے کہ سب سے پہلے گھر جو روئے زمین پر لوگوں کے لئے بنایا گیا وہ مکہ میں ہے (تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کعبہ سے پہلے کوئی گھر وہاں نہ تھا...... گویا کعبہ سے تعلق رکھنے والے علاقہ میں گھر بنائے)، پس اگر ان لوگوں نے بیت اللہ سے پہلے وہاں گھر بنائے تھے تو وہ اس علاقہ وسرزمین کے مالک ہیں اور اگر بیت اللہ ان سے قدیم تھا (پہلے اور پہلا گھر تھا) تو وہ علاقہ اسی سے تعلق رکھتا ہے، امامؑ کا ارشاد گرامی سن کر ابوجعفر نے اہل مکہ کو بلایا اور اپنے مؤقف ودلیل سے آگاہ کیا تو وہ کہنے لگے: آپ جو چاہتے ہیں وہ کر لیں۔ مسجد الحرام کے اپنے توسیعی منصوبہ پر عمل کریں......" (تفسیر العیاشی، جلد اول، صفحہ ۱۸۵)

مسجد الحرام کی توسیع پر لطیف استدلال

سمبل سکینہ
حیدر آباد لطیف آباد، یونٹ نمبر ۸، C-1

حسن بن علی بن نعمان سے روایت ہے: "**لما بنی المهدی فی المسجد الحرام بقیت دار فی تربیع المسجد فطلبها من اربابها فامتنعوا، فسئل عن ذلک الفقهاء، فکل قال لهٗ: انهٗ لا ینبغی ان تدخل شیئاً فی المسجد الحرام غصباً، فقال لهٗ علی بن یقطین: یا امیر المؤمنین ! انی اکتب الٰی موسی بن جعفر علیهما السلام لا خبرک بوجه الامر فی ذلک، فکتب الٰی والی المدینة ان یسأل موسی بن جعفر علیهما السلام عن دار اردنا ان ندخلها فی المسجد الحرام فامتنع علیها صاحبها فکیف المخرج من ذلک ؟ فقال ذلک لابی الحسن ، فقال ابو الحسن علیه السلام:**

فلا بد من الجوانب فی هذا ؟ فقال لهٗ: الامر لا بد منهٗ ، فقال لهٗ : اکتب: بسم اللّٰه الرحمٰن الرحیم، ان کانت الکعبة هی النازلة بالناس فالناس اولٰی بفنائها، وان کان الناس هم النازلون ببناء الکعبة فالکعبة اولٰی بفنائها، فلما اتی الکتاب الی المهدی اخذ الکتاب فقبله، ثم امر بهدم الدار، فاتی اهل الدار ابا الحسن علیه السلام فسألوه ان یکتب الی المهدی کتاباً فی ثمن دارهم، فکتب الیه ان ارضخ لهم شیئاً فارضاهم "۔

جب خلیفہ مہدی عباسی نے مسجد الحرام کا توسیعی منصوبہ شروع کیا تو مسجد کو مربع شکل دینے میں ایک مکان آڑے تھا، اس نے گھر والوں سے وہ جگہ مانگی تا کہ مسجد کی توسیع مکمل ہو سکے مگر انہوں نے انکار کر دیا، مہدی عباسی نے اس سلسلہ میں فقہاء سے استفساء کیا تو سب نے بالاتفاق یہی کہا کہ مسجد الحرام میں کوئی جگہ غصبی طور پر داخل کرنا جائز نہیں، اس وقت علی بن یقطین نے اس سے کہا کہ میں حضرت امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام کو خط لکھتا ہوں پھر تمہیں اس مسئلہ کا جواب دوں گا، چنانچہ علی بن یقطین نے والیءِ مدینہ کو خط لکھا کہ وہ حضرت امام موسیٰ بن جعفر علیہما السلام سے دریافت کرے کہ مسجد الحرام کے نزدیک ایک گھر ہے کہ جسے میں مسجد الحرام میں شامل کرنا چاہتا ہوں مگر اس گھر کا مالک راضی نہیں ہو رہا، اس سلسلہ میں کیا کروں؟ والیءِ مدینہ امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور مسئلہ دریافت کیا، امام ابوالحسن موسیٰ کاظم علیہ السلام نے ارشاد فرمایا : کیا اس کا جواب ضروری ہے ؟ والیءِ مدینہ نے کہا: ہاں، یہ نہایت ضروری ہے، امامؑ نے فرمایا: تو لکھو: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم : اگر خانہءِ کعبہ، مکہ کی تعمیر کے بعد بنا ہے تو لوگ اپنی زمین پر کعبہ سے زیادہ حق رکھتے ہیں، اور اگر کعبہ پہلے بنا اور اس کے بعد لوگوں نے اس کے اردگرد مکانات تعمیر کیے تو اس سرزمین پر کعبہ کا حق ہے۔ جب یہ خط مہدی عباسی کے ہاتھ میں پہنچا تو اس نے اس کا بوسہ دیا اور حکم دیا کہ اس شخص کے گھر کو گرا دیا جائے، گھر والے حضرت امام ابوالحسن علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ آپؑ مہدی عباسی کو خط لکھیں کہ انہیں گھر کی قیمت (معاوضہ) ادا کرے، امامؑ نے مہدی عباسی کو خط لکھا کہ ان لوگوں کو کچھ رقم دے کر راضی کر لو، مہدی نے امامؑ کے حکم کے مطابق ان لوگوں کو راضی کیا۔

(تفسیر العیاشی، جلد اول، ص ۱۸۶)

مسجد الحرام کی توسیع کے حوالہ سے مذکورہ بالا دو روایتیں نہایت لطیف استدلال پر مشتمل ہیں اور اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مسجد الحرام کی توسیع کا کام سب سے پہلے منصور دوانیقی نے کیا اور اسے مہدی عباسی نے پایہءِ تکمیل تک پہنچایا۔

فریضہء حج کی وضاحت

کتاب کافی میں ایک روایت ذکر کی گئی ہے کہ آیت مبارکہ "وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيْلًا" کی تفسیر میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: "**يعنی به الحج والعمرة جميعاً لانهما مفروضان**"، اس سے حج اور عمرہ دونوں مراد ہیں کیونکہ وہ دونوں واجب ہیں۔

یہ روایت تفسیر العیاشی میں بھی ذکر کی گئی ہے، البتہ اس میں لفظ "حج" کو اس کے لغوی معنی یعنی قصد سے تفسیر کیا گیا ہے۔

انکار سے مراد ترک کرنا ہے

تفسیر العیاشی میں مذکور ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے جملہ "ومن كفر" کی تفسیر میں ارشاد فرمایا کہ اس سے مراد "من ترک" ہے، یعنی "جس نے انکار کیا" سے مراد "جس نے ترک کیا" ہے۔

(تفسیر العیاشی، جلد اول، صفحہ ۱۹۲)

اس روایت کو شیخ طوسیؒ نے تہذیب میں ذکر کیا ہے (ملاحظہ ہو، التہذیب، جلد ۵ ص ۱۸ حدیث ۴)

قارئین کرام! آپ بخوبی آگاہ ہیں کہ کفر بھی ایمان کی طرح کئی درجات رکھتا ہے اور یہاں کفر سے مراد فروعِ دین کا انکار ہے۔

کون کافر ہے؟

کتاب کافی میں علی بن جعفر سے مروی ہے کہ انہوں نے اپنے بھائی امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام کے حوالہ سے بیان کیا کہ آپ نے ایک حدیث میں میرے اس سوال کے جواب میں کہ آیا ہم میں سے جو شخص فریضۂ حج ادا نہ کرے کیا وہ کافر ہے؟ ارشاد فرمایا: نہیں، وہ کافر نہیں، بلکہ کافر وہ ہے جو حج کے واجب ہونے کا انکار کرے۔

(فروع کافی، جلد ۴ ص ۲۶۵)

اس موضوع کی بابت کثیر روایات موجود ہیں اور مذکورہ بالا روایت میں "کفر" کی تفسیر اس کا انکار کرنے کے معنی

میں کی گئی ہے، البتہ آیت مبارکہ سے اس کا عندیہ نہیں ملتا، لہٰذا اس میں ''کفر'' سے اس کا لغوی معنی یعنی حق پوشی مراد ہے اور اس کا مصداقی تعین ہر مورد کے مخصوص حوالوں کی بنیاد پر ہوتا ہے۔

ایک تاریخی بحث

یہ بات قطعی ویقینی اور شہرۂ آفاق وتواتر کی حامل ہے کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے کعبہ کو بنایا اور جب اس کی تعمیر کا کام پایۂ تکمیل کو پہنچا تو اس کے اطراف میں جو لوگ سکونت پذیر ہوئے وہ ان کے فرزند ارجمند حضرت اسماعیل علیہ السلام اور یمنی قبائل میں سے بنی جرہم کے افراد تھے۔

خانۂ کعبہ کی عمارت مربع شکل میں تھی اور اس کے چار کونے چاروں سمتوں یعنی شمال، جنوب، مشرق ومغرب کی طرف اس طرح قائم ہیں کہ تند وتیز ہوائیں اور شدید ترین طوفان بھی اسے نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

کعبہ حضرت ابراہیمؑ کی تعمیر کردہ صورت وحالت پر باقی تھا کہ پہلی بار عمالقہ نے اس کی مرمت کی سعادت حاصل کی، پھر قبیلہ جرہم نے اس کی تعمیر نو کی (یا اس کے برعکس یعنی پہلے جرہم والوں نے اور پھر عمالقہ نے اس کی تعمیر نو کی، جیسا کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے منقول روایت میں بیان ہوا ہے)۔

یہاں تک کہ کعبہ کی تولیت کی ذمہ داری حضرت پیغمبر اسلامؐ کے ایک جد جناب قصی بن کلاب کے ہاتھوں میں آئی (یہ دوسری صدی قبل از ہجرت کا واقعہ ہے) چنانچہ انہوں نے اس کی بوسیدہ عمارت کو گرا کر دوبارہ تعمیر کرایا اور اس کی بنیادیں بہت مضبوط کیں، اور روم کے درخت کی لکڑی اور کھجور کے درخت کی شاخوں سے اس کی چھت بنائی، انہوں نے خانۂ کعبہ کے قریب ایک عمارت تعمیر کروائی جسے "دار الندوہ" کا نام دیا، وہ جگہ ان کے مرکز حکومت اور اپنے ساتھیوں سے مشاورت کے لئے مخصوص تھی، (جسے آج کی زبان میں پارلیمنٹ ہاؤس کہا جاتا ہے)، پھر انہوں نے قریش کے مختلف گروہوں کے درمیان خانۂ کعبہ کے اطراف واردگرد کے علاقے تقسیم کر دیئے تو ہر گروہ نے کعبہ کے اردگرد مطاف کے نزدیک اپنے گھر تعمیر کئے اور اپنے گھروں کے دروازے مطاف کے سامنے رکھے۔

بعثت نبویؐ سے پانچ برس پہلے سیلاب کی وجہ سے کعبہ منہدم ہو گیا تو قریش کے مختلف گروہوں نے اس کی تعمیر نو کے لئے متعلقہ کاموں کی ذمہ داریاں آپس میں تقسیم کر لیں۔ چنانچہ جو معمار اسے تعمیر کر رہا تھا وہ روم کا باشندہ تھا جس کا نام ''یاقوم'' تھا اور اس کی مدد کرنے والا ترکھان ایک مصری باشندہ تھا، جب حجر الاسود رکھنے کا وقت آیا تو وہ آپس میں جھگڑ پڑے کہ ان میں سے کون حجر الاسود نصب کرنے کے اعزاز کا حقدار ہے، وہ دونوں گروہ اس سلسلہ میں کسی نتیجہ تک نہ پہنچے، بالآخر

انہوں نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ اس مسئلہ کے حل کے لئے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فیصلہ کروائیں کیونکہ دونوں فریق آنحضرتؐ کی عقلمندی، فکری قوت وفراست اور دانائی ومعاملہ فہمی کے بلند پایہ مقام سے آگاہ تھے، اس وقت آنحضرت کا سن مبارک ۳۵ برس تھا، آنحضرتؐ نے ان سے فرمایا کہ ایک چادر لے آئیں، آپؐ نے حجر الاسود کو اس میں رکھ دیا اور تمام قبائل کو حکم دیا کہ وہ چادر کو مل کر اٹھائیں اور ہر قبیلہ کے افراد چادر میں ہاتھ ڈالیں تاکہ سب اس عزت واعزاز سے بہرہ مند ہو جائیں، آپؐ کے حکم وفیصلہ کے مطابق قبائل نے چادر کو مل کر اٹھایا اور اتنا بلند کیا کہ رکن شرقی میں واقع اس کے نصب کرنے کی جگہ تک پہنچ گئی تو آپؐ نے حجر الاسود کو خود اپنے ہاتھ میں لے کر دست مبارک سے اس کی اصل جگہ پر نصب کر دیا۔ (اس طرح قبائل کے درمیان جو سنگین تنازعہ شروع ہو چکا تھا نہایت خوش اسلوبی سے حل ہو گیا)۔

ادھر خانہ کعبہ کے تعمیری اخراجات نے ان لوگوں کی کمر توڑ دی تھی لہٰذا انہوں نے اس کی اونچائی اسی حد تک کافی سمجھی جواب ہے۔ اسی وجہ سے حجر اسماعیل کی جانب سے کچھ زمین حجر الاسود کی جانب باقی رہ گئی کیونکہ عمارت میں اس قدر وسعت نہ تھی۔

خانہ کعبہ اسی صورت میں باقی رہا یہاں تک کہ یزید بن معاویہ کے دور میں عبداللہ بن زبیر نے حجاز پر قبضہ کر لیا اور یزید نے اس کے مقابلے میں حصین کو سردار لشکر بنا کر بھیجا تو اس نے عبداللہ بن زبیر سے زبردست جنگ کی جس میں یزید کے فوجیوں نے کعبہ پر منجنیق سے پتھروں کی بارش کر دی جس سے کعبہ منہدم ہو گیا اور اس کا غلاف اور بعض لکڑیاں جل گئیں، پھر یزید کی موت کے بعد جنگ رک گئی تو ابن زبیر نے سوچا کہ عمارت کے باقی ماندہ حصہ کو مکمل طور پر گرا کر اسے دوبارہ تعمیر کرے، اس نے یمن سے صاف ستھری گچ ومضبوط چونا منگوا کر اس سے کعبہ کی تعمیر نو کی اور حجر کو بیت کا حصہ بنا دیا، اس نے دروازہ کو زمین تک نیچا رکھا اور قدیمی دروازہ کے بالمقابل ایک دوسرا دروازہ بنا دیا تا کہ لوگ ایک دروازہ سے داخل ہوں اور دوسرے دروازہ سے باہر نکلیں، اس نے عمارت کی بلندی ستائیس ذراع...... تقریباً ساڑھے تیرہ میٹر...... رکھی، جب عمارت مکمل ہو گئی تو اس نے کعبہ کو اندر اور باہر سے نہایت عمدہ وقیمتی عطر سے معطر کر دیا اور نہایت عمدہ ریشمی غلاف اس پر چڑھا دیا، یہ سارا کام ۱۷ رجب ۶۴ ہجری کو پایۂ تکمیل تک پہنچا۔

پھر جب عبدالملک بن مروان تخت خلافت پر بیٹھا تو اس نے عبداللہ بن زبیر سے جنگ کرنے کے لئے حجاج بن یوسف کی سربراہی میں ایک لشکر بھیجا، حجاج کے لشکر نے ابن زبیر کو شکست دی اور اسے قتل کر کے خود خانہ کعبہ میں داخل ہو گیا، پھر عبدالملک بن مروان کو کعبہ کی تعمیر کی بابت عبداللہ بن زبیر کے اقدامات سے آگاہ کیا، عبدالملک نے حکم دیا کہ اسے اس کی پہلی شکل میں لوٹا دیا جائے، چنانچہ حجاج نے اسے شمالی سمت سے تقریباً ساڑھے چھ ذراع گرا دیا، اور پھر اس دیوار کو قریش کی قائم کردہ بنیاد پر تعمیر کر دیا اور غربی دروازہ کو بند کر کے شرقی دروازہ کو سطح زمین سے اونچا کر دیا، پھر باقی ماندہ پتھروں سے اس کا

فرش بنا دیا۔

پھر جب ۹۶۰ ہجری میں سلیمان عثمانی سلطنت پر بیٹھا تو اس نے کعبہ کی چھت کو تبدیل کر دیا، پھر ۱۰۲۱ ہجری میں احمد عثمانی تخت نشین ہوا تو اس نے کعبہ کی مرمت کروائی، پھر ۱۰۳۹ ہجری میں شدید سیلاب کی وجہ سے کعبہ کی شمالی و شرقی اور غربی دیواروں کو سخت نقصان پہنچا اور وہ گر گئیں تو عثمانی سلطنت کے چوتھے تاجدار مراد نے اس کی مکمل مرمت کروائی جو کہ آج تک یعنی ۱۳۷۵ ہجری قمری (۱۳۳۸ھ شمسی) تک اسی حالت میں باقی ہے۔ (یہ تاریخ اس کتاب (المیزان) کی تالیف کے وقت تھی)

کعبہ کی شکل

کعبہ تقریباً مربع شکل میں بنا ہوا ہے، اسے نیلگوں سخت پتھروں سے بنایا گیا ہے، اس کی بلندی سولہ میٹر ہے جبکہ عہد نبویؐ میں اس کی بلندی اس سے کم تھی جیسا کہ روایات میں مذکور ہے کہ فتح مکہ کے دن حضرت پیغمبر اسلامؐ نے کعبہ میں رکھے ہوئے بتوں کو توڑنے کے لئے حضرت علیؑ کو اپنے کندھوں پر اٹھایا، اس کی شمالی سمت کہ جس میں میزابِ رحمت ......اور حجر اسماعیل......واقع ہے، اور جنوبی سمت جو کہ شمالی سمت کے عین مقابل ہے کا طول دس میٹر اور دس سنٹی میٹر ہے، اور جس جانب دروازہ ہے وہ اور اس کے عین مقابل سمت کا طول بارہ میٹر ہے، دروازہ زمین سے دو میٹر بلندی پر نصب ہے، اور حجر الاسود خانہ ء کعبہ میں داخل ہونے والے کے بائیں طرف واقع ہے (جب کوئی شخص کعبہ کے اندر داخل ہوتا ہے تو اس کے بائیں طرف کونے پر حجر الاسود نصب ہے) حجر الاسود مطاف کی زمین سے ڈیڑھ میٹر بلندی پر واقع ہے، حجر الاسود بیضوی شکل کا ناتراشیدہ بھاری پتھر ہے، اس کا رنگ سیاہ و سرخی مائل ہے اور اس میں سرخ رنگ کے داغ اور زرد رنگ کی لکیریں دکھائی دیتی ہیں جو کہ اس کی اندرونی ٹوٹ پھوٹ کے نشانات ہیں۔ اس کا قطر تقریباً تیس سینٹی میٹر ہے۔

کعبہ کے چار کونوں کو قدیم الایام سے ''ارکان'' کہا جاتا ہے، شمالی کونہ کو رکن عراقی، غربی کونہ کو رکن شامی، جنوبی کونہ کو رکن یمانی اور شرقی کونہ کو کہ جہاں حجر الاسود نصب ہے رکن الاسود سے موسوم کیا جاتا ہے اور دروازۂ کعبہ اور حجر الاسود کے درمیان کی جگہ کو ''ملتزم'' کہتے ہیں کیونکہ طواف کرنے والا شخص دعا و استغاثہ کرتے وقت اس سے چپکا ہوتا ہے۔

اور وہ پرنالہ جو شمالی دیوار پر ہے کہ جسے میزاب رحمت (رحمت کا پرنالہ) کہتے ہیں اسے حجاج بن یوسف نے بنوایا تھا، پھر سلطان سلیمان نے ۹۵۴ ہجری میں اسے تبدیل کر کے ایک چاندی کا پرنالہ لگوا دیا، پھر ۱۰۲۱ ہجری میں سلطان احمد نے تبدیل کر دیا اور سے بنا ہوا خوبصورت مینا کاری کے ساتھ سنہری نقش و نگار کا حامل پرنالہ لگوایا، پھر ۱۲۷۳ ہجری کے اواخر

میں سلطان عبدالمجید عثمانی نے اسے تبدیل کر کے اس جگہ سونے کا پرنالہ نصب کروادیا جو کہ اب تک موجود ہے، اس پرنالہ کے روبرو ایک قوسی دیوار ہے جسے ''حطیم'' کہا جاتا ہے یہ نیم دائرہ کی شکل میں ہے کہ جس کی دو طرفیں کعبہ کی شمالی وغربی سمتوں کو ہیں اور ان سے دو میٹر اور تین سنٹی میٹر دور ہیں، حطیم کی بلندی ایک میٹر ہے اور یہ ڈیڑھ میٹر میں پھیلی ہوئی ہے، اس کے اندرونی حصہ میں خوبصورت پتھروں سے نقش ونگاری ہوئی ہے، اس کے اندرونی وسطی حصہ اور کعبہ کی دیوار کے وسط کے درمیان آٹھ میٹر اور ۴۴ سنٹی میٹر کا فاصلہ ہے، حطیم اور دیوار کعبہ کے درمیان جگہ کو حجر اسماعیل کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی تعمیر کردہ عمارت میں اس سے تقریباً تین میٹر، کعبہ کے اندر تھا پھر باہر آگیا، (اسی لئے طواف میں اس جگہ کو شامل کرنے کا حکم ہوا تا کہ عہد ابراہیمیؑ کے کعبہ کا مکمل طواف ہوجائے) اور اس کا باقی حصہ حضرت ہاجرہؑ اور ان کے فرزند کے مویشیوں کے لئے مخصوص تھا، کہا جاتا ہے کہ حضرت ہاجرہؑ اور حضرت اسماعیلؑ اسی جگہ مدفون ہیں، اور جہاں تک خانہء کعبہ کے اندر واقع ہونے والی تبدیلیوں اور بیت اللہ کی مروجہ رسوم وعادات کا تعلق ہے تو چونکہ وہ تفصیلات ہماری تفسیری بحث سے خارج ہیں اس لئے ان کے تذکرہ کی یہاں ضرورت نہیں۔

غلافِ کعبہ

سورۂ بقرہ کی تفسیر میں حضرت ہاجرہؑ وحضرت اسماعیلؑ اور ان کے اس سرزمین میں آنے کے واقعات پر مشتمل روایات میں بیان ہو چکا ہے کہ جب خانہء کعبہ کی تعمیر کا کام مکمل ہوگیا تو حضرت ہاجرہؑ نے اپنی چادر کعبہ کے دروازہ پر لٹکادی،

اور جہاں تک کعبہ کے غلاف کا تعلق ہے کہ جس سے پورے کعبہ کو ڈھانپا جاتا ہے تو اس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ سب سے پہلے جس شخص نے خانہء کعبہ کو غلاف اوڑھایا وہ یمن کا باسی تھا جس کا نام ابوبکر اسعد تھا، اس نے چاندی کے تاروں سے بنے ہوئے کپڑے کا غلاف بنایا اور خانہء کعبہ پر چڑھادیا، اس کے بعد اس کے جانشینوں نے یہ کام سنبھالا، پھر لوگ مختلف چادروں کا غلاف بناتے رہے اور تہہ بہ تہہ اس پر ڈالتے رہے کہ جب بھی کوئی چادر پرانی ہوجاتی تو اسے اتار کر اس کی جگہ دوسری چادر چڑھادی جاتی تھی، یہ سلسلہ قصی بن کلاب کے دور تک اسی طرح جاری رہا، قصی نے اس کام کو منظم و باقاعدگی عطا کرنے کی غرض سے تمام عرب قبائل کو اس میں شریک کیا اور ہر قبیلہ کو اس میں حصہ شامل کرنے کی دعوت دی تا کہ ہر سال نوبت بہ نوبت نیا غلاف بنایا جائے اور موسم حج میں کعبہ پر چڑھایا جائے، یہ سلسلہ قصی کی اولاد تک جاری رہا چنانچہ ایک سال ابوربیعہ بن مغیرہ غلاف دیتا تھا اور دوسرے سال قبائل قریش غلاف دیتے تھے۔

عہد نبویؐ میں خود آنحضرتؐ نے کعبہ کو یمانی کپڑے کا غلاف پہنایا، اس کے بعد یہ سنت جاری ہوگئی مگر جب خلیفہ

مہدی عباسی حج بیت اللہ کو آیا تو کعبہ کے خدام نے اس سے شکایت کی کہ کعبہ کی چھت پر ریشمی کپڑوں کا ڈھیر لگ گیا ہے اور اس بات کا اندیشہ لاحق ہوگیا ہے کہ کپڑوں کے وزن سے کعبہ کی چھت گر جائے گی، مہدی عباسی نے حکم دیا کہ چھت پر پڑے ہوئے تمام کپڑے نیچے اتار لئے جائیں اور ہر سال صرف ایک غلاف چڑھایا جائے، یہ رسم اب تک باقی ہے، یاد رہے کہ بیرونی غلاف کعبہ کے علاوہ کعبہ کے اندر بھی ایک غلاف ہوتا ہے کہ جس کی ابتداء جناب عباس بن عبدالمطلب کی والدہ گرامی نے کی جو کہ اپنے فرزند جناب عباس کے بارے میں مانی ہوئی نذر کی ادائیگی کے طور پر تھی۔

کعبہ کا مقام ومنزلت

خانہ کعبہ کو تمام اقوام وامتوں کے نزدیک عزت واحترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا چنانچہ ہندو بھی اس کی تعظیم کرتے اور کہتے تھے کہ "سیفا" کی روح کہ جسے وہ اقنوم سوم سمجھتے ہیں حجر الاسود میں حلول کرگئی اور یہ اس وقت ہوا جب وہ اپنی زوجہ کے ہمراہ بلاد حجاز آئے۔

اور فارس کے صابئین وآتش پرست اور کدانی حضرات بھی خانہ کعبہ کی تعظیم کرتے اور اس کا احترام کرتے تھے اور اسے سات بااحترام گھروں میں سے ایک سمجھتے تھے۔ وہ سات گھر یہ ہیں:

(۱) کعبہ،

(۲) مارس، جو کہ اصفہان کے ایک پہاڑ پر واقع ہے۔

(۳) مندوسان، کہ جو ہندوستان میں ہے۔

(۴) نوبہار، جو کہ شہر بلخ میں واقع ہے۔

(۵) بیت غمدان، کہ جو شہر صنعاء میں ہے۔

(۶) کلوسان، جو کہ خراساں کے شہر فرغانہ میں واقع ہے۔

(۷) ایک گھر جو چین کے بالائی علاقہ میں واقع ہے۔

کلدانیوں کی طرف سے منقول ہے کہ وہ خانہ کعبہ کو قدیمی ہونے اور طویل عمر والا ہونے کی بناء پر زحل کا گھر سمجھتے ہیں۔

اہل فارس بھی کعبہ کی تعظیم واحترام کرتے ہیں اور ان کا عقیدہ ہے کہ ہرمز کی روح اس میں حلول کرگئی، وہ لوگ کعبہ

کی زیارت کرنے بھی جاتے تھے۔

یہودی بھی خانہء کعبہ کی تعظیم واحترام کرتے تھے اور اس میں شریعت ابراہیمیؑ کے مطابق عبادت الٰہی بجالاتے تھے، چنانچہ کعبہ میں تصویریں اور مجسمے رکھے ہوئے تھے جن میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کے مجسمے شامل تھے کہ جن کے ہاتھوں میں ازلام کی چھڑیاں تھیں، ان میں حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰ مسیحؑ کے مجسمے بھی شامل تھے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ نصاریٰ بھی یہودیوں کی طرح کعبہ کی تعظیم واحترام کرتے تھے۔

عرب بھی کعبہ کی تعظیم واحترام کرتے اور اسے خانہء خدا سمجھتے تھے، اور دنیا کے گوشہ گوشہ سے اس کی زیارت کے لئے آتے تھے، وہ اسے حضرت ابراہیمؑ کا تعمیر کردہ گھر سمجھتے تھے اور حج بیت اللہ عربوں کے دین وآئین کا حصہ بن چکا تھا کہ جسے وہ نسل درنسل انجام دیتے رہتے تھے۔

کعبہ کی تولیت

کعبہ کی تولیت سب سے پہلے حضرت اسماعیلؑ کے پاس تھی، پھر ان کے بعد ان کی اولاد نے یہ ذمہ داری سنبھالی، یہاں تک کہ قبیلۂ جرہم نے ان پر غلبہ پالیا اور کعبہ کی تولیت ان سے چھین لی، پھر عمالقہ اس کے مالک بن گئے، عمالقہ بنی کرکرکا ایک گروہ تھا جنہوں نے قبیلۂ جرہم سے کئی جنگیں لڑیں اور ان پر غالب آئے، عمالقہ مکہ کے نچلے علاقہ میں آکر رہتے تھے جبکہ جرہم والے مکہ کے بالائی علاقہ میں رہتے تھے اور ان میں ان کے بادشاہ بھی ہوئے تھے مگر زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ جرہم والے عمالقہ پر غالب آگئے اور کعبہ کی تولیت پھر ان کے پاس آگئی جو کہ تقریباً تین سو سال تک ان کے پاس رہی، اس عرصہ میں انہوں نے عہد ابراہیمیؑ میں تعمیر شدہ بیت اللہ میں غیر معمولی اضافے کئے۔

پھر جب نسل اسماعیل بڑھ گئی اور ان کی تعداد وقوت اور شان وشوکت میں اضافہ ہوا مگر مکہ میں ان پر عرصۂ حیات تنگ ہو گیا تو انہوں نے جرہم والوں کو مکہ سے نکال باہر کرنے کی ٹھان لی اور اس مقصد کے لئے ان کے ساتھ نبرد آزما ہو گئے یہاں تک کہ طویل جنگوں کے بعد بالآخر وہ جرہم پر غالب آگئے اور انہوں نے ان کو مکہ سے نکال باہر کردیا، اس زمانہ میں بنی اسماعیلؑ کی بزرگ شخصیت عمرو بن لحی تھا جو خزاعہ کا بزرگ تھا، سرزمین مکہ کا اقتدار اس کے ہاتھوں میں آگیا اور اس نے کعبہ کی تولیت کی ذمہ داری سنبھال لی، اسی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ وہی شخص ہے جس نے کعبہ پر بت رکھے اور لوگوں کو ان کی عبادت وپرستش کی دعوت دی، سب سے پہلا بت جو اس نے کعبہ پر رکھا وہ ''ہبل'' تھا کہ جسے وہ شام سے اپنے ساتھ لایا تھا، اس بت کو وہاں نصب کرنے کے بعد اس نے مزید کئی بت وہاں لاکر رکھے، یہاں تک کہ کثیر تعداد میں بت جمع ہو گئے اور

عربوں میں بت پرستی کا بازار گرم ہو گیا جس کے نتیجہ میں حنفیت و یکتا پرستی قصہء پارینہ بن کر رہ گئی، چنانچہ اس حوالہ سے "شحنہ بن خلف جرہمی" نے اپنے اشعار میں عمرو بن لحی کو مخاطب کر کے یوں کہا :

یا عمرو انک قد احدثت الٰھة
شتی بمکة حول البیت انصاباً
وکان للبیت رب واحد ابداً
فقد جعلت لہٗ فی الناس ارباباً
لتعرفن بان اللّٰہ فی مھل
سیصطفی دونکم للبیت حجاباً

(اے عمرو، تو نے ہی نئے خداؤں کو مکہ میں لا کر بیت اللہ کے آس پاس انہیں رکھ دیا ہے، خانہء خدا کا ایک ہی پروردگار ہمیشہ سے چلا آ رہا تھا مگر تو نے لوگوں کو کئی پروردگاروں کی چوکھٹوں پر جھکا دیا، بہت جلد تجھے معلوم ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ عنقریب تیرے علاوہ بیت کی پردہ داری کے لئے کسی کو چن لے گا)

حلیل خزاعی کے دور تک خانہء کعبہ کی تولیت بنی خزاعہ کے پاس رہی مگر حلیل نے اپنے بعد اس ذمہ داری کے لئے اپنی بیٹی زوجہ قصی بن کلاب کو معین کیا اور خانہء کعبہ کے دروازہ کے کھولنے اور بند کرنے کا اختیار بنی خزاعہ کے ایک شخص جس کا نام ابوغبشان خزاعی تھا، کے سپرد کیا، ابوغبشان نے اس منصب کو ایک اونٹ اور ایک مشک شراب کے عوض قصی بن کلاب کے ہاتھوں فروخت کر دیا، اس کا ایسا کرنا عربوں میں احمقانہ معاملہ کے لئے ضرب المثل بن گیا اور جو شخص کسی اچھی و قیمتی چیز کا سودا کسی ردی و نہایت معمولی یا بے قدر و بے فائدہ یا نقصان دہ چیز کے ساتھ کرتا تو اس کے بارے میں کہا جاتا: "اخسر من صفقة ابی غبشان" کہ یہ معاملہ تو ابوغبشان کے معاملہ سے بھی زیادہ نقصان و خسارہ والا ہے۔

بہر حال کعبہ کی تولیت قریش کے پاس آ گئی اور قصی بن کلاب نے ایک بار پھر کعبہ کی تعمیر نو کی جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، یہ صورتحال فتح مکہ تک باقی رہی، آنحضرتؐ مکہ پر فتح پانے کے بعد خانہء کعبہ میں داخل ہوئے اور حکم دیا کہ تمام تصویریں اور مجسمے محو کر دیئے جائیں، اور بتوں کے بارے میں حکم دیا کہ ان کو منہدم کر دیا جائے چنانچہ آپؐ کے فرمان کے مطابق بتوں کو ریزہ ریزہ کر دیا گیا، مقام ابراہیمؑ یعنی وہ پتھر کہ جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دونوں قدموں کے نشانات ثبت تھے اور اسے کعبہ کے جوار میں ایک برتن میں رکھا گیا تھا آپؐ نے اسے اس کی اصل جگہ پر منتقل کر کے وہاں دفن کر دیا جو کہ اس وقت معروف و مشہور ہے۔ اب اس پر ایک گنبد نما بنایا گیا ہے، اس کے چار ستون اور چھت ہے اور خانہء خدا کے زائرین طواف کے بعد وہاں نماز ادا کرتے ہیں۔

کعبہ کے بارے میں روایات و احادیث کثرت سے موجود ہیں جن میں کعبہ اور اس سے تعلق رکھنے والے دینی امور و اشیاء کی تفصیلات مذکور ہیں، ہم نے ان میں سے انہی چند کو ذکر کرنے پر اکتفاء کی ہے جو آیات الحج اور آیات کعبہ کے بارے میں تدبر و تفکر کرنے والے اہل بحث و تحقیق کی بنیادی ضرورت کو پورا کر سکیں۔

اس گھر کی اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بابرکت اور سرچشمہ ہدایت بنایا ہے کہ اس کی عظمت کے بارے میں کسی اہل اسلام نے اختلاف نہیں کیا۔

آیات ۹۸ تا ۱۰۱

○ قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَاللَّهُ شَهِيدٌ عَلَىٰ مَا تَعْمَلُونَ ﴿٩٨﴾

○ قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ مَنْ آمَنَ تَبْغُونَهَا عِوَجًا وَأَنتُمْ شُهَدَاءُ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٩٩﴾

○ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تُطِيعُوا فَرِيقًا مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ يَرُدُّوكُم بَعْدَ إِيمَانِكُمْ كَافِرِينَ ﴿١٠٠﴾

○ وَكَيْفَ تَكْفُرُونَ وَأَنتُمْ تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ آيَاتُ اللَّهِ وَفِيكُمْ رَسُولُهُ ۗ وَمَن يَعْتَصِم بِاللَّهِ فَقَدْ هُدِيَ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿١٠١﴾

ترجمہ

○ " کہہ دو، اے اہل کتاب! تم اللہ کی نشانیوں کا انکار کیوں کرتے ہو جبکہ خدا تمہارے اعمال پر ناظر و گواہ ہے "

(۹۸)

○ " کہہ دو، اے اہل کتاب! جو شخص ایمان لایا ہے اسے اللہ کی راہ سے کیوں روکتے ہو، تم اسے ٹیڑھا کرنا چاہتے ہو جبکہ تم...... اس کے برحق ہونے پر...... گواہ و آگاہ ہو، اور اللہ تمہارے اعمال سے غافل نہیں "

(۹۹)

○ " اے اہل ایمان! اگر تم ان اہل کتاب کے کسی گروہ کی فرماں برداری کرو تو وہ تمہیں تمہارے ایمان لانے کے بعد دوبارہ کفر کی طرف پلٹا دیں گے "

(۱۰۰)

○ " اور تم کیونکر کفر اختیار کر سکتے ہو جبکہ تمہارے سامنے اللہ کی آیات پڑھی جاتی ہیں اور تم میں اس کا رسول بھی ہے، بہر حال جو شخص خدا سے وابستہ ہو وہ صراط مستقیم کی طرف ہدایت یافتہ ہو گیا "

(۱۰۱)

تفسیر و بیان

یہ آیات مبارکہ جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں سیاق کی پیوستگی کی بناء پر اس مطلب پر دلالت کر رہی ہیں کہ اہل کتاب (البتہ ان کا ایک گروہ یعنی یہودی، یا یہودیوں کا ایک گروہ) آیات الٰہی کا انکار کرتے تھے اور مؤمنین کو اللہ کی راہ سے روکتے تھے اور وہ اس طرح کہ انہیں راہ خدا کا تعارف اس طرح کرواتے کہ وہ اسے ٹیڑھی و غیر مستقیم سمجھیں کہ جس سے منزل مقصود تک رسائی ممکن نہیں ہوتی، اور وہ گمراہی کے الٹے، ٹیڑھے اور کج راستہ کو خدا کے راستوں سے تمثیل دیتے تھے، ان کی کوشش ہوتی تھی کہ مؤمنین کے دلوں میں شبہے و وسوسے ڈالتے رہیں تا کہ وہ حق کو باطل اور باطل کو حق سمجھیں یعنی جس راہ و عقیدہ کو اپنائے ہوئے ہیں اور اسے حق سمجھتے ہیں اسے باطل قرار دیں اور جس راہ و عقیدہ کی دعوت یہودی انہیں دیتے ہیں جو کہ باطل ہے اسے حق قرار دیں، چنانچہ سابقہ آیات سے اہل کتاب کے انحرافی طرز عمل اپنانے کا ثبوت فراہم ہو چکا ہے کہ وہ تورات کے نزول سے قبل ہر طعام کے حلال ہونے کا انکار کرتے تھے اور قبلہ کی تبدیلی یعنی بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کے حکم کی منسوخی کا انکار کرتے تھے۔ تو زیر بحث آیات مبارکہ (۹۸ تا ۱۰۱) انہی سابقہ آیات کی تتمیم و تکمیل کرتی ہیں اور انہی مطالب کو بیان کرتی ہیں یعنی تورات سے پہلے ہر طعام کا حلال ہونا اور کعبہ کا ہی وہ پہلا گھر ہونا جسے لوگوں کے لئے بنایا گیا، تو ان آیات میں یہودیوں کو آیات خداوندی کے انکار اور مومنین کے دلوں میں شبہات اور وسوسے ڈال کر انہیں ان کے دین کے بارے میں بدظن کرنے کی کوششوں پر سخت توبیخ اور مورد مذمت قرار دیا گیا، اس کے ساتھ ساتھ مؤمنین کو خبردار کیا گیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ان اہل کتاب کی ہاں میں ہاں ملائیں اور ان کا کہنا مان کر دین حق کا انکار کر دیں، اور مؤمنین کو اس بات کی تشویق دلائی گئی کہ وہ اللہ سے وابستہ رہیں تو ایمان کے راستہ کی ہدایت سے بہرہ مند رہیں گے اور ان کی ہدایت کو دوام حاصل ہوگا۔

تفسیر المنار جلد چہارم میں سورۂ مبارکہ آل عمران کی تفسیر میں زیر نظر آیت پر بحث کرتے ہوئے سیوطی کے حوالہ سے ذکر کیا گیا ہے کہ انہوں نے کتاب لباب النقول میں زید بن اسلم کی روایت ذکر کی ہے کہ انہوں نے کہا کہ شاش بن قیس

......جو کہ ایک یہودی شخص تھا......ایک دفعہ اوس وخزرج کے چندلوگوں کے پاس سے گزرا اور دیکھا کہ وہ آپس میں دوستانہ ماحول میں باتیں کر رہے ہیں تو جل بھن گیا اور ان دو قبیلوں کی طویل جنگوں کے بعد آپس میں محبت وانس کا منظر دیکھ کر برداشت نہ کرسکا، اس نے یہودی نوجوان کو جو اس کے ساتھ تھا، حکم دیا کہ وہ ان میں بیٹھ جائے اور ان کے درمیان پھوٹ ڈالنے کی غرض سے انہیں جنگ وبغات میں دونوں قبیلوں کے مارے جانے والے افراد کی یاد دلائے تاکہ ان کے دلوں میں ایک دوسرے سے نفرت کی آگ بھڑک اٹھے، اس نوجوان نے اس منصوبہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے ابن قیس کی ہدایت پر عمل کیا اور فریقین کو ان کے مقتولین کی یاد دلائی، بالآخر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا اور وہ دونوں قبیلے ایک بار پھر آپس میں دست وگریباں ہو گئے، چنانچہ قبیلہ اوس کے ایک شخص بنام اوس بن قرظی اور خزرج کے ایک شخص بنام جبار بن صخر کے درمیان تند و تیز جملوں کا تبادلہ ہوا اور وہ آپس میں سخت الجھ گئے، اس طرح ان دو قبیلوں کے درمیان ایک بار پھر دشمنی کی آگ شعلہ ور ہو گئی اور دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے آ گئے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ دوبارہ ان کے درمیان جنگ چھڑنے لگی، اس صورتحال کی اطلاع حضرت پیغمبر اسلامؐ کو پہنچی تو آپؐ خود ان کے پاس تشریف لائے اور انہیں نصیحت کی اور ان کے درمیان مصالحت کروا دی، ان لوگوں نے آنحضرتؐ کے ارشادات وفرامین پر پوری طرح توجہ دی اور آپؐ کے احکامات کی اطاعت وفرماں برداری کا ثبوت دیا، اس وقت اوس وخزرج کے بارے میں خداوند عالم نے یہ آیت نازل فرمائی

"یَآ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِیْعُوْا فَرِیْقًا مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ یَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِیْمَانِكُمْ كٰفِرِیْنَ"

(اے ایمان والو! اگر تم ان اہل کتاب کے کسی گروہ کی اطاعت کرو گے تو وہ تمہیں تمہارے ایمان لانے کے بعد دوبارہ کافر بنا دیں گے)،

اور شاش بن قیس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی:

"یَآ اَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ ......الخ"

(اے اہل کتاب! تم اس شخص کو اللہ کی راہ سے کیوں روکتے ہو جو ایمان لایا ہے......)

یہ روایت "در منثور" میں زید بن اسلم کی بیان کردہ تفصیلی روایت کا خلاصہ ہے، اس سے قریب المعنی روایات جناب عبداللہ ابن عباس اور دیگر راویوں سے بھی منقول ہیں۔

بہر حال، زیر نظر آیات مبارکہ ہمارے بیان کردہ مطالب سے تطبیق کے حوالہ سے مذکورہ روایت کی نسبت زیادہ نزدیک اور واضح ہیں چنانچہ یہ حقیقت ظاہر و آشکار ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ کہ ان آیات میں کفر وایمان، یہودیوں کی گواہی وآگاہی، آیات الٰہی کا مؤمنین کے سامنے پڑھا جانا اور اس طرح کے دیگر امور ومطالب ذکر کئے گئے ہیں اور یہ سب کچھ

ہمارے ذکر کردہ مطالب سے موزونیت کا حامل ہے، اور اس کی تائید و تصدیق درج ذیل آیت مبارکہ سے ہوتی ہے:

سورۂ بقرہ، آیت :۱۰۹

○ " وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَٰبِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّنۢ بَعْدِ إِيمَٰنِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم......"

(کثیر اہل کتاب چاہتے ہیں کہ تمہیں تمہارے ایمان لانے کے بعد دوبارہ کافر بنا دیں، یہ ان کے حسد کی واضح نشانی ہے)

بنا برایں حق وہی ہے جو ہم نے بیان کیا ہے اور وہ یہ کہ زیر بحث آیات مبارکہ سابقہ آیات کا تتمہ ہے اور ان کی تکمیل کرتی ہیں۔

اہلِ کتاب کی توبیخ

○ " قُلْ يَٰٓأَهْلَ الْكِتَٰبِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِـَٔايَٰتِ اللَّهِ......"

(کہہ دو، اے اہل کتاب ! تم اللہ کی آیات کا انکار کیوں کرتے ہو......)

ان آیات کی وحدت سیاق کی بناء پر معلوم ہوتا ہے کہ ان میں تورات کے نزول سے قبل ہر طعام کا حلال ہونا اور دین اسلام میں کعبہ کا قبلہ ہونا ملحوظ و مقصود ہے۔

ایک بار پھر توبیخ و سرزنش

○ "قُلْ يَٰٓأَهْلَ الْكِتَٰبِ لِمَ تَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ مَنْ ءَامَنَ تَبْغُونَهَا عِوَجًا"

(کہہ دو، اے اہل کتاب! جو شخص ایمان لا چکا ہے تم اسے اللہ کی راہ سے کیوں روکتے ہو، تم اسے ٹیڑھا دکھانے کے درپے ہو)

لفظ "صد" کا معنی پھیر دینا ہے۔

" تَبْغُوْنَهَا " سے مراد یہ ہے کہ تم راستہ کے بارے میں خواہاں وکوشاں ہو۔

" عِوَجًا " میں لفظ "عوج " سے پھرا ہوا، تحریف شدہ مراد ہے، تو آیت کا مرادی معنی یہ ہے کہ تم کیوں اللہ کے راستہ کو ٹیڑھا اور ناہموار ظاہر کرنے کے درپے ہو۔

اہل کتاب کی گواہی وآ گاہی کا حوالہ

سہیل سلیمی
حیدرآباد، سندھ، پاکستان

○ " وَّاَنۡتُمۡ شُهَدَآءُ "
(اور تم گواہ......وآ گاہ......ہو)

اس سے مراد یہ ہے کہ تم جانتے ہو کہ تورات کے نزول سے پہلے ہر طعام حلال تھا اور یہ بھی جانتے ہو کہ قبلہ کی تبدیلی نبوت کی خصوصیات ونشانیوں میں سے ہے (یہ آنحضرتؐ کی صداقت کا ثبوت ہے کہ جسے تم نے اپنی کتابوں میں پڑھ رکھا ہے کہ پیغمبر آخر الزمانؐ کے عہد نبوت میں قبلہ تبدیل ہو کر بیت المقدس سے کعبہ کی طرف ہو جائے گا یعنی کعبہ، قبلہ قرار پائے گا)

یہاں یہ نکتہ قابل ذکر ولائق توجہ ہے کہ اس آیت میں اہل کتاب کو گواہ کہا گیا ہے (وَّاَنۡتُمۡ شُهَدَآءُ) جبکہ سابقہ آیت میں خداوند عالم نے خود کو ان کے اعمال وافعال اور کفر پر گواہ ذکر کیا ہے (وَاللّٰهُ شَهِيۡدٌ عَلٰى مَا تَعۡمَلُوۡنَ)، تو تقابلی و محاذاتی تذکرہ میں جو معنوی لطافت پائی جاتی ہے وہ کسی بیان کی محتاج نہیں اور وہ یہ کہ وہ جس چیز کا انکار کرتے ہیں اس کی حقانیت کے گواہ ہیں (اس کے برحق ہونے سے بخوبی آگاہ ہیں) اور اللہ ان کے انکار اور کفر کا گواہ ہے۔ تو دونوں حوالوں سے گواہی کا تذکرہ کلام کی معنوی خصوصیت اور مطلب کی لطیف جہت کو واضح کرتا ہے۔

یہاں ایک لطیف نکتہ یہ بھی ہے کہ اس آیت میں گواہی کی نسبت ان کی طرف دینے کے بعد سابقہ آیت کے ذیلی جملہ یعنی "وَاللّٰهُ شَهِيۡدٌ عَلٰى مَا تَعۡمَلُوۡنَ" (اور اللہ تمہارے اعمال پر گواہ ہے) کو اس آیت کے ذیلی جملہ میں ان لفظوں میں تبدیل کر دیا گیا: "وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ" (اور اللہ تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے)۔ تو اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ کلام میں مقصود یہ ہے کہ وہ دین اسلام کی حقانیت کے گواہ......اور اس سے آگاہ...... ہیں، اور خداوند عالم ان تمام پر گواہ......اور ان سے آگاہ......ہے۔

ایمان والو! خبردار رہو

O " یَاَیُّهَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا (تا) وَفِیْكُمْ رَسُوْلُهٗ ...... الخ "

اس آیت میں اہل ایمان کو خبردار کیا جارہا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اہل کتاب کے ایک گروہ کا کہا مان لیں، اس میں لفظ "فریق" (گروہ) سے...... جیسا کہ بیان ہو چکا ہے...... یہودی مراد ہیں یا یہودیوں کا ایک گروہ،

اور جملہ "وَاَنْتُمْ تُتْلٰی عَلَیْكُمْ اٰیٰتُ اللّٰهِ وَفِیْكُمْ رَسُوْلُهٗ......" کے ذریعے اس مطلب کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ تم یہودیوں کی فتنہ انگیزی کا شکار ہو کر آیات خداوندی کے منکر کیونکر ہو سکتے ہو جبکہ تم میں اللہ کا رسول موجود ہے کہ جس کے ذریعے حق سے وابستہ ہونا تمہارے لئے ممکن ہے اور تم آیات الٰہی پر پوری طرح توجہ والتفات کر کے ان کے معانی میں غور وفکر اور تدبر کرو کہ اگر اس کے باوجود کوئی چیز غیر واضح ہو تو حضرت پیغمبر اسلامؐ کی طرف رجوع کر کے آیات سے فہم المعانی کا مرحلہ باآسانی طے کر سکتے ہو، یا یہ کہ تم ابتداء ہی میں آنحضرتؐ کی طرف رجوع کر کے حق وحقیقت سے آگاہی و وابستگی اور طلب ہدایت کے تمام تقاضے پورے کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہو کیونکہ خدا کا رسولؐ تم میں موجود ہے کہ جو نہ تو پردے میں چھپا ہوا ہے اور نہ ہی تم سے دور ہے کہ اس تک رسائی دشوار ہو، تم ان کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے حق کی راہنمائی حاصل کر سکتے ہو جس سے یہودیوں کی طرف سے ہونے والی فتنہ پروری کی کوششیں دم توڑ جائیں گی اور تم حق کی سیدھی راہ پر گامزن ہو جاؤ گے کیونکہ آیات الٰہی اور رسول خداؐ سے تمسک اختیار کرنا دراصل خود خدا سے وابستہ ہونا ہے اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ خدا سے وابستگی کا نتیجہ صراط مستقیم کی ہدایت سے بہرہ مند ہونا ہے۔

بنابرایں "وَكَیْفَ تَكْفُرُوْنَ" میں " کفر " سے مراد ایمان کے بعد کفر اختیار کرنا ہے، اور جملہ "وَاَنْتُمْ تُتْلٰی عَلَیْكُمْ" اس بات سے کنایہ کے طور پر ہے کہ کفر سے بچنے کے لئے آیات الٰہی اور رسولؐ خدا سے اعتصام ووابستگی ممکن ہے یعنی جو شخص آیات الٰہی اور رسول خداؐ سے وابستہ رہے وہ ایمان کے بعد کفر کے دلدل میں پھنسنے سے بچ سکتا ہے، اور جملہ "وَمَنْ یَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ " اس حقیقت کی بابت قاعدۂ کلیہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور صراط مستقیم کی ہدایت سے مراد پختہ ایمان کی نعمت سے بہرہ مند ہونا ہے جو کہ ایسا راستہ ہے جس میں نہ تو کوئی اختلاف پایا جاتا ہے اور نہ ہی اس کا راہی منزل مقصود سے بھٹک سکتا ہے بلکہ وہ اپنے راہیوں کو درمیانی حد میں رکھتا ہے اور انہیں ادھر ادھر بھٹکنے نہیں دیتا یعنی انہیں ایسی درمیانی حد میں رکھتا ہے کہ وہ گمراہ ہونے سے محفوظ رہتے ہیں۔

یہاں ایک لطیف ادبی نکتہ موجود ہے اور وہ یہ کہ جملہ " فَقَدْ هُدِيَ" میں ماضی مجہول کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے جو وقوع پذیر ہونے والے کام کو ثابت کرتا ہے، اس میں فاعل کا عدم ذکر اس کام کے خود بخود وقوع پذیر ہونے کی دلیل ہے کہ خواہ اس کے فاعل کی طرف توجہ والتفات ہو یا نہ ہو۔

بہرحال اس آیت مبارکہ میں ہر اس حق سے آشنائی و آگاہی حاصل کرنے میں کتاب وسنت کے کافی ہونے کا ثبوت ملتا ہے جس کی بابت گمراہ ہونے کا امکان واندیشہ ہو۔

آیات ۱۰۲ تا ۱۱۰

○ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ﴿۱۰۲﴾

○ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا ۚ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿۱۰۳﴾

○ وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿۱۰۴﴾

○ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۱۰۵﴾

○ يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿۱۰۶﴾

○ وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ۭ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۷﴾

○ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۭ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۸﴾

○ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۱۰۹﴾

○ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ
بِاللّٰهِ ۭ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّھُمْ ۭ مِنْھُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُھُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۱۰﴾

ترجمہ

○ " اے اہل ایمان ! تم تقوائے الٰہی اختیار کرو جس طرح اس کا حق ہے، اور تم نہ مرنا مگر مسلمان ہونے کی حالت میں ! " (۱۰۲)

○ " اور تم سب ہی اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو اور ایک دوسرے سے جدا نہ ہو، اور تم اللہ کی نعمت کو یاد کرو کہ جب تم ایک دوسرے سے دشمنی رکھتے تھے تو اس نے تمہارے دلوں کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا کہ جس کے نتیجہ میں تم آپس میں بھائی بھائی بن گئے اور، تم تو دوزخ کے کنارے پہنچ گئے تھے مگر اس نے تمہیں اس سے نجات عطا کی، اسی طرح اللہ تمہارے لیے اپنی آیتوں کو واضح طور پر بیان کرتا ہے تا کہ تم ہدایت پا سکو " (۱۰۳)

○ " اور یہ ضروری ہے کہ تم میں سے کچھ لوگ ایسے ہوں جو نیکی کی طرف بلائیں اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کریں کہ وہی فلاح و کامیابی سے ہمکنار ہوں گے" (۱۰۴)

○ " اور تم تفرقہ اندازی کرنے والوں اور واضح نشانیاں آجانے کے باوجود اختلاف کی راہ پر چلنے والوں جیسے نہ بنو، کہ انہی کے لئے بہت بڑا عذاب مقرر ہے " (۱۰۵)

○ " اس دن (روز قیامت) کچھ چہرے سفید اور کچھ چہرے سیاہ ہوں گے، تو جن لوگوں کے چہرے سیاہ ہوں گے ان سے کہا جائے گا کہ کیا تم ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے تھے، تو اب تم اپنے کفر اختیار کرنے کا مزہ چکھو " (۱۰۶)

○ " اور جن کے چہرے سفید ہوں گے تو وہ اللہ کی رحمت سے بہرہ مند ہوں گے ، وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے" (۱۰۷)

○ " یہ اللہ کی آیات ہیں جو حق کے ساتھ ہم آپ کے سامنے پڑھتے ہیں اور خدا تو کائنات پر ظلم کرنا نہیں چاہتا" (۱۰۸)

○ " اور خدا ہی زمین و آسمان کی ہر چیز کا مالک ہے، اور خدا ہی کی طرف تمام امور کی بازگشت ہوگی " (۱۰۹)

○ " تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کے لئے پیدا کیا گیا ہے، تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہو اور تم خدا پر ایمان رکھتے ہو، اگر اہل کتاب ایمان لاتے تو ان کے لئے بہتر تھا، ان میں سے کچھ لوگ ایمان لائے ہیں اور اکثر فاسق و بدکار ہیں " (۱۱۰)

تفسیر و بیان

یہ آیات مبارکہ سابقہ دو آیتوں کا تتمہ ہے جن میں مؤمنین کو اہل کتاب کی فتنہ پروریوں اور وسوسہ انگیزیوں کے بارے میں خبردار کرتے ہوئے ان سے اپنے آپ کو بچا کر رکھنے کا کہا گیا تھا، اور یہ بھی کہا گیا تھا کہ ان کے پاس وہ شخصیت موجود ہے جس سے وابستگی اختیار کر کے وہ گمراہی اور ہلاکت کے گہرے کھڈ میں گرنے سے بچ سکتے ہیں، تو یہ مطلب ان آیات مبارکہ میں یکے بعد دیگر مذکور ہے، گویا" بات سے بات نکلتی ہے" کے باب سے ہے، اور لطیف و قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس سلسلۂ بیان میں اگرچہ مؤمنین سے مخاطب ہو کر بات کی گئی ہے لیکن سابقہ سیاق یعنی اہل کتاب کے بارے میں مطالب ذکر کرنے کی روش میں تبدیلی محسوس نہیں ہوتی بلکہ تبدیلی پائی ہی نہیں جاتی، اس کا ثبوت ان آیات کے بعد والی آیت (۱۱۱) کے ابتدائی جملوں میں موجود ہے جن میں ارشاد ہوا: " لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى ......" (وہ تمہیں پریشان کرنے کے سوا کوئی تکلیف نہیں پہنچا سکتے)۔

تقویٰ اختیار کرنے کا فرمان خداوندی

○ " يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ "
(اے ایمان والو ! تقوائے الٰہی اختیار کرو جو تقویٰ اختیار کرنے کا حق ہے)

سابقہ بیانات میں تقویٰ کے بارے میں وضاحت ہو چکی ہے اور یہ بیان ہو چکا ہے کہ تقویٰ، احتراز اور اپنے آپ کو بچانے کے معنی میں آتا ہے لہٰذا جب اس کی اضافت خداوند عالم کے ساتھ ہو یعنی کہا جائے " تقوائے الٰہی" تو اس سے مراد اس کے عذاب سے بچنا ہوتا ہے، چنانچہ اس حوالہ سے درج ذیل آیت مبارکہ میں یوں ذکر ہوا:

سورۂ بقرہ، آیت : ۲۴

○ " فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ "
(پس تم اس آگ کا تقویٰ اختیار کرو (اس سے اپنے آپ کو بچاؤ) جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں)

تو تقوائے الٰہی کا حصول اس کے ارادہ و چاہت اور مرضی کے عین مطابق عمل کرنے اور زندگی بسر کرنے سے یقینی ہوتا ہے یعنی اس کے تمام فرامین و احکامات کی اطاعت کی جائے، اس کی نعمتوں پر اس کا شکر ادا کیا جائے، اس کی طرف سے آنے والی آزمائشوں پر صبر کیا جائے، آخری دو کاموں کی بازگشت شکر کی طرف ہوتی ہے کیونکہ شکر سے مراد ہی یہ ہے کہ ہر چیز کو اس کے اصل مقام پر رکھا جائے (جو کام اس سے موزوں ہو وہ انجام دیا جائے، نعمت شکر کی متقاضی ہوتی ہے اور مصیبت و آزمائش صبر چاہتی ہے)۔ خلاصہ یہ کہ تقوائے الٰہی یہ ہے کہ ہر حال میں خدا کی اطاعت و فرماں برداری کا عملی دم بھریں اور کبھی اس کی معصیت و نافرمانی نہ کریں اور ہر حال میں اس کے سامنے خضوع اور سر تسلیم خم کریں خواہ وہ کچھ عطا کرے یا نہ کرے یا موجود عطیہ کو روک لے۔

یہ ہے لفظ "تقویٰ" کا مرادی معنی، اب اگر اس کے ساتھ "حَقَّ تُقٰتِہٖ" کے الفاظ کا اضافہ کیا جائے یعنی جو تقویٰ اختیار کرنے کا حق ہے، تو چونکہ اس میں تقویٰ کی حقیقت اور اعلیٰ ترین مدارج و مراتب جلوہ گر ہوئے ہیں اور اس میں باطل کی آمیزش کا تصور ہی نہیں ہوتا لہٰذا تقوائے الٰہی کی نسبت سے اس کا معنی خالص عبودیت و بندگی ہوگا کہ جس میں انانیت و غفلت کی آمیزش نہیں ہو سکتی یعنی وہ اطاعت ہی اطاعت ہے کہ جس میں معصیت و نافرمانی کا شائبہ نہیں پایا جاتا، وہ شکر ہی شکر ہے کہ جس میں کفرانِ نعمت کو راہ نہیں ملتی، وہ ذکر ہی ذکر ہے کہ جس میں نسیان آ ہی نہیں سکتا، اور وہی حقیقی اسلام ہے کہ جو اسلام کے درجات و مراتب میں سب سے بلند درجہ و مقام ہے۔ بنابرایں جملہ "وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ" کا معنی یہ ہوگا کہ گویا یوں کہا گیا ہے: "**دوموا علی هذه الحال (حق التقوی) حتی تموتوا**" کہ اسی حالت پر یعنی حق التقویٰ پر قائم و دائم رہو یہاں تک کہ تم پر موت آ جائے یعنی مرنے تک تقویٰ کی اسی حالت اور رتبہ و درجہ پر قائم رہو، یہ معنی درج ذیل آیت مبارکہ میں تقویٰ کے معنی سے مختلف ہے:

سورۂ تغابن، آیت: ۱۶

○ "فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ"

(تم تقوائے الٰہی اختیار کرو جس قدر کر سکتے ہو)

اس آیت میں تقویٰ اختیار کرنے کے حکم کا معنی یہ ہے کہ تم جس قدر استطاعت و قدرت رکھتے ہو اس کے مطابق اپنے کسی بھی کام میں تقویٰ کو نہ چھوڑو، یعنی اپنے مقدور بھر تقویٰ اختیار کرنے میں کوتاہی نہ کرو، البتہ جہاں تک استطاعت و توانائی کا تعلق ہے تو وہ افراد کی قوتوں، ہمتوں اور سوچوں کے مختلف ہونے کی وجہ سے مختلف ہوتی ہے، اور یہ بات ہر طرح کے شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ حق التقویٰ کا جو معنی ہم نے ذکر کیا ہے وہ اکثر لوگوں کے بس سے باہر ہے کیونکہ اس باطنی سفر میں جو مراحل و منزلیں طے کرنی پڑتی ہیں اور جن خطرات سے گزرنا و نمٹنا پڑتا ہے وہ اہل علم و ارباب دانش کے سوا کسی کی سمجھ میں ہی

نہیں آسکتے، اور اس میں جو باریکیاں اور لطیف حقیقتیں ہیں ان سے آگاہی والتفات اہل اخلاص کے سوا کسی کے بس میں نہیں، چنانچہ تقویٰ کے مراحل میں سے کچھ ایسے مراحل بھی ہیں کہ جن کے بارے میں عامتہ الناس یہ خیال کرتے ہیں کہ نفس انسانی اس پر قادر ہی نہیں اور قطعی ویقینی طور پر اس سے عجز وناتوانی کا نظریہ اپنا لیتے ہیں جبکہ حق التقویٰ کی منزل پر فائز افراد اس مرحلہ کو نہ صرف یہ کہ مقدور اور انسانی دسترس میں سمجھتے ہیں بلکہ اپنی عظیم ہمتوں کے ساتھ اس سے زیادہ مشکل مرحلوں کو سر کر چکے ہوتے ہیں۔

اس بیان کی روشنی میں جملہ "فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ" ایسا کلام قرار پاتا ہے کہ ہر طبقۂ فکر وفہم کے افراد اپنے مقدور کے مطابق اس کا معنی کر کے اسے اپنی باطنی کیفیات پر منطبق کرتے ہیں اور اپنی قدرت وطاقت کے مطابق اس کا تعین کرتے ہیں، اور اس کلام (فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ) کے ذریعہ جملہ "اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ" سے یہ مراد لیتے ہیں کہ اس میں ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ حق التقویٰ کی طرف قدم بڑھاؤ اور اس تک رسائی کے پختہ ارادہ وعزم کے ساتھ اپنی ہمتیں وتوانائیاں بروئے کار لاؤ، تو یہ کاوشیں اسی طرح سے ہیں جیسے صراط مستقیم کی ہدایت پانے میں معمول ہوتی ہیں کہ جس تک رسائی معدودے چند خدا پرستوں کے سوا کسی کے بس میں نہیں ہوتی جبکہ ہر شخص اس کا دعویدار نظر آتا ہے، لہٰذا ان دو آیتوں یعنی "اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ" اور "فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ" کا حاصل نتیجہ یہ ہے کہ پہلے تمام لوگوں کو تقویٰ اختیار کرنے اور حق التقویٰ کی منزل پانے کی دعوت دی گئی اور پھر اس منزل تک رسائی کے لئے اپنی مقدور بھر کاوشیں بروئے کار لانے کا حکم دیا گیا، تو ان دونوں دستورات کا ماحصل یہ ہوگا کہ تمام لوگ تقویٰ کی راہ پر گامزن ہو جائیں البتہ ہر شخص اپنی قدرت وطاقت اور فکر وفہم کی قوت وتوانائی کے مطابق اس کے مراحل طے کرے اور اس کے مراتب ودرجات سے بہرہ مند ہو۔ اور خداوند عالم کی طرف سے حاصل ہونے والی توفیق وتائید کے ساتھ تقویٰ کے بلند ترین درجات کے حصول میں کوشاں ہو۔

یہ ہے مذکورہ بالا دو آیتوں کے معانی میں غور وفکر اور تدبر کے بعد حاصل ہونے والا نتیجہ! اسی سے ظاہر وواضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا دو آیتیں معنی ومطلوب کے حوالہ سے نہ تو ایک دوسرے سے کلی طور پر مختلف ہیں اور نہ ہی ایک دوسرے کے عین مطابق! یعنی ایسا نہیں کہ جو کچھ جملہ "اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ" میں مقصود ہے بعینہٖ وہی معنی جملہ "فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ" میں مقصود ومد نظر ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ پہلی آیت مبارکہ "اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ" اصل مقصد ومنزل مقصود تک پہنچنے کی دعوت دیتی ہے جبکہ دوسری آیت "فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ" اس تک پہنچنے کی کیفیت کو واضح کرتی ہے۔

تاحیات اسلام پر رہو

○ "وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ "

(اور تم ہرگز نہ مرنا مگر یہ کہ تم مسلمان ہو)

اس جملہ میں ارشاد ہوا کہ تم نہ مرنا مگر یہ کہ تم مسلمان ہو، یعنی مسلمان ہونے کی حالت میں مرنا، اب دیکھنا یہ ہے کہ موت تو ایک غیر اختیاری چیز ہے اس سے روکنے سے کیا مراد ہے ؟

اس میں شک نہیں کہ موت تکوینی امور میں سے ہے جو کہ ہمارے دائرہ اختیار سے باہر ہیں لہٰذا اس اور اس جیسے امور کے بارے میں امر اور نہی بھی تکوینی ہوں گے، چنانچہ اس کی مثالیں درج ذیل آیتوں میں موجود ہیں :

سورۂ بقرہ، آیت :۲۴۳

○ " فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا "

(خدا نے ان سے کہا: تم مر جاؤ)

سورۂ یٰسٓ، آیت :۸۲

○ " اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ "

(یہ کہ اس سے کہے: ہو جا، تو وہ ہو جاتا ہے)

پہلی آیت میں مرنے کا حکم ہے اور دوسری آیت میں وجود پذیر ہونے کا حکم ہے۔

البتہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی غیر اختیاری چیز کی اضافت اختیاری چیز کی طرف کر دی جاتی ہے اور وہ دونوں خاص ترکیب پا لیتے ہیں، پھر اس ترکیب یافتہ چیز کو اختیاری قرار دے کر اس کی نسبت اصحاب اختیار کی طرف دی جاتی ہے کہ جس کی بناء پر اس کی بابت امر و نہی اختیاری جہت کے حامل ہو جاتے ہیں چنانچہ ارشاد الٰہی ہے :

سورۂ بقرہ، آیت :۱۴۷

○ " فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ "

(پس تو شک کرنے والوں میں سے ہرگز نہ ہو)

سورۂ ہود، آیت :۴۲

○ " وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ "

(اور تو کافروں کا ساتھی نہ بن)

سورۂ توبہ، آیت :۱۱۹

○ " وَكُونُوا مَعَ الصّٰدِقِينَ "

(اور تم سچوں کے ساتھ ہو جاؤ)

اس طرح دیگر آیات بھی موجود ہیں،

ان آیات میں "ہونے" اور "نہ ہونے" کا جو امر و نہی ہے اس کا اختیاری ہونا ایک اختیاری چیز سے تعلق کے حوالہ سے ہے ورنہ اصل "ہونا" اور "نہ ہونا" اختیاری نہیں بلکہ تکوینی ہے اور تکوینی امور میں انسان کے اختیار کا کوئی دخل واثر نہیں ہوتا لیکن اسے اختیاری امور یعنی شک کرنا، کفر وانکار کرنا اور صداقت اپنانا سے مرتبط کر کے اختیاری قرار دینے کے بعد اس کی بابت خداوندِ عالم نے جو امر و نہی صادر کیے وہ مولا کے فرمان کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بنابرایں اسلام کے بغیر مرنے سے نہی کرنا اسے اختیاری قرار دینے کی بناء پر ہے کہ جس کی بازگشت کنایۃً اس بات کی طرف ہے کہ زندگی کے آخری لمحوں تک ہر حال میں اسلام سے وابستہ رہیں اور اس کی تعلیمات پر عمل پیرا ہوں کہ اگر موت آئے تو اسی حالت میں آئے جب تم اسلام پر قائم ہو تو اس وقت کہا جا سکے گا کہ مرنے والا اسلام کے ساتھ مرا ہے، (اسلام پر مرنا یا اسلام کے ساتھ مرنے کا مطلب یہی ہے کہ اسلام کی تعلیمات پر عمل کرنے کی عمومی پابندی کے ساتھ مرا ہے، لہٰذا اسے محاورۂ اسلام پر مرنا کہا جاتا ہے)

اتحاد وعدم تفرقہ کا حکم

○ " وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا "

(اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور تفرقہ پیدا نہ کرو)

اس سے پہلے آیت مبارکہ (۱۰۱) میں ارشاد ہوا کہ تم کس طرح کفر اختیار کر سکتے ہو جبکہ تمہارے سامنے اللہ کی آیات پڑھی جاتی ہیں اور اس کا رسول تم میں موجود ہے اور جو شخص اللہ سے وابستہ ہو وہ صراطِ مستقیم کی ہدایت پا گیا (وَكَيْفَ تَكْفُرُونَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ؕ وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ) اس میں آیات الٰہی اور رسول خداؐ (کتاب وسنت) سے تمسک اختیار کرنا خدا سے تمسک اختیار کرنا قرار دیا گیا ہے کہ جو یہ تمسک اختیار

کرے وہ خدا کی امان میں ہے اور اس کا ہدایت پانا یقینی اور خدا کی طرف سے ضمانت کا حامل ہے، اور جو شخص رسول خداؐ کے دامن سے وابستہ ہو گویا وہ کتاب اللہ کے دامن سے وابستہ ہو گیا کیونکہ کتاب اللہ ہی اس کا حکم دیتی ہے چنانچہ اس سلسلہ کی ایک آیت میں یوں ارشاد ہوا:

سورۂ حشر، آیت :۷

O "وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا "

(جو کچھ رسول تمہیں دیں (حکم دیں) اسے لے لو (اس پر عمل کرو)، اور جس چیز سے وہ تمہیں روکیں اس سے رک جاؤ)

تو زیر نظر آیت مبارکہ (۱۰۲) میں حبل اللہ سے وابستہ ہونے کا حکم دیا گیا جبکہ اسی مطلب کو سابقہ آیت (۱۰۱) میں "يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ" یعنی اللہ سے وابستہ ہونے کے الفاظ میں بیان کیا گیا تھا تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حبل اللہ یعنی اللہ کی رسی سے مراد وہی کتاب ہے جو خداوند عالم کی طرف سے نازل کی گئی ہے اور وہی ہے جو بندہ اور پروردگار کے درمیان ربط و رابطہ کا وسیلہ بنتی ہے اور آسمان کا زمین سے تعلق جوڑتی ہے، اس مطلب کو دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ حبل اللہ یعنی اللہ کی رسی سے مراد قرآن مجید اور حضرت پیغمبر اسلام محمد مصطفیٰؐ ہیں اور سابقہ ذکر کئے گئے مطالب سے آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ ان سب کی بازگشت ایک ہی حقیقت کی طرف ہے۔

اور قرآن مجید اگرچہ حق التقویٰ اور پختہ اسلام ہی اختیار کرنے کی دعوت دیتا ہے لیکن زیر نظر آیت مبارکہ میں جو غرض و مقصد ملحوظ ہے وہ سابقہ آیت میں مذکور و ملحوظ امور یعنی حق التقویٰ اختیار کرنے اور اسلام پر مرنے کے حکم میں مقصود غرض سے مختلف ہے کیونکہ سابقہ آیت میں مذکور حکم میں فرد فرد کو مخاطب کیا گیا ہے جبکہ اس آیت میں اجتماعی حوالہ سے بات کی گئی ہے اور فرد فرد کی بجائے تمام افراد کو اجتماعی صورت میں مخاطب کیا گیا ہے چنانچہ اس میں لفظ "جَمِيْعًا" اور جملہ "وَّلَا تَفَرَّقُوْا" سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔

تو معلوم ہوا کہ ان آیات مبارکہ میں جہاں ہر فرد کو کتاب وسنت سے تمسک اختیار کرنے اور وابستہ رہنے کا حکم دیا گیا ہے وہاں اسلامی معاشرہ کو معاشرہ کی حیثیت میں کتاب وسنت سے وابستہ رہنے کا دستور و فرمان صادر کیا گیا ہے۔

نعمت خداوندی کی یاد!

○ " وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا "

(اور تم اللہ کی نعمت کو یاد کرو کہ جب تم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن تھے پھر اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی تو تم اس کی نعمت کے طفیل ایک دوسرے کے بھائی بن گئے)۔

جملہ "اِذْ كُنْتُمْ" اس نعمت کو بیان کرتا ہے جس کا ذکر ہو چکا ہے، اس بناء پر جملہ "وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا" بھی جملہ "اِذْ كُنْتُمْ" پر عطف ہوگا۔

یہاں نعمت کو ذکر کرنا دراصل قرآن مجید میں جاری سلسلہ بیان واسلوب سخن کی بناء پر ہے اور وہ یہ کہ قرآن مجید اپنی تعلیمات کے ساتھ علل واسباب کو بھی ذکر کرتا ہے اور اس طرح لوگوں کو خیر وسعادت اور ہدایت کی راہ دکھاتا ہے تاکہ لوگ اندھی تقلید کی مذموم روش سے دور رہیں...... بلکہ دلیل وبرہان اور پختہ ثبوت کے ساتھ عقیدہ وعمل کا سلسلہ قائم کریں......اور یہ بات تعلیمات الٰہی کے حوالہ سے بعید از قیاس ہے کہ ان میں لوگوں کو سعادت وخوش بختی کی ہدایت سے نوازا جائے جو کہ علم نافع اور عمل صالح سے عبارت ہے اور پھر انہیں تقلید کی تاریکی اور جہالت کی ظلمت میں دھکیل دیا جائے، بلکہ ضروری ولازم ہے کہ کسی بھی دانشمند ومحقق پر کوئی بات غیر واضح ومبہم نہ رہے اور نہ ہی کسی طرح کی غلط فہمی کا شائبہ ہو، بنابرایں یہ واضح ہوا کہ خداوند عالم لوگوں کو ان کی سعادت کی حقیقت سے آگاہ کرتا ہے اور انہیں اس کے اسرار ورموز اور علل واسباب سے بھی آگاہی دلاتا ہے تاکہ وہ حقائق کے ایک دوسرے سے ربط وتعلق سے بخوبی واقف ہوں اور یہ جان لیں کہ تمام دینی حقائق ومعارف کا سرچشمہ فیض خداوند عالم کی یکتا ذات ہے اور لوگوں پر واجب ولازم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور سر تسلیم خم کریں کیونکہ وہ رب العالمین ہے اور اس کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہیں کیونکہ وہ اس ہستی کی رسی......وراستہ...... ہے جو تمام موجودات عالم ہستی کا پروردگار ہے، چنانچہ اسی مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بعد والی آیات مبارکہ میں یوں ارشاد فرمایا:

" تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ " (۱۰۸)،

" وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ " (۱۰۹)،

(یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم آپ کے سامنے پڑھتے ہیں حق کے ساتھ، اور اللہ کائنات پر ظلم نہیں کرنا چاہتا)، (اور اللہ کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ کی طرف تمام امور کی بازگشت ہے)۔

خلاصۂ کلام یہ کہ خداوند عالم نے لوگوں کو حکم دیا کہ جب تک کسی بات کی اصل وجہ و بنیاد معلوم نہ ہو اسے قبول نہ کریں اور جب تک کسی کام کی حقیقت سے آگاہی حاصل نہ ہو اس کو نہ اپنائیں، یعنی قول و فعل میں دلیل و مقصد معلوم ہونا ضروری ہے۔ پھر خداوند عالم نے اس قاعدہ کلیہ اور عمومی ضابطہ سے استثناء کرتے ہوئے انہیں حکم دیا کہ جہاں تک اس کی اپنی ذات اور اس کے رسول گرامی قدر کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں ان کا فریضہ ہے کہ اس کے حضور سر تسلیم خم کر دیں اور کسی دلیل و وجہ کے پیچھے جانے کے بجائے اس کے ہر حکم پر عمل پیرا ہو جائیں اور صرف یہی بات ان کے لئے اطاعت میں کافی ہے کہ وہ ان کا معبود اور علی الاطلاق مالک ہے، لہٰذا انہیں اس کے علاوہ کچھ بھی چاہنے کا حق حاصل نہیں کہ جو خدا نے ان کے بارے میں ارادہ کیا ہے اور انہیں صرف وہی کام کرنے کا حق اور اجازت ہے جو خدا نے ان کے بارے میں فیصلہ کیا ہے، اسی طرح ان پر لازم ہے کہ وہ رسول اللہؐ کے ہر فرمان کی اطاعت و فرمانبرداری کریں اور ان کی علی الاطلاق اطاعت کریں یعنی وہ کچھ انہیں کہیں اسے بجا لائیں اور جس سے روکیں اسے ترک کریں، اور اس سلسلہ میں صرف یہی بنیاد قرار دیں کہ اس کا حکم رسول اللہؐ نے دیا ہے کیونکہ وہ خدا کا بھیجا ہوا پیغامبر ہے کہ جس کا کام خدا کے احکامات و پیغامات پہنچانے کے سوا کچھ نہیں، وہ تو آیا ہی اسی لئے ہے کہ لوگوں کو اللہ کے فرامین و دستورات سے آگاہ کرے۔

ان دو استثنائی دستورات کے بعد خداوند عالم اپنے بندوں کو اصول و معارف کے حقائق کے بارے میں آگاہی دلاتا ہے اور انہیں سعادت و خوش بختی کے راستوں و طریقوں کی ہدایت و رہنمائی کرتا ہے، اور پھر ان تمام امور کی عمومی بنیادی وجہ سے بھی آگاہ کرتا ہے تاکہ وہ معارف کے ایک دوسرے سے ربط و تعلق اور سعادت کے طریقوں سے روشناس ہوں کہ اس طرح وہ عقیدۂ توحید کے تقاضوں کو کامل طور پر پورا کریں اور اس خدا پسند روش کو اپنائیں کہ جس کی بنیاد پر تفکر و تدبر کے صحیح و درست راستہ پر گامزن ہوں اور اظہار حق کی اصل راہ کو پہچان لیں، جس کے نتیجہ میں ان کی زندگی، علم و یقین پر استوار ہو اور وہ اندھی تقلید کے بندھنوں سے آزاد ہو جائیں اور پھر اس کا عملی نتیجہ و فائدہ یہ ہوگا کہ وہ جب بھی دینی معارف یا ان سے تعلق رکھنے والے امور میں سے کسی کی بھی دلیل و وجہ اور بنیادی حقیقت سے آگاہی حاصل کرلیں گے تو اسے قبول کرنے میں دیر نہ کریں گے اور اگر انہیں کسی بات کی گہرائی تک جانے اور اس کی دلیل سے آگاہ ہونے میں کامیابی نہ ہو تو وہ اسے جلد بازی کے ساتھ رد کر دینے اور اس کا انکار کرنے کی راہ نہیں اپنائیں گے بلکہ اس کے بارے میں مزید بحث و تحقیق اور غور و فکر کریں گے اور پھر اس کے قبول یا عدم قبول کا فیصلہ کریں گے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر بلکہ واجب الالتفات ہے کہ کوئی شخص یہ خیال نہ کرے کہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دین کی بنیاد یہ ہے کہ کسی سے بھی خواہ وہ خدا اور رسول خداؐ ہی کیوں نہ ہو کوئی بات دلیل کے بغیر قبول نہ کی جائے، کیونکہ یہ تو نہایت احمقانہ و سفیہانہ نظریہ ہے کہ جس کی کوئی قدر و قیمت ہی نہیں اور نہ ہی اس کی کوئی معقول بنیاد ہے بلکہ اس کی بازگشت تو اس بات

کی طرف ہوگی کہ خداوند عالم اپنے بندوں سے چاہتا ہے کہ وہ دلیل کے باوجود دلیل تلاش کریں کیونکہ اس کی ربوبیت اور اس کا مالک علی الاطلاق ہونا ہی ہر دلیل کی بنیاد اور اس بات اصل واساس ہے کہ اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں اور رسول کی رسالت خود ایک مضبوط دلیل ہے کہ وہ جو کچھ بھی پیش کرتا ہے اس کا سرچشمہ خدا ہے اور وہ خدا کے فرامین و پیغامات واحکام بندوں تک پہنچاتا ہے (غور کریں) یا اس کی بازگشت اس بات کی طرف ہوگی کہ وہ جن چیزوں میں اپنی ربوبیت کی بنیاد پر تصرف وفیصلہ کرتا ہے ان میں اپنی ربوبیت کو بے اثر کردے جبکہ ایسا کرنا کھلا تناقض ہے۔

حاصل الکلام یہ کہ اسلامی طریقہ وروش اور سنت وسیرت نبویؐ دعوت الی العلم اور اندھی تقلید سے دوری اختیار کرنے کے سوا کچھ نہیں اور جو لوگ خود اندھی تقلید کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں اور اپنے آپ کو ترقی یافتہ ودانشور سمجھ کر کتاب و سنت کی پیروی کو تقلید کا نام دیتے ہوئے زبان اعتراض وتنقید دراز کرتے ہیں دراصل وہ خود اندھی تقلید کے دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔

اور شاید آیت میں مذکور مطلب یعنی وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ (اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھنا) اور "وَلَا تَفَرَّقُوْا" یعنی عدم تفرقہ کو "نعمت" سے تعبیر کرکے "وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ" کہنے کی وجہ بھی یہی ہو کہ جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے اور وہ یہ کہ تمہیں اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامنے اور تفرقہ پیدا نہ کرنے کا حکم دینے کی دلیل یہ ہے کہ تم نے خود ہی باہمی دشمنی وعداوت کی تلخی چکھ لی ہے اور محبت والفت اور بھائی چارہ کے شیریں آثار ونتائج بھی دیکھ لئے ہیں کہ تفرقہ وجدائی کے نتیجہ میں تم آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کی زد میں آگئے تھے جبکہ اتحاد ویکجہتی اور باہمی محبت کے نتیجہ میں تم نے اس سے نجات پائی، تو ہم تمہیں اس دلیل سے آگہی دلا رہے ہیں، اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کے ذریعے ہم اپنی بات کو ٹھوس بنیاد پر استوار کرنا چاہتے ہیں کہ اس کے بغیر ہماری بات کا حق ہونا ثابت نہ ہوگا، نہیں ایسا نہیں، بلکہ ہماری بات ہر حال میں حق ہے خواہ ہم اس کے ساتھ دلیل ذکر کریں یا نہ کریں، ہم جو بات کرتے ہیں وہ حق ہی ہوتی ہے اور یہاں دلیل ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ تمہارا باہم متحد ہونا اور تفرقہ کا شکار نہ ہونا ہماری طرف سے تم پر نعمت ہے اور اسی سے اس حقیقت سے آگاہ ہو جاؤ کہ ہم تمہیں جو بھی حکم دیتے ہیں اس میں تمہارے لئے سعادت وخوش بختی راحت وآرام اور کامیابی وکامرانی ہے۔

اور خداوند عالم نے زیر نظر آیت مبارکہ میں دو دلیلیں ذکر کی ہیں، ایک اعتصام بہ حبل اللہ کے ضروری ولازم ہونے پر اور دوسری عدم تفرقہ پر، پہلی دلیل جملہ "اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً ......" کے ذریعے بیان کی جو کہ تجربہ پر مبنی ہے اور دوسری دلیل جملہ "وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ......" کے ذریعے بیان کی کہ جو عقلی استدلال پر مبنی ہے۔

اور جملہ "فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا" میں دراصل اسی مطلب کو دوبارہ بیان کیا گیا ہے جو جملہ "وَاذْكُرُوْا

نِعۡمَتَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ......“ میں بیان کیا گیا، اور ”نعمت“ سے مراد دلوں کا ایک دوسرے سے قریب کرنا وران میں الفت پیدا کرنا ہے۔ اور یہ نعمت جس ”اخوت“ کو جنم دیتی ہے اس سے مراد بھی وہی دلوں کا ایک دوسرے سے قرب اور الفت ہے، بنابرایں یہاں ”اخوت“ و برادری کے رشتہ کی بات ادعائی ہے، یعنی وہ واقعی و حقیقی برادری کا رشتہ مقصود نہیں جو دو حقیقی بھائیوں کہ جو والدین کے حوالہ سے بھائی بنتے ہیں کے درمیان پایا جاتا ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں اس اخوت کی طرف اشارہ ہو جو درج ذیل آیت میں مقصود ہے:

سورۂ حجرات، آیت :۱۰

○ ” اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ اِخۡوَۃٌ “

(بے شک، مؤمنین ایک دوسرے کے بھائی ہیں)

کیونکہ اس آیت میں مؤمنین کے درمیان ایمانی اخوت و برادری کا جو شرعی رشتہ قائم کیا گیا ہے اس کی بناء پر ان کے درمیان متعدد آثار اور اہم حقوق کا سلسلہ و نظام قائم ہو گیا ہے۔

آگ کے شعلوں کی زد میں!

○ ” وَکُنۡتُمۡ عَلٰی شَفَا حُفۡرَۃٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنۡقَذَکُمۡ مِّنۡہَا “

(اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے پھر اس نے تمہیں اس سے بچا لیا)

”شَفَا حُفۡرَۃٍ“ گڑھے کے اس کنارے کو کہتے ہیں کہ اگر کوئی اس پر کھڑا ہو تو اس میں گرنے والا ہی لگتا ہے۔ اگر یہاں آگ سے مراد دوزخ کی آگ ہو تو آیت کا معنی یہ ہوگا کہ تم کافر تھے اور دوزخ کے کنارے پر پہنچ گئے تھے کہ اس میں گرنے میں ایک لحہ سے زیادہ باقی نہ رہا تھا جو کہ موت سے عبارت ہے کہ جو انسان کی آنکھ کی سیاہی اور سفیدی سے بھی زیادہ اس سے نزدیک ہے، پھر خدا نے تمہیں ایمان کے ذریعے اس سے نجات عطا کی۔

اور اگر اس سے مراد ان کی ابتر معاشرتی حالت کو بیان کرنا ہو کہ جو ان کے ایمان لانے سے پہلے ان کی تھی تو اس صورت میں آیت کا معنی یہ ہوگا کہ ایمان لانے کے بعد ان کے دلوں میں الفت پیدا ہو گئی اور وہ ایک دوسرے کے دشمن ہونے کی دلدل سے نکل کر ایمانی بھائی چارہ سے بہرہ مند ہو گئے۔

اس طرح لفظ ”نار“ (آگ) سے مراد جنگیں اور لڑائی جھگڑے ہوں گے اور اس طرح کا استعمال عام و رائج ہے جو

کہ مجازی طور پر ہوتا ہے، یعنی شدید جنگ اور سخت لڑائی کو آگ سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس بناء پر اصل مقصود اس مطلب کو بیان کرتا ہے کہ جو معاشرہ پراگندہ دلوں اور مختلف و گوناگوں مقاصد اور نفس پرستی پر مبنی ہو تو لامحالہ وہ اتحاد و یکجہتی کے راستہ سے دور ہونے کی وجہ سے ایک ہی منزلِ مقصود تک پہنچنے کی متحدہ کاوشوں سے محروم ہوگا بلکہ افراد کے ذاتی مفادات و بیہودہ شخصی ترجیحات کی بھینٹ چڑھ کر شدید ترین اختلافات اور سخت ترین دشمنی سے دوچار ہوگا۔ اور یہ صورتحال انہیں تنازعات کی پست ترین منزل تک لے جائے گی اور انہیں ہمیشہ کشت و خون کی دلدل میں پھنسنے کا اندیشہ لاحق رہے گا کہ جو ان کے زوال و نابودی کا پیش خیمہ ہی نہیں بلکہ یقینی سبب بن جائے گا، اور یہی وہ آگ ہے جو جہالت کے گہرے کھڈ کے کنارے لا کھڑا کرتی ہے کہ جس میں گرنے والے کو نجات کا کوئی راستہ اور چھٹکارے کا کوئی وسیلہ نہیں مل سکتا۔

اس بیان سے معلوم ہوا کہ اس آیت مبارکہ کے نزول سے پہلے کچھ مسلمان ایسے تھے جو کفر کو چھوڑ کر ایمان کے دائرے میں داخل ہو گئے تھے اور ان آیات میں انہی کو مخاطب قرار دے کر ان کے ماضی کے حوالہ سے بات کی جا رہی ہے کہ وہ اسلام لانے سے پہلے کی زندگی میں مسلسل لڑائی جھگڑوں میں اس حد تک چلے گئے تھے کہ نہ تو انہیں امن و امان نصیب تھا اور نہ ہی راحت و آرام، اور نہ انہیں اس صورتحال سے نکلنے کی راہ سوچنے کی فرصت تھی، بلکہ وہ معاشرتی امن کی حقیقت سے بھی آگاہ ہی نہیں رکھتے تھے کہ جو معاشرے کو جاہ و جلال، مال و دولت اور عزت و حفاظت جان سے مالا مال کر دے، پھر جب اجتماعی صورت میں انہوں نے اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیا اور سعادت و خوش بختی کے آثار واضح طور پر انہیں دکھائی دینے لگے تو انہوں نے ان نعمتوں کی شیرینی چکھی اور وہ اس حقیقت سے آگاہ ہو گئے کہ جو کچھ خداوند عالم نے ان سے نعمتوں کے عطیہ اور سعادت کی حقیقی لذت کے بارے میں کہا تھا وہ سچ اور حق تھا۔ لہٰذا اس آیت میں نعمتوں کی جو یاددہانی کرائی گئی وہ ان لوگوں اور ان کے علاوہ دوسروں پر بھی اپنا مطلوبہ اثر چھوڑتی ہے اور سب کو دعوت فکر و عمل دیتی ہے۔ اسی وجہ سے کلام کو مشاہدہ اور زمینی حقائق لمس کرنے کا امین بنایا گیا ہے اور فرضی و خیالی اور تصوراتی خاکوں کو بنیاد نہیں بنایا گیا ہے کیونکہ مشاہدہ اور بیان کا تقابل ہی نہیں ہو سکتا...... عیاں را چہ نسبت بہ بیاں...... اور نہ ہی تجربات کو مفروضات کے برابر قرار دیا جا سکتا ہے، اسی بناء پر بعد والے جملہ "وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا......" میں گزرے ہوئے لوگوں کے انجام کار کا حوالہ دے کر لوگوں کو خبردار کیا گیا کیونکہ ایمان لانے والوں نے اپنی آنکھوں سے ان کا برا انجام دیکھا اور اپنے کانوں سے ان پر جو گزری اسے سنا، لہٰذا مومنین پر لازم ہو گیا کہ وہ ان لوگوں کے انجام کار سے عبرت حاصل کریں اور جو کچھ ان پر گزری اس سے سبق لیں تاکہ ان کے اختیار کردہ راستہ پر نہ چلیں اور ان کے انجام جیسی صورتحال سے دوچار نہ ہوں۔

یہ سب کچھ بیان کرنے کے بعد خداوند عالم نے انہیں اس خصوصیت سے آگاہ کیا جس کی بناء پر انہیں مخاطب قرار دیا گیا، چنانچہ ارشاد ہوا: "كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ"، اسی طرح خدا تمہیں اپنی نشانیوں سے آگاہی

دلاتا ہے تاکہ تم ہدایت یافتہ ہو جاؤ،

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرنے والی امت !

○ "وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ"
(تم میں سے کچھ لوگ ایسے ہونے چاہییں جو نیکی کی دعوت دیں اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کریں)

قطعی ویقینی تجربات اس حقیقت کا ثبوت دیتے ہیں کہ انسان اپنی زندگی میں جو معلومات حاصل کرتا ہے......اور ان میں سے صرف انہی معلومات کو اپنے لئے جمع ومحفوظ کرتا ہے جو اس کے لئے فائدہ مند ہوں......خواہ وہ جہاں سے اور جس طریقہ سے بھی انہیں حاصل کرے اور جس طرح بھی انہیں محفوظ کرے، لیکن اگر ان معلومات کو ہمیشہ ملحوظ ومدنظر قرار نہ دے اور نہ ہی انہیں بار بار عملی جامہ پہنائے تو وہ معلومات جاتی رہیں گی اور بالآخر ان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ہر طرح کے شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ انسان کے ہر عمل کا دارومدار علم پر ہوتا ہے کہ علم کے قوی ہونے سے عمل میں قوت آتی ہے اور علم کے ضعیف ہونے سے عمل میں کمزوری پیدا ہوتی ہے، علم کے صالح ودرست ہونے سے عمل بھی صالح ودرست ہوتا ہے اور علم کے فاسد وخراب ہونے سے عمل بھی فاسد وخراب ہوتا ہے، چنانچہ اس کی مثال درج ذیل آیت مبارکہ میں پاک زمین اور ناپاک زمین سے دیتے ہوئے یوں ارشاد الٰہی ہوا:

سورۂ اعراف، آیت :۵۸

○ "اَلْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَالَّذِیْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا"
(پاک زمین کی پیداوار اس کے پروردگار کے اذن سے نکلتی ہے اور ناپاک زمین خس وخاشاک کے سوا کچھ پیدا نہیں کرتی)

اور یہ حقیقت بھی ہر طرح کے شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ علم وعمل اثر گزاری کے حوالہ سے ایک دوسرے کے برعکس ہیں، علم عمل کا مضبوط ترین داعی ہے، اور جو عمل وقوع پذیر ہو اور اس کے اثر کا بھی مشاہدہ ہو جائے وہ نہایت طاقتور معلم بن جاتا ہے جو انسان کو علم کی دولت عطا کرتا ہے۔

بہرحال مذکورہ بالا امور ہی علم نافع اور عمل صالح کے حامل صالح معاشرہ کو ان کی معرفت وثقافت کے تحفظ کی دعوت

دیتے ہیں اور افرادِ معاشرہ کو اس بات کی تاکید و تلقین کرتے ہیں کہ جو شخص خیر و نیکی کے راستہ سے ہٹ جائے اسے واپس اس کی طرف لوٹائیں اور جو شخص خیر و نیکی کے راستہ سے کلی طور پر منہ موڑ چکا ہو اسے اس کے حال پر نہ چھوڑیں کہ وہ شر اور برائی کے گہرے کھڈ میں گر جائے بلکہ اسے ہلاکت و نابودی کی وادی میں گرنے سے روکیں اور اسے خیر و نیکی کے راستہ سے دور نہ جانے دیں۔

اسی کا نام خیر و نیکی کی دعوت دینا اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے، اسی کی طرف خداوند عالم نے اس آیت میں توجہ مبذول کروائی ہے، "يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ" (وہ خیر کی دعوت دیتے ہیں اور امر بالمعروف و نہی المنکر کرتے ہیں)۔

اس بیان سے وہ بنیادی نکتہ بھی معلوم ہو جاتا ہے جس کی بناء پر خداوند عالم نے خیر و شر کو "معروف اور منکر" سے تعبیر کیا ہے، کیونکہ یہ کلام سابقہ آیت مبارکہ کے ان الفاظ پر مبنی ہے: "وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا...... الخ" (اور تم سب اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور تفرقہ پیدا نہ کرو)، ظاہر ہے کہ جس معاشرہ کی اصل و اساس ہی اعتصام بحبل اللہ اور عدم تفرقہ ہو اس میں "معروف" یعنی پسندیدہ کام ہی "خیر" و نیکی قرار پائے گا اور "منکر" یعنی ناپسندیدہ کام ہی "شر" اور برائی کہلائے گا اور اگر بالفرض یہ نکتہ اس وجہ تسمیہ میں ملحوظ نہ بھی ہو تب بھی "خیر" کو "معروف" اور "شر" کو "منکر" سے موسوم کرنے میں یہی بات کافی ہے کہ دینی نقطۂ نگاہ میں "خیر" کو معروف اور "شر" کو منکر قرار دیا گیا ہے، کہ جس میں افراد کے عملی حوالہ کا عمل دخل نہیں۔

ایک ادبی حوالہ !

جملہ "وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ" میں حرف "من" کے بارے میں دو قول ذکر کئے گئے ہیں:

(۱) بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یہ تبعیض کے معنی میں ہے یعنی اس میں بعض افراد مقصود ہیں، اس قول کی دلیل یہ پیش کی گئی ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور اسی طرح خیر و نیکی کی دعوت دینا واجب کفائی اعمال میں سے ہے..... کہ جو تمام افراد پر واجب ہوتے ہیں مگر بعض کے انجام دینے سے دوسروں سے ساقط ہو جاتے ہیں.....،

(۲) ایک قول یہ ہے کہ یہاں حرف "من" بیانیہ ہے یعنی ان افراد کی نشاندہی کرنے کے لئے جو امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور دعوت الی الخیر دیتے ہیں، اس بناء پر آیت کا معنی یہ ہوگا کہ اس طرح کے صالح معاشرہ کے ذریعے تم ایسی امت بن جاؤ جو دعوت الی الخیر دینے والی ہو اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنے والی ہو، گویا یہ اسی طرح ہے جیسے کہا جائے:

"لیکن لی منک صدیق ای کن صدیقاً لی" کہ تجھ سے میرا ایک دوست ہونا چاہیے یعنی تو میرا دوست بن جا...... تو اس سے بظاہر یہ مراد ہے کہ حرف "مــن" کو بیانیہ قرار دینے کا مطلب اسے ابتدائیہ قرار دینا ہے یعنی ایسی امت نہیں جو دعوت الی الخیر دے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرے۔

بہر حال کہنے کی بات یہ ہے کہ حرف "مــن" کو تبعیض کے لئے قرار دیں یا بیانیہ مانیں، دونوں صورتوں میں اس بحث کا کوئی عملی نتیجہ نہیں نکلے گا اور اس سے خاطر خواہ فائدہ حاصل نہ ہوگا کیونکہ دعوت الی الخیر اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر ایسے امور و اعمال ہیں کہ اگر واجب ہوں تو طبعاً واجب کفائی ہوں گے کیونکہ دعوت اور امر و نہی سے مطلوبہ غرض حاصل ہونے کے بعد دوبارہ ان کا انجام دینا بے معنی ہوگا، اگر فرض کیا جائے کہ تمام افراد امت دعوت الی الخیر دینے والے ہوں اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنے والے ہوں تو اس کا یقینی طور پر مطلب یہ ہوگا کہ امت میں کچھ افراد ایسے ضرور ہیں جو ان فرائض کو ادا کرتے ہیں، تو یہ کام بہر حال بعض افراد کے ذمہ بنتا ہے کہ جو اسے ادا کرتے ہیں، لہٰذا اگر آیت میں بعض افراد مخاطب ہوں تو مطلوب حاصل ہے کہ وہی افراد مقصود ہوں گے جو یہ فریضہ ادا کرتے ہیں اور اگر تمام افراد مخاطب ہوں تو تب بھی انہی بعض کے حوالہ سے ہوگا، دوسرے لفظوں میں یہ کہ ان فرائض و واجبات کے بارے میں تمام افراد ہی اجر و ثواب پائیں گے، اسی لئے سلسلہ ء بیان کے آخر میں ارشاد ہوا: "وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ" (وہی لوگ کامیاب ہیں)، بنابرایں بظاہر یہی بات درست ہے کہ حرف "مــن" تبعیض کے لئے ہے یعنی اس میں بعض افراد مقصود ہیں، اور عام محاوروں اور استعمال ہونے والے جملوں میں بھی اس طرح کی ترکیب و ترتیب میں ایسا ہی ملحوظ و مقصود ہوتا ہے اور اگر اس کے علاوہ مقصود ہو تو اس کے لئے اضافہ و استثنائی دلیل کی ضرورت ہوتی ہے۔

یہاں یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ مذکورہ تین موضوعات یعنی دعوت الی الخیر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، طویل و عمیق تفسیری بحثوں کے حامل ہیں کہ انشاء اللہ کسی موزوں مقام پر ان سے مربوط مطالب ذکر کئے جائیں گے اور ان کے ساتھ ساتھ دیگر متعلقہ علمی، اخلاقی اور معاشرتی بحثیں بھی پیش کی جائیں گی۔

تفرقہ پیدا کرنے والوں سے اجتناب کا حکم

○ "وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ"

(اور ان لوگوں جیسے نہ بنو جنہوں نے تفرقہ کیا اور واضح نشانیاں آ جانے کے بعد بھی باہم اختلاف کا شکار ہو گئے......)

بعید نہیں کہ جملہ "مِنۢ بَعۡدِ مَا جَآءَهُمُ ٱلۡبَيِّنَٰتُ" کا تعلق صرف "وَاخۡتَلَفُوا" سے ہو، اس صورت میں اختلاف سے مراد اعتقادی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہونا ہے اور "تَفَرَّقُوا" میں تفرقہ سے مراد جسمانی طور پر ایک دوسرے سے جدا ہونا ہے۔ یہاں تفرقہ کا ذکر اختلاف سے پہلے اس لئے ہے کہ جسمانی طور پر جدائی و دوری اعتقادی طور پر ایک دوسرے سے جدا و بعید ہونے کا مقدمہ و تمہید ہوتی ہے، کیونکہ کسی قوم کا یکجا و متحد ہونا اور جسمانی طور پر ایک دوسرے کے قریب ہونا اعتقادی لحاظ سے بھی انہیں ایک دوسرے سے قریب کر دیتا ہے اور میل جول کے نتیجہ میں ایک دوسرے کی توانائیوں سے استفادہ کرنے کی راہ ہموار ہو جاتی ہے جس سے ان کے درمیان اختلافات کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں، لیکن اگر وہ ایک دوسرے سے جدا ہوں اور ان کے درمیان تفرقہ پیدا ہو جائے کہ ان کا میل جول باقی نہ رہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مختلف مذاہب و مسالک میں بٹ جائیں گے اور ان کے درمیان فکری و نظریاتی ہم آہنگی کی بجائے تفرقہ و مسلک گرائی کی جڑیں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جائیں گی اور پھر وحدت و اتحاد کے خواب چکنا چور ہو جائیں گے، شاید اسی مطلب کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ارشاد الٰہی ہوا: "وَلَا تَكُونُوا كَٱلَّذِينَ تَفَرَّقُوا" تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو ایک دوسرے سے جدا ہو گئے یعنی پہلے جسمانی طور پر ایک دوسرے سے جدا ہوئے اور ان کی اجتماعی حیثیت ختم ہو گئی اور پھر اس کے نتیجہ میں وہ عقائد و نظریات میں ایک دوسرے سے اختلاف کا شکار ہو گئے۔ اسی اختلاف کو خداوند عالم نے اپنے مقدس کلام میں کئی مقامات پر دشمنی و بغاوت کا شاخسانہ قرار دیا ہے، چنانچہ درج ذیل آیت میں یوں ارشاد ہوا:

سورۂ بقرہ، آیت: ۲۱۳

○ "وَمَا ٱخۡتَلَفَ فِيهِ إِلَّا ٱلَّذِينَ أُوتُوهُ مِنۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡهُمُ ٱلۡبَيِّنَٰتُ بَغۡيَۢا بَيۡنَهُمۡ"

(اور اس میں نہیں اختلاف کیا مگر صرف ان لوگوں نے جنہیں وہ دیا گیا، بعد اس کے کہ ان کے پاس واضح نشانیاں آچکی تھیں، انہوں نے ایسا آپس میں دشمنی کی بنیاد پر کیا)

البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ عقائد و نظریات میں اختلاف کا ہونا ناگزیر ہوتا ہے کیونکہ ہر شخص کی قوت فہم دوسرے سے مختلف ہونے کی وجہ سے عقائد و نظریات کا مختلف ہونا ناگزیر ہوتا ہے اسی طرح اس اختلاف کا دور کرنا اور تمام افراد کو ایک پلیٹ فارم پر واپس لانا بھی ضروری اور ناگزیر ہوتا ہے اور اس کا ایک بنیادی ذریعہ لوگوں کا جسمانی طور پر ایک دوسرے سے قریب ہونا ہے کہ ان کے باہمی میل جول سے نظریات کا اختلاف بھی ختم ہو سکتا ہے، البتہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ اختلاف کا دور ہونا ممکن بھی ہے اور قابل عمل بھی البتہ بالواسطہ! اور اگر اس واسطہ و ذریعہ کو نہ اپنایا جائے تو یہ ان کی طرف سے ظلم و بغاوت کہلائے گا اور اپنے ہی ہاتھوں اپنے آپ کو اختلافات کی بناء پر ہلاکت و تباہی سے دوچار کرنا ہوگا۔

اسی وجہ سے قرآن مجید نے اتحاد و یکجہتی کی دعوت دی، اور اس کی بابت بھرپور تاکید کی اور لوگوں کو اختلاف کا شکار

ہونے سے سخت منع کیا، قرآن مجید کا اس سلسلہ میں اس قدر تاکید کرنا اس بنیاد پر ہے کہ خداوند عالم اس امت کے بارے میں بخوبی آگاہ ہے کہ اس میں پیدا ہونے والے اختلافات کا دامن وسیع ہوگا اور وہ سابقہ امتوں کی طرح بلکہ ان سے کہیں زیادہ اختلافات کی لپیٹ میں آئیں گے، چنانچہ قرآنی اسلوب بیان کے بارے میں ہم کئی بار ذکر کر چکے ہیں کہ جب بھی اس میں کسی چیز سے ممانعت کی بابت سخت الفاظ و انداز اختیار کیا جائے اور اس کے قریب جانے سے نہایت سختی کے ساتھ نہی کی جائے تو اس سے اس کام کے وقوع پذیر ہونے اور لوگوں کی طرف سے اس کا ارتکاب کرنے کے واضح اشارے ملتے ہیں کہ لوگ اسے انجام دیں گے اور اس کا شکار ہوں گے، امت کے درمیان اختلافات کے جنم لینے کے بارے میں جہاں قرآن مجید نے واضح اشارے دیئے ہیں وہاں حضرت پیغمبر اسلامؐ نے بھی اس کے وقوع پذیر ہونے اور امت کے اس میں مبتلا ہونے کے بارے میں پیشگوئی کی اور متعدد حوالوں سے ارشاد فرمایا کہ ان کی امت میں رفتہ رفتہ اختلاف پیدا ہوگا اور پھر پھیلتا چلا جائے گا یہاں تک کہ انہیں گروہوں اور فرقوں میں بانٹ دے گا۔ اور ان کی امت کے درمیان اختلافات اسی طرح پھیل جائیں گے جس طرح یہود و نصاریٰ کے درمیان پھیلے۔ اس سلسلہ میں اصل روایت "روایات پر ایک نظر" میں ذکر کی جائے گی، انشاءاللہ تعالیٰ،

قرآنی پیشگوئی کی تصدیق، امت کے درمیان واقع ہونے والے شدید ترین اختلافات سے ہوگئی چنانچہ آنحضرتؐ کی رحلت کو زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ امت اختلافات سے دوچار ہوگئی اور گوناگوں مذاہب و مسالک میں تقسیم ہوگئی، اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ فروعی اختلافات اصولی اختلافات کی صورت اختیار کر گئے اور ہر فرقہ و گروہ دوسرے فرقہ کو کافر کہنے لگا، ایک دوسرے پر کفر کے الزامات لگانے کا سلسلہ عہد صحابہ سے شروع ہوا اور اب تک جاری و ساری ہے، چنانچہ جب بھی کسی نے دو مذاہب و مسالک کے درمیان اختلافات ختم کرانے اور انہیں ایک پلیٹ فارم پر لانے کی کوشش کی اس نے تیسرے مذہب کو جنم دے دیا۔

جب ہم امت اسلامیہ میں وقوع پذیر ہونے والے اختلافات کا تجزیہ و تحلیل کرتے ہیں اور اس کے پس منظر پر غور کرتے ہیں تو اس منحوس سلسلہ کی کڑیاں منافقین سے جڑی ہوئی نظر آتی ہیں کہ جن کے بارے میں قرآن مجید نے نہایت سخت الفاظ استعمال کیئے اور ان کی شیطانی چالوں، دغابازیوں اور مکروفریب پر مبنی حرکتوں سے پردہ اٹھایا، چنانچہ آپ اگر منافقین کے بارے میں قرآنی بیانات پر بخوبی غور کریں اور دیکھیں کہ خداوند عالم نے ان کے بارے میں سورۂ بقرہ، سورۂ توبہ، سورۂ احزاب اور سورۂ منافقون و دیگر سورتوں میں جو کچھ ارشاد فرمایا اور ان کی باطنی ناپاکی کو برملا کیا تو آپ کی حیرت کی انتہاء نہ رہے گی جبکہ یہ سب کچھ عہد نبویؐ میں ان کی حالت کی عکاسی کرتا ہے کہ ابھی نزول وحی کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا تھا، پھر جب آنحضرتؐ کا وصال ہوگیا تو ان کا تذکرہ بھی رک گیا اور دفعتہً ان کی آوازیں دب گئیں۔

بہرحال آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں کے درمیان گروہ بندی کی آگ بھڑک اٹھی اور گوناگوں مذاہب و مسالک نے ان کے درمیان دوریاں پیدا کر دیں، ظلم واستبداد کے ذریعے وجود میں آنے والی حکومتوں نے لوگوں کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا اور ان کی سعادت آمیز زندگی کو گمراہی و بدبختی میں بدل دیا **(و اللہ المستعان)**

خدا سے دعا و امید ہے کہ ہمیں توفیق دے کہ اس موضوع کی بابت تفصیلی و تکمیلی تذکرہ سورۂ برأت کی تفسیر میں کر سکیں، انشاء اللہ تعالیٰ۔

چہروں کے سفید و سیاہ ہونے کا دن

○ " یَّوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوْہٌ وَّ تَسْوَدُّ وُجُوْہٌ...... **الخ** "

(جس دن کچھ چہرے سفید اور کچھ چہرے سیاہ ہو جائیں گے......)

یہاں چونکہ کفرانِ نعمت کی بات ہو رہی تھی اور وہ یعنی کفران نعمت بھی خیانت کی طرح خست و شرمندگی کا باعث بنتا ہے لہٰذا خداوند عالم نے تمثیلی طور پر عذاب کی مختلف قسموں میں سے اسی قسم کو بیان کیا ہے جو خست و شرمندگی سے ہم رنگ ہے یعنی چہرے کا سیاہ ہونا (منہ کالا ہونا)، کہ جیسے دنیا میں شرمندگی کی علامت کے طور پر جانا جاتا ہے، چنانچہ جملہ "فَاَمَّا الَّذِیْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْھُھُمْ اَکَفَرْتُمْ بَعْدَ اِیْمَانِکُمْ" (جن لوگوں کے منہ کالے ہوں گے...... ان سے کہا جائے گا...... کیا تم ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے ہو؟)، اسی طرح نعمت خداوندی کا شکر ادا کرنے والوں کے اجر و ثواب کے اشاراتی تذکرہ میں اس چیز کو ذکر کیا جو شکر سے موزونیت رکھتی ہے یعنی چہرہ کا سفید ہونا، کہ جیسے دنیا میں رضایت و پسندیدگی سے کنایہ قرار دیا جاتا ہے۔

آیات الٰہی کی تلاوت

○ " تِلْکَ اٰیٰتُ اللّٰہِ نَتْلُوْھَا عَلَیْکَ بِالْحَقِّ "

(یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم تیرے سامنے حق کے ساتھ پڑھتے ہیں)

"بِالْحَقِّ" (ب جار، الحق مجرور) کا تعلق جملہ " نَتْلُوْھَا " سے ہے، حق کے ساتھ تلاوت کرنے سے مراد برحق

تلاوت کرتا ہے، یعنی وہ باطل وشیطانی نہیں،

ممکن ہے "بِالْحَقِّ" کا تعلق "آیات" سے ہو، البتہ اس حوالہ سے کہ اس میں وصفی معنی کا پہلو پایا جاتا ہے۔

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ ظرف "بِالْحَقِّ" مستقر ہو کہ جس کا متعلق لفظوں میں ذکر نہ کیا گیا ہو...... بلکہ مقدر یعنی تصور میں فرض کر کے جملہ سے فہم المعنی مقصود قرار پائے......،

ان احتمالات کی بناء پر آیت کا معنی یہ ہوگا کہ جو آیات ان دو گروہوں یعنی کافروں اور شاکروں کے ساتھ خدا کے برتاؤ کو آشکار کرتی ہیں وہ حق کے ساتھ ساتھ ہیں اور ان کی بابت باطل وظلم کا شائبہ تک نہیں ہوسکتا، اس حوالہ سے یہی احتمال آیت کے بعد والے جملہ سے زیادہ ہم رنگ نظر آتا ہے جس میں ارشاد ہوا: "وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ" (اللہ عالمین پر ظلم نہیں کرنا چاہتا)،

خدا اور ظلم ؟ یہ نہیں ہوسکتا

O "وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ"
(اور اللہ عالمین پر ظلم نہیں کرنا چاہتا)

اس جملے میں لفظ "ظُلْمًا" نکرہ ہے جو کہ نفی کے سیاق میں ہے کہ علم الادب کی رو سے جب نکرہ، نفی کے سیاق میں آئے تو استغراق کا فائدہ دیتا ہے......یعنی اس میں عمومیت پائی جاتی ہے اور تمام افراد و مصادیق اس میں شامل ہوتے ہیں......

اور لفظ "لِّلْعٰلَمِيْنَ" جو کہ جمع محلّٰی باللام ہے (یعنی عالمین جو کہ عالم کی جمع کا صیغہ ہے اس پر الف ولام آیا ہے) اور علم الادب میں اس طرح کا صیغہ بھی استغراق وعمومیت کا فائدہ دیتا ہے، لہٰذا آیت کا معنی یہ ہوگا کہ خداوند عالم کوئی ظلم بھی تمام عالمین، تمام افرادِ کائنات کے لئے نہیں چاہتا، (کائنات وموجودات ہستی کے کسی بھی فرد پر ظلم کرنا نہیں چاہتا) اور حقیقت بھی یہی ہے کیونکہ لوگوں کے درمیان تفرقہ اندازی ایسا کام ہے جس کا منحوس اثر تمام عالمین اور تمام افرادِ بشر کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔

سب کچھ اللہ کا ہے

O " وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ "
(اور اللہ کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، اور اللہ کی طرف تمام امور کی بازگشت ہے)

اس سے پہلے خداوند عالم نے ارشاد فرمایا کہ وہ کسی پر ظلم کرنا نہیں چاہتا، تو اس کے بعد اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے اس حوالہ سے پیدا ہونے والے ممکنہ منفی خیالات اور ظلم کرنے کے خدشات کو رد کرنے کے لئے یوں فرمایا کہ وہ ہی موجودات عالم کی ہر چیز کا ہر حوالہ سے مالک ہے، تو اسے اختیار ہے کہ وہ ان کے بارے میں جو اور جس طرح چاہے فیصلہ کرے، لہٰذا اس کی بابت یہ تصور ہی نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنی غیر مملوکہ اشیاء کے بارے میں کوئی فیصلہ کرے کہ جسے ظلم وزیادتی قرار دیا جائے۔

اور ویسے بھی جو شخص ظلم کرنا چاہتا ہے وہ اس وقت ایسا کرتا ہے جب اس کا کوئی مقصد کسی غیر مملوکہ چیز پر ظلم وزیادتی کرنے کے علاوہ حاصل نہ ہوتا ہو اور اس کے علاوہ اس کی ضرورت پوری نہ ہوتی ہو، جبکہ خدا تو غنی و بے نیاز ہے اور جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ اسی کا ہے۔

یہ مطالب بعض مفسرین نے زیر نظر آیت مبارکہ کی تفسیر میں پیش کئے ہیں، لیکن یہ ظاہر الآیہ سے مطابقت نہیں رکھتے، کیونکہ ان میں خداوند عالم کے غنی و بے نیاز ہونے کو اصل واساس قرار دیا گیا ہے یعنی وہ کسی پر ظلم اس لئے نہیں کرتا کہ وہ ہر ایک سے بے نیاز ہے، کسی کا محتاج نہیں اور نہ ہی اسے کوئی ایسی ضرورت لاحق و درپیش ہوتی ہے جس کو پورا کرنے کے لئے وہ اپنی غیر مملوکہ چیز یا شخص پر ظلم وزیادتی کرے، جبکہ آیت مبارکہ میں خدا کے غنی و بے نیاز ہونے کی بجائے اس کی مالکیت مذکور ہے، بہر حال اس کا ہر شے کا مالک ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ ظالم نہیں۔

اس کے علاوہ ایک دلیل یہ بھی ہے کہ تمام امور خواہ کچھ بھی ہوں ان کی بازگشت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے، خدا کے علاوہ کوئی چیز کسی کے دست قدرت واختیار میں نہیں کہ جسے خدا اس کے ہاتھ سے چھین لے اور اسے اپنے ہاتھ میں لے کر اس کے بارے میں خود جو چاہے انجام دے کہ اس صورت میں اسے ظلم وزیادتی کہا جائے، چنانچہ اسی دلیل کی طرف جملہ "والیہ ترجع الامور" میں اشارہ کیا گیا ہے۔

یہ دونوں دلیلیں جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں اور ایک دوسرے کی لازم و ملزوم ہیں، ان میں سے پہلی دلیل اس بات پر مبنی ہے کہ ہر چیز خدا کے لئے ہے، اس کی ملکیت ہے، اور دوسری اس بات پر مبنی ہے کہ کوئی چیز غیر خدا کی ملکیت نہیں۔

بہترین امت کا اعزاز

○ " کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ "
(تم بہترین امت ہو کہ جسے لوگوں کے لئے لایا گیا ہے)

یہاں امت کا لوگوں کے لئے لایا۔۔نکالا جانا۔۔ذکر کیا گیا ہے جس کا معنی (واللہ اعلم) یہ ہے کہ اسے ان کے لئے ظاہر کیا گیا ہے۔

آیت میں جملہ "اُخْرِجَتْ" ذکر ہوا ہے، "اخـــراج" کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں حدوث اور خلق کئے جانے کا لطیف اشارہ پایا جاتا ہے یعنی خداوند عالم یہ بتانا چاہتا ہے کہ اس امت کو میں نے خلق کیا اور وجود عطا کیا، چنانچہ اس کا ثبوت درج ذیل آیت مبارکہ میں پایا جاتا ہے:

سورۂ اعلیٰ، آیت : ۴

○ " الَّذِیْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰی "
(وہ کہ جس نے گھاس کو نکالا......یعنی اگایا......)

اس میں بھی لفظ " اخراج " استعمال ہوا ہے۔

زیر نظر آیت میں مؤمنین سے خطاب کیا گیا ہے جو کہ اس بات کا قرینہ ہے کہ یہاں لفظ "الـنـاس" سے مراد عام افراد بشر ہیں، اور جیسا کہ کہا گیا ہے فعل " کُنْتُمْ " یہاں وقت اور زمانہ کی قید سے خالی ہے، اور لفظ "امـــت" کسی ہدف و غرض اور مقصد کے حامل گروہ اور فرد، دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

یہاں ایمان باللہ کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بعد ذکر کیا گیا ہے جو کہ جزء کے بعد کل اور فرع کے بعد اصل کا ذکر کرنے کے طور پر ہے۔

بنابرایں آیت مبارکہ کا معنی یہ ہے کہ تم اے اہل اسلام (گروہ مسلمانان) بہترین امت ہو کہ جسے اللہ نے لوگوں کے لئے اور ان کی ہدایت کی غرض سے ظاہر کیا، کیونکہ تم سب اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور میرے عائد کردہ فریضے یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ادا کرتے ہو، تو امت مسلمہ کا تمام لوگوں پر امتیازی حیثیت و اعزاز کا حامل قرار دیا جانا امت کے بعض افراد کے حقیقت ایمان اور صحیح معنی میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے عملی اقدامات اٹھانے کی بنیاد و حوالہ سے ہے۔

یہ ہے مفسرین کرام کے ان بیانات کا خلاصہ جو انہوں نے زیر نظر آیت کے حوالہ سے پیش کئے ہیں۔

اور بظاہر (واللہ اعلم) آیت سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ "کُنْتُمْ" وقت و زمانہ سے خالی "ہونے" کا معنی دیتا ہے، اور آیت مبارکہ میں صدرِ اسلام کے مؤمنین یعنی مہاجرین و انصاری کی تعریف کی گئی ہے کہ وہ دوسروں پر ایمان لانے کے حوالہ سے سبقت رکھتے ہیں۔

اور یہاں "ایمان" سے مراد، اس خدائی دعوت پر لبیک کہنا اور ایمان لانا ہے جس میں خداوند عالم نے لوگوں کو اعتصام بحبل اللہ (اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھنا) اور کفر کے مقابلے میں عدم تفرقہ کا حکم دیا ہے کہ جس کا ثبوت ماقبل جملہ " اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ ......" میں موجود ہے ؟ اور اہل کتاب کے ایمان سے مراد بھی یہی ہے، نتیجتاً آیت مبارکہ کی بازگشت اس معنی کی طرف ہوگی کہ اے امتِ مسلمہ کے افراد ! تم اپنے وجود میں آنے اور لوگوں کے سامنے جلوہ گر ہونے کی ابتداء ہی سے بہترین امت تھے کیونکہ تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے تھے اور کرتے ہو اور تم اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے ہوئے تھے اور تھامے ہوئے ہو اور تم یک جان و یک دل ہو کر یہ سب کچھ کرتے تھے اور کرتے ہو، گویا تم سب ایک ہو، اگر اہل کتاب بھی تمہاری طرح یہ سب کرتے تو ان کے لئے بہتر تھا مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ آپس میں اختلاف کیا اور ان میں سے کچھ لوگ مؤمن ہوئے اور اکثر فاسق ہو گئے۔ قارئین کرام! آپ ملاحظہ کریں کہ آیات مبارکہ میں کئی التفاتی موارد پائے جاتے ہیں یعنی ان میں خطاب کا انداز تبدیل کیا گیا ہے، غائب سے مخاطب، مخاطب جمع سے مخاطب مفرد اور بالعکس یعنی مخاطب مفرد سے مخاطب جمع کا انداز اختیار کیا گیا ہے، اسی طرح بعض مقامات پر اسم ظاہر کو ضمیر کی جگہ لایا گیا ہے، اور کئی مقامات پر ضمیر کی بجائے لفظ جلالہ (اللہ) کو بار بار ذکر کیا گیا ہے، تو ان تمام تبدیلیوں کی وجوہات اور اصل راز سے آیات کے معانی میں غور و فکر کرنے والے حضرات بخوبی آگاہ ہو سکتے ہیں۔

روایات پر ایک نظر

حقیقی تقوائے الٰہی

کتاب معانی الاخبار اور تفسیر العیاشی میں ابوبصیر سے مروی ہے انہوں نے کہا: میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیت مبارکہ " اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ " کی تفسیر پوچھی کہ اس میں حقیقی تقوائے الٰہی سے کیا مراد ہے؟ تو امامؑ نے ارشاد فرمایا: اس سے مراد یہ ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے اور نافرمانی نہ کی جائے، اسے یاد رکھا جائے، بھلایا نہ جائے، اور اس کا شکر ادا کیا جائے کفران نہ کیا جائے،

(عن ابی بصیر قال: سالت ابا عبداللّٰہ علیہ السلام عن قول اللّٰہ عزوجل "اتقوا اللّٰہ حق تقاتہ ، قال :یطاع فلا یعصی ، ویذکر فلا ینسی ، ویشکر فلا یکفر ")

(معانی الاخبار صفحہ ۲۴۰، تفسیر العیاشی ج ۱ ص ۱۹۴ ح ۱۲۰)

ایک حدیث نبویؐ

تفسیر "درمنثور" میں ہے کہ حاکم اور ابن مردویہ نے ایک حوالہ سے ابن مسعود کی روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا:

"قال رسول اللہ (ص): اتقوا اللّٰہ حق تقاتہ ان یطاع فلا یعصی، ویذکر فلا ینسٰی،

حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ارشاد فرمایا: تقوائے الٰہی اختیار کرو جیسا کہ تقویٰ اختیار کرنے کا حق ہے اور وہ اس طرح اس کی اطاعت کی جائے نافرمانی نہ کی جائے اور اس کو یاد رکھا جائے بھلایا نہ جائے۔

(تفسیر "درمنثور" جلد ۲ ص ۵۹)

دوسری حدیث نبویؐ

کتاب '' درمنثور'' میں ہے کہ خطیب نے انس سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا:

" قال رسول اللّٰہ (ص): لا یتقی اللّٰہ عبد حق تقاتہ حتی یعلم ان ما اصابہٗ لم یکن لیخطئہٗ، وما اخطأہ لم یکن لیصیبہٗ "

حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ارشاد فرمایا: کوئی بندہ اس وقت تک تقوائے الٰہی کا پورا پورا حق ادا نہیں کرسکتا جب تک کہ اسے اس بات کا علم (یقین) حاصل نہ ہو کہ اسے جو کچھ ملا ہے وہ اسے ہی ملنا تھا اور اسے اس سے ہرگز محروم نہ ہونا تھا، اور جو اسے نہیں ملا وہ اسے ملنا ہی نہیں تھا اور اسے اس نے پانا ہی نہ تھا،

(تفسیر '' درمنثور'' جلد دوم ص ۶۰)

ہمارے سابقہ بیان میں واضح کیا جاچکا ہے کہ پہلی دو روایتوں سے آیت سے فہم المعنی کی کیفیت کیا ہے، اور جہاں تک تیسری حدیث کا تعلق ہے تو اس میں آیت کی تفسیر تقویٰ کے اصل معنی کی بجائے اس کے لازم المعنی سے کی گئی ہے، اور یہ نہایت واضح امر ہے۔

حق التقویٰ کا لطیف معنی

تفسیر '' البرہان'' میں شہر ابن آشوب کی سند سے بحوالہ تفسیر وکیع، عبد خیر سے روایت کی گئی ہے کہ انہوں نے کہا:

سألت علی بن ابی طالب عن قولہ تعالٰی: "یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ"، میں نے حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ سے آیت مبارکہ "یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ" کی تفسیر پوچھی، تو امامؑ نے ارشاد فرمایا: **واللّٰہ ما عمل بہا غیر بیت رسول اللّٰہ، نحن ذکرناہ فلا ننساہ، و نحن شکرناہ فلن نکفرہٗ، و نحن اطعناہ فلم نعصہ، فلما نزلت ھذہ الآیۃ قال الصحابۃ لا نطیق ذلک، فانزل اللّٰہ : فاتقوا اللّٰہ ما استطعتم، قال و کیع ما أطقتم......،** خدا کی قسم، سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھرانہ کے، کسی نے اس آیت پر عمل نہیں کیا، ہم ہی نے ہمیشہ اسے یاد رکھا اسے کبھی فراموش نہیں کیا، ہم ہی نے سدا اس کا شکر ادا کیا، کبھی اس کا کفران نہیں کیا، اور ہم نے ہمیشہ اس کی اطاعت و فرمانبرداری کی، کبھی اس کی معصیت و نافرمانی نہیں کی، جب یہ

آیت نازل ہوئی تو صحابہ نے کہا: ہم تو اس کی توان نہیں رکھتے، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: "**فاتقوا اللّٰہ ما استطعتم**" (پس جتنا کر سکتے ہو تقوائے الٰہی اختیار کرو)، وکیع نے "**ما استطعتم**" کا معنی یہ کیا: "**ما اطقتم**" یعنی جتنی تم طاقت رکھتے ہو،

(تفسیر البرہان، ج۱ ص ۳۰۴ ح ۳)

تقویٰ بقدر استطاعت

تفسیر العیاشی میں ابوبصیر سے روایت ذکر کی گئی ہے انہوں نے کہا :

" سألت ابا عبدالله (عليه السلام) عن قول الله: " اتقوا الله حق تقاته "، قال(ع): منسوخة، قلت: وما نسختها ؟ قال (ع): قول الله " فاتقوا الله ما استطعتم "،

میں نے امام ابوعبداللہ جعفر صادق علیہ السلام سے آیت مبارکہ "**اتقوا اللّٰہ حق تقاتہ**" کا معنی پوچھا، تو امامؑ نے ارشاد فرمایا: وہ منسوخ ہوگئی ہے، میں نے عرض کی: کس آیت نے اسے منسوخ کیا ہے؟ امامؑ نے فرمایا: اس آیت نے: "**فاتقوا اللّٰہ ما استطعتم**" (پس تم تقوائے الٰہی اختیار کرو جس قدر کر سکتے ہو)،

(تفسیر العیاشی، ج۱ ص ۱۹۴)

مؤلفؒ: وکیع کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تفسیر العیاشیؒ میں اس آیت کے منسوخ ہونے کی جو بات کی گئی ہے اس سے مراد تقویٰ کے مراتب کا بیان ہے، اور جہاں تک نسخ کے اصطلاحی معنی کا تعلق ہے جیسا کہ بعض مفسرین کرام نے یہاں مراد لیا ہے تو وہ ظاہر القرآن سے مطابقت نہیں رکھتا، بلکہ قرآن اسے رد کرتا ہے۔

اسلام وتسلیم میں یکسانیت

تفسیر مجمع البیان میں مذکور ہے کہ حضرت امام جعفر صادقؑ سے روایت کی گئی ہے آپؑ نے "وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ" کو "**وَاَنْتُمْ مُسَلِّمُوْنَ**" (لام پر شدہ کے ساتھ) پڑھا۔

(ملاحظہ ہو: تفسیر مجمع البیان ج ۲ ص ۴۸۲)

اللہ کی رسی

تفسیر "درمنثور" میں آیت مبارکہ "وَاعۡتَصِمُوا بِحَبۡلِ اللهِ جَمِيۡعًا" کے ضمن میں مذکور ہے کہ ابن ابی شیبہ اور ابن جریر نے ابوسعید خدری سے روایت کی کہ اس آیت کی تفسیر میں حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ارشاد فرمایا: " **کتاب الله هو حبل الله الممدود من السماء الی الارض**"، خدا کی کتاب ہی خدا کی وہ رسی ہے جو آسمان سے زمین تک کھنچی ہوئی ہے۔

(تفسیر "درمنثور" ج ۲ ص ۶۰)

قرآن: وسیلۂ ربط باخدا

تفسیر "درمنثور" ہی میں ہے کہ ابن ابی شیبہ نے ابی شریح الخزاعی سے روایت کی، انہوں نے کہا: **قال رسول الله (ص): ان هٰذا القرآن سبب طرفه بيد الله، وطرفه بايديكم، فتمسكوا به فانكم لن تزالوا ولن تضلوا بعدهٗ ابداً** "

حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ارشاد فرمایا: یہ قرآن وسیلۂ ربط ہے کہ جس کا ایک سرا خدا کے ہاتھ میں اور دوسرا سرا تمہارے ہاتھوں میں ہے، پس تم اس سے وابستہ ہو جاؤ، کہ اس سے وابستگی کے بعد تم ہرگز فنا نہ پاؤ گے اور نہ ہی کبھی گمراہ ہو گے۔

(تفسیر "درمنثور"، جلد ۲ صفحہ ۶۰)

امام زین العابدین کا فرمان

کتاب معانی الاخبار میں امام زین العابدین علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے آپؑ نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا:

" **وحبل الله هو القرآن** "

حبل اللہ سے مراد قرآن ہی ہے۔ (معانی الاخبار، ص ۱۳۲، ح ۱)

اس مطلب و مضمون پر مشتمل متعدد روایات موجود ہیں جو فریقین شیعہ و سنی کی کتب میں ذکر کی گئی ہیں۔

آل محمدؐ، حبل اللہ ہیں

تفسیر العیاشی میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا:

" ال محمد هم حبل الله الذی امر بالاعتصام به فقال: "وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا "

آل محمدؐ ہی حبل اللہ ہیں کہ جس سے وابستہ ہونے کا حکم دیا گیا ہے چنانچہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: تم سب اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور تفرقہ پیدا نہ کرو۔

تفسیر العیاشی، جلد اول ص ۱۹۴ حدیث ۱۲۲)

اس مطلب پر مشتمل دیگر روایات بھی وارد ہوئی ہیں، اور ہمارے سابقہ بیان میں جو کچھ ذکر ہو چکا ہے اس سے اس مطلب کی تائید ہوئی ہے، اور ابھی مزید روایات بھی ذکر کی جائیں گی جن میں اس مطلب کے تائیدی حوالے موجود ہیں،

حدیث ثقلین کا حوالہ

تفسیر " درمنثور" میں ہے کہ طبرانی نے زید بن ارقم سے روایت کی ہے، انہوں نے کہا:

قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه و آله وسلم: انى لكم فرط، و انكم واردون على الحوض، فانظر وا كيف تخلفونى فى الثقلين؟ قيل: وما الثقلان يا رسول اللّٰه ؟ قال (ص): الاكبر كتاب اللّٰه عزوجل سبب طرفه بيداللّٰه ، وطرفه بايديكم، فتمسكوا به لن تزالوا ولن تضلوا، والاصغر عترتى، وانهما لن يفترقا حتى يردا على الحوض، وسألت لهما ذلك ربى فلا تقدموهما فتهلكوا، ولا تعلموهما فانهما اعلم منكم ،

حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ارشاد فرمایا: میں تم سے پہلے جانے والا ہوں اور تم حوض کوثر پر میرے پاس آؤ گے، بس تم خیال رکھنا کہ میرے بعد ثقلین کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہو؟ پوچھا گیا: ثقلین (دو گرانقدر چیزوں) سے کیا مراد ہے اے اللہ کے رسول! تو آپؐ نے ارشاد فرمایا: پہلی بھاری بڑی چیز اللہ کی کتاب ہے کہ جس کا ایک سرا خدا کے ہاتھ میں اور دوسرا تمہارے ہاتھوں میں ہے، بس تم میرے بعد اس سے تمسک اختیار کرنا، اسی سے وابستہ رہنا کہ اس کے نتیجہ میں تباہی و گمراہی سے ہمیشہ کے لئے بچ جاؤ گے، اور دوسری چھوٹی بھاری، گرانقدر چیز میری عترت ہے، اور وہ دونوں ہرگز ایک دوسرے سے

جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ دونوں میرے پاس حوض کوثر پر پہنچ جائیں گے، اور میں نے تمہارے لئے ان کے بارے میں اپنے پروردگار سے استدعا کی ہے، پس تم ہرگز ان سے آگے نہ بڑھنا ورنہ تباہ ہو جاؤ گے، اور ہرگز انہیں کچھ تعلیم دینے کا نہ سوچنا کہ وہ دونوں تم سے زیادہ علم رکھتے ہیں،

(تفسیر" درمنثور" ج ۲ ص ۶۰)

حدیثِ ثقلین، ان احادیث متواترہ میں سے ہے جن کے بارے میں فریقین شیعہ و سنی اجماع و اتفاق رائے رکھتے ہیں،......دونوں کے نزدیک متفق علیہ ہے......، اور ہم اس سورہ کی تفسیر کی ابتداء میں بیان کر چکے ہیں کہ بعض علمائے حدیث نے اس کے راویوں کی تعداد پینتیس (۳۵) صحابہ کرام تک ذکر کی ہے کہ جن میں مرد اور عورتیں دونوں شامل ہیں، اور حدیث شناسوں و راویوں کی کثیر تعداد نے اسے بیان کیا ہے۔

۷۲ فرقوں کا تذکرہ

تفسیر" درمنثور" میں ہے کہ ابن ماجہ، ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے انس سے روایت کی ہے انہوں نے کہا:

" قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلم: افترقت بنو اسرائیل علیٰ احدیٰ وسبعین فرقۃ، وان امتی ستفترق علیٰ اثنتین و سبعین فرقۃ ،کلھم فی النار الا واحدۃ، قالوا : یا رسول اللّٰہ! ومن ھٰذہ الواحدۃ ؟ قال: الجماعۃ ثم قال(ص): وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا "

حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ارشاد فرمایا: بنی اسرائیل ۷۱ فرقوں میں بٹ گئے اور بہت جلد میری امت بھی بہتر فرقوں میں بٹ جائے گی کہ وہ سب جہنم کی آگ میں جلیں گے سوائے ایک فرقہ کے ، اصحاب نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! وہ ایک فرقہ کون سا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: وہ جماعت ہے، پھر آپؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: "وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا " تم سب اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو،

(تفسیر" درمنثور" جلد اول صفحہ ۶۰،۶۱)

یہ روایت بھی شہرہ آفاق روایات میں سے ہے، البتہ شیعہ محدثین نے اسے عبارت میں قدرے فرق کے ساتھ ذکر کیا ہے (ملاحظہ ہو: کتاب خصال (صدوقؒ)، کتاب معانی الاخبار، کتاب احتجاج (طبرسیؒ)، کتاب الامالی، کتاب سلیم بن قیس، تفسیر العیاشی)۔ کتاب خصال میں شیخ صدوقؒ نے اپنے اسناد سے سلمان بن مہران کی روایت ذکر کی ہے کہ انہوں نے امام جعفر بن محمد علیہما السلام کے حوالہ سے بیان کیا کہ امامؑ نے اپنے آباء گرامی قدر سے حوالہ سے حضرت امیر المومنینؑ کا ارشاد

گرامی ذکر کیا کہ انہوں نے فرمایا:

سمعت رسول اللّٰہ (ص) یقول: ان امۃ موسٰی افترقت بعدہٗ علٰی احدیٰ وسبعین فرقۃ، فرقۃ منھا ناجیۃ و سبعون فی النار، وافترقت امۃ عیسٰی بعدہٗ علٰی اثنتین وسبعین فرقۃ، فرقۃ منھا ناجیۃ واحدیٰ وسبعون فی النار، وان امتی ستفترق بعدی علٰی ثلاث و سبعین فرقۃ، فرقۃ منھا ناجیۃ، واثنتان وسبعون فی النار،

میں نے حضرت پیغمبر اسلامؐ سے سنا آپؐ نے ارشاد فرمایا: حضرت موسیٰؑ کی امت آنجنابؑ کے بعد اکہتر فرقوں میں بٹ گئی، ان میں سے ایک فرقہ نجات پانے والا ہے اور باقی ستر (۷۰) جہنم میں جائیں گے، اور حضرت عیسیٰؑ کی امت، ان کے بعد بہتر (۷۲) فرقوں میں بٹ گئی، ان میں سے ایک فرقہ نجات پانے والا جبکہ دیگر اکہتر (۷۱) فرقے دوزخ کی آگ میں جلیں گے، اور میری امت میرے بعد بہت جلد تہتر (۷۳) فرقوں میں بٹ جائے گی کہ جن میں سے ایک فرقہ نجات پانے والا جبکہ بہتر (۷۲) فرقے دوزخ کی آگ میں جلیں گے،

(کتاب خصال، ص ۵۸۵، ح ۱۱۔ کتاب معانی الاخبار، ص ۳۲۳، ح ۱۷۔ کتاب الاحتجاج، ج ۱، ص ۳۹۱۔ کتاب سلیم بن قیس، ص ۲۱۴۔ کتاب تفسیر العیاشی، ج ۱، ص ۳۳۱)

یہ حدیث درج ذیل حدیث کے عین مطابق ہے:

تفسیر ''درمنثور'' میں ہے کہ ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور حاکم (انہوں نے اس حدیث کی صحت کا واضح اظہار کیا) نے ابوہریرہ سے روایت کی کہ انہوں نے کہا:

قال رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم: افترقت الیھود علٰی احدیٰ وسبعین فرقۃ، وتفرقت النصاریٰ علٰی اثنتین و سبعین فرقۃ، وتفترق امتی علٰی ثلاث و سبعین فرقۃ "

حضرت رسول خداؐ نے ارشاد فرمایا: یہودی اکہتر (۷۱) فرقوں میں بٹ گئے، عیسائی بہتر (۷۲) فرقوں میں بٹ گئے اور میری امت تہتر (۷۳) فرقوں میں بٹ جائے گی،

(تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲ ص ۶۲)

بنی اسرائیل سے مماثلت وتقابل

تفسیر ''درمنثور'' میں ہے کہ حاکم نے عبداللہ بن عمر کے حوالہ سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے کہا:

" قال رسول اللہ صلی اللہ علیه و آلہ وسلم: یأتی علیٰ امتی ما اتیٰ علیٰ بنی اسرائیل حذو النعل بالنعل حتی لو کان فیهم من نکح امه علانیة کان فی امتی مثله، ان بنی اسرائیل افترقوا علیٰ احدیٰ و سبعین ملة، وتفترق امتی علیٰ ثلاث و سبعین ملة، کلها فی النار الا ملة واحدة، فقیل لهٗ: ما الواحدة ؟ قال (ص) : ما انا علیه الیوم و اصحابی،

حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ارشاد فرمایا: میری امت کا حال بھی بعینہٖ بنی اسرائیل جیسا ہوگا، یہاں تک کہ اگر بنی اسرائیل میں کوئی ایسا شخص آیا ہو جس نے اپنی ماں کے ساتھ بدفعلی کی ہو تو میری امت میں بھی اسی جیسا شخص ہوگا، بنی اسرائیل اکہتر (۷۱) گروہ بنے اور میری امت تہتر (۷۳) گروہوں میں بٹ جائے گی، وہ سب جہنم میں جائیں گے سوائے ایک گروہ کے! پوچھا گیا کہ وہ ایک گروہ کون سا ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: اسی نظریہ کے حامل جو آج میرا اور میرے اصحاب کا ہے۔
(تفسیر درمنثور ج ۲ ص ۶۲)

اس حدیث کے مانند کتاب جامع الاصول میں ترمذی کے حوالہ سے ابن عمرو بن عاص کی روایت مذکور ہے جس میں یہی حدیث نبویؐ بیان کی گئی ہے، (ملاحظہ ہو: جامع الاصول، ج ۱۰، ص ۴۰۸)

امام جعفر صادقؑ کی روایت

کتاب کمال الدین و تمام النعمہ میں مؤلف نے اپنے اسناد سے غیاث بن ابراہیم کی روایت ذکر کی ہے، انہوں نے کہا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے آباء کے حوالہ سے بیان فرمایا:

"قال رسول اللہ (ص): کل ما فی الامم السالفة فانه یکون فی هذه الامة مثله حذو النعل بالنعل و القذة بالقذة "

حضرت رسول خداؐ نے ارشاد فرمایا: جو کچھ سابقہ امتوں میں تھا اسی جیسا اس امت میں بھی ہوگا، صدر در صدا اور طابق النعل بالنعل !

(کمال الدین واتمام النعمہ، ص ۵۷۶)

امت کی خیانت

تفسیر قمی میں حضرت رسول خداؐ سے روایت ذکر کی گئی ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

" لتر كبن سنة من كان قبلكم حذو النعل بالنعل، و القذة بالقذة، لا تخطئون طريقهم ولا يخطى، شبر بشبر، وذراع بذراع، وباع بباع، حتى ان لو كان من قبلكم دخل حجر ضب لدخلتموه، قالوا: اليهود والنصارىٰ تعني يا رسول الله (ص) ؟ قال(ص): فما اعنى؟ لتنقضون من دينكم الامانة وآخره الصلاة "

تم اپنے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کے طرزِ عمل کو صد در صد اپناؤ گے اور تم ان کی روش سے ذرہ بھر فرق نہ کرو گے بلکہ ان کے مطابق اس طرح عمل کرو گے کہ تمہارے اور ان کے اعمال میں بالشت با بالشت، بازو با بازو اور باع با باع جیسی ہم رنگی کی صورت ہوگی (یعنی ایک جیسے اعمال ہوں گے)،......وجب کا معنی بالشت، ذراع کا معنی کہنی سے انگلیوں کے سروں تک کا فاصلہ اور باع کا معنی انگلیوں کے سروں اور کلائیوں کے درمیان کا وہ فاصلہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنے ہاتھوں کو دائیں اور بائیں دونوں طرف کو کھولتا ہے تو اس کے درمیانی خلا کو باع کہتے ہیں......، یہاں تک کہ اگر تمہارے پیشرو لوگوں میں سے کوئی شخص گوہ کے بل میں بھی داخل ہوا ہو تو تم بھی اس میں داخل ہو گے، صحابہ نے کہا: کیا آپ کی مراد یہود و نصاریٰ ہے اے اللہ کے رسول! آنحضرتؐ نے فرمایا: تو میں اور کسے مراد لے رہا ہوں، تم اسلام کی رسی کو ٹکڑے ٹکڑے کرو گے چنانچہ تم سب سے پہلے اپنے دین کے دستور کی خلاف ورزی کرتے ہوئے امانتوں میں خیانت کرو گے اور پھر نوبت نماز ترک کرنے تک پہنچ جائے گی،

(تفسیر قمیؒ، جلد ۲ ص ۴۱۳)

بنی اسرائیل سے مماثلت کی آخری حد

کتاب جامع الاصول میں صحاح کے حوالہ سے ماخوذ اور صحیح ترمذی کے حوالہ سے حضرت پیغمبر اسلامؐ کا ارشاد گرامی مروی ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

" والذی نفسی بیدہ لتر كبن سنن من كان قبلكم حذو النعل بالنعل و القذة بالقذة حتى ان كان فيهم من اتى امه يكون فيكم ، فلا ادرى اتعبدون العجل أم لا ؟ "

مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھوں میں میری جان ہے تم اپنے پیشرو لوگوں کے طرزِ عمل کو سو فی صد اور کامل برابری کے ساتھ اپناؤ گے (جو کچھ انہوں نے کیا تم بھی بعینہ اسی طرح کرو گے)، یہاں تک کہ اگر ان میں سے کوئی شخص اپنی ماں سے بدفعلی کا مرتکب ہوا ہوگا تو تم میں بھی اس جیسا شخص پیدا ہوگا، اب یہ مجھے معلوم نہیں کہ آیا تم بھی بچھڑے کی پوجا کرو گے یا نہ کرو گے ؟

یہ بھی مشہور روایات میں سے ایک ہے اور اسے اہل سنت نے صحاح ستہ اور دیگر کتب حدیث میں ذکر کیا ہے، اور شیعہ محدثین نے بھی اپنی جوامع میں ذکر کیا ہے۔

انس بن مالک کی روایت

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں انس بن مالک کی روایت ذکر کی گئی ہے جس میں انہوں نے کہا:

" ان رسول اللّٰہ (ص) قال: لیردن علی الحوض رجال ممن صاحبنی حتی اذا رفعوا اختلجوا دونی، فلأ قولن: ای رب أصحابی فلیقالن: انک لا تدری ما أحد ثوا بعدک "

حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ارشاد فرمایا: میرے صحابہ میں ہی سے کچھ لوگ حوضِ کوثر پر میرے پاس آئیں گے، جوں ہی وہ نزدیک آئیں گے تو انہیں پکڑ کر مجھ سے دور لے جایا جائے گا، اس وقت میں پکاروں گا: میرے پروردگارا! یہ میرے صحابہ ہیں، تو فوراً جواب آئے گا: کیا تمہیں معلوم نہیں کہ انہوں نے تیرے بعد کیا کارستانیاں کی ہیں۔

(صحیح بخاری، ج ۸، ص ۱۴۹۔ صحیح مسلم مع شرح نووی، ج ۱۵، ص ۶۴)

صحابہ کا ارتداد

صحیح بخاری اور صحیح مسلم ہی میں ابو ہریرہ کی ایک روایت ذکر کی گئی ہے کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ارشاد فرمایا:

"یرد علی یوم القیامۃ رھط من اصحابی ...... او قال من امتی...... فیحلؤون عن الحوض فا قول: یارب اصحابی، فیقول: لا علم لک بما أحدثوا بعدک ؟، ارتدوا علٰی اعقابھم القھقری فیحلؤون "،

قیامت کے دن میرے اصحاب...... یا فرمایا: میری امت...... میں سے کچھ لوگ میرے پاس آئیں گے مگر انہیں حوض کوثر سے اٹھا دیا جائے گا، میں کہوں گا: پروردگارا! یہ میرے اصحاب ہیں، خداوند عالم ارشاد فرمائے گا: کیا تمہیں معلوم نہیں کہ انہوں نے تیرے بعد کیا کارستانیاں کیں، یہ لوگ تیرے بعد اپنے پچھلے پاؤں پلٹ گئے (مرتد ہو گئے) تو اب وہ یہاں سے دھتکارے گئے۔

(صحیح بخاری، ج ۹ ص ۵۸، صحیح مسلم مع شرح نووی، ج ۳ ص ۱۳۶)

یہ روایت بھی مشہور روایات میں سے ایک ہے اور اسے فریقین شیعہ و سنی محدثین نے اپنی صحاح اور جوامع میں ذکر کیا ہے اور اس کے راویوں میں متعدد صحابہ کرام مثلاً ابن مسعود، انس بن مالک، سہل بن ساعد، ابو ہریرہ، ابو سعید خدری، عائشہ، ام سلمہ اور اسماء بنت ابی بکر اور دیگر شامل ہیں، اور اسے بعض آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے بھی روایت کیا گیا ہے۔

اس طرح کی روایات اپنی کثرت اور تفنن یعنی گوناگوں اسلوب بیان کے حوالہ سے ان مطالب کی تصدیق کرتی ہیں جو آیات کریمہ کے ظواہر سے استفادہ کر کے ہم نے پیش کئے ہیں، اور آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد امت میں یکے بعد دیگرے رونما ہونے والے واقعات سے ان روایات میں مذکور مطالب کی تصدیق ہوتی ہے۔

جاہلیت کی موت!

تفسیر "درمنثور" میں ہے کہ حاکم نے...... کہ جنہوں نے اسے صحیح قرار دیا ہے...... ابن عمر کے حوالہ سے روایت بیان کی ہے انہوں نے کہا:

" قال رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم: من خرج من الجماعة قيد شبر فقد خلع ربقة الاسلام من عنقه حتى يراجعه ، ومن مات و ليس عليه امام جماعة فان موتته ميتة جاهلية "

حضرت رسول خداؐ نے ارشاد فرمایا: جو شخص ایک بالشت بھی جماعت سے باہر نکل جائے گویا اس نے اسلام کا ہار اپنی گردن سے اتار دیا جب تک کہ دوبارہ جماعت میں واپس نہ آجائے، اور جو شخص اس حال میں مرجائے کہ اس پر کوئی ایسا امام و رہبر نہ ہو جو جماعت کی ہدایت کر رہا ہو تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہے۔

(تفسیر "درمنثور" جلد ۲ ص ۶۱)

یہ روایت بھی اپنے مطلب و مضمون کے حوالہ سے مشہور روایات میں سے ایک ہے اور فریقین نے آنحضرتؐ سے روایت کی ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

" من مات ولم يعرف امام زمانه فقد مات ميتة جاهلية "

جو شخص مرجائے جبکہ وہ اپنے زمانہ کے امام کو نہ پہچانتا ہو تو گویا وہ جاہلیت کی موت مرا ،

ہمیشہ حق پر !

کتاب جامع الاصول میں ترمذی اور سنن ابوداؤد کے حوالہ سے حضرت رسول خداؐ کا فرمان مذکور ہے کہ آپؐ نے

ارشاد فرمایا:

" لا تزال طائفة من امتی علی الحق "

میری امت میں سے ایک گروہ ہمیشہ حق پر ہوگا،

(جامع الاصول، ج ۱۰، ص ۴۱۰، حدیث ۷۴۷۵)

اہل بدعت و باطل پرست !

" مجمع البیان " میں آیۂ مبارکہ " أَكَفَرْتُم بَعْدَ إِيمَانِكُمْ " کی تفسیر میں حضرت امیر المومنینؑ سے منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا:

" هم اهل البدع والاهواء والآراء الباطلة من هذه الامة "

(......ایمان کے بعد کفر اختیار کرنے والوں سے مراد......) اس امت سے اہل بدعت، نفسانی خواہشوں کے پیروکار اور باطل نظریات والے ہیں،

(مجمع البیان، ج ۲ ص ۴۸۵)

درمیانی امت !

مجمع البیان اور تفسیر العیاشی میں آیت مبارکہ " كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ " کی تفسیر میں ابو عمرو زبیری سے مروی ہے کہ حضرت امام جعفر صادقؑ نے ارشاد فرمایا:

" الامة التی وجبت لها دعوة ابراهيم وهم الامة التی بعث الله فيها ومنها وليها، وهم الامة الوسطى، وهم خير امة اخرجت للناس "،

اس سے مراد وہ امت ہے جس کے بارے میں حضرت ابراہیمؑ کی دعا مستجاب ہوئی، اور وہ امت وہ لوگ ہیں جن میں اور جن میں سے اور جن کی طرف انبیاء بھیجے گئے، اور وہی لوگ درمیانی امت ہیں اور وہی لوگ بہترین امت ہے جسے لوگوں کے لئے بھیجا گیا،

(مجمع البیان، تفسیر سورۂ آل عمران، آیت ۱۱۰، تفسیر العیاشی، ج ۱ ص ۱۹۵، حدیث ۱۳۰)

اہل بیتؑ: بہترین امت!

تفسیر" درمنثور" میں ہے کہ ابن ابی حاتم نے ابوجعفر امام محمد باقرؑ سے روایت کی ہے کہ آپؑ نے ارشاد فرمایا: آیت مبارکہ "کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ" میں بہترین امت سے اہل بیتؑ نبیؐ مراد ہیں۔

(تفسیر" درمنثور، ج ۲، ص ۶۴)

پانچ خدائی عطیے وامتیازات

تفسیر" درمنثور" میں ہے کہ احمد نے حسنؑ بن علی کے حوالہ سے روایت ذکر کی ہے کہ انہوں نے کہا:

" قال رسول اللّٰہ (ص): اعطیت مالم یعط احد من الانبیاء: نصرت بالرعب، واعطیت مفاتیح الارض، وسمیت احمد، وجعل التراب لی طھوراً، وجعلت امتی خیر الامم "،

حضرت رسول خداؐ نے ارشاد فرمایا: مجھے وہ کچھ عطا کیا گیا ہے جو کسی نبی کو نہیں دیا گیا:

(۱) رعب ودبدبہ کے ذریعے دشمنوں کے مقابلہ میں میری مدد کی گئی،

(۲) زمین کی کنجیاں مجھے دی گئیں،

(۳) مجھے "احمد" کے نام سے موسوم کیا گیا،

(۴) خاک کو میرے لئے پاک کرنے والی قرار دیا گیا،

(۵) میری امت کو بہترین امت قرار دیا گیا،

(تفسیر" درمنثور"، جلد دوم، صفحہ ۶۴)

آیات ۱۱۱ تا ۱۲۰

○ لَنْ يَضُرُّوكُمْ إِلَّا أَذًى ۖ وَإِنْ يُقَاتِلُوكُمْ يُوَلُّوكُمُ الْأَدْبَارَ ثُمَّ لَا يُنْصَرُونَ ﴿١١١﴾

○ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوا إِلَّا بِحَبْلٍ مِنَ اللَّهِ وَحَبْلٍ مِنَ النَّاسِ وَبَاءُوا
بِغَضَبٍ مِنَ اللَّهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ
وَيَقْتُلُونَ الْأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۚ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ ﴿١١٢﴾

○ لَيْسُوا سَوَاءً ۗ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتْلُونَ آيَاتِ اللَّهِ آنَاءَ اللَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُونَ ﴿١١٣﴾

○ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُونَ
فِي الْخَيْرَاتِ ۖ وَأُولَٰئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ ﴿١١٤﴾

○ وَمَا يَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُكْفَرُوهُ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ ﴿١١٥﴾

○ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ۖ وَأُولَٰئِكَ
أَصْحَابُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿١١٦﴾

○ مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا
اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتْهُ ؕ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۱۷﴾

○ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ؕ وَدُّوْا مَا
عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۖۚ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ؕ قَدْ
بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

○ هٰٓاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا
اٰمَنَّا ۖۚ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ؕ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۱۹﴾

○ اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۡ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ؕ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا
يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۱۲۰﴾ ع

ترجمہ

○ "وہ ہرگز تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتے سوائے معمولی اذیت وآزار کے ، اور اگر تم سے قتال کریں گے تو وہ تمہارے سامنے پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے، پھر ان کی کوئی مدد نہ کی جائے گی " (۱۱۱)

○ " ان پر ذلت چھائی رہے گی وہ جہاں بھی ہوں، مگر یہ کہ وہ اللہ کی رسی کو تھام لیں یا یہ کہ انہیں لوگوں کا سہارا مل جائے، وہ خدا کے غضب کا شکار رہیں گے اور ان پر بیچارگی چھائی رہے گی، کیونکہ وہ خدا کی آیات کا انکار کرنے کے مرتکب ہوئے اور انہوں نے اللہ کے نبیوں کو ناحق قتل کیا، یہ سب ان کی نافرمانی اور زیادتیوں کا نتیجہ ہے " (۱۱۲)

○ " وہ سب برابر نہیں، اہل کتاب میں سے کچھ افراد ایسے ہیں جو دین پر قائم ہیں، جو راتوں کو آیات الٰہی کی تلاوت کرتے ہیں اور سجدہ گزاری میں مصروف رہتے ہیں" (۱۱۳)

○ " وہ خدا اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں، وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں، اور نیکیوں میں تندہی و تیزی سے کام لیتے ہیں، اور وہی صالحین میں سے ہیں " (۱۱۴)

○ " وہ جو بھی نیک کام کریں گے اس کی ناشکری ہرگز نہ ہوگی، اللہ متقی لوگوں سے بخوبی آگاہ ہے" (۱۱۵)

○ "یہ ایک حقیقت ہے کہ جن لوگوں نے کفر اختیار کیا انہیں ان کے اموال اور اولاد اللہ سے ذرہ بھر بے نیاز نہیں کر سکتے ، اور وہی جہنمی ہیں کہ وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے" (۱۱۶)

○ " وہ اس دنیاوی زندگی میں جو کچھ خرچ کرتے ہیں وہ اس نہایت ٹھنڈی ہوا کی طرح ہے جو ظالموں کی کھیتی پر پڑی تو اسے تباہ کر دیا، خدا نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنے اوپر ظلم کے مرتکب ہوئے " (۱۱۷)

○ " اے اہل ایمان ! تم اپنوں کے سوا کسی کو اپنا راز دار نہ بناؤ وہ تمہیں نقصان پہنچانے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑیں گے، وہ تمہیں صرف دکھی دیکھنا چاہتے ہیں، ان کی دشمنی وعداوت ان کی زبان سے ظاہر ہو چکی ہے اور جو کچھ ان کے دلوں میں ہے وہ اس سے کہیں بڑا ہے، ہم نے تو واضح نشانیاں پیش کر دی ہیں اگر تم عقل سے کام لینے والے بنو" (۱۱۸)

○ " ہاں، تم تو ان سے دوستی کرتے ہو مگر وہ تم سے دوستی نہیں کرتے حالانکہ تم تمام کی تمام کتاب پر ایمان رکھتے ہو، (ان کی حالت یہ ہے کہ جب تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اور جب اکیلے ہوتے ہیں تو غصہ میں انگلیاں کاٹتے ہیں، ان سے کہیں کہ تم اپنے حصہ ہی میں مر جاؤ، یقیناً خدا تمہارے دلوں کی باتوں سے بخوبی آگاہ ہے" (۱۱۹)

○ " اگر تمہیں کوئی نیکی واچھائی ملے تو انہیں دکھ پہنچتا ہے اور اگر تمہیں کوئی تکلیف ہو تو اس سے وہ خوش ہوتے ہیں ، اگر تم صبر سے کام لو اور تقوی اختیار کرو تو ان کی کوئی چال تمہیں ذرہ بھر نقصان نہیں پہنچا سکتی، بے شک خدا ان کے اعمال پر حاوی ہے " (۱۲۰)

تفسیر و بیان

یہ آیات مبارکہ...... جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں...... اسی غرض و مقصد کو بیان کر رہی ہیں جو ان سے ماقبل آیات میں مورد توجہ قرار پاچکا ہے کہ جس میں اہل کتاب بالخصوص یہودیوں کے بارے میں بیان کیا گیا کہ وہ آیات الٰہی کا انکار کرتے ہیں، اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہیں، اور مومنین کو اللہ کے راستہ سے روکتے ہیں، بنابرایں سابقہ دس آیات "بات سے بات نکلتی ہے" کے طور پر ہیں لہٰذا زیر بحث آیات مبارکہ کا ان سے اتصال و ربط اسی طرح باقی ہے۔

اذیت و آزار!

○ " لَنۡ یَّضُرُّوۡکُمۡ اِلَّاۤ اَذًی......"

(وہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے سوائے اذیت و آزار کے......)

لفظ "اَذًی" ...... جیسا کہ راغب نے مفردات القرآن میں لکھا ہے...... کا معنی ہر وہ تکلیف ہے جو کسی جاندار کو پہنچے۔ خواہ اس کی جان کو ہو یا جسم کو ہو یا دنیاوی یا اخروی نتائج و آثار کے حوالہ سے ہو !

ذلت و عزت !

○ " ضُرِبَتۡ عَلَیۡہِمُ الذِّلَّۃُ اَیۡنَ مَا ثُقِفُوۡۤا اِلَّا بِحَبۡلٍ مِّنَ اللّٰہِ وَحَبۡلٍ مِّنَ النَّاسِ"

(ان پر ذلت ڈال دی گئی وہ جہاں بھی ہوں سوائے اس کے کہ وہ اللہ کی رسی کو تھام لیں اور لوگوں کے ساتھ مل جائیں)

لفظ "ذلت" اپنے معنی کی حامل نوع کے لئے بنایا گیا ہے۔

اور لفظ "ذُلّ" (ذال پر ضمہ کے ساتھ) ذلت کی اس حالت و کیفیت کو کہتے ہیں جو قہر و غلبہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اور ذال کے نیچے زیر کے ساتھ "ذِلّ" اس ذلت کو کہتے ہیں جس کا سبب تعصب اور تکبر ہو...... یہ معانی راغب نے مفردات القرآن میں لکھے ہیں......، البتہ اس کا عمومی و جامع معنی کہ جو "ذل" (ذال پر پیش کے ساتھ) اور "ذل" (ذال کے نیچے زیر کے ساتھ) اور اس کے دیگر مشتقات میں پایا جاتا ہے اور قابل تطبیق ہے وہ مد مقابل کے سامنے انکساری و مطاوعت اور رام ہو جانا ہے، اس کے مقابل میں لفظ "عـز" ہے کہ جس کا معنی مد مقابل یا کسی کے سامنے عجز و انکساری اور اس کی مطاوعت نہ کرنا ہے۔

جملہ "ثُقِفُوٓا" کا معنی یہ ہے کہ وہ جہاں بھی پائے جائیں...... جس مقام پر ہوں......

لفظ "حبـل" اس سبب کو کہتے ہیں جس کو تھام کر بچاؤ کا اقدام کیا جاتا ہے۔ اس لفظ کو استعارہ کے طور پر ہر اس چیز کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جو امن، بچاؤ اور حفاظت کا سبب ہو جیسے عہد کرنا، ذمہ میں لے لینا اور امان و پناہ دینا بھی اسی معنی میں آتے ہیں...... اور انہیں بھی حبل سے تعبیر کیا جاتا ہے......، یہاں آیت مبارکہ میں مراد یہ ہے (واللہ اعلم) کہ ذلت ان کی تقدیر میں لکھی جا چکی ہے اور اس طرح ان کی لوح حیات پر ثبت ہو چکی ہے جیسے کسی دھات پر مہر ثبت ہو جاتی ہے یا جیسے خیمہ انسان کے سر پر نصب ہوتا ہے، اسی طرح ذلت ان کے لئے لکھی جا چکی ہے یا اس پر مسلط ہو چکی ہے اور اس سے نجات صرف اسی صورت میں مل سکتی ہے کہ وہ اللہ کی رسی کو تھام لیں اور اس کے ذریعے خدائی توفیق و عنایت سے بہرہ مند ہو جائیں، اور انسانیت کی مضبوط رسی سے وابستہ ہو جائیں۔

یہاں آیت مبارکہ میں لفظ "حبـل" دوبارہ ذکر ہوا ہے (بِحَبۡلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبۡلٍ مِّنَ النَّاسِ) اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں اضافتوں میں اس کا معنی مختلف ہے یعنی جب حبل من اللہ کہا جائے تو اس کا معنی وہ نہیں ہوگا جو حبل من الناس میں ہے، بلکہ خدا کی طرف اضافت میں اس کا معنی قضاء و قدر اور تکوینی یا تشریعی حکم و فیصلہ ہے اور لوگوں کی طرف نسبت و اضافت میں اس کا معنی عملی یکجہتی ہے۔

اور "ضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ" (ذلت ان پر ڈال دی گئی) سے مراد تشریعی طور پر ان کا ذلت سے دوچار کیا جانا ہے۔ چنانچہ اس کا ثبوت جملہ "اَيۡنَ مَا ثُقِفُوٓا" میں موجود ہے کیونکہ بظاہر اس کا معنی یہ ہے کہ مؤمنین جہاں بھی انہیں پائیں یعنی ان پر تسلط و بالادستی حاصل کر لیں، یہ معنی ان کی تشریعی ذلت سے اس لئے موزونیت رکھتا ہے کہ اس کے آثار میں سے ایک "جزیہ" ہے،...... یعنی جب مؤمنین ان پر غلبہ پالیں اور انہیں قبضہ میں لے لیں تو ان سے جزیہ لیں جو کہ خدا کی طرف سے مقررہ سزا کے طور پر ان کی ذلت کی ایک صورت ہے......

اس طرح آیت کا معنی یہ ہوگا کہ وہ لوگ شریعت اسلامیہ کی رو سے ذلیل ہیں مگر یہ کہ وہ یا ذمۂ اسلام میں آ جائیں

یا کسی بھی طرح لوگوں (مسلمانوں) سے امان حاصل کرلیں۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ آیت "ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ" (ان پر ذلت ڈال دی گئی) شرعی حکم صادر کرنے کے مقام میں نہیں بلکہ خدائی فیصلہ اور قضاء وقدر سے آگاہ کرنے کی صورت میں ہے کیونکہ ظہور اسلام کے وقت یہودی سخت ذلت سے دوچار تھے کہ وہ مجوسیوں کو جزیہ دیتے تھے اور ان کے بعض گروہ نصاریٰ کی آمریت کا شکار تھے۔

اگرچہ یہ معنی کسی حد تک درست معلوم ہوتا ہے اور شاید اس کی تائید اس کے بعد آیت کے آخر تک کے الفاظ سے بھی ہوتی ہے کیونکہ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہودیوں کی ذلت و بیچارگی کا سبب ان کا اپنا کیا دھرا ہے اور وہ یہ کہ وہ آیات الٰہی کا انکار کرتے تھے، انبیاء کو قتل کر دیتے تھے اور ہمیشہ دوسروں پر زیادتی کرتے تھے، لیکن اس سے آیت میں اہل کتاب سے صرف یہودی مراد لینے پڑیں گے جبکہ اس طرح کی تخصیص کی بظاہر کوئی وجہ دکھائی نہیں دیتی، بہرحال اس سلسلہ میں عنقریب آیہ مبارکہ "وَأَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ" ......سورۂ مائدہ، آیت ۶۴......کی تفسیر میں مزید مطالب ذکر کئے جائیں گے۔

غضبِ الٰہی کی بارش

سہیل سکینہ
حیدرآباد سندھ، پاکستان

○ "وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ"
(اور وہ غضب الٰہی میں گھر گئے اور ان پر رسوائی ڈال دی گئی)

"باؤا" کا معنی اختیار کرنا، بنالینا ہے، عربی زبان میں جب یہ کہا جاتا ہے: "باؤا مباءة ومكاناً" تو اس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک جگہ اپنے لئے اختیار کرلی، اسے اپنا ٹھکانہ بنالیا، یا یہ کہ ایک جگہ واپس آگئے۔

لفظ "مسکنت" شدید ترین فقر و ناداری کو کہتے ہیں، اور بظاہر اس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ انسان فقر و ناداری اور محرومی کی اس حد تک پہنچ جائے کہ اس سے چھٹکارے کا راستہ اسے دکھائی نہ دے، اس معنی کی روشنی میں آیت کے صدر اور ذیل میں پائی جانے والی عمدہ موزونیت واضح و ظاہر ہو جائے گی۔

عصیان اور اعتداء

O " ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ "
(یہ اس لئے ہوا کہ انہوں نے معصیت و نافرمانی کی اور وہ زیادتیاں کرتے تھے)

اس جملہ کا معنی یہ ہے کہ ان پر ذلت و سکنت اس لئے ڈال دی گئی کہ وہ عصیان و ترک اطاعت کے مرتکب ہوئے جبکہ وہ اس سے پہلے زیادتیوں پر زیادتیاں کرتے چلے آ رہے تھے۔

تمام اہل کتاب برابر نہیں

O " لَيْسُوْا سَوَآءً...... (تا) مِنَ الصّٰلِحِيْنَ "

لفظ "سَوَآءً" (برابر) مصدر ہے اور اس سے وصفی معنی مراد لیا گیا ہے، مقصود یہ ہے کہ اہل کتاب سب کے سب اس حوالہ سے ایک جیسے نہیں اور اس وصف و حکم سے سب برابر نہیں، کیونکہ ان میں سے کچھ افراد ایسے بھی ہیں جو آیات الٰہی کی تلاوت کرتے ہیں، شب و روز عبادت بجا لاتے ہیں، خدا اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں، نیکیوں کی انجام دہی میں بڑھ چڑھ کر کام کرتے ہیں،......الخ۔

اسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ جملہ "مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ......" ان کے بارے میں خدائی حکم کا سبب بیان کرنے کے مقام میں ہے کہ جس کے ذریعے تمام اہل کتاب کا برابر نہ ہونا بیان کیا گیا ہے۔

آیت مبارکہ میں "اُمَّةٌ" کے ساتھ لفظ "قَآئِمَةٌ" کے مختلف معانی کئے گئے ہیں، بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ وہ خدا کے حکم و فرمان پر قائم و ثابت قدم ہیں، بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ عادل ہیں، بعض حضرات نے اس کا معنی اس طرح بیان کیا ہے کہ وہ صحیح و درست مذہب و ملت والے افراد ہیں، لیکن حق یہ ہے کہ لفظ "قائمة" میں اطلاق پایا جاتا ہے اور مذکورہ تمام معانی میں اس کا استعمال کیا جانا ممکن ہے البتہ "کتاب" اور ان کے اعمالِ صالحہ کا ذکر کیا جانا اس کا تعین کر دیتا ہے کہ اس سے ان کا ایمان اور اطاعت پر قائم و ثابت قدم ہونا مراد ہے۔

لفظ "اٰنَآءَ" جمع کا صیغہ ہے اس کا مفرد "إنی" ہے۔ (ہمزہ کے نیچے زیر یا زبر کے ساتھ!) بعض حضرات کا کہنا

ہے کہ یہ "إنو" کی جمع ہے کہ جس کا معنیٰ "وقت" ہے، اس بناء پر لفظ "آنَآءَ" کا معنی اوقات ہوگا۔

مسارعت کا معنی مبادرت اور جلدی کرنا ہے، یہ "سرعت" سے باب مفاعلہ ہے، مجمع البیان میں مؤلفؒ نے کہا ہے کہ "سرعت" اور "عجلت" میں یہ فرق ہے کہ "سرعت" اس کام میں جلدی کرنے کو کہتے ہیں جس میں جلدی کرنا جائز اور روا ہو، اس حوالہ سے وہ پسندیدہ صفت کہلاتی ہے۔ اس کے مقابل میں "ابطاء" (کندروی، سستی) ہے جو کہ مذموم صفت ہے۔ اور "عـجـلـت" اس کام میں جلدی کرنے کو کہتے ہیں جس میں جلدی نہیں کرنی چاہیے، اس حوالہ سے وہ مذموم و ناپسندیدہ صفت کہلاتی ہے اور اس کے مقابل میں "انـــات" ......تانی و بے رغبتی......ہے جو کہ پسندیدہ صفت ہے، (ملاحظہ ہو: مجمع البیان جلد ۲ ص ۴۸۸)۔

ظاہراً "سرعت" اصل میں حرکت کا وصف اور "عجلت" متحرک (حرکت کرنے والا) کا وصف ہے، ......سرعت یعنی تیز رفتاری اور عجلت یعنی تیز رفتار شخص، البتہ ان کے استعمالی موارد ان کے درمیان پائے جانے والے فرق کو واضح کرتے ہیں......

لفظ "خیرات" تمام اعمال صالحہ کے لئے استعمال ہوتا ہے خواہ عبادات ہوں، یا مالی انفاق ہو، خواہ عدل ہو اور یا حاجت روائی ہو، سب کو "خیر" کہا جاتا ہے۔ یہاں یہ لفظ دو خصوصیات کا حامل ہے، ایک یہ کہ جمع کا صیغہ ہے "خیرات" جس کا معنی ہے نیکیاں، اور دوسرا یہ کہ اس پر الف ولام آیا ہے "الخیرات" کہ جو استغراق یعنی تمام معانی کا حامل ہے، لہٰذا تمام نیکیاں و نیک اعمال اس میں شامل ہیں۔ البتہ عام طور پر اسے مالی نیکیوں میں استعمال کیا جاتا ہے اور یہ اسی طرح سے ہے جیسے لفظ "خیر" عام طور پر مال اور مالی موارد میں استعمال ہوتا ہے۔

اس آیت میں خداوند عالم نے اہل کتاب کی تمام اچھی صفات کو ذکر کیا ہے یعنی ایمان، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، ہر کار خیر میں جلدی کرنا (نیکیوں میں آگے بڑھنا)، پھر ان کی توصیف میں کہا کہ وہ صالحین میں سے ہیں اور اسی وجہ سے وہ صراط مستقیم والے اور نبیوں، سچوں اور شہیدوں کے ساتھی ہیں، چنانچہ سورۃ الحمد کی آخری آیت میں یوں ارشاد ہوا: "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ ۙ۬ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ"، (ہمیں صراط مستقیم کی ہدایت فرما، ان لوگوں کا راستہ جنہیں تو نے نعمتیں عطا کیں کہ جن پر تیرا غضب نازل نہیں اور نہ ہی وہ گمراہ ہیں) اور سورۂ نسآء، آیت ۶۹ میں یوں ارشاد ہوا: "فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ......" (وہی ہیں جو ان لوگوں کے ساتھ ہیں جن پر اللہ نے نعمتیں نازل کیں نبیوں میں سے، صدیقین میں سے اور شہیدوں و صالحین میں سے)۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس آیت میں جن کی تعریف کی گئی ہے ان سے عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی مراد ہیں۔

کارِخیر کا نیک انجام

O " وَمَا يَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُكْفَرُوهُ "
(اور وہ جو بھی نیک کام کریں اس کی ناقدری ہرگز نہ کی جائے گی)

یہاں ''کفر'' سے مراد ''کفران'' ہے جو شکر کے مقابل میں آتا ہے۔ یعنی خداوند عالم ان کے کارِ خیر پر ان کا شکریہ ادا کرتا ہے اور ان کے کارِ خیر کو...... قبول کر کے اس کی برکات...... ان کی طرف لوٹا دیتا ہے کہ اسے ضائع و بے نتیجہ نہیں چھوڑتا، جیسا کہ درج ذیل آیت میں یوں ارشاد فرمایا:

سورۂ بقرہ، آیت :۱۵۸

O " وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَإِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ "
(اور جو شخص اپنی پسند سے نیکی کرے تو اللہ شکر گزار اور بہت زیادہ جاننے والا ہے)

سورۂ بقرہ، آیت :۲۷۲

O " وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلِأَنْفُسِكُمْ ...... وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تُظْلَمُونَ "
(اور تم جو نیکی کرو وہ تمہارے اپنے لئے ہے...... اور تم جو نیک کام کرو...... انفاق کرو...... تو تمہیں پورا پورا دیا جائے گا اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا)

کفار خسارے میں ہیں

O " إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ...... "
(جن لوگوں نے کفر اختیار کیا انہیں فائدہ نہ دیں گے۔۔۔)

وحدتِ سیاق سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جن کا تذکرہ یہاں ہوا ہے کہ انہوں نے کفر اختیار کیا (الذین کفروا) ان سے مراد اہل کتاب کا وہ گروہ ہے جنہوں نے نبیؐ کی دعوت کو قبول نہیں کیا بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ وہ اسلام کے خلاف

سازشیں کرتے رہے اور انہوں نے اپنے تمام وسائل شمع اسلام گل کرنے میں لگا دیئے اور اس مقصد کے لئے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ اس آیت میں اہل کتاب کی بجائے مشرکین ملحوظ ہیں اور یہ واقعۂ احد کے تذکرہ کا تمہیدی بیان ہے کہ جس کی بابت بہت جلد اشارہ ہوگا۔

لیکن یہ رائے بعد میں آنے والے جملہ "وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا" (آیت ۱۱۹) کے تناظر میں قرین صحت نظر نہیں آتی، کیونکہ اس میں یہودیوں کے مسلمانوں سے طرز عمل کا ذکر ہے نہ کہ مشرکین کے طرز عمل وروش کا !

اسی سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں تک آیات کا اتصال و پیوستگی اپنے مقام پر باقی ہے اور اس میں کوئی خلل وانقطاع واقع نہیں ہوا۔

بعض مفسرین نے زیر نظر آیت کے بارے میں کہا ہے کہ یہ مشرکین کے طرز عمل کو بیان کرتی ہے جبکہ "تُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ......" والی آیت یہودیوں کے بارے میں ہے، لیکن یہ نظریہ درست نہیں۔

دنیاوی زندگی کی مماثلت

O " مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا......"

(اس دنیاوی زندگی میں وہ جو کچھ خرچ کرتے ہیں۔۔۔)

اس آیت میں لفظ "صــــر" ذکر کیا گیا ہے اس کا معنی سخت سردی ہے۔ یہاں اسے تمثیلی صورت میں ذکر کرتے ہوئے دنیاوی زندگی میں انفاق سے اس لئے مقید کیا گیا ہے تاکہ اس بات کا ثبوت دیا جا سکے کہ وہ لوگ (یہودی) اخروی زندگی سے منقطع ہیں اور ان کا انفاق ان کی دنیاوی زندگی کے سوا انہیں کوئی فائدہ نہ دے گا اور "حــرث قــوم" کو "ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ" سے اس لئے مقید کیا گیا ہے تاکہ بعد والے جملہ "وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ" سے اس کا ربط بخوبی واضح ہو۔

خلاصۂ کلام یہ کہ یہودیوں کا اپنی دنیاوی زندگی میں انفاق اور مال خرچ کرنا اگرچہ ان کی نظر میں ان کی دنیاوی زندگی کی بہتری و رفاہ اور ان کے غلط مقاصد کے حصول کے لئے ہے لیکن وہ اس سے شقاوت و بدبختی کے علاوہ کچھ حاصل نہیں کر سکیں گے بلکہ وہ جس چیز کو اپنے لئے فائدہ مند اور سعادت بخش سمجھتے ہیں وہ اس ہوا کی طرح ہے جس میں سخت سردی

ہو جو ظالموں کی کھیتی کو تباہ کر دے، اور یہ صرف اس ظلم کی بناء پر ہے جو انہوں نے اپنے اوپر کیا ہے کیونکہ برے عمل کا نتیجہ برا ہی ہوتا ہے۔

رازداری کا اصول

O "يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ......"
(اے ایمان والو! تم اپنے سوا کسی کو رازدار نہ بناؤ۔۔۔)

اس آیت میں "ولیجه" یعنی رازداری و قریبی رشتہ داری کو "بِطَانَةً" سے تعبیر کیا گیا ہے کہ جس کا معنی کپڑے کا استر ہے، یعنی وہ کپڑا جو بدن سے بیرونی کپڑے کی نسبت زیادہ نزدیک ہوتا ہے، یہاں اس لئے اس کے ساتھ تشبیہ دے کر بیان کیا گیا ہے کہ استر انسان کے اندر اور جسم کی چھپی ہوئی جگہوں سے زیادہ آگاہ ہوتا ہے، چنانچہ نزدیک ترین شخص کی مثال بطانہ یعنی استر سے دی گئی ہے۔

"لَا يَاْلُوْنَكُمْ" کا معنی یہ ہے کہ تمہارے بارے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑیں گے۔

"خَبَالًا" کا معنی شر اور فساد ہے، اسی وجہ سے جنون و دیوانہ پن کو "خبل" کہتے ہیں کیونکہ اس میں عقل کی خرابی ہوتی ہے۔

جملہ "وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ" میں حرف "ما" مصدریہ ہے، اس بناء پر اس کا معنی یوں کیا جائے گا: "ودوا واحبوا عنتكم و شدة ضرركم" وہ تمہاری سخت تکلیف اور شدید نقصان کے خواہاں ہیں۔

جملہ "قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ" سے مراد یہ ہے کہ ان کی دشمنی اور عداوت ان کی زبانوں پر آ گئی ہے اور اپنے اندر چھپی ہوئی آگ کو ظاہر کر چکے ہیں کہ ان کا طرزِ سخن ہی تم سے ایسا ہے کہ اب سب کچھ آشکار ہو چکا ہے، تو اس میں ایک نہایت لطیف استعارہ و کنایہ سے کام لیا گیا ہے، اس میں یہ راز نہیں کھولا گیا کہ ان کے سینوں میں کیا چھپا ہوا ہے بلکہ اسے پردۂ ابہام ہی میں رہنے دیا گیا اور جملہ "وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ" (اور جو کچھ ان کے سینوں میں چھپا ہوا ہے وہ بہت بڑا ہے) کے ذریعے اشارہ کیا گیا ہے کہ ان کے سینوں یعنی دلوں میں چھپی ہوئی بات تنوع اور بہت بڑی ہونے کی وجہ سے لفظوں میں بیان نہیں کی جا سکتی، چنانچہ لفظ "اکبر" اس پوشیدہ راز کے توصیف سے باہر ہونے کا تاکیدی اشارہ ہے۔

جملہ "هٰۤاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ......" میں ظاہراً حرف "اُولَآءِ" اسم اشارہ ہے اور حرف "هَا"

تنبیہ اور متوجہ کرنے کے لئے ہے، حرف "ھَا" اور حرف "اُولَآءِ" کے درمیان "انتم" ذکر ہوا ہے، لہٰذا آیت کا معنی اس طرح کیا جائے گا: "انتم ھٰؤلاء" تم وہی ہو... تم ہی ہو...، اور یہ اسی طرح ہے جیسے عربی زبان میں کہا جاتا ہے :
"زید ھٰذا و ھند ھٰذہ کذا و کذا" یہ زید اور یہ ہند، اس طرح ہے اور اس طرح ہے۔

جملہ "وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ" میں کتاب پر الف ولام (الکتاب) جنس کا معنی دیتا ہے، اس بناء پر جملہ کا معنی یہ ہوگا کہ تم تو تمام آسمانی کتابوں پر کہ جو اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہیں ایمان رکھتے ہو، خواہ وہ تمہاری کتاب ہے یا ان کی کتاب ہے، جبکہ وہ تمہاری کتاب پر ایمان نہیں رکھتے۔

جملہ "وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا" (اور جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی ایمان لائے ہیں) میں اہل کتاب کے نفاق کو بیان کیا گیا ہے کہ وہ منافقانہ طور پر جب تم سے ملتے ہیں تو ایمان کا اظہار کرتے ہیں۔

جملہ "وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ" (اور جب وہ اکیلے ہوتے ہیں تو غصہ کی وجہ سے اپنی انگلیاں کاٹنے لگتے ہیں) میں "عض" کا معنی دانتوں سے سختی کے ساتھ کاٹنا ہے۔

"انامل"، انملة کی جمع کا صیغہ ہے جس کا معنی انگلی کا سرا ہے۔

"غیظ" کا معنی سخت غصہ وکینہ ہے۔

"عض الانامل" غصہ اور کینہ کی بناء پر سخت حسرت وافسوس کے اظہار کے موقع پر بولی جانے والی ضرب المثل ہے۔

جملہ "قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ" (کہہ دیجئے کہ تم اپنے غصہ وکینہ ہی میں مرجاؤ) دراصل فرمان کی صورت میں ان پر بددعا ہے۔ اسی سے اس کا ربط واتصال اس سے ملحق جملہ "اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ" سے قائم ہوجاتا ہے لہٰذا اس کا معنی یہ ہوگا: "اللھم امتھم بغیظھم انک علیم بذات الصدور" (کہو: اے اللہ! انہیں ان کے کینہ کی وجہ سے موت دے دے، کہ بے شک تو سینوں میں چھپی ہوئی باتوں کو بخوبی جانتا ہے، یعنی جو کچھ دلوں اور سوچوں مں ہے تو اس سے اچھی طرح آگاہی رکھتا ہے۔

جملہ "اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْھُمْ" (اگر تمہیں کوئی اچھائی...... اچھی چیز ونیکی...... ملے تو انہیں تکلیف ہوتی ہے) میں "مسائت" ...... کہ جو "تَسُؤْھُمْ" کا مصدر ہے...... کا معنی سرور وخوشی کے مقابل میں آتا ہے یعنی ناخوشی،

بہرحال اس آیت میں رہنمائی کی گئی ہے کہ ان کی چالوں سے بچنے اور ان کے دلوں میں چھپے ہوئے کینہ ودشمنی سے محفوظ رہنے کے لئے صبر اور تقویٰ بنیادی شرطیں ہیں یعنی اگر تم ان کے شر سے بچنے کے خواہاں ہو تو صبر اور تقویٰ اختیار کرو۔

الحمد رب العالمین وله الشکر علی نعمة التمام و توفیق الاتمام،

وصلی اللّٰہ علٰی محمد و آله الطاهرین،

ترجمہ المیزان جلد ۳

بروز منگل ۱۹ فروری ۲۰۰۸ء تمام ہوا۔

"اللهم تقبل منی باحسن القبول ووفقنی لما فیه رضاک یا ولی التوفیق"

العبد حسن رضا غدیری

لندن

سہیل سکینہؑ

حیدرآباد لطیف آباد، یونٹ نمبر ۸ ـ ۹